UNIVERSAL
LIBRARY

The Drinched Book

text fiy book

text cut book only

The Zamana.
Regd No. A. 211.
January 1939.

زمانہ

ایک ماہوار رسالہ

مرتبہ:- دیا نراین نگم، بی۔ اے،

جلد ۷۲	جنوری سنہ ۱۹۳۹ء	نمبر ۱

فہرست

تصاویر:- آہو چشم (رنگین) نشاط باغ۔ شالامار باغ سری نگر۔

قیمت سالانہ پانچ روپیہ

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

یک پرچہ آٹھ آنہ

نمونہ سات آنہ

گھر میں رکھنے والی چھ چیزیں جن کا ثانی دوسرا نہیں

"امرت دھارا" رجسٹرڈ

لاہور کے مشہور و معروف حکیم کوی و نود وید بھوشن پنڈت ٹھاکر دت شرما وید کی ایجاد ہے۔ جس نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ باقی پانچوں ادویات اس عجیب الاثر دوائی کی ملاوٹ سے تیار کیجاتی ہیں۔ لاکھوں استعمال کرنے والوں میں سے ۳۶ ہزار سے اوپر لکھ کر بھیج چکے ہیں کہ:۔

"امرت دھارا ہر گھر اور جیب میں موجود رہنی چاہئے"

یہ ایک ہی دوائی کھانے اور لگانے سے تقریباً کل امراض یا حادثات کا قطعی علاج ہے۔ ہر قسم کے اندرونی و بیرونی درد، نزلہ، کھانسی، زکام، دمہ، بخار، ہیضہ، انفلوئنزا، پلیگ، نمونیا، چوٹ، زخم، پھنسی، سانپ، بھڑ وغیرہ کا ڈنک کوئی بیماری نہیں جو یہ دور نہ کرے

قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ۔ نصف عصہ۲ ۔ نمونہ ۸ر

"امرت دھارا" مرہم رجسٹرڈ

بعض جلدی امراض کے دور کرنے والی ادویات کو اپنی مشہور و معروف دوائی "امرت دھارا" کے ساتھ ملانے سے تیار کی گئی ہے۔ "امرت دھارا مرہم" میں

کوئی حیوانی چربی شامل نہیں ہے!

"امرت دھارا" مرہم تقریباً تمام جلدی امراض کیلئے بے نظیر دوائی ہے۔ تمام قسم کے زخم، چوٹ، رگڑ، پھوڑے، پھنسیاں، خارش، داد، چنبل، ایگزیما، چھالے، ہاتھ پاؤں کا پھٹنا، سوزش جلد، جلدی دانے۔ زخم ہائے آتشک، مسہ ہائے بواسیر، مچھر، بھڑ وغیرہ کے ڈنک، آگ یا گرم پانی یا تیزاب وغیرہ سے جلنا سب اس سے دور ہو جاتے ہیں۔ بڑے بڑے گہرے زخم اتنی جلدی بھرنے شروع ہوتے ہیں کہ بڑے بڑے ڈاکٹر حیران رہ جاتے ہیں۔ عجیب مرہم ہے۔ قیمت فی بکس ایک روپیہ (عہ ر)

"امرت دھارا" صابن

اس صابن میں جو خوبی ہے وہ کسی میں نہیں۔ یہ صابن جلدی امراض جیسے داد، چنبل، پھوڑے، پھنسی، پتی، خارش، گرمی دانے، کیل، چھائیاں وغیرہ کو دور کرتا ہے۔ کاربالک سوپ وغیرہ کی طرح بدبودار نہیں ہے بلکہ روزانہ استعمال کے لئے یہ لاثانی چیز ہے۔ میل کو فوراً دور کرتا ہے۔ چمڑے کو نرم اور خوبصورت بناتا ہے۔ ڈس انفکٹنٹ (جرم کش) اول درجہ کا ہے

اسواسطے وبائی دنوں میں باہر سے آکر اس سے ہاتھ دھونے چاہئیں

جب سے ہم نے یہ صابن مشتہر کیا ہے پبلک نے اسکو بہت پسند کیا ہے۔ قیمت تین ٹکیہ کا بکس صرف چودہ آنہ (۱۴ر) فی ٹکیہ ۵ر

"امرت دھارا" لوزنجز یعنے "امرت دھارا" کی میٹھی ٹکیہ رجسٹرڈ

ولایت سے پیپرمنٹ کی ٹکیہ وغیرہ برائے فروخت ہندوستان میں آتی ہیں۔ ہم نے امرت دھارا کی ٹکیہ تیار کی ہیں۔ جن کے ذریعے بچے اور نازک مزاج تک امرت دھارا کو نہایت خوشی سے کھا سکتے ہیں۔ آپ جیب میں ہر وقت امرت دھارا ٹکیہ کو رکھ سکتے ہیں، اور وہاں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ان کو چوسنے سے حسب ضرورت امرت دھارا کا فائدہ ہونیکے ساتھ ساتھ دانتوں اور مسوڑھوں کے امراض بلغم، خراش گلو، گلے پڑنا، کھانسی وغیرہ کو فائدہ ہوتا ہے۔ بچوں سے کہو کہ بدیسی ٹکیہ و گولیاں وغیرہ کھانے کے بجائے ان کو پاس رکھا کریں۔

قیمت فی ڈبیہ ایک سو ٹکیہ ۱۲ر

"امرت دھارا" بام

یہ بام خاص طور پر تمام قسم کے دردوں کیواسطے اکسیر ہے۔ جہاں درد، اینٹھن، سوجن، چیرنا، توڑنا، کریدنا وغیرہ ہو۔ اس جگہ کے لئے اس سے بڑھ کر آپ کو آرام دینے والی بام نہ ملیگی۔ گٹھیا، گوٹ، درد چھاتی وغیرہ سب میں استعمال ہو سکتی ہے

قیمت فی شیشی ایک روپیہ (عہ ر)

"امرت دھارا" لوشن

اس کے غرارے کرنے سے منہ، دانت، گلا کی عفونت دور ہوتی ہے اور منہ کی بیماریاں نہیں ہوتیں۔ اگر ہوں تو ہٹ جاتی ہیں۔ دانت مضبوط رہتے ہیں۔ حجامت کے بعد مل لینے سے استرا لگنے کا اثر نہیں ہوتا۔ بالوں پر ملنے سے بال مضبوط رہتے ہیں۔ گلے کی خرابیاں دانتوں کی عفونت، گندہ دہنی، مچھر وغیرہ کاٹے پر لگا سکتے ہیں۔

قیمت فی شیشی ایک روپیہ (عہ ر)

خط و کتابت و تار کا پتہ:۔
"امرت دھارا" ۲۵۴ لاہور

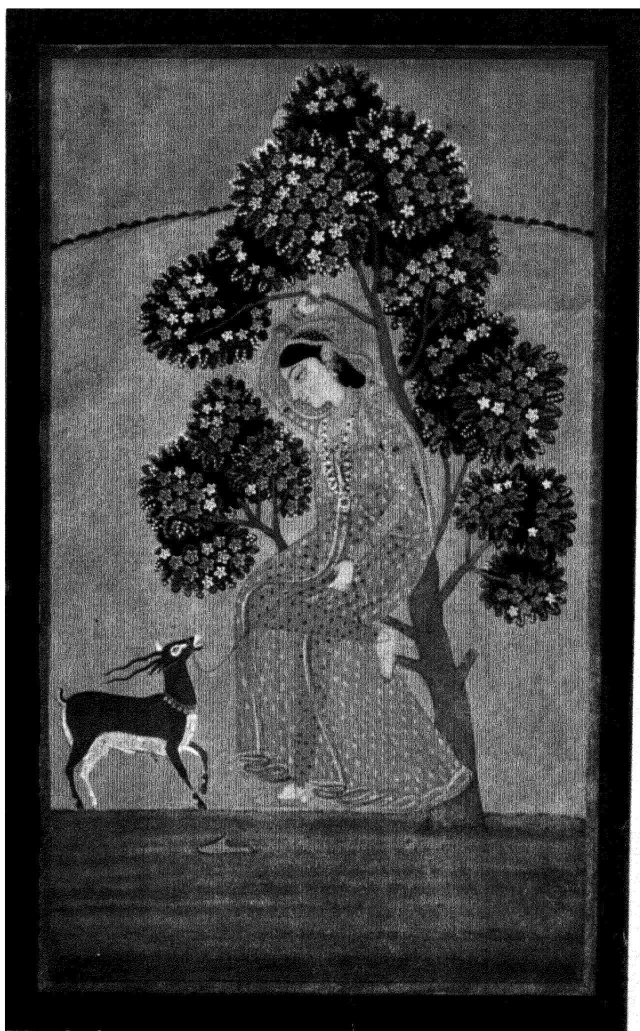
المشتہر
مینجر امرت دھارا اوشدھالیہ۔ امرت دھارا بھون۔
امرت دھارا سڑک، امرت دھارا ڈاکخانہ، لاہور

فہرست مضامین "زمانہ" جلد ۷۲ بابتہ جنوری لغایتہ جون ۱۹۳۹ء

تصاویر:- آہوئے چشم (رنگین)، نشاط باغ۔ شالامار باغ۔ پنڈت برج نراین چکبست۔ آنریبل بابو سمپورنانند وزیر تعلیم۔ رائے صاحب پنڈت سری نراین چترویدی۔ خنکار (رنگین)، مسٹر سنت پرشاد مدیر ہرش

حصۂ نثر

حصۂ نظم



آهو چشم

زمانہ

جلد ۷۲   جنوری ۱۹۳۹ء   نمبر ۱

ادیب کی آرزو

ایک "ادیب" کے قلم سے

دہرہ دون - ۲۳ - جون ۳۸ء

حامد! تمہارا خط ابھی ابھی مجھے ملا، اس کی پانچ ہی سطروں نے میرے دل میں کچھ ایسا ہیجان برپا کردیا ہے کہ اب آگے پڑھنے کی تاب نہیں، معلوم نہیں کہ آئندہ بھی کبھی اس کے مطالعہ سے اپنے دل کے سب سے زیادہ دُکھتے ہوئے زخم پر نشتر لگانے کی جرات کرسکوں گا یا نہیں۔ مجھے معاف کرنا حامد، اپنے حُسن کے بلند تصورات سے، اپنے جذبات کی فراوانی سے، اور دُور سے محسوس ہونے والے نیم بیدار اشارات سے مجبور ہوں کہ اپنی مکمل شکست کا اعتراف کرلوں۔

میری طرح غالباً تم بھی مجبور ہو۔ تمہارے لئے روپیہ۔ بینک۔ تجارتی اور سیاسی معاہدے۔ فوج اور آلات حرب۔ سماج۔ غربت۔ افلاس۔ فاقہ۔ اناج۔ غلہ۔ زمین اور پیداوار اس دنیا کی ناقابل انکار حقیقتیں ہیں، اور اِن مسائل میں بڑی حد تک کامیابی ممکن ہے۔ اگر آج نہیں تو کل۔ لیکن حامد! میرے لئے سب سے بڑی حقیقت خود "حیات" اور "زندگی" ہے۔ یہ حقیقت کتنی وسیع، کتنی عمیق اور کتنی ہمہ گیر ہے۔ اس کے متعلق ذرا سوچو حامد۔ انسانی دماغ ازل سے اس کو سوچ رہا ہے اور تھکتا نہیں ابھی تک ناکامیابی کے یقین کے باوجود حیات وکائنات کا حل تلاش کرنے میں سرگرداں ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ خواہ عقل کے پنجے اس گتھی کو سلجھانے میں شل ہوجائیں، خیالات کی بلند پروازیاں پستیوں میں

تبدیل ہوجائیں، اور غور و فکر کی کرنیں ایک بار عالم کے تمام مستور ذرّوں کو چمکا دیں لیکن زندگی کے بھید کا پتہ ہرگز نہیں چل سکتا۔ مگر اس علم کے باوجود وہ کائنات کے مرکزی نکتہ کے تعین کے لئے بیچین نظر آتا ہے۔

حامد! موسیٰ اور طور کا قصہ تو تم نے بارہا سنا ہوگا، آؤ میں تم کو انسان اور زندگی کے طور کی بھی زیارت کرادوں۔ ادراک اور کاوش کا سرمایہ لٹا چکنے کے بعد مضطرب انسانی زندگی کے حضور میں سوز و گداز کے ہاتھوں پر ایک دھڑکتے ہوئے حسّاس دل کا پیشکش لیکر حاضر ہوتا اور زندگی سے اپنے رُخ کا نقاب اُلٹ دینے کی منتیں کرتا ہے، تو زندگی اُس کو اپنے ایک ہلکے سے جلوہ سے مسحور کرکے خاموش کر دیتی ہے انسان پوچھتا ہے زندگی کیا ہے؟ زندگی انسان کے سوال کو یہ پوچھکر ٹال دیتی ہے کہ محبّت کیا ہے؟ ادب و شاعری کیا ہیں؟ حُسن کا دل یا آرٹ کس کو کہتے ہیں؟ خود حُسن کی کیا حقیقت ہے؟

اِنسان انھیں سوالات کا حل تلاش کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے۔ برسوں، عمروں، صدیوں وہ انھیں مسائل میں منہمک رہتا ہے، سوچتے سوچتے وہ حیران ہو جاتا ہے، گفتگو اور بحث کرکے تھک جاتا ہے۔ کتابیں لکھ لکھ کر وہ ایک انبار لگا دیتا ہے۔ لیکن یہ تمام جوابات اس کے دل کو تشفی نہیں بخش سکتے اور اس کے دل کی پیاس بجھانے کے لئے ناکافی ثابت ہوتے ہیں۔

یہ سب کچھ میں نے اس لئے لکھ دیا کہ تم سرچشمۂ ادب کی گہرائی، وسعت اور اہمیت کا پورا اندازہ کرسکو۔ اور یہ محسوس کرلو کہ ادب کی تصویریں صرف زندگی کے پس منظر پر کھنچ سکتی ہیں۔

ممکن ہے ہم اس کا جواب نہ دے سکیں کہ ادب کیا ہے، ممکن کیا یقیناً۔ لیکن پورے یقین کے ساتھ اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ادب کا زندگی سے گہرا تعلق ہے، ادب زندگی کا ایک عکس ہے، جیسا میں نے ابھی کہا کہ زندگی کے اُن متعدد لطیف جلووں میں سے جو انسان کو مسئلہ حیات سے قریب تر کر دیتے ہیں ایک ادب بھی ہے۔

اب ذرا غور کرو حامد! جو شخص ادب کو اس نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو، جو اپنی منزلِ مقصود کے فاصلہ اور دوری کا تصوّر بھی نہ قائم کرسکتا ہو، جو ادب کی تکمیل کو زندگی کے رازِ سربستہ کے عریاں ہو جانے کے برابر سمجھتا ہو جو زندگی کی حقیقت کا ایک خفیف اور دھندلا سا احساس حاصل کرنے کے لئے ادب کی وسیع لیکن پھر بھی نہایت دشوار گذار وادیوں سے اپنے دل کے موہوم اشارات پر کسی نامعلوم جذبہ کے ماتحت برابر چلا جارہا ہو، مسلسل اور پیہم چلا ہی جارہا ہو۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے کو غزل سے اتنا ہی دور سمجھے جتنا شعر کے شروع میں تھا۔ جس کے ذہن حُسن کاری (آرٹ) اور ادب کے معیار کی بلندی کا احساس انسانی قوتوں سے کہیں بالاتر ہو

ادبیات میں تخلیقی کوششوں کے متعلق جس کی آرزوئیں اتنی لطیف اور اتنی پاکیزہ اور اس قدر مرتفع واقع ہوئی ہوں کہ اُسے چند لمحوں کے لیے بھی اپنی کامیابی اور تکمیل آرزو کا خیال نہ آیا ہو۔ حامد! ایسے غیر آسودہ انسان کو اپنی روح میں ایک تشنگی سی محسوس کرنے والے شخص کو، ایسے گم کردہ منزل مسافر کو نہ معلوم کیوں تم نے "تکمیل" کے لفظ سے مضطرب کر دینے کا خیال کیا!

حامد! تم جانتے ہو مجھے مشرق کی اس فضول اور حد سے زیادہ خاکسار بتانے والی رسم سے ہمیشہ نفرت رہی ہے۔ اس لئے غالباً تمھیں یہ باور کرانا مشکل نہ ہو کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اُس رسم کی پابندی کے لحاظ سے نہیں بلکہ تم کو اپنے دل کی انتہائی گہرائیوں سے پیدا ہونے والی صدائے احتجاج کی ایک ہلکی اور مبہم سی گونج سنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اپنی روح کی تڑپ کا تمکو احساس دلانا چاہتا ہوں اور اپنے چھلے ہوئے زخموں پر تمھاری نمک پاشی سے تمکو منفعل کرانا چاہتا ہوں۔ حامد! تم نے میری سب سے زیادہ دہکتی ہوئی آگ کو چھیڑا ہے۔ تم نے میرے رستے ہوئے ناسور کو ناقابل برداشت ٹھیس لگائی ہے۔

تمھارے خط کو پڑھکر آج اس مقولہ کے معنی جتنی اچھی طرح میرے ذہن میں واضح ہوگئے ہیں شاید کبھی ہوئے تھے کہ چھوٹے چھوٹے جملے بھی اپنی معنویت کے لحاظ سے موت کی حلاوت کا مزہ دے سکتے ہیں، معلوم نہیں تم نے یہ معشوقانہ انداز کہاں اور کب سیکھا ہے کہ التفات اور وفا کے پردے میں ایسا زبردست حملہ کرتے ہو جس کی ایک ہی جنبش کام تمام کردے۔

لکھنے کو تو یوں چند الفاظ کی ترتیب کا ایک چھوٹا سا جملہ ہے "آپ نے اپنے ادبی کارناموں سے اُس مقصد عظیم کی تکمیل کر دی ہے جس کے لئے فطرت نے آپ کو مامور کیا تھا" لیکن معانی کے لحاظ سے اس کی کاٹ اس قدر گہری واقع ہوئی ہے کہ میرے جیسے انسان کی زندگی برباد کر دینے کو کافی ہے۔ یہ ایک ایسا مرہم ہے جو نا تمام کوششوں کے زخم پر لگ کر ناکامیابیوں کے خون کا سیل رواں جاری کر سکتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اُمید کا چشمہ انسان کے سینہ میں ہمیشہ اُبلتا رہتا ہے، اور خصوصاً جوانی میں بڑے جوش وخروش سے اُبلتا ہے۔ لیکن حامد! میں تم سے پوچھتا ہوں۔ اس میں سے کتنے قطرے ارتقائی مراحل طے کرکے گوہر آبدار کی شکل بھی اختیار کرتے، اور کامیابی کی منزل مقصود تک پہنچے ہیں؟ تم دنیا میں ہر سانس لینے والے انسان کے دل کا جائزہ لو۔ تم کو وہ اُن آرزوؤں کا ایک مدفن نظر آئیگا جن کے مچلنے سے

کبھی اس کی روح میں ایک گدگدی سی محسوس ہوا کرتی تھی اور جن کی بے چینی اور تڑپ کو زندگی کے
گوناگوں مسائل کا بوجھ ہمیشہ کے لئے کچل چکا ہے. جہاں حرماں نصیبوں کی لاتعداد قبروں پر ظفرمندی کے
دو تین چراغ جل رہے ہونگے اور انسانی شخصیت کا خارجی حیثیت سے مطالعہ کرنے والی ظاہر بیں آنکھیں صرف
ان چراغوں کی روشنی سے متاثر ہیں۔ مجھے اس میں زیادہ اعتراض نہیں کہ اگر اس روشنی کی چمک ہماری آنکھوں
کو خیرہ کردے تو ہم اس سے انسان کی عظمت کے قائل ہوجائیں. لیکن اس سے یہ نتیجہ کیوں نکالا جائے
کہ اس کے مقصدِ زندگی کی بھی تکمیل ہوگئی۔ اُس کے تمام ارادوں نے عملی تشکیل کا جامہ پہن لیا. اس کے خوابہائے
رنگارنگ نے اپنی صحیح تعبیر تلاش کرلی. اس کے مضرابِ حیات نے دل کی تڑپ کا آخری راگ اور سوزِ دروں
کا آخری ساز بجاکر اُس کے ارتعاش کو دنیائے عمل کی فضا میں ہمیشہ کے لئے حل کردیا ہے۔

خیر معاف کرنا جذبات کی رو میں بات ذرا طولانی ہوگئی، اور وہ ذاتی بحث جسے میں چھیڑنا
چاہتا تھا ایک مرتبہ پھر پس پشت پڑگئی. لیکن میرے دل میں یہ کانٹا بھی کھٹک رہا ہے کہ تم کو جذبات سے
اب کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ یہ میں شکایت کے خیال سے نہیں بلکہ ہمدردی سے کہہ رہا ہوں۔ وہ ہمدردی
جس کے اظہار کے پردے میں بیزاری و نفرت کے اور زیادہ بھیانک جذبات چھپے ہوتے ہیں اور جس سے
درحقیقت اپنی معصومیت و فوقیت جتانا منظور ہوتی ہے، بلکہ سادہ۔ صاف اور پرخلوص ہمدردی جو خود
اپنے ماجراتِ دل، اپنی مایوسیوں اور ناکامیوں کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ کچھ سمجھے؟ مجھے تم سے آرٹ سے
بے تعلق ہوکر "علمی انسان" بن جانے پر ہمدردی ہے۔ اس لئے نہیں کہ میرے جمالیاتی جذبہ کو ٹھیس لگتی ہے
اور حُسن کاری کی پیہم تخلیق کے لئے میرے دل کی پیاس بھڑک اُٹھتی ہے. بلکہ صرف اس لئے کہ اب میں
تمہاری بیچارگی سے متاثر ہوں کیونکہ اب تم صرف اپنی ہی نہیں دوسروں کی آرزوؤں کے بھی شکار ہو
اب تمہارا سینہ صرف ایک واحد انسان کی اُمیدوں کا مدفن نہیں ہے بلکہ اس میں کروڑوں بیکس انسانوں
کی آس دم توڑ رہی ہے خیر تم میرے مقصد کو سمجھنا چاہو تو زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوکر ۱۹۱۸ء
کے ختم ہوتے ہوتے اپنے قائدِ اعظم کامریڈ لینن (Lenin) کی خدمت میں حاضر ہوجاؤ کہ آج جب آپ
کی حیات کا اہم ترین مقصد پورا ہوچکا ہے۔ وہ انقلاب جس کے لئے آپ نے اپنی زندگی وقف کردی تھی
قریب قریب مکمل ہوچکا اور حکومت کی باگ ڈور بڑی حد تک آپ کی جماعت کے ہاتھوں میں آگئی ہے
اب تو غالباً آپ کی زندگی کا مشن پورا ہوگیا ہوگا، اور آپ کی تمام اہم کوششیں درجۂ تکمیل کو پہنچ
چکی ہونگی؟

اس سوال کے پوچھتے ہی میں تم کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ لینن (Lenin) کا بھاری سر تم کو

اچھی طرح گھورنے کے لئے ذرا آگے بڑھ جائے گا۔ اس کا دل تیزی سے حرکت کرنے لگے گا۔ چند لمحوں کی خاموشی اور غور کے بعد اُس کا پورا جسم تھرّا اُٹھے گا، دلی اُلجھن، ذہنی کوفت، حیرت اور غصّہ کی کشمکش میں بڑی متانت کے ساتھ نہایت ہی خاموش لہجہ میں جو اس کی انتہائی خود اعتمادی کا پتہ دیگا وہ تم سے بے اختیار ہو کر کہہ اُٹھے گا، اور اس کے اس قول کی ہمنوائی اس کے جسم کا ہر رگ و ریشہ، اُس کے خون کا ایک ایک قطرہ اور اس کی پوری روح کرے گی کہ "ہمارا کام تو درحقیقت اب شروع ہوا ہے تخریب کی خاکستر پر ہم کو تعمیر کا محل بلند کرنا ہے اور ایک ترقی پسند سماج کی بنیادوں کو استوار کرنا ہے۔ ہماری زندگی کے سب سے زیادہ مشکل دور کی ابتدا تو اب ہوئی ہے، کیونکہ اب ہمارے سامنے اپنے عقائد کی عملی تشریح کا مسئلہ درپیش ہے۔"

اور اگر تم کو لینن کی آئندہ چھ برس کی زندگی سے کچھ غلط فہمی ہوئی ہو تو اس کے بستر مرگ پر آ کر میری صداقت بیان کا اندازہ کر لو، مگر دیکھو اتنی احتیاط ضرور کرنا کہ ماضی کے تبصرے سے خاموش شدہ دل کے زخم ہرے نہ ہو جائیں تم صرف وداع ہونے والے مسافر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سب کچھ پڑھ لوگے، اس کی حسرت بھری نگاہیں تم کو بتا دیں گی کہ گو زندگی کا پیمانہ چھلک اُٹھا لیکن زندگی کے مقصد کی تکمیل بالکل نہیں ہوئی۔

یہ ہے حامد! تمہارے نزدیک دنیا کے سب سے زیادہ مکمل انسان کی زندگی کا خاتمہ! یہ ہے اُس انسان کے کمال کا حشر جس کے مقاصد متعین اور آئیڈیل قابل تصور تھے۔ تو پھر ایک آرٹسٹ، شاعر اور ادیب کے دل میں "تکمیل" کے لفظ سے تم کیوں چٹکیاں لینا چاہتے ہو جب تمہیں معلوم ہے کہ اس کے آئیڈیل تاروں کی دنیا سے بھی بلند اور اس کے خیالات سمندر کی تہ سے بھی زیادہ گہرے ہیں۔ میں کہتا ہوں تم ہر اُس انسان کی زندگی کا تجزیہ کرو جس نے قلم کے ذریعہ دنیا فتح کرنے کی کوشش کی، اور کہیں کسی موقع پر اس کی کسی تخلیقی کوشش یا قلمی کارنامہ میں تکمیل کا لفظ چسپاں کرکے مجھے دکھا دو، یقین مانو، اگر خدا کی قدرت یا فطرت کے کسی معجزے سے وہ تمام چیزیں معرض وجود میں آسکیں جس کا ان لوگوں نے لکھنے کا ارادہ کیا تھا لیکن نہ لکھ سکے تو وہ آج کے موجودہ ادب سے سیکڑوں گنا زیادہ ضخیم اور کہیں زیادہ حسین و قابل قدر ہوتا۔

مثال کے طور پر تم صرف اسٹیونسن کو دیکھو، لیکن شاید تم اُسے خواب و خیال کی دنیا کا باشندہ کہکر ٹال دو۔ اچھا تو میں تمھارے سامنے جذبات و خیالات کو انتہائی ایمانداری سے نظم کر دینے والے ایک ہندوستانی شاعر ہی کی مثال پیش کرونگا جس کا پورا کلام حرکت عمل، گرمی حیات۔ انقلاب جنگ اور بغاوت کا شعلہ انگیز پیام ہے۔ جو ترقی کی مادی دنیا میں اتنی تیزی سے گامزن ہو جانا چاہتا ہے کہ اپنے شاعرانہ عقیدوں کی مناسبت پیدا کرنے کے لئے بھی توقف نہیں کرتا، اور بہ بانگ دہل کہتا ہے کہ خود اپنے دل کو انتہائی تکلیف و صدمہ کے باوجود مجھے کہنا پڑتا ہے کہ ایشیا کے پرانے تاجدار "دل" کی جگہ اب مغرب

Stevenson

کے حکمران "دماغ" کو لے لینا چاہیئے۔ دیکھو اس شاعر کی اپنے احساسات کے متعلق کیا رائے ہے؟ اس کے جذبات کس قدر شدید اور انتہا پسند واقع ہوئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ:۔

"توپوں اور بادلوں کے گرجنے سے غیر شاعر پر وہ اثر نہیں ہوتا جو عینک کے تال پر ایک ذرے کے گرنے سے شاعر کے دل پر ہوتا ہے:"

لیکن کیا اس شدت کے ساتھ وہ ان جذبات کی ترجمانی پر بھی قادر رہوتا ہے؟ اس امر کے متعلق بھی اسی شاعر کے کچھ اشعار ملاحظہ کر لیجئے:۔

دل میں جب اشعار کی ہوتی ہے بارش بیشمار
نطق پر بوندیں ٹپک پڑتی ہیں کچھ بے اختیار

رہتے ہیں بیدار دل کی محفل خاموش میں
بند کر لیتے ہیں آنکھیں نطق کی آغوش میں

شعر ہو جاتا ہے صرف اک جنبش لب سے نڈھال
سانس کی گرمی سے پڑ جاتا ہے اس شیشے میں بال

اس سے بڑھکر اور ہو سکتی ہے کیا حیرت کی بات
"شعر" کو سمجھا اگر شاعر کی تو نے کائنات

شعر کیا؟ جذب دروں کا ایک نقش ناتمام
مشتبہ سا اک اشارہ ایک مبہم سا کلام

بے حقیقت لے کے اندر زمزمہ داؤد کا
عارض محدود میں سایہ سا لامحدود کا

شعر کیا؟ کچھ سوچنا دل میں بہ لحن دلنشیں
شعر کیا؟ ہر چیز کہہ کر کچھ نہ لکھنے کا یقیں

نہر میں حسن قمر کی اک اچٹتی سی ضیا
جھانکنا قطرہ کے روزن سے عروس بحر کا

مر کے بھی تو شاعروں کا بھید پا سکتا نہیں
عقل میں یہ مسئلہ نازک ہے آ سکتا نہیں

(جوش)

ہاں تو اب تم سمجھے کہ تمہاری اس غلط فہمی سے ایک حسن کار کو کتنا روحانی صدمہ اور کیسی شدید تکلیف ہو سکتی ہے؟ تم نے میری مقبول عام نظم "   " کی تعریف کی ہے اور میرے ناول "نوجوان بھکارن" کو سراہا ہے۔ میں بھی اپنی کوششوں میں ان دو چیزوں کو ذرا ترجیح دیتا ہوں لیکن ان کی بنیاد پر تم اس قدر ستم ظریفی کیوں کرتے ہو؟ اس کا جواب دینے سے میں بالکل قاصر ہوں اور اس مشکل کو ذرا بھی حل نہیں کر سکتا۔ ماضی کی المناک داستان کو تازہ کر دینے کے لئے یہ جملہ تمہارے قلم سے کیونکر نکلا کہ

"آپ نے اپنے ادبی کارناموں سے اس مقصد عظیم کی تکمیل کر دی جس کے لئے فطرت نے آپ کو مامور کیا تھا"

حامد! اب میں تمہارے سامنے تکمیل کی حقیقت کی قلعی کھول دینا چاہتا ہوں۔ اسی لئے میں اتنی دیر سے اسے ٹال رہا تھا، بات دوسری طرف نکل جاتی تھی ـــــ وہ وقت یاد کرو حامد! جب فاشیت کے

عالمگیر طوفان" پر مسٹر جالنسن کی تقریر سنکر واپس ہوتے ہوئے تم مجھ سے بحث کر رہے تھے اور ہندوستان کی فرقہ وارانہ تحریک میں بھی فاشیتی طوفان کی کڑیاں تلاش کر رہے تھے، اور میں نے آخر کار تنگ آکر تم سے کہہ دیا تھا کہ اچھا تو تم خدا اور شیطان میں صلح کرا دو، اس شرط پر کہ خدا زمین سے اپنا اختیار اٹھا کر شیطان کو سونپ دے۔ تم اس عجیب خیال پر ہنس پڑے اور مجھے بھی ہنسی آگئی۔ لیکن اگر تم ان الفاظ کے روزن سے میری زندگی کی اہم ترین آرزو کا مزار دیکھ سکتے تو ایک ٹھنڈی سانس بھرے بغیر نہ رہ سکتے۔ کاش تم یہ جان سکتے حامد! کہ یہ دو جملے میرے سب سے زیادہ بلند ادبی شاہکار کی جان تھے۔

میری زندگی کی بہت سی گھڑیاں اس غور و فکر میں صرف ہوئی ہیں کہ میں دنیا کو بالکل نئے ڈھنگ کا ایک ڈرامہ دے سکوں جس کا اسلوب بیان۔ پس منظر۔ کردار۔ واقعات۔ نتائج اور موضوع سب کچھ نیا ہو۔ اس ڈرامہ کی سرخی میرے ذہن میں خدا اور ابلیس کا معاہدہ بنکر گونج رہی تھی۔ مدتوں میرا دل دھڑکتا رہا۔ دماغ ذہنی کاوش میں مصروف رہا۔ روح تشنہ تھی اور میری پوری شخصیت اس کی تکمیل کے لئے سرگرداں تھی کبھی ملوگے تو وہ متعدد صفحات جو اس سلسلے میں میں نے لکھے تھے اور اُس کا خاکہ جس پر اس ڈرامہ کو ابھارنے کی کوشش کر رہا تھا تمھیں دکھاؤں گا، اور تم خود فیصلہ کر لوگے کہ اگر یہ مکمل ہو جاتا تو جیتی دنیا تک لوگ اسے بھلا نہ سکتے۔

لیکن دنیا؟ دنیا کو حسین و جمیل چیزوں کی فنا و بقا کی کیا فکر ہے، شاید وہ حُسن کاری کے شاہکاروں کو پیدائش سے پہلے ہی فنا کرنے کے لئے گہری سازشیں کیا کرتی ہے۔ ان کی گرفتاری کے لئے سونے چاندی کا چھوٹا، باریک مگر بہت ہی مضبوط جال بنا کرتی ہے جس میں جگہ جگہ وقت کی تنگی کی گرہیں ہوتی ہیں حُسن کار کو اس جال میں گرفتار کر کے وہ کبھی اُسے "کارہائے بیجا" میں مصروف کر دیتی ہے اور کبھی بیماری اور گھر بار کی کوفت میں اُلجھا دیتی ہے۔

حامد! تمھیں سوچو، انفلوئنزا کا ایک مریض ہر روز صبح کو اپنے شہ پارۂ حیات کی تکمیل کا ارادہ کر کے بیٹھے، کچھ لکھتا رہے، لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد بچوں کے رونے کی صدا، کسی چیز کی کمی کی شکایت، گھر کی ابتری، قرضداروں کا تقاضا اور اس قسم کی ہزاروں چیزیں اس کو چند نقرئی ٹکڑوں کی سخت ترین ضرورت کا احساس دلا دیا کریں اور اس کے خیالات اپنے ہی سے جنگ کرنے میں مصروف ہو جائیں۔ جمالیات اور ضرورت کے دیوتا برسرپیکار ہوں اور وہ مجبور ہو کر فوراً چند ورق پلٹ کر کسی اخبار یا رسالے کا فرمائشی مضمون لکھنے میں مشغول ہو جائے، اور لکھتے ہی لکھتے درد سر یا بیماری کی تکلیف کا دورہ اُسے آدبوچے اور وہ لُٹے سیدھے مضمون ختم کر کے اپنے بستر پر دراز ہو کر اپنی ناکامیوں کا ماتم کرے، اور کل کے منصوبے باندھے

جو نمودار ہو کر بالآخر پھر اسی طرح ختم ہو جائیں۔

حامد! اس ڈرامہ کی رسائی اگر صفحۂ قرطاس تک ہوسکتی تو تم دیکھتے کہ یہ اپنے دامن میں کیسے نادر ادبی پہلو لئے تھا۔ گورکی، اور ہارڈی کی روح، ملٹن اور ڈانسٹے کا قالب تلاش کر کے تمھارے سامنے بولتی اور اس تیز دھارے میں کیٹس کی لطافتوں کی باریک لہروں کا امتزاج تلوار کے چمکدار پھل پر چلتی ہوئی سورج کی ہلکی سی کرن کا اثر رکھتی۔ جب ابلیس، فرشتوں کی بزم میں تقریر کرتے ہوئے اپنی پوری قابلیت اور خطابت کا زور فرشتوں کے گروہ کی اہمیت ثابت کرنے میں صرف کر دیتا اور آنے والی مخلوق یعنی انسان کو اس گروہ پر فضیلت دینے کی مخالفت کرتا تو تمھارے ذہن کے سامنے نہ صرف اپنی دنیا کی طبقاتی جنگ کا پورا نقشہ پیش ہو جاتا بلکہ سرمایہ دار طبقہ کیونکر ان پرانے خیالات سے اپنی اہمیت کی غلط فہمی میں مبتلا ہے اور اپنے وجود کو ہر حال میں سوسائٹی کی بقا کے لئے ضروری سمجھتا ہے، اور نئے آنے والے طبقات کی تاریخی اہمیت سے نابلد رہنا چاہتا ہے، اس کا بھی تمھیں پوری طرح احساس ہو جاتا۔ پھر جب یہی ابلیس خدا سے بغاوت کر کے فرشتوں سے علیحدہ ہو کر گروہ شیاطین کی تنظیم میں مصروف ہوتا تو تمھاری آنکھوں کے سامنے کسی اشتراکی گروہ سے کوئی مسولینی یا ہندوستانی کانگریس سے فرقہ وارانہ تحریک کے اراکین اور رہنما کے خروج کا نقشہ پھر جاتا۔ اور ان تمام تصورات کے لئے تمکو کسی تشریح کی ضرورت نہ ہوتی۔ بلکہ گفتگو کے لب و لہجے، کرداروں کے خصائل اور اُن کے چاروں طرف پیدا کی ہوئی فضا سے تمھارا ذہن خود بخود ادھر منتقل ہو جاتا۔ ابلیس جب خدا سے انسان کو مکمل آزادی دلانے کے لئے زبانی ردّ و قدح کرتا اور غصہ میں آکر اس آزادی سے عمل میں آنے والے ہولناک نتائج پر بھی روشنی ڈالتا تو اس پردے میں تمھارے سامنے ایسے مسائل آجاتے کہ تم مدتوں چکر میں پڑے رہتے اور ان کا جواب تم سے ممکن نہ ہوتا۔ ابلیس اور شیاطین کی بڑھتی ہوئی قوتیں تم کو دنیا میں رجعت پسندانہ اور "انسانیت کش" قوتوں کی موجودہ یورش سے دوچار کرا دیتی۔ لیکن پھر بھی خدا کو اپنی قدرت پر کامل اعتماد سے ترقی پسندوں کی آخری فتح کا بظاہر بہت ہی ہلکا لیکن حقیقتاً ایک نہایت ہی گہرا احساس تمھارے ذہن کے کسی گوشہ میں برابر محفوظ رہتا، انتہائی "خیر" اور انتہائی "شر" کے نمائندہ ہونے کے باوجود تم کو ان کرداروں میں کوئی اصولی فرق نظر نہ آتا بلکہ وہ اتنی خوش اسلوبی سے پیش کئے جاتے کہ تم ہر ایک سے محبت کرنے پر مجبور ہوتے۔ اور یہ پہلو اس امر کا آئینہ دار ہوتا کہ بیسویں صدی کی تنازع للبقا میں کوئی ناکارہ انسان عام سطح سے ابھر کر دنیا کے ڈرامہ کا کردار نہیں بن سکتا۔ جب نتیجہ وہی ہوتا کہ بالآخر خدا کو ابلیس سے اس شرط پر صلح کرنی پڑتی کہ کچھ دنوں کے لئے زمین پر خدائی کا چارج شیطان کو دیدیا جائے۔ سوچو حامد! یہ کتنی عبرتناک ٹریجیڈی ہوتی! باطل کا وقتی عروج اور حق کی

پامالی (جو دراصل عصر حاضر کی سب سے زیادہ افسوسناک حقیقت ہے) یعنی رجعت پسندی کی فتح کا ایک عکس ہوتا لیکن میں اس کو اتنی خوبصورتی سے پیش کرتا کہ شاید دنیا کو پڑھنے کے لئے اس سے زیادہ دلچسپ ڈرامہ نہ مل سکتا، جہاں خدا کو شیطان سے دوستی گانٹھنا پڑے۔

طرز نگارش اور آرٹ کے متعلق صرف اتنا کہنا ہے کہ کسی پس ماندہ قلم کے "قطرات ترشح" اتنے زبردست موضوع کی تشنگی کو سیراب نہیں کر سکتے۔ کوئی معمولی قلم ایسے مسالہ کے وزن اور بلندی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ان کے قلمبند کرنے کو فطرت صرف کبھی کبھی ڈانٹے اور ملٹن ہی کو پیدا کرتی ہے۔ اور پھر اگر بلند مسالہ کے لئے آرٹ بھی بلند نہیں ہے تو اس کا نہ لکھنا ہی بہتر ہے۔

مختصراً یہی میری خواہش تھی لیکن اسے قلم تک پہنچنے کی سکت نصیب نہیں ہوئی۔ لبوں تک بھی پہونچے پر اس سے ہوا میں پیدا ہونے والے ہلکے سے تموج کی تاثیر اس سے زیادہ نہ بڑھ سکی کہ تھیں متبسم کر دے حامد! کاش دنیا میرے فضا میں بکھرے ہوئے الفاظ کی وسعت ہی کا اندازہ کر سکتی!

یہی نہیں حامد! میری وہ کوششیں بھی جو معرض وجود میں آ چکی ہیں بالکل نامکمل ہیں اور ان کو میں اس طرح پیش نہیں کر سکا جیسا کہ میں چاہتا تھا۔ ان سب میں ایک کمی ہے جس کی تلافی شاید اب ناممکن ہے۔ مثال کے طور پر میری نظم "دوشیزۂ فطرت" ہی کو لے لو جس کا تم نے ذکر بھی کیا ہے۔ پڑھنے والے صدیوں تک اس نظم کو پڑھیں گے، اس کے مناظر سے لطف اندوز ہونگے، اُس کے حسن سے خود اپنی روح میں ایک پاکیزگی اور لطافت سی محسوس کریں گے۔ اور اُسے میری بہترین نظم بلکہ میرا شاہکار سمجھیں گے۔ لیکن ان کو یہ نہ معلوم ہوگا کہ یہ نظم خود میری نظروں میں غیر مکمل ہے۔ اس میں شدت سے محسوس ہونے والا ایک خلا ہے، انسانی حسن کا خلا۔ میرا عقیدہ ہے کہ فطرت کے حسن کی دل آویزیاں اس وقت تک تشنۂ تکمیل رہتی ہیں جب تک کہ کسی خوبصورت دوشیزہ یا معصوم بچے کا حسن اس میں جان نہ ڈال دے۔ لیکن یہی نکتۂ تکمیل میرے لئے مسئلہ لاینحل بن گیا، اور مہینوں میں اسی کشمکش میں مبتلا رہا کہ فطرت کی معصوم منظر آفرینیوں کو دو بھولے بھالے بچوں کے حسن میں کھپا دوں یا معصوم کے مقابل شوخی اور غفلت کے سامنے احساس حسن کا نظارہ پیش کر کے ایک دوشیزہ کا حسین پیکر تیار کروں، جس کی مخمور رعنائیاں فطرت کے عالم رنگ و بو کی تکمیل کی کوشش کریں۔ اور پھر اگر اطفال کی تصویر بھی پیش کی جائے تو کیا، ان میں سے ایک بچہ ہو اور ایک بچی جو مکتب فطرت میں عشق کے سبق سیکھیں پھولوں کی مہک اور چڑیوں کے چہچہوں سے متاثر ہو کر ان کے دل میں خلوص و محبت کے جذبات پرورش پائیں یا دونوں بچے مرد ہوں اور سامنے سے ایک کشتی موجوں سے تھپیڑے کھاتی، سرکش بھنوروں کو چیرتی بڑھتی

چلی آتی ہو، اور کنارے پر آکران بچوں کو بٹھائے جائے؟ یا پھر اگر دوشیزہ ہو تو تنہا، اپنے شباب کے بوجھ سے لدی ہوئی، فطرت کی وسعتوں پر حکمراں، یا ایک نوجوان کے ساتھ، چشمہ کا صاف پانی چلوؤں میں لیکر اُس کے منھ پر مار کر لنسوانی ترنّم سے قہقہے لگاتی ہو؟ —— لیکن حامد! آج تک میں فیصلہ نہ کرسکا کہ میری اس نظم کا آخری نکتہ آسکر وائیلڈ کا دل ہو یا ٹیگور کی روح!

"نوجوان بھکارن" کی ناول کے متعلق تمھیں چپکے سے بتائے دیتا ہوں کہ وہ میں نے بالکل اپنی مرضی کے خلاف لکھا ہے۔ چپکے سے اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اگر ہمارے "ترقی پسند" مصنفین برہم ہو گئے تو اور بھی مشکل ہوگی۔

مثال کے طور پر اس کا آخری منظر لو جہاں نوجوان بھکارن اکبرؔن دن بھر کی صعوبت پریشانی اور فاقہ کے بعد ایک پھوٹی کوڑی حاصل کئے بغیر بھوکی اور تھکی ماندی اپنی سات برس کی چھوٹی سی خوبصورت لڑکی کے ساتھ شہر کی وسیع سڑکوں پر گھسٹتی چلی جارہی ہے۔ اتفاقاً لڑکی ٹھوکر کھا کر گرتی ہے اور اس کا پیر ٹوٹ جاتا ہے، اب اس میں زمین سے اُٹھنے کی بھی قوت نہیں، ماں بیٹھ پر لاد کر بمشکل دس قدم اٹھاتی ہے کہ پاس ہی ایک گائے کو روٹی کھاتے دیکھکر لڑکی بے تحاشا اپنے کو گرا کر گرتی پڑتی، دوڑتی لنگڑاتی کسی نہ کسی طرح گائے کے پاس جا کر اس سے روٹی چھیننے کی ہمت کرتی ہے۔ لیکن گائے کے بیدرد پاؤں بچی کو پامال کردیتے ہیں۔ اتفاق سے یہ وہی مشہور گائے ہے جس کی وجہ سے آتنا کشت وخون ہوا تھا۔ اس لئے مسلمان ایک مسلمان بچّی کی "شہادت" سے بیتاب ہو کر گائے پر حملہ کر دیتے ہیں اور کشت وخون کا بازار گرم ہو جاتا ہے عمر بھر بے یار و مددگار، بے بس وبیکس ماں جس کو کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملا حیرت کرتی ہے کہ اس کی پیاری بچی کی بھوکی آتما کو مرنے کے بعد دنیا انسانوں کے لہو سے سیراب کرنے کو کیسے تیار ہے۔

یہ منظر میرے ذہن میں سرے ہی سے بدلا ہوا تھا۔ میں اسے اسی طرح پیش کرنا چاہتا تھا کہ سڑک پر منصور اور لڑکی اپنی ماں کے ساتھ جا رہے ہیں۔ ماں اور بیٹی آج کچھ خوش ہیں کیونکہ اُنھیں بھیک میں پانچ پیسے، چھ روٹیاں، اور تین پاؤ کے قریب آٹا ملا ہے۔ لڑکی منصور کے سامنے دست سوال پھیلاتی ہے، منصور بلا توجہ دیئے ہوئے آگے بڑھنا چاہتا ہے لیکن لڑکی کا پاؤں دب جاتا ہے اور وہ نوجوان منصور پر گر پڑتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو نظر بھر کر دیکھتے ہیں، منصور غصّے میں۔ لڑکی بیچارگی کے عالم میں معصوم لیکن مفلوک حُسن جب منصور کے پہلو میں سمٹ کر آجاتا ہے تو وہ اُس سے دامن بچا کر نکل جاتا ہے، لیکن نظر اپنا پُورا کام کر جاتی ہے۔ نوجوان جب بڑھتا ہے تو جیب سے دو پیسے گر پڑتے ہیں، لڑکی

درد کے اضطراب سے بےچین ہوکر جاتے ہوئے منصور کی جانب دیکھتی ہے۔ ماں پیسے اٹھانے کو کہتی ہے لیکن لڑکی نظریں نہیں اٹھاتی۔ ماں دونوں پیسے اٹھا کر ایک لڑکی کو دیتی ہے اور اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔

اِس حقیقت کو سمجھ سکتے نہیں اہلِ فراغ
اور کچھ ظلمت بڑھا دیتا ہے مفلس کا چراغ (جوشؔ)

منصور کو تنہائیوں میں لڑکی کی دل فریب نظریں چھیڑتی ہیں، پریشان کرتی ہیں، بےچین کرتی ہیں۔ مدتوں کے بعد بھی ان نظروں کی سراسیمگی، حسرت اور معصومیت کا خیال اُس کے دل میں جذبات کا ایک طوفان سا پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن جب وقت کے ستم کش ہاتھ منصور کو دولتمندوں کی محفل سے گھسیٹ کر فقیروں کی صف میں کھڑا کر دیتے ہیں اور منصور کی آنکھیں اُس نظر سے دوچار ہوتی ہیں تو افسوس فلاکت کے دھبے آنکھوں کا نور لوٹ چکے تھے اور نگاہوں کی معصومیت بارہا چند چاندی اور تانبے کے سکوں کے نذر ہو چکی تھی، نظریں لبوں کے شہد اور سینہ کی گرمی کے خرید و فروخت کی داستان کہہ رہی تھیں، شباب لُٹ چکا تھا، صورت روڑھی ہو چکی تھی اور منصور کی دنیا تباہ۔

اب اس قصّے کو ختم ہونے دو حامد! چونکہ تمھارے جملے کا اثر کافی قبول کر لیا تھا، اس لئے ضرورت سے بہت زیادہ لکھ گیا ہوں۔ خیر تمھارے کہے بغیر اپنے دل پر جبر کر کے معاف کئے دیتا ہوں، لیکن یاد رکھو آئندہ ایسی گستاخیوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔ تمھارا جمیل

غزل

مایۂ عیش و فورِ غم و آزار نہ ہو
جس کو ہم داغ ہیں سمجھے گُلِ گلزار نہ ہو

دل کی تسکیں کے لئے رنج و الم کیا کم ہیں
دردمندوں کا نہیں کوئی بھی غمخوار۔ نہ ہو

گو دل آویز ہے آسودگیٔ کنجِ لحد
طبعِ محزوں پہ یہ آرام کہیں بار نہ ہو

وجہِ تجدیدِ طرب ہیں غم و آلامِ جہاں
گل ہو بے کیف گلستاں میں اگر خار نہ ہو

جسکو داغِ دلِ پُردرد سمجھتے ہیں سب
بادۂ عشق کا وہ ساغرِ سرشار نہ ہو

ہنسکے گلزار میں کہتے ہیں یہ گُل شبنم سے
ہو وہ گریاں جسے تابِ خلشِ خار نہ ہو

امتحاں گاہِ محبت ہے یہ دنیا جگدیش
قیدِ ہستی سے کبھی بھول کے بیزار نہ ہو

جگدیش سہائے سکسینہ بی اے ایل ایل بی

"تقصیرِ اولیں"

(از مسٹر جگدیش سہائے بی۔اے۔ ایل ایل۔بی)

روح کیا ہے؟ قطرۂ بحرِ جمالِ یار ہے
جو شرابِ ہستیِ جاوید سے سرشار ہے

پیشتر یہ شاہدِ عشرت سے ہم آغوش تھی
گلشنِ فردوس میں مصروفِ ناؤنوش تھی

رفتہ رفتہ عیشِ پیہم کاہشِ جاں ہوگیا
قلب یکرنگی سے جنت کی پریشاں ہوگیا

شوق کہتا تھا کہ کوئی دوسرا گلزار ہو
مسکنِ روحِ رواں آرام گاہِ یار ہو

بیقراری حد سے گزری جب دلِ ناشاد کی
بارگاہِ ایزدی میں ایک دن فریاد کی

یہ ندا آئی، کہ تیرا عشق ابھی کامل نہیں
تو ہماری جلوہ گاہِ خاص کے قابل نہیں

بوستانِ خلد میں رنج و اَلم مفقود ہیں
ساز و سامانِ مسرت ہر طرف موجود ہیں

عشق کا کیسے گزر ہو گلشنِ بیخار میں
ہم نے اِس صہبا کو رکھا ہے خمِ آزار میں

اے کہ تیرے قلب میں شوقِ وصالِ یار ہے
عاشقوں کے واسطے دنیائی درکار ہے

خواہشاتِ مختلف کی جو نمائش گاہ ہو
قلبِ شیدا کے لئے اِک آزمائش گاہ ہو

نالہائے غم جہاں ہوں خندۂ عشرت کے ساتھ
نفس کی ترغیب بھی ہو جذبۂ الفت کے ساتھ

عشق پابندِ سلاسلِ عقل کے زنداں میں ہو
خیر و شر کی کشمکش بھی کشورِ ایماں میں ہو

روح کو بھی قالبِ خاکی سے رسم و راہ ہو
نشۂ ہستی خمارِ موت سے آگاہ ہو

جو کرے گا ہم سے الفت اس خراب آباد میں
ماسوا کو بھول جائے گا ہماری یاد میں

بحر میں وہ قطرۂ مضطر فنا ہو جائے گا
عشق کے اعجاز سے بیشک خدا ہو جائیگا

(۲)

روح نے یہ عرض کی ہم عاشقِ رنجور ہیں
امتحاں کے جو شرائط ہوں ہمیں منظور ہیں

معجزہ آخر دکھایا انتہائے شوق نے
حسن کو بھی کردیا مضطر ہوائے شوق نے

محفلِ انجم ہوئی آراستہ افلاک پر
لالہ کاری کی عناصر نے بساطِ خاک پر

صفحہ جو سادہ تھا پہلے اب منقش ہوگیا
امتزاجِ خاک و باد و آب و آتش ہوگیا

روح بھی آئی زمیں پر خلد سے گاتی ہوئی
خود بخود یعنی اسیرِ قالبِ خاکی ہوئی

گلشنِ فردوس میں اس کی یہی تقصیر تھی
جلوۂ حسنِ ازل کی عاشقِ دلگیر تھی

ہندوستان کے بنک[1]

(۵)

امپیریل بنک آف انڈیا

(از مسٹر عبدالرحیم شبلی، بی، کام)

ہندوستان کے بنکوں میں "امپیریل بنک آف انڈیا" کو ایک خاص پوزیشن حاصل ہے۔ کیونکہ ابتدا ہی سے یہ بنک "ایک مرکزی بنک" کی حیثیت سے جاری ہوا ہے اور ۱۹۳۵ء تک یہ ہندوستان کا نیم سرکاری بنک رہا۔

۱۹۲۰ء میں برسلز (صدر مقام بلجیم) میں ایک بین الاقوامی مالی کانفرنس ہوئی۔ جس میں یہ ریزولیوشن پاس کیا گیا کہ "جن ممالک میں کوئی اشاعتی مرکزی بنک Central Bank of Issue نہیں ہے اُن میں ایسے بنک جلد سے جلد قائم کر دیئے جائیں"۔ چنانچہ ہندوستان میں بھی گورنمنٹ نے فیصلہ کیا کہ ملک کے تین پریسیڈنسی بنکوں کا (جنھیں سرکاری کام کا کافی تجربہ حاصل تھا اور جن کا مفصل حال ہم "زمانہ" فروری ۱۹۳۸ء میں لکھ چکے ہیں) الحاق کر کے ایک "امپیریل بنک" قائم کیا جائے۔ جو کسی حد تک "مرکزی بنک" کا کام دے۔ اس فیصلہ کے پیش نظر ستمبر ۱۹۲۰ء میں "امپیریل بنک ایکٹ" پاس کیا گیا جس کا نفاذ ۲۷۔ جنوری ۱۹۲۱ء سے شروع ہوا۔

دستور اساسی بمبئی۔ مدراس اور کلکتہ کے پریسیڈنسی بنکوں کا مشترکہ سرمایہ صرف سات کروڑ روپیہ تھا۔ لیکن نئے بنک کا سرمایہ پندرہ کروڑ روپیہ قرار دیا گیا، کیونکہ وسیع کاروبار کے پیش نظر بنک کی مالی حالت مستحکم ہونا ضروری تھی۔ اس پندرہ کروڑ روپیہ میں سوا گیارہ کروڑ روپیہ منظور شدہ سرمایہ تھا اور پونے چار کروڑ روپیہ ریزرو فنڈ (سرمایہ محفوظ)۔

منظور شدہ سرمایہ کو پانچ پانچ سو روپیہ کے حصّوں میں تقسیم کیا گیا اور یہ حصے پرانے پریسیڈنسی بنکوں کے حصہ داروں کو منتقل کر دیئے گئے۔ نئے بنک کے لوکل بورڈ کے ڈائرکٹر تقریباً وہی اصحاب

[1] اس سلسلہ کے پہلے چار مضمون "زمانہ" جنوری۔ فروری۔ مارچ اور اپریل ۱۹۳۸ء میں شائع ہو چکے ہیں۔

مقرر ہوئے جو پرانے پریسیڈنسی بنکوں کے تھے۔ صدر دفتر کے لئے کوئی خاص مقام تجویز نہیں ہوا، بلکہ جہاں سہولت ہوتی وہاں مرکزی بورڈ سال میں ایک مرتبہ اپنا اجلاس منعقد کر لیتا تھا۔ مجلس وضع قوانین نے اس تجویز کو اس لئے بہتر سمجھا کہ اس کے لئے تین پریسیڈنسی شہروں میں سے کسی ایک کو اس غرض کے لئے منتخب کرنا ایک مشکل امر تھا۔

امپیریل بنک کا نظم و نسق گورنروں کے ایک سنٹرل بورڈ کے سپرد کیا گیا جس کے ممبر حسب ذیل ہو سکتے تھے:۔

(۱) مینجنگ گورنر، جو دو سے زیادہ نہ ہوں، ان کا تقرر سنٹرل بورڈ کی سفارش پر گورنر جنرل کرتا تھا۔

(۲) صدر، نائب صدر اور لوکل بورڈوں کے سیکرٹری جو حصہ داروں کے نمائندے ہوتے تھے۔

(۳) کنٹرولر آف کرنسی، یا گورنر جنرل کا کوئی اور نامزدہ سرکاری افسر۔

(۴) چار غیر سرکاری افسران جو عوام اور ٹیکس دینے والوں کی نمائندہ ہوں۔ ان کی نامزدگی بھی گورنر جنرل کرتا تھا۔

ان میں سے کنٹرولر آف کرنسی اور لوکل بورڈوں کے سیکرٹریوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل نہیں تھا کنٹرولر آف کرنسی گورنمنٹ کا نمایندہ ہوتا اور صرف اُسی کے مفاد کی وکالت کرتا تھا۔ گورنر جنرل با جلاس کونسل کو حق حاصل تھا کہ وہ کسی ایسے معاملہ کے متعلق جو حکومت کی مالی پالیسی یا بجٹ پر اثر انداز ہو مناسب ہدایات جاری کرے۔

سنٹرل بورڈ کے فرائض یہ تھے کہ وہ بنک کے کام کی عام دیکھ بھال کرے۔ لوکل بورڈوں کے اختیارات پر نگرانی رکھے، بنک کی شرح اور روپیہ کی تقسیم کا تعین کرے۔ اور بنک کے ہفتہ وار حسابات کی اشاعت کا ذمہ دار رہے۔

اس کے برخلاف لوکل بورڈوں کا کام یہ تھا کہ وہ اپنے اپنے حلقہ میں روزمرہ کاموں کی نگرانی اور دیکھ بھال کریں۔

سنٹرل بورڈ کے تین ممبروں کی ایک چھوٹی سی کمیٹی اور تھی جو مرکز کے روزمرہ کے کاروبار کا انتظام کرتی تھی۔ اس کا ایک ممبر کنٹرولر آف کرنسی ضرور ہوتا تھا۔

قانون کی رو سے بنک کو لندن میں بھی ایک شاخ قائم کرنے کی اجازت تھی۔ لیکن یہ شاخ براہ راست عوام کے لئے غیر ملکی مبادلہ کا کام نہیں کر سکتی تھی۔ بلکہ صرف حکومت ہند، سیکرٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا۔ اور دیگر بنکوں کی طرف سے اسے لندن میں کاروبار کرنے کی اجازت تھی۔

بنک کے عام کام | امپیریل بنک ایکٹ سنہ ۱۹۲۰ء کی رُو سے اس بنک کو مندرجہ ذیل قسم کے کاروبار کرنے کی اجازت تھی:-

(۱) بنک برطانیہ اور ہندوستان کی حکومتوں، پورٹ ٹرسٹوں، میونسپلیٹیوں، سرکاری ریلوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کی جاری کردہ کفالتوں میں اپنا روپیہ لگا سکتا تھا۔

(۲) مندرجہ بالا کفالتوں کی ضمانت پر روپیہ قرض دے سکتا تھا۔

(۳) منظور شدہ ہنڈیوں، پرامیسری نوٹوں، مال و اسباب یا اس سے متعلق تمام کاغذات کی ضمانت پر روپیہ دے سکتا تھا۔

(۴) ایسی ہنڈیوں اور دیگر قابل انتقال کفالتوں کو لکھنے، منظور کرنے، اُن پر بٹہ کاٹنے اور اُن کو فروخت کرنے کا کام جن کی ادائیگی ہندوستان یا سیلون میں ہونا ہو۔ علاوہ بریں گورنر جنرل با جلاس کونسل کی ہدایات کے مطابق ایسی ہنڈیوں کی خرید و فروخت اور اُن پر بٹہ کاٹنا بھی جن کی ادائیگی ہندوستان سے باہر ہونا ہو۔ بنک کو ایسے شخصوں کے فائدہ کے لئے بھی ہنڈیاں لکھنے اور اُنھیں اعتبار نامے دینے کی اجازت تھی جن کی جائداد کا نظم و نسق بنک کے ماتحت ہو یا جو جائز ذاتی اغراض کے لئے اُن کا استعمال کرنا چاہیں۔

(۵) ہندوستان میں قرض لینا، امانتیں جمع کرنا، سونے اور چاندی کی خرید و فروخت، کفالتوں کی امانت رکھنی اور اُن کا سود وصول کرنا۔ وغیرہ۔

(۶) لندن کی شاخ کو اجازت تھی کہ وہ انگلستان میں بنک کی جائداد پر بنک کی ضروریات کے لئے روپیہ قرض لے، لیکن وہ لندن میں پریسیڈنسی بنک کے پُرانے گاہکوں کے سوائے اور کسی سے امانت لینے یا کسی کو اُدھار دینے کی مجاز نہ تھی۔

بہر حال اِن شرائط پر اس بنک کا سیکرٹری آف اسٹیٹ انڈیا سے دس سال کے لئے معاہدہ ہوا جو ایک سال کے نوٹس پر ختم ہو سکتا تھا۔

بنک کے سرکاری کام | چونکہ امپیریل بنک ایک سرکاری بنک کی حیثیت بھی رکھتا تھا اس لئے اس کے مندرجہ ذیل کام بھی تھے:-

(۱) حکومت ہند کے لئے عام لین دین کا کام کرنا، سرکاری ادائیگیاں وصول کرنا اور گورنمنٹ کی طرف سے روپیہ تقسیم کرنا، اپنے صدر دفتر اور شاخوں میں خزانہ رکھنا۔

(۲) سرکاری قرضوں کا نظم و نسق جس کے لئے اُسے کچھ مقررہ معاوضہ ملتا تھا۔

(۳) ۱۹۲۱ء سے قبل ایک سو نئی شاخیں کھولنا، جن میں سے چوتھائی شاخوں کے مقامات کا فیصلہ خود گورنمنٹ کے ذمہ تھا۔

جنوری ۱۹۲۱ء سے قبل پریسیڈنسی بنکوں کی ۵۹ شاخیں تھیں جن میں ۳۱۔ مارچ ۱۹۲۶ء تک ایکسو دو ۱۰۲ کا اور اضافہ کیا گیا۔ اس طرح بنک کی کل شاخیں ایکسو اکسٹھ ۱۶۱ ہوگئیں۔ ان نئی شاخوں میں سے چھتیس ۳۶ دفاتر ایسی جگہ قائم کئے گئے جہاں پہلے کوئی بنک نہیں تھا۔ اور باقی کی چھیاسٹھ شاخوں میں سے اکسٹھ ۶۱ شاخیں ایسی جگہ کھولی گئیں جہاں سرکاری خزانے کے دفاتر تھے۔ نئی شاخوں میں سے کل نواسی ۸۹ شاخیں ایسی جگہ قائم کی گئیں جہاں گورنمنٹ کے دفاتر خزانہ تھے۔

(۴) بنک سے اُمید کی جاتی تھی کہ وہ عوام کو مختلف شاخوں میں اپنا روپیہ منتقل کرانے کے لئے ایسی مناسب شرح پر جس کی منظوری کنٹرولر آف کرنسی نے دی ہو سہولتیں بہم پہونچائے۔

عام طور پر دس ہزار روپیہ یا اس سے زائد کی رقم کے انتقال کے لئے ایک آنہ فی سو روپیہ کی شرح مقرر تھی لیکن بعد ازاں دیگر بنکوں کو امپیریل بنک کے ذریعہ روپیہ منتقل کرانے پر مائل کرنے کے لئے یہ شرح دو پیسے فی سو روپیہ کردی گئی۔ اگر دونوں مقامات پر امپیریل بنک کی شاخیں موجود ہوں تو گورنمنٹ اپنے خزانہ کے ذریعہ روپیہ منتقل نہیں کرتی تھی۔

(۵) جنوری ۱۹۲۱ء میں امپیریل بنک کی لندن میں شاخ قائم کی گئی جس نے حکومت ہند کا وہ کام اپنے ذمہ لے لیا جو اس سے قبل بنک آف انگلینڈ کے سپرد تھا۔ مثلاً ہندوستان کے ہائی کمشنر کا "چلتو حساب" وغیرہ

بعض کام ایسے بھی تھے جو امپیریل بنک نہیں کرسکتا تھا۔ مثلاً خارجی مبادلہ کا کاروبار وہ نہیں کرسکتا تھا۔ لندن میں کوئی قرض نہیں لے سکتا تھا۔ ایسی ضمانتوں کے علاوہ جن کا ذکر ہم "بنک کے عام کام" کے تحت میں کرچکے ہیں وہ کسی ضمانت پر روپیہ قرض نہیں دے سکتا تھا۔ اس طرح وہ اپنے حصوں کی ضمانت پر روپیہ قرض دینے کا مجاز نہ تھا۔ اگر کسی فرم یا کسی شخص کو ذاتی ضمانت یا بٹہ پر قرض دینے کی بھی گورنمنٹ نے ایک حد مقرر کردی تھی۔ اور چھ ماہ سے زائد عرصہ کے لئے تو وہ کسی صورت میں بھی قرض نہیں دے سکتا تھا۔ ذاتی ضمانت یا بٹہ پر بھی روپیہ صرف اسی صورت میں دیا جاسکتا تھا کہ کاغذات پر کم از کم دو ایسے شخصوں یا فرموں کے دستخط ہوں جو کاروبار میں ایک دوسرے کے شریک نہ ہوں۔

بنک کے خلاف اعتراضات | جب سے امپیریل بنک قائم ہوا ہے اس کے نظم ونسق اور طرزِ عمل کے متعلق متعدد اعتراض ہوچکے ہیں جن میں سے چند کا خلاصہ درج ذیل ہے:۔

سب سے پہلی اعتراض کی بات یہ تھی کہ اس بنک کو قطعی طور پر ایک سرکاری بنک نہیں کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ مفاد عامہ کی نمایندگی نہیں کرتا، بلکہ ایک نجی ادارہ ہے جس کا نظم و نسق زیادہ تر یورپینوں کے ہاتھ میں ہے۔

درحقیقت امپیریل بنک نے قریب قریب وہی انتظام اور طرز عمل جاری رکھا جو پرانے پریسیڈنسی بنکوں کے زمانہ میں رائج تھا۔ ظاہر ہے کہ یورپین ہندوستانی ضروریات کو پورے طور پر سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اور اکثر اوقات وہ ہندوستانی فرموں کے مفاد کے خلاف بھی کاروبار کیا کرتے تھے، اور ہندوستانی اداروں کو مناسب شرح سود پر اُدھار بھی نہیں دیتے تھے بلکہ اکثر یہ ہوتا تھا کہ اگر کسی یورپین فرم نے قرض مانگا تو اُسے کم شرح سود پر دیدیتے تھے۔ لیکن اگر کوئی ہندوستانی فرم قرض کی درخواست کرے تو خواہ اس کی پیش کردہ ضمانت جس قدر ٹھوس اور قیمتی ہو اُس سے زیادہ شرح سود طلب کیا جاتا تھا۔

یہ بنک ہندوستانیوں کو اپنے اعلیٰ عہدوں میں بھی بہت کم دخل دیتا تھا، اور ملازمت درکنار انھیں کام سیکھنے کی بھی اجازت نہیں دیتا تھا۔ مبادا ہندوستانی ساہوکاری سے ماہر ہوکر یورپینوں کا مقابلہ نہ کرنے لگیں۔

علاوہ بریں مفصّلات میں بھی انگریز افسر متعین کئے جاتے تھے جو عوام اور دیہاتیوں کی ضروریات سمجھنے سے قاصر رہتے اور اس طرح اُن کو کوئی فائدہ نہ پہونچا سکتے تھے۔

سنٹرل بورڈ میں جو چار غیر سرکاری ہندوستانی افسر نامزد کئے جاتے تھے وہ بھی گورنمنٹ کے آدمی ہونے کی وجہ سے عوام کا بھلا نہ کرسکتے تھے۔ چنانچہ لوگوں نے مطالبہ کرنا شروع کیا کہ اِن نمایندوں کو اسمبلی مقرر کرے۔

امپیریل بنک کے خلاف ایک اور اعتراض یہ تھا کہ جو روپیہ شاخوں میں بطور امانت وصول کیا جاتا وہ مقامی ضروریات پر خرچ کرنے کے بجائے مرکزی دفتر میں بھیج دیا جاتا تھا۔

اس بنک کے پرائیویٹ بنک ہونے کی وجہ سے گورنمنٹ اس کے منافع میں شریک نہ ہوسکتی تھی۔ حالانکہ اس کی ساکھ محض اس لئے قائم تھی کہ اس کا تعلق حکومت سے ہے۔

اس بنک کا بڑے بڑے منافع تقسیم کرنا بھی قومی مفاد کے خلاف تھا، کیونکہ بنک کا اصل مقصد تو قومی بھلائی ہونی چاہیئے نہ کہ تجارتی اصول پر کام کرکے نفعے کمانا۔

پھر بنک کی مرکزی مجلس بھی ناکارہ اور نااہل تھی کیونکہ وہ قانون تو پاس کردیتی لیکن اُس پر عملدرآمد کروانے کی پرواہ نہ کرتی۔

اس کے علاوہ ۱۹۲۰ء کے قانون کے ماتحت بنک پر حکومت کو کچھ بہت زیادہ اقتدار حاصل نہ تھا اور کنٹرولر آف کرنسی بنک کے معاملات میں صرف اُسی وقت دخل دے سکتا تھا جب حکومت کے مفاد خطرے میں ہوں۔

شاخیں قائم کرنے کے متعلق بنک نے جو پالیسی اختیار کی تھی وہ بھی مفید ثابت نہیں ہوئی۔ کیونکہ بعض حالات میں ایسے مقامات پر شاخیں قائم کی گئیں جہاں پہلے ہی داد وستد کی سہولتیں میسر تھیں۔ اسی طرح امپیریل بنک کا دیگر بنکوں کے ساتھ زبردست مقابلہ ہوگیا جس میں امپیریل بنک کو یقینی کامیابی حاصل ہوئی۔

امپیریل بنک کے متعلق یہ بھی اعتراض تھا کہ اس کے کام بہت محدود ہیں، اور اس وجہ سے وہ ملک کے لئے زیادہ مفید ثابت نہیں ہوسکا۔ یہ بنک یورپ کے مرکزی بنکوں کی طرح بھی نہ تھا۔ جس کے سپرد زر اور نوٹوں کی چھپائی اور اشاعت وغیرہ ہو بلکہ ہندوستان میں یہ کام گورنمنٹ خود کرتی تھی۔ پس امپیریل بنک کو کسی طرح سے بھی "مرکزی بنک" نہ کہا جاسکتا تھا۔

پھر اس بنک کو "خارجی مبادلہ" میں حصہ لینے کی اجازت نہ تھی، حالانکہ دوسرے غیر ملکی بنک اس کاروبار سے کثیر منافع حاصل کررہے تھے۔ اسی طرح یہ بنک غیر ملکوں میں نہ تو امانتیں وصول کرسکتا تھا اور نہ قرض دے سکتا تھا۔ حالانکہ ہندوستانی بازارِ زر پر بوجھ ہلکا کرنے کے لئے بعض اوقات غیر ملکوں میں ایسا کرنا اشد ضروری ہوتا ہے۔

سب سے آخری اعتراض امپیریل بنک پر یہ تھا کہ اسے کسی صورت میں بھی "بنکوں کا بنک" نہیں کہا جاسکتا تھا، کیونکہ دیگر بنک اس میں اپنا برائے نام روپیہ جمع رکھتے تھے۔

غرض ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ امپیریل بنک کے وجود میں آنے سے ہندوستانی بازارِ زر کو کوئی خاص فائدہ نہ پہونچا۔

امپیریل بنک ایکٹ میں ترمیم انھیں اعتراضات کی بنا پر ہلٹن ینگ کمیشن نے سفارش کی کہ ہندوستان میں ایک جداگانہ "ریزرو بنک" قائم کیا جائے جو پورے طور پر وہ کام کرے جو ایک مرکزی بنک سے مخصوص ہیں۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء میں جب پہلی مرتبہ اسمبلی میں ریزرو بنک بل پیش کیا گیا یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ امپیریل بنک ایکٹ میں بھی مناسب ترمیمات کردی جائیں۔ چنانچہ ریزرو بنک ایکٹ اپنی اصلی شکل میں ۱۹۳۴ء میں پاس ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی امپیریل بنک ایکٹ ۱۹۲۰ء کا ترمیمی قانون پاس کیا گیا جو "امپیریل بنک امنڈمنٹ ایکٹ ۱۹۳۴ء" کے نام سے موسوم ہے۔

اِس کے روشن خدوخال یہ ہیں کہ "بنک کے سنٹرل بورڈ میں مندرجہ ذیل ممبران شامل ہوں لوکل بورڈوں کے صدر اور نائب صدر۔ لوکل بورڈوں سے ایک منتخب نمایندہ مینجنگ ڈائرکٹر جس کو سنٹرل بورڈ پانچ سال کے لئے منتخب کرے۔ دو ایسے افراد جو سرکاری افسر نہ ہوں اور جن کو گورنر جنرل نامزد کریں ایک ڈپٹی مینجنگ ڈائرکٹر جس کو سنٹرل بورڈ منتخب کرے۔ لوکل بورڈوں کے سیکریٹری، آئندہ قائم ہونے والے لوکل بورڈوں کے نمایندے۔

ان میں سے سنٹرل بورڈ کے مقرر کردہ ڈپٹی مینجنگ ڈائرکٹر اور لوکل بورڈ کے سیکریٹریوں کو سنٹرل بورڈ کے اجلاس میں ووٹ دینے کا حق نہیں دیا گیا۔ لیکن جب مینجنگ ڈائرکٹر اجلاس میں موجود نہ ہو تو ان کے بجائے ڈپٹی مینجنگ ڈائرکٹر ووٹ دے سکتا ہے۔ علاوہ ازیں گورنر جنرل ایک اور سرکاری افسر بھی اجلاس میں شامل ہونے کے لئے نامزد کر سکتا ہے۔ لیکن اُسے ووٹ دینے کا حق حاصل نہ ہوگا"

نئے ایکٹ کے ماتحت کنٹرولر آف کرنسی سنٹرل بورڈ میں سرکاری نمایندہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح اب گورنر جنرل صرف دو آدمی بورڈ میں شامل ہونے کے لئے نامزد کر سکتے ہیں۔ مینجنگ ڈائرکٹر کو بھی سنٹرل بورڈ ہی براہ راست مقرر کرتا ہے۔ اس طرح اب امپیریل بنک کے متعلق سرکاری اختیارات کم کر دئیے گئے ہیں۔

۱۹۳۴ء کی ترمیمات کے مطابق امپیریل بنک گورنمنٹ کا بنک نہیں رہا۔ بلکہ اب اس کام کے لئے ریزرو بنک قائم ہوگیا ہے۔ لیکن اس وقت بھی امپیریل بنک تمام سرکاری کام کے لئے ریزرو بنک کا واحد ایجنٹ ہے۔

نئے قانون کے ماتحت امپیریل بنک کی لندنی شاخ پر جو بندشیں تھیں وہ بھی دُور کر دی گئی ہیں اور اب بنک دیگر ممالک میں شاخیں اور ماتحت دفتر بھی کھول سکتا ہے۔

سنٹرل بورڈ کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ گورنر جنرل کی اجازت کے بغیر بھی لوکل بورڈ قائم کر سکتا ہے۔ اسی طرح سرمایہ میں اضافہ کے لئے بھی اُسے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ غرض ان تمام امور میں بھی جو سرکاری مالیات پر اثر انداز ہوتے ہیں امپیریل بنک اب گورنر جنرل کی ہدایات کا پابند نہیں رہا۔

بنک کے کاروبار پر جو بندشیں لگائی گئی تھیں اُن کو بھی نئے ایکٹ نے دُور کر دیا ہے۔ مثلاً اب بنک ایسی مبادلہ کی ہنڈیوں کی بھی خرید و فروخت کر سکتا ہے جن کی ادائیگی ہندوستان سے باہر

ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ غیر ملکوں سے قرض لے سکتا ہے اور خارجی مبادلہ کی بھی اُسے اجازت ہے پہلے بنک چھ ماہ سے زائد عرصہ کے لئے قرض نہیں دے سکتا تھا لیکن اب یہ مدت نو ماہ کردی گئی ہے، اور مال واسباب اور اُس کے کاغذات کی ضمانت پر بھی وہ قرض دے سکتا ہے۔ ریزرو بنک کے حصوں اور میونسپلیٹوں۔ ریاستوں اور لیمیٹڈ کمپنیوں کی کفالتوں اور تمسکات پر بھی قرض دینے کا اُسے اختیار حاصل ہے۔

لیکن بعض پُرانی بندشیں اب تک قائم ہیں۔ مثلاً بنک کو رہن پر روپیہ دینے کی ممانعت ہے اور نجی افراد کو قرض دینے کے متعلق وقت، رقم اور ضمانت کی جو حدبندیاں پہلے مقرر کردی گئی تھیں وہ ابھی تک دُور نہیں کی گئی ہیں، اور ان کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ امپیریل بنک کو ریزرو بنک کا واحد گماشتہ تسلیم کیا گیا ہے جس کی بدولت وہ سرکاری خزانہ اور سرکاری رقومات جمع کرنے کا کام بدستور کرتا ہے اس لئے اُسے بعض شرائط کی پابندی بھی کرنا ہوگی۔

مرکزی تحقیقاتی مجلس کی سفارشیں سنٹرل بنکنگ انکوائری کمیٹی نے ہلٹن ینگ کمیشن کی سفارش پر ہندوستان میں ایک جداگانہ مرکزی بنک کے قیام کی ضرورت کو تسلیم کرلیا ہے۔ اسی لئے اُس نے امپیریل بنک کے کام کی توسیع و اصلاح کے لئے متعدد سفارشات کیں جن میں سے پہلی یہ ہے کہ مشترکہ سرمایہ دار اور امداد باہمی کے بنکوں کی طرح یہ بنک بھی دیسی بنکوں کو ہنڈیوں اور چکوں کی رقم وصول کرنے کے لئے ایک گماشتہ کی حیثیت سے استعمال کرے۔

دوسرے یہ بنک دیسی ساہوکاروں کی ہنڈیوں پر زیادہ فراخدلی سے بٹہ کاٹے۔

تیسرے کوآپریٹیو بنکوں کو اصل امانت کی نسبت زیادہ روپیہ نکلوانے (overdraft) اور قرض لینے کی سہولتیں دے۔

چوتھے جن شرائط پر اس نے مشترکہ سرمایہ دار بنکوں کو انتقال رقومات کی سہولتیں دے رکھی ہیں انھیں شرائط پر کوآپریٹیو بنکوں کو بھی سہولت دے۔

پانچویں موجودہ کی طرح آئندہ بھی بنک گوداموں میں رکھی ہوئی زراعتی پیداوار کی ضمانت پر قرض دیتا رہے۔

چھٹے جرمنی کی طرح یہ بنک بھی مشترکہ سرمایہ دار بنک صنعتوں کو بعض شرائط کے ماتحت مالی امداد دے کر ہندوستانی مصنوعات کی امداد کرے۔

ساتویں بنک ہندوستان کی خارجی تجارت کو بھی مالی حیثیت سے سنبھال لے۔

اب جبکہ ہندوستان میں ایک جداگانہ مرکزی بینک قائم ہوگیا ہے اور امپیریل بینک پر سے ۱۹۲۰ء کی بندشیں دُور کردی گئی ہیں یہ دیکھنا باقی ہے کہ یہ بینک صنعتی مالیات اور خارجی مبادلہ کے کاروبار میں کس حد تک حصّہ لیتا ہے۔

بنک کی ترقی امپیریل بنک ۱۹۲۰ء میں قائم ہوا تھا، اُس وقت سے ابتک اس نے عظیم الشان ترقی کی ہے چنانچہ اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اثنا میں اس بنک کے اداشدہ سرمایہ، ریزرو فنڈ سرکاری اور نجی امانتوں اور نقد روپے میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے جیساکہ نقشۂ ذیل سے معلوم ہوگا:۔

امپیریل بنک آف انڈیا کا سرمایہ۔ زرِ محفوظ۔ امانتیں اور نقد رقوم

سال	اداشدہ سرمایہ	زرِ محفوظ	سرکاری امانتیں	نجی امانتیں	نقد روپیہ
۳۱۔ دسمبر	لاکھ روپے	لاکھ روپے	لاکھ روپے	لاکھ روپے	لاکھ روپے
۱۹۲۱	۵۶۲	۴۱۲	۶۸۰	۶۵۷۷	۱۳۶۰
۱۹۲۲	۵۶۲	۴۳۳	۱۴۱۵	۵۷۰۰	۱۵۰۷
۱۹۲۳	۵۶۲	۴۵۵	۸۵۶	۷۴۱۹	۱۵۰۱
۱۹۲۴	۵۶۲	۴۸۰	۷۵۰	۷۶۷۱	۱۵۶۰
۱۹۲۵	۵۶۲	۴۹۲	۵۴۶	۷۷۸۳	۱۷۴۶
۱۹۲۶	۵۶۲	۵۰۹	۶۴۵	۷۳۸۹	۲۰۹۰
۱۹۲۷	۵۶۲	۵۲۴	۷۲۰	۷۲۰۷	۱۰۸۹
۱۹۲۸	۵۶۲	۵۳۹	۷۹۵	۷۱۳۰	۱۰۵۸
۱۹۲۹	۵۶۲	۵۴۸	۷۶۰	۷۱۶۴	۱۴۰۰
۱۹۳۰	۵۶۲	۵۵۳	۷۳۷	۷۶۶۰	۱۳۰۴
۱۹۳۱	۵۶۲	۵۱۴	۸۳۲	۶۳۸۶	۱۱۰۴
۱۹۳۲	۵۶۲	۵۴۲	۷۰۷	۶۸۳۶	۲۰۹۷
۱۹۳۳	۵۶۲	۵۴۹	۶۴۴	۷۴۱۳	۱۵۶۰
۱۹۳۴	۵۶۲	۵۳۵	۶۷۲	۷۴۲۸	۱۸۹۷

بنک کی مالی حالت کا اندازہ لگانے کے لئے مندرجہ ذیل گوشوارے کا بغور مطالعہ مفید ثابت ہوگا

اِس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ بنک اپنا روپیہ کہاں کہاں لگاتا ہے اور کس قسم کا کاروبار کرتا ہے:-

گوشوارہ امپیریل بنک آف انڈیا

۲۲ مئی ۱۹۳۶ء

اثاثہ	ہزار روپے	ہزار روپے
جو روپیہ نفع پر لگایا گیا:		
سرکاری کفالتوں میں	۴۱۲۵۶۸	
امپیریل بنک ایکٹ ۱۹۲۰ء کے ماتحت منظور شدہ دیگر کفالتوں میں	۹۱۱	۴۱۳۷۷۹
جو روپیہ قرض دیا گیا:-		
اُدھار	۳۵۵۵۸	
نقد اور اصل سے زائد رقومات	۱۸۳۲۵۲	
بلوں کی خرید اور اُن پر بٹہ کاٹنے میں	۳۸۸۳۶	۲۵۷۶۴۶
ضبط شدہ حصص		۲۳۲۰۶
متفرقات		۶۸۰۴
سونا	—	—
نقد:-	—	—
پاس اور ریزرو بنک میں	۲۰۶۶۸۷	
دوسرے بنکوں کے پاس	۱۵۱۳	۲۰۸۲۰۰
روپے		۹۰۹۶۳۵

موجبات	ہزار روپے	ہزار روپے
سرمایہ:-		
منظور شدہ		
کل ۲۲۵۰۰۰ روپیہ جو پانچ پانچ سو کے حصوں میں تقسیم ہے	۱۱۲۵۰۰	
کل ۲۲۵۰۰۰ روپے جو پانچ پانچسو کے حصوں میں تقسیم ہو	۱۱۲۵۰۰	
وصول شدہ		
۷۵۰۰۰ روپیہ جو پانچ پانچسو روپے کے حصوں میں تقسیم ہے مکمل اور پانچ پانچسو روپے کے ۱۵۰۰۰۰ حصوں میں سے صرف ۱۲۵ روپے	۱۸۷۵۰	۵۰۶۲۵۰
ادا شدہ		
حصہ داروں کے محفوظ موجبات ۱۵۰۰۰۰ حصوں میں ۳۷۵ روپے	۵۶۲۵۰	
فی حصہ		۵۴۷۵۰
ریزرو فنڈ		۷۹۰۱۰۰
امانتیں		۸۵۳۵
متفرقات		
روپے		۹۰۹۶۳۵



بادۂ جذبات

(از پروفیسر رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری، ایم۔اے)

پہلا دَور

ہر نالہ تیرے درد سے اب اور ہی کچھ ہے
ہر نغمہ سرِ بزمِ طرب اور ہی کچھ ہے

اربابِ وفا جان بھی دینے کو ہیں تیار
ہستی کا مگر حسنِ طلب اور ہی کچھ ہے

یہ کام نہ لے نالہ و فریاد و فغاں سے
افلاک اُلٹ دینے کا ڈھب اور ہی کچھ ہے

اِک سلسلۂ راز ہے جینا کہ ہو مرنا
جب اور ہی کچھ تھا مگر اب اور ہی کچھ ہے

کچھ مہرِ قیامت ہے نہ کچھ نارِ جہنم
ہشیار کہ وہ قہر و غضب اور ہی کچھ ہے

مذہب کی خرابی ہے نہ اخلاق کی پستی
دنیا کے مصائب کا سبب اور ہی کچھ ہے

بیہودہ سری سجدے میں ہے جان کھپانا
آئینِ محبت میں ادب اور ہی کچھ ہے

کیا حسن کے اندازِ تغافل کی شکایت
پیمانِ وفا عشق کا جب اور ہی کچھ ہے

دُنیا کو جگا دے جو عدم کو بھی سُلا دے
سُنتے ہیں کہ وہ روزِ وہ شب اور ہی کچھ ہے

آنکھوں نے فراقؔ آج نہ پوچھو جو دکھایا
جو کچھ نظر آتا ہے وہ سب اور ہی کچھ ہے

دُوسرا دَور

یہ موت و عدم، کون و مکاں اور ہی کچھ ہے
سُن لے کہ مرا نام و نشاں اور ہی کچھ ہے

اتنا تو یقیں ہے کہ وہی ہیں تری آنکھیں
مجھ کو بھی مگر وہم و گماں اور ہی کچھ ہے

شعلوں میں وہ انداز کہاں سوزِ نہاں کے
اُٹھتا ہے جو دل سے وہ دھواں اور ہی کچھ ہے

اِک کیفیتِ راز ہے غم ہے نہ مسرت
اس بزمِ محبت میں سماں اور ہی کچھ ہے

جو مرحلۂ قربت و دُوری سے گذر جائے
سُنتے ہیں کہ وہ جذبِ نہاں اور ہی کچھ ہے

یا درد کے نغموں میں بھی ہے تیری ہی آواز
یا پردۂ سازِ رگِ جاں اور ہی کچھ ہے

یہ نیند کا جھونکا تو نہیں بےخودیٔ عشق — ہشیار کہ وہ خوابِ گراں اور ہی کچھ ہے
اب موت بھی ہے گردِ رہِ کوچۂ جاناں — ان منزلوں میں عمرِ رواں اور ہی کچھ ہے
اچھے ہیں جہاں ہیں مگر اے امنِ جاناں — پاتے ہیں جو تجھ میں وہ اماں اور ہی کچھ ہے
بجلی کے چمکنے میں کہاں عشق کی گرمی؟ — وہ شعلۂ لرزاں وتپاں اور ہی کچھ ہے
جو زخم کھلا دے جو مرا رنگ اڑا دے — وہ فصلِ گل و فصلِ خزاں اور ہی کچھ ہے
اک خوابِ پریشاں سے ہیں اس دور کے آثار — ہشیار کہ اب رنگِ جہاں اور ہی کچھ ہے
اک چیز ہے نیرنگیٔ روداد محبت — لیکن بحدیثِ دگراں اور ہی کچھ ہے

شاعر ہیں فراق اور بھی اس دور میں لیکن
یہ رنگِ بیاں رنگِ زباں اور ہی کچھ ہے

تیسرا دَور

وحشت نہ زیادہ ہے نہ کم اور ہی کچھ ہے — اس دل میں وہ آ ہوئے حرم اور ہی کچھ ہے
گو دل میں ترا لطف و ستم اور ہی کچھ ہے — آنکھوں کا تری قول و قسم اور ہی کچھ ہے
آباد ہے انسان کے دم سے بھری دنیا — یہ قافلۂ راہِ عدم اور ہی کچھ ہے
ہم سینہ سپرِ تیرِ قضا سے بھی رہے ہیں — لیکن تری تلوار کا دم اور ہی کچھ ہے
یہ داغ ہیں وہ پھول مگر دیکھیے رفتار — وہ اٹھتا ہوا نقشِ قدم اور ہی کچھ ہے
جس میں نئی دنیا کا تماشا نظر آئے — سنتے ہیں کہ وہ ساغرِ جم اور ہی کچھ ہے
تو سامنے ہے، ہجر تو کیونکر اسے کہیے — اس وقت مگر دل کو بھرم اور ہی کچھ ہے
احساس بس احساس ہے۔ یہ رنج و خوشی کیا — اے عشق تجھے کارِ اہم اور ہی کچھ ہے
کچھ چھلکے ہوئے حسن کا انداز ہے اس میں — اب درد زیادہ ہے نہ کم اور ہی کچھ ہے
گو عشق سے کچھ حسن کی بدلیں نہیں آنکھیں — اب دل کی خوشی اور ہے غم اور ہی کچھ ہے
ہوتی ہیں تہیں کالی گھٹاؤں میں بھی لیکن — اس زلفِ گرہ گیر میں خم اور ہی کچھ ہے
اس چشمِ سیہ مست کی نیت نہیں کھلتی — دل کا بھی مگر بھید بھرم اور ہی کچھ ہے
اس سے تو ترے کوچے کی راہیں نہیں ملتیں — یہ مرحلۂ دیر و حرم اور ہی کچھ ہے
برباد ہوں آباد ہوں عنوانِ دگر سے — صحرائے عدم باغِ ارم اور ہی کچھ ہے

اوجھل نگہِ شوق سے ہے دل میں بھی آکر — اس راہ میں وہ شوخیِ رم اور ہی کچھ ہے
کچھ ملنے لگا ہے تری آنکھوں کا پتہ بھی — اب وحشتِ دل تیری قسم اور ہی کچھ ہے

دل جس کو ترستا ہے فراقِ اہلِ وفا کا
وہ لطف و کرم جور و ستم اور ہی کچھ ہے

جذباتِ بیخود

(از منشی رضی احمد بیخود غازیپوری (بنارس)

کتنی شیشے میں ہے شراب نہ پوچھ — اے مرے محتسب حساب نہ پوچھ
پرتوِ حسنِ لاجواب نہ پوچھ — جس کا پردا ہے آفتاب نہ پوچھ
مستقل مسکرا کے غنچوں نے — دل کیا خستہ و خراب نہ پوچھ
اب ٹھہرتی نہیں نظر بھی کہیں — کاوشِ طرزِ انتخاب نہ پوچھ
حسن کی بارگاہِ عالی میں — کون ہوتا ہے باریاب؟ نہ پوچھ
رنج سہتے ہیں شکر کرتے ہیں — غم نصیبوں کی پیچ و تاب نہ پوچھ
درد اٹھتا ہے خونِ دل ہو کر — رنگِ موجِ شرابِ ناب نہ پوچھ
زندگی خواب تھی کہ بھول گیا — مجھ سے تعبیرِ حسنِ خواب نہ پوچھ
اِک نفس نے بدل دی دنیا ہی — شوخیِ رنگِ انقلاب نہ پوچھ
مستیِ چشمِ ساقیِ دوراں — پھر اٹھا جھوم کر سحاب نہ پوچھ
عینِ خشکی ہے موجِ دریا بھی — تشنگیِ لبِ سراب نہ پوچھ

کن تبسم شعار آنکھوں نے
مجھکو بیخود کیا خراب نہ پوچھ



سنسکرت ڈرامہ[1]

(از پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری۔ ایم۔ اے)

آپ نے جب کبھی ننھے مُنّے بچّوں کو کوئی کہانی سُنائی ہوگی جس میں ہونی یا اَن ہونی کسی طرح کی بھی بات ہو تو اکثر بچوں نے آپ سے پوچھا ہوگا کہ کیا سچ مچ ایسا ہوا تھا۔ دراصل بچّے صرف کہانی سُن کر خوش نہیں ہوتے بلکہ اُن کو کہانی کا پُورا مزا جب آتا ہے جب اُنھیں یہ یقین ہو جائے کہ کہانی صرف باتیں ہی باتیں نہیں ہے بلکہ ایسا واقعی ہوا تھا۔ کون ایسا بیدرد بھائی یا باپ ہوگا، کون ایسی بیدرد ماں یا بہن ہوگی جو جن و پری کی کہانیوں کو بھی کسی بچّے کو جھوٹا بتا دے۔ جب بچپن کے دن بیت جاتے ہیں تو خیالی دنیا آنکھوں کے سامنے سے اُوجھل ہونے لگتی ہے۔ یقین کا گھروندا ٹوٹ جاتا ہے اور زندگی میں سچ اور جھوٹ کی دھوپ چھاؤں شروع ہو جاتی ہے۔ مگر ہم بڑے ہو کر بھی بچّے ہی رہتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ بچّے صرف ہمارے کہنے سے کہانی کو سچ مان لیتے ہیں اور ہم آنکھوں سے بھی کہانی کا سچ ہونا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایک بار ایک لالہ صاحب پردیس گئے اور ایک بُڑھیا کی جھونپڑی میں جا کر کہا کہ "مَتوا! ذرا تمبا کو تو پلا دے"۔ بڑھیا نے چلم تیار کر کے دی اور پوچھا کہ آپ کہاں سے آتے ہیں۔ لالہ صاحب نے کہا "لنکا سے آ رہا ہوں"۔ بُڑھیا نے پوچھا "لنکا کیسے جلی؟" لالہ صاحب نے کہا کہ "صرف سُننا چاہتی ہو یا دیکھنا چاہتی ہو؟" بڑھیا کے منھ سے نکل گیا کہ "سُنا تو بہت ہے لیکن دیکھا نہیں"۔ لالہ صاحب نے کہا "اچھا میں آنکھوں سے لنکا جلنا دکھا دونگا" اور تمبا کو پی کر سُلگی ہوئی چلم چھپر پر اُلٹ دی اور فوراً آگ لگ گئی۔ لالہ صاحب نے کہا کہ مَتوا لنکا ایسے ہی جلی تھی۔ خیر بُڑھیا کو اور لالہ صاحب کو آپ جتنا بھلا برا کہنا چاہیں کہیں۔ لیکن اگر اپنے گھر میں یا پڑوس میں آگ نہ لگے تو لنکا کا جلنا ہم آپ سبھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ شاعری میں، غزل میں، یا کبت میں، گیتوں اور دوہروں میں، مثنویوں یا کتھاؤں میں، رامائن میں، مہابھارت، شاہنامہ، آلھا میں، کتھا سرت ساگر میں، الف لیلا میں، چندر کانتا اور طلسم ہوشربا میں، ناولوں اور چھوٹی بڑی کہانیوں میں یہاں تک کہ سائینس کی کتابوں میں، تاریخ یا اتہاس کی کتابوں میں، جغرافیہ میں سفرناموں میں، اور اخبار میں چھپنے والی خبروں میں، عدالت کی کارروائیوں میں، سچ ہوتا ہے یا جھوٹ۔ اس کو تو ہم سے اچھا آپ

[1] یہ تقریر ۲۴ جولائی ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے براڈ کاسٹ ہو چکی ہے۔

جانتے ہونگے، لیکن بیان کے ساتھ ساتھ تصویریں بھی ان کتابوں اور اخباروں میں ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ سینما میں اصل کھیل کے پہلے روزانہ خبروں اور واقعوں کی چلتی پھرتی بولتی ہوئی تصویریں بھی دکھائی جاتی ہیں۔ آپ ہمارے دیس کے مشاعروں اور کوی کو سمیلنوں کو لے لیجئے۔ کتنے کوی اور شاعر ایسے ہوتے ہیں کہ جنم بھر میں جو کچھ بھی اُنھوں نے کہا ہے وہ روپیے آٹھ آنے میں چھپنے کے بعد ہم مول لیکر پڑھ سکتے ہیں۔ لیکن انھیں شاعروں کو ہم سیکڑوں روپیہ دیکر بُلاتے ہیں کہ سمیلن میں آئیں اور صرف پانچ سات منٹ تک اپنی دو ایک کوِتا اپنی زبان سے سُنا دیں۔ خیر شاعری ہو یا زندگی من ہی من میں کسی بات کو جانکر ہمارا دل پوری طرح خوش نہیں ہوتا۔ اور ہمارا کام نہیں چلتا۔ کوئی ہم سے کتنا ہی پریم یا محبت کرے یا ہماری عزت کرے لیکن اگر وہ سامنا ہونے پر اچھی طرح سلام نہ کرے، اچھی طرح ہم سے نہ بولے، اور اپنے چہرے اور آنکھوں سے اپنا پریم ہم پر ظاہر نہ کرے تو ہمارا جی کھٹا ہو جاتا ہے۔ دوستوں کی سچی دوستی، پریمیوں کا سچا پریم، میاں بیوی کی اور باپ بیٹے کی سچی محبت کبھی کبھی ادھ مری ہو گئی ہے، بلکہ مر گئی ہے۔ صرف اس لئے کہ محبت تو تھی لیکن ظاہر نہیں کی گئی، کبھی کبھی تو کُھل کر لڑ جھگڑ لینے سے پریم جی گیا ہے، بلکہ بڑھ گیا ہے۔ اور چُپ رہ جانے سے پریم مر گیا ہے یا بُری طرح گھائل ہو گیا ہے۔ اسی طرح ناٹک یا ڈرامہ پیدا ہوئے۔ جب دنیا کا بچپن تھا تو کسی بات کو کہنے سے پہلے کسی جذبہ جیسے خوشی، غصّہ، محبت، نفرت، ڈر، اُمید، حوصلہ، بیدلی، کو باتوں سے ظاہر کرنے کے پہلے آنکھ، چہرہ یا بدن کے دوسرے حصوں کو ہلا کر یا خاص روپ رنگ دیکر ہزارہا سال پہلے کے آدمی ظاہر کیا کرتے تھے۔ بھاشا کے پہلے بھیس، زبان کے پہلے اشاروں یا صورت کے ذریعہ سے دل کا حال بتایا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ آدمی نے ناچنا پہلے سیکھا اور گانا بعد کو۔ ناٹک سنسکرت کا لفظ ہے اور ڈرامہ یونانی زبان کا لفظ ہے اور دونوں کا مطلب ناچنا ہے۔ ناچنا کیا ہے؛ ہاتھ پاؤں اور پورے بدن کے اشاروں، حرکتوں اور روک تھام سے دل کے بھاؤ، دل کے خیالات کو بیان کرنے کے بدلے دِکھا دینا۔ مطلب یہ ہے کہ ناچنا بھی ایک طرح کی ایکٹنگ یا اداکاری ہے۔ جب ہم کسی خیال یا جذبے کو یا کسی واقعہ کو سنتے بھی ہیں اور دیکھتے بھی ہیں تو اُس کی سچائی کا بھی یقین ہو جاتا ہے۔ اور اس کا اثر بھی گہرا پڑتا ہے۔ اِس سلسلے میں آپ کو یہ بھی یاد دلا دوں کہ جس طرح کبھی کبھی ناچنے والا کچھ دیر تک گانا بالکل بند کر کے صرف ناچ دکھاتا ہے۔ اسی طرح ایک خاص قسم کا ناٹک یا ڈرامہ ایسا بھی ہوتا ہے جس میں دکھانے والے کچھ منہ سے نہیں بولتے، اُسے Pantomime یا Dumb show کہتے ہیں۔ ہاں تو دنیا میں ناٹک یا ڈراما یونھیں شروع ہوا کہ آنکھوں

سے آواز سے چہرے سے اور بدن سے بھاؤ بتائے جائیں. ٹھیک طرح سے غزل یا گیت گانا مرثیہ یا مجلس پڑھنا بلکہ روزانہ کی زندگی میں بات کے علاوہ بدن کو جو حرکت ہو جاتی ہے یا جو اشارے ہاتھوں سے ہو جاتے ہیں ان سب میں ڈراما یا ناٹک کا بھید چھپا ہوا ہے۔ اُردو کا پہلا ڈراما امانت کی اندر سبھا غزل، گیت، مرثیہ، مجلس اور سوز خوانی کا نتیجہ تھا. یونانی ناٹک Greek Drama کو لے لیجئے ٹریجیڈی (غم اور موت کے ڈرامے) اور کومیڈی (ہنسی اور خوشی) کے ڈرامے دونوں ڈایونیسس Dionysus یا بیکس (Bacchus) کی پوجا کے نتیجے تھے. جس طرح کسی بزرگ کی قبر یا درگاہ پر عرس خوانی یا قوالی کے وقت کچھ لوگوں کو حال آجاتا ہے اور وہ لوگ جھومنے یا ناچنے لگتے ہیں چین میں ناٹک یا تو تاتاریوں کی وجہ سے پیدا ہوا یا قومی گانے اور ناچنے سے پیدا ہوا۔ اسی طرح یورپ میں یونان اور روم کے ناٹکوں کے ہزار دو ہزار برس بعد جب یورپ میں عیسائی مذہب قائم ہو گیا تو اب سے قریب پانچسو برس پہلے کا ڈراما (Medieval Drama) گرجا گھروں میں شروع ہوا۔ ان ناٹکوں میں مذہبی گیت اور انجیل کے قصے کہانیاں ہوتے تھے.

ہمارے دیس کا سنسکرت ڈراما کیسے پیدا ہوا؟ بہت دنوں تک کہنے والے کہتے تھے کہ سنسکرت ناٹک یونانی ناٹک سے پیدا ہوا۔ لیکن جب اس بات کی کھوج کی گئی تو پتہ چلا کہ سنسکرت ناٹک بالکل قومی اور ملکی پیداوار ہے۔ سنسکرت ناٹک نے ہمارے دیس میں اور ہماری قومی زندگی میں جنم لیا، یہیں پلا بڑھا، پنپا اور لہلہایا۔ اس پر یونان، روم اور کسی دوسرے دیس یا قوم کا کوئی اثر نہیں تھا. سنسکرت ناٹک ٹھیٹھ اور خالص ہندوستانی چیز تھا۔ اگر آپ سنسکرت ڈراما کے جنم کا پتہ لگانا چاہتے ہیں اور اس کی جڑ تک پہونچنا چاہتے ہیں تو رگ وید کے اِن منتروں کو دیکھیئے جن میں دیوتاؤں اور دوسرے لوگوں کی آپس میں بات چیت (Dialogues) کا بیان ہے. جیسے سرما اور پنیوں کی بات چیت یما اور یمی کی بات چیت، پُرورو اور اُروسی کی بات چیت، اِن میں سے آخری بات چیت سیکڑوں بلکہ ہزارہا سال بعد کالیداس کے مشہور اور شاندار ناٹک وکرم اُروسی کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ ویدوں کے کچھ ان منتروں کو جن میں بات چیت آگئی ہے بعد کے لوگوں نے بڑھاوا دیا۔ اُنھیں پھیلایا اور اُن سے کہانیاں بنائیں، اور اس طرح سنسکرت ناٹک بنایا بنا ہوگا. لیکن وہ ناٹک جسے کھیل کی شکل میں راس یا لیلا کی شکل میں لوگوں کے سامنے ایکٹ کر کے دکھایا جائے، اس کی شروعات کیونکر ہوئی؟ کھیلے جانے والے ناٹک کے جنم کا پتہ ٹھیک ٹھیک تو نہیں ملتا لیکن کچھ روایتیں اور کچھ لفظ یا نام ناٹک کے جنم کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مثلاً ایکٹر یا اداکار کے لئے نٹ کا لفظ، اور ڈراما یا کھیل

کے لئے ناٹک کا لفظ سنسکرت لفظ نرت سے نکلے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ناچ ترقی کرتا
کرتا ناٹک بنا۔ آپ خواہ مخواہ ناچ کو صرف ایک مرد یا عورت کا ناچ کیوں سمجھتے ہیں۔ ہولی کے
موقع پر کیرتنوں میں اور دوسرے تیوہاروں میں کئی آدمی ملکر بلکہ جماعت کی جماعت ملکر ناچتی ہے۔ بلکہ
ناچنے والوں کی ٹولیاں بن جاتی ہیں، ایک کا ناچ دوسرے کے ناچ کا گویا جواب ہوتا ہے۔ اور اکثر
گانوں میں بھی سوال اور جواب یعنی منظوم بات چیت ہونے لگتی ہے۔

روایتوں کے مطابق ناٹک کو بھرت یا بھارت نامی شخص نے ایجاد کیا، اور گجراتی میں اب بھی
بھروت گانے والے کو کہتے ہیں۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ ناچ اور گانا بڑھتے بڑھتے ناٹک بنے سنسکرت
کی ہزاروں برس کی پرانی کتاب مہا بھاشیہ میں ان ناٹکوں کا ذکر ہے جو کھیل کر دکھائے جاتے تھے۔
کنس ودھ یعنی کرشن کے ہاتھوں اس کے ظالم ماموں راجا کنس کی موت، بلی بندھ یعنی راجہ بلی کس
طرح قسمت کی گردش سے ایک اصطبل میں باندھ دیے گئے تھے، اور ایسی ہی اور بہت سے ناٹکوں
کا ذکر ہے۔ یہ ناٹک اب ملتے نہیں۔

روایت ہے کہ ناٹک کے موجد بھارت نے دیوتاؤں کے سامنے ایک ناٹک کروایا تھا جس میں
وشنو کی استری یعنی لکشمی کے سوئمبر کا کھیل دکھایا گیا تھا۔ کئی سو برس کی روایتوں نے سری کرشن جی
اور گوپیوں یعنی برندابن کی وہی بیچنے والی چنچل کنواری لڑکیوں کو رہس لیلا اور سنگیت کے لئے چن
لیا ہے۔ اس لیلا میں گانا بجانا اور ناچ سب ہی شامل ہیں

روایت ہے کہ مہابھارت کی کتھا کو ویاس جی بولتے جاتے تھے، اور گنیش جی لکھتے جاتے تھے
جب کئی لاکھ شعر یعنی اشلوکوں کی یہ کتاب ختم ہوگئی تو ویاس نے کہا کہ میرے دل کا حوصلہ پورا نہیں ہوا
مجھے شانتی نہیں ملی۔ تب گنیش جی نے ویاس منی سے کہا کہ کرشن لیلا لکھو اور سری مد بھاگوت ویاس
جی نے بنایا۔

لیلا اور ناٹک یا ڈرامہ میں بہت نزدیکی رشتہ ہے۔ کچھ ایسی بات دھیان میں آتی ہے کہ وشنو
اور کرشن کی بھگتی اور پوجا یعنی دونوں دیوتاؤں کی روایتوں کے میل جول سے سنسکرت ناٹک نے
جنم لیا۔ یہ روایتیں یا کتھائیں بہت رنگین اور رسیلی ہیں، اور دل کے گہرے بھاؤں کو یہ لیلائیں اُکسا
دیتی ہیں، اور ایک ایک بات پر یا تو آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں یا دل میں گدگدی پیدا ہوتی ہے
ان دیوتاؤں کی کتھاؤں اور لیلاؤں سے شروع ہوکر سنسکرت ڈرامہ خوب پھلا پھولا اور پروان چڑھا
...نا پورا رنگ روپ دکھلاتا ہوا اب سنسکرت ڈراما آگے بڑھا۔ اس کا پتہ ان سب ناٹکوں سے ملتا ہے

جو زمانے کے ہاتھوں سے اب تک بچے ہوئے ہیں اور برباد نہیں ہوئے۔ پھر ناٹک کا پورا علم اور اُس کے قاعدے قانون مقرر ہو گئے، اس فن اور اس علم کا نام ہزاروں برس پہلے ناٹیہ شاستر رکھا گیا۔

ساہتیہ درپن جو ایک بہت پرانی کتاب ہے، اس میں لکھا ہے کہ اونچے قسم کا ناٹک روپک کہلاتا ہے، اور معمولی ناٹک اُپ روپک کہلاتا ہے۔ پھر روپک کے دس قسم اور اُپ روپک کے اٹھارہ قسم بتائے گئے ہیں۔

سنسکرت ناٹک میں ایک خاص بات یہ ہوتی ہے کہ ناٹک کا خاتمہ موت اور غم، رونے اور پیٹنے پر کبھی نہیں ہوتا، یعنی ٹریجیڈی لکھنا منع ہے۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ نثر میں معمولی بول چال کے ساتھ ساتھ بیچ بیچ میں رنگین اور بھاؤں سے بھری ہوئی شاعری ملتی ہے۔ بولیاں بھی دو زبانوں یا بھاشاؤں میں ہوتی ہیں۔ بڑے آدمی سنسکرت میں اور معمولی لوگ اور عورتیں پراکرت میں بات چیت کرتے ہیں۔ سنسکرت ڈراما بڑی ملی جلی ہوئی چیز ہے۔ دل کو خون کر دینے والا غم اور دل کو باغ باغ کر دینے والی خوشی ساتھ ساتھ ملیں گے۔ ناٹک کا مسخرا یا نقال (Jester) جسے سنسکرت ڈرامے والے ودوشک کہتے ہیں اس وقت بھی کھل کر مذاق کرتا ہے جب ہیرو اور ہیروئن (نایک اور نایکا) مصیبت، غم اور ناامیدی کے سمندر میں ڈوب رہے ہوں۔ لیکن جیسا بتایا جا چکا ہے ڈرامے کا خاتمہ کبھی موت اور رونے پیٹنے پر نہیں ہوتا۔ کوئی ہندو تیوہار بھی غم اور ماتم کا تیوہار نہیں ہے۔ ناٹک کے دوران میں دل دکھانے والی، بیچین کر دینے والی، ڈرا دینے والی اور ہمت و حوصلہ توڑ دینے والی جتنی باتیں آتی ہیں وہ سب اخیر میں ڈھارس اور امید اور خوشی سے بدل جاتی ہیں۔

سنسکرت ناٹک لکھنے والے صرف دل کا خون کرنا نہیں جانتے تھے، بلکہ ہماری ہنسی، ہمارے آنسو اور ہمارے دل کے خون کو ملا کر ہمارے گھائل دل کے لئے مرہم بھی بنا دیتے تھے۔ اسٹیج پر وہ مصیبت جو دیکھی نہ جائے، ایسی بد دعا یا شاپ جس سے لوگ ڈر جائیں، تہذیب سے گری ہوئی کوئی بات خون اور موت دکھانے کی سخت ممانعت تھی۔

اس لحاظ سے سنسکرت ناٹک یونانی ناٹک سے، روم کے ناٹکوں سے خون آلود خاصکر سنیکا کی ٹریجیڈی (The Senecan Tragedy of Blood and horror) سے، انگریزی ناٹک سے بالکل الگ اور مختلف چیز رہی ہے۔ یہ بھی ایک مزیدار بات ہے، اور کچھ تعجب کی بات ہے کہ سنسکرت کے ہر ناٹک کا مسخرا یعنی ودوشک جس پر سب کو ہنسی آتی ہے، اور جس کی صورت شکل

پہناوا اور ہر بات بھدی بھونڈی اور ہنسنے والی چیز ہوتی ہے۔ جسے سب بیوقوف بناتے ہیں ہمیشہ کوئی نہ کوئی برہمن ہوتا ہے۔ یوں تو ہندوستان کا ڈراما یعنی سنسکرت ناٹک یونانی کومیڈی یا نقل سے کچھ کچھ ملتی جلتی ہوئی چیز ہے۔ لیکن ملکۂ الزبتھ کے زمانے کے انگریزی ناٹک اور خاصکر شیکسپیئر کے ناٹکوں سے کئی خاص باتوں میں سنسکرت ناٹک ملتا ہے۔ مثلاً سنسکرت ڈرامے میں ہر آدمی اپنے خاص اور نرالے رنگ روپ اور چال چلن طبیعت اور مزاج کو ظاہر کرتا ہے نہ کہ کسی خاص ذات یا پیشہ والوں کے مزاج اور طور طریقوں کو۔ یونانی ناٹک میں کہانی ایک دن ایک جگہ اور ایک واقع پر ختم ہوتی ہے۔ اس کو ارسطو نے وقت، جگہ یا سین اور کہانی یا پلاٹ کا ہونا (The Unity of Time, place and Action) بتایا ہے۔ سنسکرت ڈرامے میں پلاٹ تو ایک ہوتا ہے لیکن وقت اور مقام یا سین بدلتا رہتا ہے۔ اور اس لحاظ سے شیکسپیئر کے ناٹکوں سے سنسکرت ناٹک ملتا ہے۔ ایک اور بات میں دونوں میل کھاتے ہیں، یعنی غم اور خوشی، رونا اور ہنسنا، مصیبت اور چھیڑ چھاڑ، ہر ناٹک میں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ شیکسپیئر کے یہاں بھی اور سنسکرت ناٹکوں میں بھی کہانی در کہانی (Plot and Underplot) اکثر ہوتی ہیں پلاٹ یا قصے کو آگے بڑھانے کے لئے کئی دونوں میں ایک طرح کی ترکیبیں کام میں لائی جاتی ہیں، جیسے چٹھی لکھنا، مُردوں کو جلا دینا، کسی کو بیوقوف بنانے کے لئے اُسے اسٹیج پر دھوکے سے نشہ پلا دینا، کتنے مزے کی بات ہے کہ دو ڈھائی ہزار برس کے زمانے کا فرق چھ ہزار میل دونوں ملکوں میں فرق، اور بھاشا، دیس، رہن سہن کا فرق ہوتے ہوئے بھی انگریزی ناٹک اور سنسکرت ناٹک اتنے طریقوں سے ملتے جلتے ہیں۔

سنسکرت کے ہر ناٹک میں ایک خاص قسم کی تمہید ہوتی ہے، یعنی شروعات (Prologue) جس میں دعا آشیرواد (نندی) مانگتے ہیں یا دیتے ہیں، پھر اسٹیج کا منیجر اور ایک دو کھیل دکھانے والے آپس میں بات چیت کرتے ہیں، اور ناٹک کے لکھنے والے کی تعریف، پبلک کو خوش کرنے کی باتیں، پرانے واقعات اور نئے زمانے کی باتیں ہوتی ہیں، جن سے کہانی پر روشنی پڑے۔ ہر سنسکرت ناٹک میں کئی ایکٹ اور سین ہوتے ہیں، اور نئے ایکٹ کے پہلے ایک درمیانی سین (Inter Lude) ہوتا ہے جسے وِشکمبھ یا پرویشکا کہتے ہیں۔ جسے یا تو ایک آدمی ادا کرتا ہے یا دو آدمی بات چیت کے ذریعہ سے ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح تماشا دیکھنے والوں کو پیش آنے والے واقعات کے لئے تیار کر دیا جاتا ہے۔ ہر ناٹک کا خاتمہ پر سارے ملک کی بھلائی اور خوشحالی

کے لئے دعا مانگی جاتی ہے۔ ایک سنسکرت ناٹک ایک ایکٹ سے لیکر دس ایکٹ تک لمبا ہوتا ہے مثلاً نایکا میں چار ایکٹ اور پرہسن یعنی نقل میں صرف ایک ایکٹ ہوتا ہے۔ پُرانے زمانے میں تھیٹر یا آجکل کی طرح کے اسٹیج نہیں تھے۔ ناٹک شاہی محلوں کے سنگیت شالہ (Concert Room) میں کھیلے جاتے تھے۔ ڈراپ سین یا پردا بیچ سے کھل جاتا تھا، یہ پردا عام طور پر اسٹیج کے پیچھے ہوتا تھا، آگے نہیں ہوتا تھا۔ سب چیزیں اسٹیج پر دکھائی نہیں جاتی تھیں، بہت کچھ باتیں لوگ فرض کر لیتے تھے۔ یہی شکیسپیر کے زمانے میں ہوتا تھا۔ پردہ کے پیچھے (Green room or retiring room) ہوتا تھا جسے نیپتھیہ کہتے تھے۔ اور کھیل دکھانے والے پردے کو ذرا سا جھٹکا دیکر بیچ میں کھل جانے والے راستے سے اسٹیج پر نکل آتے تھے۔ لڑائی کے ہتھیار، کرسیاں، سنگھاسن یا تخت، رتھ اور سواریاں سب اسٹیج پر موجود ہوتے تھے۔ دنیا اور جنت کے رہنے والوں میں اکثر مڈبھیڑ ہو جاتی تھی۔ اس لئے آسمانی رتھوں یا وِمانوں کے اُترنے کا بھی انتظام اسٹیج پر تھا۔

اِن ناٹکوں کو دیکھنے کون لوگ تھے؟ آج کل کی طرح یا شیکسپیئر کے زمانے کی طرح ٹکٹ خرید کر کچھ امیروں کے ساتھ، ہزاروں غریب، کسان، مزدور، دوکاندار اور ملازم پیشہ لوگ سنسکرت ڈراما نہیں دیکھتے تھے۔ زیادہ تر راجہ گھرانا اور سیکڑوں برہمن، سردار اور دربار سے تعلق رکھنے والے رئیس، عہدہ دار اور سرکاری ملازم یا رئیسوں کے ملازم یہ کھیل دیکھتے ہوں گے۔

یہ مختصر کہانی ہے سنسکرت ناٹکوں کی، جو اب سے قریب ڈھائی تین ہزار برس پہلے شروع ہوکر قریب ایک ہزار برس تک لوگوں کے دلوں کو گرماتے اور لوگوں کو ہنساتے، رُلاتے، بہلاتے اور زندگی کے بھید بھرم بتاتے رہے۔

جذباتِ منوّر

ازحضرت منوّر لکھنوی

ساحلِ بحر پہ گو لاکھ صدف چاک کئے — جستجو جس کی تھی ہم کو وہی گوہر نہ ملا

فضول سلب ہوئی صبر و ضبط کی طاقت — نہ ہم کو سوزِ دروں آشکار کرنا تھا

ہوائے گلشنِ دہر اسقدر ہے کیف انگیز — گذرا ادھر سے ہوا جس کسی کا جھوم گیا

ہر اک سے پوچھتا ہوں تفصیل مشکلوں کی — یوں دل کی طاقتوں کا اندازہ کر رہا ہوں

اُف رے یہ کد و کاوش اور اس پہ بھی گلشن میں — جس پھول کے طالب ہیں وہ پھول نہیں ملتا

حُبِّ وطن

ازمہاشہ جیمنی سرشار، خیرپور (سادات)

انا کہ تیرے پاس ہیں لعل و گہر بہت
حق نے عطا کیا ہے تجھے مال و زر بہت

دلکش وسیع و سربفلک ہیں مکاں ترے
محتاجِ لطف سیکڑوں پیر و جواں ترے

تیری نگہ رفیع ہے یہ جانتا ہوں میں
احباب میں وقیع ہے یہ مانتا ہوں میں

اندوہ و فکر و کاہش و کلفت سے دور ہے
آنکھوں میں تیری نور ہے دل میں سُرور ہے

بجلی کے قمقموں سے ہے پُرنور گھر ترا
پُرلطف قہقہوں سے ہے معمور گھر ترا

تجھکو خدائے پاک نے انساں بنا دیا
اور اس پہ طرّہ یہ کہ سخنداں بنا دیا

شہرت ہے تیری فکرِ فلک رس کی چار سو
نازاں ہے تیری ذات پہ دنیائے رنگ و بو

دنیا کو فخر و ناز ہے تیرے کمال پر
حیرت میں اِک جہاں ترے جاہ و جلال پر

خود حُسن تیرے عشق کا سائل ہے یہ درست
شان و شکوہ کا ترے قائل ہے یہ درست

ہے تیری خوبیوں کا زمانے کو اعتراف
تجھ میں ہزار وصف ہیں لیکن خطا معاف

حُبِّ وطن جو دل میں نہیں سب فضول ہے
خالی ہے رنگ و بُو سے تو کاغذ کا پھول ہے

حُبِّ وطن ہے عقل ہو جیسے دماغ میں
حبِ وطن ہے تیل ہو جیسے چراغ میں

حبِ وطن ہے جیسے ہو مستی شراب میں
حبِ وطن ہے ولولے جیسے شباب میں

حبِ وطن ہے پھول میں جس طرح رنگ و بو
حبِ وطن ہے پہلو میں دل، دل میں آرزو

حبِ وطن ہے دیدۂ بینا کی روشنی
حبِ وطن ہے چاند کی جس طرح چاندنی

حبِ وطن ہے جلوۂ خورشید کی چمک
حبِ وطن ہے سبزۂ بیگانہ کی لہک

حبِ وطن ہے پھول چمن میں ہو جس طرح
حبِ وطن ہے روح بدن میں ہو جس طرح

حبِ وطن ہے عشقِ نوآموز کا سرور
حبِّ وطن ہے حسنِ جہاں سوز کا غرور

حبِ وطن ہے لعلِ بدخشاں کا رنگ و آب
حبِ وطن ہے گوہرِ غلطاں کی آب و تاب

حبِ وطن ہے جوہرِ عالی کہیں جسے
حبِ وطن ہے شانِ جلالی کہیں جسے

حبِ وطن وفورِ شجاعت کا نام ہے
حبِ وطن لہو کی حرارت کا نام ہے

دل نرم ہو بشر کا لہو گرم چاہیئے
جو یہ نہیں تو آدمی کو شرم چاہیئے

نقوشِ بہزاد

(حضرت بہزاد فاطمی نبیرۂ علامہ شاد عظیم آبادی)

دل کی زاہد نماز کیا جانے
غم پرستی کا راز کیا جانے

زخمِ بسمل کا ذوقِ بیتابی
شورشِ امتیاز کیا جانے

دل کا آئینہ توڑنے والا
سعیِ آئینہ ساز کیا جانے

کس لئے جھک گئی جبیں اپنی
سنگِ درگاہِ ناز کیا جانے

عشق کے دم سے لطفِ محفل ہے
حسنِ خود بیں یہ راز کیا جانے

کیا گذرتی ہے خرمنِ دل پر
شعلۂ برقِ ناز کیا جانے

بت پرستی بھی حق پرستی ہے
کعبۂ امتیاز کیا جانے

کس کے کس کے جگر پہ تیر لگے
یار کی چشمِ ناز کیا جانے

حق پرستی کو میری اے بہزاد!
یہ طلسمِ مجاز کیا جانے

*

ہندوستان میں چھاپہ خانوں کا پہلا دور

(۱۵۵۶ء لغایت ۱۸۰۰ء)

از مسٹر پیارے لال شاکر (میرٹھی)

ہندوستان میں چھاپہ خانوں کے آغاز کے متعلق معلومات قریب قریب معدوم ہیں۔ دو چار کتابیں ہیں بھی تو اُن غیر ملکی زبانوں میں ہیں جن سے اہلِ ہند استفادہ نہیں کرسکتے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا سے بالعموم تمام طلب مسائل پر کچھ نہ کچھ روشنی مل جاتی ہے، لیکن اس باب میں وہ بالکل خاموش ہے۔ دوسری طرف بالفور کی "سائیکلوپیڈیا آف انڈیا" نے ہندوستان میں مطابع کی تاریخ پر جو بیان درج کیا ہے، اُس میں سولہویں اور سترھویں صدی کے مطابع کو بالکل نظرانداز کردیا ہے۔ اُس کے بیان کے مطابق ہندوستان میں مطبع کا آغاز ۱۷۱۱ء میں اُس زمانے میں ہوا جب ٹرنکوبار میں "پراٹسٹنٹ" مشنریوں نے اپنی خدمات کا سلسلہ شروع کیا تھا۔

زمانۂ حال میں سب سے پہلے "منگلور میگزین" (کرسمس ۱۹۰۱ء) نے ہندوستان میں چھاپہ خانوں کے آغاز کے باب میں تحریر کیا تھا کہ "ہندوستان میں سب سے پہلی کتاب ۱۵۷۷ء میں کوچین میں طبع ہوئی"۔ اس اعلان نے ایک معنی میں سنسنی پیدا کردی۔ متعدد اخبارات و رسائل نے اس بیان کی مخالفت و تائید میں مضامین شائع کئے۔ سب سے زیادہ "مدراس میل" نے اِس بحث میں حصہ لیا۔ اُس نے اپنی اشاعت مورخہ ۸ ر مارچ ۱۹۰۱ء میں لکھا تھا:۔

"سر ولیم ہنٹر نے امپیریل گزیٹیر آف انڈیا (جلد چہارم ص۲۱۲) میں تحریر کیا ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلی کتاب ۱۵۷۷ء میں کوچین کی جیسویٹ سوسائٹی نے طبع کی۔ اسی قسم کا ایک بیان لفٹننٹ ایچ۔ اے۔ین براؤن نے اپنی کتاب "ہینڈ بک آف پورٹس آف انڈیا اینڈ سیلون" (ص۹۳) میں درج کیا ہے۔ یہ دونوں بیانات غلط ہیں۔ جیسویٹ پادری گوا میں سولھویں صدی کے اول نصف میں آئے۔ فونسیکا نے "ہسٹری آف گوا" (ص۵۹) میں لکھا ہے کہ انھوں نے گوا میں آنے کے تھوڑے دِنوں بعد یورپ سے دو پریس منگائے اور اُنھیں اپنے دو کالجوں، سینٹ پال اور ریشول میں نصب کیا۔ یہ دونوں کالج ۱۵۴۲ء میں قائم ہوئے اور روز افزوں ترقی کررہے تھے۔ اِن کالجوں کے اسٹاف میں کئی نامی گرامی ہستیاں شامل تھیں مثلاً سینٹ فرانسس زیویر۔۔۔۔۔۔ گوا میں یہ پریس ۱۵۵۶ء میں آئے، یعنی واسکوڈی گاما کے

ہندوستان آنے کے ۵۹ برس بعد جسویٹ پادری غیر معمولی طور پر سرگرم تھے۔ ترقی کے دلدادہ تھے، اور خاص طور پر کوشاں تھے کہ سائنس ولٹریچر کی کسی شاخ کو ہاتھ لگائے بغیر نہ چھوڑیں گے۔ ان حالات میں یہ کیونکر یقین کر لیا جائے کہ ان لوگوں نے دونوں پریسوں کو ۷۲ برس تک اپنے یہاں بیکار پڑا رہنے دیا۔ ۱۵۴۱ء میں گوا کے وائسرائے جان ڈی کیسٹرو کو شاہ پرتگال جان سوم نے حکم دیا تھا کہ گوا کے اُن دیہات میں جہاں مسیحی خاندان پائے جاتے ہیں، ابتدائی مدارس قائم کئے جائیں۔ اس حکم کی تعمیل ہوئی اور مسیحی بچوں کو مذہبی تعلیم کے لئے سینٹ فرانسس زیویر نے "مسیحی تعلیم کا خلاصہ" بطور سوال و جواب تیار کیا جو ۱۵۵۷ء میں طبع ہوا۔" (اورینٹل کانکویسٹ جلد اول ص۱، ہسٹری آف گوا ص۹)

اس خط کی اشاعت کے بعد ہندوستان کے اخبارات کے علاوہ غیر ملکی اخبارات بھی اس بحث میں شریک ہو گئے۔ اس سلسلے میں بشپ میڈلی کاٹ کا وہ مضمون خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے جو آپ نے رسالہ ٹبلٹ میں شائع کیا تھا۔ آپ نے ہندوستان کے اول مطبع کا صحیح زمانہ تعین کر کے اس بحث کو گویا ختم کر دیا۔

(۱) گوا ۱۵۵۶ء جیسویٹ پادریوں نے گوا میں آنے کے کچھ عرصہ بعد یورپ سے ڈیڑھ پریس منگائے اور اُن کو اپنے ڈیڑھ کالجوں میں نصب کیا۔ پریس ۱۵۵۰ء میں آئے تھے مگر معلوم ہوتا ہے کہ چند سال تک واقعی اُن سے کام نہیں لیا گیا۔ ۱۵۵۷ء میں سینٹ فرانسس زیویر نے "کاٹی کزم آف دی کرسچن ڈاکٹرن" (مسیحی تعلیمات، بطور سوال و جواب) مدون کی جو چھاپ کر شائع کی گئی۔ یہ سب سے پہلی کتاب تھی جو گوا[1] میں طبع ہوئی۔ جس کتاب سے یہ معلومات حاصل کی گئی ہیں، اُس کا بیان ہے کہ:-

"بچوں کی صحیح تعلیم کی غرض سے زیویر نے ایک کاٹی کزم تیار کی جو گوا میں ۱۵۵۷ء میں طبع ہوئی۔"

(اورینٹل کانکویسٹ مطبوعہ لسبن ۱۷۱۰ء جلد اول)

اسی کتاب میں مذکور ہے کہ کاٹی کزم کے علاوہ ایک پرائمر سے بھی کام لیا جاتا تھا جس کو فادر مارکس جارج نے تالیف اور فادر ٹامس اسٹیونس، ایک انگریز نے مقامی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ ۱۵۵۷ء کی کاٹی کزم مقامی زبان میں نہ تھی، بلکہ پرتگالی زبان میں تھی۔ گوا کے مطبع کے متعلق جو یادداشتیں موجود ہیں، نیز بعض قدیم دستاویزوں سے بھی، اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلی کتاب مالابار میں طبع ہوئی تھی۔

(۲) کوچین ۱۵۷۷ء گوا کی کاٹی کزم کی طباعت کے ۲۰ برس بعد ۱۵۷۷ء میں، یعنی کیکسٹن پریس کی سب سے پہلی کتاب کی طباعت کے کامل ایک صدی بعد جیسویٹ سوسائٹی کے ایک ہسپانوی ممبر جان گنسالوس نے

---

[1] پرتگیزی دور میں گوا ہندوستان سے الگ نہ تھا۔ بلکہ اس کا شمار بھی "ہندوستانی مقبوضات" میں تھا۔

سب سے پہلی بار ملائلم تامل زبان کے حروف کندہ کئے اور سینٹ فرانسس زیویر کی "مسیحی تعلیمات" کا ترجمہ کھرشتیہ و ناکم کے نام سے چھاپا۔ کہا جاتا ہے کہ اِس کتاب کا ایک نسخہ پیرس کے قومی کتبخانے میں اب تک موجود ہے۔

یہاں تک تو قدیم و جدید شہادتیں متفق ہیں، لیکن جب جان گنسالوس کے پریس کے مقام وقوع کو دریافت کرنے کی کوشش کیجاتی ہے تو مالابار کے دو مقام اِس اعزاز کا استحقاق جتاتے ہیں۔ روایات اگرچہ ویپی کوٹہ کے حق میں ہیں، لیکن تحریری شہادتوں سے کوچین اِس اعزاز کا مستحق ثابت ہوتا ہے۔ کوچین کے بااثر اخبار آرگس کی رائے پڑھ کر تعجب ہوتا ہے جو اُس نے اس بارے میں ظاہر کی ہے:-

"۔۔۔ یہ بات کچھ مخفی نہیں کہ سب سے پہلی کتاب کوچین میں طبع ہوئی۔ جیسوئیٹ پادری ۱۵۴۹ء میں کوچین میں آئے اور ۱۵۵۲ء میں یہاں کی عبادت گاہ باقاعدہ طور پر اُن کے حوالہ کی گئی۔ اُس زمانے میں مشنری خدمات کا مرکز گوا تھا۔ کوچین میں اُنکا کوئی اہم ادارہ نہ تھا۔۔۔" (آرگس مورخہ ۲۳ مارچ ۱۹۰۸ء)

یہ دعویٰ سراسر غلط ہے۔ کوچین کے قلعہ میں پادریوں کی قیام گاہ اور گرجہ گھر کے علاوہ سوسائٹی کا ایک کالج بھی تھا جس میں ۳۰۰ سے زائد طلباء زیرِ تعلیم تھے۔ خود سینٹ فرانسس زیویر اپنے گوا اور روم کے احباب کو کوچین کالج کے بارے میں بہت کچھ لکھتے رہتے تھے۔

ہم نے بیان کیا ہے کہ کوچین میں ملائلم تامل زبان میں کاٹی کزم طبع ہوئی تھی۔ ذرا اُن اسباب اور وجوہ پر بھی نظر ڈالنا چاہیئے جو اس کے محرک ہوئے۔ جیسوئیٹ سوسائٹی کی تاریخ میں مذکور ہے کہ سوسائٹی کے جنرل نے فادر ویلگنانی کو وزیٹر کی حیثیت سے گوا و مالابار کے صوبوں کے معائنہ کو بھیجا تھا۔ آپ ۴۴ پادریوں کے ساتھ ۱۵۷۴ء میں گوا پہونچے۔ اُس زمانے میں مغربی ساحل پر کچھ مذہبی بدمزگی پیدا ہوگئی تھی۔ فادر ویلگنانی اُن شکایات کو رفع کرنے کی غرض سے گوا سے مالابار تشریف لے گئے اور کلیسائے سینٹ ٹامس کے آرچ بشپ سے متعدد ملاقاتیں کیں۔ بالآخر یہ بات طے ہوئی کہ جیسوئیٹ سوسائٹی کے کارکن ویپی کوٹہ کی سکونت اختیار کریں اور عوام کی مذہبی تعلیم و تربیت میں آرچ بشپ اور اُن کے مددگاروں کا ہاتھ بٹائیں۔ اِن حالات میں اِس بات پر تعجب نہ ہونا چاہئے کہ انھیں سب سے پہلے کاٹی کزم کی طباعت کا خیال پیدا ہوا۔ گوا میں اِس طریقہ سے کام لیا جاچکا تھا۔ علاوہ بریں، کاٹی کزم کے ذریعہ سے مذہبی تعلیم دینا سب سے پہلا کام ہے جو تمام مسیحی فرقوں میں اختیار کیا جاتا ہے۔

فادر فرانسس ڈی سوزا لکھتے ہیں:-

"ہم نے مالاباری زبان میں کاٹی کزم کی طباعت کے کام کو ہاتھ لگایا۔ برادر جان گنسالوس نے چھپائی کے لئے چوبی ٹھپّے (بلاک) تیار کئے۔ یہ سب سے پہلی کتاب تھی جو ہندوستان میں چھپی، اور چونکہ ملیالم

بالکل نئی چیز تھی، علاقہ کے لوگوں نے بھی اُس کی خاطر خواہ قدر کی۔"

یہی رائے ویرا پولی کے مذہبی حلقہ کے رومن کیتھولک پادریوں کی ہے، جنھوں نے ۱۸۶۲ء میں کیرالا میں مسیحی مذہب کی تاریخ شائع کی ہے۔ اس "تاریخ" کے مصنف بشپ مارسیلی نس نے قدیم یادداشتوں نیز سولھویں اور سترھویں صدی کے مصنفین سے بہت استفادہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"... سینٹ پال کالج کے منتظمین نے قلعہ کوچین میں ۱۵۷۷ء میں ملائلم زبان میں ایک کاٹی کزم چھاپی، جس کے لئے جان گنسالوس نامی ایک جیسویٹ برادر نے ٹھپے بنائے تھے۔"

مسٹر جی میکنزی اپنی کتاب "ٹراونکور میں مسیحیت" میں وپی کوٹہ کے پریس کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"ہندوستان میں یہ پہلا مطبع نہ تھا۔ ۱۵۷۷ء میں ایک ہسپانوی، جان گنسالوس نے کوچین میں سب سے پہلی مرتبہ ملائلم تامل زبان کے حروف تیار کرکے ایک کاٹی کزم چھاپی تھی۔"

"اورینٹل کانکویسٹ" کے بیان کے علاوہ جو دیگر آرا ہم نے پیش کی ہیں اگرچہ نسبتاً زمانہ حال کی ہیں لیکن بیشتر قدیم یادداشتوں پر مبنی ہیں۔ ذیل میں دو اور شہادتیں ملاحظہ ہوں[1]:۔

(۱) "سب سے پہلی کتاب جو ٹائپ سے طبع ہوئی، جان گنسالوس کی طبع کردہ "مسیحی تعلیمات" ہے۔ ہمارے علم میں جان گنسالوس پہلا شخص ہے جس نے اول بار تامل حروف کندہ کئے۔"

(۲) "۱۵۷۷ء میں کوچین میں جان گنسالوس نے پہلی مرتبہ مالاباری تامل حروف لکڑی پر کندہ کئے جن کے ذریعہ سے "مسیحی مذہب کی ابتدائی تعلیم" ہندوستان میں اول کتاب کی حیثیت سے طبع ہوئی۔"

جان گنسالوس کا پریس کوچین کے پرتگالی قلعہ میں نصب تھا۔ ۱۷۵۰ء میں بھی ایک پریس قلعہ کوچین میں تھا۔ مگر ۱۵۷۷ء والے پریس کو اُس سے کچھ واسطہ نہیں۔ کوچین پر جب چھ ماہ کے محاصرہ کے بعد ڈچ قبضہ ہوا (۶ر جنوری ۱۶۶۳ء) تو اُنھوں نے کوچین کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ جیسویٹ پادریوں کو بہت زیادہ نقصان اُٹھانا پڑا۔ اُن کو خارج البلد کیا گیا۔ اُن کے متعدد راہب خانوں، شاندار کالج، دو شفاخانوں، بشپ کی قیامگاہ اور تیرہ گرجوں کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ اکتوبر ۱۷۹۵ء میں کوچین پر انگریزوں کا تسلط ہوا۔ رہی سہی کسر ۱۸۰۶ء میں اُنھوں نے پوری کردی، یعنی پرتگالی دور کے تمام آثار کو بارود سے اُڑا دیا۔ بہت سی پبلک عمارات اور ایک عظیم الشان کتھیڈرل جو ڈچ لوگوں کی دستبرد سے بچ رہے تھے، اس بار وہ بھی مٹ گئے۔

(۳) پنی کیل ۱۵۷۸ء: ۱۵۷۸ء میں ایک مطبع موضع پُنی کیل (ضلع تنادلی) میں قائم ہوا۔ یہ موضع کیپ کامرن سے بیس میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ اور اُس زمانے میں موتیوں کی پیداوار و تجارت کا خاص مرکز تھا۔ یہ مطبع

[1] ہر دو شہادتوں کا ماخذ لاطینی زبان کی دو کتابیں ہیں جو ۱۷۹۶ء و ۱۷۹۴ء میں روم میں طبع ہوئیں۔

فادر جان ڈی فیر یا نے قائم کیا تھا۔ اُس زمانے میں کورومنڈل کے ساحل کی زبان تامل تھی۔ پادری صاحب مذکور نے تامل زبان کے حروف خود کاٹے اور پھر اُن کو ڈھال کر مذہبی تعلیم کے لئے کئی چھوٹی چھوٹی کتابیں چھاپ کر شائع کیں۔ مزید برآں انھوں نے تامل زبان کا قاعدہ اور اسی قسم کی دو ایک کتابیں اور بھی چھاپیں تاکہ اس علاقہ میں کام کرنیوالے مشنری وہاں کی زبان لکھنا پڑھنا سیکھ سکیں۔ مطبوعہ کتابیں اُس زمانے میں ایک اعجوبہ تھیں۔ مسیحیوں کے علاوہ غیر مسیحی بھی مانگ مانگ کر انھیں بڑے اشتیاق سے پڑھتے تھے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ پنی کیل کے مطبع میں جو ٹائپ استعمال ہوتا تھا، اُس کا ایک ایک حرف جمایا جاتا تھا۔ کوچین کے مطبع کی طرح سالم صفحہ کا ٹھپہ تیار نہیں کیا جاتا تھا۔

(۴) وِپی کوٹہ ۱۶۰۲ء سینٹ ٹامس کلیسا سے معاہدہ ہونے کے کچھ عرصہ بعد ۱۵۷۹ء میں جیسوئیٹ پادریوں نے وِپی کوٹہ (چینا منگلم) کو اپنا مستقر بنایا۔ یہ مقام کرنگانور سے جانبِ جنوب ایک میل کے فاصلہ پر تھا۔ ۱۵۸۱ء میں یہاں انھوں نے ایک عبادت گاہ بنائی اور ۱۵۸۳ء میں مدرسۂ الہیات قائم کیا، اور ۱۵۸۷ء میں ایک کالج قائم کیا۔ اُسی زمانے میں انھوں نے پاپائے روم سے استدعا کی کہ باشندگانِ مالابار کی مذہبی تعلیم کے لئے مخصوص کتب ارسال کی جائیں۔ پاپائے روم (کلیمنٹ ہشتم) نے کتابیں تو ارسال نہ کیں بلکہ ایک پریس اور کلدانی زبان کا ٹائپ بھیج دیا۔ یہ پریس ۱۶۰۲ء میں آیا، اور فادر البرٹ لارشی نے اس کو وِپی کوٹہ میں قائم کیا۔ مطبع قائم ہونے کے بعد پے در پے کئی کتابیں طبع ہوئیں۔ یہ سب کتابیں مذہب کی ابتدائی تعلیم کے متعلق تھیں، اور کلدانی زبان میں چھاپی گئی تھیں۔

(۵) امبلاکاڑ ۱۶۷۹ء ایک اور مطبع ۱۶۷۹ء میں موضع امبلاکاڑ میں قائم ہوا۔ یہ موضع ترچور سے بیس میل جانبِ جنوب واقع تھا۔ امبلاکاڑ سترھویں صدی میں جیسوئیٹ پادریوں کی مصروفیات کا مرکزی مقام تھا۔ ۱۶۶۳ء میں اس جگہ ایک مدرسۂ الہیات بھی قائم ہوا تھا۔ جو سینٹ پال سیمنری کے نام سے مشہور تھا۔ اس گاؤں کا ایک حصہ وہاں کی زبان میں اب تک ایک ایسے نام (SAO PAULO UR.) سے مشہور ہے۔ جسکا ترجمہ ہے "سینٹ پال کا گاؤں"۔

ترچور کے مسیحیوں سے روایت ہے کہ امبلاکاڑ میں ایک مطبع ۱۵۵۵ء میں قائم ہوا تھا۔ لیکن کسی تحریری شہادت کی عدم موجودگی میں اس کو وثوق کے ساتھ پیش نہیں کیا جاسکتا۔ امبلاکاڑ کے مطبع سے سب سے پہلے تامل و پرتگیزی ڈکشنری (مولفہ فادر انتونی پر وئینزا متعلقہ مدورا مشن) ۱۶۷۹ء میں طبع ہوئی۔ اس ڈکشنری کے لئے ایک مالاباری مسیحی نے تامل زبان کے الفاظ کے ٹھپے تیار کئے تھے۔[۱]

---

[۱] بشپ میڈلی کاٹ کے آرٹیکل سے مترشح ہوتا ہے کہ جان گنسالوس کے مطبع میں بھی ایک ڈکشنری (باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

ڈکشنری کی طباعت واشاعت کے بعد اسلاکارڈ کے مطبع سے اور بہت سی کتابیں چھپ کر شائع ہوئیں، بلکہ کہنا چاہیئے کہ گوچین اور وپی کوٹہ کے مطابع کے مقابلہ میں یہاں کے مطبع نے نمایاں ترقی کی تھی۔ تامل حروف کے لئے چوبی ٹھپّے استعمال کئے جاتے تھے اور یوروپین زبانوں کے الفاظ کے لئے سیسے کے حروف جو عام طور پر مروج ہیں۔ لیکن کچھ عرصہ بعد تامل زبان کے حروف بھی ڈھال لئے گئے تھے۔ چنانچہ سنہ ۱۸۰۰ء کے بعد متعدد تامل کتابیں سیسے کے حروف سے چھاپی گئی ہیں۔

جن مطابع کا ہم نے ذکر کیا ہے، اُن کا کسی سائیکلوپیڈیا میں ذکر نہیں ہے۔ چنانچہ سائیکلوپیڈیا آف انڈیا نے ہندوستان میں چھاپہ خانوں کا آغاز اٹھارھویں صدی کے شروع میں بتایا ہے۔ ہم نے صرف سولھویں اور سترھویں صدی کے مطابع کا ذکر کیا ہے، اور ہمارے خیال میں وہی زمانہ ہندوستان میں چھاپہ خانوں کا پہلا دور تھا۔ اُس کے بعد اٹھارھویں صدی میں مطابع کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ پہلے دور میں چھاپہ خانوں کی پیدائش ہوئی اور دوسرے دور میں اُن کی نشو ونما۔

اٹھارھویں صدی میں اِس کام میں پراٹسٹنٹ مشنریوں نے نمایاں ترقی کی تھی۔ منجملہ ان کے ڈاکٹر ولیم کیری کا نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے، جنھوں نے ہندوستان کی دس بارہ زبانوں مثلاً بنگالی، ہندوستانی (ناگری)، سنسکرت، تلیگو، پشتو، برمی، تامل، سنگالی، ملائی وغیرہ میں انجیل مقدس کا ترجمہ چھاپ کر شائع کیا تھا۔ حتیٰ کہ چینی زبان میں بھی انجیل مقدس شائع کی، جس کی طباعت کیلئے سیسے کے حروف تیار کئے گئے تھے، حالانکہ خود چین میں چوبی حروف یا ٹھپّے استعمال ہوتے تھے۔ ڈاکٹر کیری کے مطبع (واقع سیرامپور نزد کلکتہ) کی مصروفیات و ترقی کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ اُنھوں نے اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ٹائپ فاونڈری اور کاغذ سازی کا کارخانہ قائم کیا تھا۔ وہاں کا کاغذ آج تک "سیرامپوری" کے نام سے مشہور ہے۔ ٹائپ کا کارخانہ سنہ ۱۸۶۰ء تک اور کاغذ سازی کا سنہ ۱۸۶۵ء تک قائم وجاری رہا۔

ڈاکٹر ولیم کیری کی گرانبہا خدمات کا تذکرہ کسی آئندہ موقع پر ہدیۂ ناظرین کریں گے۔



(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۹) طبع ہوئی تھی۔ جسمیں ملائم زبان کے الفاظ کیلئے چوبی ٹھپّے اور یوروپین زبان کے الفاظ کے لئے سیسے کے حروف استعمال کئے گئے تھے۔ اِس لحاظ سے پنی کیل کے مطبع کو کامیاب اور ترقی یافتہ مطبع کہنا بیجا نہیں جسمیں دیسی زبان کے لئے بھی ٹھپّے نہیں بلکہ حروف استعمال کئے جاتے تھے۔

آزادی کیلئے ہندوئنکی آخری جدوجہد

از مسٹر تارا شنکر ناشاد ایم - اے - ایل - ٹی

ہندوستان کی تاریخ مین ہندوؤن کے عروج کا خاتمہ عموماً پرتھوی راج اور جے چند کی خانہ جنگیون کے روح فرسا واقعات کے تذکرہ کے بعد ہی کر دیا جاتا ہی۔ اسمین شک نہین کہ ہندو اقتدار کو جو دھکا تھا نیسر کی لڑائیون مین لگا اس سے ہندو قوم کے پیر جمنے مشکل ہوگئے۔ مگر اسے ہندوؤن کا دائمی زوال تصوّر کرنا تاریخی نقطۂ نظر سے درست نہ ہوگا۔ کیونکہ مغلون کے زوال کے بعد اٹھارھوین صدی مین ایکمرتبہ پھر ہندو اقبال کا ستارہ اس زور کے ساتھ درخشان ہوا کہ باید و شاید۔ اگر قسمت نے ساتھ دیا ہوتا اور راجپوتون اور سکھون نے ذرا بھی فراخدلی سے کام لیا ہوتا تو آج دنیا ہی کچھ اور ہوتی۔ پھر بھی سمجھنے والون پر یہ حقیقت پوشیدہ نہین ہی کہ انگریزون نے ہندوستان دراصل مغلون سے نہین بلکہ ہندوؤن سے پایا۔ آج کے مضمون مین ہم دیکھین گے کہ مرہٹے کس حد تک اپنا دبدبہ پورے ہندوستان مین جما چکے تھے اور پھر اُسے کس طرح کھو بیٹھے۔

ہندوؤن کی مدتون کی خوابیدہ قوم کو ایک آواز سے جگانے والے چھترپتی شیواجی مہاراج تھے۔ مرہٹون کے لئے واقعہ کے لحاظ سے یہ کسی قدر خوش نصیبی کی بات تھی کہ اورنگ زیب نے شیواجی کی وہ عزت نہ کی جسکے وہ اہل تھے۔ کیونکہ شیواجی بھی جے سنگھ کی کرتوتون سے راجپوتون کی طرح مغل بادشاہ کے حلقہ بگوشون مین قریب قریب شامل ہو چکے تھے۔ یہ دُرِ شاہوار بھی شہنشاہی ہار مین منسلک ہوتے ہوتے رہ گیا۔ مشیت ایزدی کچھ اور تھی۔ پہاڑی چوہا" جو مٹھائی کے ٹوکرے مین بیٹھ کر نکلا تو پھر مغلون کے دام حرص و آز مین گرفتار نہ ہوسکا۔ اورنگ زیب نے خود اقبال کیا ہی کہ" میری لاتعداد فوج اُنیس (۱۹) سال تک متواتر بہادر سردار شیواجی اور اسکے راج کے پیچھے پریشان رہی مگر اس کا راج ہمیشہ بڑھتا ہی رہا"

حقیقت یہ ہی کہ شاہی فوجین نہ صرف پریشان ہی رہین بلکہ شیواجی کے پیچھے تباہ و برباد بھی ہوگئین۔ اورنگ زیب کا خیال تھا کہ جب دکن کی شیعہ سلطنتین مٹ جائینگی تو مرہٹون کو مدد دینے والے نہ رہین گے۔ ایسی صورت مین اُن سے کیفے نپٹ لیا جائیگا۔ مگر مرہٹون کی حکمت عملی نے اورنگ زیب کو دکن کی لڑائیون مین اتنی کثیر مدت تک پھنسائے رکھا کہ نہ صرف مغل فوج عاجز اور تباہ ہوگئی بلکہ بادشاہ بھی اپنے سلطنت اور عزیز جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

شیواجی کے جیتے جی تو اورنگ زیب کی دال نہ گلی مگر ان کے سدھارتے ہی تھوڑے ہی عرصہ مین شیواجی کے لڑکے سنبھاجی کو اُسی کے جنرل کے ہاتھون گرفتار کرا کے پکڑ منگوایا۔ اور طرح طرح کی اذیتین دیکر ۱۶۸۹ء مین مروا ڈالا۔ اسکے لڑکے ساہو کی تعلیم و تربیت شاہی حرم میں ہوئی۔ سنبھاجی کا بھائی کسی طرح مغل پنجے سے بھاگ نکلا تھا اس نے جنجی مین اپنا راج قایم کیا۔ ۱۷۰۰ء مین وہ بھی لقمۂ نہنگ اجل ہوا۔ اسکی ہوشیار بیوی تارا بائی نے راج کا کام سنبھالا اورنگ زیب کی وفات پر ۱۷۰۷ء مین ساہو چھوڑ دیا گیا۔ دکن پہونچکر اس نے اپنے راج کیلئے تارا بائی سے جھگڑا شروع کیا۔ آخر یون طے پایا کہ تارا بائی کولہاپور مین راج کرے اور ساہو یا شیواجی دوم کو پونا کا راج دیا جائے۔ مرہٹون کی اس منحوس خانہ جنگی کا خاتمہ کرانے والا مہاراشٹر براہمن بالاجی وشوناتھ تھا جو پونا دربار مین شروع شروع مین بحیثیت کارکن ملازم ہوا تھا۔ کلائیو کی طرح قلم کا استعمال اُسے بھی زیادہ راس نہ آیا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ مین وہ تمام مرہٹہ فوج کا سنیاپتی یا سپہ سالار ہو گیا۔ بالاجی وشوناتھ جس طرح ایک بہادر اور لایق جنرل تھا اُسی طرح امور سلطنت مین بھی کافی دسترس رکھتا تھا۔ اُس نے جلد ہی پونا کو دلّی سے آزاد کرا کر ساہو کو دکن کے چھ صوبون سے چوتھ اور سردیش مکھی وصول کرنے کا حق دلایا۔ اور پونا کا راج استوار کر دیا۔ زندگی نے زیادہ وفا نہ کی اور ۱۷۲۰ء مین چل بسا۔ پھر بھی اس تھوڑے سے عرصہ مین بہت کچھ کر گیا مغل حرم مین نازون کا پالا ساہو کب کسی کام کا نکل سکتا تھا۔ فقط نام کو راجہ تھا۔ راج کا اصلی کرتا دھرتا سنیاپتی اور وزیر اعظم تھا۔ جو پیشوا کے نام سے ملقب تھا۔

بالاجی وشوناتھ کے بعد اس کا لڑکا باجی راؤ پیشوا ہوا۔ مرہٹہ تاریخ کی اِس جلیل القدر ہستی کو اگرچہ ہندستانی تاریخ مین ابھی وہ منتخب جگہ نہ ملسکی ہے جس کا وہ حقدار ہے لیکن اُمید ہے آگے چلکر اسکی عظمت کا صحیح اندازہ ہندوستانی مورخ کرے۔ صورت شکل مین اگرچہ وہ بہت شاندار اور رعب والا انسان نہین معلوم ہوتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اورنگ زیب کے بعد اگر کوئی شخص تھا جس کا نام سُنکر دہلی سے پونا تک کے لوگ سہم جاتے تھے تو وہ دوسرا پیشوا باجی راؤ تھا۔

یہان اختصار مدّنظر ہے اسلئے مرہٹہ سردار کے اُن عجیب و غریب کارنامون کے تفصیلی بیان کا موقع نہین تاہم یہان پر اس کا مختصر ذکر بے موقع نہ ہوگا۔

سلطنت مغلیہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ اورنگ زیب کے مرتے ہی مغل سپاہ اور جنرلون نے اطمینان کا سانس لیا اس کے دس بارہ سال بعد۔ یعنی ۱۷۲۰ء تک مغلون کی رہی سہی طاقت بھی جاتی رہی۔

چارون طرف لوٹ مار مچی ہوئی تھی۔ نوابی کا بازار اصلی معنون مین گرم تھا۔ بنگال و بہار مین علی وردی خان کا طوطی بول رہا تھا۔ اودھ اور دیگر پوربی اضلاع نواب صفدر جنگ کے تصرف مین تھے۔ مالوہ۔ گجرات

احمد نگر وغیرہ سبھی آزاد ہو چکے تھے۔ پنجاب افغان سردار احمد شاہ ابدالی کے زیر اثر تھا۔ ایسی حالت میں باجی راؤ کو ہندوستان میں ہندو راج قایم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس نے ۱۷۲۳ء میں اجین لے لیا اسی سال گجرات کو بھی اپنا باجگذار بنایا۔ آمبر نریش سوائی جے سنگھ اور بندیلا چیف راجہ چھتر سال سے ۱۷۲۵ء میں صلح مصالحت کر کے انہیں اپنی طرف ملایا جب نظام الملک کو مغل بادشاہ نے باجی راؤ کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کے لئے دکن بھیجا۔ تو اس نے پونا راج کے قدیم دشمن کولہاپور کے مرہٹہ راجہ اور اس کے بااثر وزیر تربنک راؤ کو اپنی طرف ملانے کی کوشش کی۔ باجی راؤ اس کا مطلب فوراً سمجھ گیا اس نے تربنک راؤ کو ۱۷۳۱ء میں میدان جنگ میں تہ تیغ کر کے کولہاپور پر ایسا رعب جمایا کہ اس کے بھتیجے جی بھر کو لہاپور کو مخالفت کی ہمت نہ پڑی۔ نظام الملک سے بھی عارضی طور پر صلح ہو گئی اس نے بھی باجی راؤ کو شمال کی طرف مطلق العنان چھوڑ دینے کا وعدہ کیا اور خود دکن میں آزادی کا خواہشمند ہوا باجی راؤ نے ۱۷۳۶ء میں مالوہ اور بندیل کھنڈ کو دوبارہ سر کیا اور دہلی کی طرف بے پناہ طوفان کی طرح بڑھا۔ دہلی کے مغل بادشاہ سے یہ نہ دیکھا گیا۔ اس نے فوراً نظام اور چند راجپوت سرداروں کو اکٹھا کر کے ۱۷۳۷ء میں بھوپال کے مقام پر باجی راؤ سے مقابلہ کیا جس میں ہمیشہ کی طرح باجی راؤ کی پھر فتح ہوئی بادشاہ کو مجبوراً چنبل ندی تک تمام ملک باجی راؤ کے حوالے کرنا پڑا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ نادر شاہ اپنی فوج ظفر موج کے ساتھ دلی کی طرف لپکا آرہا تھا۔ باجی راؤ نے اس سے مقابلہ کرنے کی دل میں ٹھانی اور وہ اسی تیاری میں مشغول تھا۔ کہ ۱۷۴۰ء میں اس کا چراغ زندگی یکایک بجھ گیا۔ ورنہ آج ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

باجی راؤ کے بعد اس کا لڑکا بالاجی باجی راؤ۔ تیسرا پیشوا اگرچہ بہادر جنرل اور ہوشیار مدبر تھا۔ پھر بھی اسمیں اپنے باپ کی قابلیت نہ تھی۔ نہ اسمیں وہ اونچے ارادے ہی تھے۔ اس نے ہندوستان میں ہندو راج قایم کرنے کا خیال یک نہ ہونے والی بات سمجھکر دل سے نکال دیا۔ اور صرف دکن میں اپنا اقتدار جمائے رکھنا اپنا فرض اولین سمجھا۔ ۱۷۴۹ء میں جب ساہو فوت ہو گیا تو بالاجی باجی راؤ پونا کا مالک بن بیٹھا سب سے پہلے اس نے راگھوجی بھونسلا کو زیر کیا۔ جب اُس نے بنگال کے نواب پر چڑھائی کی تو باجی راؤ دوم نے اُسے ایسا کرنے سے روکا اور نواب کی حمایت کی۔ اس طرح اس نے باجی راؤ کی ہندوؤں کو متحد کرنے کی پالیسی کے خلاف عملی ثبوت دیا۔ اس کے افسروں نے راجپوتوں سے چوتھ وصول کیا اور انہیں طرح طرح کی اذیتیں دیں۔ اس طرح آپس کی رقابت اور راجپوتوں کی نفرت کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہاتھ میں آیا ہوا موقع نکل گیا۔ بالاجی باجی راؤ نے اپنی طاقت کا مناسب استعمال نہ کیا۔ اس وقت اس کے مقابلہ کی تاب کسی بھی مسلمان طاقت میں نہ تھی۔ اس کے بھائی رگھناتھ راؤ عرف رگھوبا نے ۱۷۵۶ء میں پنجاب

پر اپنا تسلط جما لیا۔ اور ۱۷۵۷ء میں جب کہ پلاسی کے میدان مین کلایو برطانوی سلطنت کی بنیاد رکھ رہا تھا۔ مرہٹے دکھن مین لوٹ مار مین مشغول تھے۔ انھون نے میسور اور کرناٹک سے کئی لاکھ روپیہ لئے۔ انہون نے کلایو اور ویٹسن کی مدد انگیز اسکے بحری ڈاکوؤن کے سر کرنے مین کی ۱۷۵۸ء مین رگھنا تھ راؤ نے دوبارہ پنجاب کو احمد شاہ ابدالی کے گورنر سے چھینا۔ اس پر احمد شاہ ناراض ہو کر ۱۷۵۹ء مین ہندوستان پر چڑھ آیا۔ اس نے پنجاب کو دوبارہ اپنے تسلط میں کرکے دہلی کی طرف کوچ کیا۔ نواب اودھ اور روہیلون سے سازش کی۔ ہلکر اور سندھیا جنھون نے روہیلون کی سرکوبی مین نواب صفدر جنگ کی مدد کی تھی احمد شاہ کے مقابلے کی تاب نہ لاسکے بن ۱۷۶۰ء مین بالاجی باجی راؤ نے نظام علی سے بیجاپور کا راج چھین لیا تھا۔ یہ اس کا آخری اور زبردست معرکہ تھا۔ طاقت کے زعم مین دو لاکھ سپاہ کے ساتھ احمد شاہ ابدالی کو سزا دینے کے لئے آگے بڑھا۔ دسواس راؤ پیشوا کا بھتیجا اس بڑی فوج کا سپہ سالار تھا۔ سداشیو بھاؤ۔ فاتح بیجاپور مشہور توپچی ابراہیم گاردی اپنے ۵۰ توپون کے ساتھ دہلی کی طرف روانہ ہوئے۔ بھرت پور کا مشہور سردار سورج مل اپنے ۲۰ ہزار بہادر جاٹوں کو لیکر مرہٹون کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہوا۔

۶ جنوری ۱۷۶۱ء کو پانی پت کے میدان مین مرہٹون کے ستر ہزار سوار ایک لاکھ ۵۰ ہزار پیدل جوان (جسمین نو ہزار ہندوستان کے منتخب سپاہی تھے) مورچہ پر آ ڈٹے۔ اُس طرف ترپن ہزار افغان سوار اور چالیس ہزار مغل جوان احمد شاہ کی زیر کمان مسلمانون کا کھویا ہوا اقتدار واپس لینے پر تلے تھے۔ روہیلون کا مشہور سردار نجیب خان بھی اُن کے ساتھ تھا۔ دو ماہ تک دونوں طرف کی فوجین خاموشی کے ساتھ مورچہ ڈالے پڑی رہین۔ احمد شاہ ایک دم چپ سادھے پڑا رہا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مرہٹہ بھیڑیے افغانون سے زیادہ تکلیف مین تھے انہیں رسد کا سامان بہت دور سے منگانا پڑتا تھا" اودھ کا نواب مرہٹون سے صلح کی بات چیت کے لئے سلسلہ جنبانی کر رہا تھا۔ آخر بھاؤ نے اعلان کیا "کہ اب پیالہ لبریز ہے اور اس مین ایک بوند کی بھی گنجائش نہین۔ صلح مصالحت کی بات چیت بالکل فضول ہے۔ فیصلہ تلوار کے ہاتھ ہے"۔ بس پھر کیا تھا۔ ہندو بھوکے بازون کی طرح ٹوٹ پڑے روہیلون کے پیر اکھڑ گئے جاٹوں نے انہیں روند ڈالا۔ نواب وزیر کو بھی دو فرلانگ پیچھے ہٹنا پڑا۔ مسلمان سپاہیون مین بھگدڑ مچ گئی۔ تھوڑی دیر کے لئے ایسا معلوم ہوا کہ ہندوؤن کی جیت ہو گئی۔ شیو شیو۔ ہر ہر کی آواز سے آسمان گونج اٹھا۔ احمد شاہ دس ہزار بہادر جوان کو لئے اپنے سرخ خیمہ سے لڑائی کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ مرہٹے اپنے کامیاب طریقہ "گرمیلا" کو کام مین نہ لاکر ایکدم حملہ کر بیٹھے ہین۔ وہ بھی سب کے سب ایک ساتھ۔ بس موقع کو غنیمت سمجھ کر جب کافی دیر تک مار کاٹ ہو چکی اپنی تازہ سپاہ کو لیکر آگے بڑھا۔ بھاگنے والے مسلمانون کو

روکنے کی کوشش کی جنھوں نے اس کے روکنے پر نہ مانا انہیں وہیں سپرد تیغ کیا۔ بیچ میدان میں اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں کے ساتھ احمد شاہ نے نواب وزیر کی حوصلہ افزائی کی۔ اور دم کی دم میں پانسہ پلٹ گیا۔ ہندوں کی تقدیر کا فیصلہ ہوگیا۔ بھاؤ میدان جنگ میں کام آیا۔ اس کے گرتے ہی ہلکر اور سندھیا بھاگ کھڑے ہوئے۔ سورج مل نیچے کھچے جاٹوں کو لیکر چلتا ہوا۔ ان کے بھاگتے ہی مرہٹہ فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ وسواس راؤ آخر تک لڑتا رہا۔ مگر اکیلے کر ہی کیا سکتا تھا۔ بہادروں کی موت مرا۔ سکھ اور راجپوت اپنی بربادی کا تماشا دیکھتے رہے۔ ؎

آشیانہ کو مرے صیاد نے جب آگ دی — آہ کس حسرت سے ہم بیٹھے دھواں دیکھا کئے

اس طرح ہندوں کو آپس کے نفاق نے کہیں کا نہ رکھا۔ پیشوا نے جب لڑائی کا حال سنا تو مارے رنج کے اس کے پران ہی نکل گئے۔

آئینۂ حیرت

از مسٹر عبد المجید حیرت

آج یہ سوچنے بیٹھا ہوں کہ کل کیا ہوگا — اِس سے بڑھکر بھی کسی سر میں خلل کیا ہوگا

آج کچھ ہے تو سہی حال کسی کا بہتر — یہ خدا ہی کو ہے معلوم کہ کل کیا ہوگا

کام کی بات ہے، کہنے کو تو کہدوں لیکن — فکر ہی جب نہیں کوئی تو عمل کیا ہوگا

ایک دن اُس کی محبت میں فنا ہو جانا — اور اِس عقدۂ دشوار کا حل کیا ہوگا

دل نے صدمہ وہ اُٹھایا ہے کسی کے ہاتھوں — جس کے آگے کوئی پیغام اجل کیا ہوگا

یہ غم و رنج ہی قسمت میں اگر لکھا ہے — اِس میں تدبیر سے بھی ردّ و بدل کیا ہوگا

جس میں اک سوز بھی ہو، ساز بھی ہو، اے حیرت
اُس سے بڑھ کر کوئی اندازِ غزل کیا ہوگا

جگنو کو دیکھکر

محمد اجمل خاں صاحب بی۔اے (علیگ) نجیب آبادی

اے کہ تیرے دم سے ہے نائے چمن سیمیں خرام　　تو ریاضِ طور کا ننھا سا ہے ماہِ تمام
پھر رہا ہے یوں ہوا کے دوش پر کیوں ہانپتا؟　　نور کی موجوں میں بل کھاتا لرزتا کانپتا
ٹہنیوں کی آڑ لیکر منہ چھپاتا۔ جھانکتا　　پتیوں پر نور برساتا۔ فضا کو ناپتا
چھیڑ کرتا رِ نظر آنکھوں سے گم جاتا ہوا　　پھر فریبِ نور کے انداز دکھلاتا ہوا
وسعتِ تاریکیٔ شب میں کبھی کھویا ہوا　　گہ ضیائے روز کی آغوش میں سویا ہوا

بجلیاں چمکا رہا ہے تو فضا کے اوج پر
قمقمہ لرزاں ہے کوئی یا ہوا کی موج پر
کوکبِ پرّاں ہے کوئی یا شرارِ آرزو
یا فضا میں رقص فرما ہے رُوانِ رنگ و بو

دیکھنے میں ایک کیڑا ہے، مگر روشن ضمیر　　اور اب تک حضرتِ انساں تفکر کا اسیر
تیری قسمت ہے سراپا لذتِ غیب و حضور　　میری قسمت میں اندھیرا ہی قرینے کا نہ نور
میں بھی تیری طرح خاکی ہوں سُن اے جلوہ فروش!　　مجھکو بھی بتلا تری فطرت ہے کیوں جلوہ سروش

آرزوئے نور میں کھویا چلا جاتا ہوں میں
جانے کس عالم سے گذرا ہوں کہاں جاتا ہوں میں

مغل[1] باغات

(از خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی)

بہارِ باغِ دنیا چند روزہ بہار ہے، دم زدن میں کھلی اور چشم زدن میں مرجھا کر رہ گئی، ابھی ابھی چمن غنچہ بنا ہوا تھا، کلی کلی من میں پھول رہی تھی، پھول کھل کھلا رہے تھے۔ غنچہ کا تبسمِ زیرلب زمانہ کو تہ و بالا کر رہا تھا، قیامت ڈھا رہا تھا، عروسِ چمن بہاروں پر تھی، گلِ نودمیدہ اُبھاروں پر تھا، دم کے دم میں نقشہ بدل گیا، کایا پلٹ گئی۔ ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی بہار نہ تھی۔ بادِ سرما کے ہاتھوں گرم بازاریٔ شاہدِ گل سرد تھی۔ گل فروش تہیدست، دامانِ باغباں بھی خالی نظر آیا، صحنِ چمن اُجڑ چکا تھا، مرغانِ چمن کہاں، وہ شاخ بھی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا۔

یہ ہے رنگِ عالمِ فانی اور یہ ہے اس باغ کی کل کائنات۔

تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں۔ مغل باغات کے مصنف مرکھپ گئے، خاک کو باغ بنانے والے دماغ اب خود تہِ خاک ہیں۔ وہ گل کھلانے والی طبیعتیں مرجھا گئیں، آثار اور افسانے رہ گئے ہیں اگر مصنف کی خو بُو سے واقفیت ہو جائے تو تصنیف کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔ گل و گلزار کا حال سننے سے پہلے گلزار نشینوں کا ذکر ہو جائے تو کیا بُرا ہے۔

خانہ بدوش شہسوار، ناوک فگن تیر انداز، تلوار کے دھنی، تیغ بدست، سر بکف، گھر بار تج نکل کھڑے ہوئے۔ منغلائے سویاہ (مقابلِ آفتاب) کو چھوڑ ایران کا رُخ کیا، کچھ عرصہ تو حبِ وطن نے نہ چھوڑا کہ کہیں بستے لوٹ مار کی، اور اپنوں میں آملے پھر وہی سنگلاخ پہاڑ اور وہی جفاکشی۔ برفانی جاڑے جھلسا دینے والی گرمیاں، کچھ روز تو یہ رنگ رہا، رفتہ رفتہ سرسبز وادیوں اور میدانوں نے اپنا رنگ جمایا اور یہ مغلستان کے باشندے، ایران اور ترکستان میں بسنے لگے، قدرت کے یہ الّڑھ فرزند مشاطۂ ایران کے دلدادہ ہو گئے۔ یہ سرزمین چمنستان تھی، نباتات کی دولت سے مالامال، آبِ رواں اور لبِ جو قدم قدم پر۔ مغلوں کی رنگین طبیعتیں اس ہرے بھرے خطہ کو دیکھکر رنگ لائیں، برسوں کے رُکے ہوئے جوش دل کھول کر نکالے۔ آبِ رواں کے کنارے

---

[1] یہ تقریر براڈکاسٹنگ اسٹیشن دہلی سے شائع ہو چکی ہے، جسے اسٹیشن مذکور کے ڈائرکٹر صاحب کی اجازت سے شائع کیا جاتا ہے (اڈیٹر)

دل بھر کر دل کی پیاس بجھائی۔ دامانِ نگاہ پھولوں سے بھرلیا۔ خدامعلوم کیا کیا گل کھلائے ہوں گے اور کیسے کیسے باغ بنائے ہونگے۔

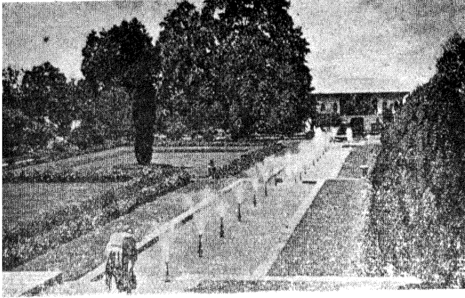
لبِ جوئبار اور کنارِ آب کے دلدادہ، ہریاول کے متوالے، مرکر بھی گلوں ہی میں رہتے تھے۔ کابل میں بابر کا بنایا ہوا باغ ہے اور مرنے والا بعد مرگ بھی وہیں موجود۔ شاہانِ مغلیہ کا چراغ گل ہوگیا، وہ چمن اُڑ گیا، آندھیاں آتے آتے، پراب بھی ہندوستان میں مختلف مقامات پر ان کی یادگار باغات موجود ہیں۔ جہاں کہیں بھی کسی باغ کا نام "شاہ لمار" سنیئے سمجھ لیجئے کہ یہ کسی نہ کسی مغل بادشاہ کا بنایا ہوا ہے۔ "لمار" ان کی زبان میں باغ کو کہتے تھے، "شاہ لمار" وہ باغ ہوا جو بادشاہ نے بنوایا ہو۔

عیش و نشاط کے دلدادہ جہانگیر نے سرزمین کشمیر میں شاہ لمار تیار کرایا۔ نورجہاں اس کی شریکِ زندگی نے پہلو بہ پہلو نشاط کی طرح ڈالی، مغل باغات میں سب سے مشہور یہی دو باغ ہیں لاہور میں بھی ایک شاہ لمار ہے اور اچھا خاصا ہے۔ دہلی میں بھی ایک ہے پر قابل ذکر نہیں۔ تواریخ میں دہلی کے قریب ایک باغ کا ذکر ہے جس میں اورنگ زیب کی تاجپوشی ہوئی ہے۔ عالمگیر مصلحتاً مصور مقام پر تاجپوشی مناسب نہیں سمجھتا تھا، اسی وجہ سے اس باغ کو اس رسم کے ادا کرنے کے واسطے منتخب کیا تھا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ بڑے بڑے امیر اس باغ کو دیکھنے کے متمنی تھے اور غیر ممالک کے سفیر بمشکل اجازت حاصل کرتے۔ امرا بھی درخواستیں گذارتے،

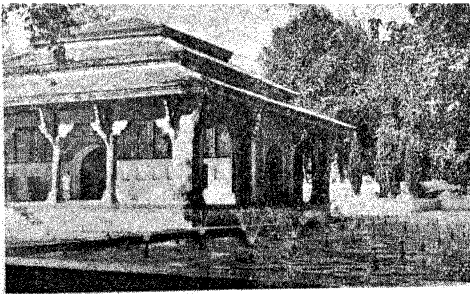
دہلی کے پاس ایک چھوٹا سا مقام ہے "شاہدرہ" وہاں بھی شاہ لمار ہے۔ جو باغ بادشاہ بنواتا اس کو شاہ لمار کہتے تھے۔ باقی دوسرے باغات جو بیگمات کے حکم سے بنائے جاتے اُن کے نام سے شہرت پاتے اور آج تک اُن کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ مثلاً قدسیہ باغ، روشن آرا باغ۔ قلعہ کے اندر دو باغ تھے، ایک آفتاب باغ دوسرا مہتاب باغ۔

باغ بنانا انسان کے خمیر میں ہے، کون ایسا صاحبِ دولت ہوگا جس نے یہ کھیل نہ کھیلا ہو مغل ہر معاملہ میں اُپج کی لیتے تھے اس میں بھی اُنھوں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ ہی چُنی، باغ بنائے اور کچھ اس شان کے کہ اور سب کا رنگ پھیکا پڑگیا۔

خدا معلوم زمینِ چمن نے کیا کیا گل کھلائے ہونگے جو ہم تک پہنچے، ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں بیلا۔ چنبیلی۔ گلاب۔ سوسن۔ یاسمن۔ جوئی۔ چمپا۔ موتیا۔ نرگسِ شہلا۔ نرگس عبہر۔ سیوتی۔ گلاب۔ نافرمان عباسی۔ چاندنی۔ شبّو۔ گیندا۔ داؤدی۔ گل تسبیح۔ ڈیلا۔ چھوئی موئی۔ رائے بیل۔ بنفشہ۔ بوستاں افروز



نشاط باغ سري نگر کشمير



شالامار باغ سري نگر کشمير

ریحان. نسرین و سوسن ؔ مکھی - لالۂ نعمان . وگل شفتالو -

ہریاول ہریاول سب ایک سی. ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ مغل اپنے باغات پر الہیٰ کیا جادو پڑھ کر پھونک دیتے تھے کہ من موہنا اور نظر فریب ہو جاتا تھا - بندہ نواز مغل باغ کی یہ خصوصیت ہے کہ دروازہ میں گھستے ہی تمام کی تمام پھلواری بیک نظر آنکھوں میں سما جاتی ہے - دیدۂ دیدار طلب کو تجسس کرنا نہیں پڑتا - دامانِ باغبان اس کے روبرو پھیلا ہوتا ہے، عروسِ بہار بے حجاب نظر کے سامنے - یہ خصوصیت مغل باغوں میں کیوں تھی - وہ چھوٹی چھوٹی کیاریاں باغ میں جہاں تہاں نہیں بناتے تھے - دروازے کے سامنے ایک مسلسل مستطیل کیاری ہوتی تھی بیچ میں نہر دونوں طرف گل پھول، پھولوں میں بھی یہ خیال رکھا جاتا تھا کہ چھوٹے قامت کے پودے آگے، اُن سے بڑے اُن کے پیچھے اور اسی طرح بتدریج فوج کی طرح قد کے لحاظ سے پھلواری بوتے تھے - اس وجہ سے ایک نظر میں سارا باغ نظر کے سامنے آکر دل و دماغ پر اپنا پورا پورا اثر جما لیتا تھا - یہ راز ہے مغل باغات کی دل فریبی کا - دوسرے تمام باغوں میں اس بات کا لحاظ نہیں رکھا جاتا - کہیں گلاب کا تختہ ہے کہیں موتیا کی کیاری - اس میں دماغ پر بار پڑتا ہے، نظر کو منظورِ نظر ڈھونڈنا ہوتا ہے - مغل باغات میں لطف بغیر کاوش کے مل جاتا تھا - علاوہ ازیں ان باغوں میں سدا بہار رہتی تھی - ہر موسم میں کوئی نہ کوئی پھول نمو پر ہوتا تھا اور یہ کیاری کبھی اُجڑتی نہ تھی -

مغل تلوارِ آبدار کے پرستار، آبرو کے متلاشی، لب جو اور آب رواں پر جان دیتے تھے، نہر، فوارہ اور آبشاریں ان کے چمن کے لئے لازم تھے - فوارے ایسے نہیں جیسے آجکل ہوتے ہیں کہ بڑی تلیاں بہ رہی ہیں جیسے کیٹلی کا نل کھول دیا، وہ فوارے ہزارہ ہوتے تھے - پتلی پتلی پھواریں نکلتی تھیں - عروسِ چمن پر موتیوں کی نچھاور معلوم ہوتی تھی -

مغل باغات کی ایک اور خصوصیت تھی اور اس کے بھی وہی موجد، طبقہ بہ طبقہ باغ بناتے تھے - ان سے پہلے اس قسم کا باغ نہیں بنا تھا - درجہ بدرجہ اُترتا چڑھتا ہوتا تھا - اس میں بھی یہی تخیل تھا کہ دیکھنے والے کی نظر پر بار نہ پڑے - اس وضع کی بہترین مثال نشاط باغ ہے - سامنے سطحِ آب کہ اس سے نیچی سطح نہیں - پشت پر پہاڑ کی چوٹی، بیچ میں سیڑھیوں کی طرح طبقہ بہ طبقہ باغ - ہمارے خیال میں وضع کے لحاظ سے نشاط شالامار پر فوقیت رکھتا ہے، اور کیوں نہ ہو نورجہاں کا بنوایا ہوا ہے -

مغل جس طرح سبزہ زار اور پھولوں پر فریفتہ تھے اسی طرح میوہ دار درختوں کے بھی دلدادہ

ان کے واسطے شجر بار ور لطف نظر سے خالی نہ تھا اور حقیقت بھی یہ ہے کہ پھل شجر کا انتہائے کمال ہے۔ مغلوں کے باغات میں میوہ دار درخت لازمی تھے۔ بیچ کیاری میں نہیں پہلوؤں میں لگاتے اور ان میں قد و قامت کا لحاظ رکھا جاتا تھا آخر میں سب سے اونچے درختوں کی باڑ لگاتے تھے اور بتدریج چھوٹے درخت لگاتے ہوئے کیاریوں تک پہنچ جاتے تھے۔ اس طرح سارا باغ درختوں اور پودوں کے دو پشتوں کی شکل بن جاتا تھا۔ اور جس زاویہ سے بھی دیکھئے سبزہ زار ہی نظر آتا تھا۔

مغل باغات کے چربے اب بھی اُتارے گئے۔ مثلاً وائسرائے کی کوٹھی میں مغل باغ لگایا گیا لیکن میوہ دار درختوں کی کسر رہ گئی اور مغل باغ کی تکمیل کے لئے یہ درخت جزو لازم ہیں ورنہ وہ باغ پر صحیح کیفیت پیدا نہیں کر سکتا۔

عام طور پر مغل باغ کے گرد چار دیواری ہوتی تھی، پردہ کا بھی لحاظ تھا اور یہ بھی مصلحت کہ نظر باغ میں محصور ہو کر رہ جائے اور گرد و نواح سے اثر نہ لے سکے۔

وہ مالی نہ رہے یہ باغ کے دن کے۔ دنیا اسی کا نام ہے۔ رہے نام سائیں کا۔

"زمانہ" تیس سال پہلے

زمانہ جنوری ۱۹۱۹ء میں "چند تعلیمی و مذہبی مسائل" کے عنوان سے رائے پربھو لال صاحب (حیدرآباد دکن) کا ایک قابل غور مضمون شائع ہوا تھا جس کے آخری صفحہ میں وہ لکھتے ہیں:۔

"آجکل ملک میں ایک نیا انقلاب ہو رہا ہے، مذہب کے بجائے اب قومی اغراض اور قومی بہبودی کے نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ مگر بعض لوگ قوم کے بہت محدود معنی لیتے ہیں اور اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بنانا چاہتے ہیں۔ انہیں سے ہر شخص اپنی اپنی قوم کی ترقی چاہتا ہے اور اسکی جد و جہد میں اس خیال کو مطلقاً ترک کر دیتا ہے کہ ہماری جد و جہد کا یہ نتیجہ تو نہ ہوگا کہ کسی دوسری قوم کے مقاصد پر جو ہماری ہمسائے میں رہتی ہیں کوئی مضر اثر پڑے۔ حالانکہ ہم درصل ایک ایسی متحدہ سوسائٹی کے اعضا ہیں کہ اگر ایک عضو کو کوئی تکلیف ہوگی تو اسکا اثر اس پر ضرور پڑیگا۔ دوسرے عضو کو راحت پہونچانے کی چاہے جس قدر کوشش کیجائے مگر اسی ہندوستان میں ایک زمانہ تھا کہ گرہست یعنی خانہ دار سب سے پہلے باہری مہمانوں پھر اپنے عزیز و اقربا اور پھر نوکروں چاکروں کو کھانا کھلاتا تھا اور خود سب سے پیچھے کھاتا تھا۔ اور اب یہ زمانہ آیا ہے کہ اول خویش بعدہٗ درویش کا مسئلہ علم ہوتا جاتا ہے۔ ایثار نفسی ہی سے ملکی ترقی کی بنیاد مستحکم ہو سکتی ہے، اسی سے عناد باہمی منقطع ہو سکتا ہے۔ یہی ویدانت کا لُب لباب ہے جسکو "کرم یوگ" کہتے ہیں۔ ویدانت کا یہی فلسفہ صلح کل کا پیغام روئے زمین کے تمام اقوام اور تمام مذاہب کو دے رہا ہے۔"

سیلِ زمانہ

(از حضرت محمود اسرائیلی)

یوں ہی یہ سیلِ زمانہ مجھے بہائے جائے دلِ ملول سے نقشِ الم مٹائے جائے
رموزِ دہر سرودِ ظفر سنائے جائے مرے خیال، مری ہمتیں بڑھائے جائے
ہر اک بھنور سے نئی داستاں بنائے جائے

نہ کوئی روزِ ازل کا سراغ پاتا ہے رخِ ابد سے نہ پردہ کوئی اُٹھاتا ہے
کسی سے پوچھ کے دیکھو تو کیا بتاتا ہے کہاں سے آیا ہے تو اور کدھر کو جاتا ہے
مگر یہی کہ وہ سُن سُن کے مسکرائے جائے

کسے خبر ہے کہ ہستی کا مُدعا کیا ہے فنا کا سلسلہ یہ کیوں ہے اور بقا کیا ہے
یہ مہر و ماہ ہیں گردش میں کیوں، ضیا کیا ہے یہ وقت کیا ہے فلک کیا ہے اور فضا کیا ہے
مگر جو چاہے وہ بیٹھا تکیں ملائے جائے

وہ ڈوبے سیلِ زمانہ میں یا کنارے جائے بشر کا کام ہے بس ہاتھ پاؤں مارے جائے
جو موجیں تُند ہوں تو اور سر اُبھارے جائے وہ اپنے جسم کو ہاتھوں کے بل سہارے جائے
مصیبتوں میں ہنسے خود بھی اور ہنسائے جائے

پیغامِ عمل

(از حضرت "سروش")

اے نیند کے ماتے ہوش میں آ، یہ عالم ہے بیداری کا
پیغامِ عمل لے کر آیا ہے قافلہ صبحِ بہاری کا

اب خوابِ گراں کی بدمستی کی سحر طرازی ختم ہوئی
دنیا کے جوان و پیر سبھی بھرنے لگے دم ہشیاری کا

مرغانِ ترنم پیرا نے تاثیر بھرے نغمے چھیڑے
کلیوں نے خزانہ کھول دیا گلزار میں مشکِ تتاری کا

جاں بخش ہوا کے جھونکوں نے احساسِ تمنا تیز کیا
ہر رند نے مست انگڑائیاں لیں دور آگیا بادہ خواری کا

سرمستِ سپاسِ حق ہو کر مسجد کی طرف عبّاد چلے
مندر کی فضا میں گونج اٹھا گھنٹہ شوخیِ پجاری کا

کھیتوں میں مشقت کرنے کو ہل بیل لیے دہقان چلے
رہگیر بھی چونکے وقت ہوا منزل کی طرف تیاری کا

آفاق سے شب کی ظلمت کے وحشت افزا پردے اٹھے
ہر سمت ضیائیں لہرائیں در کھل گیا لطفِ باری کا

گردوں پہ مصورِ فطرت نے تصویرِ شفق میں رنگ بھرا
بہتے دریا نے پیش کیا اک منظر رقص نگاری کا

ہر سو کسی شاہدِ رعنا کے فردوسِ نظر جلوے چمکے
ہر دیدۂ بینا بھرنے لگا دم بیخودیِ سرشاری کا

ذراتِ زمیں کے سینے میں جذباتِ ترقی جاگ اٹھے
مشرق سے کرشمہ دکھلایا خورشید نے تابش باری کا

اٹھ دیکھ کہ بزمِ ہستی کا انداز ہی اور سے اور ہوا
تو خود کو بدل کچھ کر کے دکھا اب وقت ہے کارگذاری کا

خاکِ پروانہ یہ کہتی ہے سن اے دل کے غلام
زندگی اپنی خرافات میں کھونا ہے حرام
حوصلہ ہو تو محبت میں فنا ہو جائے

صدر الدین سرشار کسمنڈوی

ہندوستانی پہلوان

(از ٹھاکر چندر بھوشن سنگھ)

فنِ کشتی کی تاریخ کا صحیح پتہ لگانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے مگر ہر ایک ملک کی معتبر تواریخ میں اس فن کا ذکر موجود ہے۔ رامائن اور مہابھارت میں سینکڑوں جگہ "ملیہ جودھیہ" (मल्लयुद्ध) کا تذکرہ[1] یونان کے پہلوان صدیوں تک اپنی قوت اور گٹھیلے بدن کے لئے مشہور رہ چکے ہیں مسلمانوں کے اعتقاد میں حضرت علی جیسا کوئی پہلوان نہیں ہوا۔ فردوسی کے شاہنامہ میں سہراب اور رستم کی خونیں لڑائی کا حال موجود ہے، مگر مقابلہ اور زور آزمائی کے قواعد بہت کچھ بدل گئے ہیں۔ اُس زمانہ میں مغلوب کو اکثر اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا، مگر فی زمانہ یہ خونخوار رواج کہیں سننے میں نہیں آتا۔ ممکن ہے جان لیوا نبرد آزمائیوں ہی سے سلطنتوں کا فیصلہ ہوتا رہا ہو لیکن رستم نے سہراب کو اس خیال سے نہیں مارا تھا!

فن کی حیثیت سے نہ سہی پیٹ پالنے ہی کی غرض سے سہی، مگر یہ فن آج بھی ہندوستان میں نہ صرف زندہ ہے بلکہ اس فن میں دیگر ممالک سے سبقت لے گیا ہے۔ رستمِ دوراں گاما کے علاوہ امام بخش (رستمِ ہند) گونگا عرف فیروز الدین۔ حمیدا، چھوٹا گاما، بینکیا بولر، آتو خاں۔ دولت محمد۔ اللہ بخش شہاب الدین۔ گنڈا سنگھ اور گوبر بابو وغیرہ موجودہ دور کے بین الاقوامی شہرت رکھنے والے ہندوستانی پہلوان ہیں۔ ان میں سے کتنوں نے تو یورپ امریکہ وغیرہ جا کر بڑا نام اور دولت پیدا کی ہے۔

گاما اور زبیسکو (Zbysco) کی کشتی سے پہلے ہندوستانی پہلوانوں کی جو قدر دیگر ممالک میں تھی اُس کا سرسری تذکرہ یہاں پر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

عرصہ ہوا کہ ٹام کیلن (Tom Callox) نامی ایک انگریز پہلوان نے یورپ کے بڑے سے بڑے پہلوانوں کو نیچا دکھا کر Champion of the World کا خطاب حاصل کیا تھا۔ وہ اپنی شہ زوری پر اتراتا

[1] صوبہ کے مشہور روزنامہ اخبار لیڈر میں ہندوستانی پہلوانوں کے متعلق غالباً ۳۵ء میں ایک مضمون شائع ہوا تھا مضمون نگار نے پہلوانوں کی یہ فہرست خود گاما کی مدد سے تیار کی تھی۔ اس وقت بھی اس میں کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت نہیں "بھوشن"

اور پہلوانوں کو خم ٹھونک کر للکارتا پھرتا تھا مگر کوئی اُس سے لڑنے کو راضی نہ ہوتا تھا۔ جب ٹام کیلین کلکتہ میں آیا تو کوچ بہار کے مہاراجہ نرپیندر نارائن بھوپ بہادر نے غلام کے باپ کریم کو اُس سے لڑنے کے لئے آمادہ کیا۔ کہتے ہیں کہ ٹام اس بُری طرح پچھاڑا گیا کہ اُسی رات کو وہ انگلینڈ کے لئے روانہ ہوگیا۔ لیکن اس شکست کا ولایت والوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ٹام گیلن نے مرتے دم تک اپنا خطاب نہ چھوڑا۔

ایک دوسرا واقعہ یہ ہے کہ پیرس کی بڑی نمائش میں آنجہانی پنڈت موتی لال نہرو صاحب اپنے ساتھ کئی نامی پہلوانوں کو لے گئے تھے۔ اس زمانہ میں ترکی پہلوان احمد مدرالی دنیا کا زبردست پہلوان سمجھا جاتا تھا۔ اس نمائش میں غلام نے مدرالی کو چت کردیا، گو یورپ والوں پر اس کا کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ لیکن فنِ کشتی کے ماہروں کو اسے "لاثانی" کا خطاب دینا ہی پڑا۔

ہندوستانی پہلوانوں کا نام سب سے پہلے دیگر ولایتوں میں مشہور کرنے کا سہرا ٹھاکر بُٹا سنگھ کے سر ہے۔ ہندوستان میں اُن کا کیا مرتبہ تھا۔ اس کی بابت صحت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن یورپ کا مشہور سے مشہور پہلوان بھی اُس سے خائف تھا۔ معمولی پہلوان تو اُس کا مگدر بھی نہ اُٹھا پاتے تھے۔ اُس نے ولایت کے درجنوں چمپئن (Champions) گرائے تھے۔ مگر چوالیس سال کی عمر میں سڈنی (Sydney) کے دنگل میں روس کے مشہور پہلوان ہیکن[1] سمتھ سے ہار گیا، اور آسٹریلیا ہی میں بودوباش اختیار کرلی۔

۱۹۱۰ء میں ہندوستانی کشتی کا ایک انگریز ماہر آر۔ بی۔ بنجمن (R.B. Benjamin) چار مشہور پہلوان گاما۔ گونگا۔ امام بخش اور احمد کو لے کر انگلستان پہونچا۔ درحقیقت وہ اس وقت کے چمپئن (Champion) فرنک گاچ (Frank Goch) کو گاما سے لڑانا چاہتا تھا۔ اور اس کشتی کا خیالی نتیجہ بھی اُس نے نکال رکھا تھا۔ کچھ دن بنجمن صاحب کو للکارتے ہی گذرے۔ آخرکار جان لیم (John Lemm) نامی سوٹزرلینڈ کا پہلوان امام بخش کے مقابل آیا۔ لیم Hangler's Circus Tournament کا چمپئن تھا، اس لئے تمام یورپ میں اس کی بڑی شہرت تھی۔ مگر امام بخش نے لیم کو بڑی آسانی سے نیچا دکھا دیا۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہے۔ ہمارے یہاں کی طرح مغربی ممالک میں کشتی کا فیصلہ ایک ہی مرتبہ میں نہیں ہوجاتا۔ وہاں Best of the three falls کا اُصول رائج ہے، یعنی تین مرتبہ کشتی ہوتی ہے اور دو بار کا جیتنے والا غالب سمجھا جاتا ہے۔ لیم پہلی مرتبہ پانچ منٹ میں اور دوسری مرتبہ آٹھ منٹ میں گرگیا تھا

[1] Hackens-chmidt. Swiss Wrestler ہے

اِس شکست سے انگریزوں کی آنکھیں کھُلیں۔ اسی وقت ڈاکٹر رولر نامی ایک امریکن پہلوان گاما سے قوت آزمائی کرنے کے لئے اکھاڑے میں اُترا۔ رولر نے صرف فرنک گاچ کے مقابلہ میں ایک مرتبہ زمین دیکھی تھی اور زبسکو (Zbysco) سے برابر چھوٹا تھا۔ رولر کے آنے سے انگریزوں کو اُمید ہوگئی تھی کہ اب ٹیم کی شکست کا بدلہ لِل جائیگا مگر گاما نے اس کو پہلی مرتبہ ساڑھے چار منٹ میں اور دوسری مرتبہ بارہ منٹ میں گرا دیا۔ ہیکن سمتھ (Hackens-chmidt) جس نے سٹڈنی کے دنگل میں بھٹا سنگھ کو ہرایا تھا اس وقت انگلینڈ ہی میں تھا۔ لوگوں نے بڑی سفارش کی کہ وہ گاما کے مقابل اکھاڑے میں اُترے لیکن وہ راضی نہ ہوا اور انتقام کی خواہش دل ہی میں رہ گئی

اسی دوران میں امام اور آئرلینڈ کے سب سے بڑے پہلوان پٹ کالونی (Pall Connolly) زور آزمائی کے لئے میدان میں اُترے۔ دیکھتے ہی دیکھتے امام بخش پٹ کی چھاتی پر جا بیٹھا۔

اس طرح تین مشہور پہلوانوں کے گر جانے کے بعد گورے لوگ ہندوستانی پہلوانوں کو کچھ سمجھنے لگے، اور امام بخش کو تیندوا (The Panther) اور گاما کو پنجاب کا شیر (Lion of the Punjab) کہنے لگے۔

آخر زبسکو اور گاما کا مقابلہ ٹھہرا۔ گاما نے اپنے حریف کو ایک گھنٹہ میں پٹک دینے کی شرط کی تھی، چنانچہ وہ دو ۲ گھنٹے اور پینتالیس ۴۵ منٹ تک زبسکو پر سواری گانٹھے بیٹھا رہا۔ مگر فیل تن زبسکو چت نہ ہوسکا۔ اُس کشتی میں اعزاز گاما ہی کے ہاتھ رہا۔ دوسرے دن پھر اسی کشتی کا مقابلہ ہونے والا تھا مگر زبسکو بستر باندھکر روانہ ہوگیا۔ روسی پہلوان ہیکن سمتھ بھی انگلینڈ ہی میں تھا مگر وہ بھی سوئٹزرلینڈ چلا گیا۔ شاید گاما کے رہتے اُسے انگلستان کی فضا راس نہ آئی۔ اس کشتی کے صلہ میں گاما کو ایک زریں پٹہ (John Bull Champion-Ship Belt) ملا جس کی قیمت تقریبًا پندرہ ۱۵ سو روپیہ ہے یہ پٹہ انگلینڈ کے سب سے بڑے پہلوانوں کو دیا جاتا ہے۔

اس کے بعد ہندوستانی پہلوان انگلینڈ سے چلے آئے اور انگلستان میں بھی کشتی کا پیشہ بند سا ہوگیا۔

۱۹۱۱ء میں بنجن صاحب پروفیسر رام مورتی کے ساتھ سولہ ۱۶ پہلوانوں کی ایک جماعت لے کر دوبارہ انگلینڈ گئے۔ اِن میں احمد بخش۔ رحیم۔ غلام اور تیلا زیادہ مشہور تھے۔ پروفیسر رام مورتی نے کشتی کے لئے Sporting Life کے دفتر میں دو لاکھ روپیہ رحیم کے لڑنے کے لئے جمع کیا تھا مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ کچھ دن انتظار کے بعد مارس ڈریاز (Maurice Deriaz)

احمد بخش کے مقابل آیا۔ وہ فرنک گاچ سے صرف ایک مرتبہ گرا تھا اور زبسکو سے برابر رہا تھا۔ ونٹی نال اُٹھانے میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ (Health and Strength) نامی رسالہ کے رپورٹر سے دوران ملاقات اُس نے کہا تھا کہ "ہندوستانی پہلوان داؤں پیچ اور جوڑ توڑ والا ہوشیار کشتی باز ہوتا ہے لیکن وہ ہماری طاقت کو نہیں جانتا۔ ہم صرف طاقت سے احمد کو نیچا دکھاویں گے"۔ اِسی رپورٹر نے جب احمد سے اس کا جواب مانگا تو اُس نے کہا "ڈینگ مارنا ہماری عادت نہیں، آپ کے بوائے اسکاؤٹ کا اُصول ہے کہ انسان کو ہر وقت تیار رہنا چاہیئے، چنانچہ ہم ہمیشہ تیار ہیں، اور اتنا کہتے ہیں کہ مارس ہارے بغیر نہ رہیگا"۔ احمد کے قول کی سچائی اِس بات سے معلوم ہو سکتی ہے کہ مارس پہلے دور میں ۴۶ سکنڈ میں اور دوسرے دور میں ¾ منٹ میں چت ہو گیا۔ اِس مرتبہ اُسی نمایندہ اخبار سے مارس نے کہا کہ "جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہندوستانی پہلوان کی کامیابی صرف گرفت اور داؤں پیچ پر منحصر ہے وہ پاگل ہیں۔ میں مرتے دم تک احمد کی گرفت کو یاد رکھونگا"۔ بڑی منت خوشامد کے بعد احمد سے ایک سوئیس پہلوان آرمنڈ شیرپلا (Armand cherpillod) لڑنے کے لئے راضی ہوا۔ اسپورٹنگ کلب کا منیجر کہنے لگا کہ "بس اب ہندوستانیوں کو میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑیگا"۔ مگر کشتی شروع ہونے کے چار ہی منٹ بعد آرمنڈ گالیاں دینے اور چیخنے چلّانے لگا کہ "ارے تم مجھے مارے ڈالتے ہو"۔ آخر کار اُس نے اکھاڑا ہی چھوڑ دیا اور اس کے دوست واحباب کسی طرح بھی اُسے احمد بخش سے لڑنے پر آمادہ نہ کر سکے"۔

گاما کے انگلینڈ چھوڑتے ہی جو کشتیاں ہوتی تھیں وہ بھی بند ہو گئیں، اس لئے وہاں رہنا بیکار سمجھکر غلام اپنے شاگرد چھاگا اور رتیلا کو لے کر فرانس چلا گیا۔ انگلستان کے باہر کشتی کا ایک دوسرا ہی طریقہ رائج ہے جو "رومی یونانی" طرز کہلاتا ہے۔ اس خاص طرز کی کشتی میں کمر سے نیچے کی گرفت جائز نہیں ہے۔ غلام محی الدین نے ایک ہی ہفتہ میں اس طرز کو بھی سیکھ لیا اور اس فن کے بہت بڑے چمپین مارس گامبیئے (Maurice Gambier) اور پچاس دیگر پہلوانوں کو نیچا دکھایا بنجمن صاحب پھر سب کو لے کر امریکہ پہونچے۔ اسی وقت چمپین (Champion ship) کے اعزاز کے لئے شکاگو میں گاچ اور ہیکن سمتھ میں مقابلہ ہوا۔ گاچ خطاب لے کر گھر بیٹھ رہا اور ہمارے ہندوستانی پہلوانوں کو کسی نے پوچھا بھی نہیں۔ شاید اسی لئے یہ کیا گیا کہ کہیں ہندوستانیوں کے مقابل گورا گاچ champion ship کے اعزاز سے محروم نہ رہ جائے۔ خیر!

گاما کی منتخب کردہ فہرست کے پہلوانوں کا مختصر تذکرہ درج ذیل ہے:۔

I shall ever remember his terrible arm rolls. مطبع

گاما مدت سے گاما ہندوستان ہی کا نہیں بلکہ دنیا کا سب سے بڑا پہلوان تسلیم کیا جاتا ہے
وہ ایک خوبصورت کشمیری مسلمان ہے، کوئی ساٹھ برس کی عمر ہوگی مگر بڑھاپے نے ابھی تک
اُس کے فن کو زک نہیں پہونچائی ہے۔ اس کا قد پانچ فٹ ۹ انچ اور وزن دوسو ساٹھ پونڈ ہے۔
وہ تین ہزار سے زیادہ دنگل لڑ چکا ہے مگر آج تک کبھی چت نہیں ہوا۔ جن کشتیوں کا ذکر اوپر آچکا
ہے ان کے علاوہ ایک مرتبہ اُس نے اپنے انگلینڈ کے قیام میں جوجوتسو[۱] کے مشہور جاپانی پہلوان "تارو میاکی"
(Tarro Myake) اور اُس کے اونتیس[۲۹] ساتھیوں کو اکیلے ہی مقابلہ کے لئے للکارا تھا۔ گاما نے وعدہ کیا
تھا کہ وہ پندرہ پندرہ[۱۵] کے گروہ میں ایک ہی گھنٹے کے اندر تیسوں جوانوں کو گرا دیگا مگر پہلے گروہ کو گرانے کے بعد
اس کو آرام کرنے کے لئے بیس[۲۰] منٹ کا وقفہ ملنا چاہیئے۔ منتظمین صاحب نے انعام کا روپیہ کشتی کے دفتر میں
جمع کردیا مگر جاپانی لوگ بھاگ نکلے۔ مشہور گھونسہ باز جیک جانسن بھی گاما کے مقابلہ سے ہمیشہ گھبراتا رہا۔

سنہ ۱۹۱۱ء میں پورے اٹھارہ برس بعد زبسکو اور گاما کی کشتی پٹیالہ میں ہوئی۔ گاما کا حریف جو پچپن[۵۵]
برس کا تھا صرف تیس[۳۰] سکنڈ میں زمین پکڑ کر چت ہوگیا۔ بعض لوگ تو کشتی ہوتے دیکھ ہی نہ سکے۔ اگر زبسکو
خود اپنی ہار نہ قبول کرلیتا تو لوگوں کو شک ہی رہتا۔ لیکن اس عمر میں زبسکو کا گاما کے مقابل خم ٹھوکنا ہی
کچھ کم تعجب اور ہمت کی بات نہ تھی۔ اس وقت اس اُترتی جوانی میں بھی گاما کا مدمقابل کوئی نظر نہیں آتا[۲]۔

---

[۱] افسوس کی بات ہے کہ تلاش کے باوجود ہم کو ان پہلوانوں کے حالات نہ معلوم ہوسکے۔ شاید کوئی کتاب ان کے حالات زندگی کے متعلق موجود بھی نہیں ہے۔ اس جگہ پر ہم کو راجہ رُکما نگد سنگھ بہادر آف کھٹیاری ضلع ہردوئی کی یاد آتی ہے۔ مرحوم نے مسٹر شری رام شرما رئیس پورقاضی کی مدد سے ہندوستانی پہلوانوں کے متعلق ایک ضخیم کتاب شائع کرنے کا ارادہ کیا تھا اور اس پر تقریباً دس ہزار روپے صرف کرنے کے لئے تیار تھے۔ مگر پنڈت جی کی تساہلی سے کتاب شائع نہ ہوسکی۔ مہاراج کا پہلوانوں پر ساٹھ روپیہ یومیہ خرچ ہوتا تھا اور اپنی زندگی کے اٹھائیس برس (جب تک وہ ریاست کے مالک رہے) انھوں نے اس وضعداری کو نبھادیا۔ لکھنؤ کی چھپی نمائش میں بھی ہر اتوار کو دنگل ہوتا تھا۔ پہلوان اپنے پاس سے چھ دن تک کب پیسہ خرچ کرنے والے تھے۔ تقریباً ڈیڑھ سو پہلوان راجہ صاحب کے پاس پہونچے؛ در بے تکلف رہنے لگے۔ کسی نے مہاراج سے کہا "دنگل تو آپ کا ہے نہیں پھر آپ اتنا خرچ کیوں برداشت کر رہے ہیں"۔ یہ سنکر مہاراج مسکرا دیئے اور کہنے لگے کہ زندگی کا کیا ٹھکانا اس لئے یہی بہتر ہے کہ ہم اخیر وقت تک اپنی وضع کو نبھا دیں"۔ ان کا یہ کہنا ایک طرح سے بالکل ٹھیک ثابت ہوا کیونکہ گذشتہ ۱۹ جنوری سنہ ۳۰ء کو راجہ صاحب نے لکھنؤ میں ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کرلیں۔ دوران علالت میں گاما بھی ملنے کے لئے آیا تھا اُس نے روکر دعا مانگی کہ راجہ صاحب کو صحت ہو۔ راجہ صاحب نے کہا کہ یہ میرا آخری وقت ہے" عرصہ سے امام بخش کو نہیں دیکھا۔ گاما کو دوسو روپیہ رخصتانہ دیا۔ امام بخش بھی دوڑا آیا اور رونے لگا۔ دعائیں مانگیں، مگر صحت نہ ہونا تھی نہ ہوئی۔ امام بخش کو بھی چلتے وقت راجہ صاحب نے دوسو روپیہ دیا تھا۔

[۱] جوجوتسو۔ ایک طرح کی دھر پکڑ کی کشتی ہے جس کا جاپان میں بہت رواج ہے۔ اس میں ہاتھ کی پکڑ کو کچھ اس طریقہ پر چھوڑتے ہیں کہ اگر پکڑنے والا چھوڑ کر الگ نہ ہوجائے تو اس کا ہاتھ ہی ٹوٹ جائے۔ ہندی کے مشہور رسالہ مادھوری (لکھنؤ) میں اس کے متعلق ایک مفصل مضمون شائع ہوچکا ہے۔

[۲] اس وقت دنیا میں دو پہلوان اپنا جواب نہیں رکھتے، ایک تو ہمارا گاما اور دوسرا فن لینڈ کا مشہور دوڑنے والا نورمی ہے (Nurmi the wing footed Finn) جس نے آٹھ سکنڈ میں سو گز دوڑ کر نیا ریکارڈ قائم کیا۔
بمبئی کے بین الاقوامی دنگل میں گاما نے ایک لاکھ کی بازی لگنے پر لنگوٹ باندھنے پر آمادگی ظاہر کی مگر اتنا روپیہ نہ لگایا جاسکا۔ بہرحال گاما نے اس سن میں بھی سب کو للکار ہی دیا۔

۱۹۱۰ء کے بعد وہ کسی ہندوستانی پہلوان سے نہیں لڑا۔ جو پہلوان گاما کے مقابلہ کے لئے آئے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ پہلے امام بخش سے ہاتھ ملالے اور امام بخش سے لڑنے کی ہمت کسی کو ہوتی ہی نہیں کیونکہ وہ ہنوز سب پر غالب ہے، اپنے عروج کے بعد سے اُس نے زمین پکڑی ہی نہیں۔

خود گاما کے بیان کے مطابق پنجاب میں بھی رفتہ رفتہ کشتی کا شوق کم ہو رہا ہے۔ جہاں اکھاڑے میں روزانہ چالیس پچاس پہلوان زور کرنے آتے تھے وہاں اب بیس بائیس ہی کی حاضری رہ گئی ہے۔ ہندو مسلمانوں کی روزانہ کے لڑائی جھگڑے نے اس فضا کو بھی نہ چھوڑا، گاما کا کوئی ہندو شاگرد نہیں ہے، جس کا اُسے بہت افسوس ہے۔ اس کا مشہور اکھاڑا موری دروازہ (لاہور) کے باہر والے باغ میں ہے۔

امام بخش | گاما کا چھوٹا بھائی امام بخش کوئی باون ترپن برس کا ہوگا۔ ۱۹۱۰ء میں گاما کے چھوڑ دینے پر اُس نے "رستم ہند" کا خطاب اپنایا تھا۔ اور ابھی تک کوئی پہلوان اس سے اس خطاب کو چھین نہیں سکا۔ آج تک وہ صرف ایک ہی کشتی میں ناکامیاب رہا ہے۔ ایک بار گونگا نے اُس کو پچھاڑ دیا تھا مگر اس کے بعد ہی اُس نے دو مرتبہ گونگا کو دے ٹپکا اور اپنی اگلی دھاک بٹھا دی۔ مرحوم شاہ جارج کی سلور جوبلی کے موقعہ پر وہ گونگا سے لاہور کے دنگل میں پانچ گھنٹے تک لڑا مگر کشتی برابر رہی۔

گونگا | اِن دونوں بھائیوں کے بعد تیسرا نمبر گونگا کا ہے۔ اس کی عمر اُنتالیس ۳۹ چالیس ۴۰ سال ہوگی۔ ایک بار امام بخش کو شکست دینے کے بعد وہ دو مرتبہ اُس سے ہار چکا ہے اور ایک مرتبہ برابر چھوٹا ہے۔ اُس نے چھوٹے گاما کو تین بار گرایا ہے۔ حمیدا اور بنکیا بولر سے بھی وہ زور آزمائی کر چکا ہے مگر یہ کشتیاں برابر رہیں۔

حمیدا | نامی پہلوانوں میں حمیدا سب سے کم عمر ہے، وہ مشکل سے اکتیس ۳۱ بتیس ۳۲ برس کا ہوگا وہ طاقت اور داؤں پیچ میں گونگا کی ٹکر کا ہے۔ گونگا سے اُس کی کشتی برابر چھوٹی تھی۔ حمیدا نے بنکیا بولر کو جو گونگا سے برابر چھوٹا تھا شاہ جارج آنجہانی کی سلور جوبلی کے موقعہ پر امرتسر کے دنگل میں نیچا دکھا دیا مگر یہ جیت برائے نام تھی۔

چھوٹا گاما[1] | چھوٹے گاما اور حمیدا کے درمیان دنگلی کشتی نہیں ہو سکتی۔ یہ دونوں ایک ہی اکھاڑے کے ہیں اور چچازاد بھائی بھی ہیں۔ یہ دونوں بھائی کبھی گاما اور امام بخش سے بھی نہیں لڑ سکتے کیونکہ

---

[1] ایک مرتبہ مہاراجہ صاحب کو لھاپور کی سرپرستی میں ایک دنگل ہوا تھا جس میں گونگا اور کلو کے لڑکے گاما کی کشتی ہوئی تھی گاما جیت ہو گیا۔ یہ خبر جب گاما کو ملی تو اُسے روحانی صدمہ ہوا۔ وہ قانونی چارہ جوئی کرنے والا تھا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ گرنے والے پہلوان کا نام بھی گاما ہے اور یہ خبر اُس کو بدنام کرنے کے لئے نہیں پھیلائی گئی ہے۔ غالباً اسی وقت سے کلو کے لڑکے گاما کو لوگ "چھوٹا گاما" کہنے لگے۔ (بھوشن)

اُن کے بھی رشتہ دار ہوتے ہیں، دونوں گاما کو اُستاد بھی مانتے ہیں۔ چھوٹا گاما تین مرتبہ گونگا سے پٹ چکا ہے۔ آتو خاں ایک مرتبہ اُس سے ہار چکا ہے۔

بینگیا بُولر | اِس پہلوان کی عمر ابھی تینتالیس برس کی ہوگی، اس کا وطن کولھاپور ہے۔ طاقت اور زور میں بُولر، مرحوم کنکڑ سنگھ کے برابر ہے۔ اس کا بدن کنکڑ سے بھی زیادہ گٹھیلا ہے۔ وہ بڑے سے بڑے پہلوانوں سے ٹکر لے سکتا ہے۔ گونگا سے برابر اور حمیدا اور چھوٹے گاما سے ایک ایک بار کشتی کھا چکا ہے۔ اللہ بخش کو تین بار اور گنڈا سنگھ کو ایک بار پست کر چکا ہے۔ گونگا۔ چھوٹے گاما۔ حمیدا اور بُولر کو ایک ہی درجہ میں رکھنا نا مناسب نہ ہوگا۔ ان کی طاقت اور انکا فن برابر ہے۔

آتو خاں | ایک مرتبہ یہ پہلوان چھوٹے گاما سے چت ہو چکا ہے۔

دولت محمد | ایک مرتبہ حمیدا سے کشتی ہار چکا ہے اور ایک مرتبہ دونوں برابر رہے ۱۹۳۳ء میں اس نے امریکہ میں اکیسو بتیس ۱۳۲ کشتیاں لڑیں اور اکثر میں وہ کامیاب رہا۔ بعض دنگلوں میں ہار جیت کا کوئی قابل قبول فیصلہ نہ ہو سکا۔

شہاب الدین | ہندوستان کا سب سے قدآور پہلوان ہے۔ ایک مرتبہ گنڈا سنگھ کو پچھاڑ چکا ہے۔ اور ایک مرتبہ چھوٹے گاما سے ہار چکا ہے۔

گوبر بابو | بابو امبوگھ کلکتہ کے بنگالی پہلوان ہوئے ہیں۔ انھیں کے پوتے گوبر بابو ہیں۔ ہندوستان کے صرف یہی ایک نامی پہلوان ہیں جو تعلیم یافتہ ہیں اور جنھوں نے کشتی کو روپیہ پیدا کرنے کے لئے نہیں بلکہ بحیثیت فن سیکھا ہے۔ ۱۹۱۳ء میں صرف بائیس ۲۲ برس کی عمر میں وہ امریکہ گئے، ولایت میں اُنھوں نے پہلے جمی کیمبل Jimmy Campbell نامی ایک مشہور اسکاٹ پہلوان کو زمین پر لٹایا۔ اس کے بعد انگلینڈ کے مشہور پہلوان (Jimmy Esson) کو پچھاڑا۔ مگر انگلینڈ کے متعصب لوگوں نے ان کو اپنے یہاں کے پہلوانوں کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں دی۔ ۱۹۲۳ء میں گوبر بابو چمپئن لوئی (Champion Lewis) سے لڑنے کے لئے امریکہ گئے۔ لوئی کو پہلے مرتبہ گوبر بابو نے نیچا دکھایا مگر دوسری مرتبہ خود نیچے جا رہے۔ تیسری بار بے قاعدگی برت کر لوئی نے گوبر بابو کو گرا دیا۔ جب ججوں سے بابو صاحب نے اپیل کی تو ان کی بات کی کوئی شنوائی نہ ہوئی! مگر وہاں کے پہلوانوں نے اُن کو "دوسرے درجہ کا سب سے بڑا پہلوان (Light Heavy-weight champion of the World) مان لیا۔[1]

---

[1] اِس مضمون کے لکھنے میں مَیں نے "ہندی رسالوں سے استفادہ کیا ہے۔ (بھوشن)

فنا فی القوم مہاتما ہنس راج جی

از حضرت طالب چکوالی بی-اے، ایل ایل-بی (راولپنڈی)

فنا فی القوم ہونے کا سبق ہم کو دیا تو نے
فنا فی القوم ہونا ہی اَمر ہونے کا نسخہ ہے
فنا فی القوم ہو کر ہی بسر جیون کیا تو نے
فنا فی القوم ہونا موت کو بھی جیت لینا ہے

ترے ایثار کے قربان، صدقے تیری ہمت کے
جو ناممکن نظر آتا تھا، ممکن کر دیا تو نے
جوانی کی اُمنگیں بھینٹ کر دیں ملک و مِلت کے
بقائے قوم کا دل میں تہیہ کر لیا تو نے

جوانی کی اُمنگیں، ولولے، ارمان، اُمیدیں
تری ہمت سے لڑ کر ہو گئیں بیجان سی چیزیں
مخالف بزدلوں اور حاسدوں کی سخت تنقیدیں
ترے عزمِ مصمّم کے لئے تھیں کام کی چیزیں

شبِ تاریک میں تو نے کیا نورِ سحر پیدا
ضیائے علم سے پنجاب کا گھر گھر ہوا روشن
ترے کالج نے کتنے ہی کئے شمس و قمر پیدا
ضیا باری سے جن کی ایک عالم ہو گیا روشن

محافظ تھی تری بالغ نگاہی دَورِ طوفاں میں
تری کشتی کو تھا تکیہ ترے ایثار و ہمت پر
ترے دم سے رہے محفوظ ہم گردابِ دَوراں میں
بھروسہ تھا تری تدبیر، دانش اور حکمت پر

مگر اوجھل ہوئی آنکھوں سے تیری شکلِ نورانی
تدبّر، دُور بینی، تیاگ اب ڈھونڈنے پائیں گے
ہوئی نایاب سے نایاب تر تیری جہاں دانی
پڑیگا وقت جب، احسان تیرے یاد آئیں گے

فنا کے ہم کھلونے ہیں، فنا انجام ہے اپنا
دوائیں اور دعائیں بے اثر ثابت ہوئیں یکسر
جو تیرا کام تھا جاری رہے، یہ کام ہے اپنا
چکانا ہے ترے اُپکار کا جو قرض ہے ہم پر

تنقید کتب

مکاتیب مہدی

دُور بیٹھے ہوئے اپنے دوستوں، عزیزوں، چھوٹوں اور بزرگوں سے خاموشی کے ساتھ گفتگو کر لینا خطوط کی ایک ادنیٰ کرامات ہے۔ لیکن بعض خطوط تاریخی اور ادبی یادگار ہیں۔ جنھیں معتقدین اور قدردان احباب اپنی جان کے ساتھ محفوظ رکھتے ہیں۔ خطوط جمع کرنے کا طریقہ سب سے پہلے یہودیوں اور عیسائیوں نے شروع کیا۔ چنانچہ سینٹ پال کے خطوط اب تک انجیلوں کا ضمیمہ ہیں۔ غرض سامی نسل کی قوموں کو اسکا بہت شوق رہا ہے، عرب لوگ بھی اسی میں شامل ہیں۔ اُن کا اپنے نبیؐ، صحابہؓ، تابعین اور دیگر بزرگوں کے خطوط کا محفوظ رکھنا اُنکی نسلی خصوصیت ہے۔ لیکن ادبی خطوط کا محفوظ رکھنا کسی خاص قوم کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ انگریزی، جرمن، فرانسیسی، فارسی میں عموماً خطوط کے مجموعے پائے جاتے ہیں۔ اور اُن میں سے بعض کو ادبی شاہکار سمجھا جاتا ہے، فارسی کی تقلید میں بعض اُردو ادیبوں کے خطوط بھی اکثر محفوظ رکھے گئے ہیں۔ چنانچہ سرسید احمد خاں، مولانا حالی، مولانا شبلی، امیر مینائی اور مرزا غالب کے خطوط اُردو لٹریچر کی جان اور علمی و ادبی معلومات کا خزانہ ہیں۔

کتاب زیر نظر میں سید مہدی حسن صاحب تحصیلدار مرحوم کی بیگم صاحبہ نے اُن کے چند خطوط ایک دیباچہ کے ساتھ نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ترتیب دیکر شائع کئے ہیں۔ یہ خطوط ثقات کی شُستہ اور منجھی ہوئی زبان کے عمدہ نمونے ہیں۔ بعض خطوط میں بعض کتابوں اور علمی مضامین کی تنقید کا حق بھی ادا کر دیا گیا ہے زبان میں رنگینی اور شوخی دونوں موجود ہیں۔ چنانچہ جابجا شاعرانہ رنگ کے جملے بھی بہت دلچسپ اور خوش آیند ہیں۔ البتہ بعض مقامات پر عربی و فارسی کا رنگ زیادہ غالب ہوگیا ہے۔ بہرحال یہ مجموعۂ مکتوبات پڑھنے کے قابل ہے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ سب عمدہ۔ حجم ۳۰۲ صفحات۔ شروع میں مصنف کا فوٹو بھی ہے۔

شایقین مہدی بیگم، بسنت پور ضلع گورکھپور، یا آسی پریس گورکھپور سے طلب فرمائیں۔

اسرار جیلانی

یہ حکیم غلام جیلانی صاحب امرتسری کے صدری مجربات کا مجموعہ ہے، جو پشتہاپشت سے سینہ بہ سینہ چلے آتے ہیں۔ اِس مجموعہ میں تقریباً ڈھائی سو بیماریوں کا حال، علامات، اسباب اور علاج بتائے گئے ہیں۔[1]

[1] قیمت فی جلد دو روپیہ، ملنے کا پتہ۔ مینجر صاحب دواخانہ مجربات جیلانی امرتسر۔

طرز تحریر شستہ اور زبان سلیس و عام فہم ہے۔ کتاب کی بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ تمام بیماریوں کے نام ہندستانی عربی، فارسی اور انگریزی چاروں زبانوں میں لکھدئے گئے ہیں۔ گو بعض جگہ کاتب نے انگریزی لفظوں کو غلط لکھدیا ہے۔ اُمید ہے کہ آیندہ ایڈیشن میں اِس نقص کی اصلاح کردی جائیگی۔ حکیم غلام جیلانی صاحب بڑے تجربہ کار اور پرانے طبیب ہیں اور اس سے پہلے اپنی کئی تصانیف کلید حکمت، مجربات جیلانی اور نشاط زندگی وغیرہ شائع کرچکے ہیں۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ اور جلدبندی سب عمدہ ہے۔ حجم ۴۰۰ صفحات۔

فہرست

یہ گورنمنٹ سٹی کالج حیدرآباد دکن کے کتبخانہ کی اُردو، فارسی و عربی کتابوں کی ایک نئی طرز کی فہرست ہے جسے مولوی غلام رسول صاحب نے محنت سے مرتب کیا ہے۔ تمام کتابوں کو انگریزی حروف کی ترتیب کے ساتھ علوم و فنون وار تقسیم کیا گیا ہے۔ کل کتبخانہ ترپن۵۳ مدات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے چھبیس۲۶ مدات کے ہر حصہ کے لئے انگریزی کا ایک بڑا حرف اور دوسرے چھبیس۲۶ حصوں کیلئے چھوٹا حرف مقرر کیا گیا ہے۔ مثلاً عام سائنس کیلئے "A" اور عام ریاضی کے لئے "B"۔ لغت کے لئے "K"۔ تاریخ کے لئے "V"۔ اس کے علاوہ سب کتابوں کا نقشہ بھی تیار کیا گیا ہے۔ جسمیں (۱) نمبر شمار (۲) مولف یا مرتب کا نام (۳) کتاب کا نام (۴) سال اشاعت (۵) پبلشر یا مطبع کا نام (۶) کیفیت یعنی کتاب نئی ہے یا ترجمہ۔ اگر ترجمہ ہے تو اصل کتاب کا نام وغیرہ۔ اِس طرح فاضل مرتب نے تین ہزار دو سو ترسٹھ کتابوں کی مکمل فہرست مرتب کردی ہے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ ہر چیز پسندیدہ ہے۔ قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن

خطبات صدارت جوبلی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علیگڈھ کی پنجاہ سالہ جوبلی کا جو شاندار اجلاس مارچ ۳۷ء میں منعقد ہوا تھا۔ اُس کے ہر شعبہ کے صدر اور سکرٹری علیحدہ علیحدہ تھے۔ چنانچہ تمام شعبوں کے صدر صاحبان نے جو صدارتی تقریریں ارشاد کی تھیں اُنھیں جمع کرکے ایک کتابی صورت میں شائع کردیا گیا ہے۔ اصلاح معاشرت پر پروفیسر مولوی الیاس برنی صاحب ایم اے، ایل ایل بی، تعلیم نسواں کے متعلق شیخ عبداللہ ایڈوکیٹ علیگڈھ۔ ابتدائی تعلیم و مدارس اُردو، خانصاحب سید آل علی نقوی ایم، اے۔ اعلیٰ تعلیم، علامہ عبداللہ یوسف علی ایم، اے۔ اردو پریس کانفرنس میں خان بہادر مولوی بشیرالدین ایڈیٹر "البشیر" اٹاوہ، منشی دیانرائن نگم ایڈیٹر رسالہ "زمانہ"۔ اسلامی علوم و فنون، مولانا سید سلیمان ندوی ایڈیٹر "معارف"۔ مدارس اسلامیہ، مولانا سید حسین احمد مدنی۔ اُردو کانفرنس، مولوی عبدالحق بی۔ اے سکرٹری انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد۔ تعلیم ثانوی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں شیخ الجامعہ ملیہ دہلی کے خطبے قابل ذکر ہیں اور مستقل دلچسپی کی چیزیں ہیں۔ ہر خطبہ اپنے اپنے موضوع پر ایک ادبی شاہکار ہے اور تلاش و تجسس کے بعد لکھا گیا ہے۔ اِس لحاظ سے یہ مجموعہ ہر کتبخانہ و لائبریری میں رکھے جانیکے قابل ہے۔ حجم ۲۳۶ صفحات۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ صدر دفتر کانفرنس سلطان جہان منزل علیگڈھ

رفتار زمانہ

(ممالک غیر)

یہودیوں پر نازیوں کا ظلم | جرمن سفارت کے ایک افسر کے قتل سے مشتعل ہوکر (جسکا ارتکاب پیرس میں ایک یہودی نوجوان نے کیا) جرمن نازی یہودیوں پر جو ظلم ڈھارہے ہیں، اُن کے خلاف برطانیہ، امریکہ، فرانس وغیرہ ممالک میں بہت کچھ اظہارِ غم وغصہ کیا گیا ہے۔ نازی عوام نے جو دہشت انگیزی بیچارے یہودیوں پر روا رکھی اور لوٹ مار کی، اُس میں یقیناً حکومت وقت کی شہ ہے۔ جرمن اخبارات نے بھی نازی دہشت انگیزوں کی زیادتیوں کی کوئی مذمت نہیں کی، بلکہ اُسے پیرس کے واقعہ قتل کی قدرتی اور جائز جوابی کاروائی قرار دیا ہے۔ یہاں تک کہ ایک اخبار نے یہ بھی دھمکی دی ہے کہ اگر ممالک غیر میں بہت زیادہ اظہارِ غم وغصہ کیا گیا تو یہودیوں کے خلاف نازی عوام نے جو کاروائی خودبخود مشتعل ہوکر کی ہے اُسکے خلاف باضابطہ طور پر اور سخت تر کاروائی زیادہ وسیع پیمانہ پر کیجائیگی۔ اسوقت جرمنی میں یہودیوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے حالانکہ تمام دُنیا کے یہودیوں نے اُس سترہ سالہ یہودی جوان کی حرکت پر (جس نے جرمن سفارت کے افسر کا قتل کیا) اظہار افسوس کیا ہے۔ لیکن نازی جرمنوں کا غم وغصہ کسی طرح فرو ہونے نہیں آتا۔ اُس پر ستم ظریفی یہ کہ نازیوں کی لوٹ مار سے جس کی روک تھام کا کوئی انتظام جرمن حکام نے نہیں کیا جو یہودیوں کا نقصان ہوا۔ اُس کے لئے وہ بیمہ کمپنیوں سے معاوضہ بھی طلب نہیں کرسکتے۔ کیونکہ نازی گورنمنٹ کے حکم کے بموجب انھیں اس معاوضہ سے جرمن پارلیمنٹ کے حق میں دستبردار ہونا پڑے گا۔ اس کے علاوہ پیرس والے قتل کی پاداش میں آٹھ کروڑ چالیس لاکھ پونڈ کا خون بہا کل یہودی قوم پر عائد کیا گیا ہے اور حکم ہوا ہے کہ اگر یہ رقم جرمن یہودیوں نے ازخود مہیا نہ کی، تو نازی حکومت جرمنی کے یہودیوں سے جبراً وصول کریگی۔

گو یہ دُرست ہے کہ نازیوں کا خیال ہے کہ یوروپ کی پچھلی لڑائی میں یہودیوں نے غداری کی اور حریفوں سے ملے رہے اور یہ بھی سچ ہے کہ جرمن مدبران برابر اس پالیسی کے حامی رہے کہ جرمنی میں خالص جرمن نسل ہی کے لوگ آباد ہوں اور ملک کو رفتہ رفتہ غیر جرمن نسل کے لوگوں سے خالی کرالیا جائے تاہم جس شدت اور جور وجبر سے اس پالسی پر عملدرآمد ہورہا ہے وہ اب جرمن نازیوں کے طرزِ عمل کا ایک مستقل جزو ہوتا جاتا ہے۔

یہودیوں پر سخت پابندیاں عاید کردی گئی ہیں۔ جن کی رُو سے جرمن حکام اُن کی دوکانوں کا مال واسباب روخت کرسکتے ہیں۔ اُن کی اراضی بیچ سکتے ہیں۔ اُن بیچاروں کو یہ بھی اختیار نہیں کہ بلا اجازت وزیر اقتصادیات

اپنے تمسکات بیچ سکیں یا سونے، چاندی اور پلاٹینم کی چیزیں اور ہیرے، جواہرات خرید سکیں۔ انھیں موٹر سائیکل اور موٹر گاڑیاں رکھنے یا چلانے کی بھی ممانعت کردی گئی ہے۔ یہ خبر بھی معلوم ہوئی ہے کہ اب عنقریب ہی رومن کیتھلک گرجے اور خانقاہیں بھی ہٹلر کی فرعونیت کا شکار ہونے والی ہیں۔ نازی گورنمنٹ جلد ہی اُن کے تمام مال وجائداد ضبط کرنیکے متعلق سرکاری فرمان جاری کرنے والی ہے۔ اِن واقعات نے نازی طریق حکومت کی اصلی نوعیت کو تمام دُنیا پر واضح کردیا ہے اور امریکہ وغیرہ رہے سہے جمہوری ممالک میں ان کے خلاف آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ حال ہی میں امریکہ کی وزارت نے کہا ہے کہ جرمنی مظالم کو قرون وسطیٰ کے مظالم سے تشبیہ دینا اُن قرون کی سخت توہین کرنا ہے۔ اسوقت دُنیا کے ہمدردانِ قوم وملک اِس فکر میں ہیں کہ کس طرح ان مظالم کی داد رسی کیجائے۔ مگر جب تک جرمنی واٹلی کی موجودہ طرزِ حکومت قائم و برقرار ہے اُس وقت تک یہی حالات رہیں گے۔ جمہوری طرزِ حکومت کیلئے یہ سخت آزمایش کا زمانہ ہے۔ اِس کشمکش میں جمہوریت کی فتح اُسی وقت ہوسکتی ہے۔ جب اس کے حامی ملک جان ہتھیلی پر رکھکر ہمت واستقلال سے اِس جور وتشدد کے اصول کی بیخ کنی کے لئے متفقہ طور پر آمادہ ومستعد ہوں۔ محض نیک خیالات، صلح کُن تجاویز یا زبانی شور وغل سے یہ خطرہ دُور نہیں ہوسکتا ہے بلکہ خوف ہے کہ کہیں پست ہمتی کی بدولت جمہوریت کا قلع قمع ہی نہ ہوجائے،

فرانس، جرمنی، اطالیہ، برطانیہ، پولینڈ اور ہنگری مسٹر چیمبرلین کے رفیق اور مداح اصحاب یہ کہہ رہے ہیں کہ معاہدۂ میونخ سے برطانوی عزو وقار کو کوئی دھکا نہیں پہونچایگا۔ تاہم اِس میں کوئی شک نہیں کہ جرمنی نے اٹلی کی امداد سے بین الاقوامی سیاسیات میں فرانس اور برطانیہ کی جمہوری حکومتوں کے دست وپا شل کردئے ہیں اور فی الحال دونوں کو بے یار ومددگار بنادیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک دوسرے چھوٹے بڑے ملکوں کو اِن پر جو اعتبار واعتماد تھا وہ باقی نہیں رہا۔ اِس طرف جرمنی نے برطانیہ سے اپنی پُرانی نوآبادیات کا سوال اُٹھا دیا ہے (گو ابھی تک سرکاری حیثیت سے اس کی سلسلہ جنبانی نہیں ہوئی ہے) اور اطالوی اخبارات نے اپنی افریقی نوآبادی ٹیونس وکارسیکا اور نیقیہ کی واپسی کا شگوفہ چھوڑ دیا ہے۔ جس سے تمام یوروپ میں عجیب کھلبلی پیدا ہوگئی ہے۔ ہرچند کہ فرانس نے برطانیہ کے نقشِ قدم پر چل کر عین خوف وہراس کی حالت میں آخر کار ۶ دسمبر کو جرمنی سے ایک معاہدہ کرلیا ہے جس کی رُو سے دونوں نے ایک دوسرے کے مفاد وحقوق، امن وامان کا دوستانہ خیال رکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن اس پر بھی جرمنی اٹلی کے مذکورہ بالا مطالبات کی پوری حمایت کر رہا ہے۔

حال میں ٹیونس کے چند اطالوی باشندے فرانس کے خلاف مظاہرہ کرنیکی علت میں گرفتار کئے گئے ہیں۔ جرمن اخبارات نے اِس واقعہ پر غم وغصہ کا اظہار کیا ہے اور اٹلی نے بھی حکومت فرانس سے اس کے متعلق جواب طلب کیا ہے ان حالات کی موجودگی میں جرمنی اور فرانس کے درمیان اس معاہدۂ صلح کی جو ہر فان ربن ٹراپ اور موسیو بونے وزیر خارجہ فرانس کے دستخطوں سے ہوا کیا اہمیت ہوسکتی ہے۔ اِس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ واقعی ہٹلر کے قول وفعل کا

کوئی اعتبار نہیں۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ ہٹلر کی خفیہ کوشش یہی ہے کہ فرانس اور اٹلی کے درمیان مصالحت نہ ہونے پائے اور قرینہ سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ ہٹلر اپنی کوشش میں کامیاب ہوگا کیونکہ اٹلی کی طرف سے جو مطالبے پیش کئے گئے ہیں وہ بالکل ایسے ہیں جو عموماً ایک فاتح اپنے مغلوب کو قبول کرنے کیلئے مجبور کرتا ہے۔

اٹلی کے مطالبات یہ ہیں کہ فرانس بحیرۂ روم میں اٹلی کی بالادستی قبول کرلے، فرانس اور روس کے مابین جو معاہدہ چلا آتا ہے اسمیں تبدیلی کی جائے، اسلحہ جات پر اخراجات میں تخفیف ہو، اخبارات کو فاسیت اور نازیت کے خلاف مضامین شائع کرنے سے روکا جائے، جرمنی کی نوآبادیات کا مسئلہ طے کردیا جائے اور یہ ضمانت دی جائے کہ فرانس کی موجودہ حکومت جو فیصلہ کرے گی اُس کی پابندی آیندہ بھی ہر حکومت پر لازم ہوگی اور کسی دوسری حکومت کو جو فاسیت کے خلاف ہو، اُسے رد کرنے کا حق نہ ہوگا۔

حال میں فرانس میں مزدوروں کی عام ہڑتال کرانے کی ایک فرانسیسی اہم اور بڑی ٹریڈ یونین نے سخت کوشش کی مگر اس میں اُسے بوجوہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اُن وجوہات میں ایک یہ بھی ہے کہ مزدوروں اور فرانسیسی رہنماؤں کو اِس بات کا احساس کرایا گیا کہ اگر مزدوران ملک اختلافات زور کرتے گئے تو فرانس اُمراءِ یورپ ہٹلر اور مسولینی کا شکار ہوجائیگا۔

فرانس کا رفیق دیرینہ برطانیہ بھی اسوقت عجیب اُلجھن میں مبتلا ہے۔ وہ کسی طرح بھی جرمنی اور اٹلی کو ناراض کرنا نہیں چاہتا۔ چنانچہ وزیر اعظم چیمبرلن نے حال ہی میں دارالعوام میں یہ بیان کیا کہ فرانس اور برطانیہ کے مابین کوئی ایسا معاہدہ نہیں، جس کی رُو سے برطانیہ پر یہ لازم ہو کہ اگر اٹلی فرانس سے اپنے پُرانے مقبوضات حاصل کرنے کے لئے جنگ کرے تو انگلستان اُس کے خلاف فرانس کی مدد کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ فی الحال برطانیہ جرمنی سے خوف زدہ ہوگیا ہے اور سلطنت برطانیہ میں اِس وقت عجب ہلچل مچی ہوئی ہے۔ اِدھر ہندوستان میں کانگریس فیڈریشن کے مقابلہ کے لئے تیار بیٹھی ہے۔ اُدھر جنوبی افریقہ میں بھی قومیت کا جذبہ ترقی پر ہے اور کناڈا اپنے پڑوسی امریکہ کے نقشِ قدم پر چلکر یورپ کے معاملات سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اُس نے غیر مبہم الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ فیڈرل گورنمنٹ بلا مداخلت غیرے یہ فیصلہ کرے گی کہ آیا کناڈا کو برطانیہ کی اُلجھنوں میں شریک ہونا چاہیئے یا نہیں۔ اِن اُلجھنوں کے علاوہ برطانیہ کو اس وقت دوسرے ممالک کی رفاقت بھی حاصل نہیں ہے کیونکہ جب سے برطانیہ نے جرمنی اور اٹلی کے تالیف قلوب کی پالسی پر عملدرآمد شروع کیا ہے اُس کے پُرانے رفیقوں کو اُس پر اعتماد نہیں رہا اور اُس کو بھی اپنے پُرانے رفیقوں پر اعتماد نہیں رہا۔ اس کی ساکھ بھی باقی نہیں رہی۔ ایسی حالت میں برطانیہ امریکہ کو اپنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ پچھلی جنگ عظیم میں بھی عین وقت پر امریکہ کو اپنی طرف ملاکر برطانیہ نے جنگ کا تختہ پلٹ دیا تھا۔ اب پھر برطانیہ امریکہ کیساتھ اپنی محبت اور رفاقت کا اظہار کر رہا ہے اور حال ہی میں دونوں ملکوں میں ایک قابل قدر تجارتی معاہدہ بھی ہوگیا ہے۔

فرانس اور برطانیہ دونوں کو اپنی اپنی اندرونی کمزوریوں کا احساس ہوگیا ہے۔ اُدھر جرمنی کی طاقت اور حوصلے

بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ معاہدۂ میونخ کے بعد ہی ہٹلر کو یہ اطمینان ہوگیا ہے کہ وہ میمل اور ڈینزگ پر بھی تسلط جمالیگا اور برطانیہ اور فرانس اُس کی مزاحمت نہ کرینگے۔ میمل میں پچھلے ہفتہ جو انتخابات ہوئے ہیں۔ اُنمیں اُنتیس ۲۹ نشستوں میں پچیس ۲۵ نشستیں جرمنوں کے قبضہ میں آئیں۔ اِس صورت میں میمل کی پارلیمنٹ میں جو لتھونیہ کے ماتحت ہے، جرمن اثر و اقتدار نمایاں رہیگا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب جلد ہی میمل کے جرمن بھی یہ مطالبہ کریں گے کہ میمل جرمنی سے ملادیا جائے۔ اِس وقت لتھونیہ دھمکی دے رہا ہے کہ وہ کسی طرح بھی اِس الحاق کی اجازت نہ دیگا لیکن ہٹلر کے دبدبہ کے آگے ایسی دھمکی کیا موثر و کارگر ہوگی ؟

میمل کے بیرونی معاملات اب تک لتھونیہ ہی کے ماتحت ہیں۔ لیکن اگر میمل پر جرمنی کا تسلط ہوگیا تو لتھونیہ کی تجارت کو بہت بڑا نقصان پہونچیگا۔ کیونکہ لتھونیہ کے پاس مال کی برآمد کے لئے صرف یہی ایک بندرگاہ ہے۔ اسکے علاوہ پولینڈ کو بھی نقصان پہونچے گا۔ کیونکہ اِس وقت اُسے اِس بندرگاہ میں جہاز رانی کے پورے حقوق حاصل ہیں۔

خیال کیا جاتا ہے کہ میمل کے بعد ہٹلر کی توجہ ڈینزگ کی طرف مبذول ہوگی اور یقیناً ڈینزگ پر جرمنی کا تسلط ہوجائیگا۔ مگر اس کا نتیجہ پولینڈ کے حق میں اچھا نہ ہوگا کیونکہ اُس کے پاس کوئی بندرگاہ نہ رہ جائیگی۔ ہٹلر نے یوکرین کے علاقہ کو پولینڈ سے علیحدہ کرنے کی سلسلہ جنبانی شروع کردی ہے۔ سُنا جاتا ہے کہ اس کی خفیہ انجمن قائم ہوئی ہے۔ جسمیں چالیس ۴۰ ہزار ممبر ہوگئے ہیں۔

مشرق بعید۔ چین پر جاپان | چینیوں کے استقلال میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اُنھوں نے اب یہ فیصلہ کیا ہے کہ ایک مقام پر جمکر نہ لڑا جائے کیونکہ اِسی طریق عمل سے اُنھیں شنگھائی، ہانکاؤ وغیرہ مقامات پر شکست ہوئی ہے۔ چنانچہ جنرل پیچنہائی[ل] نے نئے ڈھنگ پر جنگ کرنے کا اعلان کیا ہے۔ اُن کا ارادہ ہے کہ ہر طرف سے معرکہ آرائی کی جائے اور کل مُلک میدان جنگ بنا دیا جائے۔ اگر جاپانی جنوب کی طرف دھاوا کریں تو چینی شمال کی جانب بڑھ جائیں گے اسی طرح جاپانی مغرب کی طرف بڑھے تو چینی مشرق کا رُخ کریں گے۔ اس پالسی کی غرض و غایت یہ ہے کہ جاپانیوں کا ملک کے کسی حصہ میں تسلط نہ ہونے پائے۔ جاپانیوں نے بھی اپنے حملے کم کردئے ہیں اور اُن کی پالسی اب یہ معلوم ہوتی ہے کہ مفتوحہ مقامات پر خاطر خواہ حکومت قائم کردیں، جو اُن کے اشاروں پر اُن کی مرضی کے مطابق عمل کرے۔ چینیوں کو اگر کامیابی کی کوئی اُمید ہوسکتی ہے تو اِسی صورت میں کہ وہ موجودہ لڑائی جاری رکھیں، کیونکہ جنگ جسقدر طول پکڑے گی، جاپان کے ذرائع میں کمی ہوگی۔ جس سے اُس کے دست و پا شل ہوتے جائیں گے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اِسی مقصد کی تکمیل کے لئے امریکہ چین کو پچاس ۵۰ لاکھ پونڈ قرض دینے والا ہے۔ اور برطانیہ بھی مشرق بعید میں اپنے مفاد کی حفاظت کی خاطر اسی طرح چین کی اعانت کرنا چاہتا ہے۔

General Paichunhai. ل

روس بھی جاپان کو اس طرف الجھایا کر اس سے اپنا پرانا حساب بیباق کرنا چاہتا ہے کیونکہ یہی موقع ہے، جب وہ جاپان کو دبا سکتا ہے اور جو زکیں کھا چکا ہے اُن کا بدلہ لے سکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ایسا کرنے میں خطرہ بھی لاحق ہے۔ لیکن دوسری صورت میں اگر جاپان کو فتح حاصل ہو گئی اور اس نے چین پر اپنا تسلط قائم کر لیا تو پھر مشرق بعید میں کوئی طاقت اُس کا مقابلہ نہ کر سکیگی۔ بہرحال روس نے جاپان کو باوجود پُرانے صلحنامہ کے متنبہ کر دیا ہے کہ اُسے بحر جاپان میں ماہی گیری کا کوئی حق حاصل نہیں۔ جاپان نے بھی سخت جواب دیا ہے کہ اگر روس نے مصالحانہ رویہ اختیار نہ کیا تو جنگ چھڑ جانے کا اندیشہ ہے۔

امریکہ کے مدبران بھی جاپان اور جرمنی سے علانیہ بدظن ہو رہے ہیں۔

ہندوستان

فیڈریشن، ریاستیں اور کانگریس خیال کیا جاتا تھا کہ والسرائے ہند لارڈ لنلتھگو انگلستان سے واپسی پر مہاتما گاندھی سے مسئلہ فیڈریشن پر تبادلۂ خیالات کریں گے، تاکہ اس ضمن میں جو اختلافات حکومت برطانیہ اور کانگریس کے درمیان ہیں اُنکے دفعیکی کوئی صورت نکل آئے اور باہمی مفاہمت ہو جائے۔ کانگریس نے شروع ہی سے اس اسکیم کو اُس کے تحفظات اور بعض اہم مدات (مثلاً مال و فوج وغیرہ) میں والسرائے کو کلی اختیارات حاصل ہونیکے ساتھ اہل مُلک کو کوئی دخل نہ ملنے کے باعث بیکار قرار دیا ہے اور نمایندہ اسمبلی کے اصول پر زور دیتے ہوئے فیڈرل اسکیم کے اُس حصّہ کو ناقص قرار دیا ہے جسمیں ریاستوں کے نمایندوں کا انتخاب عوام کی رائے سے نہیں بلکہ فرمانرواؤں کی نامزدگی سے ہوگا۔ ۱۶ ردسمبر کو انڈر سکرٹری آف اسٹیٹ نے دارالعوام میں بیان کیا کہ اگر ریاستوں نے اپنی رعایا کی آئینی ترقی کی طرف قدم بڑھایا تو حکومت برطانیہ مزاحم نہ ہوگی۔ مگر وہ اس کے لئے والیان پر کسی طرح کا دباؤ بھی ڈالنا پسند نہ کرے گی۔ اُس کیساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ والسرائے ہند اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ والیان ریاست اپنی رعایا کو اپنے حقوق دینے میں دریغ نہ کریں۔ اس طرف جہاں بعض بڑی ریاستوں میں حکام اور رعایا میں تصادم ہو رہا ہے، وہاں بہت سی دوسری ریاستیں اپنے یہاں قانونی کونسلیں وغیرہ قائم کر رہی ہیں۔ موجودہ تصادم کا بھی بالآخر یہی نتیجہ ہوگا کہ رعایا کو مزید حقوق حاصل ہوں گے۔ کانگریس کمیٹی کے پچھلے اجلاس میں جو پچھلے ماہ واردھا میں ہوا تھا اس مسئلہ پر خاص طور پر غور ہوا تھا۔ چنانچہ ہری پورہ کانگریس کے فیصلہ کی مزید توضیح کر دی گئی ہے۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کانگریس بالآخر ریاستوں کی رعایا پر آئے دن جو سختیاں ہو رہی ہیں اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیگی۔ البتہ کانگریس از خود کسی ریاست میں کوئی ایجی ٹیشن شروع کرنا نہیں چاہتی ہے اور اُسکی یہ بھی خواہش ہے کہ ریاستوں کی رعایا میں اپنی اصلاحات کا از خود جوش پیدا ہو اور وہ اس راہ میں جو قدم اٹھائیں اپنے بل بوتے پر اٹھائیں۔ کانگریس اخلاقی حیثیت سے ان کی جدوجہد پر نظر رکھے گی۔ اور اگر ایسا ہی کوئی موقع آ پڑا تو ہمدردی

سے بھی دریغ نہ کرے گی۔ درحقیقت ریاست راجکوٹ میں جس طرح سردار پٹیل کا درمیان ہو گیا ہے اس سے تو یہی واضح ہو رہا ہے کہ کانگریس ریاستی رعایا کی جدوجہد سے بہت دیر تک بے تعلق نہ رہ سکیگی۔

فیڈریشن کے متعلق ریاستوں کا رویہ عنقریب صاف ہو جائیگا۔ عام طور پر لوگوں کو یہی خیال ہے کہ اس سلسلے میں عنقریب ہی گورنمنٹ کی کانگریس سے مصالحت ہو جائے گی۔ لیکن حضور وائسرائے نے حال میں کلکتہ میں جو تقریر کی ہے اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ابھی تک گورنمنٹ اس ایکٹ میں کسی طرح بھی فوری طور پر کوئی اصولی تبدیلی کرنے کو تیار نہیں ہے۔ حضور والیسرائے نے اہلِ ملک سے اپیل کی ہے کہ وہ ایکٹ کے الفاظ پر خیال نہ کریں بلکہ اِس اسپرٹ کو دیکھیں، جس کے ماتحت یہ ایکٹ اِسقدر کدوکاش کے بعد مرتب کیا گیا ہے۔ آپ نے صوبجاتی حکومتوں کی مثال دیکر کہا کہ جس طرح وزرائے صوبہ اور گورنران اتفاق رائے سے کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح والیسرائے بھی نمایندگانِ ملک کی رائے سے کل کام کریں گے۔ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ مرکزی معاملات میں کانگریس اور تمام خیرخواہانِ ملک کی یہی رائے ہے کہ کل معاملات ملکی فائدہ کے لحاظ سے نہ کہ برطانیہ کے نقطۂ خیال کو مدنظر رکھکر طے جائیں۔ جب تک قانونی حیثیت سے اہم اور ضروری محکموں کا آخری فیصلہ خود ہندوستانیوں کے ہاتھ میں نہ ہوگا، یہ مُدعا پورا نہ ہوگا۔ چنانچہ شرح تبادلہ کے متعلق ملکی ماہرین کی رائے برٹش مدبروں سے بالکل جداگانہ ہے۔ لیکن برٹش مدبروں ہی کی مقرر کردہ پالسی پر عمل ہو رہا ہے اور ملکی لیڈروں کی آواز بے اثر ثابت ہوئی ہے۔ بہرحال صدر کانگریس اور دیگر لیڈرانِ ملک نے حضور والیسرائے کی اپیل کے باوجود فیڈریشن کی مخالفت کرنے کا خیال ظاہر کیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اِن دونوں نقطۂ خیال میں کس طرح مطابقت پیدا ہو سکتی ہے۔

بہرحال اِس بارے میں وائسرائے ہند اور رہنمایانِ ملک کے درمیان براہِ راست تبادلۂ خیال ہوئے بغیر سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ یہ مرحلہ کیسے طے ہوگا؟

ہندوستان پر لنکاشائر کا غیظ و غضب ۶ دسمبر کو لندن میں لنکاشائر مِل والوں نے ہندوستان کے متعلق بہت کچھ غم و غصہ کا اظہار کیا۔ اُن کو شکایت ہے کہ ہندوستان نے معاہدۂ اٹاوہ کو منسوخ کر کے لنکاشائر کے مال پر درآمدی چونگی لگادی ہے۔ انھوں نے ہندوستان کے خلاف زور شور سے ایجی ٹیشن کرنے کا فیصلہ کیا ہے یعنی عام جلوس اور ڈیپوٹیشنوں کا اہتمام کر رہے ہیں تاکہ انگلستان کے بورڈ آف ٹریڈ پر زور ڈال کر اُس کی معرفت ہندوستان پر سیاسی دباؤ ڈالیں اور اپنی مطلب برآری کریں۔ درحقیقت معاہدۂ اٹاوہ ہندوستان کے مفاد کے خلاف ثابت ہوا اور جس وقت سے اُس پر عملدرآمد ہوا تھا ملک میں اُس کے خلاف برابر صدائے احتجاج بلند کی گئی تھی۔ تین سال ہوئے اسمبلی نے ایک ریزولیوشن کے ذریعہ اس معاہدے کو منسوخ کر دیا تھا۔ مگر ہندوستان کی بدنصیبی سے اب تک عملی طور پر اس معاہدہ پر عمل ہو رہا ہے۔ شکر ہے کہ ۵ دسمبر ۳۸ء کو کامرس ممبر نے اسمبلی میں یہ اعلان کر دیا ہے کہ اگلے بجٹ سیشن کے بعد اِس معاہدہ پر عملدرآمد نہ کیا جائے گا۔ دوسرے معاہدہ

کے لئے ہندوستان نے اپنی طرف سے کوشش اُٹھا نہیں رکھی۔ شملہ میں پچھلے گرمی کے موسم میں لنکاشائر کے نمایندوں اور ہندوستان کے سُوتی کارخانوں کے قائمقاموں کے درمیان بات چیت ہوئی تھی مگر لنکاشائر کے نمایندوں نے جو مطالبے پیش کئے وہ سراسر ناواجب تھے۔ جنھیں ہندوستان کے غیر سرکاری نمایندے کسی طرح قبول نہ کرسکتے تھے۔ اب لنکاشائر والوں کی یہ دھمکی کہ وہ ہندوستان کی روئی کی خریداری میں کمی کردیں گے ہندوستان کو مرعوب نہیں کرسکتی۔ اِس لئے انھیں مصالحت سے کام لے کر ایسا معاہدہ کرلینا چاہئے جو فریقین کے حق میں یکساں مُفید ہو۔

نئے معاہدہ کی بابت گورنمنٹ ہند اور گورنمنٹ برطانیہ میں خط وکتابت ہورہی ہے اور حکومتِ برطانیہ کا خیال ہے کہ چونکہ مسلم لیگ کانگریس کے خلاف ہے اس لئے مسٹر جناح کی اعانت حاصل کرکے گورنمنٹ معاہدۂ متذکرہ کی مرکزی اسمبلی سے تصدیق کرالیگی۔ حال ہی میں برطانیہ اور امریکہ کے مابین جو تجارتی معاہدہ ہوا ہے، اُس کا اثر برطانیہ میں ہندوستانی مال کی درآمد کے خلاف ثابت ہوگا۔

ریاستوں میں آئینی ترقی کے لئے جدوجہد میسور کی کانگریس ورکنگ کمیٹی نے بیان شائع کیا ہے کہ ودرا سواتھم رپورٹ نے محض حکومت میسور کے مطبوعہ بیانات پر مہر تصدیق لگانے کا کام کیا اور آزادی کے لئے میسور کی کانگریس کے پُرامن جدوجہد پر اظہارِ ملامت کیا ہے۔

ریاست راجکوٹ میں آئینی ترقی کے لئے عوام نے بڑی قربانیاں کیں۔ ریاست کے افسروں نے ستیہ گرہیوں پر لاٹھی چارج کیا۔ سولہ سو سے زاید آدمی گرفتار ہوئے اور سردار پٹیل کی صاحبزادی اور بعض دیگر معزز خاتونیں بھی جیل خانہ بھیجدی گئیں۔ جلسوں اور جلوسوں پر پابندیاں عائد کی گئیں، اور طالب علموں کو تنبیہ کردی گئی کہ اگر انھوں نے عام تحریک میں حصہ لیا۔ تو انھیں کالجوں سے نکال دیا جائے گا۔ غرض سختیوں کی انتہا کردی گئی۔ لیکن ایجی ٹیشن دبائے نہ دبا۔ مہاتما گاندھی اور سردار پٹیل کی مصالحانہ کوششیں بار آور ہوئیں۔ آخر حکمران ریاست نے اپنے یوروپین دیوان کے تمام تشددانہ احکام کو رد کرکے رعایا کے ساتھ مراعات سے کام لینے کا اعلان کردیا۔ جس سے ایجی ٹیشن کامیابی کے ساتھ ختم ہوگیا۔ اور ایک کمیٹی مقرر کردی گئی جس میں تین ممبر راجہ صاحب کے نامزدہ ہوں گے اور سات رعایا کے قائمقام، ریاست کی آئینی اصلاحات کے متعلق یہ کمیٹی آخر جنوری تک جو سفارشیں کرے گی انھیں راجہ صاحب تسلیم کرلیں گے اس طرح روشن خیال حکمران نے اپنی ریاست کو مزید بدنامی سے بچالیا۔ راجہ صاحب نے اپنی اولوالعزمی کے ثبوت میں یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ وہ ریاست کی آمدنی کی صرف دس فیصدی رقم اپنی نجی اور خاندانی ضروریات پر صرف کرینگے باقی نوّے فیصدی رعایا کی فلاح وبہبود پر صرف کیا جائے گا۔

اِس فیصلے سے رئیس راجکوٹ نے تمام والیانِ ریاست کے لئے ایک قابلِ تقلید مثال پیش کی ہے جسکی عام طور پر پیروی ہونا چاہئے۔ اِس وقت بعض دیگر بڑی ریاستوں کی رعایا نے بھی اپنے آئینی حقوق کے لئے پُرامن جدوجہد شروع

کردی ہے۔ ہم کو اُمید ہے کہ اُن کے حکمران بھی جلد ہی محسوس کریں گے کہ موجودہ زمانہ کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ عوام کی ترقی کے لئے ہر ممکن کارروائی کیجائے اور رعایا کو تمام شہری اختیارات دئے جائیں۔

مالابار کے اچھوت اور مندروں میں داخلہ مدراس کی دونوں مجالس قانون ساز نے مندروں میں اچھوتوں کے داخلہ کا قانون پاس کردیا ہے۔ اس کا جو مسودہ شروع میں شائع کیا گیا تھا اُسمیں یہ ملحوظ رکھا گیا تھا کہ اگر کل حلقے کے ہندو رائے دہندگان (جن کا نام مدراس اسمبلی کے ووٹروں کی فہرست میں ہے) بہ استثنائے اُن اقوام کے جن کا شمار اچھوتوں میں ہے، کثرت رائے سے کسی مندر کی بابت اِس بات کے حق میں رائے دیں کہ اُسے اچھوتوں کیلئے کھول دیا جائے تو حکومت کے لئے اِس فیصلہ پر عملدرآمد کرنا ضروری ہوگا۔ منتخب کمیٹی نے اس مسودہ کے خاص حصوں میں کوئی تبدیلی نہیں کی، البتہ اُن مندروں پر جو کسی خاص شخص کی ذاتی ملکیت ہیں اور عوام کے لئے استعمال نہیں ہوتے، اِس قانون کا اطلاق نہ ہوگا۔ بہر حال یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ مدراس اسمبلی کے صرف ۲ دو ممبران نے اس قانون کے خلاف ووٹ دئے۔ باقی سب صاحبان نے اس کی تائید کی۔ غرض کانگریسی حکومت سرکاری حیثیت سے اپنا حق ادا کرچکی۔ اب اِس قانون کی کامیابی کا دار و مدار رائے عامہ پر ہے۔ یہ قانون مالابار کے لئے بنا ہے، لیکن کل صوبہ مدراس بلکہ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی اس کا بڑا خوشگوار اثر پڑے گا۔ جس کے لئے مدراس کے قابل وزیر اعظم ہماری دِلی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

آل انڈیا مسلم لیگ پٹنہ میں مسٹر جناح مستقل پریسیڈنٹ لیگ کی صدارت میں مسلم لیگ کا چھبیسواں ۲۶ اجلاس بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ خوب زور شور کی تقریریں ہوئیں اور صاحب صدر مسٹر جناح نے بھی بڑے گھن گرج کی صدارتی تقریر کی۔ مگر اُن سب کا ماحصل" بقول ہمعصر "صداقت" بمبئی یہی تھا کہ "مسلمانانِ ہند کانگریس سے متنفر اور دُور رہیں۔ اس کے سوا اور کوئی ایسی بات نہیں کہی گئی جو عام مسلمانوں کے مفاد سے تعلق رکھتی ہو"۔ بقول مسٹر ہارنیمین ایڈیٹر اخبار بمبئی سینٹینل یہ ایک ہولناک واقعہ ہے کہ مسٹر جناح کی رہنمائی میں مسلم لیگ نے اپنی ساری قوت کانگریس اور ہندوؤں کے خلاف شدید قسم کے الزامات لگانے میں صرف کردی اور عام مسلمانوں کی اصلاح و ترقی اور تعمیر کے لئے کوئی عملی تجویز پیش نہ کی۔

مسٹر جناح نے مہاتما گاندھی کو بھی بہت سخت سُست کہا جس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر جناح اِسوقت کانگریس اور مہاتما جی سے اِسقدر چڑھ گئے ہیں کہ اُنھیں خود نہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ غم و غصّے میں کیا کہہ رہے ہیں۔ ہم کو یقین ہے کہ اگر مسٹر جناح ٹھنڈے دِل سے غور کریں گے تو انھیں خود ہی اپنے رویہ پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوگی۔

کانگریس کے خلاف اُن کے الزامات کہاں تک صحیح ہیں" اِس کا فیصلہ بھی انھیں خود ہی ٹھنڈے دِل سے کرنا چاہیئے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی سوچنا چاہیے کہ بقول ہمعصر "صداقت" بمبئی "اُن الزام تراشیوں سے مُلک یا خود امت اسلامیہ کو کیا فائدہ پہونچے گا" جیسا کہ ہمعصر "حقیقت" لکھنؤ نے راجہ صاحب پیرپور کی رپورٹ پر رائے زنی کے سلسلے میں لکھا ہے کہ "ان شکایات میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو نئی ہو بلکہ تمام تر وہی شکائتیں ہیں۔ جو عرصہ سے زیر بحث ہیں۔ حال میں اُردو کے متعلق

کانگریسی وزارت صوبہ متحدہ کے خلاف بہت کچھ پروپیگنڈا کیا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ صوبہ کی قانونی اسمبلی میں آج اُردو کا پہلے سے کہیں زیادہ زور ہے۔ سوالات اُردو میں پوچھے جاتے ہیں اور اُن کے جوابات بھی گورنمنٹ کی طرف سے اُردو ہی میں دئے جاتے ہیں۔ تقریریں بھی پہلے سے کہیں زیادہ اُردو میں ہوتی ہیں۔ اسمبلی کی کاروائی اور اُس کا روزانہ ایجنڈا اُردو ہندی دونوں میں چھپنے لگا ہے۔ صوبے میں اس وقت ساڑھے تین ہزار سے زائد سرکاری کتبخانے اور ریڈنگ روم قائم کئے گئے ہیں جن کے لئے ۴۸ ہزار روپیہ کی لاگت سے اُردو کتابیں خریدی گئی ہیں۔ بہرحال اگر واقعی کانگریسی حکومتوں نے مسلمانوں کے ساتھ کوئی زیادتی ہے تو شمار و اعداد سے اُسکی تفصیل بتانا چاہئے۔

بقول ہمعصر حقیقت لکھنؤ۔ " اصل دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کانگریسی حکومتوں سے پہلے مسلمانوں کو کیا حقوق حاصل تھے اور اب انہیں کیا کمی ہوئی ہے ؟ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب پہلے کیا تھا اور اب پچھلے ڈیڑھ سال میں کیا رہا ہے ؟ مسلمانوں پر کانگریسی حکومتوں نے اور کون سی سختیاں کی ہیں ؟ ان کے مذہبی و تمدنی حقوق کو کیا مضرتیں پہنچائی ہیں ؟ مگر پلیٹ فارم پر پہونچ کر لیڈران فرقہ ان تفصیلات میں نہیں پڑتے ہیں بلکہ صرف بُرا بھلا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

ہندو مہاسبھا کے پریسیڈنٹ مسٹر ساورکر نے بھی اجلاس ناگپور کی صدارتی تقریر میں مسٹر جناح اور اُنکے پیروں کو خوب کوسا ہے۔ جس طرح مسلم لیگ کے اولالعزم لیڈروں نے ہندوں کو ہندوستان کی تمام خرابیوں کی جڑ قرار دیا اُسی طرح مہاسبھا کے بلند نظر صدر نے مسلمانوں کو تمام ملکی نقائص کا سبب بتایا۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اُسی طرح کا برتاؤ کرنا چاہتے ہیں جیسا کہ آجکل جرمنی وغیرہ ملکوں میں یہودیوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ لیکن اِس دشنام بازی اور جنگ زرگری سے نہ ہندوؤں کو کوئی نفع پہونچ سکتا ہے اور نہ مسلمانوں کو۔ دونوں میں کوئی بھی اِس ملک سے خارج نہیں ہوسکتا۔ دونوں کو چار و ناچار یہیں مرنا اور یہیں جینا ہے۔ شاید اسی وجہ سے مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو وغیرہ ملکی لیڈران ہندو مسلم اتفاق سے ابھی تک مایوس نہیں ہوئے ہیں۔ اور ان دل شکن حالات کی موجودگی میں بھی مہاتما جی کا یہی خیال ہے کہ وہ دن دُور نہیں ہے۔ جب دونوں قوموں میں ملکی مسائل کے متعلق کامل اتفاق رائے ہو جائیگا کیونکہ دونوں کے اختلافات کی کوئی بُنیاد نہیں ہے اور ان کے باہمی جھگڑوں کی واقعی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ تمام اختلافات محض سطحی ہیں، اور دونوں کے مُلکی اور مالی مسائل مشترک ہیں۔ دونوں ایک ہی ملک، ایک ہی آب و ہوا میں رہتے ہیں، ایک ہی قسم کا اناج کھاتے اور پانی پیتے ہیں۔ اِس لئے لیڈران خواہ کچھ کہیں۔ جب عوام بیدار ہوں گے، تو ان فروعی باتوں کو بالائے طاق رکھکر اتفاق و اتحاد سے ملکی بہبودی کا کام کریں گے۔ یہی پنڈت جواہر لال نہرو کی رائے ہے اور ہمارا بھی یہی یقین و عقیدہ ہے۔

دو افسوسناک موتیں پچھلے سال کے آخری زمانہ میں مہاتما ہنس راج اور مولانا شوکت علی کے انتقال پُرملال سے مُلک دو بڑے پُرجوش و کارکن رہنماؤں کی آیندہ خدمات سے محروم ہوگیا۔ مہاتما ہنس راج آریہ سماج کے بہترین رہنما اور نفس کشی اور ایثار کی

زندہ مثال تھے۔ آپ نے اپنی تمام عمر ملک کی تعلیمی خدمت میں صرف کردی۔ مذہبی حیثیت سے آپ اپنے زمانہ کے بہترین آریہ تھے۔ صبر و شکر، برداشت و تحمل اور محنت و جانفشانی میں ملک کے صرف چند اور رہنما اُن کی برابری کر سکتے ہیں۔
صاحب مرحوم نے بالکل نوعمری میں اپنی زندگی پبلک خدمت کے وقف کردی تھی۔ اُنھوں نے ۷۵ سال کی عمر پائی مگر آخری دم تک اپنے جوانی کے عہد کو مستعدی اور گرمجوشی سے نباہتے رہے۔ جس وقت آپ کا بیٹا ایک سنگین سیاسی جرم میں ماخوذ ہوکر سزایاب ہوا۔ تو مہاتما ہنس راج نے اس سخت حکم کو صبر و شکر سے سُنا اور اپنے قومی فرائض میں بالکل اسی طرح منہمک رہے، جیسے کہ اُس واقعہ سے پہلے۔ زندگی کے آخری حصے میں آپ کی حیثیت ایک رشی کی سی ہوگئی تھی۔ افسوس! اُن کی عملی خدمات کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔ لیکن اُنکی نیک مثال آیندہ نسلوں کیلئے چراغ ہدایت کا کام دیگی۔

مولانا شوکت علی نے ۶۵ سال کی عمر پائی لیکن مُلک کو اُن کی علالت کا حال معلوم ہی ہوا تھا کہ وفات کی خبر آگئی۔ آپ مولانا محمد علی کے بعد ملکی خدمات کا سلسلہ محض اپنے دم سے قائم کئے ہوئے تھے۔ آخری حصہ زندگی میں وہ کانگریس سے علیحدہ ہوگئے تھے۔ لیکن اُن کے ذاتی تعلقات سب سے بہت شگفتہ رہے، قدرت سے اُنھوں نے مرنجان مرنج طبیعت پائی تھی۔ کھل کر لڑنے اور دل سے ملنے کو ہر وقت تیار رہتے تھے۔ وہ اپنے دلی جذبات چھپانے کے بالکل عادی نہ تھے۔ اور جو کچھ دل میں آتا تھا برملا کہہ ڈالتے تھے۔ لیکن ہندو مسلم اتفاق کے وہ ایک سرگرم وکیل اور بڑے پُرجوش حامی تھے۔ قومی سرگرمیوں کی خاطر اُنھوں نے سرکاری ملازمت سے بھی استعفار دیدیا تھا اور ۱۹۱۹ء میں قید کی مصیبت بھی جھیلی تھی، گول میز کانفرنس میں بھی مدعو ہوئے تھے اور عرصہ تک علیگڈھ کالج اولڈ بوائے ایسوسی ایشن کے سکرٹری رہچکے تھے۔ مرکزی اسمبلی کے ممبر بھی تھے، غرض عوام میں اُن کا خاصہ اثر تھا یہی وجہ ہے کہ تحریک خلافت میں اہل ملک نے اُن کی اور مولانا محمد علی صاحب کی زیر ہدایت لکھوکھا روپیہ کا چندہ جمع کیا۔ آپ کی موت سے ملک ایک عظیم الشان مسلم لیڈر کی خدمات سے محروم ہوگیا۔ جسکی رہنمائی کی آجکل خاص طور پر ضرورت تھی۔

ایک اور حادثہ　۱۱ دسمبر کو ہمارے صوبے کے مشہور و معروف لبرل لیڈر پنڈت جگت نرائن صاحب ملّا کی وفات بھی (جو ۱۱ دسمبر کو یکایک قلب کی حرکت بند ہوجانے سے ہوئی) ایک افسوسناک قومی سانحہ ہے۔ پنڈت جی اپنی قانونی قابلیت، آزاد خیالی، صاف گوئی اور بے لوثی کے لئے خاص طور پر مشہور تھے۔ آپ نے نصف صدی تک وکالت کی۔ چنانچہ فوجداری مقدمات میں آپکا ملک کے بہترین وکیلوں میں شمار ہوتا تھا اور جرح میں کم سے کم صوبہ میں آپ کا کوئی ہمسر ہی نہ تھا۔ ہنٹر کمیشن کے روبرو آپ نے ۱۹۱۹ء کے واقعات پنجاب کے متعلق سرکاری افسروں سے جو جرح کی تھی اس نے آپکی شہرت تمام ملک میں قایم کردی تھی۔ کارکوری کے مقدمہ ڈکیتی میں بھی آپ کی جرح یادگار رہیگی۔ سیاسی حیثیت سے آپ شروع میں کانگریسمین تھے۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں کانگریس ہوئی تو آپ ہی استقبالیہ کمیٹی کے چیرمین منتخب ہوئے۔ اُس کے بعد، منٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کی حمایت کی غرض سے آپ لبرل پارٹی میں شامل ہوگئے اور مسٹر چنتامنی کیساتھ صوبے کی سب سے پہلی وزارت میں داخل ہوئے۔ لیکن جب

مسٹر چنتامنی کا گورنر صوبہ سے اختلاف ہوا تو آپ نے بھی وزارت کی مجموعی ذمہ داری کا اصول برقرار رکھنے کے خیال سے اپنے عہدہ سے استعفا دے کر اہلِ ملک کے لئے ایک قابل قدر مثال قائم کی۔

آپ چالیس سال تک لکھنؤ میونسپل بورڈ کے ممبر رہے اور کئی سال چیرمینی کے فرائض ادا کئے۔ آپ نے بحیثیت وائس چانسلر دو سال تک لکھنؤ یونیورسٹی کی بھی خدمت کی۔ غرض پنڈت جی تمام عمر ملک وقوم دونوں کی بہترین خدمت انجام دیتے رہے۔ آپ کی بے لوثی ضرب المثل تھی اور آپ کی ذات میں بہت سی خوبیاں جمع ہو گئی تھیں۔

مباحثہ

درندوں اور ہاتھیوں کی لڑائی

از مسٹر پیارے لال شاکر میرٹھی

زمانہ بابت ماہ نومبر ۳۸ء میں حضرت وصل بلگرامی کا ایک مضمون بعنوان "نوابانِ اودھ" شائع ہوا ہے۔ جس میں حضرت وصل فرماتے ہیں کہ:۔

"ہندوستان میں سب سے پہلے جس شخص نے درندوں کو پالنے اور لڑانے کو رائج کیا وہ غازی الدین حیدر ہی تھے۔"

مولانا شرر مرحوم نے بھی اپنے سلسلۂ مضامین "ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" میں یہی خیال ظاہر فرمایا تھا لیکن جب ان مضامین کو کتابی صورت میں چھاپنے کی غرض سے مولانا نے نظرثانی فرمائی تو حاشیہ میں لکھا ہے کہ:۔

"مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی نے بتایا اور ہمیں بھی بعد کو تاریخوں میں نظر آیا کہ درندے اور ہاتھی دہلی میں بھی لڑائے جاتے تھے۔" (گذشتہ لکھنؤ۔ ص ۱۴۴)

وینس کا ایک باشندہ بنام نکولا منوچی ۱۶۵۶ء یعنی عہد شاہجہانی میں دہلی میں آیا تھا۔ اور آتے ہی شہزادہ داراشکوہ کی سرکار میں ملازم ہو گیا تھا۔ ۱۶۶۶ء تک اس کا قیام دہلی و آگرہ میں رہا۔ اس نے "مغل انڈیا" کے نام سے ایک کتاب چار جلدوں میں لکھی تھی، زمانہ تصنیف ۱۶۹۹ء لغایت ۱۷۰۵ء ہے۔ یہ کتاب انگریزی میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ اسکی پہلی جلد میں منوچی نے ہاتھیوں کی لڑائی کی دو تصویریں بھی شامل کی ہیں، جن کو دربار مغلیہ کے کسی مصور نے بنایا تھا۔ ان تصویروں سے بھی مولانا شیروانی کے قول کی تائید ہوتی ہے۔ لہذا یہ کہنا کہ جنگلی درندوں کو پالنے اور لڑانے کو ہندوستان میں غازی الدین حیدر نے رائج کیا، صحیح نہیں ہے۔

علمی خبریں اور نوٹ

لالہ ہردیال ایم۔اے سالہا سال کی سیر وسفر کے بعد ہندوستان واپس آرہے ہیں۔آپ نے اپنی زندگی بھر کے مطالعہ مذاہب کا خلاصہ تین سو صفحات کی ایک کتاب "مذہب اور انسانیت" نامی میں قلمبند کر دیا ہے۔ مختلف مذہبوں کی تاریخ بھی اِس میں دیدی ہے ۔ میسرز لاجپت رائے اینڈ سنز پبلشرس لاہور نے اسے مجلد شائع کیا ہے اور پونے دو روپیہ قیمت مقرر کی ہے۔

مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا بی۔اے ۔ ایل ایل بی میرٹھ مصنف "سیر المصنفین" نے "مراۃ الشعراء" کے نام سے ایک تذکرہ الشعراء لکھا ہے۔جس کے بعض حصے وقتاً فوقتاً زمانہ میں شائع ہو چکے ہیں۔اب یہ تذکرہ مکمل ہوگیا ہے اور اشاعت کیلئے اِس کی کتابت شروع ہوگئی ہے۔ تقریباً ایک ہزار صفحات ہوں گے جنمیں تین سو شاعروں کا حال مفصّل درج ہے ۔ قیمت چھ روپیہ تجویز کی گئی ہے۔لیکن پیشگی قیمت ادا کرنیوالوں سے صرف پانچ روپیہ لئے جائیں گے۔کفایت کے علاوہ پیشگی خریداری سے فاضل مصنف کو کتاب کی اشاعت میں بھی مدد ملیگی۔ہم کو اُمید ہے کہ شایقین ادب پیشگی قیمت بھیج کر مصنف کی حوصلہ افزائی کرینگے۔ مفصل اشتہار اِسی پرچہ میں کسی دوسری جگہ درج ہے۔

"نغمہ نور" کے نام سے حضرت بہزاد لکھنوی کا مجموعہ کلام زیر طبع ہے اور اس ماہ کے آخر تک شائع ہوجائے گا۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو کی اَن تھک کوشش سے انجمن کا دفتر اورنگ آباد دکن سے اب پایۂ تخت ہند نئی دہلی میں منتقل ہوگیا ہے اور سر راس مسعود صاحب مرحوم کی جگہ اب ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو صاحب بالقابہ انجمن کے مستقل صدر منتخب ہوئے ہیں۔ ہم کو اُمید ہے کہ نئے پریسیڈنٹ صاحب کی رہنمائی میں انجمن اپنے نئے صدر مقام سے مُلک کی پہلے سے بھی زیادہ خدمت انجام دے سکیگی۔

ہمارے دوست سید حامد حسین صاحب قادری پروفیسر سینٹ جان کالج آگرہ آجکل "داستان تاریخ اُردو" کے نام سے اُردو نظم ونثر کی ایک مفصل تاریخ لکھ رہے ہیں۔جسمیں مصنفین کے حالات کے ساتھ ساتھ اُن کی طرز تحریر کے نمونے بھی پیش کئے جائینگے "تاریخ و تنقیدات اُردو" کے نام سے پروفیسر صاحب کے مضامین کا مجموعہ بھی عنقریب شایع ہونے والا ہے۔

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم کے اُردو فارسی کلام کا آخری مجموعہ "ارمغان حجاز" کے نام سے تین سو صفحات پر شائع ہوگیا ہے۔ یہ تازہ مجموعہ جسمیں ڈاکٹر صاحب کا تمام غیر مطبوعہ کلام شامل ہے، عمدہ لکھائی کے ساتھ خاص اہتمام سے چھاپا گیا ہے، اور شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب لوہاری دروازہ لاہور سے مل سکتا ہے۔

مولوی محمد طاہر صاحب فاروقی ایم۔اے پروفیسر اُردو آگرہ کالج نے "سیرت اقبال" کے نام سے علامہ اقبال کی ایک مفصل سوانحعمری لکھی ہے۔ جسمیں علامہ موصوف کے نظریات پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ کتاب پانچ سو صفحات پر ختم ہوئی ہے اور قومی کتب خانہ، ریلوے روڈ لاہور سے مل سکتی ہے۔

اعلیحضرت نظام دکن نے از راہِ قدر افزائی علامہ اقبال کی بیگم صاحبہ، اُن کے صاحبزادہ میاں جاوید و صاحبزادی منیرہ بانو کو پچاس پچاس روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر فرما دیا ہے۔

مولوی عبدالسلام صاحب ندوی آجکل مولانا شبلی نعمانی کی ایک مفصل سوانحعمری لکھ رہے ہیں۔

مولانا طفیل احمد صاحب منگلوری ٹرسٹی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کی مشہور تصنیف "مسلمانوں کا روشن مستقبل" کا پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا ہے۔ آجکل اُس کا دوسرا ایڈیشن فاضل مصنف کی نظر ثانی کے بعد زیر طبع ہے۔

منشی پریم چند کے ناول "بیوہ" اور "میدان عمل" کے دوسرے ایڈیشن جامعہ ملیہ دہلی کے اہتمام سے شائع ہوگئے ہیں۔ اُن کا آخری ناول گئودان بھی ہندی سے ترجمہ ہوکر عنقریب شائع ہونیوالا ہے۔ ترجمہ مکرمی اقبال ورما صاحب سحر ہنگامی نے کیا ہے۔

حضرت جگر مرادآبادی کا مجموعہ کلام کئی سال ہوئے "شعلہ طور" کے نام سے لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ اب اُس کا دوسرا ایڈیشن اضافہ کیساتھ جامعہ ملیہ دہلی کے اہتمام سے شائع ہوا ہے اور اُسکی قیمت بھی تین روپیہ کے بجائے ڈھائی روپیہ کردیگئی ہے۔

آجکل صوبہ متحدہ اور بعض دوسرے صوبوں کی انتظامی باگ ڈور کانگریسی وزرا کے ہاتھ میں ہے۔ چونکہ یہ حکومتیں عوام کی نمائندہ ہیں۔ اِس لئے رفاہ عام کے متعلق اُن کا نقطۂ خیال بھی ہمارے سابق حکمرانوں سے بہت کچھ مختلف ہے۔ نئی حکومتیں عوام کو فائدہ پہونچانے کے درپے ہیں اور ملک سے جہالت دُور کرنے کی بڑی کوشش کررہی ہیں۔ چنانچہ صوبہ متحدہ کی

کانگریسی گورنمنٹ نے صوبہ کے اڑتالیس ۴۸ ضلعوں میں کتب خانوں اور اخبار گھروں کا ایک جال بچھا دینے کی کوشش کی ہے چنانچہ نومبر گذشتہ سے اب تک ۷۶۸ کتب خانے اور تین ہزار چھ سو ریڈنگ روم قائم ہو چکے ہیں۔ ہر کتبخانہ کو فی الحال دو سو ۲۰۰ روپیہ قیمت کی کتابیں دی گئی ہیں۔ بیس ۲۰ روپیہ اُن کی جلد بندی کو اور بارہ ۱۲ روپیہ الماریوں وغیرہ اور دس ۱۰ روپیہ متفرق سامان کے لئے منظور کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ساڑھے اٹھارہ روپیہ سالانہ لائبریرین کو الاؤنس وغیرہ دینے میں خرچ ہوگا۔ اِس طرح ہر کتب خانہ کے لئے دو سو اکسٹھ روپیہ کا ابتدائی صرفہ منظور ہوا ہے۔

ہر ریڈنگ روم کے لئے تیرہ ۱۳ روپیہ سالانہ کے اُردو، ہندی اخبارات و رسالے خریدے گئے ہیں اور بارہ ۱۲ روپیہ سالانہ ٹیچر انچارج ریڈنگ روم کو بطور الاؤنس دیا جائے گا، ساڑھے آٹھ روپیہ سے ڈیسک، ٹاٹ اور پٹیاں وغیرہ خریدی جائیں گے، ان کتب خانوں کے لئے اب تک ایک لاکھ چون ہزار ۱۵۴۰۰۰ روپیہ کی اُردو ہندی کتابیں خریدی جا چکی ہیں۔ قریب پچاس ہزار کی اُردو کتابیں لی گئی ہیں۔ باقی ہندی کتابوں پر صرف ہوا ہے۔

اِس محکمہ کے افسر اعلیٰ رائےصاحب پنڈت سری نراین چترویدی ہیں، جنھوں نے مختلف پبلشروں سے خاص رعایتی قیمت پر کتابیں خریدی ہیں۔ جس کی بدولت ایک لاکھ بانوے ہزار روپیہ قیمت کی کتابیں ایک لاکھ چون ہزار روپیہ میں حاصل ہوئی ہیں اور بعض پبلشروں نے بعض مطبوعات ان کتب خانوں کو مفت بھی دی ہیں۔ ہم کو اُمید ہے کہ اِس اسکیم کے ماتحت عوام میں اخبارات و کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا کرنے کا مزید انتظام کیا جائے گا۔

حکومت صوبہ عنقریب ہی عوام کی جہالت رفع کرنے کی باقاعدہ جد و جہد شروع کرنے والی ہے۔ چنانچہ ۱۵ جنوری کو اُس نے صوبہ میں ہر جگہ "یوم خواندگی" منانے کا انتظام کیا ہے۔

اِسی سلسلے میں گورنمنٹ صوبہ متحدہ نے جامعہ ملیہ دہلی سے اڑتالیس ہزار روپیہ کی قیمت کی اُردو کتابیں خریدی ہیں، اِتنا بڑا آرڈر اِس سے پہلے شاید ہی ہندوستان کے کسی پبلشر کو ملا ہو۔

کچھ ہی دن پہلے تک ہماری یونیورسٹیوں میں ہندی اُردو لٹریچر کی کوئی پرسش نہ تھی مگر اب زمانہ پلٹ رہا ہے۔ چنانچہ الہ آباد یونیورسٹی کے جوبلی پر اُردو ہندی ادیبوں کی بھی قدر افزائی کی گئی اور مشہور ہندی اُردو مصنف رائے بہادر پنڈت شیام بہاری مصر و مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو کو ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری عطا کی گئی۔ پچھلے جلسہ تعلیم اسناد کے موقع پر الہ آباد یونیورسٹی یونین نے ہندوستانی ادب کے محسنوں کی قدر دانی میں ایک اور قدم یہ بڑھایا کہ ہندی شاعر پنڈت سمترا نندن پنت و شاعر اعظم حضرت جوش ملیح آبادی کی خدمت میں خیر مقدمی ایڈریس پیش کئے جسمیں وائس چانسلر صاحب اور یونیورسٹی کے تمام معززین شریک تھے۔

زمانہ

نمبر ۲ — فروری سنہ ۱۹۳۹ء — جلد ۷۲

اکبر الہ آبادی کا سنجیدہ کلام

(از سید اختر عرفانی، ایم - اے)

عموماً لوگ اکبر الہ آبادی کو ایک ظریف شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں، اور واقعی اُن کا ظریفانہ کلام عام طبائع کو تفریحی مشاغل کی دلچسپیوں میں زیادہ پسندیدہ نظر آتا ہے اور اسی لئے اُن کے کلام کا وہی حصہ زیادہ مقبول ہوا۔ چٹکیاں، اور گدگدیاں، طنز، اشارے کنائے، مزاح، چٹکلے، پھبتی، تمسخر، استہزا، چھیڑ چھاڑ، لطائف وظرائف، غرض اسی قبیل کی تمام خصوصیات جس قدر اکبر کے کلام میں ایک لطیف جدت اور شگفتگی کے ساتھ ملتی ہیں کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں پائی جاتیں۔ لیکن اگر اس فضا پر نظر ڈالی جائے جس میں اکبر کا دردمند دل کرب وآلام کی منزلیں طے کر رہا تھا تو شاید یہ امر واضح ہو جائیگا کہ اکبر کا کلام اس کشمکش حیات، اُس جدوجہدِ زندگی، اُس خستگی وحیرانی کا آئینہ ہے جس کے لئے اکبر کا دل ہمیشہ اضطراب کی کروٹیں لیتا رہا۔

درحقیقت اکبر الہ آبادی کی شاعری اس کشمکش کا نتیجہ تھی جو انھوں نے تنظیم اخلاق وتہذیب وتمدن میں صرف کی۔ اکبر جس نظم ونسق کو پسند کرتے تھے وہ خالص ایشیائی اور اسلامی تھا، لیکن وہ ایک ایسے ماحول میں سانس لے رہے تھے جو فرنگی روح اختیار کر رہا تھا۔ سوسائٹی کا یہ رویہ جو رفتہ رفتہ لوگوں کی فطرت میں شدت کے ساتھ داخل ہو رہا تھا اکبر کی وضعداری اور روحانی حسیات کو ہر وقت بےچین رکھتا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

علم نے، رسم نے، مذہب نے جو لی تھی بندش ٹوٹی جاتی ہے وہ، سب بند کھلے جاتے ہیں

اسی اضطراب نے اکبر کو شاعر بنا رکھا تھا۔ چنانچہ اکبر کی شاعری تمام تر انھیں محسوسات کا نتیجہ ہے جو ان کے قلب میں موجزن رہتے تھے۔ اکبر سوسائٹی کو ایک مجسمۂ اخلاق و ایمان دیکھنا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے وہی کام کیا جو حالی نے مسدس لکھ کر انجام دیا تھا۔ اکبر زندگی کی بنیاد انھیں اُصولوں پر رکھنا چاہتے تھے جو مذہب کے بنیادی عناصر ہیں۔ اُنھوں نے زندگی کی جدّوجہد کو مختلف صیغوں میں تقسیم کیا اور فرداً فرداً ہر عنوان پر تنقید کی محض کسی جذبۂ عصبیت کے تحت ہو کر نہیں بلکہ وہ اس کے متعلق ایک ذاتی اور خالص رائے رکھتے تھے اور ان کو یقین تھا کہ ان کا مشورہ ملّت و مذہب کے دائرے میں داخل ہے کسی طرح خارج نہیں

اکبر نے جو معیار زندگی مقرر کیا ہے اس کے اندر اُنھوں نے اخلاق کے اُصول ریاضی کے اُصولوں کی طرح بدیہیات و مسلّمات پر قائم کئے ہیں۔ فلاسفۂ متقدمین نے فلسفۂ اخلاق کی بحث علمِ انسانی سے شروع کی ہے۔ اور متاخرین نے قانونِ فطرت سے۔ چنانچہ اکبر کا نظریہ یہ ہے کہ قانونِ فطرت الہامی یا ایزدی قانون کا ایک حصّہ ہے جس کا کام انسان کے جذبات کی ترجمانی کرنا ہے، اور فطرتِ انسانی کا یہ عام خاصہ ہے کہ وہ اپنے ہم جنس کے ساتھ سلامت روی سے پیش آئے، اور اسی وجہ سے اس کے لئے چند اُصولوں پر کاربند ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ اکبر نے قانونِ فطرت ہی کو سوسائٹی میں پھیلانے کی کوشش کی وہ جو ایک ناقابلِ تبدیل قانون ہے۔

اقبال نے شاعر کو "دیدۂ بینائے قوم" قرار دیا مگر اکبر اقبال سے پہلے قوم کی عدم بصارت پر آنسو بہا چکے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

چشم بے سر ہے اب ہماری قوم خوار و نزار و خراب و ابتر ہے

جب آنکھ کو کھلنے میں ہو جھجک، جب منھ میں زباں جنبش سے ڈرے
اس قید میں کیونکر جینا ہو، اللہ ہی اپنا فضل کرے

اکبر نے بھی اقبال اور ٹیگور کی طرح مغربی تہذیب کی خود غرضی کو بخوبی محسوس کر لیا تھا۔ چنانچہ موجودہ سیاسیات و نظام معاشرت کو انانیت کی کارفرمائی سمجھ کر وہ صداقت، محبت، اخوت اور انسانیت کی تلقین کرتے ہیں۔ "اللہ ہی اپنا فضل کرے" ایک قسم کی مناجات ہے جس میں انسانیت کی جانب مائل ہونے کا تقاضا ہے

ہندوستان میں قومیت، حریت اور اشتراکیت کی تحریکیں جس قدر بھی پیدا ہوئیں اُنھوں نے ہندوستانیوں کے خیالات کی رَو کو ایک خاص سمت میں پھیر دیا۔ چنانچہ اکبر کے دل میں بھی اس کی لہر دوڑ گئی۔ اکبر موجودہ نظامِ تمدن کو جس کی بنیاد استبداد پر قائم ہے پیامِ انقلاب دیتے ہیں اور قوم کو تہذیب و شائستگی کے

ساتھ آگاہ کرتے ہیں کہ ؎

جینے والوں ہی کے ہیں ہنگامے خلق انھیں پر نگاہ کرتی ہے

اس شعر کے خاموش اشارے کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو محبوسِ قفس ہو کر کارزارِ گلشن پر نگاہ رکھتے ہوں۔ اکبر چونکہ وجدانی ذوق رکھتے تھے اس لئے انھوں نے قلبی تاثرات و محسوسات کو نظری اور عقلی مشاہدات پر ترجیح دی۔ اُن کے نزدیک زندگی میں جو چیزیں قلبی وجدان اور ولولۂ ذوق وشوق سے متعلق ہیں وہ سراسیمگی و وارفتگی پیدا کرتی ہیں جو انسان کو مجاز سے حقیقت کی جانب لے جاتی ہیں، وہ اِن چیزوں کو جو نظری اور علمی ہیں تسلیم نہیں کرتے بلکہ اُن کو جو قلب کو گرما دیں۔ درحقیقت انسان کو اپنے محسوسات سے سب سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ علمی اور عقلی ترقیاں ذہنی اُلوہیت، پرواز ذکاوت، تخیل، تصورات اور طلسم خیال کی جا ہے جس قدر منزلیں طے کریں لیکن حقیقی امن وسکون اس وقت حاصل ہوتا ہے جب قلب مطمئن اور آسودہ ہو۔ اکبر انھیں نظریوں کے حامل ہیں۔ وہ عقل وعلم کو قلب وضمیر کا رہبر قرار نہیں دیتے بلکہ چاہتے ہیں کہ قلب وضمیر ان چیزوں کی ہدایت کرتا رہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

نگاہ اُٹھتی ہے احساسِ ماسوا کے لئے کہاں ہے دل اسے روکے ذرا خدا کے لئے

فلسفۂ وحدت الوجود جس کا تعلق عقل سے نہیں بلکہ یقین سے ہے لفظی دلائل وعلمی براہین انسان کو ایک کشمکشِ پیہم اور جہدِ باہم میں ڈال دیتے ہیں مگر کسی نتیجے پر نہیں پہونچاتے۔ بیشک اس قسم کے مباحث وتنقید سے ذہنی ارتقا تو ہوتا رہتا ہے لیکن آگے چلکر یہ ارتقا انسان کو تشنہ کام چھوڑ دیتا ہے۔ جہاں نہ سود ہے نہ زیاں محسوساتِ عارف جب تزکیۂ نفس اور مطالعۂ خاموش کے تحت میں آزادانہ طور پر کام کرتے ہیں اسی وقت اسرارِ حقیقت منکشف ہوتے ہیں۔ ہوشیاری جادۂ معرفت میں سراب کا کام دیتی ہے۔ دراصل علم وعقل وہ عطیات ہیں جو انسان کو فطری طور پر مرحمت کئے گئے ہیں۔ لیکن بالآخر یہ چیزیں سطحِ ظاہر کی ہیں ؎

نورِ عرفاں عقل کے پردے میں پنہاں ہوگیا ہوش میں آنا حجابِ روئے جاناں ہوگیا
انکشافِ رازِ ہستی عقل سے ممکن نہیں متصل ہو سطحِ ظاہر سے یہ وہ باطن نہیں

جہاں ہستی ہوئی محدود، لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
عقیدے، عقل، عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

گم ہیں نظر سے نورِ حقیقت کی ہستیاں اندھیر ہیں حواس کی ظاہر پرستیاں

انکشافِ رازِ ہستی گو عقل ہی کا فعل ہے لیکن یہ وہ عقل نہیں جو ہوشیاری اور دانائی سے عبارت ہے بلکہ وہ عقل ہے جو دیوانگی اور وارفتگی کے اندر کیف ومستی پیدا کرتی ہے۔ ظاہری لوازمات ہوشیاری اور

تعقل سے عقدۂ حسنِ ازل وا نہیں ہو سکتا۔ جس قدر قطع و برید اور نقد و نظر صرف کی جائیگی اسی قدر رجحانات بڑھتے جائیں گے اور دماغ حقیقت سے بعید ہوتا جائیگا۔ دوسرے شعر میں رازِ ہستی کو باطن اور عقل کو سطح ظاہر سے تشبیہ دیکر کس قدر باریک خیال کو پیش کیا گیا ہے۔ عقل ایک ظاہری سطح ہے اُس حقیقت کی جو اس کے اندر پوشیدہ ہے!

نظری فلسفہ چونکہ اکتسابی شے ہے اس لئے اس کا دائرہ انسان کی ذہنی پرواز اور علمی استعداد پر منحصر ہے۔ عقل چونکہ اس فلسفہ کا آلۂ کار ہوتی ہے اس لئے علمی مباحث اور عقلی استدلال کا حقائق و معارف میں لانا گویا ہستی کے مقصد و نظریہ کو محدود کرنا ہوا۔ اکبر نظری انکشافات اور علمی بحث و مباحثہ کو نگاہِ اولیں سے تشبیہ دیتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے۔ یہ چیزیں واقعتاً کسی حقیقتِ ماسوا کا تجزیہ کرنے سے قاصر ہیں۔ وہ مقام جہاں انسان کی عقل ایک مجسمۂ استعجاب و حیرت بن جائے اور جہاں عقل و ہوشیاری کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں اِن چیزوں سے بے نقاب نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے مذہبِ صفا اور دینِ معرفت کا آغاز ہوتا ہے۔ ؎

نگاہِ اولیں کے دام میں اُلجھی ہے اِک دنیا نصیب ہر نظر کب ہے پہونچنا حدِ حیرت تک

اِس حدِ حیرت پر اگر کسی کی نظر پہونچتی ہے تو وہ عارف دیوانہ کی ہے جس کا تجربہ اصغر نے خوب کیا ہے ؎

اب نہ کہیں نگاہ ہے اب نہ کوئی نگاہ میں محو کھڑا ہوا ہوں میں حُسن کی جلوہ گاہ میں

اکبر کے نزدیک تو جمالِ یار کا خیال ہی برق پاشی کا سبب بنتا ہے، بھلا عقل کی تاب کہاں کہ اسے پا سکے

کیونکر دلیل دیکھ سکے اُس جمال کو جس کا خیال برق گراتا ہے ہوش پر

خودی اور بیخودی پر اقبال نے جس حد تک استدلال کیا ہے اس کا زیادہ تر حصہ اکبر کے نظریۂ حیات میں پایا جاتا ہے، دونوں کا مطمحِ نظر بڑی حد تک ایک ہے اور مقامِ اتصال بھی بڑی حد تک ایک۔ ملاحظہ ہو

خلافِ بےخودی کیوں ہے یہ وعظِ حضرتِ واعظ
خودی ہی کو نہیں سمجھائیں آخر بےخودی کیسی؟

کوشش یہ تھی خودی کو میں گم کردوں عشق میں دقت یہ ہوگئی کہ فقط عقل کھو سکا

عشق کو کیوں بے خودی مقصود ہے حُسن بعید ہے، خودی محدود ہے

منکشف ہو جائیں اسرارِ خودی بیخودی کا بھی یہی مقصود ہے۔

واقعاتِ عالم پر جس قدر غور کیا جائے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک کی ضد کا دوسری ضد کی طرف جانا اس کی ترتیب اور اس کے نقص کے ساتھ ہوتا ہے۔ بس یہی کیفیت آفتابِ وجود یا بےخودی کی ظلمت

عدم یا خودی پر عکس ڈالنے کی ہونی چاہیئے تھی اور یہی ہوا بھی۔ کہ اس کی پہلی شعاع سے زنگِ عدم دور ہوا اور حقیقت کی ابتدائی شکل وجود میں آئی۔ اس کے بعد جس حد تک یہ ضیا پاشی ہوتی گئی اسی حد تک خودی یا عدم کی ظلمتیں یعنی نقص اور عیب دور ہوتے گئے اور وجود کی کامل سے کامل شکلیں بنتی گئیں حتیٰ کہ انسان اور کامل انسان میں آکر اس "نابود" نے وہ "بود" حاصل کی کہ آفتابِ وجود کی شعاعیں اس کے اندر چمکنے لگیں اور عقل و معرفت کے نور سے ایسے جسمانی اور روحانی جلوے ظہور میں آئے کہ بعض حالات میں اس پر خود آفتابِ وجود ہونے کا گمان گذرا۔ اکبر اسی نظریے کے قائل ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ انسان نورِ خدا کا مظہر ضرور ہے لیکن ذرا سی لغزش میں کور باطن ہو سکتا ہے۔

پند و موعظت اور تنظیم اخلاق جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں اکبر کی شاعری کا نمایاں رنگ ہے۔ چنانچہ آخری فرض جو ہر نقاد یا مبصر کا ہوتا ہے یہ ہے کہ وہ خود ہمدردی اور نیک نیتی کے ساتھ صلاح و مشورہ دے اکبر نے بھی یہی کیا۔ چنانچہ اگر ان کے سارے کلام پر غور کیا جائے تو سوسائٹی کی تنقیص و تنقید کے ساتھ ہمدردانہ صلاح اور صائبِ مشورے پائے جائیں گے جو اکبر کے معلمِ اخلاق و ناظم تمدن و معاشرت ہونے کا بدیہی ثبوت ہیں۔ سہ

ذرہ ذرہ ہے خضرِ شوق تو ہو — چلنے والے کو لاکھ راہیں ہیں
سب سے بدتر بتوں سے ہے امید — سب سے بہتر خدا سے ڈرنا ہے
اب رہی بحث رنج و راحت کی — یہ فقط وقت کا گذرنا ہے
نشہ جن کو چڑھا ہے نخوت کا — اُن کے چہروں کو بھی اُترنا ہے
گُل سے پوچھو کس انتظار میں ہے — غنچہ کو تو ابھی سنورنا ہے
کہاں ثبات کا اُس کو خیال ہوتا ہے — زمانہ ماضی ہی ہونے کو حال ہوتا ہے
پسندِ چشم کا ہرگز کچھ اعتبار نہیں — بس اک کرشمۂ وہم و خیال ہوتا ہے
فروغِ مہر ہی باقی رہا نہ بت کا شباب — زوال ہی کے لیئے ہر کمال ہوتا ہے

عالمِ رنگ و بو کی بے بضاعتی و بے ثباتی شعرا کا ایک معمولی مضمون رہا ہے اور مناظرِ فطرت کے مطالعہ کرنے کے بعد وہ اپنی استعداد دماغی اور پرواز نفس و روح کے مطابق نتیجے نکالتے رہتے ہیں۔ آخری شعر میں اکبر نے بھی مشاہدۂ غنچہ و گل سے ایک پُر معنی اور عبرت آموز نتیجہ نکالا ہے "گل کس انتظار میں ہے" اور دوسرے مصرعہ میں "ابھی سنورنا ہے" لاکر معنی اور مطالب کو کس قدر بلیغ کر دیا ہے کہ دوسرے شعرا کے یہاں نہیں پہلے مصرعہ کا انداز استفہام ایک خوبصورت طرز بیان ہے۔ اس طرح شعر میں سوال و جواب کا پہلو

پیدا ہو گیا ہے۔

انسان کے فطری جذبات کا مدعا حفظِ نفس یا حظِ نفس ہوتا ہے۔ حظِ نفس یا عدم حظِ نفس پر جہاں تک اس کی ذات کا تعلق ہے جان بوجھ کر وہ کبھی عامل نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ تمام بدیوں اور برائیوں کے اندر وہ دنیا یا عاقبت میں اپنے حظِ نفس کے متعلق نیک انجام نہ دیکھتا ہو۔ مراد یہ ہے کہ انسان پر جو برائیاں یا مصیبتیں آتی ہیں وہ اس کے خیالات کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اس طرح علم و نیکی لازم و ملزوم ہیں۔ علم انسان کو نیکی کی جانب مائل کرتا ہے۔ انسان جب کسی دوسرے کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا ہے۔ وہ درحقیقت صرف خود اپنے حظِ نفس یا حفظِ نفس کے اسباب فراہم کرتا ہے۔

دنیا کا تردد جب تک تھا، جب تک کہ ہم اس کے طالب تھے
پھیری جو نظر غم ہو گئے کم، رغبت نہ رہی، دنیا نہ رہی،

کینہ و پیکار میں بھی یوں تو ہے اک حظِ نفس
زیست کا اصلی مزہ لیکن محبت ہی میں ہے

نفسِ نابینا حریص و طالبِ لذات ہے
عقل کی خدمت فقط ترتیب محسوسات ہے

بارِ دل پاتا ہوں اپنی ہستیِ غمناک کو
حسِ لذت سے ہے یاس اب قوتِ ادراک کو

بے تمیزی حس کی ہے اور نقش محسوسات ہے
دیکھتا ہے کون حسنِ صفحۂ ادراک کو

حقایق و معارف اور صوفیانہ صنفِ سخن میں اکبر ہمیشہ مذہبی دائرہ کے اندر رہ کر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اُنھوں نے فلسفۂ وحدت فی الکثرت کو مختلف اسلوب سے بیان کیا ہے جس میں لطف زبان، سلاست، لہجہ، انداز اور استدلال کی خاطر خواہ چاشنی ہے، ملاحظہ ہو ۔

آنکھوں میں اتر آتے ہیں موہوم سے نقشے ۔۔۔ دل میں یہ سمائی ہے کہ موجود وہی ہے
صفحۂ ہستی پہ آخر کس قلم کی ہے کشش ۔۔۔ نقش مٹتے ہی رہے لیکن اُبھرتے ہی رہے

جلائے جب شعلۂ تحیّر، تو ذہن ڈھونڈھے پناہ کس کی
یہ کس کے معنی ہوئے ہیں ثابت، یہ صورتیں ہیں گو اکس کی
جمالِ فطرت کے لاکھ پرتو، قبولِ پرتو کی لاکھ شکلیں

طریقِ عرفاں میں کیا بتاؤں، یہ راہ کس کی وہ راہ کس کی
یہ کس کے عشووں کا سامنا ہے، کہ لذتِ ہوش ہو گئی گم
خودی سے کچھ ہو چلا ہوں غافل، پڑی ہے مجھ پر نگاہ کس کی

بے سازِ بے مغنی یاں وجد آرہا ہے   ہر وقت بج رہا ہے، ہر ذرہ گا رہا ہے

عشق کی لذت آفرینیاں کوئی اس کے دل سے پوچھے جو کبھی زندگی میں کسی عشوۂ لبِ لعل اور نگاہِ ناز سے آشنا ہوا ہو۔ زندگی بھی وہ نہیں جو نشۂ شباب کی فریب خوردہ ہو بلکہ ایک پاک اور بے داغ زندگی جس کو دیدۂ پُر تمنا نے مصروف اشک ریزی رکھ کر اس مقام پر پہونچا دیا ہو جہاں مجازِ حقیقت سے ہمکنار ہو کر ایک بلند و رفیع احساس پیدا کر دیتا ہے۔ اکبر اس مقام پر آکر کہتے ہیں ؎

مری اُنکی نگاہیں لڑ گئی تھیں رات محفل میں   یہ دنیا ہے بس اتنی بات پھیلی داستاں ہو کر
نظر وہ ہے جو دل پر نقشِ حسنِ مدعا کھینچے   نفس وہ ہے کہ جو سینے سے آہِ دلکشا کھینچے
وہ جاں اچھی جو مستِ وعدۂ دیدارِ فردا ہو   وہی دل خوب جو یہ انتظارِ جاں فزا کھینچے

فرومایۂ عشاق کی محبت کا سدرۃ المنتہیٰ وصلِ معشوق ہے اور بس، لیکن ایک بلند مقام عاشق کا مطمح نظر اس سے بھی آگے ہے۔ حسنِ مدعا کی داد دیجئے جس نے اکبر کے نظریۂ جبر و اختیار کو آنا بلند کر دیا ہے۔

عام طور پر شعرا عشق بلا سنج کی تصویر کا ایک ہی رُخ دکھاتے ہیں، زیادہ تر نظر قنوطیت و آزردگی کی جانب مائل ہوتی ہے۔ لیکن اکبر کی بلند ہمتی اور ذوقِ خستگی ناکام محبت ہونے کے باوجود اس مائدۂ نعمت سے اپنے کام و دہن کو دوسرے پیرایہ میں لذت یاب پاتے ہیں۔ ؎

جام ہے غیر کو دو، میں نہ کروں گا شکوہ   رنج کی بات ہے، پی جاؤں گا آنسو کی طرح

اکبر درد و آلام ہی کو عین زندگی سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی ایک کشمکشِ دوام اور اضطرابِ مدام کا نام ہے

قرار دل کو نہیں حسنِ انتشار تو ہے   وصالِ یار نہیں ہے، خیالِ یار تو ہے

کوئی جدت نہیں، معنی صاف ہیں، البتہ قرار دل کے ساتھ حسنِ انتشار کا ٹکڑا قابل غور ہے، قرار کے ساتھ وصال اور خیال کے ساتھ انتشار کے لطیف اشارے قابل داد ہیں۔

جمال ایک خیال ہے جو مادّہ کے لباس میں جلوہ گر نظر آتا ہے، وہ حیات سے بھی زیادہ ترقی یافتہ چیز ہے جو حیات کو بھی بھلا دیتی ہے۔ ایک نوجوان اپنی محبوبہ کے چہرے پر نگاہ ڈالکر اپنے قلب کو سکون

سے بھر لیتا ہے، کبھی وہ مغنیٔ حسن سے متاثر ہوکر اپنی موسیقی کے بازوؤں سے فضا میں اُس تاثیر کو پھیلا دیتا ہے اور اپنی ہر آواز کے ساتھ اپنی روح کے اجزا کو صرف ہوتے ہوئے دیکھتا ہے ؎

تھا کیا ہی سماں، تھی کیا ہی وہ شب، سینے ہی میں تھے اسبابِ طرب

ہر حرکتِ دل ایک نغمہ تھی، ہر تارِ نفس سازِ زندہ تھا

جذبات، تشبیہات اور استعارے کے مخلوط اثر نے شعر میں کیسی حلاوت پیدا کردی ہے؛ حرکتِ دل کے ساتھ نغمہ اور تارِ نفس کے ساتھ سازِ زندہ کا تلازم کتنا دلکش اندازِ بیان ہے!

اکبر کے عشقیہ اشعار بھی خوب ہوتے ہیں ؎

جب تمہارا خیال آتا ہے ساری دُنیا کو بھول جاتے ہیں

سنبھالیں دل کو کہ ہم حالتِ جگر دیکھیں تمام آگ لگی ہے کدھر کدھر دیکھیں

صبر رہ جاتا ہے اور عشق کی چل جاتی ہے ضبط کرتا ہوں مگر آہ نکل جاتی ہے

پائی نہ کسی میں بُو وفا کی چاہا تھا کسی کے ہو رہیں ہم

ایک دن اور قیامت کھسک آئیگی ادھر اور کیا عرض کروں آپ سے کل کیا ہوگا

دل کی بیتابی ہے ظاہر آنکھ کے اظہار سے بجلیاں پیدا ہوئی ہیں آنسوؤں کے تار سے

کیا ہو رہا ہے دل پہ اثر کچھ نہ پوچھیے کس کی پڑی ہے مجھ پہ نظر کچھ نہ پوچھیے

مایوسی نے محفوظ کیا اُمیدوں کی بیتابی سے اب اشک بھی تھمتے جاتے ہیں اب دل بھی ٹھہرا جاتا ہے

مشاہدۂ موجودات میں اکبر کا رنگ دوسرے شعرا سے بالکل جدا ہے اور وہ محض اس وجہ سے کہ اکبر کی شاعری خلوت نشینی اور رامش و رنگ کا نتیجہ نہ تھی بلکہ مطالعۂ نفس، مشاہدۂ فطرت، تجزیۂ محسوسات قوم و ملت، تمدن، مذہب، تہذیب و معاشرت اور حقائق و معارف کے ان تجربات کا ثمرہ تھی جن سے

اکبر اپنے نظریہ کی رنگ آمیزی کیا کرتے تھے۔ اکبر کے متعلق جو اعتراض آجکل کے ادیب عام طور پر کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ انکے کلام میں "شعریت" نہیں۔ لیکن اکبر نے خود اپنے رنگ میں ان معترضین کو جو جواب دیا ہے وہ کس قدر مناسب اور برمحل ہے۔ ؎

پیٹیں یہ نگاہیں لاکھ طرح، خود اپنی مشاہد ہو نہ سکیں
کیا اصل و حقیقت ہے اپنی، ادراک کو یہ ادراک نہیں

حقیقت یہ ہے کہ اکبر شاعر کو سوسائٹی کا کوئی عضو معطل نہیں، بلکہ اس کو ہوشیاری اور بیداری کا مجسمہ سمجھتے ہیں، چنانچہ اس کا ثبوت وہ خود اپنی ذات سے دیتے ہیں ؎

دل وہ ہے جو فریب نظر کو سمجھ سکے آنکھیں وہ ہیں جو ژرف نگاہی کے ساتھ ہیں

اکبر اخلاق کے بہت بڑے معلم تھے اور واقعات کے بہت بڑے مبصر، ان کی نظریں جب کسی چیز پر پڑتی ہیں تو اس کے سنجیدہ اور علمی پہلو پر۔ ان کے دل میں جو ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ وہ کسی حجاب آفرین" پیکر جمال" کی "دزدیدہ نگاہی" کا نتیجہ نہیں ہوتا نہ کسی "حسن لب بام" کی "پراگندگی نقاب" کی ادا شناسی کا ثمرہ۔ بلکہ ان کی بیتابی صاعقہ کی بیتابی ہے جو محض اس لئے تڑپتی ہے کہ فضا کے تضاد اور انتشار کو ہموار کر کے برق پاروں کو فطری سطح پر لے آئے۔ ان کی بیچینی شعاع آفتاب کی بیچینی ہے جو محض اس لئے سرگرداں ہے کہ نور و ظلمت کے افتراق کو مٹا کر تجلی کے محاذ کو وسیع کر دے۔

شاعری میں حکمت و فلسفہ کے تمام شعبے داخل ہیں یا نہیں؟ اس وقت یہ موضوع زیر بحث نہیں مگر یہاں اتنا عرض کرنا بیجا نہ ہوگا کہ شعر حقیقتاً اُس شعور معنوی کا نام ہے جس کا تعلق انسان کے صرف احساسات لطیفۂ روحانیت سے ہے۔ اس لئے میرے نزدیک ایک شعر کا تعلق اخلاقیات سے ہو سکتا ہے۔ لیکن حکمیات غیر اخلاقی سے اس کو متعلق کرنا خواہ مخواہ کی جسارت ہوگی۔ شاعری کبھی بھی فطرت سے منحرف ہو کر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ تمام عالم میں جس صنف سخن کو کافی ترقی ہوئی وہ وہی ہے جس کو "عشقیہ" (Erotic or Amatory) کہتے ہیں۔ اس کی مقبولیت کا راز اس کے فطری بانکپن اور قدرتی انداز میں مضمر ہے۔ لیکن واضح رہے کہ ایسی شاعری کا تقاضا محض "جنسیین" ہی سے نہیں بلکہ وہ مذہب، اخلاق، مناظر فطرت، قوم و ملک ہر ایک سے وابستہ ہونا چاہیئے۔

اکبر کے خلاف جو اعتراضات معرض بیان میں لائے جاتے ہیں وہ ایک طرح بجا اور درست ہیں اور اگر اکبر زندہ ہوتے تو غالبا وہ غالب کے ساتھ کھڑے ہو کر کہہ دیتے کہ ؎

کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

حقیقت یہ ہے کہ اکبر کا منتہائے شعر و شاعری محض لطفِ بیان، سلاستِ زبان، بندش کی چستی اور مضمون کی دلآویزی نہ تھا۔ وہ اپنا مطمحِ نظر اس قدر بلند رکھتے تھے کہ اُردو زبان ادائے مطلب اور اظہارِ خیال کے لئے ناکافی ہے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

اکبر یہ رحم فرما اے خالقِ معانی الفاظ سے نہیں ہے تسکین اس کے دل کو

چنانچہ اکبر کو محض ایک ذوقی اور اکتسابی شاعر سمجھکر ان کے کلام پر تنقید و تبصرہ کرنا اخلاقی بدعت ہے۔ اکبر کا سارا کلام دیکھ ڈالئے آپ باوجود سعی و کاوش کے ایک مصرعہ بھی ایسا نہ پائیں گے جو ان کے حقیقی رنگ اور ان کے اصلی پیام سے علٰحدہ ہو۔ ان کی شاعری یکسر صرف اس جذبہ کے اظہار کے لئے وقف تھی کہ خالق و مخلوق کا تعلق نہایت و لانہایت کا تعلق ہے اور کائنات کا ذرّہ ذرّہ جو حقیقتاً ایک پرتو ہے اسی آفتابِ کبریائی کا اور اپنے جزِ اصلی اپنے منبعِ فطری تک پہونچنے کے لئے بیتاب ہے اور یہ تمام جستجو یہ تمام ہنگامۂ عالم ایک حیرت ہے غیر متناہی، ایک کشمکش ہے ابدی، ایک بیکسی اور بیچارگی ہے ناقابلِ علاج، اکبر نے صرف فلسفۂ تکوین کو سامنے رکھا ہے اور اس میں خصوصیت کے ساتھ خالق و مخلوق کا تعلق، قدرت کی بے پایاں وسعت، اس کے مظاہر و آثار، اپنی محدود و ناکام جستجو، اور آخر میں وحدت الوجود جو نتیجہ ہوتا ہے اس قسم کے تجسس کا، یہ سب کچھ ہے۔

اکبر نے مذہب اور اصول مذہب کو انسانیت کے درد کا درماں بتایا ہے جس کی وجہ سے ان کا پیغام کسی طرح متضاد و مبہم نہیں ہے۔ اکبر میں اور موجودہ دَور کے دوسرے شعرا میں (اقبال، ٹیگور وغیرہ چند شعرا کو چھوڑ کر) جو افتراق عام ہے وہ یہ کہ ان لوگوں نے جو کچھ کہا ہے اس سے پہلے خود سمجھ نہیں لیا ہے۔ اکبر جو کچھ کہتے ہیں خود سمجھتے اور جانتے ہیں۔ دوسرے شعرا اپنے مسلک اور مذہب کو شاعری کے پردے میں چھپانا چاہتے ہیں اور پڑھنے والے کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ مذہبی واعظ بن کر سامنے آرہے ہیں یا محض ہندوستانی کے جامہ میں جلوہ گر ہیں۔ یا ان لوازم سے مادر اور اس ہیولیٰ کی شکل میں جو ذہنِ فطرت میں پہلے پہل مرتسم ہوا تھا، یعنی محض انسان مطلق کی صورت میں۔ لیکن اکبر جب سامنے آتے ہیں تو ایک مبصرِ بیدار، ایک ناظمِ تہذیب، ایک معلمِ اخلاق اور ایک شاعرِ حقیقت نواز، ایک مومن وضعدار، ایک صوفی صافی اور ایک عارفِ محقق بنکر اور پھر ؎

ہر چند بگولہ مضطر ہے، اِک جوش تو اس کے اندر ہے

اک وجد تو ہے، اِک رقص تو ہے، بےچین سہی، برباد سہی

"گُلِ نوخاستہ"

(از مسٹر جگدیش سہائے سکسینہ بی۔ اے، ایل ایل۔ بی، (شاہجہانپور)

—(۱)—

اے گُلِ نوخاستہ، اے زادۂ فصلِ بہار!
تیرا کھِلنا ہے چمن میں خندۂ بے اختیار

شام ہو یا ہو سحر، ہنسنے سے تجھکو کام ہے
تو ریاضِ دہر میں ناواقفِ آلام ہے

بےخبر گلچیں سے ہے، غافل ہے تو انجام سے
گوش ہیں ناآشنا تیرے خزاں کے نام سے

خوفِ صرصر ہے، نہ فکرِ بلبلِ دلگیر ہے
تو خوشی کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے

تیرا پیمانہ شرابِ عشق سے لبریز ہے
دردمندوں کو ترا منظر سرور انگیز ہے

—(۲)—

دلربائی کس قدر تیرے رُخِ زیبا میں ہے
خود فراموشی کا عالم حسنِ بےپروا میں ہے

تیری زینت کو بڑھاتے اور بھی گلشن میں ہیں
یہ دُرِ خوش آبِ شبنم جو ترے دامن میں ہیں

حُسن سے تیرے ثباتِ رونقِ گلزار ہے
تو چمن کے واسطے اِک دولتِ بیدار ہے

سوز ہو کیونکر نہ مرغانِ چمن کے ساز میں
نغمہ پیرا ہیں یہ تیری جلوہ گاہِ ناز میں

ترا سودا ہے ازل سے نرگسِ بیمار کو
تو نے دیوانہ بنایا عندلیبِ زار کو

—(۳)—

کس قدر دلکش ہے یہ رعنائی و مستی تری
سرخیِ افسانۂ طفلی ہے ہر ہستی تری

شوق تیرا جانبِ گلزار لاتا ہے مجھے　　اپنے بچپن کا زمانہ یاد آتا ہے مجھے

میں بھی دنیا میں کبھی ناواقفِ آلام تھا　　تیری صورت بے نیازِ گردشِ ایام تھا

وہ بہارِ زندگی اب اے گلِ گلشن گئی　　تیری ہستی عمرِ رفتہ کا مرقع بن گئی

تیرے نظارے سے دل کو شاد کر لیتا ہوں میں　　ایک دنیائے نشاط آباد کر لیتا ہوں میں

(۴)

حیف دو دن کے لئے تسکیں فزائے دل ہے تو　　بوستاں میں اک نمودِ حسنِ مستعجل ہے تو

آج تیرے حسن سے روشن ہے ایوانِ بہار　　کل ترے ماتم میں ہوگا چاک دامانِ بہار

آہ یہ آئینِ قدرت کس قدر جاں سوز ہے　　صورتِ رقصِ شرر ہے جو نظر افروز ہے

برق کی چشمک شفق کا جلوۂ دلگیر ہے　　خندۂ یکدم ظہورِ صبح کی تنویر ہے

دہر میں ہر زشت و زیبا گو فنا انجام ہے　　حسن میں رنگِ بقا لیکن برائے نام ہے

کچھ سمجھ میں رازہائے زندگی آتے نہیں　　صورتِ گل خارِ صحرا جلد مرجھاتے نہیں

جب نہ تھا رنگِ بقا یا رب بہارِ حسن میں　　دلربائی بھی نہ ہوتی جلوہ زارِ حسن میں

باغِ عالم میں اسیرِ رنگ و بو ہوتے نہ ہم
صورتِ گل ہنس کے شبنم کی طرح روتے نہ ہم

انسان کا مستقبل

بصیرتوں پر ہے عکس افگن، بصارتوں پر چھپا ہوا ہے　　وہ بابِ مستقبلِ درخشاں جو بہرِ انساں کھلا ہوا ہے

تمام اجزا رواں دواں ہیں ازل ہی دن سے کمال کی جانب　　لگی ہیں اک عمر سے نگاہیں ہر ایک کانٹے کی گل کی جانب

مطیع ہونے کی عنصروں میں خود اس طرح کشمکش ہے جاری　　ملے گی انساں کو رفتہ رفتہ دیارِ قدرت کی شہریاری

فرشتے جو ہو گئے ہیں پائے انساں قدم پہ جھک جائیگا دو عالم　　ضمیرِ انسانیت کے اندر مچل رہی ہے وہ سعیِ پیہم

نواب تاج محل صاحبہ

(از شیخ تصدق حسین صاحب بی اے۔ ایل ایل بی۔)

ببجّو طوائف متوطن حسن پور بندھوا و مقیم شہر لکھنؤ دولتِ حسن سے مالا مال تھی، اُس کی ایک لڑکی حسینی نامی تھی۔ وہ بھی ناچ گانے میں طاق اور حسن و جمال میں شہرۂ آفاق تھی۔ شادی بیاہ کے جلسوں میں مجرا کرنے بھی جایا کرتی تھی۔ اور ایک عالم اُس کے شمعِ رُخ کا پروانہ ہو رہا تھا۔ نصیر الدین حیدر شاہ اودھ بھی اِس قتالۂ عالم کے حسن کرشمہ ساز اور شمشیر ابرو کے گھائل ہو گئے، اور داخلِ محل کر کے "خورشید محل" خطاب عطا کیا۔ اس کے بعد ایک روز بادشاہ نے مذاقاً اپنا تاج خورشید محل کو پہنا دیا اور نواب تاج محل خطاب دیگر ممتاز و سربلند فرمایا۔

کچھ دنوں کے بعد بقول سید کمال الدین حیدر مصنف تواریخ اودھ مرزا حسین بیگ جو سواروں میں نوکر تھے تاج محل کے باپ مشہور ہوئے۔ بیگم کی ماں کی سفارش سے نواب گنج چھ لاکھ روپیہ سال کی اُن کی جاگیر ہوئی۔ داروغہ ڈیوڑھی ہوئے، اُن کی نئی امارت سپاہگری کے ساتھ ہوئی۔

نصیر الدین حیدر بتاریخ ۱۸۔ اکتوبر ۱۸۲۷ء اورنگ سلطنت پر جلوہ گر ہوئے، تخت نشینی سے ایک سال کے اندر ہی اُن کا عقد تاج محل کے ساتھ ہوا۔ اور بتاریخ یکم مارچ ۱۸۲۹ء انھوں نے باسٹھ لاکھ چالیس ہزار روپیہ سکہ چلن بہ تقرر سود پانچ روپیہ فیصد سالانہ حسب معاہدہ گورنمنٹ انگریزی کو بطور قرض دوام دے دئیے جس کے معاوضہ میں حسب منشار تاجدار اودھ گورنمنٹ انگلشیہ منجملہ دیگر بیگمات کے تاج محل کو مبلغ چھ ہزار روپیہ ماہوار بطور وثیقہ ادا کرنے کی پابند ہوئی۔ نیز یہ طے پایا کہ یہ وثیقے دوامی طور پر بیگمات نامزد شدہ کو اور اُن کے بعد اُن کے ورثار کو ملتے رہیں۔ اگر کسی محل کا وارث نہ ہو تو اُس کو اختیار ہے کہ جس کسی کو اور جس غرض اور مقصد کے لئے چاہے وصیت کر دے۔ مگر برٹش گورنمنٹ نے یہ اختیار اپنے ہاتھ میں رکھا کہ وہ جب مناسب خیال کرے کسی وارث کو وہ کل رقم ادا کر کے جس کے سود سے اُس کو وثیقہ ملتا ہے وثیقہ دینا موقوف کر دے۔

۱۸۔ اکتوبر ۱۸۲۸ء کو شاہ نصیر الدین حیدر نے اپنی تاجپوشی کا سالانہ جشن بڑے کروفر اور دھوم دھام

سے منایا۔ اِس موقعہ پر ایک معزز انگریز خاتون کو محل سرائے شاہی میں باریابی کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔ انھوں نے اپنی ایک ہمجولی کو اپنے مکتوب میں بیگماتِ شاہی کی تصویر حسب ذیل الفاظ میں کھینچی ہے:-

”شاہ حال نصیر الدین حیدر کی بیگمات نہایت نفیس شاہانہ لباس زیب تن کئے تھیں، اور اُن ماہرو اور گل اندام حسینوں کی مانند معلوم ہوتی تھیں جن کا تذکرہ الف لیلہ میں آیا ہے۔

اُن کی ایک بیگم تاج محل اتنی حسین وجمیل اور گلعذار ہیں کہ انھیں دیکھکر میرا طائرِ خیال معًا لالہ رخ کی طرف پہونچ گیا، گویا وہ اپنی پوشاکِ عروسی میں ملبوس عین بعین چوتھی کی دُلہن کی طرح بنی ٹھنی بیٹھی ہے، گوری اور سانولی عورتوں میں اتنی پیاری اور موہنی شکل از سرتاپا نور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی میری نظر سے کبھی نہیں گذری۔ وہ نکہ سکھ سے بالکل درست ہیں، اور ایسی نرگسی آنکھیں اور خمدار ابرو چشم فلک نے بھی کبھی نہ دیکھے ہونگے۔ اُن کی شادی کو صرف ایک یا دو مہینے گذرے ہیں، اور ابھی انھوں نے صرف چودھویں سال میں قدم رکھا ہوگا، مگر شباب اُن پر پھٹا پڑتا ہے، قد بھی اُن کا نہایت موزوں بوٹا سا ہے ہاتھ پاؤں چھوٹے اور خوشنما ہیں، اور چہرہ پر صد درجہ کا بھولا پن ہے، غرضیکہ پورا سراپا ایسا پاکیزہ اور دلکش ہے کہ اگر تم صرف ایک نظر دیکھ لیتیں تو اُن کے بادۂ حسن سے مدہوش ہوجاتیں۔

اُن کی پوشاک گہرے سُرخ رنگ کے زربفت کی تھی، اور بالوں میں حقیقتًا موتی پروئے تھے جن کی لمبی لمبی لڑیاں جن کے سروں پر بڑے بڑے آبدار موتی تھے بالوں کے ساتھ مِل جُل کر علٰحدہ علٰحدہ گردن تک لٹک رہی تھیں، اور سر کے دونوں جانب زلفوں میں خوشنما پیچ وخم دیکر چارلس دوم Charles II شاہ انگلستان کی پریرو اور مہ پارہ بیگمات کی طرح پٹیاں جمائی گئی تھیں۔ پیشانی پر ایک مختصر سا طلائی حلقہ تھا جس کے زیریں حصہ میں نصف پیشانی تک بڑے بڑے سڈول اور آبدار موتی لٹک رہے تھے بیچ بیچ میں زمرد کی لڑیاں تھیں[1]

اس جہیز کے بالائی جانب ہما کی شکل کا ایک زیور زیب فرق کئے تھیں جس کے پروں سے موتیوں کی بڑی بڑی لڑیاں نکل کر سر کے بالائی حصے پر پھیل گئی تھیں[2] جس طرح ہم لوگ اپنے بال اوپر کی طرف چڑھا لیتے ہیں، اُن کے گوشوارے بڑی بڑی بالیوں کی قطع کے تھے جن میں سے موتیوں کی بڑی بڑی لڑیاں جن کے درمیان زمرد کی لڑیاں تھیں چاروں طرف لٹک رہی تھیں۔ ان لڑیوں کے موتی بتدریج بڑے ہوتے گئے تھے[3]

ناک میں نتھ بھی تھی جس میں بڑے قدو قامت کے گول اور سڈول موتی تھے، اور وسط میں زمرد کی چُنی تھی، اور ہار و مالے تو اتنی کثرت سے زیب گلو کئے تھیں کہ اُن کی تفصیل بیان سے باہر ہے۔

---

[1] چاند ٹیکے سے مراد ہے۔ [2] جھمکے سے مراد ہے۔ [3] جھالوں سے مراد ہے۔

اُن کی آستینیں لمبی تھیں، جو کہنی کے مقام سے کھلی ہوئی تھیں، اور اُن کی چوڑی چکلی پوشاک جسم کے زیریں حصہ کو پورے طور سے ڈھانکے ہوئے تھی جس میں بالائی حصۂ جسم کے لئے ایک تنگ اور چست کرتی جوڑ دی گئی تھی جو گلے کے مقام پر کھلی ہوئی تھی۔[1]

جب وہ خرامِ ناز کرتی تھیں تو کئی خادمائیں اُن کی پوشاک سنبھالنے کو ساتھ چلتی تھیں، اور جب وہ کوچ پر رونق افروز ہوتی تھیں تب بھی پیش خدمتیں اُن کی پشت پر کھڑی رہتی تھیں۔ تاکہ جب نقل و حرکت سے اُن کے زیورات زر بفت کی رضائی میں جو وہ اوڑھے ہوئے تھیں اُلجھ جائیں تو یہ لوگ پھر قرینہ سے کردیں۔ یہ حُسن کی دیوی آجکل دوسرے محلات کے لئے بہت ہی رشک و حسد کا باعث بنی ہوئی ہے اور بادشاہ سلامت اور اُن کی والدہ معظمہ دونوں ان کو بہت عزیز رکھتے ہیں، اور اعزازی خطابات سے بھی افتخار بخشا ہے۔"

فانی پارکس (Fanny Parkes) ایک فرانسیسی خاتون بزمانۂ حکومت شاہ نصیر الدین حیدر بسلسلۂ سیاحت ہندوارالسلطنت لکھنؤ میں بھی وارد ہوئی تھیں۔ اُنھوں نے اپنے سفرنامہ میں تاج محل کے متعلق حسب ذیل تحریر کیا ہے :-

" تاج محل کے داخلِ حرم ہونے سے قبل بادشاہ کو اپنے ولایتی محل دختر والٹرز سوداگر الملقب بہ نواب مخدرۂ علیا کی بہت چاہت اور الفت تھی۔ مگر تاج محل سے شادی رچانے کے بعد بادشاہ اُن کی چاہ میں ایسے ڈوبے کہ ولایتی محل کی مطلق پروا نہ رہی اور اُن کا ستارۂ اقبال بالکل غروب ہوگیا۔"

نصیر الدین حیدر دل پھینک اور متلون مزاج آدمی ہیں، اُن میں یہ وصف بھی ہے کہ اُن کا پیمانۂ دل تو شراب الفت سے لبریز رہتا ہے مگر منظور نظر پوشاک کی طرح بدلتے رہتے ہیں، چنانچہ تاج محل جیسی قمر طلعت و پری پیکر عورت بھی زیادہ عرصہ تک اُن کو اپنے حلقۂ اثر میں نہ رکھ سکی، اور تھوڑے ہی زمانے کے بعد اعلیٰ حضرت دوسری بی حسینی الملقب بہ بادشاہ محل کی زلف پرپیچ میں گرفتار ہوکر اُنھیں کا کلمہ پڑھنے لگے، اور تاج محل کی طرف سے سرد مہری ہوگئی۔ اور اُن کا آفتاب عروج پورے طور پر گہن میں آگیا۔"

ایک دوسرے مقام پر موصوفہ تحریر کرتی ہیں :-

"تاج محل بادہ گلگوں سے بھی شوق کرتی ہیں، اور بادشاہ کی مے نوشی کا کل سازوسامان اُنھیں کی محل سرا میں رہتا ہے۔"

نصیر الدین حیدر نے بماہ جولائی ۱۸۳۷ء زہر خورانی سے انتقال کیا۔ اُن کے بعد محمد علی شاہ اُن کے

---

[1] غالباً منشائے مصنفہ کی پیشواز سے مراد ہے۔

چچا پانچ برس تک تخت شاہی پر جلوہ افروز رہے۔ اُن کے بعد اُن کے فرزند امجد علی شاہ بھی بمدت پانچ سال تاجدار اودھ رہے۔ اُن کی رحلت کے بعد اُن کے پسر دوم جان عالم واجد علی شاہ نے تخت موروثی پر جلوس فرمایا۔

اس دس سال کی مدت میں جو واقعات بیگمات شاہی کے متعلق پیش آئے اُن کی نسبت سید کمال الدین حیدر اپنے مخصوص انداز میں حسب ذیل رقم طراز ہیں:-

"صاحبات محل، اہل ذمائق، نواب مبارک محل صاحبہ، ولایتی محل، ممتاز محل، سرفراز محل، تاج محل، نواب ملکۂ جہاں صاحبہ، فارغ البال رہتی تھیں۔ اور ظلِ حمایت صاحب رزیڈنٹ میں باستراحت تمام خواب راحت میں آرام کرتی تھیں۔ ہر چند بہ سبب ظنونِ فاسد جو خلاف شاہی ہوتے تھے، اور متواتر مداخلت بے محل اغیار سے اکثر وزرائے سلطنت سے ممانعت ظاہر ہوئی کس واسطے کہ حفظ ناموس اسلاف کرام حاکم وقت پر لازم ہے۔ چنانچہ نواب منتظم الدولہ (حکیم مہدی علی خاں) نے بہت تاکید اس انتظام میں بحکومت جاہی اور میر منشی صاحب ریزیڈنٹ بسفارش بحیلہ وثیقہ چاہتے تھے۔ کہ مداخلت بیجا کریں، نواب نے روبروے صاحب ریزیڈنٹ معقول کیا اور بعض وزرا نے دھمکا کر اپنی صورت نفع نکالی اور پھر اس کا انتظام قرار واقعی نہ کیا۔ بیگمات نے بھی اپنی عادات قدیمہ سے ہاتھ نہ اُٹھایا۔"

چنانچہ ۱۸۴۹ء میں بعہد حکومت واجد علی شاہ تاج محل نے پیٹ سے پاؤں نکالے اور بدأطواری پر کمر باندھ لی۔ اسی اثنا میں اُن کے یہاں ایک لڑکی کی پیدائش نے اُن کے کرتوتوں کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اُن کی بدچلنی اور بے راہ روی تمام دنیا پر روشن ہوگئی اور شہر میں بڑا غلغلہ اُٹھا۔ گھر گھر چرچے ہونے لگے، میر کلب حسین پسر جناب سید علی صاحب مجتہد العصر تاج محل سے تعلق رکھنے کی علت میں گرفتار ہوگئے اور بحکم نواب ناظر محلات شاہی سزایاب ہوکر قید و بند کی سختیاں بھی جھیلیں۔

واجد علی شاہ نے بخیال مزید حفظِ ناموس شاہ نصیر الدین حیدر تاج محل کے مکان پر چوکی پہرہ بھی بٹھادیا۔ اس پر انھوں نے سخت بیزاری اور ناخوشی کا اظہار کیا اور بادشاہ کو مطعون بھی کیا کہ وہ اس حیلہ سے مجکو اپنے تصرف میں لانا چاہتے ہیں مگر واجد علی شاہ اس الزام کو بالکل بے سروپا بتاتے تھے۔ اُن کا بیان تھا کہ خود تاج محل مجھ پر ڈورے ڈالتی تھیں اور لگاوٹ کرکے مجھے اپنے قابو میں لانا چاہتی تھیں۔ اسی غرض سے انھوں نے قطب علی خاں ستار باز اور اپنی مغلانی کو بھی میرے پاس بھیجا تھا۔ مگر میں نے بہ پاس و لحاظ اپنے بزرگ شاہ نصیر الدین حیدر انھیں صاف جواب دیدیا کہ مجھے یہ فعل منظور نہیں ہے۔

---

[1] محل خانۂ شاہی

واجد علی شاہ کی اس سخت گیری کو سلیمن صاحب رزیڈنٹ اودھ نے بھی ناپسند کیا، اور اُن کو تحریر کیا کہ تاج محل کے مکان سے پہرہ ہٹالیں، لیکن اگر مناسب خیال فرمائیں تو نگرانی کے لئے ایک محلدار مقرر کر دیں علاوہ بریں ایک حکمنامہ بھی ہر وثیقہ دار بیگم کے نام بھیجدیا کہ ہم نے محلات کی نگرانی اور دیکھ بھال کے لئے ایک محلدار مقرر کیا ہے تاکہ وہ پندرھویں روز بیگمات کے حرکات وسکنات سے مطلع کرتی رہے۔ اس کی تنخواہ صاحبانِ محل کے ذمہ ہوگی۔ اس کے علاوہ ایک داروغہ بھی سرکار شاہی سے مقرر ہوا تاکہ وہ بھی بیگمات کے پوشیدہ حالات سے مطلع کرتا رہے۔ اس جدید انتظام سے بیگمات کے حواس جاتے رہے۔ ہر طرف نقرئی وطلائی گھوڑے دوڑنے لگے مگر کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

واقعات مرقومہ بالا کی تائید وتصدیق سلیمن صاحب کے مراسلوں سے بھی ہوتی ہے۔ موصوف اُسی زمانہ میں رزیڈنٹ اودھ تھے اور سلطنت اودھ کے نظم ونسق کے متعلق سرکار انگلشیہ کو رپورٹ مرسل کرنے کے لئے اودھ کا دورہ کر رہے تھے۔ اس واقعہ کے بارے میں اپنے سفرنامۂ اودھ کی جلد دوم میں وہ تحریر کرتے ہیں:۔

"تاج محل ابتک بقیدِ حیات ہیں، اُن کو چھ ہزار روپیہ ماہوار پنشن بذمہ داری برٹش گورنمنٹ برابر مل رہی ہے۔ اُن کے یہاں ایک لڑکی کی پیدائش کے بعد یہ مناسب خیال کیا گیا کہ اُن کو زیرِ نگرانی رکھا جائے تاکہ مزید ولادت ہونے سے شاہ نصیر الدین حیدر کی اور زیادہ رسوائی وبدنامی نہ ہو۔"

ایک خط موصوف نے اسی واقعہ کے متعلق کپتان برڈ (Captain Bird) اسسٹنٹ رزیڈنٹ اودھ کو بھی بتاریخ ۵۔ دسمبر ۱۸۴۹ء اپنی قیام گاہ نواب گنج سے حسب ذیل مضمون کا روانہ کیا تھا۔

"تاج محل کے متعلق میں نے رچمنڈ صاحب (Richmond) اسسٹنٹ رزیڈنٹ کے حکم کے مطابق کارروائی کی کہ اگر اعلیٰحضرت (واجد علی شاہ) کو منظور ہو تو تاج محل پر ایک محلدار مسلط کر دیں مگر سپاہیوں کو واپس بلالیں، اور آپ کو اس امر پر زور دینا چاہیئے کہ میرے حکم کے موجب تاج محل کے مکان سے سپاہی فوراً ہٹالئے جائیں۔"

ایک اور خط بتاریخ ۱۰۔ دسمبر ۱۸۴۹ء موصوف نے اپنی فرودگاہ بہرائچ سے کپتان برڈ کو مندرجہ ذیل مضمون کا بھیجا تھا۔

"تاج محل کے متعلق میرا آخری حکم یہ تھا کہ وہ ایک محلدار کو جس کو بادشاہ نامزد کریں، اپنے مکان میں قیام کی اجازت دیں، لیکن اُن کو اس امر پر مجبور نہ کیا جائے کہ سپاہیوں کا پہرہ بھی اُن کے مکان پر قائم رہے۔ میں اس مضمون کا ایک مراسلہ جہاں پناہ کو بھی بھیج چکا ہوں اور میرے حکم پر قطعی طور سے عملدرآمد

ہونا چاہیئے۔ تاج محل ایسی آوارہ منش اور بے ادب عورت ہے کہ اگر وہ میرے حکم سے سرتابی کرکے بادشاہی مقررکردہ محلدار کو اپنے یہاں نہ رہنے دیگی تو میں سخت سے سخت کارروائی کرنے پر مجبور ہو جاؤنگا۔"

یہ امر واقعہ ہے کہ نواب تاج محل اور میر کلب حسین دونوں ایک دوسرے کے ایسے عاشق زار اور بادۂ الفت سے اتنے متوالے اور سرشار ہو رہے تھے کہ باوجود سرکاری پابندیوں اور بندشوں کے ان کے سیلاب عشق میں سرمو اُتار نہ ہوا بلکہ دونوں مہجورین باصدق و وفا آتش فراق سے اور زیادہ جلنے لگے۔ خواب وخور حرام ہوگیا۔ درد فرقت سے کسی پہلو قرار نہ آتا تھا۔ بالآخر حکمت عملی سے میل جول کی وہ صورت پیدا کی کہ کسی طرح کا دغدغہ اور وسوسہ نہ رہا۔

پہلے تاج محل بحیلۂ زیارت عتبات مقدسہ لکھنؤ سے روانہ ہوئیں، کچھ روز کانپور میں بازار رام نراین میں قیام کرکے ایک کوٹھی خریدی پھر عراق روانہ ہوگئیں۔ میر کلب حسین کو اُن کی جدائی کا صدمہ شاق گذر رہا تھا، اس لئے چند دنوں کے بعد وہ بھی علٰحدہ سے عراق جا پہونچے، اور وہاں دونوں بلاکشانِ محبت سلک نکاح میں منسلک ہوگئے۔ اور آزادی و شادمانی سے زندگی بسر کرنے لگے۔

لکھنؤ میں مشہور ہے کہ نواب تاج محل ایک کروڑ روپیہ کی مالیت کے جواہرات اور دیگر سامان اپنے ہمراہ لے گئی تھیں۔ تاج محل کی لکھنؤ سے روانگی کی تاریخ اور سنہ کا پتہ باوجود سخت جستجو کے نہیں چلا مگر سید کمال الدین حیدر لکھتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء میں بزمانۂ حکومت مرزا برجیس قدر (پسر واجد علی شاہ) حضرت محل والدہ برجیس قدر نے برائے اخراجات حکومت مبلغ ایک لاکھ روپیہ تاج محل سے بھی وصول کئے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ عظیم تک تاج محل لکھنؤ میں مقیم تھیں، اس کے بعد عملداری سرکار انگلشیہ میں ماحول موافق پاکر سفر عراق اختیار کیا۔ کیونکہ سکونت لکھنؤ ترک کرنے کے بعد نہ تاج محل کبھی لکھنؤ آئیں نہ اُن کی کوئی لڑکی آئی نہ میر کلب حسین آئے۔

دورانِ قیام عراق میں میر کلب حسین کے تاج محل سے دو لڑکیاں پیدا ہوئیں، جو بڑی بیگم اور چھوٹی بیگم مشہور ہوئیں۔ جب یہ لڑکیاں سن شعور کو پہونچیں تو اُن کی شادی کی فکر ہوئی۔

میر کلب حسین اُن کی کتخدائی اپنے خاندان والوں کے ساتھ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ میر مہدی حسین اور میر جعفر حسین پسران میر باقر حسین کو جو امام باڑۂ غفران مآب کے قریب رہتے تھے، لکھنؤ سے عراق بلواکر بڑی بیگم کی شادی میر مہدی حسین سے اور چھوٹی بیگم کی میر جعفر حسین سے کردی۔ دونوں بھائی کھرے سید اور خاندانِ اجتہاد سے تعلق رکھتے تھے، مگر بدقسمتی سے مفلسی کا چوتالہ دونوں کے یہاں بج رہا تھا۔ اس رشتہ بندی سے سوکھے دھانوں پانی پڑا۔ اور دونوں کی مُرجھائی ہوئی کھیتیاں سرسبز و شاداب ہوکر لہلہانے لگیں

(میری مہدی حسین کے کوئی اولاد بڑی بیگم سے ہوئی - میر جعفر حسین کے یہاں صرف ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام کلثوم بیگم رکھا گیا - لڑکیوں کی شادی خانہ آبادی سے فراغت پانے کے بعد میر کلب حسین خدا کے گھر سدھارے - میر جعفر حسین اُن کے قبل ہی دنیا کو خیرباد کہہ چکے تھے - پھر بڑی بیگم اور اُن کے بعد چھوٹی بیگم بھی داغ مفارقت دے گئیں - اِن پیہم صدمات روحانی سے تاج محل کو آزارِ جسمانی لاحق ہو گئے - آخر کار ۱۸۷۵ء میں حسینانِ جہاں کی یہ سرتاج اور گلشنِ خوبی و رعنائی کا یہ خوشرنگ اور بےنظیر پھول بھی ظالم موت کے ہاتھوں فنا ہو کر سرزمینِ عراق ہی میں سپردِ خاک ہوا - اُن کی آنکھ بند ہوتے ہی اہل دنیا دوڑ پڑے - نوابِ اقبال الدولہ (پسر نواب شمس الدولہ ابن نواب سعادت علی خاں) نے جائداد کا تعلیقہ کرایا - لکھنؤ کے ایک صاحب مقیم عراق نے مرحومہ کا گراں بہا تاج اور بیش قیمت اسباب کھسکا دیا - تین دن تک برابر جواہرات ڈھوئے گئے - کچھ سرکار میں بطور امانت جمع کر دیئے گئے بہت کچھ خود لے گئے - کچھ مال ڈیوڈ ساسون (David Sassoon) کی سپردگی میں دیدیا جو وہاں کے بہت وسیع یہودی سوداگر تھے۔

بر وقتِ انتقالِ تاج محل مولوی مہدی حسن لکھنؤ میں تھے - تاج محل کی ایک حبشی کنیز نے اُن کو اطلاع دیکر عراق بُلوایا - تاج محل کچھ عرصہ سے مولوی مہدی حسین سے ناخوش تھیں، جس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ داروغہ تاج محل کی بیٹی کو سبز باغ دکھا کر عراق سے لکھنؤ لے آئے تھے اور یہاں لا کر اُن سے نکاح کر لیا تھا - اس سبب سے تاج محل اُن کی صورت دیکھنے کی روادار نہ تھیں، اور میر مہدی حسین بھی شرم سے اُن کا سامنا نہ کرتے تھے - ان دوسری بیوی سے میر مہدی حسین کے دو بیٹے میر عابد حسین اور میر نظیر حسین اور ایک بیٹی چھنی بیگم پیدا ہوئیں - جب میر مہدی حسین عراق پہونچے تو نواب اقبال الدولہ تعلیقہ کرا چکے تھے اور بہت کچھ بیش بہا مال و اسباب خُردبُرد بھی ہو چکا تھا - عراق پہونچکر میر مہدی حسین نے اقبال الدولہ کے مکان کی تلاشی چاہی مگر بالیوز (ریزیڈینٹ) نے بوجہ اُن کے اعزاز و مرتبہ کے اجازت نہ دی۔

اِن جملہ معاملات کو سلجھانے اور مال و اسباب کو بذریعہ عدالت واپس لینے کے لئے زر نقد کی اشد ضرورت تھی - کلثوم بیگم اُس وقت نابالغ تھیں، چنانچہ میر مہدی حسین نے اپنی بھتیجی کے ولی کی حیثیت سے تاج محل کی پنشن فروخت کر دی اور کلثوم بیگم کی شادی سے بھی بطور سرپرست سبکدوش ہونا چاہا۔ اس غرض سے لکھنؤ میں مناسب بَر کی تلاش ہونے لگی - کئی شریف زادے جن میں ایک مشہور شاعر بھی تھے اس سونے کی چڑیا کے خواستگاروں میں تھے - مگر نظرِ انتخاب میر اصغر حسین پر پڑی اور اُنھیں کے سر کامیابی کا سہرا بندھا - میر اصغر حسین بھی اُس زمانہ میں پریشان حالت میں تھے - متصل امام باڑہ آغا باقر سکونت پذیر

تھے۔ کلثوم بیگم سے شادی رچانے کے بعد اُن کا بھی ستارۂ اقبال جگمگانے لگا۔ تقریباً بائیس لاکھ روپے بطور نقد و جنس اُن کے ہاتھ لگے۔ جس سے عُسرت عشرت سے بدل گئی اور بوستانِ حیات میں تازہ بہار آگئی۔

لوگ بیان کرتے ہیں میر مہدی حسین نے میر اصغر حسین سے تقریباً چار لاکھ روپے بموجب عہد و پیمان بروقت نکاح اپنی حق السعی کے وصول کئے جن کے لئے قبل سے پختگی بھی کرائی تھی۔ لکھنؤ واپس آکر میر مہدی حسین نے پاٹا نالہ کا ایک قطعہ اراضی کلثوم بیگم سے مانگ کر اس پر ایک شاندار عمارت اسی روپیہ سے تعمیر کرائی جس میں حسین آباد کا آہنی پھاٹک نیلام میں خرید کر لگایا۔ اسی سبب سے یہ عمارت آہنی پھاٹک والی عمارت مشہور ہوئی۔ موصوف نے مجالس عزا بھی بڑے حوصلہ اور شان سے منعقد کیں۔ جن میں ہزارہا آدمیوں کا مجمع ہوتا تھا اور جن کی خوش انتظامی زبان زد خلائق تھی۔ میر صاحب کو شعر و شاعری سے بھی ذوق تھا ماہر تخلص کرتے تھے۔ اُن کے بعد اُن کے دونوں بیٹے میر عابد حسین و میر نظیر حسین بہت اڑ کر چلے، زمین پر قدم نہ رکھتے تھے اپنی بدشوقیوں اور شاہ خرچیوں سے کل دولت اُڑا دی۔ کئی لاکھ کا گھر خاک کر دیا، تنکا تک باقی نہ رکھا۔ فضول خرچیوں کا یہ عالم تھا کہ چواسپہ گاڑی سواری کے لئے رکھی گئی، اُن کا اصطبل گھوڑوں کی کثرت سے سوداگر کا گھوڑ سال معلوم ہوتا تھا۔ کتوں کے پٹوں اور گھوڑوں کے سموں تک میں گھڑیاں لگادیں بالآخر اسی عادتِ بد کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو کر بڑی تنگدستی اور پریشانی کے عالم میں دونوں بھائیوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

تاج محل کے دو بھائی رمضان علی خاں اور آغا صاحب اور ایک بھتیجے احمد حسن خاں پسر رمضان علی خاں لکھنؤ میں موجود تھے مگر اُن کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔

مولوی اصغر حسین جب اپنی نوعروس کلثوم بیگم کو عراق سے لکھنؤ لائے تو سکندر باغ میں کرمن صاحب کی کوٹھی میں قیام کیا۔ پھر ۱۸۹۰ء میں محلہ نرہی متصل حضرت گنج میں دو قطعہ عالی شان مکانات تعمیر کرا کے وہاں منتقل ہو گئے۔ موصوف نے بھی بہت رئیسانہ ٹھاٹھ دکھائے۔ اُن کی سواری کی فٹن میں گھڑی اور آئینہ تک لگا رہتا تھا۔ ماہ محرم میں پانچویں تاریخ کو اُن کا عَلَم بڑے ساز و سامان اور شاندار جلوس کے ساتھ درگاہ حضرت عباس جاتا تھا۔ میر صاحب کو بھی شعر و سخن کا بہت مذاق تھا فاخر تخلص تھا مجلسیں اور مشاعرے اُنھوں نے بھی بہت دھوم دھام سے کئے۔ کچھ عرصہ تک لکھنؤ میں قیام کرنے کے بعد کلثوم بیگم بوجہ وبار ہیضہ عراق چلی گئیں۔ پھر بوجوہات چند در چند وہیں قیام کیا، لکھنؤ واپس نہ آئیں اور تخمیناً ایک سال کے بعد ایک بیٹا اپنی یادگار چھوڑ کر اس دار ناپائدار سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئیں

تاج محل کی املاک کوچہ چھوٹی شہزادی متصل پاٹہ نالہ میں تھی مگر اب وہ قائم نہیں ہے۔ اب اُن کی طرف

ہر دار کٹرہ بزن بیگ میں متصل باغ شوکت الدولہ مرزا جعفر موسومہ بقیہ تاج محل موجود ہے جس میں اُن کے خاندان کے لوگ مدفون ہیں۔ عراق میں تاج محل کے تین قطعہ مکانات ملحق یکدگر اور ایک مسجد روضہ کربلائے معلّٰے کے قریب واقع تھی۔ مکانوں میں بیک وقت تیس چالیس زائرین کے قیام کی گنجائش تھی انھیں کے لئے مکانات وقف تھے اور وہیں مجالس بھی ہوتی تھیں۔

عراق میں اُن کا ایک اور وقف بھی ہے جس کی آمدنی سے آٹھویں اور مجالس ہوتی ہیں اور وظائف بھی دیئے جاتے ہیں۔ اس کل املاک کا نام "تاج محل" تھا۔ سُنا ہے اب اس کو سرکار عراق نے معاوضہ دیکر حاصل کرلیا ہے اور یہ بھی اقرار کیا ہے کہ اُس کے عوض میں دوسری عمارت تعمیر کرادی جائیگی۔ یہ بھی بدریافت معلوم ہوا ہے کہ ماہ جون ۱۹۳۰ء میں جب یہ عمارت کھودی گئی تو ایک دیوار سے اشرفیوں کی تھیلیاں برآمد ہوئیں۔

نواب تاج محل، اُن کی دونوں بیٹیوں اور نواسی کی قبریں روضۂ کربلا کی غلام گردش میں واقع ہیں، یہ تینوں قبریں جھاڑ فانوس اور دیگر سامان آرایش سے مزین ہیں اور قرآن خواں بھی بغرض ایصال ثواب مقرر ہیں۔

زمانہ تیس سال پہلے

زمانہ فروری ۱۹۰۹ء میں نامور محب ہند لالہ لاجپت رائے صاحب کا ایک مضمون مغربی تہذیب پر چند منتشر خیالات کے عنوان سے شائع ہوا تھا جس میں موصوف نے جو اُن دنوں لندن میں تھے، لکھا تھا:۔

"یورپ میں سوشلزم دن بدن زوروں پر ہے جس کی تعلیم یہ ہے کہ ملک کے کل باشندے مثل ایک کنبے کے ہیں اور کنبے میں کسی کو حق نہیں ہے کہ وہ دوسرے کو بھوکا پیاسا رکھکر خود آرام کرے اور دولت سے مالا مال ہو جائے۔ بعضوں کو یہ یقین ہے کہ ہر ایک قوم کی دولت و زمین و مکانات غرض کل افراد قوم کی مشترکہ جائداد ہیں۔ اور اُس قوم میں ہر ایک شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی قدرتی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے اُس مشترکہ فنڈ یعنی جائداد سے مناسب فائدہ اُٹھائے اور اپنی محنت و لیاقت اور ہمت کا پھل بھی مشترکہ فنڈ میں ڈالے۔ یا یوں کہو کہ یورپ کی سوشیل تعلیم ایک پہلو سے کل قوم کی قوم کو ہندوؤں کے خاندان مشترکہ کے اُصولوں کے نیچے لانا چاہتی ہے۔ بہرحال غرباء و مزدوری پیشہ جماعتیں اپنے حقوق حاصل کرنے پر کمربستہ معلوم ہوتی ہیں۔ وہ ہر روز یہ سوال کرتی ہیں کہ کوئی وجہ نہیں کہ ہم میں جو اصل میں قوم کی بڑھانے والی ہیں اور اُن لوگوں میں جنھوں نے روپیہ اور پولیٹیکل طاقت کے زور سے ہمکو قابو میں کر رکھا ہے اس قدر تفاوت ہو کہ وہ اس طرح دولت میں لوٹ پوٹ ہوں اور ہم زندگی کی معمولی ضروریات کو بھی ترستے رہیں۔ یہ تفاوت مٹانے کیلئے اگر اس امر کی ضرورت ہوئی کہ وہ وحشی پن اختیار کریں تو شاید ان کو ایسا کرنے میں بھی عذر نہ ہوگا۔"

طلوعِ سحر

(از مسٹر رہبر بی-اے)

لو سورج نکلا مشرق سے، سونا بکھرا میدانوں پر
آنکھوں کو خیرہ کرتے ہیں اب برف کے ڈھیر چٹانوں پر
نوزاد، ملائم، فرحت زا، آتی ہیں کرنیں بڑھ بڑھ کر
برسوں کی پیاسی ہوں جیسے، گرتی ہیں ایسی شبنم پر
غنچوں نے آنکھیں کھولی ہیں، کلیاں بھی ہونٹ ہلاتی ہیں
گلشن کے گوشے گوشے میں کیا تتلیاں رقص دکھاتی ہیں
وہ سرو کی اونچی چوٹی سے چھَن چھَن کے کرنیں آتی ہیں
تالاب کے پانی میں گر گر "جل پریاں" سی بن جاتی ہیں
تالاب کی تٹ پر دوشیزہ اِک بیٹھی بیٹھی تکتی ہے
وہ محو منظرِ حُسن ہوئی، آنکھوں سے باتیں کرتی ہے
تو نے یہ کنول کیا دیکھ لیا؟ کیوں اتنا تو مسرور ہوا؟
کیا خوابِ رنگیں کا عالم نہیں آنکھوں سے ابھی دُور ہوا؟
اِک کیف کا عالم طاری ہے، جو روح کو تازہ کرتا ہے
جب شاخ صبا سے ہلتی ہے، پہلو میں دل بھی مچلتا ہے
او عارف آ کر دیکھ ذرا، او جوگی مَن کی پیاس بُجھا!
وہ دیکھ وہاں ہے جلوہ گر، وہ دیکھ وہاں ہے نورِ خدا
کیوں موسیٰ موسیٰ ہوتی ہے؟ کیوں طور بھلا مشہور ہوا
صحرا پہ سحر کا عالم ہے، ہر ذرّہ جلوۂ طوُر ہوا
سُن سن رہبر کیا کہتے ہیں، وہ پھُول جو نیلے پیلے ہیں
قدرت کے رنگ نرالے ہیں، قدرت کے راگ سُریلے ہیں

پنڈت برج نراین چکبست[1]

(از پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری ایم۔ اے)

آج سے تیس برس کی بات ہے، میری عمر دس برس کی رہی ہوگی، میں گورنمنٹ اسکول کے کسی ابتدائی درجے میں پڑھتا تھا۔ غالباً شام کی ڈاک سے رسالہ "زمانہ" میرے یہاں آیا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب چمک دمک اور آب و تاب سے شائع ہونے والے آجکل کے اُردو رسالوں کا پتہ بھی نہیں تھا۔ ہندوستان کے اِس مایۂ ناز شاعر ترجمانِ حقیقت سر محمد اقبال جسکا آج ہم ماتم کر رہے ہیں۔ اس کی شہرت بھی ابھی ایک دُور کی آواز تھی۔ آسمانِ شاعری پر یوں تو نئے ستارے رونما ہو چلے تھے لیکن ابھی امیر و داغ کی شہرت گھٹا کی طرح چھائی ہوئی تھی، جدید اُردو نثر و نظم اور دَورِ حاضر کی اسپرٹ کا تنہا علم بردار اس وقت صرف رسالہ "زمانہ" تھا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جس رسالے میں ہمارے ملک کے اور علم و ادب کے قریب قریب تمام لیڈر مضامین لکھتے ہوں۔ اس کے لئے دیدہ و دل کس طرح فرشِ راہ رہتے ہوں گے

بہرحال اسی رسالے میں چکبست کی غالباً وہ نظم پہلی بار میں نے پڑھی، جو جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں پر اُنھوں نے کہی تھی۔ میری عمر ہی کیا تھی مگر مجھ پر اس دل دُکھا دینے والے شعر کا جو اثر ہوا اُس کے لئے سحر جادو اور معجزہ کے الفاظ بھی بے رنگ اور بے کیف معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے بعد جس نظم کی مجھے یاد آتی ہے وہ گوپال کرشن گوکھلے کی موت پر چکبست کا مرثیہ تھا جس کا یہ شعر ان کیفیتوں کا حامل تھا جن کا بیان کرنا ناممکن ہے۔

جنازہ قوم کا گھر سے ترے نکلتا ہے
سہاگ ہند کا تیری چتا میں جلتا ہے

اب میں اسکول سے نکل کر میور سنٹرل کالج الہ آباد کے ایف۔ اے کلاس میں آچکا تھا۔ اسی وقت ایک دلچسپ غلطی کا بھی ازالہ ہوا۔ میں کیا بلکہ معلوم ہوا کہ صدہا لوگ شاعر کا نام تو پنڈت برج نراین سمجھتے تھے اور چکبست ان کا تخلص سمجھتے تھے۔ جس وقت یہ معلوم ہوا کہ "چکبست" ان کا تخلص نہیں ہے بلکہ اُن کے نام کا حصّہ ہے تو میری بھی اور میرے خیال میں اس بارے میں صدہا گمراہ حضرات کی کچھ دلشکنی ہوئی۔ اس

---

[1] یہ تقریر ۱۲۔ مئی ۱۹۳۸ء کو لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہو چکی ہے۔

غلط فہمی کا ازالہ کچھ غیر شاعرانہ بات معلوم ہوئی۔ مجھے تو جب اپنی یہ ناواقفیت یاد آتی ہے تو خوب ہنسی آتی ہے۔ بہرحال بات کتنی ہی دلچسپ ہو مگر یہ جملہ معترضہ تھا۔ میں نے ابھی وفات کو کھلے پر چکبست کی نظم کا ذکر کیا تھا۔ اسی زمانہ میں ہندو یونیورسٹی ڈپوٹیشن کے متعلق ان کی ایک نظم شائع ہوئی جس کے ٹیپ کا مصرعہ تھا ع

فقیر قوم کے آئے ہیں، جھولیاں بھر دو

اس کے دو برس بعد ۱۹۱۶ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس ہوا، پنڈال میں پچاس ہزار آدمیوں کا مجمع تھا، میں بی۔ اے میں پڑھتا تھا اور غالباً سب سے پیچھے کی صف میں بیٹھا تھا۔ اُس وقت میں نے پہلے پہل چکبست کو دیکھا تھا، اور پہلی بار اُن کی آواز سنی۔ یہ کہتے ہوئے میرا جی خوش نہیں ہوتا، کہ اس موقع کا مجھ پر خوشگوار اثر نہیں ہوا، میں یہ تو ہرگز نہیں کہوں گا، کہ چکبست کو دیکھکر اور اُن کی آواز سُن کر تصنّع یا رعونت اور غرور کا پتہ چلتا تھا۔ لیکن ایک غیر ارادی اور غیر شعوری تکلف کا پتہ ضرور چلتا تھا۔ اُن کے قوم پرستی کے جذبے سے انکار نہیں لیکن اُن کی شخصیت جمہوریت کے اس عنصر سے معرّا تھی، جس میں انسانوں کی انفرادی زندگی کے دُکھ سُکھ سے ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ کسی ذات واحد سے ہمدردی اور محبت اور بے تکلف خلوص کا فقدان مجھے چکبست میں معلوم ہوا۔ وہ مجھے کچھ الگ تھلگ اور رُکے رُکے سے آدمی معلوم ہوئے۔ یہ بہت سخت الفاظ ہیں۔ مگر یہ میری بدنصیبی کہ مجھ پر ناگزیر طور پر یہی اثر ان کو دیکھکر اور اُن کی آواز سُن کر پڑا۔ اسی کانگریس میں اقبال کی وہ لافانی نظم پہلے پہل ملک نے سنی۔ "خاکِ وطن کا مجھکو ہر ذرہ دیوتا ہے"۔ میں نے قریب سے چکبست کو الہ آباد میں ۱۹۲۵ء یا ۱۹۲۶ء میں دیکھا تھا۔ جب وہ دیوان رادھے ناتھ کول کے مشاعرے میں شریک ہوئے تھے، اور چکبست ہی کے منہ سے سُنا ہوا اُن کا یہ شعر مجھے یاد ہے :-

مزا ہے عہدِ جوانی میں سر پٹکنے کا
لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے

چند الفاظ میں چکبست کے حالاتِ زندگی یہ ہیں کہ اگر آج وہ زندہ بھی ہوتے تو وہ صرف چھپن برس کے ہوتے، اور اگر وہ آج مرتے تو لوگ کہتے کہ انھوں نے کم عمر پائی، یا ابھی مرنے کے دن نہیں تھے۔ چکبست ۱۸۸۲ء میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے۔ بزرگوں کا وطن لکھنؤ تھا اس لئے وہیں چلے آئے اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج سے بی۔ اے کیا۔ اس کے بعد وکالت شروع کی، ان کا شمار قابل اور کامیاب وکیلوں میں ہونے لگا تھا۔ ۱۹۲۶ء کی بارہ فروری کو ایک مقدمے کی پیروی کے

لئے رائے بریلی گئے، سہ پہر تک بحث کی اور پھر لکھنؤ واپس آنے کے لئے اسٹیشن آئے، ریل میں بیٹھے تھے کہ دماغ پر فالج گرا اور زبان بند ہوگئی۔ لوگ گاڑی سے نکال کر ویٹنگ روم میں لائے اور کچھ گھنٹوں کے بعد اسٹیشن ہی پر انتقال کیا۔ ۱۱ بجے رات کو موٹر پر رکھ کر لوگ لاش کو لکھنؤ لائے۔ چکبست نے کُل چوالیس برس کی عمر پائی۔ وہ جوان مرے اور جوان جیئے بھی جو ایک بہت قابل رشک بات ہے۔ جو کچھ لکھا اس میں جوانی کی آن بان اور بانکپن اسی طرح قائم ہے کہ دیکھتے بنیں بنتی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ چکبست شاگرد کس کے تھے اور انکی شاعری کی ابتدائی محرکات اور حالات کیا تھے۔ اور انکی انفرادی زندگی سے گہرا تعلق رکھنے والے وہ داخلی اور خارجی واقعات کیا تھے جو ان کی شاعری کا مواد بن سکے۔ چکبست نے جس فضا میں آنکھ کھولی وہ سرعت سے بدل رہی تھی۔ قدامت اور نئی تہذیب کے عناصر دونوں وقت کی طرح مل رہے تھے۔ لیکن ابھی دور حاضرہ کی اسپرٹ خود شناس نہیں ہوئی تھی۔ ادب اور شاعری سے چکبست کو فطری اور گہرا لگاؤ تھا۔ آتش اور انیس کا طرز ان کے دل کو بھا گیا تھا۔ اور ان دو استادوں کا لب و لہجہ خود چکبست کا لب و لہجہ بن گیا تھا۔ ایسی کامیاب تقلید کی مثال اُردو شاعری کی تاریخ میں نایاب ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔ جب ہندوستانی فوج جنگ عظیم میں شرکت کے لئے ساحل ہند سے روانہ ہوئی۔ اس سماں کا نقشہ چکبست یوں کھینچتے ہیں۔

ساحلِ ہند سے جرارِ وطن جاتے ہیں ۔۔۔ کچھ نئی شان سے جانبازِ کہن جاتے ہیں
رن میں باندھے ہوئے شمشیر و کفن جاتے ہیں ۔۔۔ تیغ زن، برق فگن، قلعہ شکن جاتے ہیں

سامنے ان کے ظفر برہنہ پا چلتی ہے
اُن کی تلوار کے سائے میں قضا چلتی ہے

گائے پر چکبست کی مشہور نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو:۔

صاحبِ دل تجھے تصویرِ وفا کہتے ہیں ۔۔۔ چشمۂ فیض خدا مردِ خدا کہتے ہیں
دردمندوں کی مسیحا شعرا کہتے ہیں ۔۔۔ ماں" تجھے کہتے ہیں ہندو تو بجا کہتے ہیں

کون ہے جس نے ترے دودھ سے منھ پھیرا ہے
آج اس قوم کی رگ رگ میں لہو تیرا ہے

چکبست کی ایک نہایت دلکش نظم "پھول مالا" ہے جو اُنھوں نے حالی کے مرثیۂ دلّی والی نظم کی زمین میں کہی ہے۔ وہ عورتوں کی آزادی کے بارے میں بقول پروفیسر آل احمد سرور حدِ ادب کے قائل تھے۔ سرور صاحب نے ایک بہت لطیف روایت اس سلسلہ میں بیان کی ہے۔ وہ یہ ہے کہ بچپن میں جو کہانیاں سنتے تھے اُن سب میں ایک چیز مشترک ہوتی تھی۔ ہیرو کو اس کی بہن یا بیوی

یا ماں تین طرف جانے کی اجازت دیتی تھی، اور چوتھی طرف کے لئے منع کرتی تھی۔ نتیجہ ہمیشہ یکساں نکلتا تھا ہر شخص چوتھی سمت کو دوڑتا تھا۔ کہیں ہماری لڑکیوں اور عورتوں کا بھی یہی حشر نہ ہو۔

روشِ خام پہ مردوں کی نہ جانا ہرگز   داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز

رنگ ہے جن میں مگر بوئے وفا کچھ بھی نہیں   ایسے پھولوں سے نہ گھر اپنا سجانا ہرگز

رُخ سے پردے کو ہٹایا تو بہت خوب کیا
پردۂ شرم کو دل سے نہ اُٹھانا ہرگز

دل تمہارا ہے وفاؤں کی پرستش کے لئے   اس محبت کے شوالے کو نہ ڈھانا ہرگز

ہم تمہیں بھول گئے اس کی سزا پاتے ہیں   تم ذرا اپنے تئیں بھول نہ جانا ہرگز

چکبست نے رامائن کا ایک سین یعنی رام کی جلاوطنی پر جو نظم لکھی ہے اگرچہ وہ بہت مشہور ہے مگر اس نے ہمیشہ مجھے بدمزہ کیا وہاں جذبات اور زبان میں جس نرمی معصومی اور حلاوت کی ضرورت تھی وہ چکبست کے مرصع اور بلند آہنگ اسلوب بیان کے بس کی چیز نہ تھی۔ فن شاعری کو ان مقامات پر فنا کی جاں گداز منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں۔ یہاں زبان آتش اور انیس کا گذر نہیں مگر مرثیوں کا تو چکبست بادشاہ ہے۔ ایک رہنمائے وطن کی رحلت پر یہ بند ملاحظہ ہو:۔

وطن کو تو نے سنوارا کس آب و تاب کے ساتھ   سحر کا نور بڑھے جیسے آفتاب کے ساتھ

چُنے رفاہ کے گُل حسن انتخاب کے ساتھ   شباب قوم کا چمکا ترے شباب کے ساتھ

جو آج نشو و نما کا نیا زمانہ ہے
یہ انقلاب تری عمر کا فسانہ ہے

بال گنگادھر تلک کی موت پر جو مرثیہ کہا اس میں کس قیامت کا مصرعہ کہدیا

طنطنہ شیر کا باقی نہیں سونی ہے کچھار

چکبست کی غزلوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ مجھے تو پروفیسر سرور کے کچھ الفاظ یاد آئے جو انھوں نے چکبست پر اپنے اظہار خیال کے دوران میں لکھے ہیں۔ پروفیسر سرور کہتے ہیں کہ پنڈتان کشمیر جنت ارضی کے حور و غلمان ہونے کا فخر کر سکتے ہیں۔ لیکن میری گذارش یہ ہے کہ حور و غلمان باوجود اپنے حسن و جمال کے کبھی گنہگار محبت نہیں ہوتے۔ "غزل اُردو اور فارسی شاعری میں وہ صنف ہے جو اپنی بہترین شکل میں لامذہب ہوتے ہوئے بھی۔ روحانیت اور انسانیت

کی تمام لطافتوں اور شرافتوں معصومیوں اور رنگینیوں، گہرائیوں وغیرہ کی حامل ہے۔ میں شروع سے سنتا چلا آیا ہوں کہ چکبست آتش اور انیس کے مقلد اور غالب کے معتقد تھے۔ مسدس کے میدان میں واقعہ ہے کہ اتنی کامیاب تقلید کی مثال اردو میں نہیں ملتی۔ اور تقلید ہی نہیں میں کہوں گا کہ چکبست نے مسدس میں آتش کا تیور اور مردانہ لہجہ اور انیس کی خوش بیانی اور برجستگی دونوں کو ملا دیا ہے۔ رہی غزل تو باوجود آتش کی لب و لہجہ کی تقلید کے آتش کی دقت نظر اور وسعت نظر اور آتش کے فقیرانہ عاشقانہ اور والہانہ انداز اور اس کے اخلاقی وجدان کو نہیں پا سکے۔ بہرحال مجھ پر جو اثر چکبست کو دیکھکر ہوا تھا وہی اُن کی غزلوں کو سُن کر بھی ہوتا ہے۔ یعنی انتہائی طور پر مہذب اور سنجیدہ اور بے تکلف ہونے کا مگر سپردگی خستگی اور گداز یا حقیقی عظمت کا نہیں۔ ان کی غزلوں کے کچھ بہترین اشعار سنیئے:۔

نہ کوئی دوست و دشمن ہو شریک درد و غم میرا
سلامت میری گردن پر رہے بارِ الم میرا

لکھا یہ داورِ محشر نے میری فردِ عصیاں پر
یہ وہ بندہ ہے جس پر ناز کرتا ہے کرم میرا

فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا
اجل کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا

مٹنے والوں کی وفا کا یہ سبق یاد رہے
بیڑیاں پاؤں میں ہوں اور دل آزاد رہے

اس کے ساتھ ہی ہم کو یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ خود آتش اور انیس بھی اپنے سب سے زبردست اور پاکیزہ ترین کلام میں بھی لکھنؤ اسکول کے عیب سے بچ نہیں سکے وہ مبالغہ یا غیر سنجیدگی یا رعایت لفظی کا نہیں ہے۔ بلکہ بیان میں خارجیت کا عیب ہے، سب کچھ تو کہہ دیا جاتا ہے۔ بیان میں عقلیت نثریت، ادبیت اور خطیبانہ انداز حاوی ہوجاتے ہیں۔ داخلی اشارات اور کنایات استعجاب و انفعال خاموشی اور بے زبانی، معصومیت اور سپردگی بیان ملتی ہی نہیں۔ شاعری کی لغت اور زبان اپنی ماورائی منزلوں تک پہونچ ہی نہیں سکتی۔ لیکن جس قصیدہ نما زبان کی داغ بیل لکھنؤ اسکول نے ڈالی تھی، وہ قومی یا اور طرح کی مسلسل نظموں کے لئے اور خاصکر مسدس کے لئے بہت کچھ خوبیوں کی حامل ہے۔ اس قسم کی شاعری کے لئے لکھنؤ اسکول زبان بہت نمایاں اور مکمل چیز ہے۔ اور چکبست نے تو اپنی نظموں میں اس زبان کے ممکن محاسن کو اجاگر کر دیا ہے جہاں تک کساؤ اور چستی، زور، رنگینی، آب و تاب اور چٹیلے پن کا تعلق ہے جہاں تک تکمیل بیان اور صیقلِ زبان (Polish and Finish) کا تعلق ہے خود آتش اور انیس کے کلام کا بہت بڑا حصہ کمزور یا پھسپھسا یا نامکمل یا کم از کم دوئم درجے کا ملیگا

لیکن چکبست کے مجموعۂ کلام صبح وطن میں مشکل سے کوئی کمزور مصرعہ ملے گا، خواہ ہلکے مصرعے یا اشعار مل جائیں ہر مصرعہ چکبست کے قلم سے یوں نکلتا ہے جیسے کمان سے تیر، یہ معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ نہ یہ معمولی کامیابی ہے کہ اُردو ایسی نازک زبان میں غالباً ایک مصرعہ یا لفظ میں بھی چکبست سے کوئی زبان کی غلطی یا لغزش ہوئی ہی نہیں اور اُردو میں ابتذال کے غلبے کو دیکھتے ہوئے یہ کتنی پاکیزہ خوبی ہے کہ عمر بھر میں چکبست نے اپنے کلام میں کوئی ہیٹی بات نہیں کہی۔ چکبست نے کُل چوالیس برس کی عمر پائی، اگر میر، آتش، غالب یا انیس بھی صرف چوالیس برس کی عمر میں مرجاتے تو چکبست کے مقابلہ میں آخر اُن کے بھی کارنامے کیا ہوتے۔ لیکن میں یہ بھی کہوں گا کہ اگر چکبست نے طویل عمر بھی پائی ہوتی تو کوئی زبردست اضافہ اپنے کلام میں یا اس کی خصوصیت میں شاید نہ کرسکتے، اُنھیں جو کچھ ہونا تھا ہو چکے تھے۔ چکبست کی قدر و منزلت کا جچا تُلا اندازہ صرف اُن کے منظوم کلام سے نہیں ہو سکتا بلکہ معرکۂ شرر و چکبست اور مضامین چکبست میں محقق زبان اور زبردست انشاپرداز ہونے اور ادبی بحث میں جس تبحّر کا ثبوت چکبست نے دیا اور شرر ایسے جیّد آدمی کے لئے جتنے خطرناک حریف چکبست ثابت ہوئے، ان باتوں سے بھی ہوسکتا ہے۔ اُردو ادب میں ایسے زبردست اور سلجھے ہوئے ادیب بہت کم پیدا ہوئے ہیں "صبح وطن" کی متعدد نظموں نے جس سحر کارانہ انداز سے دلوں کو تڑپا دیا تھا اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کرسکتے ہیں جنھوں نے ان نظموں کو اس وقت دیکھا یا سُنا جب وہ پہلی بار کسی رسالے میں شائع ہوئیں، صبح وطن میں بھی ان نظموں کی تابناکی آج بھی قایم ہے۔ اور قایم رہیگی، خواہ اُن کا رنگ و بو ہماری روح کی ماورائی یا قریب ترین مقامات تک پہونچے یا نہ پہونچے لیکن ان پھولوں کی رنگینی اور شادابی کو بادِ خزاں نہیں چھو سکتی۔ چکبست کے اور میرے ایک فاضل دوست کی رائے ہے کہ اگر چکبست زیادہ دن تک زندہ رہتے۔ تو غالباً اب وہ بجائے نظم کے نثر لکھتے۔

قطعات

(جناب الطاف مشہدی)

میرے پہلو سے اُٹھ رہا ہے دُھواں کیا خبر کس لئے اُداس ہوں میں
آنکھ پُرنم ہے دل میں غم کا ہجوم اک سراپائے رنج و یاس ہوں میں

آج دھیمے سُروں میں گاؤ ذرا دل کے زخموں کو گدگداؤ ذرا
وطن کے مینارِ تخئیلا کے عہد آغاز کو بلاؤ ذرا

good

وطن

(از فیاض الدین احمد خاں فیاض گوالیاری، بی۔ اے)

پھر چھیڑ کے دل خونِ دل سے لکھنے دو مجھے عنوانِ وطن
پھر دل میں تڑپ سی پیدا ہے، پھر روح میں ہے طوفانِ وطن
دیکھوں تو وطن میں کون ہے وہ، جو دل سے نہیں قربانِ وطن
حیوان سے بدتر دیکھا ہے، کیا تم نے کوئی انسانِ وطن!
کیا میرے وطن کی چھاتی پر، بستا ہے کوئی ایسا دل بھی
گلشن جو لہو سے سینچ نہ دے، آئے جو سوالِ شانِ وطن!
فرزند جنے ہیں ایسے بھی، کیا میرے وطن کی ماؤں نے
پل بڑھ کے وطن کی گود میں جو، سب بھول گئے احسانِ وطن
اُبھرا ہے یہاں کی خاک سے کیا، ایسا بھی کوئی پتھر کا دل
مٹی میں جو ملتی دیکھ سکے تصویرِ جمالستانِ وطن
اپنے ہی گلے پر چلتی ہیں، کیا تلواریں جانبازوں کی
جو جانِ وطن کہلاتے ہیں، کیا اُن میں ہیں دشمن جانِ وطن
اس پاک ہوا میں لیتے ہیں، سانسیں کیا ایسے انساں بھی
تھرائیں نہ جن کے دل کی رگیں، جب روح سُنے اعلانِ وطن
کیا ایسے بھی صاحب غیرت ہیں کیا اُن کے بھی سینے میں دل ہے
سینوں میں نہ جن کے ہوک اُٹھے، سُن سُن کے غمِ پنہانِ وطن
اس خاک سے ہم سب اُبھرے ہیں، اس خاک میں ہم کو ملنا ہے
پھر پھوٹ یہ کیسی آپس میں، کچھ غور کریں یارانِ وطن
یوں آپس میں نفرت کرکے، یہ ڈھونگ قدامت کے رچ کے
محتاج ہو ٹکڑے ٹکڑے کو، ٹکڑے نہ کرو دامانِ وطن

تفریق و تعصب کی لعنت، کیوں دُور نہ کردیں ہم سر سے
ہے حبِّ وطن مذہب اپنا، ایمان اپنا ایمانِ وطن
فیاضؔ وہ ساعت دُور نہیں، جب جہل کی تاریکی مٹ کر
چمکے گا ستارہ قسمت کا، اُبھرے گا مہِ تابانِ وطن

واردات

(از حضرت مضطر نعمانی)

کیفیتِ تباہیِ ارماں نہ پوچھیے
کس نے بنا دیا مجھے انساں نہ پوچھیے

اُف حُسن ہے رہینِ حجابِ تعینات
دیر و حرم ہیں بے سر و ساماں نہ پوچھیے

اب لے اُڑا ہے شوقِ دیارِ حبیب کو
ہم سے نزاعِ گبر و مسلماں نہ پوچھیے

مضمر ہیں میری ذات میں لاکھوں تجلیاں
ذرّاتِ دل ہیں جوشِ بداماں نہ پوچھیے

جس غم زدہ کا بیڑا ہو غرقابِ بے خودی
اُس سے حکایتِ شبِ ہجراں نہ پوچھیے

حیرت سے بن گیا ہوں میں اک پیکرِ سکوت
احباب نے کیا ہے جو احساں نہ پوچھیے

نیرنگیِ حیات نے دیوانہ کر دیا
بس چھوڑ دیجیے مرا داماں نہ پوچھیے

دنیائے بے وفا میں مری سادگیِ دل
وہ کر رہی ہے جورِ فراواں نہ پوچھیے

وہ جنبشِ نگاہ ہے اب ضامنِ حیات
ہم سے ہمارا حالِ پریشاں نہ پوچھیے

دامن کرم کا تھام کے بیہوش ہو گئے
یہ دل ہے یا کہ جنتِ عصیاں نہ پوچھیے

بادِ خزانِ آہ سے ہمدم بہارِ دل
جس درجہ ہوتی رہتی ہے ویراں نہ پوچھیے

المختصر کہ مضطرِ بے خانماں سے آپ
جز قصہ ہائے جورِ عزیزاں نہ پوچھیے

رئیس

از مرزا فدا علی خنجر لکھنوی

اِن کا نام سیّد احسان علی اور رئیس تخلص تھا۔ سید مظہر علی کے صاحبزادے اور میر انیس کی بہن کے نواسے تھے۔ اصلی وطن فیض آباد تھا۔ ۱۸۲۹ء میں وہیں گلاب باڑی میں پیدا ہوئے۔ درسیات کی کتابیں مختلف مدرسوں میں مختلف اُستادوں سے پڑھیں۔ بچپن فیض آباد میں گذرا۔ جوانی کے آغاز میں روزگار تلاش کرتے ہوئے لکھنؤ آئے۔

ان کے آبا و اجداد شہزادوں اور نوابوں کی ڈیوڑھیوں پر داروغگی کی خدمات انجام دے کر بسر اوقات کرتے تھے۔ انھوں نے بھی یہی پیشہ اختیار کیا اور ساری زندگی نواب امجد علی خاں کی خدمت میں گذار دی۔ نواب موصوف منتظم الدولہ کے خاندان سے تھے اور اُن کی اولاد نوابان شیش محل کے نام سے یاد کیجاتی ہے۔

رئیس کو لکھنؤ آنیکے بعد شاعری کا شوق پیدا ہوا جو درحقیقت میر علی حسین طوبیٰ کی صحبت کا فیض تھا۔ طوبیٰ اُن کے گہرے دوست اور مرثیہ گو شاعر تھے۔ کبھی کبھی تفنن کے طور پر غزل بھی کہہ لیا کرتے تھے۔ رئیس سے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تو اکثر صحبتیں گرم رہا کرتی تھیں۔ شعر و سخن کا چرچہ ہوتا تھا۔ سُنتے سُنتے یہ بھی شعر کہنے لگے۔ میر اُنیس کا طوطی بول رہا تھا۔ شہر کی مجلسیں اُن کے مرثیوں سے گونجتی رہتی تھیں۔ رئیس نے کلام کی اصلاح اُن کے سپرد کی اور غزلوں کے ساتھ ساتھ مرثیہ لکھنا بھی شروع کر دیا۔ جب تک میر انیس حیات رہے کسی اور اُستاد کی ضرورت نہ ہوئی۔ اُن کے بعد نگاہ انتخاب نے میر مونس کو چُنا۔ جب وہ بھی نہ رہے تو کچھ دنوں میر نفیس کی شاگردی کا دم بھرا۔

رئیس شہرت پسند نہ تھے، ہمیشہ گوشۂ عافیت کے شائق رہے۔ عام مشاعروں سے اجتناب تھا صرف شیش محل کی صحبتوں میں شریک ہو کر جوہر طبع پیش کرتے تھے۔ طبیعت بہت نکھری ہوئی پائی تھی۔ میر نفیس سا عالی دماغ اور نقادِ سخن ان کی خوش فکری کا معترف تھا۔

اول اول چاہ کنکر میں مکان لے کر سکونت اختیار کی تھی۔ پھر معالی خاں کی سرائے میں رہنے لگے قدیم وضع کے پابند تھے۔ جاڑا، گرمی، برسات ہمیشہ ایک وضع قائم رکھی۔ جب تک زندہ رہے،

روئی دار کپڑے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ چوگوشیہ ٹوپی، باریک تنزیب کا کرتا اُس پر نین سُکھ کی اچکن یا انگرکھا۔ ڈھیلی مُہری کا پائجامہ۔ جالی لوٹ کا سہ گوشیہ رومال گلے میں پڑا ہوا۔ بڑے خوش خلق، صاف دل اور مُنکسر مزاج واقع ہوئے ہوتھے۔ علم مجلس میں کمال مہارت تھی۔ بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی کے ذریعہ سے ہر شخص کو گرویدہ بنالیتے تھے۔

ایامِ عزا میں مجلسیں پڑھتے تھے۔ اور شایقین بڑے شوق سے شریک ہوکر اُن کے کلام کی داد دیتے تھے۔ میر احمد حسین تعلقہ دار سرائے میر ضلع اعظم گڈھ کے یہاں نہایت پابندی سے عشرہ محرم پڑھنے جایا کرتے تھے۔ تعلقہ دار موصوف بھی قدر افزائی اور عزت و احترام میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے تھے۔

یہ وضع عمر بھر قائم رہی۔ جب تک زندگی نے وفا کی۔ سرائے میر کا عشرہ کبھی ناغہ نہ ہوا۔ رئیس کے بعد اُن کے چھوٹے بھائی ذاکری کی خدمت بجالاتے تھے۔ وہ خود تو شاعر نہ تھے لیکن میر انیس کے مرثیے پڑھ کے اہلِ مجلس کو داخلِ ثواب کرتے تھے۔

رئیس کے حلم و طبعی شرافت کے متعلق ایک دلچسپ حکایت بیان کیجاتی ہے۔ جس کا یہاں پر تذکرہ لُطف سے خالی نہ ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ میر احمد حسین تعلقدار سرائے میر رئیس کا بڑا احترام کرتے تھے۔ جب وہ تشریف لیجاتے تھے تو اُن کے قیام کے لئے ایک ہوادار مکان مخصوص تھا۔ خاصہ کے کھانے کا خوان مقرر تھا۔ اور مہمانداری میں کسی طرح کی کوئی کمی نہ تھی۔ مکّا نامی خدمتگار خاص طور سے خدمت پر مامور ہوتا تھا۔ یہ شخص نہایت حریص اور بدسرشت واقع ہوا تھا۔ اور رئیس کے حلم و مروت اور خوئے چشم پوشی سے ناجائز فائدہ حاصل کرنے میں نہایت بیباک وجری تھا۔ اُسکا معمول تھا کہ تعلقدار کے باورچی خانے سے نفیس ولطیف کھانوں کا جو خوان لاتا اُس کے سب کھانے نکالکر اپنے گھر پہنچا دیتا اور رئیس کیواسطے ایک پیالے میں ماش کی دال اور دو روٹیاں خوان میں لگا کر سامنے حاضر کرتا۔ یہ صبر و شکر کے ساتھ اسی پھیکی سیٹھی غذا پر کفایت کرتے اور ایک لفظ زبان سے نہ کہتے۔

اتفاق سے ایک دفعہ تعلقدار کے داروغہ صاحب اُن کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے مجلس کا وقت قریب تھا کہ مکّا خدمتگار خوان سر پہ رکھے حاضر ہوا۔ رئیس کو شرم آئی کہ داروغہ صاحب کے سامنے ماش کی دال اور دو روٹیاں کھائیں۔ انھوں نے خوان کو رکھوا دیا۔ لیکن داروغہ صاحب نے کھانا کھانے کا اصرار کیا۔ ہر چند اُنھوں نے حیلے حوالے سے ٹالنا چاہا مگر داروغہ صاحب نے اس تکلف کو جائز نہ رکھا۔ اُٹھ کر اپنے ہاتھ سے کسنا کھولا، خوان پوش ہٹایا اور حیرت سے تصویر بن گے

رہ گئے۔ پھر دریافت کیا کہ "کیا ابھی تک خاصہ نہیں آیا ہے؟" رئیس نے سکوت اختیار کیا۔ آخر تحقیقات کرنے سے راز افشا ہوا۔ مکا پر عتاب نازل ہوا۔ اور وہ ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ لیکن ان کے خلق و مروت نے گوارا نہ کیا۔ تعلقدار صاحب سے بہت کچھ کہہ سُنکر اُسے پھر بحال کرا دیا۔

رئیس خوش فکر و خوش گو شاعر تھے۔ جملہ اصناف سخن میں پوری کامیابی سے طبیعت کے جوہر دکھاتے تھے۔ اگرچہ مرثیہ گوئی کی جانب خصوصیت سے متوجہ تھے لیکن ظرافت نگاری میں بھی مشاق تھے۔ اُنھوں نے ایک افیونی نامہ تصنیف کیا تھا۔ جسمیں نہایت پُرمذاق عنوان سے افیونیوں کی ہجو کی ہے، اُس کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

اُس لیلیٰ کا وصف کیا بیاں ہو — شمہ بھی لکھوں تو داستاں ہو
دریائے فنا کی سیل کہئے — بھوت اِن کو اُسے چڑیل کہئے
مجنوں کی طرح فریفتہ ہیں — کالی صورت پہ شیفتہ ہیں
آتا نہیں خوش انھیں نہانا — بھاتا ہے اُسے بدن کھجانا
جس شخص کی بند پائے آنکھیں — دِل کھول کے یہ بچھائے آنکھیں
سرگوشیاں اس سے ہر زماں ہوں — جس کے بالوں میں گتھیاں ہوں
جس شخص کا سر سدا رہے خم — اُس سے یہ گھُلی ملی ہے ہر دم
مشتاق اُسی کے وصل کی ہے — خواہش جسے قطع نسل کی ہے
جس کو دیکھے گی سست اندام — پہلو میں اُسی کے صبح اور شام
شیرینی کی جس کو چاٹ ہو گی — اُس سے نہ کبھی اُچاٹ ہو گی
پینک میں سدا رہے جو بیہوش — اُس شخص سے ہو گی یہ ہم آغوش
گھستے جو لگاتے گا بدن میں — بیٹھے گی اُسی کی انجمن میں

صفت افیونی

معشوق کا سُن چکے ہیں سب حال — لکھتا ہوں اب عاشقوں کا احوال
اے اشہبِ کلک جم کے چلنا — گھوڑ دوڑ نہیں ہے تھم کے چلنا
یاں میر روی نہ کر نہ چھل بل — میدانِ عمل میں آدُ گھٹا چل
ہاں ساقی لالہ رنگ ہشیار — ہوتے ہیں عیاں نشہ کے آثار
وہ ابرِ خمار گھر کے آیا — آنکھوں میں ہے پھر سرور چھایا

دریائے سُرخ کا بہا دے
جلسہ افیون کا دکھا دے

ایسا آنکھوں میں نشہ چھائے
افیونی ہر اِک بدن کُھجائے

اس طرح گزک کا تذکرہ ہو
چٹخاروں کی دم بدم صدا ہو

جاری ہوں وہ شعر تر زباں پر
ہو لذتِ نیشکر زباں پر

ٹپکے مضموں سے اسقدر قند
ہر سطر ہو صورتِ شکر قند

شیرے کا چلے قلم سے دھارا
کاغذ کا ورق بنے کرارا

اپنے سب دوست سب بیگانے
لازم ہے کوئی بُرا نہ مانے

رئیس کے کلام کا بڑا حصہ تلف ہوگیا۔ پھر بھی اُن کے صاحبزادے اور شیش محل میں جو ذخیرہ محفوظ ہے، وہ اُن کی پُرگوئی پر دلالت کرتا ہے۔ اُنھوں نے ساٹھ برس کی عمر پاکر شوال ۱۲۹۹ھ میں انتقال کیا اور حکیم بندہ مہدی کے مقبرے میں دفن ہوئے۔ کلام کا مختصر نمونہ یہ ہے ؎

سلام

علیؑ کے لال کے پہنچے جو نہی رکاب میں پاؤں
بپا تھا شور کہ ہیں قُرصِ آفتاب میں پاؤں

ہر ایک شخص ہے مہماں سرائے دُنیا میں
تھمے کسی کے نہ اِس منزلِ خراب میں پاؤں

چلے جو لاشۂ اکبر پہ شہ تو حال یہ تھا
کہ ایک جا نہ ٹھہرتے تھے اضطراب میں پاؤں

کدھر کدھر نہ پھرے بہرِ رزق سرگرداں
کہاں کہاں نہیں پہنچے ہیں اضطراب میں پاؤں

رئیسؔ، اجر انھیں کس طرح نہ ہاتھ آئے
چلیں جو شام و سحر جادۂ ثواب میں پاؤں

صبح کا منظر

جب رَن میں زرفشاں ورقِ آسماں ہوا
پنہاں نظر سے حسنِ رُخِ کہکشاں ہوا

کوسوں فروغِ نور سے روشن جہاں ہوا
اسلام کی سپاہ میں شورِ اذاں ہوا

روپوش ہوگیا مہِ تاباں حجاب سے
ذرے نظر ملانے لگے آفتاب سے

صحرا وہ پُر فضا وہ زر افشانیٔ سحر
پھولی ہوئی شفق کی وہ سُرخی اِدھر اُدھر

سارا سماں تھا خلد کا مابینِ خشک و تر
پھولوں میں تھی وہ بُو کہ مہکتے تھے بام و در

جنباں ہوا سے نخلِ چمن بار بار تھے
شبنم کی آب و تاب پہ موتی نثار تھے

مناجات

جب پڑھ چکے نمازِ سحر قبلۂ انام　　　خالق سے کی یہ عرض کہ اے رب ذوالکرام
گھیرے ہیں تین روز سے دریا کو اہلِ شام　　　عالم ہے تو کہ سب مرے بچے ہیں تشنہ کام
پیاسوں پہ ازدحام سپاہِ شریر ہے
پانی کے بدلے بارشِ پیکانِ تیر ہے

یارب! جفا میں آلِ پیمبر کو صبر دے　　　کلثومؑ کو حسینؑ کی دختر کو صبر دے
قیدِ ستم میں عابدِ مضطر کو صبر دے　　　چادر چھنے تو زینبِ مضطر کو صبر دے
منظور یہ نہیں کہ حرم پر جفا نہ ہو
شکوے سے پر کسی کی زباں آشنا نہ ہو

کمالِ فن

تھی آبرو کی تیغ بہادر کو جستجو　　　دریائے خوں میں دوڑتی پھرتی تھی چارسو
آتش مزاج و شعبدہ کردار و تند خو　　　چالاک، تیز دست، پُر انداز، شعلہ رُو
جلتے تھے اہلِ نار شرارے غضب کے تھے
بسمل پھڑک رہے تھے اشارے غضب کے تھے

وہ بانکپن وہ ناز سے چلنا اِدھر اُدھر　　　بسمل وہ ہو گیا جسے دیکھا اُٹھائے سر
طرار، خانہ جنگ، ستمگار، شعلہ ور　　　آفت کا مُنھ، بلا کی برش، قہر کی نظر
بالکل چلن عروس کے سب آشکار تھے
ناہیں نہ تھیں گندھے ہوئے پھولوں کے ہار تھے

رئیسؔ کی غزلیں ضائع ہو گئیں۔ کوشش سے چند اشعار دستیاب ہو سکے، جو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں ؎

کبھی ہنستے کبھی کرتے ہوئے ناز و ادا نکلے　　　عجب انداز اُن کے آج تو نام خدا نکلے
سمجھ کے پاؤں رکھیں وہ شہیدِ دل کے مزارِ دل پر　　　کہیں گورِ غریباں سے نہ رونے کی صدا نکلے
محبت کیجئے یا جان دیجے اے رئیسؔ اُس پر　　　نہیں ممکن کہ اُس گل سے کبھی بوئے وفا نکلے

بے گناہی مری ثابت جو ہوتی قتل کے بعد　　　دیر تک یاس سے دیکھا کیا جلاد مجھے
پر کترتا ہے مرے جبکہ بہار آ پہنچی　　　حیف! کس وقت دغا دیتا ہے صیاد مجھے

گیتانجلی

(از شری جیت اندر جیت شرما)

دیدار جو ترا مجھے اس عمر میں تو | کرنے دے یہ خیال کہ میں بدنصیب ہوں
رکھ میرے دل کو رات دن اس غم میں بیقرار | سُن لے یہ التجا مری بےبس غریب ہوں

جوں جوں یہ عمر ختم ہو بازارِ دہر میں | اور لاکھ لاکھ ہی ملیں ایک ایک ہزار سے
کرنے دے یہ خیال کہ سب کچھ لُٹا دیا | بےچین ہر گھڑی رہوں اس غم کے بار سے

مَیں تھک کے بیٹھ جاؤں اگر رہگذار میں | بستر لگاؤں ہانپ کے جب فرشِ خاک پر
محسوس ہو مجھے کہ سفر ہے مرا طویل | اِس غم سے چاک چاک رہیں سینہ و جگر

ہو جنتِ نگاہ جو آراستہ مکاں | نغمہ ہر اک حیات کا فردوسِ گوش ہو
سب کھِلکھِلا کے ہنس پڑیں مَیں غم میں محو ہوں | کچھ ہو خبر کسی کی نہ کچھ تن کا ہوش ہو

شاعر کی جنّت

(حضرت منور لکھنوی)

کیوں گلشنِ وجود لطافت اثر نہ ہو | ڈوبی ہوئی جمال میں میری سرشت ہے
سیراب روح سے ہے خیابانِ زندگی | رشتہ مگر یہ رشتۂ دہقان و کشت ہے
محوِ طوافِ جلوہ گہِ جاں ازل سے ہوں | کعبہ یہی مرا یہی میری کنشت ہے

کرتا ہوں روز و شب مَیں اسی گلزمیں کی سیر
دنیا مرے خیال کی مجھکو بہشت ہے

ہندوستان کی ہولناک ناخواندگی

ہندوستان کی آب وہوا مردم ریز اور زمین زرخیز ہے۔ ہر قسم کی قدرتی دولت سے مالا مال ہے۔ آبادی کے لحاظ سے اس کا نمبر چین کے بعد ہے یعنی تمام دُنیا سے دوسرے نمبر پر ہے۔ مگر ان تمام خوبیوں کے باوجود بھی ہندوستان دو باتوں یعنی دولت اور تعلیم میں دُنیا کے تمام ملکوں سے پیچھے ہے۔ دونوں مسئلے بڑی حد تک ایک دوسرے سے وابستہ ہیں، گورنمنٹ برطانیہ نے ان کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی اور نہ اُن کے حل کرنے میں کوئی غیر معمولی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ اتنے زمانہ کی حکومت کے بعد بھی ہندوستان کے عوام جاہل محض ہیں۔ بمشکل سے دس فیصدی حرف شناس ہونگے،

اِس وقت ہندوستان کی آبادی کا اندازہ ساڑھے سینتیس کروڑ نفوس کیا جاتا ہے۔ ملک میں ڈھائی سو آرٹ کالج، ساڑھے تین ہزار ہائی اسکول، دس ہزار مڈل اسکول اور تقریباً دو لاکھ پرائمری اسکول موجود ہیں جنکی بدولت بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں تو خیر تعلیم کا کچھ چرچا نظر بھی آتا ہے۔ مگر دیہات میں جہاں ہندوستان کی نوّے فیصدی آبادی رہتی ہے۔ خال خال ہی کوئی شخص لکھا پڑھا ملتا ہے۔

آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے نویں سالانہ اجلاس منعقدہ کراچی ۱۹۳۳ء میں مس ایمی رستم جی انسپکٹرس مدارس بمبئی نے کیا خوب کہا تھا کہ:-

> ہندوستان کی سب سے بڑی کمزوری جو ہمیں اپنے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کا آسانی سے شکار بنا دیتی ہے جمہور ہند کی جہالت یا ناخواندگی ہے۔ چنانچہ ہمیں خیال تک نہیں ہوتا کہ ان ناخواندوں کی تعداد کتنی زبردست ہے۔ اور یہ تعلیم و ترقی یافتہ لوگوں کی راہ میں کتنا زہریلا کانٹا ہیں۔ ہندوستان کے ایک ہزار مردوں میں صرف ۱۳۲ مرد اور ایک ہزار عورتوں میں صرف ۲۴ عورتیں لکھنا پڑھنا جانتے ہیں۔ ہم سیاسی اور قومی ترقی کے معاملات میں تو بڑھ چڑھ کر باتیں بناتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں جانتے کہ جب تک ملک سے ناخواندگی وجہالت کی بیخکنی نہ ہو اس وقت تک سیاسیات پر گفتگو کرنا حماقت ہے۔"

دراصل جب تک ملک کے لوگ عام طور پر خواندہ نہ ہو جائیں۔ ہم کسی قسم کی اصلاح و ترقی نہیں کر سکتے ہیں اسی خیال سے اب ہمارے صوبہ کے وزیر تعلیم آنریبل شری سمپورنانند صاحب نے اِس عام جہالت کے خلاف جہاد شروع کیا ہے۔ چنانچہ ۱۵ر جنوری کو صوبے بھر میں "یوم خواندگی" منایا گیا اور ہر تعلیم یافتہ شخص سے اِس کارِ خیر میں مدد دینے کی اپیل کی گئی۔ چنانچہ لکھے پڑھے آدمیوں سے اِس بات کا عہد لیا گیا کہ وہ اِس سال کے اندر خواہ خود

کم سے کم ایک ناخواندہ شخص کو خواندہ بنادیں یا ایک شخص کو خواندہ بنانے کے لئے مبلغ ڈیڑھ روپیہ اپنے ضلع کی تعلیمی کمیٹی کے حوالہ کریں۔

اِس مسئلہ کی اہمیت ذہن نشین کرنے کے لئے ہم ذیل میں بعض اعداد و شمار پیش کرتے ہیں جس سے ناظرین زمانہ کو ہندوستان کی عام ناخواندگی واضح ہو جائے گی۔

۱۹۳۱ء میں ہندوستان کی مردم شماری ۳۵ کروڑ ۲۸ لاکھ ۳۷ ہزار ۷۷۸ تھی۔ جن میں سے صرف ڈیڑھ کروڑ اکاسی لاکھ ۳۱ ہزار ۲۱۵ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اور یہی تعداد ان لوگوں کی ہے جو ریاستہائے حیدرآباد، میسور اور بڑودہ میں رہتے ہیں۔ لکھے پڑھے لوگوں میں بلحاظ قومیت پارسیوں کی تعداد ۸۵ فیصدی، جینیوں کی ۵۸ فیصدی، دیگر فرقوں کی ۱۶ فیصدی اور مسلمانوں کی صرف گیارہ فیصدی ہے۔ دوسرے لفظوں میں تمام ہندوستان میں لکھے پڑھے لوگوں کی تعداد فقط اتنی ہے، جتنی آسام اور سی۔پی دونوں کی آبادی ملکر ہوتی ہے۔

اور سنئے! اگر ہندوستان کے تمام اَن پڑھ لوگوں کو دو دو ملا کر ایک ایک گز کے فاصلہ سے ایک قطار میں کھڑا کیا جائے۔ تو یہ قطار بانوے ہزار دو سو چھیالیس میل لمبی ہوگی۔ اور اگر اس قطار کو پچیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ایک مقررہ مقام کے سامنے سے گذرنے کا حکم دیا جائے تو پوری قطار اس مقام سے دس برس ایک مہینہ اور پانچ دن میں گذریگی۔ اگر ان لوگوں کو دس دس کی تعداد میں برابر کھڑا کیا جائے تو یہ قطار بھی اٹھارہ ہزار چار سو انچاس میل لمبی ہوگی۔ اور اُسے مقررہ مقام سے گذرنے میں ڈیڑھ برس سات دن لگینگے۔ یہ گویا تمام ہندوستان کی حالت ہے

ہندوستان کے دیہات تو تعلیم سے کورے ہی ہیں۔ لیکن ہمارے بڑے بڑے شہروں کی (جن پر ہندوستان کو فخر ہے) تعلیمی حالت بھی نہایت افسوسناک ہے۔ شہر بمبئی ہی کی مثال لیجئے۔ جو "باب الہند" کہلاتا ہے۔ اور ہندوستان میں کلکتہ کے بعد سب سے بڑا شہر ہے۔ یہاں کی آبادی میں خواندہ لوگوں کی تعداد ۲۱½ فیصدی ہے۔

بمبئی میں ۲۵۷ میل لمبی سڑکیں ہیں۔ اگر شہر بمبئی کے تمام ناخواندہ ملکر نوشت و خواند کا مطالبہ کریں اور اپنا مطالبہ پورا کرانے کے لئے ستیہ گرہ پر اُتر آئیں، اور سڑکوں پر لیٹ جائیں تو ان لوگوں کی ہر سڑک پر تین تین قطاریں لیٹی ہوئی نظر آئیں گی۔

مشرقی اور مغربی زبانوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کیونکہ مغربی زبانوں کی تحریر کا رسم الخط انکی طباعت کے رسم الخط سے بالکل جدا گانہ ہے مگر یہ بات مشرقی زبانوں میں نہیں ہے۔ یہاں معمولی لکھائی اور چھپائی دونوں کے حروف یکساں ہیں۔ اِس لئے ان حرفوں کے سیکھنے سکھانے میں چنداں دقت نہیں پڑتی۔ دیوناگری ہی کو لے لیجئے جس میں ہر قسم کے حروف ملاکر صرف اڑتالیس حروف یا علامتیں ہیں۔ اگر آدھ گھنٹہ روز بھی لگاتار محنت کی جائے۔ تو ہر ناخواندہ بالغ شخص کو زیادہ سے زیادہ چھ مہینہ میں لکھنا پڑھنا آسکتا ہے۔

اسی مضمون کی ابتدا میں جو اعداد و شمار ہم نے دئے ہیں۔ اُنمیں دکھایا گیا ہے کہ ہندوستان میں لکھے پڑھے لوگوں کی تعداد بمشکل دس فیصدی ہوگی۔ اس دس فیصدی میں بھی عورتوں کی تعداد صرف ڈیڑھ اور کچھ کسر فیصدی ہے اندازہ کیجئے کہ نوشت و خواند کے لحاظ سے ہم اپنی عورتوں کو کسقدر پست گڈھے میں ڈالے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ہندؤں کو پراچین شاستروں میں ہدایت ہے کہ جہاں تک ممکن ہو شادی بیاہ کیوقت عورت میں تعلیم کا وصف بھی دیکھا جائے اور مسلمانوں کے نبیؐ نے بھی تمام مسلم مرد و عورتوں پر علم حاصل کرنا فرض قرار دیا ہے۔ مگر کسقدر افسوس کا مقام ہے کہ دوسری باتوں میں تو ہندو اور مسلمان شاستر اور حدیث کا نام لیتے ہیں۔ لیکن پڑھنے پڑھانے کے سلسلہ میں اپنے مذاہب کو طاق نسیاں میں رکھ دیتے ہیں۔ ورنہ ہم اسکول کی تعلیم کا خرچ برداشت کرنے کے قابل نہ بھی ہوں، تو فرصت کے وقت اپنی بیوی بچوں کو خود ہی لکھنا پڑھنا سکھا سکتے ہیں۔ البتہ ارادہ اور ہمت کی ضرورت ہے۔ اگر ہمارے تعلیم یافتہ لوگ آج ہی سے دوسروں کو تعلیم دینے کا تہیہ کریں، تو ناخواندگی کی ظلمت بغیر کسی خرچ اور بغیر کسی دقت کے بہت جلد دُور ہو سکتی ہے۔

اس امر سے تو کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ بچوں کی تعلیم کا گہوارہ ماں کی گود ہوتی ہے۔ آج کی بہنیں اور بیٹیاں کل کی بیویاں اور مائیں ہوں گی۔ یہ ناخواندہ عورتیں نہ اپنے گھروں کا صحیح انتظام ہی کرسکتی ہیں۔ اور نہ اپنے بچوں کو تعلیم دے سکتی ہیں۔ اس لئے بقول آنریبل ڈاکٹر کاٹجو "عورتوں کی ناخواندگی اور جہالت کا دور کرنا سب سے زیادہ ضروری ہے۔ کیونکہ گھر کی ملکہ بہرحال عورت ہوتی ہے۔ اور وہ اگر ناخواندہ اور جاہل ہے تو گھر کی حالت سُدھرنا مشکل ہے"

شہروں میں یہ کام ہماری میونسپلٹیاں عام جبریہ تعلیم کی اسکیم رائج کرکے انجام دے سکتی ہیں۔ مگر دیہات میں یہ ضرور مشکل ہے۔ کیونکہ ابھی تو وہاں کے مرد ہی ناخواندہ ہیں۔ عورتوں تک تو عرصہ کے بعد نوبت پہونچے گی۔ مگر اس مقصد کی تکمیل میں بھی گرام سدھار کا محکمہ اور گاؤں کی پنچائتیں بخوبی مدد دے سکتی ہیں۔ شہروں سے اُستانیاں تیار کرکے دیہات بھیجی جائیں اور وہ وہاں کی لڑکیوں اور عورتوں کے پڑھانے کا فرض اپنے ذمہ لے لیں۔ اس طرح یہ کام جلد پورا ہو سکتا ہے۔

اب رہا مردوں کی تعلیم کا معاملہ، تو اس کی دو مدیں ہیں یعنی بچوں اور (۲) بالغوں کی تعلیم۔ بچوں کی تعلیم کیلئے میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے اسکول ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جنمیں مزید اضافہ ہونا چاہیئے۔ لیکن بالغوں کی جہالت دُور کرنے کے لئے مختلف قسم کی تدبیریں اختیار کرنی پڑیں گی، اور اُس کے لئے ہر ممکن ذریعے سے کام لینا ہوگا۔ مثلاً

(۱) نائٹ اسکول (شبینہ مدرسے) کھولے جائیں کیونکہ بالغ لوگوں کو صبح سے شام تک روزی کمانیکی فکر رہتی ہے اسلئے ان کو دن کے وقت تو فرصت مل نہیں سکتی۔ اگر نائٹ اسکول موجود ہوں تو کم سے کم ایک گھنٹہ کے لئے

رات کو اسکول جا سکتے ہیں۔ ان اسکولوں کے چلانے کی ذمہ داری ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں خصوصاً اسکولوں اور کالجوں کے طالب علموں کو لینا چاہیئے۔ پڑھائی ایک گھنٹہ سے زیادہ نہ ہونی چاہئے۔ کیونکہ دن بھر محنت کرنیکے بعد لوگوں کا دماغ زیادہ دیر تک کام کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ دیہات میں یہی کام گرام سدھار کے افسران اور مدرسوں کے ٹیچر اُسے اپنے ذمہ لے سکتے ہیں۔ گورنمنٹ صوبہ نے ایک روپیہ فی شخص حق المحنت دینے کا بھی اعلان کیا ہے۔ اسکولوں اور کالجوں کے طلبا بھی گرمیوں کی تعطیل میں دیہات کا دورہ کرکے بالغوں کی تعلیم کی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔

مگر اس سلسلہ میں یہ واضح رہے کہ بچّوں کے مقابلہ میں بالغوں کی تعلیم زیادہ مشکل ہوتی ہے۔ بچّوں کو ڈرا دھمکا اور پھسلا کر بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن بالغوں پر یہ منتر بیکار ثابت ہوتے ہیں۔ اس لئے بالغوں کی تعلیم کی خدمت صرف ایسے لوگ انجام دے سکتے ہیں جو دلدہی اور ترغیب سے کام لے کر خوش اخلاقی سے پڑھنے والوں کی ہمت افزائی کریں۔ اس مقصد کے لئے پڑھانے والوں کو چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں تقسیم کرکے خاص تعلیم و تربیت دینے کی ضرورت ہے۔

(۲) لیبر اسکول:۔ جس طرح میونسپلٹیاں جبریہ تعلیم رائج کر رہی ہیں، اسی طرح صنعت و حرفت کے کارخانوں کو بھی اپنے یہاں کے بالغ مردوں کے لئے مدرسہ جاری کرنا چاہیئے۔ صورت یہ ہوسکتی ہے کہ ہر کارخانہ کام کرنے سے پہلے آدھا گھنٹہ اپنے مزدوروں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کا انتظام کرے۔ اس طرح سال بھر کے عرصہ میں ہر مزدور حرف شناس بن سکتا ہے۔ تنخواہ دیتے ہوئے، مزدوروں سے رسید پر انگوٹھے کے بجائے دستخط کرنا لازمی کردیا جائے تاکہ ہر مزدور کو کم سے کم اپنا نام لکھنا تو آجائے۔ یہی طریقہ میونسپلٹیاں اور پولس بھی اپنے یہاں جاری کرسکتی ہیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں یہ ممکن ہے کہ کوئی کانسٹبل یا گاؤں کا چوکیدار ناخواندہ بھرتی نہ کیا جائے۔

(۳) سینما بھی عام تعلیم کے لئے ایک عمدہ ذریعہ ثابت ہوسکتا ہے، بشرطیکہ خاص طور پر تعلیمی فلم تیار کئے جائیں۔

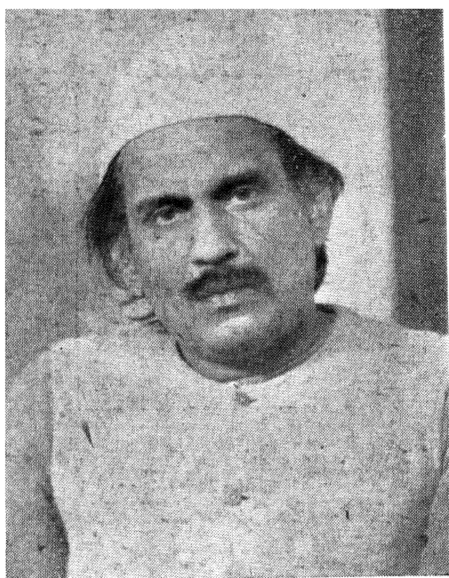
(۴) گراموفون کے ذریعہ بھی تعلیمی ریکارڈ بنا کر عام جہالت کو بڑی حد تک دُور کیا جاسکتا ہے۔

(۵) ریڈیو سیٹ بھی دیہات میں تقسیم کرکے کام لیا جائے تو عوام کی جہالت آسانی سے ایک بڑی حد تک دُور ہوسکتی ہے، اس کے ذریعہ عوام کو یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔

(۶) طلسمی لالٹین کے ذریعہ بھی مختلف قسم کی تصویریں دکھا کر عوام کو بڑی دلچسپی کے ساتھ تعلیم دیجاسکتی ہے۔

(۷) لکچر:۔ اصلاحِ معاشرت، تعلیم اخلاق اور توسیع معلومات کے لئے لکچروں سے بھی مدد لیجا سکتی ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا گورنمنٹ صوبہ بھی عوام کو تعلیم دینے کا خاص انتظام کر رہی ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق اُس نے ایک خاص محکمہ قائم کیا ہے اور رائے صاحب پنڈت سری نرائن صاحب چترویدی ایم۔ اے (سابق



آنریبل سری سمپورنانند وزیر تعلیم
صوبہ متحدہ



رائے صاحب پنڈت سری نراین چترویدی
افسر توسیع تعلیم صوبہ متحدہ

انسپکٹر مدارس حلقہ فیض آباد) کو اس کا افسر انچارج مقرر کیا ہے۔ جن کی کوشش سے صوبے میں ۱۹۶۰ اسکول بالغوں کے لئے کھولے گئے ہیں اور ۶۸ے گشتی کتب خانے جاری کئے گئے ہیں۔ انہیں سے ہر کتب خانے کی پانچ پانچ شاخیں قائم کی گئی ہیں۔ جنمیں تین تین سو کتابیں ہندی اور اُردو کی مہیا کی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ تین ہزار چھ سو ریڈنگ روم کھولے گئے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک دارالمطالعہ کو اردو ہندی کا ایک۔ ایک رسالہ اور اردو ہندی کے دو ہفتہ وار اخبار دئے گئے ہیں۔ ان سے صوبہ متحدہ کے ہر حصہ کے لوگ تبت اور نیپال کی سرحد سے لے کر پنجاب۔ راجپوتانہ، صوبہ متوسط، وسط ہند اور بہار کی سرحد تک مستفید ہوئے ہیں۔ اس محکمہ نے بالغوں کے اسکولوں کے لئے چند خاص کتابیں بھی تیار کرائی ہیں۔ جو طالب علموں کو مفت دی جاتی ہیں۔ جو مدرس اپنی کوشش سے ناخواندہ بالغوں کو خواندہ بنا دیں گے ان کو لٹریسی اسکیم کے ماتحت ایک روپیہ فی شخص انعام دیا جائے گا۔

صوبہ کے محکمہ گرام سدھار نے بھی دیہات میں ڈھائی سو لائبریریاں کھولنے کا انتظام کیا ہے۔ ہر لائبریری کو ڈھائی سو روپیہ کی کتابیں دی جائیں گی۔ ساڑھے تین ہزار ریڈنگ روم کھولے گئے ہیں۔ جنمیں سرکاری خرچ پر اخبار اور رسالے دئے جاتے ہیں۔ "ہیلسٹی وان" (سفری لائبریری) کے ذریعہ سے بھی دیہاتیوں کو تعلیم دینے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔

اس تحریک کی طرف توجہ مبذول کرنے کی غرض سے وزیر تعلیم صوبہ آنریبل شری سمپورنانند صاحب نے ۱۵ جنوری ۳۹ء کو "خواندگی کا دن" منانے کا انتظام کیا تھا۔ چنانچہ صوبے بھر میں اُس روز ہر جگہ پربھات پھیریاں نکالی گئیں۔ جنمیں ہزارہا طالب علموں نے حصہ لیا۔ دن کو جلوس نکالے گئے۔ جلسے اور تقریریں ہوئیں۔ لوگوں سے حلف ناموں پر دستخط کرائے گئے کہ وہ سال بھر میں کم از کم دو دو آدمیوں لکھنا پڑھنا سکھا دیں گے۔

میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں، پرائیویٹ کالجوں اور اسکولوں نے اپنی عمارتیں نائٹ اسکولوں کے لئے دینے کا وعدہ کیا۔ سیکڑوں طالب علموں نے رضاکارانہ طور پر بالغوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کے لئے اپنی خدمات پیش کیں، اور تو اور خود ہز ایکسلنسی گورنر صوبہ سرہیری ہیگ بالقابہ نے اس عہدنامے پر دستخط فرمائے ہیں۔ لیڈی صاحبہ نے عہدوپیمان تو نہیں کیا۔ لیکن ایک آدمی کو خواندہ بنانے کی غرض سے دو روپیہ مقررہ فیس ادا فرمائی۔ وزیر اعظم و دیگر وزرائے صوبہ بھی لوگوں کو خواندہ بنانیکے عہدنامے میں شریک ہوئے ہیں۔ آنریبل مسٹر جسٹس کملاکانت نے بارہ ناخواندہ آدمیوں کے پڑھانے کا صرفہ دینے کا وعدہ فرمایا۔ آنریبل شری پرشوتم داس ٹنڈن اسپیکر قانونی اسمبلی صوبہ نے ادنیٰ قوم کے کئی نوجوانوں کو پڑھانے کا تہیہ کیا ہے۔ غرض اس طرح تمام صوبے میں پانچ لاکھ آدمیوں نے ناخواندگی ختم کرنیکی جدوجہد میں مدد دینے کا عہد کیا ہے۔ محکمہ توسیع تعلیم کی کوشش اور اس تمام جوش وخروش کو دیکھتے ہوئے اُمید

"اے دل فریب خوردۂ دیدار"

(از خان بہادر مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر بی.اے. ڈپٹی کمشنر سیتاپور)

بیخود نہ ہو تجلّیٔ انوار دیکھکر
اے دل، فریب خوردۂ دیدار، دیکھکر

حکمِ مغاں ہے ظرفِ قدح خوار دیکھکر
دو اب شراب، نبض کی رفتار دیکھکر

تھا مژدۂ بہار، پیامِ شکست رنگ
دل خون ہوگیا گل و گلزار دیکھکر

اکثر مآلِ دید سے بیگانہ ہوگئے
نقش و نگار پردۂ اسرار دیکھکر

اے دشمنِ شکیب جفا اب جفا نہیں
آزار کش کو دیتے ہیں آزار دیکھکر

بے اختیار اہلِ وطن یاد آگئے
باہم سلوک آبلۂ و خار دیکھکر

کوچے کا اُس کے ہے یہ پتا جانِ بےقرار
آتی ہے نیند سایۂ دیوار دیکھکر

اب اُس کو خوش خرام کہو یا شراب خوار
ہوتا ہے مست اپنی ہی رفتار دیکھکر

دامن کسی کا میرا گریبان تو نہیں
اے گل فروش دیدۂ خونبار دیکھکر

مستی اُسی کی، بلکہ اُسی کا ہے میکدہ
دیکھے جسے وہ نرگسِ سرشار دیکھکر

کیا کیا تھا نازِ حسن پہ ماہِ تمام کو
مرمر گیا وہ پھول سے رخسار دیکھکر

توبہ اسی کا نام ہے کیوں میرزا اثرؔ
ملتے ہو ہاتھ خانۂ خمار دیکھکر

رباعی

کیا جام دئے ہیں متصل اے ساقی
اب مست ہے بزم آب و گل اے ساقی
میں جہل سے "ذرات" سمجھتا تھا انھیں
یہ تو ہیں دھڑکتے ہوئے دل اے ساقی

(حسرتؔ)

ایک شمع اور دو پھول

از مسٹر عزیز الرحمن ایم۔اے

اُس رات اگر کوئی بھولا بھٹکا انسان مادھوراؤ کی گلی میں سے گذرتا تو اُس کو ایک درد میں ڈوبی ہوئی آواز سُنائی دیتی۔ جسمیں نہ معلوم کتنی آرزوئیں تڑپ رہی تھیں۔ مگر وہ رات ایسی نہ تھی جس میں کوئی عمداً باہر نکلنے کا قصد کرتا۔ پُردرد آواز اِس رات کی شاکی بھی تھی ؂

"رات اندھیری بادل گرجے　　　　بجلی تڑپے اور تڑپائے

رات اندھیری۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔"

ایک طرف یہ نالۂ نیم شبی تھا تو دوسری طرف نغمۂ شیریں بھی۔ بجلی کی دلخراش کڑک اور بادل کی پُرزور گرج کا کملا کی نیند پر چنداں اثر نہ ہوا۔ مگر اِس صدائے دِلدوز نے اُسے بیدار کرکے بستر پر اُٹھا کر بٹھا دیا ؂

"بجلی تڑپے، اور تڑپائے ۔۔۔۔۔۔ اور تڑپائے ۔۔۔۔۔۔"

جذبات سے لبریز، دھیمی دھیمی آواز سُن کر کملا کی نیند کافور ہوگئی۔ کچھ دیر تو اپنی جگہ ساکت و متحیر بیٹھی رہی۔ پھر یکایک اُٹھی۔ اندھیرے میں راستہ ٹٹولتی ہوئی میز کے قریب پہنچی، اور کونے سے دیاسلائی کا بکس اُٹھا کر ایک دیاسلائی جلائی۔ لالٹین تو دکھائی نہ دی۔ اِس لئے میز کی دراز سے جلدی جلدی ایک موم بتی جو نصف کے قریب استعمال ہوچکی تھی نکالی۔ اُسے روشن کیا۔ دیاسلائی کو جو جل کر اُس کی انگلیوں کے قریب پہنچ چکی تھی ایک جھٹکا دیکر بجھا دیا۔ اور پاؤں سے مسل ڈالا۔ موم بتی کو اپنے ہاتھ میں لیا اور پھر آہستہ آہستہ قدم ٹیکتی ہوئی اپنے کمرے کے زینے سے اوپر چڑھنے لگی۔

اوپر پہنچ کر ایک لمحہ کے لئے رُک گئی۔ اُس کا خیال درست نکلا۔ آواز بدستور نرملا کے کمرے سے آرہی تھی۔ دروازے کے پاس پہنچ کر وہ رُکی۔ "جاؤں یا نہ جاؤں" ؟ اُس نے اپنے دِل سے سوال کیا۔ پھر آہستگی سے دروازے کے پٹ کھولے۔ اور موم بتی کو بجھنے سے بچانے کیلئے بایاں ہاتھ اُس کے گرد حالہ کئے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ دو قدم ہی چلکر اُسے ٹھہر جانا پڑا۔

موم بتی کی مدہم روشنی میں اُس نے دیکھا کہ اُس کی بڑی بہن اپنی چارپائی سے کچھ فاصلے پر کھڑکی کے پاس

ساکت کھڑی ہے۔ اُس کے اندر آنے سے پہلے تو نرملا یقیناً وہ دِلفگار گیت گا رہی ہو گی۔ مگر اب اُس کا چہرہ کملا کی طرف تھا۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ اور اُسکا کملایا ہوا چہرہ اُس کے رنج والم کے جذبات کا آئینہ تھا۔ بستر جوں کا توں بچھا تھا۔ اُس پر ایک شکن بھی نہ تھی۔ کملا نے یہ سب کچھ دیکھا اور سب کچھ سمجھ بھی لیا۔

نرملا کو اِس حالت میں دیکھ کر وہ کانپ گئی۔ پھر یاد آنے پر اُس نے تیزی سے مڑ کر کواڑ بند کئے ، اور موم بتی کو آتشدان پر جما دیا مگر ـــــ آگے نہ بڑھ سکی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کے پاؤں زمین نے پکڑ لئے ہوں۔ اُس کے مُنھ سے صرف ایک لفظ نکلا۔

"نرمل!"

نرملا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بُت بنی کھڑی رہی۔ صرف اُس کی نگاہوں میں جان معلوم ہوتی تھی۔ اب تک وہ ٹکٹکی لگائے کملا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مگر اب جادو ٹوٹ چکا تھا۔ کملا سے نہ رہا گیا۔ وہ اپنے دونوں بازو پھیلا کر دوڑی اور بڑی بہن کو گلے لگا لیا۔

"نرمل! نرمل!! یہ تمھیں کیا ہو گیا؟ کیسا گیت گا رہی تھیں؟ کیوں اپنے دِل کو اس طرح پریشان کرتی ہو؟ بولو بھی۔ کہیں پتا جی جاگ اُٹھے تو کیا کہتے۔ کچھ کہو بھی، نرمل؟"

کملا ایک ہی سانس میں اتنی باتیں کہہ گئی۔ مگر نرملا کے مُنھ سے ایک حرف بھی نہ نکلا۔

"سُریندر؟" کملا نے آخر دبی آواز میں پوچھا۔

نرملا نے کچھ کہے بغیر آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔ اُس کی جھکی ہوئی آنکھوں سے دو قطرے اس کے رخسار پر بہہ آئے اور کملا کے بازو پر آ گرے۔

کملا اُسے اپنے شانے کا سہارا دے کر چارپائی کے پاس لے آئی۔ اور نرمی سے بٹھا کر آپ بھی اُس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ بہن کو اس حال میں دیکھکر اُس کا دِل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا تھا۔ وہ اُسے دِلاسا دینا چاہتی) اور اُس کا غم دُور کرنا چاہتی تھی۔ مگر یہ نہ جانتی تھی کہ کیا کرے۔ آخر نرملا کے چہرہ کو بغور دیکھتے ہوئے دبی آواز میں کہنے لگی

"نرمل، کیا تمھیں سُریندر سے بہت پریم ہے؟"

کتنا عجیب سوال تھا۔ نرملا نے اپنی نگاہیں اوپر اُٹھائیں اور کملا کی طرف دیکھا۔ کملا کو اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ نرملا کی روح اس کی جھکی ہوئی آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔

کملا نے اپنے بازو بہن کی گردن میں حمائل کر دیئے۔

"نرمل! غم نہ کرو۔ تمھیں دُکھی دیکھکر میں بہت دُکھی ہو جاتی ہوں۔ تمھیں معلوم ہی ہے، میں تمہاری خوشی

کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ کچھ میرا بھی تو خیال کرو۔ نرمل! اگر تم اِس طرح اپنے آپ کو گھلاؤ گی تو میرا کیا حال ہوگا؛ میں تو جیتے جی ہی مر جاؤں گی۔"

آخری فقرہ اپنا کام کر گیا۔ نرملا کے مُنھ میں زبان پیدا ہو گئی۔

"یہ نہ کہو، کملا! یہ نہ کہو۔ مگر —— کیا کروں۔ میرے بس کی بات نہیں۔"

"ایشور سے اُمید رکھو۔"

اُمید! —— آہ! مایوس و ناکام اِنسان اُمید کے سہارے ہی جیتا ہے۔ اُمید ہی اسکی آخری جائے پناہ ہوتی ہے۔ نرملا بھی ایک دُھندلی سی اُمید کو پہلو میں دبا کر کملا کی گود میں سو گئی۔ مگر کملا کو نیند نہ آئی۔

(۲)

شام کے وقت جب بابو رتن ناتھ دفتر سے تھکے ماندے لوٹے تو اُن کے چہرے پر معمول سے زیادہ افسردگی کے آثار ظاہر تھے۔ محلہ میں اُنکی بڑی قدر کی جاتی تھی۔ اِس لئے نہیں کہ وہ پڑھے لکھے، عالم فاضل تھے۔ پڑھے لکھے تو سُریندر کے باپ بابو امرچند بھی تھے۔ مگر لوگوں کے دِلوں میں اُن کے لئے وہ عزت، وہ محبت نہ تھی۔ جو بابو رتن ناتھ کی تھی۔ اِس فضیلت کی وجہ اُن کی نیک نفسی اور خلق تھا۔ وہ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے۔ ہر ایک سے میل جول رکھتے اور حتی الوسع غریب غربا کی مدد کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ لوگ اُنھیں فرشتہ خصلت خیال کرتے تھے۔

بابو امرچند بدقسمتی سے اِن خوبیوں کے مالک نہ تھے۔ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے بالاتر سمجھ کر سوسائٹی سے گریز کرتے۔ عوام سے راہ و رسم پیدا کرنا اُن کے لئے گناہ عظیم تھا۔ نوجوان سُریندر میں اپنے باپ کے نقائص کی بجائے بابو رتن ناتھ کے اوصاف موجود تھے۔ لوگ اُس کی تعریفیں کرتے نہ تھکتے تھے اور اُس سے مِلکر بہت خوش ہوتے۔ وہ بھی اہل محلہ کو خوش رکھنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا تھا۔ اسی لئے بابو رتن ناتھ سُریندر کو بہت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

جب بابو رتن ناتھ گھر پہونچے، تو اُن کی بیوی نے ایک ہی نظر میں اُن کی حالت کا اندازہ لگا لیا۔ آثار اچھے نہ تھے۔ وہ سمجھی کہ آج خیر نہیں۔ اتنے مغموم تو کبھی نظر نہیں آئے۔ مگر بابو رتن ناتھ کچھ کہے بغیر اپنی بیوی کے پاس سے گذر گئے۔ وہ اُنھیں اِس طرح اپنے کمرے کی طرف جاتے دیکھکر اور بھی گھبرائی۔ مگر اُن کے پیچھے جانے کی ہمت نہ کر سکی۔ جب وہ اپنی ٹوپی اور کوٹ اُتار کر برآمدے میں آئے تو اُن کی بیوی کانپ رہی تھی۔ اور اسی لئے جب اُنھوں نے بظاہر ایک لاپرواہی کے انداز سے کہا۔

"وہ تو پندرہ سو ۱۵۰۰ سے ایک پائی بھی کم لینے پر راضی نہیں ہوتا۔"

تو اُس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اور آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔ تھوڑی دیر میں سنبھل کر کہنے لگی۔

"آپ دفتر سے تھکے ہوئے آئے ہیں۔ کرسی پر بیٹھ جائیں۔ پھر بات کریں گے۔ منھ ہاتھ تو دھو لیجئے، پانی لاؤں؟"

بابو رتن ناتھ نے سر کو خفیف سی جنبش دی مگر کوئی جواب نہ دیا۔ بیوی نے کرسی لاکر آگے رکھدی، وہ اس پر بیٹھ گئے۔ اُن کی گردن آگے کو جھک گئی۔ ان کے ہاتھ گھٹنوں پر مایوسانہ انداز میں پڑے تھے۔ نگاہیں زمین پر کسی چیز کو ڈھونڈتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

"کہاں ہیں نرمل اور کمل"؟ اُنھوں نے بدستور زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہیں ہونگی کہیں"؟ بیوی کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا "آپ کہے جائیں، میں دھیان رکھونگی"۔

بابو رتن ناتھ نے ایک سرد آہ بھری "مجھے کئی بار یہ خیال ہوا کہ پچھلے جنم میں میں نے کوئی بڑا گناہ کیا ہوگا جس کے عوض آج ایسی ایسی سزائیں بھگت رہا ہوں"۔

"ایسی باتیں نہ کیجئے۔ جہاں اتنی مصیبتیں سہی ہیں۔ یہ گھڑی بھی کٹ جائے گی۔ ایشور بڑا کارساز ہے، ہم پر دیا کرے گا۔

بیوی کی بات سن کر بابو رتن ناتھ نے ایک لمحہ کے لئے سر اوپر اُٹھایا۔ اور اس کی طرف غمگین نگاہوں سے دیکھکر پھر سر کو جھکا لیا اور کئی لمحے خاموش رہے۔

"وہ اب بھی ہم پر دیا کرے گا" بالآخر اُنھوں نے بیوی کے الفاظ آہستگی سے دوہرائے، گویا وہ ان الفاظ کے معنی سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ "سات بیٹیاں اور بیٹا ایک بھی نہیں۔ بڑی دیا ہے! اور وہ بھی ایک ایسے دیس میں، جہاں بیٹی، ماں باپ کے لئے وبالِ جان بن کر آتی ہے"۔ اُنکی آواز دلی جوش سے بلند ہوگئی تھی۔

مگر اتنا کہہ کر وہ رک گئے۔ اپنے ہاتھ ملنے لگے، اور دھیمی آواز میں کہنے لگے: "مگر مجھے بیٹا نہ ہونے کا اتنا افسوس نہیں، بیٹیوں سے مجھے دلی محبت ہے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ جب یہ بیچاریاں دوسرے گھر جانیکے قابل ہوجاتی ہیں تو اُن کے لئے مناسب بر ملنا محال ہو جاتا ہے۔ لڑکوں کی تو کمی نہیں، مگر لڑکے والے سمجھتے ہیں کہ اُن کے ہاتھ ایک نادر موقع آگیا۔ جس کا انھیں پورا فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔ لڑکے کے عوض لڑکی کے ماں باپ کی کھال بھی پائیں تو اُتار لیں"۔

بیوی خاموشی سے دل کا اُبال سُنا کی۔

"نہیں" بابو رتن ناتھ پھر بولے "نہیں، میں نے ضرور کوئی گناہ کیا ہوگا۔ ورنہ یہ آفت نازل نہ ہوتی"۔

بیوی نے ہمدردانہ لہجے میں کہا "ہمت نہ ہارئیے، کوئی نہ کوئی صورت پیدا ہو ہی جائے گی۔ آج نہیں تو کل۔ آخر یہ مصیبت بھی دُور ہو جائے گی۔

"پانچ لڑکیاں بیاہ چکا ہوں"۔ بابو رتن ناتھ اپنی بیوی سے مخاطب ہونے کے بجائے اپنے آپ سے

باتیں کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اُن کے لئے بر تلاش کرنے میں کتنی تکلیف اُٹھائی۔ اور جب اپنی پسند کے موافق لڑکے مِل گئے تو اُن کو حاصل کرنے کیلئے قرضہ کا کتنا بار اُٹھایا۔ آج تک اُس سے سبکدوش نہ ہو سکا۔ کماتے کماتے تھک گیا ہوں۔ کمر ٹیڑھی ہوگی مگر دو لڑکیاں ابھی بیاہنے کو باقی ہیں۔ ساری عمر تو انھیں اپنے گھر بٹھا نہیں سکتا۔ مگر اب بار اُٹھانے کی ہمت نہیں رہی۔ جی چاہتا ہے کہیں بھاگ جاؤں اور وہیں زندگی ختم کر دوں۔ مگر پھر تم ــــ اور دونوں لڑکیاں ــــ" بابو رتن ناتھ کی آواز میں ہچکی پیدا ہوگئی۔

"ایسا نہ کہئے۔ ایسا نہ کہئے"۔ بیوی نے اپنے شوہر کی متغیر حالت سے ہراساں ہو کر قطع کلام کیا۔ "جو ہونا ہے ہوگا۔ آپ کیوں گھبراتے ہیں۔ نرمل اور کمل ابھی کچھ دن اور ٹھہر سکتی ہیں"۔

ان الفاظ سے بابو رتن ناتھ کے دِل کو کچھ ڈھارس ہوئی۔ سر اونچا کر کے کہنے لگے۔ "مگر نرمل کے لئے سُریندر جیسا نیک اور ہونہار لڑکا اور کہاں ملیگا؟"

"آخر سریندر کا باپ کیوں اِس طرح اپنی ضد پر اڑا ہوا ہے۔ اگر تین سَو گھٹا دے تو اُس کا کیا نقصان ہو جائے گا؟ اتنی جائداد کا مالک ہے۔ مجھے تو اُس سے یہ اُمید نہ تھی۔

"کیا بتاؤں۔ میں نے تو اپنی طرف سے کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ آج پھر اُس کے مکان پر گیا تھا۔ مگر اُس کا مزاج کچھ ایسا دکھا ہے کہ تمھارا حال بھی نہ پوچھا۔ سریندر کے لئے وہ پندرہ سو سے کم لینے کو راضی نہیں"۔

ماں کے سینے میں غصّہ کی آگ مشتعل ہوگئی۔ اُس نے سوچا۔ "ہمیں اِتنا نہ گرنا چاہئے۔ دُنیا میں سریندر جیسے ہزاروں لڑکے ہوں گے۔ البتہ ڈھونڈنے کی مصیبت اُٹھانی پڑے گی۔ مگر یہ کوئی بات نہیں۔ نرمل میرے جگر کا ٹکڑا ہے اگر ہمیں لڑکا اچھا مل رہا ہے تو ہم بھی تو چاند جیسی بہو دے رہے ہیں۔ کیوں کسی کے پیچھے بھاگتے پھریں"۔ اپنی خیالات کی بنا پر اُس نے جواب دیا۔

"تو پھر سریندر کو بھول جاؤ۔ سمجھو کہ سریندر تھا ہی نہیں۔ اور لڑکی کیلئے کوئی اور بر ڈھونڈنا شروع کردو"۔

بابو رتن ناتھ کو اِس جواب کی قطعاً اُمید نہ تھی۔ وہ انگشت بدنداں رہ گئے۔

"تو گویا بنا بنایا کام بگاڑ دوں۔ ایسے موقع کو ہاتھ سے جانے دوں۔ سریندر جیسا لڑکا......"

"سریندر جیسے لڑکے ہزاروں، لاکھوں ہیں"۔ بیوی نے بے صبری سے قطع کلام کر کے کہا۔ "اگر ہم اپنی لڑکی کو کسی امیر گھرانے میں نہیں بیاہ سکتے تو نہ سہی۔ اگر ہم اُس کے لئے کوئی ایسا شوہر نہیں ڈھونڈ سکتے جو اُس کے آگے دَو دَو نوکر رکھے تو نہ سہی۔ میں اپنی جان سے پیاری بیٹی کو کسی غریب کے حوالے کر دوں گی۔ مگر یہ ذلّت نہ سہوں گی میں اپنی نرمل کی اِس طرح دُرگت نہ ہونے دونگی"۔

"مگر تم نہیں سمجھتیں ......"

"میں خوب سمجھتی ہوں - اگر بابو امرچند کو اپنے بیٹے پر ناز ہے - تو مجھے بھی اپنی بیٹی پر فخر ہے - میں ایک سریندر نہیں، ہزاروں سریندر اُس پر واری کر سکتی ہوں۔"

"سریندر نے تو کوئی گناہ نہیں کیا۔"

"بس اب آپ اس بحث کو جانے دیں - بابو امرچند کو جو کچھ میں نے کہا ہے بتا دیں، اور ساتھ ہی یہ بھی کہدیں کہ ایشور کی مہربانی سے ہمیں اور بہت سی جگہیں ہیں۔"

"مگر تم میرا مطلب نہیں سمجھیں - میں ......"

"اچھا کہئے - لیکن میں کہے دیتی ہوں کہ اب بابو امرچند کے بیٹے کو اپنی لڑکی نہ دونگی - چاہے کچھ ہی ہو جائے اگر وہ بیندرہ سو سے اتر کر پانچ سو پر بھی آجائیں تو میری طرف سے یہی جواب ہوگا۔"

بابو رتن ناتھ نے دل ہی دل میں بیوی کے اس فیصلے پر داد دی - وہ جانتے تھے کہ ماں کی محبت ایک اتھاہ سمندر ہے - اگر ایک بار متلاطم ہو جائے تو دُنیا کی کوئی قوت اس کے جوش کو ٹھنڈا نہیں کر سکتی - اگر ممکن ہوتا تو وہ خود اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتے - مگر آہ! یہ ممکن نہ تھا - وہ خارجی قوتیں جنھوں نے ان کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا، اُن کو ایسا کرنے کی اجازت نہ دیتی تھیں - بابو رتن ناتھ نے اپنی بے بسی محسوس کی اور خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے - کہنے لگے :-

"تم اپنی آخری بات کر چکیں - اب ذرا میری بات پر بھی دھیان دو - یہ تو ساری دُنیا جانتی ہے کہ میں دفتر کا ایک معمولی کلرک ہوں - مگر یہ بھی جانتی ہو کہ دفتر میں میری کتنی عزت کیجاتی ہے - میرے ساتھ کام کرنے والے مجھے محض کلرک ہی نہیں سمجھتے، وہ میری اتنی ہی قدر کرتے ہیں - جتنی کہ ایک عادل افسر کی اُس کے ماتحت کرتے ہیں - میں اپنی بڑائی نہیں کرتا، بلکہ حقیقت بیان کر رہا ہوں - دفتر میں سبھی سمجھتے ہیں کہ فارغ البال زندگی بسر کر رہا ہوں - کسی کو کیا خبر کہ میں نے کس طرح پیٹ کاٹ کاٹ کر پانچ بیٹیاں بیاہی ہیں - پانچوں بیٹیاں اچھے خاصے مالدار گھرانوں میں دی ہیں - اب نرمل کو کس طرح ایک غریب شوہر کے ہاتھوں سونپ دوں؟ لوگ کیا کہیں گے؟ میں کسی کو کیسے مُنہ دکھاؤنگا؟ اور کیا تم مجھے اس طرح شرمندہ ہوتے دیکھنا پسند کرو گی؟"

بابو رتن ناتھ نے بیوی کے چہرے پر اپنی نگاہیں گاڑ دیں اور جواب کا انتظار کرنے لگے - مگر جواب کہاں سے ملتا؟ ایک شوہر پرست بیوی کس طرح اپنے شوہر کی بدنامی گوارا کر سکتی تھی؟

"مگر" بابو رتن ناتھ نے پھر منقطع سلسلۂ کلام کو جاری کیا "مگر میں یہ ذلت اور رسوائی بھی برداشت کر لیتا اگر میرے راستے میں ایک اور رکاوٹ نہ ہوتی - میری بدقسمتی یا خوش قسمتی سے بڑے بھائی صاحب سرکاری وکیل ہیں - اور ایک شاہانہ زندگی بسر کرتے ہیں - اب اگر میں اپنی لڑکی کسی قلاش کے حوالے کر دوں تو اُس سے صرف میری آن ہی کو ٹھیس

نہ لگیگی بلکہ اُن کے نام پر بھی دھبّہ آئے گا۔ عام لوگ اُنھیں کن انکھیوں سے دیکھیں گے۔ میں تو ایک معمولی کلرک ہوں۔ سب کچھ سہہ لوں گا۔ مگر اُن کی رسوائی مجھ سے نہ دیکھی جائے گی۔"

کاغذ کی ناؤ اس وقت تک ہی اکڑی رہ سکتی ہے جب تک وہ پانی کی زد سے محفوظ رہے۔ جہاں پانی پڑا وہ بیکار ہوگئی۔ اُسے چاہے کسی رُخ مروڑ لو۔ بابو رتن ناتھ کے دلائل نے بیوی کی آنکھوں سے ایک پردہ ہٹا دیا۔ اُس نے اصلیت کی جھلک دیکھ لی اور اُس کے ارادے ایسے بہہ گئے، جیسے تیز پانی کی رَو پر گھاس پھوس۔ اپنے شوہر کے پژمردہ چہرے کو دیکھکر نیچی آواز میں کہنے لگی:۔

"تو پھر پندرہ سو کیسے پُورے ہوں گے۔ اپنے بڑے بھائی سے ہی مدد مانگ لیجئے۔"

"مجھے سب مصیبتیں منظور ہیں۔ مگر یہ نہ ہوسکیگا۔"

بیوی نے کہا۔ "پھر؟"

بابو رتن ناتھ نے ایک شکست خوردہ شخص کی طرح گردن جھکالی۔

"ایک بھکاری کو بھیک مانگنے کے سوائے اور چارہ ہی کیا ہوسکتا ہے؟"

بیوی کے کلیجے میں نشتر چُبھ گیا۔ اُس نے ایک آہ سرد بھری اور اپنی پُرنم آنکھیں شوہر کے پاؤں پر لگادیں۔

اگر اِن دونوں حرماں نصیبوں کو یہ معلوم ہوجاتا کہ ان کی ایک ایک بات کملا نے دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہوکر سُن لی ہے تو اُن کا کیا حال ہوتا؟

(۳)

طوفان کی آمد سے کچھ عرصہ پیشتر فضا پر سکون چھایا ہوتا ہے۔ مگر آناً فاناً جب یہ سکون منتشر ہوجاتا ہے تو پھر خدا کی پناہ! یہی معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا میں سکون کی کوئی ہستی ہی نہ تھی۔ بعینہٖ جب اِنسان پر کوئی مصیبت نازل ہونیوالی ہوتی ہے تو وہ ہشاش وبشاش دکھائی دیتا ہے۔ آس پاس کی چیزیں اُسے حسین نظر آتی ہیں اور اُسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فتح اُس کے سامنے کھڑی مسکرا رہی ہے اور اُس کے پاس آنے کے لئے صرف اُس کے اشارے کی منتظر ہے مگر بے خبر انسان یہ نہیں جانتا کہ یہ عارضی خوشی سراب کا دوسرا نام ہے۔

اتوار کی صبح کو جب بابو رتن ناتھ سو کر اُٹھے تو چاند کی ملکہ ابھی تختِ آسمان پر جلوہ گر تھی۔ نسیم سحری کھڑکی میں سے گذر کر آئی اور اُنھیں گدگدانے لگی۔ مگر وہ کچھ ایسے محو تھے کہ ہوا کی اٹھکھیلیاں اُنھیں بستر سے اُٹھا دینے میں ناکام رہیں۔ اُن کی آنکھیں چاند پر جا لگیں۔ اور وہ اس نظارے سے لُطف اندوز ہونے لگے۔ یکایک اُنھیں یاد آگیا کہ آج اُنھیں ایک مہم سر کرنی ہے۔ مگر اس خیال سے اُنھیں چنداں فکر نہ ہوئی۔ وہ بستر چھوڑ کر کھڑکی کے پاس آ کھڑے ہوئے، اور سوچنے لگے کہ آخر یہ کوئی ایسی آفت تو ہے نہیں کہ میں اپنے آپ کو پریشان کروں۔ ایشور نے چاہا تو آج ہی رقم پوری

کرلوں گا۔ سیٹھ رام تیرتھ بہت نیک آدمی ہیں۔ میری کہانی سُنیں گے اور مجھے مصیبت میں دیکھیں گے تو میری مدد سے دریغ نہ کریں گے زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ سُود کی شرح بڑھ جائیگی۔ مگر میری بیٹی کی زندگی تو آرام سے کٹیگی۔ زندگی رہی تو سُود اور اصل دونوں پائی پائی ادا کردونگا۔ پھر انھیں اپنی بیوی کا خیال آیا۔ عورت نہیں، وفا اور کفایت کی دیوی ہے۔ اُسکی جان اپنی بچیوں ہی میں اٹکی رہتی ہے۔ اپنی تو اُسے مطلق پرواہی نہیں۔ رُوکھی سوکھی جیسی ملے اُسی پر قناعت کرتی ہے۔ مگر بچیوں کو اور مجھے شکایت کا کبھی موقع نہیں دیتی۔ میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ مجھے ایسی دیوی مل گئی۔ اور رکمنی! وہ معصوم بچی ہے۔ نرمل کے چلے جانے سے آدھی ہو جائے گی۔ مگر اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے! اور پھر ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ جب یہ معصومیت کی پُتلی بھی ہمیں چھوڑ جائے گی۔ بابو رتن ناتھ کی آنکھیں آبگوں ہوگئیں۔

مگر انھوں نے فوراً ہی اپنے خیالات کو سنبھال لیا۔ آج جب میں خوشی خوشی واپس آؤنگا اور نرمل کی ماں کو آہستہ سے مُسکرا کر بتلاؤں گا کہ کام بن گیا۔ اب نرمل کے لئے فکر نہ کرو۔ تو وہ خوشی سے پھُولے نہ سمائیگی۔ مُنہ مانگی مُراد ملے گی۔ ان خیالات نے بابو رتن ناتھ کے دل پر آب حیات کا کام کیا۔ انھیں ایسی خوشی محسوس ہوئی، جس کے وجود سے وہ اب تک بے خبر تھے۔ وہیں کھڑے ہوئے انھوں نے انگڑائی لی اور پھر چاند کی طرف دیکھا۔ اُن کی آنکھوں میں مسرت کی جھلک تھی اور لبوں پر ہلکی سی مُسکراہٹ۔

یکایک اُن کے کمرے کے دروازہ پر کسی نے زور سے دستک دی۔ ایک لمحہ کے لئے وہ کچھ حیران سے ہو گئے۔ اس وقت انھیں کبھی کسی نے آکر نہ جگایا تھا۔ اُن کی بیوی انھیں ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ دماغی کام کرنے والوں کو زیادہ سونا چاہیئے۔ اسی لئے وہ انھیں کبھی مُنہ اندھیرے نہ جگاتی۔ دروازہ پھر شدت سے کھٹکھٹایا۔ بابو رتن ناتھ نے آگے بڑھکر کنڈی کھول دی۔ اُن کی بیوی باہر کھڑی تھی۔ مگر ایسی حالت میں کہ بابو رتن ناتھ کے اوسان خطا ہو گئے۔ بال پریشان تھے۔ آنکھوں سے خوف ٹپک رہا تھا۔ سانس پھولا ہوا تھا۔ پاؤں میں جوتی بھی نہ تھی۔

بابو رتن ناتھ کے مُنہ سے یہ الفاظ نکلے "کیوں، خیر تو ہے؟" اُن کے چہرے کی رنگت بھی زرد ہوگئی تھی۔

"میرے — ساتھ — چلئے — دیر نہ — کیجئے" بیوی نے اپنا ہاتھ کلیجے پر رکھکر کہا اور اپنے شوہر کی طرف التجا آمیز نظروں سے دیکھا۔ اور چل پڑی۔ بابو رتن ناتھ مجنونانہ اُس کے پیچھے ہو لئے۔ اسوقت اُنکی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ ایک ہی نظر میں انھیں معلوم ہوگیا تھا کہ کوئی بڑی آفت آگئی۔ ایک لحظہ پہلے وہ خوشی کی لہروں پر رقصاں تھے۔ ایک لمحہ بعد وہ غم کے گرداب میں پھنس گئے۔ اپنی بیوی کے پیچھے ایسے ہی چلے جاتے تھے جیسے کہ ایک معصوم بچہ بھرے بازار میں اپنے باپ کے پیچھے جو بہت آگے نکل گیا ہو۔

نرملا کے کمرے کے قریب جاکر بابو رتن ناتھ کی بیوی نے اپنی پوری قوت سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اور پھر اُن کے دیکھتے ہی دیکھتے چکرا کر زمین پر گر پڑی۔ بابو رتن ناتھ دیوانہ وار بیوی کو اُٹھانے کے لئے آگے بڑھے مگر ان کے دل میں

ایک زبردست خوف سما گیا اور انھوں نے مٹھی بند کرکے زور سے دروازے پر ضرب لگائی۔ مگر کسی نے ان کی دستک کا جواب نہ دیا۔ انھوں نے متعدد بار دروازہ کھٹکھٹایا۔ پھر پاگلوں کی طرح اپنی بیوی کے قریب دوڑ آئے اور چند لمحے زمین کی طرف تکتے رہے۔ پھر کچھ سوچ کر نیچے بھاگے اور کملا کے کمرے تک آ پہنچے۔ اس کے دروازے کھلے تھے مگر کملا نہ تھی۔ بستر لپٹا ہوا پڑا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک مدت سے یونہی پڑا ہے۔ بابو رتن ناتھ نے کھڑکی میں سے سر نکال کر نیچے کی طرف جھانکا۔ کوئی متنفس دکھائی نہ دیا۔ وہاں سے پھر بھاگے اور نرملا کے کمرے کے قریب آکر دم لیا۔ پھر دروازے کے ساتھ منھ لگا کر چلّا اٹھے "نرملا۔ نرملا۔ نرملا بیٹا تم کہاں ہو؟ بولتی کیوں نہیں؟ دروازہ کھولو۔ کملا تم اندر ہو؟ بیٹا دن نکل آیا۔ اٹھو دروازہ کھولو" مگر کوئی جواب نہ ملا۔

بابو رتن ناتھ کی قوتِ گویائی سلب ہوگئی۔ وہ بیٹیوں کو بلانا چاہتے تھے مگر ان کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلتا تھا۔ وہ اپنی بیہوش رفیقہ حیات سے بات کرنا چاہتے تھے مگر ان کا منھ کھلتا ہی نہ تھا۔ وہیں کھڑے ہوئے کس بیبسی کی حالت میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ ان کی پیشانی عرق کی بوندوں سے چمک رہی تھی یکایک وہ دروازے کی طرف لپکے اور اپنے تمام جسم کے وزن کو شدت سے اس پر دے مارا۔ ایک جگر خراش صدا پیدا ہوئی۔ اور بابو رتن ناتھ دروازے سمیت کمرے کے اندر دھڑام سے جا گرے، اور گرتے ہی اپنے پاؤں پر اٹھ کھڑے ہوئے۔

ان کی آنکھوں کے سامنے ایک ایسا منظر تھا جسے دیکھکر انسان پر سکتہ چھا جاتا ہے۔ چارپائی پر دونوں بہنیں ساتھ ساتھ سو رہی تھیں۔ مگر ان کی نیند وہی نیند تھی جسے ایک دفعہ پاکر پھر کبھی کوئی نہیں اٹھتا۔ دونوں کی آنکھیں بند تھیں۔ دونوں کے لبوں پر ایک ہلکا سا تبسم کھیلتا دکھائی دیتا ہے جیسے دونوں حیاتِ ابدی حاصل کرکے مسکرا رہی ہوں۔

بابو رتن ناتھ روئے نہیں۔ ان کی آنکھوں سے ایک قطرہ بھی نہ نکلا۔ انسانی فطرت ایک سربستہ راز ہے۔ ایک ایسی گتھی ہے جس کو آج تک کوئی نہ سلجھا سکا۔ چند لمحے پہلے وہ اپنی بیٹیوں سے ملنے کیلئے انکی صورت دیکھنے کے لئے دیوانے ہو رہے تھے۔ اب جبکہ انھوں نے بیٹیوں کو اس حالت میں پایا تو آہ و زاری کرنیکے بجائے ان کے لبوں پر مہر سکوت لگ گئی۔ دلی جذبات کے وہ سرچشمے جو ایسے سانحے دیکھکر بہہ نکلتے ہیں خشک ہوگئے۔ وہ دیکھتے رہے اس منظر کو جس نے ان کے جگر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔ اپنی ان لاڈلی بیٹیوں کو جن کے لئے وہ اپنی جان تک قربان کرنیکو تیار رہتے تھے، مگر جواب انکی آنکھوں کے سامنے بیجان پڑی تھیں۔ دفعتاً ان کی نظر میز پر رکھے ہوئے ایک کاغذ کے پرزہ پر پڑی جو ایک گلاس کے نیچے دبا ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھے اور پرچہ اٹھا لیا۔ یہ ان کی بیٹیوں کا آخری سلام تھا۔

"ماتا اور پتا جی" بابو رتن ناتھ کی دھندلی آنکھوں نے پڑھا "رنج نہ کیجئے۔ ہم نے خوب سوچ بچار کر یہ کام کیا ہے۔ کل تک ہم دونوں کی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی۔ مگر کل شام کو میں نے آپ کی باتیں سنیں تو میری اور نرملا کی

آنکھیں کھُل گئیں۔ آپ فرشتہ صفت ہیں جو ہماری خاطر اِتنے دُکھ اُٹھائے اور کبھی شکایت کا لفظ بھی نہ نکلا۔ کاش! ہمیں پہلے ہی اِس کا علم ہو جاتا تو ہم آپ پر یہ تکلیفیں نہ آنے دیتیں۔ ایک بات آپ سے ہمیشہ چھپی رہی۔ نرمل کو شرتیندر سے پریم تھا۔ مگر وہ اپنے پریم کی خاطر اِس عمر میں اپنے پتا کے سر پر قرض کا بوجھ نہ دیکھ سکتی تھی اُسے جان دینا زیادہ آسان معلوم ہوا۔ اور جب اُس نے دِل میں یہ ٹھان لی ہے تو میں نے بھی سوچا کہ میرے باقی رہنے سے کیا فایدہ ہوگا؟ میرے لئے بھی آپ کو قرض کا بار اُٹھانا پڑیگا۔ آپ نے ہمیں بہت سُکھی رکھا۔ ایشور آپکو ہمیشہ خوش رکھے۔" کملا

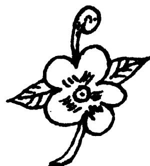
اِس عبارت کے نیچے نرملا کے ہاتھ کا لکھا تھا۔ "کملا نے جو کچھ لکھا ہے حرف بحرف سچ ہے۔ میں اور کیا لکھوں صرف ایک پرارتھنا کرتی ہوں۔ آپ ہمارے لئے رنج نہ کیجئے گا۔ اور ہم دونوں ابھاگنوں سے جو بھول چوک ہوئی ہو اُس کو مُعاف کیجئے گا"۔ بدنصیب نرملا

بابو رتن ناتھ اُس گلاس کی طرف دیکھا تو کاغذ کا ٹکڑا اُن کے ہاتھ سے گر گیا۔ اُسوقت تک اُنھوں نے ضبط کا کمال دکھایا تھا۔ مگر اب اپنے آپ کو نہ سنبھال سکے۔ جذبات کے پُرشور دریا کے بند ٹوٹ گئے۔ اُن کی آنکھوں سے سیلابِ اشک رواں ہو گیا۔ سسکیاں بھرنے لگے۔ آنسو کسی طرح نہ تھمتے تھے۔ اِسی حالت میں وہ کمرے سے باہر نکل آئے۔ اور اپنی بیوی کے جسم پر جو ابھی تک بیہوش پڑی تھی گر پڑے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

اُنھیں کیا پتہ تھا کہ اُن کے گھر کی وہ شمع بھی جس کی جان بخش روشنی کی اُنھیں اپنے آخری وقت میں ایسی ضرورت تھی ہمیشہ کے لئے بجھ چکی تھی۔

جب بیوی نے کوئی حرکت نہ کی تو رتن ناتھ کو ایک اور فکر دامنگیر ہوا۔ اس وقت وہ اپنی بیٹیوں کو بھی بھول گئے۔ بھاگے بھاگے گئے۔ اور پانی لاکر بیوی کے چہرے پر چھینٹے دیئے۔ اُسے بار بار پکارا، جسم کو ہلایا۔ جھٹکے دیئے، مگر سب کوششیں بے سُود ثابت ہوئیں۔ ناؤ تو مدت ہوئی سمندر کی گہرائیوں میں ڈوب چکی تھی۔ ملاح کی دوڑ دھوپ کس کام آتی؟ بابو رتن ناتھ کی دُنیا تاریک ہو گئی۔ سر پیٹ کر بیٹھ گئے۔ اور گو علانیہ اُن کی زبان سے شکایت کا ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ مگر اُن کا دل رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا:-

"میرے گھر میں دو پھول باقی رہ گئے تھے وہ دیکھتے دیکھتے مرجھا گئے۔ ایک شمع بچی تھی وہ بھی گُل ہو گئی۔ اب اِس اندھیر نگری میں زندگی کے دِن کیسے کٹیں گے۔



جذباتِ ضیاؔ

(از حضرت ضیاؔ فتح آبادی)

گیت تیرے حسن کے گاتا ہوں میں
چاند کی کرنوں کو تڑپاتا ہوں میں

یہ مقامِ عشق ہے بالائے فہم
تجھ کو پاکر آپ کھو جاتا ہوں میں

منزلِ مقصود ہوتی ہے قریب
راستے سے جب بھٹک جاتا ہوں میں

ہے اِسی کا نام سعیِ زندگی
دل کو اُمیدوں سے بہلاتا ہوں میں

داستانِ دل ہے کہنے کے لئے
داستانِ دل کہے جاتا ہوں میں

بیکسی بھی تو خدا کی دین ہے
بیکسی پر اپنی اِتراتا ہوں میں

میرے استقبال کو مستی بڑھے
میکدے میں جھوم کر آتا ہوں میں

اس کے دل میں بھی ہے داغِ سوزِ عشق
چاند کو ہم داستاں پاتا ہوں میں

چھیڑتی ہے صبح جب سازِ حیات
وجد میں آتا ہوں اور گاتا ہوں میں

خود تڑپتا ہوں تڑپ کر اے ضیاؔ
اہلِ محفل کو بھی تڑپاتا ہوں میں

رُباعی

کب شیشہ لیا جام لیا ساقی نے
آنکھوں سے فقط کام لیا ساقی نے

بے مے پیئے جب قدموں میں لغزش آئی
تو ہنس کے مجھے تھام لیا ساقی نے

گُشتہ

ہلالِ ابرو

(از سیّد محمد الیاس رضوی اجمیری)

اے لاجوردی بام فلک سے جھانکنے والے ماہ نو! تیری رویت، بے شمار آنکھوں کا نور اور دلوں کا سرور ہے اے منازل فلکی کو بسرعت طے کرنے والے پیک تیز گام! تیرا پیکر، پژمردہ جذبات اور مرجھائی ہوئی اُمنگوں کو فرحت و تازگی کا پیام ہے۔

اے ظلمات شب میں رہبری کرنے والے خضر دیرینہ سال! تیری نمود صحرائے طلب میں بھٹکنے والے مسافروں کیلئے چشم براہ ہے یہ مانا کہ آج تو عالم اسلامی کے لئے نوید مسرت عید کے جشن و انبساط کا اعلان ہے، اور حاجیوں کے لئے اجر جمیل کی دعوت ہے، مگر تیری حالت بھی عجیب ہے، تو کبھی مسرت و انبساط کا پیامی بنتا ہے اور کبھی رنج والم کی دعوت اپنے ساتھ لاتا ہے۔ تیرا اُفق پر نمودار ہونا کبھی تو دنیا کے اہم ترین تاریخی حادثات کی یاد دلاتا ہے اور کبھی کسی آنے والے یادگار واقعہ کی خوشخبری دیتا ہے۔ بہر حال تیرا کوئی خاص مقصد نہیں معلوم ہوتا، جس طرح تیرا جسم مختلف صورتیں بدلتا ہے اسی طرح تیری ہر بات میں گوناگوں تغیرات پائے جاتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ تو ہمیشہ ایک حالت پر نمودار ہوتا ہے، مگر دنیا کبھی کسی آنکھ سے تجھے دیکھتی ہے اور کبھی کسی آنکھ سے اور تو بھی نہ معلوم چپکے چپکے اُن کو کیا کیا کہہ دیتا ہے اور دنیا بھی آنکھوں ہی آنکھوں میں نہ جانے کیا سمجھ لیتی ہے کہ کبھی تیرا مطلب کچھ سمجھا جاتا ہے اور کبھی کچھ!

مگر ایک محروم دید یا حرماں نصیب انسان، ہمیشہ تجھے ایک نظر سے دیکھنے کا عادی ہے اُسے نہ اس کا خیال ہے کہ تو کیا پیام لایا ہے اور نہ اس کی فکر کہ تیرے طلوع ہونے کا کیا مقصد ہے، اس کو تجھ سے صرف اس لئے دلچسپی ہے کہ تو اُن کی ابروئے خمدار سے مشابہ ہے۔

اُسے نہ ہلالِ عید کو دیکھکر مسرت ہوتی ہے نہ ہلالِ محرم اُس کے لئے غم و اندوہ کا سامان۔ اس کے نزدیک دونوں کا ماحصل ہلال ابرو کی دید ہے۔ ...... اور بس۔

ہلالِ عید می بینند و من پیوستہ ابرویت
مبارک باد بر تو عید و برمن دیدنِ رویت

تنقید کتب

لختِ جگر

از سید اختر علی تلہری

ہندوستان کے اُردو شعراء میں جناب صفیؔ لکھنوی کا درجہ بہت ممتاز ہے۔ غزل۔ قصیدہ۔ مثنوی۔ مسدس وغیرہ تمام اقسامِ نظم میں آپ کے کلام کا بڑا ذخیرہ موجود ہے، جسے پرکھنے والی نگاہیں نظرانداز نہیں کر سکتیں۔

میں اس وقت جناب صفیؔ کی نہ غزلیات سے بحث کرنا چاہتا ہوں اور نہ اُن کے قصائد سے۔ بالفعل میرے پیش نظر اُن کی قومی نظموں کا وہ مجموعہ ہے جو اُنھوں نے "لختِ جگر" کے عنوان سے شیعہ کانفرنس کے پلیٹ فارم سے پڑھی ہیں اور جنھیں سید منظور علی صاحب وصی، مولوی گنج لکھنؤ نے جناب ممتاز حسین صاحب جونپوری کے بسیط مقدمہ کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔ چونکہ ان نظموں کے مخاطب شیعہ ہیں۔ اِس لحاظ سے اُن کی حیثیت "فرقہ وارانہ" ہو گئی ہے۔ لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ ہندوستان میں جتنی قومیں آباد ہیں۔ وہ زیادہ تر ایک ہی قسم کے معاشرتی و تمدنی آزار میں مبتلا ہیں۔ اور انھیں ایک ہی طرح کے علاج کی ضرورت ہے۔ ان نظموں کو مجموعی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ ہندوستان کی ہر ملت کے قومی کالبد کو باہمی اختلاف۔ خود غرض رہنماؤں کی کثرت۔ کارکنوں میں خلوص و راست بازی کی کمیابی۔ حُبِ جاہ اور عدمِ ایثار کے کیڑے ہی کھائے جا رہے ہیں۔ شیعہ بھی انھیں دُکھوں میں مبتلا ہیں۔ اِس لئے اُن کی شفایابی کے لئے جو تدبیریں بتائی جائینگی وہ سب کے لئے مفید ہوں گی۔

ایسی حالت میں "لختِ جگر" کے اُن حصّوں کا مطالعہ عوام کے لئے بھی مفید ہوگا۔ اور ان مواعظ کی شاعرانہ خوبیوں نے انھیں عام دلچسپی کی چیز بنا دیا ہے۔ اور کسی خاص طبقہ کو اُس پر ملکیت جتانے کا کوئی حق نہیں ہے

شیعہ کانفرنس کے جس جس شہر میں اجلاس ہوئے ہیں، جناب صفیؔ نے وہاں کی تاریخی و جغرافیائی خصوصیتیں بھی نظم کر دی ہیں۔ اِس لئے ان نظموں میں آپ کو دہلی، کلکتہ، الہ آباد، لاہور۔ خیرپور سندھ، بمبئی، جونپور، فیض آباد، بنارس اور آگرہ وغیرہ کے بہت سے دلکش تاریخی و جغرافیائی نقشے بھی دستیاب ہو جائیں گے۔

"لختِ جگر" کے یہ حصّے بیانیہ نظم "Descriptive Poetry" کے تحت میں آتے ہیں۔ اور اِس صنفِ نظم کو کامیابی سے لکھنے کے لئے ایک شاعر میں جن خصوصیتوں کا پایا جانا ضروری ہے وہ جناب صفیؔ میں پورے طور سے

پائی جاتی ہیں۔ الفاظ و محاورات کے بڑے ذخیرہ کے علاوہ موقع کی مناسبت سے جن لفظوں کے استعمال کی ضرورت ہوتی ہے، اُن کے انتخاب کا بھی انھیں پورا سلیقہ حاصل ہے۔ گوناگوں تشبیہوں اور استعاروں پر بھی انھیں قدرت ہے۔ اُن کی زبان میں بھی شیرینی اور بیان میں خاص لطافت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صفی نے مختلف شہروں کے جو تاریخی مُرقعے کھینچے ہیں، اُنمیں خاص دلکشی و دلآویزی پیدا ہوگئی ہے۔

آگرہ کے اجلاس کانفرنس کے سلسلے میں جو نظم کہی گئی ہے اُسمیں تاج کا بیان قابل دید ہے ؎

سبزہ زارِ آگرہ، اے خطۂ مینو سواد　　ہر عمارت ہے تری اک جنت ذات العماد
خاص کر وہ تاج، فی الواقع جو ہے تاج البلاد　　جنت شدّاد بھی جس کی کنیز خانہ زاد
دیکھ کر سیر اس کی دُنیا سے گذرنا سہل ہے
مقبرہ ایسا جو مل جائے تو مرنا سہل ہے

وہ صفائے بام و در جس پر پھسلتی ہے نظر　　وہ لطافت گرد جس کے سامنے آبِ گہر
وہ صباحت، زرد جس سے عارضِ شمس و قمر　　شیشۂ دل میں سما جائے نزاکت اِس قدر
موم پتھر بن گیا اللہ رے گل کاریاں
پھول میں نازک رگیں پتی میں نازک دھاریاں

اے زہے صناعیِ صناعِ صنعت آفریں　　تاج یا ترشا ہوا مُہرِ سلیماں کا نگیں
منفعل رو کار سے تحریرِ چشمِ سرمگیں　　سنگِ موسیٰ کے حروف اور سنگِ مرمر کی زمیں
نور و ظلمت میں بہم جب خوب گاڑھی چھن گئی
آنکھ کی پتلی سفیدی میں سیاہی بن گئی

مُرتفع در، خوشنما محراب، کتبہ دل پسند　　اے خوشا طالع جو اسکی دید سے ہو بہرہ مند
شانِ خط صید نظر کے واسطے گویا کمند　　تحت سے تا فوق کل حرفوں کے یکساں جوڑ بند
اک عبادت ہے نظارہ اس نشیمن گاہ کا
جوشن بازو ہے درسورہ کلام اللہ کا

سُرخ پتھر کی زمیں دو ز ایک نہر مستطیل　　صدر دروازہ سے کرسی تک بعنوان جمیل
بیچ میں ایک حوض یا کوثر بروئے سلسبیل　　صاف جس کی سیڑیاں ترشا ہوا دندانِ فیل
دیکھیے زینوں پہ چڑھ کے خود پسندی حوض کی
نہر کی پستی پہ ہنستی ہے بلندی حوض کی

نہر کے دونوں طرف سرو گلستانِ بہار کہکشاں کے پہلوؤں میں سبز پوشوں کی قطار
حوض میں فوارے اور اُن سے یہ معنی آشکار صورتِ آبِ رواں ہے ہستی ناپائدار

ہے ترقی سے تنزل پر زمانہ دیکھ لو

اہلِ ہمت یوں لٹاتے تھے خزانہ دیکھ لو

روئے گیتی کے لئے یہ تاج ہے تاج الشرف ماہ کامل میں کلف۔ ہر برج اسکا بے کلف
جوشش زن موجِ بہار لالۂ و گل ہر طرف گل بھی غنچے بھی صراحی در بغل ساغر بکف

مستیوں کے زور میں ہشیاریاں بھولی ہوئی

نرگس شہلا کی آنکھوں میں شفق پھولی ہوئی

لطفِ نظارہ یہ کہتا ہے شب مہتاب میں کیا حباب اُٹھا ہوا ہے چشمۂ سیماب میں
ماہ نخشب سے کہیں بہتر ہے آب و تاب میں عقل پھنس جاتی ہے جسکو دیکھکر گرداب میں

پھوٹ پڑتی ہے نگینوں کی تو آتا ہے نظر

بے جھپک چوٹیں ستارے کر رہے ہیں ماہ پر

آگرہ کے تاج کی بہت سی شاعرانہ تصویریں نظر سے گذری ہیں۔ لیکن صفیؔ نے چند شعروں میں جو اسکا نقشہ اُتار دیا ہے، اُس کی دیدہ زیبی کا کیا کہنا۔ بنارس کانفرنس کے سلسلہ میں دو بندوں کے بعد شاعر کہتا ہے:۔

ہے لبِ دریائے گنگ ایکی بہار آئی ہوئی کو ترا آشاموں کی ہر سو چھاؤنی چھائی ہوئی
ہر طبیعت حسن کے منظر پہ لہرائی ہوئی لب پہ اک موجِ تبسم آنکھ شرمائی ہوئی

ڈوب کر کیونکر نکلتے ہیں ستارے دیکھ لو

یہ تماشا آؤ گنگا کے کنارے دیکھ لو

روئے گنگا جسپر کاشی خوشنما تعمیر ہے خطِ قوسی میں سر جدول یہی تحریر ہے
پُل ہلالِ عید گنگا صاف جوئے شیر ہے یا بتوں کے ابروِ پیوستہ کی تصویر ہے

آسماں تھا فتنہ بازی میں جو مشہور جہاں

سرزمین حسن نے کھینچی ہے غمزے کی کماں

ہے حصارِ عافیت کی پشتباں اس پل کی نیو سینہ تانے یا ہے مست خواب راحت کوئی دیو
پیکر کاشی پہ ہے کیا خوشنما آڑا جینو ہے کہیں نہر ہر لب ساحل کہیں پر شیو شیو

سنیاسی سانڈ، رانڈیں گھاٹ پر کی سیڑھیاں

آفتِ جاں، دشمنِ دین ہیں یہی سب الاماں

چشمِ بددور اُف بنارس کیا ہی بانکا شہر ہے ہر ادا مہوش حسینوں کی یہاں کے قہر ہے
غیرتِ کشمیر ہے یہ انتخاب دہر ہے ہر گلی کوچہ میں جاری حسن کی اک نہر ہے
صاف ہیں شفاف ہیں کتنے یہاں کے بتکدے
ہیں ہر دم دلہن کی طرح پھولوں میں لدے

وہ دھوندلکا صبح کا وہ دور تک گنگا کا پاٹ وہ کگاروں سے نمایاں جابجا پانی کی کاٹ
وہ پریزادوں کے جمگھٹ سے پرستاں راج گھاٹ دل بہل جائے جو انساں کی طبیعت ہو اُچاٹ
اُتریں پانی میں گجر دم روز کا معمول ہے
ہر حسیں نازک بدن گویا کنول کا پھول ہے

دیکھ لو آب رواں میں حسن دلکش کی بہار صاف سینوں سے جوانی کی اُمنگیں آشکار
جال پھیلائے ہوئے پانی پہ زلف تابدار بال کا باندھا چلا آتا ہے جس میں خود شکار
جھوم کے اُٹھی جہاں گھنگھور متوالی گھٹا
دیکھنا برسائے گی موتی یہی کالی گھٹا

شیعہ کانفرنس کا پہلا اجلاس خسرو باغ الہ آباد میں ہوا تھا۔ چنانچہ شاعر معجز بیان نے اُس کے مختلف مناظر کی بھی جو تصویریں کھینچی ہیں، انھیں دُنیائے ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتی ؎

باغ یہ واقع ہے اسٹیشن سے تھوڑی دُور پر دید کے قابل ہیں اُس کے خوشنما دیوار و در
چار دیواری اگر دیکھیں تو آتے ہیں نظر مختلف پتھر کے ٹکڑے وصل یوں باہمدگر
جس طرح دلق گدائے تارک دُنیائے زشت
اپنے گھوپے میں چھپائے ساز و سامان بہشت

سبز بیلوں کے گھنے پتوں سے پھاٹک سبز پوش جس طرح آنچل عروسانِ حسین کے زیب دوش
کیاریاں پھولوں کی کثرت سے دکانِ گلفروش رنگ بنکر پھوٹ نکلا ناصیہ کے دل کا جوش
اہلِ دل کے حوصلہ کی طرح اتنا بڑھ گئیں
دیکھتے ہی دیکھتے پھاٹک پہ بیلیں چڑھ گئیں

گوشے چاروں دیکھئے اس باغ خلد آثار کے سُنئے خاموشی سے قصے ہر در و دیوار کے
مقبرے شاکی ہیں دَورِ چرخ کجرفتار کے مٹ گئے ہیں جابجا سے حرف تک اشعار کے
کون کس کی قبر ہے کوئی پتہ چلتا نہیں
مدتیں گذریں چراغ اُن پر کبھی جلتا نہیں

ہے خزاں کے رنگ میں ڈوبی یہاں کی ہر بہار　　یہ اندھیری قبر اُف یہ پردۂ شبہائے تار
کیا کریں زندانیانِ خاک ہیں بے اختیار　　آ نہیں سکتی، نہ آ، اے شمع بالائے مزار

کچھ نہ کچھ گورِ غریباں پر بھی ساماں ہو گیا
چار تارے چرخ سے ٹوٹے چراغاں ہو گیا

خوب ہم نے اِس تمھارے باغ کی دیکھی بہار　　شاخ در شاخ اسکی راہیں اور سڑکیں پیچدار
ہے کہیں پھولوں کا اک تختہ کہیں پر سبزہ زار　　کھینچتا ہے دامن نظارہ ہر نقش و نگار

ہے کہیں کچھ خم کہیں سیدھا گیا ہے راستہ
ٹہنیاں ترشی ہوئی آراستہ پیراستہ

کسقدر باقاعدہ ہے ہر چمن کا عرض و طول　　دائرہ کوئی نہ کوئی زاویہ جس میں فضول
صورتِ اشکال اقلیدس نہایت با اصول　　آنکھ میں جس طرح پتلی اُس طرح تھالے میں پھول

دیکھ کر مسرور ہوتا ہے دلِ اندوہگیں
قرۃ العین چمن ہے نرگسِ شہلا نہیں

جونپور کے جغرافیائی و تاریخی خصوصیات کا نقشہ کھینچتے ہوئے گومتی کا ذکر آگیا ہے۔ اِس سلسلہ کا ایک بند اپنی شاعرانہ ندرتِ تخیل کے لحاظ سے سُننے کے قابل ہے، فرماتے ہیں ؎

منتخب دو سبزہ زاروں میں رواں اک آبجو　　بادہ کش دو ایک کاسے میں زلالِ آرزو
ایک شفاف آئینہ دو مہوشوں کے روبرو　　دیکھئے نقشہ تو شہر جونپور و لکھنو

ایک دریا پر بسے ہیں شانِ ساحل ایک ہے
دل بظاہر ہیں جدا لیکن رگِ دل ایک ہے

صفیؔ صاحب نے اِن نظموں میں اس کا بھی لحاظ رکھا ہے کہ جس مقام پر یہ نظمیں پڑھی جائیں۔ اُن میں وہاں کی مخصوص مشہور ہستیوں کا تذکرہ بھی آجائے۔ چنانچہ الہ آباد کے دوسرے اجلاس میں جو نظم پڑھی ہے، اُس میں فرماتے ہیں ؎

ہے مثل راجہ کے گھر میں موتیوں کی کیا کمی　　زیب معدن میں جواہر لال موتی لال جی
فرد ہیں فرد یں یہ دونوں، ان سے زینت شہر کی　　ڈاکٹر سپرو کا انصافاً نہیں ہے مثل بھی

بے تعصب، خوش دماغ، آئینہ دل، منصف مزاج
فخر ملت، فخر ملک، اُردو ادب کے سر کا تاج

لاہور کی کانفرنس میں جو نظم پڑھی ہے اُسمیں وہاں کے تمام مقامات کا تذکرہ کرتے ہوئے اقبال مرحوم کے متعلق فرماتے ہیں ؎

کون لاہور انتخاب کشور ہندوستاں ۔۔۔ تربیت گاہِ سر اقبال افتخارِ شاعراں

خضرِ ملت، فلسفیِ عصر، ادیب نکتہ داں ۔۔۔ ہر ترانہ جس کا اک بانگ درائے کارواں

آسماں پیوند شعروں کے مضامین بلند

شوکت الفاظ سے شانِ تخیل چار چند

اجلاسِ کلکتہ میں جو نظم پڑھی ہے اُس میں فرماتے ہیں ؎

کون کلکتہ جہاں ہے شاعر نامی ٹیگور ۔۔۔ جس کے میدان تخیل کا نہیں کچھ اور چھور

طبع موزوں میں بھرا ہے دستِ قدرت نے وہ زور ۔۔۔ حسن معنیٰ اُس پہ صدقے چاند پر جیسے چکور

دیکھئے جو نظم وہ ڈوبی ہوئی تاثیر میں

جادوِ بنگالہ سے بڑھ کر کہیں تسخیر میں

اصل یہ ہے کہ جناب منفیؔ کی جدت پسند طبیعت نے اِن نظموں کی چمن بندی میں شاعرانہ عرق ریزی سے کام کیا ہے جس وہ صحیح معنوں میں ادب و شاعری کے چہرے کے نکھار کا سامان ہوگئی ہیں۔

رباعیاتِ خیام کا ہندی ترجمہ

رباعیات کی روز افزوں شہرت نے خیام کو غیر فانی بنادیا ہے۔ دُنیا کی قریب قریب ہر زبان میں ان کا ترجمہ ہوگیا ہے۔ ہندی میں بھی ان کے بیسوں ترجمے ہو چکے ہیں۔ زیادہ تر فٹزجیرالڈ کے انگریزی ترجمہ ہندی میں کئے گئے ہیں مگر منشی اقبال ورما سحرؔ ہتگامی نے اصل فارسی سے ۴۴۴ رباعیات کا ہندی ترجمہ کیا ہے۔ اور اِس نادر مجموعہ کو انڈین پریس الہ آباد نے خاص اہتمام سے دبیز خوبصورت کاغذ پر تصویر دار حاشیہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ مُصنف کی تصویر کے علاوہ ۲۰ خوبصورت سہ رنگی تصویریں بھی دیگئی ہیں۔ اور ہر تصویر کے مقابل اُس کے متعلق رُباعی کا ہندی ترجمہ درج کردیا گیا ہے۔ سحرؔ صاحب اِس سے پہلے (سعدیؒ کی کریما وغیرہ) کئی اُردو فارسی کی کتابوں کا ترجمہ کر چکے ہیں۔ اِس ترجمہ میں سنسکرت کے مشکل الفاظ اور محاورات کی بھرمار نہیں ہے اور ہر رُباعی میں رنگینی اور روانی کے ساتھ ساتھ اصل مفہوم کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ سحرؔ صاحب نے شروع میں خیام کے سوانحی حالات بھی درج کردئے ہیں جو تحقیق سے فراہم کئے گئے ہیں۔ کتاب کا حجم تقریباً ڈیڑھ سو صفحات ہے۔ کاغذ، چھپائی اور جلد سب نہایت خوبصورت ہے۔ قیمت صرف چار روپیہ۔ ملنے کا پتہ:- بیجر بُک ڈپو، انڈین پریس الہ آباد۔

رفتار زمانہ

(ممالک غیر)

سیاسیات یوروپ | یوروپ کا امن ابھی تک خطرے میں ہے کیونکہ اس وقت بین الاقوامی تنازعے صلح وصفائی کے ساتھ طے نہیں ہو سکے۔ اسپین کا قضیہ طے ہو جانے پر فضا بہت کچھ متغیر ہو جائے گی۔ ڈیڑھ ہفتے پہلے جو خبریں آ رہی تھیں۔ اُن سے یہی مترشح ہوتا تھا کہ یہ خانہ جنگی جلد طے ہونے والی نہیں۔ کیونکہ باغیوں کی فتوحات کے بعد ہی یہ خبر بھی آجاتی تھی کہ جمہوری فوجوں نے پھر اپنے قدم جمالئے ہیں۔ مگر مسٹر چیمبرلین کے سفر روم کے بعد اسپین میں باغیوں کی فتوحات کا سلسلہ پھر زور وشور سے شروع ہو گیا۔ دریائے ایبرو تمامتر باغیوں کے قبضہ میں آچکا ہے۔ باغی فوجیں صوبہ بارسیلونا میں داخل ہو کر صدر مقام بارسیلونا میں داخل ہو چکی ہیں۔ جمہوری حکومت پہلے ہی سے بارسیلونا سے منتقل ہو گئی تھی۔ جس تیز رفتاری سے باغی اسپین کی تسخیر میں کامیاب ہو رہے ہیں اُس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ہفتہ عشرہ میں جمہوری فوجوں کی مدافعت مجبوراً ختم ہو جائے گی۔ لیکن سرکاری فوجوں کے سکنڈ جنرل نے اعلان کیا ہے کہ جنگ اس وقت تک جاری رکھی جائے گی، جب تک اسپین کا ملک اسپین کے باشندوں کے لئے بالکل محفوظ نہ ہو جائے گا۔ باغی فوج کے سردار اعلیٰ اعلان کر رہے ہیں کہ وہ اسپین میں امن قائم کرانے کی فکر میں ہیں۔ لیکن جنرل موصوف لکھتے ہیں کہ ہم اب ایسے مرحلے پر پہونچ گئے ہیں جب دُنیا کے سامنے ایک خوفناک سانحہ رونما ہونے والا ہے

سائینور نیگرین وزیراعظم نے بھی اہل اسپین کو مخاطب کرتے ہوئے ایک تقریر میں کہا ہے کہ دشمنوں کی یہ اُمید کہ بارسیلونا کے فتح ہوتے ہی جمہوری اسپین بھی فتح ہو جائے گا ایک بار پھر ناکام ہو کر رہے گی۔ کیونکہ اسپین اب بھی اپنے دشمنوں کا موثر طریقے پر مقابلہ کرنے کو تیار ہے۔ بہرحال جب تک ہمیں کوئی اُمید نہ دلا سکتا تھا میں خاموش رہا۔ آج میں یقین دلاتا ہوں کہ ہم لوگ قطعی محفوظ ہیں۔

بہرحال اِن دلیرانہ اعلانات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس نابرابر کی لڑائی اور آئے دن کی مصیبتوں پر بھی اسپین کے شیدائیان جمہوریت کے دم خم میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ جنرل فرانکو اٹلی وجرمنی کی مدد سے اسپین پر ظاہری فتح حاصل کر لیں۔ لیکن اسپین کی ہمت اور جمہوریت پسندی ابھی تک قائم ہے اور کیا عجب ہے کہ اب بھی ہٹلر اور مسولینی کے منصوبے پورے نہ ہو سکیں۔

مسٹر چیمبرلین کا روم پہونچنا اور جنرل فرانکو کی یکایک پیشقدمی ممکن ہے اِن دونوں واقعات میں کوئی تعلق نہ ہو

اور ان دونوں کا ایک وقت میں ہونا محض اتفاقیہ بات ہو۔ لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عجب نہیں وزیر اعظم برطانیہ نے اٹلی کی رضاجوئی کے لئے اسپین کو اٹلی کی نذر کر دیا ہو۔ بہرحال اُن کے لئے یہ ایک معمۂ لاینحل ثابت ہو رہا ہے کہ کس طرح اٹلی کی تالیف قلب کی جائے۔ یہی ایک صورت تھی کہ برطانیہ فرانس پر دباؤ ڈال کر اس سے طوعاً و کرہاً بندرگاہ جیبوتی، ملک ٹیونس اور جزیرہ کارسیکا کی واپسی کا معاملہ اٹلی کے خاطر خواہ طے کرادے۔ لیکن فرانس پہلے ہی اعلان کر چکا تھا کہ ایک انچ زمین بھی وہ اپنے حریفوں کے حوالہ نہ کرے گا۔ سفر اٹلی کے دوران میں برٹش وزیر اعظم سے فرانس کے وزراء نے یہ بات گوش گذار کر دی تھی کہ وہ اٹلی اور فرانس کے مابین صلح وصفائی کرانے کی خواہ مخواہ زحمت گوارا نہ کریں لہذا اس کے سوائے اور صورت ہی کیا نکل سکتی تھی کہ اسپین کو مسولینی کے حوالے کرکے اُس کی خوشنودی حاصل کیجائے اور بحیرۂ روم میں برطانوی مفاد کے تحفظ کی ضمانت کرلیجائے۔

مسٹر چیمبرلین اور مسولینی کی اس تازہ ملاقات کی بابت شائع شدہ سرکاری بیان سے تو صرف یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اٹلی نے وزیر اعظم چیمبرلین اور اُن کے رفیق لارڈ ہیلیفکس وزیر خارجہ برطانیہ کی خاطر مدارات کا بڑی دھوم دھام سے اہتمام کیا۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ وسیع پیمانہ پر پچھلے سال ہر ہٹلر کا خیر مقدم کیا گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اُس موقعہ پر پبلک مظاہروں پر پچاس لاکھ پونڈ کی رقم کثیر صرف کی گئی تھی۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت سیاسی بساط میں ہٹلر جیسا کوئی دوسرا سیاناشاطر نہیں ہے۔ اب ہٹلر کی کامیابیوں کو دیکھکر مسولینی نے بھی اپنی ہوس کے پر پرزے نکالنا شروع کئے ہیں۔ چنانچہ فرانس سے اپنے سابقہ مقبوضات کی واپسی کا مطالبہ اسی ہوس کا نتیجہ ہے۔ مگر مسولینی ابھی اسی ادھیڑ بن میں ہے اور چیمبرلین سے ربط وضبط بڑھانے کی فکر میں مصروف ہے کہ ہٹلر بھی جو سیاسی سازش کا ماہر کامل اور اپنی ضرورت پر دوسروں سے کام نکالنے میں طاق ہے، روس کے خلاف اعانت حاصل کرنے کے لئے پولینڈ سے سازباز کر رہا ہے۔ چنانچہ پولینڈ اور جرمنی کے درمیان معاہدہ ہوگیا ہے جس کی رُو سے جرمنی پولینڈ کی حفاظت کرے گا اور پولینڈ نوآبادیات کی واپسی کے متعلق جرمن مطالبات کی حمایت کریگا۔ ہنگری بھی عنقریب ہی اشتراکیت کے خلاف معاہدہ پر دستخط کرکے جرمنی، اٹلی اور جاپان کا رفیق بننے والا ہے۔ غرض جرمنی مشرقی یوروپ میں سرعت کے ساتھ اپنا اثر، تسلط واقتدار بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ یہ واقعہ ابھی تازہ ہے کہ روس اور رومانیہ میں یہ معاہدہ ہوا تھا کہ اگر روس کو چیکوسلاویکیا کی مدد کے لئے جانا پڑا تو رومانیہ روسی فوجوں کو اپنے ملک سے گذرنے کے لئے پانچ میل چوڑا راستہ دیدیگا۔ لیکن چیکوسلاویکیا کے قضیہ میں فرانس وغیرہ ملکوں نے جو بیست ہمتی دکھائی اُس کے بعد سے رومانیہ کو فرانس کی رفاقت سے جو تقویت حاصل تھی وہ باقی نہ رہی اور اب وہ بھی عجب کشمکش میں پڑ گیا ہے۔ اگر وہ جرمنی کے دائرۂ اتحاد میں داخل ہوتا ہے تو خواہ مخواہ اپنے نزدیک ترین پڑوسی روس کی دشمنی مول لیتا ہے لیکن ہٹلر بتدریج مستقل مزاجی کے ساتھ اپنا رسوخ

بڑھا رہا ہے، اور مشرقی یوروپ میں شاطرانہ چالیں چل رہا ہے۔ سرِدست وہ دو ہزار میل طویل ایک شاہراہ بنانیکی فکر میں ہے جو متعدد سڑکوں کا مرکز ہوگی۔ جن کے ذریعہ ہٹلر جنوبی مشرقی یوروپ میں تجارتی لین دین کے معاہدوں پر عمل درآمد کریگا۔ جرمنی ریاستہائے بلقان سے کچا مال لینا چاہتا ہے اور اُس کے عوض وہ اُنھیں ایسی سڑکیں بنانیوالی مشینیں بہم پہونچانے کا وعدہ کر رہا ہے۔ جن سے حیرت انگیز تیزی کے ساتھ موٹروں کے لائق سڑکیں بن جاتی ہیں۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ دریائے رائن وڈانیوب کی نہر[1] مکمل ہوجانے پر لندن سے راٹرڈم تک تمام تجارتی مال ایسی آسانی سے آجا سکیگا۔ جیسا کہ اِس وقت وآینا سے آتا جاتا ہے۔

پُرانی جرمن نوآبادیات کی واپسی کے مسئلہ کے متعلق جرمن پریس کی یہ رائے ہے کہ اگر برطانیہ اِن نوآبادیات کے عوض دوسری نوآبادیات دے کر معاملہ چکانا چاہے تو جرمنی کو اس کی یہ تجویز قبول کرلینا چاہئے مگر اس کے ساتھ ہی جرمنی کو اِس بات کی پوری آزادی ملنا چاہئے کہ وہ اُن نوآبادیات میں اپنے بحری مستقر قائم کرے۔

برطانیہ اپنے اسلحۂ جنگ کی توسیع میں بڑی عجلت کے ساتھ ترقی کر رہا ہے۔ جرمنی بھی اِس دوڑ میں پیچھے رہنا نہیں چاہتا۔ مگر اُسے مالی مشکلات درپیش ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہٹلر اس کے لئے جائز و ناجائز طریقہ سے روپیہ اکٹھا کرنے کی تدبیریں رہا ہے۔ اِسی لئے وہ جرمن یہودیوں سے آٹھ کروڑ چالیس لاکھ پونڈ کا خون بہا طلب کرچکا ہے۔ اور رومن کیتھولک گرجاگھروں کی بیش قیمت جائداد بھی ضبط کرنے کی فکر میں ہے۔ چنانچہ پادریوں کو اندیشہ ہورہا ہے کہ کہیں اُنھیں بالکل جائداد ہی سے محروم نہ کردیا جائے۔ جرمنی میں ہر قسم کے ٹیکسوں میں انتہائی اضافہ ہوچکا ہے۔ اب لوگوں سے غالباً ان کے سرمایہ کا ایک معقول جُزو بطور ٹیکس لینے کی پالسی پر عمل ہونے والا ہے۔ چنانچہ جرمنی کے تجارت پیشہ لوگوں کو اِس کا اندیشہ ہورہا ہے۔

امریکہ اور جرمنی میں بھی کشیدگی بڑھ رہی ہے۔ دونوں ممالک نے اپنے اپنے سفیر واپس بُلالئے ہیں۔ گو امریکہ اور جرمنی کے مفاد ایک دوسرے سے متضاد ہیں اور ان کا کسی بات میں کوئی تنازعہ باہمی نہیں ہے تاہم پریسیڈنٹ روزولٹ نے یہودیوں کے ساتھ ہٹلر کے ظالمانہ سلوک پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا ہے۔ جس سے اُس کو سخت رنج پہونچا ہے۔ پریسیڈنٹ روزویلٹ کو خوف ہے کہ کہیں آمریت زور پکڑ کے جمہوریت کے نصب العین کو ایسا ضرر نہ پہونچادے کہ امریکہ کو بھی دھکا لگے۔ دوسرے وہ جاپان کے ساتھ جرمنی کی دوستی کو بھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ جاپان سے امریکہ کو بھی خطرہ ہے۔ چنانچہ اہلِ امریکہ کو جزیرہ فلپائن کی حفاظت کی فکر دامنگیر ہے۔ امریکہ اُن فوائد کو بھی قائم رکھنا چاہتا ہے جو اُسے مشرقِ بعید میں حاصل ہیں۔ چنانچہ مسٹر روزولٹ نے بحرِ اوقیانوس اور بحرالکاہل میں نئے بحری بیڑے قائم کرنا تجویز کئے ہیں۔ چنانچہ ۶۵ کروڑ ڈالر کے صرفہ سے گوآم کی بندرگاہ کی قلعہ بندی کیجائیگی۔

[1] Rhine – Danube Canal.

جس سے جاپان کو بھی امریکہ سے بدظنی ہو رہی ہے۔

چین وجاپان ادھر کئی مہینوں سے جاپان کی جنگی کاروائی مدہم رہی مگر اب پھر بڑے زور شور سے کاروائی شروع کردی گئی ہے چنانچہ حال ہی میں جنوبی چین کے دو بڑے شہروں پر ہوائی جہازوں سے بمباری کی گئی۔ جاپان کی حکومت میں جو تبدیلی حال میں ہوئی ہے۔ اُس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ جنگ چین کے متعلق وزرائے جاپان کی پالسی کامیاب پالسی نہیں سمجھی گئی اور اب جو فوجی وزارت برسر اقتدار ہوئی ہے اُس نے مصمم ارادہ کرلیا ہے کہ جاپان کے تمام ذرائع اس جنگ پر صرف کردئے جائیں اور جس طرح سے ممکن ہو نئی سرگرمی اور مستعدی کے ساتھ لڑائی جاری کرکے نتحیابی حاصل کیجائے۔ اِس میں شُبہ نہیں کہ جاپان کی نئی وزارت کے سامنے بڑی مشکلات حائل ہیں۔ اسوقت گورنمنٹ جاپان پر تقریباً سترہ ارب ین (yen) کے قرض کا بار ہے جو قریب قریب اسی جنگ کے جاری رکھنے کیلئے لیا جاچکا ہے۔ نئے بجٹ میں جاپان کے جنگی اخراجات کا اندازہ تقریباً ۵۹ کروڑ پونڈ لگایا گیا ہے۔ رقم مذکور علاوہ دیگر اخراجات کے جنگ پر صرف کی جائے گی۔ قرض کے علاوہ ٹیکسوں میں بھی جو اضافے ہو رہے ہیں۔ اہلِ جاپان انھیں عرصہ دراز تک برداشت نہ کرسکیں گے۔ اسوقت جاپان کی تجارت بھی روبہ تنزل ہے۔ چنانچہ جاپانی مال کی برآمد بتدریج گھٹ رہی ہے۔ بین الاقوامی سیاسیات میں جاپان کے لئے پیچیدگیاں پیدا ہورہی ہیں۔ امریکہ، جرمنی و جاپان دونوں کے خلاف علانیہ غم وغصہ کا اظہار کر رہا ہے۔ چینیوں نے بھی نئے طرز سے جنگ شروع کی ہے یعنی کسی خاص مقام پر جم کر لڑنے کے بجائے اُنھوں نے کُل ملک کو میدانِ جنگ بنادیا ہے۔ چنانچہ ناممکن نہیں کہ کچھ عرصہ تک معرکہ آرائیوں کے بعد جاپان کے حوصلے پست ہونے لگیں۔ کیونکہ چین میں فتح حاصل کرنے اور مفتوح علاقوں پر تسلط جمانے میں جاپان کو ایسے غیر معمولی اخراجات کا بار اُٹھانا پڑ رہا ہے جنکی وجہ سے جاپان کیلئے مفتوحہ علاقہ جات نفع بخش ثابت ہونیکے بجائے گھاٹے کا سودا ثابت ہو رہے ہیں۔ چینیوں نے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ جاپان میں نئی وزارت کتنی ہی انتہا پسند کیوں نہ ہو ہم اُس کی کوئی اہمیت نہیں سمجھتے۔ کیونکہ ہم آخر دم تک لڑنے کے لئے تیار ہیں۔ چنانچہ مسٹر وانگ چنگ وی کو جنھوں نے صلح کی تجویز پیش کی تھی، پارٹی سے نکال دیا گیا ہے۔

بہرحال ۱۹۳۸ء جنگ اور امکاناتِ جنگ میں گذرا۔ اور اسپین۔ چین۔ آسٹریا۔ چیکوسلاویکیا۔ میونخ۔ پولینڈ۔ ہنگری۔ جرمنی اور فلسطین سبھی جگہ لڑائی کا خلفشار رہا۔ اب نئے سال یعنی ۱۹۳۹ء کا بھی ایک مہینہ ختم ہوچکا ہے۔ مگر آثار سے یہی دکھائی پڑتا ہے کہ اِس سال بھی زمانہ کی گردش جنگ اور امکاناتِ جنگ ہی پر مشتمل رہے گی۔ سالِ رواں میں اکثر ملکوں میں اندرونی بدامنی پھیلنے کے امکانات بھی نظر آرہے ہیں۔ کیونکہ اس مجنونانہ اسلحہ بندی میں ٹیکسوں کا بار حد سے زیادہ بڑھ رہا ہے۔ عام طور پر لوگوں کی آمدنی میں کمی ہو رہی ہے بلکہ عوام کو روٹی کے لالے پڑ رہے ہیں۔ یہی حالات بے چینی بلکہ بدامنی کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔

ہندوستان

عام خواندگی ہمارے ملک کی تمام مصیبتوں کا سبب یا تو مفلسی ہے یا عام جہالت و ناخواندگی۔ اس لئے خوشی کی بات ہے کہ صوبہ کی موجودہ حکومت نے ناخواندگی کی بلا دور کرنے کی کوشش شروع کر دی ہے۔ چنانچہ ۱۵ جنوری کو اس مبارک تحریک کی شروعات کی گئی اور تمام صوبہ متحدہ میں یہ دن بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ علی الصبح تمام شہروں اور قصبوں میں ناخواندگی دور کرنے کی تلقین کے لئے پربھات پھیریاں نکالی گئیں جنمیں مدرسوں کے ہزاروں طالب علم شریک ہوئے۔ ہز ایکسیلنسی گورنر بہادر صوبہ اور وزیر اعظم آنریبل مسٹر پنت اور تمام دیگر وزرائے نامدار نے ناخواندہ اصحاب کو تعلیم کی برکت سے مستفیض کرنے کے حلف نامہ پر دستخط کئے۔ صوبہ کی یونیورسٹیوں، سیاسی، تعلیمی اور مجلسی انجمنوں اور سرکردہ اصحاب نے بھی اس تحریک میں دل کھول کر حصہ لیا۔ اسی طرح اڑتالیس ضلعوں میں ہر طبقہ کے لوگوں کی کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ جن کے ممبروں نے حلف نامہ پر دستخط کئے۔ گھر گھر جا کر کنویسنگ کی غرض پانچ لاکھ آدمیوں نے کم از کم ایک آدمی کو پڑھنا لکھنا سکھلانے کے لئے حلف ناموں پر دستخط کئے۔ اس سلسلہ میں صوبہ کی حکومت نے ۱۹۶۰ اسکول اور ساڑھے سات سو سے زائد لائبریریاں بھی کھولی ہیں۔ ہر لائبریری کی پانچ شاخیں ہونگی۔ جنمیں ہر ایک میں اردو ہندی کی تین سو کتابیں دی گئی ہیں۔ تین ہزار چھ سو ریڈنگ روم بھی قائم کئے گئے ہیں۔ اور ہر ریڈنگ روم کو دو ہفتہ وار اخبار اور ایک ماہوار رسالہ دئے گئے ہیں۔

کانگریس اور مسلم لیگ کانگریس اور مسلم لیگ کی کشیدگی تمام کوششوں کے باوجود ابھی تک طے ہوتی نظر نہیں آتی ہے۔ کانگریسی لیڈر مصالحت کے لئے ہر طرح سے تیار ہیں مگر مسٹر جناح اور اُن کے رفقا بے بنیاد الزامات اور مبہم اعتراضات کے علاوہ مطلب کی کوئی بات نہیں کرتے۔ ہاں اس بات پر یہ حضرات ضرور اڑے ہیں کہ کانگریس سب سے پہلے مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت مان لے۔ حالانکہ کانگریس کے لئے جو ہمیشہ سے بہ حیثیت مجموعی تمام ہندوستان کی خدمتگزاری کا دم بھرتی چلی آئی ہے صریحاً ناممکن ہے کہ وہ اپنے لئے ایک فرقہ وارانہ پوزیشن قبول کرلے اور احرار پارٹی، جمعیۃ العلماء اور دیگر مسلمانوں اور عیسائیوں وغیرہ کو جنھوں نے اولوالعزمی کے ساتھ سرد و گرم دونوں حالتوں میں اُس کا ساتھ دیا ہے یک لخت نظر انداز کر دے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے تو کانگریس کی طرف سے یہاں تک کہدیا ہے کہ وہ اُس کے متعلق کوئی ذکر درمیان میں آئے بغیر مسلم لیگ کے نمائندوں سے مصالحت کی بات چیت کرنے کو تیار ہیں۔ مگر مسٹر جناح کسی طرح نہیں مانتے ہیں۔ اور اسی شرط کو مقدم سمجھتے ہیں اور برابر یہی کہے جاتے ہیں کہ سب سے پہلے مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد سیاسی جماعت تسلیم کیا جائے اور کانگریس ہندوں کی نمائندہ بن کر گفتگو کرے۔

اس وقت ہمارے ہموطنوں کی طرف سے ہر قسم کے مطالبے بھی پیش ہو رہے ہیں۔ مسٹر جناح نے صوبہ متحدہ کی کانگریسی وزارت پر سخت الفاظ میں بہت سے ناواجب حملے کئے ہیں اور عجلت یا غصے میں اُنھوں نے بہار کے دو مقامات کو بھی صوبہ متحدہ میں شامل کر لیا ہے۔ جب پنڈت جواہر لال نہرو نے اُن سے ان الزامات کی تشریح کی درخواست کی اور

اُن کی آزادانہ تحقیقات کیلئے رضامندی ظاہر کی تو مسٹر جناح نے صاف اور صریح جواب دینے کے بجائے تحقیقات کی مشکلات بیان کرنے پر اکتفا کی، اور معاملہ جس جگہ سے اُٹھایا گیا تھا وہیں رہ گیا۔

سُنا جاتا ہے کہ مہاتما گاندھی نے خود ہی ایک اسکیم مسلم لیگ کے مطالبات کو مدنظر رکھتے ہوئے مرتب کی ہے اور اُن کی کوشش ہے کہ اُس پر کانگریسی وزرا عملدرآمد کر کے مسلمانوں کی تالیف قلوب کریں۔ مگر اس پر بھی یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس طرح کی یکطرفہ کاروائی مسلم لیگ کو پسند نہ ہوگی۔ غرض اس وقت مصالحت کی کوئی کوشش بارآور نہیں ہورہی ہے بلکہ اس کا اُلٹا اثر یہ ہورہا ہے کہ اب جگہ جگہ یہ مطالبہ ہونے لگا کہ مسجدوں کے سامنے سڑکوں پر کسی وقت کوئی باجہ نہ بجایا جائے۔ بنارس میں نگر کیرتن اور کانپور میں ایک برات کے موقعہ پر مُفت کے جھگڑے ہوچکے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ آئے دن کے یہ جھگڑے کس طرح ختم ہوں گے اور ان سے ہندو مسلمانوں کو کیا فائدہ پہونچے گا؟

پچھلے دنوں ہز ہائینس سر آغا خاں کی بابت سُنا گیا تھا کہ وہ ہندو مسلم مصالحت کے متعلق مہاتما گاندھی سے بات چیت کرنے والے ہیں۔ چنانچہ وردھا میں آپ نے جاکر مہاتما جی سے ملاقات بھی کی۔ لیکن یہ تحقیق معلوم نہیں ہو سکا کہ اس مسئلہ پر ان دونوں بزرگانِ مُلک میں کوئی تبادلہ خیال بھی ہوا یا نہیں۔ البتہ ٹانگانیکا میں ہندوستانیوں کی تنظیم کے سلسلے میں ہز ہائینس موصوف نے کانگریس کی امداد چاہی ہے۔ چنانچہ خبر ہے کہ مہاتما جی نے اس درخواست کو قبول کرکے سردار پٹیل کو آیندہ اپریل یا مئی میں ٹانگانیکا بھیجنے اور وہاں کے ہندوستانیوں کو منظم کرنے کا وعدہ کرلیا ہے

ٹانگانیکا مشرقی افریقہ کی ایک جرمن کالونی ہے جس کا رقبہ تین لاکھ ۶۴ ہزار مربع میل ہے اور جو یوگنڈا اور کینیا کے جنوب میں واقع ہے۔ اس کی آبادی پچاس لاکھ تیس ہزار ساڑھے آٹھ سو ہے مگر اُنمیں یوروپین صرف آٹھ سوا آٹھ ہزار ہیں۔ باقی چار ہزار عرب۔ دس ہزار ہندوستانی ہیں اور باقی اس ملک کے اصلی باشندے ہیں۔ مسلمانوں کی کل آبادی ڈھائی لاکھ ہے۔ جنہیں اکثر سر آغا خاں کے مُرید ہیں۔ جنگ کے بعد سے یہ ملک برطانیہ کے زیر انتظام ہے۔ چنانچہ جب سے جرمنوں نے اپنی پُرانی نوآبادیوں کا مطالبہ کرنا شروع کیا ہے۔ وہاں ایک نئی لیگ قائم ہوئی ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ اس نوآبادی کو جرمنی کو واپس نہ کیا جائے۔ سر آغا خاں بھی اس تحریک کے حامی ہیں اور کانگریس کی امداد سے ٹانگانیکا کو جرمنی کے قبضہ سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں سردار پٹیل کا سفر عموماً ہندوستان اور خصوصاً کانگریس کی تاریخ میں ایک اہم واقعہ ہوگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پنڈت جواہر لال نہرو کی کوشش سے کانگریس کا بیرونی دُنیا سے تعلق قائم ہوتا جاتا ہے۔ آیندہ کانگریس میں نحاس پاشا بھی تشریف لانے والے ہیں۔ ادھر اسپین اور چین کے ساتھ رہنمایان کانگریس نے اظہار ہمدردی کیا ہے۔ حال میں مہاتما گاندھی نے یہودیوں کے خلاف ہر ہٹلر کے مظالم پر اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا ہے۔ جس کا جرمنی میں خاص نوٹس لیا گیا ہے۔

اس مرتبہ آیندہ فروری کانگریس کے پریسیڈنٹ کے انتخاب میں جو اختلاف رائے ہوگیا ہے اس سے کانگریس کے

وقار کو صدمہ پہونچنے کا اندیشہ پیدا ہوگیا ہے۔ پچھلے سال کے صدر مسٹر سبھاش چندر بوس امسال بھی کانگریس کے صدر منتخب ہونے کے خواہشمند تھے لیکن مولانا ابوالکلام آزاد کا نام سُن کر خاموش ہوگئے تھے۔ اکثر لیڈران کانگریس کی خواہش تھی کہ اس سال مولانا موصوف ہی کانگریس کی رہنمائی کی ذمہ داری اپنے سر لیں۔ مولانا ممدوح بھی رضامند ہوگئے تھے۔ لیکن بعد میں اُنھوں نے اپنی تندرستی کو اس قابل نہ سمجھا کہ اِتنا بڑا بار اپنے اوپر لیں۔ چنانچہ وہ صوبہ اندھرا کے فاضل رہنما ڈاکٹر پٹابھی سیتا رامیہ کے انتخاب کی سفارش کر کے صدارت کی اُمیدواری سے دست بردار ہوگئے۔ اب مسٹر بوس کو اپنی دلی آرزو پوری کرنے کا موقع مل گیا۔ ادھر مہاتما جی اور اُن کے تجربہ کار رفقا کی رائے میں مسٹر بوس کے دوبارہ انتخاب کی ضرورت نہ تھی۔ چنانچہ مہاتما جی نے مسٹر بوس کو ایک نجی تار کے ذریعہ ڈاکٹر پٹابھی کے حق میں امیدواری صدارت سے دست بردار ہونے کی درخواست کی۔ سردار پٹیل، بابو راجندر پرشاد وغیرہ لیڈران ملک نے رائے دہندگان سے ڈاکٹر پٹابھی کی طرف ووٹ دینے کی اپیل کی تھی مگر مسٹر بوس نے فیڈریشن کی مخالفت کا جذبہ اُبھارنے کے ساتھ ساتھ آزادیٔ رائے میں مداخلت کا نعرہ بلند کیا۔ چنانچہ سوشلسٹ خیال کے اکثر لوگوں نے اُن کو ووٹ دئے۔ جن لوگوں کو سردار پٹیل کی سخت گیریوں کی شکایت ہے۔ اُنھوں نے بھی اِس موقعہ پر مسٹر بوس کی طرف ووٹ دینا سردار ممدوح کے خلاف ووٹ دینے کے برابر سمجھا۔ اُدھر صوبہ بنگال کے ووٹروں نے مسٹر بوس کا ساتھ دینا اپنا فرض منصبی سمجھا۔ غرض انتخاب میں مسٹر بوس نے ڈیڑھ سو ووٹوں سے ڈاکٹر پٹابھی سیتا رامیہ کو شکست دی۔

مہاتما جی نے اِس انتخاب کو اپنی شکست قرار دیتے ہوئے اپنے ہم خیال لیڈروں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ مسٹر بوس اور اُن کی پارٹی کو اپنے اصولوں کے مطابق سیاسی پروگرام بنانے اور اُس پر عمل کرنے کا پورا موقع دیں۔ مسٹر بوس نے نوجوان پارٹی کے خاص خاص اصحاب کو مشورہ کے لئے کلکتہ طلب کیا ہے۔ اور خود بھی ایک اعلان کیا ہے جسمیں اُنھوں نے لکھا ہے کہ وہ اپنے مقدور بھر کانگریس کا متحدہ محاذ قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اور مہاتما گاندھی کو مُلکی خدمت سے خوش و مطمئن رکھنا اپنا مقدم فرض سمجھتے ہیں لیکن سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ دونوں صاحبوں کے خیالات میں جو اصولی اختلافات ہیں وہ کس طرح رفع ہوسکتے ہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ مُلک کی عام رائے مہاتما جی کے موافق ہو یعنی ورکنگ کمیٹی، آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور خود کانگریس کے اجلاس عام میں کثرت رائے مہاتما جی کے اصولوں کے موافق ہو لیکن ایسی حالت میں مسٹر بوس کا نیا صدارتی دور بالکل مفلوج ہوکر رہ جائے گا۔ اِس وقت سردار پٹیل پارلیمنٹری بورڈ کے صدر ہیں مگر چونکہ وہ مسٹر بوس کے ہمخیال نہیں ہیں۔ اِس لئے اُنھوں نے نئے بورڈ کی تقرری تک کسی اہم معاملہ میں دخل دینے سے انکار کر دیا ہے۔ یہ پوزیشن بالکل صحیح ہے مگر اس سے کانگریس کے متحدہ محاذ میں فرق آتا ہے جو ملک کی سیاسی تحریک کے لئے کمزوری کا باعث ہوگا۔ ابھی وقت مسٹر بوس کے دوبارہ انتخاب نے بالکل ایک نئی صورت پیدا کر دی ہے۔ دیکھئے اس کا آخری نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ بہرحال آیندہ دو ماہ کانگریس کی تاریخ میں بہت اہم ثابت ہونگے۔

مباحثہ

اُردو۔ ہندی۔ ہندستانی

جواب۔ از منشی شیام موہن لال جگر بریلوی۔ بی۔ اے

میرے مضمون "اُردو، ہندی، ہندستانی" مطبوعہ رسالہ زمانہ اپریل کے جواب میں "حق پرست" صاحب نے ایک مقالہ زمانہ بابت ماہ ستمبر میں سپرد قلم فرمایا ہے۔ جسمیں فاضل مضمون نگار نے میرے مضمون کا خلاصہ پیش کر کے اُس سے کئی باتوں سے اختلاف رائے ظاہر کیا ہے۔

پہلا نتیجہ جو فاضل مضمون نگار نے میرے مضمون سے اخذ کیا ہے، مجھے ایک سنگین جرم کا مرتکب ٹھہرا سکتا ہے۔ اس لئے سب سے پہلے اُسی کی تردید ضروری ہے۔ "حق پرست" صاحب فرماتے ہیں:-

"...... اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ہندو بھی اب اس (اُردو) سے مُنھ موڑنے لگے ہیں اور ہندی کی جانب توجہ کرنے لگے ہیں جو اُن کی غلطی ہے .... اب واجب ہے کہ مسلمان اپنی فارسی کی بھرمار کو چھوڑ دیں اور ہندو اپنی اس ہندی کی کوشش سے باز آئیں۔"

میں "حق پرست" صاحب سے عرض کروں گا کہ براہ کرم میرا مضمون ایک مرتبہ پھر ملاحظہ فرمائیں۔ میرے کسی لفظ سے ہندی کی مخالفت کا اظہار نہیں ہوتا۔ میں ہندی کی اہمیت و فضیلت سے بخوبی واقف ہوں اور اُردو کو ہندی کے مقابلہ میں ہرگز پیش نہیں کر سکتا۔ میں تو خود کہتا ہوں کہ اُردو جو مسلمانی زبان کہلائی جانے لگی ہے۔ یہ بالوجہ ہے اور بڑی حد تک صحیح ہے اور آخر میں ہندستانی کو بھی ایسی ہی اُردو کے رنگ میں رنگے جانے سے آگاہ کرتا ہوں۔ میرے مضمون سے جس اُردو کی وکالت کا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے وہ ایسی ہی اُردو ہو سکتی ہے جو ہندوں کے تمدن، معاشرت و مذہب کی بھی پوری حد تک امین و محافظ ہو۔ ایسی زبان جس میں نہ عربی فارسی کی بھرمار ہو نہ سنسکرت کی بہتات۔

میرے ذہن میں ہندوستانی ایسی ہی زبان سے عبارت ہے اور میں ایسی ہی اُردو کو ہندستانی کا نام دے سکتا ہوں رہا یہ کہ ایسی زبان کے بہت سے صیغوں میں خصوصاً مذہبی امور میں ہندوں کو سنسکرت اور مسلمانوں کو عربی زبان ہی کو ماخذ قایم رکھنا ہوگا۔ یہ بالکل صحیح اور لازمی ہے مگر اس سے ایک دوسرے کو خالف و متوحش ہونے کی کوئی وجہ نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں زبانوں سے زیادہ جدید علوم و فنون کے رواج و ترقی کے لئے انگریزی سے استفادہ کرنا ہوگا جس کے ساتھ بےشمار الفاظ اور اصطلاحیں اس زبان کی لینا ہونگی جیسا کہ اب بھی ہو رہا ہے۔ ان کو نہ عربی کا جامہ پہنانے کی ضرورت ہے نہ سنسکرت کا۔ ایسی ہندستانی کے ساتھ ساتھ جس کا مفہوم اوپر واضح کیا گیا ہے مسلمانی اُردو اور ہندوی ہندی

بھی جدا جدا ملک میں ترقی کر سکتی ہیں۔ میں کسی ایک کو دوسری پر قربان کر دینے کی ترغیب کا گنہگار نہیں ہو سکتا۔ اور "حق پرست" صاحب مطمئن رہیں کہ اگر مسلم برادران وطن نے زبان کے متعلق ہندوؤں کے حقوق کو تسلیم نہ کیا اور ان کیساتھ ایسا ہی سلوک روا رکھا جیسا کہ اب تک رہا ہے اور اسمیں کوئی بیّن تبدیلی مصلحت وقت کے لحاظ سے نہیں بلکہ قومی یگانگت کے تقاضے سے خلوص کے ساتھ نہ ہوئی تو وہ دن دور نہیں جب یعنی اردو کے چند ہندو نام لیواؤں کے بعد جو ناقدری کے باوجود اس زبان کے گلے کا ہار بنے چلے جاتے ہیں ملک کے کونے کونے سے یہی آواز آئے گی کہ "ہندی ہندوؤں کی اور اردو مسلمانوں کی"۔ اس سے ملک کو بحیثیت مجموعی فائدہ ہوگا یا نقصان یہ بہت بڑی بحث ہے۔ بظاہر دونوں قوموں کے درمیان ایک خلیج اور پیدا ہو جائے گی۔ اور اگر دونوں قوموں کا اندرونی اور آخری مقصد یہی ہے کہ ہندستان مسلم انڈیا اور ہندو انڈیا میں ہو جائے تو یہ زبان کی تقسیم بھی ناگزیر ہے۔ لیکن باہمی بات چیت، خط و کتابت، باہمی بیوپار، کاروباری معلامات وغیرہ وغیرہ کے لئے پھر بھی ایک مشترکہ زبان کی ضرورت باقی رہے گی۔ جو نہ مسلمانی اردو ہوگی اور نہ ہندوی ہندی۔ بلکہ وہی عوام کی زبان ہوگی اور اخبارات کے ذریعہ عوام میں ترقی کرے گی۔ پھر کیوں نہ ہم اسکو ہندستانی کہہ کر ابھی سے مکمل کرنے کی کوشش کریں۔

اِس بات کو ثابت کرتے ہوئے بھی کہ اردو اب ہندوؤں کی زبان نہیں کہی جا سکتی میں ہرگز یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں جیسا کہ "حق پرست" صاحب فرماتے ہیں کہ اردو کی بنیاد مسلمانوں نے ڈالی یا یہ کہ ہندو محض ایک نقال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ "حق پرست" صاحب تحقیق کی زحمت گوارا فرمائیں گے تو اُن کو معلوم ہوگا کہ اردو کی داغ بیل ڈالنے والے ہندو اور مسلمان دونوں ہی تھے۔ بلکہ یہ کہنا حقیقت سے زیادہ قریب ہے کہ اردو کی تخلیق میں کسی کا بھی ارادہ شامل نہیں تھا۔ دونوں قوموں کی کاروباری اور بازاری ضرورتوں کی بدولت یہ وجود میں آئی۔ اور ایک عرصے تک باہمی میل جول سے یہ ترقی کرتی رہی لیکن اس کے بعد ترقی کے وہ دور شروع ہوئے جنہیں ہندو عناصر اُس سے بالکل خارج ہوتے گئے اُن بے شمار ضخیم مذہبی کتابوں کے اردو ترجموں کے علاوہ جو ہندوؤں کی قلم کے رہین منت ہیں اور جو ہندوؤں میں اردو کی تمامتر ترقی اور ہر دلعزیزی کے باعث ہوئے ہیں ہندوؤں کی طبع زاد تصنیفات اِس امر کی زبردست شہادت ہیں کہ ہندو محض نقال ہی نہیں بلکہ صاحب طرز ہوئے ہیں۔ بعض بعض اصناف ادب کے موجد بھی وہی ہیں مثلاً علم معنی و بیان[۱] صنائع و بدائع میں سب سے پہلی کتاب منشی دیبی پرشاد ساحر بدایونی نے تصنیف کی۔ منشی تھن لال بہجت نے ایک کتاب قواعد اردو پر "قواعد انشار" لکھی۔ یہ اپنے طرز کی پہلی کتاب تھی جسمیں علم معنی و بیان اور شعر و شاعری سے بحث کی گئی ہے اس بنا پر ہندو بھی بجا طور پر کہہ سکتے ہیں ؎

نسیم دہلوی ہم موجد باب فصاحت ہیں　　کوئی اردو کو کیا سمجھے کہ جیسا ہم سمجھتے ہیں

---

[۱] ملاحظہ ہو "اردو ایسوسی ایشن میگزین" لکھنؤ یونیورسٹی بابت ۱۹۲۸-۲۹ء مرتبہ سید زوار عباس صفحہ ۳۹

پنڈت رتن ناتھ در سرشار نے فسانہ کی بُنیاد ہی نہیں ڈالی بلکہ وہ کارنامہ پیش کیا جسکی نظیر نہیں اور جو قیامت تک اُردو کے لئے سرمایۂ افتخار بنا رہیگا۔ علامہ کیفی دتاتریہ سالنامہ ادبی دُنیا کے صفحہ ۲۵ پر لکھتے ہیں کہ:-

"جو ہندو مسلمان اُردو و ہندی کے قضیے کو ملی رنگ میں ڈوب دینا چاہتے ہیں اُن کیلئے یہ انکشاف سبق آموز ہے کہ پنجاب میں اوّلیں اخبار اور رسالہ نکالنے والا بھی ایک ہندو تھا۔ اس وقت کے بوڑھے اُن بزرگوں کی نبیرگی کی حیثیت سے آگے نہیں گئے ہیں، اور یہ ملک کا قانون ہے کہ ایک مکسوبہ جائداد تیسری پُشت میں جاکر جدی جائداد کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ اقلیت واکثریت کے حساب سے بھی یہ امر ثابت ہے کہ اُردو کی صحافت کے بارے میں ہندوں کی حیثیت ویسی ہی ہے جیسی ایک موروثی جائداد سے متعلق مشترکہ خاندان کے ایک فرد کی"

کیفی صاحب کے آخری جملے بلاکم و کاست کل اُردو ادب پر صادق آتے ہیں۔ لیکن اب یہ سب حقوق اور حقائق عجیب اور اجنبی معلوم ہوتے ہیں اور اُردو کے اجارہ داروں کی زیادتیوں اور تعصبات کے باعث عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ اُردو سے ہندوں کا کوئی تعلق نہیں اور اگر ہے تو وہ نقالی تک محدود ہے۔ تعصب نے ہندوں کو اُردو سے مٹادیا اور اب اُن کی نقالی کا خیال اسقدر وسعت اور پختگی کے ساتھ پھیل گیا ہے کہ اُس کے خلاف واقعات پیش کرنے پر بھی لوگوں کے دلوں سے یہ خیال نہیں نکلتا۔ اسی خیال نے "حق پرست" صاحب کو یہ فتویٰ صادر فرمادینے پر اُبھارا ہے کہ:-

"ہندوں کی زبان غیر متوازن اور بھدی ہوجاتی ہے۔ اور اگر نیاز فتحپوری یہ کہتے ہیں کہ ہندوں کو اُردو لکھنا نہیں آتا تو غلط نہیں۔"

اِس کے جواب میں حقیقت یہ ہے کہ بیشمار ہندوں کا نام اور کلام مٹ جانے کے بعد بھی اب تک جو چند بزرگ مخالف کوششوں کے باوجود زندہ چلے جاتے ہیں۔ اُن میں سرشار اور نسیم کے نام سب سے پہلے زبان پر آتے ہیں۔ ان میں سے نسیم کو تو فنا کردینے کی کوشش ایک مدت سے ملک میں جاری ہے اور ہر نقاد جو اُردو میں پیدا ہوتا ہے سب سے پہلے نسیم ہی کو تختۂ مشق بناکر نام پیدا کرنے کی سعی کرتا ہے۔ ان دونوں بزرگوں کے پیش رووں میں سے تو کوئی بھی اب زندہ اور باقی نہیں۔ نہ کسی کا کوئی نام لیتا ہے نہ کلام کا آسانی سے پتہ چلتا ہے۔ ان حضرات میں ایک سرب سکھ دیوانہ تھے۔ جن کے متعلق حکیم قدرت اللہ مجموعۂ نغز[1] میں لکھتے ہیں:-

"وے از شعرائے دیار مشرق است در بلدہ لکھنؤ بچند علم اُستادی برافراشت و کثیرے بود کہ نسبت تلمذ بوے نداشتہ جعفر علی حسرت کہ اُستاد قلندر بخش جرأت است نسبت تلمذ بوے دارد۔ کمتر کسے از سکنۂ آں دیار وے را اُستاد نہ پندارد"

دورِ جدید کے معماروں میں منشی جوالا پرشاد برق، منشی درگا سہائے سرور جہاں آبادی، پنڈت برج نراین چکبست، منشی جگت موہن لال رواں ایسے مشاہیر ہیں۔ جن کی تصنیفات ممتاز خصوصیات اور مخصوص کمالات سے مالامال ہیں اور ہر ایک انمیں

[1] ملاحظہ ہو مجموعہ نغز، مرتبہ محمود شیرانی لکچرار پنجاب یونیورسٹی۔ مرتب نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ یہ تذکرہ آزاد کی آبحیات کا ماخذ ہے اور پھر بھی آزاد نے دیوانہ کو ترک کردیا۔ جگر

ہے ادبی حیثیت سے ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ اور منشی درگا سہائے سرور اور منشی پریم چند کی مثال تو نہ پیدا ہوئی اور نہ ہو گی۔ متفرق طور پر بعض مبصران فن اور نقادان ادب نے ان حضرات کے متعلق جو رائیں وقتاً فوقتاً ظاہر کی ہیں اگر اُن میں سے ایک ایک بھی پیش کی جائے تو یہ مضمون ایک دفتر ہو جائے۔[1]

حق پرستی کا مقتضیٰ یہ ہے کہ حق پرست صاحب اور اُن کے ہم خیال جو مسلمانوں کو اُردو کا واحد موجد، مجتہد، اور بلا شرکت غیرے مالک سمجھتے ہیں وہ کم سے کم متذکرہ بالا حضرات کی تصانیف نیک نیتی کی نظر سے شروع سے آخر تک بغور مطالعہ فرمائیں۔ اُس وقت اُن کو معلوم ہو گا کہ ان بزرگوں کے ادبی کمالات پر اُتنے ہی دفتر لکھے جا سکتے ہیں جتنے کسی بڑے سے بڑے نثار یا شاعر پر اب تک لکھے گئے ہیں۔ لیکن دفتر لکھنا درکنار آجکل اُن کا مطالعہ بھی شاید گناہ میں داخل سمجھا جاتا ہے۔ ہندوؤں کو اتنی توفیق نہیں کہ اپنے اہل کمال کو زندہ رکھنے کی تدابیر اختیار کریں۔ نہ ان میں اپنے دعوے پیش کرنے کا مادہ اور اُن کو منوانے کی ہمت ہے۔ جو ادبی ذوق سے بے بہرہ ہیں وہ تو معافی کے قابل ہیں ہی لیکن جو شاعر و ادیب ہیں اُن کے تمام تر حوصلوں اور ارادوں کی معراج یہ ہے کہ مشاعروں میں یاد کرئے جائیں، وہاں تھوڑی سی واہ وا ہو جائے یا دو چار اخباروں اور رسالوں میں اشاعت مضامین کا شرف حاصل ہو جائے۔ بس یہی اُن کی دانست میں ادبی زندگی کا معیار و منتہا ہے۔ وہ اِس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ اُن کے لئے اُردو ادب میں کوئی مستقل جگہ نہیں، اور اگر بے خبر نہیں ہیں تو اپنے ضمیر کو دھوکا دیتے ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ ہندو خود زندہ رہنا نہیں جانتے۔ پھر غیر ہندوؤں کو اُن سے ہمدردی ہو تو کیوں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ حقیقت سے ناواقف بعض بعض ہندو حضرات بزعم دیانتداری یہ فرما دیتے ہیں کہ جس میں "نت" ہوتا ہے وہ خود چمک جاتا ہے اُسے چمکانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ صحیح بھی ہے اور نہیں بھی۔ صحیح یوں ہے کہ ہندو شاعر و ادیب بھی مخالف اثرات کے باوجود اپنی زندگی میں خوب چمکتے ہیں۔ لیکن چراغ حیات گل ہو جانے کے بعد ہی چراغ لے کر ڈھونڈھنے پر بھی اُن کا پتہ نہیں ملتا۔ اور یہ قول غلط یوں ہے کہ سونا جب تک کان میں پڑا رہتا ہے اُسے کوئی نہیں جانتا۔ جب وہ مٹی میں سے نکال کر نکھار کر بازار میں لایا جاتا ہے تو اسکی قدر و قیمت ہوتی ہے اور جب زیورات کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے تو حسن و جمال کی زینت بن کر اپنے پیدا ہونے کا مقصد پورا کر دیتا ہے۔ آج غالبؔ کی جو پرستش کیجاتی ہے اُس کا سہرا مولانا حالیؔ کے سر ہے۔ دراصل اپنوں کی قدر دانی ہمارے برادرانِ وطن کا حصہ ہے۔ یہی نہیں کہ وہ اہل کمال کے جوہروں کو ڈھونڈ ڈھونڈھ کے چمکاتے ہیں بلکہ گرم بازاری و بزم افروزی کی خاطر بُرائیوں کو بھی خوبیاں ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً سر سید احمد کے مضامین میں زبان و بیان اور محاورے کی جو غلطیاں ہیں اُنھیں مولانا حالیؔ اوصاف میں شمار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ (سر سید) تحریر یا تقریر کی رَو میں قواعد اُردو کی کچھ پروا نہ کرتے تھے اور ان قاعدوں سے جو شاعروں اور انشا پردازوں نے مقرر کئے ہیں

[1] فاضل مضمون نگار نے بیان پر محسنین اُردو کے متعلق چند رائیں پیش کی ہیں جو بخوف طوالت نظر انداز کی جاتی ہیں۔ (ایڈیٹر)

بالکل آزاد تھے۔ وہ ان غلط لفظوں کو جو عام فہم اور خاص و عام کی زبان پر جاری ہوں صحیح الفاظ پر ترجیح دیتے تھے اس کو قوم پرستی کہتے ہیں۔ اس کے برخلاف ہندو تصانیف پر اگر کسی کی نگاہ پڑتی بھی ہے تو سب سے پہلے عیوب ڈھونڈے جاتے ہیں ؎

ببین تفاوت رہ از کجاست تابکجا

اب رہی "حق پرست" صاحب کی خاموش غنچی' یا 'پوشیدہ غنچی' کی مثال یا اسی قسم کے بعض فقرے یا عبارتیں تو مجھے بڑی حیرت ہے کہ "حق پرست" صاحب نے ان کو ایک ادبی یا علمی کوشش کا نتیجہ کیونکر سمجھ لیا۔ ایسی عبارتیں' اور جملے جن سے غلط فہمی میں پڑ کر "حق پرست" صاحب کائستھوں پر برس پڑے ہیں۔ اس بات کی بین شہادتیں ہیں کہ کائستھوں نے فارسی زبان میں کتابی کمال ہی نہیں حاصل کیا تھا بلکہ اس کو اپنی گھریلو زندگی کا جزو بنا لیا تھا اور اسی جزو میں یہ تمسخر کا انداز بھی شامل تھا۔ ایسی فارسی کی یہی علت غائی تھی، جو کائستھوں کی اختراعی قوت کی دلیل ہے ورنہ کون سلیم العقل اور صحیح المذاق شخص ان مثال کو کسی سنجیدہ ادبی کوششوں پر محمول کر سکتا ہے۔ لیکن اس نفسیاتی حقیقت سے جو بے خبر ہیں وہ ان مثالوں کو ہندوؤں کے استہزاء کا آلہ بنا کر ان سے وہ انداز مخصوص کرتے ہیں جواب سے بیشتر "بوے کچوری می آید" سے تعبیر کیا جاتا تھا حالانکہ یہ انداز بعض بڑے بڑے مشاہیر کے یہاں ہے اور بہت کھلا ہوا ہے۔ چنانچہ چراغ سخن میں مرزا یاس "یگانہ" عظیم آبادی نے غالب کے متعلق بھی اس قسم کے بہت اعتراضات کئے ہیں۔

یاس صاحب نے غالب کے بخیئے اُدھیڑنے کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کا مضحکہ اُڑا کر بھی ثواب لوٹا ہے، فرماتے ہیں۔ "یہ معلوم ہوتا ہے لالہ بھیروں پرشاد کا شعر ہے۔ اس فقرے کے وہی معنی ہیں جو "بوے کچوری می آید" کے ہیں۔ مرزا یاس بوے کچوری کی طرف اشارہ کریں یا لالہ بھیروں پرشاد "بوے قورمہ می آید" کہیں۔ بات ایک ہی ہے۔ لیکن اس سے مرزا غالب کے مرتبہ پر اب کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ اگر غالب ہندو ہوتا تو کبھی کا فنا ہو چکا ہوتا، اور اگر کہیں اُس کا نام رہ جاتا تو صرف "لالہ شاہی" اشعار پیش کرنے کے لئے۔

اگر ہمارے "حق پرست" ان عذرات کو بیجا سمجھتے ہیں۔ تو مشاہیر سلف تو ایک طرف رہے۔ موجودہ زمانہ کے اُن ادبا و شعراء کے یہاں سے میں متعدد قسم کی لغزشوں کی بہت مثالیں پیش کر سکتا ہوں جو فارسی و عربی میں منتہی سمجھے جاتے ہیں، لیکن مجھے کسی کی دل آزاری منظور نہیں۔ درحقیقت غلطیاں بڑے بڑوں سے ہوتی آئی ہیں اور ہوتی رہینگی۔

آخر میں "حق پرست" صاحب سے ادب سے گذارش ہے کہ براہ کرم تھوڑی سی ابتدائی اُردو کی تاریخ اور کم سے کم اُن ہندو مشاہیر کی تصنیفات ضرور مطالعہ فرمالیں جن کے نام میں نے سطور بالا میں گنائے ہیں اور اگر میرے حقیر مشورے کو وہ شرف قبول بخشیں گے تو مجھے یقین ہے کہ میرے معروضات سے اتفاق رائے فرمائیں گے۔

چو بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست ٭ سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجاست

زمانہ

جلد ۷۲ — مارچ سنہ ۱۹۳۹ء — نمبر ۳

مرزا دبیر

(از حضرت وصل بلگرامی)

اُردو شاعری کی طرح اُردو مرثیہ گوئی کی بنیاد بھی دکن میں پڑی۔ سنہ ۱۰۲۲ھ ہجری سے اُس نے ترقی کے میدان میں قدم بڑھائے، اور سرزمینِ دکن نے اچھے اچھے مرثیہ گو پیدا کئے۔ سنہ ۱۱۴۱ھ ہجری میں خود وَلی نے واقعاتِ کربلا میں ایک مثنوی لکھی، اُس وقت تک مرثیے چَو مصرعے ہوا کرتے تھے۔ اُس زمانے میں میاں مسکین نے مرثیہ گوئی میں بہت نام پیدا کیا۔ میر و سَودا نے بھی طبع آزمائی کی، لیکن اُن کے مرثیے مقبولِ عام نہ ہوئے۔ بعض کا خیال ہے کہ سب سے پہلے سَودا نے مرثیے کو مسدس کی شکل میں پیش کیا۔ بعض لوگ احمد شاہ نامی ایک دوسرے شاعر کا نام لیتے ہیں لیکن محققین اِس نتیجے پہونچے ہیں کہ سب سے پہلے جس نے مسدس میں مرثیہ کہا وہ میاں سکندر سَودا کے ہمعصر تھے' انھوں نے اپنے وطن پنجاب سے آکر لکھنؤ کو اپنا مسکن بنایا تھا۔ اُن کا وہ مرثیہ جو سب سے پہلے مسدس میں سُنا گیا آج بھی زبان زدِ خلائق ہے۔ اس کا آغاز اس مصرعے سے ہوتا ہے ؏

ہے روایت شُترا سوار کسی کا تھا رسول

اور مَیں نے اپنی صِغر سنی میں کئی بار اپنے وطن بلگرام میں اس مرثیئے کو سُنا ہے۔

اِس دَور کے بعد میر انیس کے پردادا میر ضاحک نے مرثیہ گوئی کو نئے لباس میں پیش کیا' اُن کے بعد اُن کے صاحبزادے میر حسن نے بھی مرثیہ لکھا لیکن وہ کاغذ ہی پر آکر رہ گیا۔

اسی طرح مرثیہ گوئی تیزی کے ساتھ روز افزوں ترقی کرتی رہی، لیکن درحقیقت صحیح معنی میں جس نے اس کی ترقی کا بنیادی پتھر رکھا وہ میر مظفر حسین ضمیر کی باکمال ہستی تھی۔

میر ضمیر مرزا دبیر کے اُستاد، اقلیم مرثیہ گوئی کے بادشاہ سمجھے جاتے تھے ۱۲۴۹ھ ہجری کا زمانہ تھا کہ میر ضمیر نے فنِ مرثیہ گوئی میں چار چاند لگائے، ایک نئی روح پھونکی، اور ایک جدید شاہراہ نکالی جو انھیں کی ایجاد تھی، کیونکہ سب سے پہلے ضمیر ہی نے مسدس میں اپنا مرثیہ منبر پر بیٹھکر تحت لفظ پڑھا۔

اس رنگ، اس جوش اور اس مقبولیت سے متاثر ہوکر میر انیس کے والد میر خلیق نے بھی وہ وہ کمال دکھائے کہ اُن کی مرثیہ گوئی کا لوہا زمانے کو ماننا پڑا، انھیں کے برابر میاں دلگیر اور مرزا فصیح کے مراثی بھی شہرت پانے لگے۔

قدرت نے دبیر کو مرثیہ گوئی اور صرف مرثیہ گوئی کے لئے پیدا کیا تھا اُنھوں نے اپنی تمام عمر مداحیِ اہل بیت میں صرف کردی، اور دیگر اصنافِ سخن پر قادر ہونے اور اُس میں طبع آزمائی کرنے کے باوجود مرزا دبیر کوئی خاص درجہ حاصل نہ کرسکے۔ نہ معلوم کتنی غزلیں اُنھوں نے کہیں، کیسی کیسی سخت زمینوں کو پامال کیا، مگر آج اُن کی ایک غزل بھی مشکل سے کسی کے پاس مل سکے گی۔ دبیر کا رنگِ تغزّل اُن کے اس مطلع سے ظاہر ہے ؎

دفن کرنا مجھکو کوئے یار میں　　قبرِ بُلبُل کی بنے گلزار میں

ان کا نام سلامت علی اور تخلص دبیر تھا، اُن کے جدِ اعلیٰ ملا ہاشم شیرازی ملا اہلی کے حقیقی بھائی اور ایک زبردست ادیب و نثار تھے۔ مرزا صاحب کا خاندان شیراز میں ہمیشہ بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز رہا۔ جب زمانے نے ساتھ نہ دیا تو یہ خاندان شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں غالباً ۱۱۷۴ھ یا ۱۱۸۰ھ ہجری میں دہلی و اکبرآباد میں آکر آباد ہوا۔

مرزا صاحب کے نانا مرزا عنایت اللہ ناظم صوبۂ کشمیر اور ماموں مرزا شہامت علی خاں شاہزادگانِ دہلی کی تعلیم و تربیت کے لئے مقرر کئے گئے۔ اُن کے جدِ امجد مرزا محمد رفیع شہنشاہِ دہلی کے میر منشی ہوئے ان کے والد مرزا غلام حسین نے اپنی تمام عمر نہایت عزت و وقار اور صبر و شکر کے ساتھ دہلی سے آکر لکھنؤ میں بسر کی۔

مرزا دبیر کی شادی انشا کی حقیقی نواسی میر معصوم علی کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ مرزا دبیر دلّی محلہ بلّی ماراں متصل لال ڈگّی میں دوشنبہ کے دن ۱۱ جمادی الاول ۱۲۱۸ھ ہجری یعنی ۲۹ اگست ۱۸۰۳ء کو عالمِ وجود میں آئے، پانچ سات برس کی عمر کے بعد آپ کے والد آپ کو اپنے ہمراہ دہلی سے لکھنؤ لے آئے

گیارہ بارہ برس کے سن میں جب آپ فارسی و عربی میں کافی دستگاہ حاصل کر چکے تو ۱۲۲۳ھ ہجری میں آپ کے والد نے یہ دیکھکر کہ صاحبزادے کا فطری ذوق مداحیِ اہل بیت کی طرف مائل ہے میر ضمیر کے سپرد کر دیا میر ضمیر نے اِن کا تخلص دبیر رکھا، اور بڑی خوشی سے اپنے حلقۂ تلامذہ میں شامل کر لیا۔

مرزا دبیر کی پہلی تصنیف یہ رُباعی ہے جو سب سے پہلے آپ نے جناب ضمیر کو سنائی

کسی کا کندہ نگینے پہ نام ہوتا ہے　　کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرا ہے یہ دنیا کہ جس میں شام و سحر　　کسی کا کوچ، کسی کا مقام ہوتا ہے

رفتہ رفتہ مرزا صاحب کے کلام کا شہرہ عام ہونے لگا، اور بڑی بڑی مجلسوں سے یہ خراج تحسین لے کر اُٹھے۔ اِس مقبولیت نے اُن کے حاسد پیدا کر دیئے، جنھوں نے غیر تو غیر اُستاد و شاگرد میں کشیدگی پیدا کرادی، لیکن بہت جلد صفائی ہوگئی۔

جناب ضمیر نے ایک رُباعی میں جو ایک خاص مجلس میں اپنی آخری عمر میں پڑھی تھی دبیر کی شاگردی پر اظہارِ فخر کیا ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے:-

پہلے تو یہ شہرہ تھا ضمیر آیا ہے　　اب کہتے ہیں اُستادِ دبیر آیا ہے

مرزا صاحب نے سب سے پہلی مجلس شاہ غازی الدین حیدر کے عزاخانۂ خاص میں پڑھی۔ بادشاہ نے بڑے اشتیاق میں بُلایا تھا۔ یہ وہی اپنے سادہ لباس میں یعنی سر پر پیچ گوشیہ ٹوپی، وہی گھٹنوں سے نیچا ڈھیلا کُرتا، بڑے پائنچوں کا غرارے دار پاجامہ، پاؤں میں گھیتلا جوتہ پہنے فینس پر سوار ہوکر تشریف لے گئے۔ بادشاہ پہلے سے منتظر تھے۔ سلام ہوا اور مرثیہ سُنانے کے لئے اشارہ فرمایا گیا۔ مرزا صاحب نے مرثیہ سُنانے سے پہلے ایک تازہ بند جو راستے میں کہہ لیا تھا سُنایا ؎

واجب ہے حمد و شکر جناب اِلٰہ میں　　فضلِ خدا سے آیا ہوں کس بارگاہ میں
مجھ سا گدا اور انجمنِ بادشاہ میں　　چرچا یہ لوگ کرتے ہیں اس وقت راہ میں
ذرّے پہ چشمِ مہر ہے، مہرِ منیر کو
حضرت نے آج یاد کیا ہے دبیر کو

اُس کے بعد یہ مرثیہ سُنایا ع

داغِ غمِ حسین میں کیا آب و تاب ہے

جب یہ موقع آیا کہ جناب سکینہ یزید سے اُس کے لشکر والوں کے ظلم کی فریاد کر رہی ہیں اور اُن کے جور و ستم کی داد خواہ ہیں تو بادشاہ بیتاب ہو کر رونے لگے، وہ بند یہ ہے:-

جب روز کبریا کی عدالت کا آئے گا جبّار بادشاہوں کو پہلے بُلائے گا
انصاف و عدل اُن سے بہت پوچھا جائیگا تو آج داد دینے کی کل داد پائے گا
گُل کر دیا ہے دونوں جہاں کے چراغ کو
لوٹا ہے تیرے عہد میں زہرا کے باغ کو

ایک بار مرزا صاحب آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ کی مجلس خاص میں پڑھ رہے تھے کہ منبر پر جو شامیانہ سایہ کئے ہوئے تھا ہوا کے تیز جھونکوں سے ایک طرف ہٹ گیا۔ اور مرزا صاحب کے منہ پر دھوپ آگئی۔ بادشاہ نے چتر منگوایا اور جب تک مرثیہ ختم نہ ہوا خود چتر لگائے کھڑے رہے ۱۲۹۱ ہجری میں جب مرزا صاحب اپنی آنکھوں کے علاج کے سلسلے میں مٹیابرج کلکتہ میں بادشاہ کے مہمان ہوئے، بادشاہ نے ایک مرثیہ پڑھا تھا جس میں کئی بند مرزا صاحب کی تعریف میں تھے۔ ایک بند کی مشہور بیت یہ ہے۔ ؎

بچپن سے ان کے دامِ سخن میں اسیر ہوں میں کم سِنی سے عاشقِ نظمِ دبیر ہوں

مرزا دبیر کی شہرت کا آفتاب جب نصف النہار تک پہونچا تو قدرت نے اِن کا ایک حریف مقابل پیدا کر دیا، یہ میر انیس کی ذات ستودہ صفات تھی۔ یہاں تک کہ دونوں کے طرفداروں کے علٰحدہ علٰحدہ دو گروہ پیدا ہوگئے جس سے دونوں حضرات کو اپنے کمالات کے نمایاں کرنے کا بہترین موقع مل گیا۔ یہ زمانہ وہ زمانہ تھا جب ناسخ و آتش کی اُستادی کا سکّہ جما ہوا تھا۔ ایک دن کسی نے مجمع میں ناسخ کو مرزا صاحب کے ایک مرثیے کا ایک بند سُنایا جو سراپا میں تھا۔ ناسخ نے جوش مسرت میں فرمایا کہ ظہیر فارابی نے بھی پُتلی کو عیسٰی سے تشبیہ دی ہے مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا، مرزا کی تشبیہ کا جواب ہی نہیں پلک کے پنجے کو مریم لکھکر جس طرح اپنے دعوے کو ثابت کیا ہے یہ مرزا کا کمال ہے۔ وہ بند یہ ہے ؎

کیوں مدِّ نظر چشم کو گردش ہے ہر اک بار پہلو جو بدلتے ہیں مگر مردمِ بیمار
ابرو کے قرینے سے کھلا چشم کا اسرار ہیں نور کے گہوارے میں عیسیٰ خوش اطوار
یاں پنجۂ مریم کہوں پنجے کو پلک کے
گہوارے میں عیسیٰ کو سلاتی ہے تھپک کے

صاحب "جلوۂ خضر" کا بیان ہے کہ ۱۸۵۴ء میں جب میں مرزا غالب کا مہمان تھا، ایک دن اُن کی صحبت میں مرثیے کا ذکر آگیا۔ مرزا غالب نے فرمایا کہ میں نے بھی ایک مرثیہ شروع کیا تھا تین بند کے بعد جو دیکھا تو واسوخت ہو گیا، پھر یہ بند سُنا کر فرمایا کہ واقعی یہ حق مرزا دبیر کا ہے دوسرا اس راہ میں

قدم نہیں اُٹھا سکتا۔

مرزا صاحب کے پڑھنے کی بڑی بڑی معینہ مجلسیں تھیں، امرا و غربا کے علاوہ شہزادیاں تک مرثیہ کہکر مرزا صاحب کے پاس اصلاح کے لئے بھیجتی تھیں۔ مرزا صاحب کی ایک اصلاح بھی ملاحظہ ہو۔ بنیر شکوہ آبادی کی غزل کا مطلع ہے ؎

موئے خط عارضِ تاباں پہ ہیں آتے جاتے
حبشی ملکِ سلیماں ہیں دباتے جاتے

مرزا صاحب نے دوسرے مصرع کو یوں بنادیا ع

مورچے ملک سلیماں ہیں دباتے جاتے

مورچے کا لفظ سلیمان کی رعایت سے جو لطف دے رہا ہے ظاہر ہے۔

جب تک سلطنتِ اودھ قائم رہی مرزا صاحب لکھنؤ سے باہر نہیں گئے۔ ۱۸۵۷ء میں غدر کے ہنگاموں سے پریشان ہوکر اپنے ایک دوست سید سلامت علی کے پاس سیتاپور جاکر اس وقت تک مقیم رہے جب تک کہ یہ ہنگامہ فرو نہیں ہوا۔ اُسی زمانۂ قیام میں ایک بڑھیا فقیرنی نے مجلس کی مرزا صاحب اُس کے اصرار پر بڑی خوشی سے اُس کے یہاں تشریف لے گئے اور مرثیہ پڑھا۔

۱۸۵۸ء کے عشرۂ محرم میں نواب دولہا کے یہاں مجلس پڑھنے کانپور جانا ہوا، اُس کے بعد امام باندی بیگم رئیسۂ عظیم آباد نے بُلوایا اور اپنی قدردانی و عقیدت کا ثبوت دیا جس کا اثر یہ ہوا کہ مرزا صاحب نے عظیم آباد کے سوا پھر کسی دوسری جگہ کا رخ نہیں کیا۔ مرزا صاحب کے پڑھنے کی آخری مجلس وہ مجلس تھی جب آپ نے ۲۵۔ ذی قعدہ ۱۲۹۱ہجری کو یہ مرثیہ پڑھا ہے ع

انجیلِ مسیح لبِ شبیر ہیں عباس

آخر یہ فضل و کمال کا آفتاب ۷۲ برس کی عمر میں چہارشنبہ کے دن ۳۰۔ محرم ۱۲۹۲ہجری کی شب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔ عیسوی حساب سے ۹۔ مارچ ۱۸۷۵ء تاریخ وفات ہے۔ آپ کی لاش آپ کے مسکونہ مکان میں سپرد خاک کی گئی۔ اب وہ محلہ نخاس جدید کے نام سے مشہور ہے اور جس گلی میں مرزا دبیر کا مکان تھا اب وہ گلی کوچۂ دبیر کہلاتی ہے۔

مرثیہ گوئی کے ساتھ ساتھ کیا باعتبار زبان اور کیا باعتبار نُدرتِ مضامین وجدتِ تخئیل و تشبیہ و استعارات اُردو ادب اور اُردو شاعری دونوں ہمیشہ مرزا صاحب کے زیر بار احسان رہیں گے۔

مرزا صاحب نے مشکل پسند طبیعت پائی تھی، یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام کا بہت حصہ دقیق صنائع بدائع اور مختلف باریک نکات میں جذب ہوگیا ہے۔ فارسی قصیدہ اور تاریخیں بھی اِس کی شاہد ہیں۔

کئی مرثیئے متعدد رباعیاں اور ایک رباعی صنعتِ غیر منقوطہ میں موجود ہیں، اور یہیں تک نہیں ایک رباعی صنعتِ منقوطہ میں بھی کہہ ڈالی۔ ملاحظہ ہو :-

جب بنت بن قیس نے زینت بخشی — زینب نے تشفی تب، یہ شفقت بخشی
تیغیں جز تن، جبیں شق، جی بے چین — جنت بخشی، نبی نے جنت بخشی

ایک غیر منقوطہ رباعی بھی سُن لیجیے ؎

گر مہرِ امام دوسرا حاصل ہو — گو درد ہو لا دوا، دوا حاصل ہو
اُس دم ہو مدد گار اگر احمد کا لال — واللہ کہ دُر مدعا حاصل ہو

غیر منقوط سلام کا مطلع یوں فرماتے ہیں ؎

مسطور اگر کلام ہو سرورِ امام کا — مصرع ہمارا سرو ہو دارالسلام کا

مرزا صاحب کی وہ مجلس اہلِ لکھنؤ کبھی نہیں بھول سکتے جب مرزا صاحب نے یہ اعلان کیا تھا کہ اس مجلس میں پُورا مرثیہ صنعتِ غیر منقوطہ میں پڑھا جائیگا۔ اس مجلس میں جناب ضمیر اور خواجہ آتش بھی شریک تھے۔ جب مرزا صاحب پُورا مرثیہ اسی صنعت میں پڑھ چکے تو خواجہ صاحب نے مرزا صاحب کو مخاطب بنا کے فرمایا کہ یہ صنعت اس بے تکلفی کے ساتھ نظم کرنا آپ ہی کا حصہ ہے۔ فیضی کی تفسیر سُنی تھی یا آج یہ مرثیہ سُنا۔ اُس مرثیے کا آغاز اِس مصرع سے ہوتا ہے ع

مہرِ علَم سرورِ اکرم ہوا طالع

ایک اور مجلس میں جب مرزا صاحب نے جناب علی اکبر کے گھوڑے کی تعریف میں جو حضرت سرورِ کائنات کی سواری کا گھوڑا تھا یہ بند پڑھا ؎

وہ رخش تھا یا ابلقِ ایام کا اقبال — نکھ سکھ سے درست اور جواں بخت و جواں سال
جادو کی نری آنکھ، فقط معجزے کی چال — خورشید کا سُم برق کی دُم، سنبلہ کی یال
قوت کی طبیعت تھی، دلیری کا جگر تھا
سرعت کا بدن، فہم کا دل عقل کا سر تھا

خواجہ آتش بے ساختہ بول اُٹھے "بھئی سلامت علی خدا تم کو سلامت رکھے، کون کہہ سکتا ہے کہ تم فقط مضامین اچھے کہتے ہو، تم سے بہتر کوئی دوسرا شاعر زبان بھی نہیں کہہ سکتا۔

گھوڑے کا ذکر آ گیا، مرزا صاحب کی زبان سے دو شعر اور سُن لیجئے ؎

خوش خو و خوش خرام و خوش اندام و خوش لگام — خوش رو و خوش جمال و ادا فہم و تیز گام

جاندار و شوخ چشم و سعید و خجستہ کام	گل پوش و تیز ہوش و سمن گوش و سرخ فام

۱۲۵۹ہجری میں جب امجد علی شاہ کا عہد سلطنت تھا خواجہ آتش یہ مرثیہ سنکر ع

"کوہ رقیم پر جو علی کا گزر ہوا"

مرزا صاحب سے فرمانے لگے "ارے میاں اگر ایسے مضامین کہوگے تو تم مرجاؤگے یا خون تھوکوگے"۔

آخر میں مرزا صاحب کے چند شعر اور سن لیجئے اور لطف اٹھائیے۔ ایک بند صبح کی تعریف میں ملاحظہ ہو:

ذروں میں نور مہر در آیا قمر قمر	لوٹا سحر نے معدن شبنم گہر گہر
بڑھ کر نقیب نور پکارا سحر سحر	فرماں نجوم و بدر کو پہونچا بدر بدر
برقع جو اٹھ گیا تھا رخ آفتاب کا
پردہ تھا فاش، صبح ملمع نقاب کا

تلوار کی صفت کس خوبی سے بیان کی ہے ؎

چھلبل تھی، چھلاوہ تھی، طلسمات تھی اسرار	چالاک، سبک سار، طرحدار، نمودار
نیزہ کہیں، خنجر کہیں، اور کہیں تلوار	بجلی تھی کسی جا، تو کہیں نور کہیں نار
سیماب تھی، سیلاب تھی، طوفاں تھی، ہوا تھی
شعلہ تھی، شرارہ تھی، قیامت تھی، بلا تھی

فوارے کی تعریف سننے کے قابل ہے:۔

فوارہ بلندی کی طرف چھوڑ دیا تھا	پانی بھی گلستاں کے تماشے کو اٹھا تھا

دوسری جگہ فوارے کی گرمی ملاحظہ کرلیجئے ؎

فوارے کو نہ حوض میں گرمی سے کل پڑی	پانی کی بھی زبان دہن سے نکل پڑی

ایک شعر میں گرمی اور دھوپ کی شدت کو کس طرح بیان کیا ہے ؎

چھالا تھے آفتاب کا گردوں کے پاؤں میں	خود چھپی ہی ہے دھوپ درختوں کی چھاؤں میں

جناب امام حسین کے آخیر وقت کی جگر خراش تصویر کس طرح کھینچی ہے ؎

منھ لال، جبیں لال، بدن لال، زباں لال	لہراتے تھے بل کھائے ہوئے گیسوؤں کے بال
آلودہ بہ خوں ریش امام دوسرا تھی
اس شان سے تیاری دیدار خدا تھی

بسنت

(از پرنسپل رام پرشاد کھوسلا ناشاد ایم۔ اے)

ہر شجر صحنِ چمن کا مست نوشا نوش ہے ساغرِ شبنم کو پی کر ہر کلی مدہوش ہے
وجد میں آ آ کے ہر غنچہ لبِ خاموش ہے عندلیبِ گلستاں پھولوں سے ہم آغوش ہے
بیخودی کے راگ مرغانِ چمن گاتے ہیں آج
میٹھے نغموں سے عروسِ گل کو بہلاتے ہیں آج

آسماں پر رنگِ ابرِ رحمت باری کو دیکھ صحنِ گلشن میں عروسِ گل کی بیداری کو دیکھ
سبز مخمل پر یدِ قدرت کی گلکاری کو دیکھ نازِ گل کو بلبلوں کی نازبرداری کو دیکھ
دیکھ لے تو اے بشر آ کر تماشائے بہار
ہے بسنت آتے ہی کیا کیا حُسنِ قدرت پر نکھار

جھلملاتا بیخودی کا رنگ جامِ مُل میں ہے بیہُشی کی تان مُضمر خندۂ قلقل میں ہے
اک نیا اندازِ مستی نغمۂ بلبل میں ہے اک نیا طرزِ جنوں ہر شاخ و برگ و گل میں ہے
گلستاں میں ہر شجر ہے مائلِ رقص و سرود
سازِ موسیقی بنا ہے پتے پتے کا وجود

بادۂ عشرت سے پھر لبریز پیمانے ہوئے مے پرستوں سے پھر آباد آج میخانے ہوئے
نوجوانانِ چمن پھر پی کے مستانے ہوئے منتشر پھر زہد کی تسبیح کے دانے ہوئے
جس جگہ دیکھو وہیں ہے محفلِ عیش و نشاط
جا بجا پیشِ نظر ہے رنگِ بزمِ انبساط

ہر رگِ قدرت میں جوشِ رنگ و بو پیدا ہوا گوشۂ دل میں بھی شورِ آرزو پیدا ہوا
سوکھے تنکوں میں تر و تازہ لہو پیدا ہوا شورِ مرغانِ گلستاں چار سو پیدا ہوا
دور دور آغوشِ غفلت سے عروسِ گل ہے آج
نونہالانِ چمن پر نغمہ زن بلبل ہے آج

سنسکرت ناٹک میں بھاؤ اور رس

از پروفیسر رگھو پتی سہائے فراق ایم۔اے (گورکھپوری)

دُنیا میں جو کچھ ہے اُس میں اور باتوں کے ساتھ ساتھ بھاؤ اور رس بھی ہے۔ آسمان زمین، سورج، چاند، تارے، مٹی اور پانی آگ اور ہوا۔ گرمی۔ سردی۔ برسات۔ بہار اور پت جھڑ، جاندار چیز یا بے جان چیز، بستی یا اُجاڑ، کوئی کام، کوئی خیال، کوئی حالت، جانی ہوئی چیز یا بے جانی ہوئی چیز یہ سب اچھے ہوں یا بُرے ہوں۔ دُکھ دیں یا سُکھ دیں۔ ہنسائیں یا رُلائیں، کام کی ہوں یا بے کام کی ہوں۔ نیک نام ہوں یا بدنام ہوں۔ لیکن ان سب میں بھاؤ اور رس ہوتا ہے۔ یہ بھاؤ اور رس ہر چیز اور ہر حالت میں اسی طرح بسا ہوا ہے۔ جیسے باجا میں راگ اور پھول میں خوشبو اور راگ اور خوشبو دونوں میں اثر، آپ چوبیس گھنٹے کے دن کا کوئی وقت لے لیجئے۔ بھور کا وقت، دن چڑھے کا وقت، دوپہر دن ڈھلے، سہ پہر، شام، رات آدھی رات، پچھلا پہر، دن اور رات کے ایک ایک پل کو دھیان میں لائیے۔ نہ تو یہ وقت اور یہ پل ایسی چیز ہے کہ اس کا بھید بھرم اور رس کا پورا اثر گھڑی کی سوئی بتا سکتی ہے۔ نہ کلنڈر کی تاریخ بتا سکتی ہے۔ نہ اندھیرا اُجالا اور گرمی، سردی یا ٹمپریچر اس کا پورا اثر بتا سکتے ہیں۔ ہمارے دل پر اثر ڈالنے والے اسی بھید بھرم کو جو ہر چیز میں چھپا ہوا ہے۔ اور ہر چیز سے جھلک رہا ہے۔ بھاؤ اور رس کہتے ہیں۔

یہ بھید بھرم اور یہ اثر دنیا کے دُکھ سُکھ غم اور خوشی نقصان اور فائدے سے الگ ہے۔ اور ان سب میں بسا ہوا اور رما ہوا بھی ہے۔ اس بھاؤ اور رس میں بڑی تہیں اور بڑی گہرائیاں بڑی سختی اور بڑی نرمی، بڑی سادگی اور بڑی رنگینی، بڑا بھولا پن اور بڑی چترائی، بڑی تنگی اور بڑا پھیلاؤ، سب میں ملا رہنا اور سب سے الگ رہنا، دوری اور نزدیکی جانکاری اور انجان پن، پاکیزگی اور گناہ سبھی کچھ ہوتا ہے۔ یہ بھاؤ اور رس ہر چیز کا ست اور جوہر ہے، ہر چیز کی جان ہے نہ اس کی جوکھ ممکن ہے، نہ اس کا مول لگایا جا سکتا ہے۔ وہ زندگی اور موت کی طرح ہر جگہ موجود ہے، جیسے سب جانتے ہیں اور کوئی بھی نہیں جانتا، ہمارے دیس کے ایک کوی نے کیا بات

کہی ہے "گونگے کا سپنا بھو سمجھ سمجھ پچھتائے"۔ ناٹک میں سین یا جگہ ہوتی ہے وقت اور زمانہ ہوتا ہے، وہ لوگ ہوتے ہیں جو کچھ کرتے ہیں، یا جن پر کچھ گذرتی ہے۔ ان لوگوں کی بات چیت بھی ہوتی ہے جسے مکالمہ (Dialogue) یا سمواد کہتے ہیں۔ ان سب سے ملکر پلاٹ یا کہانی بنتی ہے۔

اب آپ بتائیں کہ اِن سب باتوں کے سوا ناٹک میں کچھ اور بھی ہوتا ہے، وہ کیا؟ کُل چیزوں سے ملکر اور ہر چیز میں لبی ہوئی ایک تاثیر ہوتی ہے، ایک مہک ہوتی ہے ایک رنگ ہوتا ہے سنسار اور زندگی کا ایک بھید بھرم ہوتا ہے، پُورے ناٹک کا ایک مزاج ہوتا ہے، ایک دل ہوتا ہے، اس کے قہقہوں اور آنسوؤں میں ایک خاص تال اور سم ہوتا ہے۔ ٹھنڈک اور گرمی زندگی اور موت کی ایک خاص تصویر اور ایک خاص مطلب ہوتا ہے۔ اس کے اچنبھا اور جانکاری، چپ اور بولی کا ایک خاص انداز لب و لہجہ ہوتا ہے، اور یہ ہے ناٹک کا بھاؤ اور رس۔

اگر سنسکرت ناٹک کو صرف پلاٹ اور سین اور کہانی کے لحاظ سے یونانی ناٹک (Greek Drama) یا شیکسپیئر کے ڈراما یا دنیا کے اور ملکوں کے ناٹکوں سے ملائیں اور دونوں کے فرق کو دیکھیں تو یہ فرق صرف باہری اُور دکھاوٹی ہوگا، یوں تو ہوگا بہت دلچسپ لیکن دلیس، بھیس اور بھاشا کے نرالے پن سے آگے بڑھکر اور ذرا ڈوب کر سنسکرت کے ناٹکوں کے دل کی دھڑکنوں کا اگر دوسرے ناٹکوں کے دل کی دھڑکنوں سے مقابلہ کریں تو اصلی بھید کھُلے گا، اور دونوں کے بھاؤ اور رس کا پتہ چلے گا۔

سنسکرت ناٹک کس زمین پر، کس آسمان کے نیچے، سورج، چاند اور ستاروں کی کن کرنوں کی گرمی اور ٹھنڈک۔ تازگی اور رنگینی زندگی اور موت کے کس بھیس کس بھید اور بھرم کس چڑھاؤ اور اُتار کس درد اور کس خوشی کی جگمگاہٹوں اور تھرتھراہٹوں کو لیکر پیدا ہوا؟

اس دیس کی پُرانی کہانی ہے کہ دیوتا اور آسُر یعنی شیطان کا دَل یا گروہ جب سنسار کے سمندر کو متھ رہے تھے تو اور قیمتی چیزوں کے ساتھ سمندر سے زہر ہلاہل بھی نکلا جس کی لہریں نیلے یا آسمانی شعلوں کی طرح تھیں، اور جس کے اثر سے برہمانڈ یعنی تمام عالم بھسم ہو جاتا۔ دیوتا اور آسُر دونوں کانپ اُٹھے اور سنسار کو پالنے والے اور بچانے والے خدا وشنو سے استوتی کی یعنی دعا مانگی کہ بھگوان آپ اس زہر ہلاہل کے شعلوں سے دنیا کو بچائیں۔ وشنو نے جواب دیا یہ کام میرے بس کا نہیں۔ تم لوگ دنیا کو مٹانے والے دنیا کی بربادی اور موت پر قہقہہ مار کر ہنسنے والے خدا شیو یا

مہادیو کے پاس جاؤ۔ جب دیوتاؤں اور شیطانوں نے شیو کے سامنے ہلاہل کا پیالہ پیش کیا اور کہا کہ اے سنسار کے مٹانے والے بھگوان سنسار کو زہر ہلاہل سے بچاؤ، اس وقت شیو نے تھرتھراتے ہاتھوں سے وِش (ہلاہل) کا پیالہ اُٹھایا، شیو کی آنکھوں میں موت کے درد اور زندگی کی محبت کے آنسو تھے، اور ہونٹوں میں سیاہ لکیریں کانپ رہی تھیں۔ شیو نے پیالہ پی لیا، اور اس کے درد اور جلن سے حلق میں نیلا داغ پڑ گیا۔

اِس کہانی میں شیو کے قہقہوں اور شیو کے آنسوؤں میں شیو کی بیدردی اور شیو کے درد بھرے دل میں سنسکرت ناٹک، سنسکرت ٹریجڈی اور سنسکرت کومیڈی کے بھاؤ اور رس کا کچھ پتہ چلے گا۔ وہ بھاؤ اور رس جو امرت بھی ہے اور وِش (ہلاہل) بھی ہے۔ سنسکرت ناٹک کا بھاؤ اور رس وہ بھید سے بھری ہوئی چیز ہے جس میں مسکراہٹ اور آنسو خوشی اور غم دونوں کی جھلک ملکر ایک ہو گئی ہے، دوپہر کا اُجالا اور آدھی رات کا اندھیرا، کالی گھٹائیں اور بجلیاں اور رنگین دھنک سب اسی بھاؤ اور رس کی جھلکیاں ہیں۔ نرک اور سُرگ دونوں کی سیر ایک ہی جگہ ہو جاتی ہے۔ آئیے اب سنسکرت کے کچھ ناٹکوں پر نظر ڈالیں۔

سنسکرت ناٹک لکھنے والوں میں سب سے مشہور نام کالیداس کا ہے، شکنتلا۔ وکرم اُروسی اور مالوی کا گنمتر، تین ناٹک زمانے کے ہاتھوں بچ گئے ہیں۔ ان میں کالیداس نے اپنے دل و دماغ اور طبیعت کی اس بھرپور رنگینی اور اس رچی رچائی اونچ کا ثبوت دیا ہے۔ نازک اور نرم بھاؤ یعنی جذبات کے اظہار اور بیان میں وہ کمال دکھایا ہے کہ دنیا بھر کے پڑھے لکھے لوگوں نے تمام ملکوں اور زمانوں کے چوٹی کے ناٹک لکھنے والوں میں کالیداس کو مانا ہے۔ شاعرانہ بھاؤ بیحد جاندار ہوتے ہوئے بھی نرم اور نازک ہیں، گہرے اور سچے ہیں، شانتی اور ٹھہراؤ سے بھری ہوئی اس جیتی جاگتی ہوئی دنیا کو کسی طرح کی زیادتی اور سختی کسی طرح کے طوفان اور آندھی کے جھونکے اور جھٹکے چھو تک نہیں سکے ہیں۔ دُکھ اور غم دل کا خون کرتے ہوئے بھی اتنے نرم بنا دیئے گئے ہیں کہ نشتر امرت کی دھار بن گیا ہے۔

اُنیسویں صدی کے غالبًا سب سے زبردست دماغ یعنی مشہور جرمن فلاسفر اور گوئٹے جس کے دماغ میں آئینہ کی صفائی اور آئینہ کا ٹھہراؤ تھا۔ اس پر شکنتلا کا بہت گہرا اور زبردست اثر پڑا تھا، اور عمر بھر یہ اثر قائم رہا۔ آج اتنا وقت کہاں کہ اس ناٹک کے ایک ایک سین اور ایک ایک ایکٹ ایک ایک جھلک پر ہم نظر ڈالیں۔ صرف اس سین کو لے لیجئے جس میں شکنتلا اپنے

رشی کے آشرم سے رخصت ہو رہی ہے۔

جن پھولوں اور پودوں کو اُس نے اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا اور سینچا تھا، جنگل کے جن ہرنے اور ہرنیوں اور دوسرے جانوروں سے جو اس سے ہل مل گئے تھے، جنگل کی زمین اور آسمان سے، وہاں کی صبح شام سے رخصت ہوتے وقت اس کی نگاہیں اس کے دل کی حالت اُس کی بولی اور اُس کی خاموشی، رشی کا آشیرباد اور اُس کی سکھیوں کا اُداسی کو دباکر اور چھپا کر اُس سے چھیڑ چھاڑ کرنا۔ اس سین میں وہ نرمی اور کسک ہے، وہ ٹھہراؤ اور وہ بہاؤ ہے، وہ سجاوٹ اور وہ سادگی ہے، وہ بھاؤ اور وہ رس ہے جس کی مثال دنیا بھر کی شاعری ناولوں اور ناٹکوں میں کہاں ہے؟

وکرم اُروسی بھی کالیداس کا زبردست ناٹک ہے، اس کا پلاٹ اور اس کی ہر بات، اس کا بھاؤ اور رس بھی شکنتلا سے بالکل الگ ہے۔ اس ناٹک میں ہیرو اور ہیروئن یعنی پورورَو اور اُروسی اپنے اندر آدمیوں اور دیوتاؤں کے اِن زبردست اور چمکتے ہوئے گنوں اور خوبیوں کا ثبوت دیتے ہیں، دیولوک اور منشیہ لوک یعنی جنت اور دنیا کے چڑھاؤ اور اُتار ان کا ملن اور ان کا ٹکرانا، ان زمیوں اور اُن طاقتوں، ان آندھیوں اور ان چٹانوں، اس تڑپ اور گرج اس بہادری اس جیت اور اس جیت سے زیادہ شاندار اور چمکتی ہوئی اُس ہار کی ایسی زندہ تصویریں ہیں جن کو دیکھکر دنیا کی زبردست رزمیہ اور بزمیہ شاعری کو ہم کچھ دیر کے لئے بھول جاتے ہیں۔ یوں تو اس ناٹک کو ہم ویر بھاؤ اور ویر رس کی چمکتی ہوئی مثال کہہ سکتے ہیں۔ ویرتا یعنی بہادری زوردار ہوتے ہوئے بھی اِن گہرائیوں اور زندگی کے ان گہرے بھیدوں کا پتہ دیتے ہیں، اس بھرپور کساؤ اور اُبھار کا پتہ دیتے ہیں، حسن عشق زندگی اور دنیا کو اتنی اُونچی اور گہری چیز بنا دیتے ہیں جو صرف اس حالت میں ممکن ہے، جب ہمارے ہندوستان کا ایک زمانہ اپنی پوری جوانی پر تھا، جب ہندوستان کے بیتے ہوئے دنوں کی گھڑی دوپہر تھی۔

آئیے اب سنسکرت ناٹک کے دوسرے مشہور کوی بھوبھوتی کا کمال دیکھیں، اس کا زبردست ناٹک اُتر چرت کچھ لوگوں کی رائے میں شکنتلا سے کم نہیں۔ راون کو جیتنے کے بعد رام نے سیتا کو راج محل سے نکال دیا، کیا رام کو ایسا کرنا چاہیئے تھا؟ اس نازک اور پیچیدہ سوال پر اس ناٹک میں روشنی ڈالی گئی ہے یاد رہے کہ بھوبھوتی نے جس رام کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے، وہ تلسی داس کی رامائن کا رام نہیں ہے، بلکہ اِس رام اور اُس رام میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ یہ ناٹک رام کی زندگی کا ناٹک ہے سیتا کی زندگی کا ناٹک نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس ناٹک میں سیتا کی تصویر اتنی ہی جاندار اور چمکتی ہوئی ہے جیسے بجلی، اور یہ تصویر جادو بھرے

لفظوں میں کھینچی گئی ہے۔

آپ اس ناٹک میں رام کی مصیبتوں کو دیکھیئے، سیتا کی مصیبتیں کم نہیں لیکن نظر رام کی مصیبتوں پر رکھیئے ورنہ اس ناٹک کا مطلب سمجھ میں نہ آئیگا۔ ہم آنے والی طوفان کی دھمک دور سے اِن باتوں میں سُنتے ہیں جو اچانک رام کے منہ سے نکل جاتی ہیں، رام کے ان ارادوں میں جن میں وہ پرجا کے لئے سب کچھ قربان کردینے کے لئے تیار ہیں۔ پھر رام کو ہم قسمت کے شکنجوں میں جکڑا ہوا دیکھتے ہیں، جب رام راون کو مار چکے اور سیتا اور راج سب کچھ پا چکے، جب خوشی کے دن شروع ہوئے، اُس وقت اچانک غم اور مصیبت کا وہ تیر چلا جس کا جواب صرف تیر کھا لینا ہے۔ اس امتحان میں رام ایسے سورما کا دل کانپ اُٹھتا ہے جس پیاری سیتا کے لئے چودہ برس بن باس جھیلا اور جس کی جُدائی میں پاگل ہوگئے تھے۔ اسی سیتا کو پرجا کی ضد پوری کرنے کے لئے پھر ہاتھ سے کھو دینا ہے۔ رام کا کلیجہ پھٹ جاتا ہے، اور وہ بے اختیار کہہ اُٹھتے ہیں، ہمیں صرف دُکھ بھوگنے کے لئے زندگی ملی تھی۔ اس ایک بے اختیار پکار کے بعد سناٹا چھا جاتا ہے۔ ناٹک کے اس سین پر پردہ پڑ جاتا ہے لیکن پردے اور خاموشی کے پیچھے دُکھ کے نشتر ایسی بیدردی سے رام کے دل اور کلیجے کا خون کر رہے ہیں۔ حالانکہ رام کے چہرے پر وہ شانتی آچکی ہے جس کے سامنے مرتے وقت رگوں کا کھنچنا اور سانس کا رُکنا رونا اور سینہ کوبی غم کو منہ چڑھانا اور غم کی بے غرَضی معلوم ہوتی ہے۔ غم کی اس تصویر کے سامنے آواز بند ہوجاتی ہے، سانس رُک جاتی ہے۔ سیتا کی سہیلیوں کے ہونٹوں تک غصہ سے بھرے ہوئے لفظ آجاتے ہیں۔ سیتا کے پتا راجہ جنک کے ہونٹ غصہ سے تھرتھرا جاتے ہیں۔ سیتا کی آنکھوں میں اُلاہنے یعنی الزام کی ایک جھلک نظر آتی ہے، نظر آتی ہے اور پھر غائب ہوجاتی ہے۔ کیونکہ سیتا کی آنکھیں رام کو اس طرح دیکھتی ہیں جیسے رام سچ مچ ہیں۔ ان نگاہوں سے نہیں جنھیں اس اچانک مصیبت میں بے انصافی نظر آرہی ہے

پھر ہم دوسروں کی زبانی رام کے اس گھائل دل کی جھلک دیکھتے ہیں جس کا پتہ عام طور پر رام کو دیکھکر چلانا مشکل ہے۔ وہ زندگی جو سیتا کے ساتھ گذرے، وہ زندگی جو ایسے راج سنگھاسن یعنی تخت پر گذرے جس کی چوڑی اور گہری بنیادیں رعایا کی مرضی پر ہوں، ہاں وہ زندگی بھی جو سیتا کے ساتھ بن باس میں گذرے۔ کیا ایسی زندگی میں کوئی ٹریجڈی نظر آتی ہے؟ نہیں جیسا سنسکرت شاعری کے آدم والمیکی نے بھی تاڑ لیا تھا، وہ زندگی جو سیتا سے دُور کٹے رام کی ٹریجڈی اسی میں تھی وہ زندگی جو رام سے دُور کٹے سیتا کی ٹریجڈی اسی میں تھی۔ اس دکھ اُس ٹریجڈی کا سب سے بھیانک روپ

اِسی دھیرج اس ٹھہراؤ میں نظر آتا ہے۔ اس بے بسی میں نظر آتا ہے، اس صورت حال میں نظر آتا ہے، جہاں دیکھنے میں تو رام کو سب کچھ اختیار ہو لیکن اصل میں کوئی اختیار نہ ہو۔ بے قصوری اور معصومی کے اس اٹل وشواش میں دکھائی دیتا ہے۔ جب وہ وشواش ایک ہی وقت میں دل کو ڈھارس بھی دے، اور دل کا خون بھی کرتا جائے لیکن آسمانوں کی چکیاں انسان کی طاقتوں کو پیسکر بھی پیس نہیں سکتیں۔

سیتا نے اپنی خاموش قربانی سے، اپنی بے قصوری سے تقدیر پر وہ فتح حاصل کی جس کی کوئی اُمید رام نہیں کر سکتے، وہ فتح جو صرف سیتا کی فتح نہیں ہے بلکہ سچائی اور انصاف کی فتح ہے، وہ جیت جس پر سیتا ہی کا حق نہیں ہے۔ بلکہ جو رام کی بھی جیت ہے، جو دنیا کے تمام مردوں اور عورتوں کی جیت ہے۔ میرے اور تیرے میں کیا رکھا ہے؟ لیکن اس ناٹک کی ٹریجڈی اس ذرا سی بات میں ہے کہ یہ جیت رام کے لئے رام کے ہاتھوں سے ہونا ناممکن ہے۔ رام کو خاموش اور دکھائی نہ دینے والے آنسوؤں کے ساتھ زندگی کاٹنا ہے اُس دن تک جب تقدیر کا پہیہ اپنا پُورا چکر لگالے، اور بھوبھوتی کی ٹریجڈی اس بھیانک نرمی اور محبت کی چمکتی ہوئی مثال ہے، جو اس دنیا میں ہمیں مٹا کر رہتی ہے۔ اور جس کے دھیان سے بھی دل کانپ جاتا ہے۔

یہ ہے بھوبھوتی کا ناٹک، اور یہ ہے سنسکرت ٹریجڈی، لیکن سنسکرت ٹریجڈی میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اس حالت کو کبھی نہیں پہونچ سکتا جہاں رحمت کے پھُول برس نہ سکیں، اور ناٹک کا خاتمہ اس خوشی پر نہ ہو جو غم کے سمندر میں کنول کے پھُول کی طرح نہ کھِلے، بیدرد تقدیر کے مذاق سے بھی ایک گہرا مذاق ہے، ایک گہری ہستی ہے، جس کے پھُول زندگی کے خون سے کھلتے ہیں۔ سنسکرت ناٹک زندگی اور دنیا سے صلح کا پیام ہے۔ وہ پریم اور آشا کا سندیس ہے۔ بھوبھوتی کے برکت اور آشیرباد کے چھندوں میں سنسکرت ٹریجڈی وہاں پہونچ گئی ہے، جہاں وہ زندگی سے گناہ کے داغ دھوتی ہے، جہاں زہر کے ہر قطرے کی تہہ میں امرت ہوتا ہے۔ جو دل کا خون کر کے دل کو طاقت اور خوشی دیتی ہے جہاں پھول اور کانٹے اپنا بھیس بدل کر رنگ و بو کے بھاؤ اور رس کی وہ نئی دنیا بناتے ہیں جو اس پرانی دنیا کا اصلی روپ ہے۔ دنیا کے دُکھ اور سُکھ کی اصلی شکل کو جنت کہتے ہیں۔

یہ مختصر بیان ہے سنسکرت ناٹک کے اس بھاؤ اور رس کا جس کے لئے زندگی ترستی ہے۔ اس بھاؤ اور رس کو پانا امرت کو پانا ہے، جنت کو پانا ہے، زندگی کو پانا ہے۔

(نوٹ) اس مضمون کی اشاعت کیلئے صاحبِ مضمون کے علاوہ ہم ڈائرکٹر صاحب آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ کے مرہون منت ہیں۔ (ا۔ ز۔)

بسنت

از حضرت جگر بریلوی

آگیا پھر موسموں کا تاجدار
دیدنی ہے کوہ و صحرا کی بہار

پھٹ پڑا ہے حسن باغ و راغ میں
کچھ نہیں ہے فرق بن اور باغ میں

صاف ستھری جانِ نظارہ فضا
آسمانِ نیلگوں نکھرا ہوا

ہر شجر پہنے ہے پیراہن نیا
سبز اور شاداب جنگل ہو گیا

فیضِ شبنم سے نکھر آئی ہے گھاس
دُھل گیا ہے بوٹے بوٹے کا لباس

سبزہ و گل سے ٹپکتی ہے شراب
ہے نمو کا جوش یا جوشِ شباب

ہر کلی پیالی ہے، گل پیمانہ ہے
گلستاں ہے یا کوئی میخانہ ہے

جوش پر نشو و نمائے رنگ ہے
عرصۂ ارض و سما بھی تنگ ہے

آتشِ گل سے چمن دہکا ہوا
بُو سے پھولوں کی ہے بن مہکا ہوا

ہر طرف ہے غنچہ و گل کا ہجوم
مچ رہی ہے طائروں کے غل سے دھوم

پھرتے ہیں ہر سمت اتراتے ہوئے
ڈالی ڈالی کی ہوا کھاتے ہوئے

اپنے دامن میں لیئے موجِ شمیم
پھرتی ہے اٹھکھیلیاں کرتی نسیم

آتی ہے سبزہ کو لہکاتی ہوئی
جاتی ہے کلیوں کو چٹکاتی ہوئی

ہے ہوا میں کیف صہبائے کہن
پھر رہے ہیں مست طاؤس اور ہرن

کوک وہ کوئل کی، موروں کی جھنگار
جان لیوا وہ پپیہے کی پکار

آم کے اشجار میں بور آگیا
آم کی یاد آئی جی للچا گیا

کھل گئے شفاف جھیلوں میں کنول
بھونرے بو پاتے ہی آئے ہیں نکل

پھرتے ہیں خوش مے پرستوں کی طرح
گرتے ہیں پھولوں پہ مستوں کی طرح

بن میں یہ ہر سمت ٹیسو کھل گیا
یا بھڑک اٹھا ہے شعلہ حسن کا

ڈھاک میں اتنا نمو کا جوش ہے
سر سے پا تک سرخ ہے گلپوش ہے

سرسوں پھولی ہے بسنتی ہے زمیں
منظرِ رنگیں ہے کتنا دل نشیں

سادگی بھی اس میں ہے خوبی بھی ہے
حسنِ تمکیں شانِ محبوبی بھی ہے

سبزہ و گل میں ہے جس سے جوشِ رنگ
ہے وہی انسان کے دل میں اُمنگ

ہے عجب یہ موسمِ حسن آفریں
خار بھی ہوتے ہیں اس رُت میں حسیں

حسن کی بجلی کو چمکاتا ہے یہ
عشق کے شعلوں کو بھڑکاتا ہے یہ

بادِ صحرا میں ہے تاثیرِ شراب
بڑھ رہا ہے دل میں شوق و اضطراب

ولولوں میں جوش پیدا ہو چلا
بادیہ گردی کا سودا ہو چلا

بادۂ عرفاں

(دلیس راج سروش)

اے نرگسِ ساقی مجھے مستانہ بنا دے
قیدِ غمِ کونین سے بیگانہ بنا دے

دنیا کی حقیقت کا مجھے راز بنا کر
دنیا کی حقیقت کو اک افسانہ بنا دے

گر تو نے مجھے ذوقِ مئے ناب دیا ہے
عالم کو مرے واسطے میخانہ بنا دے

شمع کو کبھی چہرۂ پرنور دکھا کر
غمخوارِ جگر سوزیِ پروانہ بنا دے

صہبائے بہاراں کے پیاسے ہیں عنادل
ہر گل کو چھلکتا ہوا پیمانہ بنا دے

دیوانگیٔ عشق میں برباد بنا کر
تو اپنے کرم سے مجھے فرزانہ بنا دے

یہ قادرِ قدرت کی رضا ہے جبھی چاہے
صحرا کو چمن، باغ کو ویرانہ بنا دے

سنتا ہوں کہ بگڑی ہوئی قسمت نہیں بنتی
قسمت مری اے ہمتِ مردانہ بنا دے

یہ ترک و فنا کا ہے سروش ایک کرشمہ
جو قطرے سی ہستی کو دُرِ یکدانہ بنا دے

فردوسی اور سلطان محمود

از محمد یحییٰ تنہا بی۔آے۔ ایل ایل بی

بعض غلط روایات اسقدر مشہور ہوگئی ہیں کہ آج اُن کی تردید آسان کام نہیں ہے۔ جو بات ایک مدت سے مسلمہ طور پر چلی آتی ہے۔ اُس سے انحراف سخت مشکل ہے۔ لیکن زمانہ ستمبر ۱۹۳۸ء میں فردوسی پر مضمون پڑھکر بعد افسوس ہوا کہ ہمارے لکھنے والے فردوسی کی شاعری کی تعریف اور سلطان محمود کی مذمت لازم و ملزوم قرار دے چکے ہیں۔ اور یہ کس لئے؟ صرف اس وجہ سے کہ سلطان محمود کے دشمنوں نے اُس کی نیک نامی کو جو اُسکی سخاوت و فیاضی اور علم دوستی کے باعث اُسے حاصل تھی مٹانا چاہا اور کہیں اُس کو شیعوں کا دشمن اور کہیں خلاف وعدہ اور کہیں طامع ظاہر کیا۔ حالانکہ ان عیوب میں سے ایک بھی اُسمیں موجود نہ تھا۔ سلطان کی رواداری بروئے تاریخ مسلّم ہے۔ سلطان نے ہندوستان میں ہندؤں کو ملک بخشا۔ اور جلیل القدر عہدے دئے۔ "نہتہ راجہ" ایک ہندو کا تصنیف شدہ ناول ہے۔ اُس کے مطالعہ سے ظاہر ہوگا کہ سلطان محمود اپنی بات کا کسقدر پکا تھا اور ہندو راجاؤں کے ساتھ اُس کا کیسا اچھا سلوک تھا۔ شیعہ فاضل البیرونی سلطان کا مصاحب تھا۔ شیعہ شاعر عضائری رازی کو کثیر انعام دیا۔ سلطان کی دو لڑکیاں دو شیعہ شہزادوں منوچہر بن قابوس و عنصر المعالی کیکاؤس کو بیاہی گئیں۔ وزیر میمندی خارجی المذہب تھا۔ الغرض سلطان کے دربار میں مختلف عقائد و مذاہب کے آدمی جمع تھے۔ اور وہ سب سے بہ تلطف پیش آتا تھا۔ یہ کہنا کہ فردوسی کو رافضی سمجھ کر انعام نہیں دیا۔ ایک بے سروپا بات ہے۔

اگر "بعض اوقات انصاف پر طمع غالب ہوجاتی تھی" تو سمجھ میں نہیں آتا کہ جب سلطان کو لاکھوں روپیہ کے جواہرات سومنات کے بت کو بدستور قائم رہنے پر پیش کئے جارہے تھے تو اُس نے کیوں جواہرات کی پروا نہیں کی؟ اور صاف کہدیا کہ "میں بت شکن کی بجائے بت فروش مشہور نہیں ہونا چاہتا"۔ لالچ اور طمع کا اقتضار تو یہی تھا کہ وہ بت توڑنے سے درگزر کرتا لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ طامع اور لالچی نہیں تھا۔ وعدہ خلافی جسکو معمولی آدمی بھی بُرا سمجھتا ہے۔ سلطان محمود جیسا مذہب کا پابند اور جلیل القدر بادشاہ کیسے وعدہ خلافی کا مرتکب ہو سکتا تھا۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کہانی کیونکر مشہور ہوئی اور اسکی حقیقت کیا ہے؟

مورخین عرب نے سلطان محمود کے زمانہ کے حالات شرح وبسط کے ساتھ لکھے ہیں لیکن انہیں اس کہانی کا کہیں پتہ نہیں۔ عینی ایرانی مورخ سلطان کے عہد میں تھا۔ وہ بھی اس قصہ کا کچھ ذکر نہیں کرتا۔ (الہند و ماالہم من مقالہ مقبول کا مصنف سلطان کا معاصر اور مخالف ہے۔ نہایت سختی سے سلطان پر نکتہ چینی کرتا ہے اور جابجا سلطان کو برا بھلا کہتا ہے لیکن یہ کہانی اُس کو بھی نہیں ملی۔ اگر یہ امر واقعہ ہوتا تو اس مصنف کے لئے عیب چینی کا اچھا مشغلہ ہاتھ آجاتا۔ محمود چوتھی صدی ہجری میں تھا۔ اِس زمانہ کے مورخ اس واقعہ سے بے خبر ہیں۔

اول یہ روایت چہار مقالہ میں نظر آتی ہے جو کسی ماخذ کے بغیر درج ہے۔ چہار مقالہ ڈیڑھ صدی بعد کی تصنیف ہے۔ مورخین عصر اور زمانۂ قریب کا اس واقعہ کو نہ لکھنا اور ڈیڑھ صدی بعد لکھا جانا خود ظاہر کرتا ہے کہ یہ من گھڑت قصہ ہے۔ ممکن ہے کہ یہ روایت غوریوں کے خوش کرنے کیلئے لکھی گئی ہو، کیونکہ صاحب چہار مقالہ غوریوں کا درباری شاعر تھا۔ اور غور وغزنین کی عداوت مشہور ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ چہار مقالہ میں یہ روایت اِس کے مصنف نے نہ لکھی ہو بلکہ بعد میں اضافہ کی گئی ہو۔ اُس زمانہ کی بہت سی کتابیں بلکہ اُس کے بعد کی بھی کتابیں دست برد زمانہ یا روایت سازوں کی تحریف سے محفوظ نہیں ہیں۔ مثلاً دیوانِ حافظ، کلیات شمس تبریز، گلستان وغیرہ وغیرہ۔

اصل یہ ہے کہ فردوسی ایک شاعر تھا سُنی المذہب۔ سلطان محمود کے درباری شعرا میں سے تھا۔ شاہنامہ اُس کی تصنیف ہے جسمیں بہت کچھ تحریف ہوئی ہے۔ سلطان کے عہد میں قرامطہ کا زور تھا۔ قرامطہ سلطان کے سخت مخالف تھے۔ اور سلطان قرامطہ کا دشمن تھا۔ امرا اور درباریوں میں باہم فریق بندی تھی فردوسی بھی ایک فریق کا رکن تھا۔ فردوسی پر مخالف فریق نے قرمطی ہونے کا الزام عائد کیا اور وہ اِس وجہ سے سلطان کی نظر سے گر گیا۔ تذکرۂ دولت شاہ میں ہے کہ ایاز نے بادشاہ سے کہا کہ فردوسی قرمطی ہے، اُس پر بادشاہ نے فردوسی سے کہا کہ "تو قرمطی بودہ"۔ صاحب آتش کدۂ آذر نے بھی لکھا ہے کہ فردوسی کو قرمطی کہا گیا اور یہ الزام اُس پر اِسلئے بھی لگا کہ دیلمیوں سے سلطان کی سخت مخالفت تھی اور اکثر قرامطہ دیلمیوں کے زیرحمایت رہتے تھے۔ فردوسی کو فخر الدولہ دیلمی نے ایک ہزار اشرفیاں بھیجی تھیں اور فردوسی نے اُس سے خط وکتابت کی تھی علاوہ اِس کے قرامطہ کے اکثر بڑے بڑے رہنما طوس کے رہنے والے تھے۔ ان واقعات سے فردوسی کا قرمطی ثابت کرنا اور اُس کا معتوب کرانا کیا مشکل تھا۔ اُس زمانہ میں اکثر مقربین اس شبہ میں معتوب ہو جاتے تھے۔

حسنک میکال سلطان محمود کا خاص وزیر تھا۔ اس پر بھی یہ الزام لگایا گیا کہ خلیفۂ بغداد نے سلطان کو لکھا کہ حسنک کا سر کاٹ کر بھیج دو۔ سلطان نے جواب میں لکھا کہ میں نے اس کو بچپن سے پرورش کیا ہے۔ میں اسکے

عقائد و اعمال سے بخوبی واقف ہوں۔ یہ اُس پر سراسر اتہام ہے۔ اُس وقت اُس بیچارے کی جان بچی۔ لیکن سلطان کے بعد یہ اسی شبہ میں قتل کیا گیا۔ امام فخرالدین رازی رحمۃ اللہ علیہ کو سلطان شہاب الدین غوری از راہِ عقیدت اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ جب سلطان کو قرامطہ نے شہید کیا تو امام صاحب بھی اس شبہ میں ماخوذ ہوئے۔

صرف یہی الزام تھا کہ جس پر فردوسی معتوب ہوا اور شعرائے دربار کی سفارش پر رہا ہو کر سلطان کے بھائی کے پاس سفارش کے لئے گیا اور اس طرح بیان کیا ؎

چنیں شہریارے و بخشندہ　　　بہ گیتی ز شاہاں درخشندہ

نکرد اندریں داستاہا نگاہ　　　ز بدگوئے بدبخت آمد گناہ

حسد برد بدگوئے در کارمن　　　تبہ شد بر شاہ بازار من

اگر غلط روایت والا معاملہ ہوتا تو فردوسی سلطان کے بھائی کے پاس سفارش کے لئے ہرگز نہ جاتا اور اگر وہاں جاتا تو ہجو لکھنے کے بعد وہاں سے کیسے واپس آسکتا تھا؟ دوسرے شعر کے پہلے مصرع سے ثابت ہوتا ہے کہ سلطان شاہنامہ دیکھنے بھی نہ پایا تھا کہ مخالفین کی دراندازی سے سلطان فردوسی سے مشکوک ہو گیا۔ اور اسکو بھاگنا پڑا۔ ہجو میں ایک شعر ہے ؎

بداندیش را روئے نیکی مباد　　　سخنہائے نیکم بہ بدکرد یاد

اس شعر سے صاف اس امر کی توضیح ہوتی ہے کہ انعام کا قصہ نہ تھا بلکہ کسی مخالف نے کچھ بدگوئی کی تھی اور وہ یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ فردوسی کو قرمطی کہا گیا۔

انگلستان کے نامور مستشرق پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب ادبیاتِ عجم میں یہ تحقیق لکھی ہے کہ محمود کے دربار میں شاہنامہ کا سیکنڈ ایڈیشن پیش ہوا تھا۔ اس تحقیقات کی بموجب سلطان کے فرمایش کرنے اور انعام و وعدۂ انعام سب کی تردید ہوگئی۔

شاہنامہ میں بیحد تحریف ہوئی ہے۔ اگرچہ مشہور یہ ہے کہ ساٹھ ہزار اشعار اس میں موجود ہیں۔ لیکن یہ تعداد کسی ایک نسخہ میں بھی نہیں پائی جاتی۔ ایک نسخہ محمد خاں قزوینی کا لکھا ہوا صرف بائیس ہزار بیس اشعار پر مشتمل ہے اور نسخوں میں اس سے زیادہ اشعار ہیں۔ یہاں تک کہ ایک نسخہ میں جو ۸۰۰ھ کا لکھا ہوا ہے اور سب سے قدیم نسخہ ہے، جو اب تک دستیاب ہوتے ہیں اور شاہنامہ کے اختتام سے چار سو دس برس بعد لکھا گیا ہے (۱۱۹۷۰۸) اشعار ہیں۔ جسمیں سات ہزار اشعار صرف بغداد کی تعریف میں ہیں۔ لطف یہ ہے کہ ہر نسخہ میں تعداد اشعار مختلف ہے اور دو نسخے بھی ایسے نہیں ہیں جنکی تعداد اشعار یکساں ہو۔

علامہ لطف علی خاں آذر لکھتے ہیں:۔

"امروز شاہنامہ کہ صحت داشتہ باشد وجود ندارد بعلت عدم ربط کتاب و نساخ چنداں تغیر یافتہ کہ نمی تواں گفت کہ دریں کتاب شعرے از فردوسی ماندہ۔ باز انچہ باقی ماندہ بمقابل اشعار فصیح بلغا و افکار بلیغ فصحاء رہ ارباب شعر خوب و سخن مرغوب دارد۔" (آتش کدۂ آذر)

موجودہ شاہنامہ میں تاریخی غلطیاں ایسی ہیں جن کو فردوسی جیسا ماہر تاریخ ایران و مورخ قدیم نہیں کرسکتا تھا مثلاً ؎

چو پرویز ہرمز چو پورش قباد　　　　چو خسرو کہ پرویز نامش نہاد

اِس شعر سے پرویز کا بیٹا ہرمز ثابت ہوتا ہے حالانکہ ہرمز کا بیٹا پرویز تھا۔ شاہنامہ میں پرچہرہ کو ایرج کی نواسی بتلایا ہے۔ حالانکہ پرچہرہ ایرج کی بیٹی تھی۔ شاہنامہ میں دارا کے قاتل ناسار و حانوسار نامی دو وزیر بتلائے ہیں حالانکہ دارا کے قاتل دو ہمدانی سپاہی تھے۔ (زینت التواریخ و تواریخ ایران سرجان ملکم)

شاعری کی ایسی غلطیاں پائی جاتی ہیں کہ معمولی شاعر بھی نہیں کرسکتا۔ مثلاً

چو سال اندر آمد بہفتاد یک　　　　ہمیں زیر شعر اندر آمد فلک

شاعر کا مطلب یہ ہے کہ ۳۷۱ ہجری میں تمام اشعار مکمل ہوئے۔ کتاب (شاہنامہ) تیار ہوگئی۔ اِس شعر سے یہ مطلب کہاں پورا ہوتا ہے اور مصرع ثانی تو بالکل مہمل ہے۔

"شاہنامہ تصنیف فردوسی بصنعتِ لزوم زبانِ فارسی" (خیاباں)۔ لیکن موجودہ شاہنامہ صنعتِ لزوم کی قید سے آزاد ہے۔ اِس میں بہت سے الفاظ عربی کے موجود ہیں۔ حالانکہ وہ ایسا قادر الکلام تھا کہ اہم مضامین کو بغیر عربی الفاظ کے نہایت زوردار الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ آفرینشِ عالم کے متعلق لکھتا ہے لیکن مادہ، وجود، عنصر وغیرہ وغیرہ الفاظ استعمال نہیں کرتا اور مطلب کو نہایت سلیس خالص فارسی میں کس زور سے بیان کرتا ہے ؎

از آغاز باید کہ دانی درست　　　　سرمایۂ گوہراں از نخست

کہ یزداں ز ناچیز چیز آفرید　　　　بداں تا توانائی آمد پدید

وزو مایۂ گوہر آمد چہار　　　　برآوردہ بے رنج و بے روزگار

(سرمایہ بمعنی مادہ۔ توانائی بمعنی طاقت۔ گوہر بمعنی عنصر)

شاہنامہ فردوسی کی تصنیف مشہور ہے لیکن بروئے تحقیق اس کے تین مصنف ہوتے ہیں۔ اِسمیں ایکہزار اشعار دقیقی کے شامل ہیں (تذکرہ ہفت اقلیم و مجمع الفصحاء) فردوسی کو خود بھی اس کا اقرار ہے ؎

ز گشتاسپ و ارجاسپ بیتے ہزار　　　　بگفت و سر آمد ورا روزگار

پذیرفتم و داشتم زو سپاس　　　　مرا در دل آمد ز ہر سو ہراس

یعنی گشتاسپ وارجاسپ کے بیان میں ایک ہزار اشعار اُس نے لکھے تھے کہ وہ مرگیا۔ میں نے اُن اشعار کو شکریہ کے ساتھ شامل کرلیا۔ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے:۔

"استاد اسدی طوسی در روزگار سلطان محمود استاد فرقۂ شعرائے خراسان بود اُو را بکرات تکلیف نظم شاہنامہ کردند او پیری وضعیفی را بہانہ کردہ استغفار کرد...... فردوسی را کہ شاگرد او ست ہمیشہ اشارت بنظم شاہنامہ میکرد تا آخر چناں شد وچوں فردوسی از غزنین گریختہ بطوس رفت و از انجا بہ رشمدار (قہستان) وطالقان رفتہ باز بطوس مراجعت کرد۔ درحین قرب وفات اسدی را بخواند وگفت وقت رحلت ست واز شاہنامہ قلیلے ماندہ وکسے را قوت نباشد کہ باقی را بقید نظم درآرد۔ اسدی گفت اے فرزند غمگیں مباش اگر حیات باشد من باتمام رسانم، فردوسی گفت اے استاد تو پیری شکل کہ ایں کار از تو کفایت شود اسدی گفت انشاء اللہ تعالیٰ بشود ودرہماں چند روز شروع کردہ از اول استیلائے عرب برعجم تا آخر کہ چہار ہزار بیت می شود بقید نظم درآورد و فردوسی ہنوز زندہ بود کہ بنظرش گزوانید واو خوشحال شدہ بر ذہن مستقیم اوستاد آفریں خواند"

اسی طرح یہ روایت آتشکدۂ آذر میں بھی ہے۔ خیاباں میں اِس طرح مذکور ہے:۔

"شاہنامہ تصنیف فردوسی بصنعت لزوم زبان فارسی، تکملہ آں حکیم اسدی استاد فردوسی کردہ بود"

ان تینوں روایتوں سے صاف ظاہر ہے کہ شاہنامہ تمام فردوسی کی تصنیف نہیں۔ نہ اُس کی حیات میں مکمل ہوا۔ پھر اِس کا دربارِ سلطانی میں مکمل پیش ہونا کیونکر صحیح مانا جاسکتا ہے۔

چہار مقالہ میں ہے کہ شاہنامہ ۴۰۰ھ ہجری میں مکمل ہوا اور مدت تکمیل ۳۰ یا ۳۵ سال ہے اس لحاظ سے (۴۰۰-۳۵) ۳۶۵ھ ہجری یا (۴۰۰-۳۰) ۳۷۰ھ ہجری سال آغازِ شاہنامہ قرار پاتا ہے اور محمود کی تخت نشینی ۳۸۷ھ ہجری میں ہوئی۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی نے شاہنامہ خود شروع کیا اور سلطان نے شاہنامہ مرتب کرنے کی فرمایش نہیں کی چنانچہ ایک روایت ہے کہ فردوسی نے شاہنامہ اپنے شوق سے طوس میں شروع کیا اور تاریخی سرمایہ اُس کو ایک دوست نے دیا۔ اسی واقعہ کو شاہنامہ میں اِس طرح بیان کیا ہے۔

بہ شہرم یکے مہرباں دوست بود	تو گفتی کہ بامن بہ یک پوست بود
مرا گفت خوب آمد ایں رائے تو	بہ نیکی خرامد مگر پائے تو
نوشتہ من ایں نامۂ پہلوی	بہ پیش تو آرم مگر معنوی
تو ایں نامہ خسرواں باز گو	بدیں جوئے زد میہماں آبرو

چو آورد ایں نامہ نزدیکِ من　　برافروخت ایں جانِ تاریکِ من

شاہنامہ کا انتساب بھی محمود غزنوی کے نام پر نہیں ہوا۔ برٹش میوزیم کے شاہنامہ میں اشعار ذیل درج ہیں، جنمیں فردوسی شاہنامہ کو ۳۸۹ھ میں ختم کر کے خان النجان (ایک ناحیہ ہے اصفہان کے قریب) کے رئیس احمد بن محمد بن ابی بکر الاصفہانی کے نام سے معنون کرتا ہے۔

اگر سال .... آمدست　　نہم سال و ہشتاد باسی صدست
گرانمایہ احمد کہ ہم سال او　　بجوید بہر جا از و آل او
زبا باش جوئی تو نام درست　　ابوبکر آخر محمد نخست
خداوند ایں دفترِ بندہ کرد　　لبِ ہر مرادم پُراز خندہ کرد

قیاس چاہتا ہے کہ یہ مضمون صحیح ہے کیونکہ فردوسی دوسری جگہ کہتا ہے کہ میں نے اِس کتاب کو مکمل کر کے بیس برس تک محفوظ رکھا اور تلاش میں رہا کہ کس کے نام سے معنون کروں ؎

سخن را نگہ داشتم سال بیست　　کہ بینم سزاوار این گنج کیست

ایک اور جگہ فردوسی کہتا ہے ؎

جہاں تا بود شہریاراں بود　　پیامم بر تاجداراں بود
کہ فردوسیِ طوسیِ پاک جفت　　نہ ایں نامہ بر نام محمود گفت

اِن امور کو پیشِ نظر رکھکر کیا ممکن ہو سکتا ہے کہ شاہنامہ سلطان محمود کی فرمائش پر لکھا گیا ہو اور اُس کے نام سے معنون بھی نہ ہو؟

مشہور یہ ہے کہ ہجو فردوسی نے لکھی لیکن از روئے تحقیق یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہجو ہرگز فردوسی کی لکھی ہوئی نہیں الحاقی ہے۔ ہجو کے اشعار لچر اور غلط واقعات پر مبنی ہیں۔ ایک جگہ کچھ کہا ہے دوسری جگہ اُس کی تردید کر دی ہے فردوسی سے یہ اُمید نہیں کی جاسکتی کہ وہ غلط واقعات پر اپنے اشعار کی بنیاد رکھے۔ مثلاً

اگر شاہ را شاہ بودے پدر　　بسر بر نہادے مرا تاج زر
وگر مادرِ شاہ بانو بدے　　مرا سیم و زر تا بہ زانو بدے

سلطان محمود غزنوی سلطان سبکتگین کا بیٹا تھا۔ اور سلطان محمود کی والدہ امیر زابلستان کی بیٹی تھیں۔ اِس شعر میں بانو سے مُراد امیر باپ کی بیٹی ہے حالانکہ بانو صرف بیوی کو کہتے ہیں۔ الغرض محمود لونڈی کے بطن

سے پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس لئے اُس کو پرستارزادہ کیسے کہا جاسکتا ہے جیسا کہ اِس شعر میں کہا گیا ہے ؎

اگرچہ بود زادۂ شہریار — پرستارزادہ نہ آید بکار

اور اس شعر میں سلطان کو بادشاہ کا بیٹا تسلیم کر لیا حالانکہ سب سے پہلے شعر میں اِس سے انکار کیا ہے کہ سلطان بادشاہ کا بیٹا تھا۔

اِس مضمون پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے لیکن بخوفِ طوالت اِس کو یہاں ختم کرتا ہوں۔ جن اصحاب کو مزید شوقِ تحقیق ہو، وہ رسالہ "محمود اور فردوسی" مصنفہ قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم مطبوعہ معین دکن پریس، حضرت مصنف سے حیدرآباد دکن محلہ عابد شاپ مکان مولوی فیض الدین صاحب وکیل کے پتہ سے طلب کریں، اُس سے اندازہ ہو جائے گا کہ یہ کہانی بالکل بے اصل ہے۔ اور ہجو ہرگز فردوسی کی تصنیف نہیں ہے۔ سلطان محمود کو ناحق بدنام کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

جذباتِ شوق

از پنڈت جگموہن ناتھ رینہ شوقؔ

جھلک تھی جلوہ کی لیکن وہ بے حجاب نہ تھا — نگاہِ شوق کا در پردہ کچھ جواب نہ تھا
خودی کے نشہ میں دِل مائلِ شراب نہ تھا — وہ ایک پردۂ غفلت تھا، مستِ خواب نہ تھا
بہار آئی، کھِلے پھول، ہر فضا بدلی — مگر یہ دِل ہی تھا جس میں کہ انقلاب نہ تھا
نسیمِ صبح نے غنچوں سے چھیڑ چھاڑ جو کی — چمن میں عارضِ گل کوئی بانقاب نہ تھا
ہوا نہ ہم کو کچھ احساسِ جوششِ بیتابی — فریبِ شورشِ دِل تھا یہ اضطراب نہ تھا
کیا نہ اُس نگہِ شرمگیں نے خوں میں غرق — جفا کے نام سے واقف ترا حجاب نہ تھا
سوال کو مرے گو تیری تمکنت سمجھی — مگر وہ چُپ ترا رہنا کوئی جواب نہ تھا
ہجوم موجِ فنا سے محال تھا بچنا — کسی کے ہاتھ میں وہ ساغرِ حباب نہ تھا
ہزار آفتیں گو دِل کے ساتھ تھیں۔ لیکن — غریقِ موجۂ بدمستیٔ شباب نہ تھا
کبھی وہ کعبہ بنا اور کبھی وہ بُت خانہ — یہ اور کیا تھا، اگر دِل کا انقلاب نہ تھا

صلائے عام تو ساقی کی تھی، مگر اے شوقؔ
ہمارے میکدہ میں شیشۂ شراب نہ تھا

یادِ ایّام

(از حضرت نسیم لنگوی خوجیانوالی)

کہاں وہ دن کہ میری آرزوؤں کے حسیں طائر ہوا کرتے تھے پر افشاں محبت کے گلستاں میں
دلِ مضطر میں اُمیدوں کے شعلہ آفریں زائر تجلی جس طرح پرّاں دیارِ انجمستاں میں

شفق کے خمکدہ میں وہ شباب و شعر کا پلنا برسنا وہ شرابِ نور کا زرّیں سحابوں سے
شفق افروز پیشانی میں شمعِ طور کا جلنا خراجِ سجدہ لینا وہ کسی کا آفتابوں سے

وہ پڑھنا گیسوؤں کے سائے میں سرشار راتوں کا وہ آپس میں اشارے قدس کے بالانشینوں کے
وہ رس اور پریم ننھی ننھی پیاری پیاری باتوں کا وہ بحرِ نیلگوں میں ننھے ہلکورے سفینوں کے

بلائیں بڑھ کے لے لینا وہ شوخ و شنگ کرنوں کی وہ شرما کر کسی کا ڈھانپ لینا مہر انور کو
فضا میں نور و نغمہ کے وہ طوفاں کا اُمنڈ آنا سحر کی دیوی کا وہ چھیڑنا زلفِ معطر کو

تھا تخلیقِ جنوں میں خون ساری روحِ مانی کا ہر اک نقشِ حسیں رعنائی شاہکارِ فطرت تھا
تھا رتبہ یہ نگاہِ عشق پیشہ کی جوانی کا چراغ لالۂ صحرا بھی شعلہ زارِ فطرت تھا

کہاں ڈھونڈوں میں اب اُن زرّیں لمحاتِ مسرت کو بھٹکتا پھرتا ہوں قدرت کی عشرت زا بہاروں میں
شکایت ہے یہ فطرت سے مری روحِ محبت کو مری ناکامیوں کے چرچے پھولوں اور ستاروں میں

رُباعی

ہر آن جفا سے قلب ڈر جاتا ہے ہر بات پہ آسماں بپھر جاتا ہے
کرتا ہے اسے مالِ غنیمت میں شمار جو لمحہ فراغت سے گذر جاتا ہے

(کلیم) جوش

نوبل پرائز کی کہانی

از مسٹر ضیاء الدین احمد برنی بی۔ اے

ایلفریڈ نوبل سویڈن کی راجدھانی اسٹاک ہالم میں ۲۱ اکتوبر ۱۸۳۳ء کو پیدا ہوا تھا۔ اسکا باپ امے نوایل نوبل اپنے زمانہ کا مشہور آدمی تھا۔ یہ شخص بلا کا محنتی تھا اور بعض خاص قابلیتوں کا مالک۔ معمار کی حیثیت سے تعلیم پانے کے بعد وہ محض چھبیس ۲۶ سال کی عمر میں جیومیٹری کا پروفیسر مقرر ہوگیا۔ اور چونکہ یہ کام اُس کی خداداد قابلیتوں کے لئے کافی میدان بہم نہیں پہونچاتا تھا اس لئے اُس نے روس کے دارالسلطنت سینٹ پیٹرزبرگ میں انجنیری اور جہازسازی کے کارخانے کھولے اور ساتھ ہی تارپیڈو بنانے کا کام بھی شروع کردیا۔ تقریباً بیس برس تک یعنی جنگ کریمیا کے ختم ہونے کے کچھ دنوں بعد تک اُس نے ان کارخانوں کو نہایت کامیابی کے ساتھ چلایا۔ لیکن چونکہ اس لڑائی سے روسی حکومت کی مالی حالت بہت کچھ خراب ہوچکی تھی۔ جسکی وجہ سے وہ ان کارخانوں کے لئے کافی کام نہ دے سکتی تھی اس لئے اُس نے انھیں اپنے ایک بیٹے لوئی کے سپرد کردیا اور خود اسٹاک ہالم واپس آگیا۔ جہاں وہ اپنے دوسرے بیٹوں کی مدد سے پھٹنے والے گولے بنانے کی ترکیب معلوم کرنے میں مشغول ہوگیا۔

اُس وقت تک بھک سے اُڑنے والی جو چیز بنی یا صنعتی کارخانوں میں استعمال کیجاتی تھی، وہ ایک قسم کا کالے رنگ کا پاوڈر تھا جو زور سے دھماکا پیدا کیا کرتا تھا۔ نائٹرو گلسرین اگرچہ چند سال پہلے فرانس میں دریافت ہوچکا تھا مگر وہ اتنا خطرناک مسالہ تھا کہ اُس کا استعمال نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لیکن اکتوبر ۱۸۶۳ء میں ایلفرڈ نوبل نے ایک ایسے پھٹنے والے مادہ کا پیٹنٹ کرایا جو نائٹرو گلسرین اور معمولی بارود کا مرکب تھا۔ لیکن نائٹرو گلسرین کے استعمال سے کئی سال تک خوفناک حادثے پیش آتے رہے۔ جنمیں سب سے بڑا حادثہ شہر برسیلز میں ۱۸۶۸ء میں واقع ہوا جسمیں ایک درجن آدمی مرگئے تھے اور بیسیوں زخمی ہوئے تھے۔ اس واقعہ سے چار سال پہلے بھی ایک حادثہ ہوا تھا جسمیں ایلفرڈ کے چھوٹے بھائی آسکر ایمل کی صرف اکیس ۲۱ سال کی عمر میں جان ضائع ہوئی تھی اور ہیلین برگ کا کارخانہ بھی تباہ و برباد ہوگیا تھا۔ انہی حادثوں کی وجہ سے انگلستان میں پھٹنے والے مادّے کے خلاف سخت نفرت کا جذبہ پیدا ہوگیا اور بعض دوسرے ملکوں نے بھی اسکے استعمال کے خلاف تجویزیں منظور کیں۔

ایلفرڈ نوبل نے ۱۸۶۷ء میں ڈائنامیٹ ایجاد کیا۔ جسکی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے وزن سے تین گنا

نائٹروگلسرین جذب کرلیتا تھا۔ اِسی آمیزش کا نتیجہ تھا کہ نائٹروگلسرین جیسی خوفناک چیز معمولی بارود سے بھی کم خطرناک ہوگئی اور سردی، گرمی یا پانی کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوسکتا تھا یہ چیز آج بھی پہاڑوں میں راستے بنانے اور چٹانوں کے اُڑانے میں کام آتی ہے۔ اِس ایجاد کے بارہؔ سال بعد ایلفرڈ نے بیلسٹائٹ کا پٹینٹ کرایا جو ایک قسم کا آتشگیر سفوف ہے جسمیں آگ لگنے پر بھی دھواں نہیں نکلتا۔ اِس ایجاد سے لڑائی کے طریقوں میں زبردست انقلاب ہوگیا۔

اِس صنعت کو جوں جوں ترقی ہوئی، نوبلؔ کا نام دُنیا میں مشہور ہوتا گیا۔ سانؔ ریمو میں اُس نے ایک بہت بڑی لیبوریٹری بنائی اور اپنے رہنے کے لئے ایک مکان بھی بنایا۔ جس کا نام اگرچہ مائی نیسٹ (My Nest) یعنی "میرا گھونسلا" تھا۔ لیکن لوگ ہمیشہ اُسے "نوبل وِلا" یعنی "نوبل کا محل" کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

ایلفرڈ نوبل نے ایک اور چیز ایجاد کی، جس کا نام مصنوعی گٹا پارچہ ہے۔ آجکل موٹر اور بجلی کا زمانہ ہے، مگر اسے ڈائنامیٹ کی دریافت سے کسی طرح کم نہ سمجھنا چاہیئے۔ اِسی کے سلسلے میں نوبلؔ بھاری بھاری گولے پھینکنے والی توپیں بھی ڈھالا کرتا تھا۔

نوبلؔ نے ساری عمر شادی نہیں کی۔ اس کا سارا وقت یا تو لیبوریٹری میں گزرتا تھا یا سویڈنؔ سے اٹلیؔ اور اٹلیؔ سے سویڈنؔ اور دوسرے مُلکوں میں آنے جانے میں صرف ہوتا تھا۔ بات یہ ہے کہ گھرستی کا سُکھ اُٹھانے کے لئے اُس کے پاس وقت ہی نہ تھا۔ پروفیسر لوئی ہنریؔ کا جس نے سب سے پہلے ایلفرڈ نوبل کے حالات ایک فرانسیسی میگزین میں لکھے، بیان ہے کہ اُسکی ماں ہی اُس کے لئے محبت و پریم کی دیوی تھی۔ اور اُس کے سب بچے بھی اپنی ماں سے بڑی محبت اور عزت کے ساتھ پیش آیا کرتے تھے۔ ماں کا انتقال ۱۸۸۹ء میں چھیاسی (۸۶) سال کی عمر میں ہوا۔ اِس واقعہ کے سات (۷) سال بعد ایلفریڈ نوبل کا بھی سانؔ ریمو میں ۱۸۹۶ء میں انتقال ہوگیا۔

ایلفریڈؔ کی صحت کبھی اچھی نہیں رہی۔ وہ طبعاً گوشہ نشین واقع ہوا تھا۔ اُس کی زندگی بیحد سادہ تھی، اور دولتمند ہونے کے باوجود اُس میں گھمنڈ نام کو نہ تھا۔ اپنی ایجادوں کی عظیم الشان کامیابی کی وجہ سے اُس نے اِتنی دولت پیدا کرلی تھی کہ لوگ اُس کا اندازہ ساڑھے چار کروڑ فرانک کرتے تھے۔ مرنے سے کئی سال پہلے سے اُس نے سوچنا شروع کردیا تھا۔ کہ اتنی بڑی دولت کس کام میں صرف کرے۔ ساٹھ برس کی عمر میں اُس کے پاس تقریباً تین کروڑ روپے تھے جن کا وہ بلا شرکت غیرے تنہا مالک تھا۔ نوبل ہروقت اسی سوچ بچار میں رہتا تھا کہ یہ تین کروڑ روپیہ کس کام میں صرف کیا جائے۔

نوبلؔ ٹرسٹ کے ایک ٹرسٹی مسٹر سوہلمین انجنیئر کا بیان ہے کہ نوبلؔ کا ہمیشہ سے یہی خیال تھا کہ "دولت کسی واحد شخص کو نہ ملنا چاہیئے، جس نے اُس کے لئے کبھی محنت نہ کی ہو اور نہ ایسے شخص کو ملنی چاہیئے جو صرف اِس وجہ سے اُسے حاصل کرنا چاہے کہ وہ فلاں کا بیٹا ہے یا بھتیجا ہے"۔ نوبلؔ کا یہ بھی خیال تھا کہ "رشتہ داروں کے لئے

کروڑوں روپیہ چھوڑ مرنا سخت بیوقوفی ہے"۔ وہ کہا کرتا تھا کہ "ذاتی محنت کے بغیر کسی کو کوئی بڑا ورثہ چھوڑنا اُسے ہمیشہ کے لئے سُست، ناکارہ اور اپاہج بنا دینے کے برابر ہے"۔ وہ اپنے رشتہ داروں سے صاف صاف کہہ دیا کرتا تھا کہ میرے روپے کا آسرا نہ کرو۔ میرے بعد میری دولت تمھیں نہ ملے گی"۔ موت سے چند دن پہلے نوبل نے اپنے دو دوستوں سے کہا کہ "ذاتی عقیدہ سے میں سوشل ڈیماکراٹ ہوں، لیکن عملی حیثیت سے میں حد سے آگے بڑھنے کے خلاف ہوں۔ اور میرا تجربہ ہے کہ بڑا ورثہ انسان کو بیکار بنا دیتا ہے۔ اِس لئے ہر مالدار شخص کو اپنی دولت کا صرف تھوڑا سا حصہ اپنے بچوں اور دوسرے وارثوں کے لئے چھوڑنا چاہئے تاکہ وہ اُسکی مدد سے دُنیا میں اپنے لئے راستہ پیدا کر سکیں۔ وہ کہتا تھا کہ کسقدر ظلم کی بات ہے۔ کہ جائدادیں ایسے لوگوں کے لئے چھوڑی جائیں جنھوں نے اُن کے حاصل کرنے میں ذرا سی محنت بھی نہیں کی ہے۔ بڑی میراث ملنے سے دماغی طاقت پوری پوری ترقی نہیں کر سکتی اور ذاتی جد وجہد کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ حالانکہ محنت ہی سے انسان اپنے آپ کو پوری طرح اُبھار سکتا ہے"۔ اِسی خیال سے نوبل نے اپنے رشتہ داروں کو صرف تین لاکھ روپے چھوڑے۔

موت سے چند مہینے پہلے نوبل نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ "میں با کار آدمی کے لئے ایک پیسہ بھی چھوڑنا پسند نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کا مطلب یہی ہوگا کہ میں اُسے اپنا کام بند کرنے کی رغبت دِلاتا ہوں۔ میں ایسے خیالی آدمی کی امداد کرنا پسند کرتا ہوں جو طرح طرح کی مشکلوں سے گھرا ہو"۔

اِنہی خیالات کو عمل میں لانے کے لئے اُس نے وصیت کی کہ تمام سرمایہ سے ایک انعامی فنڈ قائم کیا جائے۔ اس وصیت کے، جو ۲۷ نومبر ۱۸۹۵ء کو لکھی گئی تھی، بعض حصے یہ ہیں:۔

"کل رقم کے پانچ برابر حصے کئے جائیں اور ایک حصہ اُس شخص کو دیا جائے جس نے فزیکل سائنس میں کوئی اہم دریافت کی ہو، دوسرا حصہ اُس شخص کو دیا جائے جس نے کیمسٹری میں کوئی کام کی بات دریافت کی ہو، تیسرا حصہ فزیالوجی کی اہم دریافت کرنے والے کو دیا جائے، چوتھا حصہ اُس شخص کو دیا جائے جو ذہنی حیثیت سے کوئی زبردست ادبی تصنیف پیش کرے اور پانچواں حصہ ایسے شخص کو دیا جائے جس نے مختلف قوموں میں بھائی چارہ کے خیالات پھیلانے، فوجیں کم کرنے اور امن پھیلانے کے سلسلہ میں سب سے اچھا کام کیا ہو۔

میری دِلی خواہش ہے کہ اِن انعامات کی تقسیم کے وقت نسل، قومیت، ذات پات، رنگ اور مذہب کا ہرگز کوئی لحاظ نہ کیا جائے کیونکہ میرا اصلی مدعا یہ ہے کہ یہ انعامات صرف ایسے ہی آدمیوں کو دئے جائیں، جو واقعی اُن کے مستحق ہوں خواہ وہ میرے ہموطن ہوں یا کسی غیر ملک کے باشندے ہوں"۔

اپنی دولت کو اِس طرح تقسیم کرنے سے نوبل کا مقصد یہ تھا کہ سائنس کی تحقیقات کرنے والوں کے لئے جو

دن رات علمی تجربوں میں لگے رہتے ہیں اور بڑی سے بڑی دریافت کرنے کے باوجود غربت و افلاس میں زندگی بسر کرتے اور اسی حالت میں مرجاتے ہیں، آسانیاں پیدا کی جائیں۔ وہ ایسے لوگوں کو نہ صرف اُن کی محنت کا صلہ دینا چاہتا تھا۔ بلکہ ہونہار آدمیوں کے لئے ترقی کے موقعے بھی مہیا کرنا چاہتا تھا۔ وہ خود کیمسٹ تھا۔ اِس لئے اُس نے سب سے پہلی جگہ سائنس کی تحقیقات کو دی۔ وہ ڈاکٹر لوئی پاسچر کا بھی بیحد مداح تھا اور چونکہ اُس کی صحت خراب رہا کرتی تھی۔ اِس لئے تیسرا انعام ڈاکٹری اور فزیالوجی کے لئے رکھا گیا۔ چوتھا انعام لٹریچر کے لئے رکھا۔ پروفیسر سنری کا بیان ہے کہ آخری عمر میں نوبل کو شاعری سے (خصوصاً بائیرن کی شاعری سے) گہری دلچسپی ہوگئی تھی۔ اِس لئے لٹریچر کو بھی اُس نے انعامات میں شامل کرلیا۔ پانچواں انعام اُس نیک مقصد کے لئے ہے جس نے آج بھی دُنیا کی توجہ کو سب سے زیادہ اپنی طرف کھینچ رکھا ہے۔

نوبل کو بین الاقوامی امن کی جدوجہد سے بیحد دلچسپی تھی۔ اُس کی وصیت میں اگرچہ اِس انعام کو آخری جگہ دی گئی ہے، لیکن نوبل نے خود اُس کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ:۔

"میں چاہتا ہوں کہ اپنی دولت کا بڑا حصہ ایسے انعام کی بُنیاد ڈالنے میں صرف کروں۔ جو اُس شخص کو دیا جائے جو یورپ کو عالمگیر امن کی جانب ترقی کرنے پر مائل کردے۔"

نوبل سویڈن میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن فرانس، اٹلی اور دوسرے ملکوں میں بھی برسوں رہا۔ ان سب ممالک کے حالات دیکھکر اُس کو یہ خیال ہوگیا تھا کہ پُرانی دُنیا کا نظامِ حکومت بالکل بگڑا ہوا ہے۔ اِسلئے اسکی خواہش تھی، کہ یورپ کا نظامِ تمدن بھی ممالک متحدہ امریکہ کی طرز پر قائم ہوتا کہ اِن مُلکوں میں جنگی تیاریوں کا خاتمہ ہوجائے۔ اور اُس کے بجائے عقل و قانون کا راج قائم ہو۔ اِسی لئے اُس نے ہمیشہ کے لئے ایک لاکھ دس ہزار روپے کی سالانہ رقم اُس شخص یا اُس انسٹی ٹیوشن کو دینی منظور کی جو دُنیا کی قوموں کے درمیان برادرانہ امن و صلح کو سب سے زیادہ ترقی دے اور فوجوں اور ہتھیاروں میں کمی کراکر دُنیا کا امن و امان قائم رکھے اور باہمی صلح کو ترقی دینے کی کوشش کی ہو۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ نوبل کے مرنے کے بعد اس کے کسی رشتہ دار نے اپنا حصہ لینے کے لئے عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا۔ وصیت پر ۲۹ رجون ۱۹۰۰ء کو شاہی منظوری ہوئی اور انعامات پہلی مرتبہ ۱۹۰۱ء میں دئے گئے یہ انعامات ہر سال ۱۰ ردسمبر کو دئے جاتے ہیں جو مسٹر ایلفرڈ نوبل کی وفات کا دن ہے

ہر انعام کی رقم دس ہزار پونڈ ہوتی ہے۔ لیکن دفتر کا خرچ نکالنے کے بعد ہر انعام میں صرف آٹھ ہزار پونڈ کی رقم بچتی ہے۔ اسکے ساتھ ہی ڈپلوما اور سونے کا تمغہ بھی دیا جاتا ہے جس پر نوبل کی تصویر نقش ہوتی ہے۔ مگر کامیاب اُمیدوار کو اُس کے لینے کے لئے سویڈن جانا پڑتا ہے۔

پچھلے اٹھتیس سال میں ہندوستان کے دو نامور شخص ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور اور سرسی وی رامن کو بھی یہ انعام ملا ہے

سادہ لوح پروانے

(از حضرت سرشار کسمنڈوی)

ہائے وہ دردناک افسانے — جن کے ہیرو ہیں تیرے دیوانے
تم نہیں ہو تو دیکھتا ہوں مَیں — ہر طرف ہولناک ویرانے
شمع سے دل نوازیوں کی اُمید — ہائے اے سادہ لوح پروانے
چُپ کھڑا ہوں ہجومِ محشر میں — منتظر ہوں کہ کوئی پہچانے
پا گئے جوشِ شباب میں ترکیب — ہیں وہی بے پناہ افسانے
مُنہ لگوں کی خرابیاں، توبہ! — ٹھوکروں میں پڑے ہیں پیمانے
اَب کہاں پرسشِ پرستاراں — چند روزہ ہیں یہ صنم خانے
سِسکیاں بھر رہی ہیں قندیلیں — کروٹیں لے رہے ہیں پروانے
یاس و اُمید کے دوراہے پر — سر جھکائے کھڑے ہیں دیوانے
شورشِ انقلاب زندہ باد — دم بخود ہیں بُلند کاشانے
کیا عجب دل جلوں کی تربت پر — شمع لا کر جلائیں پروانے
تھک کے بیٹھے ہیں کوئے جاناں میں — تازہ دم ہو رہے ہیں دیوانے

مل گیا عِشق کا صِلہ سرشار
ہو گئے بیکسی سے یارانے



جذباتِ نجم

(از حضرت نجمؔ آفندی)

دے کے دل میں بیقرار دیکھتا چلا گیا — دُور تک نگاہِ یار دیکھتا چلا گیا

اُس کو راہِ عشق پر لے کے آئے بھی تو کیا — اپنے حُسن کی بہار دیکھتا چلا گیا

چھیننے کی چیز تھا میرا عزمِ مستقل — انقلابِ روزگار دیکھتا چلا گیا

موت نے اُتار لی جب نقابِ زندگی — زندگی کا پردہ دار دیکھتا چلا گیا

کیا ضرور تھا کہ وہ غم کی بات پوچھ لے — دو جہاں کا غم نثار دیکھتا چلا گیا

کائناتِ حُسن تھی آئینہ در آئینہ — میں بہار در بہار دیکھتا چلا گیا

آئیں گے ضرور وہ اُن سے یوں کہے کوئی — اُن کی راہ جاں نثار دیکھتا چلا گیا

زندگی بھی خواب تھا اے خراب زندگی — خوشگوار و ناگوار دیکھتا چلا گیا

آہ کر رہا تھا جو سانس بھی نہ لے سکا — فیض جبر و اختیار دیکھتا چلا گیا

پھر خمارِ غم ہوا غم کو پھر نظر لگی — پھر مجھے ستم شعار دیکھتا چلا گیا

عید ہی سہی مگر میکدہ میں ہم نہ تھے
نجمؔ ابرِ نو بہار دیکھتا چلا گیا۔

ادھیڑ عمر کی آفتیں

از مسٹر جے۔ آر۔ رائے

ادھیڑ عمر میں بڑھاپے کا انسداد مغربی اصول کے رُو سے ادھیڑ عمر چالیسویں برس سے شروع ہوتی اور ساٹھویں سال میں ختم ہوجاتی ہے۔ اس زمانۂ عمر کی اہمیت پر خاطر خواہ زور دینا اور اس کی ضرورت جتانا دشوار ہے۔ ادھیڑ عمر کی بے احتیاطی یا پیش بندی کا بقیّہ ماندہ عمر پر نہایت گہرا اور دیرپا اثر پڑتا ہے۔ آپ چاہیں تو اس عمر میں بڑھاپے کے اثرات کی بہت کچھ روک تھام کرکے عرصے تک زندگی سے لطف اُٹھا سکتے ہیں۔

زمانۂ زوال کا آغاز جسمانی نمو کے بعد ادھیڑ عمر جسمانی زوال کا زمانہ ہے۔ آپ کی جسمانی نشو و نما پچیسویں سال میں تمام ہوجاتی ہے۔ مگر دماغ پینتیس سال کی عمر تک بڑھتا رہتا ہے اور چالیس برس سے پہلے پہلے یہ اپنی اصلی پختگی سے روشناس ہوچکتا ہے۔ اسی وجہ سے انگریزی میں یہ کہاوت مشہور ہے "چالیسویں برس یا تو انسان دانا ہوجاتا ہے یا نادان"۔ چالیس برس کے بعد معمولی آدمیوں کی جسمانی اور عقلی طاقت زوال پذیر ہوجاتی ہے اور جو لوگ جوانی کو اپنی نادانیوں سے برباد کردیتے ہیں۔ اُن کا تو چالیس سال کے بعد بڑھاپا شروع ہوجاتا ہے۔ پچاس برس کے لگ بھگ جم راج کے دُوت آپ کے درِ دولت پر اسی طرح آن موجود ہوتے ہیں جیسے کچہری کے پیادے ڈگریدار کا پروانہ لے کر روپیہ طلب کرنے آجاتے ہیں۔

ادھیڑ عمر کی بیماریاں بھی نرالی ہوتی ہیں۔ جن کا آپ کو جوانی میں تجربہ ہی نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ یہ اُسی دَور میں آدمی کو پریشان کرتی ہیں۔ ادھیڑ عمر میں صرف جسمانی تغیر ہی نہیں، بلکہ روحانی اور نفسیاتی انقلاب بھی واقع ہوتا ہے اور اسی لئے اُس زمانہ میں انقلابِ عظیم ہوتا ہے۔ کون کون سی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ یہاں پر اُن کا اجمالی ذکر کیا جاتا ہے

سب سے پہلے اس بات کو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ ادھیڑ عمر سے جسمانی اور عقلی نشو و نما تمام ہوجاتا ہے۔ عقل اور جسمانی طاقتوں کی پختگی سے زندگی کا لُطف پہلے سے کئی گنا زیادہ ہوجاتا ہے۔ اگر جوانی میں اپنی طاقتیں ضائع نہ کردی گئی ہوں تو ادھیڑ عمر میں زندگی کا لُطف بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ادھیڑ عمر میں جو طبعی تبدیلیاں ہوتی ہیں، اُن میں حسب ذیل قابلِ ذکر ہیں:-

(۱)۔ جسم کے اندر چربی جمع ہوجاتی ہے، جس سے مرد اور عورتیں دونوں بھاری بھرکم ہوجاتے ہیں۔ چالیس برس

سے پہلے بمشکل پچیس فیصدی آدمی موٹے ہوتے ہیں۔ مگر ادھیڑ عمر میں نرم معدہ کی دیواروں کے اندر چربی جمع ہونے سے بدن موٹا ہو جاتا ہے۔ عورتوں کی کمر اور کولہے موٹے ہو جاتے ہیں اور سینہ اُبھر آتا ہے۔ اکثر مردوں کے پیٹ بڑھ جاتے ہیں۔ دُبلے آدمیوں کا پیٹ بھی کچھ بڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

(۲) جلد کی لچک جاتی رہتی ہے۔ اس وجہ سے چہرے کی صورت متین ہو جاتی ہے۔ حالانکہ جوانی میں یہ بدلتی رہتی ہے۔ چہرے پر جھُریاں پڑ جاتی ہیں۔

(۳) بالوں اور ناخنوں کی رنگت بدل جاتی ہے۔ آجکل خالص غذا میسر نہ آنے اور نظام اعصاب کی کمزوری سے بال جلد سفید ہو جاتے ہیں۔ چہرے کی رونق جوانی ہی میں رخصت ہو جاتی ہے، لیکن چالیس برس کے بعد بالوں اور ناخنوں کی رنگت پہلے سے بھی زیادہ بگڑ جاتی ہے۔ بال پتلے، ناخن لمبے اور موٹے ہو جاتے ہیں۔

(۴) عضلات کی فطری طاقت میں فرق آجاتا ہے۔ اس کا بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ ریشوں کے شمار میں کمی واقع ہو جاتی ہے، اور اُن کے اندر چربی بھرنے لگتی ہے۔

(۵) جوڑوں میں چکنائی دار مادہ کی مقدار گھٹ جانے سے تبدیلی ہو جاتی ہے۔ جوڑوں کی ٹوپیوں میں چاک ایسی چیز جمع ہونے لگتی ہے۔ جوڑوں کے مفصل میں جو بافتیں ہوتی ہیں، اُن میں بھی چاک ایسی چیز پیدا ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جوڑ اپنی لچک کھو بیٹھتے ہیں۔ اینٹھن ہونے لگتی ہے۔ جس کے سبب سے بعض آدمیوں کو گٹھیا وغیرہ امراض لاحق ہو جاتے ہیں۔ کئی اور قسم کے درد بھی ادھیڑ عمر ہی میں رونما ہوتے ہیں جن سے شباب نا آشنا ہوتا ہے۔

دل میں انقلاب مذکورۂ بالا تبدیلیوں کا فطری سبب یہ ہوتا ہے کہ جسم سے زہر بخوبی خارج نہیں ہوتا۔ باہر سے بھی زہر داخل ہوتا رہتا ہے، جس کا سب سے بڑا منبع غذا ہے۔ اس دور میں آپ کی رغبت ایسی چیزوں کی طرف رہتی ہے۔ جس سے زہر کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔

مگر سب سے بڑا انقلاب دِل کی فطری ساخت میں واقع ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے شرائین بھی اثر پذیر ہو جاتی ہیں۔ اُن کی لچک مفقود ہو جاتی ہے۔ اور ریشہ دار بافتیں ظہور میں آتی ہیں۔ عمر کے ساتھ دِل کی طاقت بھی گھٹ جاتی ہے۔ اگر دل پر خلاف معمول بار گراں پڑے تو وہ اُسے برداشت نہیں کرتا۔ اس سے اختلاجِ قلب (دھڑکن) پیدا ہوتا ہے۔ اِس وجہ سے وہ تمام ورزشیں جو آپ جوانی میں کرتے ہیں مثلاً دوڑنا، فٹ بال، ڈنڈ نکالنا، دوڑ کر چڑھائی اُترائی طے کرنا، یا تو بالکل ترک یا کم کرنا پڑتا ہے۔ اگر آپ لاپرواہی کرتے ہیں تو دِل کی فطری ساخت کو سخت نقصان پہونچتا ہے۔

اِس بات کو یاد رکھنا چاہیئے کہ جس رگ کے ذریعہ سے دِل میں خون آتا ہے وہ سخت ہو جاتی ہے۔ جس سے کئی قباحتیں لاحق ہو جاتی ہیں۔ دماغ کے اندر کی شرائین میں فرق پیدا ہو جاتا ہے جس سے خون کی بہم رسانی کم ہو جاتی ہے

سینے اور گردوں کی رگوں میں بھی تبدیلی ہوجاتی ہے۔ جس سے کئی امراض سینہ اور گردہ ظہور میں آتے ہیں۔ حالانکہ جوانی میں آپ ان سے ناآشنا رہتے ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ جب دماغ، سینہ اور گردہ میں تازہ پاک خون معقول مقدار میں نہ جائے تو حافظہ کمزور، پھیپھڑے نربل اور گردے گرسنہ رہتے ہیں وہ اپنے جبلّی افعال بخوبی انجام نہ دے سکیں گے۔ تھوڑی سی مشقت سے سانس اُکھڑنا یا پیشاب کے متعلق شکایات پیدا ہونا شروع ہوجاتی ہیں۔ کنپٹی، کہنی اور بازو کی رسّی جیسی اُبھری ہوئی رگیں اس امر پر دال ہیں کہ دل کی سب سے بڑی رگ سخت ہوگئی ہے اس سے دل کی کمزوری اور خفقان وغیرہ پیدا ہوجاتا ہے۔ بعبارت دیگر اس سے یہ مراد ہے کہ جس آدمی کی رگیں سخت ہوجاتی ہیں وہ امراض قلبی کا شکار ہونے لگتا ہے۔

پھیپھڑوں کی سختی | پھیپھڑوں کی طبعی لچک جو لڑکپن اور جوانی میں پائی جاتی ہے، ادھیڑ عمر میں ختم ہوجاتی ہے اور وہ سخت ہوجاتے ہیں۔ ذرا سی محنت کرنے یا تیز چلنے سے سانس پھولنے لگتا ہے پھیپھڑوں کی بافتیں پھیل جاتی ہیں۔ چھاتی کے پھیلنے اور سکڑنے کی جبلّی صلاحیت میں نقص پیدا ہونے اور پسلیوں اور سینہ کی دیواروں کے پٹھے اکڑنے کے سبب سے یہ تکلیف اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ ہوا کی نالی میں رطوبت پیدا ہونا موقوف ہوجاتی ہے۔ اسی لئے کھانسی کا ٹھسکا شروع ہوجاتا ہے اور کف خارج ہونے میں دقّت ہونے لگتی ہے اس وجہ سے بار بار کھانسنا پڑتا ہے۔ تب بلغم خارج ہوتا ہے اور یہ تکلیف سال بسال بڑھتی ہی جاتی ہے۔

قبض کی آفت | ادھیڑ عمر کی تمام آفتوں میں قبض سب سے بڑی آفت ہے، جس سے صحت خراب، تنومندی برباد اور لطف زندگی کرکرا ہوجاتا ہے۔ بڑھاپے کی روک تھام ناممکن ہے۔ مگر قبض کی وجہ سے بڑھاپا بڑی تیزی سے آتا ہے، ادھیڑ عمر کی قبض کے اسباب میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں۔

دانت خراب ہونے سے غذا خوب چبا کر کھانا دشوار ہوجاتا ہے۔ اور معدہ کی طاقت پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ غذا کی نالی میں تبدیلیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ ایسڈ اور خمیر پیدا کرنے والی گلٹیوں میں رطوبت پیدا کرنے کی فطری طاقت کی کمی وبیشی کے باعث یہ تغیر واقع ہوتا ہے اس سے غذا ہضم نہیں ہوتی۔ قبض ہوجاتا ہے۔ اور معدہ کے اندر دیر تک فضلہ پڑا رہنے کا سب سے مضر اثر نظام اعصاب (ناڑی چکر) پر ہوتا ہے۔ جس سے جسم کی عام کمزوری پیدا ہوجاتی ہے۔ ادھیڑ عمر میں پاخانہ کی حاجت کے وقت سستی کرنے سے انتڑیوں کے نچلے حصے میں بے حسی پیدا ہوجاتی ہے۔ جو چربی کے اجتماع سے بڑھتی رہتی ہے۔

جگر کے فعل کا واسطہ ہاضمہ سے | ادھیڑ عمر کی تمام تکلیفوں میں جگر کے فعل کا ڈبل حصہ ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جگر کے اندر پت (صفرا۔ بائل) پیدا ہوکر باریک نالیوں کے راستہ سے معدہ میں پہونچتا ہے جس سے غذا ہضم ہوتی ہے علاوہ ازیں جگر کا ایک بڑا کام زہر خارج کرنا بھی ہے۔ ادھیڑ عمر کے طبعی تغیرات سے جگر کے پت پیدا اور زہر خارج کرنے کے

فطری فعل میں رخنہ واقع ہو جاتا ہے۔ جس سے صحت اور توانائی پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ صفرا کی نالی میں سوزش ہوتی ہے اس سے پتّہ کی پتھری (گالی اسٹون) بنتی ہے۔ اسی سے ادھیڑ عمر کی عورتیں دُکھ پاتی ہیں۔ جگر سے پت پیدا اور خارج ہو کر پتّہ میں جمع ہوتی رہتی ہے۔ لیکن جب پت کے اخراج میں رکاوٹ پیدا ہو جائے تو پتّہ میں پتھری بنتی ہے۔ جس سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ جگر کے لازمی خلیات میں ریشہ دار بافتوں کے ظہور سے جگر سخت ہو جاتا ہے، لیکن مردوں کے جگر اتنے سخت نہیں ہوتے۔ جتنے کہ عورتوں کے۔ اسی وجہ سے وہ زیادہ تکلیف اُٹھاتی ہیں۔

گردوں کی اندرونی تبدیلیاں ایسی نامعلوم ہوتی ہیں۔ کہ اگر اُن کا خاص خیال نہ رکھا جائے تو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ مثلاً اگر کئی بار پیشاب آئے یا سر میں درد ہو۔ طبیعت میں کسل اور معمولی چیزوں سے بیزاری پیدا ہو یا جسم تھوڑی سی محنت بھی برداشت نہ کر سکے۔ تو کسی ہوشیار ڈاکٹر کو یا اسپتال میں پیشاب اور خون کے دباؤ وغیرہ کی رفتار کا معائنہ کرانا چاہئے ادھیڑ عمر میں خون کے دباؤ (Blood Pressure) کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ جس کا ایک بڑا سبب دل کے اندر خون بہم پہونچانے والی رگ کی سختی ہے۔ اس کے ساتھ ہی گردوں میں بھی نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں، چونکہ کچھ دنوں سے اکثر لوگ اس شکایت کے شکار ہو رہے ہیں۔ اس لئے یہاں پر اُس کا اجمالی ذکر نامناسب نہ ہوگا۔ دل، گوشت، رگوں اور پٹھوں کا بنا ہوا لوتھڑا ہے۔ جس کی عضلاتی دیواریں پے در پے سُکڑتی اور پھیلتی ہیں۔ جب دل سُکڑتا ہے تو خون باہر نکلتا اور شریانوں میں بہتا چلا جاتا ہے۔ اس بہاؤ کا رگوں کے اندر دباؤ ہوتا ہے، جب دل پھیلتا ہے تو وریدوں کا کثیف خون اس کے اندر آتا ہے۔ اُس وقت رگوں کے اندر خون کا دباؤ کم ہو جاتا ہے، خون کی مقدار کے تناسب ہی سے رگوں میں خون کے بہاؤ کا دباؤ ہوتا ہے۔ ایک سکنڈ میں دل ایک بار حرکت کرتا ہے رگوں کے اندر خون ہر وقت بھرا رہتا ہے۔ دل کے سُکڑتے وقت خون باہر نکلتا ہے۔ جس سے رگوں کے اندر کے خون پر ایک ایک لمحہ کے بعد دباؤ پڑتا رہتا ہے۔ دل کے پھیلنے سے یہ دباؤ کم ہوتا ہے۔ گویا نبض کی حرکت کے ساتھ خون کے بہاؤ میں تیزی اور سُستی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ دل کے سُکڑنے اور پھیلنے سے رگوں کے خون کے بہاؤ کے چڑھاؤ اُتار کی (۸۰) اور (۱۳۰) حرکات ہوتی ہیں۔ اگر اس سے بڑھ جائے، تو گویا دل پر بار گراں پڑ گیا۔ جس سے اُس کے جلد ناکارہ ہو جانے کا خوف پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر خون کے طبعی بہاؤ میں سُستی آجائے تو اطراف جسم کے بافتوں کو خون میسر نہ آئے گا۔ اس سے کئی قباحتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ خون کے بہاؤ کی تیزی کا سبب یہ ہوتا ہے کہ دل اور گردے اور شریانوں کی طبعی حالت میں خاص نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر بہاؤ کی تیزی مستقل صورت اختیار کرے۔ تو شریانوں کے پھٹنے کا اتنا احتمال نہیں ہوتا۔ جتنا کہ خود دل اور گردہ کے ناکارہ ہو جانیکا اندیشہ ہو جاتا ہے اس سے زندگی کا چراغ بھی گُل ہو جاتا ہے۔ خون کے بہاؤ کی تیزی کا پہلا سبب رگوں کے اندر چونہ جمع ہو جانا اور دوسرا نظام اعصاب کی خاص کمزوری ہے۔ بخار کے بغیر نبض کی تیزی خون کے بہاؤ کی تیزی کا نشان ہے۔

نظام اعصاب میں تغیر ذہنی اور جذباتی ہے۔ فکر و تردد کا ذہنی طاقت پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ اگر شریانوں کے اندر چونہ جمع ہونے لگے اور خون کے بہاؤ میں تیزی پیدا ہو جائے، تو نظام اعصاب کی اثر پذیر ساخت پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے اور اگر کچھ بھی نہ ہو۔ تو بھی زہریلے مادہ کے جمع ہونے سے بہت بُرے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے عصبی ناتوانی، دماغی کمزوری، نیند نہ آنا۔

ادھیڑ عمر کی عورتوں میں عجیب و غریب تغیر پیدا ہوتا ہے۔ عورتوں کی کثیر تعداد میں پینتالیس ۴۵ برس کے بعد اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی اور بہت سی عورتیں تو چالیسویں سال کے بعد ہی کئی قسم کی شکایات میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ رحم کی کمزوری اور ایام ماہوار کی بے قاعدگی سے اکثر عورتوں کو سخت تکلیف ملتی ہے۔ جسم میں کئی قسم کے درد پیدا ہو جاتے ہیں۔ عورت کے رحم کے ساتھ جو ٹھوس گلٹی پیوست ہوتی ہے۔ اُس کا غدہ درقیہ سے خاص تعلق ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسرے ٹھوس غددوں کی مُفید رطوبت کا اثر رحم پر بہت گہرا پڑتا ہے۔ اسکے برعکس مردوں میں اولاد پیدا کرنے کی قوت عرصے تک قائم رہتی ہے۔ مگر عورتیں پینتالیس ۴۵ سال کے بعد اس طاقت سے محروم ہو جاتی ہیں۔ مگر مرد کے آلۂ تولید کی گلٹیاں بھی ادھیڑ عمر میں زوال پذیر ہونے لگتی ہیں۔ جس سے طاقتِ رجوعیت بھی کمزور ہو جاتی ہے۔

ادھیڑ عمر کی آفتوں کا انسداد مذکورہ بالا آفتوں کی مختصر فہرست پڑھنے کے بعد ناظرین کے دل میں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوگا کہ کیا ان آفتوں سے بچنا ممکن ہے؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ ذیل کی ہدایتوں پر عمل کرنے سے آپ ان مصیبتوں سے بہت کچھ محفوظ رہ سکتے ہیں۔ تیس چالیس سال کی عمر والے اصحاب اپنی آئندہ زندگی کی اصلاح کر کے ادھیڑ عمر اور بڑھاپے کی آفتوں کو بہت کچھ ٹال بھی سکتے ہیں۔ یہاں پر یہ بھی گذارش کر دینا ضروری ہے کہ راقم نے مدت العمر کے تجربے سے ان باتوں کو مُفید پایا ہے اور ان مصیبتوں سے خلاصی حاصل کر چکا ہے اور آج بھی پچیس ۲۵ سال کے جوانوں کی طرح دماغی اور جسمانی کام کر سکتا ہے۔ پیدل چلنے میں آج تک کوئی آدمی مجھے مات نہیں دے سکا۔ اور جسمانی محنت میں دیہاتی بھی میری برابری نہیں کر سکتے۔ بہرحال میری حکمت میرے تیس ۳۰ سالہ تجربات اور تحقیقات سے ماخوذ ہے۔

(۱) سب سے مقدم اِس بات کو سمجھ لینا چاہئے کہ جوانی کی زندہ دلی اور ہنسنے کھیلنے، چلنے پھرنے، کھانے پینے کی عادتیں قائم رکھیئے۔ اور ادھیڑ عمر کی کاہلی اور کسل سے بچے رہنے سے ادھیڑ عمر اور بڑھاپے کی مصیبتوں کی بہت کچھ روک تھام ہو سکتی ہے۔

(۲) اپنے معمولات بدل ڈالئے۔ خواہ کھانے پینے کے بارہ میں ہوں یا کام کاج کے متعلق۔ روزانہ معمول کی پابندی سے جسمانی اور دماغی تومندی اور صحت برباد ہو جاتی ہے۔ نت نیا مشغلہ اور نئی چال اور نیا ڈھنگ ہو۔ تاکہ ایک ہی ڈگر پر چلنے کی مضرتوں سے بچے رہیں۔ نئی دلچسپی اور نئے شغل اور دِل بہلاؤ کے نئے سامان سے دل و دماغ کو ترو تازگی اور تحریک ملتی ہے۔ جس راستہ یا بازار سے آپ کا روزانہ گذر ہوتا ہے، اس کی ہر ایک چیز معمولی معلوم ہونے لگتی ہے،

اور سیر و تفریح کا لطف باقی نہیں رہتا ہے۔ ذہن بھی کند اور طبیعت سیر ہوجاتی ہے۔ اس سے نفسیاتی نقصانات بھی ہوتے ہیں۔ حالانکہ ضرورت دماغی اور جسمانی تحریک کی ہے جس سے صحت و تندرستی کو ترقی حاصل ہو۔

(۳) اس بات کو مدنظر رکھنا چاہیے کہ ادھیڑ عمر میں خوراک جسمانی نمو کے لئے نہیں بلکہ بافتوں کی شکست و ہزیمت کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ اس لئے صرف اسی قدر کھانا چاہیے جتنا بآسانی ہضم ہوسکے۔ بہت کھانے سے طاقت حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ ہضم کرکے جزو بدن بنانے سے توانائی آتی ہے۔ اس بات کو فراموش نہ کرنا چاہیے۔ اگر آپ اس دور میں چٹ پٹی چیزیں کھانے کی خواہش کو روکنے کی کوشش نہ کریں گے تو آپ اتنی غذا کھائیں گے۔ جسے ہضم کرنا دشوار ہوگا۔ اس لئے یہ مناسب ہے کہ سادہ اور تھوڑی غذا کھائیے جو جلد ہضم ہوجائے اور آپکی توانائی بھی قائم رہے۔ بہر حال خوراک طاقت دینے والی ہو۔ پھل۔ سبزی۔ ساگ اس کا لازمی جزو ہو۔ روٹیاں لال اور سخت گیہوں کے موٹے آٹے کی ہوں۔ باریک آٹے سے معدے میں بہت سی خرابیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ مثلاً نفخ اور قبض وغیرہ۔

(۴) خوب نہانا چاہیے۔ تاکہ جسم کے اندر کا زہریلا مادہ جو ادھیڑ عمر کے جسمانی انقلاب سے بہت زیادہ پیدا ہونے لگتا ہے۔ بآسانی خارج ہوتا رہے۔ جلد کی صحت جسمانی تندرستی کے لئے بیحد ضروری ہوتی ہے۔ ورزش کے بغیر جلد عمدہ حالت میں نہیں رہ سکتی۔ اس لئے دونوں وقت اگر کچھ نہ ہوسکے۔ تو ڈیڑھ تین میل پیدل ہوا خوری کر لینا چاہیے۔ ڈنڈ اور دوڑنا بھی اچھی ورزشیں ہیں۔ مگر اتنا تیز نہ دوڑنا چاہیے کہ سانس اکھڑ جائے۔

(۵) اس بات کو بھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ قبض سے ساٹھ ستر امراض پیدا ہوجاتے ہیں۔ صحت و تندرستی کا سب سے بڑا دشمن قبض ہے۔ ادھیڑ عمر میں یہ بہت ستاتا ہے۔ اس لئے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ قبض کبھی نہ رہنے پائے۔ کیونکہ اس سے آپ کی تندرستی برباد ہوجائے گی۔ اس لئے ساگ پات، ترکاریاں اور پھل بکثرت کھانے چاہئیں۔ صبح و شام ہوا خوری کیجئے۔ ہر بات میں قاعدہ اور اعتدال مدنظر رکھئے۔ ورنہ آپ کی صحت کا ستیاناس ہوجائے گا اور آپ طرح طرح کی شکایات میں مبتلا رہیں گے۔ اگر قبض سے زیادہ تکلیف ہو، تو کسی تجربہ کار معالج سے رجوع لانا چاہیے۔ علمی مشاغل والوں کو زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ کیونکہ وہ آئے دن اس کا شکار رہتے ہیں۔

(۶) نظام اعصاب | اس بات کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ تازہ ڈاکٹری تحقیقات کی رو سے انسان کی زندگی اور تندرستی کا دار و مدار تمام تر نظام اعصاب کی صحت پر موقوف ہے۔ ذہن، خیالات کی اپج۔ غور و فکر اور پرواز تخیل۔ تندرستی اور اخلاقی کیفیات سب کی سب نظام اعصاب کی بدولت ظہور میں آتی ہیں۔ اس لئے یہ بہت ضروری ہے کہ نظام عصبی عمدہ حالت میں رہے۔ قبض اور بدہضمی اور ہر قسم کی بے اعتدالی نظام عصبی کی دشمن ہیں

اگر عرصہ تک لطفِ زندگی حاصل کرنے کی تمنا ہو۔ تو نظامِ عصبی کی صحت کا سب سے زیادہ خیال رکھنا چاہئیے۔ مقوی غذا کے علاوہ عصبی مقویات بھی کھانا بیحد ضروری ہے۔

(۷) معدہ فضلہ سے جہاں تک پاک رہ سکے بہتر ہے۔ جلد غسل سے درست رہتی ہے۔ اور گردوں کے فعل میں بھی کوئی نقص واقع نہ ہونے پائے۔ کبھی پیٹ بھر کھانا نہ چاہئیے۔ بلکہ تھوڑی بھوک باقی رکھ کر کھانے سے ہاتھ کھینچ لینا چاہئیے۔ سونے کیلئے کافی وقت دینا ضروری ہے' اس سے دماغ تر وتازہ رہتا ہے۔ نئی دلبستگیوں سے بھی دماغی طاقت کو تازگی دیتے رہنا اور فضول فکر و تردد سے بچنا چاہئیے۔ ان باتوں کا لحاظ رکھنے سے ہر شخص ادھیڑ عمر کی آفتوں سے بہت کچھ محفوظ رہ سکتا ہے۔

جوانی کی طاقتوں کی بحالی آخیر میں اس دلچسپ سوال پر مختصر بحث کرنا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ کیا کھوئی ہوئی جوانی دوبارہ حاصل ہوسکتی ہے"؟ پنڈت مدن موہن صاحب مالوی کے "علاج کایا کلپ" کے بعد یہ سوال بڑا دلچسپ بن گیا ہے۔ کایاکلپ کی ماہیت پر روشنی ڈالنا تو میری طاقت سے باہر ہے۔ مگر میرے تجربے میں جو کچھ آیا ہے اُسکے بیان کرنے میں تامل نہیں۔

بیس پچیس برس ہوئے۔ ایک انگریزی کتاب "دوامی زندگی"[ل] پڑھتے وقت میرے دل میں یہ سوال پیدا ہوا تھا۔ کہ کیا انسان اپنی جوانی برقرار رکھ سکتا ہے۔ اُس وقت میں بھی جوانی کے عالم میں تھا۔ چنانچہ سوچ بچار کے بعد تجربے شروع کئے۔ دس بارہ برس ہوئے ادھیڑ عمر کی آفتوں کی جھپیٹ میں آگیا۔ مگر دو چار برس کی کوشش کے بعد اُن سے بچ نکلا اور ابھی تک اُن سے محفوظ ہوں۔ میرے جوانی کے مشاغل میں ابھی تک کوئی فرق نہیں آیا۔ البتہ فطرتِ انسانی کی اخلاقی کمزوریوں کے احساس کا طبیعت پر ضرور ناخوشگوار اثر پڑا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں (۱) غذا (۲) ورزش (۳) باقاعدگی کا لحاظ رکھا ہے اور بعض خاص ادویات استعمال کی ہیں۔ جن کی بدولت جوانی بحال ہوگئی ہے۔

رشیوں کی جدت طرازی یہاں پر یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ شروع زمانہ سے آدمی کو سدا بہار جوانی کی ہوس رہی ہے۔ چنانچہ رسائن، امرت، سنجیونی، آبِ حیات اور اکسیر اعظم اسی خواہش کا نتیجہ ہیں۔ ان کے متعلق بیسوں افسانے مشہور ہیں۔ مہابھارت میں چیون رشی کا قصہ ملتا ہے۔ جس نے بڑھاپے میں راجکماریوں سے بیاہ رچایا تھا۔ اور اشونی کمار (سورگ دیس کے وید) نے اپنی حکمت سے ایک رسائن تیار کر کے اُسے کھلائی تھی۔ جس سے وہ جوان ہوگیا۔ اس رسائن کا نام چیون پراش ہے۔ جسمیں تیل۔ گھی۔ شہد سمیت چالیس چیزیں پڑتی ہیں۔ اور ایک ہوشیار وید ہی تیار کر سکتا ہے۔ آٹھ دس برس کا ذکر ہے کہ سورگباشی سر جگدیش چندر بوس دارجیلنگ کے قریب سے کوئی بوٹی لائے تھے۔ جس سے اُنھوں نے ایک مُردہ مینڈک زندہ کیا تھا۔ بعض بعض سنیاسی مہاتماؤں کو بھی عجیب قسم کی بوٹیاں معلوم ہوتی ہیں۔ جن سے لاعلاج امراض جھٹ پٹ اچھے ہوجاتے ہیں

ل How to Live for ever.

بعض انجان آدمیوں کو ایسی چیزیں معلوم ہیں۔ جن سے ایسے ناسور جنھیں ڈاکٹر اور وئید اچھا نہیں کر سکتے، جاتے رہتے ہیں

جنسی گلٹی کی تجدید | پچیس برس ہوئے۔ آسٹریا کے ایک ماہر اسٹارناک نے سفید چوہوں پر تجربے شروع کئے۔ اُس کا خیال تھا کہ بڑھاپے میں جان داروں کی مادہ کی طرف جانے کی خواہش مردہ ہو جاتی ہے اور اُن کی چستی چالاکی بھی جاتی رہتی ہے۔ اس وجہ سے اُس نے یہ قرار دیا کہ اگر جنسی خواہش پھر سے بحال ہو جائے تو تندرستی اور چستی بحال ہو سکتی ہے۔ بڈھے چوہوں کے بعد بڈھے کتوں اور بیلوں پر تجربے کر کے اسٹارناک نے اپنا خیال درست ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اور جب اُسے اسمیں کامیابی ہوئی تو اُس نے بڈھے آدمیوں پر بھی تجربے کئے۔ بقول "سائنس آف لائف" "چند مہینوں کے بعد چوہوں کی حالت پہلے بدتر ہو جاتی ہے۔ اس لئے پھر سے انمیں گلٹی کا پیوند چڑھانا پڑتا ہے۔ بہرحال جنسی گلٹی کی تجدید کے باوجود ہمارے جسم کا ایک حصہ بڑھاپے کا شکار ہوتا چلا جاتا ہے اس سے مُراد نظام عصبی ہے۔ دماغ کے خلیات کا شمار نہیں بڑھتا۔ جنم دن سے لے کر مرتے وقت تک وہ یکساں رہتے ہیں۔ بلکہ بڑھاپے میں سکڑ جاتے ہیں"۔ یہ مغربی سائنس کا قول ہے۔ تاہم بندر کی گلٹی کے پیوند سے جوانی بحال کرنا اسٹارناک کی انوکھی اختراع ہے۔ مگر انسان کا علم ہمیشہ بڑھتا رہتا ہے۔ ڈاکٹری سائنس نا تمام اور اُدھوری ہے۔ کیونکہ اسے اب تک انسانی جسم کے تمام اسرار معلوم نہیں ہوئے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئیے کہ جسم جیو آتما کا آلۂ کار ہے۔ جس نسبت سے آپ کو اپنے جسم پر قابو ہوگا۔ اُسی نسبت سے آپ میں بل بوتہ ہوگا۔

"تیج ویکلی" افسانہ نمبر

تیج ویکلی کا ۱۹۳۹ء کا پہلا پرچہ افسانہ نمبر کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ یہ پرچہ خاص طور پر دلچسپ ہوتا ہے چنانچہ اس سال کے افسانہ نمبر میں بھی ملک کے بعض بہترین لکھنے والے ادیبوں کے افسانے درج ہیں اور چند منظوم افسانے بھی ہیں۔ جس سے اس پرچہ کی رونق دو چند ہو گئی ہے۔ درجنوں تصویریں اور ایک دلچسپ کارٹون بھی ہے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود اس نمبر کی قیمت ۲ آنہ ہے۔ شائقین منیجر تیج ویکلی دہلی سے طلب کریں۔

رتن (تعلیم نمبر)

کئی سال سے کشمیر ریاست کے شاہزادہ ولیعہد کے نام سے "رتن" نامی ایک دلچسپ بچوں کا رسالہ شائع ہو رہا ہے۔ دسمبر ۱۹۳۸ء کا پرچہ خاص اہتمام سے "ایجوکیشن نمبر" کے نام سے نکلا ہے۔ جسمیں مختلف سربرآوردہ حضرات کے پیغامات کے علاوہ بچوں کی دلچسپی کے کئی خاص مضامین نظم و نثر ہیں۔ اس نمبر میں وار دھا اسکیم کی حمایت میں جو ریاست کشمیر کے بعض اسکولوں میں رائج کی گئی ہے کئی قابل قدر مضامین درج ہیں۔

شائقین مینجر رسالہ رتن دربار گڈھ روڈ جموں سے طلب فرمائیں۔

گنگا اشنان

(از حضرت اختر بریلوی)

اشنان کا تھا قابلِ نظّارہ نظارا
فردوس در آغوش تھا گنگا کا کنارا

گنگا کی اُبھرتی ہوئی موجوں کا تبسّم
پیدا کئے دیتا تھا نظارے سے نظارا

دم بھر کو اُسے چین نہ آتا تھا میسّر
پانی نظر آتا تھا جھلکتا ہوا پارا

اک گھاٹ پہ اشنان میں مشغول تھے سب مرد
اک گھاٹ پہ سب قاف کی پریاں تھیں صف آرا

پانی سے جھجکتی تھی کوئی کمسن و ناداں
شرماتی تھی مجمع سے کوئی انجمن آرا

ہر گام پہ رُک رُک کے وہ پانی میں اُترنا
لے لے کے کسی اپنی سہیلی کا سہارا

ناتجربہ کاروں کا وہ پانی سے لرزنا
چُھٹنا نہ کبھی ہاتھ سے گنگا کا کنارا

طرّار حسینوں کی وہ پانی میں شرارت
کر جانا وہ گنگا کے کنارے سے کنارا

پانی میں اُچھل کود سے ہنگامہ بپا تھا
بپھری ہوئی ہر موج تھی بہتا ہوا دھارا

پانی سے نکلنے کا سماں بھی تھا دل آویز
چُٹکی میں دبائے ہوئے ساری کا کنارا

سردی کے تشدّد سے لرزتا ہوا پیکر
لیتا تھا عجب ناز سے خیمے کا سہارا

ہر سمت پریشاں تھے نظارے ہی نظارے
چلتا بھلا کس کس پہ ان آنکھوں کا اجارا

غروبِ آفتاب

(از جناب اختر ہوشیار پوری، بی۔ اے۔)

شام ہے گلرنگ جلوے ہیں فلک پر آشکار
آشیانوں کو اُڑے جاتے ہیں طائر بے شمار

آ رہے ہیں ہَل لئے دہقان کچھ گاتے ہوئے
راستوں کے پیچ و خم پر پیچ و خم کھاتے ہوئے

مشعلِ خورشید مدھم ہو رہی ہے دمبدم
ہوتی جاتی ہے فضا میں روشنی ہر لحظہ کم

آسماں پر اک صباحت ہے زمیں خاموش ہے
پتی پتی گلستانِ دہر کی مدہوش ہے

نرم رَو دریا میں ہے موجوں کو نیند آئی ہوئی
ہے عروسِ شب نے اپنی زلف بکھرائی ہوئی

لگ گئی چُپ طائروں کو۔ نور مدھم ہو گیا
اس طرح محسوس ہوتا ہے کہ جنگل سو گیا

دُور کی آبادیاں دھندلی نظر آنے لگیں
ظلمتیں میدان میں آکر جال پھیلانے لگیں

شاخساروں میں اندھیرا بڑھ رہا ہے دمبدم
ڈگمگاتے ہیں رہِ ظلمت میں جلوؤں کے قدم

ذرہ ذرہ تیرگی کے دام میں محبوس ہے
دلنشیں رنگیں مناظر سے نظر مایوس ہے

آسمانوں پر شفق کا رنگ ہے چھایا ہوا
احمریں دریا ہو جیسے جوش پہ آیا ہوا

بدلیوں سے چھن رہی ہیں اس طرح رنگینیاں
دل میں کیفیت ہے لیکن ہو نہیں سکتی بیاں

روحِ شادابی ہو شمعِ ضو ہو جانِ نُور ہو
یہ بتاؤ دیدۂ اختر سے تم کیوں دُور ہو

ھڑتال

از مسٹر دھیرج پرکاش بھٹناگر شتہ

گنیش مل کی ھڑتال کو آج اکیسواں روز تھا۔ مگر مل مالکوں اور مزدوروں میں سمجھوتہ کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی مل کے مالک اور منیجر اپنی ضد پر تھے اور مزدور اپنی شرائط پر اڑے بیٹھے تھے۔ دونوں میں کوئی بھی اپنی بات سے بال بھر سرکنا نہ چاہتا تھا۔ سرمایہ داروں کو تو سیچنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اُن کے سر میں دولت کا نشہ تھا۔ اور بدن میں سفید چاندی کے ٹکڑوں کی گرمی۔ اُن کو یقین تھا کہ یہ چند کوڑیوں کے بھکڑ مزدور جن کو پیٹ بھرنے کو روٹی اور پہننے کو کپڑا میسر نہیں، کس طرح اُن کا مقابلہ کر سکیں گے؟ اُن کے قبضہ میں دولت کی زبردست ڈھال موجود ہے۔ جس پر ان کنگال مزدوروں کا کوئی ہتھیار کارگر نہیں ہوسکتا۔ آج نہیں تو کل ضرور وہ اُن کے سامنے ہتھیار ڈال دیں گے۔ پھر انھیں ضرورت ہی کیا ہے جو اُن کی بیہودہ اور بے سر و پا شرائط منظور کریں۔ یا اُن میں کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ کے لئے دماغ سوزی کریں۔ مل مالک اور منیجر کا تو یہ روّیہ تھا کہ وہ مزدوروں کے نمایندوں سے سیدھے مُنھ بات ہی نہ کرتے تھے سیدھی بات کا الٹا جواب دیتے اور ترشی سے پیش آتے۔ اُنکو روپیہ کا غرور تھا۔ ایک بڑی زبردست طاقت کا بھروسہ تھا

ہر روز میٹنگ ہوتی۔ شہر کے بڑے بڑے آدمی اسمیں شامل ہوتے اور سمجھوتہ کی کوشش کرتے۔ بڑے بڑے زبردست مقرروں کی زوردار تقریریں ہوتیں مگر نتیجہ کچھ نہ نکلتا۔

معاملہ بڑے پیچیدہ مراحل طے کر رہا تھا۔ سکون دامن اضطراب کے ہنڈولے میں جھول رہے تھے۔ تمام شہر بے چین سا تھا۔ ہر لحہ بلوہ ہوجانے کا اندیشہ لگا رہتا۔ مسلح پولیس گشت لگاتی رہتی۔ حکام بے چین و پریشان پھرتے نظر آتے۔ آنے والی مشکلات کو بھی جلد از جلد حل کر دینا چاہتے تھے مگر یہ گتھی سلجھتی ہی نہ تھی۔

اگر مزدوروں کے لیڈر اور دوسرے چند کارکن حالات کی باگ ڈور کو قابلیت سے نہ سنبھالے رہتے تو اب تک صورت حال دوسری ہی ہوگئی ہوتی۔ دولت کا خوشنما دامن بے گناہوں کے خون سے کبھی کا آلودہ ہوگیا ہوتا۔

دولتمندوں کے ایجنٹوں اور جاسوسوں نے خفیہ طور پر مزدوروں کو بھڑکانے اور فساد برپا کرانے کی بڑی کوشش کی۔ تاکہ سرکشی کا الزام عائد کرکے اُن غریبوں کو پھانس دیا جائے۔ مگر ایسا ہو نہ سکا۔

پانچ روز اور گذر گئے۔ انقلاب نے واقعات کی تصویر کا دوسرا رُخ پیش کیا۔ اگلے روز آفتاب عالمتاب کی

بھولی بھالی چھوٹی چھوٹی سنہری کرنیں ایک انقلاب آمیز پیغام کے ساتھ نمودار ہوئیں۔ تمام شہر نے اُن کا بیتابانہ استقبال کیا۔ جس طرف بھی جو شخص گیا اُس نے وہیں ایک سُرخ پوسٹر چسپاں پایا۔ نئی بات تھی۔ اِس لئے ہر گلی کوچہ میں انھیں پرچوں کا تذکرہ تھا۔

اِن پرچوں میں کارخانوں کے مالکوں اور سرمایہ داروں کے اُس ظالمانہ سلوک اور وحشیانہ برتاؤ کی کُھلے الفاظ میں پُرزور ملامت و مذمت کی گئی تھی۔ جو وہ اب تک غریب مزدوروں کے ساتھ کرتے آرہے تھے اُسکے ساتھ ہی مزدوروں کو اِس بات کی تلقین کی گئی تھی کہ "وہ اپنے واجب حقوق سے دستبردار نہ ہوں اور آخیر دم تک ظلم کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کریں۔ اُن سے یہ بھی اپیل کی گئی تھی کہ جب تک اُن کی شرائط منظور نہ ہو جائیں۔ کوئی شخص مل میں جاکر کام کرنے کا خیال تک اپنے دِل میں نہ لائے، ورنہ مخالف جماعت کو سر چڑھنے کا موقع مِل جائیگا اگر آپ دُنیا کی تاریخ میں ایک کامیاب مثال پیش کرنا چاہتے ہیں تو اپنی ہڑتال کو مکمل بنائیے۔ اصول پر قائم رہئے اصول سے گِر جانا انسانیت سے گِر جانے کے مترادف ہے۔ اِن عارضی تکلیفوں سے گھبرانہ جائیے۔ اِنکا خاتمہ ضرور ہوگا۔ یاد رکھئے۔ وہ دِن نزدیک ہے جب دولت کا مغرور سر افلاس کے قدموں میں دکھائی دے گا۔"

اِن پوسٹروں نے صورِ محشر کا کام دیا۔ سوئے ہوئے فتنے جاگ اُٹھے۔ مردہ جسم میں نئی روح آگئی۔ مزدوروں کے حوصلے بڑھ گئے۔ اور اُنھوں سرمایہ داروں کے خرمنِ اُمید میں آگ لگادی۔ چنگاریاں دُور دُور تک پہنچیں حکام بھی گھبرا اُٹھے۔ غیظ و غضب کے شعلے بلند ہوئے۔ جبر مخالفت برداشت نہیں کرتا۔ آنًا فانًا میں پولس کے سجیلے جوانوں سے بھری ہوئی لاریاں شکار کی تلاش میں میدان میں آڈٹیں۔ چشم زدن میں مزدور پارٹی کے خاص خاص رُکن بڑے گھر کی چہار دیواری میں مہمان بناکر آرام سے بٹھادئے گئے۔

حکومت کی اِس دست درازی سے شہر میں کھلبلی مچ گئی۔ آگ پر اور روغن پڑگیا۔ مزدوروں نے اس کے خلاف اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے کے لئے ایک زبردست جلوس نکالا۔ ہر قدم قدم پر اِس قسم کے نعرے بلند ہوئے "انقلاب زندہ باد! مزدور پارٹی زندہ باد!! ہندوستان کے غریب بھائی زندہ باد!!! سرمایہ داری کا خاتمہ!!!!"

ہزاروں آدمیوں کا اجتماع تھا۔ جلوس طوفانی طاقت سے سیلاب کی طرح بڑھتا ہی چلا جاتا تھا۔ جو کوئی بھی راستہ میں ملتا خس و خاشاک کی طرح اسی رو میں بہنے لگتا۔ جلوس شاہراہ سے گذرتا ہوا پریڈ کے میدان میں داخل ہوا۔ مسٹر قدوائی کی صدارت میں جلسہ کی کاروائی شروع ہوئی۔ ریزولیوشن پیش اور پاس کیا گیا کہ حکومت کی اِس جارحانہ کاروائی کو پبلک ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور اُس سے اِستدعا کرتی ہے کہ وہ اِن بے خطا گرفتار شدہ اشخاص کی رہائی کا جلد از جلد انتظام کرے۔ سرکار سے انصاف کی توقع رکھتے ہوئے یہ بھی درخواست

کی جاتی ہے کہ وہ اِن مِل مالکوں کے آئے دن کے مظالم کی پوری طرح روک تھام کرے۔ نیز یہ بھی التجا کیجاتی ہے کہ اِن غریب اور بے روزگار مزدوروں کو جو اتنے عرصہ سے بیکاری میں دن کاٹ رہے ہیں۔ بطور ہرجانہ ایسی رقم دلائی جائے۔ جس سے سمجھوتہ ہونے تک یہ لوگ اپنے خاندان کا پیٹ پال سکیں۔ اِسی طرح اور بھی کئی تجویزیں پیش ہوئیں۔ جو عام رائے سے پاس کی گئیں۔ آخر میں مسٹر ورما سے تقریر کرنے کی التجا کی گئی۔

مسٹر رام کرشن ورما شہر کے بڑے متمول اشخاص میں تھے لیکن دولت کے غلام نہ تھے بلکہ اس کو رفاہ عام کی شے سمجھتے تھے۔ جہاں ضرورت پڑتی مٹھی کھول دیتے۔ بیرسٹر تھے مگر بیرسٹری نہ کرتے تھے۔ جوانی کو عیش و آرام میں وقف نہ کر کے مُلکی خدمات کے سپرد کر دیا تھا۔ جوان ہوتے ہوئے بھی اُنھوں نے اب تک شادی نہ کی تھی۔ کیوں نہیں کی؟ یہ تو تحقیق معلوم نہیں مگر اس میں کوئی راز ضرور تھا۔ اور یہ راز سربستہ ہی رہا۔ اگر یہ افشا ہو جاتا تو ممکن تھا کہ دُنیا اُنکی خدمات سے محروم ہی رہ جاتی۔ ورما صاحب فطرتاً بڑے خوش مزاج اور ظریف طبع واقع ہوئے تھے۔ مگر یہ خوش طبعی اور مصروفیات زندگی اُن کے غنچۂ دل کو شگفتہ نہ رکھ سکیں۔ کسی کو زندگی کا شریک بنائے بغیر زندگی میں رومانس پیدا نہیں ہوتا۔ محبت کا زخم رس رس کر ارمانوں کی دُنیا کو تباہ کر دیتا ہے۔ چونکہ ایک دُکھیا دل دوسرے کے دُکھ کا جلد احساس کر لیتا ہے۔ اسی لئے مسٹر ورما نے بھی مزدور جماعت کا بیشتر کام اپنے ذمے لیا تھا۔ اور ایک طرح سے وہی اُن کے رہنما تھے۔ وہ ایک بڑے زبردست مقرر تھے۔ اُن کی تقریریں بڑی پُر اثر اور پُر جوش ہوتی تھیں۔ اور لوگوں کو اُنکی تقریر سُننے کا بڑا اشتیاق رہتا تھا۔

تقریر شروع ہوئی۔ "انقلاب زندہ باد" کے نعروں سے فضا گونج اُٹھی۔ اُنھوں نے فرمایا:۔

"عزیز دوستو! اخباروں کے ذریعہ نیز دوسرے ذرائع سے آپ دُنیا کی موجودہ حالت اور اُس کے تغیر و تبدل سے رفتہ رفتہ واقف ہوتے جا رہے ہیں۔ اس اُلٹ پھیر اور انقلاب کے متعلق آپ کو روز ہی کوئی نہ کوئی بات اخباروں میں دیکھنے اور پڑھنے کو مل جاتی ہے۔ دُنیا اب کروٹ بدل رہی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب تمام دُنیا میں دولتمندوں کا طوطی بولتا تھا۔ سرمایہ داری کی بُنیاد غریبوں کے خون سے ڈالی جاتی تھی۔ دولت کے قلعہ کی دیواریں مُفلس و نادار کی ہڈیاں توڑ کر مستقیم و مستحکم کی جاتی تھیں۔ مگر اب زمانہ پلٹا کھا رہا ہے۔ مزدور اور کسانوں میں اب وہ پہلی سی جہالت کی باتیں نہیں رہیں۔ اُن کا وہ سیدھا پن ختم ہو چکا۔ زمانہ نے انھیں ٹھوکر مار کر بیدار کر دیا ہے۔ وہ اب زر پرستوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر رہنا گوارا نہیں کر سکتے۔ اُنھیں بھی احساس ہونے لگا ہے کہ وہ بھی اسی خمیر اور اسی گوشت پوست سے بنے ہوئے انسان ہیں جس سے یہ ظالم و سفاک زمیندار۔ سرمایہ دار۔ زردار اور کارخانہ دار!! اب بیچارے مزدور اور کسان اپنے بُرے بھلے اور نفع نقصان کو خود ہی اچھی طرح سمجھنے لگے ہیں۔ کسی دوسرے کے

سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ سالہا سال کے تلخ تجربہ نے اُن پر یہ روشن کردیا ہے کہ سرمایہ دار ایک لٹیری اور ڈاکو پیشہ جماعت کے ممبر ہیں۔ یہ جماعت غیر قانونی جماعت ہے جو حکومت کا سہارا پاکر جرائم پیشہ ڈاکوؤں کی طرح غریبوں کو لوٹ کر انھیں بے خانماں و برباد اور روٹی کے ٹکڑوں تک کے لئے محتاج کردیتی ہے۔ اِس بیرحم اور ظالم فرقہ کو غریبوں کے بچوں کو بھوک سے تڑپ تڑپ کر مرتے دیکھکر بھی ترس نہیں آتا۔ (شرم۔ شرم)

آپ لوگ روز جو یہ نئے نئے قانون اور نئی نئی اسکیم بنتے اور بگڑتے دیکھتے ہیں، سب اسی جماعت کے گرگوں کی ایجاد ہیں تاکہ یہ غریبوں اور کمزوروں کو جی بھر کر لوٹیں اور ستائیں۔ اُن سے کس کر مشقت لیں اور اُن کی خون و پسینہ کی گاڑھی کمائی کو نگل جائیں اور ڈکار تک نہ لیں۔ ایسے ایسے اُلجھانے والے قانون اختراع کئے گئے ہیں۔ جن سے کمزور اُبھرنے نہ پائیں اور طاقتور اُن بیچاروں کے جان و مال کو اپنے آہنی پنجہ میں دابے رہیں۔ غریبوں کا خون چوسنے کے ایک نہیں سیکڑوں ذریعے اُن کے پاس موجود ہیں۔ قرض اور سُود کی چکی کو یہ لوگ ایسی چستی و چالاکی اور سختی سے گھماتے ہیں کہ بیچارہ غریب کسان یا مزدور عمر بھر اُسکی گردش میں گھومتا رہتا ہے اور چھٹکارا نہیں پاتا اور آخر کار پس کر فنا ہو جاتا ہے۔ یہ تو چاہتے ہی ہیں کہ غریب لوگ صفحۂ عالم سے مٹ جائیں مگر غریبی کا نام نہ مٹنے پائے۔

جو مزدور ان کی مل، ان کے کارخانوں اور خود اُن کی عزت اور شان کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اُنھیں کو خاک میں ملا دینا یہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ سیکڑوں ہزاروں روپیوں کے منافع کا باعث ہوتی ہے مزدور کی محنت اور اُس کی ہنرمندی اور کاریگری۔ مگر اس بیچارہ کو اس منافع کی ایک پھوٹی کوڑی بھی دیکھنے تک کو نصیب نہیں ہوتی۔ تمام یہی مُوذی ہضم کر جاتے ہیں۔ اور مزدور کو۔ آپ کو معلوم ہے اسکی اس جانفشانی کا کیا صلہ ملتا ہے؟ یہی تمام مظالم اور زیادتیاں جنکا آپ لوگ آج شکار ہو رہے ہیں۔

مسٹر ورما نے اپنی لوچدار آواز سے پھر کہا:-

"دوستو! آپ اس ظلم کی فریاد خدا سے بھی نہ کریں۔ شکایت کرنا اور بھیک مانگنا غلام اور بزدل کا کام ہے مرد کا نہیں۔ مرد تو اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دیتا ہے۔ ظلم کو مٹانے کیلئے اُس کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔ آپ کو بھی اُسی حوصلے سے کام کرنا ہوگا۔ میں آپ کو تاکید کردینا چاہتا ہوں کہ آپ میں بہتوں کو پھسلایا جارہا ہے اور لالچ دیا جارہا ہے کہ آپ لوگ پھر بغیر کسی شرط کے مل کے کام پر واپس چلے جائیں۔ مگر میں آگاہ کئے دیتا ہوں کہ یہ سب فریب ہے۔ دھوکا ہے۔ آپ کو پھانسنے کا جال ہے وہ لوگ آپ کے ہمدرد نہیں بلکہ دشمن ہیں جو آپکے شیرازہ کو منتشر کرکے آپ کی طاقت کم کرنا چاہتے ہیں۔

یہ سب اُنکی چالیں ہیں۔ آج اگر آپ اُن کے دھوکے میں آگئے تو کل وہ آپ کو پیس کر رکھدیں گے۔ یہ حضرات جو آپ کے خیر خواہ بننے کا دعویٰ کرتے ہیں سب رنگے سیار ہیں۔ سب شیطان ہیں۔ کوئی بھلا نہیں! اسلئے میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ آپ متحد اور مشترکہ طور سے اِس ظُلم کا مقابلہ کریں۔ آپ کی فتح لازمی ہے۔ مگر مقابلہ تشدد دانہ نہ ہو۔ تشدد غیر دانشمندانہ ہے۔ اصول کے خلاف ہے۔ یہ امر روزِ روشن کی طرح ظاہر ہے کہ مِل کے مالکان آپ کو کُھلا چیلنج دے رہے ہیں۔ آپ اس چیلنج کا ضرور جواب دیں مگر عقلمندی سے اور ذرا سوچ سمجھکر یقین رکھئے کہ پبلک کی ہمدردی آپ ہی لوگوں کے ساتھ ہے۔ سب کو آپ کی تکلیفوں کا احساس ہے۔ ایسے موقع پر کوئی صاحب دِل اور ذی حس اِنسان آپ کی مدد سے مُنہ موڑنا گوارا نہ کریگا۔ میں خود اِس مصیبت میں آپ کا شریک ہوں۔

فی الحال آپ صاحبان کے اہلِ و عیال اور آپکی امداد کے لئے پچاس ہزار روپیہ نذر کرتا ہوں۔ اور بعد میں بھی جسقدر امدادِ ضرورت ہوگی پُوری کردی جائے گی۔"

آخری جُملہ ختم ہوتے ہی "انقلاب زندہ باد! بھارت ماتا کی جے!! مسٹر ورما کی جے" کے فلک شگاف نعروں سے آسمان گونج اُٹھا۔ مسٹر ورما نے پھر کہا کہ:-

"بھائیو! قبل اِس کے کہ آپ لوگ اپنے مکانوں کو جائیں مجھے اِس بات کا یقین دلائیں کہ آپ میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے غداری نہ کریگا اور نہ مِل میں کام کرنے جائیگا۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو یہ کلنک تا زندگی آپ کی پیشانی پر رہیگا۔"

ایک ساتھ ہزاروں ہاتھ اُٹھ گئے اور سب نے بیک آواز ہوکر قسم کھائی کہ سمجھوتہ ہونے تک کوئی بھی مِل کے کام پر واپس نہ جائے گا۔ ازاں بعد جلسہ ختم ہوا۔ سب لوگ اپنے اپنے مکانوں کو واپس ہوگئے ... ...

جلسہ کے بعد دو روز خاموشی سے گذر گئے۔ تیسرے روز کی صبح ایک نیا شگوفہ لے کر نمودار ہوئی۔ چلّے کی سردی پڑ رہی تھی۔ کُہرے کی موٹی چادر نے تمام شہر کو کس کر لپیٹ رکھا تھا۔ سُورج کی ہلکی کرنیں اِس چادر کو تار تار کردینے کے لئے پوری طاقت استعمال کرتی جارہی تھیں۔

اچانک گنیش مِل کا بھونپو (سیٹی) سُنائی دیا اور لگاتار پندرہ منٹ تک بجتا رہا۔ لوگوں نے دیکھا کہ بہت سے مزدور مِل کی طرف لپکے چلے جارہے ہیں۔ اصلیت یہ تھی کہ سیکڑوں مزدوروں کو ورغلا کر اور لالچ دیکر مِل میں کام کرنے کے لئے تیار کرلیا گیا تھا۔ جو لوگ بھوک کی تکلیف اور اپنے ننھے ننھے بچوں کا بلبلانا برداشت نہ کرسکے۔ وہ ہی جماعت کا بھی آخر تک ساتھ نہ دے سکے۔ پیٹ کی آگ اِنسان کے قدموں میں لغزش پیدا کردیتی ہے۔ ایسا اِنسان غدار کہلانے کا مستحق نہیں! حقیقی غدار وہ ہیں جو صاحبِ توفیق ہوتے ہوئے بھی اپنی قوم اور اپنے ملک

کو غلام بنانے میں غیروں کے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

اب مزدور دو ٹکڑوں میں منقسم ہو گئے۔ ایک وہ جو مل میں کام کرنے کے لئے رضامند تھے۔ اور جوق درجوق اس طرف دوڑے چلے جارہے تھے۔ دوسرے وہ جو ورما صاحب کے سامنے کئے ہوئے وعدے کو آخر دم تک نبھانا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ دشمن کی چالوں نے ذرا سی دیر میں ایک متحد جماعت کو دو فریق میں بانٹ دیا بھائی بھائی آپس ہی بگڑ بیٹھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آخرالذکر پارٹی نے پکٹنگ شروع کردیا۔ بات بڑھنے لگی۔ آنیوالے خطرہ اور فساد کو روکنے کے لئے تمام شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کردی گئی۔ کہیں بھی چار پانچ آدمی یکجا نہ ہوسکتے تھے۔

مسٹر ورما اور اُن کے ساتھیوں نے حکومت کی اس دست درازی کو بیجا قرار دیا اور ان حکام کی خلاف ورزی کرنے کا تہیہ کرکے اس بات کا اعلان کردیا کہ "اس جابرانہ رویہ کے خلاف آواز بلند کرنے اور حکومت سے انصاف اور روٹی کے لئے اپیل کرنے کے لئے پریڈ کے میدان میں ایک پبلک اجتماع ہوگا۔ قرب وجوار کے لوگ بھی زیادہ سے زیادہ تعداد میں جمع ہوں" یہ خبر اطراف وجوانب میں بجلی کی طرح دوڑ گئی۔ مسٹر ورما سے آس پاس اور دُور دراز سبھی جگہ کے لوگ واقف تھے۔ بے لوث اور بے غرض خدمات انسان کے لئے شہرت کا دروازہ کھول دیتی ہیں۔ دوپہر ہوتے ہوتے پریڈ کا میدان ہزاروں فاقہ کش، غربت زدہ، چیتھڑوں اور پھٹے پُرانے گدڑوں میں ملبوس مزدوروں، کسانوں اور بیروزگاروں سے کھچا کھچ بھر گیا۔ یہ سب لوگ روٹی اور روزی کا مسئلہ اور اُسکا حل معلوم کرنے کے لئے اتنی دُور سے ایسی سردی میں دوڑے چلے آئے تھے۔ مگر حکومت کے ایجنٹوں اور عہدوں کے غلاموں کی نظروں میں یہ تحریک باغیانہ تھی۔

سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر مہیش کی زیر کمان مسلح پولیس نے امن وامان کی حفاظت کے لئے پریڈ گراؤنڈ کا محاصرہ کرلیا۔ مسٹر ورما ابھی یہاں نہیں پہونچے تھے۔ لوگ بڑی بے چینی سے اُنکی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ ادہر مسٹر مہیش یہ فیصلہ کئے ہوئے تھے کہ آج کسی صورت سے مسٹر ورما کی تقریر نہ ہونے دیں گے۔ وقت زیادہ ہوتا جارہا تھا۔ لوگوں کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ اچانک بھیڑ میں ہل چل پیدا ہوئی اور ہزاروں آدمیوں کے اجتماع میں سے نہ معلوم کہاں سے آکر ایک حسین دوشیزہ خدائی نور کی طرح پلیٹ فارم پر جلوہ افروز ہوگئی۔

حاضرین سکتہ میں آگئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے اِن پر جادو کردیا ہے۔ اِس نازنین نے بلا توقف اپنی شیریں مگر پُر استقلال و پُرجوش آواز سے اِس جم غفیر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:-

"بزرگو اور بھائیو! مجھے یہاں اِس طرح اچانک دیکھکر آپ سب کو تعجب ہو رہا ہے۔ تعجب کی بات ضرور ہے مگر واقعات اکثر انسان کو عجیب وغریب کام کرنے پر مجبور کردیتے ہیں۔ آپ سب اصحاب مسٹر ورما

کی آمد اور اُن کی تقریر سننے کے منتظر ہیں۔ وہ شاید آتے ہی ہوں گے۔ مگر جب تک وہ تشریف لائیں میں کچھ باتیں آپ کی خدمت میں عرض کروں گی۔ مجھے آپ کی تحریک سے دلی ہمدردی ہے جس کا پختہ ثبوت یہ ہے کہ میں آپکے درمیان موجود ہوں۔ آپ میں بہت کم اصحاب مجھ سے واقف ہوں گے۔ زیادہ تعارف کی ضرورت نہیں۔ گنیش مل کے مالک میرے محترم والد ہیں۔ میں شرمندہ ہوں کہ آپ لوگوں نے ہم لوگوں کے باعث اِتنی سختیاں اور اتنے مظالم برداشت کئے۔ ممکن ہے ابھی اور زیادتیاں ہوں۔ اور آج کا دن بھی معلوم نہیں کس طرح گذرے۔ پولیس الگ اپنی کارگذاری دکھانے کے لئے مستعد ہے۔

عدم تشدد غریبوں اور نہتّوں کے لئے سودمند ضرور ہے مگر کب تک؟

یہ جملہ پورا نہ ہونے پایا تھا۔ کہ مسٹر مہیش نے آگے بڑھ کر اپنی بھاری اور زوردار آواز سے گرج کر کہا:-

"کملا۔ تمھیں یہاں آنے کے لئے کس نے اجازت دی؟ اِن شیطانوں کی بھیڑ میں آکر تمھیں اِس طرح اپنے والد کے خلاف زبان کھولتے شرم نہیں آتی۔ اور تم کُھلے الفاظ میں میری بھی توہین کر رہی ہو۔ تمھیں میری شخصیت اور میری پوزیشن کا علم نہیں؟ تم اگر مجھکو اب تک نہیں سمجھ سکیں تو یہ تمھاری غلطی ہے، اور شاید اِس غلطی کا خمیازہ تمھیں بھگتنا پڑے۔ یہ تمام فساد اور تمام شیطانیاں اُسی بدمعاش ورما کی ہیں۔ تم پر بھی یہ اُسی کا رنگ چڑھا ہے۔ اگر تمہارے دل میں ابھی تک اسی آوارہ گرد کا خیال جاگزیں ہے، تو آج تمہاری نظروں کے سامنے ہی میں تمہاری اُمیدوں کا خاتمہ کر دوں گا۔ اِس شہرت کے دیوانے کو ایسی جگہ کی ہوا کھانے بھیجوا دوں گا جہاں کی تمھیں مدتوں خبر نہ ملے"۔

یہ کہتے کہتے اُن کا چہرہ غصّہ سے تمتما اُٹھا۔ اُنھوں نے بڑے تحکمانہ اور پُرغرور انداز سے بھیڑ کو بھی منتشر ہوجانے کا حکم دیا۔

کملا اِس بیجا اور بیہودہ سلوک کو برداشت نہ کر سکی۔ اُسکی فطرتِ خاموش بھڑک اُٹھی۔ اُس کا نازک بدن غصّہ سے کانپ اُٹھا۔ مگر اُس نے اپنی طبیعت پر قابو رکھتے ہوئے مسٹر مہیش سے للکار کر کہا:-

"مسٹر مہیش مجھے آپ کے انسانیت سے اِسقدر گرجانے کا افسوس نہیں۔ افسوس اِس بات کا ہے کہ مجھے آپ کی اوچھی باتوں کا مجبوراً جواب دینا پڑا۔ مجھے یہاں آنے میں کس بات کی شرم تھی؟ شرم تو اُن لوگوں کو اور آپ کو آنی چاہیئے جن کے نیک افعال کے باعث مجھے یہاں آنا پڑا۔ میں آپ سے اور مسٹر ورما سے دونوں ہی سے عرصے سے واقف ہوں۔ اور میں نے آپ دونوں کو بخوبی پرکھ لیا ہے۔ آپ ہم میں سے کسی کو بھی نہیں سمجھ سکے۔ میں آج آپ سے کہتی ہوں کہ میں آپ سے نفرت کرتی ہوں۔ آپ مجھے عورت سمجھکر ڈرانا چاہتے ہیں، یہ آپ کی غلطی ہے۔ مسٹر ورما ابھی نہیں آئے یہ اچھا ہی ہوا۔ اگر وہ آجاتے تو

آپ کے انتقام کی آگ ضرور بھڑکتی اور انجام نہ معلوم کیا ہوتا۔ اس وقت اِن لوگوں کی باگ ڈور میرے ہاتھ میں ہے۔ میں اِن کو آپ کے اور والد صاحب کے ستم برداشت نہ کرنے دونگی۔"

اور یہ کہتے ہی اُس نے لوگوں کو مخاطب کر کے پھر کہا:۔

"بھائیو! میں سمجھوتہ کی ہر ممکن طریقہ پر کوشش کرونگی۔ آپ کی شرائط پوری کی جائیں گی۔ میں اُمید دلاتی ہوں کہ فی الحال اگر آپ کی اُجرتوں میں اضافہ نہ ہوسکا تو تخفیف اور کمی بھی نہ ہوگی۔ آپ کی دیگر باتیں بھی پوری کی جانے کی کوشش کی جائے گی۔ اِتنے عرصہ کے معاوضہ کے لئے میں آپ کو اپنے طلائی زیورات نذر کرتی ہوں۔"

یہ کہتے کہتے اُسنے ایک رومال میں بندھے ہوئے زیورات پلیٹ فارم پر ڈال دیئے۔ لوگ چلّا اُٹھے "کملا ماتا کی جے۔" "بھارت ماتا کی جے۔" شور بند ہو جانے پر کملا نے پھر کہا:۔

"بھائیو۔ اگر میں سمجھوتہ نہ کرا سکی تو میں آپ کو یہ مشورہ دونگی کہ آپ مل پر دھاوا بول دیں اور مل پر اپنا قبضہ کریں۔ اس سے خون خرابہ ضرور ہوگا۔ مگر کیا کیا جائے؟ اور کوئی دوسری صورت ہی نہیں۔"

پھر اُس نے پولیس کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا:۔

"میرے بھائیو! آپ کو معلوم ہے کہ کون آپ کو ہمارے خلاف اُبھار رہا ہے۔ کون بھائی کو بھائی کا خون بہانے کی ترغیب دے رہا ہے۔ آپ سب ہمارے ہی بھائی ہیں۔ کیا آپ کا دل گوارا کرتا ہے کہ آپ نہتوں پر ہتھیار اُٹھائیں۔ ہم بالکل نہیں چاہتے کہ ہم میں اور آپ میں رنجش پیدا ہو۔ یا ہم آپ کی مخالفت یا مقابلہ کریں۔ لیکن اگر آپ ہمیں مجبور کریں گے تو انجام اچھا نہ ہوگا۔ اِس لئے میں آپ بھائیوں سے دست بستہ التجا کرتی ہوں کہ آپ ہمارے کاموں میں دخل نہ دیں اور مناسب تو یہ ہے کہ آپ واپس چلے جائیں۔"

مسٹر ہیتش کو اتنی تاب کہاں تھی۔ اُنھوں نے اپنا نادر شاہی حکم صادر کرتے ہوئے پولس سے کہا کہ وہ بھیڑ کو ڈنڈے مار کر بھگا دے اور اگر نہ ہٹے تو فوراً گولی چلا دے۔ پولیس نے حکم پاتے ہی لاٹھی چارج شروع کیا۔ بھیڑ نے اُس کا کھُلا مقابلہ کیا۔ فساد نے بلوہ نے کی صورت اختیار کر لی۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے بلا پس و پیش گولی چلانے کا حکم دیدیا۔ اِتنے میں ہی مسٹر ورما چند آدمیوں کے ہمراہ کار میں آتے دکھائی دیئے۔ مسٹر ورما کو کملا کے والد نے کملا کی ضد سے مغلوب ہو کر اپنے بنگلہ پر اِس گتھی کو سلجھانے کے لئے راستہ میں ہی سے بلوا لیا تھا۔ اور اُن سے کچھ عرصہ تک صلاح و مشورہ کے بعد مزدوروں کی بعض شرطیں کسی حد تک قبول کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ اسی گفت و شنید میں مسٹر ورما کو پریڈ کے میدان میں پہونچنے میں دیر ہو گئی۔ وہ کملا کے مکان سے واپس ہو رہی رہے تھے کہ اُن کو خبر ملی کہ کملا بھی پریڈ گراؤنڈ کے جلسہ میں شریک ہے اور وہاں پولیس اور مزدوروں

میں لڑائی شروع ہوگئی ہے۔ یہ خبر پاتے ہی مسٹر ورما اور کملا کے والد جلد از جلد وہاں پہونچنے کے لئے کار میں روانہ ہوئے۔ لیکن وقت پر نہ پہونچ سکے۔ پولیس اور مزدوروں میں کچھ عرصہ پیشتر مڈبھیڑ ہو چکی تھی۔ معاملہ گولیوں تک پہونچ چکا تھا۔ نہتے لوگ جان بچانے کے لئے جس طرف راہ ملتی بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سب کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ کون کس کی سدھ لیتا۔ بیسیوں مزدور گولی کا شکار ہو چکے تھے۔ اتنے میں ایک بار پھر پلیٹ فارم سے آواز آئی:۔

"بھائیو! بھاگو مت۔ میں بھی یہاں موجود ہوں۔ ذرا استقلال سے کام لو۔ دشمن کی تعداد ہی کتنی ہے۔ ایک بار پھر حوصلہ جمع کرو۔ ہم ضرور دشمن پر قابو پا جائیں گے۔"

گولیوں کی بوچھاڑ میں اُس نے ایک بار پھر مسٹر مہیش کو للکارا۔ اور اِس ظالمانہ حرکت کو بند کرنے کو کہا مگر گولیاں چلنا بند نہ ہوا۔ کملا شیرنی کی طرح گرج کر مسٹر مہیش کی طرف لپکی۔ گولیاں اب بھی چل رہی تھیں۔ کملا اپنا مقصد پورا نہ کر سکی۔ ایک۔ دو۔ تین۔ گولیاں یکے بعد دیگرے اُس کے نازک جسم کے پار ہو گئیں۔ خوبصورت جسم خاک نشین ہو گیا۔ مسٹر ورما وقت پر اُس کی امداد کو نہ پہونچ سکے۔ جب تک اُنھوں نے اُس پھول کو خاک آلود ہونے سے بچا کر اپنی آغوش میں سنبھالا۔ پھول مرجھا چکا تھا۔ موت کا سناٹا چھا گیا۔ گولیوں کی بارش بھی بند ہوگئی۔ لوگوں کا بھاگنا دوڑنا بھی رُک گیا۔ ایک سکتہ کا عالم طاری تھا۔ مسٹر ورما کملا کے بےحس جسم کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ ایک بار پھر کہیں سے گولی چلی اور ایک عجیب انتقام آمیز قہقہہ کی آواز آئی۔ گولی مسٹر ورما کے سینے کے پار ہوگئی۔ دو جسم یکجا ہو کر خاک میں مل گئے۔ کچھ دیر تک مسٹر مہیش کی خوفناک وخونی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ مگر پھر وہ بھی بند ہوگئی۔

پریڈ کا میدان خون سے رنگا جا چکا تھا۔ کملا کے والد مسٹر ہردے ناتھ یہ سب منظر بت کی طرح خاموش کھڑے ہوئے دیکھتے رہے۔ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کو جس شخص کا شریکِ حیات بنانا پسند نہ کرتے تھے۔ قدرت کے ہاتھوں نے اسی کو اس کا شریکِ مرگ بنا دیا۔

مسٹر ہردے ناتھ سرکار پسند ہونے کی وجہ سے مسٹر ورما کی قوم پرستی سے متنفر تھے۔ کملا کو مسٹر ورما سے محبت تھی۔ اور یہ محبت آج تک یونہی گھٹتی چلی آتی تھی۔ مسٹر ہردے ناتھ سوسائٹی کے آدمی تھے اور سرکار کی نظروں میں اُن کی کافی عزت تھی۔ وہ کملا کی شادی مسٹر مہیش سے کر دینا چاہتے تھے۔ مگر کملا کو یہ پسند نہ تھا۔ اِسی لئے آج تک معاملہ یونہی رہا۔ محبت کی کارسازی سے دو دل جو زندگی میں ایک نہ ہو سکے آغوشِ مرگ میں یکجا ہو گئے۔ اب مسٹر ہردے ناتھ کی دُنیا تاریک ہو گئی تھی۔ اپنی شریکِ زندگی کو وہ عرصہ ہوا کھو چکے تھے۔ آج نازوں کی پالی بیٹی کو بھی اپنی ہی غلطی سے کھو بیٹھے۔ اب اُن کو دُنیا سے نفرت سی ہوگئی۔ وہ پاگل سے ہو گئے۔ اُن کے بدن میں اچانک رعشہ سا آیا۔ اور وہ چکرا کر گر پڑے۔ بہ مشکل تمام اُن کو ہوش میں لایا گیا۔ اُن کی

آنکھوں سے اشکوں کا دریا رواں تھا۔ اُن کے ساتھ ہزاروں آدمی رو رہے تھے۔

اُنھوں نے روتے روتے کہا:-

"بھائیو! کملا کی وصیت پوری کی جاتی ہے۔ آپ کی تمام شرائط منظور کر لی گئیں۔ اب مجھے مل سے کوئی سروکار نہیں۔ سروکار رکھکر ہی کیا کرنا ہے۔ مل آپ لوگوں کی ہے۔ ہڑتال ختم کیجئے۔"

منظر بڑا دردناک تھا۔ سب لوگوں کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ دو ارتھیاں تیار کی گئیں۔ مجمع گنگا کی طرف بڑھا۔ دو فانی جسم غیر فانی شہرت کے ساتھ آگ کی پاک مگر تیز لپٹوں کے سپرد کر دیئے گئے۔ سارا شہر اس جانکاہ حسرتناک ماتم میں شریک تھا۔

تمام شہر میں آج مکمل ہڑتال تھی۔

ریویو

میرزائی

اِس کتاب میں عام مسلمانوں اور قادیانی جماعت کی باہمی کشمکش کا ایک دلچسپ اور سبق آموز مرقع ہے۔ قصہ شروع سے آخر تک اِس قابلیت سے لکھا گیا ہے کہ ختم کئے بغیر کتاب ہاتھ سے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا ہے۔ باتوں ہی باتوں میں مصنف نے اُن زیادتیوں کو تفصیل سے بیان کر دیا ہے جو سوشل حیثیت سے قادیانی جماعت کے ساتھ برتی جاتی ہیں۔ اس کے مصنف کنور بہر پرتاپ سنگھ صاحب ہیں۔ جنھیں قادیانی جماعت کے مذہبی عقائد سے غیر معمولی واقفیت معلوم ہوتی ہے۔ اکثر اوقات ناظرین کو مصنف کے طرز بیان اور اندرونی معلومات سے یہ دھوکا ہونے لگتا ہے کہ کہیں یہ کتاب پروپیگنڈا کی غرض سے کسی قادیانی لیڈر کی تو نہیں لکھی ہوئی ہے بہرحال اِس کتاب سے ہندوستان کے مختلف فرقوں کے اندرونی تعصبات پر خاطر خواہ اور قابل قدر روشنی پڑتی ہے۔ حجم ۱۸۲ صفحات، قیمت ۱۲؍ ملنے کا پتہ:- منتری پستک مندر دہلی۔

اربعہ عناصر

خانصاحب حکیم محمود علی خان ماہر اکبرآبادی (حال دہلوی) کی مختلف رباعیوں کا ایک دلپذیر مجموعہ ہے جسمیں حمد و نعت اور عبرت و موعظت کے مضامین کا عنصر زیادہ ہے۔ شروع میں سیماب اکبرآبادی، حکیم آزاد انصاری سہارنپوری، حضرت جوش ملیح آبادی، مولانا رحیم اللہ فدائی گلاوٹھی کے لکھے ہوئے دیباچے ہیں۔ جنمیں حکیم صاحب کے حسن کلام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مصنف کا فوٹو بھی شامل ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ، ۸۰ صفحے ضخامت۔ قیمت ایکروپیہ۔ ملنے کا پتہ:- خانصاحب حکیم محمود علی ماہر اکبرآبادی، فراشخانہ، دہلی۔

سانٹ

(از مسٹر شانتی سروپ کیفؔ)

لمحہ لمحہ زندگی کا درد سے ہے بے قرار
آہ تیری یاد بھی وجہِ سکونِ دل نہیں اب دلِ پُرغم نشاطِ عشق کے قابل نہیں
عشرتِ فردا کا مجھ کو کس طرح ہو اعتبار

اب تصوّر میں بھی تو ہوتا نہیں جلوہ طراز!
اب کہاں دل میں امیدوں کی تبسّم زائیاں اب تو بھیگی رات ہے آنسو ہیں اور تنہائیاں
کچھ خبر تجھ کو دلِ مضطر کی ہے او بے نیاز!

آہ میرے دل کی محفل میں اندھیرا ہے ہنوز
تو سراپا روشنی بن کر اِسے پُرنور کر آپ بھی مسرور ہو اور مجھ کو بھی مسرور کر
دیکھ اپنے کیفؔ کو وہ محوِ سجدہ ہے ہنوز
ہو تصوّر سے ترے روشن چراغِ آرزو
ہو ترے دیدار سے سرسبز باغِ آرزو

رُباعی

اپنی ہی گرفت میں خود انسان ہے آج کل صاحبِ تدبیر تھا حیران ہے آج
جو وقت کے اقتضا سے تھی کل اک رسم وہ وہم کے ارتقا سے ایمان ہے آج

(کلیم) جوشؔ

تجلیاتِ گوہر

(از منشی دوارکا پرشاد صاحب گوہر لکھنوی)

خوفِ سزا جزا نہ کر فعل کے ارتکاب سے　رکھ نہ غرض ثواب سے دل میں نہ ڈر عذاب سے

خاکِ شرارِ آہِ دل شعلہ کر اضطراب سے　دیر و حرم کو پھونک دے نالۂ برق تاب سے

کایا پلٹ ہو ہند کی جلوۂ بے نقاب سے　ساقیِ انجمن ہو مست ساغرِ آفتاب سے

دل نہ بتوں کو دیجئے کہتے تھے ہم جناب سے　جان چھڑانی ہوگئی ذو بھر اسی عذاب سے

مرکزِ خامشی بنے دونوں ہی پیچ و تاب سے　ہم اِدھر اک سوال سے وہ اُدھر اک جواب سے

اُن کی ادا و حسن میں لگ گئے اور چار چاند　ورنہ بہارِ کم سنی کم نہ تھی کچھ شباب سے

گلشنِ خار زار میں پھولوں کے لالہ زار میں　دامنِ دل بچا کے چل بادِ صبا گلاب سے

چھڑ ہی گئی شبِ وصال جنگ حجاب و شوق میں　دست درازیاں نہ تھیں شوق کی کم حجاب سے

پیری و عیبِ صد ہزار واہ ری حسرتِ شباب　موئے سپید اب سیاہ ہونے لگے خضاب سے

سنتے ہیں صوفیانِ مست میکدۂ حیات میں　تشنہ لبی بجھاتے ہیں جلوہ گہِ سراب سے

خواب و خیال میں نظر آتے ہیں وہ کبھی کبھی　پھرتے ہیں ہم بھی ساتھ ساتھ اُنکے خیال و خواب سے

فلسفۂ حیات کو کہتے ہیں سب خیال و خواب　نقش بر آب قلب ہے حرکتِ اضطراب سے

قطرۂ آب نے کہا بحر سے رو کے ایک دن　مجھ کو جدا سمجھ لیا آپ نے کیوں حباب سے　قطعہ

بحر نے تب حباب کو موج کی نذر کر دیا　مِلنا نصیب ہو گیا قطرہ کو موجِ آب سے

یوں ہی ہے کائنات کا حیلہ وجود ہست و نیست　قطرہ کبھی جدا نہیں بحر میں ہے حباب سے

دیکھ کے حسن و عشق کی ساری کرشمہ بازیاں　شوکت و شانِ تخت و تاج کم ہے نظر میں خواب سے

سمپسن اور ونڈسر ملکۂ حسن و شاہِ عشق　ایک سے اک گلے ملے چھوٹ کے ہر عذاب سے

بزمِ مشاعرہ میں آج سنتے ہیں حضرتِ گوہر
لائے ہیں کر کے انتخاب کوئی غزل کتاب سے

*

ستی

از مسز عبدالواحد صاحبہ ممبر سنٹرل اسمبلی

پرانی وضع کی ایک کوٹھی ہے۔ باہر دیوان خانہ۔ ایک طرف کو زنانہ مکان کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ سامنے دالان میں تخت پر گاؤتکیہ لگا ہے۔ ایک معمر خاتون بیٹھی چھالیہ کتر رہی ہے۔ ایک دس گیارہ سال کی بچی پاس بیٹھی ہوئی کاغذ کاٹ رہی ہے۔ دروازہ پر نوکر نے آواز دی۔ رحیماً! رحیماً! خط لیجاؤ۔ رحیماً نے خط لاکر دیا۔

خاتون۔ (خط دیکھکر لڑکی سے) نسیمہ! ذرا یہ خط تو بھابی جان کو دے آؤ۔

نسیمہ خط لے کر دوڑتی ہوئی کوٹھے پر پہونچی۔ یہاں ایک کمرہ کچھ نئے رنگ میں آراستہ ہے۔ ایک مسہری پر ایک بیس بائیس۲۲ سال کی لڑکی بیٹھی ہوئی کچھ کاڑھ رہی ہے۔

نسیمہ نے خط دکھا کر کہا۔ "دیکھئے بھابی جان میرے پاس کیا ہے؟"

رقیعہ نے خط لینے کو ہاتھ بڑھایا۔

نسیمہ۔ نہیں بھابی جان۔ میں بھائی جان کا خط جب تک نہیں دونگی جب تک آپ میری گڑیا کا سوئٹر بننے کا وعدہ نہ کریں گی۔

رقیعہ۔ (مسکراکر) تمھیں کیسے خبر ہوئی کہ یہ تمھارے بھائی جان کا خط ہے۔ کیا اور کوئی مجھے خط نہیں بھیجتا؟

نسیمہ۔ بھابی جان۔ آپ مجھے دھوکا دینا چاہتی ہیں۔ دیکھئے ٹکٹ۔ اور کیا آپ سمجھتی ہیں کہ مجھکو خبر نہیں کہ آج بھائی جان کے خط کا دن ہے۔

رقیعہ۔ اچھا بھائی۔ لاؤ خط دے دو۔ ہم تمھاری گڑیا کا سوئٹر بن دینگے۔

نسیمہ (خط دیتے ہوئے) دو رنگ کا بننے گا۔ بہت اچھا ہو۔

نسیمہ خط دے کر کودتی ہوئی نیچے چلی گئی۔ رقیعہ نے خط کھولا اور پڑھنا شروع کیا۔ یکایک اُس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ چہرے پر مُردنی چھا گئی۔ اور خط ہاتھ سے چھوٹ پڑا۔

دو منٹ تک وہ اسی حالت میں بیٹھی رہی پھر اُٹھی۔ کمرہ کا دروازہ بند کیا اور خط اُٹھا کر پھر پڑھا خط کا مضمون یہ تھا

رقیعہ پیاری!

سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تمھیں کیونکر لکھوں کہ میں اپنے عہد پر قائم نہ رہ سکا۔ الزبتھ کی محبت نے مجبور کردیا۔ میں نے سوچا تھا کہ اِس گناہ کی پاداش میں باقی عمر جلاوطنی میں گذار دوں گا۔ لیکن ابا جان کی

اُس کے پاس تھا۔ بلکہ وہ سلیم جو کبھی اُسکا تھا۔ اور جسکی محبت کی لاش کے ساتھ وہ ستی ہو رہی تھی۔

رقعیہ کی تندرستی روز بروز خراب ہونے لگی۔ سلیم نے اُس کو علاج کے لئے آمادہ کرنے میں کوئی خوشامد اُٹھا نہ رکھی۔ سارے گھر نے اصرار کیا۔ لیکن وہ ہمیشہ مذاق میں ٹال دیتی اور کہتی کہ "مجھے وہم کا مرض نہیں ہے۔ میں اتنی بیکار تو ہوں نہیں کہ آپ لوگ میرے لئے شغلہ ڈھونڈھ رہے ہیں"۔

اُس پر سلیم خاموش ہو رہتا اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

جاڑے کا موسم تھا۔ گھر گھر انفلوئنزا پھیلا ہوا تھا۔ رقعیہ کو بھی انفلوئنزا ہوا۔ اس میں خیال ہے کہ اُس نے دیدہ و دانستہ بے احتیاطی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انفلوئنزا نے نمونیا کی شکل اختیار کر لی۔ سلیم نے علاج اور خدمت میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا۔ دن اور رات تیمارداری میں ایک کر دیا۔ ہر مشہور ڈاکٹر کو بلایا لیکن ہوا وہی جو ہونا تھا۔

رقعیہ جانبر نہ ہو سکی۔

چتا سُلگ گئی اور راکھ رہ گئی

تاثیر سحر

از منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی

ہوتی ہے نگاہ دو دل کی سیری اِسوقت　　کرتی ہے صعود روح میری اِسوقت
خود ہی یارب نہ جانے کیسے ہر روز　　آنے لگتی ہے یاد تیری اِسوقت

تہ میں اس کی فراغ بالی بھی ہے　　حرکت یہ رگوں کو دینے والی بھی ہے
ہے صبح صبیح کی منور کیا بات　　اک ساتھ جمالی بھی جلالی بھی ہے

خورشید نے چھیڑا ہے کوئی ساز عجیب　　اسکے پردے میں ہے اک آواز عجیب
نغمے ہیں گلو سوز یہ گویا پیدا　　کرنوں کے چھٹکنے کا ہے انداز عجیب

ہر رنگ عروس تو یہ شرماتی ہیں　　پہلوے سحر کو گو یہ گرماتی ہیں
ہر سمت بکھیر کر تبسم اپنا　　کرنیں سورج کی دل کو برماتی ہیں

رفتارِ زمانہ

(ممالکِ غیر)

جنگ اسپین اور سیاسیاتِ یورپ بارسلونا اور کیٹلونیا (Catalonia) پر جنرل فرانکو کی حکومت قائم ہونیکے بعد کئی چھوٹے چھوٹے یوروپین ممالک نے اور اُن کے بعد فرانس اور برطانیہ نے اُسے تسلیم کرلیا ہے۔ وزیراعظم مسٹر چیمبرلین نے پارلیمنٹ میں بیان کیاکہ یہ فیصلہ اسپین کے موجودہ حالات پر بڑے غور کے بعد کیا گیا ہے۔ کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ اب بارسلونا اور کیٹلونیا کے فتح ہونے کے بعد اسپین کا بیشتر حصہ جنرل فرانکو کے قبضہ اقتدار میں آگیا ہے۔ مسٹر چیمبرلین کے اِس اعلان پر مخالف پارٹی نے "شرم، شرم" کے نعرے بلند کئے اور لیبر پارٹی نے دوسرے ہی دن پارلیمنٹ میں اُس کے متعلق ملامتی ووٹ کی تحریک پیش کردی مگر اس تحریک کے خلاف ۳۴۴ ممبران تھے اور موافقت میں صرف ۱۳۷ ممبران نے رائے دی۔ مسٹر چیمبرلین نے تقریر کے دوران میں نہایت پُرزور طور پر یہ بیان کیاکہ اگر وہ فرانکو کی حکومت تسلیم نہ کرتے تو اس سے جمہوری حکومت کو کچھ مدد نہ ملتی اور سوائے اس کے کہ وہ لڑتی رہتی اور باشندگانِ اسپین مرتے کھپتے رہتے اور کوئی مُفید نتیجہ برآمد نہ ہوتا۔ اب چونکہ اکثر ملکوں نے فرانکو کی فتح تسلیم کرلی ہے۔ امید ہے کہ جمہوری حکومت جنگ کو خواہ مخواہ طول نہ دیگی اور فریقین میں صلح ہوجائے گی۔

اِس سلسلے میں سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنرل فرانکو کی فتحیابی کے بین الاقوامی سیاسیات پر کیا اثرات ہوں گے؟ جنرل فرانکو کو یہ فتح آمران یوروپ سولینی اور ہٹلر کی مدد سے حاصل ہوئی۔ پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی مطلب برآری کا مناسب بندوبست کئے بغیر جنرل فرانکو کو ملک اسپین میں بلا مداخلت حکمرانی کرنے دیں؟ اور جنرل فرانکو کو بھی کیسے یہ جرأت ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے رفیقوں اور مصیبت کے ساتھیوں سے بے نیاز ہوجائیں اس وقت گو جمہوری حکومت کی کمر ٹوٹ گئی ہے اور پریسیڈنٹ آزانہ بھی مستعفی ہوچکے ہیں۔ تاہم جنرل فرانکو کو ملک پر تسلط حاصل کرنے میں قدم قدم پر دشواریاں پیش آئیں گی۔ کیونکہ شکست کے باوجود جمہوریت پسند لوگ اس وقت بھی اسپین میں باقی ہیں اور کم سے کم یہ لوگ تو جنرل فرانکو کی حکومت کو خوشی یا قدر کی نگاہوں سے نہیں دیکھ سکتے نیز اُن کے دلوں سے عام خونریزی کا نقش اور مردوں، عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کے سسک سسک کر دم توڑنے اور برفانی پہاڑیوں کو بڑی مصیبت

سے پار کر کے ملک سے فرار ہونیکے جگرخراش مناظر کی یاد اِس قدر جلد محو نہیں ہوسکتی۔ غرض جنرل فرانکو کو ابھی کم سے کم کچھ عرصہ تک اپنا تسلط جمائے رکھنے کے لیئے اندرونی وبیرونی اتحاد واعانت کی ضرورت ہوگی۔

بہرحال برطانیہ اور فرانس نے دیکھ لیا کہ جو ہونا تھا ہو کر رہا۔ اب یہی مناسب ہے کہ جنرل فرانکو کی تالیف قلب کی جائے۔ چنانچہ انھوں نے مصلحت وقت اِسی میں دیکھی کہ عجلت کے ساتھ اِس کی حکومت تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا جائے۔ ہاں ان دونوں کو یہ ضرور اُمید ہے کہ شاید اب بھی مدبرانہ چالوں سے جنرل فرانکو کو اٹلی اور جرمنی کے اثر سے اِتنا تو ہٹایا ہی جاسکتا ہے کہ وہ جنگ کی صورت میں غیر جانب دارانہ رویہ اختیار کرے۔ خصوصاً جبکہ جغرافیائی حیثیت سے اٹلی اور جرمنی کے مقابلہ میں فرانس اور برطانیہ کو اُس سے کہیں زیادہ قرب حاصل ہے۔ فرانس کی تو سرحدیں ہی اسپین سے ملی ہوئی ہیں۔ اور برطانیہ کے ساتھ اسپین کے تجارتی تعلقات قائم رکھنا خود فرانکو کے حق میں مفید ہوگا۔ آثار سے یہ بھی پایا جاتا ہے کہ جنرل فرانکو بھی فتحیاب ہو جانے کے بعد اِس بات کا خواہاں ہوگا کہ کسی طرح اٹلی کے زور واثر سے گلو خلاصی حاصل کرلے۔ یوں تو اٹلی نے چیمبرلین سے وعدہ کرلیا ہے کہ جنگِ اسپین کے ختم ہو جانے کے بعد اسپین سے اطالوی فوجیں واپس بُلالی جائیں گی اور لڑائی ختم ہونے کے بعد وہ اسپین کے اندرونی معاملات میں کوئی مداخلت روا نہ رکھے گا۔ مگر ہماری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اتنی جان و مال کی قربانی کے بعد اٹلی اب خود اپنی خوشی سے اسپین سے کیسے کنارہ کشی کرسکتا ہے؟ ہمارا تو یہی خیال ہے کہ جرمنی اور اٹلی اسپین میں حتی المقدور اپنا اقتدار ضرور قائم رکھیں گے اور اسپین کے ساحل پر اگر ان ممالک غیر کا کوئی عمل دخل ہوگیا تو پھر یہ ممالک برطانیہ کے لئے کسی وقت خطرناک حریف ثابت ہوسکتے ہیں۔ بہرحال اسپین میں اثر واقتدار حاصل کر کے جرمنی اور اٹلی فرانس سے بھی چھینا جھپٹی کریں گے۔ اگر واقعی حالات نے یہی صورت اختیار کی اور صلح وصفائی سے آپس کے تصفیئے طے نہ ہوسکے تو عالمگیر جنگ ہونے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔

اِدھر اٹلی فرانس سے ٹیونس، جیبوتی اور کارسیکا کی واپسی کا مطالبہ کر رہا ہے۔ اُدھر فرانس نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ اِس مسئلہ پر اٹلی کو بحث ومباحثہ اور گفتگو کرنیکا اختیار تو ہے لیکن اگر اُس نے دھمکیوں سے کام لیا تو اُس کا نتیجہ عموماً سب کیلئے اور خصوصاً اٹلی کے لئے بہت ہی خطرناک ہوگا۔ وزیراعظم برطانیہ کو بھی پس وپیش کے بعد فرانس کی حمایت کا اعلان کرنا پڑا۔ ان حالات میں ممکن ہے کہ اٹلی اپنے مطالبات میں کمی کرکے اور ان مقبوضات کی اطالوی آبادی کے لئے خاص مراعات وحقوق حاصل ہو جانے ہی کو کافی سمجھے اور اگر اٹلی یہ رویہ اختیار کرنے پر رضامند ہوگیا تو وزیراعظم برطانیہ بھی فرانس پر دباؤ ڈال کر فرانس کی اطالوی رعایا کو خاص

حقوق و مراعات دلانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ بہرحال دیکھنا چاہیئے کہ آیندہ کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں؟

مشرق بعید؛ چین و جاپان کی لڑائی بدستور جاری ہے۔ جاپان فتحیاب ہوتا چلا جارہا ہے مگر چین کے حوصلے ابھی تک پست نہیں ہوئے ہیں اور وہ حیرت انگیز استقلال سے کام لے رہا ہے۔ اس جنگ سے قطع نظر اس وقت دُنیا کیلئے مغرب سے کہیں زیادہ مشرق میں لڑائی چھڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ اس وقت برطانیہ، امریکہ، فرانس، روس اور جرمنی سبھی کی توجہ اس طرف مبذول ہے اور ہر ایک کو اپنے اپنے مفاد کیلئے حفاظت کی فکر دامنگیر ہے۔ امریکہ اور برطانیہ تو چین کی حمایت و اعانت کے لئے تیار ہیں۔ امریکہ کو جاپان سے خطرہ ہے۔ اور مشرق بعید میں اپنے اقتصادی فوائد کی حفاظت کے علاوہ اُسے جزایر فلپائن کی حفاظت کی بھی فکر ہے۔ اسی لئے مسٹر روزولٹ صدر امریکہ نے بحر اوقیانوس اور بحرالکاہل میں نئے بحری بیڑے قائم کرنا تجویز کئے ہیں۔ اور گوام کی بندرگاہ کی قلعہ بندی میں ۶۵ کروڑ ڈالر کی کثیر رقم صرف کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان کارروائیوں کی وجہ سے جاپان امریکہ سے بدظن ہورہا ہے مگر خود بھی ایسی ہی کارروائیاں کررہا ہے۔ جس سے برطانیہ، فرانس و امریکہ بھی اُس سے بدظن ہورہے ہیں چنانچہ اب وہ جزیرہ ہائنان (Hai-nan Island.) میں داخل ہوگیا ہے حالانکہ فرانس سے معاہدہ ہوچکا تھا کہ وہ ایسا نہ کریگا بشرطیکہ فرانس چین کو انڈو چائنا (Indo China.) کے ذریعہ جنگی سامان بہم نہ پہونچائے۔ جاپان کہتا ہے کہ فرانس نے شرط پوری نہیں کی اور فرانس کا دعویٰ ہے کہ اُس نے کوئی عہد شکنی نہیں کی اور جاپان کی بدظنی بالکل بے بنیاد ہے۔ بہرصورت سیاسیات میں ایک دوسرے پر بے جا اتہام رکھکر مطلب برآری کا بہانہ نکال لینا معمولی بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت جاپان مغربی بحرالکاہل میں سنگاپور کے بحری مستقر کے مقابلے میں اپنا ہوائی و بحری مستقر قائم کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اسی خیال کی تکمیل کیلئے جاپان کو Hai-nan Island میں اپنا تسلط قائم کرنا لازمی ہوگیا۔ مگر جاپان کی یہ پیشقدمی فرانس و برطانیہ کی ناراضگی کا باعث ہوئی۔

ادھر روس اور جاپان کا معاملہ کچھ ایسا پیچیدہ ہورہا ہے کہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کس وقت یہ دونوں ملک برسرپیکار ہوجائیں۔ روس نے جاپان کو باوجود پُرانے صلحنامہ کے متنبہ کررکھا ہے کہ اُسے بحر جاپان میں ماہی گیری کا کوئی حق حاصل نہیں۔ جاپان نے اُسکا سخت جوابدیا کہ اگر روس اس معاملہ میں مصالحانہ رویہ اختیار نہ کرے گا تو جنگ چھڑ جانے میں کسر نہ ہوگی۔ لیکن ابھی تک یہ معاملہ رُکا تھارہا۔ اب البتہ چونکہ ماہی گیری کا موسم قریب آگیا ہے حکومت جاپان اس مسئلہ کے فوری تصفیہ کی کوشش کررہی ہے۔ چنانچہ جاپانی سفیر مقیم ماسکو کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ حکومت روس کو اپنے رویہ پر نظرثانی کرنے کے لئے سلسلۂ جنبانی کرے، اور اس بات سے متنبہ کردے کہ اگر تسلی بخش طور پر یہ معاملہ طے نہ ہوا تو اب مزید پس و پیش کی گنجائش نہیں ہے اور جاپان جس طرح مناسب سمجھے گا اِس جمود کو توڑ کر اپنا حق حاصل کرلیگا۔ اگر واقعی یہ معاملہ صلح و صفائی سے حل نہ ہوا۔ اور اِن دونوں میں

لڑائی چھڑ گئی تو ہٹلر اپنے معاہدہ کی رُو سے جاپان کی اعانت کریگا۔ اور اس طرح روسی طاقت کو دو طرف کی لڑائی سنبھالنا پڑے گی مگر معاہدۂ جاپان و جرمنی سے پہلے فرانس اور روس کا معاہدہ ہو چکا ہے جس کی رُو سے فرانس کو روس کی اعانت کرنا چاہئے۔ غرض صورت یہ ہوگی کہ اگر جرمنی نے روس پر حملہ کیا تو فرانس اُس پر عقب سے حملہ کرے گا اور جرمنی کو دوہری مشکلات میں پھنس کر جنگ کرنا پڑے گی۔ اگر نوبت یہاں تک پہونچی۔ تو دوسری مغربی سلطنتیں بھی اس جنگ میں گھسٹ آئیں گی اور یہ لڑائی عالمگیر ہو جائے گی۔

بہرحال اسوقت تو جرمنی و دیگر ممالک مغرب دُور اندیشی سے کام لیں گے اور خواہ مخواہ عالمگیر جنگ کے ورطۂ فنا میں پھنسنے سے بچے رہیں گے مگر جرمنی اس خطرہ سے محفوظ رہتے ہوئے بھی شاطرانہ چال کھیلے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر روس اور جاپان میں طاقت آزمائی ہوئی۔ تو جرمنی سارے چیکوسلاویکیہ کو ہڑپ کرلینے کی کوشش کریگا۔ ابھی یقینی طور پر تو کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ بظاہر اسباب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کے امکانات کا سلسلہ بدستور قائم ہے۔

فلسطین کانفرنس | لندن میں دو تین ہفتوں سے فلسطین کانفرنس ہو رہی ہے لیکن ابھی تک کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا ہے۔ پہلے تو عربوں اور یہودیوں میں اِسقدر کشیدگی تھی کہ دونوں نے ایک میز پر بیٹھکر گفتگو کرنیسے انکار کردیا اِس لئے وزیراعظم برطانیہ کو دونوں پارٹیوں کیلئے علیحدہ علیحدہ جلسے منعقد کرنا پڑے۔ مگر اب یہ بات نہیں رہی اور تازہ ترین خبر ہے کہ بالآخر دونوں میں تبادلہ خیالات ہوا گو ابھی تک کسی معاملہ میں بھی اتفاق رائے نہیں ہوا ہے۔ عربوں کا مطالبہ ہے کہ انھیں مکمل فلسطین میں ایک آزاد و خودمختار سلطنت قائم کرنے کی اجازت دیجائے۔ چنانچہ اُن کا بیان ہے کہ ۱۹۱۵ء میں سر ہنری میکمیہن اور شریف حسین کے درمیان جو خط وکتابت ترکی کے خلاف جنگ کے سلسلے میں ہوئی تھی اسمیں عربوں کی آزادی کا معاہدہ بھی شامل تھا۔ برطانیہ کو اس دعویٰ سے اتفاق نہیں ہے۔ اِس لئے اُس نے مجبوراً اپنی رائے اور خواہش کے خلاف باہمی صفائی کی اُمید پر اس خط وکتابت کو تمام وکمال شائع کردیا ہے۔ یہودی قدرتاً عربوں کے اس مطالبہ کے خلاف بڑے زور وشور کے ساتھ صدائے احتجاج بلند کررہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ معاہدۂ مذکور کے مطابق عربوں کو عرب دُنیا (Arab World) میں بیشتر مقامات پر آزادی دیجا چکی ہے خصوصاً سعودی عرب، عراق، یمن اور کم وبیش ملک شام اور شرق اردن (Transjordan.) میں۔ مگر فلسطین کو عمداً و قصداً جائز طور پر اس معاہدہ کے عملدرآمد سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے اُن کا دعویٰ ہے کہ اعلان بالفور کی رُو سے فلسطین اُن کا قومی وطن قرار پایا ہے اِس لئے فلسطین میں یہودیوں کی مسلسل آمد کے خلاف عربوں کی شکایت بیجا ہے۔ کیونکہ یوروپ خصوصاً جرمنی میں یہودیوں کیساتھ تشدد دیجا ہو رہا ہے اسی وجہ سے فلسطین میں آباد ہونے والے یہودیوں کی تعداد دو چار ہزار افراد سالانہ سے بڑھکر ساٹھ ستر ہزار تک ہوگئی ہے۔ اسی لئے عربوں کا مطالبہ ہے کہ یہودیوں کا مزید داخلہ بند کیا جائے۔ اِس سلسلہ میں لارڈ طیسیول نے

تجویز کیا ہے کہ ایک مدت معینہ کے لئے عربوں اور یہودیوں کی آبادی کی نسبت ۶۰ و ۴۰ مقرر کردی جائے۔

اسوقت عربوں کو مکمل آزادی دیکر یہودیوں کو اُن کے نظرِ ترحم کے حوالہ کر دینا بھی دُرست نہیں۔ کیونکہ یہودیوں کا یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے کہ اُنھوں نے اربوں روپیہ خرچ کرکے فلسطین کی اقتصادی تعمیر کی ہے۔ جس سے عربوں کا معیار زندگی بہت بلند ہوگیا ہے۔ یہودیوں کو بھی عربوں کے مطالبات کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے اور فلسطین میں یہودیوں کی مزید آمد کی روک تھام قبول کرکے تحفظات کے زیر سایہ ایک قلیل تعداد جماعت کی حیثیت سے رہنا منظور کرلینا چاہیئے۔ آجکل کچھ اسی قسم کی گفتگو بھی ہورہی ہے اسوقت اہم سوال یہ ہے کہ عربوں کو آزادی دیکھے بعد یہودیوں کے تحفظ کے لئے کیا تدابیر ضروری ہونگی۔ فلسطین میں مجلس قانون ساز کے قائم کئے جانے کی تجویز زیر غور ہے مگر عرب نمایندے اِس قدر جان و مال کی قربانی کرنے کے بعد یہ نظام حکومت قابلِ قبول نہیں سمجھتے۔ دیکھئے فریقین مصالحانہ رویہ اختیار کرتے ہیں یا کشت و خون اور غارتگری کا دور ابھی کچھ دنوں تک اور جاری رہتا ہے۔ مگر اس کا نتیجہ کسی کے لئے بھی اچھا نہ ہوگا۔

:-(ہندوستان):-

کانگریس کی پوزیشن | فیڈریشن کے مقابلہ کے لئے جہاں یہ ضروری ہے کہ ہندو مسلم اتحاد ہوجائے۔ وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ دوسری سیاسی پارٹیاں بھی اپنے اختلافات رفع کرنے کی مناسب تدابیر اختیار کریں مگر ملک کی بدنصیبی ہے کہ کچھ دنوں سے خود کانگریس میں اختلافات بڑھ گئے ہیں۔ چاہیئے تو یہ کہ کانگریس کے دائیں بائیں بازو اپنے باہمی اختلافات مٹا کر ایک متفقہ محاذ پیش کریں۔ لیکن حالات بالکل اُس کے برعکس ہیں، کانگریس کے بزرگ تجربہ کار رہنما جو مہاتما گاندھی کے ہمخیال ہیں فیڈریشن اور جنگ آزادی کے معاملہ میں صرف پُرامن طریقوں پر عملدرآمد کرنا چاہتے ہیں۔ اُنھوں نے سابقہ جدوجہد اور موجودہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اِس بات کا بخوبی اندازہ کرلیا ہے کہ ملک کسقدر قربانی کرنے کو تیار ہے نیز ملک میں اندرونی امن و امان قائم رکھنے کے لئے کونسا رویہ بہتر ہوگا۔ مگر یہ نقطۂ نگاہ صدر کانگریس مسٹر بوس کو پسند نہیں آیا۔ چنانچہ اُنھوں نے دُوراندیشی اور مصلحت بینی سے کام لینے کے بجائے خواہ مخواہ مہاتما گاندھی اور اُن کے ہمخیال کانگریسی لیڈروں پر یہ الزام لگادیا کہ وہ فیڈریشن کے متعلق حکومت برطانیہ سے سازباز کر رہے ہیں۔ مسٹر بوس کے اِس الزام بیجا پر ورکنگ کمیٹی کے بارہ ۱۲ ممبران نے جو مہاتما گاندھی کے ہم نوا اور ہمخیال ہیں، استعفا دے دیا تاکہ مسٹر بوس اپنے مجوزہ پروگرام پر عملدرآمد کے لئے اپنے حسب منشار اپنے رفیقانِ کار منتخب کرکے نئی ورکنگ کمیٹی مرتب کرسکیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے مسٹر بوس سے ان الزامات کو جو اُنھوں نے کانگریسی لیڈروں پر لگائے ہیں، واپس لینے کی اپیل کی۔ مگر مسٹر بوس نے اس کو پسند نہیں کیا۔ بلکہ اُنھوں نے بارہ ۱۲ ممبروں کے استعفے کو

منظور کرنے میں بھی پس و پیش نہیں کیا۔ اس پر پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی صدر کانگریس کو لکھدیا کہ موجودہ حالات میں وہ کمیٹی میں رہ کر نہ تو صدر کانگریس کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ ملک ہی کو کوئی فائدہ پہونچا سکتے ہیں۔ ممبران ورکنگ کمیٹی نے جو مستعفی ہو چکے ہیں، مسٹر بوس کو اس امر کا یقین دلایا ہے کہ وہ اُن کے پروگرام میں خواہ مخواہ مزاحم نہ ہوں گے۔ اور جن مدات میں اُنھیں اُن کے پروگرام سے اتفاق ہوگا۔ اُن میں وہ ان کا پورا ساتھ دیں گے۔ مگر ہم اسے ملک کی بدنصیبی سمجھتے ہیں کہ کانگریس کی باگ ڈور ایسے نازک وقت پر ایسے رہنمایاں کے ہاتھ میں چلی جائے جو ابھی عمر و تجربہ میں نسبتاً کم اور مزاج اور خیالات کی رُو سے انتہا پسند واقع ہوئے ہیں خصوصاً اِس صورت میں جب یہ طبقہ فوری جوش میں اُن بزرگانِ قوم کو بھی جنھیں ملک کی دوسری سیاسی پارٹیاں انتہا پسند خیال کرتی ہیں رجعت پسند گردانتا ہے۔ بہرحال دیکھئے آیندہ حالات کیا صورت اختیار کرتے ہیں۔ کانگریس کا آیندہ اجلاس ۱۰۔ لغایت ۱۲۔ مارچ ہوگا ہمیں توقع ہے کہ اِس موقع پر اہلِ ملک مہاتما گاندھی اور اُن کے پروگرام ہی پر عمل کرنا پسند کریں گے اور مسٹر بوس بھی ضبط و مصلحت سے کام لے کر اپنے ساتھیوں کو مہاتما گاندھی کے اصولوں کو قبول کرنے کی رائے دیں گے۔

آل انڈیا ریاستی پرجا کانفرنس — فیڈریشن کے علاوہ ہندوستان کا سب سے اہم مسئلہ ریاستوں کی بدنظمیاں مٹانا ہے۔ چنانچہ اس وقت تمام ملک کے لیڈروں کی تمام تر توجہ اُنھیں دو باتوں پر مرکوز ہے۔ دیسی ریاستوں کی رعایا کے حقوق کی حفاظت کے لئے کئی سال سے پرجا منڈل قائم ہے جس کا سالانہ جلسہ "آل انڈیا اسٹیٹس پیپلز کانفرنس" کے نام سے کئی سال سے ہو رہا ہے۔ اِس مرتبہ اس کا چھٹا اجلاس لدھیانہ میں پنڈت جواہر لال نہرو کی زیرِ صدارت ہوا۔ اِس کانفرنس میں ریاستوں کے اُن معاہدوں کے متعلق جو اب سے سَو سال پہلے "ایسٹ انڈیا کمپنی" کی عملداری میں ریاستوں اور برطانیہ کے درمیان ہوئے تھے کئی ریزولیوشن پاس ہوئے اور اِس بات پر خاص طور سے زور دیا گیا کہ ان معاہدوں میں رعایا کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے، اور یہ معاہدے خود پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے زیرِ ہدایت وحسبِ منشاء ملک معظم شہنشاہ ہند بارہا منسوخ کئے جا چکے ہیں۔ لہٰذا ریاستوں کی رعایا پر اُن کی رُو سے خواہ مخواہ پابندیاں عائد کر کے اُن کی آئینی ترقی کا دروازہ مسدود نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ سول آزادی سے متعلق بھی ایک ریزولیوشن مسٹر شاکر علی خاں ریاست بھوپال کی طرف سے پیش ہو کر پاس ہوا۔

پنڈت جواہر لال نہرو صاحب کی صدارتی تقریر پُر زور تھی۔ اسمیں اُنھوں نے ریاستوں کے متعلق کانگریس کی سابقہ اور موجودہ پالیسی کے رجحان کو درست قرار دیتے ہوئے کہا کہ حالات کی تبدیلی کے ساتھ پالیسی بھی بدلتی رہتی ہے۔ جب تک کانگریس کو یہ خیال رہا کہ ریاستوں کے لوگ سیاسی حقوق کے لئے تیار نہیں ہیں اُسوقت

تک یہی مناسب سمجھا گیا کہ کانگریس اس بارے میں جو کوشش کرے وہ باہر ہی سے کرے۔ کیونکہ اِس طریقہ سے ریاست کے لوگوں پر بہت اچھا اثر پڑنے کی اُمید تھی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مگر اب ریاستوں کی رعایا جنگ آزادی کے لئے تیار ہوگئی ہے اور وہ آزادی کی جدوجہد میں برطانوی علاقہ جات کے ہندوستانیوں سے پیچھے نہیں رہنا چاہتی۔ ہری پورہ کانگریس میں ریاستوں کے متعلق جو ریزولیوشن پاس ہوا تھا۔ اُس سے کانگریس پالسی کے ارتقا کی کیفیت پوری طور پر ظاہر ہوتی ہے۔

واقعی آزادی کے لئے ہندوستان کے کسی حصہ میں بھی کوئی جدوجہد ہو، وہ کل ملک کی آزادی سے وابستہ ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ امر مسلمہ ہے کہ ریاستوں کے ہندوستانیوں اور برٹش انڈیا کے ہندوستانیوں میں کسی قسم کی کوئی غیریت یا تفریق نہیں ہے۔ اِسی لئے کانگریس نے مکمل ذمہ دارانہ حکومت اور ریاستوں میں شہری آزادی کی گارنٹی کا اعلان کیا اور اِسکو بھی واضح کردیا کہ اُسے ریاستوں میں بھی آزادی کے لئے سرگرم کار ہونے کا پورا حق حاصل ہے۔ بقول صاحب صدر ہندوستان میں تقریباً ۶۰۰ ریاستیں ہیں۔ جن میں سے اکثر میں رجعت پسندی اور مطلق العنانی کا دور دورہ ہے۔ اس کی اصلی ذمہ داری برٹش امپیریلزم پر ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس طرزِ حکومت سے برطانوی حکمرانی کو تقویت پہونچتی ہے۔ یہ بھی امر مسلمہ ہے کہ ایسی مطلق العنانی اب دُنیا کے کسی دوسرے حصہ میں قائم نہیں رہی اسلئے ہندوستان میں بھی اب یہ حالت باقی نہ رہنا چاہئیے۔

ریاستوں کی آزادی کے معاہدہ کے متعلق نہرو صاحب نے کہا کہ موجودہ بین الاقوامی سیاسیات نے لوگوں کی آنکھیں کھول دی ہیں کہ جب امپیریلزم کے راستے میں کوئی معاہدہ باعثِ زحمت ہوتا ہے تو اُسکی دھجیاں اُڑادی جاتی ہیں۔ بہرحال ان معاہدوں کے سہارے پر ریاستوں میں مطلق العنانی کا قائم رکھنا کل ہندوستان کی آئینی ترقی میں سدِ راہ ہوگا۔ کیونکہ فیڈریشن کا نفاذ ہندوستان کے لئے اُسی وقت مفید ہوسکتا ہے جب تمام بڑی ریاستوں میں بھی ذمہ دار طرزِ حکومت قائم ہوجائے۔

اِسوقت ریاستوں کی رعایا سے جو ٹکر ہورہی ہے وہ بظاہر والیانِ ریاست سے ہے لیکن یہ درحقیقت برٹش امپیریلزم سے ہے۔ جو اپنے ایجنٹوں اور ریزیڈنٹوں کے ذریعے اقتدار قائم کئے ہوئے ہے۔ اور یہ کوشش بھی ہورہی ہے کہ عوام کی تحریک کو کچل دیا جائے۔ پنڈت جواہرلال کی رائے میں اگر یہ رویہ جاری رکھا گیا تو کانگریس پوری طاقت، مگر پُرامن طریقہ سے مداخلت کرے گی۔ آپ نے یہ بھی واضح کیا کہ بعض والیانِ ریاست اپنی رعایا کو شہری آزادی سے محروم رکھنے کے لئے خدا معلوم کیا کیا تدابیر اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً راجپوتانہ کی ایک ریاست میں ٹائپ رائٹر رکھنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ ریاست کشمیر میں ایسا قانون ہے جو چند سال پیشتر برما میں بغاوت فرو کرنے کے لئے نافذ کیا گیا تھا۔ ریاست حیدرآباد میں لوگوں کی

شہری آزادی بہت ہی محدود ہے۔ راجکوٹ اور جے پور کے معاملات آل انڈیا حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ بہر نوع اب ریاستوں میں عوام کی تحریک بڑھ رہی ہے اور آیندہ اس میں مزید ترقی ہوگی۔ کشمیر میں تو اکثر ذی فہم ہندوؤں اور سکھوں نے ذمہ دار حکومت کے مطالبہ کی حمایت کی ہے۔ حیدرآباد کے متعلق بھی ذی فہم مسلمانوں کو ایسا ہی کرنا چاہیئے۔

ریاستہائے اڑیسہ | پنڈت صاحب کی رائیں اپنی جگہ پر درست ہیں لیکن اب برٹش گورنمنٹ بھی ریاستوں کے نظامِ حکومت میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کر چکی ہے۔ چنانچہ حال ہی میں صاحب وزیر ہند اور وائسرائے ہند نے اس کے متعلق اہم اعلانات کئے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ نے اڑیسہ کی بعض ریاستوں سے مندرجہ ذیل امور کی بابت فوری رپورٹ طلب کی ہے۔

(۱) بجٹ کی تفصیلات اور اُس پر عملدرآمد کا کیا طریقہ ہے؟

(۲) ریاستوں کی شرح لگان و مالگذاری اور اُن کے قریبی برٹش صوبجات کی شرح رائج الوقت کیا ہے؟

(۳) معافی مالگذاری، لگان اور چھوٹ کے کیا قاعدے ہیں، اور اُن قواعد میں اور قریبی برٹش صوبجات کے قواعد و ضوابط میں کیا فرق ہے؟

(۴) جملہ ٹیکسوں کی تفصیل۔ نیز اُن زائد ٹیکسوں کی فہرست جو ریاستوں میں نافذ ہیں مگر قرب وجوار کی برٹش عملداری میں نہیں ہیں۔

(۵) جن ریاستوں میں رعایا کی کوئی نمایندہ جماعتیں قائم ہوں، اُن کی ترکیب و تشکیل کی تفصیلات۔

اِس سلسلے میں ریاستوں نے رعایا کے ساتھ جو مراعات کی ہوں۔ اُن کی تفصیلات بھی طلب کی گئی ہیں۔ اور یہ بھی ہدایت ہے کہ اس فہرست میں جن شکایات کی تلافی کا اہتمام کیا گیا ہو اُن کا ذکر بھی آجائے۔

ان سب باتوں سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ قوت بالادست کم از کم اب ریاستوں کی آئینی ترقی کے خلاف نہیں ہے۔

وزارت سندھ | وزیر اعظم سندھ خان بہادر اللہ بخش بڑے دم خم کے آدمی معلوم ہوتے ہیں کیونکہ کسی عنوان سے بھی وہ اپنی وزارت کو فرقہ وارانہ اصول کی بُنیاد پر مسلم لیگ سے وابستہ کرنا نہیں چاہتے۔ ایسی صورت میں کانگریس کو اُن کی پوری اعانت کرنا چاہیئے۔ خصوصاً جبکہ خان بہادر موصوف کو خدمتِ ملک اور آئینی ترقی کے نصب العین کے متعلق کانگریس سے اتفاق ہے۔ ہماری رائے میں کانگریس نے سندھ اسمبلی میں جو غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کیا وہ سراسر مصلحتِ وقت کے خلاف ہے۔ اسی طرح کانگریس کو بنگال میں بھی جو موقع ملا تھا۔ اُس کو ہاتھ سے جانے دینا سخت غلطی تھی ورنہ اس وقت بنگال کی پوزیشن بھی ویسی ہی ہوتی، جیسی کہ اب سندھ کی ہوگئی ہے اور بنگالیوں کو دیگر صوبوں کے کانگریسی رہنماؤں سے مخالفت کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔

شکار

یہ تصویر غالباً چاند بی بی ملکہ بیجاپور کی ہے۔ جو اٹھارہویں صدی کی مصوری (دور عہد مغلیہ) کے آرٹ کا نمونہ ہے



Engraved by Colortype Co.

زمانہ

جلد ۶۲ — اپریل سنہ ۱۹۲۹ء — نمبر ۴

ادب کی پیدائش

(از منشی رام سروپ بھٹناگر کامل، ہیڈ مولوی گورنمنٹ ہائی اسکول شاہجہانپور)

علم ادب کی تحقیقات کا سلسلہ ہر زمانہ میں مصنفین کا دلچسپ مشغلہ رہا ہے۔ ہزارہا تصانیف میں علم ادب کے متعلق نئے ڈھنگ سے عاقلانہ بحث کی گئی ہے، اس کے علاوہ اور بھی بہت سا مواد موجود ہے جس سے ہر زمانہ میں علمی ذوق رکھنے والی طبائع جدید معلومات سے متاثر ہوتی رہی ہیں۔ لیکن ان تمام تصانیف میں ارسطو کی مایۂ ناز تصنیف "شعریات" کا پایہ بہت بلند ہے۔ اس گرانمایہ تصنیف کو دیکھکر ارسطو کی علمی تلاش و تجسس، صبر و استقلال، مدتوں کی جانگداز سعی اور سالہا سال کی عرقریزی ناظرین کو متحیر کر دیتی ہے۔

ارسطو نے اس مشہور تصنیف میں ہر تنقیدی پہلو پر نظر ڈالتے ہوئے مختلف نقطۂ خیال سے علم ادب پر روشنی ڈالی ہے، اور تمام اصناف شاعری پر اظہار رائے کیا ہے۔ اس کی ہر ایک بحث بیحد معلومات اور نکات پر مبنی ہے۔ محاسنِ ادب، اُن کے نتائج اور اثرات بتانے کی کافی کوشش کی ہے۔ اس کے دل کو یہ خیال ہمیشہ گدگداتا رہا ہے کہ آخر وہ کیا اسباب تھے جنھوں نے انسان کو ادبی تصنیف، انشا پردازی اور شاعری کی طرف متوجہ کیا وہ اس سوال کا خود ہی ان الفاظ میں جواب دیتا ہے کہ قدرت نے اول ہی روز انسانی طبیعت میں جہاں اور عادتیں ودیعت کیں، وہاں تقلید اور نقالی کی خصلت بھی عطا کی۔

انسان کی طبیعت روز ازل سے اثر پذیر واقع ہوئی ہے، ہر خوشنما چیز دیکھکر اس کے جسم میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ ہر دلکش سین اس کے جذبات کو برانگیختہ کرنے میں جادو اثر ثابت ہوتا ہے، اور جہاں

انسان کا دل ان جذبات سے متاثر ہو کر بے قابو ہوا اور اس پر کیف بیخودی طاری ہوا تو فوراً وہ جذبات الفاظ کی صورت میں موزوں طریقہ پر ڈھل کر زبان سے نکلنے لگے۔ اسی کا نام شاعری ہے، اور چونکہ فطرت نے انسان کو اپنا ایک شریک رنج و راحت اور معاون و ہمراز تلاش کرنے پر مجبور کر دیا ہے اس لئے وہ اپنے جذبات سے دوسروں کو محظوظ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ ایک شاعر اپنا کلام دوسروں کو سنا کر اپنے جذبات کی داد پانے کی خواہش رکھتا ہے۔ انھیں دو خصلتوں کی بنا پر انسان کے ادبی کارناموں کی مکمل فہرست بنانا محال ہے۔

ارسطو کا خیال سچا خیال ہے کہ علمی ارتقا کی صناعیاں و نیز تصنیفات کا وجود انھیں خصائل انسانی کے علمی نتائج ہیں اور امر واقعہ ہے کہ ان خصائل کے بغیر ان کا وجود ناممکن تھا

ارسطو نے اسی سلسلہ میں یہ بھی بتلایا ہے کہ اس تقلید کو عکاسی (Photography) سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی، بلکہ یہ نقاشی اور مصوری ہے مصور (شاعر) ایک سین کا چربہ لیتا ہے، ضروری باتیں دکھاتا ہے معمولی باتوں کو دھندلا کر دیتا ہے، غیر ضروری باتوں کی جگہ خالی چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن فوٹوگرافر یہ عمل کامیابی کے ساتھ نہیں کر سکتا۔

ارسطو اور افلاطون کی شاعری کے متعلق تخئیل کی جنگ نے ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی ہے۔ ہر خیال کے پیرو ایک خاص تعداد میں موجود ہیں، ارسطو کا خیال تو معلوم ہی ہو چکا

افلاطون کا شاعری کے متعلق خیال ہے کہ "تخئیلی یا تخلیقی ادب ایک شئے مہمل ہے جس کی بنیاد محض دھوکے پر قائم اور یہ صداقت سے بالکل عاری ہے۔" اس کے بعد اس کا جواب افلاطون ہی کے بیان سے ان الفاظ میں ملتا ہے کہ بے شبہ کسی آرٹ اور کسی فن جمیل میں ظاہر طور پر صداقت نہیں ہوتی۔ لیکن جس قدر بھی صداقت ہوتی ہے وہ اس قدر بہتم بالشان ہوتی ہے کہ جس قدر اس کا سمجھنا دشوار ہوتا ہے اُسی قدر اُس کا جاننا ضروری اور خوشگوار ہوتا ہے۔

افلاطون کے نقطۂ خیال سے ڈراما ایک دھوکا، مخرب اخلاق عمل اور گرا ہوا تمدن ہے۔ لیکن ارسطو تمدن کی بنا پر ڈرامہ کو انسانی ضروریات کا ایک ضروری حصہ تصور کرتا ہے۔ ارسطو کا یہ خیال کسی ثبوت کا محتاج نہیں ہے، کیونکہ ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ رنجیدہ انسان کا رنج کسی طریقہ سے اس قدر جلد دُور نہیں ہوتا جتنا کہ ایک پُر لطف ڈرامے یا فلم کے دیکھنے سے۔ کوئی عبرت انگیز واقعہ یا مسرت خیز تذکرہ ہر وقت اور ہر ساعت انسان کے سامنے نہیں ہوتا۔ اب اگر اس کی نقل شعر، تصویر، ڈرامہ یا فلم کے ذریعہ سے دکھائی جائے تو وہ بہت زیادہ موثر، عبرت خیز اور سبق آموز ہو جاتا ہے۔ یہی نکتہ ہے جس نے انسان

کی فطرت پرست طبیعت کو جمالیات سے بہرہ اندوز ہونے کا شائق بنا دیا ہے۔ اسی خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے نیومن (New man) نے ارسطو کے خیال کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

"ادب خارجی صداقت کو نہیں بلکہ داخلی کو، اشیاء کو نہیں بلکہ خیالات کو پیش کرتا ہے۔"

علم ادب کی تخلیق کے متعلق فرانس کے ایک مشہور نقاد گوسائین کا خیال ارسطو کی رائے سے سبقت لے گیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ "وہ کیا خاص شئے ہے جو انسان کو فنون لطیفہ کی تحصیل کی طرف مائل کرتی ہے؟ کیا تقلید کی خواہش کے علاوہ وہ اور بھی کوئی شئے ہوسکتی ہے؟" گوسائین کا خیال ہے کہ جب کوئی نئی وضع کی چیز پہلی مرتبہ نظر کے سامنے آتی ہے تو دماغ میں اس کے متعلق مختلف خیالات پیدا ہوتے ہیں انھیں خیالات کے مناسب وموزوں اظہار کا نام "ادب" ہے۔

اس قول کی نیومن کے آخری فقرے سے بھی تائید ہوتی ہے۔

گوسائین کا خیال یہ بھی ہے کہ جسمانی حسن میں ایک خاص قسم کی کمی رہتی ہے جس کے دور کرنے کے لئے ادب کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے متعلق وہ کہتا ہے کہ وہ کمی حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت کا نہ ہونا ہے۔ جس کی تلافی ادبی تخلیقات ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ نیومن (New man) نے جو کچھ کہا ہے صرف کانوں کے بیرونی پردوں تک محدود ہے۔ چونکہ لوگ اپنے اقوال، نصائح اور خصوصیات آئندہ نسلوں تک پہونچانے پر مجبور ہیں اس لئے انھیں مجبوراً ادبیات سے مدد لینا پڑتی ہے۔ دراصل انسان کے دل میں نمایش پسندی اور دوسروں کو محظوظ کرنے کا قدرتی مادّہ ہے۔ جو اُس کو ادبی تخلیق کی طرف مائل کرتا ہے۔

(۲)

ادب کے دو پہلو ہیں نظم ونثر، ان کی بھی کئی اصناف ہیں جو کسی اصول پر مبنی ہونے کی وجہ سے یکجا ترتیب نہیں دیئے جاسکتے۔ تاہم ذیل میں مختصراً قلمبند کی جاتی ہیں:۔

قسم ادب	خارجی	داخلی	مشترک
نظم	رزمیہ	عشقیہ	ڈرامہ
نثر	تاریخی	فلسفیانہ	ادبی

بعض مصنفین زبان اُردو نے ادب کی تقسیم کا جداگانہ پہلو اختیار کیا ہے، ان کی رائے میں ادب کی صنف میں یہ بھی ہے جس میں کسی شاعر یا کسی انشاپرداز کے کسی کارنامے پر تبصرہ کیا جائے مثلاً شبلی کی شعرالعجم اور موازنہ انیس ودبیر وغیرہ۔ اس نقطہ خیال سے ادب کی دوسری قسم وہ ہے

اسی قدر نظم میں جوش اور فرحت بخش نشاط ہوتا ہے۔
ایک مشہور ادیب کا قول ہے کہ "شاعری تخئیل کی پُر نور آنکھ ہے اور فلسفہ اونگھنے والی پلکیں
جرمنی کے ایک مشہور ادیب نے ایک کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ " شاعری انسان کی
مادری زبان ہے" یعنی جوش کی حالت میں انسان جو کچھ کہہ اُٹھتا ہے وہی اصلی شاعری ہے۔
مکالے نے شاعری کو ایک دلچسپ پیرائے میں یوں بیان کیا ہے کہ ہمارے جذبات اور خیالات
کی سچی تصویر جس کو دل کی پوشیدہ آنکھوں نے نظر غور سے دیکھا اور دل نے قبول کیا وہی شعر ہے اور
الفاظ وہ لکیریں ہیں جن سے اس تصویر کا خاکہ تیار ہوتا ہے۔ مناسب اور با موقع الفاظ شعر میں وہی
حیثیت رکھتے ہیں جو عمدہ تصویر میں نقاش کے رنگ اور بیل بوٹے۔
بلا شبہ شاعری دل کی ترجمانی کرتی ہے، وہ ایک زندہ جادو ہے جس کا اثر مردہ رگوں اور افسردہ
دلوں پر فوری ہوتا ہے۔ جس طرح ایک ساز افسردہ جذبات انسانی کو از سرنو زندگی بخشتا ہے، اسی طرح
شعر بھی مردہ دلوں میں مسرت کی لہر بجلی کی طرح دوڑا کر انسان کو از خود رفتہ کر دیتا ہے۔ شاعری ہی کی
بدولت انسان میں جذبات اور حسیات زندہ ہیں، ورنہ مصائب دنیوی کے ہاتھوں انسان اب
تک بالکل پامال ہو گیا ہوتا۔
امریکہ کا مشہور انشاپرداز ایمرسن کہتا ہے کہ جس طرح مکھی پھولوں سے رس چوس کر پھر اُگل
دیتی ہے اور وہ رس شہد کہلاتا ہے، اسی طرح شاعر ہر وقت لوگوں سے مختلف باتیں سنا کرتا ہے اور
جب وہ ان کا اعادہ کرتا ہے تو اس کا کلام ان سے بہت بالاتر ہو جاتا ہے۔
غرض شاعر خدا اور انسان کا درمیانی ترجمان ہے اور روح اور مادّہ کے درمیان گفتگو کرتا ہے
وہ غیر معمولی اور اہم باتوں کو بالکل معمولی حیثیت سے پیش کرتا ہے اور اہم مسئلوں کو آسان تر کر دکھاتا
ہے۔ ناممکنات کو ممکنات اور ممکنات کو محالات میں تبدیل کر دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے جب
چاہے حشر برپا کر دے، خدا کو انصاف کرنے پر مجبور کرے۔ اپنے گناہ محض معمولی باتوں سے بخشوالے
غرض شاعر خدا کا خاص بندہ اور شعر اس کا ایک خاص معجزہ ہے جو خداوند کریم نے شاعر کو مخصوص
طور پر عطا کیا ہے۔ عوام کی نظر پہاڑ، کوہ آتش فشاں، دریا کی روانی، سمندر اور اُس کی لہروں، چاند
سورج وغیرہ وغیرہ سے بخوبی آشنا ہو سکتی ہے۔ لیکن شاعر کی نظر وہ دیکھتی ہے جس کے دیکھنے سے
نظریں قاصر رہتی ہیں۔ شاعر ایک اشارہ میں، ذرا سی حرکت میں فطرت کے چہرے سے نقاب اُلٹ دیتا ہے
اور چمنستان کی ہر پتّی زبانِ حال سے کہنے لگتی ہے:۔

صبا ہر گل سے، ہر غنچے سے، ہر پتّی سے ملتی ہے
ہلا کر شاخ کہتی ہے، کہاں ہے تو، کہاں ہے تو؟

انسان توہمات میں، مشکلات میں، پریشانیوں میں گرفتار ہے۔ واقعات کی تصویریں اس کے سامنے متحرک ہیں لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ شاعر آتا ہے آنکھوں سے حجاب کو اُٹھا دیتا ہے، ان پر حقیقت جلوہ فگن ہوتی ہے، اور وہ گتھیاں جو فلسفہ اور منطق کا ایک دفتر عمر بھر میں نہ سلجھا سکا تھا، فطرت میں ڈوبا ہوا شاعر اُن کو کھول دیتا ہے اور تمام مشکلیں کافور ہو جاتی ہیں۔

لی ہنٹ کی رائے ہے کہ اگر کوئی شخص دریافت کرے کہ اچھے شاعروں میں کیا فرق ہوتا ہے اور اس کے دریافت کرنے کا کیا طریقہ ہے تو ہم اس سے یہ کہیں گے کہ وہ اچھے شاعروں کا اچھی طرح مطالعہ کرے اور اچھے شعر کو اچھا ہی سمجھے اور ضد کی بنا پر اُن کو بُرا نہ سمجھے۔

شاعر کی دنیا، اس کا آسمان، اس کی زمین، اس کے اصول، اس کا مذہب، اس کا ایمان، اس کے قوانین، اس کا معشوق، اس کا خدا، اُس کا وجود، اس کا طریق سوال وجواب، اس کی نظر کی وسعت، اُس کی فیاضی، غرض کہ اس کی دنیا کی ہر ایک چیز ایک نئے ڈھنگ اور وضع کی ہے، جس کا جواب نہیں۔ مثلاً ملاحظہ ہو:۔

بندہ نوازیوں پہ خدائے کریم تھا	کرتا نہ میں گنہ تو گناہِ عظیم تھا
کھول تو آنکھ ذرا دیکھ تماشا کیا ہے	وہم ہے یا کہ حقیقت ہے یہ دنیا کیا ہے
بیگناہوں میں چلا زاہد جو اُس کو ڈھونڈنے	مغفرت بولی ادھر آ میں گنہگاروں میں ہوں
زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب	موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا
قیودِ مذہب و ملت خدا سے دُور رکھتی ہیں	حقیقت میں یہ سب پابندیاں دشمن ہیں ایماں کی

عمدہ شاعر یا سچا ادیب بننے کے واسطے یہ ضروری ہے کہ وہ عمدہ اشعار کو عمدہ خیال کرتے ہوئے یہ فکر کرے کہ انھیں اشعار کی بنا پر دنیا میں شاعر کا نام مشہور ہوتا ہے۔

کالرج کہتا ہے، میں اپنی شاعری اور تصنیفات سے کسی قسم کا کوئی خارجی فائدہ اُٹھانے کا متمنی نہیں، کیونکہ میں اپنی شاعری سے بہت کچھ استفادہ کر چکا ہوں۔ اِن اشعار نے رنج وغم کی حالت میں مجھے تسلی دی ہے۔ تفکرات میں اطمینان بخشا ہے۔ دراصل شاعری نے میری طبیعت کو اس بات کا عادی بنا دیا ہے کہ میں ہمیشہ ہر شئے کو محبت کی نگاہوں سے دیکھوں۔

ورڈسورتھ کا مضمون "شاعر کیا ہے؟" قابل ملاحظہ ہے، شاعر کیا ہے اور کس سے مخاطب ہوتا ہے

۔اس کی نسبت ہم یہ کہیں گے کہ شاعر ایک انسان ہے اور انسان ہی سے مخاطب ہوتا ہے، مگر یہ ایسا انسان ہے جس کی روح دوسرے انسانوں سے مختلف ہوتی ہے۔ اس کے معلومات، جوش طبع، فطرت اخلاق۔ جذبات اور حسیات، دوسرے انسانوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ ممتاز ہوتی ہیں۔ سب سنتے ہیں مگر یہ دیکھتا ہے اور اس کو چمنستان عالم کی ہر پتی میں ایک نگار خانہ نظر آتا ہے۔ ریگستان کا ہر ذرہ اُسے آئینۂ حقیقت معلوم ہوتا ہے۔ اس کی خاص صفت یہ ہے کہ وہ جس طرح دنیا کی موجودہ اشیاء سے لطف اندوز ہوتا ہے اسی طرح خیالی چیزوں کا نظارہ کرکے مزے لیتا ہے۔ وہ دنیا کی ہر شئے کو گہری نظر سے دیکھتا ہے اور اس میں وہ نکات پیدا کرتا ہے کہ ایک عام آدمی کی نظر وہاں تک پہونچ ہی نہیں سکتی اور نہ اس قدر حقایق کا ذخیرہ ایک معمولی شخص کے ذہن میں جمع ہو سکتا ہے۔

نثر: نثر نظم کے عکس قافیہ یا بحر کی پابندی سے آزاد ہے۔ موضوع کے لحاظ سے بھی نثر کو بہت آزادی حاصل ہے۔ اس وجہ سے نثر لکھنا مشکل نہیں ہے، اور ہر شخص نثار ہو سکتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ قدرتی طور پر ہر شخص نثار ہے۔ اعلیٰ درجہ کی نثر کا معیار یہ ہے کہ اُس کو پڑھتے وقت آواز میں ایک خاص قسم کی دلآویزی پیدا ہو جائے۔ نثر کا ہر جملہ اس قدر صاف ہونا چاہئیے کہ اظہار مطلب میں کسی دوسرے لفظ یا فقرہ یا جملہ کا محتاج نہ ہو۔ ایک جملہ کا دوسرے جملہ سے اور ایک پیراگراف کا دوسرے سے ایسا ربط ہو کہ سلسلۂ عبارت میں کہیں رکاوٹ نہ پیدا ہو۔

نثار کی کامیابی یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے اُسے ایسے پیرایہ میں کہے کہ سننے والے کے دل ودماغ پر وہی اثر پیدا ہو جسے وہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔

ہر نثار کی انشا پردازی جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کہنا محض خام خیالی ہے کہ فلاں نثار کی نثر فلاں کے مشابہ ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض نثار ایسے گذرے ہیں اور موجود ہیں جن کی نثر میں محاسن اور خوبیاں پائی جاتی ہیں اور بعض کا طرز تحریر نقائص سے بری نہیں ہے۔ پس یہ کہا جاسکتا ہے کہ فلاں شخص کی نثر میں محاسن اور خوبیاں پائی جاتی ہیں اس لئے اس کی نثر اعلیٰ اور افضل ہے اور فلاں انشا پرداز کی نثر میں خامیاں ہیں۔

افلاطون کا خیال ہے کہ ادبیات، اخلاقیات اور صداقت امور پر مبنی ہیں۔ اس کے خیال میں وہ ادب جس کی بنیاد صداقت کے بجائے محض تخئیل اور وہم پر ہو ادب کے دائرہ سے خارج ہے لیکن علما افلاطون کے اس خیال سے اتفاق نہیں رکھتے۔ کیونکہ اس نے صداقت کو صرف سچائی کے معنوں میں لیکر اسے محدود کرلیا ہے، اگر اس کے خیال کی اہتمام کے ساتھ پیروی کی جائے تو ادب

بھی فنونِ لطیفہ سے خارج ہوکر خشک فلسفہ کا نمونہ بن جائیگا۔ اِس میں کلام نہیں کہ ادبیات کی بنا صداقت پر ہونا چاہیئے لیکن ادب جس صداقت اور حقیقتِ حال کی ترجمانی کرتا ہے وہ ایسی صداقت نہیں جس کو سرسری نظر سے دیکھا جا سکے یا نظرانداز کیا جا سکے۔

ادب میں صداقت کی ایسی ہی صورت ہے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا ورنہ دونوں کے گم ہو جانے کا اندیشہ ہو جائیگا۔ مگر یہ صداقت عام نظروں کو نظر نہیں آسکتی۔ اس کے واسطے باریک بیں نظر درکار ہے۔

اظہارِ صداقت کے دو ذرائع ہو سکتے ہیں۔ ایک خارجی اور دوسرا داخلی۔ خارجی صداقت یہ ہے کہ ہم برسات کی ایک رات کے متعلق کہیں کہ بارش زور کی ہو رہی تھی، بجلی چمک رہی تھی ہر طرف اندھیرا تھا۔ جو شاعر اس کیفیت کو بیان کرتا ہے اِن خیالات اور نکات کو بھی کہہ جاتا ہے جس کو نہ عام نظریں دیکھ سکتی ہیں اور نہ عام طبیعتیں اس کا احساس کر سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک بات اور ضروری معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ ادب خارجی صداقت سے بحث نہیں کرتا بلکہ داخلی صداقت سے اور اشیاء سے نہیں بلکہ خیالات سے واسطہ رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاعری اور فلسفہ میں بہت کم تعلق ہے، ادب میں خیالات سے بحث کی جاتی ہے، اگر اس میں کائنات کی کسی شئے کی نسبت بحث بھی ہوتی ہے تو وہ اس طرح کہ الفاظ کی شستگی، ترکیبوں کی چُستی اور بلند پایہ تشبیہوں کی ندرت اور استعاروں کی نزاکت میں گھُل مل جاتی ہے اور یہی صداقت کی اصلی ترجمانی ہے۔ سائینس میں اشیاء سے بحث کی جاتی ہے اور الفاظ محض مفہوم سمجھانے کی غرض سے لائے جاتے ہیں۔ ان کی فصاحت بلاغت، صفائی اور روانی سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ بلکہ دنیا کے ہر گروہ کی یہی رائے ہے اور ماہرینِ یورپ نے تو صرف اسی خیال پر سدہا کتابیں رنگ ڈالی ہیں۔ صرف اسی خیال پر اس قدر تصانیف ہیں کہ جن سے استدلال کرنا ایک طرف ان کی فہرست تیار کرنا بھی امرِ محال نظر آتا ہے۔

"کسی فن میں کمال حاصل کرنا اُسی شخص کا حصّہ ہے جو کسی اونچے قانون کی تلاش میں ہو اور صحیح راستے پر چلنے پر بھی یہ محسوس کرتا ہو کہ ابھی اُسے بہت سی خامیاں اور غلطیاں دُور کرنا ہیں۔ مگر یہ بات جبھی محسوس ہوتی ہے جب آنکھیں صداقت کے پاک قانون دیکھنے کے لئے کھُلی ہوں"

"انسانی زندگی میں بے حد تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ اس پر غور کرے کہ اس کی زندگی کی کیا حقیقت ہے، اُس کی طاقتیں کس درجہ کی ہیں اور اس کے کیا فرائض ہیں" "رسکن"

بسنت

(خانصاحب حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر اکبر آبادی)

آیا بسنت، عشرتِ دوراں لئے ہوئے رنگینی و نشاط کا ساماں لئے ہوئے
چتون میں اپنے جذب کئے کیف و رنگ و بو دامن میں اپنے سنبل و ریحاں لئے ہوئے
اپنی ہر اک نظر میں بھرے نزہتِ بہار اپنی ہر اِک ادا میں گلستاں لئے ہوئے
عُریاں کئے ہوئے اثراتِ نمود کو اِک اشتہارِ جذبۂ عُریاں لئے ہوئے
ہر لَے میں اِک مہکتا ہوا شعلۂ صدا ہر لَے میں ایک سازِ غزلخواں لئے ہوئے
کیا جانے آمد اس کی یہ کیا سحر کر گئی
صحرا کی گود زرد شگوفوں سے بھر گئی

کیسی یہ اِک ہوائے چمن خیز چل پڑی ذرّوں کے سینے پھٹتے ہی جنّت اُبل پڑی
گرمیٔ بزمِ گل نے جو انگڑائی لی نئی موسم کی چھیڑ سے رگِ فطرت اُچھل پڑی
دل کو تلاشِ کیف، نظر کو تلاشِ رنگ شوخیٔ فصل سے نظر و دل میں چل پڑی
جوشِ شگفت حشر بداماں نکل پڑا آئی صدائے صور کہ دنیا دہل پڑی
موسیقی اور شعر کے طوفاں لئے ہوئے اِک نظم تھی کہ ذہنِ زمیں سے نکل پڑی
عالم فروز شام بھی ہے اور سحر بھی ہے
ماہرؔ اُٹھو بسنت کی تم کو خبر بھی ہے

سُورگ اور نرک

(پرنسپل دیوان چند، ایم۔ اے۔)

عمر خیام نے اپنی رُباعیوں میں کئی بار اس بات کا ذکر کیا ہے کہ جو لوگ یہاں سے جاتے ہیں اُن میں سے کوئی واپس نہیں آتا تاکہ ہمیں بتا سکے کہ موت کے بعد کیا ہوتا ہے۔ ایک رُباعی میں وہ کہتا ہے "اگر کوئی شخص تمھیں بہشت و دوزخ کی بابت کہے تو اُسے مت سنو۔ کس نے جاکر دوزخ کو دیکھا ہے؟ اور کون بہشت سے واپس آیا ہے؟" عمر خیام کا اعتراض میرے مضمون کے خلاف نہیں کیونکہ میں اس مضمون میں سورگ اور نرک کی بابت نہیں کہونگا بلکہ ان وچاروں کی بابت کہوں گا جو پراچین زمانہ میں سورگ اور نرک کی بابت لوگوں کے تھے۔

مضمون بہت وسیع ہے لیکن میں کوشش کرونگا کہ اس کے متعلق ذیل کے پہلوؤں پر کچھ روشنی ڈالوں:-

(۱) سورگ اور نرک کا بھید کس بنا پر کیا گیا ہے؟ دوسرے لفظوں میں کن لوگوں کو سورگ کا ادھکاری سمجھا جائیگا اور کن لوگوں کے لئے دوزخ مناسب استھان ہوگا؟

(۲) بہشت اور دوزخ کی زندگی کس قسم کی ہوگی؟

آخر میں مَیں مختصر لفظوں میں یہ بتاؤں گا کہ ان پراچین وچاروں میں کون سے ایسے نقص تھے جنھوں نے انسانی بدھی کو ان پر مزید غور کرنے کے لئے مجبور کرکے نئے وچاروں کے لئے راستہ صاف کیا؟

(۱) سُورگ اور نرک کا بھید کس بنا پر رکھا گیا ہے؟

پراچین کتابوں میں سورگ اور نرک کی کلپنا سے پہلے دو اور استھانوں کا ذکر آتا ہے، ان کا نام Sheol اور Hades ہے۔ پراچین یہودیوں کے وچار کے مطابق سارے انسان موت کے بعد شیئول میں جاتے ہیں۔ وہاں کی زندگی ہمارے موجودہ جیون کی نسبت زیادہ دھندلی ہوتی ہے۔ وہاں نہ صاف گیان ہوتا ہے، نہ جذبات، نہ کرم شکتی۔ Hades یا مرت لوک میں بھی سارے انسان موت کے بعد رہتے ہیں لیکن وہاں کی زندگی شیول کے جیون کی طرح دھندلی نہیں ہے، وہاں ہر قسم کے احساس ہوتے ہیں۔ ایک خیال کے مطابق وہاں یم یا مرتیو کا راج ہے

دوسرے خیال کے مطابق شیطان کا۔ پُرانی روایتوں کے مطابق حضرت مسیح نے اپنی موت کے بعد اور آسمان پر چڑھنے سے پہلے تین دن اور رات مرت لوک میں گذارے۔ وہاں اُنھوں نے شیطان پر غلبہ حاصل کیا نجات کا اُپدیش دیا۔ سنتوں کو جو اُن کی پیدائش سے پہلے مر چکے تھے آزاد کیا۔ اس قسم کی روایت گوتم بدھ کے متعلق بھی بیان کی جاتی ہے، کہ جب وہ مرت لوک میں پہونچے تو آگ کے شعلوں کی جگہ ہوا کے سرد اور نرم جھونکوں نے لے لی۔ اُبلتے پانی کی کڑھائی جس میں روحیں تڑپ رہی تھیں ٹوٹ گئی۔ آگ کا سمندر ایک تالاب بن گیا جس میں کنول کے پھول لگے تھے۔ بدھ وہاں اپنے جلال میں روشنی کا لباس پہنے راج پُتر کی طرح گئے۔ یم راج نے اُن کا آدر ستکار کیا اور اُس وقت کے لئے مرت لوک سُکھ اور شانتی کا استھان بن گیا۔

شیول اور Hades کے تصور میں دھرم ادھرم، نیکی بدی کے بھید کو دخل نہ تھا، لیکن کچھ دنوں کے بعد انسان کے ضمیر میں اس بھید پر زور دیا اور اسی کی بنا پر دو مختلف استھان سورگ اور نرک، مقرر کئے۔ نیک آدمیوں کو سورگ کا اور گنہگاروں کو نرک کا ادھیکاری قرار دیا۔ جب ایک بار یہ خیال انسانوں کے دماغوں میں داخل ہوگیا تو اُس نے باقی سارے وچاروں پر غلبہ حاصل کیا۔

سورگ اور نرک میں زندگی کس قسم کی ہوگی؟

سورگ اور نرک کے سلسلے میں یہ سوال سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔ کوئی شخص کتنی پھرتی سے کودے وہ اپنے سائے سے پرے نہیں پہونچ سکتا، اُسی طرح ہماری کلپنا یا تخیل کی طاقت ہمارے تجربہ اور احساس سے پرے نہیں جا سکتی بہشت کی زندگی اُن تمام خوشیوں کا مجموعہ ہے جو انسان اپنے خیال میں لا سکتا ہے۔ دوزخ اُن تمام دُکھوں اور خرابیوں کا مجموعہ ہے جن کا انسان دھیان کر سکتا ہے۔ مختلف جماعتوں نے سورگ اور نرک کے جو نقشے تیار کئے ہیں اُن میں جو بھید ہے وہ محض اس لئے ہے کہ سکھ اور دُکھ، راحت اور رنج کے متعلق اُن کے وچار مختلف ہیں، فکر ہر کس بہ قدر ہمتِ اوست۔

عیسائی عقیدے کے مطابق سورگ اور نرک موجودہ جنم کے کرموں اور اعتقاد کا پھل ہوں گے اور وہ ہمیشہ کے لئے قائم رہیں گے۔ بعض فرقوں نے ان کے علاوہ ایک تیسرے استھان Purgatary کو بھی مانا ہے جس میں ان روحوں کو کچھ عرصہ کے لئے رکھا جائیگا جو ایمان تو لائی ہیں مگر پاپ کا جیون بسر کرتی رہی ہیں۔ پروٹسٹنٹ چرچ اس تیسرے استھان کی ہستی کو تسلیم نہیں کرتا، اس کے خیال کے مطابق نیک اور بد روحوں کو موت کے بعد فوراً ہی سورگ اور نرک میں بھیجا جاتا ہے۔ لیکن قیامت کے

دن سارے انسان روح اور جسم دونوں ایک ساتھ اُٹھیں گے ۔ اُن کے اعمال کا امتحان اور آخری وقطعی فیصلہ ہر ایک کے متعلق دیا جائے گا ۔ اِس عقیدے میں بہشتی زندگی کے متعلق خاص زور اپنے عزیزوں اور سادھو سنتوں کی سنگت اور خود خدا کی حضوری پر دیا گیا ہے ۔

نرک کا نقشہ عموماً ویسا ہی ہے جیسا دوسرے متوں میں بیان کیا گیا ہے ۔

قدیم ایران کے وچار پارسیوں کی دھرم پستکوں میں ملتے ہیں، نیکی اور بدی کی جنگ شروع سے چل رہی ہے ۔ ایک طرف آہرمزد اور اس کے ساتھی ہیں دوسری طرف اہرمن اور اُس کی فوج ہے آخر میں جیت تو آہورمزد یعنی دھرم کی فتح ہوگی، مگر اس کے لئے بھی بہت لمبا عرصہ چاہیئے پارسی خیال کے مطابق موت کے بعد تین دن رات روح جسم کے اردگرد چکر لگاتی رہتی ہے، چوتھے دن اس کا نیا جنم ہوتا ہے، ایک پُل پر سے اُسے گذرنا ہوتا ہے ۔ نیک انسانوں کے لئے وہ پُل چوڑا ہو جاتا ہے اور پاپیوں کے لئے استرے کی دھار کی طرح تنگ ۔ پاپی اس پل سے نیچے دوزخ میں گر پڑتے ہیں ۔ نیک لوگ اس سے گذر کر بہشت میں پہونچ جاتے ہیں ۔ بہشت روشنی اور پاکیزگی کا استھان ہے ۔ وہاں دلوں کو لُبھانے والے راگ سُنائی دیتے ہیں اور دوسری پوتر آتماؤں کی سنگت کا موقع ملتا ہے ۔ نرک میں تاریکی اور گندگی کا راج ہے ۔ پاپی انسان کا ضمیر اُسے ملامت کرتا ہے اور وہ اپنی خواہش پر روتا چیختا ہے، یہ حالت کلپ کے انت تک جاری رہتی ہے ۔ جب قیامت کا وقت آئیگا تو زمین آگ کی گرمی سے پگھل جائیگی اور دریا کی شکل میں بہنے لگے گی ۔ سب آتماؤں کو اس بھٹی سے گذرنا ہوگا ۔ نیک روحوں کے لئے یہ مادہ نیم گرم دودھ کی طرح ہوگا ۔ پاپی آتماؤں کے لئے اُبلتی ہوئی دھات کی طرح ۔ اس وقت اہرمن اور اہورمزد میں آخری اور فیصلہ کن جنگ ہوگی اہورمزد کی فتح ہوگی، شیطان اور اس کا لشکر آگ میں نشٹ ہو جائیں گے ۔ سارے پوتر ہو کر پھر اکٹھے ہونگے اور ایک دوسرے کو پہچانیں گے، جو بچپن یا لڑکپن میں مرے تھے وہ پندرہ سال کے بن جائیں گے، جو جوان یا بوڑھے مرے تھے وہ چالیس سال کے ہونگے، سب روحانی لباس پہنیں گے دوزخ بھی پوتر ہو کر بہشت کا ایک حصّہ بن جائیگی ۔ زمین نئی بنے گی اور بہشت تک پہونچکر اس سے مل جائے گی ۔

بدھ دھرم کے مطابق سب سے آخری آدرش تو نروان حاصل کرنا ہے، اس اوستھا میں ہر قسم کے سورگ ہیں، ان میں انسان اپنے اپنے کرموں کے مطابق جاتے ہیں اور کرموں کا پھل ختم ہونے تک رہتے ہیں ۔ سب سے نیچے درجہ کی بہشت میں جس کا نام کام دھاتو ہے ہر قسم کی خوشیاں

ملتی ہیں، لیکن بچوں کی پیدائش کے لئے پرش اور استری کا ایک دوسرے کو چھونا، ہاتھ ملانا یا محض دیکھ لینا کافی ہے۔ اس سے اونچے درجے کا سورگ رُوپ دھاتو ہے۔ اس میں بو اور ذائقہ کا احساس نہیں ہوتا۔ وشئے بھوگ کے لئے بھی یہاں کوئی گنجائش نہیں، اور بعض حالتوں میں تو ہر قسم کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ تیسرا اور سب سے اونچا سورگ اروپ دھاتو یعنی مکمل روحانی بہشت ہے۔ اس میں بھی تکمیل کی چار منزلیں ہیں۔ بودھ خیال کے مطابق سات گرم اور سات سرد نرک ہیں جس میں مختلف قسم کی اور سخت سے سخت تکلیف پاپی انسانوں کو ملتی ہے۔

مہابھارت کے مطابق سورگ ایک وسیع باغ ہے جس کے درخت پھل پھول سے لدے رہتے ہیں، سب پھول خوشبودار ہیں اور سب پھل میٹھے اور لذیذ۔ بعض درخت ایسے ہیں جن سے جو پھل چاہیں مل سکتا ہے۔ یہی نہیں ان سے کپڑے بھی ملتے ہیں اور ان کے پھلوں میں زیور بھی ہوتے ہیں۔ سارے موسم خوشگوار ہیں، تالابوں کا پانی صاف اور دلکش ہے، عورتیں بہت خوبصورت ہیں مرد سب آسمان سے گرتے ہیں، جو بچے پیدا ہوتے ہیں وہ بھائی بہن کے جوڑے ہوتے ہیں، وہ ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں اور ایک ساتھ بڑھتے ہیں۔ دس ہزار اور دس سو سال اُن کی عمر ہوتی ہے۔ سورگ میں بیماری اور شوک غم کا کوئی نشان نہیں۔ لیکن موت کا دخل وہاں ہے۔
بھگوت پوران میں اکیس قسم کے نرکوں کا ذکر ہے۔ مختلف قسم کے پاپوں کے لئے مختلف نرکوں میں پاپی آتماؤں کو جانا پڑتا ہے۔ وہاں کے خاص دُکھ یہ ہیں۔ کھانے پینے کے لئے کچھ نہیں ملتا۔ سانپ کاٹتے ہیں، یم کے دوت بید لگاتے ہیں، آگ میں جلنا پڑتا ہے، گنّے کی طرح انسان پیرا جاتا ہے، نیند نہیں آسکتی، کُتّے دانتوں سے انسانوں کا گوشت چباتے ہیں، اور جسم کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کترا جاتا ہے۔ کسی قسم کا چین نہیں ملتا۔ سب سے بڑھکر مصیبت یہ ہے کہ بیہوشی یا موت اِن مصیبتوں کا خاتمہ نہیں کر دیتی۔

پراچین آریہ وچار مذہب کی تاریخ لکھنے والوں نے اس بات کو خاص طور پر بیان کیا ہے کہ پرانوں اور دھرم شاستر سے پُرانی کتابوں میں سورگ کا ذکر تو ہے لیکن نرک کا ذکر نہیں آتا۔ اسی وجہ سے وہ بیان نہیں کرتے۔ لیکن مجھے اس کی وجہ صاف معلوم ہوتی ہے، ہندو فلسفہ کے مطابق ہماری موجودہ زندگی ایک لمبی زنجیر کی کڑی ہے اور وہ زنجیر دونوں طرف پھیلتی ہے۔ ہماری موجودہ زندگی منشیہ جیون (انسانی زندگی) کے اودّیش کو پورا کرنے کے لئے بالکل ناکافی ہے اور کسی انسان کی حالت ایسی بُری نہیں کہ وہ اُسے بہتر نہ بنا سکے۔ اس لئے انسان جب تک اپنے آپ کو

تکمیل نہیں کرلیتا اُسے تکمیل کا موقعہ ملتا ہے۔ اِس فلسفہ میں نرک کے لئے کوئی استھان نہیں ہو سکتا ہاں تکمیل کے بعد سورگ کے لئے استھان ہے۔ اونپشدوں میں نیک روحوں کے لئے پتر لوک دیولوک، اور برہم لوک، تین حالتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اِن حالتوں میں پہونچنے کے لئے جو سادھن بیان کئے گئے ہیں وہ یہ ہیں :-

(ا) ویدک کرم کانڈ، یعنی اُن فرائض کا پورا کرنا جو انسان کے لئے مقرر کئے گئے ہیں

(ب) رفاہِ عام کا کام مثلاً کنواں تالاب کھدوانا، اسکول کالج اناتھالیہ قائم کرنا۔

(ج) ضبط ریاضت اور آتمک زندگی کی پوترتا۔

(د) برہم گیان۔

سب سے اوتم اوستھا برہم لوگ ہے، اور سب سے اوتم سادھن برہم گیان ہے۔اس سے بڑھکر کوئی آنند نہیں، یہی نجات ہے۔

مَیں کہہ چکا ہوں سورگ اور نرک کے خیال کو انسان کے اخلاقی حس نے جنم دیا ہے وہی حس سورگ اور نرک کے خلاف سب سے زبردست اعتراض کرتی ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ پُن اور پاپ کا پھل ملے، اور اعمال جزا و سزا میں ایسا تناسب ہو جسے عقل انسانی قبول کرسکے۔ تمام انسانوں کو نیکوں اور بدوں میں تقسیم کر دینا اور اُن کو سورگ اور نرک کے ادھکاری قرار دینا انسانی فطرت کے ساتھ ظلم کرنا ہے۔ ہم میں سے بہت سے لوگوں کی زندگی اتنی پاک وصاف نہیں کہ اُنھیں سورگ کا ادھکاری (مستحق) بنا سکے، نہ اتنی غلیظ اور ناپاک ہے کہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں پھینکا جائے۔ ہم میں سے بہت سے نہ سیاہ ہیں نہ سفید، بلکہ خاکی رنگ کے ہیں۔ انسان محض دو جماعتوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ نہ فقط ہمارا موجودہ جنم آخری جنم ہے بلکہ یہ پہلا جنم بھی ہے تو بعض لوگوں کے خیال میں شکایت کا زیادہ موقع ہو جاتا۔ اِن لوگوں کا اعتراض ہے کہ ہم نے ان شرائط پر ہستی میں آنے کی کبھی خواہش نہیں کی تھی نہ کبھی اپنی رضامندی دی تھی۔ خدا کو ہمارے انجام کا علم تھا، کیوں اُس نے ہماری قسمت کے ساتھ کھیلنا پسند کیا۔ جہنم کی آگ میں جو لوگ ہمیشہ کے لئے جلیں گے کیا اُن کی تکلیفوں کا علم بہشت میں رہنے والوں کو ہوگا، اس علم کا اثر اُن کے احساس پر کیا ہوگا، اور خود خدا پر کیا اثر ہوگا، کیا ہماری مصیبتیں اُنھیں بیچین نہیں کر دینگی، تو اُن کی زندگی جنت کی زندگی کیسے رہیگی۔ اگر ان پر کوئی اثر نہ ہوگا تو مجھ سے مت پوچھو کہ میری رائے ان کی بابت کیا ہوگی۔ بہشت اور دوزخ کی ہستی کو تسلیم کرنے والوں نے بھی ان دقتوں کو محسوس کیا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہشت اور خاصکر دائمی دوزخ کے متعلق پراچین زمانہ کے وچار بہت کچھ ترک کر دیے گئے ہیں ؀

کلامِ مدہوش

(پروفیسر سنت پرشاد مدہوش، ایم۔ اے۔)

شاعر کی حیات و ممات

عمر بھر مرتا رہا جیتا رہا
اِک گریباں پھاڑتا سیتا رہا

عشق کا مجبور تھا، کی آہ آہ
جس پہ اہلِ بزم نے کی واہ واہ

کوئی بھی جانا نہ اُس کے راز کو
سمجھا مہمل عشق کے انداز کو

ہو چلی تھیں بُلبلیں کچھ ہم زباں
بن گئی تھی شمع بھی کچھ رازداں

اور کچھ ٹوٹے ستارے چرخ کے
کہتے ہیں واقف تھے اُس کے رمز سے

خلد میں کرتا وہ نغمہ سنجیاں
کیوں متاعِ بے بہا کی رائیگاں

پر فرشتوں میں نہیں مقسوم عِشق
اُن میں سب کچھ ہے مگر معدوم عشق

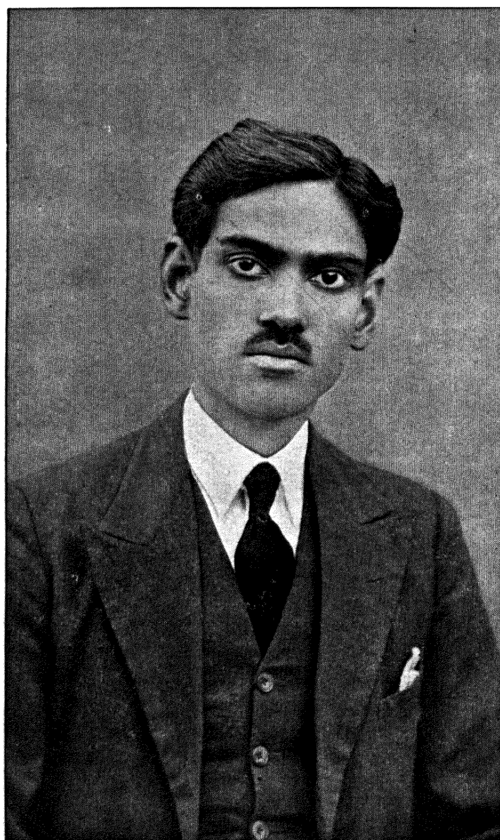
خلد میں جاتا وہ کیوں بعدِ ممات
ہم زباں تھا کون کرتا کون بات

ہم نے مانا حور بستی ہیں وہاں
اُن میں لیکن عشق کا لپکا کہاں

اِک نمائش ہے نہیں ذوقِ نہاں
پھول کی رنگت ہے لیکن بُو کہاں

حُسنِ ظاہر پر طبیعت آئے کیوں
سوئے جنت ایک شاعر جائے کیوں

مِل گیا پس حُسنِ لامحدود میں
اُس کو ڈھونڈھو جوہرِ معبود میں



مسٹر سنت پرشاد مدہوش ایم-اے

عشق کی سرمستی

مدہوش کی یاد آئی موجِ مئے مستانہ — وہ مردِ حریفِ مے وہ نازشِ میخانہ

شیشہ شکنی کی ہے ہم بادہ پرستوں نے — پی ڈالے ہیں خُم کے خُم پیمانہ بہ پیمانہ

ہم حُسن کے بندے ہیں ہم عشق کے پروردے — جُز حُسن و محبت کے ہر شئے سے ہیں بیگانہ

جو عقل کے پُتلے ہیں سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے — یہ عشق کی سرمستی سرمایۂ میخانہ

ق

وہ حُسن کی رنگینی جو رازِ محبت ہے — جو جانِ تمنا ہے جو سُرخیِ افسانہ

ہیں در کے گدا جس کے وہ خسروِ خوباں ہے — شاہی سے بھی افضل ہے یہ شانِ گدایانہ

رندوں کی فقیری پر قربان کرو آکر — اندازِ امیرانہ صد جلوۂ شاہانہ

ہے مہرِ منور یہ جو اتنا چمکتا ہے — جو روزِ ازل ہم نے پھینکا تھا وہ پیمانہ

قطرات میں اُس مے کے اک نور کا عالم تھا — چھلکے مہ و انجم جب پھیلی مے پیمانہ

اک حشر بپا کردیں وہ جوشِ طبیعت ہے — تمہیدِ قیامت ہے یہ لغزشِ مستانہ

مدہوش محبت کو دیوانہ سمجھتے ہو
دیوانے ہو دیوانے، فرزانہ ہے فرزانہ

روح کا ساز

نہ وہ دَیر میں نہ حرم میں ہے نہ وہ ہند میں نہ حجاز میں — نہ جرس نہ بانگِ اذاں میں ہے، وہ چھپا ہے روح کے ساز میں

ہو سرودِ عشق سے آشنا تو سُنائی دیگی تمھیں نوا — سنو گوشِ عشق نیوش سے وہ ہے سازِ عشق نواز میں

تجھے شیخ خلد کی چاہ ہے مجھے ذوقِ لطفِ نگاہ ہے — تجھے اُس کا حس نہیں بوالہوس جو مزا ہے سوز و گداز میں

عاشق کی آرزو

وصل تک ہی نہیں محدود محبت کے مزے — ہم کو مقبول ہیں یہ تلخیِ فرقت کے مزے

آنہ آ ہم کو شکایت نہیں محرومی کی — ہاں مگر داد تو دے دے ہمیں مظلومی کی

آرزو مرنے کی ہے دادِ محبت لے کر — بس یہ غم ہے کہ نہ مر جائیں یہ حسرت لیکر

مے نوشی

جوشِ بادہ سے ہے عالم نور کا جذبات میں — کیف وجد انگیز ہے ہر لفظ میں ہر بات میں
جامہائے اخترانِ مطلعِ سموات میں — بھر کے مے پیتا ہوں میں ہر روز آدھی رات میں
نورِ بادہ جلوہ زا اِس دل کے پیمانہ میں ہے
اِک شرابِ شعلہ افشاں میرے خمخانہ میں ہے

اتحاد

مُطربِ اُنس و محبت سرِ محفل آجا — چھیڑ مضرابِ محبت سے ہر اک دل کو ذرا
تار سے تار ہم آہنگ کرا ے نغمہ سرا — ساز سے ساز نہ رہ جائے سرِ بزم جُدا
لَے نہ تفریق کی اب اپنے بیاں میں رہ جائے
کوئی تمیز نہ ناقوس و اذاں میں رہ جائے

اُمرائی جمہوریت

یہ مانا خاک ہیں لیکن نگیں ہیں کس کی خاتم کے — فرشتوں نے نہیں سجدے کیئے کیا روحِ آدم کے
ہیں انسانِ سعادتمند ہم شاہِ دوعالم کے — مٹا دیں گے جہاں سے سب جھگڑے بیش و کم کے
ہماری ذہنیت شاہانہ ہے دل میں سخاوت ہے
عمل میں ہے مساوات اور دل میں اپنے رفعت ہے
نظام اپنا ہو جمہوری ادا اپنی ہو شاہانہ — ہمارا دل وہ ساقی ہے لٹا دے گا جو میخانہ
اُٹھا دیں گے اُسے خُم ہم سے جو مانگے کا پیمانہ — یہی ہے شانِ رندانہ یہی ہے شانِ رندانہ
بلندی سے عمل ہو اور اثر پستی تلک پہونچے
مثالِ ابرِ باراں فیض ہر بستی تلک پہونچے
بنائیں ہم جہاں میں ایک جمہوریتِ اُمرا — کریں ہم بس وہی شاہِ دوعالم کا جو ہو ایما
ادا ہر ایک ایسی ہو چلن ہر ایک ہو ایسا — جو فرزندانِ حق کے واسطے دنیا میں ہو زیبا
سمجھ لو اے عزیزو خوب ہم محبوب کس کے ہیں
ہمارا کون ہے محبوب ہم محبوب کس کے ہیں

عمل میں گو اخوت ہو نہ ہو تقلید پستی کی
نگاہوں میں مروّت ہو نہ ہو تقلید پستی کی
نظر میں اپنی رفعت ہو نہ ہو تقلید پستی کی
امیرانہ طبیعت ہو نہ ہو تقلید پستی کی

امیرانہ کہا تو دل کی وسعت کا اشارہ ہے
تعیّش سے نہیں مطلب سخاوت کا اشارہ ہے

تقاضائے عشقِ حقیقی

کچھ داد نہ دی تنگیِ قدرت نے وگرنہ
ہم اہلِ جنوں دامنِ صحرا کو پکڑتے
مجنوں تھے کسی اور ہی جلوے کے وگرنہ
ہم بھی سرِ عالم کسی لیلیٰ کو پکڑتے
عشق اپنا حدودِ ہوس و غم کے پرے ہے
کیوں دستِ جنوں خیز تمنّا کو پکڑتے
خوکردۂ آزارِ محبت تھے بتاؤ
قاتل کو پکڑتے کہ مسیحا کو پکڑتے
جاتی بھی اگر جان تو خوش ہو کے تڑپتے
شہ رگ سے خود اُس تیغِ برہنہ کو پکڑتے
تھا نطق تو لذت کشِ دعوائے شہادت
کس منہ سے ہم اُس دارو وشیشہ کو پکڑتے

غزل

جہاں میں آ کے تماشا بنا جہاں کے لئے
بشر سے پوچھ چلا مر کے اب کہاں کے لئے
بشر کی ذات نہیں جنسِ لامکاں کی قسم
زمیں زماں کے لئے تیرہ خاکداں کے لئے
مرے شباب پہ پرتو ہے میرے مرشد کا
نہیں ہے قحبۂ دنیا تو اس جواں کے لئے
رہا تو خانہ خراب آیا میں تو خانہ بدوش
چلوں یہاں سے تو کیونکر نہ لامکاں کے لئے

خراب حال ازل سے رہا ہوں میں مدہوش
چلوں گا مر کے خراباتِ جاوداں کے لئے

رباعیات

بندہ ہوں ادا نماز کرتا ہوں میں
اک فرض سے اپنے ساز کرتا ہوں میں
دے کچھ نہ مجھے وہ دینے والا مدہوش
پر دستِ طلب دراز کرتا ہوں میں

ہے طالبِ رب تو سب ہی کھو جانے دے
دنیا کی طلب کا ہاتھ سو جانے دے
مدہوش ضرور چشمِ دل وا ہو گی
تو چشمِ ہوس تو کور ہو جانے دے

کو پرواز سے کوئی باز نہیں رکھ سکتا۔ تم زمین کی باتیں نہ سوچو، آسمان کو سوچو، تم آدمیوں کی حالت پر غور نہ کرو فرشتوں اور جناتوں کی دنیا میں پھرو لیکن پھر تم یہ بھی یقین رکھو کہ شاید اس طرح تم اور صرف تم اپنی آرزوؤں کی منزل سے قریب تر ہو جاؤ تو ہو جاؤ لیکن ساری دنیا کی نظر میں تمھاری داستان ایک معمہ ہوگی، بہت سے نقاد اُسے مجازات (Symbols) سمجھ کر حل کرنے کی کوشش کریں گے اور کامیاب نہ ہونگے۔ میں کیوں اس بحث میں تمھارا زیادہ وقت لوں، اگر فرصت ہو تو کاڈول (Caudwell) کی مشہور کتاب Illusion and Reality کا آٹھواں نواں اور دسواں باب اپنے دل پر جبر کرکے پڑھ لو۔ وہاں تمھیں شخصیت اور ماحول، داخلی اور خارجی اثرات کی جنگ کا صحیح نقشہ ملے گا۔

تم ادیب کا کام زندگی کی ترجمانی بتاتے ہو اُس کے بعد بھی اپنی خیالی آرزوؤں کے پورے کرنے کے چکر میں ہو۔ فرض کرو تمھاری تنہا آرزوئیں پوری ہو بھی گئیں تو کیا ہوا۔ تمھاری دنیا کتنی مختصر ہوگی اور تمھاری تصویر کا خاکہ کتنا چھوٹا، حالانکہ بحث کرنے کے لئے تم اُسی میں ساری کائنات سمٹی ہوئی دکھاؤگے۔ تم اُن آرزوؤں کے پورے کرنے میں اپنے قلم کا زور صرف کرتے ہوئے کیوں ہچکچاتے ہو، جنھوں نے صرف تمھارے تمھیں نہیں بلکہ ہزارہا سینوں کو گرم کر رکھا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ آج تمھارے ہاتھ میں ایک بربط ہے، کائنات گوش برآواز ہے، تمھیں ایک نغمہ چھیڑنا ہے، تم نے نظر اُٹھا کر مجمع کو دیکھا۔ کچھ بیمار اپنے دکھ سے کراہ رہے ہیں، کچھ مزدور اپنے حق کے لئے اپنی جانیں ہتھیلیوں پر لئے کھڑے ہیں، تم کون سا گیت گاؤگے؟ کچھ سرمایہ دار غریبوں کا خون پینے میں مصروف ہیں، کچھ بھکاری، اندھے، لنگڑے، کوڑھی، مجبور اپنی نم آنکھوں سے تمھیں کو دیکھ رہے ہیں، تم کیا سوچتے ہو کون سا راگ چھیڑنے کا وقت ہے؟ بڑے بڑے علما اپنے ذاتی نفع کے لئے مذاہب کی پناہ لے کر غریبوں کے مذہبی جذبات سے کھیل رہے ہیں، پنڈت ہر قدم پر جاہلوں سے کچھ لینا چاہتے ہیں، تمھیں کیا کرنا چاہیئے، تمھیں ایک گیت گانا ہے۔ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ملک کی آزادی کے لئے بیچین ہیں، اُن کی اندھیری راتیں ختم ہونے کے قریب ہیں، کچھ لوگوں نے صبح کے آثار دیکھ لئے ہیں، کچھ ابھی نہیں دیکھ سکے، سب منزل کی طرف قدم بڑھائے چلے جا رہے ہیں، تم کون سا نغمہ سناؤگے؟ اقتصادی کشمکش میں مبتلا ہو کر شریف عورتیں عصمت فروشی پر مجبور ہیں، دولتمند انسان اُن کے حسن کی قیمت اُن کی بھوک کا اندازہ لگا کے کم لگاتے ہیں اور سودا چُک جاتا ہے، محراب و منبر سے چلانے والے ان عصمت فروش ناپاک روحوں سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی اُن کے آستانوں پر سر رکھ کر اپنے تقدس کو بھول جاتے ہیں۔ تمھارا کیا ارادہ ہے؟ کیا کوئی گیت نہ گاؤگے مگر تمھیں گانا ضرور ہے؟ بتاؤ کیا گاؤگے؟ بربط تمھارے ہاتھ میں ہے اور کائنات منتظر۔ اچھا فرض کرو تمھارا جی چاہتا ہے

کہ تم اِس وقت ایک عشقیہ گیت گاؤ، تم ایک سُلا دینے والا نغمہ چھیڑو کیونکہ تمھاری آرزو یہ ہے کہ دنیا میں امن اور پریم کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ شوق سے گاؤ لیکن تمھارے اس نغمہ میں مزدوروں اور بھکاریوں کی بھوکی اور ننگی آتما کے لئے کیا ہے؟ جمیل! اِن روحوں کے لئے امن اور آرام کہاں! اِن کے لئے پریم کے دروازے بند ہیں۔ تم اپنی آرزو شوق سے پُوری کرو، لیکن تم خود کہتے ہو کہ وہ پُوری ہوگی تو پھر تمھاری تخلیق کا کیا مقصد ہے۔ تمھیں اپنی ذات کو سکون حاصل نہیں ہوتا۔ تمھارے سامنے کا مجمع تم سے منہ پھیر کر کھڑا ہو جاتا ہے، تمھیں سمجھنا چاہتا تھا مگر نہ سمجھ سکا، کیونکہ اس راگ میں اسے اپنے اضطراب کی دوا بھی ملنی چاہیئے تھی لیکن نہیں ملی، وہ تو تم اپنے لئے گا رہے ہو۔ جمیل! آج کچھ اور گانے کا موقع تھا ابھی امن اور پریم کی دنیا بنی ہی نہیں۔

دیکھو جمیل خفا نہ ہو تو یہ کہوں کہ تمھارا گیت بہت اچھا ہو سکتا ہے، لیکن ہے کسی قدر بے موقع۔ میں یہ ماننے کو تیار ہوں کہ تمھاری آرزوئیں کبھی پُوری نہیں ہو سکتیں۔ لیکن تم اپنی آرزوؤں کو انسانی آرزوؤں کے حدود میں کیوں نہیں رکھتے۔ کیا یہ دائرہ چھوٹا ہے؟ کیا تم اس دائرہ کے محیط کا اچھی طرح جائزہ لے چکے کہ اُس کے باہر جانے کی کوشش کرتے ہو۔ تیتلی دنیا میں اُس وقت جاؤ جب یہاں کا کام پُورا کر چکو۔ جب یہاں تمھارے نام کا پرچم فضا میں لہرا رہا ہو، اس دنیا کو فتح کر لو پھر میں بھی تمھارے ساتھ ہونگا۔

یہ درحقیقت تمھارے خط کا جواب نہیں لکھ رہا ہوں کیونکہ جواب تو اُس حال میں ہوتا جب تمھارا تخاطب براہ راست مجھ سے ہوتا' یا تم نے یہ خط اِس نیت سے لکھا ہوتا کہ کسی علمی بحث کا دروازہ کھول دیا جائے مگر بھائی مجھے اس کا اختیار تو ضرور دوگے کہ مَیں تم سے اختلاف کروں۔ جیسے مجھے رہ رہ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ تم نے ادھر کسی ایسے نقاد کی کوئی کتاب پڑھ کر اثر لیا ہے جو آج بھی "فن برائے فن" کی آواز بلند کر رہا ہے۔

میرے عزیز دوست انفرادیت جس دَور کی چیز تھی وہ ختم ہو چکا صرف تخیل کی دنیا میں انفرادیت زیادہ دلاویز طریقہ پر قائم رہ سکتی ہے۔ جب حقیقتوں کی بحث آتی ہے تو مقاصد اور آرزوؤں میں اتحاد پیدا ہوتا ہے۔ الہام کے دروازے بند ہو چکے ہیں اور فن کاروں میں زندۂ جاوید بن جانے کی خواہش صرف انسانوں کی تاریخی کشمکش کا ترجمان بننے کے بعد پیدا ہو سکتی ہے۔ لینن کی جو تصویر تم نے پیش کی ہے مَیں اُس سے متاثر نہیں ہوا۔ یہ تو شاید تم بھی یقین نہ رکھتے ہوگے کہ لینن نے کوئی خیالی گھروندا بنایا تھا کوئی تخیلی نظام قائم کیا تھا، اُس کا لفظ لفظ زندگی کی اُن بڑی بڑی صداقتوں پر مبنی تھا جن کا پورا ہونا ضروری تھا۔ اُس نے ایک عملی پروگرام بنایا تھا اُس پر آخر وقت تک عمل کرتا رہا۔ اُس نے زندگانی جاوید

کا بھی خواب نہ دیکھا تھا، اُسے آبِ حیات کی مدد سے عمرِ خضر ملنے کی اُمید نہ تھی، وہ جانتا تھا کہ اُس کا مقصد، اُس کی آرزو اب صرف اس کا مقصد اور اُس کی آرزو نہیں بلکہ وہی شعلے نہ جانے کتنے سینوں میں بھڑک رہے ہیں، وہی آگ نہ جانے کتنے خرمنوں میں پہونچ چکی ہے، وہ مر رہا ہے اُس کا مقصد نہیں مُردہ ہو رہا ہے۔ لینن نہ ہوگا تو اسٹالن ہوگا، اسٹالن نہ ہوگا تو کوئی اور ہوگا۔ اُس کی آرزو ضرور پوری ہوگی سجھی ہوئی آرزو پوری کی جا سکتی ہے مبہم آرزو سمجھی بھی نہیں جا سکتی۔ اُس کی آرزو لامحدود نہ تھی، اُس کے ارادے خیالی نہ تھے، اُس کے حدود معین ہیں، جہاں تک وہ جا سکا گیا اور اس کے لئے وہ کبھی رنجیدہ نہ تھا۔ تاریخی حقائق کا تقاضا تھا کہ وہ اتنی ہی دُور جا سکے، لینن کی یہ تصویر بھی تم نے اپنے خیال میں بنالی ہے، اتنا جذباتی ہو جانا بھی کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ "تاروں سے زیادہ بلند" اور "سمندروں کی تہہ سے زیادہ گہرے" آئیڈیل اور خیالات کی دنیا میں بھرنے پر ناز کر کے تم اس حقیقت کو جھٹلا رہے ہو کہ تم نے زندگی کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ فطرت کا کوئی معجزہ کسی ادیب کے ایسے خیالات کی مصوری نہیں کر سکتا جو سمندر کی تہہ سے بھی زیادہ گہرے ہیں۔ زندگی تو مادہ کے بوجھ سے گرانبار ہے اُس کی ترجمانی میں یہ تصورات شاید ہی کام آسکیں۔ شاید ان باتوں سے تمھارے احساسِ جمال کو ٹھیس لگے گی۔ کیونکہ میں دُنیا کی باتیں کر رہا ہوں میں جذبات کی رَو میں بہہ نہیں رہا ہوں میں سطحِ زمین پر کھڑا ہوں اور اسی میں مجھے قوت معلوم ہوتی ہے

تم نے جوشؔ کے اشعار مثال میں پیش کرتے ہوئے شدتِ احساس کو اپنی تخیلی آرزوؤں سے اس طرح ملا دیا ہے کہ اگر کوئی غور نہ کرے تو ضرور تمھارے فریب میں مبتلا ہو جائے۔ تمھاری یا جوشؔ کی تخیلی قوتوں کا کون قائل نہیں، کسے تم دونوں کے شدّتِ احساس سے انکار ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ شدّتِ احساس کی وجہ سے تمھارے تصورات ماورائی ہو جائیں۔ تمھارے خیالات حقیقت کا پرتو نہ رہیں؟ وہ خیال جو نازک ہوتے ہوتے اصلیّت سے دُور ہو گیا، یا بلند ہوتے ہوتے حقیقت کی نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔ اِس زمین پر بسنے والے انسانوں کے کام کا نہیں رہتا۔ جمالیات، آرٹ، حُسن اصلیت، حقیقت، زندگی اور کائنات۔ یہ اور ایسے بہت سے لفظ ہمیں ہمیشہ دھوکے میں رکھتے ہیں ہم ان کے دھوکے میں کیوں آئیں، جہاں تک انسانی ذہن پہونچ سکے وہی حقیقت ہے، جہاں تک ادیب لکھ سکے وہی آرٹ ہے، جہاں تک زندگی کی ترجمانی کی جا سکے وہی حاصل زندگانی ہے۔ خط کو میں اس بحث میں طویل نہیں کرنا چاہتا، کسی موقع پر پھر اس پر غور کریں گے۔

جس ڈرامہ کا تم نے ذکر کیا ہے وہ یقیناً ایک ادبی شاہکار ہوگا، اُسے کسی طرح پُورا کرو، اِس میں تو تم سمجھ کی باتیں لکھنے والے ہو۔ وہاں نہ تو تمھیں اس "نوجوان بھکارن" کی تلاش ہے جس کی جوانی

نے اُس کی غریبی اور دُکھ سے زیادہ تم پر اثر کیا ہے، اور نہ اس میں آسکر وائلڈ اور ٹیگور کے جمالیاتی عناصر سے اپنی نظم کو ہلکا اور ناپائدار بنانا ہے۔ نہ تو معصوم بچّوں کی ہنسی اور دوشیزہ کے شباب کی جستجو سے "عالمِ رنگ و بو" کی تکمیل کی کوشش کرنا ہے۔ بلکہ یہاں تم تاریخ کے عُریاں حقائق پر حسن کارانہ نظر ڈالنے کی تمنا رکھتے ہو۔ یہاں تم حیاتِ انسانی کے تصادمات کو اپنے خیال کے صاف آئینہ میں دیکھ رہے ہو۔ یہاں تم زندگی کی بہت سی چھوٹی بڑی چیزوں کو سمجھنے اور سمجھانے کا ارادہ ظاہر کرتے ہو یہاں تمھارے حدود معیّن ہیں اور تمھارا آئیڈیل تمھارے سامنے۔ تم اسے ضرور پورا کر لوگے۔ اگر تم نہ لکھوگے تو کوئی کم سمجھ اور کم درجہ کا فن کار اسے لکھے گا اور وہ بات پیدا نہ ہوگی اس لئے جلد لکھو۔

اچھا ختم! لکھنا کہ حامد نے تمھیں کیا لکھا' اور تم میرے نقطۂ نظر کو کیسا سمجھتے ہو:

تمھارا ساحر

غزل

چھیڑ واعظ ثواب کی باتیں ہاں شراب و کباب کی باتیں
شوق کے اضطراب کی باتیں آہ! عہدِ شباب کی باتیں
مستیاں بن کے چھا گئیں دل پر ایک مستِ شباب کی باتیں
جس کی آنکھیں ہوں رشکِ میخانہ اس مجسّم شراب کی باتیں
تشنۂ سوز و ساز ہوں مطرب چھیڑ چنگ و رباب کی باتیں
کیا کہوں موجبِ تحیّر ہیں دیدۂ کامیاب کی باتیں
خود فروشی یہ لالہ و گل میں! ہائے! اس بے حجاب کی باتیں
خندۂ گل کہ نالۂ بلبل ہیں غرض اضطراب کی باتیں
سنتا ہوں سن کے بھول جاتا ہوں اس جہانِ خراب کی باتیں
خواب بن بن کے عمر کٹتی ہے یاد رہتی ہیں خواب کی باتیں
فصلِ گل آرہی ہے لے ناصح پھر سنیں گے جناب کی باتیں
تابِ لطف و کرم نہیں ہم کو اس پہ ناز و عتاب کی باتیں
برہمی زلف کی ارے توبہ! چھپتی ہیں پیچ و تاب کی باتیں
چشم و عارض کی شعلہ افشانی اُف وہ اُن کی عتاب کی باتیں
ہیں سراپا صغیر کے نغمے جلوۂ بے حجاب کی باتیں

صغیر احمد جان ۔ ایم ۔ اے

خطاب بہ ساقی

(از پروفیسر رگھوپتی سہائے صاحب فراق ایم۔ اے گورکھپوری)

حیاتِ نَو سی جو پاتے ہیں لوگ اے ساقی
کہاں کا درد اُٹھاتے ہیں لوگ اے ساقی

جہاں کو بھولتے جاتے ہیں لوگ اے ساقی
یہ کب کا حال سُناتے ہیں لوگ اے ساقی

ترے غلام کی اب شہرتیں ہیں دُنیا میں
قریب دُور سے آتے ہیں لوگ اے ساقی

یہ دَورِ جام، یہ غم خانۂ جہاں، یہ رات
کہاں چراغ جلاتے ہیں لوگ اے ساقی

نثارِ مستِ نگاہی، سنبھال محفل کو
کہ بےخبر ہوئے جاتے ہیں لوگ اے ساقی

سُنا ہے دیر و حرم کی بھی محفلیں ہیں کہیں
وہاں بھی پیتے پلاتے ہیں لوگ اے ساقی

تو کیا، تو محفلِ رنداں میں غیر ہے کوئی
جو تجھ سے حال چھپاتے ہیں لوگ اے ساقی

ہے ایک شعلۂ بےنام اور پردۂ دل
کہاں یہ آنچ دباتے ہیں لوگ اے ساقی

دلوں میں بند کیا ہے وہ بحرِ بےساحل
کہ ڈوبتے چلے جاتے ہیں لوگ اے ساقی

پکارنا ترے مستِ ازل کو ٹھیک نہیں
یہ کس کو ہوش میں لاتے ہیں لوگ اے ساقی

یہ مہر و ماہ بھی تحلیل ہوتے جاتے ہیں
ترا فسانہ سناتے ہیں لوگ اے ساقی

یہ برق دیکھ، یہ باراں، اک آگ سی دل میں
یونہی لگاتے بجھاتے ہیں لوگ اے ساقی

زماں مکاں کو ہے لرزش کہ ساغروں میں یہاں
شراب ڈھالتے جاتے ہیں لوگ اے ساقی

کچھ اور گم ہوئے جاتے ہیں تیرے متوالے
کہ راہ پر انھیں لاتے ہیں لوگ اے ساقی

تو اپنی چشمِ مروت کا عکس جام میں دیکھ
یونہی دلوں میں سماتے ہیں لوگ اے ساقی

جہاں حیات و اجل ایک ہیں اُسی کو یہاں
ترا مقام بتاتے ہیں لوگ اے ساقی

ترا ہی گُن ہے جہانِ خراب میں جس کو
عجیب درد سے گاتے ہیں لوگ اے ساقی

نہیں کہ سختیٔ منزل سے ہار دیں ہمت
تجھے سراہتے جاتے ہیں لوگ اے ساقی

مٹا مٹا کے بناتے ہیں لوگ دنیا کو
بنا بنا کے مٹاتے ہیں لوگ اے ساقی

جو چونک اُٹھتے ہیں آوازِ بازگشت سے آج
نہ جانے کس کو جگاتے ہیں لوگ اے ساقی

بس ایک بار لڑی تھی نگاہ مستوں کی
ابھی تک آنکھ چراتے ہیں لوگ اے ساقی

سُنا تو ہے کہ ترے میکدے کی رسمِ کہن
ابھی نباہتے جاتے ہیں لوگ اے ساقی

دلوں میں آگ ہے اور صبح کا دھندلکا ہے
شراب خانہ سے جاتے ہیں لوگ اے ساقی

نہ وہ سکون کا عالم نہ اضطرابِ فراق
مجھے کہاں لئے جاتے ہیں لوگ اے ساقی

آ کہ برہم ہے مزاجِ بوستاں تیرے بغیر

آ کہ سکتے میں ہے سازِ میکشاں تیرے بغیر
سرنگوں ہے گروہِ مطرباں تیرے بغیر

آگئی ہے کشتیٔ آبِ طرب گرداب میں
بجھ چکی ہے آتشِ رطلِ گراں تیرے بغیر

وہ یقینِ زندگانی جس پہ کیا کیا ناز تھا
رہ گیا ہے بن کے اک وہم و گماں تیرے بغیر

آ، کہ تیرے ہجر میں بے لالہ و گل ہے زمیں
آ، کہ بے شمس و قمر ہے آسماں تیرے بغیر

زرد ہے رخسارِ گل افسردہ ہے موجِ صبا
آ، کہ برہم ہے مزاجِ بوستاں تیرے بغیر

جوشؔ ملیح آبادی

ہندستانی زبان کا مسئلہ

(از جناب سہیل ایڈیٹر رسالہ ہندستانی)

فروری میں دہلی براڈکاسٹنگ اسٹیشن سے چند بزرگوں نے ہندستانی زبان کے متعلق اپنے خیالوں کو براڈکاسٹ کیا تھا۔ یہ تقریریں اس لئے اور بھی اہم تھیں کہ ان میں سے چار حضرات بہار گورنمنٹ کی بنائی ہوئی ہندستانی کمیٹی کے ممبر ہیں۔ ان کے سپرد جو کام کیا گیا ہے وہ "ممکن" ہے کہ زبان کے معاملے میں سارے ہندستان کی رہنمائی کرسکے (کیونکہ ہندستانی زبان میں اسکولی کتابوں کے لکھوانے کا کام بھی اسی کمیٹی کے سپرد کیا گیا ہے)

جن لوگوں نے اِن تقریروں کو سُنا ہے اُنھیں اس کا اندازہ ہوگا کہ یہ تقریریں کتنی مایوس کرنے والی تھیں۔ اِن تقریروں سے دراصل جو بات صاف طور سے معلوم ہوئی وہ یہ ہے کہ زبان کے معاملے میں ہمارے بزرگوں کا نظریہ بہت ہی اُلجھا ہوا ہے۔

اِس مختصر سے مضمون میں کسی کی تقریر کو ٹھیک طور سے نقل کرنا غیر ممکن[1] ہے۔ اِس لئے اُن تقریروں سے جو نتیجے مَیں نکال سکا ہوں اُنھیں کو یہاں پر لکھتا ہوں۔

ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی تقریر سے یہ بات صاف طور سے معلوم ہوگئی کہ وہ زبان کے معاملے میں کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے پر آمادہ نہیں۔ البتہ اگر اُردو کو 'ہندستانی' مان لیا جائے تو وہ طوعاً کرہاً اس نام کو منظور کرلیں گے لیکن زبان کی شکل صورت اور روپ ریکھا میں کسی قسم کی تبدیلی کو گوارا نہ کرینگے "ہندستانی" میں وہ ہندی کا کوئی لفظ بھی' جو اردو ادب میں پہلے سے موجود نہیں ہے داخل کرنا نہیں چاہتے۔ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ 'ہندستانی' کا نام انگریزوں کا دیا ہوا ہے، اِس سے پہلے اس زبان کا نام اُردو، ریختہ اور ہندی تھا، اب 'ہندستانی' نام اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انگریزوں کا دیا ہوا نام اختیار کیا جارہا ہے۔

لیکن ڈاکٹر صاحب موصوف نے اِس حقیقت کو بُھلا دیا کہ اُردو اور ہندی کی موجودہ صورت کی ابتدا بھی "ہندستانی" نام کے ساتھ ہی فورٹ ولیم کالج میں ہوئی تھی۔ اگر جان گلکرائسٹ رسم خط کی تلوار سے

---

[1] یہ تقریریں مکتبہ جامعہ دہلی نے کتابی صورت میں شائع کردیا ہے شائقین ۱۲ میں جامعہ سے طلب کرسکتے ہیں۔

ایک زبان کے دو ٹکڑے نہ کر دیتے تو آج نہ اُردو ہندی کی یہ شکل ہوتی اور نہ یہ جھگڑا پیدا ہو سکتا لیکن ڈاکٹر صاحب جان گلکرائسٹ کی بنائی ہوئی یا ترقی دی ہوئی زبان کو گلے کا ہار بنائے ہوئے ہیں مگر اس کا دیا ہوا نام انھیں نہیں بھاتا۔ اس کے ساتھ ہی جہاں اُنھوں نے گاندھی جی اور اُن کے ساتھیوں کے خلاف کوششیں کی ہیں وہاں جان گلکرائسٹ کو کبھی کچھ نہیں کہا۔

بہرحال ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے جرأت کے ساتھ غیر مصالحانہ رویہ اختیار کیا ہے جس سے ہمیں کوئی شکایت نہیں اور ہم اس پر کوئی بحث بھی نہیں کرنا چاہتے۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحبان نے گاندھی جی کے نظریے کی تائید کی ہے۔ اور یہی کہا ہے کہ ہندستانی جب مدراس، بنگال یا بمبئی کے لئے لکھی جائیگی تو اس کا رُجحان سنسکرت کی طرف ہوگا۔ اور جب پنجاب اور سرحد کے لئے لکھی جائیگی تو اس کا رُجحان فارسی عربی کی طرف ہوگا تاکہ وہاں کے رہنے والے اسے آسانی سے سمجھ لیں۔

دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندستانی زبان کی دو صورتیں ہونگی۔

(۱) وہ ہندستانی جس پر سنسکرت کا اثر زیادہ ہو

(۲) وہ ہندستانی جس پر فارسی عربی کا اثر زیادہ ہو۔

ہاں اس سلسلہ میں اتنا خیال ضرور رکھنا پڑیگا کہ زبان کو زیادہ سے زیادہ آسان اور عام فہم بنانے کی کوشش کی جائے، لیکن اُردو اور ہندی کا جھگڑا سرحد، پنجاب، بنگال، مدراس اور بمبئی سے زیادہ یو۔پی۔ بہار اور سی پی میں ہے، یعنی اسی "اُتر دیس" میں جہاں کی زبان کو ہندستانی کا معیار قرار دیا گیا ہے، یہاں کیا ہوگا؟ کیا لکھنؤ اور بنارس یا دہلی اور الہ آباد کے ساتھ سرحد اور مدراس والی رعایت برتی جائے گی؟ اس اتر دیس میں یہ جھگڑا کیسے طے ہوگا؟ اور اُتر دیس کی زبان کا معیار کیا رہیگا، اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔

دوسرے پنجاب اور بنگال اور مدراس اور سرحد کے سلسلہ میں بھی زبان پر عربی فارسی یا سنسکرت کے اثر کی رعایت دی گئی ہے، وہ بھی بے معنی معلوم ہوتی ہے۔ جب دو رسم خط اور لپیاں ہیں اور زبان کا جھکاؤ بھی دو طرف ہے تو پھر ایک زبان کیسے ہو سکتی ہے؟ یہی کام آسان اُردو اور آسان ہندی کہہ کر بھی لیا جا سکتا ہے۔ اتنی زیادہ الجھن پیدا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ بلکہ یہ کارروائی بالکل بے نتیجہ اور کسی حد تک خطرناک ثابت ہوگی۔

ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ الگ الگ لکھنے والوں کا ڈھنگ بھی الگ الگ ہوتا ہے۔ مثلاً جب عربی کا کوئی فاضل کچھ لکھتا ہے تو اُس کی زبان پر عربی کا اور جب سنسکرت کا کوئی ودوان کچھ لکھتا ہے تو اس پر سنسکرت

کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔ مثلاً منشی پریم چند اور مولانا نیاز فتحپوری دونوں ہی اُردو لکھتے رہے۔ لیکن دونوں کی زبان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسی طرح منشی پریم چند اور جے شنکر پرشاد کی ہندی میں اتنی ہی دوری ہے جتنی منشی جی اور مولانا فتحپوری کی اُردو میں، اور اس فرق کو ہم مٹا بھی نہیں سکتے کیونکہ اس کے مٹانے سے "طرزِ انشا کی ندرت" اور "شیلی کا انوکھاپن" ختم ہوجائے گا۔

جو صاحب اس کو اور دیکھنا چاہیں وہ مولانا شبلی، سرشار، چکبست، آزاد، خیال، نیاز، راشد الخیری، حسن نظامی، پریم چند اور سدرشن کی طرزِ انشا کو دیکھیں۔ ٹھیک اسی طرح کا فرق ہندی میں پریم چند، پنڈت بنارسی داس چترویدی، اختر حسین رائے پوری، منشی ظہور بخش ہندی کوو، مہادیوی ورما، وغیرہ کی "شیلی" میں موجود ہے۔

اس بحث سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ گاندھی جی کے خیال کے مطابق ہم آسان اُردو اور آسان ہندی کو "ہندستانی" کا نام دے سکتے ہیں، لیکن اس سے اصل الجھن نہیں مٹتی۔

دوسرا نقطہ جو ہمیں بھولنا نہ چاہیئے وہ یہ ہے کہ "اتری ہندستان" کی زبان کو سارے ہندستان کی قومی زبان قرار دینا دوسرے صوبوں کی روایتی اور نفسیاتی خصوصیتوں سے لڑائی مول لینا ہے۔

اس کا سب سے بڑا ثبوت مدراس میں ہندستانی کے خلاف تحریک ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ مدراسیوں کے لئے اتری ہندستان کی زبان اتنی ہی اجنبی ہے جتنی انگریزی۔ دراصل انگریزی سے اجنبیت تو بڑی حد تک مٹ چکی ہے، لیکن اُن پر ہندستانی کے نام سے اُتری ہندستان کی زبان لادنا ایک اخلاقی ظلم ہے۔

لیکن یہ الجھن آخر کیوں ہے؟ اور کوشش کرنے پر بھی کیوں نہیں مٹتی ہے۔

اس سوال کا جواب دینے کے لئے پُرانی تاریخ کے ورق اُلٹنا اور آزاد خیالی کے ساتھ اس پہ سوچ بچار کرنا ضروری ہے

ہماری موجودہ حالت اُس بیل جیسی ہے جس نے کوشش کرکے رسّی کی گرہیں ڈھیلی کرلی ہوں اور آگے بڑھکر ہری ہری گھانس کھانا چاہتا ہے۔ لیکن رسّی کی سب سے پہلی گرہ مضبوط کھونٹے میں بندھی ہے، وہ کوشش کرتا ہے اور تھک کر کھونٹے کے پاس ہی سر جھکا کر کھڑا ہوجاتا ہے۔

ہم ہندستانی سیاسی آزادی حاصل کرنے کی کوشش کررہے ہیں، لیکن ذہنی طور پر اب بھی روائتوں کے غلام ہیں۔ یہ گرہ اب تک ڈھیلی نہیں ہوئی، بلکہ لگاتار جھٹکوں کی وجہ سے اور بھی سخت ہوگئی ہے۔

اول تو ہم کسی مسئلہ پر آزادی کے ساتھ سوچ کر نتیجہ پر پہونچنے کے عادی نہیں ہیں، بلکہ ہمیشہ کچھ مفروضے اور مسلّمے اپنے سامنے رکھ لیتے ہیں، اس کے بعد آزاد خیالی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے ہمارا سوچنا

اقلیدس کا مسئلہ ثابت کرنے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ دماغ کا سارا زور ایک مفروضے کو ثابت کرنے میں ختم ہو جاتا ہے۔ اور کسی صحیح نتیجے پر تو پہونچتے نہیں لیکن دل میں ضرور سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے اپنے دعوے کے ثبوت میں ایسی دلیلیں پیش کر دی ہیں، جو ہمالہ سے بھی زیادہ اٹل ہیں۔

زبان کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہو رہا ہے۔ ہندی اور اُردو کے حامی رسہ کشی کر رہے ہیں۔ اور ایک کھینچ تان جاری ہے۔ اسی کھینچ تان کو ختم کرنے کے لئے ہماری قومی سبھا انڈین نیشنل کانگریس نے مہاتما گاندھی کی زبان سے ہندستان کی قومی زبان کا نام 'ہندستانی' رکھوایا۔ تو اب یہ کوشش ہے کہ ہندی۔ یا۔ اُردو کو ہی ہندستانی مان لیا جائے۔ اور اس طرح وہ کھینچ تان اب بھی باقی ہے جس کا اندازہ ملک کے بڑے بڑے لوگوں کی تقریروں تحریروں اور اخباروں کے مضمونوں سے ہوتا ہے۔ دہلی والی تقریریں اس کا سب سے بڑا ثبوت ہیں۔

'ہندستانی' کے معاملہ میں گاندھی جی نے کمزوری کا ثبوت دیا ہے۔ جہاں اُنھوں نے صلح کے خیال سے یہ نام رکھا تھا وہاں ہندستانی کی شکل صورت کے متعلق بھی انھیں ایک صاف تخیل پیش کرنا چاہیئے تھا۔ زبان کو آسان بنانے کی ضرورت کا احساس تو عام ہو چکا ہے اور یہ کام غیر محسوس طور پر برابر ہو رہا ہے۔ اس سلسلہ میں منشی پریم چند آنجہانی کی کوششیں سب سے زیادہ کامیاب رہیں۔ اُنھوں نے غیر محسوس طور پر ہندی میں فارسی عربی کے سینکڑوں لفظ بھر دیے۔ اور اردو میں ہندی کے۔ اور اس خوبی کے ساتھ کہ سب نے اُس سے مزا پایا۔ لیکن ہندستانی کی اسکیم کے بعد اس میں کرڈاپن پیدا ہو گیا۔ اور یہ صرف اس لئے کہ اسکیم ناکام، اور احساسات بیدار کا سامنا ہوا۔

لیکن اِس میں گاندھی جی کا بھی کوئی قصور نہیں۔ یہ ہماری تاریخی ہنگامہ آرائیوں کا لازمی نتیجہ اور عکس ہے جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ گاندھی جی کے پاس شاید خود بھی ہندستانی کا کوئی مستقل اور صحیح تصور نہیں ہے، وہ خود ایک مدت تک ہندی ہندستانی، ہندی اتھوا ہندستانی اور ہندستانی کی بھول بھلیاں میں چکر کاٹتے رہے ہیں۔ اور اب جہاں جا کر رُک گئے ہیں وہ ایک مبہم تخیل ہے، اور بس۔

مگر اس کی حقیقت سمجھنے کے لئے ہمیں گاندھی جی کے سیاسی رُجحانات کا غور سے مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ اُن کے پاس قومیت اور وطنیت کا ایک اُلجھا ہوا خیال ہے جس کا ایک سرا تو موجودہ زمانہ کے رُجحانات سے بندھا ہوا ہے، اور دوسرا سرا ہندو کلچر اور اس کے احیاء کے ساتھ۔ اُن کی قومیت اور وطنیت مذہبیت کی بُنیاد پر قائم ہے۔ جیسی کہ چند دوسرے ہندو بزرگوں کی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ

دوسرے مذہب اور کلچر کو بھی پوری آزادی کے ساتھ زندہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور دوسرے نہیں۔ مسلمانوں میں گاندھی جی کی قسم کی قومیت اور وطنیت کے داعی اور پیامی جمعیتہ علماء ہند کے بزرگان کہے جا سکتے ہیں۔

لیکن ہمیں اس کے لئے گاندھی جی پر کسی قسم کا الزام نہیں ڈالنا چاہیئے بلکہ سنجیدگی کے ساتھ اُن تمام حالات پر غور کرنا چاہیئے جن میں مہاتما جی نے زندگی بسر کی ہے۔ تاریخ اُن کی پوری پوری سفارش ہی نہیں بلکہ حمایت کرتی ہے۔ اور ہمیں یہ ماننے پر مجبور کرتی ہے کہ اُنھوں نے جو کچھ کیا ہے وہ مُلک پر اُن کا احسان ہے، اور اُن سے اس سے زیادہ کی اُمید رکھکر مایوس ہونا خود ہماری غلطی ہے۔ اور اگر اُن کی بنائی ہوئی راہ ہمیں منزل تک نہیں پہنچا سکتی تو یہ ہمارا فرض ہے کہ اب دوسری راہ تلاش کریں۔

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ اس سوال کے جواب کے لئے ہمیں تاریخ کے ورقوں کو اُلٹنا ہوگا۔ کیونکہ یہ تاریخی اُلجھنوں کا نتیجہ ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہندُستان کی تاریخ میں ایک نئی جھلک پیدا ہوئی۔ انگریزوں سے لڑنے جھگڑنے کے بعد ہندستانیوں نے انھیں اپنا سرپرست بنالیا۔ اور انگریزوں نے انگریزی تعلیم کا پرچار کرکے بڑی بڑی نوکریوں کی جھلک دکھاکر اپنی طرف متوجہ کیا۔ ساتھ ہی تعلیم کی مشینریوں کو اس خوبی کے ساتھ چلایا کہ نتیجہ انھیں کے حق میں نکلا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے دماغوں میں اس انگریزی تعلیم کے ذریعہ زہر بھرنا شروع ہوگیا، اور دونوں ایک دوسرے کو دشمن سمجھنے لگے۔ مگر جب عیسائی مشنریوں نے اپنا مذہب پھیلانا چاہا تو ہندو اور مسلمان دونوں ہی چونکے۔ اور انگریزی زبان کے خلاف ہنگامہ شروع ہوا۔ مسلمان عالموں نے انگریزی پڑھنا ناجائز قرار دیا۔ ہندوؤں میں کیشب چندرسین، سوامی دویکانند اور سوامی دیانند پیدا ہوئے، جنھوں نے مذہب کی حفاظت شروع کی، اور انگریزوں کو اپنے لئے ایک خطرہ سمجھا اس طرح ہندوستان میں قومیت اور وطنیت کی بنیاد مذہب پر رکھی گئی۔

۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی، اس وقت کانگریس اتنی طاقتور جماعت نہ تھی، پھر بھی اُس نے دبی زبان سے حکومت کی بعض باتوں پر نکتہ چینی کی۔ اس سے انگریزوں کو خطرہ محسوس ہوا، اور وہ اِدھر اُدھر سہارا ڈھونڈنے لگے

اس کے بعد ہی سرسید نے مسلمانوں میں ایک نئی تحریک شروع کی۔ مسلمانوں کو انگریزی پڑھنے کی ترغیب دلائی۔ مذہبی لوگوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ لیکن انھیں کامیابی نہ ہوئی اور سرسید کے مخالفوں کو شکست ہوئی۔ چنانچہ قومی رُجحان کے ساتھ اپنے اپنے مذہب کی حفاظت کے خیال نے

ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا۔ اس کا اثر ہمیں اس وقت کے ادب میں ملتا ہے۔ جہاں بنکم بابو کے ناولوں میں قومیت کا تخیل موجود ہے، اور مسلمانوں کے خلاف نفرت وحقارت کا جذبہ جھلکتا ہے اور وہ ہندو قوم کو انگریزوں کے زیر سایہ ترقی دینا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف سرسید نے "اسباب بغاوت ہند" نامی کتاب لکھکر مسلمانوں کو غدر کے الزاموں سے بری کرنے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی اس خیال کی اشاعت کی کہ مسلمانوں کا فائدہ انگریزوں سے مل کر رہنے میں ہے۔ انھوں نے انڈین نیشنل کانگریس کی تحریک کو بھی مسلمانوں کے لئے خطرناک سمجھا اور اس سے علٰحدہ رہنے کی ہدایت کی یہ ساری چیزیں وہ کیوں کرتے رہے یا کن مصلحتوں کی بنا پر کرتے رہے، اس کا اندازہ کرنا، یا اُن کی نیت واقعی کیا تھی آج اس کا کہنا مشکل ہے۔ لیکن خان بہادر ولایت حسین نے سرسید کی جو ڈائری شائع کی ہے اُس سے اس پر بہت زیادہ روشنی پڑتی ہے۔ لیکن سردست یہ چیز ہماری بحث سے باہر ہے۔ اس لئے یوں ہی چھوڑنا مناسب ہے۔

بہرحال اس وقت مذہبی جذبہ جاگ چکا تھا، اور ہندو قومیت اور مسلمان قومیت کی بنا مضبوط ہوچکی تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ لوکمانیہ تلک نے جہاں جیل جاکر گیتا کی شرح لکھی۔ وہاں بنگال کے دہشت انگیزوں نے بابو کالی جی کی مورتی کے سامنے یا قرآن ہاتھ میں لے کر انگریزوں کے خلاف لڑنے کا عہد کیا۔ ۲۲-۱۹۲۱ء تک سیاست میں گاندھی جی اور مولانا آزاد نے لوگوں کو بار بار مذہب کے نام ہی پر اُبھارا۔ بلکہ ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کا سمجھوتہ بھی مسلمانوں کے مذہبی جذبہ کا نتیجہ تھا۔

گاندھی جی نے ہندوستان کو قومیت کا ایک اُلجھا ہوا تخیل دیا، ہندو اور مسلمان گلے مل کر ملاپ اور اتحاد کا راگ الاپنے لگے۔ لیکن اس اتحاد اور ملاپ کے بعد بھی کوئی صاف خیال اُن کے سامنے نہ تھا، یہی وجہ تھی کہ اس اتحاد کے بعد ۲۱-۱۹۲۰ء میں جو تحریک ترک موالات اور تحریک خلافت شروع ہوئی وہ محض جذباتی تھی۔ اسکی تہ میں نہ کوئی جنچا تُلا پروگرام اور خیال تھا اور نہ قومیت ہی کا کوئی صاف تصور تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تحریک جتنی تیزی سے شروع ہوئی تھی اُتنی ہی تیزی سے ختم ہوگئی "مندر میں جاکر اذان دینے والے" اور "مسجد میں بیٹھکر پوجا کرنے والے" بھائی بہت جلد آپس میں لڑ پڑے۔ اور مذہب میں اتنی آزاد روی اختیار کرلینے والے لوگ چھوٹے چھوٹے مذہبی جھگڑے پیدا کرکے ایک دوسرے کا خون بہانے لگے۔ اس کے لئے تاویلیں چاہے جو کچھ پیش کی جائیں لیکن واقعہ یہی ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو البتہ پہلے لیڈر ہیں جنھوں نے سیاست کو مذہب سے الگ ہٹانے کی کوشش کی اور قومیت کا تصور وطنیت کی بنا پر صاف اور سلجھے نظریے کے ساتھ پیش کیا۔

اسی لئے پنڈت جواہر لال نہرو اور اُن کے بعد کے لوگوں میں زبان کے مسئلہ میں وہ الجھن نہیں جو اُن سے پہلے کے لیڈروں میں ہے۔ کیونکہ پہلے کے لیڈر مذہب اور کلچر کے قائل ہیں جس کا زبان سے بہت گہرا تعلق ہے۔ اس لئے گاندھی جی کے پاس اگر ہندستانی کا کوئی صحیح تصور نہیں تو کوئی تعجب نہیں، بلکہ یہی ہونا چاہیئے تھا۔

بہرحال اب یہ حالات ہمارے سامنے ہیں جن میں ہمیں اپنے لئے راہ تلاش کرنی ہے۔ سوال یہ ہے کہ "ہندستانی" کا پیوند کس سے جوڑا جائے۔ سنسکرت سے یا عربی اور فارسی سے۔

ہمیں یہ کہتے ہوئے ذرا بھی جھجھک نہیں کہ سنسکرت ایک مردہ زبان ہے، اور اس سے اپنی زبان کا پیوند باندھنے کا مطلب صاف لفظوں میں یہ ہے کہ ہم اپنی زبان کے لئے قبر کھود رہے ہیں۔ دوسری طرف عربی اور فارسی زبانیں بدیسی زبانیں ہیں، اور روز بروز بھولی بسری ہوتی جا رہی ہیں۔ اس لئے زبان کا اِن سے پیوند لگانا بھی ہمارے لئے کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا۔

اب ہمارے لئے صرف ایک صورت باقی رہ جاتی ہے کہ ایمانداری کے ساتھ زبان کو زیادہ آسان بناتے چلے جائیں اور بس۔ اس کے بعد جب جتنی تیزی کے ساتھ دوسرے صوبوں کے لوگوں سے ملتے جلتے جائیں گے، ہماری ہندوستانی زبان کی بناوٹ اور سجاوٹ غیر محسوس طور پر بنتی چلی جائیگی۔ ورنہ دوسری کوششیں اس فرقہ پرستی کے دَور میں یقینی طور پر نقصان دہ ثابت ہونگی۔

اِس سلسلہ میں ہم یہ کام کر سکتے ہیں کہ ایک آل انڈیا کمیٹی بنائی جائے جس کی شاخیں ہر صوبے میں ہوں، اور یہ شاخیں سب سے پہلا کام یہ کریں کہ اپنے صوبے کی زبان کے ایسے لفظوں کو اکٹھا کر دیں جو دوسرے صوبے میں بولے اور سمجھے جاتے ہوں۔ ساتھ ہی دوسرے صوبوں کی زبانوں کے لفظوں کو بھی اکٹھا کر دیں جو اُن کے صوبہ کی زبان میں استعمال کئے جاتے ہوں۔ پھر آل انڈیا کمیٹی زیادہ عام لفظوں کو چُن کر ہندستانی مان لے۔

لیکن یہ سب کچھ جبھی ممکن ہے کہ تمدن، کلچر وغیرہ کے مفروضے ہمارے دماغوں سے نکل جائیں اور ہم اپنی سیاسی اور سماجی زندگی میں ایک ہی رجحان پیدا کر لیں۔ اس لئے ہمیں زبان کو ایک کرنے سے پہلے اپنی سیاسی اور سماجی زندگی کو ایک بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

اُردو۔ ہندی۔ ہندوستانی

جواب از "حق پرست"

"سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست"

ستمبر ۱۹۳۸ء کے زمانہ میں مندرجہ بالا عنوان پر اپنے مضمون کی اشاعت کے بعد اس پر اہل الرائے کے آرار کا نہایت اشتیاق سے انتظار کر رہا تھا۔ اس اثنار میں خود جناب اڈیٹر صاحب زمانہ سے اس مضمون کے متعلق کچھ مراسلت رہی۔ موصوف کو بھی میرے مسلک سے اتفاق نہ تھا مگر انھوں نے اس مضمون کو ایک ایسے مطمح نظر سے دیکھا جو میرے خیالات اور جذبات کے بارے میں غلط فہمی پر مبنی تھا۔ میں نے اپنے جوابی عریضہ میں یہ واضح کر دیا تھا کہ مجھ کو اُردو سے تعصب نہیں، بلکہ میں اُس کی خوبصورتی اور طرحداری کا تہ دل سے قایل ہوں البتہ اس کو ہندوؤں کی زبان نہیں سمجھتا اور یہ یقین رکھتا ہوں کہ اس کو اختیار کر کے ہندو بنیٹ پائیں گے اور رفتہ رفتہ بہ حیثیت قوم اپنی ہستی ہی مٹا بیٹھیں گے۔ میری اس رائے کے بارے میں محترمی اڈیٹر صاحب کا کیا خیال ہے میں نہیں جانتا، غالباً یا چیز موصوف کو قائل نہ کر سکا۔ خیر کچھ بھی ہو شاید مناسب بھی یہی ہے کہ اس نوعیت کے مباحثوں میں اڈیٹر خاموش ہی رہے اور اپنے کام سے کام رکھے۔ حجتیں کرنے والے حجتیں کریں گے اور پڑھنے والے اپنے مقدور کے مطابق نتائج اخذ کریں گے۔ اڈیٹر کی لیاقت یہی ہے کہ ان مختلف اور متضاد رائوں کو قرینہ سے منظر عام پر اس اہتمام کے ساتھ لائے کہ تلخ جذبات پیدا ہونے کے بجائے مفید نتائج برآمد ہوں۔ جیسے "زمانہ" کے قابل اڈیٹر نے ماہ دسمبر ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں نہایت خوبصورتی سے کیا ہے۔ کہ مختصر اقتباسات سے اُن حضرات کا خیال بھی نہایت عمدگی سے ظاہر کر دیا جو اس "حق پرست" کے خیالات کو "غلامانہ ذہنیت" کی کاوش کا نتیجہ اور ہندو مسلم اتحاد میں رخنہ اندازی کا باعث سمجھتے ہیں اور اُس طبقہ کے خیال کے اظہار کا اہتمام بھی کیا جو اقلیت میں ہے اور جن کے نمایندے مولانا سہیل عظیم آبادی ہیں۔

مولانا سہیل عظیم آبادی نے جن قدر افزا الفاظ میں اس خاکسار کے مضمون کا تذکرہ فرمایا ہے اُس کے لئے میں تہ دل سے مشکور ہوں۔ لیکن ممدوح کو اس اعتراف کے باوجود کہ اس ناچیز کا تجزیہ قابل داد ہے

اِس بات کی شکایت بھی ہے کہ میں اس پیچیدہ مسئلہ کا کوئی حل پیش نہیں کر سکا۔ اس لحاظ سے میری حیثیت اُس طبیب کی سی ہے جو تشخیص تو ٹھیک کرے لیکن علاج سے گریز۔ غالباً میرے مضمون کا آخری حصہ مولانا ممدوح کی نظر سے نہیں گذرا جو اس مسئلہ کے حل ہی کے لئے وقف ہے۔ بدایونی صاحب نے "غلامانہ ذہنیت" کا جو فتویٰ صادر فرمایا ہے وہ اسی حل سے برانگیختہ ہو کر فرمایا ہے۔ اُن کی اور اکثر بزرگوں کی رائے میں غیر ملکی انگریزی سے کام لینا تو "غلامانہ ذہنیت" پر دال ہے لیکن غیر ملکی عربی اور فارسی کے الفاظ کا استعمال جو اردو کو ہندی سے متمیز کرتا ہے غلامی نہیں ہے۔

ترکی اور فارسی کی بھی ٹھیک اُردو کی سی کیفیت تھی، لیکن حب الوطنی کے جذبہ اور آزادی کی چاہ کا جاں فروشی سے ثبوت دینے والے ترک اور ایرانیوں کا طرزِ عمل اس بارے میں کچھ اور ہی رہا ہے۔ ترک اپنی زبان سے عربی اور فارسی الفاظ کو اور اہلِ ایران اپنی زبان سے عربی الفاظ کو خارج کر کے اپنے آزاد خیالی اور حب الوطنی کا ثبوت دے چکے ہیں، اور جو کام ترکستان اور ایران کے مسلمانوں نے کیا وہی اگر ہندوستان کے مسلمان بھی کریں تو ہندی اُردو کا جھگڑا یوں ہی مٹ جائے۔ پھر مکرمی جگر بریلوی جیسے ہندو بزرگوں کو اُس الجھن میں پڑنے کی ضرورت ہی نہ رہے جس میں وہ اُلجھ رہے ہیں۔ نہ مسلمان حضرات کو ہندوؤں کے یہ ذہن نشین کرانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگانے کی ضرورت باقی رہے کہ اُردو ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے۔

دوسرے تفرقے بھی رفتہ رفتہ آسانی سے مٹ سکتے اور ایک متحدہ قومیت کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔ لیکن کشمیری پنڈتوں کے ایک ممتاز خاندان نے جو بے نظیر مسلمان سپوت پیدا کیا اُس نے اس وطنیت کے جذبہ کے مقابلہ میں مسلمانوں کے لئے ایک اور ہی چیز رکھی۔ چنانچہ اس کے مشہور الفاظ یہ ہیں:۔ "مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا"

اِس نظریہ میں کیا کیا باتیں مضمر ہیں اُن کی وضاحت کی سر دست نہ ضرورت ہے اور نہ موقع۔ اس کے لئے ایک علحدہ مقالہ کی ضرورت ہے۔ لیکن مجھ جیسے خیال کے لوگوں کے لئے تو اپنے نقطۂ نظر سے حقیقت کا اظہار بڑی مصیبتوں کا سامنا ہے۔ جو فضا پیدا ہو گئی ہے یا پیدا کر دی گئی ہے اُس کا نقشہ اکبر مرحوم کے اس شعر سے واضح ہوگا جو حقیقی معنوں میں وطن پرست ہندوستانیوں پر آج کل خوب صادق آتا ہے۔

جب آنکھ کو کھُلنے میں ہو جھپک جب منہ میں زباں ہلنے سے ڈرے
اِس قید میں کیونکر جینا ہو اللہ ہی اپنا فضل کرے

خیر اب فروری ۱۹۳۹ء کے "زمانہ" میں مکرمی جگر بریلوی نے اُس "غیر سخن شناس" کی یاوہ گوئی

کی جانب توجہ فرمائی ہے اور اس مربیانہ مشورہ پر اپنا مضمون ختم فرمایا ہے کہ میں کچھ "تھوڑی سی ابتدائی اُردو کی تاریخ" اور کم سے کم اُن ہندو مشاہیر کی تصنیفات کا مطالعہ کروں جن کا ممدوح نے اپنے مضمون میں تذکرہ فرمایا ہے تاکہ مجھ پر ثابت ہو سکے کہ ہندو فردوریا نقال نہ تھے بلکہ اُردو کے بانیوں میں تھے۔ مَیں اِس مشورہ کے لئے ممدوح کا مشکور ہوں اور مجھ کو یہ تسلیم کرنے میں عار نہیں کہ ممدوح کے مقابلہ میں میں ایک بہت کم پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ لیکن غالباً اتنا کم پڑھا لکھا نہیں کہ ابھی مجھکو اُردو کی ابتدائی تاریخ دیکھنے کی ضرورت باقی ہو۔ میرے سابقہ مضمون پر بعض اہل نظر بزرگوں نے تو یہ رائے ظاہر کی ہے (گو میں اس کو مبالغہ سمجھتا ہوں) کہ اس چھوٹے سے مضمون میں میں نے بھی اُردو زبان کی تاریخ لکھدی ہے اور پیٹی ہوئی لکیر سے ہٹکر اُس پر ایسی صحیح روشنی ڈالی ہے جس سے کئی مسئلے جو مدتوں سے معمہ بنے ہوئے تھے خوبی اور آسانی سے حل ہو جاتے ہیں۔ جہاں تک میرے اُردو مطالعہ کا تعلق ہے مَیں نے زیادہ تر ہندو ادیبوں ہی کی چیزیں دیکھی ہیں جن میں سے بعضوں کا تو مَیں بہت ہی دلدادہ ہوں، لیکن اس کے باوجود میں نے وہ نتیجے اخذ کئے جن کا اظہار میرے سابقہ مضمون میں ہوا ہے۔

مجھکو اس سے انکار نہیں ہے کہ ہندوؤں نے بھی اُردو میں بڑے بڑے صاحب کمال پیدا کئے ضرور پیدا کیئے، لیکن اسی طرح جیسے انگریزی میں پیدا کئے۔ کیا انگریزی شاعری پر مائیکل مدھوسودن دت مس تارو دت، سروجنی نائیڈو، ششنادری، ہمندرناتھ چٹوپادھیائے، اور سب سے بڑھکر ٹیگور کے احسانات نہیں ہیں؟ انگریزی نثر میں تو سیکڑوں نام لئے جا سکتے ہیں جن میں سے کئی ایک کی انگریزی پر خود انگریزوں نے رشک کیا ہے۔ مثلاً مسٹر سکلتوا الامرحوم ممبر پارلیمنٹ، پنڈت بشن نراین در، این این گھوش، رائٹ آنریبل سری نواس شاستری، آنریبل مسٹر سچدانند سنہا، پنڈت جواہر لال نہرو اور مہاتما گاندھی کو لیجئے۔ خالص ادب سے ہٹکر علوم و فنون میں بھی انگریزی زبان کے توسط سے ہندوستانیوں نے ایک دنیا میں نام کمایا ہے۔ لیکن کیا اس بنا پر ہندو یا ہندوستانی قوم کی زبان انگریزی قرار دیجا سکتی ہے؟

یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مقابلہ درست نہیں اس لئے کہ جب انگریز یہاں آئے تو انگریزی زبان نہ صرف عالمِ وجود میں آچکی تھی بلکہ اپنے کمال کو پہونچ چکی تھی۔ اس کے برخلاف اُردو ہندوستان میں پیدا ہوئی اور مسلمانوں کے یہاں آنے کے بعد پیدا ہوئی اور اس کی نشو و نما اس وقت تک جاری ہے۔ مگر میرا معروضہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے پیشتر ہندوستان زبانوں سے محروم نہ تھا۔ زبانیں موجود تھیں اور خاصی متمدن و مہذب۔ برج بھاشا کے سحر کو تو مسلمان بھی آج تک بھول نہ سکے۔ اگر وہ چاہتے تو انھیں زبانوں کو اختیار کر سکتے تھے جیسے یہودیوں یا پارسیوں نے اُن مقامات کی زبان

اختیار کی جہاں وہ آباد ہوئے لیکن اسلام کی تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے کبھی غیر مسلموں کے ساتھ متحدہ قومیت اختیار نہیں کی۔ اُنھوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو علٰحدہ اور متمیز رکھا اور ان کی سرگرم کوشش یہ رہی کہ غیر مسلموں کو اپنے میں جذب کیا جائے۔ آج بھی متحدہ قومیت کے مسئلہ کے حل میں مسلمانوں کا یہی جذبہ حائل ہے۔ غرض ایک نئی زبان کی اگر کسی کو ضرورت تھی تو مسلمانوں کو تھی نہ کہ ہندوؤں کو۔ ایک ایسی زبان کی جس سے وہ علٰحدہ اور متمیز رہ سکیں، اور جس کے ذریعہ وہ غیر مسلموں کو اپنے اندر جذب کر سکیں۔ ہندو ادیبوں کی نکتہ چینی پر مسلمان حضرات جو مائل رہے ہیں اور ہیں وہ بھی اسی جذبۂ تفخر و امتیاز کو ثابت کرتا ہے۔

رہا یہ استدلال کہ جب دو قومیں آپس میں ملتی ہیں تو ایک نئی زبان پیدا ہو ہی جاتی ہے جو دونوں کی مشترکہ ہوتی ہے، اس کا میں قائل نہیں۔ گو میں مانتا ہوں کہ اس قسم کے ارتباط کا زبان پر تھوڑا بہت اثر ضرور ہوتا ہے لیکن ایسا انقلابی نہیں کہ ہندی کو اُردو بنا ڈالے۔ پارسی بھی تو فارسی زبان لے کر آئے تھے لیکن اس کے باوجود یہاں ان کی وجہ سے کوئی نئی زبان پیدا نہیں ہوئی۔ یہودی ایسی کثیر تعداد میں یورپ کے مختلف ممالک میں صدیوں سے بستے چلے آتے ہیں تاہم اُن کی وجہ سے نہ انگریزوں کی انگریزی بدلی نہ جرمنوں کی جرمنی۔ مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کا ملک کی زبان پر جو قدرتی اثر پڑا اُس سے کھڑی بولی کی تخلیق ہوئی۔ ہندی کی کھڑی بولی ایک ایسی چیز ہے جو ہندو اور مسلمانوں میں مشترکہ سمجھی جا سکتی ہے۔ چنانچہ کھڑی بولی کے پہلے لکھنے والوں میں مسلمان حضرات بھی ہوئے ہیں جیسا کہ میں نے اپنے سابقہ مضمون میں عرض کیا ہے۔ اگر "ہندوستانی" کا نام کسی زبان کو دیا جا سکتا ہے تو اسی کھڑی بولی کو جس کی تخلیق کا باعث مسلم (Gezius) ہوئی ہے۔

ہم مفتوح تھے، محکوم تھے، اپنی دنیوی ضرورتوں اور خواہشوں کی تکمیل کے لئے ہم اُنھیں کے دست نگر تھے۔ اس حالت میں یہ قدرتی تھا کہ ہم خواہ روزگار کے لئے ہو خواہ تفخر و امتیاز کے لئے زبان کے معاملہ میں ان کا اتباع کرتے۔ ہماری فردوروں کی حیثیت اس سے ثابت ہے کہ ہمارے بڑے سے بڑے ادیبوں نے اپنے طبع زاد کلام میں پرمیشور نہیں اللہ یا خدا ہی کہا، جنیو کو زنّار اور سنکھ کو ناقوس کہا اُن کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب و تمدن و ادبیت کی کوئی خصوصیت نہیں آئی، ترکیب میں نہ دوہے آئے، نہ چھند، نہ کبت نہ سورٹھے۔ تخیل و تشبیہات میں وہی غیر ملکی چیزیں رہیں، محبت کے لئے لیلیٰ و مجنوں، شیریں و فرہاد، گل و بلبل، سخاوت کے لئے حاتم، دولت کے لئے قارون کا خزانہ، غرض کہیں ہندو ادبیت ہندو تہذیب اور ہندو تمدن کا نام و نشان تک نہیں آنے پاتا۔ ظاہر ہے کہ اگر ہندو بہ حیثیت ہندوؤں کے مساوی حیثیت سے ایک مشترکہ زبان کی بنیاد ڈال رہے تھے تو کم از کم

انھیں کے کلام میں اُن کے قومی تہذیب و تمدن کے خصوصیات جھلکتے ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ انفرادی طور پر یہ سب باتیں غیر ارادی طور پر عمل میں لائیں۔ لیکن اسلامی حکومت، سطوت و دبدبہ کے سحر کے زیر اثر اور یہ سحر ہم پر ایسا چلا کہ ہماری نظر ان باتوں کی طرف کبھی نہ گئی۔ اب جو آنکھ کھل رہی ہے تو یہ سب باتیں عجیب و غریب معلوم دیتی ہیں۔

میرا معروضہ ہے کہ یہ حقیقت ہے جس کو بخوبی ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد ہم آئے دن کے جھگڑوں کو مٹانے کی طرف متوجہ ہوں گے تو زبان کے متعلق بہترین حل یہی ہوگا کہ مسلمان اپنی اُردو کو سنبھالیں اور ہندو اپنی ہندی کو، اور لنگوا فرانکا کے لئے سر دست انگریزی ہی سے کام لیا جائے۔ جیساکہ اس وقت نہایت کامیابی اور بغیر آپس کی تلخیوں کے لیا جا رہا ہے۔ یہ صورت اُس وقت تک قائم رہے گی جبتک کہ ہندی مسلمان یہ محسوس نہ کرلینگے (اور ایک دن آئے گا کہ وہ ضرور محسوس کریں گے) کہ وہ یہیں کے ہیں اور اُن کے آباؤ اجداد بھی یہیں کے تھے اور اُن کا ورثہ بھی یہیں کی تہذیب و تمدن ہے۔ تب وہ خود سمجھیں گے کہ ہندوستان کے لئے سنسکرت اور عربی فارسی کی حیثیت مساوی نہیں ہوسکتی (کیونکہ اول الذکر ملکی ہے اور ثانی الذکر غیر ملکی) اور مسلمان بھائی بھی خود بخود وہی کریں گے جو ترکوں اور ایرانیوں نے کیا اور بہت آسانی سے ہندوستان کے لئے ایک ایسی "لنگوا فرانکا" بن جائے گی جس کو ہندوستان جنت نشان کے طول و عرض میں ہر جگہ سہولت سے سمجھا جا سکے گا۔ اس لئے کہ مختلف صوبوں میں جو زبانیں رائج ہیں اُن میں پچاس سے پچھتر فیصدی تک سنسکرت الفاظ شامل ہیں۔

مجھکو جگر صاحب کے مضمون کا لفظ بہ لفظ جواب دینا مقصود نہیں، اس میں شکر رنجی اور تلخی کا اندیشہ ہے صرف اپنا نقطۂ خیال پیش کرنا مدِ نظر ہے۔ آخر میں میرا فرض ہے کہ ممدوح سے اپنی اُس غلط فہمی کے لئے معافی کا خواستگار رہوں جو ہندی کے بارے میں ان کے متعلق ہوئی۔ حقیقت میں موصوف کے مضمون میں کوئی لفظ اس قسم کا نہ تھا جس سے ایسی غلط فہمی بجا طور پر ہو سکتی۔

"حق پرست"



نوٹ:۔ حق پرست صاحب اطمینان رکھیں اس مباحثے کے آخر میں ہم بھی کسی آئندہ نمبر میں اپنی ناچیز رائے عرض کردیں گے۔

ایڈیٹر "زمانہ"

جذباتِ اثرؔ

(خان بہادر مرزا جعفر علی خان صاحب بی۔اے، او۔بی۔ای)

نگہِ شوق کو یوں آئینہ سامانی دے
عشق کو حسن بنا، حسن کو حیرانی دے

دلنوازی میں بھی ایذا ہے، محبت کی قسم
تجکو فرصت جو کبھی شغلِ ستم رانی دے

کچھ تری چشمِ سخن ساز کا ایسا نہ کھلا
لبِ مے نوش کو تکلیفِ گل افشانی دے

آئینہ سنگِ درِ دوست ہوا بھی تو کیا
سر جو سجدے میں جھکے، تو تری پیشانی دے

شمع درکار ہے قرباں گہِ الفت کے لئے
دل کو اک شعلہ بنا، شعلے کو عریانی دے

کسی منزل میں ہو، بیتاب ہے شبنم کی طرح
پرتوِ مہر جسے ذوقِ پرافشانی دے

اُن کی انگڑائی کا عالم تو کبھی دیکھ اے گل
اور ہی حسن تری چاک گریبانی دے

اُف وہ پرکارہ جو سنتے ہی تغافل کا گلہ
عشوہ و ناز کو تعلیم پشیمانی دے

عشرتِ ذبح تقاضا ترا سر آنکھوں پر
جب تڑپنے کی اجازت بھی گراں جانی دے

تھے وہی پھول میسر جو چڑھے "سنتا تھا
اب کھلا دل کی رہِ عشق میں قربانی دے

ہر جراحت کو ہے اِک تازہ جراحت کی ہوس
اور کچھ غمزۂ خونریز کو جولانی دے

چمن آرائیِ الفت کا اگر سودا ہے
اشکِ گلرنگ سے ہر شام و سحر پانی دے

دلِ بیتاب تماشا کی تسلی معلوم
اپنے ہر جلوے کو اِک پیکرِ انسانی دے

آؤ شیرازۂ ہستی کو پریشاں کر دیں
یوں، کہ اُس زلف کو پیغامِ پریشانی دے

اس توقع پہ ہوں خاموش کہ وہ شوخ نگاہ
پھر ٹہوکا پئے تقریبِ غزلخوانی دے

روحِ اسلام اخوت ہے، وہی ہم میں نہیں
کفر بھی ورنہ اثرؔ جلوۂ ایمانی دے

ثباتِ عشق

(ایک قصہ)

از حضرت پر پاک (جے پور)

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق　　ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

نشاط منزل صوبہ مالوہ میں دریا کے کنارے ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ تاریخ کے صفحات اِس کی تعمیر کا صاف صاف پتہ نہیں بتاتے۔ البتہ قرب وجوار کے باشندے اِس کی تعمیر کے متعلق دلدوز روایات سُناتے ہیں۔ اور دیہاتی نظموں سے اپنے بیان کی تائید کرتے ہیں جو اُن تک سینہ بہ سینہ پہونچی ہیں اور جن کو وہ دلآویز لہجہ میں یکتارہ پر گا گا کر نہایت جوشش وخروش کے ساتھ خود آبدیدہ ہوتے ہیں اور سُننے والوں کو رُلاتے ہیں۔

جذباتِ لطیف میں پروردگارِ عالم نے عجیب کیفیت پیدا کی ہے۔ بنی نوع انسان کا ہر طبقہ اِن سے حسبِ استعداد لُطف اندوز ہو کر دنیاوی آلودگی اور کثافت سے پناہ گزیں ہوتا ہے۔

تعمیر کنندہ کی سیرچشمی، خوش مذاقی اور وسیع النظری، منظر کی خوبی، عمارت کے نظام، باغ کی وسعت اور ترتیب سے نمایاں ہے۔ باوجودیکہ فی الجملہ باغ کی ترتیب اِن دنوں محض ایک تفریح گاہ کی سی ہے۔ لیکن اسکے سیر کرنیوالوں پر کم از کم تھوڑی دیر کے لئے ایک خاص قسم کی سنجیدگی جو غم زدگی کے قریب تک پہونچتی ہے طاری ہوجاتی ہے۔

اگرچہ یہ باغ قبرستان کے ملحق نہیں معلوم ہوتا ہے۔ لیکن روایات مروجہ نے اس عمارت اور فضا کے اردگرد ایک ماحولِ غم پیدا کر دیا ہے جس سے ہر شخص جسکو وہاں جانے کا اتفاق ہوتا ہے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا معلوم ہوتا ہے کہ کسی منچلے تاجدار نے اپنے عشق ومحبت کی غم زدہ پیکر کو اینٹ پتھر اور چونے کا لباس پہنا کر کم سے کم اپنے خیال میں لافانی بنادیا ہے۔

افسوس حضرتِ انسان اپنی کوتاہ نظری کے ہاتھوں ہمیشہ بقاء دوام کے لاحاصل تجسس میں مبہوت رہے ہیں، اپنی اور اِس دُنیائے گذشتنی کی اصلیت کو فراموش کر کے کہیں اِس قفسِ عنصری کو دواؤں اور مسالوں کی امداد سے ہمیشہ کے لئے محفوظ و برقرار رکھنے کا خیال کیا گیا ہے۔ کہیں عمارت اور کتبہ جات سے بقاء نام کی کوشش ہوئی ہے، اور کہیں اولاد، جائداد، تصانیف وغیرہ سے حیاتِ جاوید کی غیر ممکن الحصول خواہش کو وابستہ کیا ہے۔ درحقیقت یہ بے سُود تدبیریں دُنیا اور موجوداتِ دُنیا کی بے ثباتی اور فانی الاصل ماہیت کو ثابت کرتی ہیں ؎

حرص و ہوس سرائے فانی نہ گئی　　تا زیست اُمید کامرانی نہ گئی
ہے لوحِ مزار پر مرا نقش یہ واں　　مر کر بھی اُمید زندگانی نہ گئی

(۲)

ملکۂ شب کو مملکتِ فضا کا جائزہ لئے ہوئے کئی گھنٹے گذر چکے ہیں۔ اس کے نورانی اہلکار و کارکنان بساطِ فلک پر حسب مراتب متمکن و مصروف کار ہیں۔ تاریکی و ظلمت نقرئی شعاعوں کی چیرہ دستی سے تنگ آکر کونوں کھدروں میں جا چھپی ہے۔ دُنیا ایک کرۂ نور معلوم ہوتی ہے۔ دُنیا والے، سارے دن کی کشمکش، چپقلش و محنت کے بعد میٹھی نیند سو رہے ہیں۔ ملکۂ شب کی چند گھنٹوں کی پُرسکون حکمرانی نے کایا پلٹ کر دی ہے۔ ہر جانب سکون و خاموشی طاری ہے اور معلوم نہیں ہوتا کہ یہ وہی دُنیا ہے جہاں تھوڑی دیر قبل اسقدر کشمکش، قیل و قال، شور و غل اور جنگ و جدال جاری تھا کہ جس سے آسمان والے پناہ مانگتے تھے۔

اس سکون نے فضا کی نورانی خلعت میں خاص کیفیت و دلآویزی پیدا کر دی ہے۔ جس سے اہل دل پر محویت طاری ہو جاتی ہے۔ فرشِ دریا کو نورانی چاندنی نے فرشِ زر بنا دیا ہے۔ جس میں ہلکی ہلکی ہوا کے جھونکوں کے باعث بیشمار جگمگاتی ہوئی شکنیں پڑتی اور خود بخود فنا ہو جاتی ہیں۔

آس پاس کی پہاڑیاں سایہ کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے نہایت سنجیدگی سے ایستادہ اور محو نظارہ ہیں۔ چاندنی نے باغ میں ایک متحرک دھوپ چھاؤں کا فرش بچھا رکھا ہے۔ ہلکے ہلکے روح پرور ہوا کے جھونکے نونہالانِ چمن میں وجد کی کیفیت پیدا کئے ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی پپیہے کی جگر خراش، پی کہاں۔ پی کہاں۔ عالمگیر سکوت میں رخنہ اندازی کرتی ہے۔ اور چوٹ کھائے ہوئے دل کو بے قابو بنا دیتی ہے۔

(۳)

ہندوستانی تاجداروں کی خود غرضی۔ عیش پرستی۔ تن آسانی اور ہندوستانی علماء اور پنڈتوں کی تنگ خیالی کوتاہ نظری اور رسوم نوازی نے ہندوستان میں ہندوستانی خصوصاً اسلامی تمدن کو خاک میں ملا دیا۔ مسلمانوں میں ملک داری کی قابلیت باقی نہ رہی۔ انگریز جو بلحاظ تمدن زیادہ ترحقیقت بین، حقیقت پرور اور حقیقت پرست تھے، تخت و تاج کے مالک ہوئے۔ اور سارا ملک ان کا زیرنگین ہو گیا۔

تاجدار مالوہ نے بھی سرکار برطانیہ کی باجگذاری میں عافیت ڈھونڈھی اور انگریزوں کی خدمت کو امن و فلاحِ دنیوی کا ذریعہ قرار دیا۔ "نشاط منزل" کو اس حکمت عملی اور اپنے بے نظیر منظر کی بدولت وہ دن نہ دیکھنا پڑا جن سے اس قسم کی مرصع عمارتوں کو زمانے کے ہاتھوں عموماً دوچار ہونا پڑتا ہے۔ وہ مہمان خانہ اور تفریح گاہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ جس میں انگریز افسران عموماً آرام و تفریح و شکار کی غرض سے تعطیل کے دن گذارتے تھے۔

جس وقت کا تذکرہ ہے اُس وقت ایک نوعمر انگریز پولٹیکل افسر چارلس آس برن بہ حیثیت مہمان مقیم ہیں
یہ صاحب سرکار انگلشیہ کے سیاسی محکمہ میں ایک مقتدر عہدہ پر مامور ہیں۔

صورت و شکل، چھب و انداز، نشست و برخاست شستہ طور و طریقہ زبانِ حال سے اُن کی اعلیٰ تعلیم و تربیت
تہذیب اور شرافتِ خاندانی کا پتہ دیتی ہے۔ فطرت نے اُنکی طبیعت کو تنہائی پسند بنایا ہے۔

حسین چہرہ کی حُزن آمیز سادگی اور متانت ان کے جسم کی دلآویز رعنائیت ہر ملنے والے کی طبیعت میں
ایک خاص کشش اور دلچسپی پیدا کر دیتی ہے۔

جن اصولوں کی تحت میں قدرت نے اپنی نعمتوں کو بنی نوع انسان پر تقسیم کیا ہے، اب تک نامعلوم ہیں۔
سطحی نظر والے ضرور کہیں گے کہ اِن صاحب کے ساتھ قانونِ قدرت نے جنبہ داری برت کر بہت بڑا حصہ اُن خصائل
کا عطا کر دیا ہے۔ جو اِس دُنیائے فانی میں عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

صاحب بہادر کی سی طبیعت کے آدمی کے لئے اُس رات کا دلکش منظر جو کیفیت پیدا کر رہا تھا اُسکی تفصیل
کا تذکرہ قلم کے امکان سے باہر ہے۔ یہ ایسے محو ہو گئے کہ عرصہ تک باغ میں دریا کے کنارے سیر کرتے اور محظوظ
ہوتے رہے۔ بالآخر رات زیادہ گذرنے پر اپنے کمرہ میں گئے اور بستر پر لیٹ کر باغ کو دیکھتے دیکھتے سُو گئے۔

(۴)

کچھ ہی دیر سوئے ہوں گے کہ کسی نے اِن کا شانہ ہلایا۔ آنکھ کھولتے ہی ایسا منظر پیش نظر ہوا، جس نے انھیں
متحیر کر دیا۔ دیکھا کہ ان کی جگانے والی ایک نازنین اور بیحد خوبصورت لڑکی تھی۔ جو حُسن و چھب کے لحاظ سے
حورِ جنت معلوم ہوتی تھی۔ اِس حور کا لباس و زیور شاہانہ ہندوستانی قسم کا تھا۔ زیورات میں سب سے زیادہ نمایاں
ایک مرصع کڑا تھا۔ جو یہ نازنین بائیں ہاتھ میں پہنے ہوئے تھی۔ روشنی کے باعث بازگشت شعاعیں اس کڑے
کے جواہرات سے نکل کر نظر کو خیرہ اور سارے کمرہ کو منور کئے ہوئے تھیں۔

لیکن داہنی کلائی اس کے جوڑ کے کڑے سے خالی تھی۔

صاحب بہادر کو ساری عمر ایسے مکمل حُسن کے دیکھنے کا موقع نہ ملا تھا۔ اُن کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ عالمِ خواب
میں ہیں یا عالمِ بیداری میں۔ آنکھیں ملکر اُٹھ بیٹھے۔ لیکن حیرت کی تصویر مجسم بن گئے۔ خیالات کو مجتمع کرنیکی کوشش
کرتے تھے۔ لیکن بلا نتیجہ۔ کچھ کہنا چاہتے تھے۔ لیکن زبان اپنا فرض ادا کرنے سے انکار کرتی تھی۔ یہ کیفیت زیادہ
دیر تک قائم نہ رہنے پائی وہ نازنین پلنگ کے پاس سے ہٹ کر دروازہ کی جانب بڑھی۔ اور فرانسیسی زبان
میں نہایت شیرین اور دلدوز آواز میں اِن سے کہا۔ "آیئے مرے ساتھ آیئے"۔

یہ فوراً پلنگ پر سے اُٹھے اور بلا جواب دیئے مدہوشی کی حالت میں مشین کی طرح نازنین کے پیچھے ہوئے

Charles Asborne. ـــه

مکان اور باغ سے نکل کر دریا کی گھاٹی کے نشیب میں دونوں اُتر گئے اور پانی کے کنارے کنارے کچھ دُور تک ناہموار راستہ پر چلنے کے بعد وہ نازنین ایک غار کے دہانے پر پہونچی اور فوراً اُس میں اُتر گئی۔ اپنے ساتھی کو بھی اُس نے بلا لیا۔ یہ بھی بلا سوچے اس زمین کے جوف میں اُتر گئے۔ اندر بالکل اندھیرا تھا۔ آس پاس کی چاندنی اور ایک نورانی شعاع نے جو اُوپر کی پہاڑی شق ہو جانے کی وجہ سے غار کے اندر آ گئی تھی، اتنی روشنی پیدا کر دی تھی کہ جس کی مدد سے بدقت تمام اُس جگہ پہونچ سکے۔ جہاں وہ نازنین ٹھہر گئی تھی۔ یہ وہ مقام تھا جہاں چاند کی شعاع براہ راست پڑتی تھی بصارت کی تاریکی سے مناسبت ہو جانے کی وجہ سے اب وہ غار اتنا تاریک معلوم نہیں ہوتا تھا جتنا کہ داخلہ کے وقت غور کرنے پر اُن کو معلوم ہوا تھا۔ اُس موقع پر ان کو ایک دیوار سی بنی ہوئی دکھائی دی۔ جس کو مرور ایام نے جابجا منہدم کر دیا ہے۔ نازنین نے فرانسیسی زبان میں ان سے کہا۔ "کاغذ کو نکال لیجئے اور پھاڑ ڈالئے"۔

دیوار کے منہدم حصے کو بغور دیکھنے پر ایک کاغذ جو کسی چیز پر مُڑا ہوا تھا۔ اُس کو اُنھوں نے نکال لیا۔ اور حسب الحکم پھاڑ ڈالا۔ لیکن پھاڑنے کے بعد ٹکڑوں کو وہیں پھینک دیا۔ نازنین غار کے دہانے کی جانب رجوع ہوئی اور حسب اشارہ یہ بھی پیچھے ہو لئے۔ غار سے نکل کر دریا کے کنارے کنارے دونوں باغ میں پہونچے۔ نازنین صاحب کے کمرہ کے دروازہ تک ان کے ساتھ آئی اور ہدایت کی "اندر جایئے" یہ اندر چلے گئے۔ اُس نے نہایت حزن انگیں و جگرخراش شیرین آواز میں ان سے کہا۔ "الوداعی سلام"۔

اور اُس کے بعد باغ میں ہو کر دریا کی گھاٹی میں اُتر گئی۔

اب تک صاحب بہادر کٹ پتلی کی طرح نازنین کے حکم کی تعمیل کر رہے تھے۔ اُن کی عقل مختل تھی۔ اور حواس پر قابو نہ تھا۔ نازنین کے رخصت ہو جانے کے ایک لمحہ بعد خیالات کچھ مجتمع ہوئے اور پکارنے کی کوشش کی۔ لیکن متحرک پتوں کی دلآویز سرسراہٹ کے سوائے کوئی جواب نہ ملا۔ فوراً کمرہ سے باہر نکلے اور نازنین کی تلاش میں باغ اور اُس کے بعد دریا کی گھاٹی میں سرگرانی کی۔ لیکن بجز سنسان، دلآویز منظر چاند کی کرنوں کا فرش دریا سے اٹکھیلیوں کا سماں اور پتھروں کے انواع و اقسام کی شکلوں کے سایہ کے کچھ نظر نہ آیا۔ کئی گھنٹے کی بے نتیجہ تلاش کے بعد اپنے کمرہ میں واپس آئے۔ اُن کی پریشانی اور سراسیمگی نے نیند کو پاس نہ پھٹکنے دیا۔ باقی رات نہایت بے چینی کے ساتھ بسر ہوئی اور صبح ہوتے ہی پھر اُس غار کی تلاش میں مصروف ہوئے۔ لیکن بالکل بیکار۔ نہ اس غار کا پتہ چل سکا نہ راستہ کا جس پر رات کو اُس نازنین کے ہمراہ گئے تھے۔

نازنین کی تھوڑی ہی دیر کے ساتھ نے صاحب بہادر کے دل و دماغ پر ایسا شدید اثر پیدا کر دیا، جو کسی طرح جنون سے کم نہ تھا۔ اس جنون نے محض ان کے دماغ اور حواس ہی کو پریشان نہیں کیا۔ بلکہ ان کے وجود کی گہرائی اور روح تک متاثر ہو گئی تھی۔

اتفاقات زمانہ میں بھی عجیب ستم ظریفی ہے۔ صاحب بہادر تفریح۔ آرام۔ سیر و شکار۔ درستی صحتِ جسمانی اور دماغی کے خاطر اس مکان میں آئے تھے۔ جنون۔ اختلال دماغ اور روح کی کلپن لے چلے۔

ایک ہفتہ قیام کرنے کے بعد جس میں واقعات کے حل کرنے کی حتی الوسع ناکامیاب کوشش جاری رہی اپنے مستقر کی جانب روانہ ہو گئے۔ فرائض منصبی کی ضروری مصروفیت نے بھی طبیعت کو درست نہ کیا۔ اور ان کو محسوس ہوا کہ وہ کسی کام کی انجام دہی کے قابل نہیں ہیں۔ مجبوراً رخصت لے کر ولایت روانہ ہو گئے۔

(۵)

وطن پہونچنے پر قریب قریب ہر تفریح گاہ میں فراموشی واقعات اور سکونِ قلب کی غرض سے قیام کیا۔ لیکن طبیعت روبہ اصلاح نہ ہوئی۔ بھولنے کی بیحد کوشش کے باوجود نازنین کا جگانا، اُس کے حُسن اور زیوروں کی جگمگاہٹ۔ ساتھ آنے کا حکم۔ اُس کی آواز۔ اُس کے الفاظ۔ اُس کا آگے آگے چلنا وغیرہ وغیرہ۔ غرض جملہ واقعات ان کے دماغ کے اسٹیج پر ہر وقت مسلط رہتے تھے۔ اور اُن کی پریشانی میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ کبھی کبھی یہ بھی خیال آتا تھا" کیا مجھے بقیہ ایام زندگی پاگل خانے میں بسر کرنا پڑیں گے؟"

ایک روز اتفاقاً باڈلین لائبریری یعنی کتب خانہ کے پاس سے گذر ہوا۔ بلا کسی خاص ارادہ کے اندر چلے گئے۔ اور کتابوں کی الماریوں کو دیکھنے لگے۔ اُنکی نظر ایک کتاب پر پڑی۔ جس پر تاریخ مالوہ تحریر تھا۔ اُس کتاب کو نکلوایا اور ایک میز کے قریب بیٹھکر اُس کی ورق گردانی کرنے لگے۔ روپ متی اور باز بہادر کے عشق کی حکایت، عشق و محبت کا انہماک۔ واقعات زمانہ کی بیرحمی۔ روپ متی کا عشق کی سجدہ گاہ پر جان کو قربانی چڑھانے کا تذکرہ نظر سے گذرا۔ ان کی رگِ جنون پر ان تاریخی واقعات نے مضراب کا کام کیا۔ ایک عجیب قسم کی محویت طاری ہوئی۔ جس سے اُنکی روح کی کلپن میں اضافہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک اُٹھکر ٹہلے۔ لیکن ایک غیر معمولی کشش نے اُن کو پھر کتاب کی طرف گھسیٹا اور یہ اُس کے قریب پہونچکر پھر ورق گردانی کرنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اُنکی نظر ایک دوسرے واقعہ کی تفصیل پر پڑی۔ جس کے مطالعہ میں منہمک ہو گئے۔

انگریزوں کے تسلط کے کچھ دنوں قبل ہندوستان میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ دہلی کی مرکزی حکومت کی کمزوری نے ہندوستان میں صدہا چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم کردی تھیں۔ جو آئے دن ایک دوسرے سے دست و گریبان رہتی تھیں۔ اس زمانہ میں یورپ کے قسمت آزماؤں نے ہندوستان کو اپنا راستہ بنا لیا تھا۔ قریب قریب ہر بڑی ریاست میں ان کا درخور تھا۔ اور یوروپین طریقہ پر ہندوستان کی فوجوں کی ترتیب انکا کام تھا۔ مالوہ کی سلطنت میں بھی ایک فرانسیسی افسر سپہ سالاری کے عہدہ پر مامور ہوا۔ تھوڑے دنوں کام کرنے کے بعد اُس نے وطن سے اپنے متعلقین کو بلا لیا۔ جنمیں ایک نوجوان لڑکی، ایک نوعمر پرائیویٹ سکرٹری اور دیگر افراد تھے۔ یہ لڑکی

غیض وغضب جو طریقہ ایجاد کرتا تھا اُس کے مطابق مجرموں کو سزا دی جاتی تھی۔

بادشاہ نے اپنا وحشیانہ فیصلہ سنایا کہ ملکہ دیوار میں زندہ چُن دی جائیں۔ چنانچہ وہ قیدخانہ سے نکالی گئیں اور اپنے باغ کے قریب دیوار میں چُن دی گئیں۔

سپہ سالار صاحب یعنی ملکہ کے والد بدنامی۔ ذلت ورنج کے باعث مستعفی ہوکر اپنے متعلقین کے ساتھ وطن چلے گئے۔ اس جانکاہ واقعہ کی یادگار ملکہ کے ہاتھ کا ایک مرصع طلائی کڑا اب تک اُس کے خاندان میں موجود ہے جس وقت گرفتاری کا غیر متوقع حکم جاری ہوا۔ ملکہ بیچاری کو یکبارگی تیار ہونا پڑا تھا۔ عجلت وگھبراہٹ میں ایک ہاتھ میں کڑا پہننا بھول گئی۔ چنانچہ یہی والدین کے یہاں رہ گیا۔

کڑہ کا نام دیکھتے ہی اُن کو یاد آگیا کہ وہ نازنین جس نے ان حضرت کو جگایا اور غار میں ساتھ لے گئی تھی۔ صرف ایک ہی مرصع کڑا بائیں کلائی پر پہنے ہوئے تھی۔ داہنی کلائی اُس کے جوڑ کے کڑہ سے خالی تھی۔

مندرجہ بالا مضمون کو پڑھکر صاحب بہادر کے خیالات میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہوا۔ اور معمہ سلجھانے کی اُمید از سر نو تازہ ہوگئی۔ اُن کو کڑہ دیکھنے اور اس کاغذ کو پڑھنے کا شوق دامنگیر ہوا۔ جس کو اُنھوں نے پھاڑ کر غار میں پھینک دیا تھا۔ ایک یوروپین جس نے علمی دُنیا میں پرورش پائی ہو اس خیال کے پیدا ہونیکے بعد کیسے نچلا بیٹھ سکتا ہے چنانچہ اُنھوں نے فوراً سفر کا عزم کردیا۔ اور انگلستان سے روانہ ہوکر فرانس پہونچے۔

سپہ سالار یعنی سابق جنرل صاحب مالوہ کے مکان پر گئے اور پورے حالات دریافت کئے جو مضمون اُنھوں نے تاریخ مالوہ میں پڑھا تھا۔ اُس کی لفظ بہ لفظ تصدیق ہوگئی۔ اُس کڑہ کا بھی معاینہ کیا۔ جو اس خاندان میں بطور یادگار غم محفوظ ہے۔ دیکھتے ہی فوراً اُن کو دوسرا کڑہ جو اُنھوں نے نازنین کی کلائی پر دیکھا تھا، یاد آگیا۔

دونوں کڑوں میں اتنی مشابہت تھی کہ ایک، دوسرے کا یقیناً جوڑ تھا۔

فرانس سے صاحب بہادر ہندوستان آئے اور پھر مالوہ کی اُسی کوٹھی میں مقیم ہوئے جہاں سے درد سر اور ہیجان روح مول لیا تھا۔

اس معمے کے انکشاف کی اُمید اور امتداد زمانہ اُنکی دماغی حالت کو ایک حد تک روبہ اصلاح کرنے میں کامیاب ہوچکا تھا اب انکی حالت کسی قدر درست تھی اور حواس قابو میں تھے۔ غار کی تجسس اور تلاش ترتیب کے ساتھ کی گئی۔ بالآخر اُس کا پتہ لگ گیا۔

اُس جگہ پر پہونچ کر جہاں پر کاغذ پھاڑ کے پھینکا تھا ٹکڑوں کی تلاش ہوئی اور اُن کو جمع کرلیا گیا۔ کوٹھی میں واپس آکر ایک دوسرے کاغذ پر چپکا کر پڑھنے کی کوشش کی گئی۔ صاف طریقہ پر معلوم ہوگیا۔ کہ وہ فرانسیسی زبان میں ایک دل گرفتہ عاشق کا اپنے معشوق کے نام پیمان وفا ہے۔

راز دنیاز اور بے پایاں محبت کے اظہار کے بعد تحریر تھا کہ اگر کبھی واقعات زمانہ ایسا پلٹا کھائیں کہ محبت کی شوراشوری میں کمی ہوجائے یا قطع محبت کی غیر ممکن اور غیر متوقع صورت رونما ہو تو یہ محبت نامہ محبوب کاتب کو واپس کردے۔ تاکہ وہ اُسے پھاڑ ڈالے۔

اِس مضمون سے واقفیت کے بعد صاحب بہادر نے اپنے خیال میں سارے معمہ کو حل کرلیا۔

اِن کی رائے میں غار وہی جگہ تھی جہاں وہ نازنین جیتے جی دیوار میں چن دی گئی تھی۔ جس ہڈی پر یہ خط رکھا ہوا تھا وہ درحقیقت نازنین کے سینہ کی ہڈی تھی جہاں وہ خط چھپایا گیا تھا۔ صاحب بہادر کی رُوح اس سکرٹری کی رُوح ہے۔ جس نے وہ خط تحریر کیا تھا۔ اور جس سے نازنین کو عشق حقیقی تھا۔ اس روح نے تناسخ کے مدارج طے کرکے اب صاحب بہادر کے جسم کا چولا اختیار کیا ہے۔ نازنین کی رُوح عشق و محبت سے اتنی معمور و مجبور تھی کہ دوسرا لباس اختیار نہ کرسکی اور اپنے وعدہ اور عاشق کے حکم کی تعمیل میں صدیاں بیچینی میں گذاردیں۔ بالآخر عاشق کے ہاتھوں پیمانِ محبت کا ایفا ہوگیا۔ اُس کے بعد اُس نے اپنے عاشق کی تکالیف و بیقراری نہ برداشت کرکے معمہ کے حل کرنے میں مدد دی۔ یعنی محض اُس نازنین کی روح کی توجہ سے یہ لائبریری پہونچے تاریخ مانڈو اور اُس کے اُس جز کا معائنہ کیا جس نے جملہ حالات کے انکشاف میں مدد دی ؎

وعدہ کو وفا کرتے ہیں یوں عشق کے مجنوں پیمانِ وفا مر کے بھی رسوا نہیں کرتے

تیس ۳۰ سال پہلے

زمانہ اپریل ۱۹۰۹ء میں "رسکن اور فلسفہ زندگی" کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ جس میں رسکن کے بعض مقولے درج ہیں جو آج بھی ہمارے غور کے مستحق ہیں۔ یہاں پر ہم اتفاق کے بارے میں رسکن کے خیالات درج کرتے ہیں:-

"اگر ہم کوئی مذہبی عقیدہ رکھتے ہوں اور اُن امور کا خصوصاً لحاظ رکھیں جو ہمارے اور دوسرے مذہب والوں کے درمیان تفرقہ کا باعث ہیں تو فوراً سمجھ لیجئے کہ ہم غلط راستے پر اور شیطان کے قبضہ میں ہیں، ہم کو زندگی کے ہر لمحہ میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہئیے کہ ہم دوسروں سے کن کن باتوں میں اتفاق رکھتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ ہم اِس فکر میں محو رہیں، کہ کن کن امور میں ہمارا اُن کا تفرقہ ہے اور جس وقت یہ معلوم ہوجائے کہ ہم کسی ایسے امر میں جو عملی زندگی سے متعلق ہے، اتفاق رکھتے ہیں تو فوراً ہی ہم کو وہ کام مِلکر شروع کردینا چاہئیے۔

سکوت

(از حضرت سیّد الحسن مسیح نقوی الجازی)

چاندنی رات ہے فضا خاموش ساری دنیا ہے نیند سے بیہوش
سارے دن کے تپے ہوئے ذرّے نیند سے ہو گئے ہیں ہم آغوش
ہیں کناروں پہ نہر کے جو شجر شب کی ٹھنڈی ہوا سے ہیں مدہوش
پتّے ساکن ہیں، ٹہنیاں بے حس ہو گیا کم ہوا کا جوش و خروش
پھول ہیں گردنیں جھکائے ہوئے زمزمے بلبلوں کے ہیں خاموش
نرگس و نسترن روش بہ روش چاند کو تک رہے ہیں سب خاموش
جھیل ہے سادگی کا آئینہ موجیں ہیں ساحلوں سے ہم آغوش
چاند طے کر چکا ہے راہِ فلک ہیں ستارے بھی ماند دوش بہ دوش
ٹمٹماتی ہیں شمعیں محفل کی گم ہیں انگڑائیوں میں بادہ فروش

جذباتِ مسیح

حسن جب کامگار ہوتا ہے عشق خود بیقرار ہوتا ہے
دل کہ جس میں نہ ہو کسی کی طلب ایک اُجڑا دیار ہوتا ہے
زندگانی کے دوشِ نازک پر آرزوؤں کا بار ہوتا ہے
مرنے والے کے حال کی تصویر اِک چراغِ مزار ہوتا ہے
آدمی منزلِ محبت میں لاشۂ بے مزار ہوتا ہے
کیا بتاؤں کہ کس قیامت کا عالمِ انتظار ہوتا ہے
دیکھتا ہوں مآلِ مے نوشی صبحدم جب خمار ہوتا ہے
حسن میں سادگی کا عالم بھی اِک ہجومِ بہار ہوتا ہے
جس کا کوئی نہ ہو جہاں میں مسیح اُس کا پروردگار ہوتا ہے

تنقید کُتب

ارمغان حجاز

یہ علامہ اقبال کے فارسی و اُردو کلام کا آخری مجموعہ ہے، جو آب وتاب کیساتھ اُن کی وفات کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ یہ مجموعۂ کلام شروع سے آخر تک پیغام عمل اور درسِ آزادی سے معمور ہے۔ کلام کا فارسی حصّہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے اور اسمیں جو کہا ہے وہ دُو دُو شعروں کے قطعات میں کہا ہے۔ پہلے حصّہ کا عنوان "حضورِ حق" ہے۔ جسے مناجات سمجھنا چاہیئے۔ اس میں اقبال نے اپنے اس پُرانے نظریہ کی تجدید کی ہے کہ ؏

مانگنے والوں کو دُنیا بھی نئی دیتے ہیں

البتہ محنت اور خلوص شرط ہے۔ اِسی خلوص کی تلقین جدید الفاظ میں اِس طرح کی ہے ؎

دلے در سینہ دارم بے سرورے ... نہ سوزے در کفِ خاکم نہ نورے

بگیر از من کہ بر من بار دوش است ... ثوابِ ایں نمازے بے حضورے

اقبال سیاسی غلامی کو ایک نظر نہیں دیکھ سکتے۔ اور اِسلامی شاعر کی حیثیت سے مُسلمانوں کو اِسلامی رنگ میں اِس طرح غیرت دلاتے ہیں ؎

مسلمانے کہ در بندِ فرنگ است ... دِلش در دست او آسان نیاید

ز سیمائے کہ سودم بر درِ غیر ... سجودِ بوذرؓ و سلمانؓ نیاید

مگر اقبال کی ہمدردی و دِلسوزی صرف مسلمانوں تک محدود نہیں ہے۔ وہ اپنے وطن ہندوستان کی زبوں حالی کو دیکھ کر بھی بے چین ہوتے ہیں اور اپنے اسلامی رنگ میں یوں آہیں بھرتے ہیں ؎

دگرگوں کشورِ ہندوستان است ... دگرگوں آں زمین و آسمان است

مجو از ما نمازِ پنجگانہ ... غلاماں را صف آرائی گراں است

دوسرے حصّہ میں بھی جسمیں رسولؐ سے فریاد کی گئی ہے۔ ہندوستان کی حالت پر یوں خون کے آنسو بہائے ہیں ؎

شبِ ہندی غلاماں را سحر نیست ... دریں خاک آفتابے راگذر نیست

بما کن گوشۂ چشمے کہ در شرق ... مسلمانے ز ما بیچارہ تر نیست

؎ حجم صفحات قیمت عہ ملنے کا پتہ :۔ شیخ مبارک علی تاجر کتب لوہاری دروازہ لاہور

مسلمانانِ ہند کی مفلسی و ناداری، جہالت و بے علمی کی تصویر یوں کھینچی ہے ؎

نماند آب و تب در خون نابش نروید لالہ از کشتِ خرابش
نیام او تہی چوں کیسۂ او بطاقِ خانۂ ویراں کتابش

اور اس زبوں حالی کی وجہ اقبال کے نزدیک قوم کی نا اتفاقی، خود پسندی اور خود غرضی ہے۔ تعصب اور ناروا داری کی یہ حالت ہے کہ اگر کوئی ان کی مسجد کی طرف انگلی بھی اٹھاتا ہے تو لڑ مرتے ہیں مگر خود اس مسجد میں کبھی چراغ جلانے بھی نہیں جاتے۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں۔

مسلماناں بخویشاں در ستیزند بجز نقش دوی بر دل نہ ریزند
بنالند ار کسے خشتے بگیرد ازاں مسجد کہ خود از وے گریزند

مقتدایانِ دین کی تصویر بھی ذیل کے آئینہ میں ملاحظہ فرمائیے ؎

دلِ مُلا گرفتارِ غمے نیست نگاہے ہست در چشمش نمے نیست
ازاں بگریختم از مکتبِ او کہ در ریگِ حجازش زمزمے نیست

اقبال مسلمانوں کو صوفی و مُلا کی غلامی سے چھڑا کر قرآن کے احکام پر عمل کرنے کی صلاح دیتے ہیں۔ مسلمانوں سے وہ کہتے ہیں ؎

بہ بندِ صوفی و مُلا اسیری حیات از حکمتِ قرآں نہ گیری

چوتھے حصہ میں "عالم انسانی" کو خطاب کرتے ہوئے اقبال یہ درسِ عمل دیتے ہیں ؎

گلہ از سختیِ ایام بگذار کہ سختی ناکشیدہ کم عیار است
نمے دانی کہ آبِ جویباراں اگر بر سنگ غلطد خوشگوار است

یہی فلسفہ اصغر مرحوم نے اس پیرایہ میں بیان کیا ہے ؎

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

جو لوگ اپنی مدد آپ کرتے ہیں، اُن کی مدد خدا بھی کرتا ہے۔ اقبال نے اسی فلسفہ کو ایک نئے پیرایہ میں بیان کیا ہے ؎

چہ خوش گفت اُشترے با کرّہ خویش خنک آں کس کہ داند کار خود را
بگیر از ما کہن صحرا نورداں بہ پشتِ خویش بردن بارِ خود را

(۲)

اِس مجموعے کے ستّر صفحوں پر اقبال کا اُردو کلام ہے۔ دراصل اقبال کے فارسی اُردو کلام میں کم

زیادہ فرق نہیں۔ اصل چیز اُن کا پیغام ہے۔ جس کے سمجھنے کے بعد اُن کا کلام سمجھنے میں کوئی دقت نہیں رہ جاتی۔ لیکن اُس کے سمجھے بغیر اُن کا کلام مشکل اور دقیق معلوم ہوتا ہے۔ اقبالؔ شرعِ اسلام کو ع

حافظ ناموس زن، مرد آزما، مرد آفریں

سمجھتے ہیں۔ آئینِ اسلام کے بتائے ہوئے آئین کو ہر قسم کی غلامی کے لئے موت کا پیغام سمجھتے ہیں۔ مگر آجکل کے مسلمانوں کو اقبالؔ "محروم یقین" قرار دیکر کہتے ہیں کہ یہ کتاب اللہ کی تاویلات اور فضول مباحثوں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ وہ بار بار اِس بات پر زور دیتے ہیں ؎

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر   ہر فرد ہے ملّت کے مقدر کا ستارا

ایک دوزخی کی مناجات میں خود غرض لوگوں کی حالت یوں بیان کی ہے کہ ؎

رنجیدہ بُتوں سے ہوں تو کرتے ہیں خُدا یاد

اِس لئے اُن کی ؎   پُوجا بھی ہے بے سُود، نمازیں بھی ہیں بے سُود

آخر میں دوزخی، دوزخ کے لئے یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اور چاہے جو کچھ ہو۔ مگر ؎

اللہ! ترا شکر کہ یہ خطۂ پُرسوز   سوداگرِ یورپ کی غلامی سے ہے آزاد

آزاد اور محکوم کا فرق اقبالؔ نے یہ بیان کیا ہے ؎

آزاد کی رگ سخت ہے مانندِ رگِ سنگ   محکوم کی رگ نرم ہے مانندِ رگِ تاک

محکوم کا دل مُردہ و افسردہ و نومید   آزاد کا دل زندہ و پُرسوز و طرب ناک

آزاد کی دولت دلِ روشن، نفسِ گرم   محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک

محکوم ہے بیگانۂ اخلاص و مروت   ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک

مغرب و مشرق کا فرق کیا خوب بیان کیا ہے ؎

ضمیرِ مغرب ہے تاجرانہ، ضمیرِ مشرق ہے راہبانہ

وہاں دگرگوں ہے لحظہ لحظہ، یہاں بدلتا نہیں زمانہ

انسانی دل کے لئے اکثر شاعروں نے کہا ہے کہ ع

جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نکلا

مگر اقبالؔ کہتے ہیں ؎

سمجھا لہو کی بوند اگر تو اُسے تو خیر   دِل آدمی کا ہے فقط اک جذبۂ بلند

راس مسعود کے نوحہ میں جن بلند جذبات کا اظہار کیا ہے وہ بھی مجھنے کی چیز ہے۔ لیکن شائقین کو اُسے شروع سے آخر تک خود ہی پڑھنا چاہیئے۔ بہرحال "ارمغان حجاز" اقبال کی فلسفانہ شاعری کی آخری یادگار کی حیثیت سے عام قدر دانی کی مستحق ہے۔

تاریخ و تنقید ادبیات اُردو[1]

ادب اُردو کی تاریخ پر کئی ضخیم کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن وہ اسقدر طویل ہیں کہ اس زمانۂ عمل و حرکت میں اُن کے مطالعہ کی فرصت بہت ہی کم خوش نصیبوں کو حاصل ہو سکتی ہے۔ اس لئے اس موضوع پر ایک ایسی کتاب کی سخت ضرورت تھی جو جامع و مختصر ہونے کے علاوہ مستند بھی ہو۔ خوشی کی بات ہے کہ مولانا حامد حسن صاحب قادری پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ نے دماغ سوزی کر کے اس بڑی کمی کو پورا کر دیا۔ فاضل مصنف نے اس کتاب کے محققانہ مقدمہ میں اس قضیہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ جو حامیان اُردو و ہندی دونوں کے مطالعہ کے قابل ہے۔ لائق مصنف نے اسمیں مختصراً وہ تمام تاریخی حالات درج کر دئے ہیں، جن کی بدولت اُردو زبان وجود میں آئی۔ اسی سلسلہ میں اُنھوں نے نہایت خوبی سے اس نظریہ کی تردید کی ہے کہ اُردو تصانیف کا آغاز دکن میں ہوا اور تاریخی حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ اُردو نظم کی ابتدا دہلی اور نثر کی پہلی کتاب سید اشرف جہانگیر کا رسالہ "تصوف" کچھوچھہ ضلع فیض آباد میں تصنیف ہوئی۔ البتہ اُردو کی جو کتاب سب سے پہلے شائع ہوئی، وہ خواجہ گیسو دراز گلبرگہ دکن کی کتاب "معراج العاشقین" تھی۔ اس کتاب میں ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اسمیں قدیم و جدید سب مشہور اُردو شاعروں کا مختصر تذکرہ لکھ کر اُن کے کلام کا مختصر نمونہ بھی درج کر دیا گیا ہے۔ جس سے زبان اُردو کی تدریجی ترقی پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اُردو و ہندی کی بحث میں قادری صاحب کی اکثر رائیوں میں اختلاف کی گنجائش ہے۔ کیونکہ یہ بحث اُنھوں نے اُردو کے وکیل کی حیثیت سے کی ہے۔

اس کتاب میں "ہمارے شاعرہ" کے عنوان سے مولانا عابد حسین صاحب پروفیسر سینٹ جان کالج آگرہ کا مضمون شامل کیا گیا ہے جسمیں تعلیم و تعلم اور فن شاعری کو بہ حیثیت فن سیکھنے کی طرف تمام رجحان کم ہونے کی شکایت کی گئی ہے اور چند نمونے بھی پیش کئے گئے ہیں اور حضرت مدہوش، فراق، سحر ہنگامی، جگر بریلوی کے کلام کی خاص طور پر نکتہ چینی کی گئی ہے۔ ہم کو اس کے متعلق صرف یہی کہنا ہے کہ سہو اور خطا بڑے بڑے اُستادوں سے ہوتی رہتی ہے۔ مقالہ نگار کو خامیوں کے ساتھ ان حضرات کے کلام کی خوبیاں بھی بیان کر دینا تھیں۔ فراق، جگر، اور مدہوش اُردو زبان کی جو خدمت کر رہے ہیں، اُس کو قادری صاحب تسلیم نہ کریں۔ لیکن آیندہ نسلیں اُن کی شاعرانہ کاوشوں کی داد دیں گی۔

---

[1] حجم ۲۷۶ صفحات۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ (عہ) ملنے کا پتہ:۔ لکشمی نراین اگروال پبلشر آگرہ۔

ایک مضمون شاعری میں چوری کے متعلق بھی ہے۔ جسمیں توارد اور سرقہ کی خوب تحقیق کی گئی ہے۔ آخر میں اُردو کا ایک مختصر تاریخی نقشہ بھی دیدیا گیا ہے۔ جس پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے اُردو زبان کی تاریخ معلوم ہو جاتی ہے۔ اس کتاب کی لکھائی، چھپائی بھی بہت صاف ہے اور ہر حیثیت سے اسکول، لائبریریوں اور دیگر کتب خانوں میں رکھنے کے لائق ہے۔

متفرق کتابیں

حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی نے حال میں چھوٹی چھوٹی کتابوں کے کئی مفید سلسلے شائع کرنا شروع کئے ہیں، مثلاً "مادرِ ہند کے سپوت" کے نام سے چھوٹی سوانحعمریوں کا ایک سلسلہ جاری کیا ہے۔ اُس کی پہلی کتاب مولانا محمد علی کے متعلق اور دوسری کتاب سرسید کے متعلق ہے۔ "محمد علی" میں خواجہ احمد عباس نے مولانا مرحوم کی پیدائش سے لے کر وفات تک کے تمام ضروری حالات پر مختصر روشنی ڈالی ہے۔ اور "سرسید" میں مولانا انصار الحق ہارونی نے اس پیشوائے قوم کے مختصر سوانح حیات لکھے ہیں۔ جو بہت ہی دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ دونوں کتابوں کی لکھائی، چھپائی اور کاغذ سب اچھے ہیں۔ قیمت پانچ پانچ آنے،

دوسرا سلسلہ "کتب تعلیم بالغان" کا ہے چنانچہ اسمیں ایک ڈرامہ "تریاہٹ" کے نام سے شمس العلماء آزاد مرحوم کے پوتے آغا محمد اشرف ماسٹر دون اسکول ڈیرہ دون اور دو "کبڑے کا قاتل" اور "ابوالحسن" نامی آغا احمد حسن ایم اے نے لکھے ہیں۔ آخری دو ڈراموں کا پلاٹ "الف لیلہ" سے لیا گیا ہے اور دونوں تفریحی ڈرامے ہیں۔ لیکن "ترياہٹ" اصلاحی ڈرامہ ہے۔ اور گرام سدھار کے سلسلہ میں بہت بڑی خدمت انجام دیسکتا ہے۔ اس ڈرامہ میں فاضل مصنف نے چیچک کا ٹیکہ لگوانے، تعلیم کے فوائد اور بچوں کو زیور پہنانے کی برائیاں بیان کی ہیں۔ یہ ڈرامہ ہولی کے دنوں میں بخوبی کھیلا جاسکتا ہے۔

اس سلسلے کی ایک اور قابل ذکر کتاب سید ابن حسن صاحب جارچوی کی لکھی ہوئی "دیو مالا" ہے۔ اس کی زبان بہت سلیس اور طرزِ بیان نہایت برجستہ ہے۔ کہیں کہیں مزاح کی چاشنی بھی ہے۔ اس میں دیووں کے ملک کا ایک فرضی قصہ بیان کرکے قومی حکومت کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ اس میں دو جزیروں کی طرزِ حکومت کا مقابلہ کرکے سوراج اور سامراج کا مقابلہ کیا گیا ہے۔

توسیع معلومات کے متعلق بھی اس پبلشنگ ہاؤس نے "نئی ایجادیں" اور "ڈاکٹر صاحب" نامی کتابیں شائع کی ہیں۔ ان سب کی قیمتیں چار چار آنہ، اور ملنے کا پتہ:- حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی ہے۔

مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی ایک عرصہ سے اُردو ادب کی بڑی خدمت کر رہا ہے۔ چنانچہ جگر، جوش اور پریم چند کی کتابیں چھاپنے کے بعد وہ اُردو داں لوگوں کے لئے ملکی، تاریخی اور عام معلومات کی چھوٹی بڑی کتابیں شائع کر رہا ہے۔ اُس نے بالغوں کی تعلیم کے لئے بھی کئی چھوٹی چھوٹی مفید کتابیں تیار کی ہیں اور حال میں اُس نے **مولانا محمد علی کے مضامین** کا ایک دلچسپ مجموعہ نکالا ہے۔ جسمیں مولانا مرحوم کے بہت سے مفید و پُرجوش مضامین، جو اُنھوں نے اخبار ہمدرد میں لکھے تھے، جمع کردے گئے ہیں۔ اُسکا حجم ۵۹۰ صفحات اور قیمت ۴ر

"دُنیا کی کہانی" کے نام سے پروفیسر محمد مجیب صاحب نے دُنیا کی ہزاروں برس کی تاریخ بہت ہی اچھے پیرائے میں لکھی ہے جس سے پڑھنے والا بادشاہوں کی لڑائیوں اور تاریخوں کے گورکھ دھندے میں پڑے بغیر تاریخ کے خاص خاص واقعات اور اُن کے اثرات کا حال معلوم کرسکتا ہے۔ قیمت ۴ر

ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے "شہری آزادی" کے نام سے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی ہے جسمیں اُنھوں نے فرانس۔ امریکہ۔ انگلستان وغیرہ کے رہنے والوں کو جو جو ملکی حق اور اختیارات حاصل ہیں۔ اُن کا پورا حال درج کرکے شہری آزادی کے اصول اور مطلب سمجھائے ہیں۔ قیمت ۴ر

دیہات سدھار کا سب سے بڑا مسئلہ کسانوں کی مالی زیرباری ہے۔ لیکن اس سوال کی تہ تک پہونچنے کے لئے بڑی چھان بین اور غور و فکر کی ضرورت ہے۔ محمد عاقل صاحب اُستاد جامعہ نے ضلع علیگڈھ کے ایک گاؤں کے کسانوں کی مالی حالت کی تحقیقات کرکے اُس کا نتیجہ ایک چھوٹی سی کتاب میں لکھا ہے۔ جسکا نام "**ہندوستان کا دیہی قرض**" ہے۔ اِس میں کسانوں کی قرضداری کا پورا حال درج ہے۔ جن کے معلوم کئے بغیر اُن کی بہتری کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوسکتی ہے۔ قیمت ۴ر

انجمن ترقی اُردو نے جس کا صدر مقام اب مولانا عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن کی ان تھک کوشش دکن سے اُٹھکر ہندوستان کی راجدھانی نئی دِلّی میں آگیا ہے۔ مولانا حالی کی مشہور تصنیف "**حیات جاوید**" سوانح سرسید کی دوبارہ چھپائی کا انتظام کیا ہے۔ یہ کتاب کچھ دِنوں سے ناپید ہوگئی تھی۔ زبان اور مضمون دونوں اعتبار سے یہ اُردو میں اپنا جواب نہیں رکھتی ہے۔ اب پانچ روپیہ میں لوگ اُسے دفتر انجمن ترقی اُردو دہلی سے منگا سکتے ہیں

پچھلے سال انجمن نے ایک "**اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری**" حضور نظام کی مدد اور مولانا عبدالحق صاحب کی برسوں کی لگاتار محنت سے تیار کی تھی۔ اب اُسکا ایک مختصر ایڈیشن "**اسٹوڈنٹ انگلش اُردو ڈکشنری**" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ جس میں پندرہ سو صفحات پر ڈیڑھ لاکھ کے قریب انگریزی لفظوں اور محاوروں کے معنی اور مطلب لکھے گئے ہیں۔ اُس کی قیمت بڑی ڈکشنری سے تہائی یعنی صرف پانچ روپیہ رکھی گئی

انجمن اُردو نے ایک اور قابل قدر کتاب "اصلاحات کیمیا" کے نام سے چھاپی ہے جسمیں کیمسٹری کی انگریزی تہذیبی اصطلاحوں کا سہل الفاظ میں ترجمہ کرکے کتابی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

انجمن نے اُردو کے بہت سے پُرانے شاعروں کے حالات اور اُن کا کلام بھی ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر چھپوایا ہے۔ اسی سلسلے میں مولانا عبدالحق صاحب کے ایک اور دکنی شاعر نصرتی کا کلام ہاتھ لگا ہے۔ جو سلطنت بیجاپور کا درباری شاعر تھا اور جسے لڑائی کے معرکون اور دربار کی سجاوٹوں کو خوبی کیساتھ بیان کرنے میں کمال حاصل تھا۔ ان پُرانے شاعروں کے کلام سے اُردو کی ابتدائی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے اور اُس زمانہ کے رسم ورواج اور رہنے سہنے کے طریقوں کا حال معلوم ہوتا ہے۔

شبلی اکیڈیمی اعظم گڈھ نے مولانا شبلی کے متفرق مضمونوں کو اکٹھا کرکے کتابی صورت میں چھاپا ہے۔ حال میں اس سلسلے کی ساتویں اور آٹھویں جلدیں نکلی ہیں جنمیں مولانا کے فلسفانہ اور متفرق مضامین جمع کردئے گئے ہیں۔ اس سلسلے کی پہلی جلدوں کا زمانہ میں مفصل ریویو ہوچکا ہے۔ یہ دونوں کتابیں صورت، اور لکھائی چھپائی میں بالکل پہلی جلدوں کے مشابہ ہیں۔ مولانا شبلی اور اُردو ادب کے قدردانوں کو اس سلسلہ مضامین کی قدر کرنا چاہیئے۔

"ہندستان کی کہانی" کے نام سے مولوی عبدالسلام صاحب نے بچّوں کے لئے آسان زبان میں ہندوستان کی تاریخ لکھی ہے۔ جسمیں بچّوں کے لئے بہت ہی سہل زبان میں سیکڑوں برس کے حالات بیان کردئے گئے ہیں، اگر ہندوؤں کے زمانہ کا ذکر ذرا اور تفصیل کے ساتھ ہوتا اور سنہ اور تاریخوں کا اتنا ذکر نہ کیا جاتا تو یہ کتاب اور بھی مفید ہوتی۔

فلسفہ کی دو کتابیں خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں "مذہب اور انسانیت" کے نام سے مشہور دیش بھگت لالہ ہردیال ایم۔اے نے ایک کتاب لکھی ہے۔ جسمیں اُنھوں نے انسانیت اور دہرم کی نگاہ سے دُنیا کے دس بڑے بڑے مذہبوں کی خوبیاں درج کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ مختلف مذاہب کی تعلیم میں اصولوں کے لحاظ سے بہت کچھ مطابقت ہے۔ مذہبی تحقیقات کے قدردانوں کے لئے یہ کتاب بہت قابل قدر ہے۔ قیمت ۱۲/ع شایقین لالہ لاجپت رائے بک سیلر لاہور سے طلب کریں۔

پرنسپل لالہ دیوان چند صاحب ایم۔اے نے "جیون رہسیہ" (یا اسرار زندگی) کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جسمیں اُنھوں نے سقراط سے لے کر گوئٹے تک مغربی ملکوں کے پانچ مشہور فلاسفروں کی

تعلیم کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ لالہ جی خود بڑے فلاسفر ہیں۔ اس چھوٹی سی کتاب میں انھوں نے بڑی لیاقت سے مغرب کے بڑے بڑے فلاسفروں کے جیون وچاروں کا لب لباب درج کر دیا ہے اور ہر فلاسفر کے حالاتِ زندگی لکھکر اُن کے ضروری ضروری خیالات اور وچاروں کو لکھدیا ہے۔ جس سے ہر ایک کی تعلیم پوری طرح روشن ہو جاتی ہے۔ لالہ جی اس کتاب کا دوسرا حصہ لکھنے والے ہیں۔ جسمیں اُن کا ارادہ ہندوستانی فلاسفروں کی تعلیم پیش کرنے کا ہے۔ یہ کتاب بہت مفید اور دلچسپ ہے البتہ اس کی زبان ٹھیٹھ ہندوستانی ہے جسمیں معلوم ہوتا ہے قصداً سنسکرت الفاظ اور محاورے زیادہ استعمال کئے گئے ہیں۔ البتہ کہیں کہیں غالب وغیرہ کے دوچار اشعار بھی تبدیلِ ذائقہ کے لئے درج کر دئے گئے ہیں۔ تاہم اُردو داں لوگوں کے لئے اس کی زبان ذرا مشکل سمجھی جائے گی۔ قیمت ۸ر

آجکل ملک میں نئے خیالات کا زور ہے۔ اُردو میں بھی عام رجحان پولٹیکل کتابوں اور انقلابی رسالوں کی طرف ہو رہا ہے۔ چنانچہ غریب ومحتاج طبقے کی دُکھ بھری زندگی کے حالات اور واقعات قصّوں کے پیرائے شائع ہو رہے ہیں۔ اب تک اِس قسم کی کئی کتابیں اور رسالے نکل چکے ہیں۔

چھبیلداس۔ احمد علی۔ سجاد ظہیر۔ انصاری وغیرہ اِس صف کے مضمون میں خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں چھبیلداس نے "انقلابی شرارے" کے نام سے حال میں ایک کتاب تیار کی ہے۔ جسمیں اُنھوں نے بہت سے انقلابی ذہنیت پیدا کرنے والے مقولے اور کہاوتیں اکٹھی کر دی ہیں۔ یہ مقولے اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔ لیکن ہم نہیں جانتے کہ محض ان کے دُہرانے سے ہماری تکلیفیں کیسے دُور ہو سکیں گی؟ ہم کو خوف ہے کہ ہماری ذہنیت میں فرقہ واری جذبات اور ذات پات کے جھگڑوں کے ساتھ ساتھ ایک نئی درجہ بندی کی مخاصمت بھی پیدا ہو جائے گی۔ جس سے بدامنی کی طاقت تو بڑھ سکتی ہے لیکن ملک کا کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا

قیمت بارہ آنے ملنے کا پتہ:۔ مسرز لاجپت رائے اینڈ سنس تاجر کتب لاہور

اِس وقت باہری ملکوں کے حالات سے بھی لوگوں کو بڑی دلچسپی ہو رہی ہے چنانچہ لالہ شانتی نراین ایڈیٹر "بندے ماترم" لاہور نے ہٹلر کی خود لکھی ہوئی سوانحمری کا ترجمہ "میری جدوجہد" کے نام سے کیا ہے۔ یہ کتاب دُنیا کی مختلف زبانوں میں چھپکر ابتک چھتیس ۳۶ لاکھ کی تعداد میں بِک چکی ہے۔ انگلستان میں اِسکے اٹھارہ ۱۸ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اب لالہ شانتی نراین کی توجہ سے اُردو کے جاننے والے بھی اسے پڑھ سکتے ہیں۔

قیمت ۱۲ر ملنے کا پتہ:۔ میسرس نراین دت اینڈ سنس تاجر کتب لاہور

مسٹر لیبیح آبادی ایڈیٹر ہند کلکتہ نے "کمال اتاترک" کی مفصل سوانحعمری عربی زبان کی ایک مستند کتاب سے ترجمہ کرکے اُردو میں پیش کی ہے۔ جسمیں پانچ سو صفحات پر اِس زبردست ترکی لیڈر کی زندگی کے مفصل حالات درج ہیں۔ لائق مترجم نے اس کے آخر میں چند دلچسپ دستاویزوں کا ترجمہ بھی دیدیا ہے' جس میں کمال پاشا کے خلاف سلطان ترکی کا فرمان اور اُن کے شیخ الاسلام کا فتویٰ بھی ہے۔ اِس کتاب میں کمال پاشا کی بہت سی ہاف ٹون تصویریں بھی دیدی گئی ہیں جس سے اس کی دلچسپی بہت بڑھ گئی ہے۔ اُس کا حجم ۵۰۰ صفحات اور قیمت ؎۱۲ ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر روزانہ ہند ۲۱ ساگر دت لین۔ کلکتہ

ہندستانی

گذشتہ اگست ۱۹۳۸ء سے ہمارے مکرم حضرت سہیل عظیم آبادی کی ایڈیٹری میں پٹنہ سے "ہندستانی" نام کا اُردو رسالہ شائع ہو رہا ہے جسمیں ہندستانی زبان کے اکثر مشہور مضمون نگار اپنے خیالات پیش کرتے ہیں۔ ادبی مضامین اور افسانوں کے علاوہ اِس پرچہ میں "حال چال" کے عنوان سے موجودہ سیاسی واقعات پر بھی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اِس کی نظمیں بھی سلیس ہندستانی زبان میں ہوتی ہیں' اور موجودہ زمانہ کے دلکش مضامین پر لکھی جاتی ہیں۔ "آجکل کارواں کا گیت" کے نام سے بنگالی زبان کے مشہور شاعر قاضی نذرالسلام کی نظموں کا ترجمہ شائع ہو رہا ہے جو اُردو ادب کے لئے نئی چیز ہے۔

ترکی مشہور خاتون خالدہ ادیب خانم کا مضمون "امتحان کی کٹھن گھڑیاں" کئی پرچوں سے برابر نکل رہا ہے۔ سلسلہ مضامین کے ختم ہونے پر اِس نامور خاتون کے دیگر مضامین کے ترجمے شائع ہوں گے۔ بہرحال یہ پرچہ اپنے رنگ میں خوب اور مقصد کے لحاظ سے عام سرپرستی کا مستحق ہے۔ قیمت صرف تین روپیہ سالانہ شائقین منیجر رسالہ "ہندستانی" پٹنہ سے طلب فرمائیں۔

"رہنمائے تعلیم کا تپ دق نمبر"

ہمعصر "رہنمائے تعلیم" لاہور نے جنوری اور فروری ۱۹۳۹ء نمبروں کو ملاکر اِس سال "تپ دق" نمبر کے نام سے اپنا سالنامہ نکالا ہے جو ملک کی اُردو خوان جماعت کے لئے ایک نہایت کارآمد تحفہ ہے۔ اس میں تپ دق کے متعلق ہر قسم کی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اسکی ترتیب ڈاکٹر بی۔ ایس۔ موہن صاحب سپرنٹنڈنٹ بھناتھ سنٹوریم کانگڑہ کے ذمہ کی گئی تھیں جنھوں نے ایک ماہر طبیب کی حیثیت سے اسکو "تپ دق" کا ایک مکمل رسالہ بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ اس رسالہ کا مطالعہ ہر شخص کے لئے بیحد مفید ہوگا ضخامت ۳۵۰ صفحات سے زائد اور قیمت دو روپیہ ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ منیجر "رہنمائے تعلیم" رام گلی لاہور

یادِ رفتگان

پنڈت مہابیر پرشاد دوویدی

انسوس کہ ۲۱ر دسمبر ۱۹۳۸ء کی صبح کو ہندی علم و ادب کے نامور ادیب و نقاد پنڈت مہابیر پرشاد دوویدی کا رائے بریلی میں ۷۴ سال کی عمر میں استسقاء کے عارضہ سے سورگباش ہوگیا۔ جس سے ہندی لٹریچر کی صفِ اوّل میں ایک ایسی جگہ خالی ہوگئی جس کا پُر ہونا ناممکن ہے۔ مرحوم نے اپنی عمر کا بیشتر حصّہ ہندی ادب کی توسیع و ترقی کی کوشش میں بسر کر دیا۔ آخر تک آپ ہندی زبان کی ترقی کے لئے تن من دھن سے کوشاں رہے۔ ادھر کچھ عرصہ سے آپکی صحت خراب رہتی تھی۔ لکھنا پڑھنا بند سا ہوگیا تھا۔ پھر بھی وہ ہندی شاعروں اور ادیبوں کی برابر حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے۔ درحقیقت ہندی نثر کی موجودہ ترقی زیادہ تر مرحوم ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ہندی نظم میں اُنھوں نے کھڑی بولی کو رواج دیا۔ جو ابھی تک ترقی کر رہی ہے بھارتیندو ہریشچندر جدید ہندی نثر کے اولین مُصنف کہے جاتے ہیں مگر دوویدی جی نے اُسے بہت ترقی دی۔ چنانچہ ابھی تک اُنکی دھاک ایسی ہی جمی ہوئی ہے۔ مرحوم کو دوسروں کو ادیب بنانے کا خاص ملکہ تھا۔ آجکل کی ہندی دُنیا میں شاید ہی کوئی ایسا مشہور و معروف شاعر ہو، جو آپ کی طرزِ تحریر سے کسی نہ کسی پیرایہ میں متاثر نہ ہوا ہو۔ اور بہتوں کو تو اُنھیں نے ہندی لکھنا پڑھنا سکھلا کر اہلِ قلم بنا دیا۔

فنِ تنقید میں بھی مرحوم کو خاص طور پر دسترس تھا۔ اسمیں وہ کسی کی رو رعایت نہ برتتے تھے۔ اُنکی اکثر تنقیدیں سخت ہوتی تھیں۔ تاہم اچھی چیزوں کی قدر بھی کرتے تھے اور کبھی کبھی لوگوں کو دِل کھول کر داد بھی دیتے تھے۔

حامیانِ ہندی نے آپکی قدر بھی خوب دِل کھول کر کی تھی۔ چنانچہ ساہتیہ سملین نے اُنھیں ساہتیہ واچسپتی (خسروِ زبان) کا خطاب دیا۔ اور اُنکی سترویں سالگرہ پر مئی ۱۹۳۳ء میں الہ آباد اور بنارس میں اُنکے نام پر "دوویدی میلا" کیا۔ اور مہاراجہ اورچھا کی سرپرستی میں آپ کی ادبی خدمات کے اعزاز میں ایک خاص یادگاری کتاب شائع کی گئی۔

آپ نے اٹھارہ سال تک انڈین پریس الہ آباد کے نامور ہندی رسالہ "سرسوتی" کی ایڈیٹری کے فرائض نہایت قابلیت و جفاکشی سے انجام دئے۔ جس کے صلہ میں قدرشناس پروپرائٹر انڈین پریس پچاس روپیہ ماہوار بطور پنشن دیتا تھا۔ جسکی بدولت آپ نے اپنے قدیم وطن موضع دولت پور ضلع رائے بریلی میں اپنی بقیہ زندگی اطمینان و آرام کیساتھ بسر کی۔ آپ نے اس موضع میں ڈاکخانہ، اسپتال، اسکول اور سرکاری پنچایت قائم کرائی۔ آپ نے اپنی زندگی ہی میں اپنا کتب خانہ ناگری پرچارنی سبھا بنارس کو دیدیا تھا۔ غرض آپ نے شروع سے آخر تک ہندی زبان کی ہر طرح سے خدمت کی۔

آپ کی وفات پر ہمارے صوبہ کی قانونی اسمبلی میں بھی تعزیت و ہمدردی کا ریزولیوشن پاس ہوا صوبہ کی آئینی تاریخ میں یہ پہلا مرتبہ ہے کہ ہماری قانون ساز اسمبلی نے ایک ہندوستانی ادیب کی خدمات کا اس طرح اعتراف کیا ہے۔

رفتارِ زمانہ

(ممالک غیر)

سیاسیات یوروپ معاہدۂ میونخ کے سلسلہ میں ہر ہٹلر نے یقین دلایا تھا کہ سوڈٹین لینڈ کا الحاق یوروپ میں اُس کا آخری مطالبہ ہے۔ لیکن اس معاہدہ کو ابھی چند مہینے بھی نہیں گذرے ہیں کہ اس سفاک و عیار حکمران نے ۱۵ مارچ کو اُسکی دھجیاں اُڑادیں اور اہلِ بزم یہی کہتے رہ گئے ؎

تیرے وعدہ پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

ہم نے پچھلی اشاعت میں لکھدیا تھا کہ کچھ مغربی ممالک عالمگیر جنگ کے ورطۂ فنا میں پھنسنے سے بچنے کی کوشش میں ہیں لیکن ہٹلر شاطرانہ چالیں کھیلے بغیر نہیں رہ سکتا اور موقع پاتے ہی سب سے پہلے سارے چیکوسلاویکیہ کو ہڑپ کر لیگا۔ بیچارے امن سٹر چیمبرلین شرمندہ اور حیرت زدہ ہیں کہ یہ کیا ہوا؟ انھیں یہ بھی شکایت ہے کہ گو اُنھوں نے پچھلے ستمبر میں ہٹلر کی زیارت کیلئے کئی بار دور دراز سفر کی زحمت اُٹھائی، لیکن اِس نیاز مندی و ناصیہ فرسائی کے باوجود اُس بیوفا نے ایفائے وعدہ نہ کیا۔ کیا عجب ہے کہ مسٹر چیمبرلین کی اب بھی مراقبہ میں بیٹھکر یہی کیفیت ہوئی ہو ع "سر بسجدہ ہیں مسیحا کہ مری بات رہے"

وزیر اعظم ممدوح کو حریفانِ سیاست سے وفا کی اُمید ہی نہ کرنا چاہئے تھی۔ کیونکہ یہ پُرانی ضرب المثل ہے کہ عشق و جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ پھر بقول شاعر علائی ؎

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

ہٹلر اور ایفائے وعدہ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے مگر ستم ظریفی دیکھئے کہ ہٹلر نے عہد شکنی بھی کس انداز سے کی۔ مستند و معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ جب چیکوسلاویکیہ کے پریسیڈنٹ مسٹر ہاہا اپنے وزیر خارجہ کے ساتھ برلن پہونچے تو فوجی اعزاز کے ساتھ اُن کا استقبال کیا گیا اور وہ جرمن چانسلری کے ایک کمرہ میں لائے گئے جہاں ہر ہٹلر، ہر فان ربن ٹراپ اور فیلڈ مارشل گورنگ کے ساتھ پریسیڈنٹ ممدوح کا انتظار کر رہا تھا اور ایک دستاویز جس کا مسودہ پہلے ہی تیار ہو چکا تھا، ہٹلر نے اُن کے ہاتھ میں رکھکر صاف و صریح الفاظ میں واضح کر دیا کہ جرمن فوجیں ۹ بجے صبح پریگ (Prague) میں داخل ہو جائیں گی اور جو کوئی مزاحمت کرے گا وہ پاؤں تلے کچل ڈالا جائے گا۔ اِس مسودہ کی مختلف مدیں

اختصار کے ساتھ سمجھا کر ہٹلر نے پہلے اس پر خود دستخط کر دئے اور یہ کہکر چلا گیا کہ اِس مسودہ میں کسی بحث و مباحثہ کی گنجائش نہیں ہے۔ پریسیڈنٹ ہاہا بدحواس ہو کر ہٹلر کے رفقائے کار سے مخاطب ہوئے اور بحث چھیڑنی چاہی مگر اُنھوں نے اس کے سوا کہ اُن کے ہاتھ میں دستخط کرنے کے لئے قلم تھما دیا اور کچھ نہ کہا یہ باتیں سُنکر پریسیڈنٹ ہاہا کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اور حواس بجا نہ رہے۔ کہتے ہیں کہ پریسیڈنٹ موصوف واقعی کئی دفعہ بیہوش ہو گئے۔ جس پر ڈاکٹر بلائے گئے اور اُنھوں نے انجکشن (Injection) لگائے جس سے پریسیڈنٹ ہوش میں آئے مگر بار بار بیہوش ہو جاتے تھے۔ بالآخر ساڑھے پانچ بجے صبح جب اُن کے دست و پا بالکل شل ہو گئے تو اُنھوں نے طوعاً و کرہاً مسودہ پر دستخط کر دئے۔ کیونکہ اُنھیں ۶ بجے تک کا وقت دیا گیا تھا کہ اگر اُس وقت تک اُنھوں نے دستخط نہ کئے تو آٹھ سو ہوائی جہاز سرزمین چیک میں بمباری شروع کر کے اُسے بالکل تباہ و برباد کر دیں گے۔ جرمن فوجیں پہلے ہی سے روانہ ہو چکی تھیں۔ واقعی اِس موقعہ پر ہٹلر نے جو طنطنہ دکھایا اور جس تیور سے کام لیا وہ موجودہ زمانہ کی سیاسیات میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ اسے غنڈا پن کہئے یا رہزنی۔ مگر ایک قطرۂ خون بہائے بغیر محض دھمکیوں میں بڑے بڑے ملکوں کو اپنے قبضے میں لے لینا دُنیا کی تاریخ میں اِس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔

ہٹلر نے معاہدۂ وارسائی کی خلاف ورزی رائن لینڈ کی قلعہ بندی سے شروع کی تھی۔ اُس کے بعد آسٹریا کا الحاق اور ستمبر گذشتہ میں سوڈٹین لینڈ کا قبضہ حاصل کیا۔ مگر یہ کارروائیاں شاید اخلاقی حیثیت سے قابلِ معافی قرار دی جا سکتی تھیں۔ لیکن ہٹلر کی یہ تازہ ترین حرکت دُنیا میں ہر اخلاقی اصول کی کھُلی ہوئی خلاف ورزی ہے جس کو کسی حیلہ سے جائز نہیں قرار دیا جا سکتا۔ سوڈٹین لینڈ میں کم سے کم جرمنوں کی کثرت ضرور تھی اور حکومت خود اختیاری کے اصول کے ماتحت اُن کا یہ حق تھا کہ اگر اُنکی خواہش ہو تو جرمن ریش (.Reich) سے وابستہ ہو جائیں مگر چیکوں کو جرمنی کی ماتحتی میں زبردستی گھسیٹنا کسی طرح جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ مسٹر چیمبرلین کو بھی ۱۷ مارچ کو برمنگھم شہر میں اپنی تقریر کے دوران میں اس جبر و تشدد پر غم و غصہ کا اظہار کرنا پڑا۔ اُنھوں نے بھی اس واقعہ کو ہٹلر کی عہد شکنی قرار دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ معاہدہ میونخ کی رُو سے ضروری تھا کہ سرحدی توسیع اور اُس کے متعلق سب تضیوں کا فیصلہ بین الاقوامی کمیشن کے سپرد کیا جاتا۔ اور ہٹلر نے انھیں خاص طور پر یقین دلایا تھا کہ سوڈٹین لینڈ کے الحاق کے بعد اب یورپ میں جرمنی کو کسی اور مُلک کی تسخیر کا خیال نہیں ہے۔ نیز اب اُسے چیک سلطنت سے کچھ لینا دینا نہیں ہے اور وہ اس کا ضامن رہیگا۔ کیونکہ اُسکا کسی چیک کو جرمن سلطنت میں شامل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ مسٹر چیمبرلین نے اِس بات کی بھی شکایت کی ہے کہ

معاہدہ میونخ کے مطابق ہٹلر کو اس قسم کی کارروائی کرنے سے پہلے انگلستان وغیرہ سے مشورہ کرنا چاہئیے تھا اور ایسا نہ کرکے ہٹلر نے معاہدہ کی خلاف ورزی اور خلاف قانون کارروائی کی ہے۔ وزیر اعظم برطانیہ ان واقعات کے بعد اس بات کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں کہ برطانیہ کو اپنی پالیسی میں تبدیلی کرنا چاہئیے۔ اور ہٹلر پر یہ بات واضح کر دینا چاہئیے کہ برطانیہ اِتنا گیا گذرا نہیں کہ وہ جنگ کے تباہ کُن نتائج کے خوف سے جرمن چیلنج کا جواب نہ دے سکیگا۔

بہر حال مسٹر چیمبرلین نے اب جرمنی کے خلاف اپنے بیانات اور تقریروں میں کسی قدر سخت لہجہ اختیار کر لیا ہے۔ چنانچہ ۲۳ مارچ کو اُنھوں نے پارلیمنٹ کے سامنے جو بیان دیا اُسے اہلِ برطانیہ نے عام طور پر پسند کیا کیونکہ اُس میں بھی وزیر اعظم نے اِس بات کا اعلان کر دیا ہے کہ برطانیہ پر جرمنی اِسطرح دباؤ نہیں ڈال سکتا اور جو رویہ اُس نے اختیار کر رکھا ہے اور جس طرح خود مختار سلطنتوں کو وہ دھمکا رہا ہے وہ کسی طرح برطانیہ کو پسند نہیں ہو سکتا۔

یہاں پر یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ فرانس کے لئے جرمنی کے مقابل میں انگلستان کی اعانت و رفاقت میں رہنے کے سوائے اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے اور روس تو میونخ کے معاہدہ سے پہلے ہی چیکوسلاویکیہ کے معاملہ میں جنگ آزمائی کے لئے تیار تھا مگر برطانیہ نے اسوقت کمزوری دکھائی اور فرانس بھی بیخود ہوگیا' امریکہ بھی جرمنی کے خلاف ہی ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ اٹلی بھی دِل ہی دِل میں جرمنی کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خوش نہیں ہے اور وسط یوروپ میں ہٹلر کو جو غلبہ حاصل ہوتا جاتا ہے اُس سے وہ اندر ہی اندر کڑھ رہا ہے لیکن بظاہر وہ دوستی کا اعلان کئے جاتا ہے۔ چنانچہ اِس موقع پر بھی اُس نے اپنی رفاقت کا اعلان کیا ہے۔

ہٹلر کی درازدستیاں اور بڑھتے ہوئے حوصلے برطانیہ، فرانس، روس وغیرہ کیلئے بہت پریشان کُن ثابت ہو رہے ہیں۔ برطانیہ کو خوف ہے کہ ہٹلر کو محض یوروپ ہی پر غلبہ حاصل کرنا مقصود نہیں بلکہ وہ کل دُنیا پر حاوی ہونا چاہتا ہے چنانچہ اِس وقت وہی صورت حال ہو رہی ہے جیسی کہ پچھلی صدی کے شروع میں ہوگئی تھی جب نپولین تمام یوروپ پر چھا گیا تھا۔ ہٹلر نے رومانیہ سے بھی مجبوراً اپنے مطالبات منوالئے ہیں اور اُس نے بادل ناخواستہ جرمنی کے اقتصادی معاہدہ پر دستخط کر دئے ہیں، ان تمام واقعات سے یوروپ کی چھوٹی چھوٹی خود مختار سلطنتیں ہٹلر سے مرعوب ہو رہی ہیں، گو ہنگری اِسوقت روتھینیا (Ruthenia.) پر قبضہ حاصل کرکے خوش اور ہٹلر کے حلقۂ اثر میں ہے مگر بالآخر وہ وقت آئیگا جب ہٹلر ہنگری کو بھی مجبور کرکے جرمنی کے ماتحت بنالیگا۔ اِس وقت سوال یہ ہے کہ چیکوسلاویکیہ کے

بعد ہٹلر کی غاصبانہ توجہ کا آیندہ مرکز کیا ہوگا؛ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہٹلر اپنی نوآبادیات کا مطالبہ پیش کریگا۔ لیکن قیاس غالب یہ ہے کہ برطانیہ سے سب سے آخر میں برسرِپیکار ہوگا۔ اس وقت وہ لیتھونیہ کو دھمکا کر میمل تو لے ہی چکا ہے۔ اب ڈینزگ (Danzig) اور پولینڈ میں گذرتے ہوئے راستے "Polish Corridor" کی طرف رجوع ہوگا۔ یہ وہ علاقہ ہے جو مشرقی پروشیا کو بقیہ حصہ سے علیحدہ کرتا ہے اور جو پولینڈ سے ملحق قائم کیا گیا تھا تاکہ اُسے سمندر کے لئے راستہ مل جائے۔ پولینڈ کی پوزیشن بھی نہایت نازک رہتی ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ وہ برابر روس و جرمنی وغیرہ کی چھین جھپٹ کا شکار ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ اُس نے ہمیشہ اپنے پڑوسی ممالک سے خوشگوار تعلقات رکھنے کی کوشش کی ہے اِس دوران میں وہ اس تذبذب میں رہا کہ اگر جرمنی کے حلقۂ اثر میں آتا ہے تو روس کی دشمنی مول لیتا ہے اور معاہدۂ میونخ کے وقت جب اُس نے ہنگری کے ساتھ متحدہ محاذ قائم کرنا چاہا تھا تو ایک طرف ہٹلر مزاحم ہوا، دوسری طرف روس بھی کبیدہ خاطر ہوا۔ اگر وہ فرانس اور برطانیہ کا رفیق بنتا ہے تو اُنکی دوستی کا اب کچھ اعتبار نہیں رہا اور نہ ان سے اُسے کوئی تقویت حاصل ہوسکتی ہے۔ اگر روس سے سانہ باز رکھے تو جو اندیشہ جرمنی کی دست درازیوں کا ہے وہی خوف روس کی طرف سے بھی لاحق ہے۔ اٹلی بھی دل سے یہ پسند نہیں کرسکتا ہے کہ پولینڈ کے اندر جرمن حکومت کی توسیع ہو۔ کیونکہ اس صورت میں جرمنی بحیرۂ روم سے قریب ہوجائیگا۔ اور اِس وقت اٹلی بحیرۂ روم میں جو اقتدار حاصل کرنا چاہتا ہے اُسمیں فرقِ عظیم واقع ہوجائیگا۔ بہرحال پولینڈ یوروپین سیاست کا ایک اہم مرکز بن گیا ہے جس سے تمام ممالک مغرب پریشانی میں پڑگئے ہیں اور اِس گتھی کا سلجھنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔

درحقیقت یہ قضیہ چیکوسلاویکیہ کے قضیئے سے کہیں دشوار تر ہے۔ پولینڈ کے لئے آزاد یوکرین کے متعلق جرمن پروپیگنڈا انتشار کا باعث ہورہا ہے۔ جرمن اور پولش فوجوں میں سرحدی جھگڑے بھی شروع ہوگئے ہیں۔ معلوم نہیں کہ ہٹلر کی غاصبانہ روش یکایک کب اور کس وقت کیا رُخ اختیار کرے؛ بہرحال ہٹلر کی مصلحت کا یہ بھی تقاضا ہے کہ اس وقت وہ اسپین و اٹلی کو برطانیہ اور فرانس کے خلاف سرگرم کار رکھنے کے لئے جو مطالبات پیش کرے، اُنمیں ان کا مفاد بھی شامل ہو۔ چنانچہ بین الاقوامی مصالحت کے لئے ہٹلر مندرجۂ ذیل مطالبات پیش کریگا:۔

(۱) برطانیہ جنرل فرانکو کو جبرالٹر دیدے۔

(۲) برطانیہ میعادِ معینہ کے اندر پُرانی جرمن نوآبادیات جرمنی کو واپس کردے۔

(۳) فرانس، ٹیونس، جیبوتی اور کارسیکا کے متعلق اطالوی مطالبات پورے کردے۔

(۴) ڈنمارک جنوبی سلیزوگ (South Slesvig.) کا حصہ جرمنی کو دیدے۔

رومانیہ نے تو اکثر جرمن مطالبات (جو اس بنیادی اصول پر مبنی تھے کہ رومانیہ زراعتی ملک بن جائے اور اپنی صنعتی ضروریات کے لئے جرمنی کا دستِ نگر ہوجائے) منظور کرکے معاہدہ پر دستخط کردئے ہیں۔ اس طرح رومانیہ کی اقتصادی آزادی کا خاتمہ ہوگیا۔ کیونکہ اُسے اختیار ہی نہیں رہا کہ وہ اپنا کچا مال جسے چاہے بیچے اور اپنے لئے جو چاہے خریدے اور جس طرح چاہے اپنی صنعت وحرفت کو فروغ دے۔ پھر اسکی سیاسی آزادی کی کیا حیثیت رہی؟ ہرچند ہٹلر نے یقین دلایا ہے کہ وہ اس اقتصادی اطاعت کے عوض میں رومانیہ کی سیاسی آزادی کا ضامن رہیگا اور خود بھی دست درازی نہ کرے گا۔ لیکن اس وعدہ کا بھی کیا اعتبار ہوسکتا ہے۔

ہٹلر نے برطانیہ اور فرانس کے اعتراضات کو یہ کہکر ٹھکرا دیا ہے کہ سیاسی، قانونی اور اخلاقی ہر حیثیت سے یہ اعتراضات بے بنیاد ہیں۔ خوب ع "چہ دلاور است دُزدے کہ بکف چراغ دارد"

امریکہ اور روس نے بھی اعلان کردیا ہے کہ وہ چیکوسلاویکیہ پر جرمنی کا تسلط تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن ہٹلر پر اِن باتوں کا کیا اثر پڑے گا؟ برطانیہ کی کوشش ہے کہ روس، برطانیہ، فرانس، رومانیہ، پولینڈ اور ترکی کے درمیان متحدہ محاذ کا اعلان ہوجائے مگر روس اس اعلان سے پہلے برطانیہ اور فرانس سے تمام ضروری معاملات پر ایک مستقل سمجھوتہ کرنے پر اصرار کررہا ہے۔ بہرحال دُنیا کے جمہوری ملک ابھی تک زبانی جمع خرچ ہی میں مصروف ہیں۔ اور ہٹلر اطمینان کے ساتھ اپنے سب منصوبے رفتہ رفتہ پُورے کرتا چلا جاتا ہے اور اس غیر معمولی کامیابی سے اسکی رعونت میں بھی اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ واقعی وہی جرمنی جسے جنگ عظیم کے فاتحان نے آسٹرو ہنگیرین سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے بالکل پامال کردیا تھا۔ تیس سال کے اندر پھر قیامت بن کر اُٹھا اور آن کی آن میں تمام یورپ پر قیامت برپا کردی۔

فلسطین کانفرنس | فلسطین کے آیندہ نظم ونسق کے متعلق برطانیہ نے جو تجویزیں پیش کی تھیں اُنھیں یہودیوں اور عربوں، دونوں میں سے کسی نے منظور نہیں کیا۔ اِس لئے لندن کی فلسطین کانفرنس بلاکسی نتیجہ پر پہونچے ہوئے ختم کردی گئی۔ اب برٹش گورنمنٹ اپنی مجوزہ اسکیم پر جبریہ عملدرآمد کریگی۔ بہرحال اس اسکیم کی کیا صورت ہوگی؟ اس کا ابھی کچھ پتہ نہیں۔ لیکن اسمیں یہ بات بہرحال ملحوظ رہے گی کہ بالآخر برٹش حکمبرداری "Mandate" ختم کردی جائے گی۔ اور برطانیہ اور فلسطین کے مابین مصالحانہ تعلقات قائم کرکے فلسطین میں ایک آزاد سلطنت قائم کردی جائے گی۔ برطانیہ کا کہنا ہے کہ جب تک نئی طرزِ حکومت کامیاب نہ ہوجائے۔ برطانیہ بدستور فلسطین کے معاملات کو اپنے ہاتھوں میں رکھے گا۔ عربوں کو بھی برطانیہ کا اقتدار کسیقدر احتیاط بساتھ منظور تھا مگر وہ اس کے لئے کوئی میعاد مقرر کرانا چاہتے تھے۔ جس کے بعد برطانوی مینڈیٹ از خود ختم

کردیا جائے۔ برطانیہ ابھی کوئی خاص میعاد مقرر کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ عربوں کو خوف ہے کہ اگر کوئی میعاد مقرر نہ کی گئی تو یہودی خواہ مخواہ نئی حکومت کے راستہ میں روڑے اٹکا کر اسے کامیاب نہ ہونے دیں۔ اُدھر یہودی بھی اپنے مطالبات پر اڑے رہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہودی فلسطین کے ایک تہائی حصہ میں آباد ہیں مگر اقتصادی تعمیر و ترقی میں اُن کا حصہ دو ثلث ہے۔ اسمیں شبہ نہیں کہ یہودی سرمایہ سے چند ہی سال کے اندر فلسطین میں بہت بڑی ترقی ہو گئی ہے جو یہودی اور عرب دونوں کیلئے بہت فائدہ بخش ہے اگر برطانیہ نے مجوزہ اسکیم میں آیندہ پانچ سال تک فلسطین میں یہودیوں کے بلا روک ٹوک داخلے کی اجازت دی تو عربوں اور یہودیوں کی خونریزی اسی طرح قائم رہیگی۔ اور برطانیہ کو امن قائم کرنے میں غیر معمولی مشکلات کا سامنا ہوگا۔

ہندوستان

تریپوری کانگریس | مسٹر بوس کے دوبارہ انتخاب کے بعد بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں۔ کیونکہ موصوف نے جوش میں آکر مہاتما گاندھی اور اُن کے رفیقانِ کار پر جو کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے یہ الزام لگا دیا تھا کہ وہ فیڈریشن کے متعلق حکومت برطانیہ سے ساز باز کر رہے ہیں۔ پنڈت جواہرلال نے انھیں ان الزامات کو واپس لینے کا مشورہ دیا۔ تو اُس کا جواب یہ ملا کہ عام شکوک کی ترجمانی کی گئی ہے۔ غرض تریپوری کانگریس کے دن تک مسٹر بوس اپنی ضد پر قائم رہے۔ ملک کو فکر تھی کہ ورکنگ کمیٹی کے ممبران جو ملک کے سربرآوردہ رہنما ہیں مستعفی ہو چکے ہیں اور کشیدگی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ اگر تریپوری کانگریس میں کوئی سمجھوتہ نہ ہوسکا تو کانگریس نفاق باہمی کی وجہ سے متحدہ محاذ قائم نہ رکھ سکیگی اور یہ بات ملک کے لئے بڑی بدنصیبی کی ہوگی۔ شکر ہے کہ تریپوری میں جو کارروائی ہوئی اس سے یہ خطرہ دور ہوگیا۔ اس کے ساتھ یہ بات ضرور افسوسناک ہے کہ مسٹر بوس آخر تک اپنی ضد پر قائم رہے، چنانچہ مسٹر پنت نے جو ریزولیوشن مرتب کیا تھا وہ بے کم و کاست پیش کیا گیا۔ مزید بدقسمتی یہ ہوئی کہ مسٹر بوس علالت کی وجہ سے مشکل سے صرف ایک جلسہ کانگریس کمیٹی میں شریک ہوسکے مگر اس کی صدارت کے فرائض بھی اُن کو بسترِ علالت ہی سے ادا کرنے پڑے۔ مسٹر پنت، مسٹر بوس کی علالت کے لحاظ سے اِس پر رضامند تھے کہ اُن کا ریزولیوشن آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو غور کرنے کے لئے سپرد کر دیا جائے اور سبجکٹ کمیٹی اور کانگریس کے کھلے اجلاس میں اسکی پیشی کی نوبت نہ آئے مگر بنگال کے ڈیلیگیٹوں نے اصرار کیا کہ کھلے اجلاس کا فیصلہ حاصل کیا جائے۔ چنانچہ سبجکٹ کمیٹی میں اس پر بڑے زور و شور سے بحث ہوئی۔ بہت سی ترمیمیں پیش کی گئیں اور خوب دھواں دھار تقریریں ہوئیں اور بنگال کے ڈیلیگیٹ صاحبان نے اس پر گڑبڑ بھی بہت مچائی۔ لیکن ریزولیوشن بھاری کثرت رائے سے پاس ہوا۔ اُس کے بعد بھی مسٹر آینے نے یہ تجویز کی کہ اس کو کانگریس کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے۔ جس کو مسٹر پنت نے

صاحب صدر کی مسلسل علالت کے خیال سے منظور کر لیا۔ لیکن بنگال کے نمائندوں نے کھلے اجلاس کا فیصلہ چاہا۔ چنانچہ کھلے اجلاس میں مسٹر پنت نے اُسے بلا کسی تقریر کے پیش کیا۔ وہاں بھی یہ ریزولیوشن جوش و خروش کیساتھ پاس ہوا۔ مسٹر بوس سے یہ بھی درخواست کی گئی کہ پرانے رہنمایاں کانگریس کے خلاف اُنھوں نے جو الزامات لگائے ہیں اُن کو واپس لے لیں۔ لیکن اُنھوں نے یہی کہا کہ میں نے کسی خاص شخص پر کوئی الزام عائد نہیں کیا ہے۔ بہرحال کانگریس کے کھلے اجلاس میں سوشلسٹ پارٹی نے بھی مسٹر بوس کا ساتھ نہیں دیا۔ کانگریس نے بہ حیثیت مجموعی اس کو پاس کر کے مہاتما گاندھی کی رہنمائی اور اُنکی پالیسی میں کلّی اعتماد ہونیکا اعادہ کیا اور ان الزامات پر اظہارِ افسوس کیا۔ جو کانگریس ورکنگ کمیٹی کے مستعفی ممبران پر عائد کئے گئے تھے اِس ریزولیوشن کے زور سے کانگریس نے اپنے صدر کو اس بات کا پابند کر دیا کہ وہ موجودہ زمانہ کی نزاکت کے لحاظ سے مہاتما جی کے مشورہ کے مطابق آیندہ سال کی کانگریس ورکنگ کمیٹی نامزد کریں۔

لیڈر سوشلسٹ پارٹی نے صدارت کانگریس کے متعلق اپنی پارٹی کے رویہ کی توضیح کے سلسلے میں یہ کہا ہے کہ اُن کی پارٹی نے سبھاش بابو کی پریسیڈنٹی کے حق میں اِسلئے ووٹ دیا کہ وہ انھیں دوسرے اُمیدوار ڈاکٹر پٹابھی سیتا رامیہ پر ترجیح دیتی تھی۔ مگر پارٹی کو ہرگز یہ احتمال نہ تھا کہ اِس نئے انتخاب سے کانگریس میں پھوٹ پڑ جائے گی اور اگر پارٹی کو مہاتما گاندھی کی رائے غیر مشکوک طور پر معلوم ہو جاتی کہ وہ مسٹر بوس کے دوبارہ انتخاب کے خلاف ہیں تو تمام کوششوں کے باوجود مسٹر بوس انتخاب میں کامیاب نہ ہوتے۔ بہرحال مسٹر پنت نے اپنی تقریر میں یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اُن کے ریزولیوشن کا یہ منشا نہیں ہے کہ مسٹر بوس پر عدم اعتماد متصور ہو۔ مگر چونکہ گاندھی جی، ڈاکٹر پٹابھی سیتا رامیہ کی شکست کو اپنی شکست سمجھکر یہ خیال کرتے ہیں کہ کثیر تعداد جماعت کو اُن کی رہنمائی پر اعتماد نہیں رہا۔ اُن کا یہ خیال درست نہیں ہے اور کانگریس کے ممبران موجودہ حالات میں مہاتما گاندھی کی رہنمائی اشد ضروری سمجھتے ہیں۔ اِس لئے اُنھوں نے اس ریزولیوشن کے ذریعہ مہاتما جی کو کانگریس کی طرف سے یہ یقین دلایا ہے کہ جن لوگوں نے سوبھاش بابو کی صدارت کے حق میں ووٹ دیئے ہیں۔ ان کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ وہ مہاتما جی اور اُن کی پالسی سے اپنا عدم اعتماد ظاہر کریں۔ غرض اِس ریزولیوشن سے کانگریس رہنمائی کی آیندہ مشکلات حل ہو گئیں اور کل معاملہ صلح و صفائی کیساتھ طے ہو گیا۔ حالانکہ بنگال کے محبانِ وطن نے اس ریزولیوشن کی پیشی کے دوران میں ناحق گرمی دکھائی۔

اب لوگوں نے اخباروں میں یہ سوال اُٹھایا ہے کہ صدر کانگریس مسٹر بوس کو اس ریزولیوشن کو اپنے اوپر عدم اعتماد کا ووٹ سمجھکر صدارت سے مستعفی ہو جانا چاہیئے یا نہیں؟ مگر مسٹر بوس نے اس کے متعلق غیر ملکی اخباروں کے نمایندگان کو جو پیغام بھیجا ہے اس میں یہ صاف کر دیا ہے کہ وہ مسٹر پنت کی تقریر کے مطابق

اس ریزولیوشن کو عدم اعتماد کا ووٹ نہیں سمجھتے اور چونکہ کانگریس نے مجوزہ فیڈریشن کی مخالفت کی تجویز بھی پاس کردی ہے۔ اس لئے اُن کی پوزیشن میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ خصوصاً جبکہ اُنھوں نے اپنے دوبارہ انتخاب کی کوشش اسی پالیسی کی بنیاد پر کی تھی۔ باقی رہا ورکنگ کمیٹی کے ممبران کے متعلق مہاتما جی سے مشورہ کرنا۔ تو اس میں وہ کوئی قباحت نہیں دیکھتے۔ البتہ اگر ممبروں کی نامزدگی کے سلسلے میں مہاتما گاندھی سے اُن کا اختلاف رائے ہو یا آیندہ ورکنگ کمیٹی اُن کے راستے میں مزاحم ہو تو دوسری بات ہے۔ بہرحال جب تک ایسے حالات پیدا نہیں ہوتے، اُن کے مستعفی ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

مہاتما گاندھی کی تحریک پر کانگریس نے اپنی اندرونی اصلاح کا بھی تہیہ کرلیا ہے اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو اس کے متعلق مناسب کارروائی کرنے کا اختیار دیدیا ہے۔

تری پوری کانگریس نے بیرونی ممالک کے ساتھ ربط وضبط قائم کرنیکے سلسلے میں پنڈت جواہر لال نہرو کا ریزولیوشن پاس کردیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو اِس بات کے حامی ہیں کہ ہندوستان تمام دُنیا کے خارجی معاملات سے دلچسپی لے، وہ مسٹر چیمبرلین کی خارجی پالیسی کے خلاف ہیں، اور چاہتے ہیں کہ ہندوستان برطانیہ کی خارجی پالیسی سے علیحدہ ہو کر اُن ممالک کی صف میں جو جمہوریت کے حامی ہیں داخل ہو جائے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی سرگرم کوششوں سے ہندوستان کی غیر ملکی پالیسی مستحکم ہو رہی ہے۔ چنانچہ پچھلی کانگریس کا ایک قابل ذکر واقعہ مصری وفد کی شرکت ہے جسے پنڈت جی نے مدعو کیا تھا۔

کانگریس نے ہندوستانی ریاستوں کی بابت جو ریزولیوشن پاس کیا ہے اسمیں اجلاس ہری پورہ کے ریزولیوشن کو کانگریس کی پالیسی کی بنیاد قرار دیا گیا ہے اور یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اس سے کانگریس کی ارتقائی کیفیت پوری طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ اِس ریزولیوشن کے ذریعہ یہ بھی اعلان کیا گیا ہے کہ کانگریس کو دیسی ریاستوں کی رعایا کی آزادی کے لئے سرگرم کار ہونیکا پورا حق حاصل ہے۔ ہری پورہ ریزولیوشن میں ریاستوں کی تحریکوں میں عدم مداخلت کی پالیسی محض اس لئے رکھی گئی تھی کہ ریاستوں کی رعایا خود اپنے پاؤں پر کھڑی ہو کر اپنی آزادی کی جدوجہد کرسکے اس پالیسی میں موجودہ حالات اور آیندہ واقعات کی بنا پر ضروری ترمیم وتبدیلی ہوتی رہیگی۔ غرض جیسے جیسے حالات بدلتے رہیں گے کانگریس پالسی بھی اُنکے مطابق مرتب ہوتی رہیگی اور ہری پورہ کانگریس کی کارروائی اسکے منافی نہیں ہے۔ بہرحال تری پوری کانگریس اپنے مقاصد کے لحاظ سے بہت کچھ کامیاب رہی اور جو خطرہ لاحق تھا وہ نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ رفع ہوگیا۔ اور کانگریسی رہنما اپنا متحدہ محاذ قائم رکھنے میں بہت کچھ کامیاب ہوئے راجکوٹ کے معاملہ میں بھی جو کامیابی مہاتما گاندھی کو ہوئی وہ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں ایک اہم تاریخی واقعہ متصور ہوگا اور یہ کامیابی آیندہ کامیابیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔

ترپوری کا مرثیہ

(از پنڈت آنند نراین ملّا، ایم۔ اے، ایل ایل بی)

کل چار طرف ملک میں بجتا تھا یہی کوس — ہاں راسٹرپتی پھر سے ہوئے راسٹرپتی بوس
لیکن نہ خبر آج کی اُن کو تھی صد افسوس

سمجھے تھے موافق ہے مِرا طالعِ مسعود — دو گام پہ آتی تھی نظر منزلِ مقصود
معلوم نہیں تھا کہ بنیں گے یہ کڑے کوس

خوش جی میں تھے، وہ چال چلی جیت لی بازی — اب میں ہی فقط ملک میں کہلاؤں گا غازی
اِک آن میں سب دل کی اُمیدوں پہ پڑی اوس

لزام لگایا تھا کہ کمزور ہیں ساتھی — جانچا جب اُسے اس میں حقیقت تھی نہ کچھ بھی
پولا جنھیں کہتے تھے ثابت وہ ہوئے ٹھوس

س پر بھی کیا کوئی تلافی کا نہ چارا — کہنے لگے مطلب ہی نہیں تھا یہ ہمارا
جب کی نہیں تقصیر تو کس بات کا افسوس

پد حد سے سوا عظمتِ ذاتی کا تھا احساس — خوش ربطی باہم کا بھی مطلق نہ کیا پاس
جو زخم لگائے تھے اُنھیں سی نہ سکے بوس

لن ہے کہ ہو اس میں سیاست کا کوئی راز — ممکن ہے کہ تھا اپنی سکت کا غلط انداز
القصہ جو کرنا تھا وہی کر نہ سکے بوس

ب آج دکھاتا ہے نیا رنگ زمانہ — ہر لب پہ ہے چھوٹا سا یہ عبرت کا فسانہ
"گاندھی کو ڈھکیلا تھا مگر گر پڑے خود بوس"
افسوس، صد افسوس، صد افسوس، صد افسوس!



علمی خبریں اور نوٹ

صوبہ متحدہ کی قانونی اسمبلی میں حال میں اُردو ہندی اخباروں اور رسالوں کی اشاعت کے متعلق گورنمنٹ کی طرف سے چند سوالات کے جوابات میں بتلایا گیا ہے کہ سنہ ۱۹۲۱ء میں ہندی پرچوں کی مجموعی اشاعت دو لاکھ بتیس ہزار چھ سو چھیالیس اور اُردو پرچوں کی ایک لاکھ باون ہزار تین سو آٹھ تھی۔ مگر سنہ ۱۹۳۶ء میں ہندی پرچوں کی اشاعت تین لاکھ نوے ہزار پانچ سو پینتیس اور اُردو پرچوں کی دو لاکھ پینتالیس ہزار چار سو پندرہ ہو گئی۔

اُردو ہندی کتابوں کی اشاعت کی کیفیت یہ ہے:۔

سنہ	ہندی	اردو	سنہ	ہندی	اُردو
سنہ ۱۹۰۰ء میں	۴۲۰	۵۱۲	سنہ ۱۹۱۰ء میں	۸۰۷	۲۳۵
سنہ ۱۹۲۰ء میں	۹۴۸	۳۳۰	سنہ ۱۹۳۰ء میں	۲۰۲۹	۵۵۶
سنہ ۱۹۳۶ء میں	۲۰۹۸	۳۳۷	کتابیں شائع ہوئیں۔		

ورناکیولر فائنل امتحان میں حسب ذیل تعداد میں لڑکوں نے اُردو اور ہندی میں امتحان پاس کیا۔

سنہ	ہندی طالب علم	اُردو طالب علم	سنہ	ہندی طالب علم	اُردو طالب علم
سنہ ۱۸۹۰ء	۹۲۷	۱۵۳۲	سنہ ۱۹۲۰ء	۶۵۹۶	۴۸۶۰
سنہ ۱۹۳۰ء	۱۵۹۳۴	۱۰۱۸۰	سنہ ۱۹۳۶ء	۲۰۱۸۸	۱۴۲۸۸

سنہ ۳۸ء و سنہ ۳۹ء میں صوبہ متحدہ کے ہائی اسکول امتحان کے اُردو ہندی طالب علموں کی تعداد یہ ہے:۔

سنہ	ہندی	اُردو	سنہ	ہندی	اُردو
سنہ ۱۹۳۸ء	۷۶۲۹	۵۹۳۹	سنہ ۱۹۳۹ء	۷۸۶۴	۶۱۴۹

حکومت آسام نے پہاڑی علاقوں میں ابتدائی تعلیم عام کرنے کے لئے فیصلہ کیا ہے کہ دیوناگری یا اُردو رسم الخط کی جگہ رومن رسم الخط اختیار کیا جائے۔ معلوم ہوا ہے کہ ان علاقوں میں عیسائی مشنری عرصہ سے اشاعت تعلیم کا کام کر رہے ہیں اس لئے وہاں کے باشندے رومن خط سے اچھی طرح واقف ہیں۔

کچھ عرصہ سے اُردو ادب سے دلچسپی لینے والے اصحاب اُردو کی توسیع و ترقی میں قابل قدر سرگرمی سے کام کر رہے ہیں۔ چنانچہ پچھلے دسمبر میں انجمن بہار ادب لکھنؤ کی تحریک پر اکثر مقامات میں بڑے دھوم دھام سے "یوم اُردو" اور ۱۲ فروری کو

لکھنؤ میں ڈاکٹر سر تیج بہادر صاحب سپرو کی صدارت میں "یوم چکبست" منایا گیا۔ یوم اُردو کے سلسلہ میں جو جلسہ الٰہ آباد میں ہوا، اسکے صدر بھی ڈاکٹر سر تیج بہادر صاحب سپرو ہی تھے۔ آپ نے اُردو کو ہندو مسلمانوں کی مشترکہ میراث قرار دے کر کہا کہ اُردو ہندو مسلمانوں کے اتفاق و اتحاد کی بہترین نشانی بھی ہے۔

۲۵ و ۲۶ جنوری کو مسلم انسٹی ٹیوٹ ہال کلکتہ میں بنگال اُردو کانفرنس کا اجلاس مولانا اکرم خاں صاحب ایڈیٹر بنگلہ اخبار "آناد" کی صدارت میں ہوا۔ جسمیں بنگال میں اُردو کی ترویج پر زور دیا گیا اور گورنمنٹ سے اُردو کی عام تعلیم کا بندوبست کرنے، اُردو ٹریننگ اسکول قائم کرنے اور ڈھاکہ یونیورسٹی میں اُردو میں ایم۔اے کا امتحان جاری کرنے کی استدعا کی گئی۔ مارچ ۱۹۳۹ء میں مسلم لیگ کانفرنس کے موقع پر گورکھپور میں بھی ایک دھوم دھامی کانفرنس ہوئی۔ جسمیں اُردو کے متعلق کئی مُفید ریزولیوشن پاس ہوئے۔

ہمارے دوست سید محمد محمود صاحب رضوی مخمور کی کوشش سے آگرہ میں ۲ سال سے ہندستانی زبان کے نامور شاعر میاں نظیر اکبرآبادی کی یادگار میں ایک "نظیر اکیڈیمی" قائم ہے جس کے صدر رائے صاحب پنڈت برج ناتھ شرما اور سکرٹری منشی انتظام اللہ صاحب ہیں۔ امسال ۲۵ جنوری کو بسنت کے دن میاں نظیر کی مزار پر بڑے دھوم دھام سے "یوم نظیر" منایا گیا۔ اور ڈھائی ہزار کے قریب ہندو مسلمان معززین نے دیر تک بڑے شوق سے نظیر کا کلام سُنا۔

حال میں گورنمنٹ صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کے محکمہ اطلاعات نے زبان کے مسئلہ پر ایک مفصل پمفلٹ شائع کیا ہے جسمیں ان غلط فہمیوں کی پُر زور تردید کی گئی ہے جو اس بارہ میں موجودہ وزارت کے خلاف پھیلائی جارہی ہیں۔ اس پمفلٹ میں اس الزام کو کہ حکومت صوبہ متحدہ اُردو کے مقابلے میں ہندی کو ترجیح دیتی ہے یا اُردو کو فنا کرنیکی کوشش کررہی ہے "سرتاپا غلط" قرار دیا گیا ہے اور لکھا گیا ہے کہ حکومت نے کبھی ہندی کو اُردو پر ترجیح نہیں دی بلکہ بعض موقعوں پر اُس نے اُردو ہی کو ترجیح دی ہے۔

یہ ضرور ہے کہ کانگریس گورنمنٹ کی پالسی "ہندستانی زبان" کی ترویج ہے مگر ہندستانی زبان سے حکومت کی مراد ایسی زبان سے ہے جو اُردو و ہندی دونوں رسم الخط میں لکھی جائے اور جسمیں حتی الامکان عربی اور سنسکرت دونوں کے ثقیل اور نامانوس الفاظ نہ آنے پائیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس باضابطہ اعلان کے بعد حامیانِ اُردو کو گورنمنٹ کی طرف سے کوئی بدگمانی باقی نہ رہنا چاہیئے، خصوصاً جبکہ اسمبلی کی روئداد اور پرچہ کاروائی وغیرہ تمام سرکاری کاغذات اُردو میں بھی شائع ہوتے ہیں۔ ممبران اسمبلی کے سوالات کے متعلق گورنمنٹ کا رویہ یہ ہے کہ جس زبان میں سوال کیا جاتا ہے، حکومت کی طرف سے حتی الامکان اسی زبان میں اس کا جواب دیا جاتا ہے۔ دیہاتی کتب خانوں کے سلسلہ میں گورنمنٹ نے تقریباً بیس ہزار روپیہ قیمت کی

مزید اُردو کتابیں خریدی ہیں۔

پانی پت میں مولانا حالیؔ کی یادگار میں ایک حالی اکیڈیمی ہوئی ہے۔ جس کے صدر خواجہ امیرؔ احمد صاحب انصاری بی۔ اے منتخب ہوئے ہیں۔ علمی، ادبی اور تاریخی کتابوں کی اشاعت کے علاوہ ایک عمدہ لائبریری اور دارالمطالعہ کا قائم کرنا اِس اکیڈیمی کا خاص مقصد ہے۔

---

۱۲ فروری کو منشی مہاراج بہادر صاحب برقؔ دہلوی کے علمی احسانات کی یاد تازہ کرنے کی غرض سے چاوڑی بازار دہلی میں ایک یادگاری مشاعرہ ہوا۔

اِس نمبر کے ساتھ ہم اپنے مکرم رفیق مسٹر سنت پرشاد ایم۔ اے مدہوشؔ کا متفرق کلام اور اُنکی تازہ تصویر ہدیۂ ناظرین زمانہ کر رہے ہیں۔ مدہوشؔ صاحب اُردو ہندی کے علاوہ انگریزی اور فارسی ادب میں بھی کامل دستگاہ رکھتے ہیں۔ تصوف سے آپ کو اتنا شغف ہے کہ ہر وقت نانکؔ۔ کبیرؔ۔ سرمدؔ۔ حافظؔ۔ شمس تبریزؔ اور مولانا رومؔ وغیرہ صوفیائے کرام کا کلام آپ کے زیر مطالعہ رہتا ہے۔ مثنوی مولانا رومؔ کے تو آپ فاضل کامل ہیں۔ جس ذوق سلیم و ادبی تحقیق کے ساتھ آپ نے مثنویؔ کو بار بار پڑھا ہے اُس کی مثال آپ کے ہم عمر معاصرین میں شاذ و نادر ہی ملیگی۔ بہرحال اسی تحقیق و مطالعہ کی برکت کہ آپ کے کلام میں انسانیت و روحانیت بھری ہوتی ہے۔ حضرت مدہوشؔ کی شاعری کا انداز محض عاشقانہ نہیں بلکہ والہانہ ہوتا ہے۔ وہ شاید ہی کبھی قصداً شعر کہنے کیلئے بیٹھتے ہوں بلکہ جب اُن کے قلب پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی ہے یا اُن کے دلِ دردمند پر کوئی چوٹ لگتی ہے تو اُن کے جذبات خودبخود اشعار بن جاتے ہیں۔ اسی لئے اُن کے کلام میں وہ سب خصوصیات موجود رہتی ہیں۔ جنھیں مشہور نقادِ سخن حضرت فراقؔ سپردگی، خستگی اور گداز سے تعبیر کرتے ہیں۔

حضرت مدہوشؔ واقعاتِ دُنیا کا بھی گہرا مطالعہ کرتے رہتے ہیں اور زمانہ کے مستقل معاون ہیں۔ قریب قریب اس کے ہر نمبر کے لئے آپ کچھ نہ کچھ بھیجتے رہتے ہیں۔ ہم کو آپ کی ذات سے آیندہ کے لئے بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ ہیں، آپ زمانہ کی روایات کی دِل سے قدر کرتے ہیں اور اس کے اغراض و مقاصد سے سچی ہمدردی رکھتے ہیں۔

اِس نمبر میں ہم اٹھارویں صدی کے عہد مغلیہ کے فن مصوری کا ایک دلکش نمونہ بھی ہدیہ ناظرین کر رہے ہیں۔ اصل تصویر لندن کے مشہور و معروف برٹش عجائب خانہ میں ہے۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ یہ بیجاپور کی نامور ملکہ چاند بی بیؔ کی تصویر ہے۔

زمانہ

جلد ۷۲ مئی ۱۹۳۹ء نمبر ۵

اقبال اور تصوّف

(از ولی کمال خاں ملیح آبادی، بی۔اے)

اس میں کوئی کلام نہیں کہ اقبال بہت بلند پایہ شاعر اور عظیم المرتبت مفکر تھے، بعض حضرات کو شاید اس بات کے تسلیم کرنے میں پس و پیش ہو کہ وہ علوم روحانی کے معلم اور اسرار باطنی کے حکیم بھی تھے، اور انھیں روحانیت کی گہرائیاں معلوم اور رموز مخفی سے بخوبی آگاہی تھی۔

اقبال کی شاعری علم و حکمت کی شاعری ہے، ان کا کلام تفکر و تعقل کے ان نتائج کا مجموعہ ہے جن میں پیامات گوناگوں کے دوش بدوش عالم ملکوت و لاہوت کے وہ مخفی امور اور دنیائے روحانیت کی وہ بدیہی باتیں نظم کی گئی ہیں جو ضمیر کو آلایشوں سے صاف، قلب کو روحانی کثافتوں سے پاک کرنے والی ہیں، اور جو نہ صرف نجات بلکہ صافی ضمیر انسان اور مرد باخدا میں وہ ذوق و ولولہ پیدا کرتی ہیں کہ وہ خود پکار اُٹھے کہ:۔

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں   کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

اقبال سے پہلے بہت سے ایسے شعراء گذرے ہیں جو مسائل تصوف کو اپنی شاعری میں جگہ دیتے رہے ہیں، مثلاً فارسی میں خواجہ حافظ، خواجہ عطار، مولوی جامی، وغیرہ وغیرہ اور اردو میں ولی دکنی، جان جاناں مظہر، سودا، درد، اثر، میر، امیر، غالب وغیرہ وغیرہ، انہوں نے تصوف کے بنیادی مسائل مثلاً مسئلہ وحدت الوجود، طریقت کے مسائل، معرفت کے امور، تسلیم و رضا کی تلقین، صبر و قناعت کی ہدایت

ترک دنیا کا خیال، سکون قلب کی تدابیر، آفرینش کائنات کی حقیقت، کن فیکون کا مفہوم، حسن وعشق کے رموز، طور و موسیٰ کی کہانی، دنیائے فانی کی بے حقیقتی و بے ثباتی، موت و حیات، ذاتِ حق کی قدامت، قبض و مراقبہ، غیب و شہود، وجودِ مطلق کے اوصاف، وجودِ مقید کی بے مائگی، حُسن ازل کی جھلک، یوم الست کا وعدہ و پیمان، تزکیۂ نفس کی اہمیت، تجلیات باری کا ظہور، "ہمہ اوست" کی فلاسفی۔ غرض یہ اور اسی نوع کے دیگر مسائل کو بحسن و خوبی نظم کیا۔ لیکن اُن کا رسمی تصوّف (بہ استثنائے چند) وہ رواجی تصوّف ہے جس میں رنگ و بو ہے نہ کیف و مستی، اس لئے اُن کے کلام میں وہ گہری تاثیر اور دائمی اثر نہیں (جو اقبال کی شاعری کو حاصل ہے) لیکن اس کے برخلاف اقبال نے جو کچھ کہا وہ ذاتی اور آزاد فکر کا نتیجہ ہے۔ اُن کے کلام میں عام تصوف کے پہلو بہ پہلو ذاتی فکر کی روشنی اور شخصی اجتہاد کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔

ان امتیازی خصوصیات کے کئی اسباب ہیں:۔

اوّل یہ کہ اقبال نے مولانا جلال الدین رومی کی پیروی کی ہے، جن کی مثنوی کی شان میں کہا گیا ہے کہ ع "ہست قرآں در زبانِ پہلوی"

اور جن کے متعلق خود اقبال "پیام مشرق" میں یوں کہتے ہیں:۔

مرشدِ رومی حکیمِ پاک زاد ۔۔۔ سرِ مرگ و زندگی بر ما کشاد

اقبال نے اپنے تمام اُردو فارسی کلام میں مولانا سے فیض حاصل کیا ہے، "اسرارِ خودی" و "رموزِ بے خودی" میں بھی جو اقبال کے بہترین فارسی شاہکار ہیں، "سلطان العارفین" کی فیض بخشی کو بڑا دخل ہے۔ معرفت کے رموز، تصوف کے اسباق، اور مرگ و زندگی کے اسرار اقبال کو اسی حکیم سے معلوم ہوئے ہیں۔

یہ ضرور ہے کہ اقبال کو شروع ہی سے حقیقت کی تلاش اور معرفت کی جستجو تھی، اُن کی طبیعت کی افتاد شروع ہی سے اس طرف مائل تھی۔ فطرت نے شروع ہی سے اُن کو صوفی کا دل، فلسفی کا دماغ، اور قلندر کا وجدان سلیم عطا کیا تھا۔ اسی لئے وہ ہمیشہ طلبِ نور میں کوشاں اور حقیقت کاملہ کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

نور کا طالب ہوں، گھبراتا ہوں اِس بستی میں مَیں ۔۔۔ طفلکِ سیماب پا ہوں، مکتبِ ہستی میں مَیں

دیدارِ جلوۂ حق کی تمنّا کے متعلق ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:۔

ڈھونڈھتی ہیں جس کو آنکھیں وہ تماشا چاہیے چشم باطن جس سے کھل جائے وہ جلوا چاہیے
آرزو نورِ حقیقت کی ہمارے دل میں ہے لیلئ ذوقِ طلب کا گھر اسی محمل میں ہے

اِن اسباب کے نتیجہ میں اقبال کو یہ بات معلوم ہو گئی کہ۔

جنھیں میں ڈھونڈھتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

گویا اُس کو اس حقیقت کا پتہ چلا کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ یہ وہ حقیقت ہے جس کو الفاظ کی مختلف شکلوں میں صوفی اور ویدانتی، راہب اور پادری سبھوں نے تسلیم کیا ہے، اور جو صدق بسیط کا درجہ حاصل کر چکی ہے اور وہ حقیقتِ کبریٰ جس کو ادیانِ عالم اور فلسفہ ویدانت و تصوف میں تسلیم کیا جا چکا ہے، روحانیت کی وہ منزل ہے جہاں سے روحانی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔

بہرحال منزل پر جا کر اقبال کو یہ معلوم ہوا کہ :۔

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے

دوسری منزل پر سالک کو صرف یہ معلوم ہوا کہ " وہ آپ ہی گویا مسافر آپ ہی منزل میں ہے"۔ لیکن معمہ پھر بھی نہ کھلا :۔

ڈھونڈھتا پھرتا ہوں اے اقبال اپنے آپکو آپ ہی گویا مسافر آپ ہی منزل میں ہوں

تلاش حق کی دشوار گذار گھاٹیوں میں گذرنے کے بعد جب عالمِ ناسوت کے اس نووارد راہ رو کو رمز ہستی سے آگاہی نہیں ہوتی تو وہ شعر کی زبان میں کہتا ہے :۔

مَیں حُسن ہوں کہ عشق سراپا گداز ہوں کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں
پریشاں ہوں میں مشتِ خاک لیکن کچھ نہیں کھلتا سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں یا گردِ کدورت ہوں

افسوس ہے کہ انسان نے اپنی ہستی و مقصدِ ہستی کو نہ جانا اور اُس نے اپنے کو نہ پہچانا ورنہ اُس کو معلوم ہوتا کہ وہ کیا ہے، کہاں ہے، کیسا خزانۂ مخفی ہے، اور اُس کی قدر و قیمت کیا ہے۔ وہ اپنی حقیقت سے ناآشنا ہے، اور اسی لئے اقبال جن کی شاعری "جزو لیست از پیغمبری" کے مرادف ہے حق کی تلاش کرنے والوں سے پیمبرانہ خطابت کے لب و لہجہ میں، ہدایت و سلامتی کی راہ سے ہستی اور مقصدِ ہستی کو یوں واضح کرتے ہیں :۔

یہ سب کچھ ہے مگر ہستی مری مقصد ہے قدرت کا سراپا نور ہو جس کی حقیقت، میں وہ ظلمت ہوں
خزینہ ہوں چھپایا مجھ کو مشتِ خاکِ صحرا نے کسی کو کیا خبر ہے میں کہاں کی کس کی دولت ہوں
نظر میری نہیں ممنونِ سیرِ عرصۂ ہستی میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں

نہ صہبا ہوں نہ ساقی ہوں نہ مینا ہوں نہ پیمانہ میں اِس مئے خانۂ ہستی میں ہر شئے کی حقیقت ہوں

معمۂ ہستی کے معلوم ہو جانے پر انسان کو اُس کی حقیقت صاف صاف یوں بتاتے ہیں:۔

آہ کس کی جستجو دیوانہ رکھتی ہے تجھے راہ تو، رہرو بھی تو، رہبر بھی تو منزل بھی تو
آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا دانہ تو کھیتی بھی تو، باراں بھی تو حاصل بھی تو
کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا؟ ناخدا تو، بحر تو، باراں بھی تو، ساحل بھی تو
دیکھ آکر کوچۂ چاکِ گریباں بھی کبھی قیس تو، لیلےٰ بھی تو، صحرا بھی تو، محمل بھی تو
وائے نادانی کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو محفل بھی تو

"محتاجِ ساقی" ہونے کے کئی سبب ہیں :۔ تلاشِ حق سے بے پروائی، ذوقِ طلب کا فقدان، داخلی حکمت یعنی حکمتِ باطنی سے لاعلمی اور خاصکر یہ کہ ہر بات سے بے توجہ ہو جانا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حسینانِ جہاں کی دامِ زلف میں گرفتار ہو کر ایسا پھنسا کہ نہ نفس کی معرفت ہو سکی اور نہ اس قابل بنا کہ آئینۂ دل میں اپنی ہستی کا مشاہدہ کر سکے۔

فدا کرتا رہا دل کو حسینوں کی اداؤں پر مگر دیکھی نہ اس آئینہ میں اپنی ادا تو نے

غافل انسان اگر اپنی وسعتِ بے پایاں سے آگاہ ہوتا تو اُسے معلوم ہوتا کہ اگرچہ وہ قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے"

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ، اے غافل کہ تو قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
سینہ ہے تیرا امین اُس کے پیامِ ناز کا جو نظامِ دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے

احساسِ اصلیت کی شدت سالک کو عام طور سے، ذاتِ حق میں محو کر کے امورِ دنیا سے بے نیاز اور لذائذ دنیا سے بے پروا بنا دیتی ہے۔ یہ وہ منزل ہے جہاں سالک رفتہ رفتہ ہی پہونچتا ہے۔ اور اس منزل کا طے کر لینا ایک مبارک بات ہے۔ اس لئے کہ یہ اس بات کی علامت و دلیل ہے کہ سالک کو عرفانِ ربانی سے قدرے قلیل آگاہی ہو گئی، جس کے سبب سے وہ ذاتِ حق میں محو ہو کر امورِ دنیا سے بے پروا ہو سکتا ہے۔ اسی لئے دنیائے تصوف میں "تسلیم و رضا" کی ایک مستقل منزل ہے جہاں پہونچکر سالک میں استغنا اور بے نیازی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ دنیا سے منھ موڑ کر حق کی تسلیم اور رضائے الٰہی پر قانع ہو جاتا ہے۔ دیکھا یہ جاتا ہے کہ عام طور سے صوفی اور ویدانتی، سادھو اور ست سنگی، اس منزل پر پہونچکر خود بھی ترکِ دنیا کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور دوسروں کو بھی یہی تلقین کرتے ہیں

اقبال کو اِس بات سے اتفاق نہیں، وہ استغنا و قناعت کو مناسب تو سمجھتے ہیں لیکن ترکِ دُنیا کو "رہبانیت" جانتے ہیں، اور اُن کو اس سے اتفاق نہیں۔ وہ مجتہد ہیں اور اربابِ تصوف کی ہر کورانہ تقلید کے قائل نہیں، ترکِ دنیا کی وہ مذمت کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ترکِ لذائذ پر زور دیتے ہیں، وہ درحقیقت حرصِ لذائذِ دنیا کو پسند نہیں کرتے۔ خدا کی نعمتوں کا استعمال اور اُن سے لطف اندوزی بُری بات نہیں لیکن لذائذ کے خوشنما بھوتوں، بزم گاہِ عالم کی ہنگامہ آرائیوں، اور بوالہوس کے بھنور میں پڑ کر اپنے حقیقی مقصد کو فوت نہ کرنا چاہیئے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو دامِ بوالہوسی میں گرفتار نہیں ہوتے، اور خوش نصیب ہیں وہ اشخاص جو مادی و دنیوی چکروں کی بھول بھلیّوں میں جانا نہیں چاہتے۔ اقبال اس چکر میں پڑ چکے ہیں، مگر کچھ عرصہ کے بعد اس بھول بھلیاں اور کال کوٹھری سے نجات پائی اور اس کی کہانی یوں سنائی

رخصت اے بزمِ جہاں سوئے وطن جاتا ہوں میں　　آہ! اس آباد ویرانے میں گھبراتا ہوں میں

گو بڑی لذت تری ہنگامہ آرائی میں ہے　　اجنبیت سی مگر تیری شناسائی میں ہے

مدتوں بیٹھا ترے ہنگامۂ عشرت میں مَیں　　روشنی کی جستجو کرتا رہا ظلمت میں مَیں

چشمِ حیراں ڈھونڈتی اب اور نظارہ کو ہے　　آرزو ساحل کی مجھ طوفان کے مارے کو ہے

اقبال منازلِ روحانیت کو "عشقِ الٰہی" کی رہبری میں طے کرتے ہیں، اور یہی اُن کا روحانی مسلک ہے۔ اُن کو کائنات کی ہر چیز سے عشق ہے، وہ محبتِ خداوندی و اُنسِ ربانی کے معترف ہیں۔ ربّانی محبت (Divine Love) کی بدولت دل کے آئینہ میں نئے نئے جوہر پیدا ہوتے ہیں، جن کی قیمت کونین اور ارض و سما کی مجموعی قیمت سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ اس کے فائدے بے شمار ہیں۔ نئے نئے جوہر آئینۂ دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ محبت کے اثر سے دل پرنور اور عشقِ الٰہی سے سراپا نور ہو جاتا ہے۔ اور وہ خود ایک شمع فروزاں ہے۔ لہٰذا اقبال روحانیت کی منزلوں کو عشقِ الٰہی کی رہبری میں طے کرنے کا مشورہ دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ عشق کو آباد کر کے دل کو "پریم نگر" بناؤ تاکہ یہ دولت حاصل ہو۔

نہ چھپا چھپا کے تو رکھ اسے، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

اِس کے بیشمار فائدوں میں سے دو ایک یہ ہیں:-

جب سے آباد ہوا عشق مرے سینہ میں　　نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینہ میں

محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے ذرا سے بیج سے پیدا ریاضِ طور ہوتا ہے
جلانا دل کا ہے گویا سراپا نور ہو جانا یہ پروانہ جو سوزاں ہے تو شمعِ انجمن بھی ہے

یہی عشق اقبال کو دنیائے الوہیت کی اُس نا معلوم منزل پر پہونچا دیتا ہے جہاں اسمار و اشکال کے چہروں کی نقابیں اُٹھی ہوئی ہیں، جہاں خیر ہے نہ شر، پستی ہے نہ بلندی، موت ہے نہ حیات، روح ہے نہ مادّہ، امتیازِ بندہ ہے نہ خدا، اور جہاں روح، حیاتِ ابدی کی آغوش میں سُرور و مسرّت کی سانسیں لے کر سو جاتی ہے۔ اِسی مقام پر پہونچکر جہاں استغنائے ربّانی انسان میں سما جیس مارتا ہے۔ اقبال نے یہ کہا تھا کہ:۔

خدا کے پاک بندوں کو غلامی میں حکومت میں زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا

اور اسی بلندی سے کرشن جی نے یہ دلکش راگ سنایا تھا کہ:۔

صبحِ ازل جو حُسن ہوا دلستانِ عشق آواز کن ہوئی تپش آموز جانِ عشق
مجھ سے خبر نہ پوچھ، حجابِ وجود کی، شامِ فراق صبح تھی میرے نمود کی

تصورات روح و ازل

روح و ازل کے تصوّر کو تصوّف اور ویدانت میں بڑی شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ویدانتی یعنی ویدانت کے فلسفہ کے جاننے والے تسلیم کرتے ہیں کہ "آتما اور پرماتما کی اصل ایک ہے۔ فلسفۂ تصوف (یا Mysticism) کے ماننے والے بھی یہی کہتے ہیں کہ خدا اور بندہ دونوں کی روح ایک ہے، اور دونوں کے خواص بھی ایک ہیں، صرف فرق اتنا ہے کہ پرماتما کا "وجود" "وجودِ کامل" ہے اور ہمارا "وجودِ مقیّد" دونوں ایک ہی نور سے ہیں،

"ایک چھپنے کے لئے ایک نکلنے کے لئے"

وہ کہتے ہیں کہ ہماری آمد سے جو "دوئی" ہم میں اور "اُس" میں قائم ہوگئی ہے وہ مادشما کی تفریق کا نتیجہ ہے۔ ورنہ تو ہیں دونوں ایک ہی ہیں، دونوں کے اوصاف[1] بھی بڑی حد تک یکساں ہیں۔ حتیٰ کہ خالق نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا، جیساکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ "اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا"۔ اِسی لئے آنحضرت ؐ کے ذریعہ یہ تلقین ہوئی ہے کہ "پیدا کرو اپنے میں خدائی صفات"۔ کیونکہ دونوں کی اصل ایک ہے لہٰذا اوصاف بھی یکساں ہونا چاہیئے۔

علیسائیت کا مسئلہ تثلیث (Trinity of God) بھی حضرت مسیح کے وسیلہ سے روحِ الٰہی کا جسمِ انسانی میں آنا امرِ حق قرار دیتا ہے۔ اس کا "تجسّمِ خداوندی" پر عقیدہ Faith in Incarnation of God

[1] Attributes

اسی حقیقت کا مخفی اور غیر ملفوظ اظہار ہے کہ روح انسانی = آتما ایک ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ اس کو شریعت کی سخت گیری کے سبب سے نہ کہیں

ہندوؤں کا اوتار کا عقیدہ بھی اسی امر کا بیّن ثبوت ہے کہ وہ بھی دونوں کی اصل ایک ہی مانتے ہیں۔ حال کے رشی مُنی اور باخدا لوگ مثلاً سوامی رام تیرتھ، سوامی ویکانند اور سوامی رام کرشن اور رادھا سوامی جی کے چیلے بھی اُس "میں اور ہم" میں، کیا بہ اعتبار اصل اور کیا باعتبار اوصاف، ایک دائمی اور گہری وحدت کو تسلیم کرتے ہیں، اور اسی لئے پرماتما سے آتما کے نوشتے کو بہت ہی گہرا جانتے ہیں۔

بہر حال سب یہی مانتے ہیں کہ روح آفتاب حیات کی وہ لافانی کرن ہے جو اپنے مصدر کے تمام اوصاف پر حاوی ہے، اور دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ وہ قطرہ ہے جو اپنے سمندر میں ایک نہ ایک دن ضرور جا ملے گا۔ سمندر کے پانی کے سب خواص اس قطرہ میں بند ہیں اور در حقیقت دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھکر اقبال کے اشعار بالا پر غور کر کے فیصلہ کیجئے کہ روز ازل یعنی یوم الست کے باریک مسئلہ کو جو تمام مذہبوں کی حکمت روحانی میں (خواہ وہ ہندو دھرم ہو یا عیسائیت، اسلام ہو یا بُدھ مت، ویدانتی فلسفہ ہو یا تصوف) بڑی حد تک مشترک ہے کس پاکیزہ انداز بیان و ادائے مطلب کے ساتھ نظم کیا گیا ہے، خصوصاً یہ شعر:-

مجھ سے خبر نہ پوچھ حجاب وجود کی شام فراق صبح ہے میرے نمود کی

انگریزی کے نامور شاعر کوپر کا خیال تھا کہ

"A soul in all things and that soul is God."

(ایک ہی روح سب چیزوں میں ہے اور وہ روح خدا ہے) صوفی اور ویدانتی دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ کائنات کی ہر شئے، دریا کے ہر قطرے، ریگستان کے ہر ذرّہ، پہاڑ کی ہر کنکری اور سنسار کی ہر چیز میں ایک روح ہے، اور وہی روح تمام کائنات پر حاوی و کارفرما ہے۔ اسی کو صوفی "ہمہ اوست" جانتا ہے۔ اور "ہمہ از اوست" کا کہنے والا "مظہر خدا" کہتا ہے۔ (کیونکہ شریعت ذوق تکلم کی گریباں گیر ہے لہذا پابند شریعت اپنے دل کا مطلب استعاروں میں چھپاتا ہے) وہ روح ظاہر میں ہے اور باطن میں، نمایاں اور پنہاں دونوں ہے۔ وہی ہویدا ہے وہی پوشیدہ، وہی اول اور وہی آخر ہے۔

روح واحد کا یہ تصور اصطلاح تصوف میں "ہمہ اوست" کا مسئلہ ہے۔ وحدت کا کثرت میں نمایاں ہونا اور اشیاء کائنات کی کثرت میں روح کی وحدت اسی کا نام ہے۔ سادھو بھی اس کو مانتا ہے اور ویدانتی بھی، صوفی بھی اس کا معترف ہے اور سنیاسی بھی، روحانیت کے مختلف مسائل کی طرح اس میں کوئی تفریق نہیں

"مسئلہ وحدت الوجود بھی اس سے ملتا جلتا مسئلہ ہے، اس پر بھی ویدانتی وشواش اور صوفی یقین رکھتا ہے کہ کائنات کی ہر شے میں روح کی وحدانیت اور یکتائی پائی جاتی ہے۔

فارسی کے بڑے بڑے صوفی شعراء مثلاً مولانا روم، شمس تبریز، خواجہ فریدالدین عطار اور سرمد وغیرہ نے اس پر دل کھول کر طبع آزمائی کی۔ اُن کی حکیمانہ شاعری سے آج بھی فارسی منور اور روشن ہے، اُردو کو اس تجلی کی ضرورت تھی، یہاں تک کہ وہی روح کارفرما، جو ہر شے میں رواں دواں ہے، پیکر اقبال میں رونما ہوئی اور اپنی اصلیت کو بیان کرنے لگی:۔

کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی　　جگنو میں جو چمک ہے، وہ پھول میں مہک ہے
حسن ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے　　انساں میں وہ سخن ہے، غنچہ میں وہ چٹک ہے
یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا　　واں چاندنی ہے جو کچھ، یاں درد کی کسک ہے
انداز گفتگو نے دھوکے دیئے ہیں ورنہ　　نغمہ ہے بوئے بلبل، بو، پھول کی چہک ہے
یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو　　ہر شے میں جبکہ پنہاں خاموشی ازل ہے

اسی خیال کو ایک دوسری جگہ حمد باری کے رنگ میں حدود شریعت میں رہتے ہوئے یوں ادا کیا ہے

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی　　پروانہ کو تپش دی جگنو کو روشنی دی
رنگیں نوا بنایا مرغان بے نوا کو　　گل کو زبان دے کر تعلیم خامشی دی
نظارہ شفق کی خوبی زوال میں تھی　　چمکا کے اس پری کو تھوڑی سی زندگی دی
سایہ دیا شجر کو، پرواز دی ہوا کو　　پہنا کے لال جوڑا شبنم کو آرسی دی
سایہ دیا شجر کو، پرواز دی ہوا کو　　پانی کو دی روانی موجوں کو بیکلی دی

حق کی جھلک ہر شے میں نمایاں ہے، اس کی تجلی، پھل، پھول، پتھر، شجر، دریا، پانی، پہاڑ، کنکر، آسمان، زمین، ہوا، چاند، سورج، تارے، غرض ہر چیز سے ہویدا ہے۔ وہ تجلی سب میں حق کے دیکھنے والے کو حق ہی میں نظر آتی ہے۔

حسن ازل ہر شے میں ہویدا ہے، فیض حسن کا مصدر ایک اور صرف ایک ہے، گل رنگین

"شمع" "بچہ اور شمع" وغیرہ سے اقبال کا یہ خیال پوری طرح واضح ہوتا ہے۔ اور اسی نوع کی نظموں سے ان کا صوفیانہ کردار اور روحانی تخئیل آشکارا ہو جاتے ہیں۔

چمک تیری عیاں بجلی میں آتش میں شرارے میں جھلک تیری ہویدا چاند میں سورج میں تارے میں
جو ہے بیدار انساں میں وہ گہری نیند سوتا ہے شجر میں پھول میں حیواں میں پتھر میں شرارے میں

حسن ازل ہر شے میں ہویدا ہے:۔

حسن ازل ہے پیدا تاروں کی دلبری میں جس طرح عکس گل ہو شبنم کی آرسی میں

مصدر فیض حسن ایک ہی ہے:۔

وہیں سے رات کو ظلمت ملی ہے چمک پائی ہے تارے نے جہاں سے

اقبال روحانی مجتہد ہیں، تصوف میں اُنھوں نے بہت بلند اور وقیع اجتہاد کیا ہے، ان کے کلام میں کورانہ تقلید اور مقلدانہ عقائد کے بجائے شخصی اجتہاد کی جھلک اور آزاد فکر کا رنگ صاف چمکتا نظر آتا ہے۔ "بال جبریل" کو (جو کوئی پرانی تصنیف نہیں ہے) اُٹھا کر دیکھئے تو اس حقیقت کا پتہ چلے گا "ضرب کلیم" میں تو صاف طور پر حکیمانہ انداز نمایاں ہے۔ "مولوی" کو بھی ڈانٹا ہے اور "صوفی" کو بھی۔ دونوں کو ملامت کی ہے کہ "حرام خوری" سے باز آؤ اور راہ حق دکھاؤ۔ صوفی پر افسوس کیا ہے کہ اُس نے قوم کی لُٹیا ڈبو دی۔ کہا تو یہ کہ روحانی اصلاح و ترقی ہمارا مسلک ہے لیکن ترکِ دنیا اور رہبانیت کی وہ افیون کھلائی کہ قوائے عمل مفلوج اور قوائے ذہن معطل ہو کر رہ گئے۔ اور دوسروں کو یہ کہنے کا موقع دیا کہ "مذہب عوام کے لئے افیون ہے۔" حالانکہ حقیقی دین اور سچا دھرم عین عمل اور یکسر زندگی ہے۔

اپنی تصنیفات میں اقبال نے ایک دو جگہ نہیں بار بار ملامت کی ہے اور سکھایا ہے کہ للہ سیدھی راہ پر آؤ، قوم کو سیدھا رستہ دکھاؤ اور کھوکھلی صوفیت اور بے روح تصوف سے باز آؤ۔ قوائے عمل پیدا کرو، اور ملت مرحومہ کو زندگی کا پیام اور حیات و خودی کا درس دے کر جسدِ بے روح میں حیاتِ تازہ پیدا کر دو۔

خود اقبال نے اپنے اجتہاد کی بنیاد کو عقل اور دل اور ہر دو کے ثمر یعنی تنقید اور عشق پر قائم کیا ہے۔ لیکن عشق و دل کا عنصر غالب ہے۔ عقل و دل سے کیا مراد ہے، سنئیے!

عشق الٰہی کی راہ میں قدم زن ہونے سے پہلے عقل اور دل دو مصاحب انسان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ یہ دو مختلف چیزیں ہیں۔ دونوں کے کام اور خواص بھی مختلف ہیں۔ "عقل" کی پیداوار

"عقلیت" ہے جو "شعور" کی شکل میں، اور دل کا ثمر "عشق" مجنون و وارفتگی کی شکل میں نمایاں ہوتا ہے۔ مادّی اور دنیوی معاملات میں ضرورتِ عقل مسلّم سہی، لیکن پھر بھی اس عالمِ مادّیت میں ایسی چیزیں بھی موجود ہیں۔ جن میں عقل معطّل، اُس کی رہنمائی بے کار اور عقلیت کے استدلالات نتیجہ میں بے معنی ٹھہرتے ہیں۔

اِس میں شک نہیں کہ آج سے چند قرن قبل بیشتر مغربی مفکّرین کا خیال تھا کہ عقل ہی تمام حقایق کا ادراک کرتی ہے۔ اور وہی حقیقت کاملہ کے ادراک کا سب سے اچھا وسیلہ ہے لیکن بعد میں یہ معلوم ہوا کہ نظر نہ آنے والی چیزوں و اُمورِ روحانی کا صحیح ادراک کرنے والی ایک اور شئے بھی ہے جس کو اصطلاحِ خواص میں "وجدانِ سلیم" یعنی (*Pure Intuition.*) اور عرفِ عام میں "دل" کہتے ہیں۔ یوں تو عقل و دل یعنی "عقلیت و وجدان" کا یہ باریک مسئلہ نازک مزاج اور باریک بیں مفکرین کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ لیکن سب سے پہلے دین و فلسفہ کو ایک کرنے والے امام غزالی نے اس کی طرف توجہ کی۔ عرصہ ہوا کہ اُنھوں نے یہ بتایا کہ حقیقتِ کاملہ یعنی (*Perfect Reality*) کے ادراک کا صحیح وسیلہ "عقل انسانی" (*Human Reason*) ہرگز نہیں ہو سکتی۔ اس کی بنیاد درحقیقت "وجدانِ سلیم" (*Pure Intuition*) ہے۔

اقبال بھی امام مذکور کی طرح عقل کی رہنمائی کو ناقص ٹھہراتے ہیں اور اس کے بجائے "وجدان" کو بہتر خیال کرتے ہیں، جس کی رہنمائی میں انسان حکمت و شعور کے سدرۃ المنتہیٰ تک جا پہونچتا ہے۔ اور جہاں اگر عقل جانا بھی چاہے تو یقیناً ٹھوکریں کھائے۔ اس لئے کہ عقل کا واسطہ محض مظاہر سے ہے وہ "خدا جُو" اور اکتسابِ علمِ ظاہری کا وسیلہ ہے۔ لیکن دل معلّمِ حقایق اور باطن آشنا ہے۔ عرفانِ ربّانی کا اُسی سے پتہ چلتا ہے اور اُسی کے ذریعہ حق کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ وہ "خدا جُو" نہیں "خدا نُما" ہے، زمان و مکان سے رشتہ بپا نہیں طائرِ سدرہ آشنا ہے اور "ربِّ جلیل کا عرش"

"دل" یہی باتیں، عقل سے مخاطب ہو کر یوں کہتا ہے۔ (معرکۂ عقل و دل)

ہے تجھے واسطہ مظاہر سے — اور باطن سے آشنا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے — تو خُدا جُو، خُدا نُما ہوں میں
تو زمان و مکاں سے رشتہ بپا — طائرِ سدرہ آشنا ہوں میں
کس بلندی پہ ہے مقام مرا — عرشِ ربِّ جلیل کا ہوں میں

دل کے کارنامے بڑے بڑے ہیں، یہی وہ 'دل' ہے جس نے مہاراج کرشن کو میدان کارزار میں پہونچا دیا، رام چندر جی کو بن کی سیر کرائی، حضرت ابراہیمؑ کو آتش زار نمرود میں پہونچا دیا، رسول اکرمؐ کو غزوات و مدینہ میں کھڑا کیا۔ امیرالمؤمنین علیؑ کو خیبر شکن بنایا، امام حسینؑ کو شہادتِ عظیم دی اور پیکرِ صبر و رضا کر دکھایا:۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اِس لئے اِس بات کی ضرورت ہے کہ عقل کے مقابل میں دل کی رہنمائی کو مقدم مانا جائے اور عشق کو تنقید کا پابند بنانے کے بجائے تنقید کو محکومِ عشق ہونا چاہیئے تاکہ "عالمانہ رندی" اور "حاکمانہ کیف و مستی" پیدا ہو۔

عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی
پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل

عشق کو عقل کے چکروں میں دھڑا ایئے ورنہ دلائل کی بھول بھلیاں میں پڑکر سیدھا رستہ گم ہو جائیگا قلب کو تنقید سے آزاد کیجیئے اور اعمال کی بنیاد تنقید محض کے بجائے عشق پر قائم کیجیے پھر دیکھیے کہ کیسے کیسے جوہر آپ میں پیدا ہوتے ہیں۔

عشق پر اعمال کی بُنیاد رکھ
عقل کو تنقید سے فرصت نہیں

اِس میں شک نہیں کہ عقل "ہستیِ غائب" پر کبھی کبھی نکتہ چینی کرتی ہے اور اپنی محدود قوتِ فکر کے بل بوتے پر اُس کے وجود میں شک لانے لگتی ہے، لیکن یہی عشق اور یہی دل بتاتا ہے کہ نظام کائنات کے پسِ پردہ ضرور ایک غالب ترین قوت ہے۔ جو عالمِ اسباب کی علت اور اشیار کائنات کی "علت العلل" ہے۔ گو پیر مغربی کی تعلیم یہ ہے کہ "ہستیِ غائب" کی تلاش نادانی ہے اور محسوسات و مشاہدات کے ماورا کچھ نہیں۔ لیکن فلسفۂ زندگی کا بیان کچھ اور ہی ہے۔

تعلیم پیرِ فلسفۂ مغربی ہے یہ
ناداں ہیں جنکو ہستیِ غائب کی ہے تلاش

محسوس پر بنا ہے علومِ جدید کی
اِس دور میں ہر شیشہ عقاید کا پاش پاش

مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنونِ خام
ہے جس سے آدمی کے تخیّل کو ارتعاش

کہتا مگر ہے فلسفۂ زندگی کچھ اور
مجھ پر کیا یہ مرشدِ کامل نے راز فاش

با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است
ہر چند عقلِ کُل شدۂ بے جنوں مباش

یوں تو ہستیِ غائب کی تلاش میں بیسوں دلیلیں پیش کی گئیں اور پیش کی جائیں گی، مگر

اقبال ایک داخلی اور وجدانی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ:-

اگر کوئی شے نہیں ہے تو کیوں سراپا تلاش ہوں میں
نگہ کو نظارہ کی تمنا ہے، دل کو سودا ہے جستجو کا

حق کا دیدار اُسی کو ہو گا جو حق پر ایمان لائے، کامل سچائی کی تجلّی اُسی کو دکھائی پڑے گی جس کو ست پر وشواس ہو۔ بھگوان بدھ کو گیان تب ہی ہوا جب اُنھوں نے وشواس کی منزلیں طے کر لیں۔ یسوع مسیح "روح القدس" سے اُسی وقت بھرپور ہوئے جب "خداوند اپنے باپ" سے محبت میں کامل ٹھہرے۔ الحاد سے یہ ممکن نہیں کہ روحانیت کی منزلیں طے ہو سکیں۔ خدا باری کا انکار، وہ علّت نہیں جس سے روحانیت پیدا ہو سکے۔ تعلیم و تعلّم سے یہ بات پوری ہو سکتی تھی۔ لیکن یہاں ہوا دوسری چلی، تعلیم مغربی کے ساتھ ضعف جسمانی کی بادِ صرصر اور امراض جسمانی کی بادِ سموم تو چل ہی رہی تھی کہ الحاد کا طوفان اور انکار باری کی آندھیاں بھی ساتھ چلی آئیں! اُمیدوں پر پانی پھر گیا اور کھیتیاں شرمندۂ شباب نہ ہو سکیں

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ!

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ حصول روحانیت و عرفانِ حق کے لئے ترکِ دنیا لازم ہے، ورنہ اُس کے بغیر ممکن نہیں کہ یہ دولت حاصل ہو سکے۔ صوفیوں نے اس پر بڑا زور دیا اور بار بار بتایا کہ ترکِ دنیا ایک شیوۂ پسندیدہ ہے اُس کو اختیار کرو۔ بیسوں بندگانِ خدا، بال بچوں کی پرورش کرنے والے اہل و عیال کو چھوڑ کر مائل بہ مشورہ ہو گئے۔ ترک دنیا کو اختیار کیا اور تارک الدنیا کہلائے۔ بال بچے بھوکوں مرے اور خانہ خراب ہوئے۔ ماسوا اس کے نام نہاد صوفیوں کی باتوں سے عوام الناس میں یہ خیال عام ہو گیا کہ کاروبارِ حیات اور امور زندگی میں انسانی مشاغل، ارتقائے روحانیت کے منافی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ، دنیا دار لوگ، روحانیت سے بے خبر ہو کر پکے دنیادار بن گئے اور صوفیوں کے اس خیال نے کہ روحانیت، ترکِ دنیا کے بغیر ممکن نہیں۔ اُن کو ایسا ڈبویا کہ روحانی زندگی کا کوئی شائبہ اور کوئی رنگ باقی نہ رہا۔ روحانیت اور کاروبارِ حیات میں دوئی پیدا ہو گئی، پردہ پڑ گیا، سدِ سکندری کھڑی ہو گئی، اور اس طرح ترکِ دنیا کے خیال نے "عوام کالانعام" میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ روحانیت کے لئے دل جگر اور حوصلہ چاہیئے۔ اور وہ بدرجہا سے بھی زیادہ دشوار گذار اور ہولناک وادیوں سے ہو کر گذرنے کے بعد کہیں جا کر نظر آتی ہے۔

اقبال ان تمام بے معنی باتوں کو "وہم" سے زیادہ تصور نہیں کرتے۔ وہ ترکِ دنیا کو

ضروری نہیں جانتے۔ کیونکہ ترک دنیا بال بچوں کی خدمت گزاری سے دست بردار ہونا ہے اور اہل وعیال کی پرورش سے "سبکدوش" ہونا عذاب ہے نہ کہ ثواب، گناہ ہے نہ کہ کار خیر۔

اُن کے شخصی اجتہاد نے اُن کو بتایا کہ نام نہاد "صوفیوں" کے فرسودہ مسائل مثلاً ترک دنیا تعلیم رہبانیت، بن باس، صحرا نشینی، عبادت اہل وعیال سے دست کشی، جسمانی تکالیف اور اسی نوع کی دیگر ہلاک کن تعلیمات سے پرہیز کیا جائے۔ یہ باتیں بڑی حد تک کھوکھلی ہیں اور ان تعلیمات کا تعلق حقائق کے بجائے وہم و گمان سے ہے۔ رہبانیت میں دھرا کیا ہے۔ بال بچوں کو چھوڑ کر جنگل کی راہ لینا کیوں ضروری تصور کیا جائے۔ انسان فطرتاً مدنی الطبع ہے اور فطرت اُس کو مجبور کرتی ہے کہ اپنے نوع اور ہم جنس میں رہ کر اُس کی خدمت کرے۔ راہبوں کو رام رام کرنے کا موقع تو مل سکتا ہے لیکن رام کے بندوں کی سیوا کرنا ممکن نہیں اور اس کے کیا معنی کہ رب کے بندوں سے منھ موڑا اور اُن کی خدمت سے گریز کیا جائے۔ پھر صحرا نشینی سے خدا کا ملنا کوئی امر یقینی نہیں۔ خدا کے بندوں کی خدمت ہی سب سے بڑی عبادت ہے اور اقبال بھی خدا کے بندوں کی خدمت کرنے کو عبادت جانتے ہیں اور انھیں کے درشن کرنا چاہتے ہیں۔ جو خدا کے بندوں کے عاشق اور خدمت گذار ہیں۔

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اُن کا بندہ بنوں گا، جن کو خدا کے بندوں سے عشق ہوگا

اقبال کو اُن تمام باتوں سے سخت اختلاف ہے جو انسانوں کو پژمردہ اس کے عمل کو افسردہ ذہنی ترقی کو کمزور، دماغی ارتقا کو "ضعیف" حیات کو مفلوج اور وجدانی نشوونما کو مضمحل کر دینے والی ہیں۔ اسی لئے وہ بار بار ایسی باتوں سے گریز کرنے کی تاکید کرتے ہیں۔ حال میں اقبال کی رحلت کے بعد "ارمغان حجاز" کے نام سے ان کا جو آخری مجموعۂ کلام شائع ہوا ہے اس میں بھی اُنھوں نے چلتے چلتے یہی پیام دیا ہے کہ قوائے عمل کو مفلوج کر دینے والی باتوں سے پرہیز کرو اور "خودی" کی قوتوں سے دنیا پر چھا جاؤ۔ اس سلسلے میں اس مجموعہ کی نظم "ملّا اور صوفی" بڑی قابلِ قدر ہے۔ اور اس میں خودی کا جو پیام دیا گیا ہے وہ بھی گوشِ ہوش سے سننے کے لائق ہے۔

بہر حال اقبال "فلسفۂ خودی" کے پیامبر ہیں اور یہی اُن کے کلام کا حاصل اور اُن کی شاعری کی کائنات ہے۔ اور اسی میں اُن کے وہ پیامات قلبیند ہیں جو انتہائی حیات افروز اور بدرجہ تم جاں بخش ہیں۔

فلسفۂ خودی کا یہ پیغمبر جمود کی جگہ حرکت اور تعطل کی جگہ حیات کو تجویز کرتا ہے۔ ایمان اور خودی عمل اور ذوقِ طلب، اس فلسفہ کے اساسی اصول ہیں۔ خودی سب کچھ ہے۔ اس کے مراتب بلند و بے شمار ہیں اور اسی سے دنیا سر کی جا سکتی ہے۔ مقامِ اُلوہیت پر بھی قبضہ کیا جا سکتا ہے، اور روح وحیات کو فتح کیا جا سکتا ہے۔ اس کی جلوتوں میں مصطفائی اور خلوتوں میں کبریائی ہے۔ زمین اور آسمان کرسی اور عرش بلکہ ساری خدائی کو یہ احاطہ کئے ہوئے ہے۔

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے | خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات | خودی کیا ہے بیداریِ کائنات
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند | سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
اندھیرے اُجالے میں ہے تابناک | من و تو سے پیدا من و تو سے پاک
شبک اُس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں | پہاڑ اُس کی ضربوں سے ریگِ رواں
کرن چاند میں ہے شرر سنگ میں | یہ بےرنگ ہے ڈوب کر رنگ میں

اقبال نے اِسی فلسفۂ خودی کی اپنی تمام تصانیف میں تشریح و توضیح کی ہے۔ "اسرارِ خودی" کو اقبال نے خوب ہی بیان کیا ہے "ضربِ کلیم" اور "بالِ جبریل" اور دیگر تصانیف بھی اِس سے عاری نہیں، حتیٰ کہ اُن کی آخری تصنیف "ارمغانِ حجاز" میں بھی اسی خودی کی تبلیغ کی گئی اور اسی کے مراتب و فضائل بیان کئے گئے ہیں۔ مثلاً:-

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی | خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش | خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

خودی میں جب یہ قوتیں ہیں تو اُس کے وسیلہ سے دنیا پر چھایا جانا چاہیئے اور اسی کے زور سے مقامِ رنگ و بو کا راز پالینا چاہیئے۔ بقول اقبال:-

خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جا | مقامِ رنگ و بو کا راز پا جا

عموماً روحانیت کی دنیا کو، دنیوی ترقی کی دنیا سے الگ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اقبال اس خیال کے حامی نہیں، وہ دین اور دنیا دونوں کو ایک جانتے ہیں اور ان دونوں کو ایک کرنے والی زنجیر کا نام "خودی" رکھا ہے۔

یہ خودی دین اور دنیا زمین اور آسمان سب پر حاوی ہے۔ اس سے دنیوی ترقی بھی ممکن ہے

اور الوہیت کی منزلیں بھی طے ہو سکتی ہیں۔ مادّی فراغت بھی ہو سکتی ہے اور روحانی سکون بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اِسی دنیا میں جنت ہے اور اسی سنسار میں بیکنٹھ۔ البتہ اس خودی کے لئے "یقین محکم" اور عمل پیہم کی ضرورت ہے۔ پھر تو روحانی ترقی اور دنیوی فلاح بھی اس سے حاصل ہوگی۔ جنت کی طرف بھی یہی رہنمائی کرے گی اور دنیاوی مصائب و تکالیف کے دشوار جنگلوں کو بھی یہی کاٹے گی۔ غرض یہ فلسفہ دین اور دُنیا دونوں میں کام آتا ہے

غلامی میں نہ کام آتی ہیں تدبیریں نہ شمشیریں — جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم — جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

منزلِ خودی عمل سے طے ہوتی ہے اور قوتِ عمل کا سرچشمہ ذوقِ طلب اور کامل ایمان ہیں۔ ذوقِ طلب سے بڑی بڑی منزلیں طے ہو جاتی ہیں، شیریں بھی اس سے ہاتھ آتی ہے اور "گل بکاؤلی" بھی اِسی سے میسّر ہوتا ہے۔ "ذوقِ طلب" کا ہادی "قطب شمالی" میں بھی پہونچاتا ہے۔ اور عالمِ ملکوت ولاہوت کی بھی سیر کراتا ہے۔ یہ ہادی ہر وقت کام آتا ہے۔ اس کی ہدایت ضروری اور اشد ضروری ہے۔

دوسری چیز "ایمان" ایک نہ مٹنے والی دولت ہے۔ اگر من کے ساگر میں ڈوب کر سراغِ زندگی کے گوہر شاہوار کو حاصل کیا جا سکتا ہے، لہذا اقبال کہتے ہیں کہ:۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی — تو اگر میرا نہیں بنتا، نہ بن، اپنا تو بن
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں — تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

جس نے یہ جوہر پایا وہ "مومن" کہلایا، زندگی اُس کے قدم چومتی ہے اور حیات ابدی اُس کے آگے سرنگوں ہو جاتی ہے۔ صوفی بنے تو کیا۔ اقبال چاہتے ہیں کہ "مومن" بن جاؤ۔ مومن سب کچھ ہے، اُس کی بات میں وزن، کلام میں گداز، نگاہ میں جادو اور نظر میں وہ گہرا اثر ہوتا ہے کہ بقول اقبال تقدیروں کی تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

حاصل کلام یہ ہے کہ اقبال روحانی عُلم اور حکمت باطنی کے گہرے حکیم ہیں، اُن کے کلام میں تصوّف قدیم کے پہلو بہ پہلو شخصی اجتہادات کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ صحیح قیادت روحانی اور پاک ذوقِ طلب نے اُن کو حکمت و روحانیت کی اُن بلند چوٹیوں تک پہونچا دیا ہے جو "انسان" کا مقامِ اولین ہیں۔ اُنھوں نے معرفت نفس، عرفانِ حق، عشق الٰہی، روز ازل، جلوۂ یوم الست "ہمہ اوست" اور "وحدت الوجود" کے مسائل کو بحسن و خوبی نظم کیا ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ جو کچھ

نظم کیا ہے وہ دل کی گہرائیوں سے محسوس کرنے کے بعد لکھا ہے۔ کوئی بات سطحی اور رواجی نہیں لکھی۔ مسائل تصوّف و اسرار معرفت کے دوش بدوش امراضِ روحانی کے لئے وہ حیات بخش پیامات اور نسخے موجود ہیں جو مُردے کو زندہ اور مفلوج کو چلتا پھرتا بنا دیں۔ اُن کے کلام میں وہ تمام درس موجود ہیں جن پر عمل کرنے سے روحانیت کی دشوار گذار منزلیں طے ہوسکتی ہیں۔ دنیائے روحانیت کی وہ بدیہی باتیں نظم کی گئی ہیں جو ضمیری آلائشوں کو صاف، قلبی ناپاکیوں کو دُور اور روحانی کثافتوں سے نجات دلانے والی ہیں۔ خودی اور عمل، ایمان اور ذوقِ طلب سے اُلوہیت کے تمام مقامات، ملکوت کی تمام راہیں، لاہوت کی تمام گھاٹیاں اور ترقیات کی تمام بلندیاں طے ہوسکتی ہیں۔ یہ وہ مصاحب ہیں جن کو ہر شخص تسلیم کرنے کو تیار ہے۔ کیونکہ اُن کے کلام میں تصوف کے وہ بین المذاہب مسائل پائے جاتے ہیں جو صدق بسیط کا درجہ اور حقیقت کبریٰ کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ ان میں صوفی اور ویدانتی، راہب اور پادری، سادھو اور ست سنگی کی کوئی تخصیص نہیں۔ وہ روحانیت اور کاروبار حیات میں حدفاصل و خطِ امتیاز قائم نہیں کرتے بلکہ اسی دنیا میں رہ کر روحانیت کی راہ دکھاتے ہیں۔ اُن کا خیال کیا یقین کامل ہے کہ کاروبار حیات میں رہ کر روحانیت کی بلندیوں کو اور اُلوہیت کی چوٹیوں کو "خودی" کی آسمانی کمند سے طے کیا جاسکتا ہے اور اس طرح ابراہیمؑ و حسینؑ کی مثالیں پھر قایم کی جاسکتی ہیں۔ لیکن ہاں یہ اُسی وقت ہوسکتا ہے جب انسان عمل و ایمان کی قوتیں پیدا کرے۔ روحانیت و حیات کو تسخیر کرے اور "خودی" کو یہاں تک بلند کرے کہ رضائے ربانی، رضائے انسانی کا پاس کرنے لگے۔ اقبال:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا! تیری رضا کیا ہے

لہُو کے چند قطرے

اگر لہُو ہے بدن میں تو خوف ہے نہ ہراس
جسے مِلا یہ متاعِ گراں بہا اِس کو

اگر لہو ہے بدن میں تو دل ہے بے وسواس
نہ سیم و زر سے محبت ہے نے غمِ افلاس

(اقبال)

پروانہ

(از مسٹر ڈی۔ پی۔ بھٹناگر گشتہ (منصوری)

اے سراپا سوز، تصویر جنوں، آشفتہ سر
پیکرِ عشق و محبت، تفتہ دل، خستہ جگر
نشۂ صہبائے الفت میں خراب و بے خبر
فرقتِ محبوب میں رہتا ہے مضطرات بھر
عشق کا شعلہ نہاں ہے قلبِ سوزاں میں ترے
شمع یہ وہ ہے کہ جلتی ہے شبستاں میں ترے

ساز تیرے ساز سے رکھتی ہے شمعِ انجمن
مشتعل ہے تیرے دل میں آتشِ رنج و محن
ایک شعلہ ہے بھڑکتا ہے جو زیرِ پیرہن
مرحبا تیری محبت، حبذا تیری لگن
تیری جانبازی کا چرچا حسن کی محفل میں ہے
شمع کے رخ سے وہ ظاہر ہے جو تیرے دل میں ہے

گرم ہوتی ہے کبھی جب محفلِ عیش و نشاط
ختم ہوتا ہی نہیں تا صبح دورِ انبساط
اور حسن و عشق میں ہوتا ہے باہم اختلاط
داستاں سنتا ہے تو بھی سب کی باصد احتیاط
اور جب رہتا نہیں آخر تجھے یارائے ضبط
ڈگمگا جاتا ہے اے جانباز تیرا پائے ضبط

کام کر جاتا ہے تیرے دل پہ حسنِ فتنہ ساز
بیٹھنے دیتا نہیں پھر تجھکو دردِ جانگداز
تیرا دل رہتا نہیں پھر قابلِ عرضِ نیاز
چوٹ کھا کر ٹوٹ جاتا ہے تری ہستی کا ساز
یہ ربابِ زندگی صد حیف ہوتا ہے خموش
مختصر سی داستاں ہے تیری اے جاں فروش

کاش میں بھی شمعِ آزادی کا پروانہ بنوں
نام ہشیاروں میں ہو جس کا وہ دیوانہ بنوں
نیستی کے شوق میں ہستی سے بیگانہ بنوں
خونِ دل ہو جس کی سرخی میں وہ افسانہ بنوں
جل گیا تو جیسے شمعِ انجمن کے واسطے
کاش میں بھی کام آ جاؤں وطن کے واسطے

"دیدنی ہے آج"

مسٹر پربھان شنکر چودھری بی۔اے(آنرز) خلف حضرت رواں مرحوم

رنگِ نشاطِ زندہ دلاں دیدنی ہے آج ہم دوشیِ بہار و خزاں دیدنی ہے آج
شاخوں کے خم میں گل کا ساں دیدنی ہے آج پہلو میں تابِ حُسنِ جواں دیدنی ہے آج
نورِ چراغِ خلوتیاں دیدنی ہے آج

عالم وہ حُسن کا وہ شگوفوں کی تازگی رنگت نہ پوچھیئے رُخِ ابرِ بہار کی
نرگس کی انکھڑیوں سے نمایاں غنودگی ہر ایک شئے پہ چھائی ہوئی ہے ربودگی
بارش کا گلستاں میں دھُواں دیدنی ہے آج

جوشِ شباب پھر پلٹ آیا ہے مے کے ساتھ مستی بھری ہوئی ہے نگاہوں میں مے کے ساتھ
ہر سُو ترانہ سنجِ صبا چنگ و نے کے ساتھ کشتی رواں ہے نغمۂ ساقی کی لے کے ساتھ
موجِ خرامِ آبِ رواں دیدنی ہے آج

زُلفیں بکھر بکھر کے ہوئی رُخ کی پردہ پوش آنچل ڈھلک کے سر سے ہوا ہے وبالِ دوش
قشقہ جبیں پہ ہے نہ دُر و لعل زیبِ گوش آرائشوں کی فکر، نہ زیبائشوں کا ہوش
وارفتگیِ لالہ رُخاں دیدنی ہے آج

وہ بزمِ ناز، جام و صبوحی کی انجمن پھرتی ہے جھومتی ہوئی نکہت چمن چمن
مستی کے قافلے ہیں فضاؤں پہ خیمہ زن دم سازِ ابر و باد ہے رندانہ بانکپن
طرفِ کلاہِ پیرِ مغاں دیدنی ہے آج

سازِ طرب پہ نغمہ سرا جوشِ خوش مقال بادل گرج گرج کے جیسے دے رہے ہیں تال
فصلِ شباب، موسمِ ارماں، شبِ وصال حسنِ جواں، شرابِ کہن، موجِ برشگال
عشرت سرائے بادہ کشاں دیدنی ہے آج

پلاسی کی لڑائی[1]

از حضرت وصل بلگرامی

آپ نے پلاسی کا نام اکثر سنا ہوگا۔ پلاسی لڑائی کے میدان سے دکن جانب تین ۳ میل پر ایک گاؤں ہے جہاں پلاس کے درخت بہت ہوتے تھے۔ شہنشاہ اکبر کو رات کے وقت چوگان (جس کو آجکل پولو کہتے ہیں) کھیلنے کا شوق تھا۔ اِس کھیل کے لئے گو وچوگان یعنی گیند اور بلّے پلاس کی لکڑی کے بنائے جاتے تھے، اور گیندوں میں آگ لگاکر یہ کھیل کھیلا جاتا تھا۔ یہ لکڑی باوجود ہلکی ہونے کے بہت دیر تک روشن رہتی تھی، اِسی درخت کی مناسبت سے اِس گاؤں کا نام پلاسی پڑ گیا۔

ایک سو اکیس ۱۲۱ سال ہوئے، جون کے مہینہ اور آموں کی فصل میں ہندوستان کی یہ مشہور لڑائی ہوئی۔ یہاں پر مختصراً یہ بتا دینا بھی بے موقع نہ ہوگا کہ انگریز ہندوستان اور خصوصاً بنگال میں کیونکر آئے؟ اور کیونکر اُن کو اِتنی بڑی سلطنت حاصل ہوئی؟

سب سے پہلے ۱۴۹۸ء میں واسکوڈےگاما (Wasco-Da-Gama.) ایک پرتگالی نے راس امید (Cape of Good hope:) کے گرد گھوم کر سکندر لودی کے زمانہ میں ہندوستان کے نئے سمندری استے کا پتہ لگایا۔ ان کی تجارت اور حکومت دونوں عروج پاکر ۱۵۶۵ء تک ختم ہوگئیں۔ انگریزوں نے وقع پاتے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی بناکر ملکہ الزبتھ سے اجازت حاصل کرکے ۱۶۰۰ء سے ہندوستان یں تجارت شروع کردی۔ سورت میں کوٹھیاں بنوائیں، مدراس کی بنیاد ڈالی، سینٹ جارج کا قلعہ میر کرایا۔ چارلس دوم سے پرتگال سے جہیز میں ملا ہوا بمبئی کا قصبہ عطیہ میں ملا۔

اسی درمیان میں ۱۶۴۴ء سے بنگال میں بھی ان کا اثر شروع ہوگیا۔ وہ بھی اِس طرح کہ ایک بار پنی کے ایک جہاز کے ڈاکٹر گیبرئیل باٹن نے آگرہ جاکر شاہجہاں کی ایک چہیتی لڑکی کا علاج کیا۔ جس کا سم بُری طرح جل گیا تھا۔ باٹن کی درخواست پر شاہجہاں نے کمپنی کو بغیر کسی قسم کا محصول ادا کئے ہوئے بنگال میں زادی سے تجارت کرنے کی اجازت دیدی۔ اُسوقت بنگال کا گورنر شاہ شجاع تھا اور اُس کی شہزادی کی

---

[1] یہ مضمون آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ سے جون ۱۹۳۸ء میں نشر ہوا تھا۔ اب ڈاکٹر کرٹر صاحب کی اجازت سے ہدیہ ناظرین ہو رہا ہے۔ (ا-ل)

حالت بھی نازک تھی اور باٹن کے علاج سے اُس کو بھی صحت ہوگئی چنانچہ شجاع نے بھی کمپنی کو اپنی سرپرستی میں لے لیا اور صرف تین ہزار روپیہ سالانہ لے کر کمپنی کو پورے صوبے میں آزادی کے ساتھ تجارت کرنے کے اختیارات دیدیئے۔ شجاع کے بعد شائستہ خاں بنگال کا حکمران ہوا، وہ کمپنی کے خلاف ہوگیا۔ تو کمپنی کو مجبوراً بنگال چھوڑ کر مدراس جانا پڑا۔ مگر اسی سال شائستہ خاں کو ہٹا کر ابراہیم خاں کو ناظم بنایا گیا، جس نے کمپنی کو پھر واپس بلالیا۔ لیکن کمپنی نے اِس مرتبہ ہگلی کے بجائے چٹانا ٹی میں اپنا کام جاری کیا اور ابراہیم خاں کی اجازت سے قلعہ بنوالیا جو بعد میں فورٹ ولیم کے نام سے مشہور ہوا۔ کچھ عرصہ کے بعد ابراہیم خاں معطل ہوا، اور اُس کی جگہ شاہجہان کا پوتا عظیم الشان بنگال کا گورنر ہوکر آیا۔ کمپنی نے اُس کو راضی کرکے چٹانا ٹی، گوبند پور اور کلکتہ کے آس پاس کا علاقہ لے لیا۔

۱۷۱۵ء میں تاریخ نے پھر وہی واقعہ دُھرایا۔ ڈاکٹر ہملٹن سفارت کے ساتھ فرخ سیر کے دربار میں حاضر ہوا۔ اُس وقت فرخ سیر ایک خاص مرض کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔ ہملٹن نے علاج کیا جس سے فرخ سیر کو صحت ہوگئی۔ اس خدمت کے صلے میں کمپنی کو تمام محصولات کی ادائیگی معاف کردی گئی کلکتہ کے پاس ۳۸ گاؤں جاگیر میں دے گئے اور مرشد آباد کے دارالضرب میں اپنا سکہ ڈھالنے کی اجازت ہوگئی۔ مرشد قلی خاں، جس کے ہاتھ میں اُس وقت بنگال کی حکومت تھی ان رعایتوں سے خوش نہیں ہوا۔ اُس کو دریا کے دونوں جانب انگریزوں کا قبضہ کھٹکتا تھا۔ اُس نے فری پاس کا انتقال اور اندرونی تجارت میں اُس کا استعمال ناجائز قرار دیا۔ مرشد قلی خاں کے بعد شجاع الدین خاں نے بھی ایسا ہی کیا۔ ۱۷۳۰ء میں سرفراز خان بنگال کا گورنر ہوا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب نادر شاہ نے حملہ کیا تھا بنگال میں بھی سکون نہ تھا۔ یہ حالت دیکھکر بہار کے نائب صوبہ دار علی وردی خاں نے بغاوت کی، سرفراز خاں مارا گیا اور علی وردی خاں بنگال، بہار اور اڑیسہ کا نواب ہوگیا۔ بعد کو اُس نے اپنی گورنری کو جائز کرلیا۔ ۱۷۵۶ء میں علی وردی خاں کے بعد اُس کا نواسہ سراج الدولہ اُن کا جانشین ہوا۔ وہ کمسن اور ناتجربہ کار ضرور تھا مگر انگریزوں سے بہت کھٹکتا تھا۔ اس عرصہ میں انگریزوں کی طرف سے کئی باتیں اُس کے خلاف ہوئیں۔ جس کی وجہ سے اُس سے خاموش نہ رہا گیا۔ چنانچہ ۴ر جون ۱۷۵۶ء کو اُس نے قاسم بازار پر حملہ کرہی دیا۔ پچاس ہزار فوج لے کر کلکتہ پہونچ گیا۔ ۱۹ر جون تک کلکتہ پر سراج الدولہ کا پورا قبضہ تھا۔ اُس نے انگریزوں کو قتل نہیں ہونے دیا۔ لیکن اُس کے ماتحتوں نے جو انگریزوں سے جلے ہوئے تھے ضرور بُرا سلوک کیا۔ سب کو ایک بند اور اندھیری کوٹھری میں بند کردیا۔ یہی واقعہ بلیک ہول کی کہانی بن گیا۔ ۱۵ر جولائی کو یہ خبر مدراس پہونچی، وہاں سے کلائیو اور کرنل واٹسن

کلکتہ روانہ ہوئے۔ سراج الدولہ نے مصلحت وقت سمجھ کر صلح کرلی، اور اُن کے حصے اُن کو واپس دیدئے۔ اس کے بعد ہی کلائیو نے نواب کے درباریوں اور افسروں کو ملالیا اور نواب پر اپنا اعتبار یہاں تک جمایا کہ سراج الدولہ اُس کی طرف سے بالکل بے فکر ہوگیا۔ اور وہ فوجیں جو پلاسی میں تعینات تھیں واپس بلالیں۔ کلائیو نے میر جعفر کو اپنی طرف کرلیا اور دونوں کے درمیان ایک عہدنامہ ہوگیا۔ اب راجہ دو بھہ رام سراج الدولہ کا وزیراعظم، میر جعفر اُس کا سپہ سالار، یار لطف خاں اور اُن کے ساتھی سب انگریزوں کی طرف تھے۔ اس اطمینان کے بعد کلائیو کھلم کھلا میدان میں آگیا اور ۱۳ رجون کو چندر نگر سے روانہ ہوکر نواب کے ڈاکے ایجنٹوں کو علیحدہ کردیا۔

سراج الدولہ کی آنکھیں کھُل گئیں وہ اس سے پہلے میر جعفر کو سزا دینا چاہتا تھا لیکن اب اُسے منانا پڑا میر جعفر اور دوسرے سازشیوں نے تعمیل حکم کے لئے گردنیں جھکادیں اور چپکے سے کلائیو کو اسکی اطلاع کردی۔ نواب نے فوجوں کو فوراً پلاسی روانہ ہونے کا حکم دیدیا، لیکن اختلاف رائے کی وجہ سے ۲۱ رجون سے پہلے وہ کسی طرح پلاسی نہ پہونچ سکیں۔ کلائیو ۱۶ رجون کو پٹلی (Putli) پہونچ گیا۔ وہاں سے میجر آئر کوٹ کو کٹوہ کا قلعہ فتح کرنے کو بھیجا۔ چنانچہ قلعہ کے حاکم نے ہتھیار ڈال دئے اور انگریزی فوجیں قلعہ میں داخل ہوگئیں۔ اب صرف دریائے بھاگیرتی سراج الدولہ اور کلائیو کے درمیان رہ گیا تھا۔ کلائیو کو ابھی تک میر جعفر پر پورا بھروسہ نہیں تھا۔ اُس نے اپنی اور کونسل کی کثرت رائے (Majority of Votes.) سے کچھ دنوں کٹوہ ہی میں ٹھہرنا مناسب سمجھا۔

اسوقت ہر طرف سناٹا تھا اور ساری فضا خاموش تھی، لیکن کلائیو کو آرام کہاں۔ وہ آم کے درخت کے نیچے بیٹھا اپنی ٹھڈی کو ہتھیلی پر اور کہنی کو گھٹنے پر رکھے ہوئے کسی زبردست خیال میں کھویا ہوا تھا۔ آموں کی فصل شروع ہوگئی تھی۔ ہرے ہرے اور پکے پکے خوشرنگ آم ڈالیوں میں جھول رہے تھے۔ اُنکی لطیف خوشبو اُس کے دماغ تک پہونچ رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی آم ٹپک پڑتا تھا جو اس خاموشی میں ایک آواز پیدا کردیتا تھا۔ اب کوئلیں بھی کوک رہی تھیں۔ لیکن کلائیو نے ان آوازوں سے اپنے کانوں کو ناآشنا بنالیا تھا، صرف ایک سوال اُس کے دماغ میں چکر لگا رہا تھا۔ "مجھکو آگے بڑھنا چاہیئے یا واپس ہونا چاہیئے"۔ یکایک وہ چونک کے کھڑا ہوگیا، اُس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اور فوراً اپنی فوجوں کو صبح دریا پار ہونے کا حکم دیدیا، ۹۵۰ انگریزی پیدل۔ ۵۰ یوروپین توپچی۔ ۵۰ ملاح اور دو ہزار ایک سو دیسی سپاہی، یہ تھی کُل کائنات جو ۲۲ رجون کو پچاس ہزار کے لشکر سے مقابلہ کرنے کے لئے دریائے بھاگیرتی کو پار کرکے پلاسی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ۲۳ رجون کو پلاسی پہونچکر معلوم ہوا کہ سراج الدولہ کی فوجیں اُن سے صرف پانچ فرلانگ کے فاصلے پر ہیں جو ۳۶ گھنٹہ پہلے میدان میں اُتر چکی تھیں۔ اب دونوں فوجیں خاموشی کے ساتھ لڑائی کے آغاز کا انتظار کرنے لگیں۔

اب ذرا پلاسی کے میدان کی بھی کیفیت سُنیئے۔ مرشد آباد دریائے بھاگیرتی کے بائیں جانب واقع ہے اسی طرف بائیس۲۲ میل آگے پلاسی کا میدان ہے۔ یہاں سے پلاسی گاؤں تین میل ہے، اس جگہ دریا اس طرح چکر کھاتا ہوا گیا ہے کہ قاسم بازار ایک جزیرہ نما بن گیا ہے، یوں سمجھیے دریا داہنی جانب دائرہ بناتا ہوا آتا ہے، قاسم بازار جانے کا راستہ تین۳ طرف سے دریا گھیرے ہوئے ہے، چوتھی طرف سراج الدولہ پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ کیمپ کے آگے تین چار میل کھائی بنا رکھی ہے۔ اِس کھائی کے سامنے داہنی جانب دریا سے ملا ہوا سراج الدولہ کا توپخانہ ہے جس کی کمان سینٹ فرے ایک فرانسیسی افسر کر رہا ہے۔ توپخانے کے بائیں طرف میر مدن کی فوجیں پڑی ہیں، جنمیں زیادہ تر تیرانداز سوار ہیں۔ اس توپخانے کے بالکل سامنے آموں کا ایک باغ ہے جسیں تھوڑی سی انگریزی فوج موقع کی تاک میں بیٹھی ہے۔ انگریزی فوج کے بائیں جانب دریا ہے، سامنے سراج الدولہ کا توپخانہ، پُشت پر پلاسی کا گاؤں، داہنی جانب راجہ دوبہ رام، یار لطف خاں اور میر جعفر کی فوجیں ہیں، یہ گویا سراج الدولہ کا میسرہ فوج ہے۔ ان لوگوں کا رُخ پچھم کی طرف دریا کی جانب ہے۔ راجہ دوبہ رام کی فوج کا داہنا حصہ میر مدن کی فوجوں سے ملا ہوا ہے۔ قلب لشکر پر یار لطف خاں تعینات ہے، بالکل بائیں جانب میر جعفر کی فوجیں ہیں۔ ان تینوں غیر وفاداروں کی فوجیں تین چار میل لمبے قوس کی شکل میں پھیلی ہوئی ہیں۔ میر جعفر کی فوج کا بایاں حصہ انگریزوں کے عقب تک پہونچا ہے گویا انگریز چاروں طرف سے گھرے ہوئے ہیں خود کلائیو بھی پریشان ہے کہ اگر کہیں میر جعفر نے دھوکا دیدیا تو انگریزی فوجیں بیچ میں پس کر رہ جائیں گی۔

سراج الدولہ کی غیر تربیت یافتہ فوجوں کی تعداد پینتیس۳۵ ہزار سے کچھ زیادہ تھی اور لڑائی کے سامان کی کمی اور ذمہ داری کے احساس کا نہ ہونا نمایاں تھا۔ سواروں کی تعداد پندرہ۱۵ ہزار تھی یہ کسی قدر بہتر تھی لیکن سب سے عمدہ توپخانہ تھا جسمیں ترپن۵۳ توپیں تھیں۔ سب سے زیادہ اہمیت سراج الدولہ کی فوجوں کو فرانسیسی توپچیوں سے تھی مگر اس تعداد میں سے پنتالیس۴۵ ہزار کی تعداد غیر وفاداروں کی کمان میں تھی۔ سراج الدولہ کا وفادار جنرل میر مدن سب سے آگے فرانسیسوں کی مدد سے حملے کے لئے تیار تھا۔

دوسرے دن ۲۴ جون کی صبح کو سینٹ فرے کی پہلی توپ نے اس فیصلہ کُن جنگ کا آغاز کر دیا۔ انگریزوں نے بھی مجبوراً گولے کا جواب گولے سے دیا۔ آخر کہاں تک، اُن کے پاس صرف چند توپیں تھیں۔ انھیں اپنا توپخانہ ہٹانا پڑا۔ سراج الدولہ کے توپخانے سے ابھی گولہ باری ہو رہی تھی کہ بارش ہونے لگی۔ کلائیو اپنے توپخانوں کے ساتھ درختوں کے درمیان میں تھا۔ اُس پر بارش زیادہ اثر نہ کر سکی۔ لیکن سراج الدولہ کا توپخانہ بارش میں سست پڑ گیا۔ ادہر میر مدن نے سمجھا کہ کلائیو کے توپخانہ کا خاموش ہو جانا اُس کے بیکار ہو جانے کا ثبوت ہے اس لئے اُس نے اپنے سواروں کی جمعیت سے انگریزوں پر حملہ کر دیا۔ انگریزوں نے

اُن کو توپوں کی زد سے صرف پسپا ہی نہیں بلکہ لڑائی ہی ختم کر دی۔ کیونکہ اس گولہ باری نے سراج الدولہ کے تنہا وفادار جنرل میر مدن کو ایسا زخمی کیا کہ وہ جانبر نہ ہو سکا۔ اب سراج الدولہ نے میر جعفر کو بلایا اور اپنی پگڑی اُس کے قدموں پر پھینک کر کہا کہ جعفر اس کی عزت تیرے ہاتھ ہے۔ جعفر نے ظاہرداری سے کام لے کر خون کے آخری قطرہ سے بھی دریغ نہ کرنے کا وعدہ کر لیا۔ وہ ابھی تک خاموشی کے ساتھ انجام کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے یہ خبر کلائیو کو پہونچا دی اور اپنی طرف سے اطمینان دلا دیا۔

میر مدن کے بعد سراج الدولہ کے وفاداروں سے دُنیا خالی ہوگئی۔ اب اُس نے راجہ دولبھ رام کو بُلا کر امداد کی درخواست کی، اُس نے نہایت چالاکی سے سراج الدولہ کو مرشد آباد جانے کی رائے دی۔

سراج الدولہ دو ہزار سواروں کے ساتھ مرشد آباد چلدیا اور انھیں تینوں غداروں پر اپنی فوج چھوڑ گیا۔ دراصل لڑائی فتح ہو چکی تھی۔ اب ان تینوں نے باقی فوج کو بھی واپسی کی رائے دی، لیکن فرانسیسوں اور میر مدن کی بے سردار فوج نے اِس رائے سے اختلاف کیا۔

رات ہو چکی تھی۔ سراج الدولہ کیمپ چھوڑ چکا تھا۔ فوج بھی عقب میں جارہی تھی۔ اس نقل وحرکت کو انگریزوں نے شک کی نگاہوں سے دیکھا۔ جنرل کلپٹرک ڈیوٹی پر تھا۔ میر جعفر نے اُس وقت اُسکو حملہ کرنے کا مشورہ دیا۔ اُس نے بھی موقع اچھا سمجھا کہ فرانسیسی افسر اکیلا ہے۔ اُس نے توپخانہ آگے بڑھا دیا۔ اور کلائیو کو اطلاع دی۔ میر جعفر اب تک خاموش تھا۔ سراج الدولہ کی وفادار فوج پلٹ پڑی اور فرانسیسوں کے ہمراہ لڑنے لگی۔ فرانسیسی افسر آخری سانسیں لے رہا تھا۔ کلائیو نے اِس اثناء میں دیکھا کہ اس کے دائیں جانب کی فوج جس کی وجہ سے وہ ابھی تک اپنی جگہ پر قائم تھا، بالکل خاموش ہے۔ اُس کو یقین ہو گیا کہ غیر وفاداروں نے اپنی شرارت کو تکمیل تک پہونچا دیا۔ اِس لئے ادھر کا خیال چھوڑ کر پوری قوت سے نوابی فوج پر حملہ کر دیا۔ مجبوراً سینٹ فرے کو میدان خالی کرنا پڑا۔ پانچ بجے تک انگریز میدان کے مالک تھے۔ اب آپ جیتنے والوں کے نقصان کا اندازہ لگائیے۔ انگریزی فوج کے کل سات یوروپین اور سولہ دیسی سپاہی مارے گئے اور تیرہ (۱۳) یوروپین اور چھتیس (۳۶) دیسی زخمی ہوئے۔ اسطرح پلاسی کی لڑائی ۲۳ر جون ۱۷۵۷ء کی شام کو ختم ہوگئی۔ سراج الدولہ اُس کے بعد مرشد آباد سے راج محل چلا گیا۔ وہاں داناشاہ کے تکیہ میں ٹھہرا۔ یہاں کے فقیر نے پرانی دشمنی نکالنے کے لئے میر جعفر کو خبر کر دی۔ جس نے میر داؤد اور میر قاسم کو بھیج کر سراج الدولہ کو مع اُس کے بال بچوں کے گرفتار کر لیا اور جواہرات چھین لئے اور مرشد آباد لاکر جس بیدردی اور ظلم وستم کے ساتھ اُس کو قتل کرایا۔ اُس کا حال تاریخوں میں موجود ہے۔ یہاں بیان نہیں ہو سکتا۔ کلائیو نے میر جعفر کو بنگال کا نواب بنا دیا۔ اسی کی لڑائی ایک فیصلہ کن لڑائی ثابت ہوئی اور اس لڑائی کے بعد انگریزوں کے قدم ہندوستان

میں پورے طور سے جم گئے۔ ایک چھوٹی جماعت کا اتنی بڑی فوج پر غالب آنے سے ہندوستانی فوجوں کی قوت جاتی رہی اور انگریزوں کی دھاک بندھ گئی۔ اس لڑائی سے انگریزوں کو کامل یقین ہو گیا کہ تمام ہندوستان پر برطانوی حکومت قائم ہو سکتی ہے۔ اُس کے بعد گویا کل بنگال پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ کیونکہ میر جعفر انھیں کا بنایا ہوا حکمران تھا۔ اس کے بعد انگریز ہندوستان میں دُنیا کی سب سے بڑی منظم قوت اور طاقتور قوم سمجھی جانے لگی۔ اس لڑائی سے فرانسیسی بھی تباہ ہو گئے۔ اور اب انگریزی تجارت سب سے آگے ہو گئی۔ ہندوستان پر اقتدار حاصل ہو جانے کی وجہ سے انگریزوں کو دوسری مشرقی نوآبادیاں بسانے میں بھی آسانی ہو گئی۔ اوسط درجے کے انگریزوں کے لئے اس لڑائی نے ترقی کی نئی راہیں کھول دیں۔ انگلستان کے انجنیر، کاریگر اور دیگر پیشہ ور لوگ ہندوستان کی طرف رجوع کرنے لگے۔ تجارت کے لئے دروازہ کُھل گیا اور انگلستان کے مال کے لئے ہندوستان بہترین بازار ثابت ہوا۔

تیس ۳۰ سال پہلے

زمانہ مئی و جون ۱۹۰۹ء میں "ہندوؤں میں ذات کی تفرقی" کے عنوان سے مشہور محبِ ملک، لالہ لاجپت رائے صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ جس میں لالہ جی نے لکھا تھا کہ:۔

"ہم انسانوں کی مساوات کے مسئلے کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ سب انسانوں کو ترقی کرنے کے لئے مساوی حقوق اور موقعے ہونے چاہئیں۔ کسی شخص کی پیدائش اس کے راستے میں ترقی کرنے اور بڑھنے کی مانع نہ ہو۔ اور اس بارہ میں یقیناً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مغربی اقوام کے سوشل انسٹی ٹیوشن یا تمدنی انتظامات ہم سے بدرجہا بڑھ کر ہیں۔ ہماری سوشل تفریق میں کسی چمار یا بھنگی کے لڑکے کو کوئی حق یا موقع نہیں ہے کہ وہ برہمن یا کھتری یا ویش بن سکے۔ اس وقت انگریزی عملداری میں بیشک اُس کو کسی قدر موقعے حاصل ہیں کہ وہ بھی دولت پیدا کر سکے۔ لیکن دولت و لیاقت پیدا کرنے کے باوجود ہندو سوسائٹی کے نظام تمدن میں اوپر بڑھنے کے لئے اُسے کوئی حق یا موقع نہیں ہے ہندو سوسائٹی کی موجودہ کمزوری اس سخت حدبندی کا نتیجہ ہے۔ اور اگر ہندو قوم دُنیا میں رُتبہ و عزت اور نام و شہرت حاصل کرنا چاہتی ہے تو اُس کا اول فرض یہ ہے کہ اس حدبندی کو دُور کر دے۔ اور اپنے نظامِ تمدن میں ہر ایک ہندو کو بلا تفریق ذات پات۔ ذاتی لیاقت اور ذاتی شرافت کی بدولت اعلےٰ سے اعلےٰ رتبہ پر پہونچنے کے لئے یکساں موقع دے۔"

سنسکرت ناٹکوں کا پلاٹ

(از پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق ایم - اے)

ہندوستان اُتر میں ہمالیہ کی چوٹیوں سے لیکر دکھن میں راس کُماری تک' اور پچھم میں سندھ سے لیکر پورب میں آسام تک اتنی بڑی جگہ ہے کہ اٹلی، اسپین جرمنی - فرانس بیجیم اور انگلستان سب کے سب اس میں سما جائیں اور پھر بھی آدھی جگہ باقی رہ جائے - ہمارا دیس خود اپنی جگہ ایک دُنیا ہے یہاں کا پانی، یہاں کی ہوا، پھل اور پھول اور پیداوار' چڑیا اور جانور، زمین اور آسمان سیکڑوں رنگ روپ میں دکھائی دیتے ہیں - کشمیر کے بسنے والوں کا تپائے ہوئے سونے کا رنگ' دکھن کے کچھ حصوں میں بسنے والوں کا چمکتا ہوا سیاہ رنگ، پنجاب والوں کی سندرتا' گجرات والوں کی نرم و نازک اور نکھری ہوئی خوبصورتی' ہمارے صوبے کے لوگوں کی رچی رچائی سڈول بناوٹ - بنگال کا جادو - پھر ہر جگہ کا رہن سہن اور وہاں کی بولی ٹھولی' سب کی سب من کو موہ لینے والی چیزیں ہیں - یہ دیس نہیں ہے عجائب خانہ ہے - یہاں آدمیوں کی بستی بھی ہے' دیولوک بھی ہے' پرستان بھی ہے -

سنسکرت کے ہر ناٹک کا سین ہندوستان ہی میں رکھا گیا ہے، اس کے ساتھ ہی ساتھ دیوتاؤں کی دنیا اور پشاچوں کی دنیا کی جھلکیاں بھی دکھائی گئی ہیں - ناٹک میں جس زمانہ کا نقشہ دکھایا گیا ہے وہ ست جُگ کا سنہری زمانہ نہیں ہے، کیونکہ ست جگ میں سُکھ ہی سُکھ اور دھرم ہی دھرم تھا نہ پاپ تھا نہ دُکھ تھا اور ناٹک میں سُکھ سے ملا ہوا دُکھ اور دھرم کے ساتھ پاپ دونوں دکھائے جاتے ہیں، اس لئے زمانہ ست جگ کے بعد کا زمانہ ہے - پلاٹ یا کہانی کے متعلق اور باتوں یا معاملوں میں ناٹک لکھنے والے کو پوری آزادی دی گئی ہے - ناٹک لکھنے والا چاہے تو مشہور روایتوں یا کتھاؤں کا پلاٹ لینے یا اپنا پلاٹ خود بنائے اور چاہے دونوں کو ملا دے لیکن اگر کسی مشہور کتھا یا روایت سے کام لے رہا ہے تو اُسے یہ آزادی نہیں ہے، کہ بے جوڑ اور انمل باتیں ملا کر پرانی کتھا کے اثر کو چوپٹ کردے - اگر پلاٹ پُرانی کتھا سے لیا گیا ہے - تو اصلی کہانی کے دوران میں جو چھوٹے چھوٹے واقعے ہو جاتے ہیں (جنھیں *Underplot* یا *Subplot* یا *episode* کہتے ہیں) صرف ان کو ایجاد کرنے

میں اُسے آزادی دی گئی ہے، ایسا نہ ہو تو اصلی اور مشہور کتھا میں زیادہ ہیر پھیر ہو جانے سے ناٹک دیکھنے والوں کو تکلیف ہو گی۔ ہاں بالکل نئے پلاٹ کی اور بات ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ناٹک بنانے والے کو صرف اس کی آزادی ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لئے ضروری ہے، کہ مشہور کتھا یا روایت میں اگر نایک یا ہیرو کی زندگی میں اس کے سبھاؤ بیوہار اور چلن میں اگر کچھ شبہہ پیدا کرنے والی یا کچھ نامناسب باتیں ہوں تو انکو بدلکر ہیرو کی زندگی اور اس کے چال چلن کو چمکیلا اور شاندار بنایا جائے۔

مہا کاویہ کے لئے یہ شرطیں نہیں لگائی گئی ہیں۔ مثلاً مہا کاویہ میں شاعر کو اختیار ہے کہ راجہ دشینیت شکنتلا سے بات ہار جائے اور پھر اُسے بھول جائے، لیکن کالیداس کے لئے ضروری ہے کہ دشینیت کی زندگی سے یہ دھبا مٹا دے۔ کالیداس نے دشینیت کی اس بھول کے سلئے دُرواسا رشی کی اس بد دعا کو ایجاد کیا جو شکنتلا کو رشی نے دی۔ رامائن میں بالی کو رام نے بے قصور مارا تھا لیکن بھوبھوتی نے اُتر رام چرت میں اس کو راون کا طرف دار کھا کر رام کو اس الزام سے بری کیا۔ رام کی سوتیلی ماں کیکئی کو بھی بھوبھوتی نے الزام سے بری کیا ہے۔

پلاٹ یا کہانی کے دو حصّے ہوتے ہیں، ایک خاص حصّہ، دوسرا اتفاقیہ یا ضمنی حصّہ۔ پہلے حصّے کا تعلق اس مقصد سے ہے جسے پورا کرنے کا بیڑا ہیرو اُٹھاتا ہے، چاہے وہ حسن و عشق کا معرکہ ہو یا کوئی اور دُنیوی فتح یا کسی مشکل یا اہم اور نازک فرض کا پورا کرنا ہو۔ ضمنی حصّہ اپنی جگہ خود ایک کہانی ہوتی ہے جیسے رام کے مدد گار اور طرفدار سگریو کے کارنامے یا محض رواداری میں چلتا پھرتا ہوا ایک واقعہ یا سین ہو سکتا ہے۔ جیسے شکنتلا کے چھٹے ایکٹ میں دو آدمیوں کی بات چیت۔

پلاٹ میں جو کام یا عمل کا حصّہ ہوتا ہے (یعنی Action) وہ پانچ حالتوں یا منزلوں (اوستھا) سے ہو کر گزرتا ہے۔ شروع کا حصہ یعنی کام کا اُٹھان (یعنی کسی مقصد کو پورا کرنے کی زبردست لگن یا پکا ارادہ پھر وہ جچی تلی ہوئی زبردست تدبیریں اور کوششیں جن سے آگے بڑھ نکلے۔ پھر وہ منزل یا مقام جہاں کام پورا ہونے کی اُمید یا صورت نظر آنے لگے کام پورا ہونے کے ذریعوں (سادھنوں) اور دقتوں یا رکاوٹوں کو دیکھتے ہوئے۔ اس کے بعد جیت یا کامیابی کا پورا وشواش بشرطیکہ کوئی اتفاقیہ یا کوئی خاص رکاوٹ دُور ہو جائے۔ اور پھر آخری منزل جب کام کا ارادہ پورا ہو جائے، مثلاً رتناولی کے پلاٹ کو دیکھئے۔ پہلے ایکٹ میں پردہ اس سین پر اُٹھتا ہے جس میں راج منتری یعنی وزیر ہیروئن سے راجہ کا بیاہ رچانا چاہتا ہے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کی طرف ناٹک کا قدم اس سبق میں اُٹھتا ہے جب ہیروئن راجہ و تسں کی تصویر کھینچنے کا ارادہ کر لیتی ہے۔ دوسرے ایکٹ میں عاشق معشوق

تھوڑی دیر کے لئے ملتے ہیں۔ لیکن بڑی رانی کے اچانک آجانے کے ڈر سے چونکے ہوئے بھی ہیں، اس کے بعد راجہ وتس کو یہ ماننا پڑتا ہے کہ پریم کی جیت بڑی رانی کی ہمدردی اور مدد کے بغیر نہیں ہو سکتی اور آخری ایکٹ میں جب دلوں میں لگی ہوئی آگ محل میں بھی لگ جاتی ہے تو اس نازک اور بھیانک موقعہ پر راجہ وتس اور ہیروئن کو یہ ہمدردی اور یہ مدد مل جاتی ہے۔

ناٹک میں ان موقعوں کو جہاں ایک واقعہ دوسرے واقعہ سے ملتا ہے سندھی کہتے ہیں اور واقعات کا یہی میل اور ٹکراؤ پلاٹ کو آگے بڑھاتے ہوئے کام یا Action کو آخری منزل پر پہونچاتے ہیں۔

پہلا میل یا ٹکراؤ جسے مکھ کہتے ہیں اُسی سے ڈرامہ شروع ہوجاتا ہے پھر پلاٹ کا آگے بڑھنا جسے پرتی مکھ کہتے ہیں، اس کے بعد پلاٹ کے اندر چھپی ہوئی باتوں اور چھپے ہوئے واقعات کا ظاہر ہونا۔ (Development) جسے گربھ کہتے ہیں۔ پھر ناٹک کا ٹھہراؤ (Pause) یا درش اور اخیر میں انجام یا خاتمہ (Conclusion)

پلاٹ میں جہاں جہاں گرہ پڑجاتی ہے، یا پیچیدگی پیدا ہوجاتی ہے تو اُسے سلجھانے کے لئے سنسکرت ناٹک لکھنے والے بعض ترکیبوں کو کام میں لاتے ہیں۔ اس میں سے پانچ ایسی ترکیبیں ہیں جن میں انتر سندھی (Internal Junctions) کہا گیا ہے، مثلاً سپنا یا خواب جس کا ذکر وینی سنگھار میں دکھایا گیا ہے، جب دریودھن کی بیوی یہ خواب دیکھتی ہے کہ نکل نے ایک بھیانک بھیس میں سو سانپوں کو مار ڈالا۔ یہ مہابھارت میں کوروں کی بربادی کی گویا خطرناک پیشین گوئی ہے شکنتلا میں دشینت کے نام جو خط شکنتلا نے لکھا ہے اس سے بھی پلاٹ کی گتھیاں سلجھتی ہیں۔ اسی طرح پیغام سے بھی پلاٹ آگے بڑھتا ہے۔ پردے کے پیچھے سے ایک آواز دشینت کو رشی کے آشرم میں ہرنے کو مارنے سے روکتی ہے، اور آسمانی آواز یعنی آکاش بانی شکنتلا کے پتا کنو رشی کو شکنتلا اور دشینت کے بیاہ کی خبر دیتی ہے۔ اسی طرح رتناولی میں راج کماری نے جو راجہ کی تصویر بنائی ہے اس سے بھی پلاٹ میں رنگینی پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سے ایسے دلچسپ موقعے پیدا ہوجاتے ہیں جو کہانی کو پیچیدہ بھی بنا دیتے ہیں اور دلچسپ بھی۔ گتھیوں کو سلجھانے میں بھی اور کام یعنی Action کو آگے بڑھاتے ہیں۔ مثلاً نشہ میں کسی خاص ایکٹر کو چور کرکے بھی اس کے منھ سے بے خبری میں ایسی باتیں نکلوائی جائیں جن سے دوسرے ایکٹروں اور ناٹک کے دیکھنے والوں کو ضروری اور چھپی ہوئی باتیں معلوم ہوجائیں۔ اسی طرح اور بھی ترکیبیں ہیں جو کہانی کو دلچسپ اور رنگین بناتی ہیں۔ مثلاً بھیس بدلنا یا ذو معنی فقرے جن کے کئی مطلب نکلتے ہوں۔ یا ایسے موقعے اور ایسی حالتیں جو آگے

آنے والی باتوں پر روشنی ڈالیں، اس سے بھی سنسکرت ناٹک لکھنے والوں نے پورا پورا کام لیا ہے۔ مثلاً کوئی ایسی صورت حال یا ایسا موقع جس کو کئی طرح سے سمجھا جا سکے۔ (Ambiguous Situation) اکثر ہیرو کو اپنے مقصد کے پورا کرنے میں مدد دیتا ہے۔ وہ ڈرامیٹک طنز (Dramatic Irony) یعنی ایسا نقرہ کہ کہنے والا خود اس کی گہرائیوں اور مختلف مطلبوں کو نہ سمجھے اور ڈرامہ دیکھنے والے سمجھ جائیں اس کو بھی ہمارے سنسکرت ناٹک لکھنے والوں نے خوب نباہا ہے۔ مثلاً شکنتلا کے دوسرے ایکٹ میں پردے کے پیچھے سے ایک آواز آتی ہے جس میں ایک زنانہ کیرکٹر چکرواک کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنے شوہر سے الوداع کہے۔ صرف ناٹک دیکھنے والے اس حکم کا تعلق شکنتلا اور دشینت میں ہونے والی جدائی سے سمجھ سکتے ہیں۔ یا اُترام چرت میں رام جب یہ وعدہ کرتے ہیں کہ پرجا کی خوشی کے لئے وہ سب کچھ قربان کر دیں گے تو راجدھانی میں سیتا کے لنکا میں رہنے کی وجہ سے جو کانا پھوسی ہو رہی ہے اُسے سن کر رام کو اپنے دل کا خون کر کے سیتا کو نکال دینے کے واقعہ کی پیشین گوئی ہو جاتی ہے۔

سنسکرت ناٹک میں پلاٹ کے بارے میں یہ نہایت مختصر اور ادھورا بیان ہے، مگر اس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ناٹک لکھنے کا فن ناول اور کہانی اور مثنوی یا مہاکاویہ لکھنے کے فن سے بہت الگ ہے۔ اور اس فن کی گتھیاں سلجھانے کے لئے کیا کیا ترکیبیں کام میں لانا پڑتی ہیں۔ ہیرو ہیروئن اور چند آدمیوں پر جو کچھ بیتی ہے اس کی جھلکیاں چند ایکٹوں اور منظروں میں دکھا کر سنسکرت ڈرامہ نگار نہ صرف اپنے خاص پلاٹ کو آگے بڑھاتے ہیں بلکہ زندگی اور سنسار کی تصویر کھینچ دیتے ہیں اور چند گز لمبے چوڑے اسٹیج پر اور چند گھنٹوں میں ختم ہو جانے والی کہانی میں دنیا کا نقشہ دکھا دیتے ہیں، اور زندگی کی کہانی بیان کر دیتے ہیں۔

متفرق اشعار

(از پروفیسر مدہوش ایم۔اے)

عشق ہی زندہ ہمیں رکھتا ہے ورنہ مدہوش　　خون کچھ دل میں نہیں جان حقیقت میں نہیں

شاعری اک نغمۂ کیفِ دلِ مدہوش ہے　　دل کے اندر سوز ہے اور دل کے باہر ساز ہے

زمانہ گذرا زمانہ آیا جمود والے جمود میں ہیں　　غریبِ مدہوش ازل سے بسمل تڑپ رہا تھا تڑپ رہا ہے

فطرت میں اضطراب ہے چارہ ہی کچھ نہیں　　مدہوش بے قرار و محبت شعار کا

غریب بےبس و ہجراں نصیب ہے مدہوش　　وہ کب جیا اُسے جینے کا کب مزا آیا

درسِ عبرت

(از چودھری ہردیال شوق بی۔ اے۔ الہ آبادی)

ہے ایک روز چلنا

عشرت کی محفلوں کو راحت کی منزلوں کو
دولت کے مشغلوں کو دُنیا کے مرحلوں کو
حرمان و یاس پیکر
شکلِ خمار مضطر
تسلیم عرض کہہ کر ہے ایک روز چلنا

ذہنِ رسا سے ہو کر جوں چشمکِ تصوّر
یا ہو وداع اخگر جوں تابشِ منوّر
یا جس طرح ستارے
رخصت ہوں آسماں سے
اِس طور اِس جہاں سے ہے ایک روز چلنا

جاہ و جلالِ قیصر یا دولتِ سکندر
تاجِ مرصّعِ زر تختِ پُر از جواہر
ایوانِ پُر لآلی
قصرِ رفیع و عالی
سب چھوڑ چھاڑ خالی ہے ایک روز چلنا

ہے رفتنی یہ دنیا جینا ہے چند روزہ
کیا علم حالِ فردا پل کا نہیں بھروسہ
باطل جہاں کے دھندے
جھوٹے جہاں کے پھندے
آخر کو تو نے بندے ہے ایک روز چلنا

عصمت اور افلاس

(خواجہ عبداللطیف صاحب شمیم بھیروی)

شہر کی گلیوں میں آوارہ جوانی کی بہار — پڑ رہی جس پر نگاہِ بوالہوس ہے بار بار

مضطرب بےچین درد و رنج کی ماری ہوئی — انبساط و خرّمی کے در سے دھتکاری ہوئی

عشرتوں کی روح سے محروم ہے جس کی حیات — جس کے اشکوں سے لرزتا ہے ضمیرِ کائنات

جس کی آہوں سے ہے قلبِ عرش میں اک ارتعاش — جس کے نالوں سے فرشتوں کے کلیجے پاش پاش

جو تمدن کی نگاہوں میں ہے زہرِ زندگی — نوعِ انسانی کو ہے جو مستقل شرمندگی

جس کی قسمت میں فقط بیچارگی اور بھوک ہے — اسکی عصمت اسکی عفّت اور حیا مشکوک ہے

خونِ عفت سے اگر دامن ہوا اسکا داغدار — اس کو بھی سوچا کبھی اے عقل کے سرمایہ دار

اس کے درد و کرب کی دنیا سے محرم کون ہے؟

بیچ کھائے وہ اگر عصمت تو مجرم کون ہے؟

رباعیات

(۱)

خود سے نہ اُداس ہوں نہ مسرور ہوں میں — بالذات نہ روشن ہوں نہ بے نور ہوں میں

مختار ہے مختار رہے مختار ہے تو — مجبور ہوں مجبور ہوں مجبور ہوں میں

(۲)

اس دہر میں تا دیر ٹھہرنا بہتر — یا تیز روی سے کوچ کرنا بہتر

بس زندہ ہوں ابتک میں اسی تذبذب کے طفیل — جینے میں ہے فائدہ کہ مرنا بہتر

جوش

گذشتہ صدی کا ایک مشہور انگلو انڈین

Col. James Skinner.

کرنل جیمس اسکنر

۱۷۷۸ء - ۱۸۴۱ء

از مسٹر پیارے لال شاکر میرٹھی

غدر ۱۸۵۷ء سے بہت قبل بعض انگلو انڈین حضرات نے ہندوستان میں بڑا نام پیدا کیا۔ ان لوگوں کا تعلق بیشتر ہندوستانی والیانِ مُلک کی افواج سے تھا اور انھیں کی طرف سے وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجوں کا مقابلہ کیا کرتے تھے۔ پہلے تو ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج میں اُنکی کوئی گنجائش نہ تھی، لیکن جب متعدد والیانِ ملک اور فرانسیسیوں سے بگاڑ ہوگیا تو انھیں مجبور کیا گیا کہ کمپنی کی افواج میں شامل ہو جائیں، ان انگلو انڈین[1] حضرات میں شمالی ہندوستان میں دو نام خصوصیت کے ساتھ مشہور ہیں، یعنی گارڈنر اور اسکنر۔ دونوں فوج میں کرنل تھے اور دونوں نے بہت شہرت حاصل کی، اور دونوں نے اپنے پیچھے کافی جائداد چھوڑی گارڈنر خاندان کی جائداد تو خاندان والوں کی مقدمہ بازی کی نذر ہو چکی۔ اب صرف نام ہی نام باقی رہ گیا ہے لیکن اسکنر خاندان والوں نے بڑے رکھ رکھاؤ سے کام لیا۔ محض جائداد کے سہارے عضوِ معطل ہو کر نہیں رہ گئے بلکہ اپنی ذاتی قابلیت سے خود بھی ترقی کی۔ اُنکی زمینداری ابھی تک قائم ہے۔ آج ہم اسی اسکنر خاندان کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج میں ایک اسکاچ بنام ہرکولیس اسکنر تھا۔ ۱۸۰۰ء میں یہ صاحب لفٹنٹ کرنل بنائے گئے، اور ۱۲ر جولائی ۱۸۰۳ء کو بڑا گنج (بنگال) میں اُن کا انتقال ہوا۔ یہ اُن چند یوروپین اصحاب میں تھے جنھیں ہندوستان جنت نشان کی آب و ہوا نے اپنا گردیدہ بنا لیا تھا۔ چنانچہ ایک راجپوت شریف زادی سے شادی کر کے وہ یہیں کے ہو رہے تھے۔ وہ خاتون ایک زمیندار کی بیٹی تھی، اور اپنی نوعمری کے زمانہ میں راجہ جیت سنگھ سے معرکۂ جنگ کے موقع پر بطور "مالِ غنیمت" انگریزوں کے ہاتھ

---

[1] اس مضمون میں جہاں کہیں لفظ "انگلو انڈین" استعمال ہوا ہے، اس سے وہی مخلوط النسل طبقہ مراد ہے جس کو ۳۰-۴۰ برس قبل انگریزی میں یوریشین اور ہندستانی میں کِرانی کہا جاتا تھا۔ چونکہ آجکل انگلو انڈین کے معنی میں بہت وسعت پیدا ہو گئی ہے، اس لئے یہ صراحت ضروری تھی۔

آئی تھی۔ اُس وقت ہرکولیس اسکنر فوج میں انسائن تھے، اُنھوں نے اس راجپوت لڑکی کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔ اور آگے چل کر اُسی سے شادی کرلی۔ اُس سے چھ اولادیں ہوئیں۔ مگر آخرکار ۱۷۹۰ء میں اُس نے خودکشی کرلی۔ وہ اس ذلت کو برداشت نہ کرسکی کہ اُس کی بیٹیوں کو زنانخانے سے نکال کر اسکول بھیجا جائے یا کمپنی کے انگریز ملازمین سے اُن کی شادی کی جائے۔ اُس کے مرنے کے بعد اُس کے تین بیٹے یعنی ڈیوڈ، جیمس (عمر ۱۵ سال) اور رابرٹ کلکتہ کے فوجی یتیم خانے میں داخل کردئے گئے، بعد ازاں ۱۷۹۴ء میں ان کا ایک بورڈنگ میں انتظام ہوگیا۔

۱۷۹۶ء میں جیمس کو اسکول سے نکلکر کام سیکھنے کی غرض سے کلکتہ کے ایک مطبع میں جانا پڑا۔ چھپائی کے ٹھپّوں (بلاک) پر سیاہی لگانا اُس کا کام تھا۔ مگر اس کام میں اُسکا جی نہ لگا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"اس کام سے میرا جی اُکتا گیا۔ میں نے تہیہ کرلیا کہ یہاں سے فرار ہوکر سمندر کا رُخ کروں۔ چنانچہ تیسری شب کو میں دیوار پھاند کر نکل بھاگا۔ میری جیب میں صرف چار آنے تھے۔ ان پیسوں سے میں نے چھ دن تک گذارہ کیا۔ جب کچھ باقی نہ رہا تو بازار میں اِدھر اُدھر پھر کر کام ڈھونڈنے لگا۔ جو کام مل جاتا، اُسی کو کرکے کچھ پیسے کما لیتا۔ کئی روز تک میں نے بوجھ اُٹھاکر یا بڑھئی کا برمہ گھماکر اپنا کام چلالیا۔ ان کاموں نے مجھے دو آنے یومیہ مزدوری مل جاتی تھی۔ میں اپنے دن جیسے تیسے کاٹ رہا تھا کہ ایک دن حسنِ اتفاق سے میری بڑی بہن کے ملازم کی نظر مجھ پر پڑگئی۔ وہ مجھے پکڑ کر لے گیا اور لے کر جاکر اپنے آقا کے سامنے پیش کردیا۔ میرے بہنوئی نے مجھے خوب پھٹکارا، اور سخت سُست کہکر اپنے دفتر میں بھیج دیا۔ اُن کے دفتر میں مجھے قانونی یادداشتوں کی نقلیں کرنا پڑتی تھیں۔۔۔۔"

کچھ روز اسی طرح گذر گئے۔ اسی اثنا میں ایک دن کپتان برن سے ملاقات ہوگئی۔ کپتان صاحب جیمس اسکنر کے دھرم باپ تھے۔ بات چیت میں اُنھوں نے بھانپ لیا کہ لڑکا سپاہی بننے پر تُلا ہوا ہے، اُنھوں نے جیمس کو ایک خط دیکر جنرل ڈی بوئن کے پاس بھیجا۔ یہ صاحب فرانسیسی نسل، مرہٹہ فوج متعینہ علیگڈھ کے سپہ سالار تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جیمس اسکنر کو مرہٹہ فوج میں کمیشن مل گیا۔ چنانچہ اُسکو انسائن بناکر متھرا بھیج دیا گیا۔ آیندہ دس سالہ مدت میں جیمس اسکنر نے کئی نمایاں خدمات انجام دیں۔ سب سے پہلے چندکوری کے معرکہ میں اُس کے جوہر کھلے۔ فرانسیسی سپہ سالار جنرل پیرون اتنا خوش ہوا کہ اُس کو لفٹنٹ بنادیا۔ حملۂ چیتوڑ کے وقت جیمس اسکنر نے بڑے آڑے وقت سندھیا کی جان بچائی۔ سندھیا نے بھی اس کارگذاری کا دل کھول کر اعتراف کیا اور بھرے دربار میں گرمجوشی کے ساتھ بغلگیر ہوا۔ اور ایک گھوڑا، ایک تلوار، ایک ڈھال اور طلائی کڑوں کی ایک جوڑی (جسمیں ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے)

انعام دی۔ اس کے بعد جیمس اسکنر نے سنگانیر، لکھوا اور ودا کی مہموں میں خوب خوب دادِ شجاعت دی، جس کے صلہ میں سندھیا کی فوج کے کمانڈنٹ نے اُس کو ایک چتر اور ایک پالکی انعام دی اور اُس کے اعزاز میں جے پور میں ایک شاندار دعوت کی۔

اس وقت تک جیمس اسکنر کو کپتان کا عہدہ مل چکا تھا۔ اُس کا چھوٹا بھائی، رابرٹ اسکنر بھی ساتھ تھا اور وہ بھی انسائن بن چکا تھا۔ کچھ دنوں بعد سندھیا کا اعتماد اپنی فوج پر سے اُٹھ گیا۔ یہ بدمزگی اتنی بڑھی کہ جب راجہ اونیرا اپنی فوج لے کر بڑھا تو سندھیا کی فوج اُس کو تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔ صرف جیمس کا رسالہ مقابلہ میں ڈٹا رہا۔ اس معرکہ میں جیمس اسکنر کے ایک گولی آکر لگی جو جبڑے سے پار ہو گئی۔ وہ بیہوش ہو کر گر گیا اور مُردہ سمجھ کر اُس کو میدانِ جنگ میں چھوڑ دیا گیا۔ قریباً ایک ہزار سوار بھی مجروح و مقتول ہوئے۔ جیمس اسکنر نے اس مصیبت و بیچارگی کے وقت عہد کیا کہ اگر وہ زندہ بچ گیا تو ایک کلیسا تعمیر کریگا۔ جیمس اسکنر کے مرجانے میں کوئی کسر باقی نہ رہی تھی۔ دِن رات کھلے میدان میں بھوکا پیاسا پڑے رہنا کوئی معمولی بات نہیں ہے لیکن خُدا نے اُس کی مصیبت دُور کی۔ تیسری صبح کو ایک چمار عورت اُدھر سے گذری تو اُس غریب نے جیمس اسکنر کی خبر لی اور اُسے کھانے کو روٹی اور پینے کو پانی دیا۔ اس کے بعد جیمس اسکنر کو اونیرا کے فاتح کیمپ میں پہونچایا گیا۔ اُس کی کیفیت جیمس اسکنر کی زبان سے سُنئے:۔

"راجہ اونیرا کا خیمہ قریب ہی تھا۔ لوگ مجھے چارپائی پر ڈال کے وہاں لے گئے۔ جب میں نے اندر داخل ہو کر سلام کیا تو راجہ صاحب ایکدم اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُنھوں نے ایک مونڈھا منگایا اور میرے قریب بیٹھ گئے۔ بعدازاں مجھ سے میرا نام، میرا عہدہ وغیرہ دریافت کیا۔ میں نے جواب دیا کہ پہلے تو میں سپاہی تھا اور اب آپکا قیدی ہوں۔ اُنھوں نے مجھے میرے خیمہ میں واپس بھیج دیا اور مجھ سے کہا کہ اِس وقت تمھیں سب سے زیادہ آرام کی ضرورت ہے۔ اسی کے ساتھ اُنھوں نے میدانِ جنگ میں میرے رویہ کی بھی تعریف کی۔ میں اپنے خیمہ میں پہونچا ہی تھا کہ راجہ صاحب کی طرف سے ایک چوبدار آیا اور پانسو ۵۰۰ روپے نقد اور ایک تھال میں کھانا لایا۔ اس رقم میں سے ایک سو ۱۰۰ روپے تو میں نے اُسی چوبدار کو انعام دیدئے اور بقیہ چار سو ۴۰۰ روپے اور کھانا اپنے آدمیوں میں تقسیم کر دیا.... یہیں اپنے بھائی سے بھی میری ملاقات ہوئی۔ اُس کا زخم اب مندمل ہو چکا تھا۔ اب وہ لفٹنٹ کے عہدہ پر فائز تھا۔ اُس کے ذریعہ سے میں نے ایکہزار روپے اُس نیک دِل چمار عورت کو بھیجے جس نے سب سے پہلے میری مدد کی تھی اور جس کو میں اپنی ماں کی جگہ سمجھتا ہوں۔"

اِن مہمات کے علاوہ جیمس اسکنر نے محاصرۂ دہلی (مئی ۱۷۹۸ء) میں بھی حصہ لیا۔ نیز اُس حملہ میں بھی شریک ہوا جو ۱۷۹۹ء میں "راجہ" جارج ٹامس کے خلاف ہانسی پر ہوا تھا۔

اب تک جیمس اور رابرٹ دونوں بھائی والیانِ ملک کے سلسلۂ ملازمت میں تھے۔ کیونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں کا یہ بے معنی اور بیدردانہ فیصلہ تھا کہ کسی انگلو انڈین کو کمپنی کی باضابطہ افواج میں ملازم نہ رکھا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ اُس زمانہ کے بیشمار بہادر انگلو انڈین "خارجہ" افواج میں تو ہر درجہ اور عہدہ پر فائز تھے مگر کمپنی والے اُن کو نام کو بھی نہ پوچھتے تھے۔ لیکن جب کمپنی کا والیانِ ملک اور فرانسیسیوں سے بگاڑ ہوگیا تو وہی انگلو انڈین مجبور کئے گئے کہ خارجہ افواج سے قطع تعلق کرکے کمپنی کی افواج میں شامل ہوجائیں ورنہ باغی کی موت مارے جائیں گے۔ چنانچہ جب ہلکر سے تیسری مرہٹہ لڑائی چھڑی تو جیمس اور رابرٹ دونوں کو سندھیا کی ملازمت ترک کرنا پڑی۔

مرہٹوں کی دوسری لڑائی کے خاتمہ اور فتح دہلی کے بعد یعنی ۱۸۰۳ء میں آٹھ سَو مرہٹہ سواروں کی ایک جمعیت لارڈ لیک کے کیمپ میں پہونچی اور اپنی فوجی خدمات پیش کیں۔ لیکن اِس پیشکش کیساتھ دو خاص شرائط تھیں۔ اول یہ کہ وہ اپنے قدیم آقا یعنی سندھیا کے خلاف ہتھیار نہ اٹھائیں گے۔ دوم یہ کہ "سکندر صاحب بہادر"[1] کو ان کا کمان افسر مقرر کیا جائے۔ لارڈ لیک نے اُن کی خدمات اور شرائط دونوں کو منظور کیا۔ اور جیمس اسکنر کو اس بے ضابطہ رسالہ کا کمان افسر بنادیا۔ آگے چل کر یہ رسالہ ۱ بنگال کیولری کے نام سے مشہور ہوا اور وہی اسکنرز کیولری کے نام سے آج تک قائم ہے۔

اسی رسالہ کی مدد سے جیمس اسکنر نے ۱۸۰۵ء میں مادھو راؤ ہلکر کے قلعہ مالاگڈھ پر قبضہ کیا یہاں پر میں پانسو سکھوں کو موت کے گھاٹ اُتارا اور اُن سرداروں کو گرفتار کیا جو جمنا کے ساحل پر جمع ہوگئے تھے۔ اس کے بعد جیمس اسکنر کو علیگڈھ اور دہلی کے اُس درمیانی علاقہ کی کمان سپرد ہوئی جس میں پیروں نے فرانسیسی ریاست قائم کی تھی۔ اس علاقہ میں جیمس اسکنر نے اپنے چار سَو سواروں کی مدد سے ساٹھ ہزار بیلوں کو چھڑا کر لارڈ لیک کے کیمپ میں پہونچایا۔ ہلکر کی ایک پیش نہ گئی۔ اس کارنامہ سے لارڈ موصوف اِسدرجہ خوش ہوئے کہ جو تلوار اُن کے پہلو میں لٹک رہی تھی وہی اُتار کر مع بیس ہزار نقد جیمس اسکنر کو انعام دیدی۔ جیمس اسکنر نے یہ ساری رقم اپنے سواروں میں تقسیم کردی۔

اِس واقعہ کے بہت عرصہ بعد پنڈاری کے مشہور سرغنہ امیر خاں کو شکست دی۔ اِس جنگ

---

[1] سکندر بادی النظر میں اسکنر کی بگڑی ہوئی صورت معلوم ہوتی ہے لیکن ہندوستانی سوسائٹی میں جیمس اسکنر کا عرف "سکندر مرزا" تھا۔ رابرٹ اسکنر "چھوٹے مرزا" کے نام سے مشہور تھے

دسمبر ۱۸۱۹ء میں ایک دن رابرٹ اسکنر کو دشمن کی ایک توپ ہاتھ لگی۔ جب وہ صف میں پہونچا یا تو برطانی فوج نے پرجوش نعروں سے اُس کا خیر مقدم کیا۔ جب پنڈاری کا قضیہ ختم ہوگیا اور اسکنر کا رسالہ کامیاب و بامرام دہلی سے گذرا تو ریذیڈنٹ کرنل آکٹر لونی نے اس کا معائنہ کیا اور اپنی تلوار کھول کر رسالہ کے بہادر کمان افسر جیمس اسکنر کو عطا کی۔

کتاب موسومہ "Native Irregular Horse." کا مصنف اسکنر کے رسالہ کے بارہ میں لکھتا ہے:-

"اِس رسالہ کی اسلحہ بندی میں خود کی شان امتیازی ہے۔ خود فولاد کا اور پالش شدہ ہوتا ہے، چوٹی پر نکیلی سیخ ہوتی ہے۔ ایک طرف زنجیر لگی ہوتی ہے جو ٹھوڑی کے نیچے سے گذر کر دوسری طرف اٹکادی جاتی ہے۔ ہاتھوں میں پالش شدہ آہنی دستانے ہوتے ہیں..... گھوڑے ہلکے رنگ کے ہوتے ہیں اور جن پر جھول ڈالی جاتی ہے۔ اُن کی دُمیں مہندی سے رنگی جاتی ہیں اور پیشانی اور پٹھوں پر ہلال اور ستارے بنا دئے جاتے ہیں۔ یہ بے ضابطہ رسالہ اپنی داؤں گھات اور مستعدی کیلئے مشہور ہے۔ رسالہ کے افسروں نیز اُن کے جانوروں کی پوشش میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ مثلاً اُنکے گھوڑوں کے سر پر ایک کلغی ہوتی ہے جس کے زیریں حصّے میں طلائی تعویذ ٹنگے ہوتے ہیں۔ پھر پیشانی پر بہت قیمتی جھومر ہوتا ہے۔ سینے پر طوق اور گردن میں کئی کئی ہار پڑے ہوتے ہیں۔ ہار نیلے پوت کے بھی ہوتے ہیں اور نقرئی بھی۔ نظر بد کے اثر کو زائل کرنے کی غرض سے ہاروں میں تعویذ اور نقش والی تختیاں بھی پروئی ہوتی ہیں ... ... سواروں کا لباس نہایت دیدہ زیب اور دلفریب ہوتا ہے۔ جوان یوروپین بڑے آرزو مند ہوتے ہیں کہ وہ بھی کسی بے ضابطہ رسالہ سے منسلک ہو جائیں ......"

۱۸۰۵ء میں سر جارج بارلو گورنر جنرل مقرر ہوئے اور جب انھوں نے ہلکر سے مصالحت کرلی تو مناسب خیال کیا گیا کہ اب فوج میں بھی تخفیف کردی جائے۔ لہذا جیمس اسکنر کا رسالہ توڑ دیا گیا۔ سواروں کو پنشنیں یا یکمشت رقوم دے کر رخصت کیا گیا اور جیمس و رابرٹ اسکنر کو بیس ہزار سالانہ کی جاگیر عطا ہوئی لیکن چونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انوکھے احکام میں یہ حکم بھی شامل تھا کہ کسی یوروپی النسل آدمی کو ہندوستان میں اراضیات کا مالک بننے کا موقع نہ دیا جائے۔ لہذا وہ جاگیر بہت جلد واپس لے لیگئی اور اُسکی بجائے جیمس اسکنر کو کرنل کی پنشن عطا ہوئی اور رابرٹ اسکنر کو میجر کی۔ ۱۸۱۳ء و ۱۸۱۹ء میں جب اراضیات کے متعلق وہ پابندی اُٹھالی گئی تو لارڈ ماٹرا نے از سر نو وہی جاگیر اُن دونوں بھائیوں کو عنایت فرمائی یہ جاگیر اُس علاقہ میں عطا ہوئی تھی جو راجہ جارج ٹامس کو شکست دیکر قبضہ کیا گیا تھا۔

ہندوستان میں انگلو انڈین جماعت کے طور و طریق حد سے زیادہ بدنام ہیں۔ دُنیا کی کوئی خرابی نہیں جو اس ترقی یافتہ جماعت میں نہ پائی جاتی ہو۔ یہاں تک کہ بگڑے ہوئے ہندوستانی مسیحی بھی اپنی برائیوں پر پردہ ڈالنے کی غرض سے انگلو انڈین بن جاتے ہیں۔ لیکن غدر سے پیشتر اس جماعت میں اتنی بے غیرتی نہ پائی جاتی تھی مثال کے طور پر رابرٹ اسکنر کی زندگی کا آخری واقعہ ملاحظہ فرمائیے۔

رابرٹ اسکنر کو اپنی بیوی کے چال چلن کے بارہ میں اُلٹی سیدھی باتیں سُنکر بیحد ندامت ہوئی۔ ایک روز اُس نے اپنی بیوی کو بُلا کر اُس سے کہا کہ "مجھے تمھاری عصمت و پاکبازی پر اگرچہ کامل اعتماد ہے لیکن عوام کی چہ میگوئیاں ناقابل برداشت ہوگئی ہیں"۔ اُس نے اپنی بیوی اور اُس کی کئی پیش خدمتوں کیلئے سزائے موت تجویز کی۔ اُس کی بیوی نے بڑے سکون اور اطمینان سے اس سزا کو سُنا اور نہایت ملائمت و عاجزی سے درخواست کی کہ "مجھے اور میری پیش خدمتوں کو صرف غُسل کرنے کی اجازت دیدی جائے تاکہ ہم لوگ اس سزا کے لئے تیار ہو جائیں"۔ رابرٹ اسکنر نے یہ درخواست منظور کی۔ عورتوں نے غُسل سے فارغ ہوکر اپنا بہترین ملبوس نیز تمام زیورات زیب بدن کئے اور بڑی سج دھج کے ساتھ رابرٹ اسکنر کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ اُس اثنا میں رابرٹ اسکنر بھی تیار ہو چکا تھا۔ اُس نے پستولیں بھر رکھی تھیں۔ بیوی سامنے آئی تو اُس نے بڑی محبت سے اُس کو اپنے سینہ سے لگایا۔ بعدازاں بڑے صبر و تحمل سے اُس کو نشانہ بنادیا پھر اُس کی پیش خدمتوں کا قصّہ تمام کیا۔ اور سب کے آخر میں وہی پستول اپنے اوپر بھی داغ لی۔ ذرا سی دیر میں گھر بھر کا صفایا ہوگیا (سنہ ۱۸۲۱ء)۔

جیمس اسکنر کی فوجی سرگرمیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اُس نے ضلع ہریانہ کی سکونت اختیار کی۔ اور اپنے ذاتی رسالہ کو اپنے ساتھ رکھا۔ سنہ ۱۸۲۶ء میں اُس کے رسالہ نے اُس کی سرکردگی میں بھرت پور کا محاصرہ کیا۔ چند سال قبل وہ پنڈاری کو زیر کر چکا تھا۔ اُس کی اِن خدمات کے صلہ میں اُس کو برطانی افواج میں لفٹنٹ کرنل کا درجہ عطا ہوا، اور سنہ ۱۸۲۸ء میں سی۔ بی۔ آئی کا امتیاز حاصل ہوا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُس کی فوجی خدمات کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ اب اُس کا وقت زیادہ تر اپنے رسالہ کی دیکھ بھال اور اپنی زمینداری کے انتظام میں صرف ہوتا تھا۔ اُس نے اپنے مزارعین کو آبپاشی کی سہولتیں بہم پہونچانے کیلئے بہت روپیہ صرف کیا تھا۔ سرکاری حکام نے اُس کی زمینداری کی ہمیشہ تعریف کی۔ اُس کے کاشتکار آج تک اُس یاد کرتے ہیں اور عجیب انداز سے کہتے ہیں کہ "وہ تو بادشاہ تھا"!

جیمس اسکنر صاحب عملاً فوجی ذمہ واریوں سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ اِس لئے اب اپنے اُس عہد کو پُورا کرنے کا ارادہ کیا جو میدان جنگ میں خُدا کے سامنے کیا تھا۔ چنانچہ دہلی میں نہایت شاندار کلیسا

تعمیر کیا اور نومبر ۱۸۳۶ء کو بشپ ڈانئیل ولسن کے ہاتھوں اُس کے تقدیس کی رسم ادا ہوئی۔ رسم تقدیس ادا ہونے کے بعد جیمس اسکنر اور اُس کے تین جوان بیٹے "استحکام" کے لئے مذبح کے سامنے حاضر ہوئے اور سرنگوں ہوکر اپنی بقیہ زندگی خدا کی نذر کی۔

جولائی ۱۸۳۶ء میں ایشیاٹک جرنل میں جیمس اسکنر کے ایک ہمعصر نے تحریر کیا تھا۔

"کرنل اسکنر کی دولت کی بڑی شہرت ہے۔ زمینداری کے علاوہ اُس کو گھوڑوں، شال دوشالوں اور نیل کے کاروبار سے بڑا نفع ہوتا ہے۔ اُس کا خزانہ بھرا پڑا رہتا ہے۔ ایک عالیشان رہائشی مکان اور کارخانۂ نیل کے علاوہ کرنل نے اپنے قیمتی سامان کی حفاظت کے لئے بلاسپور میں ایک قلعہ بھی تعمیر کر رکھا ہے۔ اس قلعہ میں بیس توپیں نصیب ہیں...... کرنل اسکنر کے یہاں متعدد طوائفیں اور کافی تعداد میں کلانوت ملازم ہیں جو اپنے کمال سے اُس کو اور اُس کے مہمانوں کو خوش کیا کرتے ہیں۔ ہانسی میں بھی کرنل کا ایک خوشنما مکان ہے اور وہاں بھی وہ تمام لوازم موجود مہیا ہیں جو دوسرے مکان میں ہیں۔ کرنل کی طبیعت فطرتاً مہربان واقع ہوئی ہے ...... کرنل نے ایک چھوٹی سی لڑکی کو بیٹی بناکر پرورش کیا تھا۔ وہ ایک انگریز بچی تھی جو مخصوص حالات میں اُس کے سپرد کی گئی تھی۔ جب وہ لڑکی جوان ہوئی تو کرنل اسکنر نے اُس کی اپنے بیٹے سے شادی کردی۔ اگرچہ کرنل کا تمام خاندان مسیحی تھا اور اسی ماحول میں اُس لڑکی کی بھی پرورش و تعلیم ہوئی تھی، تاہم معاشرت میں اسلامی رنگ نمایاں تھا۔ وہ انگریز لڑکی بھی پردے میں رہتی تھی، حتیٰ کہ شادی سے قبل کسی یوروپین کی نظر اُس پر نہ پڑی تھی۔...."

وہ اسلامی حکومت کا زمانہ تھا جیسے آجکل ہر کہ ومہ آنکھیں بند کرکے "انگریزیت" کی تقلید کررہا ہے، اُسی طرح اُس زمانے میں اسلامی تہذیب کا بول بالا تھا۔ انگلو انڈین خاندانوں کی عورتیں بھی پردے میں رہتی تھیں اور اُن کا لباس بھی عموماً اسلامی ہوتا تھا۔ جیسے آجکل سیدھے سادے ناموں کی صورت بگاڑ کر اُن میں انگریزی شان پیدا کی جارہی ہے، اُسی طرح اُس زمانے میں اسلامی ناموں کا دور دورہ تھا۔ حتیٰ کہ خالص یوروپین اور انگلو انڈین حضرات بھی ہندوستانی ناموں سے مشہور تھے۔ بہتوں نے اپنے نام کا ترجمہ کرلیا تھا۔ مثلاً الگزنڈر سے سکندر، سالومن سے سلیمان وغیرہ۔ بہتوں نے اپنے انگریزی نام ترک کرکے ہندوستانی نام رکھ لئے تھے، مثلاً بھوپال کے بوربان صاحب جو فرانسیسی الاصل تھے، شہزادہ مسیح بن گئے تھے۔ بعض لوگ اپنے انگریزی ناموں سے ملتے جلتے ہندوستانی ناموں سے مشہور تھے مثلاً کرنل آکٹرلونی عام طور سے لونی اختر کہلاتے تھے۔ مرزا، نواب مرزا، چھوٹے مرزا، خان صاحب وغیرہ بعض

اینگلو انڈین حضرات کے عرف تھے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ تقلید محض برائے نام نہ تھی۔ بلکہ اینگلو انڈین خاندانوں میں بھی وہی تہذیب و شرافت، وہی خلوص و سیرچشمی، وہی شرم و حیا اور وہی پاکبازی و راستی پائی جاتی تھی جس کے لئے ہمارا ہندوستان تمام دُنیا میں مشہور و ممتاز ہے۔

کرنل اسکنر کے بیٹے کی شادی کی رسوم ادا کرنے کے لئے آگرہ کے چپلن کو ہانسی بلایا گیا تھا۔ واپسی پر اُس نے یوروپین دلہن کے بارے میں نہایت دلچسپ حالات بیان کئے تھے:۔

"دلہن ہندوستانی لباس میں ملبوس تھی۔ اُس کے دوپٹہ میں اٹھارہ سو روپئے کی قیمت کے موتی ٹنکے ہوئے تھے۔ اسی سے اُس کے زیورات کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اجنبیوں کی موجودگی کے باعث دلہن کسی قدر پریشان نظر آتی تھی۔ تاہم وہ شرم و حیا اور وہ بھولا پن اُس میں نمایاں تھا جو صرف ہندوستانی ننانخانوں ہی میں نظر آسکتا ہے......"

کرنل جیمس اسکنر کے باب میں تحریری شہادت موجود ہے کہ وہ شعر بھی کہتے تھے۔ چنانچہ ڈائس سومبر بیگم سمرو کے متبنیٰ اور وارث نے دیوانگی کے الزام کی تردید میں بطور جواب دعویٰ ایک پمفلٹ لکھا تھا اُس میں اپنے حالات بھی قلمبند کئے ہیں، اور اسی ضمن میں ذکر کیا ہے کہ جب وہ ہندوستان سے انگلستان جانے کی تیاریوں میں مصروف تھا تو کرنل جیمس اسکنر نے ایک فارسی نظم لکھ کر بھیجی تھی جسمیں اس سفر کو غیر ضروری بتا کر اس ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔ اِس سے خیال ہوتا ہے کہ اسکنر صاحب اُردو میں بھی شعر کہتے ہوں گے۔ لیکن افسوس ہے کہ کہیں سے اُن کا ایک شعر بھی دستیاب نہ ہوسکا۔

۴ر دسمبر ۱۸۴۱ء کو اِس بہادر اور شیر دل اینگلو انڈین نے ہانسی میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اگرچہ لاش وہیں سپردِ خاک کردی گئی تھی، لیکن ایک سال کے بعد اُس کو نکال کر بڑے اعزاز و تکریم کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ دہلی پہونچایا گیا۔ دہلی سے چار میل کے فاصلہ پر دہلی والوں کی ایک بڑی جمعیت نے جسمیں ہر درجہ و مرتبہ کے لوگ شامل تھے، جلوس کا ساتھ دیا۔ لاش کے دہلی پہونچنے پر کرنل کی عمر کے لحاظ سے ایک ایک منٹ کے وقفہ کے بعد ۶۳ توپیں سر ہوئیں۔ لاش اُسی گرجہ میں، جسکو کرنل جیمس اسکنر نے خُدا کے نام پر تعمیر کیا تھا، مذبح کے جنگلے کے اندر دفن کی گئی۔ یہ وہی گرجا ہے جو سینٹ جیمس چرچ کے نام سے مشہور اور اندرون کشمیری دروازہ واقع ہے۔

---

[1] ڈائس سومبر نے یوروپ میں پہونچکر وہیں شادی کرلی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد اُسکی بیوی نے اُس کو دیوانہ بتا کر اُسکی ساری دولت پر قبضہ کرلیا۔ پیرس کے ہائیکورٹ نے بھی اُس کو دیوانہ قرار دے دیا۔ اِسی موقع پر ڈائس سومبر نے اِس الزام کی تردید میں ایک ضخیم پمفلٹ چھاپ کر عدالت میں پیش کیا تھا۔

بشپ ولسن نے بیان کیا تھا کہ کرنل جیمس اسکنر دراز قد، فربہ، اور سانولی رنگت کا ایک ۵۶ سالہ فوجی آدمی ہے نیلے رنگ کی فوجی وردی میں ملبوس، سر پر وزنی ہیٹ، ایک طرف فوجی تلوار لٹکی ہوئی اور گلے میں سرخ رنگ کا فیتہ اڑا پڑا ہوا۔ کرنل اسکنر کے بیٹے اور بیٹیاں مسیحی تھے، لیکن بچوں کی ماں آخیر وقت تک مسلمان رہی۔ کرنل اسکنر نے بشپ ولسن سے کہا تھا کہ "اس سے اچھی اور بہتر بیوی ملنا ممکن نہیں۔ میرا اُس کا تیس۳۰ برس سے زیادہ کا ساتھ ہے، لیکن مجھے کسی قسم کی شکایت کبھی پیدا نہیں ہوئی"۔

لارڈ ویلسلی سے آرل آف آکلینڈ تک سب نے کرنل جیمس اسکنر کی فوجی قابلیت کا اعتراف اور اُس کے حُسنِ اخلاق کی تعریف کی ہے۔ سر جان ملکم نے ایک بار کہا تھا:۔

"یہ خیال نہ کرنا کہ میں غلو سے کام لے رہا ہوں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ تم اُتنے ہی اچھے ہو جتنا میرے جاننے والوں میں کوئی انگریز اچھا ہو سکتا ہے"۔

کرنل اسکنر کو ہر قسم کا آرام و آسائش حاصل تھا، لیکن خود اُن کی یہ کیفیت تھی کہ اپنے ابتدائی زمانہ کے اُن تاریک دنوں کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ جب افلاس و تنگدستی نے عرصۂ حیات کو تنگ کر رکھا تھا اور دُنیا میں کوئی یار و مددگار نہ تھا۔ اُن کے دسترخوان پر ایک چوبی چمچہ (ڈوئی) ہمیشہ موجود ہوتا تھا کہ وہ زمانہ پیشِ نظر رہے۔

کرنل اسکنر نے پانچ بیٹے اپنی یادگار چھوڑے تھے۔ یعنی

۱۔ جوزف اسکنر ۱۸۵۵-۱۷۹۶ء
۲۔ کرنل جیمس اسکنر ۱۸۰۵-۶۲ء
۳۔ میجر ہرکولیس اسکنر ۱۸۱۳-۵۲ء
۴۔ ٹامس اسکنر ۱۸۲۳-۶۴ء
۵۔ الگزنڈر اسکنر ۱۸۲۵-۸۵ء

ڈکشنری آف نیشنل بیاگرفی (جلد ۵۲) کا بیان ہے کہ کرنل اسکنر کی کم سے کم چودہ۱۴ بیویاں تھیں، اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ پانچوں بیٹے ایک ہی بیوی سے تھے یا مختلف بیویوں سے۔

کرنل اسکنر کی وفات کے بعد اُنکا سب سے چھوٹا بیٹا، الگزنڈر اسکنر زمینداری کی مینجری کے فرائض انجام دیتا رہا۔ ۱۸۸۵ء میں وہ بھی رحلت کر گیا تو زمینداری تمام ورثہ میں تقسیم ہو گئی۔

ساقی

(از حضرت رشدی القادری حیدر آبادی)

بتاؤں کیا کہ ترا فیض کتنا عام ہے ساقی
تری محفل کا ہر اک جرعہ کش خوش کام ہو ساقی

خدا جانے تری مے کس قدر کیف آفریں ہوگی
نظر میں تیری جب رنگینیِ صد جام ہو ساقی

درِ میخانہ جب سے بند ہے ہم کم نصیبوں پر
نہ اپنی صبح ہے ساقی نہ اپنی شام ہو ساقی

کرم تیرا نرالا ہے کہ جو گستاخ میکش ہے
وہی تیری نظر میں مستحقِ جام ہو ساقی

جسے تو اپنے پہلو میں بٹھا کر جام دیتا ہے
بتا اُس فخرِ بزمِ شوق کا کیا نام ہو ساقی

گھٹا چھائی اِدھر اُمید کے نقشے اُدھر اُبھرے
یہ تیری بے نیازی آج بے ہنگام ہو ساقی

سمجھتے ہیں یہ بربادِ خرد تیری اداؤں کو
بھری محفل میں تیرا راز طشت از بام ہو ساقی

ترے در سے نکلتا ہے کوئی بیہوشیاں لیکر
سمجھتا ہوں ابھی اُس کی تمنا خام ہو ساقی

ہماری تشنگی ہے تیرے لطفِ خاص کی طالب
ہمیں کیا بزم میں گر فیض تیرا عام ہو ساقی

ترے آتے ہی محفل بن گئی تصویرِ بیتابی
پیالہ گیر ہر اک رندِ مے آشام ہو ساقی

نگاہِ لطف اب تو رشدیِ دیوانہ پر اپنے
کہ مدت سے یہ نذرِ گردشِ ایام ہے ساقی



جوشؔ کا سیاسی مسلک

از گوبند پرشاد مسوی ایم۔اے

جب سے ہندوستان میں بیداری پیدا ہوئی ہے اور اہلِ وطن نے آزادی کی جدوجہد شروع کی ہے۔ اُردو زبان کے شاعر بھی سیاسی تحریکوں سے متاثر ہوئے ہیں۔ آخر کار وہ بھی سماج کے افراد ہیں اور اُن کی زندگی میں سماجی زندگی کے اثرات نمایاں رہتے ہیں۔ حالؔی و آزادؔ نے ابتدائی دور میں حُبِ وطن کے گیت گائے۔ لیکن اُنکی حُب الوطنی میں وہ گرمی نہ تھی جو غیر ملکی حکومت کے لیے "برقِ خرمن" ثابت ہو۔ سرور جہاں آبادی کے دل میں بھی اس چنگاری نے انگارے کی شکل اختیار کی۔ لیکن اس کا زمانہ وہ تھا جب جاپان نے روس پر فتح حاصل کی تھی۔ اور ہندوستانیوں کو اپنی پستی کے ساتھ ساتھ اپنی پوشیدہ قوتوں کا احساس ہو چلا تھا۔ چکبست کے دیش پریم کی آگ سے تیز تیز شعلے بھی بلند ہوئے۔ کیونکہ اُن کا کلام "ہوم رول" کی تحریک سے ہم آہنگ آواز تھا۔ اُس کے بعد سے ہندوستان کی سیاسی تحریک میں دو رجحان نظر آتے ہیں۔ ایک "گاندھی ازم" اور دوسرے "سوشلزم"

خالص "گاندھی ازم" کے شاعر ہیں ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ اور اشتراکی تحریک کے بھی کئی شاعر ہیں۔ مثلاً مجازؔ لکھنوی اور جاذبؔ دہلوی وغیرہ۔ اقبالؔ فاسیتی شاعر تھے[1]۔ جوشؔ کے متعلق یہ کہنا کہ وہ سوشلزم کے پورے طور پر قائل ہیں صحیح نہیں، کیونکہ وہ مذہب کو قطعی خیرباد کہنے پر رضامند نہیں۔ لیکن اشتراکی تحریک کے آزادی و مساوات و اخوت کے اصول اور اُس کے معاشی پروگرام کے وہ ضرور قائل ہیں۔

چنانچہ پہلی چیز جو آپ کو اُن کے کلام میں نظر آئے گی وہ سرمایہ داری نظام کی پرجوش مخالفت اور اُسکے خلاف شدید اظہارِ نفرت ہے۔ غالباً یہاں اس کے کہنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ شہنشاہیت "Imperialism" سرمایہ داری (Capiltalism) کا لازمی نتیجہ ہے اور فاسیت (Fascism) اس کی جدید ترین صورت ہے، چنانچہ اپنی نظم "کسان" میں اسکی حالتِ زار کا ماتم کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

ایک دل اور یہ ہجومِ سوگواری ہائے ہائے	یہ ستم اے سنگدل سرمایہ داری ہائے ہائے
تیری آنکھوں میں ہیں غلطاں وہ شقاوت کے شرار	جن کے آگے خنجرِ چنگیز کی مڑتی ہے دھار
بیکسوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں تیرے ہات	کیا چبا ڈالے گی او کمبخت ساری کائنات

ظلم اور اتنا، کوئی حد بھی ہے اِس طوفان کی
بوٹیاں ہیں تیرے جبڑوں میں غریب انسان کی

دیکھکر تیرے ستم اے حامیٔ امن و اماں
گرگ رہ جاتے ہیں دانتوں میں دبا کر انگلیاں

ادعائے پیرویٔ دین و ایماں اور تو
دیکھ اپنی کہنیاں جن سے ٹپکتا ہے لہو

ہاں سنبھل جا اب کہ زہرے اہلِ دل کے آب ہیں
کتنے طوفاں تیری کشتی کے لئے بیتاب ہیں

اِن اشعار میں سرمایہ داروں کی بیرحمی۔ اُن کا غریبوں کا خون چوسنا اور مذہب کا ناجائز استعمال سبھی باتوں کا ذکر موجود ہے۔ ایک دوسری نظم "بیکس بیمار" میں امیروں سے خطاب کر کے کہتے ہیں ؎

اے امیرو مُنہ دکھانے کے بھی تم قابل نہیں
تھیلیوں میں زر تو ہے سینوں میں لیکن دل نہیں

آدمی کب آدمی کی شکل کے تو ڑے ہو تم
پُشت پر مخلوق کی سرطان کے پھوڑے ہو تم

سرمایہ داری کا بنیادی اصول شخصی ملکیت اور نفع بازی ہے جس کے وہ سخت خلاف ہیں۔ اِس لئے وہ ہر شاعر کو اِس امر کی ترغیب دیتے ہیں کہ ؎

بستیوں کے رہنے والوں کو یہ پہونچا دے پیام
سر بسر ترمیم کے قابل ہے دولت کا نظام

اِس کے بعد سرمایہ داری نظام کو تباہ کرنیکی صورت یعنی انقلاب کی طرف آتے ہیں۔ اپنی نظم "نعرۂ شباب" میں کہتے ہیں ؎

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

اِس انقلاب سے غالباً وہی انقلاب مراد ہے جسے سب سے غریب طبقے کا انقلاب کہا جاتا ہے اور جو اصلاحی ذہنیت کا شدید ترین مخالف ہے کیونکہ سوشلسٹوں کے نزدیک موجودہ سماج کی بُنیاد ہی غلط ہے، اور اس میں اتنی خرابیاں ہیں کہ اُن کی اصلاح ممکن نہیں۔ یہ انقلاب اسوقت پیدا ہوتا ہے جب سرمایہ دار کے مظالم حد سے گذر جاتے ہیں اور جب مزدور بیکاری اور بھوک سے تنگ آ کر بغاوت پر کمربستہ ہوجاتے ہیں چنانچہ "زوالِ جہانبانی" میں کہتے ہیں ؎

مبارک ہیں مبارک دشمنوں کے جورِ پنہانی
کہ مشکل کروٹیں لے لیکے بن جاتی ہے آسانی

اسیروں کی تڑپ بجلی گرا دیتی ہے زنداں پر
قفس کے حق میں اک شعلہ ہے طائر کی پرافشانی

مچلتا ہے گدا کے دل میں آزادی کا جب شعلہ
لرز اٹھتا ہے پھنک جانیکے ڈر سے تاجِ سلطانی

یہاں "جورِ پنہانی" میں Exploitation اور Class-war کی طرف اشارہ موجود ہے، بغاوت کس طرح ہوتی ہے خود "بغاوت" کی زبان سے سُنیئے ؎

میرا مولد مفلسی کا دل ہے عسرت کا دماغ
میری پیدائش کے حجرے میں نہیں جلتا چراغ

گود میں ناداریوں کی پرورش پاتی ہوں میں بے زری کے بازوؤں پر زلف بکھراتی ہوں میں

اور بغاوت کیا کرتی ہے ؎

کنگرے ایوانِ شاہی کے جھکا دیتی ہوں میں جبر و استبداد کی چولیں ہلا دیتی ہوں میں

زیر دستوں کو دلا کر خونِ حاکم سے خراج قیدیوں کے سر پہ رکھ دیتی ہوں آزادی کا تاج

یعنی انقلاب کے بعد غریب طبقے کی قیادت Dictatorship of the Proletarait. قائم ہو جاتی ہے جیسا کہ آخری شعر سے ظاہر ہے۔

جوشؔ صاحب کو دُنیا کی سیاسی فضا میں اِسی انقلاب کے آثار نظر آتے ہیں ؎

نظر ہے کلبۂ مزدور پر معمارِ فطرت کی تلاطم میں ہے قصرِ آہنی سرمایہ داری کا

وہ ہندوستان سے بھی کہتے ہیں ؎

اُٹھو چونکو بڑھو، مُنھ ہاتھ دھو، آنکھوں کو مل ڈالو ہوائے انقلاب آنے کو ہے ہندوستان والو

سوشلزم جہاں شخصی ملکیت (Private Property) کے خلاف ہے وہاں شخصی حکومت میں بھی اُسکو نقائص نظر آتے ہیں کیونکہ آزادی اور مساوات جو اشتراکیت کے بُنیادی اصول ہیں کسی "فرد واحد" کی حکومت کو گوارا نہیں کر سکتے کیونکہ اس کے معنی ہیں غلامی اور غیر مساوات۔ جوشؔ صاحب کا یہی ایمان ہے۔ "زوال جہانبانی" میں کہتے ہیں ؎

جہانبانی دہکتی آگ ہے گرتی ہوئی بجلی ہمیشہ اِس نے دُنیا میں کیا دورِ محن پیدا

ہزاروں تجربوں کے بعد اب انسان یہ سمجھا ہے کہ شاہی سے نہیں ہوتا شرافت کا چلن پیدا

سُن اے غافل کہ تا روزِ قیامت نسلِ شاہی سے نہ ہوگا بزمِ انسانی کا صدرِ انجمن پیدا

پھر جمہوریت کی طرف رجوع کرتے ہیں ؎

ازل سے نوعِ انسانی کے حق میں طوقِ لعنت ہے کسی ہمجنس کی چوکھٹ پہ عادت سر جھکانے کی

اور اِنسان کو غیرت دِلا کر آزادی و مساوات کا پیغام دیتے ہیں ؎

جانور لیں سانس یک رنگی و آزادی کے ساتھ نوعِ انسان اور تقسیم غلام و شہریار

اس کے بعد یہ قابلِ غور ہے کہ جوشؔ صاحب سرمایہ داری سے کسی طرح سمجھوتہ کرنے پر راضی نہیں، کیونکہ یہ سراسر ناممکن ہے وہ مہاتما گاندھی کے اس اُپدیش میں کہ سرمایہ دار اپنے کو غریبوں کا امانتدار Trustee سمجھیں۔ راہِ نجات کا سراغ نہیں پاتے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

ضعف و قوت میں توازن ہو یہ ممکن ہی نہیں پھول سے گلچین کا عہر پیمان ہے نا استوار

رحم کی درخواست سے پہلے یہ دل میں سوچ لے خون ہے خادم کا آقا کے گلستاں کی بہار

اس کے بعد اُن کے وہ اشعار بھی سُنیئے جو محنت کی عظمت کے متعلق ہیں۔ کیونکہ اشتراکی نظام میں جو محنت کرتا ہے وہ اپنی محنت کا حقدار ہوتا ہے۔ اس میں سرمایہ داری نظام کی طرح کاہلوں کو دوسروں کے محنت کی کمائی چھین کر گلچھرے اُڑانے کا حق نہیں۔ کسان کی تعریف میں کہتے ہے

یہ سماں اور اک تری انسان یعنی کاشتکار ارتقا کا پیشوا تہذیب کا پروردگار

جس کے ماتھے کے پسینے سے پئے عزووقار کرتی ہے دریوزۂ تابش کلاہِ تاجدار

سرنگوں رہتی ہیں جس سے قوتیں تخریب کی جس کے بوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی

جس کی محنت سے پھبکتا ہے تنِ آسانی کا باغ جس کی ظلمت کی ہتھیلی پر تمدن کا چراغ

جس کے بازو کی صلابت پر نزاکت کا مدار جس کے کس بل پر اکڑتا ہے غرورِ شہریار

دھوپ کے جھلسے ہوئے رخ پر مشقت کے نشان کھیت سے پھیرے ہوئے مُنہ گھر کی جانب ہے رواں

کٹر قسم کے سوشلسٹوں کے نزدیک مذہب نے بجائے فائدہ کے انسان کو نقصان زیادہ پہونچایا ہے۔ مارکس مذہب کو عوام کے لئے افیون کہتا تھا۔ اشتراکیوں کے خیال میں جیسا کہ انجلس نے کہا ہے مذہب کی تخلیق خاص قسم کے حالات میں ہوئی۔ اور یہ حالات دو قسم تھے۔ اول قدرتی قوتیں اور دوسرے سماجی قوتیں۔ سائنس نے قدرتی قوتوں پر فتح حاصل کرلی ہے لیکن سوشلزم کو ابھی سماجی قوتوں پر فتح پانا باقی ہے۔ جب اِن دونوں قوتوں پر قابو ہو جائے گا تو مذہب کی ضرورت نہ رہے گی۔ خدا یا کسی نامعلوم قوت کا خیال اُن کے نزدیک اِن قوتوں سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔

جوش صاحب کا یہ خیال نہیں ہے۔ وہ یہ تو مانتے ہیں کہ مذہب کے نام پر بہت سے مظالم ہوئے ہیں اور مذہب کی بدولت بنی نوع انسان کو صدہا تکلیفیں بھی پہونچی ہیں لیکن اصلی وجہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب کی سچی اسپرٹ کو نہیں سمجھا گیا۔ بلکہ اس کا بیجا استعمال ہوا۔ وہ سرمایہ داری سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں ے

ادعائے پیرویٔ دینِ وایماں اور تو دیکھ اپنی کہنیاں جن سے ٹپکتا ہے لہو

قدامت پسندوں سے کہتے ہیں ے

حُبِ انسان، ذوقِ حق خوفِ خدا کچھ بھی نہیں تیرا ایماں چند وہموں کے سوا کچھ بھی نہیں

یعنی جوش کے نزدیک مذہب۔ حُبِ انسان، ذوقِ حق اور خوفِ خدا جیسے اعلیٰ اصولوں کا نام ہے۔ لیکن کبھی کبھی دُنیا میں اندھیر دیکھ کر خدا سے بیباکانہ شکایت کر بیٹھتے ہیں۔ اُن کا ایک شعر ہے ے

بندہ تیرے وجود کا مُنکر نہیں مگر دُنیا نے کیا دیے ہیں سبق اے خدا نہ پُوچھ

اور پھر "بیکسی بہار" میں ذرا جھنجھلا کر کہتے ہیں ؎

اور ہاں اے ماورائے فہم ہستی اے خُدا | مجھ میں ہے انکار کی قوت نہ دم اقرار کا
کون اتنا کور ہے اقرار کر سکتا ہے کون | کس کے مُنھ میں دانت ہیں انکار کر سکتا ہے کون
تجکو پانا بھی ہے حیرت خیز کھونا بھی عجیب | تیرا ہونا بھی تعجب ہے نہ ہونا بھی عجیب
بے زروں کے غم سے کیا ہوتا نہیں تجکو قلق | تیرے زرداروں ہی کو ہے کیا فقط جینے کا حق
پوچھتا ہوں میں کہ اے آقا باین شان علو | کھیلتا ہے کیا غریب انسانوں کی آہوں سے تو
اُڑ رہا ہے بے خطا کتنے ہی انسانوں کا رنگ | کھا چکا ہے کیا ترے انصاف کے کانٹے کو زنگ
کتنے ہی روحوں پہ دروازے جہنم کے ہیں باز | اس قدر رحمت کے دعوے اور اتنا بے نیاز
راس کیا آتے نہیں ہیں تجکو آئین کرم | سچ بتا معبود چنگیز و ہلاکو کی قسم

جوش کا حقیقی مذہب انسانیت اور محبت ہے جس کی توضیح میں یہاں پر اُن کی صرف دو رباعیاں لکھنا کافی ہوگا۔

ہندو ہوں نہ اے جوش مسلمان ہوں میں | صد شکر نہ ظلمت ہوں نہ طوفاں ہوں میں
آغوش ہند سے ہوں اور ہندی ہوں میں | نسل آدم سے ہوں اور انسان ہوں میں

صرصر ہے کوئی تو باد طوفاں کوئی | نشتر ہے کوئی تو تیغ عریاں کوئی
انسان کہاں ہے کس کرّے میں گم ہے | یہاں تو کوئی ہندو ہے مسلماں کوئی

غالباً یہ خیالات اشتراکی فلسفہ سے ماخوذ ہونے کے علاوہ ملک کی فرقہ وارانہ کشاکش کا نتیجہ ہیں۔

جوش صاحب کے "آدمیت" کا تخئیل ہیگل، فایرباخ اور مارکس وغیرہ سے ماخوذ نہیں ہے کیونکہ وہ انسان کو فطرت ہی سے بُرا سمجھتے تھے۔ جوش صاحب اس مسئلے میں مہاتما گاندھی کے ہمخیال ہیں اور انسان کو اس قدر نیک دیکھنا چاہتے ہیں کہ دشمن بھی برائی کرتا ہے تو انھیں شرم آتی ہے۔ چنانچہ اُن کا ایک شعر ہے ؎

کوئی حد ہی نہیں اس احترام آدمیت کی | بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں

لیکن قبل اس کے کہ مُلک میں اشتراکی نظام قائم ہو، وطن عزیز کا سیاسی غلامی سے چھٹکارا پانا ضروری ہے یہاں پر یہ سمجھ لینا چاہئیے کہ جوش کے دماغ میں وطنیت یا قومیت کا تخئیل کیا ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں:۔

"میں تمام نوع انسان کو ایک خاندان سمجھتا ہوں اور دیکھنا چاہتا ہوں۔ وطنیت کے اُس ناپاک تخئیل کو جو خود غرضی، تنگ نظری۔ منافرت اور ابن آدم کی تقسیم چاہتا ہے انتہائی حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ لیکن اسقدر وطنیت میرا ایمان ہے کہ اپنے گھر کو غاصبوں کی زندگی سے محفوظ رکھا جائے۔"

یعنی وطنیت سے انسانیت کا خون نہ ہونے پائے۔ وہ اپنے وطن ہندوستان سے خطاب کر کے کہتے ہیں ؎

تجھ سے منھ موڑ کے منھ اپنا دکھائیں گے کہاں — گھر جو چھوڑیں گے تو پھر چھاونی چھائیں گے کہاں
بزمِ اغیار میں آرام یہ پائیں گے کہاں — تجھ سے ہم روٹھ کے جائیں بھی تو جائیں گے کہاں

تیرے ہاتھوں میں ہے قسمت کا نوشتہ اپنا
کس قدر تجھ سے بھی مضبوط ہے رشتہ اپنا

یعنی وہ ڈاکٹر اقبال کی طرح مسلمانوں کو یہاں سے ہجرت کرنے کی رائے نہیں دیتے۔ اور ملک سے غداری کرنے کو کفر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ غدار سے کہتے ہیں ؎

تجھ سے روگرداں نہیں ہیں صرف ملت کے زعیم — حاکمانِ وقت بھی تجکو سمجھتے ہیں لئیم
تجھ سے نفرت کی کھٹک دونوں کی آب و گل میں ہے — فرق یہ ہے اُن کے لب پر اور اِنکے دل میں ہے

اُن کو اہلِ وطن سے بیحد ہمدردی ہے اور وہ جہاں کہیں کسی غریب۔ بیکار یا مصیبت زدہ کو دیکھتے ہیں اُنکا دل بے چین ہو جاتا ہے۔ "حسن اور مزدوری" "کسان" "ضعیفہ" "بیکس بیمار" اور "بھوکا ہندوستان" اُن کی ایسی نظمیں ہیں جن سے اِس قسم کے جذبات دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر نظم "بھوکا ہندوستان" میں فرماتے ہیں ؎

آہ اے ہندوستان، اے مفلسوں کی سرزمیں — اِس کرّے پر کوئی تیرا پوچھنے والا نہیں
آہ اک دل بھی ترے افلاس پر ہلتا نہیں — اب تو اک روٹی کا ٹکڑا بھی تجھے مِلتا نہیں
آہ اے ہندوستاں، اے کشورِ زار و نزار — تیرے بچے بھی بلکتے ہیں، جواں بھی بے قرار

اور اُس کے بعد انگلستانی سرمایہ داروں کے خلاف اہلِ ہند کو اُبھارتے ہیں ؎

تیرے مُردوں کا کفن تک لے گئے چالاک چور — شق ہوا اے تاریک جیتے جاگتے مُردوں کی گور
تیرے اوپر آکے ٹھہرا ہے ٹھگوں کا قافلہ — جھوم کر بیٹ اے بھیانک دیو اپنی پیٹھ ہلا
اے بھڑکتی آگ ٹھنڈی راکھ کی تہ سے نکل — اے رگِ غیرت اُبھر اے خون کے چشمے اُبل

آزادی اُن کا ایمان ہے اور ہندوستان کو وہ جلد سے جلد آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہر شخص کو نصیحت کرتے ہیں کہ ؎

پست سے پست ہو جو چیز وہ بن جا لیکن — مر کے بھی جنسِ غلامی کا خریدار نہ بن

اور اس آزادی کے حاصل کرنے کے لئے وہ ہر شخص کو جوش دلاتے ہیں اور قربانی کی تعلیم دیتے ہیں ؎

نوجوانو عشق کو درکار ہے مجنوں کا دل — تابکے یہ عشوہ ہائے لیلیٰ محمل نشین

نوجوانو خون جینے کے لئے تھوڑا سا خون — خون کی پیاسی ہے مدت سے وطن کی سرزمیں

پوچھے اب تم سے اگر کوئی کہ ہیں جانیں عزیز — یک زباں ہو کر پکار اُٹھو "نہیں ہرگز نہیں"

اِس سلسلے میں اہلِ اسلام سے جو کچھ اُنھوں نے کہا ہے اُس پر مسلمان بھائیوں کو غور کرنا چاہیئے ؎

شوقِ آزادی - خیالِ سرفروشی - ذوقِ مرگ — یہ تھے انصارِ حسین ابن علیؑ کے ساز و برگ

تم بھی ہو منجملۂ انصارِ شاہِ کربلا — سچ کہو اِن میں سے تم کو کیا وراثت میں مِلا

ایک اور جگہ کہتے ہیں کہ ؎

دورِ محکومی میں راحت کفر، عشرت ہے حرام — مہ وشوں کی چاہ، ساقی کی محبت ہے حرام

علم ناجائز ہے، دستارِ فضیلت ہے حرام — انتہا یہ ہے غلاموں کی عبادت ہے حرام

کوئے ذلت میں ٹھہرنا کیا گذرنا بھی حرام

صرف جینا ہی نہیں، اِس طرح مرنا بھی حرام

وہ کانگریس ایسی جماعت کی عزت کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ مُلک کی متفقہ آواز اور قوت کی نمائندہ ہے۔ ملک معظم سے یوں بیباکانہ طور پر عرض کرتے ہیں ؎

آپ سے کیونکر کہیں ہندوستان پُر ہول ہے — آپ کا نام آگ ہے اور کانگریس پٹرول ہے

وہ سرنگیں کھدرہی ہیں الحفیظ والاماں — ایک انگلستان کیا یورپ سما جائے جہاں

کیجئے جلدی ہوائے تند و گرم آنے کو ہے — ذرہ ذرہ آگ میں تبدیل ہو جانے کو ہے

وہ ہندو مسلم اتفاق کے حامی اور فرقہ داری کے سخت ترین دشمن ہیں۔ کیونکہ جنگِ آزادی کی کامیابی انھیں قوموں کے اتفاق پر منحصر ہے ؎

بہرِ خوشنودئ اغیار یگانوں کو نہ چھیڑ — اپنے ہی سر پہ جو چلتی ہے وہ تلوار نہ بن

متحدِ عزم سے کر سدِ سکندر تعمیر — باہمی جنگ سے گرتی ہوئی دیوار نہ بن

ایک اور جگہ کہتے ہیں ؎

غیر کی خدمت گذاری باہمی خونریزیاں — دوپہر کی دھوپ سر پر اور یہ خوابِ گراں

"نعرہ شباب" میں اسی بات کو کس درد و کرب سے کہا ہے ؎

یہ ستم کیا اے کنیزِ کفر و ایماں کر دیا — بھائیوں کو گائے اور باجے پہ قرباں کر دیا

دلولے میرے بڑھیں گے ناز فرماتے ہوئے — فرقہ بندی کا سرِ ناپاک ٹھکراتے ہوئے

ایک دن اِن لو کی لکھوں گا کتابِ زرفشاں — ثبت ہوگا جس کی زریں جلد پر ہندوستاں

ہم آخیر میں صرف اتنا ہی کہنا چاہتے کہ ہندوستان کے لئے ایسے شاعر کا وجود ایک فال نیک ہے اور ہمارے وطن کا مستقبل خود شاعر اعظم کی زبان سے سُنئیے ؎

مژدہ اے دل کہ نیا اب سروساماں ہوگا — جس کو دشوار سمجھتا ہے وہ آساں ہوگا

ایک مبہم سا نشان ہوگا نشانِ آلام — ایک بھولا سا فسانہ غم دوراں ہوگا

جذبات منوّر

(منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی)

اور کرتی ہے سُبک یہ پا بجولانی مجھے — میری نظروں نے بنا رکھا ہے زندانی مجھے

مِل گیا یہ حاصلِ شوقِ تن آسانی مجھے — سو لباسوں سے ہے بڑھکر ایک عُریانی مجھے

ہو گیا ہے اس قدر دل بے نیازِ قید و بند — عین آزادی ہے میری پا بجولانی مجھے

شامتِ اعمال کیا تھی میری قسمت میں شریک — خود رقم کرنا پڑی تحریرِ پیشانی مجھے

ایک کروٹ زندگی ہے ایک کروٹ موت ہے — خاک آئے اعتبارِ دردِ پنہانی مجھے

اِک قدم منزل سے آگے اور بڑھ سکتا نہیں — کامیابی سے بھی اپنی ہے پشیمانی مجھے

آستاں میں یا تو کر دیتا ہے پیشانی کو جذب — آستاں کو یا بنا دیتا ہے پیشانی مجھے

زندگی کی اب تو کچھ صورت بدلنا چاہیئے — سانس لینے سے بھی ہوتی ہے پشیمانی مجھے

مَیں شریکِ کاروانِ جادۂ تسخیر ہوں — ہر قدم ہے غیرتِ نقشِ سلیمانی مجھے

قید میں اٹھتی نہیں طوق و سلاسل کی صدا — اب نہیں کہتے ہیں زندانی بھی زندانی مجھے

ہو گیا نظروں کا اُٹھنا دشمنِ ناموسِ دل — کر دیا شرمندۂ اسبابِ حیرانی مجھے

ہاتھ ہنگامِ دعا بہرِ دعا اُٹھتا نہ تھا — ہے شکستِ جذبۂ دل سے پشیمانی مجھے

اور ہی کچھ ہے تقاضا اب تو پائے شوق کا — بخش دے یارب بلائے خانہ ویرانی مجھے

چشمِ ظاہر بیں یہ توہینِ حقیقت کس لئے — ایک صورت بھی نظر آتی نہیں فانی مجھے

ہو سکے جو اِک تقاضائے محبت پر نثار

اے منوّر چاہیئے وہ تختِ سلطانی مجھے

دو پروانے

(ایک قصّہ)

از منشی کرشن سروپ منشی فاضل

آج سے بہت دنوں پہلے جب حسینوں کی آرائش و زیبائش کے لئے مشاطہ کا وجود ہی نہ تھا اور حُسن معصومیت کا جامہ زیب تن کئے تھا۔ شمالی ہند کے ایک بڑے مندر کی فضا میں گھنٹوں اور ناقوس کی صداؤں نے انتشار پیدا کر دیا تھا۔ آرتی کا وقت تھا۔ بھگوان کی آرتی شروع ہونے والی تھی۔ آرتی دیوداسیاں کرتی تھیں اُنھوں نے اپنی زندگی اپنے دیوتا کے قدموں میں گذارنے کی قسم کھائی تھی۔ آرتی شروع ہوئی تمام دیوداسیاں زرق برق لباس پہنے نرت بھون (رقص گاہ) میں آئیں۔ اور اپنے دیوتا کو خوش کرنے کے لئے رقص کا آغاز کیا۔ انکے گھنگھرو کی مترنم جھنکار سے مندر کی فضا گونج اٹھی۔

مندر کے ایک گوشہ میں پجاری کا لڑکا اجے کھڑا تھا۔ نوجوان اجے کی نظریں چھوٹی دیوداسی پر پڑیں۔ دیوداسی کا حسین چہرہ اُس کی آنکھوں کے سامنے جم گیا۔ تمام بدن میں بجلی سی دوڑ گئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ابھی تو اس معصوم دیوداسی نے اپنی عمر کی سولہ سترہ بہاریں بھی مشکل سے طے کی ہونگی۔ یہ کس طرح اپنی زندگی کے دن گذاریگی صرف دیوتا کے دیدار پر۔ .... جسکی ایک اُمید موہوم سے زیادہ وقت نہیں ....

اجے آرتی ختم ہونے پر گھر لوٹا۔ مگر اس کے دل میں رہ رہ کر ایک میٹھا سا درد اُٹھتا تھا۔ گو دیوداسی اجے کے سامنے نہ تھی۔ تاہم وہ دیوداسی کا پُر نور چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اور دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔ کاش اس دیوداسی کے حُسن سے میرا خانۂ دل بھی پُر نور ہو جائے۔

مدھوسے کے باپ دادا مندر کے پجاری تھے۔ اس لئے مدھوسے کو ورثہ میں مندر کی گدی ملی۔ مدھوسے درمیانہ قد کے ادھیڑ عمر کے آدمی تھے۔ چہرہ چوڑا تھا۔ پیشانی پر رامانندی تلک لگاتے تھے۔ گلے میں رودراج کی مالا پہنتے تھے۔ اجے اُن کا اکلوتا لڑکا تھا اور بچپن ہی میں شفقت مادری سے محروم ہو گیا تھا۔ مدھوسے نے بڑی مصیبتیں برداشت کرکے اُسے پالا تھا۔

اجے ہر وقت چھوٹی دیوداسی کے تصور میں غلطاں و پیچاں رہنے لگا۔ اب وہ آرتی کے وقت سے بھی کچھ پہلے ہی نرت بھون میں آجاتا اور چھوٹی دیوداسی کے دیدار کے لئے ہمہ تن چشم بن جاتا۔ اس کی یہی آرزو تھی کہ

وہ اُسے دیکھا ہی کرے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس کو اپنے صفحۂ دل میں اُتار لے۔

دیوداسی پورنا نے بھی محسوس کیا کہ اجے اُس سے اُنس پیدا کرنا چاہتا ہے۔ وہ کبھی کبھی اجے کو سب کی نظریں بچا کر دیکھ لیتی تھی۔ چند دِنوں بعد اُسے اجے کی محبت کا یقین ہوگیا۔ مگر وہ کچھ نہ کہہ سکتی تھی، مجبور تھی۔

اماوس کی رات تھی۔ ہُو کا عالم تھا۔ تمام کائنات تیرہ و تار تھی۔ مندر کا چراغ اپنے آخری سانس پورے کر رہا تھا۔ اُس کی محدود روشنی رات کی سیاہ چادر پر ایک سفید چمکیلے نقطہ سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی۔

اجے اِس شب دیجور میں دیوداسی کے کمرہ کے سامنے کھڑا تھا۔ اُس نے آہستہ سے کنڈی کھٹکھٹائی۔

دیوداسی نے دھیمی آواز سے پوچھا۔ "کون ہے؟" اجے نے کہا۔ "بھکاری"۔

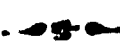
دیوداسی نے اجے کے دھندلے چہرہ کو کمرہ کے ٹمٹماتے چراغ میں دیکھ کر کہا۔ "وہ بھکاری، جس نے بھیک کی صدا لگائے بغیر ہی دِل جیسی نایاب چیز کو حاصل کر لیا۔ اب کیا جان کی بھیک مانگنے آیا ہے؟"

اجے نے جواب دیا۔ "میری التجا ہے کہ ہماری محبت دائمی محبت ہو"۔

پورنا نے اپنا ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیا۔ اور کہا۔ "وہ جسے دیوتا تصور کر لیا دیوتا ہی رہے گا"۔

اجے جب واپس لوٹا تو معمول سے زیادہ خوش تھا۔

اب پورنا اجے کو دیوتا سمجھنے لگی۔ دیوتا کے لئے مندر اور پجارن کی ضرورت تھی۔ پورنا نے خانۂ دِل کو مندر اور خود کو پجارن بنا لیا۔ اور اجے کی پوجا کرنے لگی۔ اب اُس کی طبیعت رقص و سرود سے اُکتانے لگی، اُس نے بیماری کا بہانہ کیا اور رقص سے معذرت چاہی۔



آج تہوار کا دِن تھا۔ تمام مندر بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ مندر کے احاطہ میں بہت سے لوگ جمع ہوئے۔ ہر شخص خوش و خرم نظر آتا ہے۔ آج آرتی کے لئے غیر معمولی انتظامات ہوئے تھے۔ مندر کے صحن میں ہون کُنڈ بنا ہوا تھا۔ اور پجاری وید کے منتر پڑھ پڑھ کر ہون کر رہے تھے۔ آج پورنا کو ناچ میں ضرور بالضرور شریک ہونا تھا۔

پورنا دیوداسیوں کے ساتھ مندر کی طرف آتی ہوئی نظر آئی۔ اجے کو ایسا معلوم ہوا کہ چودھویں رات کا چاند اپنے نورِ کامل کے ساتھ اس کی طرف آ رہا ہے۔ پھر جب دیوداسی اُس کے سامنے ہوئی تو اُسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ ایک تلاطمِ حُسن میں کھو گیا ہے۔ آرتی شروع ہوئی۔ پورنا نے بڑے جوش سے رقص کیا۔ یہاں تک کہ ناچتے ناچتے وہ بیہوش ہوگئی۔ اُس کا بیہوش ہونا تھا کہ تمام مندر میں شور مچ گیا۔ اجے اور دوسرے آدمیوں نے اُسے اس کے کمرے میں لے جا کر لٹا دیا۔ دیوداسی پر سکتہ کا عالم طاری تھا۔ اُسے دیوتا میں اجے کی صورت نظر آتی تھی۔ اجے کی محبت کا زخم خوردہ دِل تڑپ رہا تھا۔ اور دیوداسی کو لذتِ درد کا احساس

ہو رہا تھا۔ اسکے منہ سے کئی دفعہ عالمِ بےخبری میں نکلا" اجے میرا دیوتا ہے"، اجے میں تمھیں اپنا دیوتا بناؤنگی"۔

اجے اور دیوداسی کی محبت کا چرچا تمام شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا۔ اُس زمانہ میں کسی دیوداسی کا کسی شخص سے محبت کرنا سنگین ترین گناہ تھا۔ جس کا کفارہ گنہگاروں کو زندہ نذرِ آتش کرنے ہی سے ادا ہو سکتا تھا۔ گو اجے کا باپ مندر کا مہنت تھا۔ مگر اس قانون کو وہ بھی نہ توڑ سکتا تھا۔ اکلوتے بیٹے کی موت کو وہ ہرگز برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اس کا شیشۂ دل وفورِ غم سے چلنا چور ہو گیا۔ مگر وہ مجبور تھا۔ ایک پرند بے بال و پر کی مانند مجبور تھا۔

راجہ کی طرف سے منادی کرائی گئی کہ دیوداسی سے محبت کرنے کے جرم میں اجے کو اور اجے سے محبت کرنیکے جرم میں دیوداسی کو زندہ نذرِ آتش کیا جائے گا۔

شمشان میں آج بڑی بھیڑ تھی۔ تمام اہالیانِ شہر ان دو نورستہ پھولوں کو دیکھنے آئے تھے۔ جو قانون کی بادِ سموم سے چند ہی لمحوں میں جھلسنے والے تھے۔ چِتا کے دائیں جانب بیس فٹ کے فاصلہ پر طلائی تخت پر راجہ بیٹھا ہوا تھا۔ مہنت پیچھے کھڑا تھا۔ تمام رات روتے روتے آنکھیں آنسوؤں سے خشک ہو گئی تھیں۔ وہ بار بار اپنے سینے کو دباتا تھا۔ گویا اس کے سینے میں درد اُٹھتا ہے۔

چِتا تیار ہو گئی۔ محبت کے نام پر قربان ہونے والے دو پروانے محبت جاودانی کے حصول کی خاطر چِتا کی جانب روانہ ہوئے۔ رسم کے مطابق مہامنتری نے پوچھا کہ" تمہاری آخری خواہش پوری کی جائے گی"۔

جواب میں اجے نے کہا" مہامنتری! میں نے محبت کی بھیک مانگی تھی۔ جو مجھے مل گئی۔ اب مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں"۔ یہ کہتے ہوئے وہ دونوں چِتا کے اندر بیٹھ گئے۔

راجہ کے حکم سے آگ لگائی گئی۔ اور آن کی آن میں دو پھول دورِ بہار کے مزے لوٹے بغیر ہی پامال کر دئے گئے۔ دوسرے دن لوگوں نے دیکھا کہ بہاری جی کا عالیشان مندر جل رہا ہے۔ چکر کھاتے ہوئے شعلے آسمان کی طرف بلند ہو رہے ہیں۔ مہنت مدہوش مندر کی چھت پر کھڑے ہیں۔ شعلے بہت بلند ہو گئے اور مہنت جی اپنے بیٹے کی محبت کا ثبوت دیتے ہوئے لہراتے ہوئے شعلوں میں پنہاں ہو گئے۔



*

لطفِ سخن

(سید اختر علی اختر تلہری - جوبلی کالج لکھنؤ)

جو یہیں روز نئے حشر بپا کرتے ہیں ۔۔۔ دیکھنا یہ ہے کہ محشر میں وہ کیا کرتے ہیں

مدعا کیا ہے ترا کچھ تو بتا مالکِ دہر ۔۔۔ روز بن بن کے نئے نقش مٹا کرتے ہیں

وحشتِ دل کے لئے خوب ہے صحرا اپنا ۔۔۔ باغ کیا جائیں وہاں پھول ہنسا کرتے ہیں

بجلیاں لاکھ گریں لاکھ پھُکے خرمنِ ہوش ۔۔۔ دیکھنے والے تمھیں دیکھ لیا کرتے ہیں

حسن والوں کے ہیں انداز زمانہ سے نئے ۔۔۔ جاں نثاروں کو گرفتارِ بلا کرتے ہیں

جنت و حور کے افسانے سنیں اہلِ ہوس ۔۔۔ ہم تصور میں ترے محو رہا کرتے ہیں

ترے بیمار ہیں راضی برضائے ایزد ۔۔۔ نہ دوا کرتے ہیں کوئی نہ دعا کرتے ہیں

شرم آلود نگاہیں وہ کسی کی، توبہ! ۔۔۔ فیصلہ دل کا یہی تیر کیا کرتے ہیں

اضطرابِ دل پُر شوق نہ شرمندہ کر ۔۔۔ تیر قاتل کے نشانہ سے خطا کرتے ہیں

سرفروشی نہیں آلودۂ شوقِ جنت ۔۔۔ حق محبت کا وفادار ادا کرتے ہیں

گردشِ دہر نے دنیا ہی بدل دی اختر
اب کہاں لطف وہ پہلے سے رہا کرتے ہیں

(مسٹر جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی)

مظہرِ حسنِ ازل جلوہ گہِ طور نہیں ۔۔۔ دل ہی خود ظرفِ تجلی ہو تو کچھ دور نہیں

تنگیِ دامنِ ہستی و ہجومِ ارماں ۔۔۔ وسعتِ شوق باندازۂ مقدور نہیں

قصۂ طور سے ملتا ہے فسانہ دل کا ۔۔۔ ہے وہی بات بایں فرق کہ مشہور نہیں

عشق ہر حال میں پابندِ وفا ہے لیکن ۔۔۔ حسن ہر رنگ میں مختار ہے مجبور نہیں

بیخودی تا بہ کجا پاسِ تقاضائے وفا ۔۔۔ یہ سمجھ لے نہ کوئی جرأتِ منصور نہیں

بدگمانی سے بھی تجدیدِ وفا ہوتی ہے ۔۔۔ شیوۂ حسن مگر عشق کا دستور نہیں

ذرہ ذرہ سے نمایاں ہے شعاعِ تنویر جلوۂ حسن کسی رنگ میں مستور نہیں

جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا
حسرتِ قربِ بتاں ہے تو خدا دُور نہیں

(حضرت بسمل الہ آبادی)

آہ میری رسا نہیں ہوتی کیوں موافق ہوا نہیں ہوتی
حق کے جلوے نظر نہیں آتے جب نظر پارسا نہیں ہوتی
روح کہتے ہیں جس کو شئے لطیف وہ تو ہرگز فنا نہیں ہوتی
جبر کی انتہا تو ہوتی ہے صبر کی انتہا نہیں ہوتی
کون اُس کو نظر سے پہچانے عقل جب رہ نما نہیں ہوتی
بندگی کا خیال ہے ناحق بندگی جب ادا نہیں ہوتی
ہم حیات آشنا سہی لیکن موت نا آشنا نہیں ہوتی
مَیں تو دُنیا سے ہو بھی جاؤں جُدا مجھ سے دُنیا جُدا نہیں ہوتی
یہی کہنا تو ہے خودی کی دلیل بے خودی باخدا نہیں ہوتی
پہلے ہوتی تھی ہر کسی سے وفا اب کسی سے وفا نہیں ہوتی

کیا کہیں دل کی بات اے بسمل
شاعری میں ادا نہیں ہوتی

حضرت خیر بہوروی ایڈیٹر "جیون" "وبال جگت" گورکھپور

وہم ہے توہم نکمل" غمِ فردا کرنا غرقِ عقبٰی کو بہ یک جنبشِ مینا کرنا
میرے احساس پہ اِک آہ بھی ہے بارِ گراں مسلکِ عشق میں جائز نہیں شکوا کرنا
"آج" جاتا بھی نہیں "کل" کبھی آتا بھی نہیں وعدۂ حشر ہوا وعدۂ فردا کرنا
ایسے موسم میں کہ جب کیف میں ڈوبی ہو ہوا ساقیِ مست نظر کفر ہے توبا کرنا
سونپتا ہوں تمھیں خلوت کدۂ شوق مگر جادۂ دل سے نگاہوں میں بھی آیا کرنا
روح کا سجدہ نگاہوں کی عبادت تو ہوئی اے میرے عشق! تجھے اور ہے کیا کیا کرنا

خیر مَیں تم کو محبت کا پیمبر مانوں
حسن مغرور کو آجائے جو سجدا کرنا

(حضرت شائق وارثی بریلوی)

بے سکونی میں سکونِ قلب ہے حاصل مجھے
اضطرابِ دل نہیں ہے اضطرابِ دل مجھے

کھینچ لوں منزل کو میں یا کھینچ لے منزل مجھے
ہے بہرصورت یقینِ جذبۂ کامل مجھے

کر دیا میری خودی نے آج اس قابل مجھے
اپنے پہلو میں لئے لیتی ہے خود منزل مجھے

ذوقِ آسانی سے مطلق ہو چکا نا آشنا
اب کوئی مشکل نظر آتی نہیں مشکل مجھے

چشمِ حق بیں ہو چلی ہے شادکامِ آرزو
توڑنا ہے اب طلسمِ جلوۂ باطل مجھے

میری فطرت تو ازل ہی سے تھی آزادی پسند
کیوں کسی نے کر دیا پابندِ آب و گل مجھے

مرحبا اے اضطرابِ ذوقِ تکمیلِ طلب
لے اڑی ہے جانبِ منزل ہوائے دل مجھے

ہو چکا ہوں بے نیازِ شوق و ذوقِ آرزو
اب لبھا سکتی نہیں رنگینیٔ محفل مجھے

اُس نگاہِ ناز کے پُرکیف جلووں کی قسم
اب کہاں ممکن سکونِ اضطرابِ دل مجھے

مرحبا جوشِ تمنا مرحبا ذوقِ نظر
ہو گئی تمیزِ حسن و عشق میں مشکل مجھے

مشکلاتِ راہ ہیں ہمت شکن شائق مگر
شوقِ منزل کھینچتا ہے جانبِ منزل مجھے

(مسٹر صغیر احمد جان ایم۔اے۔ لکچرر کمرشل کالج دہلی)

یا بے نقاب ہو جا یا بے نقاب کر دے
اس عشقِ مضطرب کو اپنا جواب کر دے

عقل و خرد کو ساقی مست و خراب کر دے
ہر موجِ زندگی کو موجِ شراب کر دے

اپنا ہی سا بنا دے، مستِ شباب کر دے
کیفِ نظر سے دل کو جامِ شراب کر دے

لے قلزمِ حقیقت موج و حباب تا کے
دریائے ماسوا کو محوِ سراب کر دے

کیا شیخ، کیا برہمن، کیا دیر، کیا کلیسا
اس تفرقے کو ساقی غرقِ شراب کر دے

رنگِ شباب بھر دے ہر تازہ آرزو میں
جلوے کی شوخیوں کو پُر اضطراب کر دے

دنیائے رنگ و بو گر اک خوابِ دلنشیں ہے
اس خوابِ دلنشیں کو تعبیرِ خواب کر دے

لطف و کرم سے پہلے تکمیلِ عشق کر لوں
فی الحال رحمتوں کو وقفِ عتاب کر دے

اُف اے صغیر یہ کیا! وہ بے حجاب آیا!!
اُٹھ بے خودی کو اُس کے رُخ کی نقاب کر دے

(شیخ محمد یوسف ظفر بی۔اے میرٹھ)

دیوانہ سمجھ یا اُسے فرزانہ سمجھ لے — ہر در کو جو تیرا درِ جانانہ سمجھ لے
عکسِ رُخِ زیبا پہ جُھکے جاتے ہو خود ہی — اُٹھو! کوئی کافر اسے سجدانہ سمجھ لے
اللہ رے اُس تشنۂ ناکام کی حسرت — ہر ظرفِ شکستہ کو جو پیمانہ سمجھ لے
الفت جسے کہتے ہو چُھپائے نہ چُھپے گی — یہ راز نہیں وہ جسے دنیا نہ سمجھ لے
تکمیلِ طلب اصل میں تحصیلِ طلب ہے — تو اپنی تمنا کو تمنا نہ سمجھ لے
دنیا کی حقیقت کوئی سمجھائے تو جانوں — لیکن ہے یہی شرط کہ دیوانہ سمجھ لے
ہر بات پہ کہتے ہو "قیامت ہے قیامت" — دل اس کو کہیں وعدۂ فردا نہ سمجھ لے
یہ میرا بیان یہ مری اُلفت کی کہانی — ایسا نہ ہو کوئی اسے افسانہ سمجھ لے

دنیا میں ظفر عمرِ رواں اس کی کٹے گی
ہر دَور کو جو گردشِ پیمانہ سمجھ لے

(مولانا محمد یعقوب خاں کلام بی۔اے)

نصیب ہو کہ نہ ہو، شوقِ دیدِ یار تو ہے — قیامت آئے نہ آئے پر انتظار تو ہے
خزاں نصیب ہوئیں حسرتیں تو ہو جائیں — ترے خیال سے دل میں سدا بہار تو ہے
یہ دل وہ گھر ہے جو مرکز ہے تیرے جلووں کا — نہ رات دن سہی، لیکن کبھی کبھار تو ہے
مکر کے وعدوں سے وہ مسکرا تو دیتے ہیں — شکستِ عہد میں پہلوئے اعتبار تو ہے
لگا کے تیرِ نظر دلدہی بھی کرتے ہیں — چمک میں درد کی اک لذتِ قرار تو ہے
کیا ہے قتل مگر ساتھ ہیں جنازے کے — انھیں شہیدِ دلِ اپنے ذرا سا پیار تو ہے

کلام تیری نوا سنجیاں ارے توبہ
نہیں ہے نغمہ صدائے شکستِ تار تو ہے

(مسٹر ڈی۔ پی۔ بھٹناگر کُشتہ)

یہ تمنا تھی اگر، پُر لطف منظر دیکھتے — کعبۂ دل کو صنم خانہ بنا کر دیکھتے
اپنے رُخ سے تم ذرا پردہ اُٹھا کر دیکھتے — دیکھنے والوں کی بھی حیرت کا منظر دیکھتے
اِس سرے سے اُس سرے تک سب کو مضطر دیکھتے — اپنے جلوے آپ کچھ پردے سے باہر دیکھتے
نقشِ سجدہ سے وہیں کعبہ کی پڑ جاتی بنا — شوقِ سجدہ میں جہاں ہم سر جھکا کر دیکھتے

کچھ تو ہے پڑتی نہیں دل پر جو ساقی کی نظر
ورنہ ہم محفل میں کیوں یہ خشک ساغر دیکھتے

وہ تصوّر میں کسی صورت سے آ جاتا اگر
اس کو آنکھوں میں چھپا کر دل میں رکھ کر دیکھتے

کس طرح بجھ جاتی ہے بیکس کی شمعِ زندگی
دیکھنے والے کبھی یہ بھی تو منظر دیکھتے

قدرِ ہستی خود ہی کشتہ تم پہ ہو جاتی عیاں
قیدِ ہستی سے رہا ہو کر جو دم بھر دیکھتے

(مسٹر لبھن داس گلشن منشی عالم فاضل نادانوی (کانگڑا)

زندگی کو معنیِ جوشِ جنوں سمجھا ہوں میں
موت کو مفہوم اندازِ سکوں سمجھا ہوں میں

تو ہے اک رنگین دھوکا، تو ہے اک دلکش فریب
بس یہی کچھ تجھ کو اے دنیائے دوں سمجھا ہوں میں

کہہ دیا منصور نے رازِ محبت برملا
اس کو اے دل خامیِ جوشِ جنوں سمجھا ہوں میں

چارہ سازوں کو مرے یہ بات سمجھائے کوئی
اضطرابِ قلب کو جانِ سکوں سمجھا ہوں میں

عین ہشیاری ہے الفت میں مری دیوانگی
حق تو یہ ہے اس کو اعجازِ جنوں سمجھا ہوں میں

جورِ بیجا جس کو اے ناصح تو ہے سمجھا ہوا
اس جفا کو بارشِ لطفِ فزوں سمجھا ہوں میں

میں کہاں اور اس خراب آباد میں آنا کہاں
یہ تمہاری خود نمائی کا فسوں سمجھا ہوں میں

چاک دامن سے حدِ چاکِ گریباں مل گئی
آج گلشن رازِ تکمیلِ جنوں سمجھا ہوں میں

(حضرت نکہت انصاری بدایونی)

نقشہ مری وحشت کا ہستی میں نہ اُڑتا دیکھ
دیوانۂ الفت کو نہ دیوانہ بنا دیکھ

خاکِ دلِ برباد فضاؤں میں اُڑا دیکھ
کس سمت کو چلتی ہے محبت کی ہوا دیکھ

افسانۂ غم اس پہ اثر کر نہیں سکتا
اور ضد ہی سنانے کی ہے اے دل تو سنا دیکھ

جلنے کو ابھی بزم میں کچھ اور ہیں شمعیں
اے عشق ابھی سے کوئی آندھی نہ اٹھا دیکھ

بن جائے نہ فرقت کہیں دیباچۂ وحشت
قصّۂ شبِ غم کا نہ ستاروں کو سنا دیکھ

خالی نہیں خاکسترِ دل رنگِ تپش سے
شک ہو تو پھر اس خاک سے پروانہ بنا دیکھ

نکہت پسِ پردہ کے فریبوں سے خبردار
اک جلوۂ نادیدہ پہ دل کو نہ مٹا دیکھ

رفتار زمانہ

(ممالک غیر)

ہنگامۂ یوروپ اس وقت دُنیا کی سبھی طاقتیں بڑے زور شور سے لڑائی کی تیاریاں کر رہی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہنگامہ برپا ہے اور دِلوں میں یہ خوف جاگزین ہوگیا ہے کہ عنقریب ہی قیامت برپا ہونے والی ہے۔ مسٹر چیمبرلین وزیراعظم برطانیہ کی پالیسی ناکامیاب ثابت ہوئی۔ معاہدۂ میونخ کے بعد تھوڑی بہت اُمید ہوگئی تھی کہ امن عالم برہم نہ ہونے پائے گا۔ مگر جرمنی نے میمل کو اپنے قبضہ میں لے کر اس اُمید پر پانی پھیر دیا۔ اسکے بعد جب جرمنی نے چیکوسلاویکیہ کو بھی ہڑپ کرلیا تو رہی سہی اُمید بھی ختم ہوگئی۔ رومانیہ پر بھی جرمنی نے جبر و تشدد سے کام لیا۔ اور اب مسولینی نے بھی کھلے بندوں غاصبانہ پالیسی پر عمل کرنا شروع کردیا۔ چنانچہ البانیہ پر اُس نے جبری قبضہ کرلیا۔ جس سے بڑی بڑی طاقتوں کے دل دہل گئے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جنگ عظیم کے زمانہ ہی میں اٹلی سے وعدہ کرلیا گیا تھا کہ البانیہ اُس کو بطور مال غنیمت دیدیا جائے گا۔ چنانچہ جنگ کے بعد سے البانیہ، اطالوی اقتدار ہی کے زیر اثر رہا۔ لیکن مسولینی نے اس کو کافی نہ سمجھا۔ اور اب باضابطہ طور سے اس پر تسلط جمالیا۔ اس تسلط سے اٹلی کو کوئی خاص تجارتی فائدہ نہیں پہونچ سکتا ہے لیکن البانیہ کی سیاسی اہمیت بھی ہے اور اس پر تسلط جمالینے سے اٹلی بحرۂ ایڈریاٹک کا اجارہ دار ہوگیا ہے اب اٹرانٹو پر بھی اس کا قبضہ ہے اس لئے فرانس اور برطانیہ کا کوئی جہاز اب اٹلی کی اجازت بغیر بحرۂ ایڈریاٹک میں داخل نہیں ہوسکتا۔ ایسی صورت میں اگر جنگ چھڑ جائے تو برطانیہ اور فرانس یوگوسلافیہ کی کوئی مدد نہیں کرسکتے۔ اس لئے اس کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ نہیں رہ گیا کہ وہ جرمنی اور اٹلی سے مل جائے۔

البانیہ کے اٹلی کے زیر حکومت آجانے سے فرانس اور برطانیہ کی اس پالیسی کو کہ پولینڈ، رومانیہ، روس یوگوسلافیہ کو متحد کرکے جرمنی اور اٹلی کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرلیا جائے، بڑی ٹھیس لگی ہے۔ یوگوسلافیہ مشرقی یوروپ کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ چنانچہ وسط یوروپ میں جرمنی کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کے لئے بھی یہ ضروری تھا کہ یوگوسلافیہ جرمنی کے خلاف ہوجائے۔

اب جبرالٹر پر حملہ کرنے کی کوششیں ہورہی ہیں۔ شمال کی طرف اسپین کی فوجیں اس کی سرحد پر جمع ہورہی ہیں اور جنوب کی طرف سے بمباری کے لئے جرمنی نے اپنی فوجیں اور توپیں سیوٹا میں بھیج دی ہیں

برطانیہ اور فرانس بھی مقابلہ کی تیاریاں کر رہے۔ چنانچہ فرانس کے جنگی جہاز جبرالٹر پہونچ گئے ہیں اور مالٹا میں برطانوی فوجیں اور جنگی جہاز تیار کھڑے ہیں۔ کینیا، مصر اور سوڈان میں بھی تازہ فوجیں پہونچ گئی ہیں۔ برطانیہ کی پوزیشن واقعی بڑی نازک ہے۔ چونکہ لڑائی کا خطرہ برابر قائم ہے۔ ہندوستان، آسٹریلیا اور مشرق بعید کی طرف سفر کرنے والے جہازوں کو ہدایت کردی گئی ہے کہ وہ بحیرہ روم میں داخل نہ ہوں بلکہ کیپ آف گڈ ہوپ کا راستہ اختیار کریں۔

پریسیڈنٹ روز ویلٹ نے ہٹلر اور مسولینی کو بذریعہ تار یہ تجویز پیش کی تھی کہ اگر وہ اس بات کا وعدہ کریں کہ آئندہ دس برس تک کسی قسم کی غاصبانہ کاروائی نہ کرینگے تو اس کے عوض موصوف جرمنی اور اٹلی کے ساتھ اقتصادی تعاون کے لئے جو کچھ ممکن ہوگا اٹھانہ رکھینگے۔ جرمنی اور امریکہ کے تعلقات کشیدہ تھے ہی اب ہٹلر نے ۲۸ اپریل کو ڈھائی گھنٹہ تک ایک طول طویل تقریر میں جس کا لب ولہجہ نہایت تند وتلخ تھا اس بات پر غم وغصہ کا اظہار کیا ہے کہ پریسیڈنٹ امریکہ خواہ مخواہ جرمنی پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ اسکی ذات سے نقض امن کا خطرہ ہے۔ ہٹلر نے مختلف ہمسایہ ریاستوں سے اس کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے یہی لکھا کہ انھیں جرمنی سے کوئی اندیشہ نہیں۔ چنانچہ ہٹلر نے اس بات کی شکایت کی کہ برطانیہ، فرانس اور امریکہ کے اخبارات اس بارہ میں خواہ مخواہ جرمنی کو بدنام کر رہے ہیں۔ ہٹلر نے اس بات کو بھی فخر کے ساتھ بیان کیا کہ اس نے ایک قطرۂ خون بہائے بغیر اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس کے برعکس اس نے جنوبی امریکہ میں امریکہ کے رویہ اور فلسطین میں برطانیہ کے طرز عمل کو جابرانہ قرار دیا۔

ہٹلر نے اس بات کی بھی سخت شکایت کی کہ پریسیڈنٹ کی اپیل اس کے پاس پہونچنے سے پہلے تمام یوروپ میں شائع ہوگئی۔ چنانچہ ہٹلر نے اس توہین آمیز برتاؤ کا یہ جواب دیا کہ اس نے پریسیڈنٹ کو اپنا جواب بھیجنے سے پہلے اسے اپنی تقریر میں بیان کردیا۔

دراصل ہٹلر کو پریسیڈنٹ روز ویلٹ کا مطالبہ ناگوار ہوا ہے۔ اسی لئے اس نے یہ کاروائی کی کہ خود وسط یوروپ کی تمام ریاستوں سے دریافت حال کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ ان ریاستوں کو اطمینان دلانے کو تیار ہے بشرطیکہ وہ خود جرمنی سے اس اطمینان کی ملتجی ہوں اور مناسب تجاویز کے ساتھ اپنی درخواستیں پیش کریں۔ ہٹلر کو یہ بات بھی بہت ناگوار ہوئی ہے کہ برطانیہ نے پولینڈ سے براہ راست سازباز کرنا شروع کردیا ہے وہ اس کو جرمنی کے گرد گھیرا ڈالنے کی پالیسی قرار دیتا ہے۔ چنانچہ انگلستان سے اظہار ناراضگی کے لئے اس نے اینگلو جرمن بحری معاہدہ کو منسوخ کرکے برطانیہ کو اس کی اطلاع بھیج دی ہے۔ جرمنی کی طرف سے پولینڈ کو حملہ نہ کرنے کی جو گارنٹی دی گئی تھی وہ بھی ہٹلر نے فسخ کردی ہے۔

بہر حال ہٹلر کی جوابی تقریر کے لب و لہجہ نے جنگ کے امکانات کو قریب تر کر دیا ہے اور برطانیہ کو مدافعانہ کارروائی کرنے پر مجبور ہونا پڑا چنانچہ مسٹر چیمبرلین نے برطانیہ میں جبری فوجی بھرتی جاری کرنے کا اعلان کر دیا جس کی رُو سے بیس اکیس سال کے نوجوانوں کو لازمی طور سے چھ ماہ کی فوجی تعلیم دی جائے گی۔ اس تدبیر سے برطانیہ کی فوج میں دو لاکھ سپاہیوں کا اضافہ ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ برطانیہ جنگ کے لئے رفیقوں کے دائرہ کو بھی وسیع کرنے میں لگا ہوا ہے۔ چنانچہ برطانیہ اور فرانس جنھوں نے معاہدۂ میونخ کے وقت روس سے مشورہ کرنا بھی مناسب نہ سمجھا تھا۔ اب روس کو ہر طرح سے اپنا معین و مددگار بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ روس سے اس سلسلہ میں جو گفتگو یا خط و کتابت ہوئی ہے اُسمیں اُس نے برطانیہ کی سامراجی پالسی میں تبدیلی کی کوئی تجویز بھی پیش کی ہو۔ ادھر فرانس اور برطانیہ کا یہ خیال بھی ہو سکتا ہے کہ روس کو مشرقی یوروپ میں جرمنی کے ساتھ برسرپیکار کر کے اُلجھا دیا جائے۔ کم از کم روس کا حکمران اسٹالین اس اندیشہ سے خالی الذہن نہیں ہے۔ اسی لئے وہ برطانیہ و فرانس سے زیادہ مفید و دیرپا شرائط پر معاہدہ کرنا چاہتا ہے۔ سُنا جاتا ہے کہ ہٹلر بھی روس سے ساز باز کرنے کے لئے تیار ہو گیا ہے۔ بلکہ اُسنے در پردہ نامہ و پیام بھی شروع کر دیئے ہیں۔ اس خیال کی تائید میں کہا جاتا ہے کہ اسی لئے ہٹلر نے اپنی تازہ ترین تقریر میں روس کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نہیں نکالا۔ بہر حال اتنا ضرور ہے کہ روس سے ہٹلر بھی خائف ہے اور اِسمیں شک نہیں کہ وہ اپنے لامتناہی ذرائع کے ساتھ جس طرف ہو جائے گا۔ اُس کا پلّہ جنگ میں بھاری ہو جائے گا۔ بعض لوگوں کی رائے میں حال میں روسی وزیر خارجہ کا جو غیر متوقع استعفا ہوا ہے اس سے بھی برطانیہ اور روس کی مصالحت کی گفتگو پر خراب اثر پڑے گا۔ وزیر موصوف خود یہودی اور برطانیہ کا طرفدار تھا اور اُس کی بیوی انگریزی قوم سے ہے۔ روس میں یہودیوں کا خاصہ زور ہے کیونکہ وہ حکومت کے اعلیٰ اعلیٰ عہدوں پر ممتاز ہیں اس سے بھی اُمید ہوتی ہے کہ جرمنی کے مقابلے میں روس کے اصحاب حل و عقد برطانیہ اور فرانس ہی کا ساتھ دیں گے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ روس اس وقت کسی فریق سے کوئی باضابطہ معاہدہ کرنا پسند نہ کرے اور انگلستان و فرانس اور جرمنی و اٹلی کے درمیان جنگ چھڑ جانے پر ان دونوں کی تباہی سے فائدہ اُٹھائے۔ بہر حال انگلستان نے مسٹر چیمبرلین کی رہنمائی میں جو شرائط روس کے سامنے پیش کی ہیں وہ ابھی تک اُس کے لئے کچھ بہت دلاویز ثابت نہیں ہوئی ہیں۔ اس گفت و شنید کے دوران میں جو خبریں وقتاً فوقتاً معلوم ہو رہی ہیں اُن سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اسٹالین انگریزوں کیساتھ اپنی شرائط پر معاملہ کرنا چاہتا ہے اور ان سے مشکوک بھی ہے۔

یہ بھی خبر ہے کہ مسٹر روزویلٹ مشرق بعید کی بین الاقوامی پیچیدگیاں رفع کرنے کے خیال سے جاپان کی

بھی دس سال تک صلح قائم رکھنے کی تحریک کرنے والے ہیں۔ لیکن جس طرح کہ جرمنی اور اٹلی پر اُن کی اپیل کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اُسی طرح جاپان بھی غالباً کوئی خاطرخواہ جواب نہ دے گا۔ اوّل تو وہ پہلے ہی سے جرمنی اور اٹلی کا سیاسی رفیق اور ہمنوا ہے۔ دوسرے اِس وقت چین میں اُسے جو اُلجھنیں پیش آ رہی ہیں اُن کا سبب وہ امریکہ و انگلستان ہی کو قرار دے رہا ہے۔ جاپانی مدبروں کا ایک ذی اثر طبقہ ایسا بھی ہے جو جاپان اور برطانیہ کے میل جول کا قائل ہے اور جاپان کو جرمنی سے علیحدہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ بہرحال اس وقت اس کے لئے سب سے بڑی چیز جنگِ چین کا ختم کرنا ہے۔ کیونکہ ڈیڑھ سال سے زیادہ ہو گئے کہ بے سروسامان چینی، جاپان کی آزمودہ کار اور جدید ترین اسلحہ و سامان جنگ سے آراستہ فوجوں کا بڑی بہادری سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ جہاں جہاں جم کر لڑائی ہوتی ہے جاپانی فتح پاتے ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جسقدر مقبوضہ علاقہ بڑھتا جاتا ہے اُسی قدر جاپانیوں کی گرفت کم ہوتی جاتی ہے، اور اگر تازہ خبریں صحیح ہیں۔ تو حال ہی میں چینیوں نے ستّر بڑے بڑے اور اہم شہر دوبارہ چھین لئے ہیں۔ چین کا تمام نظم و نسق برباد ہو گیا ہے۔ مگر جاپان ابھی تک کوئی قطعی فتح حاصل نہیں کر سکا اور اگر چین کو روپیہ اور سامان جنگ سے مدد ملتی رہے تو وہ ابھی کئی برس اور جاپان کا مقابلہ کرتا رہے گا اور اُس کی فوجیں کم نہ ہوں گی۔ بہرحال لڑائی نے یہ ضرور ثابت کر دیا کہ اگر کوئی کمزور و منتشر قوم بھی اپنی بھرپور قوت سے اپنی آزادی قائم رکھنا چاہے تو جبر و تشدد کی منظم سے منظم طاقت بھی اُس کو آسانی سے مغلوب نہیں کر سکتی۔

(ہندوستان)

مسٹر بوس کا استعفا اور کانگریس | تریپوری کانگریس کے بعد یہ خیال کہ مُلک کی سب سے بڑی سیاسی تحریک کا اندرونی اختلاف دُور ہو گیا، صحیح ثابت نہ ہوا۔ اور نہ یہ اُمید پوری ہوئی کہ مسٹر بوس، مہاتما گاندھی کا اعتماد حاصل کر کے کانگریس کا متحدہ محاذ قائم رکھ سکیں گے۔ مہاتما جی اور مسٹر بوس میں آپس میں سمجھوتہ نہ ہو سکا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کوئی ورکنگ کمیٹی نامزد نہ کر سکے بلکہ آل انڈیا کانگریس کے اجلاس کلکتہ میں جو آخر اپریل میں منعقد ہوا مسٹر بوس مستعفی ہو گئے اور اب اُن کی جگہ بابو راجندر پرشاد کانگریس کے صدر منتخب ہوئے ہیں۔ اب یہ حقیقت بھی معلوم ہوئی کہ تریپوری میں آنریبل مسٹر پنت کا جو ریزولیوشن مسٹر بوس کے متعلق پاس ہوا تھا۔ اُس کی مہاتما جی کو نہ کوئی خبر تھی اور نہ اُن کی ایما سے یہ ریزولیوشن پیش کیا گیا تھا۔

مہاتما گاندھی عام طور پر ذاتیات میں نہیں پڑتے ہیں اور شخصی بنیاد پر اُنھوں نے کبھی کسی کے ساتھ اشتراکِ عمل سے انکار نہیں کیا۔ اِس لئے جب اُنھوں نے مسٹر بوس کی دوبارہ صدارت سے اختلاف رائے ظاہر کیا۔ اُسی وقت ہم کو یہ کھٹکا ہو گیا تھا کہ مہاتما گاندھی اور مسٹر سبھاش چندر بوس کے طریقِ عمل میں کوئی

اصولی اختلاف ضرور ہے یا اور کوئی اور اہم وجہ ہے جس کی بنا پر مہاتما گاندھی کانگریس کا آئندہ مسٹر بوس کی رہنمائی میں رہنا مناسب نہیں سمجھتے ہیں اسی لئے مسٹر بوس سے اُنھوں نے صدارت کی اُمیدواری سے دستبردار ہونے کی استدعا کی، اور جب مسٹر بوس نے اُن کی درخواست منظور نہیں کی تو اُنھوں نے مسٹر پٹیل کو اُن کے خلاف علانیہ کوشش کرنے کی اجازت دیدی۔ واقعات نے عام لوگوں کے اس شک کو کہ اس مخالفت کے اصل بانی مسٹر پٹیل ہیں نہ کہ مہاتماجی بالکل غلط ثابت کر دیا۔ مسٹر پٹیل نے حال ہی میں یہ کہا کہ جو کچھ اُنھوں نے کیا وہ مہاتماجی کے حکم سے کیا اور وہ اُنھیں کو اپنا رہنما مانتے ہیں۔ ذاتی حیثیت سے انھیں مسٹر بوس سے کوئی کد نہیں ہے۔ مسٹر بوس کی سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ اُنھوں نے بلا سمجھے بوجھے انتخابی مہم سر کرنے کی غرض سے مسٹر پٹیل اور دیگر ممبران ورکنگ کمیٹی پر فیڈریشن کے سلسلے میں بعض بے بنیاد الزامات لگاکر فوری کامیابی حاصل کرنیکی کوشش کی دوسری غلطی یہ ہوئی کہ جب اُن سے ان الزامات کے واپس لینے کو کہا گیا۔ اُس وقت بھی وہ کوئی الوالعزمی نہ دکھلا سکے۔ تیسرے زبان سے تو وہ یہی کہتے رہے کہ میں مہاتماجی کو خوش و مطمئن رکھنا اپنا فرض مقدم سمجھتا ہوں۔ لیکن جب رائے کا معاملہ آتا ہے تو وہ نہ صرف خودرائی سے کام لیتے ہیں بلکہ ضروری صفائی برتنے میں بھی تکلّف کرنے لگتے ہیں۔

ہمارا تو یہی خیال ہے کہ جس اعلیٰ درجہ کے عدم تشدد پر مہاتماجی نہ صرف خود کاربند ہیں بلکہ کانگریس کو بھی اس کا پابند رکھنا چاہتے ہیں، اُس کے مسٹر سبھاش بوس نہ دِل سے حامی ہیں اور نہ قائل۔ اور شاید اُس پر وہ خلوص قلب سے عمل بھی نہیں کر سکتے عدم تشدد مہاتماجی کا دین و ایمان ہے۔ مسٹر بوس کے لئے وہ ایک پالسی ہے۔ مہاتماجی شکست کھانا پسند کریں گے لیکن اپنا ایمان نہ بدلیں گے مسٹر بوس فوری فتح کے لئے جو ذریعہ ممکن ہوگا اُس کے استعمال میں دِل سے کوئی پس و پیش نہ کریں گے۔ دونوں سچے محب وطن ہیں۔ دونوں ملک کی فلاح و بہبود کے لئے جان تک نثار کر دینگے۔ لیکن مہاتماجی کسی ایسے وسیلے سے کام نہ لیں گے، جسے وہ اپنے اعلیٰ اصولوں سے گرا ہوا سمجھتے ہیں۔ ممکن ہے ہمارا خیال غلط ہو لیکن مسٹر بوس ملکی تحریک کو تقویت دینے اور آزادی کی کوشش کو زیادہ زوردار بنانے کے لئے شاید غیر ملکی امداد قبول کرنے سے بھی دریغ نہ کریں۔ بہرحال کوئی اِسی قسم کا اصولی اختلاف ہے یا کوئی ایسی ہی اندرونی وجوہ ہیں جن کی بدولت یہ باہمی اختلاف رفع نہ ہوسکا۔ دُنیا جانتی ہے کہ بابو راجندر پرشاد کو برسر عہدہ ہونے کی کوئی خواہش نہ تھی۔ لیکن اِسوقت اُنھوں نے ایسے نازک وقت میں کانگریس کی صدارت قبول کرکے جو ذمہ داری اپنے سر لیلی ہے اُس کے لئے اُن کی بلند ہمتی اور حب وطن کی جتنی تعریف کیجائے کم ہے لیکن اہلِ بنگال کی صوبہ پرستی کرشمے سے بابو راجندر پرشاد بھی توہین آمیز برتاؤ سے محفوظ نہ رہے اور اُن کے ساتھ

مسٹر پنت، مسٹر کرپلانی اور پنڈت جواہر لال نہرو سے بھی بدتمیزی کا برتاؤ کیا گیا۔ مگر بنگال میں جو نہ ہو جائے تھوڑا ہے۔ مسٹر سین گپتا اور مسٹر سی۔ آر داس کے وقت ہی سے بنگال کے کانگریسی حلقوں میں پارٹی بازی کا زور رہا ہے۔ ادھر چند ماہ سے اخبارات نے کانگریس ہائی کمانڈ کے متعلق عام بنگالیوں میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلا رکھی ہیں۔ تریپوری میں بھی بنگالی ڈیلیگیٹوں نے بڑا اودھم مچایا تھا۔ اور وقتی کامیابی حاصل کرنے کے لئے نامناسب کارروائیوں سے بھی گریز نہیں کیا اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے موقعہ پر تو ہمارے محبانِ وطن خوب ہی کھل کھیلے۔ ان حرکات کو دیکھتے ہوئے یہی کہنا پڑتا ہے کہ مسٹر سبھاش بوس اس اجلاس کو کلکتہ میں منعقد نہ کرتے تو بہتر ہوتا۔ مسٹر پٹیل نے اس سے کنارہ کشی کرنے میں عقلمندی سے کام لیا۔

بابو راجندر پرشاد صاحب نے پرانی ورکنگ کمیٹی کو دوبارہ نامزد کر دیا ہے، صرف مسٹر بوس اور اُن کے بھائی کے بجائے بنگال کے دو اور آزمودہ محبانِ وطن کو شامل کر لیا ہے مگر اہلِ بنگال نے اُن دونوں صاحبوں سے غم و غصہ کا اظہار کیا۔ مسٹر بوس سے ورکنگ کمیٹی میں شریک رہنے پر بہت زور دیا گیا۔ لیکن وہ کانگریس کے اندر فارورڈ بلاک قائم کر کے اپنی مسجد علیحدہ بنانا چاہتے ہیں۔ اُن سے پرانی ورکنگ کمیٹی نامزد کرنے کو کہا گیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اُس کے متعلق ایک ریزولیوشن بھی پیش کیا لیکن مسٹر بوس کے لئے کوئی تجویز قابلِ قبول نہ ہوئی۔ بہر حال جو ہونا تھا ہوا۔ اور ہم تو یہی کہیں گے کہ جو کچھ ہوا، مناسب ہی ہوا۔ اِس لئے کہ اس وقت مسٹر بوس کی پالیسی ہمارے ملکی مفاد کے لئے مفید نہ ثابت ہوتی۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سامنے اس وقت جہاں اور بہت سے اہم مسائل ہیں وہاں کانگریس کے اندرونی نقائص کو دور کرنے کا بڑا بھاری مرحلہ بھی ہے۔ مہاتما جی کانگریس کی اندرونی اصلاح و ترقی کے درپے ہیں۔ اور بابو راجندر پرشاد اور اُن کے ساتھی پرانے لیڈر ورکنگ کمیٹی میں نئے خون داخل کرنے کی ضرورت بخوبی محسوس کر رہے ہیں۔ مسٹر بوس دانستہ یا نادانستہ اُس کو پارٹی بندی کا کھلونا بنانا چاہتے تھے۔ مگر مہاتما جی، مسٹر پٹیل اور دیگر آزمودہ کار لیڈران ورکنگ کمیٹی کو پارٹی بندی کی جولانگاہ بنانے کے خلاف ہیں۔ لیکن جہاں تک ہم کو معلوم ہوا ہے نئے خیال اور نئے خون کے بعض سربرآوردہ لوگوں کے لئے ورکنگ کمیٹی میں جگہ نکالنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ ہم نے سنا ہے کہ خود مسٹر پٹیل اور اُن کے کئی رفقاء ورکنگ کمیٹی سے کنارہ کش ہونے کو آمادہ ہیں۔

گورنمنٹ انڈیا ایکٹ میں ترمیم اس وقت یورپ میں ہر وقت لڑائی چھڑ جانے کا خطرہ ہے۔ چونکہ ہندوستان کے سات آٹھ صوبوں میں کانگریسی گورنمنٹیں ہیں۔ اور برٹش گورنمنٹ کو ابھی تک اُن کی طرف سے

جنگ میں امداد واعانت کا اطمینان نہیں اسلئے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں دارالامرا میں ایک ترمیمی مسودۂ قانون پیش کیا گیا ہے جس میں وائسرائے کو مزید اختیارات دئے گئے ہیں۔ جن کی رُو سے وائسرائے کے اس اعلان پر کہ ہندوستان کے امن کو خطرہ ہے مرکزی حکومت کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ مرکزی اور صوبجاتی حکومتوں کے باہمی تعلقات میں دخل دیئے بغیر صوبجاتی حکومتوں کو بعض انتظامات کے متعلق ہدایات دے سکے۔ اس ترمیم کی غرض وغایت یہ بتائی جاتی ہے کہ جنگ کی حالت میں اشیا کی بہم رسانی کا انتظام گورنر جنرل کے ہاتھ میں ہونا لازمی ہے۔ مثلاً ہوائی حملوں کی صورت میں روشنی پر بھی اقتدار رکھنا ہوگا۔ پچھلے جنگ کے زمانہ میں برطانیہ میں لوگ بجلی اور اسی قسم کی بعض دوسری چیزیں حسب دلخواہ نہیں خرید سکتے تھے بلکہ حکومت کی طرف سے اُن کی مقدار مقرر کردی گئی تھی۔ اور کارخانوں کو بھی حکومت کی مانگ پورا کرنا لابدی کردیا گیا تھا۔

اِن ترمیمات کے مطابق فیڈرل اسمبلی کو صوبجاتی حکومتوں کے اختیارات حاصل ہوں گے، اور فیڈریشن اور اُس کے افسران کو ٹیکس لگانے کے اختیارات منتقل کرنے کے اختیارات رہیں گے لیکن بلامنظوری وائسرائے عطائے اختیارات کا کوئی مسودہ قانون پیش نہ کیا جاسکیگا۔

چونکہ ان ترمیمات سے صوبجاتی حکومتوں پر مزید پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔ اور وائسرائے کے اختیارات میں غیر معمولی اضافہ ہوتا ہے اس لئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اُن کے خلاف پُرزور پروٹسٹ کیا ہے۔ پارلیمنٹ میں صاحب وزیر ہند نے یہ بات صاف طور پر واضح کردی ہے کہ یہ ترمیمات صرف جنگ کے خطرہ کے لحاظ سے کی جارہی ہیں اور لڑائی کے علاوہ معمولی حالات میں اُن پر قطعی عمل نہ کیا جائے گا۔ ایک دفعہ کی رُو سے اس برقی طاقت کو ٹیکس سے مستثنیٰ کردیا گیا ہے جو فیڈرل حکومت کے لئے فروخت کی جائے یا فیڈرل ریلوں کے استعمال میں آئے۔ اُنمیں یہ بات بھی واضح کردی گئی ہے کہ ہندو یونیورسٹی اور مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے علاوہ اور سب یونیورسٹیاں صوبجاتی حکومتوں کے متعلق ہیں۔

راجکوٹ کا مسئلہ پھر کھٹائی میں پڑ گیا ہے۔ ہم نے پچھلے نمبر میں راجکوٹ ایجی ٹیشن میں گاندھی جی کی مداخلت اور وائسرائے کی عملی امداد کو ہندوستان کی تحریک آزادی کی آیندہ کامیابی کا پیش خیمہ قرار دیا تھا۔ لیکن بعد کے واقعات نے بخوبی ثابت کردیا کہ خود ہمارے ہی درمیان ایسے اسباب اور حالات موجود ہیں جو آزادیٔ وطن کی راہ میں حائل ہیں۔ چنانچہ گو چیف جسٹس صاحب انڈیا نے مہاتما گاندھی کے موافق فیصلہ دیا۔ لیکن اس سے دربار ویربالا کی سازش کا خاتمہ نہ ہوسکا۔ چنانچہ راجکوٹ کی چھوٹی سی ریاست میں بھی بجنسہٖ انھیں مخالفانہ گروہوں نے اپنا سر اُٹھایا جن سے اس وقت تمام ہندوستان کی فضا مکدر ہو رہی ہے۔ طے یہ ہوا تھا کہ اصلاحات

تجویز کرنے والی کمیٹی میں پرجا پرشد کے نمایندوں کی تعداد غالب رہے گی۔ لیکن دربار دیربالا نے جو ٹھاکر صاحب کے معتمد علیہ ہیں ریاست کے جاگیرداروں اور مسلمانوں کو مخالفت پر اکسا دیا اور ان دونوں طبقوں نے کمیٹی میں اپنی اپنی علیحدہ اور آزادانہ نمایندگی پر زور دیا۔ مہاتما گاندھی نے ٹھاکر صاحب سے ممبران کمیٹی میں اضافہ کرنے کی درخواست کی لیکن ٹھاکر صاحب کی طرف سے یہ درخواست اس بنا پر رد کردی گئی کہ ٹھاکر صاحب نے شروع میں صرف دس ممبروں کی کمیٹی مقرر کرنے کی زبان دی تھی۔ اس سے زیادہ ممبروں کی تقرری کا مطالبہ معاہدہ کے باہر ہے۔ اس پر راجکوٹ میں مہاتما گاندھی کے خلاف مخالفانہ مظاہرہ کا انتظام کیا گیا۔ اور ایک روز اُن کی عبادت میں بھی قصداً خلل ڈالا گیا۔ لیکن مہاتما جی نے اس اشتعال انگیزی اور روحانی کوفت کو صبر و تحمل سے برداشت کیا اور اپنی شکست تسلیم کرکے راجکوٹ سے یہ کہہ کر چلے آئے کہ دربار بطور خود اپنی رعایا سے مشورہ کرکے ضروری اصلاحات دیدے۔ ریاست کی طرف سے مسٹر جناح اور ڈاکٹر امبیدکار سے مشورے ہوئے مگر اب تک کوئی مُفید نتیجہ نہیں نکلا۔ چنانچہ ۱۲ مئی کو مہاتما گاندھی کو بادلِ ناخواستہ پھر راجکوٹ جانا پڑا۔ دیکھئے آیندہ معاملہ کس پہلو پر طے ہو۔ مگر ہم کو راجکوٹ میں وہی تمام خرابیاں نظر آرہی ہیں جو اسوقت ہندوستان بھر میں چھائی ہوئی ہیں۔ ٹراونکور، میسور۔ جے پور۔ بنارس اور حیدرآباد وغیرہ مختلف ریاستوں کی رعایا مزید حقوق طلب کر رہی ہیں۔ درحقیقت اس وقت ہندوستان بھر میں عوام اپنے حقوق میں توسیع کے طالب ہیں۔ چنانچہ اب تک نہ جے پور اور نہ حیدرآباد میں کوئی ہندو مسلم مسئلہ تھا۔ لیکن اب وہاں بھی حکومت کو مشکلات درپیش ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ فیاضی اور بلند نظری کو دخل دیا جائے تو کُل مسائل کم از کم آیندہ دس بیس سال کے لئے قابل اطمینان طریقے پر طے ہوسکتے ہیں۔ بشرطیکہ حکومت کو خواہ مخواہ قدیم روش پر قائم رہنے پر اصرار نہ ہو اور عوام ہند بھی نیک نیتی کے ساتھ اپنے پسماندہ برادران وطن کا ساتھ دیں۔ یہ نہیں کہ جو باتیں کشمیر کے لئے درست سمجھی جائیں وہ حیدرآباد کے واسطے نامناسب قرار دی جائیں اور خواہ مخواہ ہر معاملہ کو فرقہ وارانہ رنگت دے کر ہندو مسلم مسئلہ بنا لیا جائے۔

جن جن صوبوں میں کانگریسی حکومت ہے وہاں بھی کچھ دنوں سے یہی مشغلہ جاری ہے۔ چنانچہ اسوقت صوبہ متحدہ صوبہ بہار اور صوبہ متوسط میں آئے دن فسادات برپا کرکے گورنمنٹ کی جان ضیق میں کیجا رہی ہے۔ کانپور، بنارس وغیرہ کو اس بارہ میں غیر معمولی شہرت حاصل ہوگئی ہے۔ کانگریسی وزرا انتہائی رعایت و رواداری کا برتاؤ کرنے کے باوجود خاص طور پر بدنام کئے جارہے اور انکے ساتھ توہین آمیز برتاؤ کیا جارہا ہے۔ فرقہ وارانہ تحریکیں کُھلے بندوں زور شور سے عوام میں منافرت پھیلارہی ہیں۔ اور کانگریسی گورنمنٹ اصولوں کی دھن میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہے۔ آجکل انکی مالی پالسی بھی صوبہ کے ذی اثر معززین کی نکتہ چینی کا باعث ہورہی ہے۔ ان سب باتوں کا مجموعی اثر کیا ہوگا؟ یہ دیکھنے کی بات ہے

زمانہ

جلد ۷۲ — جون ۱۹۳۹ء — نمبر ۶

ہندوستان کا دورِ بیداری

از پروفیسر رگھوپتی سہائے صاحب فراق (الہ آباد یونیورسٹی)

ہمارے دورِ بیداری کے علمبرداروں کی فہرست میں راجہ رام موہن رائے برہمو سماج اور اس کے حلقہ بگوش و رہنما، پرارتھنا سماج کی تحریک اور بمبئی و مہاراشٹر کے علاقوں میں اس کے رہنما، تھیوسوفیکل سوسائٹی، اس کے بانی اور رہنما، سوامی دیانند سرسوتی اور آریہ سماج کے دیگر رہنما و کارکن، سر سید احمد اور اُن کی تحریک علیگڑھ، ایشور چندر ودیا ساگر، بنکم چندر چٹرجی اور بنگالی زبان کو حیات نو بخشنے والی تحریک اور اسی کے ساتھ اردو ہندی اور ہندوستان کی دوسری خاص زبانوں کی ترقی، مشترکہ زبان کی تحریک، انگریزی، ہندوستانی زبانوں میں نامہ نگاری و مقالہ نگاری کی ترقی، ویویکانند، اربندو گھوش، رام تیرتھ، نیشنل کانگریس اور اُس کے بانی، بنگالی فلاسفروں اور حسن کاروں کا طبقہ، کانگریس کے ابتدائی انتہا پسند لیڈر مثلاً تلک وغیرہ، بنگال اور دوسرے مقامات کی انقلابی تحریکات، ہندوستان میں صنعت و حرفت اور اس کے ساتھ مزدور پیشہ جماعت کی تحریک غرض یہ سب کچھ شامل ہیں۔

ہندوستان کے طول و عرض میں بدیشی حکومت قائم ہونے کے بعد ملکی باشندوں کے جذبۂ خودداری کو شدید صدمہ پہونچا، چنانچہ اس کا قدرتی نتیجہ ۱۸۵۷ء کا غدر تھا جو ہندوستانی تاریخ کے تضادی ارتقا میں ایک ناگزیر منزل تھا۔ اس کا انجام صرف تخریبی نتائج اور نفی پر مشتمل نہ تھا۔ چونکہ اس کی وجہ سے اور اس کے بعد ہندوستان میں برطانوی حکومت کی بنیاد گہری اور مضبوط تر ہوگئی اس لئے

اسکولوں اور کالجوں کی مروجہ تاریخوں میں ۱۸۵۷ء کے واقعات سے ایک قسم کی پُراسرار ہمدردی پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ کیا ہوسکتی ہے کہ آج تک اس ہندوستانی بغاوت پر کسی نے ہندوستانی ترقی کو دھکا پہونچانے کا الزام نہیں لگایا۔ صورت حال کا یہ تضاد صرف اس وقت سمجھ میں آتا ہے جبکہ ہم اس امر کا احساس کرلیں کہ ۱۸۵۷ء کا غدر ایک دودھاری تلوار تھا جس نے دونوں طرف سے کاٹا اور کاٹ رہا ہے اور جو منفی اور تخریبی ہونے کے ساتھ ساتھ تعمیری اور تخلیقی بھی تھا اور دونوں صورتوں سے دودھاری واقع ہوا تھا۔ برٹش حکومت کے ارباب حل وعقد اس کو دل ہی دل میں دعائیں بھی دیتے ہیں کہ اس کی وجہ سے ان کی حکومت کی بنیاد مضبوط ہوگئی اور وہ اُس سے اسی وجہ سے خائف بھی ہیں کہ اُسی حکومت کی ناکامیابی کے باعث بغاوت کا علم بلند کرنے والی قوتیں بھی جن کی طرف ہم اس مضمون کے ابتدائی حصہ میں اشارہ کرچکے ہیں پیدا ہوئیں۔

ایک پریشان کن سستی کے باوجود ہندوستانی دورِ بیداری کی عالمگیر اور ہر شعبۂ زندگی کو ترقی دینے والی تحریک یقینی استقلال کے ساتھ "تخلیقی اتحاد" کا فرض انجام دیتی رہی اور موافق و مخالف امور کی بدولت نئی نئی صورتیں پیدا کرتی رہی۔ اس طرح واقعی ہندوستان میں برٹش قوت کی مضبوطی اور شہنشاہیت کی ہر فتح کا اُلٹا اثر یہ ہوا کہ بالآخر وہ بھی ہندوستان کی قومی بیداری کے بھنور میں پھنس گئی۔ گویا شہنشاہیت خود اپنے جال میں شکار ہو رہی ہے۔ اسی وجہ سے عیسائی مشنریوں کا کام عیسائیت کی نشر و اشاعت، عیسائی اسکول، کالج وغیرہ تھوڑے عرصہ کے بعد خلاف توقع قومی اہمیت و قومی رنگ حاصل کرنے لگے۔ میکس ملر (M. Muller) مونیر ولیمیز (Morrier Williams) اور دوسرے مغربی مستشرقین کی تصنیفات کا بھی جو اپنے خوش آیند پہلوؤں کے باوجود اعتراض کے مقصد سے لکھی گئیں یہی انجام ہوا۔ بلکہ شہنشاہیت کے قریب قریب ہر ارادے کا یہی حشر ہوا۔ انگریزی تعلیم کی اشاعت، سفر کے ذرائع کی توسیع، ریل اور دوسری ایجادیں، بیرونی ممالک سے تجارت، ہندوستانی مزدوروں اور قانون کے پردے میں پُرفریب استحصال وغیرہ تمام باتیں شہنشاہیت کے مخالف اثرات پیدا کرتے رہے۔ جو ہندوستانی بیداری کی تحریک اور ہندوستانی قومیت کی بڑھتی ہوئی لہر کو تیز اور مضبوط تر بناتے رہے۔ نیشنل کانگریس خود برطانوی مدبروں کے اشارے پر قائم ہوئی۔ اور تین ہی چار سال کے اندر اندر اپنے چوتھے اجلاس منعقدہ الہ آباد میں ناقابل برداشت بن گئی۔ باغی قومیت شدید غلطیاں کرتی رہی اور اُسے غیر معمولی مشکلات و کشمکش سے دوچار ہونا پڑا لیکن پھر بھی اس کا اثر ان تحریکات پر بھی پڑا جو ہندوستان میں تفریق ڈالنے اور حکومت کو مضبوط کرنے کے لئے نہایت عیاری سے جاری کی گئی تھیں، چنانچہ مسلم لیگ

اور کرسچین کانفرنس میں، حتیٰ کہ اینگلو انڈین کمیٹیوں اور بڑے بڑے فرنگی کاروبار میں بھی اس گونج کی ترم تانیں سنائی دیں - غرض ہمارے دورِ بیداری کو اُن حلقوں سے بھی مدد ملی جو خود شہنشاہیت کی آماجگاہ تھے اور جن سے امداد کی کوئی توقع نہ ہوسکتی تھی - میونسپلٹیاں، ڈسٹرکٹ بورڈ، صوبہ کی قانونی کونسلیں، مرکزی مجالس قانون ساز اور خود قائم مقامانِ شاہی بھی اس ہوا سے متاثر ہوئے جو شہنشاہیت پر بھوت کی طرح منڈلا رہی تھی - اور یہ سب کچھ حکومت کے عہدہ داروں کی انتہائی منظم کوششوں اور حیرت انگیز حوصلہ شکنیوں کے باوجود ہوا تھا۔

اِن حیات نو بخشنے والی قوتوں کو بیرونی دنیا کے واقعات سے بھی بڑی مدد و قوت حاصل ہوئی روس و جاپان کی جنگ، ٹرکی - مصر - ایران - افغانستان وغیرہ حکومتوں کی قسمتوں کا الٹ پھیر پین اسلامزم کی تحریک - چین اور ایشیا کے دوسرے حصوں میں ایک نئی زندگی کی لہر - حبشی اور دوسری رنگین اقوام کی حالت، ہندوستانی دورِ بیداری کی تکمیل میں اِن سب کے مجموعی اثرات شامل حال رہے۔

غرض ہندوستانی دورِ بیداری کی ترقی میں بالکل مختلف و مخالف قوتیں اور عناصر کھنچ آئے لیکن اُس تحریک کو حقیقت سے دُور ہونے کا احساس ہوتے ہی نئی حقیقتوں سے دوچار ہونا پڑا - اور جس طرح شہنشاہیت نئی زندگی کی بڑھتی ہوئی لہر میں پھنس گئی تھی اسی طرح ہماری بیداری کو ترقی دینے والی قوتیں بھی شہنشاہیت کے عالمگیر و عیارانہ جال میں پھنس گئیں - ابتدائی جوش و خروش جلد ہی ختم ہوگیا تمام ترقی، تعلیمی، معاشی - اقتصادی اور سیاسی ادارے مایوسی بخش اور دھوکا دیتے ہوئے نظر آنے لگے اِن سب پر شہنشاہیت کی بھیانک فضا قائم ہوگئی - ہندو اور مسلم یونیورسٹیاں، گوروکل اور شانتی نکیتن، زنانہ کالج اور اسکول اور دوسرے فرقہ وارانہ سرکاری او نیم سرکاری ادارے، سب گویا شان و شوکت کے خواب سے بیدار ہوگئے - سب مصنوعی "گرم کمرے" میں رکھے ہوئے پودوں کی طرح معلوم ہوئے معاشرتی، تعلیمی اور مذہبی اصلاح کے ابتدائی علمبردار بھی اب افسوس کے ساتھ یہ محسوس کرنے لگے کہ ایک ظالمانہ نظامِ حکومت کی موجودگی میں وہ بھی کوئی ترقی نہیں کر سکتے۔

ہندوستان بلکہ تمام دنیا کی صورت حالات حرکت و رفتار کے لئے بالکل موافق تھی چنانچہ رفتار کو تیز کرنے والی طاقت نے طوفانی شکل میں نمودار ہوکر ساری دنیا کو ہلا دیا - جنگ عظیم کے بعد جو حالت پیدا ہوئی اس کی وجہ سے تمام دنیا میں ہر چیز کو دوبارہ درست اور ماحول کے موافق بنانے کی مضطربانہ کوششیں ہوئیں - چنانچہ ہندوستان میں مہاتما گاندھی کی تحریک

رو نما ہوئی، مہاتما گاندھی کے ساتھ ہندوستانی بیداری کا ایک طولانی دور درجۂ تکمیل کو پہونچکر ختم ہو جاتا ہے۔ مہاتما گاندھی کی تحریک ہندوستانی بیداری کے پہلے دَور کی غلطی یا رجعت پسندی بھی ترقی یا حرکت پذیری کی نشانی تھی۔ یہ دور۔ انیسویں صدی کے وسط میں شروع ہو کر مہاتما گاندھی کے عروج کے ساتھ فیصلہ کن اقدام کے اصول پر ختم ہوا۔

بیداری کے پہلے دَور نے گاندھی ازم کی ابتدائی شکلوں میں زیادہ منظم ہو کر ایک انقلابی رنگ اختیار کر لیا اور وہ قوتیں جن کو صرف جذباتی اور غیر متعین سمجھکر یا ذہنی بلندی کا نتیجہ بتلا کر ٹال دیا جاتا تھا۔ مہاتما گاندھی کی تحریک میں برابر عمل پیرا ہو کر یقین و حقیقت سے آشنا ہونے لگیں۔ چنانچہ اس بیداری میں پہلی بار ایک سماجی مسالہ ظاہر ہونا شروع ہوا۔ یعنی عوام نے پہلی بار اپنی صحیح جگہ لینا شروع کی۔ اور تحریک کی مادی حیثیت اور حقیقت شناسی کچھ تو گاندھی جی کی وجہ سے اور کچھ اُن کی روحانی تعلیمات کے باوجود زیادہ تیز ہوتی گئی۔ پہلے کی طرح ایک مرتبہ پھر ہندوستانی بیداری کی شراب ساغر سے چھلک اُٹھی۔ مختلف واقعات کے باوجود ترقی کا پہلا دَور جو پچھتر برس تک قائم رہا تھا مہاتما گاندھی کے ساتھ قریب ختم ہوا، اور ہندوستانی بیداری کی تحریک اب اُس منزل پر پہونچ گئی جہاں سے ترقی کی شاہراہ گھومتی مُڑتی ہوئی بالکل نئی وادیوں میں جاتی اور تحریک کو نئی زندگی بخشتی ہے۔

یہ صورت حال سرمایہ داری اور شہنشاہیت (جو اب لازم و ملزوم سی ہوگئی ہیں) کے بنیادی اور فطری نتائج کے باعث اور زیادہ شدید ہوگئی۔ لیکن معاملات رفتہ رفتہ صاف ہوتے گئے، اور ہندوستانی بیداری کے بنیادی عناصر اور نتائج منظر عام پر آگئے۔ اب اِس تحریک میں صاف طریقہ سے سوچنے سمجھنے اور کہنے کا مادہ پیدا ہوگیا، اس کا پُرانا، اُلجھا ہوا ناموافق اور متضاد مطمح نظر اور طریقۂ فکر اب از خود غلط ثابت ہو رہا ہے، اور آج ہندوستان کی سب سے زیادہ معنی خیز حقیقت یہ ہے کہ ہر سمت دلوں کی دُکھتی ہوئی رگیں ٹٹولی جا رہی ہیں۔

یہ وہ منزل ہے جس سے آجکل ہندستان گذر رہا ہے جو نہایت دشوار گذار اور مشکل منزل ہے، اس نے اسے دو دنیاؤں کے بیچ میں پہونچا دیا ہے، ایک وہ جو مردہ ہو چکی ہے اور دوسری وہ جو ابھی پیدا نہیں ہوئی۔ تمام پُرانی حقیقتیں جو مذہب اور مابعد الطبیعیات کی حدود سے نکل کر گذشتہ پچھتر برس میں تعلیمی۔ صنعتی اور سیاسی تحریکوں میں مرکوز ہوگئی ہیں، آج نہایت شدت سے گاندھی اور گاندھی ازم کی اہمیت پر مشتبہ سوالات کر رہی ہیں۔ حقیقت

پرستی میں کسی کا احترام نہیں ہو سکتا۔ تاریخی حقیقتوں کے ماتحت نہ روحانی خواب آفرینی کی گنجایش ہے اور نہ متضاد قوتوں میں کوئی سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔

پھر آج ہندوستانی بیداری کس منزل میں ہے؟ میں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اس کی منزل شاہراہ کے موڑ پر ہے۔ یہاں پر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستانی بیداری میں کون سی نئی قوتیں اور کون سی حقیقتیں ابھر رہی ہیں۔ اور یہ قوتیں اور حقیقتیں کون کون سی نئی شکلیں اختیار کر رہی ہیں اور ان سب میں ایک رواں، زندہ اور مربوط اتحاد کیسے قایم کیا جا سکتا ہے۔

اس نئے دورِ بیداری کے مرکزی اور انتہائی اہم حصوں میں ایک نئی تخلیقی سادہ پسندی کا امتیازی وصف ہوگا۔ اس میں خواہش، خیالات اور جذبات میں ایک خاص ہم آہنگی ہوگی، اور انجام کار اس میں ایسی حقیقت پسندی آجائیگی جو اس کی پہلی شکلوں میں مفقود تھی۔ اس نئے دورِ بیداری میں کسی ایسی سیاسی یا تمدنی جذبات پسندی، خیال آفرینی یا سمجھوتے کے لئے کوئی جگہ نہ ہوگی جو ہماری سماجی زندگی کی مٹتی ہوئی بنیادوں کو قائم رکھتا۔ ملک کے عوام ہی ہر چیز کے مرکز ہونگے، وہی ہر چیز کی جان ہونگے اور انھیں سے اُس کی رفعت بڑھیگی، سائینس۔ فلسفہ حُسن کاری، اخلاق اور تمدن کی تمام دوسری باتیں شہری اور سیاسی زندگی کے تمام لائحۂ عمل، قومی تعمیر کی تمام اسکیمیں اور انقلابی خیالات عام پسند ہونگے۔ عوام کا مفاد اُن کا مفاد ہوگا یہ دَورِ بیداری بلند طبقوں کے مٹتے ہوئے تمدن کی نشانیوں سے پاک ہوگا۔ اس کی کوئی خصوصیت اسے چھو بھی نہ جائے گی۔ مابعدالطبعیات (فلسفہ) اور محدود و حقیقت ناآشنا مذہبیت روز بروز زیادہ سے زیادہ مکمل ہو کر تمام اعتقادی اور مذہبی خیالات کی زنگ آلود زنجیروں کے ٹکڑے کر دیں گی مخصوص حقوق کی ساری تنظیم اور تمام اداروں کے خلاف اس کا زور روز بروز تیز اور گرم تر ہوتا جائے گا۔ وہ ایسی تمام قوتوں کی بیخ کنی کریگی اور ان قوتوں پر منظم طریقے سے اور سامنے سے حملہ آور ہوگی۔ اس دورِ ترقی میں عوام کی بڑھتی ہوئی بیداری سے حرکت و جان پیدا ہوگی۔ اس کی نظریں عوام کی جانب ہونگی اور انھیں کے دم سے اسمیں بقا پیدا ہوگی۔ وہ نہایت وسیع اور شدید حیثیت سے گرم مزاج اور انقلاب پسند واقع ہوگی۔ مارکس کا قول ہے کہ "مدتوں سے فیلسوف دنیا کی تشریح میں مصروف ہیں۔ لیکن اب اس کی صورت بدلنے کا موقعہ ہے۔"

اس نئے دورِ ترقی کی جو جھلک دکھائی گئی ہے، اس پر غالباً یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ مغرب

کی غلامانہ نقالی ہوگی، لیکن یہ کوئی نیا اعتراض نہیں۔ خود روس میں مارکس کے تابعین اوران لوگوں میں جو پُرانے روسی کلچر کے دلدادہ تھے مدت تک کشمکش ہوتی رہی۔ اسٹالن نے ان اعتراضات کا نہایت اختصار کے ساتھ یہ جواب دیا ہے کہ نئے تمدن کی روح اشتراکی ہوگی مگر شکل قومی رہیگی آپ کا یہ دور تمدفن کے مدغم ہوجانے کا دور ہے۔ ہندوستانی تمدن کی امتیازی خصوصیات مادی۔ اقتصادی اور سیاسی تعمیر کے بعد ظاہر ہونگی۔ اس سے پہلے نہیں۔ اس سے نئی زندگی اور نئے تمدن کی عمارت اور طرز تعمیر اپنی اہم صورتوں میں دنیا کے طرز سے ملتا ہوگا۔

صرف اُسی وقت ہندوستانی تمدن کی دوبارہ گل افشانی کا وقت آئے گا۔ ہندوستان کی بیداری ہونے پر تخریب بھی ہوگی اور تعمیر بھی۔ اس کے ترقی پذیر دَور میں مختلف تمدنوں کے باہمی ارتباط اور ہندوستانی تمدن کے امتیازی پہلو دونوں کی جھلک پیدا ہوگی۔ ہمارے حسن کار، فلسفی، مصوّر، معمار اور موسیقی داں ہندوستان کے گذشتہ تمدن اور دوسری قوموں اور مقاموں کے تمدن کے ان تمام اجزا کو جن میں زندگی اور بقا کے عناصر موجود ہونگے اپنے اندر جذب کرکے اُن میں مناسب موقعہ صوری و معنوی تبدیلیاں پیدا کریں گے۔ ہندوستان کا امتیازی ذہن زندگی کی نئی صورتوں کو ایک سنجیدہ اور ضوفشاں لطافت اور ایک نئی روحانی ہم آہنگی اور ترنم بخشے گا جو ہندوستان کے لئے مخصوص ہوگا۔ آج ہم اس نغمہ کی مدھم صدائیں سُن رہے ہیں اور اس دورِ بیداری کے قدموں کی چاپ ہمارے کانوں میں آ رہی ہے۔

تیس ۳۰ سال پہلے

منشی پریم چند مرحوم "نواب رائے" کے نام سے "زمانہ" میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ زمانہ مئی و جون ۱۹۰۹ء میں آپ نے "صوبۂ متحدہ میں ابتدائی تعلیم" پر ایک پُرمغز مضمون لکھا تھا جس کے دوران میں آپ نے ہندوستان کے دیہاتی مدرسوں کی ان الفاظ میں تصویر کھینچی ہے:-

"ایک درخت کے نیچے جس کے ادھر اُدھر کوڑا کرکٹ پڑا ہوا ہے، اور جہاں شاید برسوں سے جھاڑو نہیں دیگئی ہے ایک پھٹے پُرانے ٹاٹ پر بیس پچیس لڑکے بیٹھے اُونگھ رہے ہیں، سامنے ایک ٹوٹی ہوئی کُرسی اور پُرانی میز ہے اس پر حضرت مدرس کی ذات جمکن ہے۔ لڑکے جھوم جھوم کر پہاڑے رٹ رہے ہیں۔ شاید کسی کے بدن پر ثابت کرتہ نہ ہوگا دھوتی ران کے اوپر بندھی ہوئی ہے۔ ٹوپی میلی کچیلی، صورتیں گرسنہ، چہرے پژمردہ۔ یہ آریہ ورت کا مدرسہ ہے جہاں کسی زمانہ میں تکشن شلا اور ندیا کے دارالعلوم تھے۔ کس قدر تفاوت ہے۔ ہم تہذیب کی دوڑ میں دیگر اقوام سے کس قدر پیچھے ہیں۔"

پچھلے تیس ۳۰ سال کے اندر اس حالت میں کتنی اصلاح ہوئی ہے، یہ ہمارے لئے غور طلب بات ہے۔

افسونِ بہار

(از حضرت احسان دانش)

سکونِ مستقل کہاں، گریز روزگار میں اٹھا بھی جام ساقیا ہے کس کے انتظار میں
صدائے اشرِ بوکو سُن! صلائے نوبہار میں

ہجوم برق و باد ہے جوانیاں لئے ہوئے خرام ابر نرم رو سکونِ جاں لئے ہوئے
مسرتوں کا جوش ہے صدائے آبشار میں

فضائے صحنِ باغ میں طیور کی ہیں ٹولیاں گلوں کی رنگ رنگ سے مسک رہی ہیں چولیاں
بجا رہی ہے بنسری نسیم سبزہ زار میں

شگفتگی کے تخت ہیں ہوا کے نرم دوش پر مچل رہی ہیں فطرتیں جوازِ ناؤ نوش پر
چھلک رہے ہیں میکدے ضمیر میگسار میں

جہانِ عقل و ہوش ہے سرود زار بے خودی خودی کا ہر اصول ہے نگاہدار بے خودی
کھنک رہی ہیں چھاگلیں ہوائے کیف بار میں

بہار نے بکھیر دیں، چمن میں عنبریں لٹیں گھٹائیں آسمان پر بدل رہی ہیں کروٹیں
نگاہ کیف آشنا ہے گم بہشت زار میں

وہ ظرف گل ہے کون سا جو ساتگینِ زر نہیں یہ حال مستیوں کا ہے کسی کو کچھ خبر نہیں
ہے لالہ زار وجد میں، کہ وجد لالہ زار میں

اُبل پڑے ہیں زمزمے رُبابِ بر شگال سے ہر ایک شئے جواں ہوئی، شبابِ بر شگال سے
شمیم زلفِ حور ہے، نسیم خوشگوار میں

جنونِ شوق میں ہیں غرق نو بنو جوانیاں روش روش پہ چھڑ گئیں شباب کی کہانیاں
ہیں بے قرار جنتیں نگاہِ بے قرار میں

ملاحتوں کے قافلے بڑے ہیں ہر چٹان پر برس رہی ہیں مستیاں ہی مستیاں جہان پر
اُتر رہے ہیں زمزمے گھٹا سے آبشار میں

ہیں زُہد کے طواف میں کرامتیں شراب کی ہیں شاخچوں میں محوِ رقص ڈوبیاں شباب کی
چھلک رہی ہے موجِ مے نگاہِ میگسار میں
تڑپ رہی ہیں جابجا سیاہیوں میں بجلیاں دلوں کی دھڑکنیں نہ پوچھ الحفیظ والاماں
تبسمِ شرار ہے تبسمِ بہار میں
اُٹھا رہی ہے ہر کلی نگاہ سوئے آسماں اُچٹ رہی ہیں پتّوں سے پتّیوں پہ بوندیاں
نہا رہی ہیں بجلیاں اُتر کے جوئبار میں
دُھواں سا اُٹھ رہا ہے ہر نشیب کوہسار سے ڈھکی ہوئی ہیں چوٹیاں لبادۂ خمار سے
نہ اختیار دل پہ ہے نہ دل ہے اختیار میں

تجلّیاتِ اُفق

(از حضرت اُفق امروہوی)

دل سے غافل تھا ورائے لامکاں سمجھا تھا میں
وائے کج فہمی کہاں تھے وہ کہاں سمجھا تھا میں

میری صورت میں ہوا تھا خود وہ مجھ پر آشکار
جس کو لاتعداد پردوں میں نہاں سمجھا تھا میں

خود نمودِ حُسن تھی شورشِ فزائے کائنات
عشق کو ہنگامہ آرائے جہاں سمجھا تھا میں

تھے حقیقت میں وہ سب ذوقِ نظر کے شعبدے
جن کو حُسن و عشق کی نیرنگیاں سمجھا تھا میں

سامنے اُن کے زباں بھی بند ہو کر رہ گئی
ہائے اس کو دردِ دل کا ترجماں سمجھا تھا میں

رفعتِ پرواز نے میری یہ ثابت کر دیا
اِک زمیں تھی وہ بھی جس کو آسماں سمجھا تھا میں

روشنی طبعِ من برمن بلا شد اے اُفق
برقِ گلشن کو چراغِ آشیاں سمجھا تھا میں

حضرت اکبر الہ آبادی

از خان بہادر سید عشرت حسین ریٹائرڈ کلکٹر و مجسٹریٹ

میرے والد حضرت اکبر الہ آبادی کے انتقال کے وقت میری عمر چالیس۴۰ سال تھی۔ میری پیدائش اور میرے والد کی تقرری بہ عہدہ منصفی قریب قریب ساتھ ساتھ ہوئی۔ گویا ملازمت اور پنشن کا زمانہ سارا میری نظر کے سامنے سے گذرا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ میری آنکھ علیگڈھ میں کھلی جہاں میرے والد ۱۸۸۲ء سے ۱۸۸۵ء تک منصف رہے۔ میرے والد پر اس قیام کا اثر بلاشبہ بہت زیادہ ہوا۔ علیگڈھ مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب کا مرکز تھا۔ جہاں سرسید۔ حالی۔ سمیع اللہ خاں صاحب وغیرہ سے دن رات کی ملاقاتیں اور تبادلہ خیالات کے مواقع تھے۔ علیگڈھ میں قیام کے زمانہ میں میرے والد نے بلنٹ کی مشہور کتاب "فیوچر آف اسلام" کا اردو میں ترجمہ کیا اور چھپوایا۔ اور مسٹر بلنٹ سے ملاقاتیں بھی ہوئیں، جن کا ذکر مسٹر بلنٹ نے اپنی کتاب "ہندوستان بعہد لارڈ رپن" (India under Ripon) میں کئی جگہ کیا ہے۔ علیگڈھ ہی میں کنور عبدالغفور خاں صاحب رئیس دہرم پور سے ملاقات ہوئی اور آخر عمر تک اس خاندان سے مراسم قائم رہے۔ کنور عبدالغفور خان صاحب کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ چاہتے تھے کہ مجھے گود لیں۔ لیکن یہ بات میرے والد نے منظور نہ کی۔ کنور عبدالغفور خاں صاحب کے خلوص کی تعریف ممکن نہیں۔ برابر آمد و رفت رہتی تھی۔ کنور عبدالغفور خاں صاحب کو موسیقی کا بڑا شوق تھا۔ میرے والد بھی اس فن سے ناواقف نہ تھے۔ میں نے کبھی کبھی اپنے والد کو اشعار گاتے ہوئے سنا۔ ستار بجانے کا بھی شوق تھا۔ مجھے یاد ہے کہ کنور عبدالغفور خاں صاحب جب تشریف لاتے تھے تو کبھی ستار بجانیوالے ایک استاد کو بھی ساتھ لاتے تھے۔ خوب صحبتیں رہتی تھیں۔ کھماچ اور دیس راگنیاں میرے والد کو خاص طور پر پسند تھیں۔ کبھی کسی مینڈ پر یا کسی سر لگنے پر خاص اثر ہوتا تھا۔ فرماتے تھے کہ یہ سیارے جو آفتاب کے گرد گھومتے ہیں انمیں ہر ایک میں ان کی رفتار کے باعث سے ایک آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہ آواز جب کسی ساز کی آواز سے مل جاتی ہے تو قلب پر غیر معمولی اثر ڈالتی ہے۔

کنور عبدالغفور خاں صاحب کو میں نے ان کے شباب کے زمانہ میں دیکھا ہے جب ان کی مونچھیں اور گلمچھے تھے اور پھر اس زمانہ میں بھی دیکھا جب ڈاڑھی مونچھ وغیرہ سب انھوں نے منڈوا ڈالی تھی،

میرے والد فرماتے ہیں

دیکھ عبدالغفور خاں کی طرف مرد خوش حال اس کو کہتے ہیں
چار ابرو کا یاں صفایا ہے فارغ البال اِس کو کہتے ہیں

کنور عبدالغفور خاں صاحب کو سیر و سفر کا بڑا شوق تھا۔ یورپ اور امریکہ کی سیاحت کے بعد تمام ہندوستان میں گشت کرتے تھے۔ چنانچہ اسی سفر میں اُن کا انتقال ہو گیا۔

علیگڈھ کے قیام کے زمانہ میں مَیں چھوٹا تھا۔ تاہم کچھ واقعات یاد ہیں اور قابلِ ذکر ہیں۔ ہم لوگ علیگڈھ میں چھتاری کے مکان میں رہتے تھے۔ کنور لطف علی خاں صاحب اُس وقت رئیس چھتاری تھے مجھے وہ بھی اچھی طرح یاد ہیں اور وہ مکان بھی۔ میرے والد مجھ سے فرماتے تھے کہ جب وہ صبح کو فیصلے وغیرہ لکھنے بیٹھتے تھے تو میں میز پر جا کر بیٹھ جایا کرتا تھا اور کام نہ کرنے دیتا تھا۔ مجھے یہ بات یاد نہیں لیکن یہ یاد ہے کہ میرے لئے بکرے کی ایک چھوٹی سی گاڑی بنوادی گئی تھی۔ میں اُسے دوڑاتا پھرتا تھا۔ ایک مرتبہ راستے کی گہری نالی کے اوپر سے جو زور سے دوڑاتا ہوا گاڑی کو نکلا تو گاڑی بیچ سے ٹوٹ گئی۔ میں گرا اور کافی چوٹ آئی۔ آدھی گاڑی بکرا کھینچتا ہوا بھاگتا چلا گیا۔

۱۸۷۷ء میں ملکہ وکٹوریہ قیصر ہند کی جوبلی تمام ہندوستان میں منائی گئی۔ علیگڈھ میں بھی جلسے اور دربار ہوئے۔ میں چھ سال کا تھا۔ میرے والد نے دو شعر اس موقع کے لئے کہکر مجھے یاد کرا دئے، اور خود بھی سٹرا ول جج علیگڈھ کی فرمائش کے مطابق ایک قصیدہ کہا۔ یہ قصیدہ کلیات اکبر حصہ اول میں چھپا ہوا ہے۔ جس موقع پر یہ قصیدہ پڑھا گیا۔ اُس کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ اپنی یاد سے کام لیتا ہوں اور کچھ اپنے والد سے سُنی ہوئی بات ہے۔

ایک بہت بڑا شامیانہ ہے۔ پھول پتوں سے اور شیشہ آلات سے آراستہ کیا گیا ہے، ہر طرف جگمگا رہا ہے۔ حکام اور روسا اور ضلع کے دیگر معززین اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ صدر کون ہے؟ ایک جگہ سنگ مرمر کی ایک میز ہے۔ وہیں آکر لوگ تقریریں کرتے ہیں، نظمیں پڑھتے ہیں میری باری آئی۔ میرا نام پکارا گیا۔ میں میز کے پاس جا کر کھڑا ہوا۔ لیکن اتنا چھوٹا ہوں کہ لوگ مجھے دیکھ بھی نہیں سکتے۔ میز مجھ سے اونچی ہے۔ سر سید نے اُٹھا کر مجھے میز پر کھڑا کر دیا اور میں نے دو شعر پڑھ دئے۔ دربار کا دستور ہے کہ تقریروں اور نظموں کے بعد تالیاں بجتی ہیں۔ تقریروں اور نظموں کے درمیان میں لوگ خاموشی سے سنتے ہیں۔ میرے والد کی باری آئی۔ انھوں نے قصیدہ پڑھنا شروع کیا۔ لیکن دو ایک اشعار کے بعد لوگوں سے ضبط نہ ہوئی۔ مشاعرے کا سا رنگ ہو گیا۔ یعنی لوگ اشعار

کو دُہراتے تھے اور تعریفوں کے نعرے بلند ہوتے تھے۔

علیگڈھ کے حالات تو بہت طولانی ہیں۔ ایک اور واقعہ یہاں ذکر کے قابل ہے۔

میرے دادا صاحب سید تفضل حسین صاحب ایک بڑے بزرگ عابد و عامل تھے۔ ایک دن اُن کا خط میرے والد کے پاس آیا کہ "تم منصف درجہ اول ہوگئے" میرے والد نے لکھا کہ یہ کیونکر ہوسکتا ہے؟ کئی صاحبوں کا نمبر مجھ سے اوپر ہے۔ آپ کی اطلاع کا ذریعہ کیا ہے؟ میرے دادا صاحب نے جواب دیا کہ "میں نے خط جلی میں یعنی بڑے حروف میں لکھا دیکھا ہے سید اکبر حسین منصف درجہ اول۔

تھوڑے ہی دنوں کے بعد میرے والد کی ترقی درجہ اوّل کی منصفی کا حکم آگیا۔

۱۸۸۶ء میں میرے والد قائمقام سب جج غازی پور مقرر ہوئے۔ تھوڑے دِنوں کے بعد کانپور کا تبادلہ ہوگیا اور چار سال کے قریب کانپور میں قیام رہا۔ کانپور سے چار میل کے فاصلے پر ایک مقام ہے جس کا نام گوٹیا ہے اُس زمانہ میں ڈپٹی ڈائرکٹر زراعت کا دفتر وغیرہ وہاں تھا۔ مولوی محمد حسین صاحب ڈپٹی ڈائرکٹر تھے۔ بڑے علم دوست اور با مذاق۔ سید محمد ہادی صاحب اُن کے اسسٹنٹ تھے۔ وہی سید محمد ہادی صاحب جنھوں نے بعد میں شکر بنانے کی مشین ایجاد کی۔ اور ۱۹۱۰ء میں الہ آباد کی نمائش میں یہ مشین دکھلائی۔ میں الہ آباد آیا ہوا تھا۔ نمائش دیکھنے جارہا تھا۔ میرے والد نے پوچھا کہ ہادی صاحب سے ملاقات ہوگی؟ میں نے کہا کہ ضرور ہی ملوں گا۔ فرمایا کہ یہ میرا شعر اُن کو سُنا دینا ؎

ہادی دُنیا تھے وہ ہل جوتنا سکھلا گئے ہادی دیں تو نمائش میں کوئی تھا ہی نہیں

ذکر تو کچھ اور ہی کر رہا تھا لیکن خان بہادر سید محمد ہادی صاحب کے نام کے سلسلہ میں الہ آباد کی نمائش کا ذکر آگیا۔ اس نمائش کے موقع کا ایک اور شعر ہے۔ گوہر جان کلکتہ کی مشہور گانے والی نمائش میں بلائی گئی تھی۔ ان کی آواز اور ان کے علم موسیقی کا شہرہ تمام ہندوستان میں تھا۔ میرے والد فرماتے ہیں ؎

سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا خوش نصیب آج یہاں کون ہے گوہر کے سوا

میں گوٹیا کا ذکر کر رہا تھا۔ یہاں ایک چھوٹی ریڈنگ کلب قائم ہوا۔ ہفتہ وار جلسے ہوتے تھے۔ علمی اور اخلاقی مضامین اور نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ کانپور ہی میں رابرٹ سودی کی نظم "لوڈور" میرے والد نے دیکھی اور اپنی نظم "روانی لوڈور" تصنیف کی۔ سودی نے انگریزی کے تمام مصادر جو دریا کی روانی کے متعلق ہیں، بڑی تحقیق اور بڑی قابلیت سے اپنی نظم میں اکٹھا کئے ہیں۔ یہی کام میرے والد نے اُردو میں کیا۔ یہ نظم ریڈنگ کلب گوٹیا میں پڑھی گئی۔ اور اِس نظم میں بھائی حسن سے مراد میرے حقیقی چچا سید اکبر حسن صاحب مرحوم سے ہے۔

کانپور میں دیا نرائن نگم صاحب ایڈیٹر زمانہ کے جد بزرگوار منشی شیو سہائے گور سہائے صاحبان، لالہ جگی مل صاحب۔ شیخ احمد علی صاحب، مولوی احسان اللہ صاحب وغیرہ سے مراسم ہوگئے تھے جو برابر قائم رہے۔ دیا نرائن نگم صاحب کا برادرانہ برتاؤ میرے ساتھ اِس وقت تک قائم ہے۔

آج اِتنا وقت نہیں کہ میں بقیہ حالات عرض کروں۔ البتہ ایک مشہور نظم کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے۔

اک بت سیمیں بدن سے کرلیا لندن میں عقد

مجھے یہ کہتے ہوئے کسیقدر تکلف ہوتا ہے کہ یہ نظم میرے ولایت جانے سے پہلے تصنیف ہوچکی تھی۔ تکلف کی وجہ یہ ہے کہ عام خیال ہے کہ یہ نظم میرے متعلق ہے۔ لوگ مجھ سے اس کے متعلق سوالات کرتے ہیں[۱]

کانپور کے بعد ۱۹۰۳ء تک جب میرے والد کی پنشن ہوئی مسلسل تبادلے ہوتے رہے۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ اُسی زمانہ میں گورنمنٹ نے یہ تجویز کی کہ سب جج بھی ڈسٹرکٹ جج مقرر کئے جائیں۔ چنانچہ ۱۸۹۴ء میں میرے والد اس صوبے میں سب سے پہلے سب جج تھے جو قائمقام ڈسٹرکٹ اور سشن جج مقرر ہوئے۔ حالانکہ کئی افسر نمبر میں اُن کے اُوپر تھے لیکن گورنمنٹ نے اُن کا انتخاب کیا۔ اِس کے متعلق اُسوقت کی کونسل میں سوال بھی ہوا۔ لیکن گورنمنٹ نے یہی جواب دیا کہ اس تقرری میں نمبر کی بحث نہیں ہے۔ بلکہ جس کو ہم نے سب سے زیادہ قابل سمجھا اُس کا تقرر کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر سال گرمیوں میں کسی نہ کسی ضلع کی ججی پر اُن کو جانا پڑتا تھا۔ انھیں وقتوں کا شعر ہے ؎

پہلے تھے سب جج ہوئے اب جج حضور یعنی بس اب سب سے جُدا ہوگئے

۱۸۹۶ء میں گونڈہ تعینات کئے گئے۔ آب وہوا ناموافق ہوئی۔ غزل کہی جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

اب تلک گونڈے سے اُمید رہائی نہیں کچھ ہوگئی یعنے ختم آج تو جولائی بھی

آخر ملازمت کے قریب اُن کا نام ہائیکورٹ کی ججی کے لئے بھی بھیجا گیا۔ لیکن چونکہ مسٹر جسٹس ایکمین قائمقامی کررہے تھے۔ اِس لئے یہ تجویز ہوئی کہ اُن کی پنشن کے بعد تقرری ہو۔ لیکن اُس وقت کے آنے سے پہلے ہی میرے والد کی پنشن ہوگئی۔ اور اُس جگہ پر بعد میں مسٹر جسٹس کرامت حسین کا تقرر ہوا۔

میں کانپور میں چند دِنوں کے لئے گورنمنٹ اسکول میں داخل کردیا گیا تھا۔ کانپور کے بعد میری تعلیم کا اہم زمانہ آگیا تھا۔ میرے والد نے دیکھا کہ اُن کے ساتھ رہ کر میری تعلیم ٹھیک نہیں ہوسکتی۔ اسلئے میری والدہ اور میں الہ آباد میں مستقل طور پر قیام پذیر ہوئے۔ عشرت منزل کی بنیاد پڑی۔

---

[۱] جیسا کہ اب معلوم ہوا ہے یہ نظم حضرت اکبر نے ایک دوست کے صاحبزادے کے متعلق لکھی تھی۔ (ا۔ ز)

میرے والد مجھ سے فرماتے تھے کہ اس مکان کے نام میں میں نے یہ مناسبت خطی رکھی ہے کہ اگر تم زندہ نہ رہتے تو اس کا نام عبرت منزل کر دیتا اور اگر تمھاری حالت خراب اور ابتر ہوتی تو اس کا نام عسرت منزل ہو جاتا۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے والد کی زندگی میں یہ مکان عشرت منزل ہی رہا۔ وہ دن میری نظر کے سامنے ہیں کہ جب یہ مکان زیر تعمیر تھا۔ کبھی مزدوروں اور راجوں میں گھس کر اُن کے ساتھ کام کرتا تھا۔ کبھی مزدوروں کو احاطہ عشرت منزل میں اپنے ساتھ کرکٹ کھیلاتا تھا۔ غل مچتا تھا کہ دیکھئے چھوٹے میاں کام نہیں کرنے دیتے۔ پھر یہ مکان تکمیل کو پہونچا۔ میرے والد الہ آباد کے مستقل جج خفیفہ مقرر ہوئے، اور یہی مستقل جائے قیام قرار پائی۔ یہیں سے ہر سال چند مہینوں کے لئے جج پر جاتے تھے۔ اور پھر یہیں واپس آجاتے تھے۔ یہیں سے پنشن ہوئی۔ اگر یہاں کی چلتی ہوئی تصویر لی گئی ہوتی، تو کیا کیا منظر اس وقت دکھائی دیتے۔ جلسے۔ دعوتیں۔ بزمہائے سخن۔ احباب اور قدر دانوں کی آمد و رفت کا لامتناہی سلسلہ۔ اگر میں ان سب کے مختصر حالات بھی بیان کرنا شروع کروں تو دفتر ہو جائے۔ البتہ دو نام لیتا ہوں، تاکہ کچھ اشعار پڑھ سکوں۔ ایک تو حضرت شبلیؔ۔ علیگڈھ میں میرے والد نے اُن کو یہ اشعار لکھے تھے ؎

آتا نہیں مجھکو قبلہ قبلی — بس صاف یہ ہے کہ بھائی شبلی
تکلیف اُٹھاؤ آج کی رات — کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات
حاضر جو کچھ ہو دال دلیا — اُس کو سمجھو پلاؤ قلیا

دوسرے حضرت صفیؔ لکھنوی۔ جس وقت یہ بحث تھی کہ شیعہ کالج کہاں قائم کیا جائے تو الہ آباد کا نام بھی پیش کیا گیا تھا۔ الہ آباد ہی میں شیعہ کانفرنس کا عظیم الشان جلسہ ہوا۔ جسمیں حضرت صفی لکھنوی نے ایک نظم پڑھی تھی۔ اور الہ آباد کی خصوصیات بیان کی تھیں۔ اُس کا ایک بند یہ ہے ؎

جس کی خوشبو منزلوں پھیلی ہے وہ گلشن ہے تو — تازہ رس گلہائے رنگا رنگ کا خرمن ہے تو
بذلہ سنجی کا جواہر خیز ایک معدن ہے تو — حضرت اکبر لسان العصر کا مسکن ہے تو

نطق تیرے سکۂ رائج سے مالا مال ہے
ہند میں نقد ظرافت کی یہیں ٹکسال ہے

خود حضرت اکبرؔ، الہ آباد کے متعلق فرماتے ہیں ؎

کچھ الہ آباد میں ساماں نہیں بہبود کے — یاں دھرا کیا ہے بجز اکبر کے اور امرود کے

میں کہاں سے کہاں پہونچ گیا۔ ابھی تو اُس زمانہ کا ذکر ہے کہ جب میں اسکول اور کالج میں تعلیم پا رہا ہوں۔ انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد میری شادی کی فکر ہوئی۔ چنانچہ بالآخر نواب غلام حسین صاحب

اور بی۔ای۔خان بہادر، رئیس پریانواں، ضلع پرتاب گڈھ کی بڑی صاحبزادی سے شادی قرار پائی۔

۳۰ مارچ ۱۸۹۹ء کو بڑی دھوم سے شادی ہوئی۔ البتہ ناچ نہ تھا۔ سر اسرار حسن خاں صاحب مدارالمہام بھوپال نے ناچ ہونے کے متعلق تحریک کی۔

میرے والد نے جو خط جواب میں لکھا وہ پیش کرتا ہوں :۔

"میرے پیارے عنایت فرما۔ محبت نامہ کے مضامین نے دل کو باغ باغ کر دیا۔ میرے
" ایک عزیز جو دبی زبان سے اسی بات کے لئے اشارے کر رہے تھے، آپ کے خط کو سنکر پھڑک گئے
" فرمانے لگے کہ بس یہ شخص آپ کا سچا محب اور زندہ دل دوست ہے۔ فی الواقع مجھ کو بھی
" ایسا ہی یقین ہوا۔
" بیس سال سے زیادہ ہوئے میں نے عقل اور مصلحت سے فتویٰ حاصل کر کے ناچ مجرا
" دیکھنا چھوڑ دیا۔ موسیقی کا مذاق رگ و پے میں سمایا ہوا ہے۔ لیکن گانے والیوں سے جو دل کیساتھ
" گھر بھی برباد کر دیتی ہیں، ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عشرت سلمہ ان خیالات
" ہی سے ناواقف رہے اور اب اُن کو اس سے کلی احتراز ہے۔
" مسلمانوں کو ناچ دیکھنا جائز تو کبھی نہ تھا لیکن اب مصلحت کے بھی خلاف ہے۔ ہم کو
" مضبوطی کے ساتھ ایسی مثالیں قائم کرنی چاہئیں کہ غربا شادی میں ناچ نہ کرانے کو اپنی ذلت
" نہ سمجھیں اور قرضدار نہ ہوں۔ درحقیقت شرفا میں ہماری طرف یہ رسم اب کم ہوتی جاتی ہے،
" سمدھیانے میں کچھ چون و چرا ہوئی تھی۔ لیکن یہ سن کر کہ لڑکا ناچ نہیں دیکھتا۔ اُن لوگوں
" کو فخر و مسرت کا موقع ملا۔
" آپ کہیں گے کہ حضور لکچر دے رہے ہیں یا یاران بے تکلف کو خط کا جواب لکھ رہے ہیں،
" اچھا صاحب لکچر موقوف۔ کان پکڑتا ہوں۔ ہزار بار توبہ۔ اب کفر نہ بھانکونگا۔ پوری اندر سبھا
" پر ایمان لایا۔
" بھائی صاحب! چیت کا مہینہ۔ آغاز بلکہ عین موسم بہار ہوگا۔ کیسے کیسے وضعدار نوجوان ہمارے
" دوست رونق محفل ہوں گے۔ عشرت سلمہ زرد جوڑا پہنے ہوئے زینت مسند عروسی ہونگے
" دل تو یہ چاہتا ہے کہ ایک شوخ طرار پرکالۂ آتش یہ گاتی ہوئی سامنے آئے ؎

" ہے جلوۂ تن سے در و دیوار بسنتی   پہنے ہے جو پوشاک مرا یار بسنتی

" آپ گھوڑے سے، میں اجلاس سے، مولوی برکت اللہ صاحب منبر سے گر پڑتے۔ لیکن اسکے

" انتظام میں بڑی دشواریاں ہیں۔ بیحد صرف اور نہایت کم لطف۔
" جسقدر مجھ کو اس بات کی مسرت ہے کہ سمدھی صاحب ایک نہایت ذی علم۔ الوالعزم خوش مزاج "
" خوش اخلاق۔ بے تکلف رئیس ہیں، اسی قدر اس بات کا افسوس ہے کہ اس دارالریاست کی "
" راہ بہت دور اور دشوار گذار ہے۔ رائے بریلی سے پندرہ کوس۔ پرتاب گڈھ سے چوبیس کوس "
" سراتھو اسٹیشن سے جو الہ آباد سے، الہ آباد کا اسٹیشن چھوڑ کر تیسرا اسٹیشن ہے، آٹھ کوس ہے۔ "
" ہم لوگ اسی راہ سے جائیں گے۔ سراتھو سے تین میل پختہ سڑک ہے۔ پھر سات میل خام سڑک "
" ناہموار بیہڑ۔ اونچی۔ نیچی۔ نالے۔ گڑھے۔ اس کے بعد میل بھر بلکہ زیادہ ریتا۔ پھر گنگا مائی، "
" پھر بیہڑ۔ اس کے بعد دو میل عمدہ سڑک بوجہ حسن انتظام خان بہادر صاحب۔ تب پریانواں۔ "
" اگر رائے بریلی سے کوئی شخص قصد کرے تو اگرچہ سڑک خام ہے لیکن چوڑی ہے، ہموار ہے "
" صاف ہے۔ تیز رو اکے ملتے ہیں۔ پانچ چھ گھنٹے میں پریانواں پہونچ جائے۔ وہ سڑک مصطفی آباد "
" ہو کر۔ پریانواں ہو کر مانکپور کو گئی ہے۔ ۳۰ مارچ کو چار بجے تڑکے ہم لوگ انشاءاللہ یہاں سے "
" چل کر سہ پہر کو پریانواں پہونچیں گے۔ آپ براہ رائے بریلی گیارہ بجے دن کو بھی چلیں، تو پانچ بجے "
" ہمارے کیمپ میں پہونچ جائیں۔ سراتھو میں ہماری راہ ہو سکتی ہے۔ اور وہاں پورا شاعرانہ اور "
" گورنمنٹ زور لگا کر بھی تیس اکوں اور چند پالکیوں اور دس بارہ ہاتھیوں سے زیادہ کا انتظام "
" ناممکن ہے۔ بمجبوری خاص خاص اعزہ اور احباب کو ساتھ لوں گا۔
" اگرچہ ہمارے ساتھ یہیں سے آپ ہوں تو زیادہ لطف ہو۔ اور خواہ مخواہ آپ کے لئے سواری کا "
" بندوبست کر دیا جائے۔ لیکن بوجہ مذکورہ بالا آپ کو مشورہ دیا گیا کہ رائے بریلی سے تشریف لائیے۔ "
" مقصود تو یہ ہے کہ ہم آپ ساتھ مل کر عشرت کو بیاہنے جائیں۔ اور یہ حاصل ہو جائے گا۔ ہمارا "
" کیمپ علیحدہ ہوگا۔ بارات رات کو جائے گی۔ آپ اس کو ترتیب دینے والے ہوں گے انشاءاللہ "
" اب فرمائیے کیا مزا ہے کہ جنت کی قمریاں پگڈنڈیوں پر پھٹپھاتی پھریں۔ ہم لوگ خود سفر کئے ہوئے "
" کچھ آرام کرینگے۔ پھر بارات جائے گی۔ پھر نکاح ہوگا۔ بیچاری گرمیوں کی ماری لیلائے شب کی "
" بساط ہی کیا۔ چار انگڑائیاں لیں اور بھور۔ صبح سے طعام دعوت کا اہتمام ہوگا۔ پھر رخصتی کی "
" جلدی ہوگی۔ پھر اگر دو بجے وہاں سے نہ چلیں گے تو گیارہ بجے شب کو الہ آباد نہ پہونچ سکیں گے "
" جہاں کنبہ کی ساری بیبیاں منتظر واپسی بارات ہوں گی۔
" بتائیے کیا وقت ملیگا کہ اطمینان سے خنجر نگاہ کے زخمی ہوں؟ اور قاتل کو داد دیں۔ "

" آپ کار گذار افسر ہیں۔ ممکن ہے کہ اس کام کی فرصت نکال ہیں۔ لیکن جب تک مرگب انبوہ "
" نہ ہو کیا مزا ہے۔
" ان خیالات، دشواریِ منزل اور دقتِ راہ و فقدانِ سواری وضیقِ وقت کے سبب سے "
" میں نے تو باجے گاجے سے بھی کنارہ کشی چاہی تھی۔ لیکن یہ ناممکن ہوا۔ عشرت میاں کو آتشبازی "
" کا بہت شوق ہے۔ خود بھی خوب بناتے ہیں۔ اور صرف اِسی پر تو میں چھچھوندروں کو منہ لگاتے "
" ہیں۔ لہذا باجے۔ آرائش۔ آتشبازی کا انتظام جہاں تک ہو سکیگا کیا جائے گا۔
" لوگ کہتے ہیں اور سچ کہتے ہیں کہ نوشہ میاں تو رسم رسوم اور خیالِ عروس اور سہرے کے "
" سائے میں بسر کریں گے۔ باراتی بیچارے کیا کر کے رات گذاریں گے؟ میں یہ کہونگا کہ نفلیں پڑھو "
" تہجد ادا کرو۔ اور اس میں بدشگونی سمجھو تو گپ اڑاؤ اور شعر خوانی کرو۔
" آپ کے ولولے حق بجانب۔ آپ کی محبت کا میں معترف، لیکن اس کو دوسرے وقت پر "
" اُٹھار کھئے۔ بہت سے مواقع ہیں۔ ہم سے آپ سے اِس باب میں گفتگو ہو جائے گی۔
" اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو بارات کے ساتھ الہ آباد تشریف لائیے گا۔ اور یہاں سے یکم خواہ دوم "
" اپریل کو تشریف لے جائے گا۔
" مولوی برکت اللہ صاحب کی مجھکو کچھ خبر نہیں۔ آپ اِس خط کی نقل اُن کے پاس بھیج دیجئے گا۔ "
" ۳۰ مارچ کو پانچ بجے شام کو ہم آپ کو اپنے کیمپ میں پاویں۔ ساری داستان کا خلاصہ یہ ہے۔ "
" میں خود رخصت اتفاقیہ لوں گا۔ بنارس جانا جبر ہوگا۔ لیکن کیا کروں۔ باہر سے میں نے "
" محدودے چند خاص احباب کو تکلیف دینے کا ارادہ کیا ہے۔ جیکر صاحب کو کسی طرح نہ چھوڑ نگا "
" مولوی برکت اللہ صاحب ضرور ہی تشریف لائیں گے۔
" مراتب مندرجہ خط پر دانشمندانہ نگاہ ڈالئے۔ پھر جو فیصلہ کیجئے۔ ہم کو عذر نہیں۔ آپکو خود مختار "
" کرتا ہوں۔ جو انتظام کیجئے۔ بل میں پاس کر دونگا۔ جہاں تک مقدور ہے۔ باقی کے لئے وعدہ "
" جب آپ کا پوتا سول سروس ہو۔

اکبر حسین

(باقی پھر کبھی)

نگارستانِ شعرا

یہ شیخ مجیب الدین احمد فانی لدھیانوی کا مجموعہ کلام یا دیوان ہے۔ جسمیں غزلوں کے علاوہ سہرے اور قطعات بھی درج ہیں۔ دیوان کا زیادہ حصہ نعت رسول وغیرہ کے نذر ہوا ہے۔ پرانی وضع کی عاشقانہ غزلیں بھی ہیں۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ معمولی۔ قیمت ۸ آنے۔ جید برقی پریس دہلی میں چھپی ہے۔

انگریزوں کا پہلا قدم

از منشی جگیشور ناتھ بیتاب بریلوی بی۔اے، ایل ایل بی

زمانۂ قدیم میں ہندوستان اپنی صنعت و حرفت اور دولت و ثروت کی بدولت دُنیا پر چھایا ہوا تھا۔ جس طرح ہندی علوم و فنون، تہذیب و تمدن اور فلسفہ کا ایک عالم میں ڈنکا بج رہا تھا۔ اُسی طرح تجارت کی منڈیوں اور کاروباری دُنیا پر بھی ہندوستان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، مگر اسی ترقی اور اقبالمندی کے باعث ہندوستان پر بڑی بڑی مصیبتیں نازل ہوئیں۔

مسلمان ہندوستان کو سونے کی کان سمجھتے تھے۔ اس کی بے شمار دولت کے خیال سے اُن کے مُنھ میں پانی بھر آیا۔ اور سیم و زر کی حرص و ہوس نے انھیں ہندوستان پر یورشیں کرنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ اُن کے حملوں کا ایسا تانتا بندھا کہ ہندوستان کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔

انگریز دیگر مغربی اقوام کی طرح پہلے پہل تجارت کا سودا لے کر حدودِ ہند میں داخل ہوئے۔ اُسوقت یہ بات کسی کے خیال میں بھی نہ آسکتی تھی کہ ایک دن وہ اِس وسیع برّاعظم کے مالک بن بیٹھیں گے۔ اُنکے ورود سے قبل کتنی ہی دوسری یوروپین اقوام سے ہمارے تجارتی تعلقات مستحکم ہو چکے تھے۔ چنانچہ ولادت مسیح سے دو ہزار برس پہلے اہلِ ہند یوروپ سے لین دین کرتے تھے۔

جن دِنوں یونان کے اقبال و ارتقاء کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ اُس وقت یوروپ میں ہماری تجارت کا بازار خوب گرم ہو رہا تھا۔ سکندرِ اعظم جب ہندوستان آیا تو وہ اور اُس کے ہمراہی دیگر عمائدین یونان ہماری امارت کی شان و شوکت دیکھ کر انگشت بدنداں ہو گئے تھے۔ سکندر کی واپسی پر ہندوستان کی عظمت و شہرت میں اور بھی اضافہ ہوا۔ اور اس کی لا انتہا دولت کا چار دانگ عالم میں غلغلہ پڑ گیا۔ یوروپ کی آنکھیں کُھل گئیں اور وہ سمجھنے لگا کہ ہندوستان سے تجارتی تعلقات قائم کر کے وہ مالا مال ہو سکتا ہے۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ دُنیا میں ہندوستان کی ساکھ جمی ہوئی تھی، اور ہندوستانی دُنیا بھر میں سب سے زیادہ مہذب، معتمد، با اخلاق اور ایماندار تسلیم کئے جا چکے تھے۔ مشہور یونانی سیّاح میگاستھنیز نے ہندوؤں کے بارہ میں لکھا ہے کہ۔

"صفحۂ ہستی پر ایسا کوئی دوسرا ملک نہیں ہے، جہاں کی خواتین اِتنی باعصمت اور پاکدامن ہیں، جہاں غلامی کا نام ونشان بھی نہیں اور جہاں کے باشندے اِتنے جری اور باحوصلہ ہیں ہندوؤں کو اپنے مکانوں کو مقفل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ عدالتوں سے بھی انھیں کوئی سروکار نہیں۔ اور اُن کی صناعی کا تو جواب ہی نہیں ہو سکتا۔۔۔۔"

میگا ستھنیز کی طرح اور بھی بہت سے غیر ملکی مؤرخین کی تصانیف میں ہمارے شاندار ماضی کی سنہری تصویریں محفوظ ہیں۔ اُن کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ پُورے تین ہزار برس تک دُنیا کے تجارتی حلقوں میں کوئی ہندوستان کا ہمسر نہ تھا۔ یہودی، اطالوی، یونانی، مصری، شامی، فنیقی لوگ ہر سال ہزار ہا روپیہ کا مال ہندوستان سے خریدا کرتے تھے۔ اس عالمگیر تجارت کا انحصار آجکل کی طرح کچے مال پر نہ تھا بلکہ پکا اور تیار شدہ مال باہر بھیجا جاتا تھا۔ نفیس نفیس اُونی اور ریشمی کپڑے، بیش قیمت شال، کتان، زربفت، مخمل، پشمینہ اور ڈھاکہ کی ململوں کے علاوہ طرح طرح کے تیل، عطریات، رنگ، مسالے ادویات وآلات وغیرہ بیرونجات کو جایا کرتے تھے۔ اِن دِنوں جس طرح یوروپ ہماری منڈیوں کو عیش و آرایش کے اسباب سے بھر رہا ہے اسی طرح پہلے کبھی وہاں کے بازاروں میں ہمارا طوطی بولا کرتا تھا۔

زمانۂ حال میں یوروپ فیشن کا گھر سمجھا جاتا ہے لیکن اب سے کچھ ہی مدت پہلے یہ فخر ہندوستان کو نصیب تھا۔ یہیں سے نئی نئی چیزیں تیار ہوکر وہاں جاتی تھیں اور وہ لوگ ہم سے اُن کا استعمال سیکھتے تھے۔ اس طرح تجارات کا توازن ہمارے ہی موافق رہتا تھا۔

ڈاکٹر سائیس کی رائے ہے کہ تین ہزار سال ق۔م۔ سے ہندوستان اور شام میں تجارتی تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ قدیم بابلی لغات میں لفظ "سندھو" کے معنی ایک قسم کی ململ بتائے گئے ہیں۔ جیکسن صاحب نے بمبئی کے گزیٹیر میں ثابت کیا ہے کہ عیسیٰ سے سات آٹھ سو برس پہلے بھڑوچ، سپارہ بندر اور بابل کے درمیان تجارتی جہاز آیا جایا کرتے تھے۔ امریکہ کی ایل یونیورسٹی کے پروفیسر ڈے نے اپنی مشہور کتاب (History of commerce) میں تسلیم کیا ہے کہ ۲۵۰۰ برس قبل مسیح سے ہندوستان اور چین کے درمیان تجارت ہوتی تھی۔ شہرآفاق جرمن مصنف وان روہلیک (Von Rohlec) نے بڑی تلاش وتحقیق کے بعد یہ دعویٰ کیا ہے کہ اولین نسلِ انسانی کے عہدِ طفولیت ہی سے عرب اور ہندوستان کے مابین تجارت شروع ہو گئی تھی۔ پروفیسر دیبی بال اپنی تصنیف لطیف (A Geologist's Contribution of The History of ancient India.) میں رقمطراز ہیں کہ سن عیسوی سے پندرہ سو برس پہلے ہندوستان میں دھن برستا تھا اور سونے چاندی کے علاوہ نادر و نایاب جواہرات

کے سربلند پہاڑ جگمگایا کرتے تھے۔ دُور دُور کے ممالک سے اس کا لین دین تھا۔ ہراڈوٹس، یونان کا ایک مشہور سیاح گذرا ہے۔ ہندوستان اُس کی دُور رس نگاہ میں سونے کی کان تھا۔ اُس نے یونان اور ہندوستان کے تعلقات پر بھی ایک سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔

اشوک اعظم کے عہد زرین میں بھی ہماری تجارت کا دائرہ اتنا ہی وسیع تھا۔ شام، مصر، مقدونیہ اور سائیپرس وغیرہ کئی دیگر ممالک کے تاجداروں سے اشوک کے دوستانہ تعلقات تھے۔ اور سیکڑوں کی تعداد میں ہندوستانی تجار انواع واقسام کا مال لے کر ان مقامات میں گشت لگایا کرتے تھے، اشوک کے بعد آندھرا اور گپتن راجاؤں کے زمانہ میں تو ہماری بیرونی تجارت کو اِسقدر فروغ ہوا تھا جسکی انتہا نہیں صدہا اطالوی اور یونانی مصنفین اِس حقیقت کے معترف ہیں۔ یونان کے زوال وادبار کے بعد اطالیہ کا نیّرِ اقبال بلند ہونا شروع ہوا۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی تجارت نے بھی غیر معمولی زور پکڑا۔ میم سین اپنی مستند کتاب (Provinces of the Roman Empire) میں لکھتا ہے کہ:۔

"ہندوستان سے ہر سال چالیس لاکھ پونڈ کا تیار شدہ مال روم کو جایا کرتا تھا۔ اسمیں اور تمام چیزوں کے علاوہ ہیرا، موتی اور ہاتھی دانت بھی شامل تھا۔ تباہ شدہ پامپیائی کے باشندے بھی ہندوستانی عطریات کی بڑی قدر کرتے تھے"

روم کی بربادی کے بعد اہلِ وینس کا عروج ہوا۔ اُنھیں بھی تجارت سے فطری رُجحان تھا۔ چنانچہ سنہ ۱۴۹۹ء میں واسکوڈے گاما نے ایک نیا راستہ دریافت کیا جو نسبتاً آسان اور کم خرچ ثابت ہوا لیکن اس کے ساتھ ہی ہندوستان کی غیر ملکی تجارت کے زوال کے اسباب بھی پیدا ہو گئے۔

سولہویں صدی کے آغاز میں پرتگیز، سترھویں صدی میں ڈچ اور اٹھارھویں صدی میں فرانسیسی ہندوستان میں آئے اور اُنھیں کے پیچھے پیچھے انگریزوں نے بھی سرزمین ہند میں اپنا پہلا قدم رکھا۔

پرتگیز تجارتی اسباب کے علاوہ اہلِ ہند کے لئے ایک نیا مذہب بھی اپنے ساتھ لائے، اور مذہب کی آڑ میں اپنا اقتدار جمانے کی کوششوں میں مشغول ہو گئے۔ لیکن قسمت نے اُن کا ساتھ نہ دیا۔ مسیحی مبلغ اُن سے بہت پہلے داخل ہندوستان ہو چکے تھے۔ چنانچہ سنہ ۶۹ء میں سینٹ ٹامس نام کے ایک پادری کی مدراس میں وفات ہوئی تھی، جو سالہا سال تک مالابار اور ساحل کارومنڈل میں لوگوں کو اپنے خدا اور خدا کے بیٹے مسیحؑ کے روبرو سربسجود ہونے کی تلقین کرتا رہا تھا۔ سنہ ۱۸۹ء میں ایک دوسرا پادری پوٹینس ہندوستان آیا۔ سنہ ۲۸۶ء میں نسطوری پادری عراق سے آکر مالابار میں مقیم ہوئے۔ سنہ ۰۰ء میں آرمینیا کے پادری نے مالابار میں سب سے پہلا گرجا تعمیر کیا۔ سنہ ۸۸۳ء میں الفریڈ شاہ انگلستان نے اپنے دو

اینڈوں کو تھامس کے مزار کی زیارت کے لئے ہندوستان بھیجا تھا۔ ان مسیحی مبلغین کو جیسی کچھ کامیابی ہوئی وہ پرتگیزوں کو سبق سکھانے کے لئے کافی تھی مگر اُن کی آنکھیں نہ کھلیں اور وہ برابر تبلیغ مذہب کے سنہرے خواب دیکھنے میں محو رہے اور شاید اسی غلطی کے باعث اُنکی ہندوستان میں دال گلنے نہ پائی۔

واسکوڈے گاما اوّل اوّل کالی کٹ میں اُترا۔ اُس وقت زموَرن کالی کٹ کا حکمران تھا۔ اُس نے عیسائیوں اور پرتگیزوں کی تبلیغ پر پانی پھیر کر خود انھیں ہڑپ کر لینے کے لئے جو چال چلی، اُس سے خود مبلغین کے ہوش اُڑ گئے۔

ہندوستانیوں کو پرتگیزی عورتوں سے عقد کرنے کی سرکاری طور پر نہ صرف اجازت ہی دیدی گئی، بلکہ زموَرن نے اِس قسم کے رشتوں کی فراخدلی کے ساتھ حوصلہ افزائی کی۔ چنانچہ اِس تدبیر سے حسب دلخواہ نتائج برآمد ہوئے اور نئے تعلقات کی بدولت جس دوغلی نسل کا ظہور ہوا، اُس نے پرتگال والوں کا شیرازہ منتشر کر دیا۔ اور اُنمیں تفریق و تنفر کی آگ مشتعل کر دی۔ جس سے عیسائیوں کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ گاما کی مراجعتِ وطن کے وقت زموَرن نے شاہ پرتگال کے نام جو خط لکھا اُس سے ظاہر ہے کہ اُسکے تعلقات پرتگیزوں سے بہت دوستانہ تھے۔ اُس کے خط کا مفہوم یہ تھا کہ:۔

"ہم آپ کے سردار گاما کا نہایت مسرت کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہماری سلطنت میں دارچینی، لونگ، سونٹھ، کالی مرچ اور جواہرات وغیرہ بکثرت ہوتے ہیں۔ ہم چاہتے کہ ہمیں اِن اشیاء کے تبادلہ میں آپ کی جانب سے سونا چاندی دستیاب ہو۔"

رفتہ رفتہ پرتگیزوں کا اثر و اقتدار یوروپ میں بھی بڑھنے لگا۔ اور وینس و جنیوا کی تجارت معرضِ زوال میں آگئی۔ ساتھ ہی ان اقوام کے عروج کے آثار بھی نمایاں ہونے لگے جنھیں جہازرانی میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ ۱۵۰۳ء میں پرتگال سے ایک دوسرا شخص البقرق نامی ہندوستان میں وارد ہوا۔

جہاں گاما کا مقصد ہندوستان آکر اپنی تجارت کو فروغ دینا تھا وہاں البقرق یہاں اپنی حکومت کا جھنڈا گاڑنا چاہتا تھا۔ ۱۵۱۰ء میں اُس نے گوا پر قبضہ کر لیا۔ لیکن ۱۵۱۵ء میں اُسے مرگ ناگہانی کا شکار ہونا پڑا اور اُس کی ساری تمنائیں اُس کے ساتھ ہی خاک میں دفن ہو گئیں۔ اُس کے بعد ۱۵۲۴ء میں گاما تیسری دفعہ یہاں آیا۔ اور ۱۵۲۷ء میں وہ بھی لقمۂ نہنگِ اجل ہو کر کوچین میں مدفون ہوا۔ اس طرح سولہویں صدی کے اختتام تک پرتگیزوں کا خوب دور دورہ رہا۔ اُس کے بعد اُن کا زوال شروع ہوا اور پرتگال خود اپنی آزادی کھو کر اسپین کے تابع ہو گیا۔ لیکن چالیس سال کے بعد ۱۶۴۰ء میں انھوں نے اسپین کی غلامی کا جُوا اُتار کر پھینکا اور اپنی مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس دوران میں پرتگیزوں کا کاروبار

ڈچ اور انگریزوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ اور ان کا وقار ہندوستان سے ہمیشہ کے لئے اٹھ گیا۔ پرتگالیوں کی اس ناکامی کے اور بھی کئی اسباب تھے۔ یہاں انھوں نے بہت سی ناشائستہ اور ذلیل حرکتیں کرنا شروع کیں۔ وہ حد درجہ کے عیاش ہوگئے۔ اور دھوکہ بازی پر اتر آئے۔ دن دھاڑے ہندوستان کی عورتوں پر دست درازی کرنے لگے۔ مذہب کے معاملہ میں اُن کی خفیف الحرکاتی دن بدن بڑھتی گئی۔ جس کی وجہ سے وہ ہندوستانیوں کی نگاہ میں ذلیل و خوار ہوگئے اور اُن کا اعتماد جاتا رہا۔ اور یہی بات ہر قوم کی سیاسی و اخلاقی موت کے مترادف ہے۔

پرتگالیوں کے ادبار سے ڈچ قوم کا اختر قسمت چمک اٹھا۔ انگریزوں کی طرح ڈچ لوگ بھی شمال کی جانب سے ہندوستان کے لئے راستہ تلاش کر رہے تھے۔ لیکن انھیں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ اس لئے انھوں نے پرتگیزوں کی دریافت سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ پرتگالی تقریباً سو سال سے ہندوستان سے تجارت کر رہے تھے اور اسمیں انھیں بہت زیادہ منافع ہوتا تھا۔ اس لئے ان کا دارالحکومت لسبن (واقع پرتگال) دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا رہا۔ ہندوستان سے لائے ہوئے مال کو یوروپ میں فروخت کرنے کے لئے پرتگال کو ڈچوں کی امداد و اعانت کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ڈچ بھی مالی مفاد کے خیال سے بخوشی خاطر اُن کا ہاتھ بٹانے کے لئے مستعد ہوگئے۔ اور اپنے جہازوں میں اُن کا مال لاد کر سارے یوروپ میں پھیلانے لگے۔ آہستہ آہستہ اُن کو بھی براہِ راست ہندوستان سے معاملہ کرنے کی دھن ہوئی۔ چنانچہ لنکوٹینس پہلا ڈچ سوداگر تھا جو پرتگالیوں کے ساتھ گوا آیا۔

تیرہ[۱۳] برس گوا میں اقامت گزین رہ کر اُس نے کاروباری معلومات بہم پہنچائیں۔ اور ۱۵۵۲ء میں اپنے وطن کو واپس گیا۔ ۱۵۶۶ء میں اُس نے اپنے تجربات و مشاہدات کو عوام کی واقفیت کے لئے شائع کر دیا۔ اُس کے بعد ہالینڈ کے دارالحکومت ایمسٹرڈم میں تاجروں کا ایک جلسہ ہوا۔ جس میں ہندوستان سے تجارت کرنے کی قرارداد پاس ہوئی۔ جس کے مطابق کارنینس ہومن کی سرکردگی میں ۱۵۹۵ء میں چار جہاز افریقہ کے راستہ ہندوستان آئے اور ڈھائی برس کے بعد واپس ہوگئے۔ پھر چار پانچ سال کی قلیل مدت میں ڈچ لوگوں نے ہندوستان کے پندرہ چکر کئے۔ اور مختلف تجارتی اداروں کی داغ بیل ڈالی۔ ۱۶۰۲ء میں ڈچ پارلیمنٹ کے ایما سے یہ تمام کارخانے مشترک و متحد ہوکر ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کی صورت میں رونما ہوئے اور سترہویں صدی عیسوی کے خاتمے تک ڈچ لوگ ہی ہندوستانی تجارت کے اجارہ دار رہے۔ اس دوران میں انھوں نے حکومت قائم کرنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی۔ انھیں مسیحی مذہب کی تبلیغ کا جنون بھی کبھی سوار نہیں ہوا۔ اور انھوں نے ملک کے

سیاسی جھگڑوں میں بھی کوئی دست اندازی نہیں کی۔

۱۶۵۲ء میں ڈچوں نے مدراس کے متصل پال کالو مقام پر اپنی نو آبادی قائم کی۔ اس کے چھ سال بعد ۱۶۵۸ء میں سیلون کا ایک قلعہ پرتگالیوں سے حاصل کیا۔ ۱۶۶۴ عیسوی میں انھوں نے پرتگالیوں کے ساحل مالابار کے تمام مقبوضات چھین لئے۔ ۱۶۶۹ء میں پرتگالیوں کو سینٹ تھامی مقام سے نکال باہر کیا۔ ۱۶۲۳ء میں بہت سے انگریز سوداگر ڈچ لوگوں کے ہاتھ سے ابو یانہ میں قتل ہوئے۔ اس کے بعد سے انگریزوں کا اقتدار بڑھنے لگا۔ آگے چل کر ڈچ لوگ ہندوستانیوں سے بھی اُلجھنے لگے اور ان کے مظالم پرتگالیوں سے بھی کہیں زیادہ بڑھ گئے۔ اب دیسی لوگ ان سے متنفر ہونے لگے۔ جس سے ان کا کاروبار زوال پذیر ہونے لگا۔ آخر ۱۷۵۸ء میں کلایو کے ہاتھوں چنسرا کے مقام پر ان کو عروج و اقبال کا سورج ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔

تاریخ شاہد ہے کہ نویں صدی عیسوی میں انگریزوں نے ہندوستان کا رُخ کیا تھا چنانچہ انھیں دنوں شاہ الفریڈ نے اپنا ایک ایلچی ہندوستان بھیجا۔ اس کے چار پانچ سو برس بعد چودھویں صدی میں ایک دوسرا انگریز سر جارج مڈویل یہاں آیا۔ ان اصحاب کی آمد کے متعلق تاریخ نویسوں میں بہت کچھ اختلاف رائے ہے۔ لیکن یہ مسلم ہے کہ ۱۳۹۹ء میں مڈویل صاحب نے اپنی مشہور کتاب "سیاحت ہندوستان" شائع کی، اور یہی وہ پہلی کتاب تھی جو انگریزی کی چھپ کر شائع ہوئی۔ اور وہ ہندوستان ہی کے بارہ میں لکھی گئی تھی۔ سیاسی نقطۂ نگاہ سے مڈویل صاحب کا دورہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اِس لئے اس کے متعلق کسی بحث میں پڑنا محض تضیع اوقات ہے۔ سب سے پہلا فرنگی جو ہندوستان میں مستقل طور پر آباد ہوا، فادر اسٹیفن تھا۔

اکتوبر ۱۵۷۹ء میں اسٹیفن عیسائی مذہب کی تبلیغ کرتا ہوا کاروبار کرنے کے ارادہ سے گوآ آیا۔ اور وہیں جان بحق تسلیم ہوا۔ اُس نے ہندوستان کے متعلق ایک نہایت دلچسپ کتاب لکھی ہے جس کی یورپ میں بڑی قدر ہوئی۔ اس کے علاوہ اُس نے کوکنی مرہٹی زبان میں "کھست پُران" نامی ایک دوسری کتاب بھی تصنیف کی تھی۔ یہ کتاب عیسائی مذہب سے متعلق ہے اور رومن رسم الخط میں لکھی گئی ہے۔ اسٹیفن نے پرتگالی زبان میں کوکنی کی قواعد بھی مرتب کی تھی۔ ۱۵۸۶ء میں فینچ نامی ایک دوسرا فرنگی خشکی کے راستے ہندوستان روانہ ہوا۔ لیکن ابھی وہ ایران کی سرحد تک بھی نہ پہنچنے پایا تھا کہ پرتگیزوں نے اُسے گرفتار کر کے گوآ بھیج دیا۔

فرنگستان واپس جا کر فینچ نے ہندوستان کی دولت و عظمت کے راگ گا گا کر فرنگیوں کے

دندانِ آز تیز کر دے۔ ۱۵۸۹ء میں ٹامس کیونڈش دُنیا کا سفر کرکے ہندوستان پہونچا۔ واپسی پر اُس نے جو حالات بیان کئے۔ اُن کا انگلینڈ میں برسوں چرچا ہوتا رہا۔ اور فرنگی ہندوستان سے روپیہ پیدا کرنے کے لئے طرح طرح کے منصوبے باندھتے رہے۔ لیکن اُن کے ارادے شیخ چلّی کے منصوبوں سے زیادہ وقیع نہ تھے۔ البتہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے سب سے پہلے ہندوستان پر اپنا اقتدار قائم کرنے کی فکر کی۔

لطفِ کلام

لطیف انور اڈیٹر ماہنامہ "کرن" کا نور

کب تک فریب دیتا رہوں رہنما کو مَیں
حیرت سے دیکھتا ہوں ترے نقشِ پا کو مَیں

میرا نیازِ عشق نہیں ہے حریفِ ناز
بیگانہ جانتا ہوں غمِ آشنا کو مَیں

گلشن میں کس مصیبت تازہ کا ہے ظہور
چُپ دیکھتا ہوں بُلبلِ رنگیں نوا کو مَیں

آئینِ آرزو میں نہیں ہے وفا کو ناز
پہچانتا ہوں ورنہ تری ہر ادا کو مَیں

گم ہوگیا ہوں کون ہے میری تلاش میں
سنتا ہوں ہر طرف سے کسی کی صدا کو مَیں

اتنا تو ہے کہ بہلا ہوا ہے جنونِ شوق
گم کر دوں ورنہ شورشِ زنجیرِ پا کو مَیں

طوفاں میں ناخدا کی حقیقت تو ہو چکی
اب دیکھ لوں پکار کے انور خدا کو مَیں



جذباتِ نجم

نتیجۂ فکر از حضرت نجم آفندی

شکستہ ہوش نہیں ہوں شکست پاؤں کیا
اجل یہ ناز ہے کہیئے اجل تک آؤں کیا

نظر خود اُن کی ہے نیچی نظر ملاؤں کیا
فریب حُسن سلامت میں دل دکھاؤں کیا

ہزار درد ہوں آنکھوں میں اشک لاؤں کیا
میں دل کے خون سے دل کی لگی بجھاؤں کیا

جمی ہے دیر سے پندارِ حُسن کی محفل
غرورِ عشق کا قصّہ کوئی سناؤں کیا

گذار دوں شبِ غم ایک ہی تبسّم میں
سحر کے رخ پہ ستارہ سا جگمگاؤں کیا

بجانِ عشق نئی زندگی کی فکر میں ہوں
تری نظر کی بگاڑی ہوئی بناؤں کیا

یہ سُن رہا ہوں کہ آفاق میں تمھیں تم ہو
میں اپنی ہستی بیجا کو بھول جاؤں کیا

یہ نازِ حُسن مری عاشقی کے دم سے ہے
تمھارے دل میں ہوں بولو زباں تک آؤں کیا

سُنی ہو جس نے شکایت نہ التجا نہ دُعا
اُس آزمائے ہوئے دل کو آزماؤں کیا

مرا صحیفۂ اعمال دیکھنے والے
ترے حضور میں ذوقِ گناہ لاؤں کیا

سوائے غم نہ دیا کچھ تمھارے جلوہ نے
یہ سوچتا ہوں تکلف سے مُسکراؤں کیا

زبانِ شوق کھُلی ہے مزاجِ دوست کجا
کسی حسین تمنّا کا گیت گاؤں کیا

اِسی زمیں کو کبھی آسماں بنا لونگا
زمیں کو چھوڑ کے اب آسماں پہ جاؤں کیا

میں نجم جسم فسردہ ہوں روح بالیدہ
کسی نگاہِ غلط کار میں سماؤں کیا

رُباعی

اِس دَیر میں تا دیر ٹھہرنا بہتر
یا تیز روی سے کوچ کرنا بہتر

بس زندہ ہوں ابتک اس تذبذب کے طفیل
جینے میں ہے فائدہ کہ مرنا بہتر

(کلیم)
جوش

ہندوستان کے لئے ایک عام زبان کا مسئلہ

"حق پرست" کے قلم سے

آل انڈیا ریڈیو دہلی کے اہتمام سے حال میں چند مضامین "ہندوستانی" زبان کے متعلق پڑھے گئے تھے۔ پڑھنے والے بزرگ ہندوستان کے مشہور و معروف افراد ہیں یعنی مولینا مولوی عبدالحق صاحب، پنڈت برج موہن دتاترے کیفی، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر تاراچند، مسٹر آصف علی بابو راجندر پرشاد۔ ان بزرگوں کے مضامین پر حضرت سہیل عظیم آبادی کا تبصرہ بھی "زمانہ" بابت اپریل ۱۹۳۹ء میں شایع ہوا ہے۔ اِس خاکسار کو بھی اسی سلسلہ میں کچھ عرض کرنا ہے۔

چونکہ محترمی مولانا عبدالحق صاحب کو "ہندوستانی" نام سے بھی کچھ چڑھ سی ہوگئی ہے اور اُنھوں نے اس کے متعلق کئی ایک شبہے اور بحثیں پیدا کی ہیں، لہذا اصل مدعا کی طرف رجوع کرنے کی غرض سے میں نے مندرجۂ بالا عنوان قایم کیا ہے۔ غور طلب مسئلہ دراصل یہ ہے کہ وہ کونسی زبان ہوسکتی ہے جو ہمالیہ سے کنیا کماری تک اور اٹک سے کٹک تک آسانی سے سمجھی ہی نہیں بلکہ بولی بھی جاسکتی ہے۔

جن بزرگوں نے یہ مضامین پڑھے ہیں، اُن کا مدعا فرداً فرداً خواہ کچھ ہی ہو، عام طور پر جو بات بہت صاف ہے وہ یہ ہے کہ جھگڑا دراصل ہندی اور اُردو کا ہے۔ سیاسی انقلابات کے ساتھ ساتھ یہاں کے بسنے والوں میں اپنا اپنا پلّہ بھاری رکھنے کی فکریں کام کررہی ہیں، زبان کا جھگڑا بھی اسی کا ایک شگوفہ ہے۔ فکر یہ ہے کہ اگر انگریزی اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو اُس کی جگہ ہندی کو ملے یا اردو کو۔ اِس جھگڑے کی جڑ کانگریس کی یہ تحریک ہے کہ سرکاری اور "کل ہند" حیثیت کے غیر سرکاری اداروں کا کام بجائے انگریزی کے ہندوستانی میں ہو۔ یعنی کسی ایسی ہندوستانی زبان میں جس کو سب سمجھ اور بول سکیں۔

مسلمان حضرات چاہتے ہیں کہ یہ جگہ اُردو کو ملے۔ اور ہندوؤں میں وہ حضرات جو اسلامی تاثرات میں پرورش پائے ہیں اور جنھوں نے اپنی چیزوں کو ماحول کے زیر اثر بھلا بسرا دیا ہے اسی اُردو کی تائید میں ہیں۔ ان میں سے بعض حضرات یہ ضرور چاہتے ہیں کہ مسلمان بھائی اُنھیں برابری کا درجہ دے دیں۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو چاہتا ہے کہ یہ درجہ ہندی کو ملے۔ اِن دونوں کا استدلال ہی نہیں بلکہ دعویٰ ہے کہ یہ زبانیں عام طور پر ہندوستان بھر میں سمجھی جاتی ہیں ظاہر ہے کہ دعویٰ صرف ایک ہی کا صحیح ہو سکتا ہے مگر اس کا بھی امکان ہے کہ دونوں دعوے غلط ہوں۔

لہٰذا اب ضرورت یہ لاحق ہوئی کہ پہلے اس کا تصفیہ ہو جائے کہ "ہندوستانی" کیا ہے۔ اسی کی توضیح اور تصریح میں مضامین زیر بحث پڑھے گئے۔

مگر اس مسئلہ پر غور کرتے وقت ایک نہایت ہی اہم حقیقت اِن بزرگوں کی نظر سے اُجھل رہی جس کا نتیجہ سہیل عظیم آبادی صاحب کے الفاظ میں وہ "اُلجھا ہوا نظریہ" ہے جو اِن مضامین میں ظاہر ہے۔

وہ حقیقت یہ ہے کہ جو زبان کانگریس کی تحریک سے پیشتر "ہندوستانی" کہلاتی تھی اور جس کی طرف مولانا مولوی عبدالحق صاحب کا اشارہ ہے اُس کی وجہ تسمیہ کچھ اور ہے اور وہ اُس "ہندوستانی" سے مختلف ہے جو اس وقت مطلوب ہے۔ "ہندوستان" سے مراد اِن نئی سیاسی بیداریوں سے پیشتر عام طور پر کُل ہند نہیں تھی۔ بلکہ صرف وہ خطہ تھا جو "یو۔پی" کہلاتا ہے۔ آج بھی ہندوستانی آدمی سے مراد یو۔پی کے باشندہ سے ہوتی ہے۔ پنجاب کا آدمی "پنجابی" کہلاتا ہے۔ بنگال کا "بنگالی"، گجرات کا "گجراتی"، مدراس کا "مدراسی"، مہاراشٹر کا "مہاراشٹرین" یا "مرہٹہ"، لیکن یو۔پی کا آدمی "ہندوستانی" کہلاتا ہے۔ اور اُس کی زبان "ہندوستانی"۔ انگریزوں نے بھی جس زبان کو "ہندوستانی" نام سے پکارا وہ اسی خطہ یعنی یو۔پی کی زبان تھی۔

اِس میں شک نہیں کہ یو۔پی میں مختلف حصوں کی اس وقت تک مختلف بولیاں ہیں لیکن یہ سب ملتی جلتی سی ہیں۔ ایک بولی جو اِن سب حصوں میں عام ہوئی وہ کھڑی بولی تھی۔ اِس کھڑی بولی کے دو روپ ہیں، ایک ہندی دوسرا اُردو۔

اِن دونوں کے متعلق سردست تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں، صرف یہ عرض کرنا کافی ہے کہ اس حصۂ ملک یعنی یو۔پی میں چونکہ ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمان زیادہ منظم متمدن اور مہذب تھے

اور حکومت بھی عرصۂ دراز تک انھیں کے ہاتھ میں رہی، لہذا قدرتاً ہندی پر اُردو کو فوقیت حاصل ہوئی، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں میں بھی وہی "مہذب" کہلائے جنھوں نے اُردو کو اختیار کیا۔

اُس وقت عام طور پر "کُل ہند" کا وہ تصوّر نہ تھا جو اَب ہے۔ بہرحال "ہندوستانی زبان" "یو۔پی" کی زبان کا نام تھا اور اس کا اشارہ خاص طور پر اُردو کی طرف تھا۔ اِس طرح میں مولٰنا مولوی عبدالحق صاحب سے متفق ہوں کہ ہندوستانی سے مراد اُردو رہی ہے۔ لیکن اِس سلسلے میں اس بات کو ذہن نشین رکھنے کی بھی ضرورت ہے کہ جس خطّہ سے یہ منسوب تھی وہ یو۔پی تھا نہ کہ کُل ہند (آل انڈیا)

مگر اب کانگریس جو ایک عام زبان چاہتی ہے وہ کُل ہند کے لئے ہے، صرف یو۔پی، کے لئے نہیں۔ اِس فرق کو صاف اور صریح طور پر نہ دیکھنے کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے بزرگوں کا خیال زبان کے معاملہ میں "اُلجھا ہوا سا" ہوگیا ہے۔ اس پر وہ کلچرل رُجحانات بھی ہیں جو مسلمان بھائیوں میں پہلے ہی سے کافی شدید ہیں، اور اب ہندوؤں کی اس طرف بیداری سے یہ رُجحانات دن بدن اور بھی زیادہ شدید ہوتے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک عام زبان کے متعلق غور کرنے میں معاملہ کے حقیقی پہلوؤں پر نظر ڈالنے کے عوض کھینچا تانی سے کام لیا جاتا ہے جس سے گتھی اور بھی اُلجھتی ہے۔ مثال کے طور پر محترمی ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا یہ دعویٰ لیجئے کہ پہلے لوگ ہندی اُردو کا فرق بھی نہ جانتے تھے۔ اگر یہ فرق موجود نہ تھا اور اُردو ہی عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی تو ڈاکٹر گلکرائسٹ نے کس چیز کی تکمیل اور نشو و نما کے لئے للو جی لال وغیرہ کو کلکتہ بُلایا تھا؟

ممکن ہے اس کا یہ آسان جواب دیا جائے کہ محض افتراق پیدا کرنے کی غرض سے۔ کیونکہ آجکل یہ عام فیشن ہوگیا ہے کہ اپنی تمام بدقسمتیوں اور خرابیوں کو ہم انگریز اور اُن کی حکومت سے منسوب کر دیتے ہیں۔ خیر، اگر ڈاکٹر صاحب ممدوح ایسا جواب دیں تو ہم اس مسئلہ پر کہ پہلے لوگ ہندی اور اُردو کا فرق جانتے تھے یا نہ جانتے تھے تفصیلی بحث کریں گے۔ سردست تقریباً ستر سال پیشتر کا یعنی ۱۸۷۳ء کا ایک واقعہ عرض کرتے ہیں۔ جو "کلیات الکھ دھاری" میں مرقوم ہے وہ یہ ہے کہ بنگال گورنمنٹ نے جس کے ماتحت اُس وقت صوبۂ بہار بھی تھا، بہار یعنی پٹنہ وغیرہ اضلاع کے لئے یہ حکم صادر فرمایا کہ وہاں دفاتر سرکاری میں نوشت و خواند ناگری یعنی ہندی میں

مروج ہو - اس کے خلاف مسلمانوں نے باوجود انتہائی اقلیت میں ہونے کے احتجاج کیا اس احتجاج سے بحث کرتے ہوئے منشی الکھ دھاری جی لکھتے ہیں :-

"........ایک عذر (مسلمانوں کا) یہ ہے کہ زبان ہندوستان میں اگر الفاظ عربی و فارسی داخل ہوگئے تو (ہندی کے رواج سے) اُن کا لکھنا اور پڑھنا بعت سے مشکل ہوگا - یہ عذر بھی سماعت کے لائق نہیں ہے کہ عین اور غین کے واسطے ناگری میں نقطے اور اشارے قایم ہوجائیں گے علاوہ اس کے کچھ ضرور نہیں کہ غیر ولایت کی زبان کے الفاظ دیس کی زبان میں شامل رہیں[1] اصلی عذر یہ ہے کہ اگر ہندی نے رواج پایا تو مسلمان عہدہ ہائے سرکار سے محروم ہوں گے. یہ بھی سُننے کے لائق نہیں ہے - کیونکہ جب مسلمانوں کا ہند میں زور ہوا، ہنود نے چار و ناچار عربی و فارسی پڑھنا شروع کیا تھا، اور جب سے انگریزی عملداری ہوئی سب نے انگریزی پڑھنا شروع کیا - اسی طرح مسلمان بھائی بھی انگریزی اور ناگری (ہندی) پڑھکر عمدہ عہدے پائیں گے......"

(ملاحظہ ہو کلیات الکھ دھاری کا ساتواں مقالہ صفحہ ۳۹۷)

میرا مدعا یہ ہے کہ ہندی اور اُردو کا جھگڑا دراصل بہت قدیم ہے، اور کیوں نہ ہو مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کا مقصد ہندوؤں کے مذہب اور کلچر کو مٹانے کا تھا. ہندو تا حدِ امکان اس کی مدافعت کرتے رہے، چنانچہ زبان کا مسئلہ بھی اسی سے وابستہ ہے بہرحال خود یو-پی میں زبان کے متعلق حقیقی صورتِ حال یہ ہے کہ جب تک وہاں اسلامی حکومت تھی، اُردو فارسی محض تحریص اور ترغیب کی چیز بنی رہی یہ کہنا غلط ہے کہ اُردو وہ زبان ہے جو ہندو اور مسلمانوں کے اتحاد و محبت اور میل ملاپ سے پیدا ہوئی، جیسا میں نے اوپر عرض کیا، مسلمان فاتح ہندوستان میں کچھ ہندوؤں کو گلے لگانے اور پیار کرنے نہیں آئے تھے - اُن کی آمد صاف اس تخیل اور اس ارادہ پر مبنی تھی کہ یہاں کے باشندے کفار ہیں جن کا مذہب اور طور طریقے ذلیل اور قابل نفرت ہیں لہذا ان کو مسلمان بنایا جائے اور اگر یہ اسلام کو قبول کرکے اپنے آپ کو شریف نہ بنائیں (یعنی مشرف بہ اسلام نہ ہوں) تو انھیں ذبح کیا جائے جب تک کہ یہ مسلمان نہ بن جائیں - اِن کے اس تخیل کے خلاف بعض مسلمان بادشاہوں نے بھی جدوجہد کی، لیکن اُن کا کوئی مستقل اثر نہوا. بایں نتیجہ کہ خون خرابے جاری رہے اور آج تک جاری ہیں - حالانکہ موجودہ ہندی مسلمان کم از کم ۹۹ فیصدی کی حد تک اُن مسلم

[1] آج ٹرکی اور ایران کا نظریہ بھی یہی ہے - حق پرست.

فاتحوں کی اولاد نہیں بلکہ ہندوؤں ہی کے گوشت پوست ہیں - ایسی تلخ حقیقتوں کا اظہار نہ ہونا ہی بہتر ہے - لیکن زبان کے معاملہ میں بھی جو غیر رواداری سے کام لیا جارہا ہے اور اپنے اغراض کی تکمیل میں صریحاً ایسے خلاف واقعہ استدلال پیش کئے جارہے ہیں تو مجبوراً بادلِ ناخواستہ ان حقیقتوں کا اظہار کرنا پڑتا ہے - غرض اُردو اسلامی زبان ہے جو اسلامی اغراض کی تکمیل کے لئے پیدا ہوئی، اور اس میں شک نہیں کہ ابتک یہی اُردو "ہندوستانی" کہلاتی رہی ہے - لیکن یہ وہ ہندوستانی ہے جو کبھی ہندوؤں کی زبان نہ تھی - اس کے متعلق یہ ناچیز اپنے سابقہ مضامین میں کافی لکھ چکا ہے - مزید ثبوت کے لئے اب صرف غالب کو پیش کرتا ہے - رقعاتِ غالب سے ذیل کے دو اقتباسات ملاحظہ ہوں:-

"........ اے میر مہدی تجھے شرم نہیں آتی، میاں، یہ اہل دہلی کی زبان ہے، اے اب اہلِ دہلی ہندو ہیں یا اہل حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی یا گورے ہیں، ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے۔"

نواب امین الدین احمد خاں صاحب رئیس لوہارو کے نام

"........ یہ وہ دہلی نہیں جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے ...... یہ وہ دہلی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں، ایک کیمپ ہے، مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، باقی سراسر ہنود ......"

اِن اقتباسات پر کسی قسم کی حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں بہرحال اِن تمام واقعات کے باوجود چونکہ اُردو زبان زیادہ مہذب اور طرحدار تھی - لہذا ہندوؤں نے اپنی روایتی غفلت میں اسی کا پیچھا کیا - لیکن مسلمان حضرات کی کوتاہ اندیشی ملاحظہ ہو کہ اُن کی حوصلہ افزائی کے بجائے ایک طرف تو اُن کا مضحکہ اُڑایا جانے لگا اور دوسری طرف اُردو کے ایسے ہندو ادیبوں کی طرف سے بھی غفلت برتی جانے لگی - جو حقیقت میں چوٹی کے ادیب تھے - اور یہ الفاظ منشی شیام موہن لال صاحب جگر بریلوی "صاحب طرز" ہوئے ہیں -

اِس کا یہ قدرتی نتیجہ تھا کہ ہندو اپنی ہندی کی طرف رجوع ہوتے -

ہندوؤں کے ہندی کی طرف رجوع ہونے ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ اُس قسم کے زبان کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے جس کی متذکرہ بالا چھ میں سے پانچ بزرگوں نے کوشش فرمائی ہے جس میں سب سے زیادہ کامیاب کوشش پنڈت کیفی جی کی رہی ہے - مگر یہ زبان نبھنے والی نہیں -

---

۱ ڈاکٹر عبداللطیف، مولانا سلیمان ندوی علامہ شبلی مرحوم اور دیگر کئی ایک مسلم علماء مفکرین کا بھی یہی دعویٰ ہے، حقیقت

اُن کی اور ڈاکٹر تارا چند کی زبان پہ ہندی کا الزام لگایا جائیگا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے جو ہندوستانی لکھی ہے وہ عام طور پر اس زبان میں نہیں ہے جو وہ عموماً لکھا کرتے ہیں۔ خود مسلمان بھائی اسکو چلنے نہ دینگے۔ چنانچہ مولوی عبدالحق صاحب اُردو ہی کو قایم رکھنا چاہتے ہیں، مسلمان حضرات میں کثرت مولوی صاحب کے ہم خیالوں کی ہے۔ سب سے بڑی کوشش تو اس جانب عثمانیہ یونیورسٹی کو کرنی چاہیئے تھی جس کا دعویٰ ہے کہ وہاں کی جملہ آبادی کے پچاسی فیصدی ہندوؤں کیلئے (جن میں مرہٹی، تلنگی اور کنڑی بولنے والوں کی کثرت ہے) عام زبان میں تعلیم کا اہتمام کر رہی ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ہم جیسے اُردو کے تاثرات میں پرورش پائے ہوئے ہندوؤں کے لئے بھی یہ عثمانی زبان سمجھنی مشکل ہے۔ اُن لوگوں کا تو ذکر ہی فضول ہے جن کی مادری زبان مرہٹی، تلنگی، کنڑی، وغیرہ ہے۔

ہندوستانی کی یہ سب حجتیں دراصل اُردو کو انگریزی کی جگہ دینے کی غرض سے ہیں۔

لیکن اردو کی خلقی طبیعت ایسی واقع ہوئی ہے کہ اُس کا رجحان عربی اور فارسی کی طرف ہے اس میں ہندی کے الفاظ کی کھپت کی گنجایش نہیں۔ ہم خود لکھتے ہوئے اس بات کو محسوس کرتے ہیں۔ میرے پچھلے مضمون میں ایک لفظ "متوالا" میں نے استعمال کیا تھا، اڈیٹر صاحب نے اس کی اصلاح "دلدادہ" سے کردی، اور بالکل بجا کی اس لئے کہ میں اُردو لکھ رہا ہوں نہ کہ ہندی

جس قسم کی ہندوستانی ڈاکٹر تارا چند صاحب نے لکھی ہے اُس کے متعلق مسلمان حضرات کے اعتراضات ہو چکے ہیں۔ یہ تقریباً اُسی قسم کی زبان ہے جو آریہ سماجی اُردو پرچے استعمال کرتے ہیں لیکن مسلمان حضرات نے اُس کے خلاف کافی چیخا چلّایا کہ اُردو ادب کو تباہ کیا جا رہا ہے اور اُس کے گلے پر کُند چھری پھیری جارہی ہے۔ اب مسلمان حضرات اُس کو کیسے قبول کرلیں گے؟ ناممکن ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خلقی طور پر اُردو زبان کی طبیعت اس کو قبول نہیں کرسکتی۔

اب رہا یہ استدلال کہ زبانوں میں غیر الفاظ آہی جاتے ہیں، جو اُس کی تقویت، زندگی، اور طرحداری کا باعث ہوتے ہیں اور یہ کہ خود اُس زبان میں جس کو خالص ہندی کہتے ہیں عربی فارسی الفاظ شامل ہو چکے ہیں، اور اگر ان کو خارج کرنے کا سلسلہ جاری رکھا جائے تو تُلسی داس جی، کبیر داس جی اور سُور داس جی وغیرہ کے کلام کو بھی "شُدھ" کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اس کے متعلق میرا معروضہ یہ ہے کہ ہندی کے اِن ادیبوں نے فارسی عربی کے الفاظ کو استعمال کیا تو انھیں ہندی بنا کر "غریب نواز" کو "گریب نواج" کہا جیسے آپ (Lantern) کو "لالٹین" کہتے ہیں۔ عرض کو "ارج" کہا..... لیکن اُردو والے کو تو پہلے اتنا شر(ق) درست کرنا پڑتا ہے اور تلفظ میں

عربی اور فارسی ہی کا تتبع۔ اس میں ذرہ بھر بھی کسر رہی تو "جانگلو" کہلائے۔ ہم کو عربی فارسی کے الفاظ لینے سے ہرگز انکار نہیں، بشرطیکہ انھیں ہندی بنا کر لیا جائے۔ ایک لفظ میں تمثیلاً یہاں پیش کرتا ہوں جو تیلگو میں مستعمل ہے۔ وہ جوتے کو پاپوسُلو (पा पो सुलु) کہتے ہیں۔ یہ دراصل "پاپوش" کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ (میں بگڑی ہوئی نہ کہونگا۔ آج انگریز بمبئی کو "بامبے" کہتے ہیں، مدراس کو "مڈراس"۔ اور جب ہم ہندوستانی بھی انگریزی کہتے ہیں تو بمبئی نہیں کہتے بامبے ہی کہتے ہیں۔ غرض ہر زبان کی یہ خصوصیت ہے کہ جب غیر زبان کے الفاظ کو لیتی ہے تو اُس کو اس طرح اپنا بنا کر کہ بہ الفاظ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب "پھر کوئی پہچان بھی نہ سکے کہ یہ پہلے سے اِن کے ہیں یا بعد کو آملے ہیں"۔ مگر کیا اُردو میں عربی اور فارسی الفاظ کو اسی طرح "ہندوستانی" بنایا گیا ہے۔ چند مثالیں ضرور دی جاسکیں گی، مگر میں ان کو مستثنیات سے سمجھتا ہوں۔ ورنہ اُردو کا قدرتی میلان عربی اور فارسی میں اپنے آپ کو ضم کرنے کی طرف ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ خود مسلمان بھائیوں کا میلان عراق و عرب و فلسطین وغیرہ اسلامی ممالک کی طرف ہے۔ ہندوستان میں تو دراصل وہ پردیسیوں کی طرح بستے ہیں۔ ورنہ مسلمان بھائی اگر اس دیس کو اپنائے ہوتے تو اس دیس کی تہذیب و تمدن میں دلچسپی لیتے، جیسا عیسائی لے رہے ہیں سنسکرت سیکھتے جو بہ قول آغا شستری صاحب یہاں کی تمام زبانوں میں (سوائے اُردو کے) خون کی طرح بہ رہی ہے۔ تب زبان کا مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا۔ اور یہ پیچیدگیاں پیدا نہ ہوتیں۔ مگر قصور ہندوؤں کا بھی ہے، خصوصاً یو۔پی کے ہندوؤں کا کہ یہ زبان اور اُس کے مضرات پر غور کرنے سے ہمیشہ گریز کرتے رہے۔ ان کی غفلت کی یہ انتہا ہے کہ جو بہاؤ آتا ہے اُس میں آسانی سے بہ جاتے ہیں۔

معاملہ کی وضاحت کے لئے یہ تمام تذکرے ضروری تھے۔

اب میں اصل مضمون پر آتا ہوں کہ آخر ہندوستان (کُل ہند) کی ایک عام زبان کیا ہوسکتی ہے؟ حضرت سُہیل عظیم آبادی نے جو طریق کار اس کے لئے پیش کیا ہے میں اُس سے متفق ہوں کہ پہلے اُن الفاظ کو چُننے کی کوشش کی جائے جو مختلف صوبوں میں عام ہیں، پھر اُنھیں کے ذخیرہ سے ایک زبان ترتیب دی جائے جو ہندوستان میں عام طور پر سمجھی جاسکے گی اسی کو "ہندوستانی" مان لیا جائے۔ یہ بالکل درست ہے، لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوگا ملاحظہ ہو۔

میں اُردو کے تین بہت معمولی جملے اور اُن کے ترجمے مختلف صوبوں کی زبان میں دیتا ہوں

(۱) ربیندر ناتھ ٹیگور نے جس وقت سرزمین امیریکہ پر قدم رکھا تو وہاں کے باشندوں نے اُن کا نہایت جوش سے استقبال کیا۔

(۲) یہ اُردو کا ایک بہت معمولی جملہ ہے۔

(۳) اگر اس کو بھی کوئی نہ سمجھ سکے تو اُس کی ذہانت پر حیرت ہے۔

مرہٹی ترجمہ

(۱) رونِدر ناتھ ٹاگور یاں نی امیرکہ بھومی ور جیاویلیں پدارپن کیلیں تیوہاں تیتھیل ناگریکاں نی اتینت اُتساہانے تیانچے سواگت کیلیں۔

(۲) اُردو بھاشینتیل ہے ایک اتینت سادھارن واکیہ آہے۔

(۳) یالاہی جر کونی سمجھوں شکلا ناہیں ترا سلی بدّھی آشچریہ کارک ہویہ

کنڑی ترجمہ

(۱) رونِدر ناتھ ٹاگور ورو امیرکا دیشکّے ہود سمیلّی اورِگے آ دیش واسی گلو اتو تساہ یندا سواگت وننو اِترّو۔

(۲) اِدو اُردو بھاشایلّی وَندو اتینت سادھارن واکیہ دَو

(۳) ادو ننو کوڑا ارتھ ماڈ کولّا دوڑ بدھی یو آشچریہ وادّے سری

تیلگو ترجمہ

(۱) رویندر ناتھ ٹاگور گارو امیرکہ دیشمونکو وچیین سمیہ مُنا واریکی آدیش واسلو اتینت اُتساہیو تو سواگتمو سنگری۔

महाराष्ट्र مرہٹی ترجمہ

(१) रविंद्रनाथ टागोर यान्नीं अमेरिका भूमीवर ज्या वेळी पदार्पण केले तेव्हा तेथील नागरीकांनीं अत्यन्त उत्साहाने त्यांचें स्वागत केलें

(२) उर्दू भाषेतील हें एक अत्यंत साधारण वाक्य आहे

(३) यालाही जर कोणी समजूं शकला नाहीं, तर असली बुद्धि आश्चर्यकारक होय.

कानडी کناری ترجمہ

(१) रबिंद्रनाथ टागार वरु अमेरिका देशक्के होदसमयक्कि अवरिगे आ देशवासिगळु अत्युत्साहदिंद स्वागत वन्न इत्तरु.

(२) इदु उर्दू भाषयल्लि वंदु साधारण वाक्यवु

(३) इदु नुकूडा अर्थ माडकोळ्ळदवर बुद्धियु आश्चर्यवाद्द सरि.

(۲) ا دی اُردو بھاشالو یوکّا اتینت سادھارن ین واکیمو۔

(۳) دینی نی کوڑا ایورنیا گرہنچلیکا پوی نیے ڈلا داری بُدّھی آشچریہ جنکمو۔

بنگالی ترجمہ

(۱) جے سمے ربیندرناتھ ٹھاکر امریکہ دلیسیر پدارپن کریلے تکھن ادی دلیسیر ادھی واسی برندا اتی اتساہیر تہار ابھندن (یا سواگت) کریلا۔

(۲) ایہا اُردو بھاشار ایکٹی ماتر سادھارن واکیہ۔

(۳) اے سامانیہ کتھا و جہار بودھ گمیہ نہ ہوی وے تہار بدھی کے اسچریہ ہوی تے ہوے

گجراتی ترجمہ

(۱) ربیندر ناتھ ٹیگور جارے امریکہ دیس ماں پگ موکیو تیاں نالوکورے ایم نی گھنا اتساہ تی سواگت کریوں

(۲) یے اُردو بھاشا نوں سادھارن واکیہ چھے۔

(۳) یے نے بھی سمجھی سکے تو ا بنی بدھی ماں آسچریہ کرو جوئے۔

तेलंगी تلنگو ترجمہ

(१) राबंद्रनाथ टागोरु गारु अमेरिका देशमुनकु विच्चेसिन समयमुना वारिकि आदेशवासुलु अत्यंतोत्साहमुतो स्वागतमो सांगेरि.

(३) इदि उर्दू भाषलो योका अत्यंत साधारण मयिन वाक्यमु.

(३) दिनिर्नि कडा एवरयिना ग्रहिंच लेक पो यि न येडला वारि बुद्धि आश्चर्यजनकमू.

बंगाली بنگالی ترجمہ

(१) जे समेय रबिंद्रनाथ ठाकुर अमेरिका देसेर पदार्पण करिले तिखन उइ देसेर अधिवासिवृंद अति उत्याहेर सहित तेहार अभिनन्दन (स्वागत) करीला.

(२) इहार उरदू भाषार एकटी मात्र साधारण वाक्य.

(३) ए सामान्य कथा ओ जेहार बोधगम्य न हुई वे तेहार बुद्धीके आश्चर्य हुई ते होवे.

गुजराथी. گجراتی ترجمہ

(१) रविंद्रनाथ टेगोर जारे अमेरिका देसमां पग मूकियो त्यांना लोकोये एमनी घना उत्साहते स्वागत करियुं

(२) ये उरदू भाषानो साधारण वाक्य छे.

(३) योनेभी न समझी शके तो येनी बुद्धीमां आश्चर्य करु जूइए.

تامل کا پڑھا جانا مشکل ہوگا لیکن وہاں بھی وقت کے لئے سمیم (समयम) سرزمین کے لئے دیشم قدم کے لئے پادیم (पादयम) جوش کے لئے اُتساہم استقبال کے لئے سواگتم معمولی کے لئے سادھارنم جملہ کے لئے واکیم عقل کے لئے بدھی اور حیرت کے لئے آشچریم آتا ہے

ان ترجموں کا اُردو رسم الخط میں پڑھنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ اس لئے میں نے ناگری رسم الخط میں بھی انھیں پیش کیا ہے تاکہ صحت سے پڑھے جا سکیں۔ صوبوں کی زبان میں جو مشترک الفاظ ہیں اُن کے نیچے خط کھینچ دیا گیا ہے۔ اب ملاحظہ ہو کہ ان مختلف ذیل کے الفاظ سوائے اردو کے سب میں مشترک ہیں۔

وقت	کے لے	سمیہ
سرزمین	کے لئے	دیش یا بھومی
قدم	کے لئے	پَد۔ پگ
باشندے	کے لئے	دیش واسی یا ناگرک
نہایت	کے لئے	اتینت۔ یا اتی۔ یا گھنا۔ گجرات میں معمولی طور پر گھنا کہتے ہیں۔
جوش	کے لئے	اُتساہ
استقبال	کے لئے	سواگت یا ابھنندن
زبان	کے لئے	بھاشا
معمولی	کے لئے	سادھارن
جملہ	کے لئے	واکیہ
ذہانت	کے لئے	بُدھی
حیرت	کے لئے	آشچریہ

اب ان مشترک الفاظ کو استعمال کر کے دیکھیے کہ کیسی زبان بنتی ہے۔

(۱) ربندر ناتھ ٹیگور نے جس سمیہ امریکہ دیش میں پدارپن کیا تو وہاں کے ناگرکوں یا دیش واسیوں نے انکا اتینت اُتساہ کے ساتھ سواگت کیا۔

(۲) یہ اُردو بھاشا کا ایک بہت سادھارن واکیہ ہے۔

(۳) اس کو بھی اگر کوئی نہ سمجھے تو اُس کی بُدھی پر آشچریہ کرنا چاہیے

غضب ہے یہ تو وہ زبان بن گئی جس کو سنسکرت سے بھری ہندی کہتے ہیں جسکی
ہندوستانی کے گیت گانے والے مخالفت کرتے نہیں تھکتے لیکن اس کا
کیا علاج کہ مختلف صوبوں کی زبانوں سے بہت زیادہ قریب جو زبان ہوتی ہو وہ یہی ہے۔
وجہ یہ ہے کہ سنسکرت چاہے کمیش لو۔ لی جاتی ہو مگر اُسی کے الفاظ اِن صوبجاتی زبانوں
کا ذخیرہ ہیں۔ اس لئے کہ ان تمام صوبوں میں یہ بالالتزام کلاسیکل زبان کی حیثیت سے سیکھی
جاتی ہے جیسے یو۔پی اور پنجاب میں مسلمان عربی یا فارسی لیتے ہیں۔ مہاتما گاندھی جی نے "ہندی"
"ہندوستانی" کا لفظ استعمال فرمایا تو اُس کی وجہ یہی تھی کہ صرف اسی قسم کی ہندوستانی کُل ہند میں
عام فہم ہوسکتی ہے۔ اس میں اُن کا تخیل مطلق اُلجھا ہوا نہیں تھا۔ لیکن اس کی توضیح میں بیشک
اُنھوں نے کمزوری دکھلائی۔ جو اُن کی اس خواہش کا نتیجہ ہے کہ کسی طرح مُسلمان ناراض نہ ہوں خواہ وہ
ناحق ہی پر کیوں نہ ہوں۔ اُن کی تمام پولیٹیکل زندگی میں اگر کوئی کمزوری ہیں بہت نمایاں طور پر محسوس
ہوتی ہے تو وہ یہ ہے کہ مسلمان بھائیوں کے خوش کرنے کے لئے وہ اس حق و انصاف سے بھی گریز
کرجاتے ہیں جس کے پرستار وہ اپنے آپ کو کہتے ہیں۔ ان کی دوسری کمزوری یہ ہے کہ خواہ کچھ ہی ہو
انگریزوں سے مقابلہ ضرور کیا جائے اور ان کے اثرات کو ظاہر کرنے والی کسی چیز سے واسطہ نہ رکھا
جائے۔ اس میں وہ قدرت اور مصلحت دونوں کے خلاف کام کرجاتے ہیں۔

خیر اب زبان کے معاملہ میں سطور بالا سے ظاہر ہوا ہوگا کہ اگر کوئی زبان کل ہند کے لئے
عام ہوسکتی ہے تو وہ اس قسم کی ہندی ہے جس میں سنسکرت الفاظ زیادہ ہیں۔ لیکن جس کی
مخالفت مسلمان بھائی شد و مد سے کرتے ہیں۔

جس قسم کی "ہندوستانی" کی کوشش صوبۂ بہار کی کمیٹی کر رہی ہے یا محولۂ بالا بزرگوں
نے کی ہے اُس کو بھی مسلمان حضرات عام طور پر قبول نہ فرمائیں گے۔ وہ اپنے لئے اُردو
ہی کو قائم رکھیں گے۔

اِس طرح اُس اصلی ہندوستانی کے وجود میں آنے میں جو کل ہند کے لئے ضروری ہے۔
کچھ اور روڑے اٹکیں گے۔ اور زیادہ دیر لگے گی۔ اس اثنا میں زبان کے معاملہ میں جھگڑے تلخ
سے تلخ تر ہوتے جائیں گے۔ اور ایسی ایسی سر پھٹول ہوگی کہ الاماں۔

اِس لئے میں عرض کرتا ہوں کہ اگر جھگڑوں کو گھٹانا مقصود ہے تو کم از کم اس عام زبان
کے سوال کو سردست چھوڑ دیا جائے۔ اور انگریزی ہی سے کام لیا جائے جس سے اس وقت نہایت
خوبی سے بغیر کسی تلخی کے کام چل رہا ہے۔

کیا قومی زبان بنائی جاسکتی ہے؟

از ح۔ می۔ ع ایم۔اے

گذشتہ چند سال سے مشترکہ قومی زبان کے سلسلہ میں ملک کے مختلف رسالوں میں اُردو ہندی کے متعلق مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ رسالہ زمانہ میں بھی متعدد مضامین شائع ہو چکے ہیں اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔[1] ہر مضمون نگار اپنی اپنی سمجھ کے مطابق رائے کا اظہار کر دیتا ہے مگر رسالہ زمانہ میں چند ایسے بھی مضامین شائع ہوئے ہیں۔ جن میں اُردو کے ہندو مصنفین کے ساتھ مسلمانوں کے غیر منصفانہ رویہ کی شکایت کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر جناب جگر بریلوی اور ایک دوسرے بزرگ "حق پرست" جن کے دو تین مضامین رسالہ زمانہ میں شائع ہوئے ہیں مسلمانوں سے سخت ناراض ہیں اور کہتے ہیں کہ اُردو کے مسلمان مصنفین ہندو لکھنے والوں کی خدمات کا اعتراف نہیں کرتے۔ اسلئے (بقول "حق پرست" صاحب) ہندوؤں کو چاہیئے کہ وہ اُردو زبان سے اپنا رشتہ تعلق یکسر منقطع کر کے اُس کی طرف سے اپنی نگاہیں پھیر لیں اور اپنی تمام تر توجہ ہندی زبان کی ترویج و ترقی میں صرف کریں۔

قبل اس کے کہ میں اصل مضمون کے متعلق کچھ اور لکھوں مناسب ہوگا اگر میں ان دونوں متذکرہ بالا اصحاب کے زاویۂ نگاہ میں جو فرق ہے اُس کا شروع ہی میں ذکر کر دوں۔ میں نے ہر دو اصحاب کے مضامین نہایت دلچسپی اور غور کے ساتھ پڑھے ہیں اور میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ ہرچند یہ دونوں حضرات مسلمانوں کے ہندو مصنفین کے ساتھ غیر مناسب برتاؤ کے شاکی ہیں لیکن ان دونوں میں ایک خاص فرق یہ ہے کہ جگر صاحب اُردو زبان کی حمایت کرنے کے لئے اس صورت میں تیار ہیں کہ مسلمان ہندو مصنفین کی ادبی خدمات کا کماحقہٗ اعتراف کرلیں۔ اور اُردو ادب میں ہندو تہذیب کی نمایندگی کے لئے گنجائش نکالی جائے۔ برخلاف اس کے "حق پرست" صاحب کے نزدیک مشترک قومی زبان کی ہمارے ملک کو ضرورت ہی نہیں ہے اور قطع نظر اس کے کہ اُردو ادب میں ہندو تہذیب کو جگہ دی جائے یا نہ دی جائے یا ہندو مصنفوں کی خدمات کو تسلیم کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ ہندوؤں کو چاہئے کہ اُردو زبان سے اپنا رشتہ و تعلق ختم کر کے اپنا زورِ قلم ہندی

[1] اُردو رسالوں میں سب سے پہلی بحث منشی پریم چند نے رسالہ زمانہ میں شروع کی تھی۔ اسی کا سلسلہ ابھی تک چل رہا ہے۔ (ا۔ ز)

پر صرف کریں۔ غالباً ناظرین نے سمجھ لیا ہو گا کہ ان دونوں صاحبوں کی کیا پوزیشن ہے یعنی ایک صاحب مسلمانوں سے مفاہمت کرنے کے لئے تیار ہیں اور دوسرے صاحب اشتراک عمل کے لئے کسی بہاؤ آمادہ نہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ جناب جگر بریلوی ایک عرصہ سے اُردو ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں اور مسلمانوں کے اِس طرزِ عمل سے مطمئن نہیں ہیں جو ہندو مُصنفین کے ساتھ برتا گیا ہے۔ اُنھیں اندیشہ ہے کہ اگر آیندہ بھی مسلمانوں کا یہی رویہ رہا۔ تو خود انکی خدمات کا جو حشر ہونا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ اِسی لئے وہ اِس بات پر مصر ہیں کہ مسلمان اپنا طرزِ عمل بدلیں۔ ورنہ ہندو اصحاب بددل ہو کر اُردو زبان سے اپنی توجہ ہٹا لیں گے۔ اِس لئے جگر صاحب کی شکایت کو شکایت نہ سمجھنا چاہئے بلکہ یوں کہئے کہ وہ اُردو والوں سے اپیل کر رہے ہیں۔ لیکن میں کہوں گا کہ یہ تو قبل از مرگ واویلا والا مضمون ہو گا۔ جس وقت کوئی شخص اُردو زبان کی تاریخ لکھنے بیٹھے گا اور ایک خاص معیار اپنے پیش نظر رکھے گا تو اُس کا فرض ہو گا کہ وہ جگر صاحب کی خدمات کی بھی صحیح صحیح ناپ تول کرے اور اگر جگر صاحب اس معیار پر پورے اُترتے ہیں تو اُن کا ذکر خیر کرے۔ ورنہ اُس کتاب کو اہل نظر حضرات وقعت کی نگاہ سے نہ دیکھیں گے۔

"حق پرست" صاحب نے حقیقتاً اپنے مضامین میں نہایت ناحق پرستی سے کام لیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اُردو زبان کو مسلمانوں کے لئے اور ہندی کو ہندوؤں کے لئے وہ کیوں مخصوص کرنا چاہتے ہیں؟ اور کیا کبھی ایک زبان کسی خاص قوم یا فرقہ کے لئے مخصوص ہوئی ہے؟ خود ہندی اور سنسکرت کے نشو و نما میں کیا مسلمانوں نے حصہ نہیں لیا؟ یا انگریزی ادب میں جو بلحاظ مذہب اور قومیت کے ہم سے چنداں تعلق نہیں رکھتا۔ ہم نے (ہندو اور مسلمان دونوں نے) اپنی تصانیف یادگار نہیں چھوڑی ہیں۔ پھر اگر "حق پرست" صاحب مسلمانوں سے زبان کے معاملہ میں اشتراکِ عمل کے لئے تیار نہیں، تو میری رائے میں ایڈیٹر صاحب زمانہ کو، ان جیسے حضرات کے مضامین اپنے اِس مباحثہ میں شامل نہ کرنا چاہئے جو واقعی اُنھیں لوگوں کے لئے مخصوص ہے جن کے نزدیک مشترک قومی زبان کی ہندوستان کو ضرورت ہے اور جو صلح صفائی سے دونوں قوموں کو متحد کرنا چاہتے ہیں نہ یہ کہ اُن کی خلیج افتراق کو اور زیادہ وسیع بنا دیں۔

جگر صاحب نے اپنے ایک مضمون میں چند اُردو نظم و نثر کی اُن تاریخوں کا نام لیا ہے جنمیں ہندو مُصنفین کے ساتھ ناروا ظلم کیا گیا ہے۔ اِس ضمن میں اُنھوں نے آبحیات، تاریخ ادب اُردو مُصنفہ رام بابو سکسینہ اور سیر المُصنفین کو بھی شامل کیا ہے۔ آبحیات سے اُن کو شکایت ہے کہ آزاد نے اپنی کتاب میں پنڈت دیا شنکر نسیم کا تذکرہ مناسب طور پر نہیں کیا یعنی جس درجہ کے وہ شاعر تھے اُن کو وہ خصوصیت و امتیاز آزاد نے نہیں دی۔ بات دراصل یہ ہے کہ آزاد نے محض اُن شاعروں کو اپنے تذکرہ میں جگہ دی ہے،

جو اُس کے نزدیک اُستاد گذرے ہیں اور جن کو بجا طور پر درجۂ اول میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ پنڈت دیا شنکر نسیم خواجہ آتش کے شاگرد تھے۔ اُنھوں نے مثنوی گلزارِ نسیم لکھ کر اُردو ادب کی جو خدمت کی ہے۔ فراموش نہیں کی جا سکتی لیکن بحیثیت غزل گو شاعر کے اُن کو اُستادی کا درجہ ہرگز نہیں دیا جا سکتا۔ اسی لئے آزاد نے اُن کے لئے علیحدہ کوئی مضمون اپنی کتاب میں درج نہیں کیا۔ اور محض مثنوی بدرِ منیر کے ساتھ اُن کا تذکرہ کیا ہے۔ پھر یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ آزاد نے دیا شنکر نسیم کے علاوہ ناسخ یا آتش دونوں کے شاگردوں میں سے کسی ایک کو بھی اپنی کتاب میں جگہ نہیں دی۔ حالانکہ وہ سب کے سب مسلمان ہی تھے اس لئے نسیم کے ساتھ آزاد کی زیادتی کا ذکر کرنا حقیقتاً بالکل بیجا ہے۔ آزاد نے جو جگہ اُن کو دی ہے، وہ اُن کے مناسب حال ہے۔ ممکن ہے کہ آزاد نے نسیم کی مثنوی کی کھل کر داد نہ دی ہو۔ لیکن گلِ رعنا میں ایک حد تک اس کمی کو پورا کر دیا گیا ہے اور حکیم عبدالحئی مرحوم نے زیادہ مفصل طور پر نسیم کی مثنوی کے متعلق لکھا ہے۔ آزاد کو حقیقتاً نسیم سے کوئی دشمنی نہیں ہے اور اگر ہے تو صرف اتنی کہ وہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ مگر یہ دشمنی ہندوؤں کے لئے مخصوص نہیں۔ نسیم سے پہلے جو ہندو بزرگ گذرے ہیں، اُنکا تذکرہ بھی آبحیات میں نہیں ہے۔ لیکن آزاد نے جو معیار قائم کیا ہے وہ اتنا بلند ہے کہ اُس پر ہندو کیا بعض مسلمان شعراء بھی پورے نہیں اُترے اور اُس نے ان کا ذکر تک نہیں کیا ہے۔ مثال کے طور پر انعام اللہ خاں یقین کا نام آزاد نے بالکل اُڑا دیا۔ حالانکہ اُن کا کلام اُستادانہ شان لئے ہوئے ہے۔ اسی طرح پہلے ایڈیشن میں حکیم مومن خاں کو بھی درج کتاب نہیں کیا تھا حالانکہ مومن ایسا شاعر ہے کہ اُن کے اُستاد ذوق سے بہت بلند ہے اور غالب کا جس طور پر ذکر کیا ہے وہ اُس کی شان سے بہت گرا ہوا ہے۔ ایسی صورت میں آزاد سے یہ شکایت کرنا کہ اُس نے ہندو شعراء کی خدمات کو تسلیم نہیں کیا قطعاً زیادتی ہے۔ جب کہ قائم جیسے اُستاد کو آج تک آبحیات میں جگہ نہیں ملی۔ شاید اس وجہ سے کہ وہ چاند پور کا رہنے والا تھا اور خاص دلی کا باشندہ نہ تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ ہندو نہیں تھا۔

اسی طرح سیر المصنفین سے جو نثر اُردو کی تاریخ ہے جگر صاحب کو شکایت ہے کہ مولف نے ہندو مصنفین کو نظر انداز کر دیا۔ حالانکہ جلد اول میں بھی چار ہندو مصنفین کا ذکر موجود ہے اور جلد دوم میں سرشار کا جس انداز سے ذکر کیا گیا تھا۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولف سرشار کو شرر سے بہتر سمجھتا ہے پچھلے بیس سال میں اُردو زبان نے جو حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ نظم و نثر کا جو معیار بلند ہو گیا ہے اور شعراء اور مصنفین کی جو کثرت ہو گئی ہے اُس کا تقاضا ہے کہ تاریخ ادب اُردو کا مصنف قوتِ امتیاز سے کام لے اور صرف معیار پر پورے اُترنے والے شاعر و ناشر کا اپنی کتاب میں ذکر کرے۔ اسی وجہ سے سیر المصنفین

میں بھی معیار بہت بلند ہے۔ لیکن جن ہندو بزرگوں کا ذکر کیا گیا ہے اُن کی خدمات کی پوری طرح داد دی گئی ہے بلکہ اِس کتاب میں اگر سچ پوچھئے تو سری للولال کوی کا نام زائد معلوم ہوتا ہے کیونکہ اُنکی خدمات کا زیادہ تر تعلق ہندی نثر سے ہے لیکن مؤلف نے اُن کو اس لئے شامل کتاب کرلیا ہے کہ بہت سی کتابوں میں جو ہندی سے اُردو میں ترجمہ کی گئی تھیں اُنھوں نے امداد دی تھی۔ اگر اس رواداری بلکہ کہنا چاہیئے رعایت پر بھی مسلمانوں پر تعصب کا الزام لگایا جاسکتا ہے تو معلوم نہیں مُنصف مزاجی اور کس شے کا نام ہے ؟

رہی رام بابو سکسینہ صاحب کی کتاب تاریخ اُردو، سو اُس میں بھی بعض ہندو مصنفین اور شعرا کا ذکر ہے۔ اور اگر غلطی سے اُس میں کوئی نام درج ہونے سے رہ گیا ہے تو جگر صاحب کو شکایت نہ کرنی چاہیئے۔ رام بابو صاحب ہندو ہیں۔ اُنھوں نے جس مصنف کو اپنے معیار کے مطابق سمجھا داخل کیا۔ اور جس کو نامناسب سمجھا اس کو چھوڑ دیا۔ اس لئے اُن کے متعلق یہ گمان نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اُنھوں نے ہندو مصنفین کے ساتھ ناروا سلوک کیا ہوگا۔ بلکہ اگر اُنھوں نے کسی مصنف کو داخل نہیں کیا تو اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود اُس کو قابل الذکر نہیں سمجھتے۔

خیر آبحیات تو ایک خاص معیار کو پیشِ نظر رکھکر لکھی گئی تھی اور اُس کے بعد کی بھی بعض کتابیں معیاری کہی جاسکتی ہیں۔ لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا اُن تذکروں میں بھی ہندو شعرا کا ذکر موجود ہے یا نہیں، جو آبحیات سے پہلے لکھی گئی ہیں اور جن کے پیشِ نظر کوئی خاص معیار نہ تھا۔ بلکہ جس شاعر کے حالات مل گئے اُس کو داخل کتاب کردیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے بھی ہندو اصحاب کی شکایت بیجا ہے۔ بقول مولانا عبدالماجد دریابادی شیفتہ کے تذکرہ گلشن بیخار میں کم از کم ۲۷ ہندو شعرا کا حال ملتا ہے۔ اسی طرح میر حسن، میر تقی میر اور مصحفی کے تذکروں میں اکثر ہندو شعرا کا ذکر موجود ہے۔ قدرت اللہ قاسم کے تذکرہ مجموعہ نغز میں تقریباً ستر اسّی ہندو شعرا شامل ہیں۔ غرض یہ کہنا کہ ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں نے زیادتی کی ہے بالکل غلط ہے۔ آزاد سے پہلے جتنے تذکرے لکھے گئے ہیں سب میں ہندوؤں کا ذکر ملتا ہے اور آبحیات یا بعد کی کسی کتاب میں اگر کسی شخص کو نظرانداز کردیا گیا تو وہ معیار پر پورا نہ اترنے کی وجہ سے چھوڑ دیا گیا۔

اب رہا یہ سوال کہ "ہندوؤں کی تہذیب کی اُردو ادب میں نمایندگی نہیں" تو یہ اعتراض بھی درست نہیں۔ انشا اور نظیر اکبرآبادی کو تو خود جگر صاحب مانتے ہیں کہ ان دونوں کے یہاں ایسے اشعار مل جائیں گے جنمیں ہندو تہواروں اور رسموں وغیرہ کا ذکر ہے لیکن خود سودا اور دوسرے پرانے شعرا کے یہاں بھی ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اُنھوں نے ہندوستان کی مقامی خصوصیات کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

مثلاً سودا کے چند شعر درج ذیل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں ؎

ترکش اولیئڈ سینہ عالم کا چھان مارا — مژگاں کے بان نے تو ارجن کو بان مارا

ہے ضعف سے یوں نالہ ترا رونے میں سودا — ساون میں پپیہے کی ہو جوں ٹیر ہوا پر

راون کی نہ تھی سیف کی ہیبت یہ کسی کو — مصرع کی مرے آج جو ہے دھاک زمیں پر

کنھیا سے نہیں کچھ کم صنم میرا وہ ہرجائی

بعض ہندو اصحاب موجودہ دور کے شعراء پر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ اپنے اشعار میں ہندو تہذیب اور ہندوستان کی تاریخی خصوصیات کو نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن یہ بھی اگر غور سے دیکھا جائے تو غلط ہے۔ خود اقبال کی شاعری میں جس کے "حق پرست" صاحب بہت شاکی ہیں۔ ایسی نظمیں مل جائیں گی جنہیں ہندو تہذیب کی کافی نمایندگی ہوتی ہے۔ مثلاً نانک، سوامی رام تیرتھ، رام وغیرہ کی نظمیں یا ساغر کی وہ نظم ؏

سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو

اور گوتم بدھ پر سیاب اکبرآبادی اور ساغر کی نظمیں۔ غرض کہاں تک مثالیں دی جائیں۔ ہر مسلمان شاعر کے یہاں چند نظمیں اور ایسے اشعار ضرور مل سکتے ہیں جو اس بات کا کافی ثبوت ہیں کہ مسلمان ہندوستان میں اگر ہندوؤں سے ایسا خلط ملط ہوا کہ اُس نے اپنے پرائے کی تفریق ہی مٹا دی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اُردو زبان میں فارسی اور عربی کا استعمال دانستہ طور پر زیادہ کیا جا رہا ہے اور ہندی سے نفرت برتی جا رہی ہے لیکن میں ایسے اصحاب سے دریافت کرتا ہوں کہ کیا اُنھوں نے اقبال کی نظموں میں ایسے اشعار نہیں پڑھے ؎

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے — من اپنا پرانا پاپی تھا برسوں میں نمازی بن نہ سکا

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے — گفتار کا غازی تو یہ بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

یا

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے — دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اور ایک اقبال پر کیا منحصر ہے ساغر کی شاعری میں تو ہندی کے بعض ثقیل اور کم استعمال ہونیوالے الفاظ بھی آگئے ہیں۔ جوش بھی ہندی الفاظ لکھنے میں بیباک ہے مگر ان میں اور ساغر میں یہ فرق ہے کہ جوش کے الفاظ ایسے ہلکے پھلکے اور سہل ہوتے ہیں کہ اُنکو ہر ہندو اور مسلمان سمجھ سکتا ہے، اور اُن کا استعمال ہم روزانہ کی گفتگو میں بے جھجک کرتے ہیں، لیکن ساغر اپنی ہندی دانی کا اظہار بھی کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے علاوہ ہندو اور مسلمان دونوں بے تکلف فارسی عربی الفاظ بولتے ہیں اور اگر آپ یہ نہیں مانتے، تو یہ تو آپ کو ماننا ہی پڑے گا کہ مسلمان عربی فارسی کے جو الفاظ برجستگی کے ساتھ بولتے ہیں تو وہ اُنھیں آمدو

سمجھکر بولتے ہیں۔ لہذا یہ الفاظ کیسے بدیسی قرار دئے جاسکتے ہیں اور اگر آپ مسلمانوں کو بدیسی خیال کرتے ہیں تو ہندو بھی بدیسی ہیں کیونکہ یہ بھی وسط ایشیا سے آئے تھے۔ اس ملک کے اصل باشندے گونڈ، بھیل، سنتال وغیرہ ہیں۔ لہذا اُن کی زبان دیسی ہے اور باقی سب زبانیں بدیسی۔ ہندی بھی بدیسی، سنسکرت بھی بدیسی لیکن افسوس ہے کہ یہ بدیسی اشیا سے نفرت کرنے والے خود وہ ہیں جو دیسی زبان یعنی ٹیلی گو اور تامل وغیرہ زبانوں کے خلاف مدراس میں جہاد کر رہے ہیں اور ناحق اُن لوگوں کو جو یہاں کے اصلی باشندے ہیں اُنکی اپنی زبان کے تحفظ پر اُن کو سزائیں دے رہے ہیں۔

"حق پرست" صاحب کا یہ استدلال کسقدر کمزور ہے کہ جیسے ترک اپنی زبان میں سے عربی فارسی الفاظ اور ایرانی اپنی زبان میں سے عربی الفاظ خارج کرنے کی کوشش کر رہے ہے۔ ہم ہندوستانی بھی اردو میں سے عربی فارسی الفاظ کو خارج کر کے اپنی حب الوطنی کا ثبوت دیں۔ بے شک ترکوں نے عربی رسم الخط کو بدل دیا اور ایرانی عربی الفاظ فارسی سے نکال رہے ہیں، لیکن کیا اُن کی زبان اب عربی الفاظ سے اور ترکی زبان عربی فارسی الفاظ سے بالکل پاک ہوگئی ہے؟ میرے نزدیک ان دونوں قوموں نے نادانی سے کام لیا ہے۔ قاعدہ ہے کہ جتنی مرکب زبانیں ہوتی ہیں اُن میں دوسری زبانوں کے الفاظ داخل کئے جاتے ہیں اور اگر دوسری زبانوں کے الفاظ نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ زبان بے نمک ہوکر رہ جاتی ہے اور اُس کی تمام رعنائی و دلکشی یکسر خاک میں مل جاتی ہے۔ اُردو ایک مرکب زبان ہے جسمیں فارسی، عربی، ترکی، ہندی، سنسکرت، انگریزی، برج بھاشا وغیرہ زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔ اور اگر اس میں سے عربی فارسی کے الفاظ نکال دیجئے تو یہ زبان اِسقدر روکھی پھیکی ہوجائیگی کہ کوئی شخص اس کو بھول کر بھی نہ بولے گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہندی کے الفاظ میں شیرینی اور گھلاوٹ ہے لیکن عربی اور فارسی زبانوں کے نمک سے بھی شاید ہی ذی فہم انکار کر سکے۔ جس طرح صرف مٹھاس سے اِنسان کی طبیعت بہت جلد سیر ہو جاتی ہے اور اُس کا جی کسی نمکین چیز کھانے کو چاہتا ہے اسی طرح بغیر عربی فارسی الفاظ کے اُردو زبان ایسی ہے جیسے جسد بے روح۔ دُور کیوں جائیے۔ خود انگریزی زبان کا یہی حال ہے۔ اس میں بہت سے غیر ملکی الفاظ شامل ہیں مثلاً فرانسیسی، لاطینی وغیرہ۔ اب اگر ان غیر ملکی الفاظ کو زبان میں سے خارج کر دیجئے تو انگریزی کی چار سطریں لکھنا دوبھر ہوجائے گا۔ غرض یہ کہ اگر ایرانیوں نے عربی اور ترکوں نے عربی فارسی الفاظ نکال ڈالنے کی کوشش کی (اور پھر بھی وہ سب کے سب نہ نکال سکے تاکہ ان زبانوں کے احسان سے بالکل سبکدوش ہوجاتے) تو کیا ہوا انھوں نے سیکڑوں الفاظ فرانسیسی اور انگریزی سے مستعار لئے۔ گداگری بہرحال یکساں ہے خواہ وہ فارسی عربی

سے کی جائے یا فرانسیسی اور انگریزی سے۔ پھر اُردو میں فارسی عربی کے الفاظ کے استعمال میں ایک خوبی اور ہے، اور وہ یہ کہ فارسی عربی تراکیب سے ایسے بڑے بڑے مضامین، جن کو ادا کرنے کیلئے دس دس سطریں درکار ہیں صرف دو لفظوں میں ادا ہو جاتے ہیں۔ اور اگر ان تراکیب کو زبان سے خارج کر دیجئے تو اختصار جو ایک زبان کی بڑی خوبی ہے، رخصت ہو جائے گا۔

حق پرست، صاحب نے ایک جگہ تحریر فرمایا ہے کہ "جب دو قومیں آپس میں ملتی ہیں تو ایک نئی زبان پیدا ہو جاتی ہے جو دونوں کی مشترکہ ہوتی ہے۔ اس کا میں قائل نہیں۔ گو میں مانتا ہوں کہ اس قسم کے ارتباط کا زبان پر تھوڑا بہت اثر ضرور ہوتا ہے لیکن ایسا انقلابی نہیں کہ ہندی کو اُردو بنا ڈالے۔ پارسی بھی تو فارسی زبان لے کر آئے تھے لیکن اس کے باوجود یہاں اُن کی وجہ سے کوئی نئی زبان وجود میں نہیں آئی"۔ لیکن میں اُن سے دریافت کرتا ہوں کہ پارسیوں کی آخر ایسی کتنی بڑی تعداد تھی جو ہندستان آئی۔ وہ بیچارے اول تو قلیل تعداد میں آئے، پھر صرف بمبئی کے ساحل پر آباد ہو گئے یا کچھ لوگ تجارت کی غرض سے کلکتہ جیسے شہروں میں چلے گئے۔ ایسی صورت میں یہ لوگ اُردو جیسی ہمہ گیر زبان پر کیا اثر ڈال سکتے تھے؟ بے شک اُن کی وجہ سے ہندوستان میں کوئی زبان وجود میں نہیں آئی۔ لیکن خود ایرآن میں تو ایک نئی زبان پیدا ہو گئی۔ مسلمانوں کے ایرآن فتح کرنے سے قبل جو زبان وہاں کی تھی وہ وہی ہے جو ژند اور اوستا کی ہے لیکن اسلامی فتوحات کے بعد تو زبان نے گویا چولا ہی نیا بدل ڈالا۔

میری سمجھ میں یہ بات کبھی نہ آسکی کہ اُردو زبان کو قومی زبان بنانے کے لئے عربی فارسی الفاظ کو تو محض اِس لئے خارج کر دیا جائے کہ وہ بدیسی ہیں۔ مگر سنسکرت سے اِس لئے رشتہ قوی کر لینا چاہیئے کہ وہ خالص ہندوستانی ہے۔ سنسکرت خالص ہندوستان کی زبان سہی، لیکن وہ ایک مردہ زبان ہے اُس کا بولنے والا تو ہندوستان میں ایک بھی نہ ملے گا مگر سمجھنے والے بھی دو چار ہی ملیں گے۔ برعکس اس کے عربی فارسی زندہ زبانیں ہیں۔ اُن کا لٹریچر بہت وسیع ہے۔ عربی زبان عرب، مصر، شام، حجاز، فلسطین وغیرہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور فارسی ایرآن میں بولی جاتی ہے اور ترکی، ہندوستان اور دوسرے ممالک میں سمجھی جاتی ہے۔ پھر زندہ زبانوں کے مقابلہ میں ایک مردہ زبان سے رشتہ جوڑنا کتنا مہمل ہے۔ سچ ہے ایسے مشورہ دینے والوں پر ہی غالب کا یہ مصرع صادق آتا ہے ؏

دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے گا

کوئی شخص باہر سے آئے اور کسی کے یہاں مقیم ہو۔ گھر والوں کی آؤ بھگت، آنکھیں بچھانے سے اگر وہ وہیں رہ پڑے۔ آپس کے میل ملاپ کے بڑھنے سے وہ اور گھر والے مل ملا کے ایک ہو جائیں تو

پھر وہ باہر والا نہیں رہتا۔ گھر ہی کا کہلانے لگتا ہے۔ مگر ہاں جب دن رات یہ کھوج لگانے کی دھن رہتی ہو کہ یہ کہاں کا تھا، یہاں کب آیا اور کب جائے گا، تو پھر اس کے باہر والا ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ بعینہ یہی حال عربی فارسی کا ہے۔ ان دونوں زبانوں کے الفاظ کی اُردو میں اتنی کثرت ہے کہ جسے دیکھئے، بلا سوچے سمجھے بولے چلا جاتا ہے۔ جب یہ صورت ہے تو پھر یہ کہنا کس حد تک مناسب ہے کہ یہ لفظ فارسی کا ہے، یہ عربی کا۔ میں کہتا ہوں کہ اب یہ عربی فارسی کے الفاظ کہاں رہے؟ اب تو اُردو میں یہ ایسے سما گئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جُدا ہی نہیں کیا جا سکتا اور جب دونوں ایک ہو گئے ہیں۔ تو پھر عربی فارسی انھیں آپ کیوں کہتے ہیں؟ انھیں اُردو زبان کا سرمایہ سمجھئے۔ کوشش تو یہ ہونی چاہیئے تھی، کہ پرائے بھی اپنے بنائے جاتے مگر یہاں اپنے بھی پرائے بنائے جا رہے ہیں۔ ع

بریں عقل و دانش بباید گریست

بات دراصل یہ ہے کہ اس قسم کے خیالات رکھنے والے خود تعصب کے جال میں جکڑے ہوئے ہیں۔ حالانکہ کہتے یہی ہیں کہ ہم کو قومی یا نسلی تعصب سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ چاہے زبان سے نہ کہیں لیکن حقیقت میں اُن کی خواہش ہے کہ ہندوستان کی زبان اُردو یا ہندی کے بجائے ٹھیٹ سنسکرت ہو جائے۔ "حق پرست" صاحب کا خیال ہے کہ "مسلمانوں نے کبھی غیر مسلموں کے ساتھ متحدہ قومیت اختیار نہیں کی۔ اُنھوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو علیحدہ اور ممتیز رکھا اور اُن کی سرگرم کوشش یہی رہی کہ غیر مسلموں کو اپنے میں جذب کیا جائے۔" معلوم نہیں اُن کا متحدہ قومیت سے کیا مفہوم ہے؟ اگر اسکے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر ہندو مذہب اختیار نہیں کیا تو واقعی وہ اسکے قصوروار ہیں۔ لیکن اگر اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ رواداری کا ثبوت نہیں دیا۔ تو میں پوچھتا ہوں کہ کیا مسلمانوں نے ہندی اور سنسکرت زبانوں کی سرپرستی نہیں کی؟ اُن کی نشو و نما میں حصہ نہیں لیا؟ کیا وہ ہندوستان میں آکر ایسے خلط ملط نہیں ہو گئے کہ اُنھوں نے ہندو گھرانوں میں شادیاں کرلیں اور کیا اُنھوں نے بعض ایسی ہندو رسومات اختیار نہیں کرلیں جو شرعاً ناجائز ہیں؟

"حق پرست" صاحب کا یہ خیال بھی غلط ہے کہ "مسلمانوں نے ہمیشہ غیر مسلموں کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی۔" مسلمانوں نے ہرگز اس کی کوشش نہیں کی۔ البتہ یہ اعتراف کرنا ضروری ہے کہ خود اسلام کے اندر وہ کشش موجود ہے کہ خود بخود لوگ اُس کی طرف کھنچے چلے آئیں۔ اور وہ ایسا ماحول پیدا کر دیتا ہے کہ دوسری چیزیں خود بخود اس میں جذب ہو جاتی ہیں۔ مگر یہ اسلام ہی کی تنہا خصوصیت نہیں ہے ہر بھلائی اور ہر حُسن میں یہ کشش موجود ہوتی ہے۔

اب یہ سوال کہ ہندوستان کی قومی زبان کیا ہو غور طلب ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اس خیال کے بعد موجودہ زبانوں میں کسی ایک کو اس کام کے لئے پسند نہیں کرتے بلکہ ایک نئی زبان بنانا چاہتے ہیں جس کا نام انھوں نے "ہندستانی" رکھا ہے۔ زبان بنانے سے نہیں بنتی۔ دنیا میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ہے زبان خود بخود بنا کرتی ہے اور رفتہ رفتہ ترقی کرکے مدارج اعلیٰ پر پہونچتی ہے۔ یہ کہنا کہ ہندستانی زبان ایسی ہو، دیسی ہو اور اس کے لئے ایسے ایسے الفاظ ہوں، ہرگز قابل قبول نہیں۔ یہ معاملہ اس طریقہ سے طے نہیں ہو سکتا۔ کیا ضرورت ہے کہ آپ کی رائے کو دوسرے اصحاب بھی مان لیں۔ زبان قدرتی چیز ہے۔ لہذا اس میں آورد اور تصنع سے کام نہیں چلتا۔ طبیعتیں خود بخود اگر کسی طرف مائل ہو جائیں اور رفتہ رفتہ اس طرف ایک جماعت کثیر ہو جائے تو دوسری بات ہے۔ ورنہ میں یہ عرض کرتا ہوں کہ ہمارے یہاں کا بڑے سے بڑا مصنف اگر یہ کہے کہ ہمیشہ اپنی کتاب کے شروع میں جو عبارت مصنف خود لکھے۔ اس کو صرف "دیباچہ" سے تعبیر کرنا چاہیے تو ہندوستان میں شاید ایک شخص بھی اس رائے سے اتفاق نہیں کریگا بلکہ کہے گا کہ کیا وجہ ہے کہ ہم التماس، گذارش مصنف، پیش لفظ، مقدمہ، تمہید، تعارف، تشریحات، کچھ اپنے متعلق، وغیرہ وغیرہ جو جی میں آئے، لکھیں گے۔ ہم کیوں ایک لفظ "دیباچہ" کے پابند ہو جائیں۔ جب ایک معمولی لفظ کے لئے اتنا اختلاف ہو تو یہ کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ وہ "ہندستانی" جو آپ کے دماغ میں موجود ہے اور جس کو آپ تیرے صفحۂ کاغذ پر پھیلا نہیں سکتے اور جوں کی توں دونوں رسم الخط میں نہیں لکھ سکتے۔ تو میں اگر یہ عرض کروں کہ یہ ایک خیال خام کے سوا اور کچھ نہیں تو کیا بیجا ہے؟ ہمارے ملک میں بدقسمتی سے اختلافات کو مٹانے کے بجائے اُن کو اُجاگر کیا جاتا ہے۔ کوئی ضرورت خاص نہ تھی کہ زبان کا مسئلہ اٹھایا جاتا۔ اب تک انگریزی مشترکہ زبان کی حیثیت سے کام دے رہی تھی اور یہ کام اس وقت تک لیا جا سکتا تھا کہ آپ تحریر اور تقریر میں اپنی صاف اور سادہ عبارت سے ہر صوبہ میں اپنے آپ کو قابل فہم بناتے مگر آپ نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا اور ہندو جماعت نے تحکمانہ انداز میں یہ چاہا کہ اب "ہندی اتھوا ہندستانی" زبان ہونی چاہیے۔ "یہ اتھوا" کا لفظ کیا عام لفظ ہے؟ جو لوگ کہتے ہیں کہ صاف اور سادہ زبان ہو کیا وہ اس لفظ کو استعمال کرتے ہوئے محجوب نہیں ہوتے؟ شمالی ہند کا مسلمان کبھی اس لفظ کو نہیں سمجھ سکتا اور جب مسلمان نہیں سمجھتا تو آپ کیسے کہتے ہیں کہ یہ زبان صاف اور سادہ ہے؟ جبکہ ملک کا ایک گروہ کثیر اس زبان کو نہیں سمجھ سکتا۔ میرا یہ خیال ہے کہ اُردو، ہندی، ہندستانی کی بحث بالکل فضول ہے۔ پہلے خدا کے واسطے دل ملائیے۔ پھر زبان ملائیے گا۔ جب تک دل نہیں ملیں گے زبان نہیں ملیگی۔ زبان مختلف ہی رہیگی۔ یہ کوشش بالکل فضول ہے کہ پہلے زبان ایک کیجائے اُس کے بعد دل ملائے جائیں۔ اس کوشش میں دل اور پھٹ جائیں گے اور نہ زبان ایک ہوئی ہے اور نہ ہوگی۔

جذباتِ حمید

(از حضرت حمید عظیم آبادی)

خلش ہے، درد ہے، یا اضطرار ہے، کیا ہے؟ ہمارے پہلو میں دل ہے کہ خار ہے، کیا ہے؟

وفورِ شوق جُدا، دردِ اضطرار جُدا بَلا ہے یا کہ شبِ انتظار ہے، کیا ہے؟

جو گُل ہے چاکِ گریباں، جو سر ہے پُر ز جنوں خزاں کا دَور کہ فصلِ بہار ہے، کیا ہے؟

ہے مِلنا شرط، کہ بسمل بنا دیا دل کو نگاہِ ناز کہ خنجر کی دھار ہے، کیا ہے؟

نشاں نہیں ہے یہ اک آئینہ ہے عبرت کا فنا کا درس کہ لوحِ مزار ہے، کیا ہے؟

اِدھر ہیں چاکِ گریباں، اُدھر سبُو بر کف گلوں کو غم کہ سُرورِ بہار ہے، کیا ہے؟

تڑپتا کیوں نہیں سینے میں اَب دلِ مضطر یہ موت ہے کہ نویدِ قرار ہے، کیا ہے؟

وہ تیرِ ناز بھی چلتا ہے جب، تو میری طرف ہے میرا دل کہ چوٹیلا شکار ہے، کیا ہے؟

مِٹا تو مِٹنے کو لیکن ہوں ہر جگہ موجود محیطِ کُل ہے کہ میرا غبار ہے، کیا ہے؟

ہمیشہ سینے میں اِک آگ سی لگی ہے حمید
شرار ہیں کہ دلِ داغدار ہے، کیا ہے؟

رُباعی

عصمت کے لباس میں گنہگاری ہے تقدیس کی آڑ لے کے خونخواری ہے

شیطان بھی پا سکا نہ یہ رتبۂ خاص اِنسان میں اِک شانِ ریاکاری ہے

(شاہد صدیقی اکبرآبادی)

میرے محبوب

(از طالب اناوی ایف سی کالج لاہور)

زمانے کی ہوا تجھکو محبت جب سکھائے گی — کسی کی بے رُخی جب رات دن تجھکو رلائیگی
کسی کی یاد رہ رہ کر تجھے بھی جب ستائیگی — مرے محبوب مَیں اُس وقت تجھکو یاد آؤنگا

کسی کے عشق میں جب تو بھی رُسوا چارسو ہوگا — ترے دل میں بھی جب جوش و فورِ آرزو ہوگا
بیابانوں میں جب تنہا تو محوِ جستجو ہوگا — مرے محبوب مَیں اُس وقت تجھ کو یاد آؤنگا

وہ باتیں آہ! وہ راتیں تجھے جب یاد آئیں گی — گزشتہ صحبتیں جب خون کے آنسو رلائیں گی
جفائیں جب تجھے رہ رہ کے اپنی یاد آئیں گی — مرے محبوب مَیں اُس وقت تجھ کو یاد آؤں گا

گھٹائیں آسماں کی جب تجھے بیتاب کردیں گی — تری مے نوش آنکھوں کو وہ جب پُر آب کردیں گی
عمیق میں بحرِ حسرت کے تجھے غرقاب کردیں گی — مرے محبوب مَیں اُس وقت تجھ کو یاد آؤں گا

ہجوم ناتوانی سے زباں جب لڑکھڑائے گی — سوارِ دوش ہوکر جب ضعیفی مسکرائے گی
غرورِ حسنِ فانی جب ترے دل سے مٹائے گی — مرے محبوب مَیں اُس وقت تجھکو یاد آؤں گا

دمِ رخصت ندامت جب تری عبرت نشاں ہوگی — حقیقت تلخیٔ دوراں کی جب تجھ پر عیاں ہوگی
طبیعت اپنے جب اعمال پر گریاں کناں ہوگی — مرے محبوب مَیں اُس وقت تجھ کو یاد آؤں گا



تنقید کتب

ریاض رضواںؔ[1] ۴۸۰

کے نام سے حضرت ریاضؔ کا مجموعۂ کلام، قاضی تلمذ حسین صاحب کے اہتمام سے نفیس کتابت اور عمدہ چھپائی کے ساتھ حیدرآباد سے مجلد شائع ہوا ہے۔

حضرت ریاضؔ خیرآبادی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ وہ دورِ آخر کے نامور حسن پرست اور رندمشرب شاعر ہیں۔ ان کے پہلے جراتؔ، انشاؔ اور داغؔ نے عاشقانہ شاعری خصوصاً شوخ نگاری اور چلبلے پن میں کمال دکھایا ہے، لیکن ریاضؔ کے یہاں یہ رنگ بہت چوکھا اور گہرا ہے۔

ریاضؔ نثر نگاری میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کی عبارت حد درجہ شگفتہ، حشو و زوائد سے پاک، طوالت سے مبرا اور اسقدر دلچسپ ہوتی تھی کہ پڑھتے ہی منہ سے بیساختہ "واہ واہ" نکلتا تھا۔ الفاظ اس طرح بٹھاتے تھے گویا موتی یا نگینے جڑتے تھے۔ ان کی چھوٹی سی عبارت بھی جانِ ادب ہوتی تھی۔ ریاضؔ نے گورکھپور سے "ریاض الاخبار" نامی ایک ہفتہ وار اخبار نکالا تھا، جس کی کافی اشاعت تھی۔ انھوں نے جیبی تقطیع کا ایک ننھا سا رسالہ "فتنہ" بھی نکالا۔ جو اپنی قسم کا خاص پرچہ تھا۔

ریاضؔ ایک شگفتہ خاطر، مستغنی المزاج شاعر تھے۔ بڑے بڑے رؤسا اُن کی صحبت اور ملاقات کے شائق رہتے تھے۔ چنانچہ نواب صاحب رامپور نے منشی امیر احمد مینائیؔ کی معرفت کئی مرتبہ رامپور طلب فرمایا۔ اور وہ کئی بار رامپور گئے بھی، لیکن دربار سے منسلک نہ ہوئے اور ہر دفعہ واپس چلے آئے، ہاں مرحوم مہاراجہ صاحب محمود آباد نے بلاتعین خدمت پچاس روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ اُسی سے آخر تک اُن کی بسر اوقات ہوتی رہی۔ چنانچہ ریاضِ رضواں کے اکثر اشعار میں اُس کی طرف اشارہ ہے۔

ریاضؔ کے کلام کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ زبان و سلاستِ بیان کے ساتھ اُن کی فکر بلند اور تخیل نہایت نازک ہے۔ اُن کا بیشتر کلام رندی و سرمستی میں ڈوبا ہوا ہے۔ مثلاً

جہاں ہم خشتِ خم رکھدیں، بنائے کعبہ پڑتی ہے
جہاں ساغر ٹپک دیں، چشمۂ زمزم نکلتا ہے

[1] حجم ۸۰۷ صفحات قیمت چھ روپیے ملنے کا پتہ:- منیجر شاہکار گورکھپور یا دائرۃ الادب چدر گھاٹ حیدرآباد دکن

ایک ہی چلّو کے ہیں کوثر و تسنیم ریاضؔ   خاک اڑتی جو لبِ خشک مرا تر ہوتا

ارے واعظ کہاں کا لامکاں عرشِ بریں کیسا   چڑھی ہوتی جو کچھ تو ہم خدا جانے کہاں ہوتے

شراب پیتے ہی مسجد میں ہم کو گرنا تھا   یہ شغل بیٹھ کے اچھا تھا قبلہ رو کرتے

حرم والو! ریاضؔ آکر حرم میں پڑ رہیں کیونکر   گذر اُن کا کہیں بے جام و مینا ہو نہیں سکتا

پی کر بھی جھلک نور کی مُنھ پر نہیں آتی   ہم رندوں میں جو صاحبِ ایماں نہیں ہوتا

بزمِ محشر گر بنے ساقی کی بزم   میں نہ اٹھوں گا اگر پی کر گرا

غرض اس مجموعے میں ساڑھے تیرہ سو اشعار جام و شراب کے ہیں۔ اسی وجہ سے اکثر لوگوں نے آن کو خیامِ ہند کا خطاب دیا ہے۔ اُن کی تمنا دیکھئے ؎

ٹپکا دے بوند بھر کوئی مُنھ میں ریاضؔ کے   دم میکدہ میں توڑ رہا ہے پڑا ہوا

لوگ کہتے ہیں کہ ہے زاہد مرتاض ریاضؔ   رند کہتے ہیں اُسے چور ہے میخانہ کا

مر گئے، پھر بھی تعلق ہے جو میخانہ سے   میرے حصہ کی چھلک جاتی ہے پیمانہ سے

مگر باوجود اس کے کہ ریاضؔ ہر وقت میخانہ بدوش رہتے تھے لیکن انھوں نے شراب کو مُنھ لگانا تو درکنار کبھی چھوا تک نہیں تھا۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں ؎

ترے آگے سر اُٹھاتا کوئی پارسا نہ ساقی   جو ریاضؔ پارسا بھی کہیں بادہ خوار ہوتا

کچھ کام نہیں مے سے گو عشق ہے اِس شے سے   ہیں رند ریاضؔ ایسے دامن بھی نہ تر دیکھا

ریاضؔ نے شیخ صاحب کی پگڑی بھی خوب خوب اُچھالی ہے۔ مثلاً ؎

کیسے یہ بادہ خوار ہیں سُن سُن کے پی گئے   واعظ کو کچھ مزہ نہ کسی نے چکھا دیا

چُن چُن کے آج شیخ نے انگور کھائے   اب کیا کھنچیگی، تاک کا حاصل نکل گیا

قرض لایا ہے کوئی بھیس بدل کر شاید   مے فروشوں کا ہے زاہد سے تقاضا کیسا

واعظ نہ آپ بزم میں چھلکائیں جامِ خلد   کھلوائیں مُنھ جناب نہ مجھ بادہ خوار کا

خم سے نہ ہو وہ سیر، میں چلّو میں سیر ہوں   یہ ظرف شیخ کا ہے، یہ مجھ خاکسار کا

جنابِ شیخ نے جب پی تو مُنھ بنا کے کہا   مزا بھی تلخ ہے کچھ بو بھی خوشگوار نہیں

حافظؒ نے شراب کے پیالہ میں عکسِ رُخِ یار دیکھا تھا۔ ریاضؔ کہتے ہیں ؎

دُنیا سے الگ ہم نے میخانہ کا در دیکھا   میخانہ کا در دیکھا، اللہ کا گھر دیکھا

ہے میکدہ کا خاص مقامات میں شمار   جو غنچہ ملا مجھے پیرِ مغاں ملا

خمریات کے علاوہ ریاضؔ کے کلام میں تصوف کے اشعار بھی خوب ہیں ؎

نیا جلوہ، نیا پردہ، عیاں بھی اور نہاں بھی — عجب عالم ہے کثرت کا، عجب عالم ہے وحدت کا
مکان دیکھے، مکیں دیکھے، لامکاں دیکھا — کہاں کہاں تجھے ڈھونڈا کہاں کہاں دیکھا
بُت خدا ہوں کہ نہ ہوں، ہے مگر اتنی توقیر — بُتکدہ آج بھی کعبہ ہے مسلمانوں کا
کوئی سمجھے تو کیا سمجھے کوئی جانے تو کیا جانے — وہ عالم آشنا ہے پردہ دار اپنی حقیقت کا

ریاضؔ کے کلام میں بیان کی سلاست، زبان کی شستگی اور محاورات کی برجستگی اور شوخی کا بھی بڑا لطف ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی — تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی
دبی زبان سے میرا بھی ذکر کر دینا — کلیمؑ طور پر اُن سے جو گفتگو آئے
تمہارے کوچہ میں کچھ طور والے بیٹھے ہیں — ذرا تم آکے لبِ بام مسکرا دینا
گل مرقعے ہیں ترے چاک گریبانوں کے — شکل معشوق کی انداز ہیں دیوانوں کے
جاتے تھے سوئے میکدہ نکلے حرم میں ہم — کیا جانے آج راہ میں کیا پھیر ہو گیا

کہیں کہیں کلام میں عریانیت بھی ہے لیکن یہ اِس وقت اور اُن سے پہلے کے زمانہ کی شاعری کے لئے ایک معمولی بات ہے۔

بہرحال ریاضِ رضواں کے آٹھ سو صفحات میں ریاضؔ کا ہر قسم کا کلام یکجا کر دیا گیا ہے۔ مہاراجہ سر کشن پرشاد نے اس کا دیباچہ لکھکر اپنی ادبی دلچسپی اور قدر دانی کا ثبوت دیا ہے۔ نواب اخترؔ مینائی، مولانا سبحان اللہ اور مولانا نیازؔ نے تنقید و تبصرہ کا حق ادا کیا ہے۔ غرض قاضی تلمذ حسین صاحب نے اس مجموعہ کو شائع کر کے اُردو زبان پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ افسوس یہ مجموعہ ریاضؔ کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ حالانکہ آخر میں اُن کی بڑی خواہش یہی تھی کہ اُن کا دیوان خاص اہتمام سے شائع ہو اور ملک اُس کی قدر کرے۔ آیندہ ایڈیشن میں ریاضؔ کی سوانحعمری بھی شامل ہو جائے تو اِس قابلِ قدر مجموعے میں کوئی کسر باقی نہ رہے۔

مرقعِ سخن (جلد دوم)

سلسلہ ادبیات اردو کے نام سے حیدرآباد کے قدر دانانِ اُردو کی کوشش سے اُردو میں بعض اچھی اچھی کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ چنانچہ پچھلے پانچ سال کے اندر اس تحریک کی بدولت قریب ایک درجن کتابیں شائع

حجم ۴۳۱ صفحات۔ قیمت غالباً پانچ روپیہ۔ ملنے کا پتہ:- مکتبۂ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن۔

ہو چکی ہیں۔ پچھلے دنوں مرقع سخن جلد اول شائع ہوئی تھی جس میں قلمروئے آصفیہ کے پچیس شاعروں کے حالات زندگی اور نمونۂ کلام درج تھے۔ اب اس کتاب کی دوسری جلد شائع ہوئی ہے جسمیں پچاس دوسرے شاعروں کے حالات لکھے گئے ہیں اور اُن کے کلام کے نمونے بھی دیئے گئے ہیں۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ پچاس شعراء پر پچاس ہندو مسلم اہل قلم نے مضامین لکھے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر میر مہدی حسین آلم پر امرتیا تشیر سنگھ اور راجہ محبوب راج محبوب پر مہندر راج سنگھ سکسینہ ایم۔ ایس۔ سی نے مضامین لکھے ہیں غرض اس کتاب میں ہندو مسلمان دونوں شعراء کا تذکرہ موجود ہے۔ چنانچہ بالاتر مبک نائک ذرہ، لچھمی نراین شفیق اورنگ آبادی، سدانند جوگی، بہاری لال رمز، گوبسرن بلی متوکل باللہ آزاد اور راجہ محبوب راج محبوب کے حالات اور نمونۂ کلام موجود ہیں۔

اس تذکرہ میں مختلف دَور قائم کئے گئے ہیں۔ آخری دَور میں بعض ہونہار نوجوانوں کے بھی حالات درج کئے گئے ہیں جو کسی دن آسمانِ شاعری پر ستارہ بن کر چمکنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ تذکرہ میں ہز اگزالٹیڈ ہائنس نظام سادس، شہزادہ اعظم جاہ پرنس آف برار اور شہزادہ معظم جاہ شجیع و دیگر نواب زادگان کے حالات مع نمونۂ کلام بھی موجود ہیں اور حضور نظام اور دیگر حضرات کے پچاس فوٹو بھی ہیں۔ جنمیں بعض پرانی قلمی تصویروں کا عکس ہیں، جو تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔

شروع میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی لکھی ہوئی "تقریب" ہے۔ جس میں اس کتاب کے مضامین پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ سب چیزیں قابل پسند ہیں۔ جلد بھی انگریزی وضع کی ہے۔ آخر میں پندرہ صفحات کا ایک انڈکس بھی ہے جو اُن لوگوں کا حال معلوم کرنے میں بہت مدد دیتا ہے جن کا نام کتاب میں آیا ہے۔

نذرِ ولیؔ

یہ کتاب چار تنقیدی مضامین کا ایک دلپذیر مجموعہ ہے۔ جسمیں اُردو شاعری کے باوا آدم ولی دکنی کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کا بہت ہی ماہرانہ ریویو کیا گیا ہے۔ یہ چاروں مضامین جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کی چار گریجویٹ خواتین کے لکھے ہوئے ہیں، جو بی۔ اے پاس کرنے کے بعد اب ایم۔ اے کلاس میں پڑھ رہی ہیں۔ پہلا مضمون "ولی کا تخیل" لطیف النساء بیگم بی۔ اے نے لکھا ہے۔ دوسرا مضمون "کلام ولی اور تصوف" نجم النساء بیگم بی۔ اے کے قلم کا مرہونِ منت ہے۔ تیسرے مضمون "ولی کی معلومات اور خصوصیات شاعری" پر نعیم النساء بیگم بی۔ اے نے روشنی ڈالی ہے۔ چوتھا مضمون "ولی کا فن شاعری" جہاں بانو بیگم بی۔ اے کا

ضخامت ۲۴۸ صفحات۔ قیمت غالباً ڈھائی روپیہ ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

لکھا ہوا ہے۔ مضامین کے مطالعہ سے ولی کے فن شعر، اس کے اسلوب بیان اور انتخاب الفاظ پر بھی نہایت دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہے۔

آجکل ہندوستان خصوصاً پنجاب کے اہل قلم اُردو میں عربی وفارسی کے غیرمانوس الفاظ ٹھونس کر سیدھی سادی زبان کو گرانبار بنارہے ہیں۔ ان حضرات کے لئے حضرت ولی کی زبان کا مطالعہ مفید ہوگا۔ اس کتاب کے تنقیدی مضامین کی زبان بھی کسی قدر دقیق ہے۔ مثلاً "ولی کا تخیل" کے مضمون کی زبان ذرا مشکل ہے۔ چنانچہ مضمون نگار خاتون کو بعض اصطلاحات کا فٹ نوٹ میں انگریزی ترجمہ کرنا پڑا ہے جس سے مضمون سمجھنے میں سہولت ہوگئی ہے۔ اس مضمون میں فاضل نقاد نے ولی کا بعد کے مشہور شعرا سے بھی مقابلہ کرکے دکھایا ہے کہ جو مضمون کسی زمانہ میں ولی نے باندھا تھا وہی دوسرے لفظوں میں بعد کے شاعروں نے نظم کیا۔ مثلاً

ولی	بات کہنے کا کبھی جب وقت پاتا ہے غریب	بھول جاتا ہے وہ سب کچھ دیکھ صورت یار کی
میر	کہتے تھے کہ یوں کہتے، یوں کہتے جو یار آتا	سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا
غالب	آج ہم اپنی پریشانی خاطر اُن سے	کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں
امیر	یہ کہوں گا، یہ کہوں گا، یہ ابھی کہتے ہو	سامنے اُن کے بھی جب حضرت دل یاد رہے
داغ	یاد سب کچھ ہیں مجھے ہجر کے صدمے ظالم	بھول جاتا ہوں مگر دیکھ کے صورت تیری

ہمارے نزدیک حضرت ولی کے متعلق یہ مجموعہ مضامین بہت قابل قدر ہے۔ کیونکہ اس میں تنقید کا کوئی پہلو باقی نہیں رکھا گیا ہے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ سب عمدہ۔

مدراس میں اُردو

مولانا نصیر الدین ہاشمی نے اس سے پہلے ایک کتاب "دکن میں اُردو" کے نام سے لکھی تھی جس کا دوسرا حصہ اب "مدراس میں اُردو" کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ اسمیں فاضل مصنف نے صوبہ مدراس میں زبان اُردو کے رواج، ترقی اور نشوونما پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ صوبہ مدراس میں کرناٹک، اندھرا، تامل ناڈ، ملیبار، میسور وغیرہ علاقے شامل ہیں۔ شروع میں دکن، میسور، کرناٹک وغیرہ کے مختصر تاریخی حالات درج کئے ہیں۔ اور وہ اسباب بتائے ہیں، جن سے اُردو زبان ان ممالک میں رواج پذیر ہوئی۔ پہلے باب میں ۱۱۰۰ھ سے پہلے کے حالات اور اُردو کی حالت بیان کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں ۱۱۰۰ھ تا ۱۲۰۰ھ کے حالات ہیں۔ تیسرے باب میں ۱۳۰۰ھ اور چوتھے میں ۱۳۵۷ھ کے حالات درج کئے ہیں۔ اس طرح

ضخامت ۱۹۷ صفحات، قیمت عہ؍، ملنے کا پتہ:۔ دفتر سب رس رفعت منزل خیریت آباد دکن۔ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

گویا فاضل مضمون نگار نے مختلف دَور قائم کرکے ہر دَور کی لسانی خصوصیات پر فاضلانہ تبصرہ کیا ہے۔
پانچویں باب میں مرثیوں اور چھٹے میں مدراس کے اخبارات اور انجمنوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ساتواں باب سدھوٹ میں اُردو اور آٹھواں باب میسور میں اُردو کے لئے مخصوص ہیں۔ اسی سلسلہ میں تقریباً سواسو مصنفین نظم و نثر کا مختصر تذکرہ تصانیف کی فہرست، کلام کا نمونہ اور مختصر تبصرہ بھی آگیا ہے۔ شمالی ہند کے جو اہلِ قلم مولانا محوی لکھنوی کی طرح مدراس جاکر مقیم ہوگئے ہیں۔ اُن کے مختصر حالات اور نمونہ کلام بھی اس میں درج ہیں۔ بہر حال کتاب بہت کچھ تلاش و تحقیق کے بعد لکھی گئی ہے۔ اس کا وہ حصّہ خصوصیت سے دلچسپ اور پُر از معلومات ہے جو مدراس کے اخباروں سے متعلق ہے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ، اوسط درجہ، کتابت میں کہیں کہیں غلطیاں رہ گئی ہیں۔

مشاعرہ[1]

یہ ایک دلچسپ تمثیلی مشاعرہ ہے جو لائلپور کالج (پنجاب) کے پروفیسر مولوی عبداللہ صاحب کامل ایم اے کی تحریک اور پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی کی تخیل سے وجود میں آیا۔ ڈرامہ کے طور پر ایک بزم مشاعرہ منعقد کی گئی۔ جسمیں مختلف حضرات سودا، میر درد، میر تقی، جرأت، مصحفی، انشا، آتش، نسیم، ناسخ، ذوق، مومن، غالب کا بھیس بناکر اور اُن کی مشہور غزلیں یاد کرکے پڑھنے بیٹھے۔ اور محفل مشاعرہ گرم کی۔ اس مشاعرہ کی دو خصوصیات قابل ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ جن شعرائے کرام کی جو غزلیں چنی گئی ہیں، وہ اُن کے دیوان کا عطر ہیں۔ دوسری یہ ہے کہ شعر پڑھتے اور سُنتے ہوئے مشاعرہ میں جو داد مختلف شاعروں سے منسوب کی گئی ہے وہ بہت قابل تعریف ہے کیونکہ اس سے ہر شاعر کی اُفتادِ طبع، طرزِ بیان اور سخن فہمی پر روشنی پڑتی ہے اس کتاب میں کل منتخب غزلوں کے ایک سو گیارہ شعر ہیں جو مجموعی حیثیت سے اُردو شاعری کے بہترین اشعار ہیں۔ غرض یہ مشاعرہ مرزا فرحت اللہ بیگ کے فرضی مشاعرہ کے بعد اپنی طرز کا دوسرا بے نظیر مشاعرہ ہے جن حضرات کو اُردو شاعری اور ادب سے ذوق ہے، اُن کے لئے اس کتاب کا پڑھنا بہت ضروری ہے۔
لکھائی، چھپائی، کاغذ سب بہت ہی قابل قدر ہے۔ شروع میں مولوی عبداللہ کامل اور علامہ کیفی کے کے فوٹو اور مشاعرہ کے فوٹو بھی دیدیئے گئے ہیں۔ شعرا کی داد دینے یا آپس کی نوک جھونک میں جو بات تلمیح طلب آگئی ہے۔ اس کی تشریح چھوٹی سی کتاب کے ایک خاص باب کردی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ کتاب کتب خانوں اور لائبریریوں میں رکھنے کے قابل۔

---

[1] ضخامت چھوٹی تقطیع کے تقریباً سواسو صفحات۔ قیمت صرف ایک روپیہ (عہ)
ملنے کا پتہ:۔ شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ۔ لاہور۔

مہرشی شیوبرت لال صاحب ورمن

از مسٹر موتی لال مختار ایڈیٹر ست سنگت گورکھپور

فخر قوم مہرشی شیوبرت لال صاحب ورمن ایم۔ اے کی ذات بابرکات سے ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ بخوبی واقف ہے۔ ہندوستان میں عموماً اور پنجاب اور یو۔پی میں خصوصاً شاید ہی کوئی ایسا ضلع ہو جہاں آپ کے لٹریچر کے شایقین موجود نہ ہوں۔

آپ قوم کے کائستھ تھے۔ آپ کا وطن مالوف موضع پورہ قانونگویاں ہے جو راج بنارس میں کوئرھ روڈ اسٹیشن سے ڈھائی میل کے فاصلہ پر جانب مغرب واقع ہے۔ شروع شروع میں آپ چنار اور بریلی آریہ سماج اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ منشی بلدیو پرشاد صاحب بریلوی اور پنڈت کاشتا پرشاد صاحب ترویدی (پنڈت رگھوناتھ پرشاد صاحب ترویدی سابق سول جج گورکھپور کے والد بزرگوار) آپکے ہمعصر تھے آپ نے جس عرقریزی اور جانفشانی سے اس زمانہ میں کام کیا۔ وہ آپ ہی کا حصہ تھا۔ آپکا مزاج آزادی پسند تھا اور قدرت نے آپ کو کسی خاص کام کے لئے مخصوص کیا تھا۔ چنانچہ ملازمت میں رہتے ہوئے بھی آپ نے "دبدبہ قیصری" نامی اخبار بریلی سے نکالا۔ جو تھوڑے ہی دنوں تک مقبول خاص وعام رہا۔ زمانہ کا اجرا بھی جو اب مکرمی منشی دیانراین صاحب نگم کی زیر ایڈیٹری نکل رہا ہے، آپ ہی کا رہین منت ہے۔ فروری لغایت اکتوبر ۱۹۰۳ء یہ آپ ہی کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ بعد میں آپ نے اُسے منشی صاحب کے سپرد کر دیا۔

اس کے بعد جب "آریہ گزٹ" لاہور کی ایڈیٹری کے لئے ایک قابل شخص کی ضرورت محسوس ہوئی تو سماج کے برگزیدہ اصحاب کی نگاہیں آپ ہی پر پڑیں۔ چنانچہ آپ نے جس خوبی وکامیابی کیساتھ "آریہ گزٹ" کی ایڈیٹری کے فرائض انجام دیئے۔ وہ محتاج بیان نہیں۔ شیر پنجاب لالہ لاجپت رائے مرحوم، فدائے قوم مہاتما ہنسراج جی، شہید وطن سوامی شردھانند جی آپ کے سچے مداح اور قدردان تھے۔

قدرت نے آپ کے مزاج میں ایک خاص قسم کی وسیع النظری اور آزاد خیالی ودیعت کر رکھی تھی۔ بندشی زندگی پسند نہ تھی۔ اس لئے آپ نے "آریہ گزٹ" سے بھی کنارہ کشی کی اور اگست ۱۹۰۷ء سے "سادھو" نامی رسالہ لاہور سے نکالنا شروع کیا۔ اس کے مضامین اسقدر دلچسپ اور معرکۃ الآرا ہوتے تھے کہ چندہی

ماہ کے اندر اس کا دائرہ اشاعت نہایت وسیع ہوگیا اور قدر دانوں کی تعداد میں روز افزوں ترقی ہوتی گئی۔ عوام کو بلند خیالی کی جانب مائل کرنا اس کا خاص منشا تھا۔

چند سال بعد آپ کے دل میں یوروپ کی سیر و سیاحت کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ ساُدھو کا کارخانہ محترم منشی سورج نراین صاحب مہر دہلوی کے سپرد کر کے جو آپ کے خاص دوستوں میں تھے، آپ یوروپ تشریف لے گئے اور قریب ڈیڑھ سال تک مختلف ممالک کی سیر و سیاحت میں مصروف رہے۔ اثنائے سفر آپ نے ہندو مذہب کے فلسفہ پر بھی جابجا تقریریں کیں۔ اس سیر و سیاحت کا مفصل حال "یاترا سندیش" نامی کتاب میں درج ہے۔

یوروپ سے واپسی کے بعد آپ نے متعدد رسالے نکالے جن کے نام حسب ذیل ہیں:۔

(۱) سنت سندیش (۲) تتّو ورشی (۳) سرسوتی بھنڈار (۴) لکشمی بھنڈار (۵) مارتنڈ، (۶) پنجابی سورما (۷) دگیانی (۸) سنت (۹) سنت سماگم (۱۰) اودھوت (۱۱) اُپ نشد میگزین، (۱۲) ویدانت میگزین (۱۳) رستارام (۱۴) سمیرو پربت (۱۵) دھولاگر پربت (۱۶) ست سنگت۔

ان رسالوں کے سلسلہ میں آپ نے دو ہزار سے زائد کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ یہ کتابیں ہندو مذہب اور ہندو فلسفہ کے علاوہ بدھ مت۔ جین مت۔ تصوف۔ تواریخ اسلام۔ سکھ مذہب۔ عیسائی دھرم اور دیگر مذاہب پر کافی روشنی ڈالتی ہیں۔ غرض آپ کی تحریر و تقریر ہمیشہ تعصب سے پاک ہوا کرتی تھی۔ "شاہی سیریز" اور "موتی سیریز" کے ناولوں کی مجموعی تعداد چالیس کے قریب ہے۔ ہندوستان کی شجاع اور عالم استریوں کے سلسلہ والی کتابوں کی تعداد ڈیڑھ درجن سے زائد ہے۔ یہ سب کتابیں بہت مقبول ہوئیں۔ چنانچہ اب ہندی اور اُردو دونوں زبانوں میں دستیاب ہوتی ہیں۔

آپ کے زور قلم کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ آپ نے اپنے رسالوں کے لئے کبھی کسی سے مضمون نہیں لیا۔ جو کچھ تحریر فرماتے تھے خود ہی لکھتے تھے۔ غرض مصنف اور مولف کی حیثیت سے آپ اپنی ہی نظیر تھے۔ اسقدر کثیر التعداد کتابوں کی تصنیف اور تالیف کا فخر شاید ہی کسی اہلِ قلم کو نصیب ہوا ہوگا۔

ایک خاص بات اور بھی قابلِ ذکر ہے آپ نے اپنی تحریر کے ذریعہ ایک خاص زبان کی بنیاد ڈالی جسمیں ہندی کی سلیس، عام فہم اور روزمرہ بول چال کے الفاظ بہ کثرت ہوتے تھے۔ لیکن رسم الخط برابر اُردو کا ہی رکھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پنجابی و نیز دیگر اصحاب جو ہندی زبان سے قطعاً ناواقف تھے، اُن میں بھی ہندی زبان کا پرچار ہوگیا۔ یہ وہی زبان ہے جسے آجکل کے مدبر "ہندستانی" زبان کا نام عطا فرما رہے ہیں۔

آپ کی زندگی نہایت سیدھی سادی تھی۔ تقریر کے وقت مُنھ سے پھول جھڑتے تھے۔ مضامین کا سیلاب اُمڈتا ہوا چلا آتا تھا۔ گھنٹوں تقریر فرمانے پر بھی زبان کی سلاست اور مضمون کی روانی میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ جو جس خیال کا آتا تھا۔ اُس سے اسی کے نقطہ نظر سے اصلیت ذہن نشین کرانے کے عادی تھے۔

اس وقت بھی جو رسالہ نکل رہا ہے اُس کا نام "ست سنگت" ہے یہ مہرشی جی مہاراج کے ست سنگ کے بچن کے علاوہ اُن کے دیگر روحانی، اخلاقی، عام فہم اور مقبول عام مضامین سے مالا مال رہتا ہے۔ اس کا مطالعہ گھر بیٹھے اُن کی صحبت اور قُربت کا فیض بخشتا ہے اور اسی خیال سے جاری بھی کیا گیا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں یہ رسالہ میرے سپرد کر کے آپ نے مجھے بھی آزادانہ زندگی بسر کرنے کی ہدایت فرمائی۔

جب میں کرسمس ۱۹۳۸ء کے بھنڈارہ میں ۲۲ دسمبر ۱۹۳۸ء کو آپ کی خدمت میں بمقام رادھا سوامی دھام حاضر ہوا تو آپ نے چند ماہ پہلے سے غذا ترک کر رکھی تھی۔ صرف سیب یا انار کا عرق دن رات میں دو ڈھائی تولہ کے قریب نوش فرما لیا کرتے تھے۔ جسمانی حیثیت سے بہت ہی کمزور ہو گئے تھے۔ مگر پھر بھی روزانہ حسب معمول تین وقت (۴ بجے صبح۔ ۹ بجے دن اور ۷ بجے شام) سنگت کیا کرتے تھے۔ یکم جنوری ۱۹۳۹ء کو آپ نے مجھے گورکھپور جا کر "ست سنگت" کا کاروبار دیکھنے کا حکم دیا۔ چنانچہ مجھے طوعاً و کرہاً قدموں سے جدا ہونا پڑا۔ اور ۲۲ جنوری کو جب پھر حاضر خدمت ہوا۔ تو جسم بہت نحیف و لاغر ہو گیا تھا۔ مگر چہرہ کی آب و تاب میں سرِمو فرق نہ تھا۔ گورکھپور سے آپ کو خاص محبت تھی۔ چنانچہ آپ نے کہا "مجھے بھی گورکھپور لے چلو۔ کچھ روز وہاں رہنا چاہتا ہوں"۔ بہ تعمیل ارشاد انھیں گورکھپور لایا۔ غریب خانہ پر دفتر "ست سنگت" میں قیام فرما ہوئے۔ ٹھاکر نند و سنگھ صاحب حیدر آباد دکن سے ایک ڈاکٹر کو اپنے ہمراہ لائے۔ علاج معالجہ ہوا۔ تکلیف جاتی رہی۔ یہاں زیادہ تر سمادھی اوستھا یعنی بحالت استغراق و محویت میں رہا کرتے تھے۔

۱۶ فروری ۱۹۳۹ء کی رات کو تنہائی میں مجھے یاد فرما کر خاص خاص ہدایات دیں اور فرمایا کہ رسالہ "ست سنگت" بند نہ ہونے پائے۔ تمہارے پاس مضامین کا کافی ذخیرہ ہے جو آٹھ دس سال کیلئے کافی ہوگا۔ یہی "ست سنگت" میری تعلیم کے پرچار کا ذریعہ ہوگا۔ میری سچی ہمدردی تمہارے ساتھ ہے اور غیب سے بھی تم کو برابر مدد ملتی رہیگی۔ میں نے سرِ تسلیم خم کیا۔ مگر اسوقت مجھے کیا خبر تھی کہ یہ آخری ہدایت ہے۔

شیوراتری (۱۷ فروری ۱۹۳۹ء) کو آپ کا جنم دن تھا۔ اسی روز ۷۰ سال پورے ہوئے۔ دوپہر کو آرتی وغیرہ ہوئی شام کو رادھا سوامی دھام تشریف لے گئے۔ وہاں پہونچکر دوا علاج اور خورد و نوش قطعی بند کر دیا اور نہایت ہوش حواس اور خاص اہتمام کے ساتھ ۲۳ فروری ۱۹۳۹ء کو ۸ بجے صبح کے وقت شریر تیاگ کر نج دھام کی راہ لی۔ رادھا سوامی انگریزی اسکول، سنسکرت پاٹھ شالہ اور دھرم شالہ آپ کی یادگاریں ہیں۔

رفتار زمانہ

واقعات عالم پر سرسری نظر[1]

آج اگر ہم واقعات عالم پر ایک سرسری نظر ڈال کر دنیا کا جائزہ لینا چاہیں، تو ہماری نظریں دُنیا کے دو بڑے ملکوں یعنی روس اور امریکہ کی طرف ضرور مبذول ہوں گی۔ کیونکہ جرمنی اور برطانیہ سے تو ہم بخوبی واقف ہیں۔ اور اُن کی بحری، برّی اور فضائی طاقت مخفی نہیں ہے۔ ہٹلر کی آئے دن کی دھمکیاں عوام کے گوش گذار ہو چکی ہیں۔ اور برطانیہ عظمیٰ نے اس بارہ میں جو کمزوری دکھائی وہ بھی طشت از بام ہو چکی ہے۔ مسولینی بھی اپنی بکواس سے دُنیا کو کافی مرعوب کر چکا ہے۔ لیکن روس اور امریکہ کا اقتدار اب تک اقوام عالم پر باقی ہے، اور اس وقت یوروپ کے سیاسیات کی کنجی انھیں دونوں کے ہاتھ میں ہے۔

برطانیہ نے پولینڈ، رومانیہ اور یونان کو جنگ کی حالت میں تائید کی اُمید دلائی ہے۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ جرمنی، اٹلی یا اُن کے تابعین اُن ملکوں پر چڑھائی کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لیکن ہم کو ابھی تک یقینی طور پر یہ معلوم نہیں کہ واقعی جنگ چھڑ جانے پر روس اور امریکہ کا کیا طریق عمل ہوگا۔ کیا تنہا برطانیہ کی امداد، امریکہ اور روس کی متحدہ تائید کیساتھ پولینڈ، یونان، رومانیہ اور ترکی کے لئے کافی ہوگی؟

عملی تائید کے علاوہ امریکہ کی اخلاقی تائید بھی ہمارے لئے ایک بڑی چیز ہے۔ امریکہ کی عملی تائید کا دار و مدار بہت کچھ روس کی دانشمندانہ چال پر مبنی ہوگا۔ کچھ لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ: "روس کی شمولیت اور غیر شمولیت سے امریکہ کو کونسا نفع یا نقصان پہونچ سکتا ہے؟"

آئیے اب ذرا بحر الکاہل پر ایک سرسری نظر ڈالیں۔ امریکہ کے جہازی بیڑے کا بیشتر حصہ بحر اوقیانوس سے بحر الکاہل کی طرف کوچ کر چکا ہے۔ کیونکہ امریکہ یہ نہیں چاہتا کہ روس کے خلاف معاہدہ کرنے والوں کے درمیان جنگ کا فیصلہ ہو جانے سے پہلے ہی جاپان سے اس کی مٹھ بھیڑ ہو جائے۔ جاپان، روس کے خلاف معاہدہ کرنے والوں میں شامل ہے۔ اس معاہدہ کے دوسرے ارکان جرمنی، اٹلی، ہنگری اور ہسپانیہ ہیں۔ جاپان چین کے بیشتر حصہ پر قابض ہو چکا ہے اور امریکہ چین کی آزادی کا حامی ہے۔ اور روس برابر جاپان کے خلاف چین کی تائید کر رہا ہے۔ ایسا وقت بھی آسکتا ہے کہ بحر الکاہل میں امریکہ، جاپان کا سدِ راہ بن کر کھڑا ہو جائے،

---

[1] یہ مضمون دیر میں موصول ہونے کی وجہ سے رفتار زمانہ کے ذیل میں شائع ہو رہا ہے۔ یہ پروفیسر محمد اسحاق صاحب ایم۔ اے کا لکھا ہوا ہے (ا۔ ز)

اگر ایسا ہوا، تو صرف بحری چھیڑ چھاڑ ہی نہ ہوگی بلکہ روس کی فوجیں جو شرق کے دور دراز گوشوں کے علاوہ منچوریا کی سرحد پر بھی پڑی ہیں ضرور حصہ لیں گی۔ اِس لئے اب یہ جان کر کسی کو تعجب نہ ہوگا کہ واشنگٹن اور ماسکو کے درمیان ایک عرصہ سے اخلاص اور یگانگت کا برتاؤ ہو رہا ہے۔ جیسا کہ لندن اور ماسکو کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم ہو رہے ہیں۔

خوش قسمتی سے ایک عرصہ سے لندن اور واشنگٹن کے تعلقات بہت خوشگوار ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اہلِ امریکہ "میونخ کے سمجھوتے" کے بعد برطانیہ سے کچھ کشیدہ خاطر ہو گئے تھے۔ لیکن بعد میں اب پھر حالات معمول پر آگئے۔ روس اور امریکہ کی رائے میں میونخ کا معاہدہ دراصل برطانیہ عظمیٰ اور فرانس کی شکست کے بمنزلہ تھا۔ جہاں مسٹر چیمبرلین اور ڈلاڈیر کو سپر ڈال دینی پڑی۔ روس کے کسی باخبر سیاستدان نے کیا خوب کہا ہے کہ:۔ "اگر ہٹلر کو کبھی ہمارے (روس کے) ساتھ قوت آزمائی کرنا پڑ گئی تو اُس کو معلوم ہو جائے گا کہ ہماری فوجی طاقت اُس سے زیادہ مضبوط ہے"۔

اِنسان زود فراموش ہے۔ شاید بہت سے لوگ اِس بات کو بھول گئے کہ کچھ عرصہ ہوا، امریکہ کے صدر مسٹر روزولٹ نے تیس ۳۰ ریاستوں کی ایک فہرست تیار کی تھی جس میں روس کو بھی شامل کیا تھا۔ اور جنکے مقبوضات کی نسبت ہٹلر اور مسولینی سے یہ وعدہ لینے کی خواہش کی تھی کہ وہ ان ممالک پر نہ چڑھائی کریں، اور نہ انھیں جنگ کا پیغام دیں۔ روزولٹ کا یہ پیام ماسکو، پیرس اور لندن میں گرمجوشی کے ساتھ سُنا گیا۔ روزولٹ کے اِس اعلان نے جنگ سے احتراز کرنے والی قوموں میں ایک جان ڈالدی۔ یہ بھی امر واقعہ ہے کہ پچھلے اٹھارہ سال سے روس جنگ کے خلاف جدوجہد کر رہا ہے۔

اب ہم کو روس کی نسبت کیا خیال کرنا چاہیئے؟ اگر جمہوری سلطنتیں شخصی حکومتوں اور آمریت کی زیادتیوں کے تدارک کے لئے روس کی اعانت گوارا کریں، تو کیا یہ جمہوری حکومتوں کی اس بات کی کوشش نہ ہوگی کہ نازی اور فسطائیت کو خارج کر کے اشتراکیت کی داغ بیل ڈالیں؟ مگر کیا نازیت اور فسطائیت، اشتراکیت سے زیادہ خوفناک ہے؟ کیا روس کی اشتراکیت مغربی تہذیب اور جمہوریت کا ایک ہی وار میں کام تمام نہ کردیگی؟

بادی النظر میں اس پالسی میں ایک سیاسی خامی نظر آتی ہے۔ لیکن اشتراکیت کے ایک مشہور یورپین مخالف کا خیال ہے کہ:۔ "پہلے جمہوری سلطنتوں کو یقین ہو گیا تھا کہ دراصلی تصادم جرمنی، اٹلی اور روس کے درمیان تھا۔ لیکن اب اُن کو معلوم ہو گیا کہ فسطائیت اور قومی اشتراکیت کے اصول روس کی اشتراکیت سے بالکل مشابہ ہیں۔ اصولاً فسطائیت کی آمریت اشتراکیت کے ساتھ دست وگریبان ہے۔ لیکن اس کا اصل مقصد جمہوریت کی بیخ کنی ہے۔ کیونکہ اشتراکیت نے جمہوریت ہی کو اپنا مدِ مقابل اور حریف سمجھا ہے

بعدازاں ہٹلر اور مسولینی کی جنگ خواہ وہ یوروپ کی تسخیر کے لئے ہو یا نوآبادیات کی توسیع کے لئے، ایک اصولی جنگ ہوگی۔ جسمیں قومی اشتراکیت اور آمریت کا جمہوریت کے اصول کے ساتھ تصادم ہوگا۔

اس وقت یوروپ میں بہت سے مدبر ایسے ہیں جن کا خیال ہے کہ اگر کسی طرح فسطائیت اور اشتراکیت کا آپسمیں تصادم ہوکر دونوں کا خاتمہ ہوجائے تو بالآخر جمہوریت کو فتح حاصل ہوگی اور اُسے کوئی نقصان نہ پہونچے گا۔ لیکن جب اُن سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ اگر نازی، فسطائیت اور روسی اشتراکیت آپسمیں اس طرح سازباز کریں کہ روس بالکل الگ تھلگ رہے اور نازیت وفسطائیت ملکر جمہوریت کے پرخچے اُڑادیں تو پھر کیا حالت ہوگی؟ تو یہ حضرات بہت سٹ پٹا جاتے ہیں۔

جرمنی کا ایک تجربہ کار شخص (جو روس سے بخوبی واقف ہے اور اب شہر بدر کردیا گیا ہے) بیان کرتا ہی کہ:- "اگر روس اور جرمنی متفق ہوجائیں، تو پھر ہمارا خدا ہی حافظ ہے"۔

اب سوال یہ ہے کہ روس اور جرمنی متحد کیوں نہیں ہوتے؟ کیا جرمنی نے روس کو اس بات کیلئے مدعو نہیں کیا؟ اس سوال کا جواب ہم کو کہیں دوسری جگہ نظر آئے گا۔ غالباً اب روس کے اصول کار میں تبدیلی ہوچکی ہے۔ اسٹالین نے جو لینن کا جانشین ہے روس کی سیاسی پالسی بالکل بدل دی ہے۔ اُس نے اشتراکیت کو اپنے ملک کے لئے مخصوص کردیا ہے۔ اس سے پہلے لینن اور ٹراٹسکی دُنیا کے ہر حصّہ میں ایک انقلاب پیدا کرکے اشتراکیت کا دور دورہ قائم کرنا چاہتے تھے۔

اس اصولی تبدیلی کے آثار بہت دور دور پہونچ چکے ہیں۔ روس کے لئے کسی ملک میں انقلاب پیدا کرکے سرمایہ داری کو کچل ڈالنا کوئی مشکل بات نہ ہوگی۔ مگر اس ملک کے لئے اشتراکی سلطنت قائم کرنا اور بات ہے۔ بہرحال دوسرے ملکوں کے انقلاب اور خانہ جنگیاں روس کی اشتراکیت کے لئے بہت فائدہ بخش ہونگی۔ لیکن اس وقت روس کو ایک عرصہ تک امن وامان کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنے ذرائع میں مزید ترقی کرسکے۔ اور بیرونی حملہ آوروں سے بچنے کا مسالہ فراہم کرلے اور اپنے قرب وجوار کے ملکوں سے رواداری کی بنیاد قائم کرے۔ غالباً اسٹالین اسی بات کی کوشش کررہا ہے اور اب تک اُس نے جو کچھ کیا ہے اُسی میں اس کی کامیابی کا راز پنہاں ہے۔

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ کبھی کبھی روس امن کی جدوجہد میں اشتراکیت کے دائرے سے خارج ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ سر برنارڈ پیرس نے جو برطانیہ کے ایک جید عالم اور روس کے بہت بڑے مبصر ہیں ایک جگہ لکھا ہے کہ:- "اسٹالین نے روس کو بہت بڑے سیاسی اور اقتصادی سبق سکھائے ہیں، جنکی بدولت اُس نے ایک نئے روس کی بُنیاد قائم کردی ہے۔ اس کی ذات روس کے لئے ایک شجر ثمردار

ثابت ہوئی ہے اور اسکی یہ پالسی چینیوں کے لئے بھی بہت مفید ثابت ہوئی ہے چنانچہ وہ اس کے زیر اثر جاپانیوں کو اپنے ملک کے فتح کرنے سے باز رکھ سکتے ہیں۔

اسٹالین کے زمانہ میں روس میں عام تعلیم ہوچکی ہے۔ پہلے روس میں صرف پچیس ۲۵ فیصدی خواندہ تھے اب وہاں کی پچھتر ۷۵ فیصدی آبادی خواندہ ہے۔ اب روس میں ہر شخص جائداد کا مالک بھی ہوسکتا ہے اور کچھ نہ کچھ پس انداز کرسکتا ہے، اور اپنا اندوختہ دوسرے کو وصیت کرسکتا ہے۔ اُس نے پھر سے سماجی زندگی قائم کردی ہے۔ بچوں کو اپنے والدین کا احترام کرنا سکھایا جاتا ہے (یہ رسم و رواج ہٹلر کے جرمنی کے بالکل خلاف ہے)۔ بہرحال اسٹالین، روس کا قومی پیشوا اور ترقی خواہ ہے۔ اُسے دوسرے ملکوں میں اشتراکی انقلابات برپا کرنے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔

جدید تبدیلیوں کے لئے روس کو امن وسکون کی ضرورت ہے۔ اسٹالین اور لٹوی ناف نے اپنے پرانے ساتھیوں کو خوب اچھی طرح زیر کردیا ہے۔ وہ بخوبی واقف ہے کہ ہٹلر، یوروپ کا واحد مالک بننا چاہتا ہے۔ تاکہ وہ تمام دُنیا کا بادشاہ بن جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جرمنی سب سے پہلے وسطی اور جنوبی مشرقی یوروپ کو اپنے اقتدار میں لانے کا ارادہ رکھتا ہے اور روس کے اُس خطہ کو بھی جو یوروپ میں پڑتا ہے، فتح کرلینے کا خواہشمند ہے۔

اسٹالین نے روس کا نظم ونسق اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد دوسرے ملکوں سے مدافعانہ معاہدے کرنے کا آغاز کردیا ہے۔ ترکی کے مصطفیٰ کمال سے اُس نے دوستانہ معاہدہ کیا۔ اس لئے کوہ قاف کے گرجستانی حصہ اور باکو کے تیل کے چشموں کو بھی جن پر ترکستانی علاقوں سے گذر کر حملے کا امکان تھا بچالیا۔ اُس نے پولینڈ رومانیہ اور پڑوس کے دوسرے علاقوں سے بھی دوستانہ معاہدے کئے۔ روس ہی کی امداد سے رومانیہ کے وزیر خارجہ ٹیٹولسکو نے جزیرہ نما بلقان کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں، مثلاً ترکی، رومانیہ، یوگوسلافیہ اور یونان کی بُنیاد ڈال دی۔ فرانس کے ساتھ بھی اس نے ایک مدافعانہ معاہدہ کرلیا ہے اور بین الاقوامی مجلس میں بھی شامل ہونے کو تیار ہے۔ ان مدافعانہ معاہدوں کی بدولت روس جنگ و جدال کے بغیر اپنے استحکام اور ترقی کی کوشش کررہا ہے۔

آج صلح اور جنگ کا مسئلہ اور لڑائی کی صورت میں جمہوری سلطنتوں کی فتح وشکست کا راز سراسر روس کے ہاتھ میں ہے۔ جب سے جرمنی نے چیکوسلاویکیہ کو برباد کیا اور اٹلی نے البانیہ کو اپنے اقتدار میں لے لیا ہے تب سے جمہوری سلطنتوں میں ایک خلفشار پیدا ہوگیا ہے۔ برطانیہ عظمیٰ اور فرانس یوروپ کے مشرقی یا جنوبی مشرقی حصہ میں ایک ایسی قوت کی بُنیاد ڈالنی چاہتے ہیں جو جرمنی اور اٹلی کا مدافعانہ جواب دے سکیں۔

لیکن یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے۔ جب روس ان کے ساتھ شامل ہو جائے۔ اسوقت پولینڈ اور رومانیہ کو بہت سی دشواریاں حائل ہیں۔ موجودہ حالت میں اگر وہ روس کو اپنا حلیف نہ بنائے۔ تو جرمنی اسے بہت جلد نگل جائے گا۔ روس کی امداد کے بغیر برطانوی معاہدہ اسے جرمنی کے خطرے سے نہیں بچا سکتا۔ اس لئے گمان غالب ہے کہ عنقریب ہی نازیت اور فسطائیت کے خلاف روس اور برطانیہ کے مابین معاہدہ ہو جائے گا۔ ہٹلر کو شکایت ہے کہ امن پسند جرمنی کو جنگجو جمہوری سلطنتوں نے گھیر لیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہٹلر اور مسولینی، امریکن صدر روزولٹ کے اعلان کا کیا جواب دیں گے؟ جو اُس نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔ ہٹلر اپنی پرانی چال چلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو یہ کہنے پر مجبور کرنا چاہتا ہے کہ انھیں جرمنی کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں۔ وہ روس کو بنی آدم کا دشمن قرار دے کر جمہوری سلطنتوں کو بھی اُس سے بچے رہنے کی ترغیب دے رہا ہے مگر وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ جرمنی انفرادی سیاسی آزادی کا علمبردار ہے، جو جمہوری سلطنتوں کی روح رواں ہے۔

(ہندوستان):

نیا تجارتی معاہدہ | پچھلے اٹاوہ (Ottowa) والے معاہدہ کی رو سے ہندوستان کے لئے برطانیہ کی ۱۰۶ قسم کی چیزوں کو ترجیح (Imperial Preference) دینا لازمی تھا۔ لیکن نئے معاہدہ کی رو سے، جو اب لیجسلیٹو اسمبلی کی مخالفت کے باوجود گورنر جنرل نے اپنے اختیارات خصوصی کی رو سے منظور کیا ہے، ان اشیاء کی تعداد میں تخفیف کر کے صرف بیس ۲۰ قسم کے مال پر ترجیح روا رکھی گئی ہے۔ اور ترجیحی نرخ بھی چھبیس ۲۶ سے کم کر کے بیس کر دیا گیا ہے۔ کپڑے کے علاوہ صرف اُن تیار شدہ چیزوں پر ترجیحات روا رکھی گئی ہیں، جنکا ہندوستان کی بنی ہوئی اشیاء سے کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ ترجیحات کے عنوانوں میں کمی کے یہ معنی باہر کے ملکوں کے خلاف چونگی کی پابندیوں میں کمی ہے، جس کا نتیجہ ہندوستان کی بیرونی تجارت کے لئے خوشگوار ہونا چاہیئے۔ مگر اصل قضیہ ہندوستان کی روئی کی فروخت اور برطانیہ کے ساختہ کپڑے کی خریداری ہے۔ لیکن اس کا جو تصفیہ ہوا ہے وہ تسلی بخش نہیں کہا جا سکتا ہے۔ مگر یہ زیادتی ہندوستان کی بے بسی اور محکومیت کی وجہ سے روا رکھی گئی ہے جس کا اندازہ اعداد ذیل سے ہوگا:۔

ہندوستان میں لنکا شائر کے ساختہ پارچہ جات کی درآمد پر ڈیوٹی جون ۳۶ء میں پچیس ۲۵ فیصدی سے گھٹا کر بیس ۲۰ فیصدی کر دی گئی تھی۔ موجودہ معاہدہ میں اور گھٹا کر پندرہ ۱۵ فی صدی کر دی گئی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ اگر ہندوستان میں برطانی کپڑے کی درآمد ۳۵ کروڑ گز سے کم ہوگی تو یہ ڈیوٹی ۲½ فی صدی اور گھٹا دی جائے گی۔ پچھلے سال ۲۶ کروڑ ۶۰ لاکھ گز کپڑا ہندوستان میں درآمد ہوا تھا۔ اس سال کا تخمینہ

بیس کروڑ گز کا ہے۔ چنانچہ اس سال برطانی کپڑے پر صرف ۱۲½ فی صدی ڈیوٹی رہ جائے گی۔

دوسری طرف ہندوستان کی روئی کی خریداری کے معاملہ میں برطانیہ نے کم از کم چار لاکھ گانٹھیں خریدنے کا وعدہ کیا ہے یعنی اگر پہلے سال میں چار لاکھ گانٹھوں سے کم یا پہلے سال کے بعد آیندہ سالوں میں ساڑھے چار لاکھ گانٹھوں سے کم روئی خریدی گئی تو برطانی پارچہ جات پر ہندوستان میں ڈیوٹی بڑھادی جائے گی۔ مگر اس اضافہ کے ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ کیونکہ پچھلے تین سال میں جو روئی ہندوستان سے برطانیہ گئی اُس کا سالانہ اوسط پانچ لاکھ گانٹھ کا ہے۔ اس لئے اس تاوان کا کوئی اندیشہ نہیں۔ ہمارے غیرسرکاری مشیران نے پچھلے ستمبر میں یہ اندازہ لگایا تھا کہ برطانیہ آسانی سے ہندوستان سے روئی کی دس لاکھ گانٹھیں خرید سکتا ہے۔ غیرسرکاری مشیران نے یہ بھی مطالبہ کیا تھا کہ اس مقدار میں کم از کم ۶۵ فی صدی روئی ایسی ہونی چاہیئے جو چھوٹے ریشوں والی ہوتی ہے اور بنگال و برار وغیرہ میں پیدا ہوتی ہے۔ مگر منظور شدہ معاہدہ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ بہرحال عملی حیثیت سے برطانی پارچہ جات کی درآمد پر فقط ۱۲½ فی صدی ڈیوٹی رہ جائے گی۔ جس کی وجہ سے ہندوستان کی پارچہ بافی کے کارخانے مشکل سے برطانی کپڑے کا مقابلہ کرسکیں گے۔ خصوصاً جبکہ ہندوستان میں ممالک غیر سے آنے والی روئی پر ڈیوٹی بڑھادی گئی ہے۔ اور مشینری وغیرہ پر بھی ڈیوٹی میں اضافہ ہوگیا ہے۔ ان باتوں کا نتیجہ یہی ہوگا۔ کہ اہل ملک کے لئے ہندوستانی ملوں کا کپڑا مہنگا پڑے گا۔ اور ملک کے جن حصّوں میں یہ نئی انڈسٹری قائم ہوئی ہے وہاں اُسے سختیاں جھیلنی پڑیں گی۔

بہرحال شہنشاہی ترجیح (Imperial Preference) کی پالسی سے دراصل ہندوستان کو کوئی فائدہ نہ پہونچیگا۔ البتہ برطانیہ کو فائدہ پہونچانے کے لئے ہندوستان کی مرضی کے خلاف حسب دلخواہ معاہدے عائد کردئے جاتے ہیں۔ فی الواقع برطانیہ حُسنِ سلوک کے لحاظ سے ہندوستان سے روئی نہیں خریدتا ہے بلکہ محض اس لئے کہ اُسے یہ روئی سستی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے ماہرین تجارت نے اس معاہدہ کو پسند نہیں کیا ہے۔ اور صاحب گورنر جنرل ہند کا اس کو عام رائے کے خلاف محض اپنے اختیارات خاص سے پاس کردینا کسی طرح مناسب نہیں کہا جاسکتا ہے۔ اُنھیں کم سے کم ملک کے سیاسی لیڈران اور ماہرینِ تجارت کا مشورہ لے کر کارروائی کرنا تھی۔ بہرحال اس قسم کے واقعات انگلستان کی طرف سے عوام ملک میں بددلی ہوجاتی ہے۔ اور لوگوں کو شک ہونے لگتا ہے کہ برطانیہ اس ملک کو واقعی سیاسی آزادی دینے کے لئے کبھی تیار بھی ہوگا یا نہیں؟

نشہ بندی اور نئے ٹیکس | اس وقت مختلف صوبوں کی کانگریسی گورنمنٹوں کے لئے دو بڑے اہم مسائل

پیدا ہوگئے ہیں۔ انمیں سے ایک سرکاری محاصل کا مسئلہ ہے۔ دوسرا فرقہ وارانہ کشمکش کا معاملہ۔ کانگریس نے رفاہ عام کا جو پروگرام مرتب کیا ہے اُس میں قدم قدم پر صرفِ کثیر کی ضرورت ہے۔ جس کا مہیا ہونا ملک کے عام افلاس کی موجودگی میں کوئی آسان کام نہیں ہے۔ خصوصاً جبکہ متوسط طبقہ کی آمدنی کا اوسط اسقدر کم ہے۔ اِس لئے نئے ٹیکسوں کی گنجائش بھی محدود ہے اور کسی گورنمنٹ کے لئے نئے ٹیکس عائد کرکے کوئی معتدبہ رقم حاصل کرنے کا خیال پریشان کن ہے۔ اب رہا اعلیٰ طبقہ۔ اوّل تو اُن کی تعداد نسبتاً بہت کم ہے دوسرے اُن کی جماعت ایسی قابو یافتہ ہے کہ اُس پر کوئی زائد بار ڈالنا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا ہے۔

کانگریسی وزرا نے روزمرہ نظم ونسق کے بڑھے ہوئے مصارف میں حتی المقدور کمی کرنے کی انتہائی کوشش کی ہے چنانچہ اُنھوں نے خود اپنی تنخواہیں بہت کم رکھی ہیں۔ لیکن رفاہ عام کی کتنی ہی مدّوں میں اُنھیں روپیہ خرچ کرنے کی غیر معمولی ضرورت درپیش ہے۔ شلاً نشہ بندی کی اسکیم نافذ کرنے ہی میں، جو کانگریس کے اصلاحی پروگرام کی اہم ترین اسکیم ہے، صوبہ داری گورنمنٹوں کو لاکھوں کروڑوں روپیہ کا فوری خسارہ برداشت کرنا پڑے گا۔ یہ کمی کس طرح پوری کی جائے؟ یہ بڑا اہم سوال ہے جس کے متعلق مختلف سیاسی لیڈروں میں اختلاف رائے ہے۔ اول تو بہت سے اہل الرائے لوگ نشہ بندی کے قائل ہی نہیں، اور امریکہ وغیرہ ممالک میں انسداد شراب نوشی کی جدوجہد کو جو ناکامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اُسے بطور دلیل پیش کرکے ہندوستان میں ترک منشیات کی کوشش کو ایک بیکار سی بات سمجھتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ہندوستان کی گرم آب وہوا میں شراب کا استعمال ہرگز ضروری نہیں ہے۔ لکھوکھا گھروں میں اس سے جو تباہی پھیلتی ہے اُس سے بھی کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ لیکن منشیات کا استعمال کسی نہ کسی حد تک انسانی فطرت کی کمزوری میں ضرور داخل ہوگیا ہے۔ چنانچہ مذہبی ممانعتوں کے باوجود ہر ملک اور ہر زمانہ میں اس کا کچھ نہ کچھ رواج ہمیشہ رہا ہے۔ بہر حال ٹمپرنس کی تحریک پر تو سب کو اتفاق رائے ہے اور یہ کامیاب بھی ہوسکتی ہے۔ لیکن انسانی فطرت کچھ ایسی کمزور واقع ہوئی ہے کہ ایک دفعہ جب کوئی خرابی یا کمزوری داخل ہوجاتی ہے تو اسکا قلع قمع قریب قریب ناممکن ہوجاتا ہے۔ لیکن مشکل یہ آن پڑی ہے کہ مہاتما گاندھی کی زیرِ ہدایت کانگریس نشہ بندی کا تہیہ کرچکی ہے اِس لئے کانگریسی وزراء اُس پر جلد سے جلد عملدرآمد کرنے پر مجبور ہیں۔ جس سے اُن کے لئے طرح طرح کی الجھنیں پیدا ہورہی ہیں۔ صوبہ متحدہ میں پچھلے سال صرف دو ضلعوں میں نشہ بندی کی گئی تھی۔ لیکن اِسسال ایٹہ، مین پوری کے علاوہ چار اور ضلعوں (فرخ آباد۔ جونپور، بداؤں اور بجنور) میں بھی منشیات کی فروخت کا سلسلہ قطعی بند کردیا گیا ہے۔ اس سے گورنمنٹ کی معمولی آمدنی میں نصف کروڑ سالانہ سے زائد خسارہ رہے گا۔ اور گورنمنٹ نے اِس خسارہ کو پورا کرنے کے لئے ملازمت پیشہ لوگوں کی تنخواہوں پر ملازمت ٹیکس

لگانا تجویز کیا ہے۔ اگر یہ ٹیکس صرف اعلیٰ تنخواہ پانے والے سرکاری ملازموں پر لگایا جاتا تو غالباً کسی شخص کو اس سے مخالفت نہ ہوتی۔ لیکن آنریبل مسٹر گوبند بلبھ پنت وزیر اعظم صوبہ نے صنعتی کارخانوں اور نجی کاروبار کے تنخواہ داروں پر بھی یہ ٹیکس نافذ کیا ہے۔ جس سے تمام صوبے میں ایک شور و شر سا برپا ہوگیا ہے۔ اِس ٹیکس کی زد میں بڑے بڑے مالکانِ مل اور اُن کے ایجنٹ جن کو کسی ذریعہ سے بھی کوئی تنخواہ ملتی ہے آگئے ہیں۔ چنانچہ ان حضرات نے اُس کی مخالفت میں شورِ محشر برپا کر رکھا ہے اور بہت سے دیگر معززین بھی اُن لوگوں کے ساتھ ہوگئے ہیں۔ صوبے کے اکثر قابل اصحاب نے اس ٹیکس پر قانونی اعتراضات کئے ہیں اور اُسے ناجائز بتایا ہے اور ذی اثر جماعتوں نے حضور وائسرائے سے اُسے بہ اختیار خود نامنظور کرنے یا اُس کے جواز کے متعلق ججانِ فیڈرل کورٹ سے مشورہ کرنے کی استدعا کی ہے۔ لکھنؤ میں اس ٹیکس کے مخالفین نے ایک جلسہ بھی کیا جسمیں پہلے تو بعض کانگریسمینوں کی مداخلت بیجا سے کچھ بے لطفی ہوگئی۔ لیکن پھر ایک دوسری تاریخ کو یہ جلسہ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو صاحب کے زیر صدارت بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ اسمیں اکثر معززین صوبہ نے گورنمنٹ کی مالی اور نشہ بندی کی پالسی کی سخت نکتہ چینی کی۔ جیسا ہم اُوپر لکھ چکے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بہت سے اہل الرائے اصحاب کا یہ خیال یقین کے درجے کو پہونچا ہوا ہے کہ ترکِ نشیات کی تحریک کبھی کامیاب نہ ہوگی اور موجودہ پالسی سے گورنمنٹ خواہ مخواہ ایک کثیر آمدنی سے محروم ہو جائے گی۔ جس کے پورا کرنے کے لئے دوسرے لوگوں کو خواہ مخواہ زیر بار ہونا پڑے گا۔ عوام اپنے نشہ پانی کا خود ہی انتظام کرلیں گے اور گورنمنٹ اُن کا کوئی تدارک نہ کرسکیگی۔ خیر نتیجہ جو کچھ ہو۔ کانگریسی اسکیم کا یہ نقص ضرور ہے کہ اسمیں پہلا قدم ہی آخری منزل پر رکھ دیا گیا ہے۔ دوسری بات جو معمولی سمجھ میں نہیں آتی ہے یہ ہے کہ ایک طرف تو چھ ضلعوں میں یکلخت قطعی نشہ بندی کا حکم نافذ کردیا گیا ہے مگر دوسری جانب زیادہ تر اضلاع میں سرکاری آمدنی قائم رکھنے کے خیال سے "نیلام" کا مذموم و بدنام کُن طریقہ قائم رکھا گیا ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان اضلاع میں اب بھی اندھیر ہو رہا ہے اور تمام قابلِ اعتراض باتیں ہنوز باقی ہیں۔ مسٹر چنتامنی کے عہد وزارت میں "نیلام" کی پالسی قطعی موقوف ہوگئی تھی لیکن سر جے۔ پی سریواستو کی حکومت میں جب گورنمنٹ کو جا بیجا ہر طریقے سے زیادہ سے زیادہ آمدنی حاصل کرنے کی فکر تھی، یہ شرمناک طریقہ محکمہ آبکاری کے ہر صیغہ میں زور و شور سے رائج ہوگیا اور ٹھیکہ داروں کو خوش رکھنے کے لئے تمام بے ضابطگیوں کی چشم پوشی کی گئی۔ بہرحال موجودہ گورنمنٹ کا اس طریقے کو قائم رکھنا ازحد افسوسناک ہے۔ ٹمپرنس کے لحاظ سے تو یہی مناسب تھا کہ خواہ چھ کے بجائے چار ہی اضلاع میں نشہ بندی کا تجربہ کیا جاتا۔ لیکن "نیلام" کا بیہودہ طریقہ یکلخت ترک کرکے محض کمیشن پر دکانوں کا ٹھیکہ دینے کا انتظام کیا جاتا۔

صوبہ متحدہ کے علاوہ بمبئی گورنمنٹ نے بھی شہر بمبئی میں نشہ بندی جاری کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اسوقت احاطہ بمبئی کے کئی اضلاع میں نشہ بندی کا تجربہ ہو رہا ہے۔ بمبئی میں یہ تجارت زیادہ تر پارسیوں کے ہاتھ میں ہے اس لئے اس طبقہ میں اسوقت سخت بے چینی پھیلی ہوئی ہے اور احاطہ بمبئی کی کانگریسی وزارت بھی اپنی آمدنی پوری کرنے کے لئے نئے نئے ٹیکس عائد کر رہی ہے۔ اعلیٰ طبقے کی پریشانیوں کا خیر کوئی ذکر نہیں۔ مگر متوسط درجے کے لوگ بھی ہر جگہ نئے ٹیکسوں کے خیال سے بہت گھبرا رہے ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ قطعی نشہ بندی کی پالسی کامیاب نہ ہوگی۔ اس لئے عوام ایک ایسے تجربے کے لئے جو اُن کی رائے میں کامیاب نہ ہوگا۔ کسی معتدبہ مالی ایثار کے لئے تیار نہیں ہیں۔ مگر جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کانگریسی وزارتیں اپنے عقائد سے مجبور ہیں۔ بہرحال اس وقت سخت کشمکش کی حالت ہے۔ جس کا آخری نتیجہ دو چار سال بعد ہی ظاہر ہوگا۔

ادھر ایکٹ لگان کی ترمیم کے متعلق کانگریسی وزارت کو زمینداروں اور تعلقہ داروں سے بھی ٹکر لینا پڑی۔ زمیندار صاحبان نے شور وغل تو بہت مچایا اور بڑی بڑی کانفرنسیں کرکے دھواں دھار تقریریں اور بڑے بڑے اصول بیان کئے لیکن عملی حیثیت سے ابھی تک کاشتکاروں کے فلاح و بہبود کے لئے کچھ نہیں کیا۔ اودھ کی تو کیفیت یہ ہے کہ بہت سے حقوق جو آج پچاس سال سے صوبہ بنگال و بہار کے مزارعین کو حاصل ہیں اودھ کے کسانوں کو ابھی تک نصیب نہیں ہوئے۔ مگر اودھ ہی کے تعلقہ داران اس معاملہ میں گورنمنٹ کے سب سے بڑے مخالف ہیں۔ دیگر اضلاع صوبہ کے زمینداران شروع ہی سے اس بارہ میں کانگریس سے سمجھوتہ کرنے کی طرف ہیں۔ بہرحال نیا ایکٹ لگان صوبہ کی قانونی اسمبلی سے پاس ہو کر اب ایوانِ بالا کے زیر غور ہے۔ اس وقت آثار سے تو یہی پایا جاتا ہے کہ اس اہم مسئلہ میں اب سربرآوردہ تعلقہ دار صاحبان معاملہ فہمی سے کام لے کر گورنمنٹ سے مناسب سمجھوتہ کرلیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو خواہ مخواہ کی کشمکش دور ہو جائے گی۔ جس سے تمام صوبے کو نفع ہوگا۔

ہمیں افسوس ہے کہ کاتب کے سہو سے زمانہ مارچ، اپریل اور مئی ۱۹۳۹ء کی اشاعتوں میں مضامین "مرزا دبیر" "سورگ اور نرک" "سنسکرت ناٹکوں کے پلاٹ" بغیر حوالہ درج ہو گئے ہیں۔ یہ آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ سے براڈ کاسٹ ہو چکے ہیں اور ڈائرکٹر صاحب اسٹیشن مذکور کی اجازت سے زمانہ میں درج کئے گئے تھے۔

مراسلات

تنقید پر نظر

از پروفیسر حامد حسن قادری

اپریل ۱۹۳۹ء کے "زمانہ" میں میری جدید تالیف "تاریخ و تنقید ادبیات اُردو" پر اڈیٹر صاحب نے جو ریویو کیا ہے۔ اُس کے بعض فقروں سے ناظرین کو غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے۔ اس لئے یہ سطریں لکھنے کی ضرورت ہوئی۔ ریویو کے الفاظ یہ ہیں:-

"اس کتاب میں "ہمارے مشاعرے" کے عنوان سے مولانا عابد حسن صاحب پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ کا مضمون شامل کیا گیا ہے۔ جسمیں تعلیم و تعلم اور فنِ شاعری کو بہ حیثیت فن سیکھنے کی طرف عام رجحان کم ہونے کی شکایت کی گئی ہے اور چند نمونے پیش کئے گئے ہیں اور حضرت مدہوش، فراق، سحر ہنگامی، جگر بریلوی کے کلام پر کسی خاص طور پر نکتہ چینی کی گئی ہے۔ ہم کو اس کے متعلق صرف یہی کہنا ہے کہ سہو اور خطا بڑے بڑے اُستادوں سے ہوتی رہتی ہے۔ مقالہ نگار کو خامیوں کیساتھ ان حضرات کے کلام کی خوبیاں بھی بیان کردینا تھیں۔ فراق، جگر اور مدہوش اُردو زبان کی جو خدمت کررہے ہیں اُسکو قادری[1] صاحب تسلیم نہ کریں، لیکن آیندہ نسلیں اُنکی شاعرانہ کاوشوں کی داد دینگی۔"

جس مضمون پر اعتراض کیا گیا ہے وہ میرا نہیں ہے۔ لیکن میں نے اس کو اپنی کتاب میں لیا ہے۔ مگر اسکا موضوع کسی شاعر پر بالاستیعاب تنقید و تبصرہ کرنا نہ تھا۔ بلکہ شاعروں کی اصلاح کے سلسلے میں یہ لکھا گیا تھا:-

"عصر حاضر کے مشاعروں کی ایک اور اہم تر خصوصیت اصولِ شعر و غزل سے آزادی و بے راہ روی ہے۔ قدیم زمانہ میں شاعری کی تعلیم حاصل کیجاتی تھی۔ قواعد، لغت، عروض، معانی و بیان و بدیع وغیرہ تمام علوم متعلقہ پڑھتے تھے۔ ہر نظم و غزل اُستاد کو دکھاتے تھے، پھر مشاعروں میں پڑھتے تھے۔"

اس کے بعد قدیم زمانہ کی چند مثالیں بیان کرکے لکھا تھا:-

"آجکل اُستادی و شاگردی اور تعلیم و تعلم کا سلسلہ اِسقدر کم ہوتا جارہا ہے کہ بالکل منقطع ہونیوالا ہے۔ اب بجائے شاعری کے قواعد و اصول سیکھنے سے پہلے شاعری اور اُس کا اعلان، بلکہ اپنے کمال کے دعوے شروع ہوجاتے ہیں۔"

پھر فنِ شعر حاصل نہ کرنے کے نتائج یعنی اقسام اغلاط بیان کئے ہیں اور پھر اُن کی چند مثالیں لکھی ہیں۔ ان مثالوں میں حضرت فراق و جگر کے علاوہ جناب فطرت واسطی وغیرہ کے اشعار اور انکے اغلاط بھی درج کئے گئے ہیں یعنی یہ بات نہیں ہے کہ حضرت سحر ہنگامی و جگر بریلوی وغیرہ کے کلام کی خاص طور پر نکتہ چینی کی گئی ہے جیسا کہ زمانہ کے تنقید نگار صاحب

---

[1] اس جگہ قادری صاحب کا نام غلط لکھا گیا ہے۔ اُن کے بجائے مولانا عابد حسن صاحب کا نام ہونا چاہئے تھا۔ ہم کو افسوس ہے۔ اس ابتدائی غلطی کی وجہ سے محبی قادری صاحب کو بھی صفائی میں یہ مراسلہ لکھنا پڑا۔ ریویو میں محض سخن گسترانہ بات آپڑی تھی۔ قادری صاحب کو اس ریمارک سے جو تکلیف پہونچی۔ اُس کا ہم کو دلی افسوس ہے۔ ا۔ ز

نے خیال فرمایا۔ اِس وقت خود مقالہ نگار صاحب سے معلوم ہوا کہ مثالوں کی جستجو کے وقت رسالہ زمانہ کا ایک پرچہ ہاتھ آیا۔ اُس پر سرسری نظر ڈالنے سے بعض شعراء کے کلام میں غلطیاں نظر آئیں۔ اُن کو درج کر دیا گیا۔ اور یہ خیال کیا گیا کہ جو شاعر مشہور ہیں اور جن کا کلام زمانہ جیسے موقر رسالہ میں شائع ہوتا رہتا ہے وہ زیادہ قابل اعتنا ہیں بمقابلہ عوام الشعراء کے اسی لئے یہ فقرہ بھی لکھا گیا تھا۔

"جس کے یہ معنی ہیں کہ سن رسیدہ و کہنہ مشق شاعر بھی یا تو عیب کو عیب ہی نہیں سمجھتے۔ یا اصلاح حال کی دانستہ کوشش نہیں کرتے۔"

مقالہ نگار یا خاکسار راقم کو (ناقل مقالہ) کو کسی شاعر کی ذات سے بحث نہ تھی، صرف شعر و فن شعر پیش نظر تھا۔ اگر شعراء کے کلام کی خوبیاں بیان کرنے کا موقع ہوتا، دوسروں کی خوبیاں بیان کی جاتیں اور سحر و مدہوش وغیرہ کی خوبیاں نظر انداز کی جاتیں، تو البتہ شکایت کا محل تھا۔ مضمون میں شعرا کی فن شاعری سے بے اعتنائی دکھائی گئی ہے آخر موجودہ زمانہ کے شعرا کا کلام مثال میں پیش کرنا ضرور تھا اس لئے جو اتفاق سے سامنے آیا لکھ دیا گیا۔ ناظرین زمانہ میں سے جن کو میری کتاب "تاریخ و تنقید" دیکھنے کا اتفاق ہوگا وہ خود اندازہ کریں گے کہ مضمون زیر بحث کو ذاتیات سے کوئی تعلق ہے یا نہیں۔ اسی مضمون میں منظور حسین صاحب ماہر کی ایک نظم "بت ناتراشیدہ" پر اعتراض کیا گیا ہے اور اسکو عریاں و مبتذل بتایا گیا ہے اسی سلسلے میں ایڈیٹر صاحب نے میرے متعلق فرمایا ہے کہ "فراق، جگر اور مدہوش اُردو زبان کی جو خدمت کر رہے ہیں اُس کو قادری صاحب تسلیم نہ کریں"۔ یہ فقرہ میرے بہت قدیم، ۳۵ سال پرانے، کرم فرما کا مجھ پر ظلم و ستم ہے۔ یہ بات تنقید کے سلسلے میں نہ لکھی جاتی تو شاید مجھے ثبوت بہم پہونچانے میں دشواری ہوتی۔ تعجب ہے کہ اس کتاب کا تمام مقدمہ پڑھنے کے بعد بھی یہ فقرہ لکھا گیا۔ میں نے مقدمہ کے صفحہ ۱۴ پر یہ فقرہ لکھ کر کہ:۔

"ہندو بزرگوں نے شروع سے اُردو کی ساخت، رواج، ترقی اور سرپرستی میں فراخدلی کے ساتھ حصہ لیا ہے"

ہر صدی کے مشہور ہندو صاحبان شعر و ادب کے نام گنائے ہیں اور اُن کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ بیسویں صدی کے ارباب علم کے نام لکھنے مشکل تھے، اس لئے یہ لکھا ہے:۔

"ان سے کم عمر جو اسی بیسویں صدی میں پیدا ہوئے یا جنکے ادبی مشاغل اس صدی میں شروع ہوئے احاطۂ حساب سے باہر ہیں۔ کوئی میدان شعر و ادب ایسا نہیں جو انکی جولانگاہ نہ ہو۔ فن تاریخ، فلسفہ، معاشیات، ریاضیات، سائنس، ناول، فسانہ، ڈراما، انشا پردازی، نامہ نگاری، اخبار نویسی، شاعری، تذکرہ و تنقید، جملہ علوم و فنون میں اُردو لٹریچر ان ہندو اہل فکر و قلم کا رہین احسان ہے"

اِس سے پہلے اسی مقدمہ میں جہاں اُردو اخبارات کا ذکر کیا ہے۔ وہاں قدیم سے قدیم ہندو ایڈیٹروں اور اخباروں کا نام بنام ذکر کیا ہے۔ اور موجودہ اخبارات تیج، ریاست، پرتاب وغیرہ پر اس سلسلے کو ختم کیا ہے۔

پھر اصل کتاب میں "رفتار اُردو" بیان کر کے یہی نتیجہ نکالا ہے کہ اُردو کی ترقی میں ہندو اصحاب بھی برابر کے شریک ہیں۔ اس کے بعد "جدید شاعری" کا جو مختصر حال لکھا ہے۔ تاریخ نظم و نثر کا جو خاکہ کھینچا ہے۔ وہاں بھی رواں اُناؤی، جگر بریلوی، آنند نراین ملا دہلوی کو شامل کیا ہے۔ آخری "خلاصۂ تاریخ" میں جہاں تھوڑے سے نام لکھنے کی گنجائش تھی۔ وہاں بھی سرور، چکبست، رواں کے نام درج کئے ہیں۔　　حامد حسن قادری

لہ خاکسار راقم ۱۸۹۵ء سے زمانہ کا قدردان ہے۔ غالباً ۱۹۰۵ء یا ۱۹۰۶ء سے میرے مضامین نظم و نثر زمانہ میں شائع ہونے شروع ہوئے تھے۔ بیں اُس زمانہ میں شاید آٹھویں نویں درجہ میں پڑھتا تھا پہلی مرتبہ ۱۹۰۸ء میں میں کانپور آ کر ایڈیٹر صاحب سے ملا۔ کانپور آنے کا مقصد صرف دو صاحبوں سے ملنا تھا۔ منشی رحمت اللہ رعد مرحوم اور منشی دیانراین نگم صاحب۔ پھر ۱۹۱۴ء سے اب تک ۲۲ سال ہیں منشی صاحب سے ایسے تعلقات رہے ہیں کہ وہ میری افتاد طبع اور ذوق شعر و ادب سے اتنے ہی واقف ہیں جتنا میں خود۔ قادری



بندرابن کی برسات

زمانہ

جلد ۷۳ جولائی ۱۹۳۹ء نمبر ۱

اُردو - ہندی یا ہندُستانی

(از مسٹر منوہر لال کپور طالب چکوالی - بی - اے ، ایل ایل - بی ،)

غور و فکر کے عادی ہندوستانی دماغوں کے لئے اِس وقت زبان کا مسئلہ ایک پریشان کن معمہ بنا ہوا ہے - نئی نئی الجھنیں ، نئی نئی اُبجیں اور نئی نئی مشکلات پیدا ہو رہی ہیں - ملک کے بہترین دماغ اس کا حل تلاش کرنے میں مشغول ہیں ، مگر یہ گتھی کچھ ایسی اُلجھی ہوئی ہے کہ اس کا سلجھانا ممکن نہیں تو غیر اغلب ضرور نظر آتا ہے -

اِس مسئلے پر مختلف حضرات نے مختلف نقطۂ نگاہ سے روشنی ڈالی ہے - ریڈیو پر متعدد اصحاب کی تقریریں ہوئیں ، بعض صوبجاتی حکومتوں نے بھی اس کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی ، مہاتما گاندھی نے بھی توجہ کی ، اور " زمانہ " میں اِس اہم ترین مسئلہ پر کئی قابل دید مقالے شائع ہو چکے ہیں - لیکن صاف گوئی معاف کی جائے تو یہ حقیقت ناقابل تردید ہے کہ ابھی ہم اِس مسئلہ کے حل سے اتنے ہی دُور ہیں جتنے کہ پہلے بلکہ شاید اس سے بھی کچھ زیادہ دُور چلے گئے ہیں ، اور اگر اس کے حل کے تلاش کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو کیا عجب ہے کہ ہم " کعبہ " کی بجائے " ترکستان " پہونچ جائیں -

اب تک اِس مسئلہ پر جو کچھ لکھا یا کہا گیا ہے وہ چند غلط مفروضوں پر مبنی ہے - عرصۂ دراز کی غلامی کی بدولت ہماری ذہنیت بھی غلامانہ ہو گئی ہے ، اور آزاد خیالی کیسی مسئلہ پر آزادانہ غور و خوض کی عادت ہم میں باقی نہیں رہی ہے - بعض مفروضے صرف اپنی قدامت کی وجہ سے ہمارے گلے کا ہار بن گئے ہیں

اور بعض مفروضے مقتدر و معروف ہستیوں کے منظورِ نظر ہونے کے باعث ہمارے دل و دماغ پر حکمران ہیں۔ اور آزادانہ طور پر سوچنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اِن غلط مفروضوں کی بنیاد پر جو عمارت کھڑی کی جائیگی وہ یقیناً اعتماد کے قابل نہ ہوگی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ تمام بحث و مباحثے، تقریریں و تحریریں اور مقالے وغیرہ اِن ظالم مفروضوں کو درست مان کر معرضِ وجود میں آرہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام غور و فکر کے باوجود ہم غلط راستہ پر چل کر ایسے چکّر میں پڑ گئے ہیں جس سے نکلنا ممکن نظر نہیں آتا۔ اس مضمون میں ہماری غرض و غایت ایک سہل اور قدرتی حل کے متعلق چند خیالات پیش کرنے کی ہے۔ ناظرین اگر صدیوں کے پُرانے مفروضوں کو نظرانداز کرکے دماغ کو قدرتی طور پر سوچنے کا موقعہ عطا کریں گے تو یقین ہے کہ وہ انھیں نتائج پر پہونچیں گے۔

اِس سلسلے میں سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ کیا تمام ہندوستان یا بھارت ورش کے لئے ایک زبان ہونا ضروری ہے؟ کیا تمام ملک کی ایک زبان ہونا ملکی یک جہتی و اتحاد کا لازمی پیش خیمہ ہے؟ عام طور پر یہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ جب تک تمام ملک کی زبان ایک نہ ہو ملکی اتحاد یا مکمل آزادی نصیب نہ ہوگی۔ یہ خیال ایک مفروضہ کی شکل اختیار کرچکا ہے۔ لیکن شاید ہی کوئی دوسرا خیال اس قدر غلط اور نقصان رساں ثابت ہوا ہو۔ کانگریس نے اسی طرح ہندو مسلم اتحاد کے متعلق بھی غلط طریقہ اختیار کر رکھا ہے۔ "اتحاد کسی قیمت پر" اور کسی خاص جماعت کی ناز برداری سے حاصل نہیں ہوسکتا اور اگر ہو بھی جائے تو ایسا اتحاد دیرپا ثابت نہ ہوگا۔ اس مضمون میں اس موضوع پر بالتفصیل لکھنے کی گنجایش نہیں، لیکن ہندوستان کی سیاسی تاریخ اس بات کا ایک سے زیادہ مرتبہ بیّن ثبوت مہیا کرچکی ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ اس غلط پالیسی کی وجہ سے حقیقی ہندو مسلم اتحاد ایک اُمید موہوم بن کر رہ گیا ہے۔ راقم کا صدق دلی سے عقیدہ ہے کہ اگر اس غلط پالیسی پر عمل نہ کیا جاتا تو حقیقی ہندو مسلم اتحاد بہت نزدیک ہوگیا ہوتا اور یقیناً ہم اس کی بدولت مکمل آزادی کی منزل مقصود کے بہت نزدیک پہونچ گئے ہوتے۔

ہندوستان کو ایک ملک سمجھنا ہی غلطی ہے۔ رقبہ، وسعت اور آبادی وغیرہ کے لحاظ سے یہ چھوٹا سا برّاعظم ہے۔ اتنے بڑے خطۂ زمین کے حصول آزادی کے لئے یہ لازمی قرار نہیں دیا جاسکتا کہ تمام ملک میں ایک ہی زبان استعمال کی جائے۔ مختلف صوبوں میں مختلف زبانیں ہونگی۔ بھلا ۳۰ کروڑ بندگانِ خدا جو ہمالیہ سے راس کماری اور کوئٹہ سے کلکتہ تک خطۂ زمین پر آباد ہیں اور مختلف نسلوں سے ہیں، ایک ہی زبان کیسے بول سکتے ہیں؟ آب و ہوا زبان کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی۔ اِس لئے

یہ نظریہ کہ اڑتیس کروڑ نفوس ایک اور صرف ایک ہی زبان استعمال کریں طلسم خانۂ خیال سے نکل کر کبھی عملی شکل اختیار نہیں کر سکتا۔

اس ملک کے مختلف خطوں میں جنھیں سیاسی حیثیت سے مختلف صوبجات کا نام دیا گیا ہے مختلف زبانیں رائج ہیں اور رہیں گی، ان کا لٹریچر، ساہتیہ اور بولی ٹھولی سب الگ ہوگی، ہاں ایک ایسی زبان کی ضرورت سے جو بین الصوبجاتی زبان کا کام دے سکے انکار نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ خیال کہ کسی خاص صوبہ کی مروجہ زبان اپنی موجودہ شکل میں ایسی مشترکہ ملکی زبان کا کام دے سکتی ہے قرینِ قیاس نہیں۔ یہ خیال صریحًا غلط ہے مگر یہی خیال مختلف مروجہ زبانوں کی باہمی زور آزمائی کا سبب بن گیا ہے۔

چند کوتاہ اندیش و خود بین ادیبوں نے عرصہ سے یہ فضا اس درجہ مکدر کر رکھی ہے کہ اس میں غیر ضروری طور پر وہ گرمی اور وہ کشمکش پیدا ہوگئی ہے جو وطنی اغراض اور ادبی مفاد کے قطعاً خلاف ہے۔ خدا ان حضرات کو عقل سلیم و نگاہِ بے تعصب عطا کرے کہ یہ مسئلہ جو اس وقت ایک ٹیڑھی کھیر ثابت ہو رہا ہے شرمندۂ حل ہو جائے۔

اُردو ہندی کا جھگڑا ایک مدت سے چل رہا ہے، اس پر بھی عجب انداز میں بحث ہو رہی ہے اُردو کی پیدائش سے ابتدا کی جاتی ہے اور اس کے پالنے پوسنے کا سہرا مسلمان حضرات کے سر باندھا جاتا ہے، ہاں دبی زبان میں چند ہندو اہل کمال کا نام بھی لے لیا جاتا ہے تاکہ اُردو کے ہندو پرستاروں کی ہمدردی قائم رہے یا ان کی دلشکنی نہ ہو۔ اُردو کے پرستار اُردو کو تمام ہندوستان کی مسلمہ زبان قرار دینا چاہتے ہیں۔ نظام گورنمنٹ کو تو اُردو کا عشق اس درجہ مسعود کر چکا ہے کہ وہ اپنی کثیر التعداد رعایا کی مادری زبان کو اُردو پر قربان کرنے کی پوری کوشش کر رہی ہے۔

اسی طرح ہندی کے مدّاح چاہتے ہیں کہ ہندی یا برج بھاشا بھارت ورش کی مشترکہ زبان تصور کی جائے۔

جب سے یہ کشمکش شروع ہوئی ہے مسلمان حضرات جو عموماً اُردو کے پرستار ہیں، اردو کو عربی فارسی کے غیر مانوس الفاظ و ثقیل تراکیب سے گرانبار کر رہے ہیں۔ اِس سلسلے میں ڈاکٹر سر اقبال مرحوم کی اُردو کو مفرّس و معرّب کرنے کی کوشش سب سے زیادہ کامیاب ثابت ہوئی ہے اور گو وہ اُردو شاعری کے نئے دَور کے پیغمبر ہیں لیکن زبان کے اعتبار سے اُنھوں نے اُردو کے ساتھ بہت بڑی

زیادتی کی ہے جس نے اس کے مشترکہ ملکی زبان ثابت ہونے کی راہ میں سخت رکاوٹ ڈال دی ہے۔ ان کے کلام میں جوش، پیغام عمل، تخیل، بلند پروازی، ندرت، فلسفہ سب کچھ ہے مگر انھوں نے اُردو کی سلاست کو فارسی عربی الفاظ کے بے جا استعمال سے بُری طرح گھائل کر دیا ہے، اور اُن کے نا عاقبت اندیش معتقدین نے اپنی اندھا دھند تقلید سے اردو ہندی اختلاف کی خلیج کو وسیع تر بنا دیا ہے۔ اِدھر ہندی والے بھی سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ زیادہ سے زیادہ تعداد میں استعمال کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ مگر دونوں فریق یہ نہیں سمجھتے کہ اُن کی کوششیں اُن کی زبان کو ملکی زبان بننے کے نا اہل بنا رہی ہیں۔

اُردو اور ہندی کے علاوہ دوسرے صوبوں کی زبانیں بھی خم ٹھونک کر میدان میں آرہی ہیں۔ جنوبی ہندوستان کی زبانیں شمالی ہند کی زبانوں (اُردو اور ہندی) کے اس دعویٰ ہمہ گیری کے سخت خلاف ہیں، اور مدراس وغیرہ میں تو اس کے خلاف سخت ایجی ٹیشن جاری ہوگیا ہے۔

بہر حال یہ خیال کہ کسی بحث کے ذریعہ یا کسی کانفرنس کی قرارداد کے زور پر کسی خاص زبان کو ملک بھر کی مسلمہ زبان بننے کا امتیاز حاصل ہو سکتا ہے سراسر بے بنیاد اور محض لغو ہے۔

اِس میں کلام نہیں کہ جوں جوں بین الصوبجاتی کاروباری اور معاشرتی تعلقات بڑھتے جائیں گے (جیسے کہ آجکل بڑھ رہے ہیں) اور جوں جوں ذرائع آمد و رفت، سفر و قیام، سیر و سیاحت ترقی پذیر ہونگے، لوگوں کو ایک دوسرے کا مافی الضمیر سمجھنے کے لئے زیادہ سے زیادہ ایسے الفاظ کی ضرورت اور تلاش ہوگی جو مختلف صوبوں کے لوگ سمجھ سکیں۔ اور یہی مشترکہ زبان کی بنیاد ہوگی، اور خواہ ہم مانیں یا نہ مانیں اس زبان کی بنیاد پڑ چکی ہے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ ہماری مشترکہ زبان کی عمارت اِسی بنیاد سے اُٹھے گی۔ بالکل اسی طرح جیسے مغلوں اور اہل ہند کے باہمی تعلقات اور اختلاط سے اُردو کی پیدایش ہوئی ہے۔ ہندوستان کی مشترکہ زبان بھی مختلف صوبوں کے لوگوں کے باہمی تعلقات اور مِیل جول سے بن رہی ہے، اس کا نام آپ جو چاہیں رکھیں یہ زبان عوام کی زبان ہوگی جس سے اس وسیع ملک کی بڑی بھاری اکثریت اپنا کام چلائے گی۔

بعض حضرات یہ سوچتے رہتے ہیں کہ اس نئی زبان کا پیوند اُردو۔ عربی۔ فارسی سے لگانا چاہیئے یا ہندی، سنسکرت وغیرہ سے، مگر کیا یہ ان حضرات کے بس کی بات ہے؟ کیا زبان کے بارے میں کوئی صاحب ہٹلرانہ اختیارات استعمال کرنے کے مجاز ہیں؟

موجودہ زمانہ میں تمام دنیا کی زبانیں آسان سہل اور صاف ہو رہی ہیں۔ انگریزی میں
یہ تحریک امریکہ کے علمی مفکروں کی دُور اندیشی نے عرصہ سے جاری کر رکھی ہے۔ الفاظ کا تلفظ
۔ املا بھی سہل ہو رہا ہے، اور زبان بھی سادہ، سلیس اور مختصر ہو رہی ہے۔ شاید اب وہ زمانہ آرہا
، کہ جو زبان بولی جائے گی وہی لکھی جائیگی اور وہی ادبی زبان سمجھی جائیگی۔ ممکن ہے کہ ہمارے
ن مستند ادیبوں کو یہ بات ناگوار ہو، لیکن یہ بات ہو کر رہیگی اور انھیں آنے والے حالات
ے مطابق ہونا پڑے گا۔

افسوس ہمارے ملک کے ادیب عہدِ ماضی کے دھندلے چراغ کی روشنی میں رہنے، پرانی
ر کے فقیر بننے اور فرسودہ طرز پر سوچنے کے ایسے عادی ہو چکے ہیں کہ آجکل وہ محض غلط مفروضوں
بنا پر نئی نئی اُلجھنیں پیدا کر رہے ہیں، ورنہ کون نہیں جانتا کہ اب عام بول چال میں عربی،
رسی کے حلق شگاف الفاظ کی گنجائش نہیں، اور نہ سنسکرت کے غیر مانوس مردہ الفاظ کی ضرورت
ہے۔ زبان دن بدن بلکہ لحظہ بلحظہ آسان ہوتی جاتی ہے۔ صوبجات کے باہمی اختلاط سے خود بخود
یک مشترکہ زبان پیدا ہو رہی ہے، جو آئندہ ہماری مُلکی زبان ہوگی۔

ادب، ساہتیہ، کلچر کہنے کے لئے خوب چیزیں ہیں، مگر ان کا مفہوم اس علمی دنیا میں جس کو
ہم "مادہ پرستی کا دَور" کہہ سکتے ہیں اور سے اور ہوا جا رہا ہے۔ یہ محض ہماری خود غرضیاں ہیں جو
ہم کو صحیح غور و خوض سے باز رکھتی ہیں۔ جن لوگوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ اُردو کی خدمت میں
گزارا ہے یا جن کے بزرگوں نے تمام عمر اُردو کی محنت اور عرقریزی سے خدمت کی ہے وہ قدرتاً
فقدان دیکھکر بھی جو زیادہ تر مذہبی تعصبات کی بنا پر ہے اس راستہ سے باز رہنے کا خیال
ل میں نہیں لاتے ہیں۔ اُردو شاہی زبان تھی، حکومت کے رعب و اقتدار یا روزی کی ضروریات
سے مجبور ہو کر ہندوؤں نے اُردو کو اپنایا اور اس میں کمالات دکھائے، لیکن تاریخ اُردو لکھنے
والوں نے اُن سے بے مثال ادبی بے انصافی کی اور شاید وہ اسی سلوک کے مستحق تھے
لیکن اسلامی حکومت کے زوال کے بعد ہندوؤں کا اُردو پر دم بھرنا اُن کی روایتی سادہ لوحی
یا فریبِ نظر کا کرشمہ ہے۔ جس طرح انگریزی میں دادِ کمال دینا انگریزی زبان کو ہندوستانیوں
کی زبان نہیں بنا سکتا، اُسی طرح اُردو بھی ہندوؤں کی زبان نہ بن سکی یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے
کہ بعض حضرات انگریزی کو ہندوستان کی مشترکہ زبان بنانے پر مستعد نظر آتے ہیں مگر یہ خیال
بھی ناممکن العمل ہے۔ انگریزی جیسی مشکل زبان صرف اسی وجہ سے ہماری ملکی زبان نہیں بن سکتی

کہ ہماری زبانیں آپس میں لڑ جھگڑ رہی ہیں، تا حال ہم کسی متفقہ فیصلہ پر نہیں پہونچ سکے ہیں واقعی انگریزوں کے چلے جانے کے بعد انگریزی کی حیثیت اُردو سے بھی بدتر ہو جائے گی اس لیئے اس غیر ملکی زبان کا ہندوستانی عوام کی مشترکہ زبان بننے کا خیال سراسر خام ہے۔

دراصل جب تک مذہب کو سیاسیات سے علاحدہ نہیں کر دیا جاتا، ہندوستانی سیاسی حیثیت سے طفلِ مکتب ہی رہیں گے اور اُن کے خیال میں پختگی اور عمل میں استواری آنا ناممکن ہے۔ بہر حال مذہبی جنون مسئلہ زبان کو پیچیدہ سے پیچیدہ تر بنا رہا ہے ورنہ ہر اہل نظر دیکھ سکتا ہے کہ مستقبل کی مشترکہ ملکی زبان جو تمام ہندوستان میں بولی اور سمجھی جائیگی پیدا ہو چکی ہے اور عملی زندگی کے گہوارے میں پرورش پا رہی ہے۔ اس کا نام چاہے "ہندستانی" رکھا جائے یا اُسے کسی اور نام سے یاد کیا جائے، درحقیقت نام میں کیا دھرا ہے؟ اگر جاپان کی مشترکہ زبان "جاپانی" چین کی "چینی" امریکہ کی "امریکن" کہلاتی ہے تو ہند کی مشترکہ زبان کو "ہندی" کہنے میں کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیئے۔ اگر برج بھاشا یا کھڑی بولی کو بعض حضرات "ہندی" کہہ دیتے ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اہل ہند کی زبان کو "ہندی" نہ کہا جائے۔ بہر حال نام کا اتنا اختلاف نہیں ہوگا جتنا طرزِ تحریر کا۔ تحریر میں اُردو حروفِ تہجی آ ب پ استعمال ہوں یا برج بھاشا کے کا۔ کھا۔ گا (क-ख-ग-) یا انگریزی کے اے۔ بی۔ سی (A.B.C) اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ برج بھاشا کے حروف تہجی سہل ترین اور مکمل ترین ہیں، ٹائپ اور پریس کی سہولتیں انگریزی جتنی میسر ہیں، لیتھو کی محتاج نہیں۔ ہمیں اس پر طویل بحث مطلوب نہیں کیونکہ دنیا بھر کے محققین ان نتائج پر پہونچ چکے ہیں، اور اگر اہل ہند بھی بے تعصب ہو کر ان نتائج کو جو حقیقت پر مبنی ہیں بلا تامل قبول کر لیں تو یہ مسئلہ فوراً حل ہو سکتا ہے، ورنہ رفتہ رفتہ جلد یا دیر میں ملک کی فضا تعصب کے گرد و غبار سے صاف ہو جائیگی تو ہندوستان کی مشترکہ ملکی زبان کے لئے یہی حروفِ تہجی استعمال ہونگے۔

جذباتِ حیات

(از عمر حیات صاحب حیات ایچ۔ پی (آنرز))

دوا کے کام نکلیں کیا دُعا سے — دوا دے رہبرِ کامل دوا دے
مرا سب نیک و بد ہے تجھ پہ روشن — ہنسا دے یا مجھے رونا سکھا دے
کسے ہے، ایک حالت پر قناعت — مری قسمت بڑھا دے یا گھٹا دے
نہ ہو سرسبز گر نخلِ تمنا — مٹا دے پھر مری ہستی مٹا دے

مثنوی کا پُرانا اور نیا انداز

از حضرت احسن مارہروی

اُردو کی شاعرانہ تصانیف میں سب سے پہلے مثنوی کا مکمل نمونہ ملتا ہے، جس کے آغاز کا پتہ نویں صدی ہجری کے آخر اور دسویں صدی ہجری کے اول سے گجرات اور دکن میں چلتا ہے۔ ہر زبان اپنے ابتدائی زمانہ میں سہل اور عام فہم بول چال سے شروع ہوتی ہے۔ کوئی ایچ پیچ اور اُلجھی ہوئی ترکیبیں نہیں ہوتیں۔ جس انداز اور جس ترکیب سے عوام بولتے ہیں اُسی طرح شعرا اپنے کلام کو موزوں کر دیتے ہیں۔ اُردو زبان کی ابتدا گجرات یا دکن سے ہوئی، جہاں مرہٹی، تلنگی اور ٹامل وغیرہ زبانیں رائج تھیں۔ اُس زمانہ کے جو نمونے ملتے ہیں، وہ آجکل کے لئے بالکل اجنبی ہیں۔

نمونوں کی تفصیل سے پہلے ضرورت ہے کہ مختصراً مثنویوں کے معیاری انداز کو سمجھ لیا جائے۔

کسی مثنوی کی خوبی کا اندازہ کرنا ہو تو یہ دیکھنا چاہئے کہ امورِ ذیل کا کہاں تک خیال رکھا گیا ہے اور شاعر کو اُن سے عہدہ برآ ہونے میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے۔

سب سے مقدم شرط یہ ہے کہ جس داستان کے مُرقع کو دیکھنا ہے۔ اُس میں کہاں تک حسنِ ترتیب پایا جاتا ہے۔ شاعر کو کسی تاریخی واقعے میں جو مسالا ہاتھ آتا ہے وہ چند اجمالی، خام اور غیر مرتب واقعات ہوتے ہیں۔ اب دیکھنا چاہئے کہ اُس نے اس کا خاکہ کیونکر قائم کیا، اور واقعات میں کس طرح ترتیب پیدا کی کس واقعے سے آغاز کیا، جن ضمنی واقعات سے گذرتا ہوا اصل واقعے تک پہونچا اُن میں کس قسم کی ترتیب اور کتنی مناسبت ہے، کس طرح اُن کی کڑیاں ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ کن کن واقعات پر زور دیا ہے، کن کو اُبھارا ہے، کن کو دُھندلا رکھا ہے، موقع بہ موقع تخیل سے کس طرح کام لیا ہے، اخلاقی نتائج پیدا کرنے کے لئے جو فرضی باتیں پیدا کرلی ہیں، اُن میں کس طرح تناسب پیدا کیا ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ قصداً ایسا نہیں کیا بلکہ بات میں بات پیدا ہو گئی ہے، جذبات سے اپنے اپنے محل پر کیا کیا اثر ڈالا ہے، اگر ان تمام مرحلوں سے شاعر عہدہ برآ ہو، تو وہ حسنِ ترتیب میں کامیاب سمجھا جائے گا۔

مثنوی میں سیکڑوں اشخاص کا تذکرہ ہوتا ہے۔ مرد، عورت، بچے، جوان، بوڑھے، نوکر، آقا، امیر،

غریب، سوداگر، عالم، جاہل وغیرہ وغیرہ اشخاص کے اخلاق، خُوبو، طرز، انداز، مزاج، طبیعت، گفتگو، بول چال مختلف ہوتی ہے۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ جس شخص کا بیان کرے اُس کی تمام امتیازی خصوصیتیں قائم رکھے۔ بچے کا بیان اس طرح کرنا چاہئے کہ اس کی بات بات میں بچپن کی ادائیں پائی جائیں۔ نوکر کا واقعہ لکھا جائے تو اس کے اخلاق وعادات، بول چال، طرز و انداز سے نوکری اور محکومی کی بُو آتی ہو۔ ایک شریف کا بیان ہو تو سخت سے سخت حوادث میں مبتلا ہونے پر بھی اُس کی شرافت کے جوہر نظر آئیں۔ غرض کہ ہر شخص کا کیرکٹر اسی طرح بیان کیا جائے جو اُس کے حالات سے مطابقت رکھتا ہو۔

مثنوی کے لئے واقعہ نگاری بھی ایک بڑا وصف ہے، جس کا کمال یہ ہے کہ جس چیز کا بیان کیا جائے اُس طرح کیا جائے، جس طرح ایک ماہرِ فن کرتا ہے یعنی اس کی تمام اصلی خصوصیتیں بیان کی جائیں۔ اکثر شعراء جب دو پہلوانوں کی لڑائی باندھتے ہیں تو زمین اور آسمان کو ملا دیتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں بیان کرتے کہ دونوں کس طرح بڑھے، کیونکر وار کیا اور کیا کیا داؤں پیچ کئے۔ تلوار کے کیا کیا ہاتھ نکالے، نیزے کے بند کیونکر باندھے، کمان کیونکر چڑھائی، تیر کس طرح جوڑا، ڈھال کیونکر سر پر لی وغیرہ وغیرہ۔ شاعر جب کسی بات کو واقع کی حیثیت سے لکھے تو اگرچہ وہ فرضی ہو، لیکن اُس کا فرض ہے کہ بیان میں کوئی ایسی بات نہ آئے جس سے واقعہ ناممکن یا مشکوک ہو جائے۔ یہ نقص مختلف اسباب سے پیدا ہوتا ہے۔ کبھی تو جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے حقیقتاً ناممکن ہوتا ہے۔ مثلاً یہ واقعہ کہ جب رستم چلتا تھا تو گھٹنوں تک زمین میں دھنس جاتا تھا۔ کسی خاص موقعہ پر ایسا ہونا ناممکن نہ ہو، لیکن قوت کی زیادتی اور زور کی وجہ سے ناممکن معلوم ہوتا ہے، یا مثلاً یہ واقعہ کہ کیکاؤس نے عقابوں کے ذریعے آسمان پر چڑھنا چاہا۔ کیکاؤس کے جو حالات اور واقعات مذکور ہیں، اُن سے وہ اِس قدر احمق ثابت نہیں ہوتا کہ ایسی بیہودہ کوشش کا ارادہ کرتا۔ غرض واقعہ نگار کا یہ سب سے مقدم فرض ہے کہ واقعے کو اس صورت میں ظاہر کرے کہ دل میں اُتر جائے۔

مثنوی کے ان اصول وضوابط اور معیار وامتیاز کی پابندیاں ضروری ہیں مگر اکثر شعراء فارسی بھی شاعرانہ تخیلات کی رو میں مُبالغہ کی دلدل میں پھنس کر بھٹک گئے ہیں۔ اُردو جس نے فارسی کی پیروی میں پہلا قدم اُٹھایا ہے اس میں بھی اکثر ایسے ہی نمونے نظر آتے ہیں جن پر بے راہ روی کا الزام عائد ہوتا ہے۔

پُرانی اُردو مثنویاں جن کا صاف اور ستھرا نمونہ سراج اورنگ آبادی سے شروع ہوتا ہے۔ بہترین اوصاف کے ساتھ ایسے مصائب بھی پیش کرتی ہیں، جن کو اصول وضوابط کے لحاظ سے نہ ہونا چاہئے تھا۔ لیکن یہاں زمانہ کی اُفتاد اور ہر عہد کے ماحول اور گرد وپیش کے واقعات واثرات کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے، ڈیڑھ صدی پہلے کے شعرائے اُردو نے جو کچھ کہا وہ اپنے زمانہ کے مذاق کے مطابق کہا، جس کو اُن سے

پہلے ایرانی کہتے آئے تھے اور بلا اختلاف تمام ہندوستان میں پسند کیا جاتا تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ پُرانے مثنوی گو جنیں سراج اورنگ آبادی، میر تقی میر، میر حسن، پنڈت دیا شنکر نسیم، قلق، مومن اور نواب مرزا شوق زیادہ مشہور و معروف ہیں، وہ سب اُسی پُرانی روش پر چلے جس میں عاشقانہ رنگ آمیزی کی کثرت، فرضی تخیل کی افراط، رعایت لفظی کی بھرمار اور استعارہ و مبالغے کے طومار سے دفتر کے دفتر سیاہ کئے گئے تھے۔ اب اُن پُرانے انداز کی مثنویوں کے نمونے سُنائے جاتے ہیں اور سلسلہ قائم رکھنے کے لئے پہلے گجراتی اور دکنی شعرا کے صاف صاف دو دو ایک ایک شعر سن لیجئے۔

(۱) مثنوی قطب مشتری مصنفہ وجہی متوفی ۱۰۴۸ھ

شہنشہ مجالس کے ایک رات — وزیراں کے فرزند تے سب سنگات

لگے مطرباں گانے یوں سازسوں — کہ ذہرتی ہلے مست آواز سوں

(۲) مثنوی سیف الملوک مصنفہ غواصی متوفی ۱۰۳۵ھ

ہوئے جمع جنگی ہزبراں تمام — قوی ہور خوں خوار امیراں تمام

بڑا رن بڑا سخت رگڑا ہوا — کھسیا نہیں سنا سو یوں جھگڑا ہوا

(۳) مثنوی پھول بن مصنفہ ابن نشاطی متوفی ۱۰۶۶ھ

مرا تھا باپ سوداگر ختن کا — نہ تھا پروا اسے کچھ مال ودھن کا

بڑا تھا بھوت سب سوداگراں میں — اتھا مشہور سالم بندراں میں

(۴) مثنوی علی نامہ مصنفہ نصرتی متوفی ۱۰۸۱ھ

اسی رات ارسطوے دوراں کے یہاں — دکن کے سب اعیان تھے میہماں

سنوارے تھے کئی انجمن دل نشین — نشمین میں ہر روح راحت گزیں

ان دکنی نمونوں کے بعد اُن پُرانی مثنویوں کے نمونے سُنئے جو اورنگ زیب عالمگیر کے عہد سے شروع ہو کر چودھویں صدی ہجری کے اول تک جاری رہے بلکہ اس کے بعد اگر کسی نے اُن کے تتبع میں مثنوی کہی ہے تو اسی انداز میں کہی ہے۔

(۵) مثنوی بوستانِ خیال مصنفہ سراج اورنگ آبادی متوفی ۱۱۷۷ھ

میں کہتا ہوں اول سے سب ماجرا — جو کچھ مجھ پہ گذرا ہے تا انتہا

مجھے نوخطی تھی جس ایام میں — مقید نہ تھا میں کسی دام میں

نیا ان دنوں شعر کا شوق تھا — گل و باغ کی سیر کا ذوق تھا

جدھر جاؤں میں کیا غنی کیا غریب مرے ساتھ رہتے تھے اکثر نجیب

اس عہد میں دکنی زبان کی شستگی اور بندشوں کی پختگی صرف اورنگ آباد کے لئے مخصوص تھی جیسا کہ سراج کے شعروں سے ثابت ہے۔ دوسرے دکنی صوبوں میں اس وقت بھی پرانی دکنی غالب تھی۔ جیسا کہ ان مثالوں سے معلوم ہوگا۔

شاہ حسین ذوقی متوفی ۱۱۰۹ھ سب رس کے منظوم ترجمے میں کہتے ہیں:۔

مگر یہ حسنِ دل کا خوش سرشتہ لبھایا من کو میرے ہو فرشتہ

اگرچہ اس سرشتے سے اول بھی گندھے ہیں ہار ملا شیخ وجہی

اسی عہد کے شاہ بیر اللہ محرومی یوں کہتے ہیں:۔

زباں اور نظر دونوں مل یار ہو چلے ہیں تماشے کو اک ٹھار ہو

اب دہلی اور لکھنؤ کی مثنویوں کے پرانے نمونے سنئے:۔

مثنوی دریائے عشق مصنفہ میر تقی میر متوفی ۱۲۲۵ھ

ایک جا اک جوانِ رعنا تھا لالہ رخسار و سرو بالا تھا

تھا طرح دار آپ بھی لیکن رہ نہ سکتا تھا اچھی صورت بن

ناگہ اک کوچے سے گزار ہوا آفتِ تازہ سے دوچار ہوا

ایک غرفے سے ایک مہ پارہ تھی طرف اس کے گرم نظارہ

پڑ گئی اس پہ اک نظر اس کی پھر نہ آئی اسے خبر اس کی

مثنوی سحر البیان عرف بدرِ منیر مصنفہ میر حسن متوفی ۱۲۱۲ھ

ہوا ناگہاں اس کا اک جا گزر سہانا سا ایک باغ آیا نظر

سفید ایک دیکھی عمارت بلند کہ تھی نور میں چاندنی سے دوچند

وہ چھٹکی ہوئی چاندنی جا بجا وہ جاڑے کی آمد وہ ٹھنڈی ہوا

یہ عالم جو بھایا تو کوٹھے پہ آ اترا اپنے گھوڑے سے اور سر جھکا

لگا جھانکنے اس مکاں کے تئیں کہ دیکھوں یہاں کوئی ہے یا نہیں

جو دیکھا تو آیا کچھ ایسا نظر کہ سب کچھ گیا اس کے جی سے اتر

مثنوی گلزار نسیم مصنفہ پنڈت دیا شنکر نسیم متوفی ۱۲۶۰ء

کرتی تھی جو بھوک پیاس بس ہیں آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں

جامے سے جو زندگی کے تھی تنگ　　کپڑوں کے عوض بدلتی تھی رنگ

پوچھا اے آدمی پری رو　　یا　　انساں ہے پری ہے کون ہے تو

کیا نام ہے اور وطن کدھر ہے　　ہے کون سا گل چمن کدھر ہے

مثنوی قول غمیں، مصنفہ مومن متوفی ۱۲۶۸ھ

مومن زار کہ تھا گرم بیاں　　شورش سینہ سے تھا شعلہ فشاں

دل کے آتش سے جلا خاک ہوا　　بجھ گیا شعلہ بھڑک کر دل کا

مثنوی طلسم الفت، مصنفہ قلق لکھنوی متوفی ۱۲۹۶ھ

کیا کہوں تم سے حال دل کیا ہے　　کچھ مرے دل میں درد ہوتا ہے

ارے جی سنسنایا جاتا ہے　　کچھ کلیجا سا نکلا جاتا ہے

یہ ہیں پرانے انداز کے نمونے جن میں مثنویت کی حیثیت سے مثنوی بدر منیر کو فوقیت حاصل ہے۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جتنے مثنوی گو شعراء گذرے ہیں، اُن میں مثنوی نواب مرزا شوق لکھنوی کی زبان باوجود عریاں اور فحش ہونے کے بہترین اور دلکش زبان ہے، مولانا حالی لکھتے ہیں:-

"شوق کی مثنویوں کو ایک خاص حد تک بدر منیر پر ترجیح حاصل ہے۔ قدیم الفاظ اور محاورات سے، جو اب متروک ہوگئے ہیں اور بھرتی کے الفاظ سے پاک ہے۔ ان میں ایک قسم کا بیان (زبان کی گھلاوٹ روزمرہ کی صفائی، قافیوں کی نشست اور مصرعوں کی برجستگی کے لحاظ سے) بہ مقابلہ بدر منیر بہت بڑھا ہوا ہے۔ ان میں مردانے اور زنانے محاوروں کو اس طرح برتا ہے کہ نثر میں بھی بے تکلفی سے آج تک کسی نے نہیں برتا۔"

اس کے چند مہذب اور سنجیدہ اشعار سنئے:-

جائے عبرت سرائے فانی ہے　　مورد مرگ ناگہانی ہے

کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے　　آج دیکھا تو خار بالکل تھے

جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم　　آج اس جا ہے آشیانۂ بوم

بات کل کی ہے نوجوان تھے جو　　صاحب نوبت و نشان تھے جو

آج وہ ہیں نہ ہے مکاں باقی　　نام کو بھی نہیں نشاں باقی

ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے　　یہی دنیا کا کارخانہ ہے

صبح کو طائران خوش الحان　　پڑھتے ہیں کل من علیہا فان

موت سے کس کو رستگاری ہے ۔ آج وہ کل ہماری باری ہے

ہم بھی گر جان دیدیں کھا کر سم ۔ تم نہ رونا ہمارے سر کی قسم

یہ سب مثنویاں تیرھویں صدی ہجری سے پہلے کی ہیں۔ چودھویں صدی ہجری میں زبان کے ساتھ ساتھ خیالات و حالات نے بھی بہت پلٹے کھائے، اور مُبالغے، دوراز کار استعارات و تشبیہات کو بیکار سمجھا گیا۔ مذاق کی اس تبدیلی میں مغربی تعلیم کا پورا اثر ہوا۔ جن باتوں کو اچھا سمجھا جاتا، زمانہ اس کو بُرا کہنے لگا۔ شاعری میں ان تکلفات کو فضول کہا گیا۔ جس کو ابتدائے شاعری سے سب سراہتے آتے تھے۔ لفظی رعائتوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا اور اس کی جگہ صرف معنوی خوبیاں پیدا کرنے کا خیال قائم ہوا وہ تمام مثنویاں جن میں حمد و نعت، ساقی نامہ اور مختلف تمہیدیں ضروری سمجھی جاتی تھیں یک قلم موقوف ہوگئیں۔ اخلاقی، فطری، قومی اور تاریخی مضامین کو مستقل عنوانوں کے ساتھ کہنا شروع کیا۔ قصّے کہانی کے دفتر اُلٹا دیئے گئے۔ اور مناظر قدرت پر زور طبع دکھایا جانے لگا۔ اس مذاق کی ابتدا ۱۸۷۴ء سے پنجاب میں شروع ہوئی اور مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا حالی نے پہلے پہل اسکے نمونے پیش کئے۔ جنکی مثالیں یہ ہیں:-

مثنوی معرفتِ الٰہی، از آزاد، متوفی ۱۹۱۵ء

آؤ آزاد بیٹھے کیا ہو خموش ۔ فصلِ گل آئی ہے بجوش و خروش

کیا پڑے کُنجِ غم میں ہو بیکار ۔ گل و گلشن کی چل کے دیکھو بہار

لُطفِ صحبت بہم غنیمت ہے ۔ میاں آزاد دم غنیمت ہے

چل کے دیکھو ذرا چمن کی سیر ۔ گل و گلزار و یاسمن کی سیر

گرچہ بہر عوام کالانعام ۔ لُطفِ گلگشت ہو گیا بدنام

پر کرو دل میں تم جو اپنے غور ۔ ہے ہر اک امر کا علاحدہ طور

نیک و بد پر اگر نظر ہے شرط ۔ قصہ کا اپنے بھی اثر ہے شرط

سیکڑوں چیزیں اس جہاں میں ہیں ۔ کہ بُری خلق کے گماں میں ہیں

صرف ہووے گر اسمیں حُسنِ خیال ۔ تو ہو پھر نقص اس کا عین کمال

مثنوی حُبِ وطن، از مولانا حالی، متوفی ۱۹۱۴ء

اے وطن اے مرے بہشت بریں ۔ کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں

رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا ۔ وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا

تیری دُوری ہے موردِ آلام ۔ تیرے چھٹنے سے چھوٹ گیا آرام

کاٹے کھاتا ہے باغ بن تیرے | گُل ہیں نظروں میں خار بن تیرے
مٹ گیا نقش کامرانی کا | تجھ سے تھا لُطف زندگانی کا
جو کر رہتے تھے تجھ سے دُور سدا | اُن کو کیا ہوگا زندگی کا مزا
ہوگیا یاں تو دو ہی دن میں یہ حال | تجھ بن ایک ایک پل ہے اک اک سال
سچ بتا تو سبھی کو بہاتا ہے | یا کہ مجھ سے ہی تیرا ناتا ہے
کیا زمانے کو تو عزیز نہیں | اے وطن تو تو ایسی چیز نہیں

نئے انداز کی مثنویوں کا آغاز اگرچہ پچاس ساٹھ برس پہلے ہوچکا ہے مگر اس وقت سے اب تک یہی دور چل رہا ہے اور نئی پود انھیں پنجاہ سالہ درختوں سے قلمیں لے لے کر اپنی چمن بندیاں کر رہی ہے اور انھیں کو قبولیت عام کی سند حاصل ہو رہی ہے۔ نئے دور کے زیادہ نمونے اس لئے پیش نہیں کئے گئے کہ اس زمانے میں تمام اہلِ مذاق مجھ سے زیادہ آگاہ ہیں۔

HEROES & HEROINES OF ISLAM.

I & II

لندن کی مشہور و معروف میسرس میکملن کمپنی نے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں اپنی شاخیں کھولنے کے بعد مشرقی دلچسپی کی کتابیں اور رسالے بھی شائع کرنے شروع کئے ہیں۔ چنانچہ وہ بہت سی مشرقی کتابوں کے خلاصے چھوٹی چھوٹی کتابوں کی صورت شائع کر چکے ہیں، جو عام طور پر بہت مقبول ہو چکی ہیں۔ اب فرم مذکور نے ایک نئی کتاب "مشاہیر اسلام" کے نام سے شروع کی ہے۔ جس کی پہلی اور دوسری جلدیں ہمارے پاس ریویو کیلئے آئی ہیں پہلی کتاب میں پیغمبر اسلامؐ کی مختصر مگر دلچسپ سوانحعمری ہے اور دوسری کتاب میں اُن کے جانشین حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کے حالات درج ہیں۔ یہ کتابیں نہایت سلیس و عام فہم انگریزی زبان میں لکھی گئی ہیں اور انگریزی خوان بچے بھی نہایت آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں۔ دونوں کتابیں بہت دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ اور اُن کے مطالعہ سے پیغمبر اسلامؐ اور اُن کے خلفاء کے حالات پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ اُن کا ٹائپ بھی جلی ہے اور کاغذ بھی نفیس و دبیز ہے۔ سرورق میں کعبہ کا فوٹو۔
قیمت فی جلد چار چار آنہ ملنے کا پتہ:۔ میکملن اینڈ کو لمیٹڈ بمبئی۔ کلکتہ، مدراس، لندن۔



فکر و نظر

(حضرت نجم آفندی)

کون اپنے ضمیر کی خبر لیتا ہے
مشکل سے کوئی یہ دردِ سر لیتا ہے
اس دور میں جذبۂ صداقت اکثر
بچوں کی زباں سے بات کر لیتا ہے

ہے رنج بہت خوشی کے لمحے کم ہیں
کیسی دنیا میں یا الٰہی ہم ہیں
ارباب ہوس و ہوش کا ذکر نہیں
بچوں کے لئے بھی چھوٹے چھوٹے غم ہیں

انسان کی زندگی کو شرماتے ہیں
بچپن کے ہیں جو نقش مٹاتے ہیں
جھولوں میں نہ جھگڑا ہے کوئی اور فساد
کھلتے ہیں مہکتے ہیں مرجھاتے ہیں

اس کے لئے ہے ایک سپید اور سیاہ
حق بات ہے فطرت کبھی آہ سے کھیل نہ واہ
کھلتے ہیں پھول جو چمن میں ہیں
مسکاتی ہوئی دنیا میں کوئی قوم تباہ

مولانا حالی کی یاد[1]

از حضرت وصل بلگرامی

یہ اُس زمانہ کی بات ہے، جب مولانا حالی کی شہرت عام ہو چکی تھی اور میں بیتاب تھا کہ اُنھیں دیکھوں اور اُن کی گفتگو سُنوں۔ غالباً مارچ ۱۹۰۵ء کا زمانہ تھا۔ میں لاہور سے واپس ہو رہا تھا۔ پانی پت میں میرے ایک خاص ملنے والے تھے، جن کا عرصے سے اصرار تھا کہ میں کسی طرح پانی پت آؤں اور اُن کا مہمان بنوں۔ اُسی کے ساتھ مولانا حالی سے ملنے کا شوق، اِن سب چیزوں نے مل کر مجھے پانی پت اُترنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ سب سے پہلے میں نے اپنے میزبان سے یہی خواہش ظاہر کی کہ مجھے جلد سے جلد مولانا حالی سے ملادیں۔ معلوم ہوا کہ وہ اُن کے مکان سے قریب ہی رہتے ہیں۔ انصاریوں کا محلہ اُنھیں کے مورث اعلیٰ خواجہ عبد اللہ انصاری کے نام سے پانی پت میں مشہور ہے، جو غیاث الدین بلبن کے زمانہ میں یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔

غرض میں پہلی فرصت میں اپنے میزبان کے ساتھ مولانا حالی کی زیارت کے لئے روانہ ہو گیا۔ اُن کے مکان پر پہونچا۔ دروازے پر اتفاق سے ملازم یا کوئی دوسرا شخص ایسا موجود نہ تھا جو اطلاع کرتا۔ میرے میزبان نے کہا کہ مولانا تشریف رکھتے ہیں۔ وہ سُنئے، اُن کی آواز آرہی ہے۔ میں نے اِس سے پہلے نہ کبھی مولانا کو دیکھا تھا۔ اور نہ کبھی اُن کی آواز سُنی تھی۔ یہ آواز ایک گفتگو تھی جو مردانہ لہجے میں ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دوسری آواز بھی سُنائی دی، جس سے کسی خاتون کا لہجہ اور زبان معلوم ہوتی تھی۔ مجھے کسی حیثیت سے وہاں ٹھہرنا نہ چاہیئے تھا اور میں نے واپس چلنے کا ارادہ بھی کیا، مگر میرے میزبان نے مجھے روکا۔ اب وہ آوازیں پھر کانوں میں آنے لگیں اور وہ مکالمہ سُننا پڑا۔ دونوں آوازوں میں ضعف تھا، کمزوری تھی۔ مگر ایک ایسی دلچسپی اور دلکشی تھی جو بہت زیادہ اور خواہ مخواہ متوجہ کر رہی ہے۔ مردانہ گفتگو کیا تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی عبارت لکھوا رہا ہے۔ سلاست زبان اب بھی نہیں بھولی۔ حالی کی نثر کا نمونہ کسی کی زبان سے سُن رہا تھا۔ دوسری گفتگو میں بھی اِس طرز کا اثر موجود تھا۔ ابھی چند ہی منٹ گذرے ہوں گے کہ اندر سے

---

[1] یہ مضمون لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے ۳۱ دسمبر ۱۹۳۸ء کو براڈ کاسٹ کیا گیا ہے۔ اب قابل مصنف نے اسے ڈائرکٹر صاحب ریڈیو کی اجازت سے ہدیۂ ناظرین کیا ہے، جس کے لئے ہم دونوں صاحبوں کے شکر گذار ہیں۔ ا۔ ز

ایک لڑکا آیا، اور ہم لوگوں کو دیکھکر پوچھنے لگا کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ میرے میزبان نے منشار ظاہر کیا۔ وہ اندر گیا اور چند منٹ کے بعد ہم لوگوں کو بُلانے آیا۔ مولانا نے ہم لوگوں کو دیکھ کر کھڑا ہونا چاہا۔ میں نے اُن کو بیٹھا دیا۔ اُس وقت مزاج ناساز تھا اور کمزوری بھی کافی موجود تھی۔ زمین کے فرش کی نشست تھی سلام کے بعد ہم لوگ بیٹھ گئے۔ میرے میزبان کو وہ پہلے ہی سے جانتے تھے۔ میرا نام، پتہ، نشان پوچھا۔ معلوم ہوا کہ وہ میرے نام سے بھی واقف ہیں اور میری نظم و نثر کا نمونہ بھی اُن کے ملاحظہ سے گذر چکا ہے۔ پھر تو مولانا نے اِسقدر مُسرت کا اظہار فرمایا کہ بیان سے باہر ہے۔ یہ لمحے، یہ ساعتیں، یہ گھڑیاں عُمر بھر یاد رہیں گی۔ جو وقت گذرا، علمی و ادبی گفتگو میں گذرا۔ میرے اصرار پر کئی غزلیں کئی رُباعیاں اور کچھ متفرق اشعار سُنائے۔ یہ شعر کبھی نہیں بھولے گا ؎

جہاں میں حالیؔ کسی پر اپنے سوا بھروسا نہ کیجئے گا
یہ بھید ہے اپنی زندگی کا بس اسکا چرچا نہ کیجئے گا

کافی عرصہ تک نشست رہی۔ میں اُٹھنا چاہتا، مولانا اپنے کمال اخلاق سے روک لیتے تھے۔ آخر رخصت ہونا پڑا۔ اُس کے بعد پھر کبھی ظاہری ملاقات نہ ہو سکی۔ لیکن اِس شناسائی سے زیادہ وہ شناسائی ہے جس کو باطنی شناسائی کہتے ہیں اور یہ جب سے میں نے صحیح معنی میں ہوش سنبھالا ہے اُسوقت سے ہوئی، روزبروز بڑھتی گئی۔ آج بھی ہے اور قائم رہے گی۔

درحقیقت حالیؔ کی ہستی، ایسی ہستی تھی کہ اگر قوم و مُلک اُس کو بُھلانا بھی چاہے تو کسی طرح نہیں بھلائی جا سکتی۔

حالیؔ کا پورا نام خواجہ الطاف حسین ہے۔ ۱۸۳۷ء میں اپنے آبائی وطن پانی پت میں پیدا ہوئے، ابھی کمسن ہی تھے کہ والدہ دُنیا سے رخصت ہو گئیں۔ اور جب ۹ برس کے ہوئے تو اُنکے والد خواجہ ایزد بخش انصاری بھی ان کو چھوڑ کر چل بسے، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ان کی تعلیم و تربیت کا کیا انتظام ہو سکتا تھا۔ لیکن جو کچھ بھی ہو سکا۔ اُس سے ان کی صحیح فطرت نے پُورا فائدہ اُٹھایا۔ اُنھوں نے میر ممنون دہلوی کے بھتیجے سید جعفر علی سے جو فارسی کے ایک بے مثل ادیب اور اُستاد تھے، فارسی کتابیں پڑھیں۔ اور عربی کی تعلیم مولوی حاجی ابراھیم حسین انصاری سے پائی۔

جب یہ سترہ ۱۷ سال کے ہوئے تو ان کی شادی ایک متمول گھرانے میں ہو گئی۔ لیکن تعلیم کا شوق بدستور قائم رہا۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو دہلی کے سوا اور کوئی مرکز علم و ادب کا نظر نہ آیا۔ یہ دہلی چلے گئے اور تین چار سال قیام کیا۔ پھر پانی پت واپس آ گئے۔ اور ایک سال کے بعد ضلع حصار کی کلکٹری میں ایک معمولی سی جگہ پر ملازمت اختیار کر لی۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز انقلاب نے یہ جگہ چھڑا دی اور وطن واپس آنا پڑا۔

حالیؔ دُنیا کی بہت سی منزلوں سے گذر چکے تھے۔ لیکن علم کا شوق اب تک دِل میں چٹکیاں لے رہا تھا

جب غدر کے اثرات کم ہو گئے تو ایک خاص ذریعے سے پنجاب گورنمنٹ بکڈپو لاہور میں ملازم ہو گئے۔ یہ جگہ اُن کے مذاق کے بالکل موافق تھی، یعنی جو کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کی جاتی تھیں، اُن کو دُرست کر کے مروجہ زبانِ اُردو کے قالب میں ڈھالنا حالی کا کام تھا۔ اس کام نے آپ کے علمی مذاق کو ایک حد تک بدل دیا، اور آپ پر آہستہ آہستہ مغربی اندازِ بیان اثر کرنے لگا۔ لاہور کے زمانہ قیام میں بھی آپ کو دلی کی یاد ستاتی رہی۔ فرماتے ہیں ؎

دلاتی ہے صبا! کس کو چمن یاد — نہ میں بلبل، نہ میرا گھر چمن ہے
کروں تجھ سے بیاں کچھ دردِ فرقت — مگر جوشِ سخن مُہرِ دہن ہے
رہے لاہور میں آکر، سو جانے — یہی دُنیا یہی دار المحن ہے
یہاں بیگانگی ہے اس قدر عام — کہ بلبل ناشناسائے چمن ہے
مجھے تنہا نہ سمجھیں، اہلِ لاہور — تصور میں مرے اک انجمن ہے
مری خلوت میں ہے ہنگامۂ بزم — خموشی میں مری ذوقِ سخن ہے
نہ لینے دیگا جنت میں بھی آرام — یہی گر جذبۂ حُبِ وطن ہے

اتفاق سے اُسی زمانہ میں دہلی کے ایک اسکول میں آپ کو جگہ مل گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ سرسید علیگڈھ میں ایک تعلیمی ادارے کے قیام کی کوششیں کر رہے تھے۔ حالی اس کام میں سرسید کے شریک کار اور مشیر تھے انھیں دنوں میں سر آسمان جاہ مدار المہام سلطنتِ دکن علی گڈھ تشریف لائے۔ سرسید نے حالی کا بھی تعارف کرایا۔ ان کی علمی خدمتوں کا ذکر کیا۔ اور خاص الفاظ میں ان کی سفارش کی۔ سر آسمان جاہ نے خوش کر پچھتر روپیہ ماہوار کا ایک علمی وظیفہ مقرر کر دیا، جو بعد کو سو روپیہ کا ہو گیا۔

اسکول کی ملازمت نے حالی کے لئے علمی دروازے کھول دیئے تھے۔ دہلی میں اُس وقت غالب کا طوطی بول رہا تھا۔ چنانچہ حالی نے بھی اُنھیں کے آگے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ اور اپنے اُستاد کے ساتھ اکثر دہلی کے مشاعروں کی رونق بنتے رہے۔ غالب کہا کرتے تھے کہ حالی اگر تم شاعری کا ذوق نہ رکھتے یا شعر نہ کہتے، تو بڑا غضب کرتے۔ شاگرد کے بعض اشعار سے گھنٹوں لطف اُٹھایا کرتے تھے۔

غالب کی شاگردی اور شیفتہ کے فیض صحبت نے حالی کو ایک باکمال شاعر بنا دیا تھا۔ اور حالی اپنے زمانہ کے شعراء کے رنگ میں نہایت عمدہ شعر کہتے تھے۔ لیکن آپ کی طبیعت پر ایک اور رنگ غالب ہو گیا تھا جو چپکے چپکے اپنا اثر کر رہا تھا۔ یہی رنگ اور اثر ایک زمانہ میں آ کر مسدس اور دوسری طرزِ جدید کی نظموں کا ذمہ دار بنا۔ کرنل ہالرائڈ جو محکمہ تعلیمات کے ڈائرکٹر تھے، حالی کے لئے بہت مفید ثابت ہوئے۔ اُنھوں نے

ایک خاص قسم کے شاعرے کی بنیاد ڈالی۔ مختلف شعراء کو مختلف عنوانات دیدیئے جاتے تھے اور وہ اُن پر طبع آزمائی کرتے تھے۔ اس قسم کے شاعروں نے حالی کو مشقِ سخن کا بڑا عمدہ موقع دیا۔ چنانچہ اُن کی مشہور نظمیں برکھارُت، نشاطِ اُمید، مناظرۂ رحم و انصاف، اور حُبِ وطن وغیرہ انھیں شاعروں میں پڑھی گئیں۔ سر سید کی صحبت کا اثر بھی حالی کی شاعری پر بہت پڑا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۷۹ء اُن کا مشہور مسدس "مدوجزرِ اسلام" شائع ہوا۔ شروع شروع میں ہر طرف سے اس پر اعتراضات کی بوچھار شروع ہوگئی۔ لیکن جوں جوں اعتراضات بڑھتے گئے۔ مسدس کی مقبولیت بھی بڑھتی گئی اور ہر طرف حالی کی شاعری کا چرچا ہونے لگا۔

سچ تو یہ ہے کہ حالی کے پہلو میں ایک زندہ اور بے چین دل تھا۔ مگر لوگوں کی بے اعتنائی نے اُسے مردہ کر دیا تھا۔ اور قوم کی غفلتوں سے افسردگی چھا گئی تھی۔ چنانچہ ایک شاعرے میں غزل کی فرمائش پر لکھتے ہیں۔

ہوئی ریعان جوانی کی بہار آخر حیف	طبع رنگین تھی ہے عشق کی جب متوالی
اپنی روداد تھی، جو عشق کا کرتے تھے بیان	جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی
اب کہ الفت ہے، نہ چاہت، نہ جوانی، نہ اُمنگ	سر ہے سودا سے تہی عشق سے دل ہے خالی
گر غزل کہئے، تو کیا کہئے غزل میں آخر	نہ رہی چیز، وہ مضمون سجھانے والی
آپ بیتی نہ ہو جو، وہ ہے کہانی بے لطف	گرچہ ہوں لفظ فصیح اور زبان ٹکسالی
ہاں مگر کیجئے کچھ عشق کا غیروں کے بیان	لائیے باغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی
کھینچئے وصلِ صنم کی کبھی فرضی تصویر	کیجئے دردِ جدائی کی کبھی نقالی
تا کہ بھڑکائے جوانوں کے دل آتش کی طرح	وہ ہوا جس سے دماغ اپنا ہوا ہے خالی
پر یہ ڈر ہے، کہیں اپنی بھی وہی ہو نہ مثل	قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی

ایسی حالی نے اور بہت سی نظمیں کہی ہیں۔ جن کے عنوان اصلاحی ہیں، مثلاً آزادی کی قدر، قحط الرجال، بے تمیزی ابنائے زمان، اسراف وغیرہ۔ اس قسم کی نیچرل نظمیں بہت مقبول ہوئیں لیکن ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو حالی کی شاعری کو تسلیم نہ کرتا تھا۔ اسمیں شک نہیں کہ حالی کی نظموں نے شاعری کی دُنیا بدل دی۔ حالی کی طبیعت میں غالب کا رنگ آخر تک غالب رہا۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ انھوں نے غزل میں نام نہیں پیدا کیا۔ اگر نظموں کو چھوڑ کر ہم اُن کی غزلوں کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ حالی میں ایشیائی شاعری کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ چنانچہ قدیم رنگ میں کہتے ہیں ؎

اُن کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت	نہ وہ دیوار کی صورت ہے، نہ در کی صورت

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل — کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت
اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار — اک بزرگ آئے ہیں مسجد میں خضر کی صورت
شوق میں اس کے مزا، درد میں اُسکے لذت — ناصحو اُس سے نہیں کوئی مفر کی صورت

داغ کا رنگ ملاحظہ ہو ؎

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں — اب ٹھہرتی ہے دیکھئے جاکر نظر کہاں
یارب اِس اختلاط کا انجام ہو بخیر — تھا اُس کو ہم سے ربط مگر اسقدر کہاں
اب وہ اگلا سا التفات نہیں — جس پہ بھولے تھے اب وہ بات نہیں

لیکن جب طبیعت اس رنگ سے سیر ہوگئی، تو پھر اس طرح مُنہ موڑ لیا کہ لوگوں نے لاکھ مشاعروں میں بُلایا مگر نہ جانا تھا نہ گئے، اب جو رنگ طبیعت پر غالب تھا۔ وہ مجاز سے ہٹ کر حقیقت تک پہنچ گیا تھا۔ پہلے تخیل کی بلند پروازیاں، استعاروں کی شوخیاں بھی کلام میں تھیں، لیکن اب عالمگیر حقیقتیں غزلوں میں نظر آنے لگیں۔ اِن کے یہاں میر کی خستہ دلی موجود ہے لیکن دھیمی دھیمی۔ غالب کی پیچیدگی سلاست میں تبدیل ہوگئی ہے، دل افسردہ ہوگیا ہے۔ آہیں نکلتی ہیں لیکن ٹھہری ہوئی۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، لیکن تھمے ہوئے۔ اور جو کچھ کہتے ہیں اُس میں تاثیر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت — پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت
زیرِ برقعہ تو نے کیا دکھلا دیا — جمع ہیں ہر سو تماشائی بہت
آرہی ہے چاہِ یوسفؑ سے صدا — دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت
کردیا چپ واقعاتِ دہر نے — تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت
گھٹ گئیں خود تلخیاں ایّام کی — یا گئی کچھ بڑھ شکیبائی بہت
ہم نہ کہتے تھے کہ حالی چپ رہو — راست گوئی میں ہے رسوائی بہت

دہلی کے ایک مشاعرے میں ایک غزل پڑھی جس میں واہ واہ کے بجائے سامعین کے دلوں سے آہ نکل رہی تھی۔ اس کے چند اشعار آپ بھی سُن لیں ؎

تذکرہ دہلیٔ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ — نہ سُنا جائے گا ہم سے یہ فسانا ہرگز
ڈھونڈھتا ہے دلِ شوریدہ بہانے مطرب — درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز
صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی — کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز
لیکے داغ آئیگا سینے پہ بہت اے سیاح — دیکھ اس شہر کے کھنڈر وں میں نہ جانا ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک — دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانا ہرگز
کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمھارا دلّی — ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز
شاعری مر چکی اب زندہ نہ ہوگی یارو — یاد کر کر کے اُسے جی نہ کڑھانا ہرگز
غالبؔ و شیفتہؔ و نیرؔ و آزردہؔ و ذوقؔ — اب دکھائیگا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز
مومنؔ و علویؔ و صہبائیؔ و ممنونؔ کے بعد — شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز
داغؔ و مجروحؔ کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں — نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر — اب نہ دیکھوگے کبھی لطف شبانا ہرگز
بزم ماتم تو نہیں بزم سخن ہے حالیؔ — یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

کہنے کو اس کو غزل کہہ لیں مگر اس کا ہر شعر ایک مرثیہ ہے، غزل کے ساتھ ساتھ مولانا کی رباعیاں بھی تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہوتی تھیں۔ عمر خیام کی رباعیوں کی طرح حالیؔ کی رباعیوں کا بھی انگریزی اور دیگر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

قصیدے میں تو عام طور پر ممدوح کی بیجا مدح سرائی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، لیکن حالیؔ کا وہ قصیدہ جو حضور نظام کے تخت نشینی کے وقت پڑھا گیا تھا ملاحظہ ہو۔ حالیؔ کہتے ہیں ؎

ملک مرتبت میر عثمان علی خاں — مبارک تمھیں مسندِ شہریاری

بس ملک مرتبت کہہ کر فرض مداحی سے سبکدوش ہو گئے ہیں، اور اس کے بعد خاص نصیحت ہے، فرماتے ہیں ؎

مبارک ہو تم کو وہ دشوار منزل — جہاں چپے چپے پہ ہے ذمہ داری
مبارک بزرگوں کی میراث تم کو — جنھوں نے کہ جھیلی ہیں کڑیاں یہ ساری
اب ان کی جگہ آپ کو ہے اٹھانا — خدا کی امانت کا یہ بوجھ بھاری
جو بے بس ہیں دینا ہے اُن کو سہارا — جو بے یار ہیں اُن کی کرنی ہے یاری
نکمے جو ہیں اُن کو کامی بنانا — بڑھانا دل اُن کا جو ہیں کاروباری

دل سے نکلی ہوئی آوازوں کو نظم کیا ہے۔ مناجات بیوہ، چپ کی داد، قصیدہ الغیاث اسکی روشن مثالیں ہیں یہاں تک آپ نے حالیؔ کو شاعر کی حیثیت سے ملاحظہ کیا۔ لیکن بہ حیثیت نثار آپ اگر حالیؔ کو دیکھینگے تو اُن کی نثر نگاری شاعری سے کسی طرح کم نظر نہ آئے گی، بلکہ کچھ بڑھی ہوئی۔ اور کون ہے جو حیاتِ سعدی، مقدمہ دیوان حالیؔ، اذکار غالبؔ، حیات جاوید وغیرہ سے واقف نہیں۔

غرض حالیؔ کیا بہ حیثیت شاعر، کیا بہ حیثیت ناصح، کیا بہ حیثیت معلم، کیا بہ حیثیت مصنف وہ درجہ

رکھتے تھے جو دوسروں کو کم نصیب ہوا۔

میں تو یہ کہوں گا کہ حالی آدمیت اور انسانیت میں شاعر ہونے سے زیادہ قابلِ ذکر و تحسین ہیں، وہ ایک مرنجان و مرنج آدمی تھے۔ جس سے بات کرتے نہایت نرم اور شیریں لہجے میں، بات کرنے میں پھول جھڑتے تھے۔ ہر شخص کے غیب کی پردہ پوشی کرتے، اور خود کسی کی غیبت نہ کرتے۔ اپنے یہاں تعلیم کے سخت حامی تھے۔ اہل علم، اہل فن اور نیک لوگوں کی بہت قدر کرتے تھے۔

آخر عمر میں جو لوگ اُن سے ملے ہیں، اُنھیں اندازہ ہوگا کہ حالی کتنا زبردست انسان تھا۔ اپنی یا اپنی شاعری کی تعریف سُننے سے شرماتے تھے اور ہمیشہ اپنے کو ایک ناچیز سمجھتے۔ یہی انکسار اُنکے کمال کی دلیل ہے حالی ایک شاعر اور مُصنف کی حیثیت سے جس مرتبے کے شخص تھے۔ اس کا اعتراف ہر شخص نے کیا ہے۔ لیکن ایک نقاد سمجھ سکتا ہے کہ ان کے شاعرانہ کمال کا راز صرف یہ ہے کہ وہ اِنسان ہونیکی حیثیت سے غیر معمولی خصوصیات کے مالک تھے۔

ہر چند وہ ستتّر سال زندہ رہے، اور عمرِ طبعی کو پہونچ کر ۱۹۱۴ء میں آج ہی کی تاریخ یعنی ۳۱ دسمبر کو دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ لیکن چونکہ ان کی تصنیف اور شاعری کا حقیقی شباب ان کے بڑھاپے ہی میں شروع ہوا تھا۔ اس لئے ان کی موت یقیناً قبل از وقت ہوئی اور ملک ان برکات سے محروم ہو گیا جو صرف حالی کے دِل و دماغ کا نتیجہ ہو سکتے تھے۔

باقیات

از حضرت باقی صدیقی

ہجومِ غم سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں
مدام گردشِ دُنیا ہے گاہ گاہ نہیں

گناہ کرنے کو دل چاہتا تو ہے لیکن
مری نگاہ میں جچتا کوئی گناہ نہیں

ترا جہان کشادہ سہی مگر یا رب
مِرے جنوں کو تو ملتی کہیں پناہ نہیں

مِرے خمیر میں وحشت کا رنگ شامل ہے
کہ دردِ دل مرا شرمندۂ نگاہ نہیں

مجھے کچھ اس طرح باقی فریب دیتی ہے
مری نگاہ بھی گویا مری نگاہ نہیں

کیمٹی آبشار

(از پرنسپل رام پرشاد ناشاد ایم اے)

تو آبشار نہیں موتیوں کا جھومر ہے
عروسِ قدرتِ حق کی جبیں کا زیور ہے

عیاں یہ قدرتِ حق کا عجیب منظر ہے
بندھی پہاڑ کے سر پر سفید جھالر ہے

زمین ڈوبی ہوئی ہے پہاڑ کے جل میں
کہ اک عروس ہے لپٹی حیا کے آنچل میں

یہ قطرے پانی کے ہیں یا گہر چمکتے ہیں
کہ ہیرے بکھرے زمیں پر ہیں جو دمکتے ہیں

بھرا ہوا مئے عرفاں سے جام ہے تیرا
جہاں میں میکشِ سرشار نام ہے تیرا

جہان کے لئے گویا پیامِ مستی ہے
جو تیری ہستی ہے اک بیخودی کی ہستی ہے

زمیں کا راز ہے مضمر ترے ترنم میں
جھلک ہے حسنِ فلک کی ترے تبسم میں

ہے عکس انجمِ گردوں کا تیرے پانی میں
ہے مہر و مہ کا تماشا تری روانی میں

خوشی کا ساز بجاتا ہے راگ گاتا ہے
کسی عروس کے گویا سہاگ گاتا ہے

پہاڑ سے تو زمیں پر اچھل کے آیا ہے
تو اپنے گھر سے بتا کیوں نکل کے آیا ہے

تو آج سے نہیں روزِ ازل سے بہتا ہے
فلک کے راز کی باتیں زمیں سے کہتا ہے

تو جاوداں ہے تجھے خوفِ انقلاب نہیں
تو لاجواب ہے تیرا کہیں جواب نہیں

گلوں سے کوہ کے دامن کو بھر دیا تو نے
نہال کوہِ مسوری کو کر دیا تو نے



گھر گھرستی کی اُلجھنیں[۱]

از خواجہ محمد شفیع دہلوی

یہ ایسا موضوع ہے جس پر اظہارِ خیالات کے لئے بال بچّہ داری زیادہ موزوں ہیں۔ پر مشکل یہ ہے کہ گھر گھرستی کی اُلجھنوں سے واقف کار اِس معاملہ میں خیالات کا اظہار کھلے ڈلے نہیں کرسکتے۔ ہر لفظ پر زبان لڑکھڑاتی ہے اور بال بچوں کا ڈر حکمِ زبان بندی نافذ کرتا ہے۔ اسلوبِ زبان کا لحاظ رکھتے ہوئے میں نے بال بچوں کا ڈر کہہ دیا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ بچوں کا ڈر اِتنا نہیں جتنا بچوں کی ماں کا ڈر غالب ہوتا ہے۔ آدمی سوچتا ہے کہ یہاں دماغ سوزی کرو، گھر جاکر دل جلاؤ۔ کون اِس جھنجھٹ میں پڑے۔ سموئی ہوئی باتیں بناؤ نہ حقیقت سے پہلو بچاؤ نہ بیوی سے بگاڑو۔

اگر اِس موضوع پر گل افشانیاں سُننی ہوں، تو کسی ایسی محفل میں جایئے جہاں صرف مرد ہوں۔ اور صنفِ دیگر کا دُور تک گذر نہ ہو۔ ہاں اِتنا خیال رہے کہ حاضرینِ محفل میں کسی کی بیوی کا بھائی بھی موجود نہ ہو۔ اِس لئے کہ بڑے بوڑھے کہہ گئے ہیں "ساری خدائی اک طرف جورو کا بھائی اک طرف"۔

بات یہ ہے کہ جب میاں صاحب تقریر فرماتے ہیں تو اگر گھر میں ریڈیو ہوا تو فبہا، ورنہ کہیں نہ کہیں سے مانگے تانگے کا منگایا جاتا ہے یا کرایہ پر آتا ہے۔ تمام پڑوسنیں جمع ہوتی ہیں۔ کُنبہ رشتہ میں بُلاوے جاتے ہیں۔ چاء پانی کا انتظام ہوتا ہے اور گھر اچھا خاصا شادی کا گھر بن جاتا ہے۔ گھر والی بیوی یعنی مقرر کی اہلیہ ایک عجب انداز سے جو تاب بیان نہیں لاسکتا سب کے بیچ میں ہو بیٹھتی ہیں اور اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کرتی ہیں۔ چاہتی ہیں کہ کوئی اور تقریر کا ذکر چھیڑے اور اُن کے میاں کی قابلیت پر تبصرہ ہو۔ رسماً ریڈیو کھول دیا جاتا ہے لیکن بیگم صاحب کی نظر گھڑی پر لگی رہتی ہے۔ اِدھر آواز آئی کہ اب سوا آٹھ بجے ہیں اور سب گھِر کر ریڈیو کے قریب ہو بیٹھے۔ گھر والی بیگم نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ تمام نوکر چاکر دم بخود ہوگئے مہمان بیویوں نے اپنے اپنے بچوں کی طرف نیلے پیلے دیدوں سے دیکھا۔ مدعا یہ کہ خبردار جو آواز نکالی۔ جب تک تقریر ہوتی رہی سب گوش بر آواز سکتہ کے عالم میں بیٹھے سُنا کیے۔ تقریر ختم ہوئی سُننے والوں

---

[۱] ڈائرکٹر صاحب آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی کی عنایت سے ہم اس مضمون کو ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ ا-ز

نے فراغت کا سانس لیا۔ اب میاں کا انتظار ہونا شروع ہوا۔ نوکر جو چشم براہ گلی کے نکڑ پر بیٹھا تھا دوڑا آیا اور اطلاع دی۔ میاں آتے ہیں، بیگم صاحبہ ذرا سمٹ سمٹا پٹاری آگے رکھ ہو بیٹھیں۔ چھپنے والی بیویاں پردہ میں ہو گئیں۔ گھر میں قدم رکھتے ہی پرانی بڑھیا ماما نے کہا:۔ "اے میاں ابھی تو تم خیر سے مشین میں بول رہے تھے ابھی یہاں آن پہونچے۔"

قصہ مختصر ان حقیقتوں کو جاننے والا مرد کب یہ جرأت کر سکتا ہے کہ بیوی بنّو کی مرضی کے خلاف گھریلو زندگی پر ایک لفظ بھی زبان پر لا سکے۔

جب مجھ سے کہا گیا کہ گھر گھرستی کی اُلجھنوں اور بال بچّوں کی جھنجھٹوں پر آپ لوگوں سے کچھ باتیں کروں تو خیال آیا کہ یا ایمان نکل جاؤں یا کم از کم ایک ہفتہ کے لئے گھر سے نکل جاؤں۔ ایمان حلق میں اٹک گیا اور گھر چھوڑنا ناممکن نظر آیا۔ سوچا کہ جب اُستاد غالب نہ چھوڑ سکے اور پابجولاں بُلائے گئے پھر تُو کس شمار قطار میں ہے۔

خیر آمدم بر سرِ مطلب۔ آپ نے اکثر کوچہ و بازار میں اچھے خاصے بھلے مانسوں کو جاتے دیکھا ہوگا کہ ایک بچہ انگلی پکڑے ہے، ایک گود میں اور ایک کندھے پر۔ جھومتے جھامتے، موٹر کے ہارن کی پروا نہ کرتے بیچ سڑک پر چلے جاتے ہیں۔ اِس کے علاوہ آپ میں سے جو صاحب ذوق برسات کے موسم میں ادھلے یا مہرولی گئے ہونگے وہ یہ منظر نہیں بھول سکتے کہ ایک صاحب سفید پوش آگے آگے گود میں بچّہ لئے چلے جا رہے اور ڈیڑھ درجن کے قریب عورتیں اُن کے پیچھے۔ کسی بچّہ کے رونے کی آواز آئی اور وہ پلٹے۔ گود کا بچّہ اُس کی ماں کو دیا۔ روتے ہوئے بچہ کو خود لیا اور کچھ ایسی عجیب و غریب آوازیں نکالیں کہ ابھی بچہ کے آنسو سوکھنے نہ پائے تھے کہ ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ دوسرے راہگیر اُن کی طرف دیکھ کر ہنستے ہیں۔ پر یہ مردِ خُدا اپنے بینڈ بجاتے، لاؤ لشکر لئے چلے جاتے ہیں۔ اس کو بھی جانے دیجئے جو اصحاب عید بقرعید کی نماز میں شریک ہوئے ہونگے اُن کو ایک نہ ایک مرتبہ یہ سابقہ ضرور پڑا ہوگا کہ دائیں جانب جو صاحب ہیں، اُن کے ساتھ تین برس کا لڑکا ہے اور بائیں جانب والے کے ساتھ دو سال کی لڑکی۔ اب نماز شروع ہوئی اور دو برس کی لڑکی نے لڑکے کے باپ کی جوتی اُٹھائی۔ صاحبزادہ باداجان کی پاپوش کی یہ دست درازی کب برداشت کر سکتے تھے۔ غرض ان دونوں میں چھینا جھپٹی، جوتی پیزار شروع ہوئی۔ باداجان سجدہ میں ہیں اور اولاد خشوع و خضوع کر رہی ہے۔ جب سلام پھیرا۔ آگے پیچھے کی صف والوں نے لعنت ملامت کی۔ پر اُن کے کان پر جوں نہ چلی۔ اپنی اپنی اولاد کی اُنگلی پکڑ سیدھے ہو لئے۔ مردوں کی یہ قسم ہے جو شادی کرنے اور گھر گھرستی کی زندگی بسر کرنے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔

آپ نے اکثر سنا ہوگا کہ اگر اچھی بیوی مل جائے تو جیتے جی کی جنت ہے ورنہ دوزخ۔ ہم اس کے بنداں قائل نہیں۔ ہمارے خیال میں ازدواجی زندگی کی جنت و دوزخ بہت کچھ مرد کی طبیعت پر منحصر ہے۔ درحقیقت قدرت نے دو قسم کے جانور پیدا کئے ہیں۔ ایک اہلی اور دوسرے وحشی۔ اہلی وہ جانور کہلاتے ہیں جو پالتو کئے جاسکیں۔ اور وحشی اُن کو کہتے ہیں جن کی خلقت میں رام ہونا نہیں۔ یہ خصوصیات حیوانوں کی جسمانی طاقت اور قدوقامت سے متعلق نہیں۔ بڑے سے بڑے جثہ والے جانور اہلی ہوسکتے ہیں۔ مثلاً گائے، بھینس، اور چھوٹے قدوقامت والے وحشی ہوتے ہیں جیسے کوا۔ وحشی کو آپ سونے چاندی کے پنجرہ میں بند کردیجئے۔ اس کی آسائش کا پورا انتظام کیجئے پھر بھی وہ وحشی ہی رہیگا۔ علاوہ ازیں اہلی کو جائے رہائش سے کوئی سروکار نہیں۔ اس غریب کو کیسے ہی تھان پر باندھ دیجئے، وہ مگن رہیگا۔ بعینہٖ یہی کیفیت مردوں کی ہے۔ بعض اُنمیں اہلی ہیں اور بعض وحشی۔ آخر الذکر کو اچھی سے اچھی بیوی دے دیجئے۔ اُس کی جبلی وحشت اُسے چین نہ لینے دیگی۔ اور اہلی ہر حال میں ازدواجی زندگی میں خوش رہے گا۔ اِس لئے کہ وہ اِسی فضا کے لئے تخلیق کیا گیا ہے۔

جو مثالیں ہم نے پہلے دیں وہ اہلی قسم کے مردوں کی تھیں۔ اب وحشیوں کا حال سنئے۔ اُن کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ جن میں شرافت کا شائبہ نہیں اور دوسرے وہ جو شریف ہیں۔ پہلے ہم غیر شریف وحشیوں کا ذکر کریں گے۔

میاں کارخندار، تہبند باندھ، بوسکی کی قمیص پہن گھر سے چلنے کو تیار ہی تھے کہ بیوی نے دبی زبان سے کہا۔ دیکھنا پان نہیں ہیں، بس اِس غریب کا یہ کہنا تھا کہ میاں صاحب بگڑ گئے، بولے: "تو بڑی ڈھیٹ ہے، سو واری کہہ چکا ہوں۔ مجھے جاتیوں کو نہ ٹوکا کر۔ سویرے ہی سویرے میرا مجاز بگاڑ دیا۔ پیسے دیدئے، سب کچھ کردیا پھر چین نہیں"۔ بیوی نے کہا، "لانے والا کوئی نہیں تھا۔ میں نے تو اس مارے تم سے کہا تھا۔" اب میاں کارخندار آئیں تو جائیں کہاں۔ جو جو منھ میں آیا۔ اس غریب کو سنایا۔ آخر میں بولے: "تیرے بادا نے مجھے تیرے دہیز میں نوکر بنا کر دیا ہے۔ یاد رکھو، حلقوم میں سے زبان اینچ لوں گا"! خوب برس برسا میاں صاحب تہبند سنبھالتے سیدھے اکھاڑے ہولئے۔ وہاں جا یاروں سے پیچ شروع کردی۔ اب اُن کی بلا سے۔ بیوی بدنصیب اپنے نصیبوں کو پڑی روتی رہے۔

اِس سے یہ نہ سمجھئے گا کہ غیر شریف صرف غریبوں ہی میں ہوتے ہیں امیروں میں بھی ایسے حیوانوں کی اکثر مثالیں ملتی ہیں۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ نواب صاحب گھر میں قدم ہی نہیں رکھتے۔ دیوانخانہ سجا رکھا ہے چار پیر یار دوست جمع رہتے ہیں۔ شروہ چٹ نوالہ حاضر ہر وقت حاضر۔ بال بچّوں کی طرف سے بالکل بےخبر

وقفِ عیش وطرب ہیں۔ کوئی بچہ بیمار ہو اُن کی بلا سے۔ بیوی کو کپڑا درکار ہو تو اُن کی بیزار سے۔ مہینہ کے مہینہ جب تنخواہ بٹی۔ نواب صاحب کندھے پر رومال ڈال تھیلی ہاتھ میں لئے حویلی میں تشریف لائے۔ نوکروں کی تنخواہ، بچوں کا جیب خرچ، خانہ داری کی مقررہ رقم بیگم کو سنبھلوا باہر آگئے۔ اب پھر مہینہ بھر بعد دیدار ہوں گے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ روپیہ دیدیا۔ اور تمام فرائض سے سبکدوش ہوگئے۔ حالانکہ حقیقت اِس کے خلاف ہے۔ بیوی روپیہ کی اتنی طلبگار نہیں ہوتی، جتنی دلداری کی خواستگار۔ فارغ البال طبقہ میں اِس قسم کی خال خال نہیں اکثر مثالیں ملیں گی۔ ایک زمانہ تھا جب کہ بال بچوں کی طرف التفات انگشت نمائی کا باعث ہوتا تھا۔ ہم چشم بُری نظر سے دیکھتے اور احباب زن مُرید کہہ کر پکارتے تھے۔

اب ذرا شرافت زدہ وحشیوں کا حال سُنئے۔ سینما۔ تھیٹر۔ مشاعرہ۔ احباب کی صحبتوں میں سے رات کے ایک دو بجے گھر میں گھسنے کے عادی۔ تمام دن باہر رہنے کے خوگر۔ ماں باپ اُن کی صورت کو ترس جائیں، صاحبزادہ رات کے آدھی بجے گھر میں گھسے پڑ کر سوگئے۔ ابھی صبح اُٹھنے نہ پائے تھے کہ یاروں میں سے کوئی نہ کوئی آن دھمکا۔ مُنہ ہاتھ دھو اُس کے ساتھ ناشتہ کر پھر چل دیئے۔ اب اگر رات کے بارہ ایک بجے گھر آجائیں تو غنیمت سمجھو۔ باپ کو یہ حرکات ناگوار ہیں۔ کبھی مُنہ پر لاتے ہیں تو ماں سمجھا دیتی ہیں۔ تم کچھ نہ کہنا جوان بچہ ہے میں اپنی جگہ سمجھا دونگی اور کیا بتاؤں مجھے تو اُس کے گھر میں بیٹھنے سے وہم آتا ہے۔ اللہ اُسے تندرست رکھے، وہ تو دُور پار جب کبھی بیمار ہی پڑتا ہے تو گھر میں بیٹھتا ہے۔ نہیں تو اپنے پھرتا ہی رہتا ہے۔ اللہ اُسے چلتا پھرتا جیتا جاگتا رکھے۔ کسی دن اگر صاحبزادہ نے اماں کے ساتھ کھانا کھالیا تو وہ نہال ہوگئیں۔ بولیں میاں، آج پندرہ ۱۵ دن بعد تم نے ہمارے ساتھ کھانا کھایا ہے۔ بیٹا دل میں شرمندہ ہوا۔ اور کہا۔" اماں کیا بتاؤں، مجھے چھوڑتے ہی نہیں۔ پر آج سے انشاء اللہ تمھارے ساتھ کھانا کھایا کروں گا۔" کچھ دن کوشش کرکے کہیں بھی ہوا بھاگا آیا۔ کہ میں اپنی اماں کے ساتھ کھانا کھاؤنگا۔

اب ان صاحبزادہ کی ہوگئی شادی۔ بہت نا نکر کی، بہت ہاتھ پیر مارے۔ پر کسی نے ایک نہ سُنی۔ اور باندھ بوندھ بیاہ دیا۔ دوسرے دن یار دوست مبارکباد دینے آئے اور بولے لو میاں، تم ہم سے تو گئے۔ کچھ روز احباب نے لحاظ کیا کہ نئی نئی شادی ہوئی ہے اس کے پاس زیادہ نہ جاؤ۔ ولے تا کجے ؎

چھٹتے ہی چھٹتی ہے بشر کی عادت عادت اور وہ بھی عُمر بھر کی عادت

ایک رات کسی دوست کے ہاں میاں کو دیر ہوگئی۔ کھانا وہیں کھالیا۔ بارہ بجے کے قریب گھر پہونچے۔ تو معلوم ہوا کہ بیوی نے ابھی کھانا نہیں کھایا ہے۔ دریافت کرنے پر جواب ملا کہ آپ کی راہ دیکھ رہی تھی۔ نوکروں کو بلایا۔ کھانا گرم کروا، بیوی کو کھلایا۔ ساتھ دینے کی غرض سے بیوی کے اصرار پر، ہاتھ دھو خود بھی شریک ہوگئے۔

جب نوکر چاکر چلے گئے تو سمجھایا۔" دیکھو اگر مجھے دیر ہو جایا کرے تو تم کھانا کھا لیا کرو"۔

اُنھوں نے دبی زبان سے ذرا شرما کر جواب دیا" آپ کے بغیر ہمارے حلق سے نہیں چلتا"۔ اُسوقت تو بیوی کو سمجھا دیا۔ پر کچھ عرصہ بعد باہر کھانا چھٹا۔

ایک رات میاں ڈھائی بجے گھر تشریف لائے۔ دیکھا تو بیوی پڑی تارے گن رہی ہیں۔ بولے" میری آہٹ سے تمھاری آنکھ کھل گئی"۔ جواب ملا" میری آنکھ لگی ہی نہیں تھی"۔ آخر یہ کیوں؟" کچھ نیند اُڑ سی گئی"۔ رفتہ رفتہ دیر کا آنا بھی گیا۔

مختصر بیانی سے یہ نہ سمجھئے گا کہ یہ سب عادتیں بہ آسانی چھٹ گئیں۔ انمیں سے ہر ایک عادت کا چھٹنا

ع ہوگیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

ایک روز میاں کو ڈنر پر جانا تھا اور بعد میں سیر ماہ کا بھی پروگرام۔ بیوی کو اُن کے میکے بھیج دیا۔ اب جو ہمارے چھیلا ڈریس سوٹ پہنے کھڑے ہوئے تو کالی جرابیں ندارد۔ سارے سوٹ کیس دیکھ ڈالے، تمام صندوق اُلٹ پھینکے، پر جرابیں نہ ملنی تھیں نہ ملیں۔ بیوی کو موٹر بھیجی گئی کہ آکر جرابیں برآمد کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان صاحب کے تمام کپڑے اُن کی آنکھوں کے سامنے بکھرے رہتے تھے۔ کیفیت یہ تھی کہ رات کو سوٹ وغیرہ کرسیوں پر پڑے جاتے تھے اور خود بدولت پلنگ پر۔ صبح کو کپڑے کرسیوں سے پلنگ پر آجاتے تھے اور کرسیاں بیٹھنے اُٹھنے کو خالی ہو جاتی تھیں۔ اگر کبھی کوئی اس حرکت پر اعتراض کرتا، تو کہدیتے تھے۔ میاں تم کیا جانو" مالِ عرب پیشِ عرب"۔ اب جب سے بیگم صاحبہ تشریف لائیں تو ہر ایک چیز قرینہ سے رکھی جانے لگی۔ پر اگر خیر سے بیگم صاحبہ گھر میں نہ ہوں تو اُنکو کوئی چیز مل نہیں سکتی۔

موٹر کے ہارن کی آواز سن کر میاں نو گرفتا پر بُزرہ جھاڑ غصہ کے اظہار پر تیار ہو گئے۔ بیوی ساڑھی سنبھالتی بوکھلائی ہوئی گھر میں گھسیں۔ اونچی ایڑی کا جوتا تھا۔ جو کھٹ پر پیر مُڑ گیا۔ اور ایک" اوئی" کی آواز اُن کے کان میں آئی۔ اور" ماما اصیلیں بسم اللہ بسم اللہ" کہتی چاروں طرف سے دوڑتی دکھائی دیں۔ بوکھلا کر کمرہ سے نکلے تو دیکھا کہ بیگم صاحبہ ٹخنہ پکڑے زمین پر بیٹھی ہیں۔ غصہ رفو چکر ہوا۔ آنا جانا بالائے طاق۔ تیل لے مالش کرنے ہو بیٹھے۔

بیگم بولیں" کیسی بھول ہوئی میں جرابیں نکال کر نہیں گئی۔ آپ کو بڑی تکلیف ہوئی"۔ میاں نے کہا" لعنت بھیجو تم تکلیف پر۔ یہ بتاؤ کچھ ٹخنہ ٹھیک ہوا یا نہیں؟"

کچھ دن بعد اللہ نے آس اولاد دی۔ ایک رات آنکھ جو کھلی، تو بیوی غائب۔ دوسرے کمرہ میں کچھ آواز سنائی دی۔ غور کیا تو معلوم ہوا کہ بیگم صاحبہ بچّہ کو بہلا رہی ہیں اور کہتی جاتی ہیں ع

"سو جا میرے لال سو جا" ابا کی آنکھ کھل جائے گی تو بری بات ہے۔ شرافت نے اجازت نہ دی کہ بیوی بچہ کو بہلائے اور یہ پڑے سنا کریں۔ اب یہ چھیلا جو بچہ کی پرچھائیں سے بھاگتے تھے۔ بھانجا بھانجی کو کبھی پاس نہیں پھٹکنے دیتے تھے۔ رات کے ڈھائی بجے گود میں بچہ کو لئے باقاعدہ بینڈ بجا رہے ہیں۔

رفتہ رفتہ تمام عادتیں چھوٹ گئیں۔ گو ان کا چھٹنا "گوشت کا ناخن سے جدا ہونا" تھا۔ پر گوشت سڑا ہوا تھا، اور اوپریشن محبت کے کلورفارم کے زیر اثر ہوا۔

اِس سلسلہ میں کئی داستانیں بیان کی جا سکتی ہیں۔ پر مجبوری سے وقت کوتاہ و قصہ طولانی

جذباتِ شوق

از پنڈت جگموہن ناتھ رینہ۔ شوق

ہو گئی وا ماندگی وجہِ سکونِ دل مجھے
ڈھونڈتی ہے کس لئے اب کاہشِ منزل مجھے

امتیازِ دید نے جب سے کیا غافل مجھے
کر رہا ہے اور حیراں یہ حجابِ دل مجھے

جو قدم بھٹکا وہ خضرِ جادۂ مقصود تھا
خود مری گم گشتگی لائی سرِ منزل مجھے

بے نیازِ ہوش ہوں حاصل ہے لطفِ بیخودی
محوِ حیرت رہنے دے نیرنگیٔ محفل مجھے

لذتِ افتادگی بڑھنے نہیں دیتی قدم
کھینچتا ہے کس لئے اب جذبۂ منزل مجھے

راندۂ دیر و حرم ہوں میکدہ اپنا نہیں
کچھ بتا تو اب کہاں لیجائیگا اے دل مجھے

لطفِ ہم آغوشیٔ امواج بھی کچھ کم نہ تھا
بے بسی نے کر دیا شرمندۂ ساحل مجھے

مست رہتا ہوں میں خود اپنی نوائے شوق سے
چھیڑتی ہے کیوں صدائے نغمۂ محفل مجھے

عشق کی جاں سوزیوں نے کیوں ملایا خاک میں
ہو سکے تو کچھ بتا دے جذبۂ کامل مجھے

جلوۂ لیلیٰ کہاں، یہ دیدۂ حیراں کہاں
شوقؔ دھوکا دے رہا ہے پردۂ محمل مجھے

ساون کی بہار

(از حضرت نسیم خوجیانوالی، سابق ایڈیٹر 'تعمیر' لاہور)

وہ رقص کرتا پھر آیا ساون، فضا پہ مستی سی چھا رہی ہے
گھٹا میں کوئی مغنّیہ اپنا رنگیں بربط بجا رہی ہے
صدائیں رہ رہ کے کان میں بوندیوں کے گرنے کی آ رہی ہیں
نسیمِ صبحِ بہار اونچے سُروں میں کچھ گیت گا رہی ہے
وہ دھیمی دھیمی شعاعیں خورشید کی چمن پر جھلک رہی ہیں
یہ کیفیت ہے کہ حورِ فطرت تجلّیوں میں نہا رہی ہے
شگفتگی سے رچی ہوئی ہے بہارِ فردوس منظروں میں
ہوائے بخیہ خرامِ نکہت ہر ایک شے میں بسا رہی ہے
صدائیں سازِ شکستِ دل کی تڑپ رہی ہیں مچل رہی ہیں
گھٹا میں کوئی حسینۂ آتشیں نظر مسکرا رہی ہے
چمک چمک کر جھلک جھلک کر یہ شعلہ خو برقِ فتنہ ساماں
تصوّرِ حور زا میں میرے حسین شمعیں جلا رہی ہے
یہ شاخِ گُل کی شفق طرازی لطافتیں مےٴ ارغواں کی
گھٹاؤں کے لطف زا دھندلکے میں شمع سی جھلملا رہی ہے
خیال و احساس کے افق پر شراب خانے برس رہے ہیں
نسیم گلشن کی پتّیوں میں حسین نغمے بسا رہی ہے
گلوں کی چھاتی پھڑک رہی ہے ہوا کا سینہ دھڑک رہا ہے

اُدھر وہ انگڑائی لے رہے ہیں اُدھر قضا تھرتھرا رہی ہے
ابھی تک انسان کی نظر پر حجاب ہیں مذہبیتوں کے
روایتوں کی گھٹا ابھی تک افق پہ دانش کے چھا رہی ہے
فریب خوردہ شباب کی ہرزہ کاریاں یاد کر رہا ہوں
سرودِ رفتہ کی گونج دل میں ابھی تلک تھرتھرا رہی ہے
محبّتوں کی حکایتیں ہیں جوانیوں کی کہانیاں ہیں
گھٹا قیامت اُٹھا رہی ہے کہ سوتے فتنے جگا رہی ہے

لطیف انور

از جناب لطیف انور گورداسپوری

(۱)

مضراب کا محتاج ہے سازِ ہستی ورنہ غمِ تاراج ہے سازِ ہستی
اے منتظرِ نغمہ! اِسے چھیڑ ذرا ہاتھوں میں ترے آج ہے سازِ ہستی

(۲)

کِس آتشِ پنہاں سے ہے دودِ ہستی! کچھ ہے کہ نہیں اصل وجودِ ہستی
اے دستِ قضا! پردہ دری سے حاصل اُٹھا ہوا پردہ ہے نمودِ ہستی

(۳)

فطرت سے ہی پیوست مذاقِ ہستی لیکن ہے تہی دست مذاقِ ہستی
بستکین اسے ملتی ہے لحد میں انور ہوجاتا ہے کیوں پست مذاقِ ہستی

(۴)

ہر سانس اگرچہ ہے حبابِ ہستی تھامے ہوئے چلتا ہے رکابِ ہستی
لے ڈوبیگا اک روز نہ طوفان اٹھا اے تشنہ لبی! تجھ کو سرابِ ہستی

داستانِ غم

(مرزا نوشہ سے ایک انٹرویو)

از مسٹر نند کشور جھنگن ایم۔ اے۔ (جالندھر)

نکتہ چیں ہے غمِ دل اُس کو سُنائے نہ بنے کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے (غالب)

کہتے ہیں غم آدم کے ساتھ دنیا میں آیا تھا، اور قسامِ ازل نے اپنے ہاتھوں اِسے مشتِ خاک کے سپرد کیا تھا، اور یہ ہے بھی ٹھیک، کیونکہ دلِ دردمند کے سوا اور کہیں اس کا ٹھکانا بھی تو نہیں تھا۔

قسمت کیا ہر ایک کو قسامِ ازل نے جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا

بلبل کو دیا نالہ تو پروانے کو جلنا غم ہم کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا (ایک آدم زا)

یہ غم ہے کیا بلا؟ آئیے ذرا مصورِ غم شاعرِ جذبات مرزا نوشہ سے ہی پوچھ دیکھیں۔ اُف! ہم نے اُن کے سازِ دل کے کس دردناک تار کو چھیڑ دیا، کہ بس پھوٹ بہے ؎

دیکھا آخر نہ کہ پھوڑے کی طرح پھوٹ بہے ہم بھرے بیٹھے تھے کیوں آپ نے چھیڑا ہم کو

اُستاد! ایسا تنگ و تاریک حجرہ، نہ فرش و فروش نہ آرایش و زیبائش!

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

کہیں دیا سلائی ہو تو لائیے، شمع ہی روشن کر لیں۔

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے۔

آہ! وہ بھی تو نہیں، وہ بھی جل چکی ہے، اک ذری سا ٹکڑا باقی رہ گیا ہے، سیاہ پوش، خاموش!

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

بڑی مصیبت میں بسر کر رہے ہو اُستاد۔ اچھا خدا سب کا .... ہے۔

خدا؟ زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اس قدر غم بھی تو اچھا نہیں، آخر اس کا فائدہ کیا؟

دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر نہ گریۂ سحری ہے نہ آہِ نیم شبی ہے

للہ کچھ تو اپنی صحت کا خیال کرو۔ غم تو تپ ہی ہو رہا ہے"

کیجیے بیاں سرورِ تپِ غم کہاں تلک ہر مُو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے

غم نے گھر چوپٹ کر دیا۔

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

آپ غم کے ایسے آرزو مند کیوں ہیں ؟

مَیں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

تو کیا غم سے مفر کی کوئی صورت نہیں ؟ کس قدر جاں گسل ہے یہ غم !

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

سُنا ہے آپ دلّی چھوڑ رہے ہیں، خدا را دلّی نہ چھوڑیئے۔ اُستاد یہیں رہیئے۔

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا

غمِ الفت بھی بھلا کوئی غم ہے۔ مَیں تو اسے کم جانتا ہوں،

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

اچھا اُستاد یہ تو بتاؤ غم ہے کیا ؟ اس سے کبھی چھٹکارا بھی نصیب ہو سکتا ہے ؟

قیدِ حیات بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جُز مرگ علاج شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

خدا کا شکر ہے سنگ و خشت تو اس سے بچے ہوئے ہیں، عاری از حیات جو ٹھہرے،

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

مگر یہ بھی تو آپ ہی کا ارشاد ہے ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

جی ہاں ہے، پہ دِل دِل ہی ہے،

دِن تو خیر کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جاتا ہے مگر شبِ غم ؟

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بُری بلا ہے مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

اور غمِ شبِ فرقت ؟

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا بے تکلف داغِ مہ مُہرِ دہاں ہو جائے گا

آپ کہا کئے، اور ہم سنا کیئے، غم کی داستان تو کبھی ختم ہی نہ ہوگی، اُستاد چھوڑو اسے، چلو باغ کی سیر کریں۔

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا
باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا

ضرور چلو اُستاد، دیکھو تو اب تو بادل بھی برس کر کھُل گیا ہے،

ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

نہیں چلتے نہ سہی، اچھا یہ تو بتلا دو کہ سوزِ غم میں کس قدر حرارت ہے۔

آتشِ دوزخ میں وہ گرمی کہاں سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

کیا سوزِ غم کا کوئی نشان بھی ہوتا ہے۔ کبھی کسی نے اس کا نشان دیکھا بھی ہے؟

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے یہ

کیا سوزِ غم کو دل میں چھپانے کی بھی کوئی حکمت ہے؟

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

کیا غم جلانے اور مٹانے کے لئے ہی بنا ہے۔ تربیت اور پرورش کرنے کے لئے نہیں؟

غم آغوشِ بلا میں تربیت دیتا ہے عاشق کو چراغِ روشن اپنا قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

سُنتے ہیں آپ نوحۂ غم اور نغمۂ شادی میں کچھ فرق ہی نہیں سمجھتے۔ آخر کیوں؟

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی
نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیئے بے صدا ہو جائیگا یہ سازِ ہستی ایک دن

غم کو آپ بیماری بھی ٹھہراتے ہیں، جب یہ بیماری ہی ٹھہری تو اس میں فراغت کیسی؟

کیا کہوں بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس ہے

شمع اور اُسے غمِ حسرتِ پروانہ! عجیب سی بات کہہ رہے ہیں آپ، بھلا ہم بھی سنیں کیونکر؟

غم اُس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیِ شمع

عشق کو بھی آپ غم ہی سمجھتے ہیں، یہ تو بجا ہے مگر وہ غمخوارِ جانِ دردمند کب سے ہوا؟

ذرا تحفے تو ایک نظر دیکھ لیجئے!

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغِ جگر ہدیہ مبارک باد اسدؔ غمخوارِ جانِ دردمند آیا

کیا کسی نے غمِ پنہاں کو سمجھا بھی ہے، اگر سمجھا ہے تو کیسے؟

وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا راز مکتوب بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا

ہمارے محلہ میں ایک بزرگ تھے، مے و نغمہ کے دلدادہ، کہا کرتے تھے اِن سے غم غلط ہوتا ہے، کیا واقعی یہ چیزیں اندوہ ربا ہیں ؟

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے غلامِ ساقیِ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

بُرا نہ مان جائیے گا اُستاد! اگر ایک ذاتی سوال بھی پوچھ لوں۔ آپ سدا مغموم بھی تو نہیں رہتے، کبھی کبھار ہنس بول بھی لیتے ہیں۔

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

تو پھر آپ اس بات کے قائل ہوئے نا کہ جہان میں غم و شادی ہم پائے جاتے ہیں۔

جہاں میں ہوں غم و شادی بہم ہمیں کیا کام دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

غمِ دنیا سے آخر کبھی تو فرصت مِل ہی جاتی ہوگی ؟

غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اُٹھانے کی فلک کو دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

آپ کی قسمت میں واقعی غم بہت معلوم ہوتا ہے، کہتے ہوں گے کچھ کم ملتا تو اچھا تھا۔

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے

کوئی ایسی تدبیر بھی ہے جس سے غم نہ ہو ؟

شادی سے گزر کہ غم نہ ہووے اُردی جو نہ ہو تو دَے نہیں ہے

(از راہِ ظرافت) شادی سے مراد نکاح ہے کیا ؟

(بے اختیار ہنستے ہوئے) نہیں، (پھر تھوڑی دیر سوچ کر) ہاں، یوں بھی ہو سکتا ہے۔

ابکے عید تو منائی ہی ہوگی آپ نے ؟

ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی کہ صبحِ عید مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے

آپ تاریکیِ زندانِ غم کے ایسے شاکی کیوں ہیں ؟

کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم اندھیر ہے پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

آپ ہی کا قول ہے کہ غم زہر ہے، اس زہر کی علامات کیا ہیں ؟

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمایش ہے

عابد لوگ تو کم از کم غم سے آزاد رہتے ہوں گے ؟

مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

غمخوار تو غم بٹا ہی سکتے ہوں گے ؟

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم ہو غم ہی جانگداز تو غمخوار کیا کریں

آپ تو غمخوار کے بُری طرح پیچھے پڑے ہیں ؟

کیا غمخوار نے رُسوا لگے آگ اس محبت کو نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

آخر کسی نے تو آپ کی بھی کبھی غمخواری کی ہوگی ؟

زمانۂ ماضی کے کسی واقعہ کی یاد دل میں تازہ ہو جاتی ہے اور کسی غمخوار کی جانبازی کے پچھلے ہزاروں داغ روشن ہو جاتے ہیں، اور اُستاد "ہائے ہائے" کے ساتھ رونا شروع کر دیتے ہیں۔

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے

کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی یعنی مجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے

گلفشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں ختم ہے اُلفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

اب مرزا نوشہ کی حالت ایسی نہ تھی کہ کچھ پوچھا جا سکتا۔ داستانِ غم کا انجام رونے کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ بقولے ؎

نہ بولا جائے تھا اُن سے، نہ پوچھا جائے تھا مجھ سے

خود بھی روئے اور رُلایا ہم کو

کہتے ہیں غم رونے سے ہلکا ہو جاتا ہے، مگر ہر ایک غم نہیں۔ مرزا نوشہ کو روتے دیکھ ہم بھی اپنے آنسو ضبط نہ کر سکے۔

دریائے توی کے ساحل پر شام

(از حضرت احسان بن دانش)

عجب انداز سے زلفِ عروسِ شام لہرائی
چمن زاروں نے چُپ سادھی بیابانوں کو نیند آئی

شفق کا سُرخ آنچل ہے پھریرا شادمانی کا — فلک سے مینہ برستا ہے شرابِ ارغوانی کا
فضا میں زمزمہ اُٹھتا ہے چشموں کی روانی کا — سنہری وادیاں نقشا ہیں جنّت کی جوانی کا

مرقع وہ ہے جس کو دیکھکر حیران ہو مانی
صباحت زار میں کھوئی ہوئی ہے عقلِ انسانی

دھندلکا کروٹیں لے لے کے اُٹھا ریگزاروں سے — عبودیت کے جذبے پھوٹ نکلے شاخساروں سے
اشارے ہو رہے ہیں وحشتوں کو لالہ زاروں سے — صدا دیتی ہے موسیقی کی دیوی جوئباروں سے

روپہلے برف زاروں کی ہوا جس وقت چلتی ہے
دلِ شاعر کی دنیا خود بخود کروٹ بدلتی ہے

نظر آتے ہیں جگنو اس طرح شب کی رداؤں میں — ستارے جس طرح انگڑائی لیتے ہوں ہواؤں میں
کمانیں نور کی ہر سُو لچکتی ہیں فضاؤں میں — ترانے ہنس رہے ہیں آبشاروں کی صداؤں میں

تصوّر میں ہے اُن کے عارضِ پُر نور کا نقشہ
شبابِ حور کا نقشہ شرارِ طُور کا نقشہ

توی کے موڑ پر یہ جلوۂ بیتاب کا عالم — یہ موجوں کا تماشا اور یہ گرداب کا عالم
یہ فرشِ آب و رقصِ انجم و مہتاب کا عالم — درخشندہ بہشتوں کے مقدس خواب کا عالم

چراغانِ فلک کی ضو فشانی ہے بہاروں پر
نگاہیں رقص کرتی ہیں تڑپتے برق پاروں پر

یہ سنّاٹا یہ جنگل اور یہ بیتاب نظارے — ملائم فرش پر کیفِ طرب میں ناچتے تارے
یہ آئینوں میں جُنباں برق رو جلووں کے گہوارے — مچلتے ہیں بساطِ آب پر بے چین مہ پارے
چٹا نور ہے اک خوابِ فردوسِ ہوش خاموش — سکوت اندوز نظارہ ہر تکلم کوشِ خاموشی

معافی

ایک روسی کہانی کا ترجمہ

اگرچہ لیو منٹاف شکل سے بیس برس کا ہوگا۔ مگر شکل صورت سے پچیس چھبیس برس کا جوان معلوم ہوتا تھا۔ اُس کا قد پورا چھ فٹ تھا۔ اُس کے کندھے چوڑے، مضبوط اور خوب بھرے ہوئے تھے مگر چہرہ کچھ اُترا ہوا سا تھا جس سے مترشح ہوتا تھا کہ اب تک اُس کی زندگی تکلیف سے گذری ہے، اُس کی بھوئیں گھنی مگر کھلی ہوئی تھیں۔ آنکھیں ایسی معلوم ہوتی تھیں، جیسے کوئی جھرا لگتا گھور رہا ہے۔ وہ جہاز پر بڑھئی کا کام کرتا تھا۔ اُس کی محنت اور مستعدی سے خوش ہو کر مالک اُسکی بڑی قدر کرتا تھا۔ اُسکا باپ کسی اسکول میں ماسٹر تھا مگر شراب کی بدولت جلد ہی دُنیا سے کوچ کر گیا تھا۔ لیو نے باپ کی قبل از وقت موت سے عبرت حاصل کی اور شراب پینا چھوڑ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ہفتہ وہ اپنی کمائی سے کچھ نہ کچھ پس انداز کر کے بنک میں جمع کر دیتا تھا۔ داڑھی اور مونچھ صاف رکھنے کی وجہ سے لوگ اُسے "صاحب" کہتے تھے ایک دن کسی نے پوچھا کہ "تم داڑھی مونچھ کیوں نہیں رکھتے؟" اُس نے جواب دیا کہ "مجھے صاف ستھرا چہرہ ہی بھلا معلوم ہوتا ہے اور یوں تو بکرے کے بھی داڑھی ہوتی ہے۔"

اپنی ماں کی وفات کے بعد لیو، سائمن گلنکا، نامی ایک سوداگر کے یہاں رہنے لگا جو چھوٹے چھوٹے چینی کے برتنوں اور کھلونوں کا کاروبار کرتا تھا۔ اُس کی بیوی مر چکی تھی اور وہ شہر پیٹرو گریڈ کے کنارے ایک مکان کی تیسری منزل میں رہتا تھا۔ اُس کے دو لڑکے تھے جن کی خصلتیں مختلف تھیں۔

بڑا لڑکا میکسم ایک وکیل کا محرر تھا۔ اُس کے چہرے سے عیاری مترشح ہوتی تھی۔ اُس کی آنکھیں کنجی، ناک چپٹی، نتھنے چوڑے اور ہونٹھ پھیلے ہوئے تھے۔ باریک کتری ہوئی مونچھیں رکھتا۔ نمود و نمائش اور خوش پوشی کا دلدادہ تھا۔ اُس کا چھوٹا بھائی نکولس جو کچھ دنوں کسی اسکول کا طالب علم بھی رہ چکا تھا ایک دُبلا پتلا مدقوق نوجوان تھا۔ اُس کا سن اٹھارہ برس کا تھا۔ اُس کے بال سنہرے اور گھونگھر والے تھے، رسیلی نیلی آنکھیں اور لمبی اور پتلی ناک تھی۔ چہرہ کسی دوشیزہ کی طرح ملائم تھا۔ اُس کی شکل شباہت اپنی ماں سے ملتی جلتی تھی۔ اِسی لئے اُس کا باپ اُس کو بہت چاہتا تھا۔ اور جو بات اُس کے منھ سے نکل جاتی

اُس کو پورا کرنے کی کوشش کرتا۔ اُس کی خواہش تھی کہ وہ بھی زندہ جاوید شاعر پشکن کی طرح بڑا آدمی ہو جائے۔ کئی کئی دن تک مسلسل خاموشی اختیار کر لینا اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑنا اور خوشی کے مارے اِدھر اُدھر پھدکتے پھرنا اس کا وطیرہ ہو گیا تھا۔ وہ ہر حالت میں مست رہتا تھا۔ اُسکا باپ جب اُس کو کھلکھلا کر ہنستے دیکھتا تو بہت ہی خوش ہوتا تھا۔ دراصل اُس کو اِس لڑکے سے بڑی محبت تھی اور وہ اُس کے مزاج کے اُتار چڑھاؤ کو بڑے غور سے دیکھا کرتا تھا۔

مگر میکسم کو یہ بات پسند نہ تھی۔ وہ اپنے بھائی کے اُداس چہرے اور خوشی کے لمحوں دونوں کا مذاق اُڑایا کرتا تھا "تم تو کتاب کے کیڑے ہو۔ اور بھوت اور جنّوں کی دُنیا میں رہتے ہو۔ آج کوئی کھلونا ٹوٹ گیا، تو بچوں کی طرح رونے لگے۔ پھر کل کوئی دوسرا کھلونا مل گیا تو خوش ہو گئے۔ کسی کتاب میں پڑھ لیا کہ فلاں رانی پر مصیبت آئی تو فکر میں ڈوب گئے اور جیسے ہی یہ پڑھا کہ راجا نے اُس کو بچا لیا تو خوشی کے مارے پھولے نہ سمائے۔ ارے بھائی اِن باتوں میں کیا رکھا ہے۔ کتابی دُنیا کو چھوڑ کر حقیقی دُنیا میں قدم رکھو۔ ناولوں کے افراد پر غور کرنے اور قصہ کہانیوں پر سر دھننے کے بجائے دُنیا کے روزمرہ واقعات پر غور کرو۔ معمولی دُنیاداروں کو افسانہ نگاروں کی معشوقوں سے اُلجھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کتابی دُنیا کے چکر میں پڑ کر کسی کو آج تک کچھ حاصل نہیں ہوا۔"

نکولس نے پوچھا کہ "کیا تمہاری رائے میں روپیہ پیدا کرنا ہی زندگی کا مقصد ہے؟"

میکم نے کہا کہ "ضرور۔ روپیہ پیدا کر کے خرچ کرنا ہی زندگی کا مزہ ہے۔"

"کتاب لکھنے والے بھی تو دولتمند ہو سکتے ہیں۔ پھر کیا نکولس تصنیف و تالیف سے امیر نہیں ہو سکتا؟" لیو نے کہا "جی ہاں! آپکی طرح اُسے روپیہ جمع کرنے کی دھن نہیں ہے اور دولت سے تو اُسے نفرت ہے۔ اِس لئے دولتمند تو نہیں مگر مشہور بلاشبہ ہو سکتا ہے۔" میکسم نے خشکی سے مسکرا کر جواب دیا۔

نکولس نے کہا "تو یہی سہی۔"

"یہی کیوں؟ کتابوں کی اچھی اشاعت ہو جائے تو دھن دولت اور نام و شہرت دونوں مل سکتے ہیں اور تم تو روزانہ کچھ نہ کچھ لکھا کرتے ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمھاری تصانیف پشکن کے ٹکر کی ہوتی ہیں" لیو نے مسکرا کر کہا۔

"بھلی ہوں یا بُری۔ مگر بازار میں ان تصانیف کا کوئی پوچھنے والا نہیں۔ نکولس یوں ہی اپنا وقت برباد کرتا ہے۔" میکسم نے جھنجھلا کر کہا۔

نکولس کے ہونٹھ پھڑک اُٹھے۔ وہ آبدیدہ ہو گیا اور چپ چاپ وہاں سے چلا گیا۔

"تم بڑے بے مروت ہو؟ اور نکولس کا دل دکھانے میں نہ جانے تم کو کیا مزہ ملتا ہے؟" لیو نے

حقارت آمیز لہجہ میں کہا۔

"تو تم خفا کیوں ہوتے ہو، اسمیں غصہ کی کیا بات ہے؟"

"مجھے ناراض ہونے کی کیا ضرورت ہے؟"

"لیکن معلوم ایسا ہی ہوتا ہے۔ خیر چلو کچھ کھا پی لو تاکہ طبیعت ذرا سنبھل جائے۔"

میکسم اور لیو میں کبھی نہیں بنتی تھی۔ اوّل تو لیو مہذب اور تعلیم یافتہ نہ تھا۔ دوسرے وہ بڑا بخیل تھا۔ ہمیشہ کم سے کم خرچ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

میکسم نے ایک دن اُس سے یہ سوال کیا کہ "آخر یہ روپیہ کس کے لئے جمع کر رہے ہو؟ روپیہ خرچ کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ مگر تم تو ...."

"بے شک روپیہ خرچ کرنے ہی کے لئے ہوتا ہے مگر قرینہ اور عقلمندی کے ساتھ ....."

"تم خرچ کرنا کیا جانو؟ اگر جانتے ہوتے تو معلوم ہوتا کہ کسی دُکان پر جاکر روپیہ خرچ کرنے میں کیسا لطف حاصل ہوتا ہے؟ مجھ سے پوچھو نہ؟ میں تو اتنا پیدا ہی نہیں کرتا جتنا خرچ کر ڈالتا ہوں" میکسم نے چٹکی لیتے ہوئے کہا۔

"اسمیں کون سی شیخی کی بات ہے؟ خرچ تو ایک گنوار آدمی بھی کر سکتا ہے مگر پس انداز کرنا بیشک عقلمندی کی بات ہے۔"

"دیکھنا کسی دن میرا نصیب بھی چمکیگا۔ پچھلی مرتبہ بازی جیتنے میں تھوڑی سی کسر رہ گئی تھی نہیں تو...."

"ارے یہ بتاؤ کہ ملا کیا؟ اپنی ہی جیب کا روپیہ کھو بیٹھے نہ؟"

"اس سے کیا؟ ہار ہوئی تو کبھی جیت بھی ہوگی۔ جس دن گہرا ہاتھ پڑا۔ سمجھو تقدیر چمک اُٹھی۔"

لیو نے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے ٹھڈی کھجلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں ٹھیک ہے۔ بھلے دن گذرتے دیر نہیں لگتی۔ لیکن بُرے دن پہاڑ کی طرح کاٹے نہیں کٹتے۔"

"بھئی ان باتوں میں کیوں سر کھپاتے ہو۔ پرانے زمانہ میں تو لوگوں کو کوئی کام ہی نہ تھا۔ بیٹھے بٹھائے فضول باتیں بنایا کرتے تھے۔ تم بھی اس چکر میں پڑ گئے تو تمام عمر محنت کرتے کرتے مر جاؤ گے۔ مگر آرام و آسائش کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔"

"محنت اور مشقت تکلیف دہ تو ضرور معلوم ہوتی ہیں لیکن انکا نتیجہ ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔" لیو نے آہستہ سے کہا

اسی وقت سائمن گلنکا داہنے ہاتھ میں اخبار لئے کمرہ میں داخل ہوا۔ میانہ قد مگر خوب تندرست آدمی تھا۔ گٹھا ہوا جسم ہونے کی وجہ سے کسی قدر کوتاہ قامت معلوم ہوتا تھا۔ داڑھی کے بالوں کی جڑیں سفید ہو رہی تھیں

چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں اور گنجان ابرو آنکھوں پر سائبان کا کام دے رہے تھے۔
اخبار پر نظر جماتے ہوئے سائمن نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا کہ "بس۔ اب باتوں کا زمانہ گیا۔ جنگ کا طوفان سر پر آگیا۔ ایسی ہی کوئی خلاف توقع بات ہو جائے تو میں نہیں کہہ سکتا ورنہ جنگ چھڑنے میں کوئی کسر نہیں معلوم ہوتی ہے۔
اس پر میکسم نے کہا کہ "ہاں اگر زار نے شرائط منظور نہ کیں تو جرمنی ضرور تیغ آزمائی کرے گا۔
گلنکا نے لمبی سانس بھر کر کہا کہ "جرمنی تو لڑنے پر آمادہ ہے ہی۔ اُف یہ لڑائی کیسی خوفناک ہوگی۔ طرفین کے نہ معلوم کتنے جوان اس میں کام آجائیں گے۔"
"آپ تو دِل دہلانے والی باتیں کر رہے ہیں۔ ذرا اخبار تو دیجئے۔ آپ کی تو یکطرفہ بات کرنے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔" میکسم نے کسی قدر تیزی سے کہا۔
وہ بہت جلد اخبار کا پورا کالم پڑھ گیا۔ مگر پڑھتے پڑھتے اُس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔
"ہاں! آثار تو کچھ اچھے نظر نہیں آتے۔ مجھکو بھی 'ریزرو فورس' میں شامل ہونا پڑے گا۔ لیو تم کو بھی تو جانا پڑیگا۔"
لیو نے سنجیدگی کے ساتھ اپنی گردن ہلاتے ہوئے کہا "آہ کیسی بھیانک بات ہے۔ لیکن خدا کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کرنے کے سوائے اور چارہ ہی کیا ہے۔"
"ہم غریبوں کے لئے تو سب سے بڑی آفت یہ ہے کہ لڑائی چھڑتے ہی ہم بھوکوں مرنے لگیں گے۔" گلنکا نے یہ بات بڑی دردناک آواز میں کہی جس سے ثابت ہوتا تھا کہ جنگ کا خوف اُس کے دِل میں سما گیا ہے۔
"محنت اور خدا پر بھروسہ رکھو۔ یہ دونوں باتیں کسی آدمی کو بھوکا نہ مرنے دیں گی" لیو نے پھر ایک مشہور مثل دھرائی۔
میکسم نے اخبار کو زمین پر ڈال کر کہا کہ "میں باہر جا کر دیکھتا ہوں کہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟
اُس کے باپ نے کہا کہ "جاؤ۔ مگر جلد ہی واپس آنا۔ ہم بھی لڑائی کی خبر جاننے کے خواہشمند ہیں۔"
میکسم گلیوں میں ہوتا ہوا صدر بازار کی طرف چلا۔ اُس کے دِل میں ایک طرح کی ہلچل مچی ہوئی تھی راستے کے ہر موڑ پر لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ افواہوں اور قیاس آرائیوں کا بازار گرم تھا۔ جرمن سرحد پار کر کے وارسا کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ ایک جگہ اُس نے لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ روس کے کشادہ میدان خدا نے دشمنوں کے ڈھیر لگانے ہی کے لئے بنائے ہیں۔۔۔۔۔"
کچھ لوگ تو لڑنے کے شائق اور کچھ لوگ اس سے خائف تھے۔ میکسم انھیں ڈرنیوالے لوگوں میں تھا۔ اُس کا ڈرپوک دِل لڑائی کی خبریں سُنکر کانپ اُٹھا۔ وہ سوچنے لگا۔ لڑائی چھڑ گئی تو زندگی کا لطف ختم ہو جائیگا

اور بڑی مصیبت کا سامنا ہوگا۔ اُس کا خود غرض دِل صرف اپنے ہی دُکھ سکھ کی بات سوچ سکتا تھا۔ اُسے اپنے ملک کی تو کچھ پروا نہ تھی۔ البتہ اپنے آرام و آسائش کا بڑا خیال تھا۔ آج اُس کو اپنے افلاس کا علم ہوا۔ اور یہ خیال آیا کہ اگر تھوڑا روپیہ بھی پاس ہوتا تو وہ روس چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلا جاتا۔ یہ سوچ کر وہ بہت پریشان خاطر ہوا۔ اُس کی خواہش ہوئی کہ کسی ایسے محفوظ مقام پر چلا جائے جہاں لڑائی کا ذکر ہی سُننے میں نہ آئے لیکن اِسوقت اُسے کوئی ایسا مقام دکھائی نہ دیا۔ اسوقت تو ہر جگہ لڑائی ہی کا چرچا تھا۔ گھر لوٹنے سے پہلے اُس کو فوج میں بھرتی شروع ہونے کی خبر معلوم ہوگئی۔

میکسم گلی کے نکڑ تک پہونچا تھا کہ سیونگ بنک کے ایک ملازم سے اُس کی ملاقات ہوگئی۔

"آج اِسقدر جلد کیسے گھر لوٹ چلے؟" میکسم نے پوچھا۔

"اور تم۔۔۔؟ کیا کہوں۔ لڑائی کی افواہ نے بڑی گڑبڑ مچا رکھی ہے۔ ابھی بہت سا کام کرنیکو پڑا ہوا ہے دفتر سے آرہا ہوں۔ اور تکان محسوس ہورہی ہے۔"

"بھئی کیا کہتے ہو؟ کیا اب بھی لوگ روپیہ جمع کرنے کی فکر میں ہیں؟" میکسم نے تعجب آمیز لہجہ میں پوچھا۔

"نہیں۔ جمع نہیں کر رہے ہیں بلکہ جمع کیا ہوا روپیہ واپس لے رہے ہیں۔ کھڑکی پر ایک بھیڑ سی لگی ہے۔"

"آہ میرا تو ایک حبہ بھی جمع نہیں ہے۔"

"تم کو اِس بارہ میں لیو سے نصیحت لینی چاہیئے۔"

میکسم کا ماتھا ٹھنکا۔ اُس نے اپنے دوست کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے پوچھا:-

"کیا آج تم نے لیو کو دیکھا تھا؟"

"مجھ سے اِس سوال کے جواب کی اُمید نہ رکھئے۔ اُس نے احتیاط برتتے ہوئے کہا۔"

کیا اُس نے بھی سو دو سو روپیہ واپس لیا ہے؟ کچھ تو انداز بتا دیجئے؟"

"اُس سے بھی زیادہ!"

"تین، چار سو؟"

"اُس نے چاروں طرف دیکھا پھر دھیرے سے کہا" پورے پانسو۔ معلوم نہیں وہ اِتنے روپئے لیکر کیا کریگا؟"

"پانسو۔ پورے پانسو؟" میکسم اپنے دل میں بڑبڑایا اور گم سا ہو کر اپنے دوست کی طرف دیکھنے لگا۔

آپسمیں کانا پھوسی کرتے ہوئے دونوں چل دے۔

"لیو اِتنی بڑی رقم لے کر کیا کرے گا؟" میکسم کے دوست نے پوچھا۔

"ممکن ہے بھرتی کے ڈر سے کہیں باہر بھاگنے والا ہو،" میکسم نے جواب دیا۔

"اگر یہ بات ہوتی تو وہ کچھ اور بھی نکالتا۔"

"کیا ابھی اُس کی کوئی اور رقم بھی جمع ہے؟"

"ہاں ابھی کچھ اور ہے۔ اگر وہ باہر جاتا۔ تو کُل روپیہ نکال لیتا۔" دوست نے آہستگی سے کہا۔ اُس کے بعد لڑائی کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے دونوں گھر کی طرف چل دیئے۔

میکسم گھر کے بجائے ایک کھُلے ہوئے میدان کی طرف چلا گیا۔ اُس کو روپے کی ضرورت تھی۔ لیو کے روپیوں کا حال سُن کر اُس کو لالچ آ گیا۔ اگر یہ روپئے اس کو مل جائیں تو اسی وقت وہ کہیں باہر چلا جائے۔ یہ سوچتے ہوئے اُس کو اِس بات کا بھی کچھ خیال نہ آیا کہ اسوقت بھاگ جانے پر لوگ اُسے کیا کہیں گے؟ اُس کے وطن اور بھائیوں کا کیا حال ہوگا؟ خود غرضی کے سامنے اُسے ان باتوں کا کوئی خیال نہ آیا۔

لیو نے بنک سے روپیہ لاکر اپنے کمرہ میں کپڑوں کے صندوق میں رکھ دیا۔ اس کے بعد نکولس سے باتیں کرنے کے لئے نیچے کے کمرے میں چلا گیا۔ نکولس ابھی باہر سے آیا تھا۔ اور کھڑکی کے پاس بیٹھے ہوئے پُشکن کی شاعری کا مجموعہ دیکھ رہا تھا۔

"چاروں طرف لڑائی کا چرچا ہے اور آپ شاعری میں اُلجھے ہوئے ہیں" لیو نے ہنستے ہوئے کہا۔

نکولس نے جو اپنے مطالعہ میں محو تھا، اوپر نگاہ اُٹھائی اور کہنے لگا۔ "بھائی، پُشکن کو بھی کمال حاصل ہے، لڑائی ہو یا امن ہر عنوان پر اچھا لکھتا ہے۔ ذرا اس کو سنو تو:-

اُٹھو۔ اُٹھو۔ سب مل کر ایک ساتھ اُٹھو۔

روس کے بہادر لوگو! نڈر ہو کر آؤ۔
سمندر کی لہروں کی طرح لاکھوں کروڑوں کی غیر محدود تعداد میں
دشمن کی مغرور سپاہ کو شکست دو
روس کے کشادہ میدانوں میں تم کو سونے کے لئے جگہ ملے گی
اپنے بھائی کی قبر کو کوئی بھول نہ سکیگا۔"

لیو نے دھیمی آواز میں کہا کہ "ہاں! فتح حاصل ہونے تک نہ معلوم کتنے کام آئیں گے۔"

"آہ! مجھے دلی افسوس ہے کہ میں لڑائی میں نہ جا سکونگا۔ فتح حاصل کرنا یا اپنے ملک کے لئے جان دینا دونوں بڑی خوش نصیبی کی باتیں ہیں۔ افسوس! ہزاروں آدمی لڑائی میں جائیں گے مگر میں یہیں پڑا رہونگا۔ لیو میں کتنا بد نصیب ہوں۔"

"تم بھی اپنا فرض ادا کرنا۔ نکولس روسی بہادروں کے کارناموں کے ترانے گانا۔ تا کہ آنے والی نسلیں

اُن سے بہادری کے سبق حاصل کریں۔

"ہاں اب میں سمجھا۔ تم کو وہ اشعار یاد ہیں جو میں نے اُس دن سُنائے تھے؟"

"ہاں۔ بیشک وہ اشعار خوب تھے۔ اب دوبارہ پڑھ کر سناؤ" لیو نے زور دے کر کہا۔

نکولس سنبھل کر کھڑا ہو گیا اور بائیں ہاتھ میں کتاب لے کر کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ اور کتاب سے خوش الحانی کے ساتھ وہ ایک جوشیلی نظم پڑھنے لگا۔

نظم پڑھتے وقت اُس گلا بہت ہی سُریلا ہو گیا تھا۔ لیو اُس کی خوش الحانی پر محو تھا۔ عموماً اسے شعر و سخن سے کوئی زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ مگر نکولس کے پڑھنے میں نہ معلوم کیا بات تھی جو اُس کو ہمہ تن محو کئے ہوئے تھی۔

نکولس، نظم ختم کر کے کرسی پر جا بیٹھا تو لیو نے کہا "تم نے تو پڑھنا بند کر دیا، اچھا اب فوارے والی نظم سناؤ۔"

نکولس نے لیمپ جلایا۔ نظم پڑھتے پڑھتے وہ تھک گیا تھا۔ اُس نے ایک موٹی سی کتاب اُٹھائی اور قابل مصنف کی مشہور نظموں کو اُلٹنے لگا۔ اور پڑھتے پڑھتے خود بھی ایسا محو ہو گیا۔ جیسے کوئی ایکٹر اسٹیج پر ایکٹنگ کر رہا ہو۔ کبھی کرسی پر اُچکتا اور کبھی اُٹھ کر کمرے میں گھومتا۔

میکسم دبے پاؤں گھر میں آیا اور کھڑکی سے یہ نظارہ دیکھا۔ اُسے معلوم تھا کہ یہ شغل جلد ختم ہونے والا نہیں ہے۔ کیونکہ اکثر اوقات لیو سنتے سنتے خراٹے لینے لگتا تھا مگر نکولس نظمیں پڑھتا ہی جاتا تھا۔

میکسم نے دل میں سوچا کہ "یہی موقعہ ہے"۔ اُس نے باورچی خانہ کے اندر دیکھا کہ اُلنکا ایک کرسی پر خراٹے لے رہی ہے۔ اُس کے والد سائمن گلنکا کے ایک گھنٹہ تک واپس آنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔

جس خاموشی اور احتیاط کے ساتھ بلی چوہے پر وار کرنے کیلئے آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہے ٹھیک اسی طرح میکسم بھی لیو کے کمرے کی طرف چلا۔ اُس کو معلوم تھا کہ لیو کا صندوق کہاں رکھا ہے۔ اِس لئے تاریکی میں بھی اُس نے صندوق ڈھونڈھ لیا۔ اُس میں قفل لگا ہوا تھا۔ ٹٹولنے پر کوئی چیز کھنک اُٹھی۔ یہ تالیوں کا گچھا تھا جو قفل ہی میں لگا ہوا رہ گیا تھا۔ قفل کھول کر اُس نے صندوق ٹٹولنا شروع کیا۔ ایک ایک کر کے دو تھیلیاں اُس کے ہاتھ لگیں۔ اُن کو اُٹھا کر اُس نے رکھ لیا۔ مگر اس وقت اسکا دل زور سے دھڑک رہا تھا۔

اُس کے بعد اُس نے صندوق بند کر کے قفل لگا دیا۔ کنجی کے گھمانے کی آواز کمرے میں گونج اٹھی اور وہ دبے پاؤں اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ زینے تک آ گیا۔ اُس کو برابر یہی شک رہا کہ کہیں کوئی پیچھے سے تو نہیں آ رہا ہے حالانکہ چاروں طرف خاموشی تھی۔ ہاں نکولس ابھی تک نظم پڑھ رہا تھا۔ اِسی اثنا میں اُلنکا کے کمرے کی گھڑی گھنٹی بجانے لگی۔ میکسم کانپنے لگا۔ تھوڑی دیر تک رک کر وہ پھر نیچے اترنے لگا۔ خوف سے اُس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا، اور وہ گھبرا گیا۔ نکولس کی آواز برابر آ رہی تھی "یہ کمبخت سب کو جگا دیگا۔" اُس نے

نکولس کو دِل ہی دِل میں کوسنا شروع کیا۔" سامنے ہی باہر جانے کا دروازہ ہے"۔ اُس نے جوتے اُتار کر ہاتھ میں لئے اور دروازے سے جلدی سے باہر نکل بھاگا۔ گلی سے نکل کر اُس نے پھر جوتے پہن لئے۔

میکسم کا مطلب پُورا ہوگیا۔ خاصی رقم ہاتھ لگ گئی اور کوئی پکڑ بھی نہ پایا۔ اُس نے اپنے دِل میں سوچا کہ اب میں کبھی گھر نہ جاؤنگا۔ ان باتوں سے اس کی روحانی کوفت کم نہ ہوئی۔ اُس کے دِل میں ایک تلاطم سا برپا تھا۔ اُس کا ضمیر ملامت کر رہا تھا کہ تم نے بہت بُرا کام کیا ہے۔ اپنے دوست کا روپیہ چرا لیا ہے۔ اِس گناہ کی تم کو ضرور سزا ملیگی"۔ اُس کا ضمیر بار بار اُس سے یہی کہہ رہا تھا۔

آخر جب اس کو اطمینانِ قلب نصیب نہ ہوا تو وہ ایک شراب کی دکان میں چلا گیا۔

ایک گھنٹے کے اندر ہی میکسم کا باپ بھی گھر آگیا۔ اس وقت نکولس جنگ کے متعلق باتیں کرنے میں مشغول تھا۔ نکولس نے پوچھا کہ "جب تم لڑائی پر چلے جاؤ گے تو میرا جی کیسے لگیگا؟"

لیو نے کہا کہ " میرا جانا تو طے شدہ امر ہے۔ کون جانے اب پھر ملاقات ہو یا نہ ہو"؟

اسی وقت گلنکا بھی کمرے میں داخل ہوا۔ اور لیو نے پوچھا کہ "کوئی نئی خبر تو نہیں ہے"؟

"طرح طرح کی افواہیں پھیل رہی ہیں۔ کیا معلوم کون سی بات سچ اور کون سی جھوٹ ہے؟ مگر کچھ ہو کر ہی رہیگا اس میں تو کسی کو کلام نہیں۔ میکسم کہاں ہے؟"

"وہ ابھی تک نہیں آیا" نکولس نے جواب دیا۔

"نکولس۔ بیٹا جاؤ اور رم النکا کو جگا کر کافی تیار کرنے کو کہدو"۔

نکولس مستعدی سے کھڑا ہوگیا۔ اور یہ کہہ کر کہ "النکا سوتی ہوگی میں ہی بنائے لاتا ہوں" کمرہ سے باہر نکل گیا۔

لیو نے اپنی کرسی گلنکا کے پاس کھسکا لی اور دونوں باتیں کرنے لگے۔

"اب ہمارا تمہارا دنوں کا زیادہ دِنوں تک ساتھ نہ رہ سکیگا۔ جنگ میں داخل ہونے کا دروازہ تو بہت بڑا ہے مگر اُس سے باہر نکلنے کا راستہ بہت ہی چھوٹا ہے۔ اسی لئے میں تم سے آج کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ نکولس بیٹا کتنا نوجوان نہیں ہے۔ پچھلے سردی کے دِنوں میں اُس کی کیا حالت ہوگئی تھی۔ یہ تم کو معلوم ہی ہے۔ نہ معلوم لڑائی میں اُس پر کیا آفت نازل ہو۔ اِسی لئے میں اپنی ساری کمائی اُس کے حوالہ کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ وہ کسی ایسے مقام پر پہونچ سکے جہاں سردی ذرا کم پڑتی ہو"۔

گلنکا کا دِل بھر آیا۔ احسان سے اُس کی گردن جھک گئی۔ وہ کچھ کہہ نہ سکا۔

"میں نے آج بنک سے پانسو روپئے نکالے ہیں اگر یہ کافی نہ ہوں گے تو سو روپئے اور دے سکتا ہوں۔ ڈاکٹر کے مشورہ سے طے کریں گے کہ نکولس کو کہاں جانا چاہئیے۔ جہانتک ہو جلدی کرنا چاہئیے۔ دیکھنا تم انکار نہ کرنا"۔

"خدا تم کو اِس کا اجر خیر دے۔ تم بڑے دریادل ہو" گلنکا نے بھرے ہوئے دل سے کہا۔
گلنکا کو نکوتس کا بہت بڑا خیال تھا۔ اُس کو ہمیشہ اسی بات کی فکر رہتی تھی کہ نکوتس کا جاڑا کس طرح کٹے گا۔ وہ بہت ہی کمزور تھا۔
"مگر اس کے متعلق نکوتس سے ذکر نہ کرنا ورنہ وہ قبول نہ کریگا۔ بڑا خوددار جوان ہے۔"
"لیو۔ مجھ سے ممکن ہوا تو تمہارا روپیہ ضرور واپس کردوں گا۔ ہاں اسوقت نکوتس کی خاطر سے انکار نہیں کرسکتا۔ خدا میدان جنگ میں تمھاری مدد کرے۔"
"خاموش رہیئے۔ نکوتس آرہا ہے۔ اُس کے سامنے کچھ نہ کہئے۔" لیو نے دھیرے سے کہا۔
نکوتس نے کافی کا پیالہ لاکر میز پر رکھدیا۔ اُسکے بعد وہ سونے چلاگیا۔ لیو میکسم کے انتظار میں وہیں بیٹھا رہا۔
کسی دوست نے گلنکا کو بتلایا کہ اُس کا بڑا لڑکا میکسم ایک شراب خانہ میں یہ کہتے دیکھا گیا کہ لڑائی میں شامل ہونے کے بجائے وہ روس سے بھاگ جائے گا۔ گلنکا کو اس خبر سے بڑی تکلیف پہونچی۔ اس کا لڑکا لڑائی کے خوف سے بھاگ جائے۔ اس کے لئے یہ ڈوب مرنے کی بات تھی۔ سب لوگ وطن عزیز کیلئے جان دینے کو تیار ہیں۔ مگر اُسکا لڑکا اپنی جان لیئے بھاگا جارہا ہے۔ یہ سوچکر اُس کو بہت روحانی کوفت ہوئی۔
اِسی وقت لیو کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ گلنکا کے نزدیک آکر اُس نے کہا۔
"میکسم یہاں آیا اور چلا گیا۔"
گلنکا کھڑا ہوگیا اور کہا۔ "کیا کہہ رہے ہو؟"
"ہاں! وہ آیا اور میرے سب روپئے چُراکر چلا گیا۔ مجھے فرش پر میکسم کا رومال پڑا ہوا ملا ہے" یہ کہکر لیو نے خوشبو سے معطر ایک رومال میز پر ڈال دیا۔
گلنکا کا گویا کسی نے گلا کاٹ ڈالا۔ اس وقت اگر لیو اُسکو نہ سنبھالتا تو وہ زمین پر گر پڑتا۔
میکسم ریل سے پٹروگریڈ نہ چھوڑ سکا۔ کیونکہ زار نے ریل گاڑیوں کی آمد رفت بند کرادی تھی۔ تین دن اور تین رات تو اُس نے ایک جوئے کے اڈے پر گذارے۔ یہاں پر اُس نے تین سو روپئے ضائع کردے۔ اُس کے بعد ایک تجارتی جہاز کے مالک سے مل کر اور اُسے کچھ رشوت دیکر اُس نے روس چھوڑنا طے کیا۔ مگر اس طرح بھی اس کا مقصد پورا نہ ہوا۔ زار کے آدمیوں نے اُس جہاز کی تلاشی لی اور میکسم کو گرفتار کرلیا۔ میکسم کو کورٹ مارشل سے سزا ہوئی۔ جسے بھگتنے کے بعد وہ فوج میں بھرتی کرکے لڑائی میں بھیج دیا گیا۔

کئی مہینے گذر گئے۔ میکسم نے لڑائی میں کئی معرکے فتح کئے۔ اب وہ بزدل میکسم نہ تھا۔ لڑائی کی مصیبتوں نے

اُس کو نڈر بنا دیا تھا۔ خاص کارگذاری دکھانے کے صلہ میں اُسے دو مرتبہ ترقی بھی مل چکی تھی۔ لیکن اُس کا گناہ ــــ روپیوں کی چوری کا خیال ــــ رہ رہ کر اُسے ستاتا تھا۔ ہمیشہ خدا کے سامنے سر جھکا کر کہتا تھا کہ لڑائی ختم ہوتے ہی وہ تیو کا روپیہ واپس کر دیگا۔

جاڑے کا موسم آ گیا مگر لڑائی بند نہ ہوئی۔ کیا اس کا کبھی خاتمہ نہ ہوگا؟ کیا اُسے کبھی تیو سے معافی مانگنے کا موقعہ نہ ملیگا؟ روزمرہ اس قسم کے سوالات اُس کے دل میں اُٹھنے لگے۔

پولینڈ کے ایک معرکہ میں زخمی ہو جانے پر وہ اسپتال بھیجدیا گیا۔ اور جب صحت ہوئی تو گیلیشیا کی ایک رجمنٹ میں بھیج دیا گیا۔

اِس دفعہ کارپیتھین کے مشرقی ڈھال پر میکسم کو آسٹرین سپاہ سے مورچہ لینا پڑا۔

ڈکلا نامی درہ میں زار کے بہادر سپاہیوں نے مورچہ لگایا۔ برف باری ہو رہی تھی۔ دوسری طرف برف کی آڑ میں دشمنوں کا مورچہ تھا۔ چاروں طرف برف سے ڈھکے ہوئے کانٹے دار تاروں کا حلقہ تھا۔ اس پر بھی زار کے بہادر سپاہی حملے پہ حملے کر رہے تھے۔ کتنے ہی معرکے فتح ہوئے۔ روسی سپاہیوں کو بڑی بھاری قربانیاں کرنی پڑیں۔ مگر اُنھوں نے ہمت نہ ہاری۔ بہادر سپاہیوں کے دستے برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑی کے ڈھال پر چڑھ جاتے تھے۔ اُدھر سے مشین گنوں سے گولیاں برس رہی تھیں۔ مگر روسی سپاہیوں کا دھاوا نہ رُکتا تھا بہت سے سپاہی نیچے لڑھک جاتے تھے مگر اُن کی جگہ فوراً ہی دوسرے سپاہی لے لیتے تھے۔ اس ہمت و دلاوری کی بدولت آخر کار اُنھوں نے دشمن کے بچاؤ کے سبھی راستوں پر قبضہ کر لیا۔ اب تک روس کی پہاڑیوں پر ایسی لڑائی کبھی نہ ہوئی تھی۔ چاروں طرف روندی ہوئی برف پر جوشیلے سپاہیوں کے پاؤں کے نشانات اور خون کے دھبے پڑے ہوئے تھے

شام کا وقت تھا۔ ایک بہت ہی ڈھالو پہاڑی پر آسٹرین فوج نے مورچہ باندھ رکھا تھا۔ مدافعت کا بھی بہت معقول انتظام تھا۔ میکسم اِسی دستے سے ٹکر لینے کے لئے اوپر چڑھ رہا تھا۔ جہاں سے لگاتار گولہ باری ہو رہی تھی۔ میکسم کے سپاہی برابر نیچے گر رہے تھے۔ انجام کار میکسم کی گارد کا تھوڑا سا حصہ بچ رہا۔ قریب قریب کُل افسر یا تو مر گئے یا بُری طرح مجروح ہو گئے تھے۔ باقی لوگ پہاڑی کے نکلے ہوئے حصہ میں اِس طرح جا چھپے، جیسے برف کے طوفان میں بھیڑیں "اندھیرا ہو جائے تو واپس ہوں"۔ یہ سوچ کر وہ موقعہ کا انتظار کرنے لگے۔ اِتنے میں میکسم نے آگے بڑھکر ایک پُرجوش تقریر کی، جس سے اُس کے سپاہیوں میں نئی اُمنگ پیدا ہو گئی۔ "پیٹھ دکھانے سے تو مر جانا بہتر ہی ہے" سب کے دلوں میں پھر ایک نیا جوش پیدا ہو گیا۔ لوگ آگے بڑھنے لگے۔ ان بچے کھچے لوگوں نے پہلا مورچہ فتح کر لیا۔ دوسرا بھی پار ہو گیا۔ اور اب

صرف آخری حملہ باقی تھا۔ اُس کو مار لیا تو بیڑا پار ہے"۔ لیکن فتح کے بالکل نزدیک پہونچ کر بھی میکسم کامیابی کا مُنھ نہ دیکھ سکا۔ وہ زخمی ہوکر لڑھکتا ہوا نیچے آگرا۔ اور بیہوش ہوگیا۔ اُس کا آدھا جسم برف میں دھنس گیا۔ کتنی دیر تک وہ بیہوش رہا یہ اُسے نہ معلوم ہوسکا۔ ہاں جب اُس کی آنکھ کھلی، تو اُس نے دیکھا کہ کوئی شخص اُسے اُٹھاکر کہیں لے جارہا ہے۔ اسی وقت اُس کی داہنی جانگھ میں زور کا درد ہوا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاگیا اور وہ پھر بیہوش ہوگیا۔

اب جو آنکھ کھُلی تو اُس نے اپنے کو لکڑی کے مکان میں ایک زخمیوں کی ڈولی میں پڑا پایا۔ چاروں طرف زخمی سپاہی پڑے ہوئے تھے۔ اُس کی جانگھ میں لکڑی کی تختیاں کس کر باندھ دی گئی تھیں۔ اور کوئی شخص اُس کے ہونٹھوں سے گلاس لگائے اُس پر جھکا ہوا کھڑا تھا۔ اُس نے پانی پیا تو کسی قدر تازگی محسوس کی۔ تب اُس نے اُس شخص کے چہرے کی طرف نظر بھر کر دیکھا اور آہستہ سے کہا "لیو"۔

درحقیقت وہ لیو ہی تھا۔ وہی میکسم کو اُٹھاکر لایا تھا۔

"لیو...... لیو، مجھے معاف کرنا۔ مجھے تمھاری معافی کی سخت ضرورت ہے۔ لیو۔ آہ! میں نے تمھارے روپئے چُرائے اور تم نے میری جان بچائی"۔ میکسم نے رُک رُک کر کہا۔

"میرے روپئے نہ تھے، نکولس کے تھے۔ میں نے اُس کو دیدیئے تھے۔ لیکن تم اُس سے معافی نہیں پاسکتے۔ وہ اب دُنیا میں نہیں ہے"۔

میکسم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور لیو نہ معلوم کدھر چلا گیا۔

مترجمہ چندر بھوشن سنگھ

تیس سال پہلے

تیس سال ہوئے جولائی ۱۹۱۱ء میں منشی تلوک چند صاحب محروم نے "موسمِ نوبہار" کے عنوان سے زمانہ کیلئے ایک دلکش نظم لکھی تھی۔ چنانچہ اُس کے دو بند موجودہ ناظرین زمانہ کی دلچسپی کے لئے درج ذیل ہیں:-

جوش و فورِ گل سے ہے حُسنِ چمن اُبھار میں ۔۔۔ تازہ ادائے پُرخلش نکلی ہے خار خار میں
پھوٹی ہیں کونپلیں نئی پہلوئے شاخسار میں ۔۔۔ میں ہی تو ایک غم بھرا دل ہوں لئے کنار میں
اب کے فسردگی ہے اور مرے دلِ نگار میں ۔۔۔ ورنہ ہے تازگی وہی موسمِ نوبہار میں

سرو سمن بناؤ میں، سنبل تر سنگار میں ۔۔۔ رکھدیئے ہیں پرو کے دل زلف کے تار تار میں
ایسی ادائے دلنواز اب کے ہے برگ و بار میں ۔۔۔ داغ پہ داغ پڑ گئے سینۂ لالہ زار میں
اب کے فسردگی ہے اور مرے دلِ فگار میں ۔۔۔ ورنہ ہے تازگی وہی موسمِ نوبہار میں

بیمارِ محبّت

از حضرت الطاف مشہدی

اے سوختہ جاں آہ ترا عہدِ جوانی
دل وقفِ الم، آنکھ سے اشکوں کی روانی

کیا بات ہے کس واسطے یہ حال ہے تیرا
بھیگا ہوا کیوں ریشمی رومال ہے تیرا
کیوں تیری نگاہوں سے برستے ہیں فسانے
اُف ہونٹوں پہ آنے کو ترستے ہیں فسانے
کیوں تیری طرف کس لئے دیکھا نہیں جاتا
ہونٹوں کو ترے مَیں کبھی خنداں نہیں پاتا
یہ سوز کی آغوش میں سویا سا ترنّم
کیوں چھین رہا ہے مرے ہونٹوں سے تبسّم
حیراں ہوں کہ تو رات کو کیوں سو نہیں سکتا
اِک داغ بھی سینے سے کوئی دھو نہیں سکتا
کیا بات ستاروں سے تو کرتا ہے شبوں کو
ہر آن یہ کیا آہ سی بھرتا ہے شبوں کو
یہ باغ میں کس چیز کا کرتا ہے اشارہ
پاگل نہ بنا دے تجھے پھولوں کا نظارہ

اے سوختہ جاں آہ ترا عہدِ جوانی
دل وقفِ الم آنکھ سے اشکوں کی روانی

شیرِ پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ

(۱)

سردار ہمت سنگھ سہارنپوری

ہندوستان ہزار ہا سال سے غیر ملکی لوگوں کے حملوں کا نشانہ بنتا رہا ہے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ جب کسی انسان میں کسی قسم کی جسمانی کمزوری پیدا ہوجاتی ہے تو وہ مختلف بیماریوں میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ یہی حالت اس دیش کی ہوتی رہی ہے۔ جنگ مہابھارت نے اِس مُلک کے بہادروں کا صفایا کر دیا تھا۔ اِس کمزوری کا فائدہ اُٹھانے اور اِس مُلک کی دولت سے اپنا گھر بھرنے کیلئے بدیشیوں کے پے در پے حملے شروع ہوگئے۔ اور ان حملوں نے اِس کو اسقدر کمزور بنا دیا کہ صدیوں تک یہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہوسکا۔ آخیر میں مغلیہ بادشاہوں نے حکومت قائم کی اور اُن کا زمانہ بھی ظلم و ستم سے خالی نہ رہا۔ مگر زمانہ کسی کا ساتھ نہیں دیتا ہے۔ ہر کمال کو زوال ہے۔ آخر کار اُن کا پیالہ بھی لبریز ہوکر چھلکنے لگا یعنی مغلیہ سلطنت کے حکمرانوں کی طاقت کو دکن میں مرہٹوں نے، پنجاب میں سکھوں نے اور راجپوتانہ میں راجپوتوں نے اسقدر کمزور کر دیا کہ وہ ایک ٹمٹماتا چراغ نظر آنے لگی۔ اور ملک کے مختلف حصوں میں مختلف حکمرانوں کی حکومتیں قائم ہوگئیں۔ یعنی ہندوستان سیکڑوں حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ صوبہ پنجاب میں بھی بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوگیں جو آپسمیں برسرپیکار رہنے لگیں۔

ادھر ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال میں قدم جما کر ہندوستان کے بیشتر حصہ پر اپنا تسلط جمانا شروع کر دیا اُسوقت یہ اندیشہ ہوا کہ یہ کمپنی جلد ہی سارے مُلک کو ہڑپ نہ کر جائے یا ہماری کمزوریوں سے فائدہ اُٹھا کر کوئی دوسری غیر ملکی حکومت اس پر حملہ نہ کر دے۔ چونکہ ہندوستان پر اس سے پہلے جسقدر حملے اُسوقت تک ہوئے تھے وہ سب پنجاب کے راستہ سے ہوئے تھے اور یہی حملہ آوروں کے داخل ہونیکا راستہ سمجھا جاتا تھا۔ اِس لئے یہ ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ کم از کم اِس صوبہ میں کوئی ایسا بیدار مغز انسان پیدا ہو جو پنجاب پر مضبوط سلطنت قائم کر کے حملہ آوروں کے لئے اس دروازہ کو ہمیشہ کے لئے بند کر دے، نیز ایسٹ انڈیا کمپنی کی بڑھتی ہوئی طاقت سے بھی اس کو محفوظ رکھے، اور صوبہ کے باشندوں کو جو ہزاروں سال سے مظالم کا نشانہ بن رہے تھے، امن و امان کے ساتھ زندگی بسر کرنیکا موقعہ دے۔

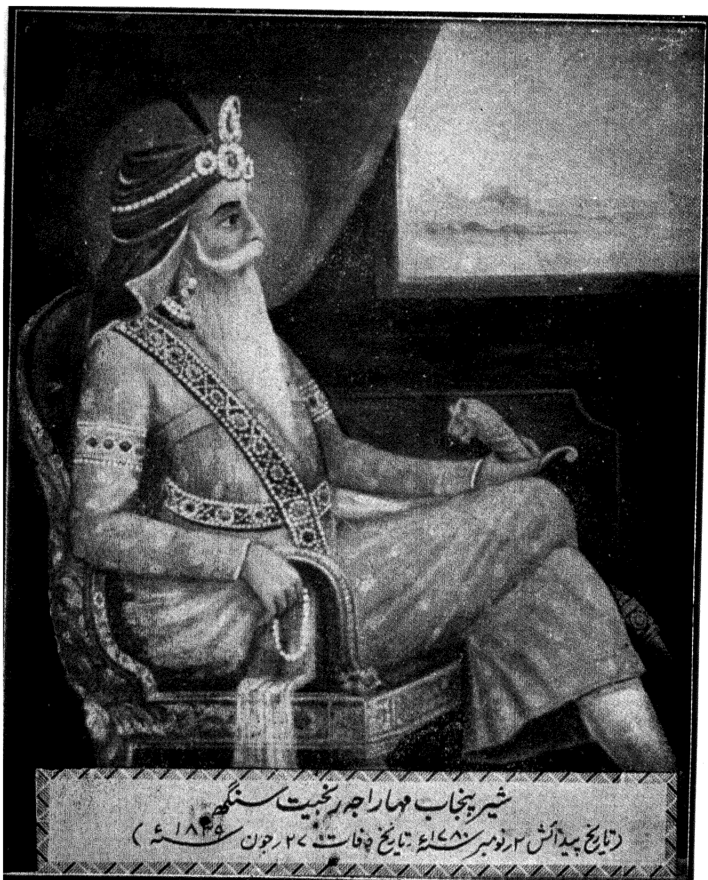
قدرت نے اس کام کی خدمت انجام دینے کے لئے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو چُنا۔ یہ بہادر اور اولوالعزم انسان ۲ نومبر ۱۷۸۰ء کو پنجاب میں پیدا ہوا۔ ان کے والد سردار مہان سنگھ ایک چھوٹی سی جاگیر کے مالک تھے باپ کے مرجانے پر مہاراجہ کی عمر صرف بارہ ۱۲ سال کی تھی۔ اُنھوں نے چھوٹی ہی عمر سے فتوحات حاصل کرنی شروع کردیں۔ اور آخر باشندگان کے اصرار پر ۱۷۹۹ء میں لاہور پر قبضہ کرکے لوگوں کو پوری حفاظت کا یقین دلایا۔ اس قبضہ سے پنجاب میں ایک نیا دَور شروع ہوا۔ لاہور پہونچ کر ۱۸۰۱ء میں رنجیت سنگھ نے مہاراجہ کا خطاب اختیار کرکے حکم دیا کہ اُن کو ہمیشہ سرکار لکھا جائے۔ اُس کے بعد اُنھوں نے ٹکسال قائم کرکے اپنے نام کا سکّہ جاری کیا۔ انصاف کےلئے عدالتیں مقرر کیں۔ انگریزوں سے دوستی کی۔ کیونکہ مصلحتِ وقت کا یہی تقاضا تھا۔ اور خود انگریز بھی اُن کی دوستی کے زبردست خواہشمند تھے۔ اسی طرح پر ترکی، روس اور فرانس نے بھی مہاراجہ سے دوستی کا دم بھرا۔ اور اپنے اپنے سفیر اُن کے دربار میں بھیجے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنی حکومت میں مذہب کی تفریق کا خیال بالکل اُڑا دیا۔ جہاں کہیں قابلیت نظر آئی۔ اُنھوں نے لائق آدمیوں کو انتخاب کرکے اپنی خدمت میں لیا۔ چنانچہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو اپنے مسلمان افسروں پر بھی ہندو و سکھ افسروں سے کم بھروسہ نہ تھا۔ اُنھوں نے فوج کو تربیت دینے کے لئے یورپین افسروں کو بھی اعلیٰ تنخواہوں پر مامور کیا۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جسقدر فتوحات کیں، انمیں اُن افسروں کا زیادہ حصہ تھا۔ بلکہ اس فوج کے وہ مشہور اور نامور جنرل جن کے نام سے کابل اور قندھار کی دیواریں ہل گئی تھیں، شیر دل ہری سنگھ نلوہ تھے، جنکی ذات پر صرف سکھ قوم ہی کو نہیں، بلکہ تمام ہندوستان کو فخر کرنے کا حق ہے۔ شیر دل ہری سنگھ نلوہ کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت قائم کرنے میں بہت بڑا دخل تھا۔

اگرچہ مہاراجہ لکھ پڑھ نہ سکتے تھے۔ مگر عالموں کی عزت کرتے تھے۔ شکل شباہت سے بھی وہ کچھ خوبصورت نہ تھے۔ مگر بشرہ سے رُعب برستا تھا۔ اور ہر وقت خوشی و زندہ دلی کے آثار نمایاں رہتے تھے اُن کے چہرہ کے جاہ وجلال کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ایک موقعہ پر جب فقیر عزیز الدین شملہ گئے، انگریزوں نے سوال کیا۔ "کیا تمہارا مہاراجہ کانا ہے؟"

فقیر عزیز الدین نے حیران ہوکر جواب دیا۔ "میں نے آج آپ لوگوں سے ایسا سُنا ہے۔ میرے مالک کے چہرہ میں وہ نور وجلال ہے کہ میں آج تک کبھی بھی اُن کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھ سکا۔"

مہاراجہ کی قوتِ متخیلہ بڑی تیز تھی۔ وہ بہت مستعد اور خوش دل تھے۔ اُن کی طبیعت میں فیاضی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ مزاج میں تعصب کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ وہ اپنے وقت کے زبردست مدبر



شیر پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ
(تاریخ پیدائش ۲ر نومبر ۱۷۸۰ء تاریخ وفات ۲۷ر جون ۱۸۳۹ء)

سیاستدان تھے۔ درحقیقت اُسوقت ان سے بہتر ہندوستان میں کوئی دوسرا حکمران نہ تھا۔ مہاراجہ کی حکومت پنجاب کے ہر طبقہ کے لوگوں کی نمایندہ تھی۔ اِس لئے اپنے وقت کے لحاظ سے اُنکی حکومت عوام کی نمایندہ حکومت کہی جانے کی مستحق ہے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ لوگوں سے کام لینا خوب جانتے تھے۔ ایک دفعہ اُن کی فوج نئی وردی پہننے اور نئے طریقے اختیار کرنے سے ذرا جھجکی۔ تو خود مہاراجہ نے اس قسم کی وردی پہنی اور قواعد شروع کردی، تاکہ سپاہی اُن کی نقل کریں۔ اور ان کی جھجک دور ہوجائے۔ اُس کے ساتھ ہی وہ سپاہیوں کے جذبات و خواہشات کا بہت احترام کرتے تھے۔ اِس لئے اُنھوں نے اپنے انگریز افسروں سے جو اُن کے یہاں ملازم تھے یہ عہد کرالیا تھا کہ وہ گائے کا گوشت نہ کھائیں گے، ڈاڑھی نہ کٹوائیں گے اور تمباکو نہ پئیں گے، مگر بعد میں تمباکو کی اجازت دیدی تھی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ ایک اعلیٰ درجہ کے بیدار مغز و منظم انسان تھے۔ اور جو بات وہ اپنے تجربہ اور عقلِ خُداداد کے زور سے کہہ دیتے تھے، وہی ہوجاتی تھی۔ اس کا ثبوت اس واقعے سے بخوبی ملتا ہے کہ ایکدفعہ مہاراجہ کے پاس ایک برہمن اپنی لڑکی کی شادی میں امداد طلب کرنے آیا۔ آپ نے اس درخواست کے جواب میں کہا کہ "سرکار تم کو پانچ روپیہ دینے کا حکم دیتے ہیں" برہمن حیران ہوگیا اور اسقدر رقم روپیہ لینے سے انکار کردیا۔ مہاراجہ نے کہا کہ "تیری قسمت کے خزانہ میں پانچ روپیہ ہی ہیں"۔ اس کی تسلی کیلئے مہاراجہ نے پانچ گملے منگوائے۔ چار میں پانچ پانچ ہزار اور ایک میں پانچ روپیہ رکھ کے سب کا مُنھ بند کرکے ایک جگہ ملاکر رکھ دئے اور برہمن سے کہا کہ ان میں سے کوئی گملہ اُٹھا لیجاؤ۔ اُس کا ہاتھ پانچ روپیہ والے گملے ہی پر پڑا۔ برہمن قائل ہوگیا۔ مہاراجہ نے کہا "ہمارا کیا قصور ہے۔ آپ کی قسمت میں سرکاری خزانہ سے پانچ ہی روپیہ ملنا مقدر ہے۔"

مہاراجہ رنجیت سنگھ بڑے حق شناس اور غایت درجے کے عدل پسند تھے۔ باوجود اس کے کہ وہ سکھ دھرم کے پکے معتقد تھے۔ لیکن اُنکے مزاج میں تعصب کو مطلق دخل نہ تھا۔ جو خوبیاں ایک سچے سکھ میں ہوسکتی ہیں وہ سب مہاراجہ رنجیت سنگھ میں موجود تھیں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے بڑے بڑے عظمت والے سرداروں کو مغلوب کرکے ختم کردیا تھا اور اُنکا تمام علاقہ اپنے قبضہ میں لے لیا تھا۔ لیکن یہ تمام کارروائی صرف اس حکمت پر مبنی تھی کہ وہ پنجاب بھر میں ایک مضبوط و مستقل سلطنت قائم کرنا چاہتے تھے جس کی اس وقت بڑی ضرورت تھی۔ درحقیقت مہاراجہ رنجیت سنگھ سخاوت، ہمت، شجاعت اور مردم شناسی وغیرہ تمام اوصاف سے بہرہ ور تھے۔ اور اس کے

ساتھ ہی بڑے صاحب اقبال اور فرخندہ خیال بھی تھے۔

آخر کار وہ دن بھی آ پہونچا کہ جس سے ہر شخص کو ایک روز دوچار ہونا پڑتا ہے۔ تاریخ ۱۵ ماہ اساڑھ سمت ۱۸۹۶ مطابق ۲۷ جون ۱۸۳۹ء روز پنجشنبہ شیر پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ جس کے نام کا دبدبہ تمام ملک میں پھیلا ہوا تھا۔ جس کی شجاعت، ہمت، لیاقت، سخاوت اور دلاوری و دلیری کے کارنامے تواریخ کے صفحوں کو زینت دے رہے ہیں، جس نے دریائے ستلج سے لیکر کابل اور تبت تک خالصہ قوم کا جھنڈا لہرا دیا، ایسے آرام سے سوگیا۔ کہ آج تک ایک صدی گذر جانے پر بھی کروٹ نہ بدلی، اور اپنے ساتھ دبدبۂ سکندری اور وہ حکم نادری جس سے ایک وقت زمین و آسمان بھی دہل اٹھتے تھے لے کر آناً فاناً خاک میں مل گیا ؎

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے
نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے

اُردو اکاڈمی دہلی

اُردو اکاڈمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے عنوانات ذیل پر بہترین مضامین کیلئے ڈھائی ڈھائی سو روپیہ انعام دینا تجویز کیا ہے۔ انعام کے متعلق اکاڈمی کا فیصلہ ناطق ہوگا اور منتخب مضامین کے تمام حقوق اشاعت وغیرہ بھی اُسے حاصل ہوں گے۔ ہر مضمون تقریباً پچاس ہزار الفاظ کا ہو، اور سکرٹری اُردو اکاڈمی کے پاس ۳۰ ستمبر ۱۹۳۹ء تک بھیجنا چاہئے۔ جو صاحب مضمون لکھنا پسند کریں۔ وہ پہلے اپنے مضمون کے انتخاب سے سکرٹری کو مطلع کردیں:-

۱۔ اشتراکیت، ۲۔ فاسزم، ۳۔ نازی ازم
۴۔ سامراج، ۵۔ وطنیت، ۶۔ سرمایہ داری
۷۔ بحیرہ روم کی سیاست، ۸۔ بحرالکاہل کی سیاست،
۹۔ امریکہ اور سیاست عالم، ۱۰۔ وسطی یورپ کی سیاست
۱۱۔ نوآبادیوں کی تقسیم ۱۲۔ ممالک اسلامی کی سیاست

منشی بشیشور پرشاد صاحب منور لکھنوی، مصنف "نسیم عرفاں منظوم" (ترجمہ بھگوت گیتا) کی نظموں کا مجموعہ "کائناتِ دل" کے نام سے عنقریب شائع ہونیوالا ہے۔ یہ نظمیں دورِ جدید کی اُردو شاعری کا بہترین نمونہ ہیں۔ شائقین اس دلکش مجموعہ کیلئے ابھی سے اس کے پبلشر رگھوبیر پرشاد سکسینہ، بلبلی خانہ دہلی کے پاس اپنی فرمائشات بھیج دیں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ

(۲)

از ڈی۔ پی۔ بھٹناگر گُشتہ

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات کو ۲۷ جون ۱۹۳۹ء کو سو برس پورے ہوئے۔ چنانچہ آپکی صد سالہ برسی پر اہلِ ملک نے متحدہ حیثیت سے آپ کی یاد میں خراجِ تحسین و عقیدت پیش کیا۔ فرقہ وارانہ جذبات اور مذہبی تعصب سے پاک رہ کر جس حُسن و خوبی و کامیابی سے آپ نے ملک میں حکومت کی اور انتظام و انصاف کا جو اعلیٰ معیار اپنے دورانِ حکومت میں آپ نے سامنے رکھا اُس کی نظیر دُنیا کی تاریخ میں شاذ و نادر ملیگی۔ یہی وجہ ہے کہ اسقدر عرصہ گذر جانے پر بھی آج تک اُن کی یاد دلوں میں تازہ ہے اور آپ کا ابھی تک نام عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ ۲ نومبر ۱۷۸۰ء کو ضلع گوجرانوالہ میں ایک سکھ جاگیردار کے گھرانے میں پیدا ہوئے "ہونہار بروا کے چکنے پات" کے مصداق اُن میں وہ تمام اوصاف حمیدہ جو قدرت ایک نمایاں ہستی میں خاص طور سے ودیعت کرتی ہے، اوائل عمر سے ہی ظاہر ہونے لگے تھے۔

پرماتما نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو حکمرانی کے لئے پیدا کیا تھا۔ اُن کی سپاہیانہ زندگی بارہ سال کی عمر سے شروع ہو گئی اور انیس بیس سال کی عمر ہوتے ہوتے اُن کے وہ تمام جوہر چمک اُٹھے جو اُن کی آیندہ زندگی کا طرہ امتیاز ثابت ہوئے۔ جبوقت وہ برسرِ اقتدار ہوئے صرف ایک مسل کے مالک تھے اور وہ وقت ایسا تھا کہ تمام پنجاب آپس کے نفاق اور پھوٹ کے باعث برباد ہو رہا تھا۔ پنجاب کی سبھی چھوٹی بڑی ریاستیں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھیں۔ اس باہمی تنازعے اور کشیدگی کے باعث سب رؤسا و رئیس ایک ایک کر کے مرہٹہ اور افغان طاقتوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنتے جا رہے تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی موقعہ شناس نگاہوں نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر سکھوں کی غیر منظم و منتشر طاقت کو اپنی عقلمندی اور پالسی سے یکجا و متحد کر کے مضبوطی سے منظم کر لیا۔ ان دنوں سکھ سپاہیوں کی یہ کیفیت تھی کہ فن سپہ گری سے بے بہرہ ہونے کے باوجود اپنے کو اس فن کا ماہر سمجھ کر وہ کسی کے زیر کمان رہنا خلاف شان سمجھتے تھے مگر چندہی دنوں میں یہ لوگ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی بہادری کا لوہا مان گئے اور جوق جوق انکی فوج میں

شامل ہونے لگے۔ مہاراجہ نے فوج کی تربیت و تعلیم کے لئے بہت سے یورپین ماہر فن جنگ مقرر کئے۔ جس سے تھوڑے ہی عرصہ میں اُن کی تمام فوج نہایت طاقتور، منظم اور تربیت یافتہ بن گئی۔ اُس کے طاقتور ہونے کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ اسمیں فرقہ بندی یا اور کسی قسم کے اختلاف یا تعصب کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ کیونکہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنی فوج کو ملکی و قومی بُنیاد پر منظم کیا۔ اُن کی فوج میں بہت سے غیر سکھ اور مسلمان بھی اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ لیکن خاص جُز سکھوں ہی کا تھا۔ اسمیں پچاس ہزار سے زائد سوار، پچاس ہزار پیدل سپاہی اور تین چار سو توپیں تھیں، یہ سب کئی دستوں میں منقسم تھے اور ہر ڈویژن ترتیب اور ڈسپلن کے لحاظ سے مکمل اور منظم تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ آئین جہانبانی سے بخوبی واقف ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے بلند پایہ مدبر تھے۔ اُنکی غیر ملکی پالسی ہمسایہ ریاستوں کی دوستی پر مبنی تھی۔ اس پالسی پر عمل کرکے اُنھوں نے نہ تو خود دوسری ریاستوں کے معاملات میں کوئی مداخلت کی اور نہ اپنے انتظامات حکومت میں کسی غیر طاقت کو دخل در معقولات کا موقعہ دیا۔ اُنھوں نے اپنی طاقت کو اس طرح وسعت دی کہ اُن کی سلطنت ستلج سے پشاور اور تبت سے لیکر سندھ تک پھیل گئی۔ وہ رموز سلطنت کو بخوبی سمجھتے تھے اور صلح و امن کے زبردست حامی تھے۔ اُنھوں نے مذہب اور سیاست کو ہمیشہ علیحدہ رکھا۔ یہی سبب ہے کہ اُن کے عہد حکومت میں کبھی کوئی فرقہ دارانہ قضیہ کھڑا نہ ہوا۔ اُن کے کریکٹر کی ایک بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ دوسرے کے مذہبی جذبات کا بالکل اسی طرح احترام کرتے تھے جس طرح خود اپنے مذہب اور دھرم کی عزت اُن کے دل میں تھی۔ دوسرے فرمانرواؤں کی طرح اُنھوں نے کبھی کسی کے مذہبی مراسم میں کسی طرح کی مزاحمت گوارا نہ کی اور نہ کبھی کشت و خون سے ہاتھ رنگا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ یوں تو ایک سخت گیر حکمران تھے مگر اُنھوں نے جبر اور بربریت سے ہمیشہ احتراز کیا اُن کا آدرش احق و انصاف تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنی رعایا کو ہمیشہ ایک نظر سے دیکھا اور کبھی کسی کیساتھ کوئی بیجا رو رعایت نہ کی۔

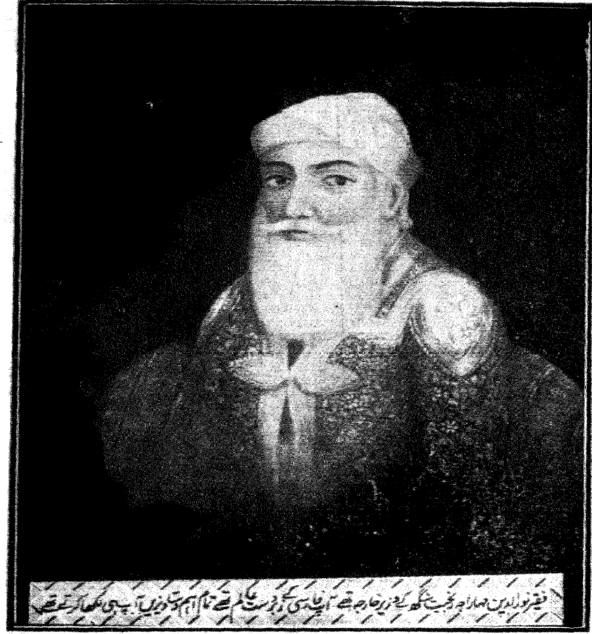
وہ ایک تجربہ کار مدبر تھے۔ اُن کی معلومات بھی بہت وسیع تھیں اور وہ ہمیشہ ان میں اضافہ کرنیکی فکر میں رہتے تھے۔ ہر چند کہ وہ ناخواندہ تھے مگر بڑے صاحب فہم و ذکا تھے۔ قدرت نے اُنھیں عقل سلیم اور ایسی نکتہ رس اور دُور اندیش طبیعت عطا کی تھی کہ مشکل سے مشکل گتھی کو بھی وہ نہایت آسانی سے حل کر ڈالتے تھے۔ وہ بلا کے ذہین تھے۔ اُن کا حافظہ اتنا تیز تھا کہ وہ ادنیٰ سے ادنیٰ واقعہ کو بھی کبھی نہ بھولتے۔ جس کو ایک دفعہ دیکھ لیا اُسے ہمیشہ کے لئے پہچان لیا۔ ساری سلطنت کا حساب کتاب اُن کے ذہن میں ہر وقت محفوظ رہتا تھا۔ کبھی کسی معاملے میں اُن کی یاد خطا نہ کرتی تھی۔ اُن کی قوت ارادی بھی آپ اپنی نظیر تھی۔ اُنکی محبت



ہری سنگھ نلوہ۔ جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کا سپہ سالار تھا اور سکھ تاریخ کی ایک اہم شخصیت ہے



راجہ دھیان سنگھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وزیر اعظم تھے ؎



فقیر نورالدین مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وزیر خارجہ تھے۔ آپ فارسی کے زبردست عالم تھے تمام اہم تحاریر آپ ہی لکھا کرتے تھے

ہمالہ پہاڑ کی طرح اٹل تھی اور جس کام کو وہ ہاتھ لگاتے ختم کئے بغیر نہ رہتے دنیا کی کوئی طاقت انھیں ان کے عزم سے ہٹا نہ سکتی تھی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ جتنے ہی ارادے کے پختہ طبیعت کے مضبوط اور رائے کے سخت تھے اُتنے ہی دل کے نرم بھی تھے۔ سخاوت میں بھی وہ یکتائے زمانہ تھے۔ اُن کا دستِ کرم ہمیشہ پیش از پیش رہتا تھا مندر، مسجد اور گوردواروں سب کو اُنھوں نے ہزاروں روپیہ کی خیرات دی۔ سینکڑوں دوسرے ادارے بھی اُنھیں کی فیاضی پر چلتے تھے۔ انھیں سکھ مذہب پر عقیدہ تھا اور ہر روز گرنتھ صاحب کا پاٹھ سنتے تھے۔ اُن کو علم و ادب سے بھی بہت ذوق تھا اور ان کے دربار میں ہمیشہ ہر قسم کے اہلِ کمال جمع رہتے تھے اور وہ سب کی قدر افزائی کرتے۔

مہاراجہ کے خط وخال اور جسم کی بناوٹ خوبصورت نہ تھی۔ اور نہ وہ شکیل ہی تھے۔ کیونکہ بچپن ہی میں چیچک نے اُن کا چہرہ بگاڑ دیا تھا اور ایک آنکھ ضائع کر دی تھی۔ مگر اُن کی پیشانی کشادہ اور فراخ تھی۔ یہاں سے اُن کے چہرہ سے جلال ٹپکتا تھا۔ جو شخص اُن کے سامنے جاتا تھا مرعوب ہوئے بغیر نہ رہتا تھا۔ غرض مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ایسی شخصیت تھی جس کو عوام میں ہمیشہ ایک امتیاز درجہ حاصل ہوتا رہا۔ ایک مؤرخ نے لکھا ہے کہ "وہ ایک ڈکٹیٹر تھے اور اُن کی وفات کے بعد سلطنت کا شیرازہ اسی وجہ سے منتشر ہو گیا کہ زندگی بھر اُنھوں نے مطلق العنان حکمران کی حیثیت سے حکومت کی، اور تمام سلطنت میں انھیں اختیارات کلی حاصل تھے اُنکے مشیر و مصاحب خود اُنھیں کے ایجنٹ تھے جو اُن کے بعد اس وسیع وعظیم مملکت کا بار قابلیت سے نہ سنبھال سکے۔ اِس لئے اسے غیروں کے ہاتھوں میں جانے سے نہ بچا سکے"۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کو گھوڑوں کا بھی بڑا شوق تھا جو اُن کی آخیر عمر تک رہا۔ اپنی ذاتی سواری کے لئے اُن کے پاس کئی نایاب و بیش قیمت گھوڑے تھے۔ لیلی، سفید پری اور گوہر بار نامی گھوڑوں سے تو اُن کو خاص اُنس تھا۔ بہرحال مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جس حیثیت سے عروج حاصل کیا اور جو غیر فانی شہرت اور ہر دلعزیزی حاصل کی وہ انھیں کا حصّہ تھی۔ اُن کا انتقال ۲۷ر جون ۱۸۳۹ء کو فالج کے حملہ سے ہوا۔ لاہور میں اُن کی شاندار سمادھ ہے جس کی حفاظت و نگرانی ایک کمیٹی کے سپرد ہے۔ وہاں ہر روز گرنتھ صاحب کا پاٹ ہوتا ہے اور ہزاروں جاتری سمادھ کی زیارت کو آتے اور اپنی بھگتی اور عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ ہم بھی شیر پنجاب کی صد سالہ برسی کے موقعہ پر اپنا خراج عقیدت پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

تنقید کتب

کلیات بحری[1]

اب تک عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اُردو شاعری میں اولیت کا سہرا حضرت ولی اورنگ آبادی کے سر ہے۔ لیکن جدید تحقیقات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اُردو شاعری میں درحقیقت اولیت کا فخر قاضی محمود بحری کو حاصل ہے جو نواح نصرت آباد کے رہنے والے اور ولی دکنی سے پرانے شاعر تھے۔ ۱۰۹۵ھ میں وہ بیجاپور پہونچے اور وہاں کی سلطنت کے زوال کے بعد حیدرآباد چلے گئے تھے۔ ۱۱۳۰ھ میں اپنے وطن موضع گوگی تعلقہ شاہ پور میں وفات پائی۔ جہاں اُن کا مقبرہ اب تک موجود ہے۔ زیر نظر کتاب انھیں قاضی صاحب کا مجموعۂ کلام ہے جو شعبۂ اُردو الہ آباد یونیورسٹی کے فاضل لکچرار ڈاکٹر سید محمد حفیظ صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی، ڈی۔ لٹ نے بڑی تلاش و تحقیق کے بعد مرتب کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے ادبی ذوق و علمی تبحر سے ناظرین زمانہ بخوبی واقف ہیں۔ کیونکہ آپ رسالہ زمانہ کے قدیم معاون اور ایڈیٹر زمانہ کے پرانے کرمفرا ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کلیات کو بڑی محنت و جانفشانی سے مرتب کیا ہے اور اس کے لئے ایک عالمانہ دیباچہ بھی لکھا ہے، جسمیں بحری کے زمانہ کی تاریخ، خود اُن کی سوانح عمری اور اُن کے ہمعصر شاعروں کے حالات وغیرہ درج ہیں اور کلام بحری کی خصوصیات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ساری کتاب پانچ ابواب میں تقسیم کی گئی ہے۔ اور اس کے آخر میں ایک فرہنگ الفاظ دیدی گئی ہے۔ جسمیں زمانہ قدیم کے تمام مشکل الفاظ کی تشریح کردی گئی ہے۔ اس بات کا ثبوت کہ بحری ولی دکنی سے پہلے کے شاعر ہیں اس بات سے بھی ملتا ہے کہ بحری کے کلام میں ولی کے مقابلے میں ہندی و سنسکرت الفاظ کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ ولی کی زبان بحری سے زیادہ ترقی یافتہ اور منجھی ہوئی ہے۔ بحری کی مثنوی "من لگن" کے ایک شعر سے بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ بہت پرانے شاعر تھے۔ شعر یہ ہے ؎

ہجری تو ہی کیتک برس تھے　　بارہ اُپر ایک سو سہس تھے
۱۱۱۲

بحری نے اپنی تصانیف میں ایک دیوان غزلیات، کچھ مرثیے، مثنوی "من لگن" اور مثنوی "گنجا نامہ" چھوڑے۔

[1] حجم ۳۱۲ صفحات۔ قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ نولکشور پریس لکھنؤ

بن کی زبان کا اندازہ مندرجہ بالا شعر سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ فاضل مرتب نے اس کلیات کو شائع کرکے اردو لٹریچر پر احسان عظیم کیا ہے۔ ہمارے نزدیک آپ کی کوشش مشکور ہوئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دیوان سے عوام کو دلچسپی نہ ہو۔ لیکن زبان کے محققین کے لئے یہ بڑی قابل قدر چیز ہے اور لائبریریوں اور کتبخانوں میں رکھنے کے قابل ہے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ سب عمدہ۔

بنی اسرائیل کا چاندؔ

یہ مشہور و معروف انگریز ناول نگار رائڈر ہیگرڈ کے ایک افسانہ "مون آف دی اسرئیل" کا ترجمہ ہے، جو عبدالمجید صاحب حیرت بی۔اے' نے بڑی محنت سے سلیس اور بامحاورہ اردو میں کیا ہے۔ جہاں تک ترجمہ کا تعلق ہے فاضل مترجم نے قابل قدر کامیابی سے اپنا فرض ادا کیا ہے، اور زبان کی سلاست کیساتھ روزمرہ محاوروں کا بھی پورا لحاظ رکھا ہے۔ اس افسانہ کا پلاٹ مصر قدیم کے اُس زمانہ کا ہے جب بنی اسرائیل یعنی یہودیوں پر فرعونِ مصر مظالم برپا کیا کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ مصر سے ہجرت کرکے کنعان کی طرف روانہ ہوئے۔ بنی اسرائیل کا مصر سے بخیریت نکل جانا اور فرعونِ مصر کا مع فوج تعاقب کرتے ہوئے غرق ہونا بائبل کی پوری روایت کا اسمیں چربہ اُتارا گیا ہے۔ صرف موسیٰؑ کا نام رہ گیا ہے۔ اِس افسانہ میں بنی اسرائیل کی ایک حسین لڑکی میرآپی اور مصری شہزادہ سیتی کے حُسن و عشق کی داستان نے مزید رنگینی پیدا کر دی ہے۔ کتاب شروع سے آخر تک بہت دلچسپ ہے۔ لکھائی، چھپائی اور کاغذ بھی پسندیدہ ہے۔

مضامین محمد علیؒ

یہ مولانا محمد علی مرحوم کے سرسٹھ تاریخی، سیاسی، ادبی اور مذہبی مضامین کا ایک بیش بہا مجموعہ ہے جو اُن کے اُردو اخبار "ہمدرد دہلی" میں وقتاً فوقتاً شائع ہو چکے تھے اب ان دلچسپ و مفید مضامین کو محمد سرور صاحب بی۔اے (آنرز) پروفیسر تاریخ، جامعہ ملیہ دہلی نے مرتب کرکے ایک مقدمہ کے ساتھ کتابی صورت میں جمع کر دیا ہے۔ یہ مضامین کس پایہ کے ہیں۔ اس کے جواب میں صرف اسقدر کہدینا کافی ہے کہ یہ مولانا محمد علی مرحوم کے مضامین ہیں، جن کے نام سے سیاسی ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے۔ تمام مضامین میں استدلال، زور، روانی اور معلومات کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور کوئی مضمون اعلیٰ ادبیت سے خالی نہیں ہے اِس کتاب کی لکھائی، چھپائی اور کاغذ سب نفیس ہے، جلد بھی خوبصورت ہے۔ شروع میں مولانا محمد علی مرحوم کا فوٹو بھی دیا گیا ہے۔

---

[۱] حجم ۲۴۴ صفحات ۔ قیمت دو روپیہ ۔ ملنے کا پتہ :۔ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی، لاہور ۔ لکھنؤ

[۲] حجم ۵۹۰ صفحات ۔ قیمت ڈھائی روپیہ ۔ ملنے کا پتہ :۔ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی لاہور لکھنؤ۔

خود نوشت سرگذشت

یہ اٹلی کے مشہور ڈکٹیٹر بنیٹو مسولینی کی آپ بیتی سوانحمری ہے جو خود اُس نے لکھی ہے۔ آجکل اٹلی اور جرمنی کے ڈکٹیٹروں نے دُنیا بھر میں دھوم مچا رکھی ہے۔ اِس لئے اِس کتاب کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو لوگ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ ایک غریب لوہار کا لڑکا اپنی محنت جفاکشی اور الوالعزمی کی بدولت کس طرح اٹلی جیسی عظیم الشان سلطنت کا "کرتا دھرتا" بن گیا ہے، وہ اس کتاب کو ضرور پڑھیں۔ اٹلی کو از سر نو زندہ کرنے میں مسولینی کو کن کن مصائب کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ان تمام مشکلات کا مفصل حال مسولینی نے خود اپنے قلم سے لکھا ہے۔ آج اِس اطالوی الوالعزم کو جمہوریت پسند دُنیا خوف وہراس کی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ بہرحال گو وہ بدنام بھی ہے اور نیکنام بھی لیکن اپنے وطن کا سچا فدائی ہے۔ یہ سوانح عمری انگریزی ترجمہ سے ترجمہ در ترجمہ کرکے شائع کی گئی ہے اور اس کی زبان پر پنجابیت بھی بہت حاوی ہے۔ پھر بھی ترجمہ بہت سلیس اور عام فہم ہے۔ جس کے مطالعہ سے ہر شخص فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ شروع میں پرنسپل چھبیلداس کا لکھا ہوا "مسولینی کا پروگرام" اور اس کے بعد پبلشر صاحبان کی تمہید ہے۔ مسولینی کیا چاہتا ہے؟ اِس کا جواب خود مسولینی کی زبان سے اِس کتاب میں پڑھیئے۔ اس کی لکھائی، چھپائی، کاغذ اور جلد وغیرہ سب معمولی ہیں۔ حجم ۲۸۶ صفحات۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ لاجپت رائے اینڈ سنز تاجران کتب۔ لاہور۔

سَبَدِ چین

مرزا غالب نے اپنے فارسی کلام کا ایک مختصر مجموعہ، جو کلیات میں شامل ہونے سے رہ گیا تھا ۱۸۶۷ء میں "سبدِ چین" کے نام سے شائع کیا تھا۔ مگر ایک عرصہ سے یہ مجموعہ نایاب ہو چکا تھا۔ اب حُسنِ اتفاق سے اس کا ایک نسخہ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کے کُتب خانہ میں مل گیا۔ چنانچہ اسی کی نقل مکتبۂ جامعہ نے شائع کردی ہے۔ اس کے شروع میں مرزا غالب کی ایک نئی تصویر بھی درج ہے اور کار پردازانِ جامعہ نے مرزا کا وہ کلام بھی جو اُن کے کلیات میں شامل نہیں، مگر مختلف کتابوں میں اِدھر اُدھر ملتا ہے، کتاب زیرِ نظر میں شامل کردیا ہے۔ علاوہ بریں مرزا کے چھ فارسی قصیدے، ایک ترکیب بند، ایک ترجیع بند، چند شعر بطرز مثنوی، پچاس قطعے، نو غزلیں، بیس رباعیاں اور ڈیڑھ درجن مختلف اشعار بھی درج ہیں، اور اپنے مرتب کردہ مجموعہ کیلئے مرزا غالب نے جو دیباچہ فارسی زبان میں لکھا تھا۔ وہ بھی شامل کردیا گیا تھا۔ جو حضرات زبان فارسی کی شیرینی، الفاظ کی روانی، تخیل کی بلندی، ترکیبوں کی چُستی اور جدت کے دلدادہ ہیں اُن کے لئے یہ مجموعہ ایک بہترین تحفہ ہے۔ دراصل غالب کا اصلی رنگ ان کے فارسی کلام ہی میں دیکھنے میں آتا ہے۔ بہرحال اس چھوٹے مجموعہ میں اُن کی ضیافتِ طبع کے لئے بہت کچھ سامان موجود ہے۔ اس کی لکھائی، چھپائی روشن، کاغذ نفیس ہے، ضخامت پانچ جُز۔ قیمت چھ آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی، لاہور، لکھنؤ۔

رفتار زمانہ

برطانیہ اور فرانس کا ابھی تک روس سے نہ کوئی سمجھوتہ ہو سکا اور نہ کوئی معاہدہ طے ہوا۔ حالانکہ انگلستان کے بعض بڑے بڑے تجربہ کار مدبر جنمیں لارڈ ہیلی فکس موجودہ وزیر خارجہ کا بھی نام لیا جاتا ہے، جرمنی و اٹلی کے مقابلہ کے لئے روس کی امداد نہایت ضروری سمجھتے ہیں۔ مسٹر چیمبرلین کی گورنمنٹ نے معاہدہ میونخ کے وقت روس کو جس طرح پس پشت ڈال کر بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ اُس کا روس نے اب کافی سے زیادہ بدلہ لے لیا۔ خبر ہے کہ وہ اپنی شرائط پر معاملہ کرنا چاہتا ہے اور ابھی تک ان پر اڑا ہوا ہے۔ فرانس کے متعلق تازہ ترین خبر یہ ہے کہ وہ برطانیہ پر روسی شرائط منظور کرنے کے لئے زور ڈال رہا ہے۔ روس ریاستہائے بلقان کی ہر حالت میں مدد کرنا چاہتا ہے خواہ اُن پر براہ راست حملہ ہو یا بالواسطہ اور اُن کی حیثیت میں کوئی اہم تبدیلی پسند نہیں کرتا۔ خواہ اسمیں وہاں کے باشندوں کی مرضی ہی کیوں نہ شامل ہو۔ اس کیساتھ ہی وہ ہالینڈ و سوئٹزر لینڈ وغیرہ کے متعلق کوئی ذمہ داری لینے کو تیار نہیں ہے۔ دراصل پچھلے برتاؤ کی وجہ سے وہ برطانیہ اور فرانس دونوں سے بہت مشکوک ہے اور اسی وجہ سے انکے ساتھ اسقدر احتیاط برت رہا ہے۔ اُدھر ہٹلر کی طرف سے خفیہ ریشہ دوانیاں ہو رہی ہیں اور یہ بات تو بالکل صاف ہے کہ حال کی تقریروں میں ہٹلر نے قصداً روس کے نظام حکومت، پولیٹکل معیار یا اُس کے حکمرانوں کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا۔ بلکہ الٹا روس کے ساتھ تجارتی معاہدہ کرنے کو تیار اور کروڑوں روپیہ کا مال خریدنے کو آمادہ ہے۔ اب اگر برطانیہ اور فرانس کو اُس کی امداد و ہمدردی حاصل کرنا ہے تو اُس کی پیش کی ہوئی شرطیں منظور کرنا ہونگی۔ لیکن برطانیہ میں اب بھی ایک ذی اثر جماعت موجود ہے، جو روس کے بہت خلاف اور جرمنی سے ہر وقت دبنے کو تیار ہے۔ مسٹر چیمبرلین اسی جماعت کے آلہ کار ہیں اور گو انھوں نے اسوقت بظاہر حال اپنی پالیسی بدل دی ہے اور اس کا بار بار اعلان بھی کر دیا ہے لیکن اُن کے دل میں ہر صورت میں صلح قائم رکھنے کی خواہش اتنی زبردست ہے کہ وہ خود سخت تذبذب میں پڑے ہوئے ہیں۔ غرض اسوقت انگلستان میں مختلف و متضاد اصولوں کی کشمکش ہو رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وزیر اعظم چیمبرلین کبھی ذرا سختی سے بات چیت کرتے ہیں تو دوسرے ہی دن اُن کا لہجہ پھر نرم ہو جاتا ہے۔ انگلستان کے بعض ذی اثر لوگ ابھی تک جرمنی کے ساتھ در پردہ ساز باز رکھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ تازہ ترین خبر یہ ہے کہ ڈاکٹر

جرمن وزیر اقتصادیات سے ایک صاحب مسٹر ہڈسن نامی نے انگلستان اور اس کے اتحادیوں کی طرف سے ایک ارب پاونڈ قرض دلانے کا وعدہ کیا ہے بشرطیکہ جرمنی "صلح کی راہ" اختیار کرے۔ اس خبر سے اخبارات نے جلی سرخیوں کے ساتھ شائع کیا ہے۔ انگلستان اور دوسرے ملکوں میں سنسنی پھیل گئی ہے۔ لیکن مسٹر ہڈسن کا بیان ہے کہ انھوں نے یہ سلسلۂ جنبانی محض اپنی نجی حیثیت سے کی ہے اور قرضہ کی کوئی خاص رقم تعین نہیں کی ؎۔ خیر جو کچھ ہو اِس سلسلے میں سب زیادہ غور طلب بات یہ ہے کہ جس جرمن وزیر سے یہ تمام بات چیت ہوئی تھی، اُس نے اپنے یہاں کے سفیر سے ان تجاویز کو برٹش گورنمنٹ کی طرف سے صلح کا پیام سمجھ کر بیان کیا۔

جرمنی کے متعلق جتنی خبریں آئی ہیں، اُن سب سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ہر ہٹلر اپنے ارادوں پر ڈٹا ہوا ہے البتہ وہ بھی جنگ سے ڈر رہا ہے اور اپنا مطلب حتی المقدر بلا کشت و خون حاصل کرنا چاہتا ہے۔ انگلستان و فرانس لڑائی کے لئے کیل کانٹے سے درست ہو رہے ہیں۔ اِس طرف جاپان کے رویہ سے البتہ ایک نئی پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے ادھر پریسیڈنٹ روزولٹ بھی امریکہ کی سینٹ کو غیر جانبداری کی پالسی میں کسی قسم کی ترمیم کرنے پر راضی نہ کر سکے۔ اس سے جس فرانس و برطانیہ کو قدرتاً مایوسی ہوئی ہے۔

یہ خیال کہ برطانیہ و فرانس کا روس کے ساتھ معاہدہ ہو جائے تو جرمنی و اٹلی اس متحدہ محاذ کی طاقت سے مرعوب ہو جائیں گے اور لڑائی کا خطرہ باقی نہ رہے گا کچھ بہت درست معلوم نہیں ہوتا ہے۔ ہاں اس معاہدہ کا یہ نتیجہ ضرور ہوگا کہ دُنیا دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ اور ایک حصے کے شرکا، دوسرے حصّے کی طاقتوں سے بالکل علیحدہ ہو کر سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی ہر طریقے سے جداگانہ پالسی پر عملدرآمد کریں گے۔ دُنیا کی تجارت بھی دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ اور ایک دوسرے سے کوئی رابطہ اتحاد قائم نہ رہیگا۔ جس سے طرفین ایک دوسرے سے ہر وقت بدظن رہیں گے۔ اگر کسی طرف ذرا بھی دوسرے کے مفاد پر کوئی چوٹ پہونچی۔ تو اسی وقت عالمگیر جنگ چھڑ جائے گی۔ اسوقت بھی بعینہ یہی کیفیت نظر آرہی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لڑائی چھڑنے میں ذرا دیر نہیں ہے۔ کوئی ذرا سی بات ہو جائے اور تلواریں میان سے نکل پڑیں۔

چین کی غیر ملکی آبادیوں کا انتظام اب تک غیر ملکیوں کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن اب جاپان انھیں اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا ہے۔ حالانکہ اس عرصے میں فرانس اور انگلستان کے سیکڑوں کارخانے اور نوآبادیاں ان علاقوں میں قائم ہو گئی ہیں۔ اِس لئے یہ حکومتیں اپنے امکان بھر اپنا اقتدار ختم نہ ہونے دینگی۔ جاپان کو شکایت ہے کہ چین کو سامانِ جنگ اور دوسری ضروری چیزوں کی بہم رسانی میں ان ملکوں سے غیر معمولی امداد پہونچ رہی ہے حال میں جاپان نے چار مجرم چینیوں کی حوالگی کا جو تین تسین میں ارتکاب قتل کے بعد روپوش ہو گئے تھے مطالبہ

؎ مسٹر چیمبرلین نے پالیمنٹ میں اس بات چیت سے گورنمنٹ کی قطعی بے تعلقی ظاہر کی ہے۔

کیا تھا اور جب یہ مطالبہ نامنظور ہوا تو جاپان نے برطانیہ کو الٹی میٹم دیکر ٹین ٹسین کی برطانوی بستی اور بیرونی دنیا کی آمد و رفت کا سلسلہ بالکل مسدود کردیا اور اس سلسلے میں بعض انگریزوں کی ایسے ہتک آمیز طریقے پر جامہ تلاشی لی کہ انھیں بالکل برہنہ کردیا۔ مگر ابھی تک برطانیہ اس کا کوئی تدارک نہ کرسکا۔ اب اس کے متعلق جو بات چیت ہورہی ہے تو جاپان نے یہ مطالبات پیش کئے ہیں کہ برٹش گورنمنٹ اپنے علاقہ کے تمام دہشت انگیزوں اور کمونسٹوں کو جاپان کے حوالہ کردے (۲) جاپان کی کرنسی پالسی کو قبول کرکے چینی سکوں کا چلن روکے اور چینی گورنمنٹ کی چاندی جاپان کو منتقل کرنے میں مدد دے (۳) جاپان کو اپنے علاقہ کے چینی بنکوں اور گوداموں کی تلاشی لینے کا اختیار دیدے۔ اور (۴) ہر ممکن طریقے سے جاپان کے خلاف چینیوں کی سرگرمی کی روک تھام کرے۔

اٹلی اور جرمنی کے اشتعال انگیز ہی سے جاپان کے حوصلے اسقدر بڑھ گئے ہیں کہ وہ برطانیہ سے پرخاش پر آمادہ ہوگیا ہے۔ اس کو یہ بھی خوب معلوم ہے کہ یوروپ اسوقت جس نازک سیاسی حالت سے گذر رہا ہے اسکے لحاظ سے برطانیہ یا فرانس، جاپان سے لڑائی چھیڑ کر دو محاذ پر اپنی طاقت منتشر کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ روس کیساتھ معاہدہ کی گفتگو شروع ہوتے وقت ہٹلر البتہ کسی قدر مرعوب ہوا تھا۔ مگر اب جب اس میں غیر معمولی تعویق ہورہی ہے تو اس کے حوصلے پھر بڑھ گئے ہیں اور اس نے بلجیم کی سرحد پر فوجیں ڈالنے کے بعد اب ڈینزگ پر قبضہ کرنے کیلئے ریشہ دوانیاں شروع کردی ہیں۔ اور پولینڈ کی سرحد پر فوجیں اکٹھا کرکے اس نے خاص ڈینزگ میں بھی اسلحہ جنگ وغیرہ داخل کردیئے ہیں۔ اسپین کو بھی اس نے ملالیا ہے اور خبر ہے کہ اسپین، جرمنی و اٹلی کی فوجی ترتیب و تنظیم اب اس طرح کردی گئی ہے کہ لڑائی چھڑنے پر تینوں ملکوں کی فوجیں مجموعی حیثیت سے کام کرسکینگی۔ جرمنی اور اٹلی کے فوجی اسٹاف کی تنظیم بھی باہمی اتفاق کی بنیاد پر کی گئی ہے، چنانچہ بہت سے اطالوی ہوائی جہاز اسپین پہونچ گئے ہیں اور خود اٹلی میں جرمن فوجیں موجود ہیں۔ ان سب کارروائیوں کے بعد اب برطانیہ کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ جس طرح سے ممکن ہو وہ جلد سے جلد روس سے سمجھوتہ کرکے اس کو اپنی طرف کرلے۔ پہلے اس معاہدہ سے مشرق بعید کو مستثنےٰ رکھا گیا تھا اور جاپان کو بھی اسمیں اعتراض نہ تھا۔ بحالت موجودہ یہ تجویز خلاف مصلحت ثابت ہورہی ہے۔ کیونکہ اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ جاپان ایشیا میں روسی حملے سے مطمئن ہوجائیگا امریکہ کی طرف سے جاپان ضرور کچھ خائف ہے اور شاید اسی وجہ سے وہ غیر ملکی آبادیوں میں اہل امریکہ سے کوئی بیجا سلوک نہیں کررہا ہے تاکہ امریکہ جس کی پالسی ہمیشہ یوروپ کی الجھنوں سے الگ تھلگ رہنے کی رہی ہے، اپنی قدیم روش کے خلاف کوئی کارروائی کرنا پسند نہ کرے۔ برطانیہ کی خواہش ہے کہ جنگ کی صورت میں امریکہ کو بھی اپنا حلیف بنالے۔ اسی لئے ملک معظم جارج ششم اپنے دورہ کینیڈا کے سلسلے میں امریکہ بھی تشریف لیگئے تھے جہاں پریسیڈنٹ روزولٹ اور اہل امریکہ نے ان کی خوب آؤ بھگت کی۔ مگر امریکن سینٹ

پریسیڈنٹ کی سفارش کے باوجود ابھی تک غیر جانبداری کی پالیسی کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔

برطانیہ و فرانس نے جاپانی اقدامات کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے سنگاپور میں جنگی بیڑہ رکھنے کا فیصلہ کیا ہے اور اگر امریکہ نے بھی برطانیہ و فرانس کا ساتھ دیا تو جاپان مقابلہ کی تاب نہ لاسکیگا۔ مگر ان سب باتون کے ہوتے ہوئے، جیسا کہ اُوپر ذکر کیا جاچکا ہے انگلستان اسوقت جاپان سے لڑنا نہیں چاہتا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں ٹوکیو میں سفیر برطانیہ اور گورنمنٹ جاپان کے مابین جو سمجھوتہ ہوا ہے، اور جس کا اعلان وزیراعظم برطانیہ نے ۲۴ جولائی کو برٹش پارلیمنٹ میں کیا، اُس سے بھی یہی ثابت ہے کہ انگلستان اسوقت کسی زبردست پارٹی کی مخالفت مول لینے کو تیار نہیں ہے۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے کم سے کم اسوقت ہم لوگوں کو جاپان کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتا ہے لیکن مشرق بعید اور مغرب دونوں میں جنگ کا خطرہ لاحق ہے اور ذرا سی بات پر عالمگیر جنگ شروع ہونے کا اندیشہ ہے۔ ہٹلر کی ساری کوشش یہی ہے کہ وہ اپنا مدعا ایک قطرۂ خون گرائے بغیر حاصل کرے۔ اب دیکھنا چاہئے کہ اس مرتبہ بھی اُسے اپنے ارادہ میں کامیابی ہوتی ہے یا کشت و خون کی نوبت آتی ہے؟

ہندوستان بھی طرح طرح کی اندرونی الجھنوں میں گرفتار ہے۔ آئے دن ہندو مسلمانوں کے فسادات ہوتے رہتے ہیں۔ لکھنؤ وغیرہ میں شیعہ سنیوں میں بھی سخت جھگڑا ہے جس کی وجہ سے اسوقت ہزارہا اہل ملک جیل کی ہوا کھا رہے ہیں۔ بنگال میں سیاسی قیدیوں کے مسئلہ نے بیچینی پیدا کر رکھی ہے۔ یکم اگست سے بمبئی میں شراب کی قطعی ممانعت کردی گئی ہے جس کی وجہ سے بڑی ہلچل مچ گئی ہے۔ لیکن کانگریس گورنمنٹ اِس اصلاح پر تلی ہوئی ہے۔ صوبہ متحدہ میں بھی بعض ضلعوں میں منشیات کی بندش کی پالیسی کی وجہ سے گورنمنٹ کو "ملازمت ٹیکس" جاری کرنا پڑا۔ جس کی بعض حلقوں کی طرف سے ابھی تک بڑے زور و شور کے ساتھ مخالفت ہو رہی ہے۔

قانون مزارعین کے متعلق زمیندار طبقہ سے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہوسکا۔ حالانکہ زمینداروں کو جس صورت سے ممکن ہو گورنمنٹ سے معاملہ کرلینا چاہئے۔ کیونکہ جب تک کاشتکار اُنکی طرف سے مطمئن نہ ہوجائینگے اُنکے لئے خطرہ ہی موجود رہیگا

ہندو مسلمانوں کے فسادات دبانے میں بھی کانگریسی گورنمنٹ کو ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ اِس بارہ میں اس کی نرم پالیسی کمزوری پر محمول کیجاتی ہے اور مخالفین کانگریس موجودہ وزارتوں کو مرعوب اور بدنام کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ہم کو تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب تک صوبوں کے لیڈران مسلم لیگ کے گورنمنٹ سے ذاتی اختلافات دور نہ ہونگے اُسوقت تک باہمی تعلقات میں یہی کشیدگی باقی رہے گی۔ قانونی اسمبلی میں جب کبھی ان فسادات پر مباحثہ ہوتا ہے تو یہی واضح ہوتا ہے کہ اگر کانگریس مسلم لیگ کے لیڈران کو وزارت میں شامل کرلیتی تو اسقدر شور و شر کی شاید نوبت نہ آتی۔

کانگریس میں پھوٹ پڑ گئی ہے۔ سوبھاش بابو نے پرانے لیڈروں کے خلاف علم بغاوت بلند کردیا ہے جس سے ہر طرف ایک انتشار سا پیدا ہوگیا ہے۔ مگر اس پرچہ میں [illegible] ... ذاکہ ہوتو بہتر

زمانہ

جلد ۷۳ — اگست ۱۹۳۹ء — نمبر ۲

ہندوستان اور بین القومی شاعر

(از مسٹر توکل حسین ڈبیاوی، بی اے)

دنیا کہتی ہے کہ حضرت اقبال کا انتقال ہوگیا، لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان گنت لوگوں
مع ہے۔ حضرت اقبال کرسیِ صدارت پر رونق افروز ہیں اور میں ایک حقیر مقرر کی حیثیت سے اُن کے
س ہی کھڑا ہوا مجمع سے مخاطب ہو کر جب کچھ رقت آمیز اور جوشیلے انداز میں حضرتِ اقبال کا یہ شعر

"مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا"

ہتا ہوں تو سارا مجمع بیتاب ہو جاتا ہے، اور یکایک لوگوں کی ایک کثیر تعداد "ہندو مسلم اتحاد زندہ باد"
نعرے لگاتی ہوئی میری طرف بڑھتی ہے اور میں مجمع کو بہ مشکل خاموش کر رہا ہوں۔

واقعی اس زندہ جاوید شاعر کے کلام کا ایسا ہی اعجاز ہے اور جب تک ان کی شاعری
اس رنگ میں رنگی رہی، ہندوستان کا ہر باشندہ اپنے قومی، مذہبی اور تمدنی اختلافات کو
طاق رکھکر شاعر کی آواز پر لبیک کہتا رہا۔ لیکن جہاں اس اندازِ بیان نے کروٹ بدلی اور شاعر نے
عنانِ خیال کو کسی اور طرف موڑا، اکثریت کے اعتبار سے طبقۂ حاوی کے ایک ذمہ دار فرد نے
ہی اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، اور شاعر کی آواز کو قوم و وطن کے لئے قاتل سمجھا
رکور کا اعتراض حقیقت سے قریب تر ہے۔ بہ حیثیت مسلمان مجھے اعتراف ہے کہ اقبال نے

مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی بے انتہا کوشش کی اور ان سے اپنی ہستی پہچاننے اور اپنی گذشتہ عظمت یاد کرنے کی کچھ اس طرح تلقین کی ہے کہ اگر مسلمان اقبال کی درد بھری آواز سنکر ہاتھ میں تیغ لے لیں اور سر سے کفن باندھ لیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن جیساکہ پنجاب کے ایک اہل الرائے نقاد نے لکھا ہے یہ بات بہت ہی افسوسناک ہے کہ وہ شاعرِ باکمال جسکے دماغ کی تراوش "میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے" کی ولولہ انگیز نظم کی ولادت گاہ ہے وہ نئے شوالہ کی تعمیر کا پجاری تھا جس کو "حبِّ وطن" کی سرشاری نے یہ کہنے پر مجبور کیا تھا "خاکِ وطن کا مجھکو ہر ذرہ دیوتا ہے۔" جو ترانۂ ہندی کے مصنف کی حیثیت سے پورے جوشِ عقیدت کے ساتھ کہتا تھا کہ

"مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا"

وہ فیلسوف شاعر جو فرقہ بندی اور ہندو مسلم خانہ جنگی کے خلاف اور ہندو مسلم اتحاد کے حق میں یوں گوہر فشانی کر چکا ہو

وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لئے اپنی زباں چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑونگا

وہی شاعر اور وہی وطن کا پجاری بعد میں وطن اور مذہب کے درمیان تضاد اغراض اور تصادم مفاد دیکھنے لگا اور وطن پرستی کے جن جذبات کا اظہار "ہمالہ" "نیا شوالہ" "ترانۂ ہندی" "قومی گیت" اور "تصویر درد" جیسی مشہور اور روح پرور نظموں میں کر چکا تھا، قدم قدم پر اُن کی تردید کرنا ضرور سمجھنے لگا۔

نرالا سارے جہاں سے اسکو عرب کے معمار نے بنایا بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

میں مذہب اسلام کی تعلیم پر پورا عبور نہیں رکھتا ورنہ علامہ اقبال کے اس خیال کی بالتفصیل تردید کرنے کی کوشش کرتا جس کی رو سے انھوں نے مذہب کے درمیان تضاد و اغراض ثابت کرنیکی کوشش کی ہے لیکن اتنا میں ضرور جانتا ہوں کہ قرآن شریف میں حب وطن کو جزو ایمان قرار دیا گیا ہے۔ پھر حضرت اقبال وطن کے پیرہن کو مذہب کا کفن کیوں بیان کرتے ہیں؟ اپنے مذہب

کے ساتھ محبت کا اظہار کرنا کوئی غیر فطری بات نہیں ہے۔ اپنے مذہب کے بانی کی جائے ولادت کو قابلِ احترام سمجھنا بھی بالکل درست اور بجا ہے لیکن ان باتوں سے یہ لازم نہیں آتا کہ جذبۂ وطنیت کی تضحیک کی جائے۔ اور اپنے وطن کو وطن سمجھنا اور اس کے متعلق اپنے ضروری فرائض کا تسلیم کرنا ایسی بات شمار کی جائے جو بنائے حصارِ ملّت کو کمزور کرتی ہو۔ یہ بات سخت افسوسناک ہے کہ ہندو اور مسلم دونوں میں ایسے اصحاب موجود ہیں جو دیدہ و دانستہ یا نادانستہ طور پر ہندو مسلم اتحاد کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کر رہے ہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ یہ بات افسوسناک ہے کہ ان لوگوں کی عوام کی نگاہوں میں خاصی قدر و منزلت ہو رہی ہے۔ تعصب نے دونوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے یا یہ سمجھئے کہ مذہبی جنون نے انھیں قومی و ملکی مفاد کو ٹھکرا دینے پر مجبور کر دیا ہے۔ جب تک دونوں طرف اس قسم کے لوگ موجود ہیں نہ ہندو مسلم اتحاد ہی ہو سکتا ہے اور نہ وطنی آزادی خیال کی حدود سے آگے بڑھ سکتی ہے۔

میں نہیں کہتا کہ اپنے مذہب، فرقے، اور قوم کے لئے ترقی کی کوشش نہ کی جائے لیکن اس کے ساتھ ہی ملکی مفاد کے خیال سے اپنے وطن کو غلامی سے آزاد کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ رواداری برتی جائے اور دوسروں کے دلوں میں گھر کیا جائے۔

اِن خیالات کے اقتباس سے میرا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ میں جذبۂ اسلامی کی بجائے ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں میں کوئی دوسرا جذبہ دیکھنا چاہتا ہوں، بلکہ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ حقیقی مسلمان ہوتے ہوئے ہم حق و صداقت کے لئے اپنی آواز بلند کریں۔ کیونکہ مذہبی اختلافات ہوتے ہوئے بھی ہم غلامی، فلاکت، پستی، اور افلاس کی زنجیریں توڑنے کے لئے متحدہ کوشش کر سکتے ہیں۔

شاعر کی آواز وقت کی آواز ہوتی ہے اور میرے نزدیک وہ شاعری مستحسن نہیں جس میں بنی نوع انسان کی تکالیف کا احساس نہ ہو۔ میری رائے میں سچّی شاعری کو قوم و فرقہ کے ادنےٰ تعصبات سے بالاتر ہونا چاہیئے۔ شاعر کی حیثیت ملکی بلکہ بین الاقوامی ہونا چاہیئے۔ اس کا ہر لفظ عالمگیر پیغام ہونا چاہیئے۔ تاکہ دنیا بھر میں جہاں کہیں اس کی آواز سنائی دے لوگوں کو لبیک ہی کہتے بن پڑے۔ اپنی قوم کو ترقی دینے کا مسئلہ بھی یقیناً پس پشت ڈالنے والی چیز نہیں ہے، حقیقی شاعر کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ اپنی قوم کا خیال رکھے، لیکن اس دھن میں نوعِ انسان کو فراموش کر دینا ایک گناہ عظیم ہے۔ ہر مذہب کی یہی تعلیم ہے کہ اپنوں کے ساتھ ساتھ اپنے ہمجنسوں کا بھی خیال رکھا جائے۔ ہندوستان کے موجودہ دور میں ہر شاعر کو ایسی ہی آواز

بلند کرنے کی ضرورت ہے جس سے باہمی منافرت کے جذبات سینوں سے دُھل جائیں۔ غلامی کی بیڑیاں کٹ جائیں، باہمی تفرقات دور ہو جائیں، مزدور اور سرمایہ دار ایک دوسرے سے بغلگیر ہوں اور بھوک و پیاس سے نڈھال انسانوں کی ڈھارس بندھے۔ تمام دُنیا کے اہل دل اس پر قربان ہوں۔ اس کا دماغ مذہب کے والہانہ جذبات سے بھی پُر ہو تاکہ وہ لوگوں کو کارزار حیات میں نہ صرف غور و فکر بلکہ عمل صحیح کی بھی دعوت دے سکے۔ ایسا شاعر، ایسا ادیب اور ایسا مصنف قابل پرستش ہے۔

ڈاکٹر اقبال کی شاعری کے متعلق "تاریخ ادب اردو" مصنفہ جناب رام بابو صاحب سکسینہ ایم اے مترجمہ جناب مرزا محمد عسکری صاحب بی۔اے، میں بھی یہی رائے ظاہر کی گئی ہے کہ:۔

"ایک زمانہ میں وہ (ڈاکٹر اقبال) اپنی بیش بہا نظموں کی بدولت پُورے ہندوستان کے دلوں پر حکومت کر رہے تھے اور مُلک کا ہر طبقہ اُن کو مادرِ وطن کا حقیقی شاعر مانتا تھا مگر کچھ عرصہ سے وہ اُن لوگوں میں ہر دلعزیز نہیں رہے، جو جذباتِ وطن کو دیگر جذبات پر مقدم سمجھتے ہیں"

بہر حال گو ڈاکٹر اقبال کی اسلام دوستی نے اُنھیں خدا اور رسول تک پہونچا دیا لیکن اُن کا "مولدِ خاص" اُن سے شاکی ہی رہا۔ ان کی شاعری پر یہ ایک نمایاں داغ ہے جس کو کوئی نہیں چھُپا سکتا۔ اس لئے اقبال مرحوم پر تنقید و تبصرہ کرتے ہوئے جو لوگ انھیں جذبۂ حب الوطنی سے خالی پاتے ہیں، اُن پر جوشِ عقیدت میں پنجابی صحائف کا پھبتیاں کسنا کسی طرح درست نہیں۔ کیونکہ بقول مسٹر لطیف احمد صاحب "اسلام کا درسِ مواخات وطنی قومیت کو باطل نہیں کرتا اور اقبال کا نظریہ مسلمانانِ ہند کے لئے دستور العمل کا کام نہیں دے سکتا ہے

بہر حال ڈاکٹر اقبال اپنی شاعری کی معراج ختم کر گئے۔ لیکن آج اُردو کو ایسے شاعر کی ضرورت ہے۔ جس کو مسلمان بھی عزیز رکھیں اور دوسری قومیں بھی۔

افسوس کہ متقدمین سے لیکر موجودہ دَور تک کے اُردو شعراء نے اپنا شاعرانہ مسلک وقتی اور نشاطی رکھا ہے۔ اُردو شاعری کو جُون بدلوانے والے صرف دو شاعر ہوئے ہیں، اکبر الہ آبادی اور حالی پانی پتی۔ انھیں دونوں شاعروں کی روش کو الفاظ کے شکوہ اور خیالات کی ندرت کے ساتھ فانی بدایونی، اصغر گونڈوی، حسرت موہانی اور آزاد انصاری وغیرہ نے اختیار کیا، اور غزل میں ایک نئی جان ڈال دی، مگر اس دَورِ عمل میں بھی اکبر اور حالی کے لگائے ہوئے پودے کی آبیاری کی توفیق صرف دو ہی چار حساس دلوں کو ہوئی، مثلاً اقبال و چکبست کے بعد اب سیماب و جوش

کی طرف عام نظریں اُٹھ رہی ہیں، جیساکہ اوپر لکھا جاچکا ہے، اقبال اپنی قوم میں پھنس کر رہ گئے چکبست کو وطن کی خدمت کا زیادہ موقع ہی نہ ملا۔ جوش اور سیماب کے دل و دماغ پر البتہ وطنی خدمت کا جذبہ بدرجۂ اتم ضرور مستولی ہے۔ ساغر نظامی، احسان بن دانش، ضیا چینوٹی ضیا فتح آبادی، اور آغاز برہانپوری وغیرہ نوجوان شعرا بھی اسی عقیدہ کے تحت نظم نگاری کے میدان میں گرم رفتار ہیں

بہر حال ہندوستان کو ایسے شاعروں کی ضرورت ہے جو آ ڈِل جل ہی کے زنداں کو آب آزادی کے ساز پر نغمے سُنائیں۔ ایسے شعرا کے کلام پر زوال و انقلاب کے اثرات تا دیر رونما نہ ہوسکیں گے۔

کلامِ جگر

(از حضرت جگر مرادآبادی)

(۱)

لب پہ نالہ ہے مرے اور نہ فریاد ہے آج — کچھ عجب طرح سے بیچین تری یاد ہے آج

کیا قیامت نگہ یاس کی بیداد ہے آج — کہ نشیمن بھی مجھے خانۂ صیاد ہے آج

برسرِ رحم، وہ شوخ ستم ایجاد ہے آج — نالہ بھی نالہ ہے، فریاد بھی فریاد ہے آج

حسرتِ قید بھی اب دل سے نکل جائیگی — مژدہ اے شوق! کہ خالی کفِ صیاد ہے آج

ایک اِک حرفِ غمِ دل کا سُنانا ہے انھیں
کل اگر بھول نہ جاؤں جو مجھے یاد ہے آج

(۲)

نظر بھی ساتھ رہی ہے قدم قدم پہ مری — پھرا ہے صحنِ چمن میں جہاں جہاں صیاد

سناؤں آہ کسے سرگزشت سیرِ چمن
نہ ہم خیال فلک ہے، نہ ہم زباں صیاد

خوابِ زندگانی

(از حضرت احسان دانش)

یہ رنگیں بدلیاں جو تیرتی ہیں آسمانوں پر
یہ دلکش گیت جو لہرا رہے ہیں بوستانوں پر

غروبِ مہر سے یہ زرفشاں جلووں کی ارزانی
یہ گہری ندیوں میں ٹھوکریں کھاتا ہوا پانی

یہ رنگینی جو پھولوں کی رگوں میں مسکراتی ہے
یہ ہریاول جو کمسن کھیتیوں میں لہلہاتی ہے

درختوں کی یہ ہلکی تیرگی میں ہانپتے جنگل
یہ سرخی سے سیاہی کا تصادم کانپتے جنگل

یہ رعنائی جو منڈلاتی ہے جبال پر ور بہاروں پر
یہ زیبائی برستی ہے جو گلشن کے نظاروں پر

یہ سازِ شام پر دھیمے ترنم جوئباروں کے
یہ خواب آلودہ آڑے ترچھے سائے دیوداروں کے

یہ بوچھاریں ہواؤں کی یہ چھینٹے آبشاروں کے
یہ خم کھاتے ہوئے ڈھلوان رستے کوہساروں کے

یہ چرواہوں کی دردانگیز تانیں بزمِ فطرت میں
یہ نزہت اور یہ حسنِ لطافت نور و نکہت میں

یہ عنابی فضاؤں میں ابابیلوں کی پروازیں
یہ ساون کی گھٹا کو دیکھ کر موروں کی آوازیں

جدھر دیکھو نظر آتا ہے اک طوفانِ شادابی
مگر مجھ کو تو اس سے اور بھی ہوتی ہے بیتابی

سمجھتا ہوں یہ منظر جاودانی ہو نہیں سکتا
یہ خوابِ زندگانی، زندگانی ہو نہیں سکتا



ڈاکٹر سر محمد اقبال

از مسٹر باسدیو سنگھ پالیوال بی۔ اے

قبل اس کے کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالی جائے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً انکی سوانح عمری ہدیۂ ناظرین کردی جائے۔ کیونکہ کسی شاعر کے کلام کا اس کے ماحول اور زمانہ کے نشیب و فراز کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔

ڈاکٹر اقبال کے بزرگوار کشمیری پنڈت سپرو خاندان سے تھے مگر دو تین سو سال کا عرصہ گذرا کہ کسی وجہ سے وہ مسلمان ہوگئے۔ ڈاکٹر مرحوم نے اپنے شعر سے اس واقعہ کی جانب اشارہ کیا ہے ؎

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی　　　برہمن زادہ، رمز آشنائے روم و تبریز است

آپ کی ولادت ۱۸۷۶ء میں بمقام سیالکوٹ ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کا زمانہ مکتب میں گذرا۔ اس کے بعد مدرسہ میں داخل کئے گئے۔ پانچویں درجہ کے امتحان میں اول پاس ہوئے اور ان کو وظیفہ بھی ملنے لگا۔ انھوں نے انٹرنس اور مڈل کا امتحان بھی امتیازی حیثیت سے پاس کیا اور وظیفہ کا سلسلہ برابر جاری رہا گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے اور مشن کالج سیالکوٹ سے ایم۔ اے پاس کیا۔ ان کو عربی اور فارسی میں اس وقت کے عربی اور فارسی کے مشہور و معروف عالم شمس العلما مولوی سید میر حسن کی شاگردی کا فخر حاصل تھا۔ وہ فلاسفی کے بہت دلدادہ تھے۔ چنانچہ فلسفہ کا مطالعہ انھوں نے جید عالم پروفیسر آرنلڈ کے زیر نگرانی کیا۔ تعلیم سے فارغ ہوکر اورینٹل کالج لاہور میں انگریزی اور فلاسفی کے اسسٹنٹ پروفیسر ہوئے اور اس دوران میں کتب بینی اور مزاولت تحریر سے ان کی استعداد میں روزافزوں اضافہ ہوتا گیا۔ شوق سیاحت و تعلیم نے ملازمت ترک کرنے پر مجبور کیا۔ اور وہ ۱۹۰۵ء میں یوروپ تشریف لے گئے۔ جہاں تین سال تک انگلستان کی سب سے قدیم اور مشہور کیمبرج یونیورسٹی میں رہ کر فلاسفی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ چنانچہ ان کی قابلیت کے صلہ میں یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی۔ اسی دوران سفر میں آپ جرمنی تشریف لے گئے۔ جہاں بڑی تحقیق و تدقیق کے بعد ایک کتاب "فلسفہ ایران" پر انگریزی زبان میں تصنیف کی جسکے صلہ میں میونخ یونیورسٹی نے آپکو ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری عطا کی۔ وہاں سے واپس آکر لندن کے پولیٹیکل سائنس کے

اسکول میں مختلف علمی مشاغل میں حصہ لیتے رہے اور ساتھ ہی بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا۔ اسی زمانہ میں آپ نے مذہب اسلام پر چھ لکچر دیئے۔ جن کی بدولت آپ کی قابلیت کی تعلیمی طبقوں میں دھوم مچ گئی چنانچہ پروفیسر آرنلڈ کی جگہ پر آپ چھ ماہ کے لئے لندن یونیورسٹی میں عربی و فارسی کے قائمقام پروفیسر مقرر ہوئے واپسی پر اسپین اور فرانس کی سیاحت کی۔ اور جولائی ۱۹۰۸ء میں معلومات کا ایک بحرِ ذخار لیکر ہندوستان واپس آئے۔ گو اُن کو بظاہر سیاست سے کوئی دلچسپی معلوم نہ ہوتی تھی۔ تاہم اُنھوں نے ۱۹۲۶ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کی ممبری کے زمانہ میں بڑی سرگرمی سے کام کیا۔ کسانوں اور مزدوروں کی فلاح و بہبود کیلئے ہر ممکن کوشش کی۔ ان کو ملک کی پامال اقوام کے ساتھ بھی سچی ہمدردی تھی۔ ۱۹۲۷ء میں آپ نے مذہبی علماء اور بزرگانِ دین کے نامناسب سلوک کی انسداد کے لئے ایک ریگولیشن پاس کرایا جو اب تک جاری ہے۔ ۱۹۲۸ء میں میسور یونیورسٹی نے آپ کو لکچر دینے کے لئے مدعو کیا۔ ۱۹۲۹ء میں آپ کو اعلیحضرت نظام دکن سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ۱۹۳۵ء میں ریاست بھوپال نے پانسو روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر کردیا۔ جس کی بدولت آپ نے فارغ البال ہوکر مسلم پبلک کی خصوصاً غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ آخرکار ۱۹۳۸ء کے اپریل میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

آپ کا شمار ان چند بزرگانِ عالی صفات میں ہے جنھوں نے اپنے اعلیٰ دماغی قابلیت اور جوہرِ طبعی سے جدید اُردو شاعری کے ناتواں جسم میں ایک نئی روح پھونک دی۔ یوں تو جدید اُردو شاعری کو فروغ دینے میں چکبست لکھنوی، سرور جہان آبادی، اکبر الہ آبادی، اصغر گونڈوی، حسرت موہانی، برق دہلوی، محروم اور جگر مرادآبادی کا حصہ کچھ کم نہیں۔ لیکن اقبال مرحوم کا نام نامی اپنی گوناگوں صفات (بے نظیر تخیل۔ نرالا اندازِ بیان۔ اچھوتے تشبیہات اور استعارے۔ اور بیساختہ پن) سے ایک امتیازی جگہ کا مستحق ہے۔ چنانچہ اگر آپ کے کلام پر ایک گہری نظر ڈالی جائے تو پتہ چلے گا کہ مومن، غالب، آزاد، حالی اور مولوی محمد اسمٰعیل کے بعد اگر کسی نے اُردو جدید شاعری کو چمکایا ہے تو اقبال مرحوم کا نام بڑی عزت اور احتشام سے لیا جائیگا۔ وہ فلاسفی اور فنِ شعر کے جید عالم تھے۔ ان کی نظموں میں نیچرل شاعری کے تمام اوصاف پائے جاتے ہیں۔ غالب کی مشکل پسندی، بے نظیر تخیل اور نرالا اندازِ بیان اقبال مرحوم کے کلام میں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ ان کے متعلق ڈاکٹر مرحوم کے دیرینہ دوست اور اُردو کے قدیم محسن، شیخ سر عبدالقادر صاحب دیباچہ "بانگِ درا" میں رقمطراز ہیں:-

"اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسداللہ غالب کو اُردو اور فارسی شاعری سے جو عشق تھا اُس نے ان کی روح کو عدم میں جاکر بھی چین نہ لینے دیا۔ اور مجبور کیا کہ وہ کسی جسد خاکی

میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے اور اُس نے پنجاب کے ایک گوشہ میں
جسے سیالکوٹ کہتے ہیں جنم لیا اور اقبال نام پایا۔"

یہ حقیقت ہے کہ اقبال کا کلام مشکل ہے اور اُس کے سمجھنے کے لئے باریک بین نظر درکار ہے، لیکن اُس کے ساتھ ہی غوطہ لگانے پر کوئی دقت پیش نہیں آتی ہے۔ اُنھوں نے خود فرمایا ہے ؎

ہوں وہ مضمون کہ مشکل ہے سمجھنا میرا کوئی مائل ہو سمجھنے پر تو آساں ہوں میں

کسی نے ڈاکٹر صاحب کو کاغذ قلم لے کر فکرِ سخن کرتے نہیں دیکھا۔ ان کے دِل و دماغ میں جذبات اور موزوں الفاظ کا ایک تلاطم بحرِ بے پایاں تھا۔ اُن کے کلام میں تغزل اور بے ساختگی کا کافی زور پایا جاتا ہے۔ اور اچھوتے استعارات اور تشبیہات بہتات سے مِلتے ہیں۔ اُن کی نظموں میں حُسن و عشق اور معاملہ بندی کی باتیں کم نظر آتی ہیں۔ فلسفیانہ اشعار بہت کافی تعداد میں ہیں۔ اُن کے کلام پر جس قدر گہری نظر ڈالی جائے۔ اُتنی ہی زیادہ خوبیاں نظر آتی ہیں۔ اُن کی قوتِ حافظہ بے پناہ تھی۔ چنانچہ لمبی لمبی غزلیں دوسرے روز زبانی سُنا دیتے تھے۔ لیکن فرمائش پر شعر کہنے سے قاصر تھے۔

ابتدائی مشق کے دِنوں کو چھوڑ کر اقبال کا اُردو کلام بیسویں صدی کے آغاز سے کچھ پہلے شروع ہوتا ہے۔ ۱۹۰۵ء تک اُنھوں نے جو نظمیں لکھیں۔ وہ سب کی سب حُبِ وطن میں ڈوبی ہوئی ہیں "نالۂ یتیم"۔ "جگنو"۔ "ہندوستان ہمارا"۔ "ہمالہ"۔ "ترانۂ ہندی"۔ "نیا شوالہ"۔ وغیرہ وغیرہ، بچہ بچہ کی زبان زد ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔ ترانۂ ہندی۔ ع

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

کی زبان کس قدر سادی ہے لیکن اشعار کس قدر بلند پایہ ہیں۔ ناظرین خود ملاحظہ فرمائیں۔
نظم "نیا شوالہ" کے بعض اشعار کبھی فراموش نہیں ہو سکتے ہیں ؎

سچ کہہ دوں اے برہمن! اگر تو بُرا نہ مانے تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پُرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بُتوں سے سیکھا جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے تیرے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے خاکِ وطن کا مجھکو ہر ذرہ دیوتا ہے

ناظرین اپنے سے پوچھیں کہ اِس سے بہتر حُبِ وطن کا اور کیا ثبوت دیا جا سکتا ہے۔ دوسرے موقع
پر فرماتے ہیں ؎

آ غیرت کے پردے اک بار پھر اُٹھا دیں بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقشِ دوئی مٹا دیں

ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت پلادیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

ہندی الفاظ کو اقبالؔ مرحوم نے جس خوبی سے کھپایا ہے۔ یہ انھیں کے بس کی بات تھی۔ اشعار کی داد دل ہی دے سکتا ہے قلم مجبور ہے۔ یہ تو تھے اُن کے قومی گیت کے نمونے، جنھیں اُنھوں نے قوم کا راگ الاپا ہے۔ اب خدا اور انسان کی محبت کے سلسلے میں جو کچھ فرمایا ہے اُس کا نمونہ بھی ملاحظہ کیجئے ؎

خُدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اُس کا بندہ بنوں گا جس کو، خُدا کے بندوں سے پیار ہوگا

یہ پاکیزہ جذبات اور بلند خیالات سب کے دلوں کو تڑپانے اور داد دینے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔

اقبالؔ مغربی تہذیب کے دِلدادہ نہ تھے، اور اکثر مہذب نوجوانانِ ملت کے خلاف مغربی مادہ پرستی کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ دراصل آپ مغرب کی خوشنما تہذیب و تمدان کو خوشرنگ کاغذی پھول سے بہتر نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خُدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

اُنھوں نے اپنی پولیٹیکل شاعری میں تشبیہات اور استعارات کے پس پردہ ملک اور قوم کو آزادی کی جنگ میں شرکت کرنے کی دعوت دی ہے۔ اگر بغور دیکھا جائے، تو اُنھوں نے اس خدمت کو ایسی خوبی سے انجام دیا ہے جو ہندوستان کے کسی حبیبِ قوم کے لئے مشکل نظر آئے گا ؎

یہ خاموشی کہاں تک لذتِ فریاد پیدا کر
زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اُن کے کلام میں میرؔ مرحوم کا درد اور سوز و گداز کوٹ کوٹ کے بھرا ہے۔ مثلاً ؎

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے

سرزمین اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا یاں تو اک قربِ فراق آمیز ہے

ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری
الٰہی! پھر مزا کیا ہے یہاں دُنیا میں رہنے کا؟
حیاتِ جاوداں میری، نہ مرگِ ناگہاں میری
مرا رونا نہیں، رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وہ گل ہوں میں خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری

دُنیا کی چہل پہل اور کروفر سے گھبرا کر کہتے ہیں ؎

دُنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یارب — کیا لُطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے مرا — ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو
مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری — دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

اُن کی مشہور نظم بعنوان " جگنو " کی اچھوتی تشبیہیں اور استعارے دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔
غرض اُن کے اشعار میں مولانا رومؒ اور   کی فلاسفی کی جھلک نظر آتی ہے۔ زندگی اور موت کے متعلق اُن کے خیالات بہت زیادہ بلند ہیں۔ خودی کی حقیقت کو دنیاوی اشیاء سے بالاتر اور زندگی و موت کی قیود سے وہ آزاد سمجھتے ہیں۔ اِس سلسلہ میں نمونے کے طور پر اُن کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں ؎

موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات — عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظامِ کائنات
ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں — جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں
آہ! غافل، موت کا راز نہاں کچھ اور ہے — نقش کی ناپائداری سے عیاں کچھ اور ہے
نہ تو زمیں کے لئے نہ آسماں کے لئے — جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے
سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے — اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے
اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو — قطرہ ہے لیکن مثلِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو — دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے
ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی — رہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی
خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں — کہ لیلیٰ کی طرح تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں

غرض ان کے پاکیزہ اور بلند خیالات اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ نہ صرف کسی خاص مُلک و قوم کے شاعر تھے بلکہ ان کے دِل میں ایک عالمگیر جذبہ تھا اور وہ ایک عالمگیر شاعر تھے۔ افسوس جدید اُردو شاعری کے گلشن کا یہ گلچین اسقدر جلد دُنیا سے اُٹھ گیا۔ جس کی تلافی نہ صرف مشکل بلکہ محال ہے۔

رُباعی

اگر در مشتِ خاکِ تو نہادند — دلِ صدپارۂ خونابہ بارے۔
ز ابر نوبہاراں گریہ آموز — کہ از اشکِ تو روید لالہ زارے

اقبال

نمازِ عشق

(از نواب محمود علیخاں صاحب عرف آغا علیخاں صاحب)

حریمِ حسن میں آکر پڑھی یہ کس نے نماز
جنونِ عشق کے بالکل بدل گئے انداز

تڑپ تڑپ گئے دل، روحیں تھرتھرا اٹھیں
حجابِ ناز سے نکلی وہ دل نشیں آواز

ہر ایک رند بھی انگڑائی لے کے اٹھ بیٹھا
نہ جانے چھیڑ دیا روح کا یہ کس نے ساز

ہزاروں صبح کے آغوش ہی میں سوتے ہیں
سحر کے جاگنے والے، ہو تیری عمر دراز

یہاں یہ ہوتے ہیں آثارِ بیخودی ظاہر
بلا جھکائے یہاں جھکتی ہے جبینِ نیاز

ہزاروں ناز ہوں صدقے حجابِ رنگیں کے
ہر ایک گل پہ ابھرنے لگا ہے رنگِ مجاز

ابل رہی ہے مئے حسن ساغرِ گل سے
حریمِ صبح میں شبنم ہے پھول کی دمساز

تجلیات سے روشن ہے کائناتِ چمن
ہر ایک پھول دکھاتا ہے اک نیا اعجاز

صبا کی موج میں رقصاں ہیں قطرۂ شبنم
شجر کی گود میں غنچے ہیں زمزمہ پرداز

ہر ایک برگِ شجر نے پڑھی نمازِ چمن
جھکا دی بڑھ کے ہر اک شاخ نے جبینِ نیاز

تڑپ رہا تھا نگاہوں میں صبح کا پرتو
دلوں میں بھرنے لگا پھر اتر کے سوز و گداز

مچل رہی تھی تجلی، فضا میں تھی ہل چل
جہانِ عشق تھا، عرصے سے گوش بر آواز

خیال ہو گئے گیسو، نگاہیں اٹھنے لگیں
نشاطِ روح کا عالم میں یوں ہوا آغاز

سریلے نغموں کی بربط پہ لہر سی دوڑی
سحر کی موجِ ہوا کا ہوا نیا انداز

سحر کے دل میں کیا راگنی نے اپنا سنگھار
ہوا خوشی سے ہم آہنگ روح کا ہر ساز

ربابِ عشق کے جب تار تھرتھرانے لگے
فضا میں گونج اٹھی حسن کی نئی آواز

ہر ایک پھول ہنسے غنچے مسکرانے لگے
چمن میں صبح کی مستی کا ہے نیا انداز

سحر کے لحن سے ہمراز و ہم نوا ہو کر
ہوئے ہیں طائرِ خوش رنگ زمزمہ پرداز

مریضِ عشق کی نبضیں ابھرتی آتی ہیں
دکھا دیا ہے اس آواز نے نیا اعجاز

جبینیں جھک گئیں سجدوں میں روحیں مست ہوئیں
نہ جانے آئی کہاں سے یہ حسن کی آواز

بہ غور اہل نظر دیکھیں، اہل دل سمجھیں
کہیں ہوئی ہے بھلا اس طرح شگفتہ نماز

پارنل اسٹوارٹ

از مسٹر ڈی۔ پی گشتہ

آئرلینڈ کے مشہور و معروف محب مسٹر پارنل جون ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کی والدہ ماجدہ امریکہ کے فوجی افسر مسٹر چارلس اسٹوارٹ کی صاحبزادی تھیں۔ برطانیہ اور امریکہ کی جنگ آزادی میں مسٹر چارلس کو اپنی بہادری و جانبازی کے بدولت عالمگیر شہرت حاصل ہوئی تھی۔ اپنے آزاد خیال والد کی وجہ سے پارنل کی والدہ کی ابتدائی زندگی سیاسی فضا میں بسر ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ بڑی آزادی پسند اور دلدادۂ حریت تھیں۔

پارنل پر بھی ان خیالات کا پورا اثر پڑا۔ چنانچہ آئرلینڈ کی محبت کا جوش اُن کی رگ رگ میں موجزن رہنے لگا۔ اور حبِ وطن کا جذبہ اُن کے دل و دماغ میں سرایت کر گیا۔ پارنل بچپن ہی سے بڑے کھلاڑی باہمت اور شریر واقع ہوئے تھے۔ وہ اپنے ہم جماعتوں اور ساتھیوں پر ہمیشہ حاوی رہتے۔ اور کبھی خوفزدہ ہونا یا مشکلات سے گھبرانا تو انھوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ ممکن تھا اپنے والد ماجد کی پرداخت و نگہداشت میں رہ کر ان کی زندگی کسی دوسرے ہی سانچے میں ڈھل جاتی، مگر مشیت ایزدی کچھ اور ہی تھی۔ چنانچہ تیرہ ۱۳ سال کے سن میں ہی پارنل ظلِ پدری سے محروم ہو گئے۔ ان کی والدہ نے حالات سے مجبور ہو کر ان کو تحصیل علم کی غرض سے انگلینڈ بھیج دیا۔ مگر وہاں پارنل کی اپنے ہم جماعتوں اور اسکول کے دوسرے طالب علموں سے مطلق نہ بنی۔ روز کسی نہ کسی بات پر جھگڑا ہو جایا کرتا تھا۔ اور اُستادوں سے بھی اکثر کہا سُنی ہو جاتی تھی۔ غرض ان کی شورش پسند خصلت اور باغیانہ اطوار کسی کو ایک آنکھ بھی نہ بھاتے تھے خیر جوں توں اسکول کا کورس ختم کر کے یہ کیمبرج میں داخل ہوئے۔ مگر وہاں بھی شیطانیوں اور مکہ بازیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ باتیں آخر کب تک گوارا کی جا سکتی تھیں۔ چنانچہ اسکولی نظام قائم رکھنے کے لئے اُن کو درسگاہ سے خارج کر دیا گیا۔

اِن تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ پارنل کی تعلیم نامکمل رہ گئی۔ انگریزی زبان پر عبور و دسترس حاصل نہ ہونے کی وجہ سے ان کو مضامین تحریر کرنے اور تقریر کرنے میں بڑی دقت اور جھجک محسوس ہوتی تھی۔

اور اِسی لئے وہ بہت محتاط رہتے تھے۔ کیمبرج سے واپسی پر وہ اعزازی حیثیت سے بلاتنخواہ فوج میں بھرتی ہوگئے اور اپنی والدہ کے ساتھ رہنے لگے۔ اُنھیں تعلیم ادھوری رہ جانے کا بڑا ملال تھا۔ اور اُن کا دماغ ہر وقت اسی غور و فکر میں مصروف رہتا تھا۔ ان کی توجہ سیاسیات کی جانب مبذول تو ہوچکی تھی۔ مگر ابھی یہ اس میں کوئی خاص دلچسپی نہ لیتے تھے۔ جس وقت امریکہ اپنی خانہ جنگیوں سے فارغ ہوچکا اور فضا کچھ بہتر ہوئی، تو وہاں کے چند آزاد خیال و حریت پسند نوجوانوں نے آئرلینڈ پہونچ کر ایک نئی تحریک شروع کی۔ جس کو "سن فین" کے نام سے موسوم کیا گیا اور اُس کا نصب العین آئرلینڈ کے لئے "مکمل آزادی" حاصل کرنا مقرر کیا گیا۔ انگلینڈ نے اس تحریک کو کچلنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مگر اس کی تمام کوششیں رائگاں ثابت ہوئیں اور اس تحریک کے شعلے سرد ہونے کے بجائے روز افزوں بھڑکتے گئے۔ پارنل کی والدہ کو بھی اس تحریک سے بڑی گہری دلچسپی تھی اور وہ حتی الامکان اس کے ممبروں کی امداد کرتی رہتی تھیں۔ چنانچہ پولیس کو اُن پر شبہ ہوگیا اور اُن کے مکان کی تلاشی لی گئی مگر کوئی قابل اعتراض شئے برآمد نہیں ہوئی۔ پارنل اب تک اس تحریک میں باقاعدہ طور پر شامل نہ ہوئے تھے۔ مگر پولیس کی سختیاں دیکھ کر وہ بھی اس کے ممبر بن گئے۔

اِنسان کی زندگی میں کبھی کبھی اچانک ایسے عجیب واقعات رونما ہوجاتے ہیں جو اس کو قعرِ گمنامی سے نکال کر شہرت کی بلند ترین چوٹی پر پہونچا دیتے ہیں۔ پارنل کی شہرت بھی اسی قسم کے ایک واقعہ کی مرہونِ منت ہے۔

جن دِنوں وہ مذکورہ بالا تحریک کی ترقی و توسیع کے لئے سرگرداں تھے اور اس کوشش میں جگہ بجگہ مارے مارے پھرتے تھے انھیں ایام میں ان کی ملاقات مس وڈ نامی ایک امریکن خاتون سے ہوگئی۔ پارنل پہلی ہی ملاقات میں اُس کی نظر کے شکار ہوگئے۔ عرصہ تک دیوانہ وار کوچۂ عشق کی خاک چھانی مگر بے اعتنائی و بے رُخیِ محبت کے سوا انھیں کوئی حوصلہ افزا جواب نہ مِلا۔ بالآخر جب ضبط کا یارا نہ رہا تو پارنل نے مجبور ہوکر اپنا دِلی راز ظاہر کر دیا۔ مگر اُس بیدرد نے اس التجا کا کچھ بھی لحاظ نہ کیا۔ اور کھلے الفاظ میں یہ کہکر شادی سے انکار کر دیا کہ "پارنل" تو کوئی ایسی معروف شخصیت یا مشہور ہستی نہیں ہے۔ جس کے کارہائے نمایاں سے دُنیا واقف ہو۔ اور میں ایک گمنام اور معمولی شخص کی شریکِ زندگی ہونا گوارا نہیں کرسکتی۔ معشوقِ جفا کار کے اِن تُرش الفاظ نے پارنل کا شیشۂ دِل تو ضرور چور چور کر دیا۔ لیکن ان کی بدولت اس بات کی کد ہوگئی کہ جس طرح ہوسکے اپنے مقصدِ حیات کی تکمیل کے لئے انتہائی کوشش کرے۔ چنانچہ اُس کے بعد سچ مچ کایا پلٹ گئی۔ اب اُنھیں دوسری ہی لَو لگ گئی۔ ہر گھڑی یہی دھن رہنے لگی کہ کس طرح نیکنامی اور

شہرت حاصل کی جائے۔ ہر وقت یہی خیال رہتا کہ دُنیا کس طرح اُن کی لیاقت و کارگزاری سے واقف ہو اور اُن کا نام بھی صفحات تاریخ میں یادگار ہو کر رہے ؛

اُولوالعزم اور مستقل مزاج پارنل اب پوری قوتِ ارادی کے ساتھ ملکی خدمات کی جانب رجوع ہو گئے دُنیا کے دیگر مشاغل اور خواہشات سے کنارہ کش ہو کر وہ ہمہ تن مضامین لکھنے اور تقریر کرنے کی مشق حاصل کرنے میں مصروف ہوئے اور دو سال کی متواتر کوشش سے ایسی مہارت پیدا کرلی کہ اُن کا شمار قابل ترین مقرروں اور کہنہ مشق مضمون نویسوں میں ہونے لگا۔ عام و خاص سبھی اُن کی قابلیت کا اعتراف کرنے لگے اور رفتہ رفتہ عوام کے دِلوں میں اُن کے لئے ایک جگہ پیدا ہو گئی۔ یہانتک کہ وہ پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہو گئے۔ اُس وقت مسٹر بٹ آئرش پارٹی کے لیڈر تھے۔ اور آئرلینڈ کے مفاد کے متعلق ہر تجویز کی تائید کرنا اس پارٹی کی پالسی تھی۔ لیکن چونکہ پارلیمنٹ میں انگریزوں کی اکثریت تھی وہ اس پارٹی کو اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہونے دیتے۔ پارنل کو یہ کمزوری بیحد کھٹکتی تھی۔ چنانچہ وہ اس کے دُور کرنے کی تدابیر سوچنے میں منہمک رہنے لگے اور بالآخر اُنھوں نے یہ رویہ اختیار کیا کہ انگریزوں کی ہر بات اور ہر قرارداد کی پُرزور تردید کرنے لگے۔ یہ پالسی کارگر ثابت ہوئی۔ چنانچہ اس کی وجہ سے پارنل کے حامیوں کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی اور جب جنوبی آفریقہ کا بل پیش ہوا، تو اسی پارٹی کی ہنگامہ آرائی اور شور و شر کے باعث پارلیمنٹ کا اجلاس متواتر چھبیس گھنٹے رہا۔

۱۸۷۸ء میں ڈبلن میں ہوم رول کانفرنس منعقد ہوئی اور اُس کے صدر مسٹر پارنل منتخب کئے گئے۔ اس کانفرنس میں اُنھوں نے ایسی پُرزور تقریر کی کہ اس کا پبلک پر بہت بڑا اثر ہوا اور ہر شخص نے بہ آواز بلند اُن کے خیالات کی تائید کی

کچھ عرصہ کے بعد اُنھوں نے آئرلینڈ میں ایک کسان سبھا قائم کی۔ جس کا مقصد کسانوں کو زمینداروں کے فولادی پنجہ سے رہائی دِلانا تھا۔ زمیندار زیادہ تر انگریز ہی تھے اور ان کو آئرش کسانوں اور مزدوروں سے ذرا بھی ہمدردی نہ تھی۔ اور وہ ان غریبوں پر جی بھر کر ظلم کرتے۔ کبھی لگان میں اضافہ کر دیا کبھی انھیں زمین سے بیدخل کر دیا۔ کبھی نذرانے نہ پہنچنے پر مارے ٹھوکروں کے بیدم کر دیا۔ غرض ان بیچاروں کی زندگی دوزخ کا جیتا جاگتا نمونہ تھی۔

اتفاق سے جس سال یہ کسان سبھا قائم ہوئی اسی سال قدرت کی طرف سے قہر نازل ہوا اور ایسا زبردست قحط پڑا کہ خدا کی پناہ۔ بہرحال کسانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی اور بیچارے دانے دانے کو محتاج ہو گئے بھوک اور فاقہ سے بیشمار جانیں ضائع ہوئیں۔ قحط سالی کی تباہ کاریوں اور فرشتۂ اجل کی ہلاکت آفرینیوں پر بھی

سنگدل زمینداروں کا کلیجہ پتھر ہی بنا رہا۔ کسی نے اس موقع پر غریبوں کی کوئی امداد نہ کی۔

مگر مسٹر پارنل کی کسان سبھا نے اس اڑے وقت پر بڑا کام کیا۔ نہایت مستعدی و جانفشانی سے قحط زدہ کسانوں کو ہر طرح کی سہولتیں بہم پہونچائیں۔ ان کی امداد میں حتی المقدور کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا۔ انھیں کارگذاریوں سے اس سبھا نے بہت ہی تھوڑے عرصہ میں نمایاں ترقی اور ہر دلعزیزی حاصل کرلی۔ اس سلسلہ میں مسٹر پارنل نے ایک مرتبہ پھر امریکہ کا دورہ کیا۔ اس بار وہاں کی پبلک نے ان کا نہایت پُرجوش و پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ آپ نے بھی اپنی تقریروں میں زمینداری سسٹم کے عیوب و مظالم پر خوب روشنی ڈالی۔ آپ نے ایک تقریر کے دوران میں اِس بات پر زور دیا کہ اپنے جائز حقوق کی حفاظت کرنے اور انھیں حاصل کرنے کے لئے ہر آئرش کو جسے اپنی اور اپنے وطن کی عزت کا پاس ہے جان و مال تک قربان کردینا چاہیے آزادی ہر شخص کا پیدائشی حق ہے اور اس کے لئے مرمٹنا اس کا مقدم فرض ہے۔ لیکن چونکہ آئرلینڈ کے لوگ بہت غریب اور نہتے ہیں اِس لئے انھیں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیئے اور جوش میں آکر یا بغیر سوچے سمجھے کبھی کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہیئے جس کے لئے انھیں بعد میں پچھتانا پڑے اور کامیابی دشوار ہو جائے۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ دشمن کو کبھی زہر دے کر نہ مارنا چاہیئے کیونکہ یہ جذبہ علوی نہیں ہے۔ بلکہ بقول حضرت عیسیٰؑ اگر کوئی شخص آپ کے ایک تھپڑ مارے تو آپ دوسرا گال بھی اُس کی طرف کردیں۔ وہ خود ہی ندامت سے مرجائے گا۔

آپ نے یہ بھی کہا کہ پیشتر اِس کے کہ ہم کسی مقابلہ کی طرف قدم بڑھائیں ہمیں اپنی پوری طاقت اور حوصلے کا اندازہ کرلینا چاہیئے۔ عدم تشدد ہی نہتوں اور کمزوروں کا کامیاب ہتھیار ہے اور ہمیں اسی کا سہارا لینا واجب ہے۔ آپ نے اہل امریکہ سے مخاطب ہو کر ایک جلسہ میں کہا کہ:۔

"میں آپ لوگوں سے آئرلینڈ کی مدد کرنے کی التجا کرتا ہوں۔ یہ آپ کا انسانی اور اخلاقی فرض ہے، کہ آپ ان مظلوموں کو ظالموں کے پنجہ سے نجات دلائیں۔ خدا آپ کو غریبوں کی امداد کرنے کی توفیق عطا کرے۔ آمین!"

امریکہ سے واپس آکر پارنل پھر کسان سبھا کے کام میں مصروف ہوگئے۔ قحط کی وجہ سے کسانوں میں جو بے چینی پھیل گئی تھی اُس کو دور کرنے کے لئے آئرش پارٹی نے پارلیمنٹ میں یہ ریزولیوشن پیش کیا کہ "چونکہ کسانوں کو یہ تمام تکالیف زمینداروں کے ظلم اور زیادتی کی وجہ سے برداشت کرنا پڑی ہیں اس لئے اُن کو زمینداروں سے اس کا ہرجانہ دلایا جائے"۔ یہ قرارداد مناسب ہوتے ہوئے بھی اس لئے منظور نہیں ہوئی کہ انگریزوں نے اس کی تائید نہیں کی۔

اس غیر منصفانہ برتاؤ نے ہر آئرش کے دِل میں برطانیہ کے خلاف نفرت و مخالفت کے جذبات پیدا کر دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بغاوت کی آگ جو ایک عرصے سے دھیرے دھیرے سلگ رہی تھی۔ ایکدم بھڑک اُٹھی۔ پارنل بذات خود بغاوت پسند نہ کرتے تھے اور نہ اس سے ان کو کوئی ہمدردی تھی۔ مگر ملک اور قوم کی خاطر انھیں سب کچھ کرنا پڑا۔

ایک مرتبہ آپ نے ایک تقریر کے دوران میں حاضرین سے دریافت کیا کہ "اگر ایک بیدخل کئے ہوئے کھیت کو دوسرا کسان لے لے تو اُس کے ساتھ کیا سلوک کرنا روا ہوگا"

جواب مِلا کہ "اسے شخص کو فوراً گولی سے مار دینا چاہیئے"

مگر پارنل نے اِن الفاظ کو کوئی اہمیت نہ دی اور سنجیدگی سے کہا کہ "اگر کوئی ناسمجھ کسان ایسی غلطی کر بیٹھے تو اُس کے ساتھ خلاف اِنسانیت برتاؤ کرنے کے بجائے یہ مناسب ہوگا کہ اس سے کوئی تعلق نہ رکھا جائے بلکہ قطعی کنارہ کشی اختیار کی جائے"۔ آپ نے کہا کہ "کوئی شخص اِتنا بے حیا اور ایسا لالچی نہ ہوگا جو عوام کے جذبات کی پامالی کر کے ایسی کمینہ کارروائی کرنے کی جُرات کرے"

چنانچہ اِس تجویز بائیکاٹ پر عمل کیا گیا اور یہ بہت مُفید اور کارآمد ثابت ہوا۔ پارلیمنٹ میں اس تحریک کے دبانے کی کوشش کی گئی لیکن پارنل اور اُن کے ساتھیوں کے آگے کسی کی پیش نہ گئی۔ آخر گورنمنٹ نے تنگ آکر ایک نئے قانون کی رو سے پارنل کو گرفتار کر لیا۔ مگر اس پر بھی بائیکاٹ کی تحریک جاری رہی۔ گرفتاری کے بعد بھی پارنل نے اپنے معمول میں سرمو فرق نہ آنے دیا۔ اور جیل خانہ کی چاردیواری کے اندر ہی سے اعلان کیا کہ "لگان کی ادائیگی فوراً بند کر دی جائے"۔

تمام آئرلینڈ کے کسانوں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ چنانچہ انگریزی گورنمنٹ کو پھر نیچا دیکھنا پڑا۔ آخر بات بڑھتی دیکھ کر سمجھوتہ کی طرف ہاتھ بڑھایا گیا اور پارنل کو اس شرط پر رہا کرنا طے کیا گیا کہ پبلک کو سرکار کے خلاف نہ بھڑکائیں اور نہ ایسے خیالات کا اظہار کریں جس سے عوام کے جذبات مشتعل ہوں۔ اس کے سلہ میں گورنمنٹ نے اپنی سخت گیری کی پالسی ترک کرنے کا وعدہ کیا۔ بہرحال صلح ہوگئی۔ اور مسٹر پارنل کو رہا کر دیا۔ مگر اُنھوں نے جیل سے رہا ہوتے ہی یہ تجویز پیش کی کہ گورنمنٹ اُن غریب کسانوں کی جو باوجود کوشش پچھلے دو سال سے لگان ادا نہیں کر سکے ہیں، مالی امداد کرے۔ شاید گورنمنٹ ایسا کرتی۔

یکن اسی دوران میں ایک ایسا واقعہ ہوگیا جس سے اس تجویز پر عمل کرنا ناممکن ہوگیا۔ کسی بدنفس نے ئرلینڈ کے نئے وزیر اور اُس کے سکرٹری کو قتل کر دیا۔ اِس حادثہ کے بعد پارنل کی اُمیدیں خاک میں مل گئیں اور اُن کا کیا دھرا مٹی میں مِل گیا۔ مخالفین نے اس مکروہ قتل کو پارنل ہی کی سازش کا نتیجہ بتایا،

اور اُن کے خلاف بڑے زور و شور سے پروپیگنڈا کیا۔ چنانچہ گورنمنٹ نے پھر جبر و استبداد کا حربہ سنبھالا۔ اور پارنل نے بھی اپنی پوری طاقت سے اِن مظالم کی مخالفت کی اور اپنے خلاف غلط الزامات کا منھ توڑ جواب دیا جس سے حریفوں کے قدم اکھڑ گئے اور بالآخر حقیقت آشکار ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ پبلک پر اصل واقعات روشن ہو گئے بے لوث اور بے غرض خدمات نے مسٹر پارنل کو پھر اپنی اصل جگہ پر لا کر کھڑا کر دیا۔ اور پیشتر کی طرح اُن کو پھر عوام کا اعتماد حاصل ہو گیا۔ اور اس عقیدت کے ثبوت میں پبلک نے اُن کو پانچ لاکھ روپیہ کی گراں نقد تھیلی نذر کی۔ تاکہ وہ اپنے مالی بوجھ سے سبکدوش ہو کر اطمینان و آرام سے اپنا بیش بہا وقت مُلک و قوم کے فلاح و بہبود میں صرف کر سکیں۔

مالی مشکلات سے فارغ ہو کر پارنل پھر ہوم رول کے کام میں منہمک ہو گئے۔ اور ڈھائی سال تک متواتر تمام آئرلینڈ کا دورہ کیا۔ جس سے عوام اُن کی رائے اور خیالات سے متفق ہو گئے۔

۱۸۸۵ء میں پارلیمنٹ کا نیا انتخاب ہوا۔ جسمیں پارنل ہی بہ حیثیت لیڈر منتخب ہوئے۔ اس مرتبہ پارلیمنٹ میں اُن کے ساتھیوں کی تعداد بہت کافی تھی۔ جس سے گورنمنٹ بھی ڈھیلی پڑ گئی۔ اور اُس کو مجبوراً پارنل کی اسکیم کو تسلیم کرنا پڑا۔ چنانچہ اس دفعہ وزرا نے اپنی طرف سے ہوم رول بل پیش کیا۔ انگریزی اخباروں نے اس پر بڑا واویلا مچایا اور پارنل کے خلاف بڑے زور و شور سے پروپیگنڈا کیا گیا۔ مگر پارنل کے خلاف جتنی تہمتیں لگائی گئیں وہ ثابت نہ ہو سکیں لیکن انھیں دنوں ایک واقعہ ایسا افسوسناک ہو گیا جس کے سبب سے پارنل کی تمام کوششوں پر پانی پھر گیا۔ بعض لوگوں کا قیاس ہے کہ یہ حرکت خود گورنمنٹ کی طرف سے کی گئی۔ کہ جب پارنل کے خلاف کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو ایک ایسی شاطرانہ چال چلی گئی کہ ان کو مات کھانی پڑی کہتے ہیں کہ اسی زمانہ میں اُن کی ملاقات ایک خاتون سے کرائی گئی جو ایک کپتان کی بیوی تھی۔ پارنل کو اس کی محبت کے جال میں کچھ اس طرح پھانسا گیا کہ اُنھوں نے اس سے شادی کر لی۔ بساطِ عشق کے ناتجربہ کار کھلاڑیوں کی طرح شکست پر شکست کھانے پر بھی پارنل کو ہوش نہ آیا۔ اُن کے خلاف پروپیگنڈا تو جاری ہی تھا۔ اس واقعہ کے بعد اُن کے ساتھیوں اور حمایتیوں نے بھی اُنکا ساتھ چھوڑ دیا۔ جسکا اُنکی صحت پر مہلک اثر پڑا۔ آخر کار ۱۸۹۱ء میں اُن کو اپنی قیمتی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔

افسوس کہ جس طرح پارنل کی سیاسی زندگی کا آغاز ایک عورت کے ترش الفاظ سے ہوا تھا۔ اسی طرح انکا انجام بھی عورت ہی کی محبت کی سحرکاری کے باعث ہوا۔ دشمن نے اُن کو راستے سے ہٹانے کی جو کمینہ چال چلی وہ کارگر ہو گئی۔ خیر جو کچھ بھی ہو پارنل کو اپنے ملک اور ملک کے غریبوں سے سچی محبت تھی اور تاریخ شاہد ہے کہ اُنھوں نے آزادی کی دیوی کے سچے پجاری کی طرح پوجا کی اور اسی کی خدمات انجام دیتے ہوئے اپنی زندگی ختم کر دی۔

---

*

کلامِ فراق

(از پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق ایم۔ اے)

جام اُدھر چھلکے ادھر راتیں درخشاں ہو گئیں
ظلمتیں لہرا کے سامانِ چراغاں ہو گئیں

شامِ صحرا ہو گئیں صبحِ گلستاں ہو گئیں
وحشتیں میری بہ ہر صورت نمایاں ہو گئیں

دل بھی ششدر رہ گئے آنکھیں بھی حیراں ہو گئیں
سب ادائیں حسن کی آئینہ ساماں ہو گئیں

پرسشیں اربابِ غم کی ہو گئیں ہاں ہو گئیں
اس نظر کی بجلیاں لہرا کے پنہاں ہو گئیں

پھر سرشکِ خوں ہوئے آئینہ دارِ لطفِ یار
پھر مری آنکھیں گلستاں در گلستاں ہو گئیں

کُل بہاریں رنگ و بو کی کھنچ کے مرکز کی طرف
شوخیِ برقِ تبسم ہائے پنہاں ہو گئیں

ماورائے ہوش و غفلت ہے یہ قولِ بے حسی
منزلیں غم کی نہ مشکل تھیں نہ آساں ہو گئیں

پھر عیاں کر حسن کی وہ خوبیاں تیرے نثار
ہاں وہی جو چشمِ ظاہر بیں سے پنہاں ہو گئیں

راہ دیوانوں کی کھوٹی کی جنونِ خام نے
وحشتیں گھٹ کر در و دیوارِ زنداں ہو گئیں

پھر تری زلفیں جنوں کے باندھ کر کچھ سلسلے
صورتِ شیرازۂ ہستی پریشاں ہو گئیں

جاں ستانی، جاں فزائی ان کی کیا جانے کوئی
وہ نگاہیں جو اُترتے ہی رگِ جاں ہو گئیں

دیدنی ہے عالمِ ہنگامہ زارِ زندگی
بستیوں کی بستیاں شہرِ خموشاں ہو گئیں

عشق کو تیرے تغافل سے نہیں شکوہ۔ مگر
دل کی چوٹیں کس لئے مایوسِ درماں ہو گئیں

اِک صلائے عام بھی ہے اِک، پیامِ راز بھی
حسن کی باتیں نہ ظاہر تھیں نہ پنہاں ہو گئیں

دل ہوئے آباد ادھر بادِ مخالف چل پڑی
بستیاں بسنے نہ پائی تھیں کہ ویراں ہو گئیں

جس طرف اُٹھی پیامِ غیب سا لیکر اُٹھی
اِس نظر کی حیرتیں اسرارِ دوراں ہو گئیں

چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہے
منزلیں چمکیں مگر شامِ غریباں ہو گئیں

وہ بھی کوئی پنجۂ وحشت ہے جس کی وحشتیں
صرفِ داماں ہو گئیں صرفِ گریباں ہو گئیں

تیرے دیوانوں کو جن کی وسعتوں پر ناز تھا
وہ فضائیں کیوں در و دیوارِ زنداں ہو گئیں

خیر سے جب ہو چکی تکمیلِ تعمیرِ جہاں — کچھ بلائیں مِل گئیں باہم اور انساں ہو گئیں

تھیں جو اِک مدت سے جانِ اضطرابِ انتظار — وہ امیدِ وقفِ تاخیر پریشاں ہو گئیں

داستانِ جور و بیدردی کی سب رنگینیاں — حاصلِ خمیازۂ حُسنِ پشیماں ہو گئیں

ہو چلی تھیں کچھ سکوں آور ادائیں حُسن کی — اِک نئے انداز سے پھر حشر ساماں ہو گئیں

زخمِ پنہاں کھل اُٹھے نوکِ مژہ کی چھیڑ سے — مُسکرا کر آج یہ کلیاں گلستاں ہو گئیں

خاک اُڑتی ہے جہاں تھے اشکِ خونیں موجزن — اُف وہ آنکھیں جو گلستاں سے بیاباں ہو گئیں

عشق کے آنسو نثارِ جورِ پیہم ہو گئے — اِس ادا سے آج وہ آنکھیں پشیماں ہو گئیں

جن کے ہر لمحے میں تھی کیفیتِ شامِ ابد — آج کیوں وہ صحبتیں خوابِ پریشاں ہو گئیں

ہاں وہی دُکھتے دلوں کو بھی خبر جن کو نہ تھی — وہ رگیں بھی صرف کاوشہائے مژگاں ہو گئیں

تھیں ازل ہی سے نگاہِ اوّلیں میں وحشتیں — بڑھتے بڑھتے صبحِ ہستی کا گریباں ہو گئیں

عشق کا گھر جس طرح ویران تھا ویران ہے — وہ نگاہیں چار دن کو دل میں مہماں ہو گئیں

کیا دھرا ہے زندگی میں کیا دھرا ہے موت میں — مرحبا وہ ہستیاں جو دُکھ کے انساں ہو گئیں

غیب کا پہلو بدلنا باعثِ خلقت ہوا — نیستی کی کروٹیں ہستی کا ساماں ہو گئیں

آہ یہ زہرابۂ ہستی کی موجیں اور یہ پیاس — کیا کروں گا؟ گر یہ موجِ آبِ حیواں ہو گئیں

درسِ عبرت ہے محبت کا یہ رنگِ بے حسی — آہ وہ چوٹیں جو صرفِ فکرِ درماں ہو گئیں

ناشکیبا جن میں تھا اکثر نشاطِ زندگی — وہ بھی راتیں راحتِ بیمارِ ہجراں ہو گئیں

خود بقا لیتی تھی جن کو دیکھ کر انگڑائیاں — کیسی کیسی صورتیں خوابِ پریشاں ہو گئیں

وہ نگاہیں گرچہ تھیں اپنی جگہ لیکن فراقؔ
باعثِ صد امتیازِ کُفر و ایماں ہو گئیں

رُباعیات

آنکھیں کھولیں مگر یہ پردا نہ کھُلا — سب ہم پہ کھُلا پہ حالِ دُنیا نہ کھُلا
دریائے تفکر میں رہے برسوں غرق — مانندِ حباب یہ معمّا نہ کھلا

ایذا سے نہ کوئی اس میں اصلا چھوٹا — ادنےٰ چھوٹا نہ کوئی اعلےٰ چھوٹا
دنیا کا بھی زنداں ہے عجب مہلک و سخت — جس میں پھنسکر نہ کوئی بندا چھوٹا

انیسؔ

موجد ہومیوپیتھی

از ڈاکٹر نجم الحسن موہانی (ہومیو) حیدرآباد دکن

حالاتِ ہانمن | جرمنی کے صوبہ سیکسنی کے ایک غیر معروف شہر میسن میں ۱۰ ار اپریل ۱۷۵۵ء کو ایک اولوالعزم ہستی نے کتم عدم سے دُنیائے ظاہر پر نزول اجلال کیا۔ نام نامی سموئیل ہانمن تھا۔ جو بعد میں ڈاکٹر سموئیل ہانمن کے نام سے مشہور ہوا۔ ڈاکٹر ہانمن کے والد بزرگوار جے۔ ہانمن بہت ہی غریب آدمی تھے۔ سموئیل ہانمن کو قدرت نے خاص دماغ عطا کیا تھا۔ غربت کی وجہ سے ہانمن کو ابتدائی تعلیم میں غیر معمولی مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ ابھی اُن کی عمر بارہ (۱۲) برس ہی کی ہوگی کہ یونانی زبان کی تعلیم دی جانے لگی۔ بیس (۲۰) برس کی عمر میں سموئیل ہانمن اپنی مادری زبان جرمنی کے علاوہ اطالوی، فرانسیسی، انگریزی، یونانی اور عربی وغیرہ کے ماہر ہوگئے۔ ان تمام زبانوں پر آپ نے محض اپنی ذاتی کوشش، اور جانفشانی سے عبور حاصل کیا۔ یہ اِس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ آپ کو خدا نے ایسا ٹھوس دماغ عطا کیا تھا۔ جو بہت کم لوگوں کے حصّے میں آتا ہے۔ ہانمن نے اپنی یونیورسٹی تعلیم محض مختلف زبانوں کے درس دینے اور جرمنی زبان میں تالیف و ترجمہ کرنیکی بدولت حاصل کی۔

اُن کا رجحانِ طبیعت ہمیشہ سے فنِ طب کی طرف تھا۔ چنانچہ ۱۷۷۹ء میں خاص اعزاز کے ساتھ آپ ارلنگن سے طب کے گریجویٹ ہوئے۔ آپ زبان ذاتی کے علاوہ دیگر شعبوں میں بھی جن کا فن طب سے کوئی تعلق نہ تھا ماہرِ کامل تصور کئے جاتے تھے اور مختلف فنّی اور ادبی اداروں میں شریک تھے۔ بہرحال نوجوانی ہی میں آپ ڈرسڈن اسپتال کے ہاؤس سرجن بنا دئے گئے۔ ۱۷۸۴ء میں آپ نے بعض سنگین پھوڑوں کے علاج کے متعلق ایک کتاب شائع کی۔ جسمیں ہڈیوں کے قطع و برید کا ایسا اصول قائم کیا۔ جو اب سے نصف صدی پہلے تک فنِ جراحی میں نہایت مقبول تھا۔ اصول مذکورہ کو لوگوں نے غلطی سے آف لیڈز کی طرف منسوب کر رکھا تھا۔ جس کو وہ لوگ اس کا موجد گردانتے تھے۔ اس ایجاد و اکتشاف کے چند روز بعد آپ گارجنتھل کے پاگل خانہ کے مہتمم بنا دئے گئے۔ آپ نے پاگلوں کے علاج کے متعلق کافی غور اور تجربہ کے بعد یہ اصول طے کیا کہ پاگلوں پر کسی قسم کی مار پیٹ یا سختی نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ سخت برتاؤ اُنھیں صحتیاب نہیں ہونے دیتا۔ آج طب کی دُنیا سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ پاگلوں اور مجنونوں کے علاج

میں عدم تشدد کی بنیاد ہانمن نے ہی ڈالی تھی۔ لیکن بعض مورخین اس کو ڈاکٹر پائینل کا کارنامہ سمجھتے ہیں۔ جو صحیح نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ پائینل نے ہانمن کی تعلیم کے بعد اپنے تجربات اس معاملہ میں پیش کئے ہیں۔
ہانمن کیمیا (کیمسٹری) کا ایسا مبصر تھا کہ آج تک اُس کے کیمیاوی امتحان کو (کہ شراب کے کیمیاوی اجزاء کس طرح معلوم کئے جاتے ہیں اور اُن کا افادہ کیونکر ہوتا ہے) کوئی غلط ثابت نہ کر سکا۔ اہلِ تحقیق اب بھی اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اُس نے دوسرے فنون پر بھی کتابیں تصنیف و تالیف کیں جو تراجم کے علاوہ تھیں۔ علاج ہومیوپیتھی کے سلسلہ میں دواؤں کے اثرات کو پورے طور سے عمل میں لانے اور صحت کو بحال کرنے کے لئے ہانمن نے اس کی سخت ضرورت محسوس کی۔ کہ حفظانِ صحت کے مسئلہ پر کچھ لکھا جائے۔ چنانچہ ایک کتاب "رفیقِ صحت" نامی اس موضوع پر سپردِ قلم کی جو آج تک ماہرینِ حفظانِ صحت کے لئے ایک بیش بہا کتاب ہے۔ اب بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ایک سو سال پہلے کی نہیں۔ بلکہ آج کی لکھی ہوئی ہے، جبکہ سائنس کی کافی ترقی ہو چکی ہے۔ کیونکہ جو مضامین اور کھانے پینے کے اصول اس کتاب میں درج ہیں، اُن کا حقیقتاً اُس وقت مصنف کے ذہن میں آنا روحانی قوت ہی کا کرشمہ ہو سکتا ہے۔ بہرحال جو باتیں آج بڑی تحقیق و تفتیش کے بعد معلوم ہوئی ہیں۔ وہ بہت کچھ اس کتاب میں موجود ہیں۔

۱۷۸۶ء میں ہانمن نے ایک رسالہ "سنکھیا" کے زہر پر لکھا۔ جس میں اُس نے ایسی نادر باتیں جمع کیں کہ اب تک سمیات (Toxicology.) میں یہ رسالہ بہت بلند پایہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہانمن نے فن دوا سازی کا ایک قرابادین بھی تیار کیا، جو بہت مقبول ہوا۔ دراصل ہانمن کی ادبی و فکری زندگی کا آغاز ۱۷۷۷ء سے ہوا اور ۱۸۳۹ء میں پایۂ تکمیل کو پہونچا۔ ۱۸۰۶ء میں ہانمن نے اپنے وقت کے مشہور طبی رسالہ "ہوف لینڈ" میں ایک مقالہ لکھا جس کا عنوان میڈیسن آف اکسپرینس (Medicine of Exprience) تھا۔ اور یہ ہومیوپیتھک علاج کی پہلی شعاع تھی۔ ہانمن نے ہاکر صاحب کی مشہور "میٹیریا میڈیکا" کا ترجمہ بھی کیا۔ جسمیں اُس نے ادویہ کو تندرست اشخاص پر آزمائش کی سفارش کی تھی۔ ہومیوپیتھی کا لفظ سب سے پہلے ۱۸۰۷ء میں ہانمن نے اپنے قلم سے استعمال کیا۔ ۱۸۱۱ء میں "میٹیریا میڈیکا پیورا" نامی ایک مخزن الادویہ کے طرز کی ایک مبسوط کتاب شائع کی۔

جس زمانہ میں ہانمن ایلوپیتھک اصولوں کی عدم صحت پر تنقید کر رہا تھا۔ اس کے خلاف ایک عام ہیجان پیدا ہوا۔ حتیٰ کہ ایلوپیتھک ڈاکٹر اور اُن کے ہمنوا دوا فروش اُس کو شاہراہ عام سے بلا زد و کوب گذرنے نہیں دیتے تھے۔ اس عالمِ پریشانی میں اس غریب کو ایک جگہ رہنا نصیب نہیں ہوا۔ کبھی لیپزک گیا

کبھی کو تقین، کبھی پیرس۔ اسی پریشانی کے زمانہ میں ہانمن نے پرانے مرضوں کے علاج پر ایک لاجواب کتاب تصنیف کی۔ مگر افسوس کہ ۲ر جولائی ۱۸۴۳ء روز یکشنبہ ہانمن کا انتقال ہوگیا۔ شہر پیرس کے گمنام قبرستان مانٹ میری نے اس کو اپنے سینہ میں جگہ دی۔ یہ مشہور و معروف محب انسان ڈاکٹر مدتوں ا۔ زمین میں محو خواب رہا۔ بالآخر زمانہ نے اُسے یاد کیا اور اُس کی نہ مٹنے والی آواز اور اُس کے نہ ٹوٹنے والے قوانین کی گونج ایک مرتبہ پھر تمام دنیا میں سنائی دی۔ اور قدردانوں نے اُس کی لاش کو گمنام قبرستان سے نکال کر مشہور اور نامور قبرستان میں منتقل کیا۔ اور اس کی یادگاریں قائم کیں، انجمنیں بنیں، سوانح عمریاں لکھی گئیں۔ غرض ؎

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوام او

تیس ۳۰ سال پہلے

زمانہ میں چانکیہ کی نیت کا ترجمہ شائع ہوا تھا۔ چنانچہ اگست ستمبر نمبر ۱۹۰۹ء سے ہم نصائح چانکیہ کے عنوان سے اس کا جو جزو درج رسالہ ہوا تھا۔ اُس کے بعض اقتباسات ہدیۂ ناظرین زمانہ کرتے ہیں۔ اب یہ سب "نصائح چانکیہ" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو گئی ہیں۔ شائقین مینجر زمانہ بک ایجنسی کانپور سے سات آنہ کے ٹکٹ بھیج کر طلب فرمالیں۔

۱۔ خیر خیرات افلاس کو۔ خوش خلقی بگڑی حالت کو۔ عقل جہالت کو اور عبادت خوف کو دفع کر دیتی ہے۔

۲۔ خواہش و طمع کے برابر دوسرا کوئی تکلیف دہ مرض نہیں ہے۔

۳۔ خدا رسیدہ شخص کی نظر میں بہشت کی کچھ حقیقت نہیں ہوتی۔ بہادر آدمی کو اپنی جان تنکے کے برابر معلوم ہوتی ہے۔ جس شخص نے اپنے دل اور اعضا کو قابو میں کر لیا ہو اُس کو حسین سے حسین عورت بھی اپنا فریفتہ نہیں کر سکتی۔ جس کو کسی چیز کی خواہش نہیں ہوتی اُس کے نزدیک کل دنیا ہیچ ہے۔

۴۔ سمندر میں بارش بے سود ہے، کیونکہ وہاں اُس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ جن لوگوں نے پیٹ بھر کھانا کھالیا ہو، وہ دوسرے سے غذا ملنے کی خواہش نہیں کرتے۔ اس لئے ایسے لوگوں کو کھانا کھلانا بے سود ہے۔ جو دولتمند ہیں اُن کو خیرات دینا فضول ہے کیونکہ اُن کو دولت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ روز روشن میں چراغ جلانا بیکار ہے۔ کیونکہ آفتاب کی روشنی کے روبرو چراغ کی روشنی بے فائدہ ہے

۵۔ جو مفلس ہیں وہ دولت کی خواہش کرتے ہیں، جنکو بات کرنی نہیں آتی وہ گفتگو کرنے کی آرزو کرتے ہیں۔ انسان بہشت کی خواہش کرتا ہے۔ دیوتا نجات چاہتے ہیں۔ حاصل یہ کہ جسکی دسترس سے جو چیز باہر ہوتی ہے وہ اُسی کی خواہش کرتا ہے۔

کوہ مری

(از حضرت طالب چکوالی، بی۔اے، ایل ایل بی)

خدا کی شان ہے عیاں فرازِ کوہسار سے
فضائے پُربہار سے، ہوائے خوشگوار سے

سروش کا پیام ہے نسیم کی زبان پر
رواں ہے بحرِ کیف کا سرودِ جوئبار سے

یہ پتّیاں ہری ہری، یہ پھول رنگ رنگ کے
کہ حُسن پھوٹ کر نکل رہا ہے شاخسار سے

ہوائے مشکبار ہے لُٹا رہی سرورِ دل
خمارِ کیف عام ہے ہوائے مشکبار سے

مری کی مال روڈ ہے کہ جلوہ گاہِ حُسن ہے
ہے غیرتِ گل و سمن جمالِ گلعذار سے

نمایشِ لباس و حُسن وقتِ شام دیکھئے
چمک دمک غضب کی ہے لباسِ زرنگار سے

اُدھر ہے کوہسار کی اُدھر بہارِ گلرخاں
لڑی ہے آنکھ دیکھئے بہار کی بہار سے

مے طرب سے مست ساکنانِ باغ و راغ ہیں
خمارِ کیفِ حُسن ہے کہ عرش پر دماغ ہیں

جذباتِ عشرت

(از نانک چند عشرت بلرامپوری)

سکوں نا آشنا ہر شے زمیں سے آسماں تک ہے
ہمارے مضطرب دل کا اثر دیکھو کہاں تک ہے

بتائیں کیا تجھے زاہد جنوں کی حد کہاں تک ہے
نظر محدود جب تیری حدودِ لامکاں تک ہے

امیدِ کامرانی آہ وہ ناکام کیا جانے
کہ جس کی سعی کی پرواز سعیِ رائیگاں تک ہے

دلِ بے مدعا اور آہ بے تاثیر کی قیمت
نہ اُس سے پوچھنا جس کی نظر سود و زیاں تک ہے

چھپاؤں کس طرح تجھکو بتا اے میرے دردِ دل
کہ رسوائی کا ساماں تو خموشی سے فغاں تک ہے

کہے دیتا مگر ہم تو جنوں اس کو سمجھتے ہیں
کہ جسکی فتنہ سامانی بہارِ بوستاں تک ہے

مرے دم سے ہے عزت خاکدانِ دہر کی عشرت
کہ رونق کارواں کی بس امیرِ کارواں تک ہے

سوامی رام تیرتھ

(از مسٹر بینی پرشاد بھٹناگر ایم - اے)

سوامی رام تیرتھ جی مہاراج نہ صرف ہندوستان کے آسمان پر مہر درخشندہ کی طرح چمکے، بلکہ اُن کی تجلی سے دور دراز ممالک امریکہ وغیرہ نے بھی کسب نور کیا۔ اُن کی ولادت کا فخر پنجاب کے ضلع گجرانوالہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں مرالی والے کو ہے۔ وہ ۲۲ اکتوبر ۱۸۷۳ء کو دیوالی کی صبح کو پیدا ہوئے تھے اور ۱۹۰۶ء میں دیوالی کے دن قیود زماں ومکاں سے آزاد ہوکر اپنے مرکز اصلی یعنی لامکاں ولازماں میں شامل ہو گئے۔

جس طرح آفتاب کو اپنے سفر آسمانی میں دُنیا کو اپنے نور سے منوّر کرنے کے لئے گھنگھور گھٹاؤں اور نپٹ تاریکیوں سے جنگ وجہد کرنی پڑتی ہے۔ اسی طرح آپ کو اپنی دنیوی زندگی میں شروع سے آخر تک تکالیف ومصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر آپ کسی مصیبت سے نہ گھبرائے بلکہ اپنی روحانی قوت سے سب پر فتح پاکر منزلِ مقصود پر جا پہونچے۔ جس طرح کالے کالے بادلوں کے مقابلہ میں آخر کار نورِ آفتاب ہی کی فتح ہوتی ہے اسی طرح دُنیا کی مصیبتوں اور دشواریوں سے جنگ کرنے میں آپکی نورانی شخصیت کو فتح حاصل ہوئی۔

دنیوی زندگی کا کوئی شعبہ نہیں، جسمیں اُنھوں نے اپنے آپ کو دوسروں کے لئے نمونہ یا آدرش نہ ثابت کیا ہو۔ جس طرح سری رامچندر جی مریادا پرشوتم یعنی دُنیا کے لئے ایک نمونہ ہوئے ہیں۔ اسی طرح یہ گجرانوالہ کے رام بھی ہمارے لئے ایک قابل تقلید ہستی تھے۔ پیدائش کے بعد ہی وہ مادرِ مہربان کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گئے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے غریبی اور مختلف مشکلات کی موجودگی میں اپنی تعلیم وتربیت کو درجہ کمال تک پہونچایا۔ اور پھر بلا چون وچرا اپنے مرشد کا حکم بجا لاکر سول سروس کی ملازمت کے مقابلے میں پروفیسری کو ترجیح دے کر اپنے فرض منصبی کو انجام دیتے رہے اور جب آپ کو مادی اشیا کے فنا ہوجانے کا یقین کامل ہوگیا تو اپنا سب مال ودولت، جاہ وحشمت، ملازمت، گھر بار بلکہ بیوی بچوں تک کو خیرباد کہہ کر اُنھوں نے سب کی محبت سے مُنھ موڑ مہاتما بدھ کی طرح ایک لازوال اور لافانی ہستی کی جستجو میں ہمالیہ کا راستہ لیا۔ اور دریائے گنگا کے کنارے برف پوش پہاڑ کی پُرخوف وادیوں اور غاروں میں مسئلہ توحید کی مزاولت کرتے ہوئے ہمہ اوست کی منزل میں پہونچ کر خدا شناس بلکہ خدا رسیدہ ہو گئے۔

وہ خدا کو محیط کل یعنی سرب ویاپک جانتے تھے جس طرح جب کسی شخص کو کوئی اعلےٰ چیز دستیاب ہوجاتی ہے تو وہ اُس کو اپنے عزیز و اقارب کو تقسیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح آپ نے بھی ہمالیہ کے گوشۂ تنہائی کے لطف و سرورِ روحانی کو چھوڑ کر شہروں و آبادیوں میں آکر دُنیائے دنی کے پریشان حالوں کو اسی سرورِ جاودانی سے مسرور کر کے اپنی سحر انگیز تحریر و تقریر سے سب کے دلوں کو مسخر کر لیا۔ اپنی محویت و مستی سے دوسروں کو محو و مست بنا کر خود فراموشی طاری کر دی۔ جس شخص کو اُن کے ہاتھ سے شرابِ وحدت کا ایک جرعہ بھی مل گیا۔ اُس کی آنکھوں سے مجاز کا پردہ ہمیشہ کے لئے اُٹھ گیا۔

یوں تو سوامی رام تیرتھ نے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، اپنی زندہ مثال سے خود کو عوام کا مشکل کشا ثابت کر دیا۔ مگر جو سب سے معرکۃ الآرا کام آپ نے انجام دیا وہ ہندوستانی قوم کے زخمی دلوں پر مرہم رکھنے کا کام تھا۔ چاروں طرف مذہبی جنگ جاری تھی اور مذہب نفاق و جنگ و جدال کا باعث ہو رہا تھا ہر طرف ہندو مسلمان جو ایک ہی خاک سے پیدا ہوئے اور ایک ہی رشتہ اخوت میں وابستہ ہیں، خون خرابہ میں مشغول تھے۔ مسلمانوں کو ہندوؤں سے شکایت تھی اور ہندوؤں کا سوارتھ مسلمانوں کے اغراض و مقاصد سے ٹکرا رہا تھا۔ آپ نے اہلِ ہند سے بار بار یہی پوچھا کہ آخر یہ انتشار اور یہ آپا دھاپی کیوں ہے؟ ایک ملک کے افراد ہوتے ہوئے اِس قدر عناد کی کیا ضرورت ہے؟ مذہب کو فساد کی جڑ بنانا مذہب کی انتہائی توہین ہے۔ دُنیا بھر کے مذاہب انسانوں کو بہتر بنانے کے لئے ہیں۔ ان کے بانی ایثار اور رحمدلی کے پُتلے تھے۔ جنہوں نے نسلِ انسان کو بہتر بنانے کے لئے اپنی زندگیاں ختم کر دیں۔ مگر انسانی خود غرضی کا بھلا ہو، جس نے مذہب کے اصلی منشار کو فوت کر کے اپنی خود غرضی کا ذریعہ بنا لیا۔ بہرحال سوامی رام تیرتھ نے مذہب کا مجاہد بن کر مذہب کا کفن پہن کر لوگوں کو مذہب کا سچا راستہ دکھایا۔ خدا لوگوں سے اوجھل تھا۔ عوام کا مذہب خدا کی راہ سے دُور تھا۔ خدا اور مذہب کے نام پر ہزاروں انسانوں نے تلواریں اُٹھائیں اور لاکھوں اسی تلوار کی گھاٹ اُتر گئے۔ لیکن اصلی مذہب مدت کا مر چکا تھا۔ ہندوستانیوں میں اُس کا جو جذبہ ہے وہ یہی مذہبی دیوانگی ہے۔ ہندو، سکھ، مسلمان ایک دوسرے کے ظلم و ستم کی داستانیں سُناتے ہیں۔ مگر اسمیں عوام کا کچھ قصور نہیں ہے۔ قوم کے اہلِ غرض عوام کے جذبات کو بھڑکا کر اپنی لیڈری قائم کرنے کی فکر کرتے ہیں اور سادہ لوح لوگ اُن کی تحریروں، تقریروں سے بھڑک اُٹھتے ہیں اور ملک میں مذہبی جنگ چھڑ جاتی ہے، جس کے سیکڑوں بےگناہ شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں کسی عالم باعمل و خدا رسیدہ کی ضرورت ہوتی ہے جو خود غرضی سے مبرّا اور مذہب کی قید سے آزاد ہو کر سب کو ایک ہی ذاتِ واحد کا مظاہرہ سمجھے۔ ایسا ہی شخص باہمی محبت اور عالمگیر اخوت کا سبق پڑھا سکتا ہے۔

ایسی ہی سوامی رام تیرتھ کی شخصیت تھی۔ چنانچہ آپ نے اپنی تقریر و تحریر بلکہ ہر قول و فعل سے اس محبت باہمی کی تلقین کی اور لوگوں کو سمجھایا کہ ع

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند

پھر یہ باہمی فتنہ و فساد کیسا؟ آپ نے اسی بات کی تلقین کی کہ خود غرضی کو چھوڑ کر دوسروں کیلئے قربانی کرنا چاہیئے۔ گذشتہ حالات یہی پکار پکار کر زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں ؎

مرنا بھلا ہے اُس کا جو اپنے لئے جیئے　　　جیتا ہے وہ جو مر چکا انسان کے لئے

اِس مذہبی نفاق کی بیخ کنی کے لئے سوامی جی نے "اکبر دلی"[1] کے عنوان سے ایک معرکۃ الآرا مضمون لکھا جسمیں آپ نے لکھا کہ :-

"غیر مذہب والے سے بھی سلوک کرو، مخالف سے بھی محبت کرو۔ شخصی عداوت کو جڑ سے اکھاڑ ڈالو وغیرہ وغیرہ۔ کہنا آسان ہے۔ لیکن کرنا بہت کٹھن ہے۔ پر ہاں کٹھن ہو خواہ کٹھن سے بھی کٹھن ہو۔ عموماً ہمیشہ اور خصوصاً آجکل ہندوستان میں بغیر اس اصول کو عمل میں لائے اتفاق قومی اور اتحاد مُلکی ہرگز ہرگز پیدا نہیں ہوسکتا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ جس مذہب میں پیدا ہوئے اُسے چھوڑ دو۔ ڈھلمل یقین یا رکابیہ مذہب بن جاؤ۔ البتہ ہم یہ ضرور کہتے ہیں کہ جس مذہب کی چار دیواری میں پیدا ہوئے اُس سے قدم باہر نکالنے کو گناہ سمجھنا بذات خود روحانی خودکشی کا گناہ ہے۔ کسی چار دیواری میں پیدا ہونا اور پرورش پانا تو امر لازمی ہے البتہ اُس چار دیواری میں بند رہ کر اُسی میں مرنا پاپ ہے"

ان کی اس تحریر کا اثر کیوں نہ ہوتا۔ بقولیکہ ؎

عشق ہو راست کرامات نہ ہو کیا معنی　　　حسب ارشاد ہر اک بات نہ ہو کیا معنی

بہر حال آپ کے روحانی جذبہ کا یہ اثر تھا کہ ہندو، مسلمان، عیسائی سب آپکے سامنے اپنے مذہبی اختلافات چھوڑ کر محبت کے رشتہ میں منسلک ہو جاتے تھے۔

ایک اور جگہ وہ یوں فرماتے ہیں کہ ؎

ظاہری ہندو پن، مسلمان پن، عیسائی پن وغیرہ مختلف پیالوں کی طرح ہیں، جنہیں وقتاً فوقتاً عالمگیر عشق کا پاکیزہ دودھ پلانے کی کوشش ہوتی رہی ہے۔ لیکن اِن سب پیالوں کا دودھ ان سب مشربوں کی جان نفی انانیت یا عشقِ الٰہی ہے ؎

مذہب عشق از ہمہ ملت جدا است　　　عاشقاں را مذہب و ملت خدا است

---

[1] یہ مضمون آپ نے رسالہ زمانہ کے لئے تحریر فرمایا۔ اور یہ زمانہ اکتوبر ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا ہے۔

پیالہ پرستی سے نفاق بڑھتا ہے یہ سب پیالے بذات خود بُت ہیں۔ آخر یہ بُت پرستی کب تک ؟ متبرک ہے وہ مست حقیقی جو بتوں کو چھوڑ کر اصل مالک اور مجاز سے نکل کر حقیقت کو پہونچا۔ سرور ذات کی وجہ سے پیالہ ہاتھ سے چھوٹ کر ٹوٹ پھوٹ گیا۔ ع

قدحے بلبم بود شکستی ربی

پھر فرماتے ہیں :۔

"بلحاظ قوم و ملت و ملک ہر فرد بشر کے ساتھ وہ اُنس جو سچا انسان بناتا ہے اتنا جوش سے بھرا پیدا کرو جو کینہ میں صرف کر رہے ہو۔ ملک کی مٹی تک کو عزیز بنا کر رکھو۔ یہی دُنیا جنتِ رضوان کو مات نہ کر دے تو کہنا۔ کیا تم نے کبھی دِل کو عداوت سے بالکل پاک اور سینہ کو کینہ سے شیشے کی طرح صاف کرنے کا تجربہ کیا ہے ؎

وفا کنیم و ملامت کشیم و خوش باشیم　　　که در طریقت ما کافریست رنجیدن

اگر یہ امتحان ابھی تک نہیں کیا تو تم کو اس کے نتیجوں کو رد کرنے کا بھی اختیار نہیں۔ یوگ درشن میں لکھا ہے کہ جب تم میں کامل محبت (اہنسا) مضبوط طور پر قائم ہو جائے تو آس پاس کے جنگلی درندوں اور گزندوں میں بھی عداوت نہیں رہ سکتی۔ اگر عمل اور ردِ عمل (Action or Reaction) کے توازن کا مسئلہ ہے تو کیوں ایسا نہ ہوگا۔"

کسی شاعر نے بھی ذیل کی نظم میں اسی تمنا کا اظہار کیا ہے ؎

گل و لالہ سے ہے رنگِ بہار بوستاں قائم　　　مہ و خورشید سے ہے آب و تاب آسماں قائم

ہے دو آنکھوں سے حسن روئے یار دِلستاں قائم　　　یوں ہی ہندو مسلمانوں سے ہے ہندوستاں قائم

گلِ ہندوستاں کا رنگ ہندو اور بو مسلم　　　تنِ ہندوستاں کی سانس ہندو اور لہو مسلم

تمھیں وہ ہو جو تھے آفاق میں تہذیب کے بانی　　　تمھیں کہلاتے ہو سرمایہ دارِ علم روحانی

تمھیں علم و ہنر اخلاق مذہب میں تھے لاثانی　　　تمھارے سامنے یونان و روما بھرتے تھے پانی

بپا ہے شور اقوامِ جہاں میں سو گئے ہندی　　　خدا کی شان دیکھو کیا تھے اور کیا ہو گئے ہندی

محبت کر کے آپس میں دِلوں پر پاؤ تم قابو　　　ہر ایک پر پڑھ کے پھونکو پریت اور پریم کا جادو

نظر آئیں مسلمان کرشن جی کے شیفتہ ہر سو　　　جنابِ مصطفےٰ کا ہو ثنا خواں ہر بشر ہندو

غرض اپنے وطن سے غیریت کافور ہو جائے　　　تعصب کا اندھیرا سب دِلوں سے دور ہو جائے

سوامی رام تیرتھ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ :۔

"اکبر دل کا ہندی یا سنسکرت ترجمہ ہوگا' مہاتما (مہا+آتما) یعنی "بزرگ روح"۔ وہ آدمی اکبر دل یا مہاتما ہرگز نہیں ہوسکتا جس کا دل تنگ اور محدود ہو کر چھوٹے سے دائرہ میں بند ہو جائے۔ جس کی ہمدردی صرف ہندو، مسلمان یا عیسائی سے وابستہ ہو اور اس سے آگے نہ جاسکے۔ وہ تو اصغر دل' ہے' اکبر دل' نہیں۔　　آتما ہے مہاتما نہیں"

ہمارے ملک میں اِدھر تو وِدوان پنڈت اور اُدھر عالم فاضل مولوی صدیوں میں عملاً اتنا نہ سمجھے کہ چونکہ ہم ہندو اور مسلمان ایک ہی ماں (ہندوستان) سے پیدا ہوئے ہیں اور اُس کے دودھ سے پلتے ہیں۔ چونکہ ہم ہندو اور مسلمان دونوں کی رگوں میں ایک ہی خون ہے جو ایک ہی نباتات ایک ہی آب و ہوا سے پیدا ہو رہا ہے پھر ہم حقیقی بھائی نہیں تو اور کون ہیں؟ محبت وہ چیز ہے کہ اس کی وجہ سے دوسرے کی سختی بھی گوارا ہوتی ہے۔ پھر صدیوں سے ہندوستان میں رہتے ہوئے مسلمان ہندوؤں سے کیوں اتنے دُور رہتے ہیں۔ ہندوؤں سے ہمارا کہنا یہ ہے کہ مریادا پرشوتم بھگوان نے شبری (بھلنی) کے جوٹھے بیر کھائے، غریب ملاح سے دوستی کی، بندروں سے محبت کی، دشمن کے بھائی کے ساتھ شفقت سے پیش آئے۔ پھر تم مسلمانوں کی شکائتیں کیوں نہیں بھول جاتے؟

گر ز دست زلفِ مشکینت خطائے رفت رفت　　ور ز ہندوئے شما بر ما جفائے رفت رفت

گر دلے رز غمزدہ دلدار یاری بُرد بُرد　　درمیاں جان و جاناں ماجرائے رفت رفت

غرض تعصب کے دُور کرنے کا کیا اس سے بڑھ کر اور کوئی نسخہ ہوسکتا ہے جو اِس حکیم حاذق نے کج فہم مریضانِ مذہب کے لئے تجویز کیا؟ اُس کے استعمال سے ہم کو شفائے کلی حاصل ہوگی اور ہماری روحانی قوت عود کر آئے گی اور آپس کی خانہ جنگی رفع ہو کر باہمی محبت پیدا ہوگی جس کی وجہ سے دین دنیا دونوں میں ہم کو لامتناہی ترقی اور لازوال سرور حاصل ہوگا۔

ادبِ لطیف (ڈرامہ نمبر)

اُردو کے مشہور رسالہ "ادب لطیف" نے ابھی حال ہی میں افسانہ نمبر شائع کیا تھا جو بہت ہی مقبول ہوا۔ غالباً اسی کامیابی اور حوصلہ افزائی پر اس رسالہ نے اپریل اور مئی کی مشترکہ اشاعت کو ڈرامہ نمبر کی حیثیت سے شائع کیا ہے، جو ۲۷ مضامین نظم و نثر کا اچھا خاصہ مجموعہ ہے۔ ڈراموں کے علاوہ پانچ مضامین جو فن ڈرامہ کے متعلق درج کئے گئے ہیں بہت ہی پُر از معلومات ہیں۔ نظموں میں جناب احمد قاسمی اور الطاف مشہدی کی نظمیں قابل قدر ہیں۔ اس نمبر کی ضخامت تقریباً ۲۲۵ صفحات اور قیمت ۱۲ آنے ہے۔ مینیجر مکتبہ اُردو لاہور سے طلب فرمائیے۔

تمھاری یاد

(از حضرت ثاقب کانپوری)

ضیائے ماہ سے جب نور چھنتا ہے فضاؤں میں
کسی کا حسن کھنچ آتا ہے جب رنگیں شعاعوں میں
دھندھلکے میں سحر کے جب ستارے مسکراتے ہیں
چمن میں جب طیور خوشنوا نغمے سناتے ہیں
میں تم کو یاد کرتا ہوں، میں تم کو یاد کرتا ہوں

تقاطر ابر کا ہوتا ہے جب صحن گلستاں پر
بہار سبزہ چھا جاتی ہے جب سارے بیاباں پر
نمی سے جب سکون اضطراب قلب ہوتا ہے
عجب کیفیتوں میں جب دل بیتاب سوتا ہے
میں تم کو یاد کرتا ہوں، میں تم کو یاد کرتا ہوں

سکوں طائر کو جب ہوتا ہے اپنے آشیانوں میں
تمنا سوتی ہے جب خواب آور داستانوں میں
فنا ہو جاتے ہیں جب دن کے محشر خیز ہنگامے
بپا ہوتے ہیں جب شب کے سکوں انگیز ہنگامے
میں تم کو یاد کرتا ہوں، میں تم کو یاد کرتا ہوں

میں اس دنیا سے کوسوں دور جب ہوتا ہوں صحرا میں
میں کھو جاتا ہوں جب خود آپ ہی اپنی تمنا میں
مری تخئیل جب ہوتی ہے میری مونس و ہمدم
ہر اک ذرہ سناتا ہے مجھے جب نغمۂ پیہم
میں تم کو یاد کرتا ہوں، میں تم کو یاد کرتا ہوں

(۲)

مرا فریب تخیل تو بار بار نہ پوچھ
قفس نصیب ہوں میں حاصل بہار نہ پوچھ
گذر رہی ہے مری عمر اک نشاط کے ساتھ
فراق میں تو مزا لطف انتظار نہ پوچھ
وفور غم سے کہیں آنکھ اشکبار نہ ہو
قرار ہے جو مرے دل میں وہ قرار نہ پوچھ
وہ جی رہے ہیں ترے وعدہ ہائے فردا پر
بلاکشان محبت کا انتظار نہ پوچھ

زبان کا مسئلہ

اور

میرے معترض

(از حق پرست)

"مگر مجھ کو خوف ہے کہ میں نے جو کچھ گذرانا ہے وہ غالباً ایک وسیع طبقہ کے لئے نہایت نامطبوع "
" ثابت ہو گا لیکن افراد کی زندگیوں کی طرح قوموں کی زندگی محض خوش آیند واقعات کا تسلسل نہیں"
" ہوتی۔ نہ صرف ناخوشگوار اور تکلیف دہ بلکہ مہیب اور خطرناک واقعات بھی پیش آتے ہیں اور "
" زندگی کی یہ شرط ہے کہ ان سے آنکھ نہ میچی جائے۔ بلکہ اُن کو اُن کے اصلی اور حقیقی رنگ میں قرار"
" واقعی طور پر دیکھا جائے اور نہایت تدبر اور سرگرمی سے اُن خطروں کے ازالہ کی کوشش کی جائے "
" جو قومی زندگی کے درپے ہیں)

اُردو۔ ہندی۔ ہندستانی والے اپنے ابتدائی مضمون کے ابتدائی کلمات میں میں نے حسب بالا عرض کیا تھا۔ جناب اڈیٹر صاحب نے "زمانہ" بابت اپریل ۱۹۳۹ء میں اپنے نوٹ میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ میرے خلاف زیادہ اور تائید میں کم خطوط وصول ہوئے ہیں۔ ان میں منجملہ بدایونی صاحب کا خط بھی تھا جنھوں نے میری ذہنیت کو غلامانہ اور میرے مضمون کو ہندو مسلم اتحاد میں رخنہ اندازی کا باعث قرار دیا ہے نیز "زمانہ" بابتہ جون ۱۹۳۹ء میں مولنا ح' ی ع ' ایم۔ اے (جنھیں آیندہ میں بنظر سہولت صرف مولنا "ح" لکھوں تو مجھکو اُمید ہے کہ ممدوح مجھکو معاف فرمائیں گے۔) کے مضمون سے ثابت ہے کہ میرا اندیشہ غلط نہ تھا۔

ایک ایسے مضمون کے متعلق جس پر مختلف فرقوں کے مفاد و اغراض متصادم ہوتے ہوں اختلاف رائے کی توقع رکھنی ہی چاہیئے۔ لیکن رائے کے اختلاف کے اظہار کے لئے کیا یہ ضروری ہے کہ طعن و تشنیع سے بھی کام لیا جائے اور مولینا ح یا مولنا بدایونی کی طرح اڈیٹر صاحب کو ترغیب

(یا دھمکی؟) دیجائے کہ وہ میرا بائکاٹ کریں اور میرے مضامین کی اشاعت سے احتراز کریں. ایک طرف مسلم رواداری کے دعوے اور دوسری طرف یہ عملی مشورے!

مجھ ناچیز کو دانائی کا دعویٰ نہیں لیکن میں بھی ایک کثیر تعداد کے جذبات وخیالات کی ترجمانی کررہا ہوں۔ اس لئے مجھکو نادان کہکر ٹالنے سے کام نہ چلے گا. کیونکہ مصلحان ملک کا مجھ جیسے 'نادانوں' ہی سے سابقہ ہے. اپنے 'جی' کو 'زبان' سے کہاں تک بچائیگا؟ ضرورت تو بمصداق اس کے کہ "با ہمیں مردماں بباید ساخت" انھیں یا تو قائل کرنا پڑیگا یا ان سے معقول ہونا پڑیگا. اور اگر کسی مسئلہ پر اتحاد رائے یا اتحاد عمل ممکن نہو تو خوشی سے اسی پر متفق ہونا پڑیگا کہ ہمارے راستے مختلف یعنی علحدہ علحدہ رہیں گے. سوائے اسکے کہ "نازی" طریقوں پر ایمان ہو کہ اپنی رائے اور اپنا پروگرام "ڈنڈوں" کے زور سے منوائیں گے. یہ "نازی" طریقے ہی تو ہیں کہ مخالف رائے کو اظہار کا موقع نہ دیا جائے جس کی کوشش بنگال اور پنجاب میں خاص طور پر ہو رہی ہے. اور ایک اور جگہ تو گلے گھونٹ دیے گئے ہیں.

آخر مسئلہ زیر بحث میں اس قدر ناراضگی اور طعن وتشنیع کا کیا سبب ہے؟ میں نے تو اپنے مضامین میں صرف علامہ شبلی مرحوم، مولنا سلیمان ندوی، ڈاکٹر عبداللطیف وغیرہ جیسے بلندپایہ مسلم علما و مفکرین کے اس دعوے ہی کی تائید کی ہے کہ "اردو اسلامی زبان ہے" یا مولنا نیاز فتحپوری وغیرہ کے اس خیال کی کہ 'ہندوؤں کو اردو لکھنا نہیں آتا'. اِس تائید میں میں نے کچھ واقعات پیش کئے ہیں اور حقیقتوں سے استدلال کیا ہے. مجھ کو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مکرمی مولنا 'ح' نے میرے مضامین بغور ملاحظہ نہیں فرمائے ورنہ وہ یہ نہ کہتے کہ "مسلمان مصنفین ہندو لکھنے والوں کی خدمات کا اعتراف نہیں کرتے. اس لئے بقول حق پرست صاحب ہندوؤں کو چاہیئے کہ وہ اُردو زبان سے اپنا رشتۂ تعلق یکسر منقطع کرلیں". کیونکہ میرا خیال شروع ہی سے یہ ہے کہ اُردو ہندوؤں کی زبان ہی نہیں. میں نے اِسی حقیقت کو واضح اور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ مجھکو شکایت درکنار اس سے سروکار ہی نہیں کہ مسلمان حضرات اُردو کے ہندو ادیبوں کے خدمات کا اعتراف کرتے ہیں یا نہیں. میری نظر میں جس بات کو منشی جگر صاحب مسلمان بھائیوں کی بے اعتنائی سمجھتے ہیں، اُس سے غافل ہندوؤں کی آنکھیں کھلنے میں مدد ملتی ہے. اسی لحاظ سے میں نے اپنے پہلے مضمون میں لکھا تھا کہ ہمیں اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے مولنا نیاز فتحپوری وغیرہ کا شکرگذار ہونا چاہیئے.

اب اگر مجھ سے اس لئے ناراضگی ہے کہ مَیں نے ہندی کی تائید کی ہے تو مولنا 'ح' اور

اُن کے ہم خیال بزرگوں کی رواداری ظاہر ہے۔ آپ اُردو کو مشترک زبان سمجھتے ہیں میں ہندی کو۔ میری ہندی کی تائید کو اگر اشتراکِ عمل اور ہندو مسلم اتحاد کے مغائر سمجھا جائے تو یہ الزام اُردو کے موئیدوں پر بھی عائد ہوتا ہے۔ کیونکہ ہندی جس آسانی سے کُل ہند میں سمجھی جا سکتی ہے اُردو نہیں سمجھی جا سکتی۔ اس سے قطع نظر جب یہ ثابت ہے کہ اُردو اسلامی زبان ہے اور ہندو اس میں وہ کمال حاصل نہیں کر سکتے جو مسلمان بھائیوں کا حصّہ ہے جس کی تائید خود مولٰنا "ح" صاحب کے اس جملہ سے ہوتی ہے:۔

"آزاد نے جو معیار قائم کیا وہ اتنا بلند ہے کہ اُس پر ہندو کیا بعض مسلمان شعرا بھی پُورے نہیں اُترتے۔"

تو آخر ہندوؤں کو بھی یہ سوچنا ضروری ہے یا نہیں کہ اُنھیں دراصل اپنی قوتیں کس طرف صرف کرنی چاہیئے اور کس زبان سے اپنا رشتہ مستحکم باندھنا چاہیئے؟ یا وہ یوں ہی بے زبانے بنے دربدر کبھی اُردو اور کبھی انگریزی کے در کی خاک چھانتے پھریں؟۔ اگر آپ کی رواداری اس کو تسلیم کر سکتی ہے کہ بیچارے ہندوؤں کو بھی آزاد خود مختار اور رمغز زندگی کا حق ہے تو میں عرض کرتا ہوں کہ اس قسم کی زندگی کی جستجو کرنے والوں کا خیال قدرتاً اُس زبان کی طرف جائیگا جس نے ہندوؤں کو سورداس۔ کبیرداس تلسی داس اور میرا بائی جیسے لافانی شاعر دیئے جنھوں نے ہندو قوم کے خیالات اور جذبات کو اُن کی زندگی کے ایک نہایت نازک مرحلہ پر ایسا رُخ دیا کہ اُن میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی، اور اگر ہم اس وقت زندہ ہیں تو ایک حد تک انھیں بزرگوں کا پُن پرتاپ ہے۔ کیا یہ اعجاز ہندوؤں کے حق میں کسی اُردو لکھنے والے سے ممکن تھا یا ہے؟

اگر میرا گناہ یہ ہے کہ میں نے سردست انگریزی ہی سے "لنگوا فرانکا" کا کام لینے کی صلاح اس لئے دی ہے کہ عام زبان کا مسئلہ مزید جھگڑوں کا باعث ہے تو خود مکرمی 'ح' صاحب نے بھی تو بالآخر یہی فرمایا ہے، اور مجھ سے کہیں زیادہ زوردار مگر مایوس کن الفاظ میں کہ:۔

"یہ کوشش بالکل فضول ہے کہ پہلے زبان ایک کی جائے اس کے بعد دل ملائے جائیں۔ اس کوشش میں دل اور پھٹ جائیں گے اور نہ زبان ایک ہوئی ہے اور نہ ہو گی"

ملاحظہ ہو کہ اِن زوردار الفاظ میں اپنے اِس خیال کے اظہار کے باوجود مولٰنا 'ح'، کا یہ فرمانا کہ "اڈیٹر صاحب 'زمانہ'" کو اِن جیسے (یعنی مجھ جیسے) حضرات کے مضامین اپنے اس مباحثہ میں شامل نہ کرنا چاہیئے جو واقعی اُنھیں لوگوں کے لئے مخصوص ہے جن کے نزدیک مشترک قومی زبان کی ہندوستان

کو ضرورت ہے" کس قدر حیرت انگیز ہے۔ بالخصوص جبکہ میرے مضامین پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ میں ایک مشترک زبان کے امکان میں یقین رکھتا ہوں۔ چنانچہ میں نے اپنے اس سے پہلے مضمون میں نہایت وضاحت وصراحت سے بتلایا ہے کہ وہ عام زبان کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ برادران وطن کے نشا و مقصد کے (جو دراصل کل ہند کے نقطۂ نظر سے قومی نہیں ہے) خلاف بیٹھتی ہے۔ اور جب اُن کے راستے میں ایسی چیزیں حائل نظر آتی ہیں تو وہ اس درجہ تلملا اُٹھتے ہیں کہ انھیں برگزیدہ ہستیوں کے احترام اور ایک وسیع طبقہ کے احساسات کا بھی خیال نہیں رہتا۔ چنانچہ مولانا ح" "ہندی اتھوا ہندوستانی" کو لیکر لفظ "اتھوا" کی پھبتی اُڑاتے ہوئے یہاں تک لکھ جاتے ہیں کہ "کیا وہ اس لفظ (اتھوا) کو استعمال کرتے ہوئے محجوب نہیں ہوتے۔"

مجھکو دراصل حیرت ہے کہ ایک طرف تو یہ دعوی کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے ہندی اور سنسکرت کی نشو و نما میں حصہ لیا اور دوسری طرف صورت حال یہ کہ "اتھوا" جیسے معمولی لفظ کا سمجھنا دشوار ہے جو سی پی۔ مہاراشٹر۔ مدراس۔ گجرات۔ بنگال وغیرہ میں ہر جگہ سمجھا جاتا ہے۔ یعنی کُل ہند کی پڑھی لکھی آبادی کا کم از کم ۳/۴ حصہ اس لفظ کو بخوبی سمجھتا ہے۔ مہاتماجی کی زبان سے یہ لفظ "اتھوا" اُسی برجستگی و بے ساختگی سے نکلا ہے بلکہ اُس سے کہیں زیادہ جس طرح بہ قول مولانا ح، مسلمان حضرات عربی فارسی الفاظ بولتے ہیں: یہ بھی خوب استدلال ہے کہ:-

"شمالی ہند کا مسلمان کبھی اِس لفظ کو نہیں سمجھ سکتا اور جب مسلمان نہیں سمجھتا تو آپ کیسے کہتے ہیں کہ یہ زبان صاف اور سادہ ہے جبکہ ملک کا ایک گروہ کثیر اس زبان کو نہیں سمجھ سکتا۔"

میں نے مانا کہ مسلمان بھائیوں کی ایک بڑی تعداد پنجاب اور سرحدی علاقہ میں ہے اگر وہاں بھی اُن کی مادری زبان اُردو نہیں بلکہ پنجابی یا پشتو ہے جن کا سنسکرت سے زیادہ لگاؤ ہے۔ مگر اُن کے لئے اُردو مادری زبان بنائی جا رہی ہے) لیکن بنگال میں بھی تو مسلمان اکثریت میں ہیں اور وہاں اُن کی مادری زبان بنگالی ہے۔ بنگالی پڑھے لکھے "اتھوا" کے معنی بخوبی سمجھتے ہیں (اس بحث میں لفظ "اتھوا" بمعنی "یا" اسی قسم کے دوسرے ہندی الفاظ کی جانشینی کر رہا ہے) اسی طرح جو مسلمان تلنگانہ کرناٹک، مہاراشٹر یا گجرات وغیرہ میں بستے ہیں اُن کی مادری زبان مقامی ہے، اور وہ لوگ بھی اس قسم کے الفاظ بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ ہندوؤں کو چھوڑیئے کیونکہ سوائے "اُردو زدہ" ہندوؤں کے (جن کی تعداد (نسبتاً) بہت کم ہے) باقی سب ہندو ہر جگہ کے اس قسم کے الفاظ بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ اب فرمائیے کہ کثیر گروہ سمجھنے والوں کا ہوا یا نہ سمجھنے والوں کا؟

مگر مولانا 'ح' نے اِس سے بھی زیادہ حیرت انگیز باتیں کہی ہیں، مثلاً یہ کہ:۔

" سنسکرت کا بولنے والا ہندوستان میں ایک بھی نہ ملے گا۔ مگر سمجھنے والے بھی دو چار ہی ملیں گے"

مجھکو یقین ہے کہ اس جملہ کے پڑھنے والے حضرات کے لئے یہ لاعلمی یا نادانی باعث تفنن طبع ہوئی، ہوگی۔ کیونکہ کون نہیں جانتا کہ ہر یونیورسٹی میں سنسکرت کی تعلیم کا انتظام ہے۔ حتیٰ کہ عثمانیہ یونیورسٹی تک میں۔ اور ان یونیورسٹیوں کی تعداد ہی دو چار کے کئی چند ہو جاتی ہے یہ تعلیم حاصل کرنے والے علیحدہ ہے خالص سنسکرت کی یونیورسٹیاں علیحدہ موجود ہیں جیسے بنارس، جے پور وغیرہ میں۔ آریہ سماجیوں کے درجن سے اوپر گروکل ہیں جو سنسکرت تعلیم کے گڑھ ہیں۔ اور کرمی (ح) کو یہ معلوم کر کے یقیناً حیرت ہوگی کہ اِس ناچیز کے شناساؤں میں دو ایک خاندان ایسے ہیں جن کے گھر کی زبان کلاسیکل سنسکرت ہے[ل]۔

اُردو کے موید دقت بے وقت یہ راگ الاپتے ہیں کہ سنسکرت مُردہ زبان ہے۔ مجھکو حیرت ہے کہ اس کو میں پروپاگنڈہ پر محمول کروں یا لاعلمی پر۔ میرے خیال میں یہ الزام دونوں ہی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ ہر ذی فہم جانتا ہے کہ زبانوں کی صورت اور رنگ ڈھنگ پر وقت اور ماحول کا ہمیشہ اثر ہوتا ہے۔ آج ایران میں فارسی کی وہ شکل نہیں رہی جس کا نقشہ ہم گلستاں اور بوستاں میں دیکھتے ہیں۔ جس نے فارسی کی ان کلاسیکل چیزوں ہی کا مطالعہ کیا ہے اُس کو آجکل کی ایرانی زبان بالکل ایک دوسری ہی زبان معلوم ہوگی۔ اسی طرح آجکل کی انگریزی پڑھے لکھوں کے لئے (Chaucer) چاسر اور اُس کے زمانہ کی انگریزی عجیب وغریب معلوم دیگی۔ قواعد میں، تلفظ میں، املا میں، طرز بیان میں اس قدر تبدیلیاں آچکی ہیں کہ تاوقتیکہ اُس پُرانی انگریزی کی خاص طور پر تعلیم حاصل نہ کی جائے اُس کا سمجھنا خود اہل زبان کے لئے مشکل ہو گیا ہے۔ لیکن کیا اس بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فارسی یا انگریزی زبانیں مرچکیں، سنسکرت نے بھی امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ روپ بدلے۔ ایک زمانہ تھا کہ اس نے پالی روپ اختیار کیا تھا۔ آج یہ ان صوبہ جاتی زبانوں بنگالی، گجراتی، مرہٹی وغیرہ کی صورت میں نمایاں ہے جو پراکرت ہیں۔ پراکرت مشتق ہے پرکرت سے (جس کے معنی ہیں قدرتی، کسی مصدر سے نکلنے والی، سلسلہ رکھنے والی یعنی تبدیل ہونے والی) اور جو زبان ویدک کہلاتی ہے اُس زبان سے مختلف ہے

[ل] ناظرین کو یاد ہوگا کہ پچھلے سال بنارس کے پنڈتوں نے آنریبل سری سمپورنانند وزیر تعلیم صوبہ متحدہ کو خالص سنسکرت زبان میں خیر مقدمی ایڈریس پیش کیا تھا، اور ممدوح نے بھی ادق ہندی میں اس کا جواب دیا تھا۔ جس کے متعلق ہمارے بعض معاصرین نے غلط فہمی پھیلانے کی کوشش کی تھی۔ ایڈیٹر زمانہ نے بنارس کے ایک مشہور وید کو اپنے عزیزوں اور شاگردوں سے ہر وقت سنسکرت زبان میں گفتگو کرتے ہوئے خود سنا ہے (ا۔ ز)

جو سنسکرت کہلاتی ہے۔ دونوں کے قواعد میں بھی فرق ہے۔ جب سنسکرت کی قواعد سے (جو پانینی کے سوتروں پر مبنی ہے) ویدک منتروں کے معنی معلوم کرنے کی کوشش کی گئی تو سخت ناکامی ہوئی اور اُول جلول معنی برآمد ہوئے لیکن جب نِروکت سے مدد لی گئی جو ویدک بھاشا کا قاعدہ ہے تو بڑے بڑے رموز منکشف ہوئے اور جو چیزیں بے معنی معلوم ہوتی تھیں وہ بڑے گہرے اور خوبصورت مطالب کی حامل ثابت ہوئیں۔

ہمارے بزرگ یہ خوب سمجھتے تھے کہ کال کے پربھاؤ سے یعنی 'زمانہ' کے اثر سے دنیا کی کوئی چیز محفوظ نہیں رہ سکتی۔ ہر چیز میں تبدیلی ہونا ضروری ہے۔ لیکن تبدّل و تغیّر کے دوران میں اگر کوئی معیاری اور معراجی چیز پیش نظر رہے تو اس ردو بدل کا رُخ بھدّے پن کی طرف نہ ہونے پائے گا۔ اور تبدّل و تغیّر نفاست وخوبصورتی کے ساتھ ہم آہنگ رہیں گے۔ لہٰذا اُنھوں نے ایک معیاری چیز پیدا کی جس کا نام سنسکرت رکھا تاکہ وہ ہمیشہ ایک خوبصورت ماڈل اور الفاظ و معانی و مطالب کے مخزن کا کام دیتی رہے۔ سنسکرت کے معنی ہی 'معیاری' یا 'معراجی' کے ہوتے ہیں، یعنی وہ زبان جس کا سنسکار کیا گیا ہے یعنی جس کو ایک معیار و معراج پر لایا گیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں زبان کا ایک دوسرا نام پراکرت رکھا یعنی وہ زبان جو سابقہ سلسلہ کو قائم رکھتے ہوئے وقت اور ماحول کے زیر اثر صورت بدلتی ہے۔ سنسکرت صدیوں سے ایک خوبصورت ماڈل اور الفاظ و معانی کے اتھاہ مخزن کا کام کمال خوبی سے انجام دے رہی ہے۔ اور اُس کے زیر اثر پراکرت برابر اپنے روپ بدلتی جا رہی ہے، اور اس وقت اِن صوبہ جاتی زبانوں کی صورت میں نمایاں ہے۔

جس اختصار کے لئے مولٰنا ح، عربی اور فارسی کی سفارش فرماتے ہیں اُس کا سنسکرت میں بدرجۂ اتم لحاظ ہے۔ اور اس معاملہ میں دُنیا کی کوئی زبان اس پر سبقت نہیں لے جا سکتی۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد اُمید ہے کہ احباب یہ بے مغز دلیل پیش نہ کیا کریں گے کہ سنسکرت مُردہ زبان ہے اور عربی و فارسی مردہ زبانیں ہیں۔ اس لئے مُلکی زبان کی بناوٹ میں اِن غیر مُلکی زبانوں سے امداد لی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اور اُردو ایک محدود طبقہ ہی کی زبان رہیگی۔ کُل ہند میں اس کا رواج ناممکنات سے ہے۔ عربی فارسی زندہ زبانیں اپنے اپنے ملک کے لئے ہونگی، جیسے فرنچ۔ جرمن یا دنیا کی کوئی اور زبان ہو سکتی ہے۔ ہمارے دیس میں خود جب جیتی جاگتی زبانیں موجود ہیں تو آپ انھیں سے رشتہ جوڑئیے، اِن دُور دراز ممالک سے

ہمیں کیا واسطہ ؟

دراصل مسلمان بھائی (جو اکثریت کی نظر سے ہندو آبا و اجداد کی اولاد ہیں، لیکن اس وقت ایک نشہ میں اپنی ہی قوم یعنی اپنے آبا و اجداد کے نام لیواوں اور اُن کی تہذیب و تمدن کو تباہ و برباد کرنے کے درپے ہو رہے ہیں۔) یہ خواب دیکھ رہے ہیں کہ جیسے آریہ فاتحوں نے اپنا مذہب اور کلچر ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلایا بدیں نتیجہ کہ جن کو یہاں کے اصلی باشندے تصور کیا جاتا ہے یعنی دراوڑ قوم وغیرہ، اُن کی زبان میں بھی سنسکرت اس درجہ حاوی و ساری ہوگئی کہ پچاس سے پچھتر فیصدی سنسکرت الفاظ اُن میں داخل ہو گئے۔ اُسی طرح یہاں مذہبی جذبات اُبھار کر عربی و فارسی کو ہندوستان بھر میں حاوی و ساری کر دیا جائے لیکن جن آریوں کے مذہبی اُصولوں اور فلسفہ نے زمانۂ حال کے بڑے بڑے فلسفیوں، سائنٹسٹ علما و فضلا سے خراجِ تحسین حاصل کئے ہوں اُن کی تسخیر اس طرح نہ ہو سکیگی۔ اُن کا مذہب کوئی ایک خاص DOGMA نہیں ہے۔ بلکہ قدرت سے ہم آہنگ ایک ایسی چیز ہے جس میں اعتقادات کی کہیں روک ٹوک نہیں، اور ہر درجہ کے آدمی اور ترقی کی ہر منزل کا لحاظ ہے۔ ایک طرف بت پرستی کی انتہائی صورتیں نظر آتی ہیں کہ شجر و حجر تک کی پرستش ہوتی ہے تو دوسری طرف توحید کا وہ تصوّر ہے جس کے آگے انسانی تصوّر کام ہی نہیں کر سکتا۔ ہندو دھرم درحقیقت مذہب و اعتقادات کی ایک یونیورسٹی ہے جہاں ابتدائی اسباق سے لیکر انتہائی معرفتوں کا اہتمام کیا گیا ہے، اور اس میں اُن لوگوں کی بھی گنجائش ہے جو چارواک یعنی دہریہ کہلاتے ہیں۔ اسی رواداری نے ایک دُنیا کو مسخر کیا، اور اتنا زمانہ گذر جانے کے باوجود جس میں کئی قومیں اور کئی مذہبی سلسلے اُٹھے اور رفنا ہوگئے، لیکن باوجود اس کے کہ ہندوؤں میں دنیا بھر کی خرابیاں اور غفلت شعاریاں آگئیں، ہندو قوم اور ہندو دھرم ہنوز زندہ ہے۔ اور بفضلہ تعالیٰ ہمیشہ زندہ رہیگا، اس لئے کہ یہ کسی خاص (Dogma) کی پرستش کا سلسلہ نہیں ہے۔ بلکہ قوانین قدرت کی پابندیوں پر زور دینے والا اور قدرت کی سی فراخ دلی پیدا کرنے کی تلقین کرنے والا سلسلہ ہے جو انسان کی روحانی نشو و نما میں اُس کے ہر درجہ اور ہر منزل کا لحاظ رکھتا ہے۔ انھیں باتوں نے آریوں کی تہذیب و تمدن کو اس درجہ مقبول بنا دیا اور وہ سب پر حاوی و ساری ہوئی۔

قتل و غارتگری و دہشت اندازی یا ایک لفظ میں نازی طریقوں سے یہ حیرت انگیز نتائج حاصل نہیں ہوئے اور نہ ہو سکتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ہندوؤں کی موجودہ حالت افسوسناک ہے، لیکن اب وہ بیدار ہو رہے ہیں

اور اِن حقیقتوں کو سمجھ رہے ہیں، اور بفضل خدا جو خرابیاں دیکھ رہے ہیں وہ کچھ عرصہ بعد باقی نہ رہیں گی۔

مکرمی مولانا ح، کے کچھ اور عجیب وغریب بیانات ملاحظہ ہوں:۔

میرے اِس استدلال سے بحث کرتے ہوئے کہ پارسی بھی تو ہندوستان میں فارسی زبان لے کر آئے تھے لیکن اُن کی وجہ سے یہاں کوئی نئی زبان پیدا نہیں ہوئی، آپ فرماتے ہیں کہ:۔

"وہ بیچارے اول تو قلیل تعداد میں آئے، پھر صرف بمبئی کے ساحل پر آباد ہو گئے، یا کچھ لوگ تجارت کی غرض سے کلکتہ جیسے شہروں میں چلے گئے، ایسی صورت میں یہ اُردو جیسی ہمہ گیر زبان پر کیا اثر ڈال سکتے تھے۔"

تعجب کا مقام ہے کہ مولانا ح، جیسے تعلیم یافتہ بزرگ کو یہ نہ معلوم ہو کہ جب پارسی مہاجرین یہاں آئے تو ہندوستان میں اُردو کا شائبہ تک نہ تھا۔ یہ بیچارے گجرات میں آباد ہوئے اور گجراتی کو اپنایا، اور اپنی خاص زبان اپنی عبادت وغیرہ کے لئے مخصوص کر لی۔

اس کے آگے وہ جو کچھ فرماتے ہیں وہی ہے جس پر میں نے علامہ شبلی مرحوم کے حوالہ سے یہ استدلال کیا ہے کہ اُردو اسلامی زبان ہے۔

ایک بیان یہ ملاحظہ ہو کہ:۔

"ترکی ہندوستان اور دوسرے ممالک میں سمجھی جاتی ہے۔"

یقیناً اُسی طرح سمجھی جاتی ہو گی جس طرح چینی یا روسی زبان!

اسی طرح مسلمانوں کا ہندوؤں کے ساتھ رواداری کا سلوک، مسلمانوں کا سنسکرت کی نشو ونما میں حصہ لینا، وغیرہ وغیرہ کئی ایک بیانات ہیں، جو تنقید کے محتاج نہیں ہیں کیونکہ ان کی حقیقت بالخصوص ان دنوں روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

لیکن ایک جگہ مولانا ح، نے انتہائی ستم ظریفی یہ کی ہے کہ اُنھوں نے ایک آدھ باتیں ایسی بھی لکھدی ہیں جن سے خواہ مخواہ پُرانے زخموں پر نمک پاشی ہوتی ہے مگر میں ان کو نظر انداز کرتا ہوں۔

حسنِ اتفاق سے مولانا ح، کے مضمون میں جو جو اُصولی باتیں ہیں، تقریباً اُن سب کا جواب شافی "ہندوستان کے لئے ایک عام زبان کا مسئلہ" والے میرے مضمون میں آگیا ہے جو اسی پرچہ میں شائع ہوا ہے۔ اب معروضاتِ بالا کے بعد صرف دو ایک امور ایسے رہ جاتے ہیں

جن پر روشنی ڈالنی ضروری ہے۔ ایک وہ اشعار ہیں جو اُردو کے چند شعرا کے کلام سے چُن کر ممدوح نے یہ ظاہر کرنے کی غرض سے پیش کئے ہیں کہ "اُردو شاعری میں ہندوؤں کی تہذیب کی نمایندگی نظرانداز نہیں"

جو شخص اُردو اساتذہ کے کلام سے واقف ہے جانتا ہے کہ نظیر اکبرآبادی کے علاوہ اور کسی اُردو شاعر کے کلام میں ہندو تہذیب و تمدن کی وہ نمایندگی نہیں ہوئی جس کو نمایندگی کہا جا سکتا ہے مگر اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ خود میاں نظیر قعرِ گمنامی میں ڈال دیے گئے۔ حالانکہ شاعرانہ حیثیت سے اُن کا درجہ بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔ آج سے بیس پچیس سال ہوئے ایک بلند حوصلہ اور روشن خیال بزرگ نے نظیر کو رسالہ 'ادیب' میں شکسپیئر سے مشابہت دی تھی۔ ڈاکٹر فیلن نے بھی اپنی مشہور و معروف ڈکشنری کے دیباچے میں نظیر کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اُس سے اُن کی عظمت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ جو انتخاب مولانا 'ح' نے پیش کیا ہے مشتے نمونہ از خروارے نہیں ہے بلکہ بہت چھان بین اور تحقیق کیجئے گا تو اس سے تین چار چند اور اشعار نکل آئیں گے یا کچھ اور زیادہ۔ بہرحال ایسے اشعار ہر ایک کے مجموعۂ کلام کا بہ استثنا ءِ انشا ایک بالکل ناچیز جزو ہیں۔ یہ جو شعر اقبال کا دیا گیا ہے کہ

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مُکتی پریت میں ہے

اس کو اگر مولانا 'ح' یعنی برادرانِ وطن اُردو تسلیم فرماتے ہیں، تو ہم بلاشبہ ایسی اُردو سے تعاون کرنے کے لئے ہر وقت آمادہ ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اِس قسم کی اُردو اُن پرچوں میں خوب چھپتی ہے جو ہندی پرچے کہلاتے ہیں۔

دوسری چیز جس کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے وہ مکرمی 'ح' کا یہ فقرہ ہے کہ "افسوس یہ ہے کہ بدیسی اشیاء سے نفرت کرنے والے خود وہ ہیں جو دیسی زبان یعنی تیلگو اور تامل وغیرہ زبانوں کے خلاف مدراس میں جہاد کر رہے ہیں۔"

اِس معاملہ کو جس رنگ میں پیش کیا گیا ہے اُس کے متعلق کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں، میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنے ابتدائی مضمون میں جو یہ عرض کیا تھا کہ زبردستی کی ٹھونس ٹھانس کچھ اچھے نتائج پیدا نہیں کر سکتی، اُس کا اشارہ مدراس گورنمنٹ کے ہندی کو لازمی قرار دینے ہی کی طرف تھا۔ راج گوپال آچاریہ صاحب نے علاقۂ مدراس میں ہندی کو لازمی قرار دے کر ہندی کی خدمت نہیں کی بلکہ اُس کے حق میں زہر بویا ہے اور اپنی ضد سے ان زہریلے

اثرات کو مستقل کرتے جاتے ہیں۔ ہندی کسی جگہ جبری قرار دیئے جانے کی محتاج نہیں ہے اُس کو محض اختیاری رکھ دیا جانا کافی ہے۔ راج گوپال چاری صاحب کی وزارت سے پہلے لاکھوں نے ہندی سیکھی اور شوق سے سیکھی، لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ ہندی کا جاننا لازمی قرار دینا وہاں کی زبانوں کے خلاف جہاد کیونکر ہوا جبکہ علوم و فنون ہندی کے ذریعے نہیں بلکہ اُن کی مادری زبان میں سکھلائے جاتے ہیں۔ ہندی محض بہ حیثیت ایک لازمی زبان قرار دی گئی ہے۔ (مگر اس کو بالکل ہندی بھی نہیں کہا جا سکتا ہے، اس لئے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی مہربانی سے اُس میں کافی عربی۔ فارسی الفاظ داخل ہو گئے ہیں[1]۔

مادری زبانوں کے خلاف جہاد اس کو کہتے ہیں جو عثمانیہ یونیورسٹی میں ہو رہا ہے۔ جہاں علوم و فنون مادری زبان کے ذریعے نہیں بلکہ اُردو کے ذریعے سکھائے جاتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہاں کے اصلی باشندے جو جملہ آبادی کے پچاسی[85] فیصدی ہیں نہ صرف اپنی مادری زبان کے فیوض ہی سے محروم رہتے ہیں بلکہ اعلیٰ امتحانوں میں جن کا روزی سے تعلق ہے مسلمانوں کے مقابلے میں قدرتاً پیچھے رہ جاتے ہیں۔ گو جب ذریعۂ تعلیم انگریزی تھا یعنی جب اجنبیت کے لحاظ سے ہندو مسلمان مساوی حیثیت میں تھے تو ہندو بازی لے جایا کرتے تھے۔

میں آخر میں چوتھی بار اور اس دفعہ مولٰنا ح کی ہمنوائی میں پھر یہ عرض کرونگا کہ ایک عام زبان یا ہندوستانی قومی زبان کا سوال تلخیوں میں اضافہ کا باعث بن گیا ہے۔ اسلئے قوم کے لیڈروں کا فرض ہے کہ فی الحال اس عام زبان کے سوال کو ختم کر دیں اور انگریزی سے جیسا اس وقت کام چل رہا ہے چلنے دیں۔

جذباتِ رضوی

از سید محمد الیاس رضوی اجمیر

وفا پرست اگر ترکِ آرزو کرتے　　تو ذرہ ذرہ میں کیوں تیری جستجو کرتے

نشاطِ زیست جنھیں نیشِ غم عطا کرتی　　کبھی نہ چاکِ گریباں کو وہ رفو کرتے

بٹھا کے دل میں آ سے جان سے عزیز رکھا　　ہم اور کیا ترے پیکاں کی آبرو کرتے

اسیرِ زلف جو پاتے کبھی اشارۂ چشم　　بیانِ حکایتِ دل تجھ سے مو بمو کرتے

حریمِ دل میں نہ گر غیر کا گذر ہوتا　　تلاشِ دوست نہ اس طرح کو بکو کرتے

سمجھتے وحدت و کثرت کا راز اے رضوی　　کبھی جو آئنہ وہ اپنے روبرو کرتے

---

[1] ہم نے بھی سُنا ہے کہ مدراس کی ہندی ریڈروں میں جو جامعۂ ملیہ دہلی کے زیر اہتمام تیار ہوئی ہیں ایسے ایسے جملے رکھے گئے ہیں کہ "شب کو رب کا شکر ادا کرو"۔ اس پر بھی بعض اصحاب کہہ رہے ہیں کہ واردھا اسکیم بھی اُردو کی مخالف ہے۔ (ا۔ز)

مباحثہ

اُردو، ہندی، ہندستانی

از منشی شیام موہن لال جگر بریلوی بی۔ اے

اپریل ۱۹۳۹ء کے زمانہ میں اُردو، ہندی، ہندوستانی کی بحث کے سلسلہ میں "حق پرست" صاحب نے جو مضمون سپردِ قلم فرمایا ہے۔ اُسمیں اُنھیں باتوں کو دُھرایا گیا ہے جو موصوف اپنے ابتدائی مضمون میں ارشاد فرما چکے ہیں۔ اور جن کے جواب میں میرا مضمون فروری ۱۹۳۹ء کے زمانہ میں شائع ہو چکا ہے۔ پھر بھی دو باتوں کے متعلق مجھے کچھ مزید عرض کرنا ہے۔

"حق پرست" صاحب اُردو کو ہندوؤں کی زبان نہیں سمجھتے اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ اس کو اختیار کر کے ہندو پنپ نہ پائیں گے۔ اور رفتہ رفتہ بہ حیثیت قوم اپنی ہستی ہی مٹا بیٹھیں گے۔

میں نے اپنے ابتدائی مضمون مطبوعہ زمانہ اپریل ۱۹۳۸ء میں جو کچھ عرض کیا ہے اُس کا مطلب بھی یہی ہے جو "حق پرست" صاحب فرماتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں اُس اُردو سے وہ زبان مراد لیتا ہوں جس سے ہندووانی عناصر برابر خارج ہوتے رہے ہیں اور جس کو اب عربی، ایرانی بنا دینے کی کوشش کیجا رہی ہے۔ اسی اُردو کے خلاف احتجاج میں میرا ابتدائی مضمون شائع ہوا تھا۔ میں نے اُس مضمون میں اِس بات پر زور دیا ہے کہ اگر "ہندستانی" کو قومی زبان بنایا جاتا ہے تو ہندووانی خصوصیات، تمدن و مذہب سے بھی اُسکو مالا مال کیا جائے۔ آیندہ قومی و ملکی ترقی کی راہوں پر اس کو ڈالا جائے۔ اس مقصد کے لئے ہر امکانی تدبیر اختیار کی جائے۔ ہندو ادیبوں اور ہندو ادبیات کو بھی اسکولوں اور کالجوں میں جگہ دی جائے۔ مختصر یہ کہ ہندستانی کی نشو و نما اب اِس طریقہ پر ہو کہ ہندو بھی اپنی تمام روایتی خصوصیات کے ساتھ اس میں ترقی کر سکیں۔ اور یہ زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ ہماری قومی زندگی کی ترقی کا ذریعہ بن سکے۔ ان سب باتوں کے لئے جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اگر یہ جدوجہد نہیں ہو سکتی تو ہندوؤں کے لئے ہندی ہی مناسب ہے۔

ہندو کی ادبی حیثیت کے متعلق بھی "حق پرست" صاحب نے وہی فرمایا ہے جو آپ اپنے ابتدائی مضمون میں فرما چکے ہیں یعنی یہ کہ "مجھ کو اس سے انکار نہیں کہ ہندوؤں نے بھی اُردو میں بڑے بڑے صاحب کمال پیدا کئے۔" آگے چل کر آپ فرماتے ہیں: "ہماری مزدوروں کی حیثیت اِس سے ثابت ہو کہ

ہمارے بڑے سے بڑے ادیبوں نے اپنے طبعزاد کلام میں پرمیشر نہیں اللہ یا خدا ہی کہا۔" اُردو میں ہندوں کی مزدورانہ حیثیت ہے۔ اس کا جواب دو طریقوں پر دیا جاسکتا تھا۔ اوّل یہ کہ ادب و شعر کا معیار پیش کر کے مسلم اور ہندو ادبا و شعرا کا ایک دوسرے سے مقابلہ و موازنہ کیا جاتا۔ قطع نظر اس کے کہ یہ طریقہ ایک طول امل تھا۔ یہ مسئلہ اس طریقہ سے اور پیچیدہ ہو جاتا۔ اس لئے کہ ممکن ہے "حق پرست" صاحب میرے پیش کردہ ادبی معیار ہی سے اختلاف کرتے اور اگر نہ بھی کرتے تو موازنہ و مقابلہ میں تو بات بات پر اختلاف کی صورتیں پیدا ہو سکتی تھیں اور ہوتیں۔ اس سے بچنے کے لئے میں نے یہ دوسرا آسان طریقہ اختیار کیا تھا کہ چند ہندو ادیبوں اور شاعروں کے متعلق بعض انصاف پسند مسلم نقادان و مبصران فن کی وہ رائیں پیش کردی تھیں جو متفرق طور پر کہیں کہیں کتابوں میں مل جاتی ہیں اور فن کی بعض اُن کتابوں کے نام لئے تھے جن کے بانی ہندو ہی تھے۔ یہ رائیں اس امر کی ناقابل تردید شہادتیں ہیں کہ ہندو نقال یا مزدور نہیں، مگر افسوس کہ محترم اڈیٹر زمانہ نے ان رائیوں کو شائع نہیں کیا[1]۔ اسی کے ساتھ ساتھ میں یہاں صرف دو ہی مصنفوں سرشار اور پریم چند کا نام لے کر یہ عرض کروں گا کہ جس شخص نے اُن کی معرکہ آرا اور ضخیم تصنیفات کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے اور اُن کی قدرتِ زبان، جدتِ فکر، وسعت مضامین، تنوعِ مطالب اور امتیازی اسلوبِ بیان اور مخصوص طرزِ ادا کا اندازہ کیا ہے۔ وہ کبھی "حق پرست" صاحب کا ہمنوا بن کر ان مشاہیر کو اُردو میں وہ حیثیت نہ دیگا جو حضرات ٹیگور اور شکنتوالا وغیرہ ہم کو انگریزی میں حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریزی ہندوستانیوں کے لئے اجنبی زبان ہے اور اُردو اسی سرزمین میں پیدا ہوئی۔ اس لئے ہندوؤں کا اس پر ویسا ہی حق و اختیار ہے جیسا مسلمانوں کا، یہ اور بات ہے کہ جب یہ ادبی زبان بننے لگی تو ہندوانی عناصر اس سے خارج کر دیئے گئے اور ہندوں کی تصنیفات کو غیر حقیقی معیار سے جانچا گیا اور تعصب کی نظر سے دیکھا گیا۔ اور ان کا حق و اختیار اس پر تسلیم نہیں کیا گیا۔

"حق پرست" صاحب کو شاید اس سے انکار نہ ہوگا کہ اُردو کی ساخت اور اجزائے ترکیبی میں دونوں قوموں کے دل و دماغ اور انفرادی خصوصیتوں کی نشو و نما کے امکانات اور صلاحیتیں موجود ہیں۔ پھر تسلیم کر لینے میں کون سے وجوہ مانع ہیں کہ ہندو بھی اُس میں منتہائے کمال پر پہونچ سکتے ہیں۔ اور واقعات بتاتے ہیں کہ پہونچے ہیں۔ جس کو انصاف پسند مسلم حضرات نے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا خود تسلیم کیا ہے۔

جن اثرات کے ماتحت اُردو کی ترقی ہوئی اُن کی وجہ سے یہ ضرور ہوا کہ خود ہندوؤں کی ادبیات

---

[1] ہماری رائے میں ہندوؤں کے ادبی کارنامے کسی تصدیق کے محتاج نہیں ہیں۔ بہرحال ہم نے اختصار کے خیال سے ان اقتباسات کو نظرانداز کر دیا تھا۔ اب بھی ہمارے نزدیک اس اختصار سے نفس مضمون میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ ا۔ز

ہندو تہذیب و تمدن کے آثار سے خالی رہیں جیسا کہ میں نے اپنے اولین مضمون میں ثابت کیا ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ کیونکر نکالا جاسکتا ہے کہ "ہندو مزدور اور نقال رہے ہیں" یہ استدلال میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ چونکہ اردو ادبیات میں ہندوانی تہذیب و تمدن کا فقدان ہے اس لئے ہندوؤں کی ادبی حیثیت بھی پست و فروتر ہے۔

میں نے اس کے برخلاف رسالہ زمانہ کے صفحات کی گنجائش دیکھتے ہوئے ہندوؤں کی غیر مقلدانہ واجتہادی بلند پائیگی ثابت کرنے کے لئے جو ممکن طریقہ تھا اختیار کیا۔ مگر اس کا ایک جزو جو مسلم حضرات کی رایوں سے متعلق تھا شائع نہیں ہوا[1]۔ اب پھر انھیں باتوں کا دہرانا محترم اڈیٹر کی اختصار پسندی کے خلاف اعلانِ جنگ ہوگا۔ اس لئے صرف اتنا عرض کرکے خاموش ہوجانا چاہتا ہوں کہ اردو میں ہندوؤں کی ناقدری اور کس مپرسی، اردو ادب میں ہندو تہذیب، تمدن اور مذہب کا فقدان اور ان امور کے متعلق بہت سے ضمنی مسئلے ایک مدت سے مجھے پریشان کئے ہوئے تھے۔ جن کے حل کرنے کے لئے میں نے پچاسوں کتابوں کا مطالعہ کیا۔ جس کے نتائج اپنی کتاب "اردو ادب اور اہلِ ہنود"[2] میں منضبط کردیئے ہیں۔ یہ کتاب کم و بیش چار پانسو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی ترتیب و تصنیف کے سلسلہ میں جو چھان بین اور تحقیقات کرنا پڑی ہے وہ مجھے بار بار یہی کہنے پر مجبور کرتی ہے کہ ہر دور میں ہندو بھی اس پایہ کے ادیب و شاعر ہوئے ہیں جن کے کمالات سے اعلیٰ سے اعلیٰ ادبی معیار مرتب کیا جاسکتا ہے اس لئے آخر میں یہ عرض کردینے پر مجبور ہوں کہ جس طرح "حق پرست" صاحب کو یہ اصرار ہے کہ ہندو "مزدور اور نقال" رہے، مجھے یہ علم و یقین ہے کہ ہندو "اہلِ زبان، زباں دان، خلاقِ کلام اور خدائے سخن" رہے اور ہیں۔

"حق پرست" صاحب کے اس اعتراض کے جواب میں کہ ہندوؤں کا کلام بھونڈا اور غیر متوازن ہوجاتا ہے۔ میں نے جو کچھ عرض کیا تھا وہ بھی محترم اڈیٹر نے بغیر قطع و برید شائع نہیں کیا۔ خصوصاً اس بھونڈے پن کی وہ مثالیں بالکل حذف کردی گئیں جو میں نے غالب کے یہاں سے پیش کی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ایک جاہل اور ایک کی غلطیاں ایک ہی حیثیت نہیں رکھتیں۔ جاہل قدم قدم پر غلطی کرتا ہے۔ اس کے لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ غلطیاں بڑے بڑوں سے ہوتی آئی ہیں۔ اس کی غلطی پکڑنا ہی غلطی ہے۔

آخر میں "حق پرست" صاحب فرماتے ہیں کہ مجھ کو جگر صاحب کے مضمون کا لفظ بہ لفظ جواب دینا مقصود نہیں اس میں شکر رنجی اور تلخی کا اندیشہ ہے۔ "حق پرست" صاحب کے پہلے مضمون کے جواب میں جو کچھ میں نے فروری کے زمانہ میں عرض کیا ہے۔ اسمیں یقیناً کوئی لفظ ایسا نہیں جس سے حق پرست صاحب یہ نتیجہ نکال سکیں جو انھوں نے نکالا اور اگر ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔ میں نے جب ایک بحث چھیڑی اور خود دعوتِ اختلاف دی تو

---

[1] لائق مضمون نگار کی اس شکایت کا اس سے پہلے ہی جواب دیا جاچکا ہے (ا۔ نر) [2] یہ کتاب ابھی شائع نہیں ہوئی ہے۔

مجھے اُس کے خلاف ہر بات سُننے کو تیار رہنا چاہئیے اور تیار ہوں۔ اس میں اگر کوئی مجھ پر غیظ و غضب کا اظہار بھی کرے جسکا حق پرست صاحب کی طرف سے قطعی اندیشہ نہیں جب بھی میں بُرا نہ مانوں گا۔ مگر کہونگا وہی جو مجھے کہنا ہے اور شائستگی و تہذیب کے دائرے میں ؎

ادب آموز ہے ہر ایک ذرہ اپنی وادی کا
نہیں ممکن کہ گرد اڑ کر پڑے رہرو کے دامن پر

جگر بریلوی

جذباتِ منوّر

از منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی

ضرور اے جذبۂ دل تو ہو محوِ کار فرمائی
حیات اک لفظ بے معنی ہے بے ہنگامہ آرائی

مزا جب ہے کہ دے ذوقِ خلش ہر خارِ صحرائی
نہیں ہر ایک کے بس کا مذاقِ برہنہ پائی

کیا کانٹوں نے خونِ مدعائے دشت پیمائی
خوش آئی آسمانوں کو نہ میری آبلہ پائی

مرے ہر موئے تن سے پھول بن بنکر لہو ٹپکے
کرے اے سوزِ دروں روشن چراغِ شامِ تنہائی

نچانے در بدر کھائی پڑی ہیں ٹھوکریں لیکن
کہاں ورنہ مری تقدیر میں ذوقِ جبیں سائی

زمیں و آسماں میں فاصلہ بڑھتا ہی جاتا ہے
کہاں تک دیکھئے لیجائے تجھکو تیری انگڑائی

کہاں تک جبر ہوگا تم سے اپنے دیدہ و دل پر
کہاں تک آئینہ دیکھو گے ہنگامِ خود آرائی

خموشی میں دمِ نظارہ ایسی روح بھر دونگا
تری تصویر بھی ہو جائے گی مجبورِ گویائی

ہے کیا مدِ نظر صبر آزمائی میگساروں کی
اگر ساقی ہے دریا دل تو پھر کیوں ظرفِ پیمائی

حدودِ شوقِ سجدہ سے گذرنا عین سجدہ ہے
نہ ہو وقتِ جبیں سائی بھی احساسِ جبیں سائی

ہیں اس کے اصطلاحِ عشق میں کچھ اور ہی معنی
تمنائی ترا کہلا نہیں سکتا تمنائی

منور ہے غنیمت حضرتِ ساحر[۱] کی ہستی بھی
انھیں کی دم سے ہے اپنے سخندانوں کی یکجائی

۱؎ یعنی فخر شعرا جناب علامہ پنڈت امرناتھ صاحب ساحر دہلوی

اُردو

(از مسٹر اعجاز صدیقی ایڈیٹر شاعر)

یہ روح رواں و جانِ عالم رومان و فصاحتِ مجسّم
ہے نصب جہاں پر اس کا پرچم اس سے ہوا اختلاط باہم
ہے اِس میں عجیب کیف اور کم قایم یہ رہے گی یوں ہی جم جم

ہے سارا جہاں امینِ اُردو
ہے کتنی حسیں جبینِ اُردو

ہے کانِ فصاحت و بلاغت یہ حاملِ صد ہزار ندرت
یہ روح کی اور نظر کی جنّت اس کے ہر بول میں حلاوت
کتنی پیاری ہے اس کی صورت ہے اِس میں بلا کی جاذ بیّت

ہر نقطہ ہے اِک نگینِ اُردو
ہے کتنی حسیں جبینِ اُردو

میرؔ و غالبؔ کو تھی یہ پیاری کی داغؔ نے اِس کی آبیاری
چکبستؔ اِسی کے تھے پجاری وہ برقؔ و رواںؔ کی جاں نثاری
کیفیؔ پہ ہیں اس کے کیف طاری سپروؔ اور شادؔ اس پہ واری

ہر دل ہے یہاں رہینِ اُردو
ہے کتنی حسیں جبینِ اُردو

ہے سارے جہاں میں اس کا چرچا ہے اِس میں فسوں نہ جانے کیسا
ہر چھوٹا بڑا ہے اس کا شیدا ہر گھر میں ہیں اس کے نام لیوا
ایسا کِس کو ملا ہے رتبا ہندی ہو کہ اور کوئی بھاشا

اب ہند ہے سرزمینِ اُردو
ہے کتنی حسیں جبینِ اُردو

آؤ آج اُس کا گیت گائیں　　مل جل کے سب اس کی لے بڑھائیں
یہ باہمی تفرقے مٹائیں　　اِس کو اپنی زباں بنائیں
آگے سب اِس کے سر جھکائیں　　سینوں سے پھر آج اسے لگائیں

چیخ اُٹھے یہ نکتہ چینِ اُردو
ہے کتنی حسیں جبینِ اُردو

غزل

(مسٹر ڈی۔پی۔بھٹناگر کشتہ (منصوری)

طلسمِ حسن ہے ہر ایک منظر تری محفل کا　　خدا جانے کہ ہوگا خون کس کس سے مرے دل کا
کسی دن یہ اثر ہو کر رہے گا جذبِ کامل کا　　ترے نغموں میں گم ہوگا ہر اک نغمہ مرے دل کا
جسے کہتے ہیں دنیا اک کرشمہ ہے مرے دل کا　　دکھاتا ہے یہ آئینہ تماشا حق و باطل کا
بہت آسان تھی مشکل کشائی۔ پھر بھی مشکل تھی　　مری آسانیوں میں بھی تھا مضمر راز مشکل کا
نشاطِ روح شامل ہے مرے ذوقِ تجسس میں　　فضا میں رقص کرتا ہے ہر اک ذرہ مرے گِل کا
ہوئی دنیائے دل تاریک داغ دل کے مٹنے سے　　غضب ہے اہلِ محفل جل کے بجھنا شمع محفل کا
یہ تقصیرِ نظر ہے یا ہے تکمیلِ نظر یارب　　گماں ہر نقشِ پا کو دیکھکر ہوتا ہے منزل کا
سلامت شوقِ صادق۔ برقرار اے سعی لاحاصل　　تمہارے دم سے قصہ مختصر ہے بُعدِ منزل کا
بجائے خود مری ہر لغزشِ پا ایک منزل ہے　　مجھے اے ہم سفر پھر خوف کیا دوریِ منزل کا
اُٹھیں گے سیکڑوں فتنے تری ہر ایک ٹھوکر سے　　جوابِ حشر ہو جائے گا ہر ذرہ مری گِل کا

تصدق اس کے اے کشتہ متاعِ ہر دو عالم بھی
بڑی نعمت ہے اطمینان کہتے ہیں جسے دل کا

سائیں بابا

از پروفیسر دیوندر دت کٹاریہ ایم۔ اے

ڈاکیئے کو اب کون نہیں جانتا؟ شہری لوگ تو مدتوں سے اُسے جانتے ہیں مگر اب دیہات کا بچہ بچہ بھی اِسے خُوب پہچانتا ہے۔ وہی اس کی خاکی وردی، وہی اس کا دقیانوسی تھیلا اور وہی اس کی ستین چال۔ اسکی زندگی کا ایک ایک لمحہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ شدت کی گرمی ہو یا سردی، آندھی آئے یا اولے برسیں۔ یہ بچارا تھکا ہارا اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کرتا۔ خطوط اُچھالتا۔ پارسل دیتا۔ رسیدیں لیتا۔ روپے جھنکارتا مستانہ وار گلی گلی اور کوچہ کوچہ اپنا روزمرہ کا کام بڑی خوش اسلوبی سے نبھاتا چلا جاتا ہے۔ توقف سے اُسے سروکار نہیں۔

دفتری حکومت کے ہر ایک صیغہ میں رشوت کی گرم بازاری ہے۔ منت، سماجت، چاپلوسی، خوشامد کو وہ درجہ حاصل نہیں جو بخشش اور انعام کو ہے۔ کسی اہلکار کے آگے ماتھا رگڑو، رشتہ داری جتاؤ۔ عمر بھر کی غلامی کا حلف اُٹھاؤ۔ وہ بگلا بھگت ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ مگر چپکے سے اُس کی مٹھی میں ایک روپیہ سرکا دو، تو جس کام کو وہ ابھی ابھی ناممکن بتا رہا تھا۔ ایک منٹ میں ہی ممکن بنا دیتا ہے۔ اگر کوئی صیغہ اس مرض سے بچا ہے تو وہ پوسٹ آفس ہے۔ اگر ہم ڈاکیئے کی پاکیزگی کی داد نہیں دیتے، اگر ہم اسکی عجلت کاری اور دیانتداری کی قدر نہیں کرتے تو ہم ایک سنگین گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔

سائیں داس ریاست چنبہ میں ڈاکیہ تھا۔ بتیس سال سے اپنے انوکھے فرائض صدق دلی سے ادا کر رہا تھا۔ اس کی دیانتداری کی دھوم تھی۔ بوڑھے سائیں داس کو بیشک اپنے عہدہ پر ناز تھا۔ تقدیر پر بھی شاکر تھا۔ کبھی زبان پر حرف شکایت نہیں لاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ریاست بھر میں لوگ اُسے سائیں بابا کے متبرک نام سے پکارتے تھے۔ وہ عالم نہ تھا مگر زندگی کے کوائف سے بے بہرہ بھی نہ تھا۔ محکمہ کے قواعد پر پُورا کاربند تھا۔ کبھی کبھی کسی کی التجا بھی سُن لیتا۔ مگر اپنے فرائض میں کوتاہی کبھی نہ کرتا۔ ایسے خط کو بھی جس کا پتہ مشکوک ہوتا، پہاڑی ندی یا غار کے حوالے نہ کرتا۔ اس پر طرفہ یہ کہ وہ وقت کا پُورا پابند تھا۔ ہر فرد بشر اُس کیساتھ خندہ پیشانی سے کلام کرتا۔ حلقے کا بچہ بچہ اُس سے مانوس تھا۔ یہاں تک کہ حلقے کی کتیا بھی دُم ہلاتی اُس کے پاؤں چاٹتی

گویا کسی بچھڑے عزیز کا خیریت نامہ طلب کر رہی ہے۔ اُسے نہ تو کسی کے لڈو پوری کی چاہ تھی، نہ کسی کے نانِ جویں سے مطلب۔ چٹھی دی اور چلتا بنا۔ اُس کا یہی شیوہ اس کی کامیابی و ہر دلعزیزی کا باعث تھا۔ افسرانِ بالا بھی اس سے مطمئن تھے بلکہ اِس بات کا بھی اُن کو احساس تھا کہ ایسے وفادار، ثابت قدم اور سلامت رو ملازم کی تنخواہ اسقدر قلیل ہے

:(۲):

جنوری کا مہینہ تھا اور کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ ہفتہ بھر سے موسلادھار مینہ برس رہا تھا۔ سائیں داس کے کپڑے تر بتر ہو رہے تھے۔ پھر بھی یہ فرض شناس ڈاکیہ کمر ہمت باندھے اپنی گشت پوری کر رہا تھا۔ ابھی نصف ڈاک بھی تقسیم کرنے نہ پایا تھا کہ ایک قہوہ خانہ کے آگے رُکا جو شہر کے بائیں طرف تھا۔ راجہ کی نگری کے ادنیٰ طبقے کے لوگ عموماً یہاں اکٹھے ہو جاتے اور بغرض تفریح یا توضیع اوقات خوب بے پر کی اُڑاتے۔

"سائیں بابا۔ اِس جھڑی میں بھی آپ دم نہیں لیتے۔ ذرا اندر تشریف تو لائیے، مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے"

یہ ایک نوجوان کے الفاظ تھے جو چلم پکڑے قہوہ خانہ کے دروازہ میں کھڑا کش لگا رہا تھا۔ اس وقت بارش زوروں پر تھی۔ اور طوفانِ باد و باراں کے تھپیڑے بوڑھے سائیں داس کے چہرہ پر بڑی بیرحمی سے پڑ رہے تھے۔ تناور درخت بھی اس طوفان کے آگے سر تسلیم خم کر رہے تھے۔ تاہم ڈاکیہ چٹھیاں وقت سے پہلے ہی بانٹنے کی دُھن میں مست تھا۔ قواعد کی پابندی اِتنی کڑی نہیں کہ ایسے غیر معمولی موسمی حالات میں بھی عارضی پناہ سے انکار کیا جائے۔ ڈاکیہ اندر آگیا اور آگ تاپنے لگ گیا۔ اس خوشنودی کی خاطر دو چار لکڑیاں اور لگا دی گئیں۔ آگ بھڑک اُٹھی اور سائیں داس اپنے کپڑے سکھانے لگ گیا۔ اس نوجوان نے ڈاکیہ سے ڈاک اور اُس کی ملازمت کے بارے میں کئی ایک سوال کئے۔

"تو کیا آپ مجھے جانتے ہیں؟"

"ہاں، ہاں! یہاں کون ہے جو سائیں بابا کی ذات پر نازاں نہیں؟ مجھے اُمید ہے آپ چائے کا ایک پیالہ ضرور قبول فرمائیں گے؟"

قہوہ خانہ کے مالک سے دو پیالوں کی فرمائش ہوئی۔ ایک کمسن لڑکا چائے لے آیا۔ سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے نوجوان نے کہا:۔

"آپ کا جی کتنا خوبصورت اور پیارا جانور ہے۔ ابھی آپ کو بہت دُور جانا ہے کیا؟ شاید آپ کو وہاں اُس مندر تک بھی جانا ہے؛ وہاں اُن درختوں کی اوٹ میں۔ مجھے بھی وہیں جانا ہے اگر آپ چاہیں، تو اُدھر کی ڈاک میں ہی بانٹ دونگا۔"

"نہیں آپ کی نوازش۔ میں خود ہی لے جاؤں گا۔"

اچھا۔ آپ کی مرضی۔ غالباً آپ کو ہدایات ہی ایسی ہیں، ورنہ مجھے تو اُدھر جانا ہی تھا۔"

نوجوان باتوں کا دلدادہ تھا۔ باتوں ہی باتوں میں اُس نے ڈاک کا تھیلا سرکایا۔ اُسکا وزن بھانپا اور پھر اُسے وہیں رکھدیا۔ مگر خطوں کی ترتیب کو بگاڑ ڈالا۔

تھیلے کو نہ چھیڑیئے جناب! آپ نے تو ترتیب ہی بگاڑ ڈالی۔ اب مجھے پھر تردو کرنا پڑے گا۔" سائیں بابا نے قدرے ترش ہو کر کہا۔

نوجوان نے معافی چاہی اور انکساری سے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ آپ اس میز پر خطوں کو پھر ترتیب دے سکتے ہیں۔"

ڈاکیہ نے تھیلا میز پر اُلٹ دیا اور چٹھیوں کو ترتیب سے رکھنے لگا۔ اس کا میزبان بیٹھا تو پرے تھا۔ مگر چٹھیوں کو چیل کی سی متجسس نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

سائیں بابا اس کام میں مصروف تھا کہ اتنے میں پیچھے سے کتوں کے غرانے کی آواز سُنائی دی۔

نوجوان نے کہا۔ "آپ کا جمی کہیں میرے جیکی کو مار نہ ڈالے، ذرا آپ اُسے روکئے تو۔"

ڈاکیہ اُٹھا اور جمی کو گردن سے پکڑ لیا۔ جس قدر سائیں بابا خاموش طبیعت تھا۔ اُسی قدر اس کا کتا شور و غل کا دلدادہ تھا۔ مگر مالک کا اشارہ پاکر یہ سمجھدار داعی خاموش ہو گیا۔ لیکن نوجوان نے موسم کو بھانپنے کے بہانہ سے قہوہ خانہ کا دروازہ کھولا۔ ہوا کے تیز و تند جھونکوں کے سبب کمرہ میں دھواں بھر گیا اور بیچارے ڈاکیئے کی ڈاک کمرے کے کونہ کونہ میں تتر بتر ہو گئی۔

سائیں بابا بہت برہم ہوئے مگر اس زمانہ ساز مہمان نے کہا۔ "کچھ مضائقہ نہیں، ہم ابھی اکٹھا کئے دیتے ہیں۔"

سائیں بابا کے انکار کے باوجود وہ بکھرے ہوئے خطوط اُٹھانے لگا۔ جب سب اُٹھائے جا چکے اور سائیں بابا نے انھیں ایک ایک کر کے دیکھا، تو اُس کا چہرہ زبانِ حال سے کہہ رہا تھا کہ ایک آدھ چٹھی گم ہے۔

نوجوان نے پوچھا۔ "کیوں کوئی چٹھی گم ہے کیا؟"

"میرا خیال ہے کہ ایک اور چٹھی ضرور تھی۔"

"اگر ہوتی تو یہیں ہوتی۔ آپ بھول رہے ہیں۔ وہیں ڈاکخانہ میں ہی رہ گئی ہوگی۔"

"ممکن ہے۔"

سائیں بابا نے سارا کمرہ چھان مارا، مگر بے سود۔ آخر کار یہی تسلیم کیا کہ اُس کی یاد اُسے دھوکا دے رہی ہے۔

اور وہاں سے چلنے کی ٹھانی۔ دل میں پشیمان تھا کہ ناحق قہوہ خانہ میں قدم دھرا۔ اور اس میزبان کے لئے اُس کے دل میں جذبۂ حقارت تھا۔ جس متنفس سے ریاکاری و مکاری کی بُو آنے لگے اُس سے وہ فوراً کنارہ کشی کر لیا کرتا تھا۔ یہ اُس کا زرّین اصول تھا۔

(۴)

طوفان اب تھم چکا تھا۔ جب اس مندر کے پاس درختوں کی اوٹ میں سائیں بابا پہونچا تو مطلع صاف ہو چکا تھا۔

"شانتی کُنج" کے باہر اُس کی مالکہ سینہہ لتا بڑی بے صبری کے ساتھ سائیں بابا کی راہ دیکھ رہی تھی۔ سینہہ لتا کی شادی کو ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ حسین تھی، چنچل تھی، رقیق القلب تھی۔ اُس کا شوہر پنڈت برجموہن ہفتہ بھر سے ڈلہوزی گیا ہوا تھا اور وہ منتظر تھی۔ کہ پیا کا سندیشہ کب آتا ہے۔

"سائیں بابا۔ ہمری بھی کوئی چٹھی ہے کیا؟"

"نہ بی بی۔ آج تو کوئی نہیں۔"

"یہ تو انوکھی بات ہے، وہ تو کہہ گئے تھے کہ آج ضرور اُن کی چٹھی ملے گی۔ سائیں بابا کچھ اُن کو ....."

سینہہ لتا کی زبان تو رُک گئی مگر اُس کے چہرہ پر مُردنی سی چھا گئی جو اُس کے دل کی پریشانیوں کی پوری پوری ترجمانی کر رہی تھی۔

"بی بی! گھبراؤ نہیں۔ آج نہیں تو کل ضرور کوئی خبر آ جائے گی۔ شاید کوئی کام اور آپڑا ہو۔ اور وہ چٹھی نہ لکھ سکے ہوں۔"

"نہیں، وہ زمین کا ایک ٹکڑا بیچنے گئے تھے۔ کل بیعنامہ تحریر ہو چکا ہوگا۔ آج انھیں یہاں پہونچنا تھا۔ کل سامنے والا کھیت نیلام ہوگا۔ اور انھوں نے اُسے خریدنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مجھے خدشہ ہے کہ کہیں وہ رانی کھیت کے راستہ کے بجائے بنی کھیت کے چھوٹے راستہ نہ آئیں۔"

"تو اُس میں کھٹکا کیا ہے؟"

کھٹکا یہ ہے کہ نواب رائے کی بن چکی اسی راہ میں ہے اور وہ درپئے آزار رہتا ہے۔ نہ صرف انکے پاس روپیہ ہوگا۔ بلکہ وہ کہیں اُن کی زندگی پر وار نہ کر بیٹھے۔"

سینہہ لتا جب کنواری تھی تو اُس کی نسبت پہلے اسی نواب رائے سے قرار پائی تھی۔ مگر اسکی عادتوں مے نوشیوں اور ہرزہ کاریوں سے مجبور ہو کر سینہہ لتا کے والد نے اس کا بیاہ برجموہن سے کر دیا تھا۔ اس دن سے نواب رائے درپئے آزار تھا اور یہ خدشہ سینہہ لتا کے دل میں خار کی طرح کھٹکتا رہتا تھا۔

دیانتداروں کی خوشی، عیاروں، نابکاروں، میکشوں کی مصیبت کا باعث کبھی نہیں ہو سکتی، مگر نواب رائے اپنی شکست و مصیبت کو سلامت رَو و مرفہ الحال برجموہن سے منسوب کرتا تھا۔ اور مارے حسد کے وہ اس تاک میں رہتا تھا کہ میں اس کا خون ہی تو پی جاؤں۔

قہوہ خانہ کا واقعہ سائیں بابا کی آنکھوں میں پھرنے لگا۔ تھیلے کو سرکانا، جیکی وجمی کا غرّانا، کھڑکی کا کھولنا، منع کرنے کے باوجود خطوط اکٹھے کرنا۔ نواب رائے کے اس رَویہ سے اُسے شک ہوا کہ سینہ لتا کے نام ایک خط ضرور تھا، جو نواب رائے نے چرا لیا ہے۔ اُس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ واپسی پر ڈاکخانہ سے وہ ڈلہوزی میں ٹیلیفون پر برجموہن کو آگاہ کر دے گا۔

(۴)

ڈاکخانہ پہونچتے ہی بابو جی سے دریافت کیا تو اِس بات کی تصدیق ہو گئی کہ واقعی سینہ لتا بی بی کے نام ایک چٹھی ضرور تھی۔ ڈلہوزی ٹیلیفون کیا تو اطلاع ملی کہ برجموہن براہ بنی کھیت چنبہ کے لئے روانہ ہو چکے ہیں۔ "کاٹو تو لہو نہیں بدن میں"۔ عالم تخیل میں خون کے پیاسے نواب رائے کا اُٹھتا ہوا ہاتھ نظر آنے لگا۔ اور اس خونِ ناحق کی ذمہ واری کے احساس سے اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

بجائے گھر لوٹنے کے سائیں بابا مع اپنے وفادار رفیق جمی کے بنی کھیت کی طرف روانہ ہوا۔ جن لوگوں نے سائیں بابا کو چوگان دروازہ کے باہر اپنے خیالات میں غرق آنے جانے والوں سے بے پروا جلدی جلدی قدم اُٹھاتے دیکھا۔ وہ حیران و ششدر رہتے کہ تھکا ماندہ، لوہے کی ٹانگوں والا سائیں بابا پھر کدھر جا رہا ہے۔ اِنسان کتنا ہی تھکن سے چور چور کیوں نہ ہو، قوت ارادی کے ایک ہی جھٹکے سے ساری تھکاوٹ دُور ہو جاتی ہے۔

پُل کے اس پار گھوڑے پر سوار ایک مسافر ملا تو معلوم ہوا کہ پنڈت برجموہن گھراٹ کے پرے پیدل آ رہے ہیں۔ سائیں بابا نے قدم اور تیز کئے اور اودھ بہاری کے کھیتوں کے پیچھے والا تنگ اور خوفناک راستہ طے کر کے گھراٹ سے سَو گز اوپر جا پہونچا۔ جہاں سے وہ برجموہن کے ہمراہ آنا چاہتا تھا۔

رات ہو چکی تھی۔ مہتاب کی ہلکی ہلکی کرنیں چٹانوں پر پڑ رہی تھیں۔ تنگ راستے کے دو رویہ ڈھلوانوں پر لمبے لمبے تناور درخت مہتاب کی کرنوں کو روک رہے تھے۔ عمر بھر کی کدورت کو دُور کرنے اور انتقام کی کی خوفناک خواہش کو پُورا کرنے کے لئے نواب رائے بھی اسی مقام کو موزوں سمجھ کر درختوں کی اوٹ میں چُھپا بیٹھا تھا۔ چاروں طرف سناٹا ہی سناٹا چھایا ہوا تھا۔

اس عالمگیر خاموشی میں اگر کوئی آواز سُنائی دیتی تھی تو وہ رواں ندی کی جھنکار تھی، جو چٹانوں سے

ٹکراتی، سنگ ریزوں سے اٹھکھیلیاں کرتی اور اٹھتی جوانی کی امنگیں سینے میں دبائے پیا کو ملنے جارہی تھی
یہیں آکر سائیں بابا رُکا۔ پتوں کی سرسراتی ہوئی آواز کے ساتھ اُس کے کانوں میں پاؤں کی آہٹ بھی سنائی دی۔ یہ برجموہن کے قدموں کی آواز تھی جو روپوں کی پوٹلی بغل میں دبائے گھر کو واپس آرہا تھا۔ اُسے ملنے کے لئے سائیں بابا آگے بڑھا ہی تھا کہ اُسے گولی لگی۔ جھاڑی کے پیچھے سے قاتل لپکا کہ روپوں کی پوٹلی قابو میں کرے مگر یہاں پہونچا تو برجموہن کو سامنے پایا۔ جونہی اپنی غلطی کا احساس ہوا تو چاہا کہ آب تیغ سے انتقام کی بھڑکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کرے۔ مگر برجموہن چوکنا ہوگیا اور اُسکے سر پر اس زور سے اپنا ڈنڈا رسید کیا کہ نواب رائے زمین پر چت گر پڑا۔
عین اُسی وقت خوف سے ہراساں ایک عورت سائیں بابا کی لاش پر گر پڑی۔ "میں کتنی ابھاگن ہوں، میں جانتی تھی کہ وہ ان کی جان لے کر رہیگا۔"
سنیہہ لتا کو جو اپنے نیک طینت شوہر کی زندگی کے خطرہ کا احساس ہوا تو وہ بھی گھر سے چل پڑی تھی۔ بندوق کی آواز جو سنی، دیوانہ وار دوڑ کر جائے وقوعہ پر پہونچی۔
"سنیہہ لتا۔ فکر نہ کرو، میں تو صحیح سلامت ہوں۔"
"اچھا تو یہ بچارا کون ہے؟"
چاند کی مدہم روشنی میں ان دونوں نے جھک کر دیکھا۔ تو سائیں بابا کو اپنی رفیقۂ حیات خاکی وردی میں نیم مردہ پایا۔ دونوں اُسے اٹھاکر گھراٹ تک لے آئے جہاں اُسے لٹا دیا گیا۔ ابھی اس میں جان باقی تھی۔
لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں سائیں بابا نے سارا ماجرا کہہ سنایا کہ کس طرح برجموہن کا خط نواب رائے نے چرالیا تھا۔ اس ذمہ واری کا احساس کرتے ہوئے اُس نے ٹھان لی تھی کہ وہ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر بھی برجموہن کو بچائیگا۔ جس کی زندگی اس کی غفلت کی وجہ سے خطرہ میں پڑ گئی تھی۔
فرض شناس سائیں بابا اس جانکاہ حملہ سے جانبر نہ ہوسکے۔ اگرچہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ لیکن اُن کی سمادھی پر اب بھی سنیہہ لتا اور برجموہن کے علاوہ سیکڑوں لوگ عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں۔

کالیداس اور ودیا

یہ دلچسپ ڈرامہ جناب جوش انبالوی کی تصنیف ہے اسمیں خوبی کے ساتھ یہ دکھایا گیا ہے کہ مورکھ راج نامی ایک لڑکا جس کو لوگ محض جاہل سمجھتے تھے کس طرح سنسکرت کا مشہور ڈرامہ نویس کالی داس بن گیا۔ ڈرامہ کا پلاٹ سنسکرت کی ایک مشہور روایت سے لیا گیا ہے اور طرز بیان کافی دلچسپ ہے البتہ زبان میں کہیں کہیں اصلاح کی گنجائش ہے۔ یہ ڈرامہ دیہاتی لائبریروں میں رکھنے کے قابل ہے۔ قیمت آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ :۔ ودیا پبلشنگ ہاؤس۔ انبالہ چھاؤنی

یادِ ریاض

مولانا محوی صدیقی لکھنوی (از مدراس)

ے ریاضِ خوشنوا! اے شاعرِ شیوا بیاں
تھی تری ذاتِ گرامی نازشِ ہندوستاں

ب کہاں سے لائیں گے ہم آہ تجھ سا نغمہ سنج
ہوتے ہیں ہر روز پیدا ایسے زندہ دل کہاں

د آتی ہے تو رو دیتا ہے دل بے اختیار
وہ تری شیریں نوائی اور بذلہ سنجیاں

ترا طرزِ ادا جو آپ اپنا تھا نظیر
جس پہ سر دھنتی ہے دنیا جسکے سب ہیں قدرداں

ں تری تحریر کی ہر سطر میں اک دلکشی
تھا تری تقریر کے ہر لفظ میں جادو نہاں

ہ کو آنکھوں میں جگہ دیتے تھے اربابِ کمال
مانتے تھے اہلِ انشا تیرا اعجازِ بیاں

جھوم جھوم اٹھتے تھے ہر مصرع پہ تیرے اہلِ ذوق
وجد کرتے تھے ترے شعروں پہ سارے نکتہ داں

ہ عجب جادو طرازی دی تھی قدرت نے تجھے
دل سے جس کے معترف ہیں ہم مذاق و ہم زباں

ہچہے تیرے دلوں کو بخشتے تھے زندگی
تو نہیں تو آہ افسردہ ہے سارا گلستاں

مد اللہ کیا ترے اخلاق اور اوصاف تھے
یاد آتے ہیں تو گر پڑتی ہیں دل پر بجلیاں

ت کے بیدرد پنجوں نے ستم یہ کیا کیا
کر دیا تجکو جدا افسوس ہم سے ناگہاں

م تجھ پہ ہو گیا افسوس وہ طرزِ سخن
جس نے تیرے نام کو بخشی حیاتِ جاوداں

نے طرزِ خاص کا تھا موجد و خاتم تو ہی
کس کی قدرت ہے کہ ہو اس فن میں تیرا امتحاں

ہ لطافت اور شیرینی، زباں کی شستگی
پائی کس شاعر نے جو ہے ترے شعروں سے عیاں

لیاں لیتا ہے دل میں تیرا اندازِ کلام
شوخیاں کرتی ہیں ہر اک بیت میں اٹکھیلیاں

ہے ترا ہر شعر اک مینائے لبریزِ شراب
جس کے ہر ہر لفظ میں بھر دی ہیں تو نے مستیاں

شق و معشوق دونوں تیرے نغموں کے اسیر
ہر غزل کیفِ محبت کی ہے رنگیں داستاں

کھینچ دی تصویر وہ جذباتِ حسن و عشق کی
خلوت و جلوت میں تھا دونوں کا گویا رازداں

جھومتے ہیں پڑھ کے یوں اشعار تیرے اہلِ ذوق
جھومتی ہیں جس طرح پھولوں کی رنگیں ڈالیاں

یں جوانی کی ادائیں جن میں اٹھلاتی ہوئی
وہ ترا ہر شعر جس کو پڑھ کے بوڑھے ہوں جواں

وہ تری ہر بیت جس میں ولولوں کی چھیڑ چھاڑ
حُسن کے غمزے کرشمے جاں نوازو دلستاں

وہ شبستانِ تمنّا کا غضب راز و نیاز
وہ نشاط و بیخودی شوق کی رعنائیاں

گدگدانا آہ وہ سوتے ہوئے جذبات کو
فطرتِ انساں کا تھا سچّا تو ہی اک ترجماں

حافظِ شیراز ہو، خیّام ہو، یا بو نواس[1]
تیرے ساغر میں ہے اِن سب کی شرابِ ارغواں

حُسن کی دلکش اداؤں کی ہیں تصویریں وہیں
عشق کے جذباتِ رنگیں کی ہیں تفسیریں جہاں

ہیں نگینوں کی طرح الفاظ شعروں میں جڑے
یہ ترا حُسنِ بیاں اور یہ ترا حُسنِ زباں

قلب کی گہرائیوں میں فکر جب پہونچی تری
راز جو سینوں میں مخفی تھے کئے وہ سب عیاں

ہر غزل ہر بیت ہر مصرع میں دیکھے تو کوئی
خلوتوں کے ہیں مرقعے، جلوتوں کی داستاں

ہر ادا ہے غمزہ و ناز و ادا کا آئینہ
ہر صدا میں آرزوئیں عشق کی ہیں خونچکاں

آہ اب ہے ہر طرف افسردگی چھائی ہوئی
تو چہکتا تھا جہاں اب خاک اُڑتی ہے وہاں

خون روتا ہے وہاں اب دیدۂ ہر بادہ خوار
آہ جس میخانے میں تو تھا کبھی پیرِ مغاں

آہ اب ڈھونڈھیں کہاں پائیں تجھے ہم کس جگہ
کُنجِ تربت میں بنایا تو نے اپنا آشیاں

بن گئی ہے محفلِ شعر و سخن ماتم کدہ
مرثیہ خواں ہے ترا ہر شاعرِ ہندوستاں

کر گیا تو شاہدِ اُردو کو بیکس غمزدہ
کیوں نہ ہو یہ تیرے غم میں سوگوار و نوحہ خواں

ہے یہ چہروں کی اُداسی اور غمگینی گواہ
رو رہا ہے دل، نہیں گو آنکھ سے آنسو رواں

تجھ سے خیر آباد کیا، سارا وطن تھا سربلند
تھا تو فخرِ قوم، فخرِ ہند، فخرِ خانداں

آہ تیری موت پر ہر جانِ غمگیں سوگوار
آہ ہے تیری جُدائی آج ہر دل کو گراں

گو نہیں تو آج زینت بخشِ ابوابِ ادب
غیر فانی ہیں مگر چھوڑے ہیں جو تو نے نشاں

وہ تری انشا، وہ تیری جنبشِ نوکِ قلم
چُٹکلے چُٹکلے جو لیا کرتی تھیں دل میں چٹکیاں

اہلِ معنی سے وہ پایا تو نے تحسیں کا خراج
جس کی حسرت میں گئی بہتوں کی کوشش رائگاں

دو چھلکتے جام ہیں دو مصرعِ رنگیں ترے
خلد میں یا کوثر و تسنیم کی نہریں رواں

پڑھ کے جن کو دل پہ طاری وجد کی کیفیتیں
روح جن کے حُسنِ معنی سے ہو مست و شادماں

ہے عقیدت مند اِک ناچیز محوؔی بھی ترا
تیرے غم میں جس کا دل زخمی ہے آنکھیں خونچکاں

---

[1] دَورِ عباسیہ کا مشہور عربی شاعر جو خمریات میں بے مثل مانا گیا ہے۔

تنقید کتب

دیوانِ ثاقب[1]

مرزا ذاکر حسین ثاقب قزلباش لکھنوی کے اِس مجموعہ کلام میں جو دیوانِ ثاقب کے نام سے شائع ہوا ہے غزلیں، قطعات تاریخ اور نظمیں بھی شامل ہیں۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ جسمیں تاریخ تصنیف کے لحاظ سے غزلیں درج ہیں، دوسو بیالیس صفحات پر ختم ہوا ہے۔ اس کا مقدمہ شیخ بدرالزماں صاحب، بی۔اے، ایل ایل۔بی نے بیالیس صفحات پر لکھا ہے جسمیں مرزا ثاقب کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے حصہ کا جسمیں قطعات تاریخ اور نظمیں ہیں، مقدمہ سید شہنشاہ حسین صاحب رضوی ایڈوکیٹ لکھنؤ نے لکھا ہے۔ جسمیں مرزا ثاقب کے کلام پر مفصل تنقید کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مولوی سید محمد حسین صاحب ایم۔اے لکچرار لکھنؤ یونیورسٹی، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی اور سید اکبر علی صاحب ایم۔اے۔ ایل۔ ٹی کے تبصرے بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ چونکہ مرزا ثاقب صاحب کو ریاست محمود آباد کی سرپرستی بھی حاصل ہے۔ اس لئے اس دیوان کے شروع میں سابق مہاراجہ صاحب محمود آباد اور موجودہ راجہ صاحب اور اُن کے چھوٹے بھائی مہاراجکمار صاحب کے فوٹو دئے گئے ہیں۔ ایک فوٹو مرزا ثاقب کی بھی ہے۔

مرزا ثاقب لکھنؤ کے مشہور اور کہنہ مشق شعرا میں ہیں۔ اس لئے وہ کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ اُن کے کلام میں طرزِ قدیم وجدید دونوں کی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ پرانی وضع کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

صفحۂ دل داغِ حسرت کا رہینِ ناز تھا	صبح تھی اور صبح پر خورشید نور انداز تھا
گردشِ چشم فسوں ساز اور عیسیٰ کا گماں	یہ وہ جادو تھا کہ جو صورت کشِ اعجاز تھا
غیر کی امداد سے چمکے نہیں اہلِ کمال	نام کو روغن چراغ طور سینا میں نہ تھا

معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ و آتش کے زمانہ میں بیٹھے ہوئے شعر کہہ رہے ہیں۔ اسی طرح کہیں انشا و مصحفی کے زمانہ کا رنگ بھی خوبی سے جھلکتا ہے، مثلاً

---

[1] قیمت مجلد چار روپیہ اور غیر مجلد تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ۔ دارالتصنیف والتالیف محمود آباد یا محمود آباد ہاؤس قیصر باغ لکھنؤ۔

تحفہ رہِ غربت کا ہوں، داغ کفِ پا ہوں / وہ گل ہوں کہ میں چشم و چراغِ کفِ پا ہوں
جادہ سے الگ خاکِ بیاباں سے ہم آغوش / گم کردۂ منزل کا سراغِ کفِ پا ہوں
تلوؤں سے مرے خون یہ کہتا ہے نکل کر / میں بادۂ سرجوشِ ایاغِ کفِ پا ہوں

اب چند شعر ایسے بھی سن لیجئے۔ جن میں دورِ جدید کا رنگ ہے ؎

دل کو محو لذتِ آزار رہنے دیجئے / خوش رہے جس حال میں بیمار رہنے دیجئے
داد و بیداد کا قصہ ہوا فیصل، یعنی / ہو گیا سب ترے آتے ہی فراموش مجھے
جانبری ہے عشق سے ممکن، موافق ہو جو دل / ہاں مگر آپس میں جھگڑا ہو تو پھر کیونکر بنے
ہٹے یہ آئینہ محفل سے اور تو آکے / کوئی تو ہو جو کبھی دل کے روبرو آئے
موسمِ حسن تو تھا، فصلِ جفا بھی آئی / ساتھ ہی ساتھ جوانی کے ادا بھی آئی
عبرت دہر ہو گیا، جب سے چھپا مزار میں / خیر جگہ تو مل گئی دیدۂ اعتبار میں
ڈال لی عادت کہ خونِ آرزو دیکھا کروں / کم نہ ہوں یوں بھی تمنائیں تو پھر میں کیا کروں
دیارِ دل میں کہیں دوست کا پتہ نہ ملا / وہ بدنصیب ہوں کعبہ میں بھی خدا نہ ملا
بھلا ہے عشق، لیکن ہر بشر قابل نہیں ہوتا / بہت پہلو ہیں ایسے بھی کہ جن میں دل نہیں ہوتا
بھولنے والوں کو بھی یہ مٹنے والا یاد تھا / ہم نہ سمجھے تھے کہ اس قابل دلِ ناشاد تھا
راحتوں میں بھی جنوں کا وہی ساماں ہوتا / پھیلتا بھی دلِ عاشق تو بیاباں ہوتا
دل کو تاکیدِ وفا ہے کہ فنا ہو جانا / درد کو حکمِ قضا ہے کہ دوا ہو جانا

مرزا ثاقب کے کلام کا بیشتر حصہ پرانے لکھنوی رنگ ہی میں ڈوبا ہوا ہے۔ بہت سے شعروں میں قدیم شعرا سے مضمون بھی لڑ گیا ہے۔ جسے توارد کہیے یا ترجمہ۔ چند مثالیں کافی ہوں گی۔ مثلاً ؎

حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا ؎

گفتہ بودم چو بیائی، غمِ دل با تو بگویم / چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی

اسی مضمون کو حضرت میر تقی میر نے اس طرح لکھا ہے۔ مگر لاجواب لکھا ہے ؎

کہتے تھے کہ یوں کہتے، یوں کہتے جو وہ آتا / سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

یہی مضمون مرزا ثاقب نے اس طرح باندھا ہے ؎

بیانِ حال کا نیرنگِ عشق دشمن ہے / ادھر وہ سامنے آئے ادھر گلہ نہ رہا

حضرت خواجہ میر درد نے شعر کہا ہے ؎

می رود ذرہ باز در کوشش		چہ کند اضطرار ہا دارد

اسی کو میر تقی میر نے اِس طرح باندھا ہے ؎

چلا نہ اُٹھ کے وہیں پھر تو بے چپکے میر		ابھی تو اُس کی گلی سے پکار لایا ہوں

مرزا ثاقب فرماتے ہیں ؎

بارہا پلٹا ہوں اُن کے در سے بے نیلِ مرام		جی میں ہے پھر آج قسمت آزمانا چاہیئے

میر مومن کا شعر ہے ؎

شب جو زنداں میں ہوئی تازہ گرفتاروں کو		سر یہ ٹکرائے کہ در کر دیا دیواروں کو

مرزا ثاقب اسی مضمون کو یوں باندھتے ہیں ؎

شب کو زنداں میں مرا سر پھوڑنا اچھا ہوا		آج کچھ کچھ روشنی آنے لگی دیوار سے

مرزا ثاقب کو تاریخ گوئی میں بھی کمال حاصل ہے۔ چنانچہ اس مجموعہ کا تقریباً ایک تہائی حصہ قطعات تاریخ سے مملو ہے۔ جنمیں بعض تاریخوں میں صنائع و بدائع سے بھی کام لیا گیا ہے۔

اگرچہ دُنیا اور اُس کے ساتھ ساتھ اُردو زبان منجھتے منجھتے کہیں سے کہیں پہونچ گئی ہے۔ بہت سی الفاظ اب متروک ہو گئے ہیں۔ بہت سے لفظوں کے پُرانے معنی بدل گئے ہیں مگر مرزا ثاقب انکا استعمال ابھی جائز سمجھتے ہیں۔ اور ہماری رائے میں ہمارے ادیبوں اور شاعروں کو عام طور پر ان معاملات میں آزاد خیالی سے کام لینا چاہیئے۔ بہرحال ہم ذیل میں چند مثالیں درج کرتے ہیں ؎

سپید بال ہوئے، دِل کا داغ جلتا ہے		سحر ہوئی پہ ابھی تک چراغ جلتا ہے

یا

اچھی تھی مرگِ عشق پہ بدنام ہو گیا		میرے ہی سر وفا کا بھی الزام ہو گیا

اب سے دس بیس برس پہلے "تب" کا لفظ "اُس وقت" کے معنی میں استعمال ہوا کرتا تھا۔ مرزا ثاقب اب بھی لکھتے ہیں۔ مثلاً ؎

فسانہ ذبح کا جز خونِ آرزو نہ رہا		چھری گلے پہ چلی تب کہ جب لہو نہ رہا

کوئی تو داد دیتا اِسی دردِ دل کی آخر		جب تم نہ بولتے تھے تب میں کراہتا تھا

"سدا" کا لفظ بھی بمعنی "ہمیشہ" بڑا پیارا لفظ ہے جسے اہلِ زبان حضرات ترک کئے ہوئے ہیں۔ لیکن مرزا صاحب اسے برابر استعمال کرتے ہیں ؎

آئینہ جس میں سدا ڈوب کے ابھرا کیا حسن		ایک ٹھہرا ہوا پانی ہے خود آرائی کا

لکھائی، چھپائی و کاغذ سب لحاظ سے یہ دیوان قابل قدر ہے۔ اس کا حجم ۲۴۴ صفحات ہے۔

معلومات سائنس[1]

ہر صبح کو جو آفتاب طلوع ہوتا ہے وہ دُنیا میں کسی نہ کسی انقلاب کا پیغام لے کر آتا ہے۔ آج سے پچاس برس پہلے گراموفون، ریڈیو، لاسلکی۔ آبدوز کشتیوں، وٹیامین (حیاتین) وغیرہ کا کسی نے نام تک نہ سُنا تھا۔ اب یہ چیزیں ہماری ضروریات زندگی میں داخل ہوگئی ہیں۔ ہر طرف موٹریں چلتی اور سروں پر ہوائی جہاز منڈلاتے ہیں اور یہ سب سائنس کے کرشمے ہیں۔ ایسی صورت میں ہر انسان پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ مروجہ سائنس کی معلومات سے بخوبی بہرہ ور ہو۔ یہ زمانہ سائنس کا ہے۔ کیونکہ سائنس نے ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں دخل حاصل کرلیا ہے۔ مگر سائنس کی کتابیں عموماً غیر ملکی زبانوں میں ہیں۔ جن کے مطالعہ سے ہمارے نوجوان اکثر محروم رہ جاتے ہیں۔ ہم ممنون ہیں مسٹر آفتاب حسن ایم۔ ایس سی، شیخ عبدالحمید بی۔ ایس۔ سی۔ بی۔ ٹی اور چودھری عبدالرشید صاحب تبسم بی۔ اے کے، جنھوں نے بڑی محنت کرکے اُردو میں یہ کتاب تالیف کی ہے۔ جسمیں خوراک وحیاتین، جراثیم، دانت، نباتات، برقی ایجادات، ریڈیم، گراموفون، فلم سازی، دوربین، لاسلکی وغیرہ پر بہت کافی روشنی ڈالی ہے۔ اور زبان اتنی سلیس اور عام فہم استعمال کی گئی ہے کہ کتاب کے مطالعہ سے تھوڑی سی استعداد کا آدمی بھی مستفید ہو سکتا ہے۔ اِس کتاب میں تقریباً بیس ۲۰ موضوعات پر کافی بحث کی گئی ہے اور ڈیڑھ درجن تصویریں بھی دی ہیں۔ جن سے کتاب کی افادی حیثیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ یہ کتاب اسکولوں کے کورس میں رکھے جانے کے قابل ہے۔ زبان میں تذکیر و تانیث کی کہیں کہیں غلطی ہے، مثلاً "کواڑ" کو مونث لکھا گیا۔ "جب توپ چھوٹتی ہے تو اکثر کواڑیں ہلنے لگتی ہیں" اُردو میں کواڑ مذکر ہے۔ اُمید ہے کہ اِس قسم کی خامیاں آیندہ ایڈیشن میں دُور کردی جائیں گی۔

لکھائی چھپائی، کاغذ سب عُمدہ۔ انگریزی وضع کی خوبصورت جلد۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات۔

حالیؔ پانی پتی[2]

یہ اُردو زبان کے مشہور و معروف اہل قلم حضرت خواجہ الطاف حسین حالیؔ پانی پتی کی مختصر سی سوانحعمری ہے۔ جسمیں مسٹر ہری چند اختر ایم۔ اے اور ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ڈی۔ لٹ نے خواجہ صاحب کے مختصر سوانح حیات درج کرکے اُن کے کلام اور تصنیفات پر بھی ایک تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ یہ چھوٹی سی کتاب اگرچہ طلبا راسکول کے لئے لکھی گئی ہے۔ مگر اس کے مطالعہ سے دوسرے حضرات بھی مستفید ہو سکتے ہیں۔ فاضل مؤلفین نے اِس چھوٹی سی کتاب میں مولانا حالیؔ کے متعلق تمام ضروری معلومات یکجا کردی ہیں جو طالب علموں کے لئے خاص طور پر مُفید ہوں گی۔

---

[1] قیمت غالباً ڈیڑھ روپیہ (عہ) ہوگی۔ ملنے کا پتہ:۔ انجمن ترقی اُردو۔ نئی دہلی۔
[2] قیمت غالباً چار آنہ (۴ر)۔ ملنے کا پتہ:۔ آر۔ ایس جوڑا، بی۔ اے، بی ٹی۔ کچہری روڈ۔ لاہور

رفتار زمانہ

سیاسیات جنگ ایک مدت سے یوروپین سیاست کی بساط میں ہٹلر کی شاطرانہ چالیں یکے بعد دیگرے برطانیہ کو مات دی رہی ہیں۔ پچھلے پانچ مہینوں سے برطانیہ اور فرانس برابر اس بات کی کوشش کرتے رہے کہ روس کو اپنے جتھے میں شامل کرلیں۔ مگر اسمیں انھوں نے اسقدر تکلف برتا اور گفتگو اور مراسلات کے سلسلے کو اتنا طول دیا کہ یہ لوگ بحث و مباحثہ ہی میں لگے رہے اور ہٹلر نے روس کے ساتھ پے درپے دو معاہدے (ایک تجارتی اور دوسرا سیاسی) اس صفائی سے کر لئے کہ حریفوں کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔ ان معاہدوں کی اطلاع فرانس، برطانیہ، پولینڈ وغیرہ کے لئے بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہوئی۔ کیونکہ ان کے تحریک کی بھی ان کو خبر نہ تھی۔ اور ہٹلر و اسٹالین کا اتحاد ناممکنات میں شمار ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس خبر نے سارے یوروپ میں تہلکہ ڈالدیا کہ روس اور جرمنی کے درمیان ایک غیر جارحانہ معاہدہ پر فریقین کے دستخط ثبت ہوگئے ہیں۔ برطانیہ کو اس کے بعد بھی کچھ امید باقی رہی کہ اگر وہ روس کو فی الفور اس بات کی رضامندی کی اطلاع دیدے کر کہ پولینڈ، روس کی امداد لینے یعنی اپنے ملک میں روسی فوجوں اور اسلحہ جات کے داخلہ کی اجازت دینے کو تیار ہے تو روس اور جرمنی کے معاہدے کی تکمیل رک جائے گی۔ مگر یہ امید غلط ثابت ہوئی۔ برطانوی اخبارات نے اس معاہدے پر رائے زنی کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اٹلی اس معاہدہ سے کبیدہ خاطر ہوجائے گا جس سے غالباً فرانس اور برطانیہ کو فائدہ پہونچے گا۔ ان کا خیال ہے کہ جس طرح ۱۹۱۴ء میں اٹلی اتحاد ثلاثہ سے علیحدہ ہوکر برطانیہ سے مل گیا تھا۔ آیندہ بھی شاید یہی صورت ظہور پذیر ہو۔ مگر یہ سب قیاس آرائیاں ہیں اور اسوقت وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے۔ بظاہر حالات اٹلی کے فیسسٹ حلقوں میں روس اور جرمنی کے درمیان معاہدہ کا خیر مقدم کیا گیا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ پولینڈ کے ساتھ جرمنی کی آویزش میں اٹلی فی الحال علیحدہ رہنا چاہتا ہے۔ مسولینی کی یہی کوشش ہے کہ ڈینزگ کا معاملہ صلح و صفائی سے طے ہوجائے اور لڑائی کی نوبت نہ آئے۔ کیونکہ لڑائی سے اٹلی کو کوئی فائدہ پہونچنے کی امید نہیں بلکہ الٹا اندیشہ ہے کہ کہیں وہ اپنے افریقی مقبوضات سے ہاتھ نہ دھو بیٹھے۔

اب رہا اسپین کا معاملہ۔ برطانیہ کے اکثر مدبروں کا خیال ہے کہ جنرل فرانکو جنگ یوروپ میں کوئی حصہ نہ لے گا کیونکہ اسے اپنے ملک کی ازسرنو تعمیر کرنا ہے۔ مگر اس کا بھی کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ آخر کس کو

گمان تھا کہ روس و جرمنی کا غیر جارحانہ معاہدہ ہوجائے گا۔ پھر جنرل فرانکو تو جرمنی کا مرہونِ منت اور رفیق کار ہے اُس کا جرمنی کا معاون ہونا بالکل قرین قیاس ہے۔ تازہ کارروائیوں سے بھی یہی ترشح ہورہا ہے کہ جنرل موصوف کی دلی ہمدردی جرمنی ہی کے ساتھ ہے اور ان کے برادر نسبتی Sen or Suner کی تو یہی کوشش ہے کہ وہ اسپین کو روم برلن محور سے وابستہ کردے بہرحال اسوقت وثوق کیساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ اسپین ضرور ہی جنگ میں شریک ہوگا۔ مگر ہٹلر کے حوصلے برابر بڑھ رہے ہیں اور اُس کے مطالبات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ڈینزگ کے الحاق کے علاوہ اب اُس نے دو اور مطالبے کئے ہیں۔ اول یہ کہ پولینڈ کا دریائی راستہ بھی جو جنگ عظیم کے بعد پولینڈ کو سمندر تک پہونچنے کے لئے قائم کیا گیا تھا جرمنی کو دیدیا جائے اور پولینڈ کو ۱۹۱۴ء کی سابقہ حالت پر لایا جائے۔ اس کے ساتھ ہی سیلیشیا کی سپردگی اور پولینڈ کی جرمن اقلیت کے ساتھ بھی مناسب برتاؤ کیا جائے۔ جرمنی نے وزیر اعظم فرانس کو جو جواب لکھا ہے اسمیں یہ بھی دھمکی دیگئی ہے کہ اگر پولینڈ نے جرمنی کی شرائط منظور نہ کیں تو جنگ کا نتیجہ خواہ کچھ ہی ہو، مگر پولینڈ ضرور تباہ ہوجائے گا۔ غرض کچھ بھی ہو، پولینڈ لڑنے پر آمادہ ہے، اور ہٹلر کی اِس رائے سے مرعوب نہیں ہے کہ جنگ میں شکست ہونے پر پولینڈ کا آزاد وجود باقی نہ رہے گا۔

اِس مرتبہ فرانس اور برطانیہ نے بھی مستقل مزاجی و اولوالعزمی سے کام لیا ہے اور پولینڈ کی آزادی برقرار رکھنے کے وعدوں کا بار بار صاف و صریح الفاظ میں اعادہ ہوچکا ہے درحقیقت ان دونوں جمہوری ملکوں نے اب بخوبی سمجھ لیا ہے کہ اگر پولینڈ کے معاملے میں بھی وہ ہٹلر کی دھمکیوں سے دب گئے تو اُنکی رہی سہی ساکھ ختم ہوجائے گی۔ چنانچہ وزیر اعظم برطانیہ مسٹر چیمبرلین جیسے صلح جُو اور صلح پسند مدبر کو بھی بالآخر اپنی پالیسی تبدیل کرنا پڑی۔ اور اُنھوں نے مجبور ہوکر دوسرے ملکوں کو قربان کرکے ہٹلر کے غیظ و غضب کو فرو کرنے کی پالیسی کو یکلخت ترک کردیا۔ برطانیہ ہٹلر کے منصوبوں سے بے خبر نہیں ہے۔ لیکن جہاں روس و جرمنی کے معاہدہ سے اس کو ایک طرف زک ہوئی ہے وہاں دوسری طرف جاپان کو اس اتحاد سے جو صدمہ پہونچا ہے اسکی وجہ سے وہ اب انگریزوں کیساتھ اپنے تعلقات خراب کرنا نہیں چاہتا۔ برطانیہ بھی اسوقت مشرق اقصیٰ میں جاپان سے برسرپیکار نہیں ہونا چاہتا۔ حالانکہ جاپان نے پچھلے دنوں انگریزوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا۔ وہ کسی خوددار قوم کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ خیر۔ برطانیہ مصلحتاً خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اور اب جاپان نے خود ہی اپنا رویّہ ٹھیک کرلیا۔ جس سے انگلستان کو کم سے کم مشرق میں مطمئن رہنا چاہیئے۔

پریسیڈنٹ روزولٹ نے ہٹلر سے کئی مرتبہ اپیل کی اور اس بات کی سچے دل سے کوشش کی کہ ہٹلر صلح و صفائی کے لئے آمادہ ہوجائے مگر اسکا کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا۔ اور ہٹلر نے ڈینزگ کو بلا کسی خیال و لحاظ اپنے حدود میں

شامل کرنے کا اعلان کر دیا۔ ایک سال کے بعد پولینڈ کے سمندری راستے کے معاملے کو اُس نے عام رائے کے مطابق طے کرنیکا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ لیکن نہ پولینڈ نے ان شرائط پر صلح منظور کی، اور نہ برطانیہ اور فرانس ہی نے اِن باتوں کو قابلِ التفات سمجھا۔ ہٹلر اپنی بات پر اڑا رہا اور یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو پولینڈ پر تین طرف سے حملہ کر دیا۔ اسی کے ساتھ اُس نے ڈینزگ کو جرمنی سے ملا کر ہر فورسٹر کو اُس کا صدر مقرر کر دیا۔ اور جرمن ریش نے بھی اِس تمام کارروائی کی تصدیق کر دی۔ ڈینزگ کے جرمن افسران تو پہلے ہی سے ہٹلر سے ملے ہوئے تھے انھیں اس جبری فیصلہ میں کیا انکار ہو سکتا تھا۔ البتہ جن بڑی بڑی سلطنتوں نے پولینڈ اور ڈینزگ کا آئین طے کیا تھا۔ اُن کیلئے یہ زبردستی ناقابل برداشت ہے چنانچہ اس کی علانیہ مخالفت میں اب انگلستان اور فرانس نے جرمنی سے جنگ کا اعلان کر دیا ہے۔

عراق۔ ترکی اور مصر بھی انگلستان کیساتھ ہیں اور برطانیہ کی تمام نوآبادیاں زور و شور سے برطانیہ کی امداد و اعانت پر کمربستہ ہو گئی ہیں۔ البتہ آئرلینڈ نے فی الحال غیر جانبدار رہنے کا ارادہ کیا ہے۔ مگر اُس نے بھی اپنی فوجوں کو جمع ہونے کا حکم دیدیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر لڑائی کچھ دنوں اور قائم رہی اور بظاہر اسباب اس کے جلد ختم ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے، تو آئرلینڈ کو مجبوراً برطانیہ کا ساتھ دینا ہوگا۔

اِس طرح ہندوستان کے لئے بھی اِس وقت انگلستان کا ساتھ دینے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے ہمارے پرجوش و سرگرم لیڈر سبھاش بابو اور اُن کے ہمنوا خواہ کچھ ہی کہیں۔ لیکن ہماری رائے میں جرمنی اور انگلستان کی معرکہ آرائی میں ہم کو اِس بات کو دم بھر بھی سوچنے کی ضرورت نہیں کہ ہم کو کس کی امداد و اعانت کرنا چاہیئے۔ ہٹلر نے جرمنی میں مطلق العنان حکومت کی انتہائی صورت قائم کر کے دُنیا کی جمہوریتوں کو پامال و مغلوب کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ چونکہ ہماری تمام امیدیں جمہوری طرز حکومت کی توسیع و ترقی سے وابستہ ہیں۔ ہم کسی طرح بھی ہٹلر کی فتح کے خواستگار نہیں ہو سکتے۔ انگلستان اپنے معیار سے کتنا ہی کیوں نہ گر جائے لیکن اس کے عوام آزاد اور آزادی پسند ضرور ہیں۔ اور اپنے اصول و عقائد سے کبھی اِس قدر منحرف نہیں ہوئے ہیں، جیسے کہ ہٹلر کے نازی پیرو۔ علاوہ بریں ہٹلر کے قول و فعل کا بھی کوئی اعتبار نہیں۔ آج وہ ایک بات کا بڑے شد و مد سے وعدہ کرتا ہے مگر کل ہی اُسے حرفِ غلط کی طرح بے تکلف و بے تردد مٹا دیتا ہے۔ ہٹلر پر تمام دُنیا پر حاوی ہونے کا نشہ بھی ایسا چھا گیا ہے کہ جب تک اس کا وجود باقی رہے گا۔ دُنیا کو امن و چین نصیب نہ ہوگا۔ اِس لئے ہر بہی خواہ جمہور کو اس جنگ میں انگلستان و فرانس کو امداد دینے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے

مہاتما گاندھی نے اپنی پوزیشن صاف کر دی ہے۔ آپ کو وائسرائے ہند نے شملہ میں تبادلۂ خیالات کے لئے بلایا تھا چنانچہ آپ نے انگلستان و فرانس کے ساتھ اپنی ہمدردی کا علانیہ اظہار کر دیا ہے۔ البتہ آپ نے

وائسرائے سے یہ بھی صاف کہدیا ہے کہ کانگریس سے گورنمنٹ کو کوئی معاملہ کرنا ہو تو وہ اُس کے صدر اور ممبران ورکنگ کمیٹی سے گفتگو کریں۔ خبر ہے کہ ہز ایکسلینسی نے بابو راجندر پرشاد اور دیگر ممبران ورکنگ کمیٹی کو شملہ میں مدعو کیا ہے۔ مسٹر جناح، مسٹر ایمنے اور دیگر لیڈران سے بھی ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔ ۱۱ دسمبر کو وائسرائے ہند اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ کے روبرو تقریر کرنے والے ہیں۔ یہ بھی خبر ہے کہ مدبران انگلستان اسوقت ہندوستان کے حقوق کیساتھ انصاف سے کام لینا چاہتے ہیں۔ بہرحال ہم ہندوستانی اس مصیبت کیوقت انگریزوں سے علیحدہ نہیں رہ سکتے۔ برٹش سلطنت کے دشمن، جمہوریت کے دشمن اور ہمارے ملکی دشمن ہیں اور ہمکو اُن باتوں کے لئے جو زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہیں اسوقت انگریزوں کا ساتھ دینا چاہیئے۔

ہم کو اُمید ہے کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی جو کچھ فیصلہ کرے گی، عام خیالات و عام جذبات کا پورا لحاظ رکھکر کریگی۔ ہم کو اس بات کے کہنے میں مطلق عذر نہیں ہے کہ ہندوستان میں سب طبقوں کی دلی ہمدردی اس لڑائی میں برطانیہ کے ساتھ ہے۔ ملک کے راجہ، مہاراجوں اور بڑے بڑے روسا اور زمینداروں نے اپنی پوری طاقت سے برطانیہ کو امداد دینے کا ارادہ کیا ہے۔ پنجاب کے طرف سے سر سکندر حیات وزیر اعظم نے پورے اشتراک عمل کا اطمینان دلایا ہے۔ اور پنجاب سے فوج کی ساٹھ فی صدی بھرتی ہوتی ہے۔ بنگال بھی برطانیہ کے ساتھ ہے۔ غرض اس وقت کانگریس کے لئے مہاتما گاندھی کی رہنمائی قبول کرنیکے سوا اور کوئی صحیح راستہ نہیں ہے۔

حیدر آباد کی اصلاحات خوشی کی بات ہے کہ حضور نظام کی روشن خیالی کی بدولت آریہ ستیہ گرہ ایجی ٹیشن کا بخیر و خوبی خاتمہ ہو گیا۔ آریوں کی تحریک کامیاب ہوئی اور کل نزاعی معاملات صلح و صفائی کے ساتھ طے ہو گئے۔ نظام گورنمنٹ نے ۸ اگست کو جو سرکاری اعلان شائع کیا ہے اُس نے سابقہ اعلان کی کچھ اس طرح وضاحت کر دی ہے کہ ہندوؤں کی ساری بدگمانیاں دور ہو گئیں اور ستیہ گرہ کے لیڈران نے سرکار دکن کی فراخدلی کا اعتراف کرتے ہوئے ستیہ گرہ کی تحریک کو بند کر دیا ہے۔ گورنمنٹ نظام نے بھی ستیہ گرہ کے قیدیوں کو رہا کر کے اپنی روشن خیالی کا مزید ثبوت دیا۔ حضور نظام اور سر اکبر حیدری جنھوں نے معاملہ فہمی اور بے تعصبی سے کام لے کر اس قضیئے کو رفع کر دیا ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔ جن اصحاب کا خیال ہے کہ یہ اصلاحات ناکافی ہیں۔ اُن کو بھی اس لحاظ سے مطمئن ہو جانا چاہیئے کہ رعایا میں جب ایک مرتبہ بیداری پیدا ہو جاتی ہے اور گورنمنٹ کی طرف سے اس کی کچھ بھی حوصلہ افزائی ہوتی ہے تو پھر ناممکن ہو جاتا ہے کہ آئندہ رعایا کو پوری سیاسی آزادی حاصل نہ ہو جائے۔

آپ بیتی

نالہ را ہر چند میخواہم کہ تنہا میکشم   سینہ میگوید کہ من تنگ آمدم فریاد کن

رنج و مصیبت کے واقعات اور ذاتی حادثات کے تذکرے سے قدردانانِ رسالہ کو مکدر و بے لطف کرنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اس ماہ اگست ۱۹۳۹ء میں میری جو خانہ ویرانی ہوگئی، اُس کی احباب زمانہ کو اطلاع نہ دینا بھی مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ہمدرد ناظرین کو یہ سن کر افسوس ہوگا کہ ۱۴ اگست ۱۹۳۹ء کی علی الصباح اُن کے دیرینہ خادم ایڈیٹر زمانہ کی رفیق زندگی نے جس کی بدولت راقم ارتیس ۳۲ سال سے زائد تمام تفکرات و ترددات خانگی سے آزاد رہا، اپنی جان شیرین جانِ آفرین کے سپرد کردی۔ پندرہ ۱۵ روز کی علالت کے بعد بھی ہم لوگ مایوس نہ تھے لیکن ۱۲ اگست کو جو حالت غیر ہوئی پھر سنبھالے نہ سنبھلی۔ احباب و اعزا نے دوا دوش و خدمتگذاری میں کسر اُٹھا نہ رکھی۔ شہر کے سبھی بڑے بڑے ڈاکٹروں اور ویدوں نے دن رات ایک کردیا۔ مگر مشیتِ ایزدی کے سامنے کسی کی کچھ نہ چلی، اور جانے والی نے جنت کی راہ لی۔ ابھی یہ غم تازہ ہی تھا اور اس خانہ بربادی کی تعزیت کا سلسلہ ختم نہ ہونے پایا تھا کہ سولہ ۱۶ دن کے بعد یعنی ۳۰ اگست کو نو ۹ بجے صبح کے وقت چہیتی بیٹی کماری دلاری بھی جس کی علالت پچھلے تین ۳ ماہ سے تمام خاندان کے لئے فکر و تردد کا باعث ہو رہی تھی، لکھنؤ میڈیکل کالج اسپتال میں ہمیشہ کیلئے داغ مفارقت دیگئی۔

یہ دونوں اندوہناک واقعات اس قدر تیزی سے پے در پے ہوئے ہیں کہ ہم لوگوں کے دل و دماغ کی عجب کیفیت ہوگئی ہے جس کا بیان فضول ہے۔ جانیوالی روحوں کی خوبیاں بیان کرنے کا بھی یہ کوئی موقعہ نہیں ہے۔ لیکن مسز دیانراین کے حسنِ انتظام، سلیقہ مندی، معاملہ فہمی اور گھریلو دور اندیشی کا سرسری ذکر نہ کرنا بھی انتہائی ناشکری ہوگی۔ انھیں کی سلیقہ شعاری اور جفاکشی کی بدولت راقم اتنے دنوں گھر گرہستی کے تمام بکھیڑوں سے آزاد رہ کر ملک کی بری بھلی جو ادبی خدمت ممکن ہوئی، اطمینان اور سیرچشمی انجام دے سکا۔ اخبار نویسوں کی زندگی کچھ بہت خوشگوار نہیں ہوتی خصوصاً ہندوستانی اخبار نویسوں کو تو معمولی آرام و آسائش کے موقعے بھی نصیب نہیں ہوتے اور خود دار اردو اخبار نویس کو تو ہمیشہ خاص مشکلات کا سامنا رہتا ہے جس کا صحیح اندازہ بہت کم لوگوں کو ہوگا۔ مگر مرحومہ کی حسنِ لیاقت اور تندہی کی بدولت میری زندگی بے فکری و آسودہ حالی میں بسر ہوئی ہے انہیں کے ایثار و جفاکشی کی وجہ سے مجھے اپنے محدود ذرائع کے باوجود ابتک وہ اطمینانِ قلب

حاصل رہا جس سے زیادہ وسیع سے وسیع ذرائع والے شخص کو بھی مشکل ہی سے نصیب ہوا ہوگا اور اگر مصائب و مشکلات میں بھی میری ہمت قائم رہی تو اس کا اصلی کریڈیٹ اسی نیک بخت خاتون کو ملنا چاہیئے۔ جس نے میرے کنبے کی پرورش و تربیت کا بار اس قابلیت و جفاکشی کے ساتھ اپنے ذمہ لے رکھا تھا جس نے شروع سے آخر تک اپنی زندگی کے پچاس سال فرض شناسی، خدمتگذاری اور دوسروں کی دلجوئی میں بحسن و خوبی بسر کردیئے جو جیتے جی دوسروں کے لئے مرتی رہی اور جس کی مرتے وقت بھی یہی خواہش تھی کہ ایشور اُس کی بیٹی کے بدلے اُس کی جان کا نذرانہ قبول کریں۔ مگر بھگوان کو یہ منظور نہ تھا اور صرف سولہ دن کے بعد اسکی نیک نہاد و نیک سیرت بیٹی بھی اپنی پیاری ماں سے جا ملی۔ یہ فرشتہ خصلت لڑکی نہ صرف اپنے والدین اور بھائی بہنوں ہی کی محبوب تھی بلکہ اس نے نوعمری ہی میں اپنے سلیقہ، فہم و فراست و نیک بختی سے خاندان کے ہر چھوٹے بڑے شخص کے دل میں ایک خاص جگہ پیدا کرلی تھی۔ ڈھائی ہفتے کے اندر یکے بعد دیگرے ان دونوں حادثات عظیم کی بدولت تمام اعزا و اقربا پر رنج و غم کا جو پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے اُس کا اٹھانا کوئی آسان کام نہیں ہے لیکن مشیت خداوندی اٹل ہے اور ہمارے لئے گردن تسلیم خم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں۔ ایشور اُن دونوں پاک روحوں کو غریق رحمت کرے اور ہم لوگوں کو ان صدمات عظیم کے برداشت کرنے کی قوت عطا فرمائے۔

مرحومہ نے پانچ لڑکے اور چار لڑکیاں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں سب سے بڑا لڑکا سری نراین نگم، ایم۔ اے، ایل ایل بی ایڈوکیٹ (کانپور) ہے۔ دوسرا لڑکا بشن نراین نگم ایم۔ اے ایل ایل بی آئی۔ سی۔ ایس، آجکل ڈسٹرکٹ و سشن جج فتحگڈھ ہے۔ تیسرا شیام نراین نگم، ایم۔ اے، بی۔ سی۔ ایس ڈپٹی کلکٹر گورکھپور ہے۔ چوتھا بیٹا براج نراین نگم، ایم۔ ایس سی، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس اٹیہ ہے۔ پانچواں جس کی عمر دس سال ہے زیر تعلیم ہے۔ تین بیٹیاں بیاہ گئی ہیں۔ ایک چھوٹی لڑکی ابھی زیر تعلیم ہے۔

انھیں حادثوں کی وجہ سے اس ماہ کے پرچے کی اشاعت میں کسیقدر تاخیر ہوئی۔ ناظرین معاف فرمائیں۔

"شام کا سناٹا"

اس مرتبہ سرورق زمانہ کے ساتھ جو رنگین تصویر ہدیۂ ناظرین ہے اسمیں چابکدست مصور نے شام کے سناٹے کا دلگداز سماں دکھانے کی کوشش ہے۔ غروب آفتاب کے وقت فضائے آسمانی پر جو کیفیت چھاجاتی ہے۔ اُس کا نظارہ پر لطف و سبق آموز ہونے کے علاوہ کتنا عبرت انگیز ہوتا ہے۔ اس کا حال کسی حسرت زدہ دل سے پوچھیئے۔

زمانہ

جلد ۷۳ — ستمبر ۱۹۳۹ء — نمبر ۳

ادیب[۱] کی آرزو

(ایک غیر ادیب کے قلم سے)

پیارے جمال!

تمھیں سخت شکایت ہے کہ میں طویل اور دلچسپ خط نہیں لکھا کرتا، دو چار لفظوں میں اپنی حالت لکھ کر بھیجدیتا ہوں۔ اور اس سے تمھیں اُلجھن اور تکلیف ہوتی ہے۔ اس تکلیف کے لئے میں تم سے معافی چاہتا ہوں، لیکن کتنی بار؟ تم بھی معاف کرتے کرتے تھک جاؤ گے۔ یہ تو ہمیشہ ہی ہوتا رہیگا۔ تم مجھ سے ایسا "دلچسپ" خط چاہتے ہو جسے تم "بار بار" اور "لطف لے کر" پڑھ سکو۔ اور میرے دماغ میں کوئی ایسی بات محفوظ نہیں جو لکھ بھیجوں تم پڑھو اور خوش ہو جاؤ۔ جمال! اس خط میں تم نے مجھے چھیڑنے کی کوشش کی ہے، تم نے "ادیب کی آرزو" پر بحث چھیڑی ہے، اور تمھاری فرمایش ہے کہ میں بھی اپنی رائے ظاہر کروں۔ ایک تو میں کوئی ادیب نہیں، جس کا مجھے پورا پورا احساس ہے۔ کوئی شخص دو چار ٹیڑھی میڑھی سطریں لکھ کر ادیب نہیں بن سکتا۔ خدا کے لئے ادیب بننا آتنا آسان نہ سمجھو، یہ بحث تم کسی لائق آدمی سے چھیڑتے تو بہتر ہوتا۔ بہر حال تم میری رائے جاننا چاہتے ہو تو سُنو،

مجھے ایک دقت کا احساس ہو رہا ہے، شاید میں تمھیں اپنا خیال پورے طور پر نہ سمجھا سکوں۔ وہ دقت یہ ہے کہ ادب کے متعلق تمھارا نظریہ وہی ہے جو آج سے کم و بیش پچاس سال پہلے تھا، اور میرا خیال — میرا خیال ابھی

۱؎ اس عنوان سے "ایک ادیب" کا لکھا ہوا ایک غور طلب مضمون زمانہ بابتہ جنوری ۱۹۳۹ء میں شایع ہوا تھا جس کا جواب ایک دوسرے ادیب نے لکھا جو زمانہ اپریل ۱۹۳۹ء میں ہدیۂ ناظرین ہوا۔ اب ایک اور صاحب الرائے نوجوان ادیب نے اس مضمون میں اصل مضمون کے اہم نکات پر اظہار خیالات فرمایا ہے۔ (ایڈیٹر)

تک ایک سہانے خواب سے زیادہ معنی نہیں رکھتا۔ اسے تم خود بھی جانتے ہو، تم کم وبیش مجھ پر وہی الزام لگاتے ہو جو میں بیشتر برس پہلے کے ادیبوں پر عائد کرتا ہوں۔

بہرحال میرا ذاتی خیال ہے (کوئی ضروری نہیں کہ تم اسے آخری فیصلہ سمجھ لو) لیکن میرا خیال ہے کہ ایک ادیب کی آرزو صرف یہ ہو سکتی ہے کہ اس کا ادب زندہ جاوید ہو۔ خواہ وہ ادیب کسی نظریہ کا قائل نہ ہو۔ "ادب برائے ادب" کا قائل ہو یا "ادب برائے زندگی" کا۔ ہر ادیب کی یہی آرزو ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ساری آرزوئیں شخصی اور انفرادی حیثیت رکھتی ہیں۔ جو ایک دوسرے سے مختلف یا ملتی جلتی ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ آرزوئیں حالات یا رجحانات کی پیداوار ہیں۔ اور امکانات، خاص حالتوں میں انھیں پورا کرتے ہیں۔ "امکانات" کا لفظ میں نے ذرا مبہم انداز میں لکھ دیا ہے جس پر ایک بحث الگ کھڑی ہو سکتی ہے، لیکن میں اس وقت اس بحث میں نہ پڑونگا۔

ہاں، تو میں نے یہ کہا تھا کہ کسی کی آرزو، حالات اور رجحانات کی پیداوار ہوتی ہے۔ حالات کی پیداوار تو یہ ہے کہ کوئی شخص بھوکا ہے، اُس کی آرزو صرف یہ ہے کہ اُسے روٹی مل جائے، اُس وقت اُسے کوئی آرزو نہیں ہوتی۔ بادشاہی کی آرزو بھی اگر اُس کے دل میں پیدا ہوگی، تو صرف اس لئے کہ بادشاہی میں اُسے دونوں وقت آرام سے روٹی ملنے کا یقین ہو جائے گا۔ لیکن اس کے برعکس جس شخص کی روٹی کا مستقل انتظام موجود ہو، اُسے پیٹ بھر کھانا ملنے کی آرزو کبھی نہیں ستاتی، بلکہ یہ خیال بھی اُس کے دماغ میں نہیں آسکتا۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان بڑا ہی بلند حوصلہ یا حریص واقع ہوا ہے۔ اُس کی آرزو سدا بدلتی رہتی ہے۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ انسان کی آرزو حالات یا رجحانات کی پیداوار ہوتی ہے، اور حالات یا رجحانات کے بدلتے ہی بدل جاتی ہے۔ مثلاً ایک بھکاری کو دیکھو، وہ تمھارے سامنے ہاتھ پھیلائے آتا ہے اُس وقت اُس کی آرزو صرف یہ ہوتی ہے کہ تم اُسے ایک پیسہ دیدو۔ وہ اس کے پالینے کے بعد ہی آگے بڑھ جاتا ہے۔ لیکن تم اُسے ایک پیسہ کے بدلے میں ایک روپیہ دیدو، پھر وہ ایک پیسہ کی آرزو لے کر تمھارے سامنے کبھی نہ آئے گا۔ کچھ دنوں کے بعد تم اُسی فقیر کو دیکھو، اگر اُس نے بھیک مانگ مانگ کر کچھ روپے جمع کرلئے ہیں، تو اُس کی آرزو رقم بڑھانے کی ہوگی، اگر اُس نے ہزار روپئے جمع کرلئے، تو وہ تم سے ایک پیسہ یا ایک روپیہ مانگ کر گزارہ کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ اُس کی آرزو اس رقم کو بڑھانے کی ہوتی ہے۔ اگر وہ بھکاری سے چھوٹا موٹا بیوپاری بن گیا تو پھر بھیک مانگ کر وہ کسی رقم کا اضافہ کرنا بھی پسند نہ کرے گا، اور آرزو کرنا تو بہت بڑی بات ہے۔ یہ حالات کے مطابق آرزو کی پیدائش کی مثال ہے۔

میں کہہ چکا ہوں کہ آرزو "رجحانات" کے مطابق پیدا ہوتی ہے۔ جانتے ہو، میں نے عجیب عجیب لوگوں

کو دیکھا ہے، آج ملک میں ہر طرف "کسان سبھائیں" اور "مزدور سبھائیں" قائم ہیں۔ اِن کے مقابلے میں زمینداروں اور مِل مالکوں کی انجمنیں بھی ہیں۔ اِن زمیندار سبھاؤں میں میں نے ایسے لوگوں کو سرگرمی سے حصّہ لیتے دیکھا ہے جن کی ٹکے کی بھی زمینداری نہیں۔ انھوں نے مجھے بتایا ہے کہ اُن کی دلی آرزو یہ ہے کہ "کسان سبھاؤں" کی طاقت کا ناش ہو۔ حالانکہ اس آرزو سے نہ آج انھیں کوئی فائدہ پہونچ رہا ہے اور نہ کل پہونچنے کی اُمید ہے۔

ٹھیک اس کے برعکس تمھیں "کسان سبھاؤں" اور "مزدور سبھاؤں" میں بہت سے زمینداروں اور سرمایہ داروں کے لڑکے ملیں گے۔ وہ جانتے ہیں کہ اِن سبھاؤں کی طاقت بڑھانے میں خود اُن کا نقصان ہے مگر وہ باز نہیں آتے۔ اِس لئے کہ اُن کی آرزو یہی ہوتی ہے۔ ہاں اس بحث سے تم نے اتنا نتیجہ تو ضرور ہی نکال لیا ہوگا کہ "ہر آرزو" کی بُنیاد میں کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔

ٹھیک یہی حالت ایک ادیب کی ہوتی ہے۔ وہ بھی آدمی ہوتا ہے اور وہ بھی حالات سے متاثر ہوتا ہے رُجحانات اُسے بھی کسی بہاؤ پر لگا دیتے ہیں۔ تم شاید یہ کہو کہ انسان خود حالات کی پیداوار ہوتا ہے اور اُسکے رجحانات بھی۔ لیکن میں اس کا بہت زیادہ قائل نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ حالات انسان پر اثر کریں، لیکن انسان کے رُجحانات حالات کے ہرگز پیداوار نہیں، بلکہ انسان کے رُجحانات کا خالق، اُس کی "داخلی حرکت" (Inner urge) ہے۔ اگر کسی شخص میں کوئی "داخلی حرکت" پیدا نہیں ہوتی تو یقین کرو اس کا کوئی خاص رُجحان نہیں ہوسکتا۔

مَیں محسوس کر رہا ہوں کہ بحث خواہ مخواہ بڑھ گئی، اسے میں نے ہی بڑھا دیا ہے، مگر ڈرتا ہوں کہ شیطان کی آنت نہ بن جائے، اس لئے اب تمھارے خط کی طرف مڑنا ضروری ہوگیا ہے۔ ادب کی بحث میں تم نے لینن اور اسٹالن کو مفت ہی میں شریک کر لیا۔ لینن انقلابی تھا' اور بہت بڑا انقلابی، لیکن انقلاب کی آرزو جو اُس کے دل میں خون کی لہروں کے ساتھ دوڑ رہی تھی بے مقصد نہ تھی۔ اوپر کہہ چکا ہوں کہ کوئی آرزو بے مقصد نہیں ہوسکتی، شرط یہ ہے کہ یہ ذی عقل آدمی کی آرزو ہو، دیوانے کی نہیں۔ لینن کی آرزوئے انقلاب اس لئے تھی کہ وہ روسی عوام کو دُکھ درد بھری زندگی سے نکالنا چاہتا تھا۔ وہ عوام کی ضرورتوں کو جاننے کے علاوہ محسوس بھی کرتا تھا۔ جاننے اور محسوس کرنے کو مَیں نے الگ الگ لکھا ہے، کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ جاننے اور محسوس کرنے میں بہت بڑا فرق ہے۔ تم کسی غریب اور مجبور کی تکلیفوں کو جان سکتے ہو لیکن محسوس نہیں کر سکتے۔ لیکن لینن محسوس بھی کرتا تھا، اگر تم بھی محسوس کرو تو یقین ہے کہ اُسی طرح اُن کی تکلیفوں کو رفع کرنے پر آمادہ ہو جاؤ۔

لینن کے تذکرہ سے ایک بات اور بھی صاف ہو جاتی ہے۔ میں نے پہلے لکھا ہے کہ حالات انسان پر اثر انداز ہو سکتے ہیں، لیکن انسان حالات کی پیداوار نہیں ہوتا۔ اور رُجحانات بھی اُس وقت تک پیدا نہیں ہوتے

جب تک اس کی "داخلی حرکت" (Inner drive) کام نہ کرے۔ اگر انسان حالات کی پیداوار ہوتا تو لینن کے تمام ہمعصروں کو اُسی جیسا ہونا چاہیئے تھا۔ اگر رُجحانات حالات کی پیداوار ہوتے تو کم سے کم سب کے رجحانات بھی لینن ہی جیسے ہوتے۔ لیکن روسی انقلاب کی تاریخ لینن کے مقابلے میں بڑے بڑے رجعت پسندوں کو بھی پیش کرتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ آرزو بے مقصد نہیں ہوتی۔ لینن نے انقلاب کی آرزو کی، اُس انقلاب کو پیدا کرنے کے لئے مصیبتیں جھیلیں، اور انقلاب پیدا کرکے چھوڑا۔ کیونکہ صدیوں کے کچلے ہوئے عوام کا ایک ہی علاج تھا۔ انقلاب کے بعد اُس نے سوشلسٹ حکومت قائم کی۔ اس کے بعد اُس کی آرزو بدل گئی، یعنی انقلاب کی آرزو نہ رہی۔ اگر صرف انقلاب پیدا کرنا اُس کی آرزو ہوتی، تو پھر دوسرے انقلاب کے لئے وہ سرگرمی کے ساتھ کوشش کرتا۔ لیکن انقلاب کے بعد وہ سوشلسٹ حکومت کو مضبوط بنانے میں سرگرم کار ہو گیا۔ اگر اس کا پیدا کردہ انقلاب بے مقصد ہوتا تو پھر یقینی دوسرا انقلاب بھی وہ کرکے رہتا، یا کم سے کم اس کی کوشش تو ضرور ہی کرتا۔ لیکن کیا تم سمجھتے ہو کہ یہی لینن چودھویں صدی میں پیدا ہوتا تو کیا اتنا بڑا انقلابی ہوتا۔ ہرگز نہیں، میں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اس داخلی حرکت (Inner drive) کی موجودگی میں وہ کسی طرح چپ نہیں بیٹھ سکتا تھا، یقینی کوئی عظیم الشان سلطنت کا بانی ہوتا۔ اور ہم دنیا کی تاریخ میں لینن کو سکندر، نپولین کی صف میں عظیم الشان اور عظیم المرتبت شاہنشاہ دیکھتے۔

تم نے دو چار شاعر اور ادیب کے نام لکھے ہیں، اور اُن کی کچھ چیزیں پیش کرکے اُن کی آرزو کا پتہ ڈھونڈنا چاہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ خدا کے لئے ایسی غلطی نہ کرو، ہندوستانی شاعر اور ادیب اب بھی لفظوں کا طلسم خانہ بنانے کے عادی ہیں۔ جس شاعر کو تم سب سے بڑا انقلابی سمجھ رہے ہو۔ میرا خیال اُس کے متعلق تم سے مختلف ہے نہ تو میر صاحب "گُل گُل" کے مرنا چاہتے تھے، اور نہ تمہارا شاعر جس کی انقلاب خواہی سے تم گھبرا رہے ہو "آگ کے شعلوں" اور تلوار کی جھنکار" سے کھیلنا چاہتا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ "شعلوں" کے تصور سے بھی وہ کانپ اٹھتا ہوگا۔ خیر کہنا صرف یہ ہے کہ انقلاب پسندی اور انقلاب خواہی کو اتنی سستی چیز نہ بناؤ۔ ہمارے ملک میں یہ چیز کافی سستے داموں پر بک چکی ہے، اب ذرا اس کی قیمت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ باقی رہا تمھارا ڈر ـــ سو میں جانتا ہوں، تم ہر نئی اور تیز چیز سے ڈرنے کے عادی ہو، اور رہو گے۔

جمال! ادب میں انقلاب، صرف دو چار دہکتے ہوئے شعروں اور مزدوروں کسانوں کی کہانیوں سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ ابھی ادب میں انقلاب پیدا ہونے میں دیر ہے۔ ہمارے ادیبوں کا کوئی صحیح "تصورِ حیات" ہی نہیں، تم کس چیز سے ڈر رہے ہو؟ ڈر۔ تیغ؟ "عریانی" سے، کھلے بند عاشقی سے۔ ارے یہ تو تمہارے الف لیلہ اور گُل بکاؤلی میں موجود ہے۔ کیا تم تلواروں کی جھنکار سے ڈرتے ہو؟ لیکن کیا یہ چیزیں داستان امیر حمزہ منظوم

اور جنگنا مہ امام حنیفہ میں نہیں ہیں؟ لڑنا مرنا — یہ تو تم برابر ہی پڑھتے آئے ہو۔ تمھارے فصیح الملک داغ کا نازک معشوق بھی تلوار رکھتا ہے اور بڑا ہی ظالم ہے، قتل کئے بغیر مانتا ہی نہیں، اُس کو قتل کرنے میں مزا بھی آتا ہے حالانکہ قتل کا مقصد بھی اُسے معلوم نہیں، اور اُس کا مقصد صرف تمھیں قتل کرنا ہے۔ —— کیا زندگی کا کوئی صحیح تصور رکھے بغیر انقلاب کی دعوت دینا، نوجوانوں کو "داغ کا معشوق" بنانا نہیں؟

ہاں کچھ لوگ ایسے بھی ضرور ہیں جو زندگی کا ایک صاف تصور رکھتے ہیں اور وہ انقلاب کو دعوت بھی دے رہے ہیں، لیکن تم نے ابھی اُن کو پہچانا ہی نہیں، اور شاید دیر ہی میں پہچان سکو گے۔

"زندگی کا تصور" بار بار دُہرا چکا ہوں، شاید تم گھبرا جاؤ، میں سچ کہتا ہوں کہ زندگی کا کوئی صحیح اور صاف تصور ہمارے دماغوں میں نہیں ہے۔ ہم ہندوستانی ابھی بہت چھوٹے چھوٹے مسئلوں میں اُلجھے ہوئے ہیں جن کی گتھی کو ہمارے بڑے بڑے دماغ ابھی تک نہیں سُلجھا سکے ہیں۔ تم اپنی موجودہ سیاست پر ذرا نظر ڈالو صاف معلوم ہو جائیگا کہ اِن چھوٹے چھوٹے مسئلوں میں وہ بڑے بڑے دماغ اُلجھے ہوئے ہیں، جن کی برتری کی دنیا قائل ہے۔

اور آگے چلو تو معلوم ہو گا کہ ہر جگہ یہ عیب موجود ہے۔ کچھ مخصوص لوگوں کے علاوہ تم جماعتی حیثیت سے اس کو مفقود پاؤ گے۔

اب اصل بحث رہ جاتی ہے۔ یعنی ادیب کی آرزو، اس کے بارے میں میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں، اس کو ختم ہی سمجھو —— لیکن تم نے میری آرزو کو پوچھا ہے؟ عزیز دوست! میں کہہ چکا ہوں کہ میری آرزوئیں سُہانے خواب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں، میں اپنی آرزو بتانے کے لئے ذرا وقت لونگا۔ میں تمھارے سامنے ایک تصویر رکھنا چاہتا ہوں۔

دیہاتوں میں کسان بھوکوں مر رہے ہیں، ہر سال مہاجن کا سود بڑھتا جا رہا ہے۔ سال میں جو کچھ پیدا کرتے ہیں، مہاجن کو سود میں دیدیتے ہیں، اور پھر بھی اصل باقی رہ جاتا ہے۔ مہاجن روپئے بڑھاتا جاتا ہے اور جو روپئے گھر میں رہتے ہیں، وہ کسی گھڑے میں بند کر کے کسی کونے میں دفن کر دیئے جاتے ہیں۔ مزدوروں کو ہمیشہ تخفیف کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ پھر سرمایہ دار بھی اقتصادی بدحالی میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ کارخانہ بند کر کے کسی پہاڑی کوٹھی پر زندگی گزارنے لگتا ہے۔ مزدور روٹی کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ہمارے ملک کے ڈاکٹر بڑی بڑی فیسیں لیکر اپنی جیبیں بھر رہے ہیں۔ لیکن دوسری طرف غریب مریض کراہتے ہوئے ہسپتالوں کو جاتے ہیں اور کراہتے ہوئے واپس چلے آتے ہیں۔ ایک مزدور نہیں جانتا کہ صبح اُٹھکر اُسے کوئی کام ملے گا یا نہیں۔ ایک کسان نہیں جانتا کہ کل اُس کا کھیت اس کے قبضے میں رہیگا یا نہیں۔ ایک آرٹسٹ نہیں جانتا کہ اس کا پیش کردہ

آرٹ سراہا جائیگا یا نہیں۔ ایک صناع نہیں جانتا کہ بازار میں آکر اس کی صنعت کا کیا حشر ہوگا۔ ایک ادیب نہیں جانتا کہ اُس کے کارناموں کا انجام کیا ہوگا۔ دوسری طرف عیش وعشرت اور شادمانی ہیں"۔

یہ ہے ایک جھلک اُس تصویر کی جو میں تمھیں دکھانا چاہتا تھا۔ سمجھتا ہوں کہ اب تم خود ایک نظر ڈال کر پوری تصویر، اپنی قومی زندگی کی تصویر کو دیکھ لوگے۔

جمال! میں ذاتی طور پر ـــــ چاہتا ہوں کہ یہ بدرونق تصویر باقی نہ رہے۔ اس کے بدلے ہماری قومی زندگی میں ہنستی خوشی، نغمے اور ساز، مسرت اور کامرانی ہو۔

اس لئے میں ایک سماجی انقلاب چاہتا ہوں، اور ادب کو اس انقلاب کا آلۂ کار بنانا!

تمھارا

ارشد

تیس سال پہلے

زمانہ بابتہ ستمبر ۱۹۰۹ء میں شہنشاہ اکبر پر ایڈیٹر رسالہ کا لکھا ہوا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کا اقتباس ناظرین زمانہ کی دلچسپی کیلئے درج ذیل ہے:-

"دلوں کی تسخیر مشکل بات ہے، ایسی مشکل کہ سخت سے سخت مہم بھی اسکے آگے کچھ حقیقت نہیں رکھتی، اور اسی وجہ سے اُسے صحیح اکبر کا معزز خطاب ملا گیا ہے۔ دنیا کی تمام فتوحات عارضی ہیں اور یہ دیرپا۔ اکبر کی یلغاروں اور کشورکشائیوں کا محاصرہ اور اُسکی شان وشوکت بلکہ عظیم الشان سلطنت کا آج نام ونشان بھی باقی نہیں۔ کہاں ہیں وہ ریاستیں جنکے مغرور سرداروں کو اُس نے اپنی تلوار اور جاں نثاروں کے بل پر ایک مرتبہ نیچا دکھادیا تھا۔ کہاں ہیں وہ صوبے جنھیں اُس نے اپنے زیر حکومت اور زیر اقتدار کر لیا تھا۔ انھیں پر کیا منحصر ہے؟ تمام شاہان سلف کی فتوحات کا کہیں نام ونشان بھی باقی نہیں ہے لیکن اکبر نے جس طرح اور جس قدر دلوں کو مسخر کرلیا تھا اُسکے فسانے آج بھی ویسے ہی دلکش اور زندہ جاوید ہیں اور عالم کے دلوں پر اس وقت بھی اُسکی حکومت اُسی طرح قائم ہے۔

آخر وہ کیا بات تھی کہ برسوں کی کھوٹ دور ہوگئی، باہمی رشک اور قومی عناد دلی نفرت اور مذہبی تعصب یک لخت مٹ گئے اور ہندو مسلم شیر اسلام کا معاملہ ہوگیا۔ جو اکبر کے جوہر ذاتی تھے جن اوصاف کا وہ مالک تھا وہ ایک ذات واحد میں کم جمع ہوتے ہیں نیکی میں نیک نیتی میں دلاوری میں۔ جوانمردی میں شان وشکوہ میں رعب وداب میں۔ رحم والضاف بے تعصبی اور فراخدلی فیاضی اور علم دوستی اور رعایا پروری میں اکبر کا پایہ بہت اعلیٰ ہے۔ یوں تو دلی اور دماغی دونوں قسم کی بہترین قابلیتیں اس کی ذات میں موجود تھیں۔ مگر دل کو دماغ پر فوقیت تھی۔ دماغی قابلیتوں میں بیرونی مدد مل سکتی ہے لیکن دلی نقص کی کوئی تلافی ممکن نہیں۔

دو شامیں

(از جناب احسان بن دانش)

اک شام تھی وہ بھی کبھی آغوشِ نظر میں
طوفان تھا جلوؤں کا مرے قلب و جگر میں

خوشبو سے تری مست تھیں شاداب فضائیں
کلیوں کو تھپکتی تھیں فسوں کار ہوائیں

پھولی تھی شفق یوں کہ تجھے شمع دکھائے
رنگین ضیائیں ترے رستے میں بچھائے

چھائی تھی چمن پر تری گلبار جوانی
آئینہ دکھاتا تھا جھلکتا ہوا پانی

سبزہ ترے ہنس ہنس کے قدم چوم رہا تھا
مہکے ہوئے جھونکوں سے چمن جھوم رہا تھا

ادراک کے قانون پہ چلتا تھا دھندلکا
بچ کر تری راہوں سے نکلتا تھا دھندلکا

چلتی تھیں ہوائیں ترے دامن کو سنبھالے
تختہ کوئی کلیوں کا نہ جھرمٹ میں بٹھالے

اس پاک تمنا میں کہ تو روند کے جائے
ہر گام پہ بیتاب تھے مہکے ہوئے سائے

کلیاں تھیں ترے سامنے شرمائی ہوئی سی
خوشبو کو بسیروں میں تھی نیند آئی ہوئی سی

اس ناز سے پڑتی تھی ملاحت کی پھواریں
بوجھل سی ہوئی جاتی تھیں پلکوں کی قطاریں

خم تھیں ترے قدموں پہ شعاعوں کی جبینیں
آتی تھیں فلک سے مری نظموں کی زمینیں

عفت کے نشے میں تری لغزیدہ خرامی
شاعر سے لکھا کر ہی رہی خطِ غلامی

ہے آج بھی سورج تو اسی طرح ضیا بار
لیکن مری آنکھوں میں ہے نظارہ بیمار

تو جب سے نہیں ہے یہ مرا حال ہوا ہے
جو چیز نگاہوں میں ہے محروم ادا ہے

مرجھائی سی جاتی ہیں ضیا بار فضائیں
شبنم سے ہیں سیلی ہوئی افسردہ ہوائیں

دھندلے ہیں چمن زنگیِ فطرت کے نظارے
آتے نہیں گردوں کے دریچوں میں ستارے

کملائے ہوئے پھول ہیں روکے ہوئے آنسو
لپٹی ہوئی کانٹوں سے ہے سہمی ہوئی خوشبو

سبزے پہ دبے پاؤں مچلتا ہے اندھیرا
فطرت کے مساموں سے نکلتا ہے اندھیرا

ہیں سایۂ اشجار میں ہانپے ہوئے نغمے
جھینپے ہوئے، سمٹے ہوئے، کانپے ہوئے نغمے

نوخیز دھندلکوں سے جو بے نور ہیں راہیں
آنکھوں سے نکلتی ہوئی ڈرتی ہیں نگاہیں

سُرخی میں سیاہی سی فلک گھول رہا ہے
جو رنگ ہے پرواز کو پَر تول رہا ہے

ہر لحظہ فضا درہم و برہم ارے توبہ
عالم یہ یہ اک نزع کا عالم ارے توبہ

اِک بار پھر اِس خلوتِ خاموش میں آجا
آغوش میں آجا، مری آغوش میں آجا!

مرگِ ناگہاں

(از منشی جگدیش سہائے سکسینہ، بی۔اے۔ ایل ایل بی)

یہ درد انگیز اشعار اُن ناگہانی حادثات کی ہمدردی میں موصول ہوئے ہیں جو ایڈیٹر زمانہ کو پچھلے ماہ برداشت کرنا پڑے جون گذشتہ میں سکسینہ صاحب کے خاندان میں بھی اسی قسم کے افسوسناک واقعات ہوئے ہیں، اسی لئے ان اشعار کا حرف حرف رنج وغم میں اس قدر ڈوبا ہوا ہے۔ (آر ز)

غم مرگِ ناگہاں کا بھلایا نہ جائے گا
بارِ الم یہ دل سے اُٹھایا نہ جائے گا

کیا پوچھتے ہو بزم میں شورِ عزا ہے کیوں
جاں سوز ہے یہ قصہ سُنایا نہ جائے گا

ہم یہ سمجھ کے خوش تھے کہ دورِ بہار میں
دل شاد کر کے ہم کو رُلایا نہ جائے گا

سمجھے تھے ہم کہ وہ تنِ سیمیں، وہ روئے خوب
شعلوں سے بے محابا جلایا نہ جائے گا

وہ نوگلِ شگفتہ کہ جانِ بہار تھا
یوں خاک میں خزاں سے مِلایا نہ جائے گا

وہ نقشِ دلنشیں کہ بہشتِ نظارہ تھا
نیرنگیٔ فلک سے مٹایا نہ جائے گا

کہتا تھا جس کا حسن کہ خاکی نہیں ہوں میں
ہم سے وہ زیرِ خاک ملایا نہ جائے گا

حضرت عروج لکھنوی

(از سید مسعود حسن رضوی ادیب، ایم ۔ اے، صدر شعبۂ فارسی و اردو لکھنؤ یونیورسٹی)

میر انیس کے پوتے اور میر نفیس کے بیٹے سید خورشید حسن صاحب عرف دولھا صاحب عروج غدر کے چند سال بعد لکھنؤ کے محلے راجہ کی بازار میں پیدا ہوئے۔ مولوی میر نیاز حسین صاحب سے فارسی پڑھی اور اپنے والد میر نفیس صاحب سے عربی اور عروض۔ آپ کی علمی استعداد بہت معمولی تھی، مگر گھر میں ہر وقت علمی چرچے تھے زبان کی درستی اور محاورات کی صحت کا خیال خمیر میں شامل تھا، شاعری کئی پشتوں سے ہوتی چلی آتی تھی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی آبائی ہنر تھے۔ غرض کہ تعلیم کی کمی وراثت اور ماحول نے پوری کر دی تھی۔ چنانچہ آپ کے کلام سے کم علمی کا اظہار نہیں ہوتا۔ اگر کہیں کہیں کوئی غلطی نظر آئے تو اُسے بشریت کا مقتضا سمجھنا چاہیئے، جس سے بڑے بڑے اہل علم بھی محفوظ نہیں رہ سکتے۔

میر نفیس کے یہاں بارہ اولادیں ہوئیں جن میں سے صرف دو بیٹیاں زندہ رہیں۔ میر نفیس کو بیٹے کی فطرتاً بڑی تمنا تھی کہ اِس خانوادۂ کمال کا نام روشن رہے۔ آخر اُن کی یہ تمنا پوری ہوئی، اور اُن کی آخری اولاد یعنی دولھا صاحب عروج نہ صرف زندہ رہے بلکہ آبائی کمالات میں اپنے بزرگوں کے صحیح جانشین ثابت ہوئے اور ایک مدت تک مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کا وقار اُنھیں کے دم سے قائم رہا۔

وہ والدین جو اپنے دس جگر پاروں کو پیوندِ خاک ہوتے دیکھ چکے ہوں اُن کا اپنے اکلوتے بیٹے کی محبت میں حد سے گزر جانا بالکل فطری ہے۔ لیکن ایسی محبت اولاد کی تعلیم و تربیت میں اکثر مخل ہو جاتی ہے۔ حضرت عروج کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا۔ چنانچہ ابتدائے شباب کا زمانہ ساز و آواز کی رنگینیوں میں گزرا خاندانی متانت اور ثقاہت اِس معاشرت کی متحمل نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باپ کا دل بیٹے کی طرف سے ہٹ گیا۔ اُسی آزادانہ معاشرت کے دور میں ایک ایسا اتفاق پیش آیا جس نے جناب عروج کی زندگی کا رُخ بدل دیا۔ خود حضرت عروج نے مجھ سے وہ واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا تھا۔ افسوس ہے کہ مجھے صرف اتنا یاد رہ گیا کہ آپ لکھنؤ کے باہر کسی مقام پر اپنے ایک دوست کے یہاں مقیم تھے۔ اُن کے یہاں مجلسِ عزا منعقد ہوئی۔ اتفاق سے ذاکر صاحب کسی سبب سے نہ آسکے۔ اِس پریشانی میں انھوں نے حضرت عروج سے مرثیہ پڑھنے کی فرمایش کی، اور

آپ کے انکار پر کچھ ایسے طنز آمیز جملے کہے، اور بعض حاضرین نے اتنا اصرار کیا کہ آپ مجلس پڑھنے پر آمادہ ہو گئے
منبر پر جانا تھا کہ آبائی کمال کے جوہر کھلنے لگے۔ انیس و نفیس کی مرثیہ خوانی کا انداز سامعین کی آنکھوں میں
پھرنے لگا۔ قدر دانوں نے خوب خوب داد دی۔ کسی نے میر نفیس کو اس مجلس کی پوری کیفیت لکھ بھیجی۔
باپ کا مایوس دل اُمیدوں سے لبریز ہو گیا، بیٹے کو ایک محبت بھرا خط بھیجا جس میں لکھا کہ کہاں تم اور کہاں
یہ تعریفیں، تم کو چاہیئے کہ شکر کا سجدہ یوں بجا لاؤ کہ زمین سے سر نہ اُٹھاؤ۔ اس اتفاقی واقعے نے حضرت عروج
کے دل میں مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کا شوق پیدا کر دیا۔ کامیابیاں اس شوق کو ہوا دیتی رہیں۔ یہاں تک کہ
ساری عمر انھیں مشغلوں کی نذر ہو گئی۔ جناب عروج کے فرزند و جانشین سید محمد حسن صاحب عرف للّن صاحب
فائز کا بیان ہے کہ لکھنؤ کے محلہ نواز گنج میں شہزادے مرزا صاحب کے یہاں حضرت عروج نے پہلے پہل اپنا کہا ہوا
مرثیہ پڑھا تھا، جس کا مطلع یہ ہے:۔

"ہاں اے قلم صدق رقم لوز فشاں ہو!"

حضرت عروج مرثیہ خوانی اور مرثیہ گوئی میں اپنے والد میر نفیس کے شاگرد تھے، مگر حق یہ ہے کہ اُن کے کمال
کو اکتساب سے بہت کم تعلق تھا۔ شاعری کئی پشتوں کی میراث تھی، طبع موزوں اور زبانِ شعر فطرت کا عطیہ تھا
وہ اپنے ایک ابتدائی مرثیے میں خود فرماتے ہیں:۔

بے مشقت مجھے اللہ نے یہ باغ[1] دیا ۔۔۔ پنجتن خوش ہوئے قسمت جو ہوئی میری رسا
کس قدر لطف و کرم خالقِ اکبر نے کیا ۔۔۔ کی وہ بخشش کہ سزاوار نہ تھا میں جس کا
بسکہ آغاز میں اُس کو خبر انجام کی تھی
وہ زباں حق نے عطا کی جو مرے کام کی تھی

شغلِ مدّاحیِ مولا سے یہ کیوں ہوں خرسند ۔۔۔ مجھ سے ناچیز کو بخشے یہ مضامین بلند
شدّتِ لطفِ الٰہی سے ہوں خود حیرت مند ۔۔۔ در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
ہر کہ در طبع رسد من بہ زباں می گویم
انچہ استادِ ازل گفت ہماں می گویم

جب حضرت عروج کی طبیعت نے یکایک پلٹا کھایا، اور آپ بزمِ نشاط کی رنگینیاں ترک کر کے مجلسِ عزا
کی رونق بنے تو بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوا کہ آپ اپنے بزرگوں کا کلام اپنے نام سے پیش کرتے ہیں، آپ نے
اس واقعے کا ذکر یوں کیا ہے:۔

---

[1] امام حسینؑ کی مدح کو باغ سے استعارہ کیا ہے۔

کرتے ہیں مری نظم بزرگوں سے جو منسوب — اپنی غلطی کا انھیں اظہار ہے مطلوب
یا مجھکو وہ فرماتے ہیں اُستادوں میں محسوب — اس فہم پہ حیرت ہے کہاں زشت کہاں خوب

عروج مغفور کے کُل مرثیوں کی تعداد پچیس سے زیادہ نہیں ہے۔ ان میں سے بیشتر مرثیے راقم نے اوّل سے آخر تک پڑھے ہیں۔ میر انیس کے سے باکمال تو روز روز پیدا نہیں ہوتے، اُن کو چھوڑ کر باقی اور مرثیہ گویوں میں حضرت عروج کا پایہ اچھا خاصا بلند نظر آتا ہے۔ وہ ایک جگہ اپنے اسلاف کا ذکر کرنے کے بعد بجا طور پر فرماتے ہیں:۔

گو کہ وہ مرتبہ حاصل نہیں مجھ کو زنہار — لیکن ابتک ہے وہی باغِ مضامیں کی بہار
وجد میں کرتا ہوں نغمے جو کبھی شکلِ ہزار — اب بھی غنچے زرِ گُل کرتے ہیں لا لا کے نثار
زمزمے سُن کے مرے صلِّ علےٰ کہتے ہیں
کان آواز پہ ہر گل کے لگے رہتے ہیں

سادگی، صفائی اور روانی حضرت عروج کے زبان کے جوہر تھے۔ وہ بیان کی سلاست اور وضاحت کا خاص طور پر لحاظ رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک مرثیے میں اپنے کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں:۔

تیری ہر بات کو دل دے کے سُنیں اہلِ عزا — ہو وہ اُردوے معلیٰ جیسے مانیں فصحا
نرم لفظوں میں کچھ اس طرح سے مطلب ہو ادا — کہ جسے سُن کے سمجھنے میں نہ ہو دیر ذرا
بزم میں رزم کا نقشہ دمِ تحریر کھچے
دامنِ حرف پہ مضمون کی تصویر کھچے

دور میں لفظوں کے مضمون ہوں یوں جلوہ فگن — شمع فانوس کے شیشے میں ہو جیسے روشن
ہو وہ ہر نقطۂ بے مثل کی کاغذ پہ پھبن — رکھے جس طرح ہتھیلی پہ صدف دُرِ عدن
مطلب الفاظ سے یوں وقت نظارا جھلکے
جس طرح پانی میں ڈوبا ہوا تارا جھلکے

عروج مرحوم مشکل اور غیر مانوس لفظوں کا استعمال پسند نہ کرتے تھے۔ وہ عام فہم لفظوں میں اپنا مطلب ادا کرنا چاہتے تھے۔ راقم حروف نے مرحوم کو بارہا مجلس میں بر سرِ منبر ہندی لفظوں کے بامحل صرف پر [اصرار] کرتے سُنا اور سامعین کو وجد کرتے دیکھا ہے۔ مرحوم کے یہ الفاظ کہ "لفظوں کا صحیح استعمال ہم سے سیکھو" [آ]ج تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ کوئی اور ہوتا تو لکھنؤ والے اس کو چٹکیوں میں اُڑا دیتے۔ حضرت [عرو]ج ہی کو یہ وقار حاصل تھا کہ لوگ جبر[اً] مجلسوں میں اُن کا یہ دعویٰ سنتے تھے اور بُرا نہ مانتے تھے۔

ہندی لفظوں کے استعمال کی چند مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:-

قبضے گہ بیٹھے تھے ہاتھوں میں جگرداروں کے

دریا میں جھجک آگئی تھی خون کی بو کی

ٹھٹھ لگے ہیں ترے دروازے پہ مےخواروں کے

بڑھ کے لڑکے یہ نہیں ہے کسی دشمن کا ہواؤ صورت برگ خزاں دیدہ ہے ہر سو ستھراؤ

وہ طرارے وہ اچانک وہ جھپٹ وہ چھل بل ابھی کمسن ہے سوار اور ہے گھوڑا اچپل

داب کرانوں میں لٹکے ہوئے دامن ٹرنے دونوں باگوں کو ذرا سا جو دیا کن حرنے

شہر کیا فصلِ بہار آنے سے آباد ہیں گاؤں بلبلوں سے نہیں اب چلنے کے صیاد کے داؤں
تازہ سبزے پہ درختوں کے تلے دیکھ کے چھاؤں بیلیں انگڑائیاں لے لیکے جو پھیلاتی ہیں پاؤں

فرش ہے نرم، تو کیا چین سے نیند آتی ہے
دم بدم بادِ صبا پاؤں دبا جاتی ہے

جیسا اوپر لکھا جا چکا ہے سادگی، صفائی اور روانی حضرت عروج کی زبان کے جوہر تھے، انھیں اپنے کلام میں مصنوعی خوبیاں پیدا کرنے کی فکر نہ تھی، اور اسی وجہ سے وہ صنعتوں کے استعمال کی طرف مائل نہ تھے۔ پھر بھی اُن کے کلام میں بعض صنعتیں کہیں کہیں بےساختہ آگئی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

چھوڑ کر سرحدِ شہر خیر سے پہنچا خادم — ایہام تضاد
شہ کے نزدیک پہنچتے ہی گنہ دُور ہیں سب — تضاد
اُس کی ادنیٰ نظر مہر ہوئی بدر تھا میں — ایہام تناسب

دریا بھرا ہوا ہے قلم میں شراب کا
دے وہ ساغر مجھے جس کا نہ کبھی کیف ہو کم
جب تک تنوں میں دم رہا یہ خوں پیے گئی

دردِ سر کھونے کو ہے دُرد بھی کافی مجھکو — تجنیس محرّف

سَن سَن کی اِک صدا تھی جیسے سُن کے رہ گئے — "

جَل کے بَل کھا گیا موئے سرِ آتش کی طرح — تجنیس لاحق

اب دیر نہ ہو دَور میں زنہار خبردار — "

پُتلیاں حوریں بھی آنکھوں سے لگالیں اس کی[1] — ایہام

چہرہ حسیں ہے ماہِ دو ہفتہ سے چار چند — سیاق الاعداد

فردوس انھیں اشکوں کے بہانے سے ملے گا — ادماج

کرتا نہ مرا سامنا گر سام بھی ہوتا — تجنیس ذیل

اُڑنے میں طیر ہے تو روانی میں ہے یہ تیر — تجنیس مضارع اور تجنیس محرف کا مجموعہ

چھیڑ کر سیر فرس برق سفر غازی نے — تجنیس قلب بعض

پیر تو پیر ہیں بچے سے جواں کانپتے ہیں — مراعاۃ النظیر

دلدوز و دلگداز و دل آزار و دل رُبا — تنسیق الصفات

حق نے چاہا کہ قومی ہوئیں قویٰ خوف ہو دُور — اشتقاق

پیدل مثالِ ریگِ رواں رن سے ہو گئے — صنعتِ التزام کی ایک خاص صورت

گل سے رُخ، مشک سے مو، غنچہ سے لب، پھول سے تن — تنسیق الصفات کی ایک خاص صورت

ضو کا اپنی یہ ہر اِک قلب کو پروانہ کریں — سیکڑوں جل کے جو مر جائیں تو پروا نہ کریں — تجنیس مرفہ

ننھے سے ہاتھوں کی دکھلا کے صفائی لڑکے — مر گئے دونوں جوانوں کی لڑائی لڑکے — تجنیس تام مستوفی

چھائی ڈھالوں کی گھٹا رن میں برسنے لگے تیر — برق کی طرح چمکنے لگی ہر اک شمشیر

صورتِ رعد گرجنے لگے لشکر کے شریر — ... ... — مراعاۃ النظیر

... ... — ناسمک جاتی ہے رہوار کی ٹاپوں کی دھمک

اثرِ نقشِ قدم واں بھی عیاں سارے ہیں — پشتِ ماہی پہ یہ ٹاپوں کے نشاں سارے ہیں — حسنِ تعلیل

---

[1] یہ مصرع گھوڑے کی تعریف میں ہے۔

جمع اسباب تباہی سے پریشاں ہے کوئی — لب خاموش سے گویا تنِ بیجاں ہے کوئی

اِس شعر کے پہلے مصرع میں صنعتِ تضاد اور دوسرے میں ایہام تضاد ہے۔
حضرت عروج کے اندازِ بیان میں جو دلکشی ہے اُس میں قافیے اور ردیف کے حسنِ استعمال کو بھی دخل ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

عزم پُورا نہ ہو جس کا وہ بہادر ہی نہیں — تیرے روکے سے جو رُک جاؤں تو میں حُر ہی نہیں

کوشش سے ملی ہیں نہ تگ و دَو سے ملی ہیں — راہیں یہ اسی شمع کے پرتو سے ملی ہیں

میں تمھارے ہی نبی کا ہوں نواسا کہ نہیں — کوئی تم لوگوں میں ہے میرا شناسا کہ نہیں
تم کو معلوم ہے دو دن سے ہوں پیاسا کہ نہیں — اب بھی پانی مجھے تم دوگے ذرا سا کہ نہیں

آنکھ سے آنکھ لڑی مردمِ دیدہ تڑپے — طائرِ ہوش بھی ہو ہو کے پریدہ تڑپے
کچھ تو بالائے زمیں حلق بریدہ تڑپے — مرنے والوں سے سوا زخم رسیدہ تڑپے

میرے گلشن کا ہر اک پھول مہکتا ہی رہا — عندلیبوں کو مرے سامنے سکتا ہی رہا
دمبدم باغِ مضامیں کا چہکتا ہی رہا — رنگِ معنی گلِ مضموں سے ٹپکتا ہی رہا

ذیل میں جو دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں اُن میں الفاظِ قافیہ کی مکتوبی صورت سے قطع نظر کر کے صرف اُن کی ملفوظی ہیئت کا لحاظ کیا گیا ہے :۔

چہرے آغوش میں زلفوں نے چھپا رکھے ہیں — شبِ معراج میں قرآن کھلے رکھے ہیں

سہمے جاتے ہیں کبھی اور کبھی گر پڑتے ہیں — بھاگتے ہیں کبھی اُٹھ کر کبھی گر پڑتے ہیں

مرثیوں کا موضوع مشترک ہے، اس لیے مرثیہ گویوں کے کلام میں مضامین کا اشتراک ناگزیر ہے۔ مگر حضرت عروج اِن مشترک مطالب میں اکثر جدّت پیدا کر کے اُن کا اثر بڑھا دیتے ہیں ذیل کی مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

خوف کی شدت سے یزیدی سپاہیوں کی حالت :۔

پنجۂ مرگ گلوگیر نظر آتا ہے ۔۔۔ ایک اک موت کی تصویر نظر آتا ہے

خم گردنیں ہیں پیرِ زمیں گیر کی طرح ۔۔۔ چپکے کھڑے ہیں خوف سے تصویر کی طرح

اب نہیں بچنے کی تدبیر نظر آتی ہے ۔۔۔ تیغ میں موت کی تصویر نظر آتی ہے

دُور ہو خوف تو بانیِ ستم بھی ٹھہریں ۔۔۔ دم ذرا سینوں میں ٹھہریں تو قدم بھی ٹھہریں

... ... ۔۔۔ دل نہاں جسم عیاں کانپ رہے ہیں تھر تھر
دمبدم خوف کا روحیں جو اثر پاتی ہیں ۔۔۔ تیلیاں تک قفسِ جسم کی تھراتی ہیں

دھڑکا ہے یہی جان بچے شیر سے کیونکر ۔۔۔ تصویر رنگی بن گئی ہے فوج سراسر
گر دم میں دم آیا تو وہ ناپاک لڑیں گے ۔۔۔ مٹی کے جو پتلے ہوں وہ کیا خاک لڑیں گے

گھوڑے کے نعلوں کی چمکتی ہوئی کیلوں کا نہر میں عکس:۔

کیلیں نعلوں کی چمک اپنی جو دکھلاتی تھیں ۔۔۔ شمعیں جلتی ہوئی پانی میں نظر آتی تھیں

گھوڑے کی رفتار کی ہمواری:۔

یہ پست و بلند ایک طرح چلتا ہے دم میں ۔۔۔ ہیں تپلیاں گھوڑے کی کہ آنکھیں ہیں قدم میں

گھوڑے کی سُبک روی:۔

بن گیا راہ میں چلتا ہوا جادو گھوڑا

ہوا اور گھوڑے کا مقابلہ:۔

پاؤں بھی چھو نہ سکی اور یہ غم لے کے پھری ۔۔۔ اپنے دامن میں فقط گردِ قدم لے کے پھری

شمر عون و محمد کے نام دریافت کرتا ہے، اور وہ جواب میں کہتے ہیں:۔

جو جری ہیں اُنھیں حاجت نہیں اظہار کی ہے ۔۔۔ نام مردوں کا رقم باڑھ پہ تلوار کی ہے

شمر عون و محمد کو میدانِ جنگ میں دیکھکر کہتا ہے:۔

خوفِ جاں دونوں کو ہنگامِ وغا کافی ہے ۔۔۔ پھُول سے جسموں کو تیروں کی ہوا کافی ہے

عون و محمد میدانِ جنگ میں:-

رَن کے چلّوں سے ہزاروں ہوئے ناوک جو رہا ہر پرِ تیر سے آنے لگی سَن سَن کی صدا
چھیڑ دیتی ہے جو تیروں کی ہوا زلفوں کو جنبشیں ہوتی ہیں رہ رہ کے سوا زلفوں کو

حضرت علی اکبر کا میدانِ جنگ کو جانا:-

... ... گھوڑے پہ یہ براق پہ بیٹھے ہیں یا رسول
غل تھا کہ خاص ہے یہ شرف آج کے لئے دن کو رسولؐ جاتے ہیں معراج کے لئے

حرم سمیت شہِ مشرقین پیاسے ہیں جہاں میں آگ لگی ہے حسین پیاسے ہیں

دب گیا خون کی بوچھار سے میداں کا غبار

یاں رن کی زمیں ڈر سے ہے گہوارۂ جنباں

صدفِ چشم سے برسانے لگے گوہر تر

ایران کے قدیم مثنوی گو جب کوئی نئی داستان شروع کرتے تھے تو طبیعت کو گرمانے کے لئے ساقی سے شراب مانگتے تھے۔ اُردو کے بعض مثنوی نگاروں نے بھی اپنے ایرانی پیشروں کی تقلید کی ہے۔ آخری دَور کے مرثیہ گویوں نے بھی اُن کی پیروی شروع کر دی۔ یہاں تک کہ ساقی نامہ مرثیے کا ایک اہم جزو بن گیا مگر مرثیوں میں ساقی کا لفظ استعارے کے طور پر آتا ہے، اور اس سے مراد ہوتی ہے ساقیِ کوثر (حضرت علی) ساقیِ ازل (خدا) یا کوئی امام یا معصوم۔ اسی طرح شراب سے ولائے اہلبیت، معرفت خدا وغیرہ مراد ہوتی ہے اپنے زمانے کے رواج کے مطابق حضرت عروج نے بھی ساقی نامے کہے ہیں اور خوب کہے ہیں، چند نمونے ملاحظہ ہوں

ساقیا مجھ سے سوا کون ہے خواہانِ شراب جان میری ہے شراب اور میں ہوں جانِ شراب
مجھ سا ہو پیر جو میخانے میں مہمانِ شراب پھر تو ہر رگ سے اُٹھے موجۂ طوفانِ شراب
ہے جہاں سرد لہو نے کی وہاں دھاریں ہوں
جھُرّیاں جسم کی چلتی ہوئی تلواریں ہوں

گلوی بن جاتی ہے اس مے کے وسیلے سے خرد گو یہ شعلہ ہے مزاج اس کا ہے لیکن کافور

غش سے چونکا دیا موسیٰ کو اسی نے سر طور
پی کے اس مے کو ہوا آنکھوں میں یعقوب کی نور
مشکل آساں ہوئی رحمت کی نشانی پائی
نشے سے اس کے زلیخا نے جوانی پائی

ساقیا فصلِ بہار آئی نہیں اب مجھے ہوش
اب ترا رند نہیں رہنے کا دم بھر خاموش
جب نظر کرتا ہے شیشے کی طرف بہرِ نوش
خود اُبل پڑتی ہے مے ہوتا ہے اس طرح کا جوش
فخر میرا ہے ترے در پہ جگہ پانے میں
سات پشتیں مری گزریں ترے مے خانے میں

ساقی وہ جام دے جو مہکتا ہوا ہو جام
مانندِ آفتاب چمکتا ہوا ہو جام
ایسا سبک تو ہو کہ بہکتا ہوا ہو جام
گرتی ہوئی شراب چھلکتا ہوا ہو جام
دستِ مژہ سنبھالنے کو ساتھ ساتھ اُٹھے
بے اختیار زاہد و واعظ کا ہاتھ اُٹھے

ایران کے قدیم قصیدہ گو اور اُن کی پیروی میں ہندوستانی قصیدہ نگار اپنے ممدوح کی شجاعت اور فنونِ جنگ میں مہارت کے سلسلے میں اکثر اُن کے گھوڑے اور تلوار کی بھی تعریف کرتے تھے۔ اُردو کے مرثیہ گویوں نے بھی یہی طریقہ اختیار کر لیا۔ اور گھوڑے اور تلوار کی تعریف میں خوب خوب زورِ طبع صرف کیا۔ حضرت عروج نے گھوڑے کی تعریف اکثر اور تلوار کی تعریف کمتر بہت اچھی لکھی ہے :-

گھوڑے کی تعریف

نیچے بس پشت پہ، رہواروں کو یہ دھیان جو تھا
اتنی تیزی پہ بھی جنبش نہ تھی جسموں کو ذرا
رو میں بھی لطف سبک خیزیاں دکھلاتی تھیں
کشتیاں دو تھیں کہ پانی پہ چلی جاتی تھیں

کبھی دکھلائے سبک چال جو یہ برق شِعار
جائے رکھتا ہوا اڑتے ہوئے ذرّوں پہ قدم
صدقے اس چال پہ ہونے کو پری رو ہو تیار
جائے کوسوں پہ زمیں سے نہ قدم چھو جائیں

جس پہ لاکھوں میں نظر پڑتی ہے ممتاز ایسا
دل ہیں پریوں کے فدا چال میں انداز ایسا

حس سے معشوق کا زیور ہو خجل ساز ایسا　　جام چھلکے نہ ہتھیلی پہ قدم باز ایسا
دخل کیا ہے جو کسی باگ پہ یہ پھٹ جائے
ہو نہ جنبش تنِ راکب کو، جو سرپٹ جائے

اس کا راکب کبھی دوڑائے جو اس کو سرِ آب　　ٹپکے قطرہ جو پسینے کا تو پانی ہو گلاب
پتلیاں آنکھوں پہ ہیں شوق سے بڑھ بڑھ کے حباب　　سُم سے دب کر نہ اُبھرتی ہوئی لہریں ہوں خراب
اُڑکے اِک بوند نہ پانی کی گھٹے ٹاپوں سے
چادرِ آب نہ سمٹے نہ پھٹے ٹاپوں سے

ایسے جاندار کسی کو نہیں ممکن شبدیز　　باگ ہل جائے تو جاتے ہیں ہوا سے کہیں تیز
نبضِ راکب کی دھمک اِن کے لئے ہے مہمیز　　کانی آنکھوں کا اشارہ ہے انھیں وقت ستیز
یاد انھیں ران کی اور باگ کی سب لاگیں ہیں
ایسے گھوڑوں کے لئے تارِ نظر باگیں ہیں
برچھوں پھرتا ہوا جاتا ہے آہو کی طرح　　پیچ و خم یال میں ہے حور کے گیسو کی طرح
سربلندی جو دکھائے یہ میانِ رفتار　　سامنے سے نظر آئے نہ کبھی اس کا سوار
چال ایسی ہے کہ پریاں ہوئی جاتی ہیں نثار　　وہ سُبک رو ہے کہ اُڑتا نہیں ٹاپوں سے غبار
ایسی رفتار ہے پیاری کہ دلوں کو جو ملے　　وے نہ خوں دب کے رگِ گل جو یہ پھولوں پہ چلے
نازنینانِ چمن خواب سے بیدار نہ ہوں　　پتلیاں آنکھوں پہ نرگس کی ذرا بار نہ ہوں

تلوار کی تعریف

ہوش اُڑیں دیکھ کے پریوں کے سجاوٹ ایسی　　ہل لے دشمن کے گلے سے بھی لگاوٹ ایسی
ناز سے چلتی ہے تھم تھم کے رُکاوٹ ایسی　　کبھی ثابت نہ بگڑنا ہو بناوٹ ایسی
خاتمہ اس کے لئے حسنِ خداداد کا ہے
تن چھریرا تو ہے بے شبہ یہ فولاد کا ہے

رن میں آئی ہے جو اس شوخ نے چہرے سے نقاب　　طالبِ دید چلے آتے ہیں بے حد و حساب

دیکھ کر اس کی ادا کہتے ہیں ہو کر بیتاب　　　اس طرف ایک نظر دیکھ لے او خانہ خراب
دل ترے واسطے لائے ہیں جگر لائے ہیں
رونمائی میں تجھے دینے کو سر لائے ہیں

کاٹ کر تیغ رگوں کو نکل آئی باہر　　　کیا صفائی تھی کہ مطلق نہ ہوئی تن کو خبر
جا کے دو ہاتھ بلندی پہ گرا گود میں سر　　　جسم اُسی طرح سے قائم رہا مرکب پہ مگر
رُک رہی دیر تلک توسن چالاک پہ لاش
لی جو گھوڑے نے پھریری تو گری خاک پہ لاش

برق چلنے میں ہیں تھمنے میں ہیں دونوں مہ نو　　　قدرداں لے انھیں گر جان بھی ہو جائے گرو
کب یہ ملتے ہیں کرے لاکھ زمانہ تگ و دو　　　نیچے ہیں کہ چراغ ظفر و فتح کی لو
ضو کا اپنی یہ ہر اک قلب کو پروانہ کریں
سیکڑوں جل کے جو مر جائیں تو پروا نہ کریں

حضرت عروج کے مرثیوں میں جنگ کے جو مناظر ملتے ہیں وہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے بشہادت اور بین تو نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ چیزیں مرثیے کے آخر میں ہوتی ہیں، اور حضرت عروج کا شاید ایک مرثیہ بھی مکمل نہیں ہے۔ متعدد مرثیوں میں ستر اسی سے لے کر سو ڈیڑھ سو تک بند ہیں مگر وہ بھی ناتمام ہی ہیں۔

بعض بلند پایہ مرثیہ گویوں نے گرمی کی شدت کا بیان اس خوبی کے ساتھ کیا کہ اس مضمون کو ایک خاص اہمیت حاصل ہو گئی، اور اکثر مرثیہ گویوں نے اس پر زورِ طبع صرف کیا۔ عروج مرحوم نے بھی ایک جگہ گرمی کی شدت کا حال خوب لکھا ہے، چند بند ملاحظہ ہوں:-

بیاں کیجئے کیا حالِ گرمیِ عاشور　　　زمین جل رہی تھی کربلا کی شکل تنور
کیا فلک پہ بخاراتِ ارض نے جو عبور　　　ہوا شعاع کی چلمن میں مہر بھی مستور
اُداسی چھا گئی رنگِ جہاں بدلنے لگا
یہ دوپہر کی تپش تھی کہ دن بھی ڈھلنے لگا

اثر سے دھوپ کے صحرا کی بھی زمین تھی سخت　　　پہاڑ خشکی سے پھٹ پھٹ کے ہو گئے تھے دو لخت
ہوائے گرم کے جھونکوں سے پتیاں تھیں کرخت　　　نہ شاخیں جھکتی تھیں سوکھے تھے اس طرح سے درخت

تمام اوجِ ہوا گرم تھا زمیں کی طرح
بگولے دشت کے تھے دیو آتشیں کی طرح

فلک سے آگ برستی تھی رن میں سرتاسر　　　نہ چین تھا کسی ذی روح کو کہیں دم بھر
اُمس بھی ایسی کہ رُکتی تھی سانس رہ رہ کر　　　غبارِ دشتِ بلا تھا کہ آتشیں چادر
مثالِ تابہ آہن زمین جلتی تھی
کہ دن کو دھوپ میں ذرّوں سے لو نکلتی تھی

تپش سے کھولتا تھا آب فرات بھی یکسر　　　تھی نہر یا تھی زمیں کی جبیں پسینے سے تر
ذرا نہ تہ سے اُبھرتی تھیں مچھلیاں اوپر　　　کلیجہ پھٹتا تھا پانی کا پڑتا تھا جو بھنور
وہ حال اب نہیں دریا کی بھی روانی کا
نہ ٹپکی بوند جو دامن نچوڑا پانی کا

دوسرے مرثیہ گویوں کی طرح حضرت عروج کے کلام میں بھی اُن کے زمانے کے واقعات کا ذکر نہیں ملتا۔ صرف ایک مرثیے میں حضرت عارف[1] کے انتقال کا حال ذرا تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ مقام ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:۔

ابھی کا ذکر ہے یاد آپ کو بھی ہوگا ضرور　　　گئے جہان سے کس طرح عارفِ مغفور
چلے تھے پڑھنے کو وہ مجلسِ امامِ غیور　　　کہ ناگہاں اجل آنے سے ہوگئے مجبور
دل و جگر میں خدنگِ ملال بیٹھ گئے
اُٹھا جو درد کلیجہ پکڑ کے بیٹھ گئے

افاقہ اِس مرضِ سخت سے ہوا بھی نہ تھا　　　کہ ایک دوست کو فوراً خدا نے بھیج دیا
سنبھالا بڑھ کے اُنھوں نے یہ حال جب دیکھا　　　میں تھا ایک مطب اُن کو لے گیا جس جا
تمام جسم تھا ڈوبا ہوا پسینے میں
مزاج پوچھا تو بتلایا درد سینے میں

کسی نے جا کے اس آفت کی کر دی گھر میں خبر　　　یہ سُن کے دوڑ کے سب آئے بادلِ مضطر
کلیجے ہل گئے، کی اُن نے حال پر جو نظر　　　یہ دیکھا اب کوئی دم میں ہے سوئے خلد سفر

---

[1] سید علی محمد صاحب عارف مرحوم حضرت عروج مغفور کے حقیقی بھانجے تھے۔ مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی دونوں فنون میں بلند پایہ رکھتے تھے۔ ۱۲ ذوالحجہ ۱۳۳۴ھ مطابق اکتوبر ۱۹۱۶ء میں انتقال کیا۔

لگی وہ چوٹ کہ دل بے قرار ہونے لگا
ہر ایک پھیر کے منہ چپکے چپکے رونے لگا

ذرا سی دیر میں تھوڑی بہت دوا بھی ہوئی مگر سکوں نہ ہوا جس قدر بھی کوشش کی
مکاں پہ لے کے چلیں سب کی رائے یہ ٹھہری کہا جو اُن سے کہ چلئے کہا تمھاری خوشی

اُٹھائے کوئی کیا رُخ نہ ایسی باتوں پر
وہ اُٹھ کھڑے ہوئے خود زور دے کے ہاتوں پر

چلے بھی اُٹھ کے قدم بھی بڑھا کے اک رکھا ہوا وہ دردِ جگر جس سے زور چل نہ سکا
زبان بند ہوئی ڈھل کے رہ گیا منکا نہ پاؤں دوسرا لیکن جگہ سے اپنی ہلا

تعلق اُن کو نہ کچھ پھر جہانِ زشت میں تھا
قدم تھا ایک یہاں دوسرا بہشت میں تھا

اگرچہ موت نے چھلکا دیا حیات کا جام مگر رہے گا دلوں میں خیال اُن کا مُدام
کبھی نہ صفحۂ ہستی سے مٹنے پائے گا نام ہمیشہ یاد دلائے گا اُن کی اُن کا کلام

مثالِ دعبل و حسّاں رہے گا نام اُن کا
کہ مجلسوں میں پڑھا جائے گا کلام اُن کا

اوپر جو اقتباسات مثالاً پیش کئے گئے ہیں اُن سے معلوم ہوگا کہ حضرت عروج واقعات و مناظر کے خارجی پہلوؤں کی تصویر کشی خوب کرتے ہیں، مگر داخلی پہلو میں زیادہ گہرے نہیں جاتے۔ اُن کی شاعری کے چند اچھے نمونے ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں :-

صبح کی ٹھنڈی ہوا کا نباتات پر اثر :-

کان میں آتی ہے جب بادِ صبا کی آہٹ لے کے انگڑائی بدل لیتی ہیں بیلیں کروٹ
خنکیٔ بادِ سحر سے جو مزہ پاتی ہیں بسترِ نرم پہ آرام سے سو جاتی ہیں

عون و محمد گھوڑے اُڑاتے ہوئے میدانِ جنگ کو جا رہے ہیں :-

چھیڑ دیتی ہے ردا رُو میں اگر بادِ صبا کروٹیں لیتی ہے بالائے ہوا زلفِ دوتا
خم بہ خم پیچ پہ پیچ اور جو پڑتے ہیں سوا دو نکڑ ہاتھوں پہ لے لیتی ہے بالوں کو ہوا

کوششیں لاکھ کرے پھر بھی ہوا پیچھے ہے
چاند دو آگے ہیں گھنگھور گھٹا پیچھے ہے

امام حسین خیمے سے میدانِ جنگ کو تشریف لیجاتے ہیں :-

... ... جانبِ فوج چلے سبطِ رسولِ دوجہاں
علمِ فوج ہیں عباسِ جری کھولے ہوئے سر پہ ہے مہرِ فلک چترِ زری کھولے ہوئے

چھ مہینے کا بچہ پیاس سے جاں بلب ہے :-

خشک ہیں پیاس سے لب سرد بدن ہے سارا سانس بھی آتی ہے رُک رُک کے یہ سوکھا ہے گلا
نرگسی آنکھوں سے ماں بہنوں کو تکتے بھی نہیں اب تو یہ گود میں آنے کو ہُمکتے بھی نہیں

پیاس کی شدت سے بچوں کی حالت :-

تین دن گزرے ہیں سہتے ہوئے تکلیفِ عطش غش سے جب اُن کو اُٹھاؤ تو پھر آجاتا ہے غش
مائیں چونکاتی ہیں جب "اے مرے جانی" کہہ کے آنکھیں پھر بند وہ کر لیتے ہیں "پانی" کہہ کے

ایک یزیدی پہلوان :-

دیکھا نہیں اس طرح کا انسان تن آور نامرد کا سر کوہ کی چوٹی ہے مدوّر
ابرو ہیں ستمگار کے فولاد کا خنجر پلکیں ہیں کہ ہیں تیلیاں لوہے کی سراسر

رخسارے جفاکار کے سختی میں حجر ہیں
اُبھرے ہوئے شانے ہیں کہ عفریت کا سر ہیں

قد تھا کہ شجر جثہ کا واک تھا یا فیل ٹکڑا تھا پہاڑی کا کہ بیڈول تھا وہ ڈیل
ساقیں نہ کہو راہِ ضلالت کے تھے وہ میل تھے ہاتھ ستمگار کے یا صورِ سرافیل

بدکیش تھا، بدعہد تھا اور زشتِ عمل تھا
مرّیخ تھا غصے میں نحوست میں زحل تھا

امام حسین کا گھوڑے پر سوار ہونا :-

یہ کہہ کے پشتِ فرس پر چڑھے امامِ زمن کئے درست قبا کے حسین نے دامن
ضیا سے رُخ کی فلک یک بیک ہوا روشن زمیں کا عکس قدم سے اُبل پڑا جوبن

ضیائے پائے شہِ دیں جو پاتے ہیں ذرّے
چمک کے مہر کو آنکھیں دکھاتے ہیں ذرّے

حضرت قاسم کی ہیبت :

گرتی ہے صف پہ صف یہ اُٹھاتے ہیں جب نگاہ　　تیغِ اجل نگاہ ہے برقِ غضب نگاہ
امکان کیا کہ ان پہ کریں بے ادب نگاہ　　نیچے کیئے ہیں فرق جھکائے ہیں سب نگاہ
آثار ہیں جلالِ علی کے جناب میں
لرزہ پڑا ہوا ہے تنِ آفتاب میں

حضرت علی اکبر کی جنگ سے دنیا میں ہلچل:-

سمجھے ملائکہ کہ یہ ہے ساعتِ نشور　　اُٹھے جگہ سے اپنی سرافیل لے کے صُور
آندھی سیہ چلی متلاطم ہوئے بحور　　کانپی زمیں، پہاڑ ہلے، شق ہوئے قبور
سامانِ حشر رن میں نمودار ہو گئے
مُردے لحد سے اُٹھنے کو تیار ہو گئے

چلتی ہے بادِ تُند لرزتے ہیں کوہسار　　شدت تھی گرد کی کہ ہوا کو بھی تھا فشار
طوفاں ہوا تھا خاک کے دریا میں آشکار　　اُٹھتا تھا کانپ کانپ کے ہر مرتبہ غبار
طاری ہراس کیوں نہ ہو سارے جہان پر
ڈر کر زمین چڑھ رہی تھی آسمان پر

یزیدی فوج پر خوف کا غلبہ:-

جنگ میں ایک کے اب ہوش بجا ہیں نہ حواس　　چہرے اُترے ہوئے ہیں جینے سے ہر اک کو ہے یاس
چھٹ گئیں ہاتھوں سے ڈھالیں ہیں نہ تلواریں پاس　　بھاگتے بھی نہیں اب زیست سے ایسا ہے ہراس
بن کے زنجیر قضا اُن کو جکڑ لیتی ہے
بھاگیں کیا خاک زمیں پاؤں پکڑ لیتی ہے

ہول کے مارے گرے پڑتے ہیں گھوڑوں سے سوار　　نہ کہیں امن کا موقع نہ کہیں جائے قرار
روندتے پھرتے ہیں لاشوں کو جو کوتل رہوار　　ہو رہا ہے ستم ایجادوں کو بے قبر نثار
جو گزرتی ہے بہر حال سنا دیتے ہیں
استخواں ٹوٹ کے اُف اُف کی صدا دیتے ہیں

حضرت زینب اپنے بچوں کو میدان جنگ میں بھیجنے کیلئے تیار کرتی ہیں:-

کنگھی کی بالوں میں اُلجھے ہوئے گیسو سلجھائے　　سُرمہ دینے لگیں آنکھوں میں تو آنسو بھر آئے

عون و محمد کا جنگ کیلئے روانہ ہونا:-

سُن کے شبیر کا ارشاد علمدار بڑھے ساتھ ماموں کے بصد شوق وہ جرار بڑھے
مسکراتے ہوئے دونوں سوئے ہوار بڑھے دل جو بیچین ہوا خود ستہ ابرار بڑھے

حضرت عروج مرثیہ گوئی میں بھی بلند پایہ رکھتے تھے۔ مگر اُن کا اصل کمال مرثیہ خوانی میں ظاہر ہوتا تھا۔ راقم حروف نے مرحوم کو لکھنؤ کی مجلسوں میں بارہا پڑھتے ہوئے سُنا ہے۔ اُن کے پڑھنے سے اُن کے کلام کا اثر دس گُنا نہیں بلکہ سو گُنا ہو جاتا تھا۔ مرثیہ خوانی ایک طرح کی اعلیٰ درجے کی ایکٹنگ ہے۔ اس لیے مرثیہ خواں کا کمال اُن مقاموں پر خوب ظاہر ہوتا ہے جہاں آواز کے اُتار چڑھاؤ، چہرے کے تغیر اور اعضا کی جنبشوں کو زیادہ نمایاں کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ذیل میں عروج مرحوم کے مرثیوں میں سے نمونے کے طور پر چند اقتباس پیش کئے جاتے ہیں، کہ اس طرح کے مقامات کو جب وہ پڑھ دیتے تھے تو اثر کا وہ عالم ہوتا تھا جو قلم کی زبان سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔

رن میں پہونچا جو بصد غیظ حسن کا دلبر دیکھ کر رعب جری ہو گئے حیراں خودسر
بڑھ کے دو چار قدم اور سوئے لشکر شر دیکھی میدان کی حد گھوڑے کو کاوا دیکر
روک کر پھر فرسِ برق سفر غازی نے
کی نمو داروں پہ چُن چُن کے نظر غازی نے

اللہ ری پُر دلیِ علی اکبرِ جواں تھے مطمئن قریب تھا گو لشکر گراں
سوکھے ہوئے لبوں پہ پھرائی کبھی زباں پوچھا کبھی لہو کبھی چٹکائیں اُنگلیاں
نعرہ کیا مثالِ اسد گاہ جھوم کے
اور یا علی کہا کبھی قبضے کو چُوم کے

رعب نے جسم سے بدخواہوں کی جانیں کھینچیں زین پر جم کے دلیروں نے عنانیں کھینچیں
جو علی کا تھا سواری کا قرینہ ہے وہی دونوں بازو وہی، شانے وہی، سینہ ہے وہی

غور سے دیکھ لیں افسر کہ غلط گو نہیں ہم وہ بلندی پہ ستارہ سا چمکتا ہے علم

خوف چھایا ہوا تیرے دلِ ناپاک پہ ہے اب زباں ہل گئی منہ میں تو یہ سر خاک پہ ہے

لکھنؤ میں حضرت عروج کے پڑھنے کی جو سالانہ مجلسیں مقرر تھیں اُن میں دو مجلسیں خاص کر قابلِ ذکر ہیں ایک وہ جو ماہ شوال کے تیسرے اتوار کو پُرانے نخاس میں اکرام اللہ خاں کے امام باڑے میں ہوا کرتی تھی۔ اس

مجلس کے بانی لکھنؤ کے ممتاز وکیل سید شہنشاہ حسین صاحب مرحوم تھے سامعین کی وہ کثرت ہوتی تھی کہ امام باڑے کے بڑے بڑے دالان، شہ نشین اور وسیع صحن میں تل رکھنے کی جگہ نہیں رہتی تھی، اور پھاٹک سے لے کر سڑک تک ٹھٹھ لگے رہتے تھے۔ ایک مجلس کا وہ منظر اب تک مجھے یاد ہے کہ ساقی نامہ پڑھا جا رہا ہے اور سامعین وجد کر رہے ہیں۔ جب حضرت عروج اس بند پر پہونچے:-

تیری سرکار سے رہتا نہیں کوئی محروم　　سال بھر بعد بہار آئی ہے ہر سمت ہے دھوم
حال رندوں کا بخوبی تجھے ہوگا معلوم　　دیکھ تو آج کہ میخانے میں کتنا ہے ہجوم

دل ہیں بیچین بہت مے کے طلب گاروں کے
ٹھٹھ لگے ہیں ترے دروازے پہ میخواروں کے

اور بیت پڑھتے وقت امام باڑے کے دروازے کی طرف اشارہ کیا تو حاضرین کے جذبات میں طوفان آگیا اور تحسین و آفریں کا شور برپا ہوگیا۔ اُس وقت کا عالم دیکھنے کے قابل تھا۔ افسوس ہے کہ وہ مجلس حضرت عروج کی زندگی ہی میں بانیِ مجلس کی ناوقت وفات کے باعث موقوف ہوگئی۔

دوسری قابل ذکر سالانہ مجلس وہ تھی جو رجب کی پچیسویں تاریخ کو دل آرام کی بارہ دری میں ہوا کرتی تھی۔ اِس مجلس کی اہمیت اور شہرت کا خاص سبب یہ تھا کہ وہ میر انیس کے زمانے میں قائم ہوئی تھی، اور وہ اس مجلس میں زندگی بھر نیا مرثیہ پڑھتے رہے۔ میر انیس کے بعد اُن کے فرزند اور جانشین جناب نفیس نے ساری عمر یہی طریقہ جاری رکھا۔ میر نفیس کے انتقال کے بعد حضرت عروج ہر سال نیا مرثیہ پڑھا کیے۔ اِس مجلس کی اہمیت بڑھانے کے لیے اس کی یہ خصوصیت اور اس کی قدامت ہی کافی تھی۔ مگر اس سے بڑا سبب یہ تھا کہ اِسی تاریخ کو میر باقر سوداگر کے امام باڑے میں مرزا دبیر اور اُن کے جانشین ہر سال اپنا نو تصنیف مرثیہ پڑھا کرتے تھے۔ اس طرح یہ مجلسیں دونوں حریف اُستادوں کے مقابلے کی مجلسیں ہوگئی تھیں۔ دونوں اُستاد اپنا اپنا زورِ طبع دکھاتے تھے۔ اور دونوں کے طرفدار کثیر تعداد میں بڑے جوش کے ساتھ اِن مجلسوں میں شرکت کرتے تھے۔ یہ سلسلہ بفضلہ اب بھی جاری ہے۔ ہر سال پچیسویں رجب کو دل آرام کی بارہ دری میں حضرت عروج کے صاحبزادے جناب میر محمد حسن صاحب عرف لڈن صاحب فائز، اور میر باقر سوداگر کے امام باڑے میں مرزا دبیر مغفور کے پوتے اور حضرت اوج مرحوم کے فرزند جناب مرزا محمد طاہر صاحب رفیع اپنے اپنے کلام سے سامعین کو مستفیض فرماتے ہیں۔

حضرت عروج اس مجلس میں ہر سال اپنا نیا مرثیہ پڑھتے تھے۔ اُن کا کلام سُننا اور کمال دیکھنے

کے لئے دُور دُور سے لوگ آتے تھے، بڑا مجمع ہوتا تھا۔ راقم بھی اِس مجلس میں التزام کے ساتھ شرکت کرتا تھا۔ وہاں جو کیفیتیں میری آنکھوں نے دیکھیں اُن کو قلم کی زبان ادا نہیں کر سکتی۔ آخری عمر میں عروج مرحوم کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ ایک مرتبہ پیری میں طویل بیماری نے اتنا کمزور کر دیا کہ چلنا پھرنا دشوار تھا، اسی حالت میں رجب کی چھبیسویں آگئی۔ دل آرام کی بارہ دری حسب معمول سامعین سے بھری ہوئی تھی۔ مجلس شروع ہونے کا وقت آگیا۔ دو آدمیوں نے بغلوں میں ہاتھ دے کر حضرت عروج کو منبر پر بٹھا دیا۔ آپ نے مرض اور ضعف کا عذر کر کے مرثیہ شروع کیا۔ چند بند پڑھے تھے کہ طبیعت میں گرمی پیدا ہو گئی، ایک چادر سے اپنی کمر کسوائی اور اِس جوش و خروش سے پوری مجلس پڑھ گئے کہ گویا بیماری اور ضعف کا نشان تک نہ تھا۔ اُس دن کا یہ سماں کچھ ایسا پُر اثر تھا کہ دیکھنے والے اُس کو کبھی بھول نہیں سکتے۔ ایک مرثیئے میں حضرت عروج نے اپنی پیرانہ سالی کا ذکر ذیل کے بندوں میں کیا ہے :-

اے زباں عرض یہ اب خدمتِ احباب میں کر
اُس سے کیا ہو جو بلاؤں میں گھرے سرتاسر
کشمکش ایسی کہ ہو سانس کا لینا دوبھر
جسم بھی ہو تنِ مدقوق کی صورت لاغر
پھر ہو کیا نظم نہ جب ذہنِ رسا کام کرے
بات کرنا جسے مشکل ہو وہ کیا کام کرے

قد جو مانندِ الف تھا وہ ہوا جاتا ہے دال
خم کمر ہونے سے آتا ہے یہ رہ رہ کے خیال
ڈھونڈلا پھر سے جوانی کو تو جائے یہ بال
عقل کہتی ہے کہ بڑھ جائیگا کچھ اور زوال
نفع کیا سوے سراب آئے جو پانی کے لیئے
خود بھی مل جائے گا مٹی میں جوانی کے لیئے

دل میں جو کچھ ہے مرے آپ سے سُن لیجے ضرور
درگزر کیجئے میری غلطی ہو کہ قصور
نظم کا پہلے سلیقہ تھا نہ اب کچھ ہے شعور
اِس پہ طرّہ ہے کہ ہوں ضعف سے بیحد مجبور
معترف خود ہوں کہ پہلے تھا نہ اب کچھ ہوں میں
آپ کی ہو نظرِ لطف تو سب کچھ ہوں میں

التماس اور یہ ہے آپ سبھوں سے بہ ادب
جتنے اعضائے رئیسہ ہیں وہ بیکار ہیں سب
جودتِ ذہنِ رسا نام کو باقی نہیں اب
شرطِ خدمت نہ بجا لاؤں یہ ہے اور غضب
ایک بچے سے بھی کم تاب و تواں رکھتا ہوں
اب تو کہنے کیلئے منہ میں زباں رکھتا ہوں

آخری بڑی مجلس جو حضرت عروج نے پڑھی وہ مجلس تھی جو جناب خان بہادر سید ابو محمد صاحب نے مارچ سنہ ۱۹۳۰ء کے آخری اتوار کو لکھنؤ کے آصفی امام باڑے میں منعقد کی تھی۔ ہر قوم و مذہب کے لوگوں کا ایک عظیم الشان مجمع تھا اور ہر شخص حضرت عروج کے کمالِ فن کا معترف نظر آتا تھا۔

مجلسِ عزا مسلمانوں کی مذہبی چیز ہے، مگر حضرت عروج کے پڑھنے کی مجلسوں میں ادبی ذوق رکھنے والے ہندو حضرات بھی بڑے شوق سے شرکت فرماتے تھے۔ راقم حروف نے ایسے جن لوگوں کو مجلس میں موجود دیکھا ہے، اُن میں مشہور شاعر پنڈت برج نرائن چکبست مرحوم اور فاضل ادیب پنڈت منوہر لال صاحب زتشی کے اسمائے گرامی خاصکر قابلِ ذکر ہیں۔

اگر کوئی شخص کسی فن کی واقفیت کے ساتھ ساتھ علمی منزلت، اخلاقی عظمت اور مالی وجاہت بھی رکھتا ہو تو یہ پتہ لگانا دشوار ہوگا کہ اُس کو جو وقعت حاصل ہے اُس میں کتنا دخل اُس کے کمالِ فن کو ہے اور کتنا دوسرے اسبابِ احترام کو۔ مگر حضرت عروج کو صرف مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے کمال کی بدولت وہ عزت حاصل تھی کہ بڑے بڑے اہلِ علم وفضل اور صاحبانِ جاہ و ثروت اُن کے اِس کمال کے سامنے سر جھکاتے تھے۔ حضرت عروج نے اپنے ایک ابتدائی مرثیے میں اِس حقیقت کا اعتراف یوں کیا ہے:-

پہلے اِس طرح کی حاصل تھی بلندی مجھے کب — مدح سے آلِ نبی کی یہ ملا ہے منصب
عرش پر جانے کا بے شبہ قرینہ ہے یہی — یعنی منبر مری معراج کا زینہ ہے یہی
طے کروں مدح کا جادہ یہ نہ تھی میری مجال — یہ کیا اُس کے کرم نے مجھے دم بھر میں نہال
اُس کی رحمت سے درِ شاہِ نجف تک پہنچا — کوکبِ بختِ رسا برجِ شرف تک پہنچا
میں کوئی شے نہیں اسکا ہے مجھے خود اقرار — پر خدا کو تو کوئی امر نہیں ہے دشوار
گو کہ ناچیز تھا اِک ذرۂ بے قدر تھا میں — اُس کی ادنیٰ نظرِ مہر ہوئی بدر تھا میں

ایک دوسرے مرثیے میں کہتے ہیں:-

مجھ سے ناچیز کا دیکھو تو ذرا عز و وقار — خادمانِ شہِ والا میں ہے میرا بھی شمار
مجھ کو مطلب نہیں کچھ کوئی اگر ہو زردار — ابنِ زہرا کی غلامی سے مجھے ہے سروکار

خادمِ خاص امامِ مدنی ہوں میں تو
درِ حیدر کی گدائی سے غنی ہوں میں تو

رحمتِ خالقِ اکبر سے یہ رتبہ پایا — ذاکرِ سبطِ رسول دوسرا کہلایا
مرتبہ مجھ کو یہ آقا نے عطا فرمایا — چترِ زریں ہے مرے سر پہ علم کا سایا

فخر ہو اپنے مقدر پہ نہ کیونکر مجھکو
تختِ شاہی سے زیادہ ہے یہ منبر مجھکو

حضرت عروج کو اپنے کمال کا صلہ اہلِ ذوق سے تعریف و تحسین کی شکل میں اور اہل دول سے نقد نذرانے کی صورت میں ملتا تھا جس کی بدولت مرحوم فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اِس انفرادی اور نجی قدردانی کے علاوہ اجتماعی اور سرکاری طور پر بھی مرحوم کے کلام کی قدر کی گئی۔ اُن کے تین مرثیوں کا ایک مجموعہ "معراج سخن" کے نام سے انڈین پریس الہ آباد نے ۱۹۲۹ء میں شائع کیا تھا، اُس کو اِس صوبے کی سرکاری ادبی انجمن "ہندوستانی اکیڈمی" نے اُس سال کی بہترین منظوم تصنیف قرار دیکر مصنف کو پانچسو روپے کے انعام کا مستحق قرار دیا تھا۔ افسوس ہے کہ اکیڈمی کے اس فیصلے کے کچھ ہی دن بعد حضرت عروج کا انتقال ہوگیا اور وہ روپیہ اُن کی بیوہ کو وصول ہوا۔

حضرت عروج کو قدردانانِ سخن لکھنؤ کے باہر مجلسیں پڑھنے کے لئے بڑے شوق سے بُلاتے تھے آپ جہاں جاتے تھے وہاں کے بڑے سے بڑے لوگ آپ کو آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ لکھنؤ کے باہر چار جگہ آپ کے پڑھنے کی سالانہ تاریخیں معین تھیں۔ ریاست محمود آباد ضلع سیتاپور میں والیِ ریاست کے یہاں ۲۱۔ رمضان۔ ریاست اصغر آباد ضلع علی گڑھ میں راجہ اصغر علی خاں صاحب مرحوم کے یہاں، ۲۷۔ صفر۔ ریاست بلوہ ضلع سیتاپور میں چودھری علی اختر صاحب کے یہاں ۴۔ ربیع الاول۔ اور حیدرآباد دکن میں نواب تہوّر جنگ بہادر کے یہاں عشرۂ محرم۔ اِن مقامات میں سے حیدرآباد اور محمود آباد کے تعلقات کئی پشتوں کے تھے۔

نواب تہوّر جنگ بہادر نے ایک مرتبہ نہایت عقیدت سے بڑے اہتمام کے ساتھ میر انیس کو حیدرآباد بُلایا۔ اُن کی خواہش تھی کہ میر صاحب ہر سال تشریف لے جایا کریں۔ لیکن کچھ تو طولانی سفر کی تکلیفیں، کچھ یہ احساس کہ اہل حیدرآباد مغز سخن تک اُس طرح نہیں پہونچتے جس طرح اہل لکھنؤ۔ غرضکہ میر انیس دوبارہ حیدرآباد تشریف نہ لے گئے، اور اُن کی جگہ اُن کے نامور صاحبزادے میر نفیس ہر سال جایا کیے۔ میر نفیس کے انتقال کے بعد نواب صاحب کی طلب پر حضرت عروج حیدرآباد جانے لگے۔ نواب تہوّر جنگ کی وفات کے بعد اُن کے صاحبزادے نواب بشیر جنگ اور نواب عنایت جنگ ہر سال حضرت عروج کو طلب فرماتے رہے۔

ریاست محمود آباد کے نامور رئیس امیر الدولہ راجہ سر امیر حسن خاں صاحب بہادر میر نفیس سے بڑی عقیدت رکھتے تھے، حضرت عروج کی بھی بہت قدر کرتے تھے۔ راجہ صاحب مغفور کے فرزند و جانشین مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں صاحب مرحوم حضرت عروج کی جو عزت کرتے تھے اس کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

ایک مرتبہ لکھنؤ میں مہاراجہ صاحب مرحوم ایک مجلس میں اپنا تصنیف مرثیہ پڑھنے والے تھے، ایک کثیر مجمع تھا۔ شہر کے بڑے سے بڑے لوگ مجلس میں شریک تھے، حضرت عروج بھی منبر کے سامنے تشریف رکھتے تھے۔ مجلس شروع ہوئی اور مہاراجہ صاحب کے کلام اور خوانندگی نے اہل مجلس کو مسحور کر دیا۔ ایک وجد اور بیخودی کا عالم تھا، تحسین و آفریں کا غلغلہ بلند تھا۔ اس عالم میں جب کبھی حضرت عروج تعریف کر دیتے تھے تو مہاراجہ صاحب منبر پر کھڑے ہو کر ادب سے تسلیم کرتے تھے، اور فرماتے تھے "یہ سب حضور ہی کا طفیل ہے"۔ اسی ایک مثال سے واضح ہو جائیگا کہ حضرت عروج کو اپنے کمال کی بدولت کیا عزت و وقار حاصل تھا۔ مہاراجہ صاحب مرحوم کے فرزندِ رشید اور ریاست محمود آباد کے موجودہ مسند نشین عالیجناب راجہ محمد امیر احمد خاں صاحب بہادر دام اقبالہٗ جس طرح مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے فن میں اپنے والد ماجد کے قدم بقدم ہیں اُسی طرح قدردانیِ کمال میں بھی اُن کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں، اور حضرت عروج مرحوم کے صاحبزادے جناب فائز کی بہت عزت اور قدر فرماتے ہیں۔

لکھنؤ میں اس وقت بھی اچھے اچھے مرثیہ گو اور مرثیہ خواں موجود ہیں۔ مگر ہر فن کی ترقی اُس کی قدردانی پر منحصر ہے، اور اب قدردانی کا یہ حال ہے کہ متعدد نہایت قابلِ قدر حضرات جنھوں نے اپنی ساری عمر فنِ مرثیہ گوئی کی تکمیل میں صرف کر دی، اس فن کے ذریعے سے اتنا مالی نفع بھی حاصل نہیں کر سکتے کہ آسانی سے اپنا پیٹ بھر سکیں۔ اور تن ڈھانک سکیں، خوش حالی اور فارغ البالی کا تو ذکر ہی کیا۔ اس ناقدری کے زمانے میں یہ اُمید نہیں کی جا سکتی کہ کوئی دوسرا عروج پیدا ہو۔ اِس لیے یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں کہ مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کا وقار حضرت عروج کے دم سے قائم تھا اور اُنھیں کے ساتھ رخصت ہو گیا۔

حضرت عروج نے ۱۲ مئی ۱۹۳۱ء مطابق ۱۲ ذوالحجہ ۱۳۴۹ھ کو چہارشنبہ کے دن دوپہرے قبل ستتر سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ مرحوم کے فرزند حضرت فائز نے بڑے اہتمام سے جنازہ اُٹھایا اور دریائے گومتی میں غسل دے کر اپنے جدِ اعلیٰ میر انیس کے مقبرے میں شب پنجشنبہ دفن کیا۔

ہمیشہ رہے نام اللہ کا!

سرِ ما ... سرِ سرو و سرِ سنبل و سرِ یاسمن

سرِ کوہ و بیابانے و سرِ گلشن و چمن

سرِ نور چراغے و سرِ گاہ و در انجمن

ترجمہ
کبھو سجن کبھو تلسی چندن ۔ کبھو پریت پھلواری اور بن
دیا جھلک کبھو باس پھول) کی ۔ بن بستی سب تیرے درپن

سید مقبول حسین احمدپوری

آفتاب

(از پنڈت اندرجیت شرما۔ ماچھرہ ضلع میرٹھ)

کس کی تلاش ہے تجھے دن رات آفتاب | ہر روز صبح صبح دکھاتا ہے سُرخ رو
آرائشیں تری ہیں یہ کس درجہ کامیاب | اتنا حسیں نہیں کوئی جتنا حسیں ہے تو

اِس وقت تیرا اور ہی کچھ رنگ ڈھنگ ہے
شوخی سی ہے نگاہ میں، دل میں اُمنگ ہے

کرتا ہے گشت چرخ پہ شان و شکوہ سے | اتنا سُبک خرام ہے تو کس اُمید پر
نیلی فضا میں جاتا ہے اونچا ہی کوہ سے | اللہ رے طویل ہے کتنا ترا سفر

ہوتا ہے چُور تو جو سفر کے تکان سے
کرتا ہے رُخ زمیں کی طرف آسمان سے

لیکن ہیں اب وہ صُبح کی سرگرمیاں کِدھر | شوخی کہاں گئی وہ شرارت کہاں گئی
قابو نہیں رہا ترا رنگِ شکست پر | صبر و سکوں کی رُخ پہ علامت نہیں رہی

ہے زرد زرد رنگ سے افسردگی عیاں
حسرت بھری نگاہ ہے پھر سوئے آسماں



کرشن جنم

از مسٹر راجیندر نرائن سکسینہ، بی۔اے

۱

دہر پر خاموشیاں چھائی ہوئی تھیں شام سے — کالے کالے بادلوں میں چھپ گئی تھی بھیگی رات
کوئی شئے واقف نہ تھی آغاز اور انجام سے — کیفِ مدہوشی میں ڈوبا تھا نظامِ کائنات

۲

یک بیک ہونے لگے روشن زمین و آسماں — چھپ گئیں تاریکیاں مہتاب کی آغوش میں
نیم شب تھی، تھا اسیرِ خوابِ غفلت اِک جہاں — ٹمٹماتے تھے ستارے وادیِ خاموش میں

۳

گا رہی تھی معرفت کے کیف زا نغمے نسیم — روح کو ملتا تھا ہر لمحہ یہ پیغامِ حیات
عطر افشاں تھی فضا میں غنچہ و گل کی شمیم — اِک بہارِ گل بداماں تھی نمودِ کائنات

۴

بارگاہِ قدس میں ہر پاک تن خاموش تھا — سر بسجدہ تھے ملائک اِک عجب انداز سے
نور سے معمور تھی خُلدِ بریں کی کُل فضا — چل رہی تھی بادِ فردوسِ بریں صد ناز سے

۵

خندہ زن تھا پھول تو غنچہ تبسم ریز تھا — دید کے قابل تھیں فواروں کی گوہر ریزیاں
چہچہاتے تھے خوشی سے طائرانِ خوش نوا — کس قدر جاں بخش تھیں قدرت کی رنگ آمیزیاں

۶

جنت الفردوس تھی یا اِک طلسمِ رنگ و آب — خوں میں آلودہ نظر آتا تھا دامانِ بہار
غنچہ و گل کی وہ مستی جس پہ قرباں خود شباب — کر دیئے شبنم نے موتی حسنِ فطرت پر نثار



۷

برابطِ قدرت سے ناگہ اک صدا پیدا ہوئی ذرہ ذرہ کیفیت میں جھومتا تھا بار بار
دہر کی ہر شَے سے پیدا تھی نوائے زندگی وہ نوا مدت سے تھا ہستی کو جس کا انتظار



۸

اِس سہانے وقت میں اُس برگزیدہ روح کا عرشِ بالا سے ہوا دُنیائے فانی میں ظہور
رازِ الفت آشنا تھی جس کی لَے کی ہر صدا جس کے نغموں سے نمایاں تھا محبت کا سرور

جذباتِ شایق

(از مسٹر کیلاش ورما شایق بی۔اے ہنگامی)

کبھی ہوں عینِ حقیقت کبھی مجاز ہوں میں جہانِ راز میں پوشیدہ ایک راز ہوں میں
انیسِ غم ہوں مگر غم سے بے نیاز ہوں میں کہ خود ہی درد ہوں اور خود ہی چارہ ساز ہوں میں
نیاز ختم ہے مجھ پہ تمام ناز ہوں میں * جو اپنا آپ ہے محمود وہ ایاز ہوں میں
قبول ہو کے رہا رنگِ ناتمامیٔ عشق نظر میں حسنِ مکمل کی سرفراز ہوں میں
نفس نفس سے ہے آہنگِ زیست کا اظہار ہزار راز کے پردوں کا ایک ساز ہوں میں
ہزار شکر کہ تکمیلِ عشق ہو کے رہی کہ ناز یوں اُٹھا بندۂ نیاز ہوں میں
کشیدگی بھی تعلق میں کارفرما ہے تمام ناز ہیں وہ سربسر نیاز ہوں میں

عجب ہے کیا جو حقیقت سے دور ہوں شایق
فریب خوردۂ نیرنگیٔ مجاز ہوں میں



۱۶۱

گیتا اور تصوّف

از منشی منظور الحق کلیم

ہندوستان جس طرح تمدن و معاشرت میں دوسری مہذب قوموں کا گرو تھا اُسی طرح وہ روحانیت میں بھی کمال پر پہونچا ہوا تھا۔ سری کرشن جی کی گیتا اُس زرّین عہد کی بہترین یادگار ہے۔

گیتا مہابھارت مصنفہ وید بیاس کے بھیشم پرب کا جزو ہے اس میں اٹھارہ باب اور سات سو منتر ہیں جن میں وہ اُصول اور نصیحتیں درج ہیں جن کی سری کرشن جی نے مہابھارت کی لڑائی کے موقعہ پر ارجن کو تلقین کی تھی۔ اسی کو دیاس جی نے نظم کرکے کتاب مہابھارت میں منسلک کر دیا۔ دیاس جی کے متعلق داراشکوہ کے الفاظ یہ ہیں:-

"کلام راحت انجام حق اساس حقیقت شناس معرفت بے قیاس وحدت محاس محرم اسرار خاص الخاص سوامی بیاس کہ تعریفش از ہرچہ گویند افزوں و توصیفش از ہرچہ نویسند خارج و بیروں است"

مہابھارت کی لڑائی دو حقیقی بھائیوں دھرتراشٹر اور راجہ پانڈو کی اولاد کے درمیان ہوئی تھی۔ دھرتراشٹر نابینا تھے اس لئے راجہ پانڈو کو سلطنت ملی تھی۔ راجہ پانڈو کی وفات کے بعد دریودھن دھرتراشٹر کا بڑا بیٹا کاروبار سلطنت کیا کرتا تھا، اس نے پانڈو کے لڑکوں کا حق جو ریاست کے اصلی وارث تھے دغا سے چھین لینا چاہا اور ان کو اذیت پہونچانی شروع کی یہی جنگ کا سبب ہوا۔

گیتا کے پہلے باب میں سینتالیس منتر ہیں۔ دھرت راشٹر اپنے رتھ بان سنجے سے جنگ کا حال پوچھتے ہیں اور وہ طرفین کے حالات کی اطلاع دیکر کہتا ہے کہ جب طرفین لڑائی کے لئے صف آرا ہوئے تو دریودھن نے اپنے اُستاد بھیشم سے کہا کہ ہماری طرف فلاں فلاں بہادر ہیں، اس کے بعد ارجن نے موقع جنگ کا معائنہ کیا اور کرشن جی سے فرمایا کہ ان میں میرے تمام اعزہ، اُستاد دوست شامل ہیں، سلطنت کے لئے میں ان کا خون نہیں بہا سکتا، یہ کہہ کر افسردہ خاطر ہوکر رتھ میں بیٹھ رہے۔

گیتا کے دوسرے باب میں جس میں سانکھیہ یوگ سے بحث کی گئی ہے ۷۲ منتر ہیں۔ اس میں کرشن جی نے ارجن کو سمجھانے کے تین طریقے اختیار کئے ہیں۔ پہلے مردانگی کی غیرت دلائی اور جب دیکھا کہ نامردی نہیں ہے بلکہ اگیان مانعِ جنگ ہے تو حیات و موت پر فلسفیانہ روشنی ڈالنی شروع کی، اور بتایا کہ روح کو فنا نہیں، یہ لازوال اور ایک حالت پر قائم ہے اور زندگی و موت روح کے اتصال و انفصال کا نام ہے۔ جو نمود بے بود ہے، پس عارف موت اور حیات کے وہم کو خیال میں نہیں لاتے۔ ماضی اور مستقبل کو چھوڑ کر حال پر نظر رکھتے ہیں، اس کے بعد انسانی فرائض پر توجہ دلائی کہ حق پر جنگ کرنا اس کا فرض ہے۔ اس باب کے چند منتر وضاحتِ بیان کے لئے حسب ذیل ہیں:-

منتر ۱۲

नत्वे वाहं जातु नासं नत्त्वं ने मे जनाधिपा ।
न चैव न भीवष्यामः सर्वे वयमतः परम ॥ १२

مطلب: ایک آتما یعنی روح مجھ میں تجھ میں اور ان سب راجاؤں میں بسیط ہے، وہ نہ کبھی پیدا ہوئی اور نہ آئندہ پیدا ہوگی، وہ قدیم ہے اور سب اجسام میں ساری ہے اور سب کو ظاہر کرنے والی ہے، اور ان اجسام کا وجود در اصل طلسمی ہے، وہ قادرِ مطلق کا پرتو ہے، جس کی وجہ سے ہم تم اور یہ راجگان فرض کئے جاتے ہیں، یہ سب اشکال فانی اور بے ثبات ہیں۔ ہستی بحت جاودانی اور فنا سے بالاتر ہے۔

ہے اصل وجود ایک باقی فانی　　اشکال کا نام ہے وجودِ ثانی
پانی سے بخار، ابر، بوندیں پھر برف　　جب گھل گیا برف پھر ہے پانی پانی

منتر ۱۴

मात्रा स्पर्शास्तु कौंनय शीतो षण सुरव दुःरव दा ।
आगमभा पायिनो निन्यास्त्वांति ति सरव भारतः ॥ १४

مطلب: ماترا سپرش یعنی احساس جو ایک قدرتی تعلق علم ذات اور علم صفات میں ہے، یہی راحت و رنج دینے والے ہیں۔ جب نفس انسانی بے یادِ خالق اندر جاتا ہے تب وہ اپنا اثر کرکے پندار پیدا کرتا ہے، اس پندار کی وجہ سے رنج و راحت محسوس ہوتے ہیں۔

منتر ۴۴

भोगैश्वर्य प्रसक्तानां तया पहृत चेतसाम् ।
व्यवसाया त्मिका बुद्धिः समाधौन विधीयते ॥ ४४

مطلب: جن کا دل لذات اور دولت میں پھنس کر ایک ہو جاتا ہے محویت کی جانب

اُن کی رائے سلیم نہیں ہوتی۔ (وہ بطون میں معشوق حقیقی کو نہیں دیکھ سکتے اور علم خودشناسی سے بے نصیب رہتے ہیں من عرف نفسہ فقد عرف ربہ سے بیگانہ رہتے ہیں۔)

मنتر ۴۶

यावानर्थ उदपाने सर्वतः संप्लु तोदके ।
तावान्स वेर्षु वेदेषु ब्राह्मणस्य विजानतः ॥ ४६

مطلب: برہم کے جاننے والے عارف کا ویدوں سے اتنا ہی مطلب باقی رہتا ہے کہ جتنا آسودہ انسان کا کنوئیں، تالاب دریا وغیرہ مقامات آبی سے۔

منتر ۵۱

कर्मजं बुद्धियुक्ता हि फलं त्यक्त्वा मनीषिणः ।
जन्म बंधा विनिर्मुक्ताः पदं गच्छं त्यानामयम ॥ ५१

جو عارف گیان یوگ علم خودشناسی پر قادر ہو کر فعل کے نتیجہ کی پرواہ نہیں کرتے، وہ پیدائش کی قید سے آزاد ہو کر سرور ابدی کا مقام پاتے ہیں۔

تیسرے باب میں تینتالیس منتر ہیں، جس میں ارجن کو یہ بتایا گیا ہے کہ افعال لازمی ہیں جن سے کسی کو نجات نہیں ملتی، افعال کا مبداء قدرت ہے، قدرت ہی کی حرکت سے کل عالم متحرک ہے، ذات پاک اور بے لوث ہے۔ دلی تعلق اور انانیت کو ترک کر کے فعلوں کا کرنا ان سے بریت حاصل کرنے کا طریقہ ہے، یعنی حواس کو شوق اور نفرت کا مطیع نہ ہونے دے اور اُن کے فعلوں کا باعث قدرت کو جاننے سے پابندیِ افعال چھوٹ جاتی ہے۔

منتر ۱۰

सहयज्ञाः प्रजाः सृष्ट्वा पुरोवाच प्रजापतिः ।
अनेन प्रसविष्यध्व मेवोऽ स्त्विष्ट कामधुक ॥ १०

قادر مطلق نے مخلوقات کو ریاض کرنے کی قوت دیکر پیدا کیا اور ہدایت کی کہ تم اس کے وسیلہ سے ترقی کرو اس سے تمہارے مطالب پورے ہونگے۔

منتر ۳۸

धूमेना व्रियते वह्नि यथा दर्शो मलेनच ।
यथोल्बेना वृता गर्भस्तथा तेनेदमा वृतम ॥ ३८

مطلب: جیسے دھواں آگ کو اور میل آئینہ کو جھلی بچہ کو چھپا لیتی ہے ویسے ہی خواہش علم ذات کو پوشیدہ کر دیتی ہے۔

منتر ۴۳

एवं बुद्धेः परं बुद्ध्वा संस्तभ्यात्म नमात्मना ।
जहि शत्रुं महा बाहो काम रूपं दुरासदम ॥ ४३

اوپر کے اشلوکوں میں یہ بتایا گیا تھا کہ جسم کثیف سے حواس برتر، حواس سے دل، دل سے عقل، عقل سے خواہش برتر ہے، اسی کی طرف اس اشلوک میں اشارہ ہے کہ اے آرجن! جو اِس طور پر عقل سے برتر بیان کیا گیا ہے اس کو جان کر اور دل کو اپنے قابو میں کر کے تو اس زبردست دشمن کو جو خواہش کی صورت رکھتا ہے ہلاک کر مراد یہ ہے کہ ذات پاک چھوٹے سے چھوٹے ذرّے اور بڑے سے بڑے عالم میں موجود ہے اور وہ اندریوں (قویٰ) اور من، بُدھی سے برتر ہے پس دانش کو اس میں دخل نہیں، صرف حالتِ کیف میں اس کے جمال کا مشاہدہ ہوسکتا ہے۔ انسان علم ذات میں مسرور رہکر اور خواہش کے افعال سے بے تعلقی اختیار کر کے خواہش کو پیدا نہ ہونے دے، خواہش کا مخزن خیال ہے اس لئے خیال کے روکنے سے خواہش کا سلسلہ رُک جاتا ہے۔

چوتھے باب میں بیالیس منتر ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ روح لازوال، محیط اور قدیم ہے اور مصدر علم و سرور ہے، اس کا علم کبھی ضائع نہیں ہوتا، البتہ کبھی پوشیدہ اور کبھی آشکارا ہوتا رہتا ہے صرف عارف اِس رمز کو جانتے ہیں جاہل صفت ادنیٰ کے غلبہ سے اس کے سمجھنے سے معذور ہیں انسانوں میں صرف صفت اور فعل کا فرق ہوتا ہے، روح سب میں یکساں موجود ہے۔ روح جسمانی افعال اور اُن کے نتیجے سے بے تعلق رہتی ہے۔ پس انسان بے تعلق ہو کر فعل کرنے سے روح میں واصل ہو سکتے ہیں، ترکِ فعل کے یہی معنی ہیں۔ فعل دو قسم کے ہوتے ہیں فعل باتعلق اور فعل بے تعلق۔ فعل باتعلق میں نیک و بد کی تمیز ہوتی ہے اور فعل بے تعلق میں تمیز نیک و بد اُٹھ جاتی ہے۔ اس طرح پر عمل کرنے سے تمام افعال آتشِ عرفان میں سوخت ہوجاتے ہیں اور انسان ذات میں مستغرق ہوجاتا ہے۔

منتر ۱۷

कर्मणो ह्यपि वोद्धव्यं वोद्धव्यंच विकर्मण ।
अकर्मणश्च वोद्धव्यं गहना कर्मणो गति: ॥ १७

مطلب:۔ نیک افعال بد افعال اور ترک افعال میں تمیز کرنا واجب ہے ترک افعال کی ماہیت کا دریافت کرنا مشکل امر ہے۔

منتر ۱۸

कर्मण्य कर्मय: पश्ये दकर्मीणि चकर्मय: ।
सुबुद्धिम न्मनुष्येष सयुक्त: कृतुन कर्मकृत ॥ १८

مطلب:۔ جو بشر افعال میں ترک افعال کا ہونا اور ترک افعال میں افعال کا ہونا مشاہدہ کرتا ہے وہ عارف اور واصل ہے چاہے تمام افعال اس سے سرزد ہوتے ہوں۔

نتیجہ کی اُمید رکھ کر خواہش کے ساتھ جو کچھ کیا جاتا ہے وہ فعل کہلاتا ہے بلا اُمید نتیجہ اور بے خواہش جو کچھ سرزد ہوتا ہے اُسے فعل سے بریت کہتے ہیں فعل دونوں میں ہوتا ہے فرق انسان کے تعلق اور بے تعلقی سے کرنے کا ہے۔ فعل سے بریت کے معنی ترک فعل نہ سمجھنا چاہیئے۔ بریت از فعل ایک حالت کیف کی ہے جو بہت غور سے معلوم ہو سکتی ہے

منتر ۲۴

ब्रह्मार्पणं ब्रह्महबि ब्रह्माग्नौ ब्रह्मणाहतम ।
ब्रह्मेव तेन गंतव्यं ब्रह्म कर्म समाधिना ॥ २४

جو یگیہ کرتے کو یگ میں ڈالنے کی شئے کو یگیہ کی آگ کو یگ کرنے والے کو ذات واحد تصور کرتا ہے اس کا ذات واحد سے وصال ہوتا ہے ٥

صوفی شدہ نیست اینست را مذہب نیست　　با دوست رسیدہ را دگر مطلب نیست
رب رس رب شد تمام رب را رب نیست　　ہر جا خورشید ہست آنجا شب نیست

اگلے منتروں نمبر ۲۵ تا ۳۰ میں مختلف قسم کے یگیہ پر روشنی ڈالی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مختلف قسم کے یگیہ یعنی ریاض مثلاً بعض جو فعل کے پابند ہیں دیوتاؤں کا یگیہ کرتے ہیں۔ بعض ذات واحد کی آگ میں عمل کو عمل کی مدد سے جلاتے ہیں۔ نمبر ۲۵ بعض قوت سامعہ وغیرہ حواس کو ضبط کی آگ میں جلاتے ہیں، بعض صوت وغیرہ محسوسات کو حواس کی آگ میں جلاتے ہیں۔ نمبر ۲۶۔ بعض سب حواس کے فعلوں اور نفس کے فعلوں کو ضبط دل کی آگ میں جو علم ذات سے روشن ہے۔ جلاتے ہیں۔ نمبر ۲۷ بعض مستقل مزاج طالب، خیرات کا یگ، یوگ کا یگ، تحصیل علوم معقولات اور منقولات کا یگ کرتے ہیں۔ نمبر ۲۸۔ بعض لوگ جو اندازہ کے موافق غذا کھاتے ہیں پرانوں کو پرانوں میں منقوت کرتے ہیں۔ نمبر ۲۹۔ بعض اشخاص جو حبس نفس کے شاغل ہیں پران اور اپان (اندر داخل ہونے والی اور باہر نکلنے والی سانس) کو روک کر پران کو اپان اور اپان کو پران میں جھونکتے ہیں۔
اوپر کے منتروں سے پتہ چلتا ہے کہ یگیہ کا اشارہ مختلف اشغال کی طرف ہے؛

منتر ۳۴

तद्धि द्धि प्रणिपातेन परि प्रश्नेन सेवया
उपदे क्ष्यंति ते ज्ञानं　　ज्ञानिन स्तत्व दर्शिनि ३४

(اے ارجن) سمجھ لے کہ حقیقت شناس عارف تعظیم، التجا اور خدمت کے کرنے پر تجھے وہ علم (معرفت) بتائیں گے ٥

راہِ حق کی ہے اگر آتی تلاش　　خاکِ پا بن مردِ حق آگاہ کی

پانچویں باب میں انتیس[۲۹] منتر ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ کیفیت قلبی کی دو صورتیں ہیں، ایک کا نام سانکھ یعنی علم حقیقت دوسری یوگ یعنی علم معرفت یوگی تمام افعال جسمانی کو کرتے ہوئے بھی نظر بباطن رہتا ہے مگر اور طریقوں کے شاغل جب کاروبار دنیوی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں نظر بالغیر ہو جاتے ہیں۔ یوگی کے معنی واصل اور سنیاسی کے معنی تارک کے ہیں مشاہدہ روح کی ترکیب حسب ذیل لکھی ہے۔

स्पर्शा कृत्वा वहि वाह्यां श्चक्षुश्चै बांवरे भ्रवो ।।
प्राणा पानौ समौ कृत्वा नासाभ्यंतर चारिणो ॥ २७
यतेन्द्रिय मनो बुद्धि मुनि मोक्ष परायण : ।
विगतेच्छा भय क्रोधः यः सदा मुक्त एवसः २८

جو عارف تعلقات بیرونی کو باہر کر کے اور نظر کو اُم الدماغ کے وسط میں ٹھہرا کر اور ناک میں سے گزرنے والے انفاس بالا و پائیں کو مساوی کر کے حواس، دل اور عقل پر قادر ہو جاتا ہے آزادی حاصل کرتا ہے اور خواہش خوف اور غصہ سے مخلصی پاتا ہے وہ ہر وقت نجات[؟] رکھتا ہے یہی نصیرا محمود کا شغل ہے۔

چھٹویں باب آتم سم یم یوگ نامی میں سینتالیس منتر ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ناساگر دھیان یعنی شغل طاوسی سے انضباط قلب پیدا ہوتا ہے اور یوگ کا تعلق بیرونی افعال سے صرف اس وقت تک رہتا ہے جب تک کہ کشایش باطنی حاصل نہیں ہوتی۔ جب شاغل قلب کی سیر دیکھنے لگتا ہے اُس وقت اُسے کل اندرونی قوتیں کام میں لانی پڑتی ہیں۔

उद्धरे दात्मानात्मानं नात्मान मवसादयेत ।
आत्मैव ह्यात्मनो बंधुरा त्मैव रिपुरात्मन:

انسان دل (روح) کو عروج دے نہ کہ اس کو پستی میں گرائے دل ہی اپنا دوست ہے اور دل ہی اپنا دشمن۔ ان فی الجسد مضغۃ ان صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب ؎

دے دل کو عروج اس کو پستی میں نہ لا	ہے دوست بڑا اس کو نہ مٹی میں ملا
گر اس کی عناں چھوٹ گئی ہاتھوں سے	دشمن نہیں اس سے بڑھ کے کوئی تیرا

यथा दीपो निवातस्थो नेगंते सोपमा स्मृता
योगिनो यत चित्तस्य युञ्जतो योगमात्मन: १९

(ترجمہ) چراغ کی لو بند ہوا میں نہیں ہلتی یہ اس یوگ کی مثال ہے جو خیال پر قادر ہے اور جس کا دل یوگ میں مصروف ہے۔

ساتویں باب گیان وگیان یوگ نامی میں تیس منتر ہیں۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اوپر کے ابواب میں اشغال وریاض کا جو بیان ہے اس سے اشراق حاصل ہوتا ہے۔ اور اس سے وہ پرکرتی کے سات طبقوں کی سیر دل میں کرتا ہے۔ قدرت نے کارن سے سوکشم اور سوکشم سے استھول ہو کر غیب سے ظہور کی طرف نزول کیا ہے اور رنگا رنگ اشیا پیدا کی ہیں جیسے کہ پانی حرارت طبعی کے کم ہو جانے سے منجمد ہو کر مختلف اشکال برف، ژالہ، یخ، گلیشر وغیرہ کی شکل اختیار کرتا ہے۔

پانچ مہا بھوت (عناصر بسیط) پانچ گن (خاصیت عنصری) پانچ گیان اندری (حواس علمی) پانچ کرم اندری (قوت افعالی) پانچ پران (انفاس) انھیں چھبیس کا نام پرکرتی ہے۔ یہ عالم میں بصورت کل اور ہر انسان میں بصورت جزو موجود ہیں، کل کا نام تت پدیا ایشر ہے اور جزو کا نام تم پدیا جیو ہے انھیں کے امتزاج سے کل اشکال نمود پاکر پھر کسی وقت اصلی خزانہ میں مل جاتی ہیں۔

علم جزویت کل پر حاوی نہیں ہو سکتا اور واقعات کو ظاہر نہیں کر سکتا۔ علم کلیت بطون میں مشاہدہ کیا جاتا ہے اور وہ راست ہے۔

آٹھویں باب مہا پرش یوگ میں اٹھائیس منتر ہیں۔ اس باب میں ادھی یگ یعنی ذات بے نشان تک رسائی کا طریقہ درج ہے جو عقل کی رسائی سے پرے ہے۔ علم اشراق کے ذریعے اس کا علم ہوتا ہے اس میں ترپٹی دھیان اور آتم دھیان کا تذکرہ ہے جس پر عمل کرکے یہ انکشاف ہوتا ہے۔

अयास योग युक्तेन चेतसा नाऽ च गामिना ।

परमं पुरुषं दिव्यं याति पार्थानु चिंतयन् ॥ ८

اے ارجن دل کو شغل کی مدد سے یکسو کرکے اعلیٰ اور حیرت افزا ذات کا تصور کرنے سے پہلے وصال حاصل کر سکتا ہے۔

مضمون کی طوالت کو مدنظر رکھتے ہوئے بقیہ ابواب کے بیانات کا صرف خلاصہ درج کیا جاتا ہے جس سے پوری کتاب پر روشنی پڑ جائیگی۔

نویں باب میں معرفت کی اس حالت کو دکھلایا گیا ہے جس کا سمجھنا حیطۂ عقل سے باہر ہے اور جس میں عارف ذات پاک کو ہر ذرہ میں محیط اور ہر شئے سے بری دیکھتا ہے۔

دسویں باب میں اس کیفیت کا بیان ہے جو معرفت کے استغراق کے بعد یعنی عالم کی کثرت

میں وحدت کا جلوہ نظر آنے پر عارف کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور جس کی مدد سے وہ اپنی ہستی کو ماضی و مستقبل میں موجود اور عالم کے ظہور کا باعث جانتا ہے۔

گیارھویں باب میں وصال کی جلالی اور جمالی دونوں صورتیں جو علم معرفت کے حاصل ہونے پر دریافت ہوتی ہیں ارجن کو عین الیقین کرا دی گئیں اور اُس نے ان میں سے جمالی پسند کی۔

بارھویں باب میں جمالی وصال کے قائم رکھنے کے لئے عشق حقیقی کا ہونا لازمی بتایا گیا ہے۔

تیرھویں باب میں عشقِ حقیقی کی شناخت کے واسطے جسم اور جان کی تشریح کی گئی ہے، اور جان کے ساتھ عشق کا ہونا حقیقی اور جسم سے عشق ہونا مجازی بتایا گیا ہے۔

چودھویں باب میں جان کا صفات سہ گانہ کے ساتھ تعلق ظاہر کیا گیا ہے اور باوجود تعلق اس کا ان صفات سے بری ہونا دکھلایا گیا ہے۔

پندرھویں باب میں صفت سہ گانہ کے وسیلے سے جان کے جسم میں نزول کرنے اور عالم کے ظہور کی کیفیت بیان کی گئی ہے، اور ذات پاک کا جسم اور جان سے برتر ہونا اور اس میں وصل ہونے والے کا فعل و عمل کی تمیز سے آزادی پانا ثابت کیا گیا ہے۔

سولھویں باب میں امر و نہی دو قسمیں جو جان کے جسم میں نزول کرنے سے پیدا ہوتی ہیں بیان کی گئی ہیں۔ سترھویں باب میں عقیدوں کی وہ تین قسمیں دکھلائی گئی ہیں جن کی پیدائش جان کے جسم میں نزول کرنے پر صفات سہ گانہ سے ہوتی ہے۔

اٹھارھویں باب میں ذات پاک کا وصال حاصل کرنے والے کی حالت جو بالمعنی نجات ہے ظاہر کی گئی ہے۔

سحر حال

[illegible]

سحر حال

[illegible]

پریم نہ پائے لوبھ کی آنکھی
پتن پتنگ کی پائے نہ ماکھی
ستمد اپنا جیون وارو
تب پریم چرنوں میں راکھی

بھلا بُرا سب بس میں اُس کے
کھُلا چھُپا سب یہی دکھا دے
ہو جو نہ باور دیکھ لے مجھکو
بس رہا نہ چلے شیطان کے آگے

مترجمہ
سید مقبول حسین
(بی اے، ایل ایل بی)
[illegible]

جذباتِ فراق

از پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق ایم۔ اے

یہ اور بات ہے وہ نہ ہوں شادماں کبھی
ہوتا ہے بیدلوں سے کوئی بدگماں کبھی

گو عشق کو ملا نہ کوئی ہم زباں کبھی
ہونی تھی اور نہ ختم ہوئی داستاں کبھی

تھے محوِ نالۂ جرسِ کارواں کبھی
بڑھ بھی گئی ہے حسرتِ پس ماندگاں کبھی

وہ نغمہ چھیڑ مطربِ آتش بجاں کبھی
کوندی تھیں جس سے طور پہ کچھ بجلیاں کبھی

بستی کبھی، اُجاڑ کبھی، لامکاں کبھی
ٹھہری نہ ایک جا مری عمرِ رواں کبھی

ایامِ خوش گوارِ محبت بھی کاٹ لے
مشکل بھی ہو رہیں گی یہ آسانیاں کبھی

یہ تاب کے حجابِ تغافل، ستم بھی کر
اپنا بھی کر خدا کے لئے امتحاں کبھی

نقشِ قدم ہیں اب نہ کہیں گردِ کارواں
منزل کو ہو سکا ہے غمِ رفتگاں کبھی

اب عشقِ بے خبر کو کسی کی خبر نہیں
دل تھا حریفِ گردشِ ہفت آسماں کبھی

کیا کیجئے جو کارِ محبت محال ہو
اب تک تو کوششیں نہ ہوئیں رائگاں کبھی

مانوس ہو چکا نگہِ آشنا سے بھی
کم ہو سکیں نہ عشق کی حیرانیاں کبھی

غم کی جھلک ہو یا وہ فریبِ نشاط ہو
تھا حسن و عشق کے بھی کوئی درمیاں کبھی

ان کے سکوتِ یاس کو اب مدتیں ہوئیں
رکھتے تھے اہلِ درد بھی منہ میں زباں کبھی

سب کچھ بھی کھو کے حسن کو پانا محال ہے
سستی ہوئی نہ ہوگی یہ جنسِ گراں کبھی

کچھ حیرتیں تھیں عشق تو کچھ حیرتیں تھیں حسن
یوں تو نہ راز تھا نہ کوئی راز داں کبھی

منصور پہ تو غمِ بے سود عشق ہے
لائے گی رنگ یہ خلشِ رائگاں کبھی

صبحِ ازل سے حسن کا مسکن دلوں میں ہے
آباد ہو سکیں نہ یہ ویرانیاں کبھی

برہم بساطِ خلوتِ دل کر گیا کوئی
تھیں رشکِ انجمن بھی یہ تنہائیاں کبھی

وہ ماجرائے عشق بھی خواب و خیال ہے
تیری نگاہ سے جو ہوا تھا بیاں کبھی

کوئی ترے فریبِ تبسم سے بچ سکا
تھا عشق بھی ملول کبھی شادماں کبھی

سازِ سکوت سازِ نواہائے راز تھے — تھیں حُسن و عشق میں یہ ہم آہنگیاں کبھی

سر بھی اُنھیں مِلا در و دیوار بھی مِلے — کم ہو سکی نہ وحشتِ زندانیاں کبھی

خاموشیاں جہان کی کچھ اور بڑھ گئیں — آئی صدائے درد اگر ناگہاں کبھی

منزل فریبِ کاوشِ پنہاں کا نام ہے — اپنی جگہ سے بڑھ نہ سکے کارواں کبھی

آوازِ صور دیکھ ابد کا سکوت دیکھ — ٹوٹا نہ اہلِ عشق کا خوابِ گراں کبھی

پرچھائیاں ہیں دار و رسن کی بھی عشق پر — مٹ کر بھی مٹ سکا ہے کسی کا نشاں کبھی

بیگانگیِ حُسن بھی اِک رنگ پر نہیں — ناواقفِ ملال کبھی، رازداں کبھی

بادِ صبا نے دل کا کنول بھی بجھا دیا — کچھ اور بات تھی کہ کھِلے گلستاں کبھی

کیا کیجیے فراقؔ کسی پر اگر کوئی
نامہرباں کی طرح ہوا مہرباں کبھی

کلامِ سحرؔ[1]

(از حضرت سحرؔ ہنگامی)

رہینِ جلوۂ تغیر امتیاز ہوں میں — کبھی ہوں نازِ سراپا کبھی نیاز ہوں میں

عیاں ہے مجھ پہ تعلق سے کل نظام کا حال — جو ایک راز ہے دُنیا تو ایک راز ہوں میں

مراد بندگیِ حق ہے، یہ نہیں معلوم — کہ بُت پرست ہوں یا بندۂ نماز ہوں میں

کسی میں بھی تو نہیں کوئی اپنی اصلیت — نشیب کی ہے خبر واقفِ فراز ہوں میں

ہے یہ بھی کوئی کرشمہ مری حقیقت کا — فریب خوردۂ نیرنگیِ مجاز ہوں میں

مری سنبھال میں ہے مرگ و زیست و مدہوشی — کہ محوِ شعبدۂ چشمِ نیم باز ہوں میں

فراق میں ہے عجب وصل کا لطیف احساس — ترا سپاس گزارِ شبِ دراز ہوں میں

بجا نہ ہو کہ نہ ہو عشق میں حصولِ کمال — ابھی تو وقفِ اداہائے سوز و ساز ہوں میں

مرے وجود سے ہے کائنات کی تکمیل
جو کچھ ہوں سحرؔ اخود اپنا گر جواز ہوں میں

---

[1] ۱۲ - فروری ۱۹۳۸ء کو دہلی میں ہمق مرحوم کی یاد میں ایک مشاعرہ ہوا تھا چنانچہ یہ غزل اسی تقریب میں لکھی گئی تھی۔

منشی پریم چند کی شخصیت

از ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ

کسی کام سے کانپور سے لکھنؤ جانا ہوا۔ سوچا چلو، پریم چند کے درشن بھی کرلوں۔ مادھری کے دفتر کی طرف روانہ ہوا۔ دفتر کے قریب پہونچا ہی تھا کہ ایک کھدّر دھاری صاحب ننگے سر مجھ سے کچھ آگے سڑک پر جاتے ہوئے دکھائی دیئے۔ چار بج چکے تھے۔ خیال آیا کہ کہیں یہی پریم چند نہ ہوں۔ حالانکہ مَیں نے اُن کی تصویر بھی نہ دیکھی تھی۔ لپک کر اُن کو جالیا اور پوچھا کہ "مادھری کا دفتر کہاں ہے؟ میں ایڈیٹر مادھری منشی پریم چند سے ملنا چاہتا ہوں۔"

جواب ملا۔ "میں ہی پریم چند ہوں، اور آپ؟"

کہہ نہیں سکتا کہ وہ میرے نام سے پہلے واقف تھے یا نہیں، مگر بڑے تپاک سے ملے۔ جیسے مجھے اُن کے برسوں سے تعلقات ہیں۔ اپنے دفتر میں لے گئے۔ مگر سڑک سے دفتر جاتے تک جبکہ ہم بڑے آہستہ آہستہ قدم اُٹھا رہے تھے ہم دونوں ایک دوسرے سے کچھ اس طرح کھل گئے اور تعلقات اتنے گہرے ہوگئے کہ سیڑھیوں پر پریم چند بولے۔ "بھئی تمھاری زندگی بڑے مزے سے گذری ہے اور دلچسپ واقعات سے لبریز ہے۔ میں تم پر ایک کہانی لکھوں گا۔" میں نے عرض کیا تو بندہ بھی آپ کو اپنے کسی افسانہ کا ہیرو بنائے گا۔ اُنھوں نے وعدہ پورا نہ کیا اور منزل پر پہونچ گئے۔ میں ابھی خستہ جانی سے پابراہ ہوں، اور ایفائے وعدہ کا ابھی تک میرے دل میں خیال ہے۔ وفا ہو یا نہ ہو، یہ مالکِ کل کی مرضی پر منحصر ہے۔ اگر مرحوم مجھے اپنی کسی کہانی میں دھر گھسیٹتے تو میرے لئے نہایت مفید ثابت ہوتا۔ اور مجھ پر اپنی نامعلوم گہرائیاں آئینہ ہوجاتیں اور میں "خودشناس" ہوجاتا۔ دوسرے کے دل کی تھاہ لینا اور اپنا حال بے کم وکاست سامنے رکھ دینا۔ وہ بھی دس بیس منٹ میں۔ یہ پریم چند جی حصہ تھا۔ میں نے اس خیال کو ایک جگہ یوں باندھا ہے ؎

احساس کو بناتا ہوں اپنے عمیق تر   دیتا ہوں طول، زندگیِ مختصر کو مَیں

پریم چند نے اور میں نے اپنے احساسات کو پہلی ملاقات کے چند لمحوں میں اسقدر عمیق بنالیا کہ

یہ مختصر لمحات ایک عمر کے مساوی ہو گئے۔

(۲)

صبح ہم دونوں اوپر کی منزل کے برآمدے میں کھڑے تھے۔ میں نے کہا: "اس احاطہ[1] میں اور کون کون رہتے ہیں؟" انھوں نے نارائن سوامی کا نام لیا۔ "یہیں نارائن سوامی؟ میں تو ابھی اسی وقت اُن کی قدم بوسی کو جاؤں گا۔" فرمایا: "کیا جلدی ہے؟ چلے جانا۔ اُن سے کیا پہلے کی جان پہچان ہے؟" میں نے عرض کیا۔ "نہیں۔ زندہ جاوید سوامی رام تیرتھ کے فیض صحبت سے برسوں تک مستفید ہونیوالے، اُن کے امرت بچن کا پالن کرنیوالی، ہستی کے درشن گویا خود سوامی جی کا ست سنگ ہے۔" بات آئی گئی ہوئی۔ وہیں کھڑے کھڑے ادھر سے کچھ شور اُٹھا۔ پریم چند نے کہا: "ذرا کان دھر کے سنو۔ کوئی صاحب بلند آواز میں جھاڑ جھنکار بتا رہے تھے، اور گالی گلوچ کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔

پھر پوچھا: "جانتے ہو، یہ کون ہیں؟ یہی آپ کے نارائن سوامی ہیں۔ ان کے غصّے کی انتہا نہیں اور گالیاں تو جس مزے سے ملازموں کو دیتے ہیں کیا کہنا۔"

فرشتہ خصلت پریم چند کا نقطۂ نظر بجا تھا۔ جس شخص کو غم و غصّہ پر قابو نہیں اور جو علی الصباح رام نام سمرن کے بجائے غلیظ گالیوں کا مالا جپتا ہے وہ اپنی زندگی کیا سنواریگا اور دوسروں کی روحانیت افروزی کا کیا باعث ہوگا؟ مجھے بارہا یہ خیال آیا۔ آخر میں نے اپنے دل سمجھانے کے لئے اسے نظم کیا ؎

عمرِ عزیز اپنی غم و غصّہ میں نہ کھو   کچھ اور کام بھی ہیں غم و غصّہ کے سوا

(۳)

پریم چند اور میں بازار جا رہے تھے۔ دوپہر ہو چکی تھی، راہ میں غالباً چترسین شاستری ملے۔ پریم چند نے بتایا کہ میرے خلاف آجکل ایک برہمن پارٹی زہر اگل رہی ہے۔ تفصیل میں نہ وہ گئے اور نہ میں نے ہی تفصیل دریافت کی۔ انھوں نے اپنے ادیبانہ اور شریفانہ انداز میں خامۂ افسانہ طراز سے ایک آدھ مخالف کو تادیب کی اور بس۔ میں شروع ہی سے پریم چند کو اپنا ماں جایا بھائی سمجھتا تھا اور یوں بھی میری ہمدردی ہمیشہ زیر دستوں[2] کے ساتھ رہی ہے۔ میرے دل میں پریم چند کی حمایت کا خیال جم گیا۔ انھیں دنوں میں جوشی بھائیوں سے ایک نے پریم چند پر جارحانہ اقدام کرکے ایک

[1] اس احاطہ میں کئی مکانات تھے جنمیں سے ایک میں پریم چند جی اور اُنکے قریب ہی سوامی رام تیرتھ مشن کا دفتر تھا۔
[2] UNDERDOG.

رذیل سی تنقیص لکھی۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ شمبھو ناتھ کو شلک اور بالکشن نوین سے مشورہ کرکے میں نے ایک کہانی "چھیٹن" کے نام سے لکھی اور میرے اصرار پر گنیش شنکر جی نے اپنے توصیفی نوٹ کے ساتھ اسے اخبار پرتاپ[1] میں شائع کیا۔ یہ کہانی مخالفوں پر ایک خاصی موثر چوٹ ثابت ہوئی۔ اس کی کامیابی کا ایک ثبوت تو میری نظر سے بھی گذرا یعنی اس کو معمولی تغیر کیساتھ کسی صاحب نے اپنے نام سے شائع کرایا۔ مگر نقل را چہ عقل۔ میری کہانی دراصل جوشی صاحب کی ایک کہانی کا Caricature تھی۔ پریم چند کی توجہ اس طرف مبذول کی گئی۔ مگر وہ اپنے خطوط میں اسکے متعلق خاموش رہے۔ میں بھی اب یہ محسوس کرتا ہوں کہ اکثر موقعوں پر دشمن کے حملوں کا جواب خاموشی ہوتا ہے جیسا کہ انجیل میں آیا ہے۔ "انتقام خدا کے لئے ہے' بندے کیلئے نہیں"

دشمن کے حملے کا نہ دیا ہم نے کچھ جواب — دشمن کو اس کی نظروں میں آخر زبوں کیا
تیری مدافعت کی تو تھی تاب اے حریف — اپنے خدا سے ڈر کے میں غصے کو پی گیا



یہی نہیں کہ ایک مومن کے دشمنوں سے خدا خود نبٹ لیتا ہے۔ اس مومن کیلئے جو یہ کہہ کر ؎

ہے پاس ہی تو منصف کامل کی عدالت — تجھکو ترے شر کو میں سمجھتا ہوں مگر ہیچ

دشمن کو اُس کی قسمت اور اُس کے خدا کے حوالے کرتا ہے۔ اکثر تائیدِ غیبی اُس کے سر سے دفعِ ضرر اور ردِ بلا کرتی ہے۔ غیب سے ایسے ایسے سامان پیدا ہو جاتے ہیں اور ایسے ایسے دوست نمودار ہو جاتے ہیں کہ ایماندار دوست خواب میں بھی اُن کی توقع نہیں رکھتا۔ ادب اور ادیبوں کے متعلق بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ اِس کا ثبوت مجھے پہلی مرتبہ پریم چند ہی کے حلقۂ احباب سے مِلا۔ بنارسی داس چترویدی کو پریم چند سے کچھ عشق ہو گیا تھا۔ پریم چند نہ صرف ایک ہندی ادیب کی حیثیت سے اُنکے معیار پر پُورے اُترے تھے بلکہ ایک شریف' خدا دوست' غریب پرور انسان اور گاندھی جی کے پکے پیرو ہونے کی حیثیت سے بھی پریم چند' چترویدی کے دِل پر چھائے ہوئے تھے۔ پھر دونوں "دیہاتی" سادگی پسند' ہٹیلے' نفس کش اور ریاضت پرور تھے۔ کلکتہ میں جب میں چترویدی جی سے مِلا تو مجھے احساس ہوا کہ یہ شخص پریم چند کو کسی دن اُس بین الاقوامی شہرت کے تخت پر پہونچا کے چھوڑے گا' جس کے پریم چند مستحق ہیں۔ جو بات ٹیگور کے لئے اینڈریوز نے کی ہے وہی چترویدی جی پریم چند کیلئے کرنا چاہتے تھے۔ چترویدی جی دُھن کے پکے' قول کے پابند' عمل کے مرتاض اور پروپیگنڈا کے لطیف

[1] کانپور کا مشہور و معروف ہندی اخبار "پرتاپ"۔

لطیف ماہر فن ہیں۔ اُردو والوں نے پریم چند کے کمال سے علانیہ اغماض کیا اور تعریف بھی کی تو تنقیص اور تذلیل کا پہلو لئے ہوئے۔ ہندی والوں نے پریم چند سے در پردہ دشمنی کی اور ادبی تنقید کے پردہ میں اُن پر سخت چوٹیں کیں۔ مگر چترویدی جی وہ شخص ہیں جنھوں نے اپنے صدق و وفا سے پریم چند کو دُنیا بھر کی بے وفائی سے بے پروا کر دیا۔ تفصیل تو مجھے معلوم نہیں مگر میرا دل گواہی دیتا ہے۔ کہ چترویدی جی کی تحریک و کوشش سے پریم چند کی کہانیاں دوسرے ملکوں کی زبانوں میں منتقل ہوئیں، اور ٹیگور سے پریم چند کا تعارف کرانے میں بھی انھیں کا ہاتھ تھا۔ انھیں کی تحریک سے پریم چند پروگریسو ادیبوں کے حلقہ میں شامل ہوئے۔ حتیٰ کہ وہ باتیں جن کی عدم موجودگی پریم چند کی تصنیف میں عیب گنایا کرتا تھا۔ خصوصاً Psychological Analysis اور محبت پرست عورت اور امیر طبقہ کے اصلی جذبات اُن کا پریم چند میں ہونا انھیں نے ثابت کیا۔

داغِ دل

از مسٹر ڈی۔ پی۔ بھٹناگر گشتہ

سرِ تُربت چراغ جلتا ہے — مرنے والے کا داغ جلتا ہے
بے کسی کا چراغ جلتا ہے — یا مرے دل کا داغ جلتا ہے
کیا مجھے حاجتِ چراغِ مزار — دل میں اُلفت کا داغ جلتا ہے
نہیں بجھتی کبھی لگی دل کی — عمر بھر اس کا داغ جلتا ہے
چشم تو روشن و دلِ ماشاد — خوب اُلفت کا داغ جلتا ہے
اُف رے نیرنگیاں محبّت کی — دل کے بجھنے سے داغ جلتا ہے
دل کی یہ شکل ہی نہیں رہتی — دل میں جب کوئی داغ جلتا ہے
اس کی سوزش پہ ناز ہے مجھکو — داغ سا دل میں داغ جلتا ہے
سوزِ فرقت میں ہے خموشی شرط — شمع ساں اس کا داغ جلتا ہے
سوزِ پنہاں نہیں عیاں پھر بھی — یوں تو جلنے کو داغ جلتا ہے
آگ بجھ بجھ کے یہ بھڑکتی ہے — داغ دے دیکے داغ جلتا ہے
اس کی عظمت کلیم سے پوچھو — جس کے سینے میں داغ جلتا ہے
دلِ گشتہ کی ہے عجب حالت — ایسا کس دل میں داغ جلتا ہے

میرا مسلک

(از حضرت نسیم گجراتی سابق ایڈیٹر تعمیر لاہور)

ہم نشیں سچ ہے تڑپ دل کی نہیں اشعار میں
میرے سینے میں نہیں جذباتِ الفت کے شرر

سُن نہیں سکتا مِرا دل چاند کے بربط کے گیت
سینۂ گل میں نہیں ملتے مجھے شبنم و گہر

پی نہیں سکتا مَیں راتوں کو ستاروں کی شراب
دل میں کیوں غلطیدۂ انوار ہو موجِ نظر

مرغزاروں کا تبسم مجھکو تڑپاتا نہیں
آبشاروں کے ترنم کا نہیں مجھ پہ اثر

گلستاں کے سینے پر ملتا نہیں مجھکو سکوں
کہکشاں کی گود سے میں چن نہیں سکتا شرر

زہرۂ و ناہید کے نغموں سے ہے دامن تہی
یعنی اس دل پر نہیں ہے اندھے کیوپڈ کی نظر

مَیں نے دیکھی ہی نہیں ان آنکھوں سے شامِ فراق
کیف زا میرے لئے ہو خاک نغموں کی سحر

مجھکو رکھتا ہی نہیں دردِ تمنا مضطرب
مَیں سمجھتا ہی نہیں مفہوم اِس شئے کا مگر

نکہتِ گیسو کے طوفاں سے نہیں وحشت مجھے
خرمنِ دل کو جلا سکتی نہیں برقِ نظر

گردشِ دوراں کی نیرنگی سے مَیں واقف نہیں
چرخ کی کروٹ ہو یا بے ربطیِ شام و سحر

میرا مسلک میرا آئیں حسن کو سجدے نہیں
خال و خط رخسار و گیسو کا نہیں مجھ پر اثر

اِک جہانِ تازہ کی زخشندگی نظروں میں ہے
مَیں نے پایا ہے جسے اپنے ہی دل میں ڈوبکر

شعلۂ فطرت شاعروں کے اُف وہ ذہنِ تابناک
جس میں ہنستے ہیں ستارے مسکراتے ہیں قمر

کتنا بے پروا ہے اِن کا عشقِ وارفتہ مزاج
طعنہ زن ہے جو ہجومِ گنبدِ افلاک پر

نازنیں سینوں پہ وہ زلفِ معطر کے ہجوم
ظلمتیں بھی ان کی ہیں غلطیدۂ نورِ قمر

کھینچ لاتا ہے جو حسن و ناز کو آغوش میں
میری قسمت میں نہیں وہ جذب قصہ مختصر

ہاں مگر اک چیز ہے ایسی مرے انداز میں
جس کو سن کر پھٹ گئے ہیں دشت زاروں کے جگر

چھوٹ جاتی ہے مرے ہاتھوں سے نبضیں بحر کی
تیر جاتی ہے دلِ خورشید میں میری نظر

مَیں شہیدانِ وطن کے گیت گاتا ہوں ندیم!
اور ایسے کہ اُلجھتے ہیں فرشتوں کے بھی پَر

انقلابی رَو تڑپتی ہے مری تخئیل میں
مَیں سکھاتا ہوں غلاموں کو غلامی سے حذر

کھیلتا ہے خون و آتش سے مرا رنگِ سخن
بجلیوں میں پرورش پاتا ہے ذوقِ شعلہ گر

اِن کی نظروں میں مسلّم گو نہیں ہستی مری
لیکن اتنا سُن رکھیں یہ شاعرانِ نکتہ ور

آندھیاں، طوفان، شعلے، جنگ و محشر، زلزلے
گیت یہ گائے ہیں مَیں نے زندگی کے ساز پر

جذباتِ شادؔ

(از حضرت شاد عارفی۔ رامپور)

کسی کو دیکھ کے میرا یہ حال ہوتا ہے
سنبھل سنبھل کے سنبھلنا محال ہوتا ہے

وہ میرے دل میں بہ شکلِ خیال ہوتا ہے
اور اس طرح کہ بھُلانا محال ہوتا ہے

ہر ایک چیز پہ اُس کا خیال ہوتا ہے
جنوں یہیں تو "بوجہِ الکمال" ہوتا ہے

ہم اُن کی راہ میں بیٹھے ہوئے ہیں آس لگائے
خیال یہ کہ اُنھیں اب خیال ہوتا ہے

ہزار دل ہوں تو رفتارِ مست پر صدقے
زمیں پہ چلتے ہو، دل پائمال ہوتا ہے

قصور وار نہیں حال پوچھنے والے
ہمارے حال سے پیدا سوال ہوتا ہے

نشاطِ رفتہ کے اِن تذکروں سے کیا حاصل
کہیں زمانۂ ماضی بھی حال ہوتا ہے

نہ رہگذر میں تکلم نہ بام پر جلوہ
وہ مجھ کو بھول گئے، یہ خیال ہوتا ہے

شریکِ دردِ محبت ہے طبعِ موزوں شادؔ
ہر ایک شعر مرا حسبِ حال ہوتا ہے

عورتوں کی مضمون نگاری

از مسز شفیع احمد قدوائی صاحبہ

کہتے ہیں ایک ستم ظریف کسان جہاں جاتا اپنے گدھے کو ساتھ لے جاتا اور اُسے شیر کی کھال پہنا کر دوسروں کے کھیت روندنے کے لئے آزاد چھوڑ دیتا۔ دیہات کے سیدھے سادے لوگ اُسے شیر سمجھ کر اُس کے پاس پھٹکنے کی بھی ہمت نہ کرتے۔ مدتوں مسٹر گدھے دوسروں کے خون پسینہ کی کمائی سے اپنا پیٹ پالتے رہے۔ آخر ایک دن جب وہ حسب عادت چر چگ رہے تھے تو بھرے پیٹ پر اپچ کی سوجھی۔ طبیعت نہ مانی اور بلا ارادہ اُنھوں نے اپنا گیت گانا شروع کر دیا۔ پھر کیا تھا اصلیت کا پتہ لگتے ہی گنواروں نے جی بھر کر خاطر تواضع کی۔ اس کہانی کو تھوڑی سی مشابہت عورتوں کی جرنلزم سے بھی ہے۔ کیونکہ مدتوں تک ہماری جرنلزم کا گدھا شیر کی کھال پہنے ادب، تاریخ، سیاست، سب کے کھیتوں کو روندتا رہا اور آخر کار ملک پر انقلاب کا رنگ چڑھتے ہی ڈھول کا پول کھل گیا۔ آج خود ہم کو بھی پتہ لگ گیا ہے کہ ہم کتنے پانی میں ہیں ویسے لکھنے پڑھنے کا شوق تو بہت دنوں سے پیدا ہو گیا تھا اور جب سے یہ اِکّا دُکّا رسالے عورتوں کے نام سے چھپنے لگے تب سے اور بھی جی میں اُمنگ پیدا ہوئی کہ لاؤ اپنا مت بھید بھی سنائیں۔ میں جانتی ہوں وہ شاید شروع ہی کے دن تھے، جب اکبر الہ آبادی نے جل کر کہا تھا ؎

شوق تحریر مضامین میں کھلی جاتی ہیں　　　بیٹھکر پردہ میں بے پردہ ہوئی جاتی ہیں

عورتیں بیچاریاں ذرا اسی بہانے پڑھے لکھے لوگوں میں شامل ہو جایا کرتی تھیں۔ ادب اور تاریخ سے انجان رہ کر مصنف لوگوں کی فہرست میں چھپ جانے کے لئے چڑے چڑیا کی کہانی کافی ہو جایا کرتی تھی، لیکن خدا مردوں کا بھلا کرے، اسمیں بھی وہ آن کودے۔ کبھی میاں بیوی کا برقعہ اوڑھ کر، کبھی بھائی بہن کے نام سے اور اکثر یہ کالج کے لڑکے اپنے کو عورتوں کی نظر میں جچانے کے لئے بڑے مضمون نگار بن بیٹھے۔ ایڈیٹر ایک دو کو چھوڑ سارے کے سارے مرد تھے، وہ اپنا من مانا لکھواتے اور چھپواتے۔ ہر رسالہ کے سرورق پر عورتوں اور بچّوں کے لئے لکھا ہوتا تھا۔ کیونکہ ان عقلمند لوگوں کے نزدیک سمجھ بوجھ میں عورت اور بچہ برابر تھا۔ بیچاری عورتوں کو سکھایا بھی یہی جاتا تھا کہ قصہ، لکھو یا نظم، سب کو پیٹ پلٹ کر "راہِ نجات" یا

"بہشتی زیور" بنا دو۔ اکیلے گھر والے یہ دھونس جماتے تو خیر کوئی بات نہ تھی۔ اخبار رسالے والے بھی جان مارے رہتے تھے کہ جو لکھو "راہِ نجات" کے ڈھرے پر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر چودہ برس کی لڑکی بوا بن کر رہ گئی۔ بڑی بوڑھیوں کی طرح نصیحت کرنیکا ایسا شوق بڑھا کہ تحریر دیکھ کر اس بات کا پتہ ہی نہ لگتا تھا کہ ہمارے آپ کے سامنے منی چھوکری بول رہی ہے یا خاندان بھر کی نانی دادی۔ باوا آدم کے وقت کی باتیں کرنے کا کچھ ایسا چسکا پڑ گیا تھا کہ قلم ہاتھ میں لیا اور ساری ماؤں بہنوں کو جنت کا سیدھا راستہ بتا دیا۔ خیر اللہ کا شکر ہے، تھوڑے ہی دن بیتے تھے کہ ملک کا رنگ بدل گیا۔ عورتوں کی جرنلزم بھی آسمان سے اتر کر زمین پر آئی۔ اس دَور میں وعظ بیان کرنے کا شوق تو کم ہو گیا۔ لیکن نہ پڑھائی پوری تھی نہ فیشن۔ اس لئے سب آدھا تیتر آدھا بٹیر ہو کر رہ گیا۔ افسانے بھی لکھے گئے، نظمیں بھی ہوئیں اور غزل بھی۔ تاریخ، سیاست، خانہ داری، دلچسپی تو سب چیزوں سے پیدا ہوگئی لیکن افسانہ لکھا تو ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا راشد الخیری کی نقل کی۔ مضمون میں سید ممتاز علی یا حسن نظامی کا خاکہ اڑایا اور غزل گائی تو داغ یا امیر مینائی کی دھن میں۔ سیاست سے دلچسپی صرف جلسوں میں رائے زنی کرنے یا تقریر کرنیوالوں کی تعریف تک محدود رہی۔

فیشن کا اثر افسانہ پر بہت پڑا۔ کبھی بی چڑیا ڈرائنگ روم میں پیازی ساری باندھے بیٹھی نظر آئیں اور چڑے صاحب باتھ روم سے سوٹ ہاتھ میں لئے برآمد ہوئے۔ ادب تمیز کے ساتھ اپنی ڈارلنگ سے بھونڈی بھونڈی دو چار باتیں کیں اور موٹر پر سوار ہو دونوں ہواخوری کو نکل گئے۔ دکھ بھری کہانیوں کی حد نہ رہی۔ جہاں دیکھو کسی نہ کسی عقل کے اندھے، گانٹھ کے پورے شوہر پر بیوی صدقہ قربان ہو رہی۔ کبھی اُس کے قدموں پر آقا اور مالک کہتی ہوئی لوٹتی نظر آئی۔ میاں سے لے کر ساس سسر تک کی جوتیاں کھا کر گھر سے نکل گئی اور قبر میں منہ چھپا کر سو رہی، یہ ہوئے افسانے۔ انمیں اکثر کوئی دل جلا ہارمونیم پر گاتی نظر آئی اور انگریز عورتوں نے تحسین ناشناس سے ہندوستانی گانوں کی عزت بڑھائی۔ شعر اور افسانہ دونوں کو عورتوں نے جی بھر کر رگڑا۔ ابا کی شان میں قصیدے لکھے گئے۔ ننھی بٹیا اور منے بھیا کے لئے جھولا تیار ہوا۔ اطاعت اور عصمت کا راگ الاپا گیا۔ کبھی بہنوں سے خطاب ہوا ؎

بہنوں پیاری تمھیں اللہ جلائے تھوڑا ۔۔۔ کبھی بہکائے نہ شیطان ستائے تھوڑا
ساتھ شوہر کے رہو بن کے پہاڑی ناگن ۔۔۔ نکلو باہر تو ذرا آنکھ جھکائے تھوڑا
بیوی اچھی ہے وہی ہاتھ ہوں جس کے اُجن ۔۔۔ پیر پھیلے ہوں مگر بین بجائے تھوڑا

کبھی عشق پر غزل لکھی ؎

نیلگوں ہے فلک جام میں فردوسِ خیال ۔۔۔ گردشِ مے ہے بساطِ فلک انجم افروز

صانع حسنِ ازل جذب محبت ماسوا　　قدرتِ محبوب حق آغوش دامان ہوا

غرض یہ ساری چیزیں بلاردیف اور قافیہ، معنی اور مطلب کے نظم کرڈالیں۔ کبھی گھریلو زندگی کی برائیاں کیں تو کبھی اپنی بے بسی کا رونا رویا۔ بزموں اور محفلوں کے بہانے دُنیا پر ثابت کردیا کہ ؎

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

کسی کے پیارے مولوی صاحب کا کولہا اُتر گیا اور دوا علاج کا بوجھ یا جڑی بوٹیوں کی چھان بین ادبی مذاق رکھنے والی بہنوں کے سپرد کی گئی۔ کسی بہن نے اپنے بہرے پن اور میاں کے خبط کی دوا لقمان صفت بہنوں سے پوچھ ڈالی۔ درزی سے لیکر لوہار اور سُنار تک کی دکانوں کا پتہ پوچھا۔ بھانجی، بھتیجی کی شادی یا بہن بہنوئی کے نتیجہ حماقت کے لئے تاریخی نام اور قطعوں کی فرمائش کردی۔ غرض اُن دِنوں عورتوں کی جرنلزم ایک ایسا اونٹ تھی جس کی کوئی کل سیدھی نہ تھی اور سب پر طرہ وہ نقالی والا کوڑھ تھا۔ اعتراض کرنے کو تو سب ہی کرتے ہیں اور میں بھی کہتی ہوں لیکن انصاف سے دیکھئے تو آخر پھر کیا لکھتیں اُنھوں نے دیکھا کیا تھا۔ اونچی اونچی دیواروں والا جیل نما مکان۔ گاؤ تکیہ سے لگ کر چھالیہ کترنے والی سست عورتیں اور بدتمیز لڑاکو نوکر۔ یہ تھا اُن کا تجربہ اور اُن کا ماحول۔ کہتے ہیں افسانہ زندگی کی سچائیاں دِکھاتا ہے اور شاعری دماغی خیالات کی جھلکتی آنکھ ہے۔ جو کچھ ہو، اسمیں تو کوئی شک نہیں۔ لیکن یہاں تو عورتوں کے رسالہ خالی پیٹ پیٹ رہے تھے۔ آخر اُن کو بھرنا بھی تھا اب اس کے لئے عاشق ہونے کون جاتا اور دُنیا دیکھنے کی کسے اجازت ملتی۔ اٹکل پچو جو جی میں آیا لکھ مارا۔ جب سے پڑھی لکھی عورتوں کی تعداد بڑھنے لگی ہے تھوڑی بہت جرنلزم بھی اونچی ہورہی ہے۔ دوچار سچ مچ کی شاعرہ اور چند اچھے بھلے قصے لکھنے والیاں بھی پیدا ہوگئی ہیں۔ ذرا بیچ میں اُردو کچھ من اُتری ہوگئی تھی انگریزی کا بڑا زور تھا۔ سو اب تو اس کا غرور ڈھے گیا ہے۔ اب تو رسالوں میں گاندھی جی کی سیاست اور ٹیگور کا فلسفہ بھی نظر آتا ہے۔ وہ فلسفہ جسے "اپنا لکھا وہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے" کہنا چاہئے۔ ایک زمانہ تھا جب قومی لیڈر بننے کا گُر تعلیم نسواں اور ہندوستانیوں کے حق حقوق پر لڑنے جھگڑنے تک محدود تھا لیکن اب تو ایسا زمانہ بدلا ہے جن کے جاہل عورت کے خیال سے رونگٹے کھڑے ہوتے تھے، تعلیم یافتہ لڑکیوں کو دیکھ کر مُنھ بناتے، فیشن ایبل بیویوں میں کیڑے ڈالتے اور سیاستدان بیوی پر آوازے کستے ہیں۔

اللہ جانے یہ کیوں کایا پلٹ ہوگئی ہے۔ خیر یہ تو بات میں بات نکل آئی۔ ہاں تو ہوا یہ کہ عورت آگے تو بڑھی، تقریریں کرتی، مضمون لکھتی اور افسانوں کے پلاٹ سوچتی ہوئی، لیکن سوجھ بوجھ، اپج جیالے پن کو دھکے دیتی ہوئی یہاں تک آئی۔ سیکھنے سمجھنے کی ضرورت تو سب کو ہوتی ہے مگر یہاں کون ایسا بیٹھا تھا جو

جو ٹھنڈے دل سے سوچا کہ لڑکیوں کو الگ بٹھکر سکھاؤ پڑھاؤ، اور بڑی عورتیں جلا بٹھیکر خوش گپیاں اڑائیں۔ یہاں تو جدھر دیکھو۔ وہی اصلاح والا ڈھونگ رچا ہوا ہے حالانکہ اصلاحی شاعری، اصلاحی افسانوں اور اصلاحی مضامین، وہ بچوڑی ہوئی ہڈیاں ہیں جنھیں برسوں گذرے مردوں نے اپنے دسترخوان سے جھاڑ کر پھینک دیا ہے۔ کیا غضب ہے کہ آج تک عورتیں اُن پر ندیدوں کی طرح ٹوٹی پڑتی ہیں۔

ویسے رنگ تو بہت بدل گیا ہے اور اِدھر ڈیڑھ برس سے ذرا ملک کی جوتی بیزار نے اُن کے کان کھڑے کر دیئے ہیں، اس لئے اب ہوا میں قلعہ بنانا کم ہوتا جا رہا ہے لیکن کہاں تک، ملک تو نہ جانے کہاں سے کہاں پہونچ گیا۔ اقبال کی مجازی مے کو جوش اور ساغر کے ساز سے ہندوستانی راگ بن کر نکلے بہت دن ہو چکے لیکن عورتیں ابھی لکیر ہی پیٹ رہی ہیں۔ اور وہاں ترقی پسندوں کا غول بھوک بھوک چلاتا ہوا بڑھا چلا آ رہا ہے۔ نوجوان انقلابی کھرپا اور کلہاڑا لئے جھاڑیوں کانٹوں سے میدان صاف کرتے آ رہے ہیں۔ اُن کی لکڑ توڑ شاعری میں نہ مے ہے نہ معشوق۔ اُن کے یہاں محبوب "چہرہ فروغ مے سے گلستاں کئے ہوئے" نہیں آتا ہے بلکہ میلی پگیا سر پر جمائے، گاڑھے کی مرزئی پہنے، سر پر گارے کا ٹوکرا رکھے مزدور "مرے جا رہے ہیں" "بڑھے جا رہے ہیں" کہتا ہوا نازل ہوتا ہے۔ اب ساقی کی صراحی، شراب ارغوانی کے بدلے خون اُگلتی ہے اور دھان من موہنی کی جگہ دیہات کی ٹھوس گنواری لہنگا پھڑکاتی، چوڑیاں بجاتی غصہ میں ناگن کی طرح پھنکارتی ہوئی امیروں کو اُپلے کی طرح ہاتھ ڈالتے تشریف لاتی ہے۔ ابھی کیا تھوڑے دن میں دیکھئے گا۔ کون کہہ سکتا ہے دس ہی پانچ برس کے اندر یہ چنگاری سچ مچ انگارے نہ اگلنے لگے گی۔ غرض ملک میں تو یہ کچھ ہو رہا ہے۔ انقلاب کی پکار ہو رہی ہے۔ نئے ادب کا پرچم لہرایا جا رہا ہے۔ اور یہاں غزل، جو مسلمانوں کی بگڑی تقدیر کی نشانی اور کاہلی کی پوٹ بن کر ورثہ میں ملی تھی۔ نئے سرے سے پھر گھروں کے اندر جنم لے رہی ہے۔

ذرا اس ستم ظریفی کو دیکھئے، عورتیں غزل کہتی ہیں وہ بھی پردہ نشین۔ جن پر پوری جوان بھی نہیں ہونے پاتیں کہ ایک مرد ماں باپ کی رضامندی سے مسلط کر دیا جاتا ہے۔ لو اسے پوجو اور محبت کرو! پیاری پیاری گڑیا سی لڑکی پورے چھ فٹ لانبے دیو دار سے باندھ دی جاتی ہے، یا فنونِ لطیفہ سے ذوق رکھنے والے نوجوان کے سر کالی کلوٹی ہتنی جیسی بیوی مڑھ دی جاتی ہے۔ یہ ہے یہاں کا دستور! اب آپ ہی بتائیے اسمیں جذبات کہاں سے پیدا ہوں اور عشق کس سے

اڑایا جاتے۔ مجھے تو اسی میں شک ہے کہ کیا عورت غزل کہہ بھی سکتی ہے؟

کہتے ہیں عورت فطرت کا راز ہے، انسانیت کی ایک پہیلی ہے۔ جسے بوجھنا ہر مرد کے لئے یہ سچ ہو یا نہ ہو۔ لیکن اسمیں تو شبہ نہیں کہ وہ اپنی محبت، اپنے جذبات یا خواہش کا بے دھڑک اظہار نہیں کرپاتی۔ آپ کسی جاہل عورت کو دیکھئے، جب وہ لڑنے یا تقریر کرنے پر آتی ہے تو گھنٹوں بے تکان بولتی چلی جاتی ہے نہ اسوقت اس کے پاس مثلوں کی کمی ہوتی ہے نہ محاوروں کی۔ لیکن جب وہ پیار کی آنکھوں سے اپنے شوہر کو دیکھکر کچھ کہنا چاہتی ہے تو الفاظ حلق میں اٹک اٹک کر رہ جاتے ہیں۔ کچھ لوگوں کی طرح اشاروں سے، کچھ آنسوؤں سے اور کچھ نگاہوں سے مدد لئے بغیر اپنا مطلب ادا ہی نہیں کرپاتی۔ نظر لاکھ پیام محبت دے لیکن اس پیام کو ڈگی پٹوا کر سب کو سنانا عورت کے بس کی بات نہیں۔ جوانی لاکھ دیوانی ہو لیکن بھرے مجمع میں ہرگز نہیں کہہ سکتی ع

لو اُن کی جوانی آپہونچی اب کیسے بچیں گے دل و جگر

عورت بے بس ہوکر آنسو بہاتی ہے لیکن زندان سے دیوانی ہوکر اک دم صحرا کی طرف نہیں بھاگتی۔ نہ دفتر ناکامی کو عنوان تمنا بنا کر مردوں کے سامنے پیش کرتی ہے جو وہ پھٹ سے کہدیں ؎

میں نے کہا کہ غیر کا کہنا نہ کیجئے   بولے وہ بیچ میں مرے بولا نہ کیجئے

جب دل پر چوٹ ہی نہیں تو درد بھرے راگ نکلیں گے کہاں سے؟ اور پھر غزل تو نری مردوں کی رام کہانی اور ساری ابھن کی بپتا ہوتی ہے۔ بھلا عورت اسمیں کہاں سما جائے گی؟ نہ معلوم اُسے دربان کی گالیاں کھانے اور لیلیٰ کا کتا بننے کا کیا شوق چرّایا ہے؟ رہا عشق حقیقی سو میاں کی پانوں کی ڈبیہ اور میاں کا پیٹ بھرنے سے اتنی چھٹی کہاں؟ جو دو گھڑی آنکھیں موند اپنی آتما اونچی کرلیں۔ ہاں نعت اور دیوان کی مدد سے لفظوں کا ایک گورکھ دھندا بن سکتا ہے، اُسے غزل یا بقول برنارڈ شاہ اگر یوروپ نیم دیوانوں کا ملک ہے تو ہندوستان کے مکمل دیوانوں کی بستی ہونے میں کوئی شک ہی نہیں! یہاں غزل عورت کہتی ہے اور گیت مرد بناتا ہے۔ اور سچ پوچھئے تو مردوں کی بے ہوئی بپتا اور بن آئی موت کی داستان سنتے سنتے ملک کا پہلے ہی سے بُرا حال ہو چکا ہے بھلا اُسے عورتوں کی زبان سے سیاپا سننے کی کیا ضرورت آپڑی ہے؟

غرض جب ہماری اوندھی سیدھی جرنلزم کا ابتک یہ حال ہو کہ کسی نہ کسی شہسوار کی گرد راہ سے اپنی منزل کا پتہ پوچھتی ہی رہی ہوں تو نئے ادب کا استقبال کون کرے اور کس کو اسکی پہچان ہے کہ پرانا ادب کونسی بلا تھی اور نیا ادب ہے کس چڑیا کا نام؟

سب کچھ جلی کٹی کہہ لینے کے بعد ذرا اپنی صفائی تو پیش کر لینے دیجئے۔ ایک بڑے آدمی نے کہا کہ اگر عورت کو پھانسی پانے کا حق ہے تو اسے عدالت کی کرسی پر بیٹھنے کا بھی حق ہے۔ پھر جب یہ دونوں حق آپ کو حاصل ہیں، تو مجھے اپنے جی کی بات کہنے کا کیوں نہ حق حاصل ہو؟ اگر آپ پھر ایسی گفتگو نہ سُننا چاہیں، تو ذرا ناپ تول کر بات کہا کیجئے اور قلم سنبھال کر لکھا کیجئے۔ تاکہ اپنوں کا جی خوش ہو اور پرایوں میں ناک اونچی رہے!

نوائے راز

از حضرت ابوالفاضل راز چاندپوری

ہمنشین! ایسی کوئی تدبیر ہونی چاہیے
میرے قبضے میں مری تقدیر ہونی چاہیے

ختم ہونا چاہیے اب قصۂ دیر و حرم
خانقاہِ زندگی تعمیر ہونی چاہیے

اِس طرح تو نظمِ عالم منتشر ہو جائے گا
خود پرستی قابلِ تعزیر ہونی چاہیے

شیخ کافر، رند مومن، متقی بادہ پرست
منقلب ہر ایک کی تقدیر ہونی چاہیے

امتیازِ کفر و ایمان وقت پر ہو جائیگا
دعوتِ میخانہ عالمگیر ہونی چاہیے

اور بڑھ جائیں ذرا تشنہ لبی کی تلخیاں
دورِ ساغر میں ابھی تاخیر ہونی چاہیے

رہزنِ ایماں ہیں دونوں، شیخ ہو یا برہمن
ان سے بچنے کی کوئی تدبیر ہونی چاہیے

مرکزِ حُسن و محبت، مطلعِ مہر و وفا
دل کے آئینے میں اک تصویر ہونی چاہیے

تابکے یہ لن ترانی، ہوشیار اے برقِ طور
آرزوئے دید کی توقیر ہونی چاہیے

ننگِ میخانہ ہے ساقی! یہ حریفِ خود فروش
میکش کم ظرف کی تشہیر ہونی چاہیے

تابکے یہ بے نیازی اے حریفانِ سخن
اب زبانِ راز عالمگیر ہونی چاہیے

؎ یہ تقریر جولائی گذشتہ میں مسز شفیع احمد قدوائی صاحبہ نے آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ سے کی تھی۔ اب مسز ممدوحہ اور ڈائرکٹر صاحب ریڈیو اسٹیشن کی عنایت سے ہدیۂ ناظرین ہے۔ ا۔ نمبر۔

تنقید کتب

یادِ چکبست[1]

اُردو دنیا میں چکبست کا نام کسی تعریف یا تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ کوئی اُردو داں حلقہ ایسا نہیں جہاں چکبست کا نام عزت و احترام کیساتھ نہ لیا جاتا ہو۔ چکبست کا سب سے بڑا اور قابل تعریف و توصیف کمال یہ ہے کہ گو لکھنؤ کی فضا ابھی تک کنگھی چوٹی، گل و بلبل کے مضامین سے گونج رہی ہے۔ مگر انھوں نے قومی شاعری کے میدان میں قدم رکھا اور فرات و دجلہ اور جیحوں سیحون کے پانیوں میں غوطہ لگانے کے بجائے گنگا جمنا کے پوتر دھارا میں اشنان کیا۔ ان کی تمام نظمیں قوم پرستی اور حبِ وطن کے جذبات میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ سلیس، فصیح اور ٹکسالی زبان میں نہایت بے ساختگی سے قومی نظمیں کہنا، چکبست کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اسی لئے اُردو ادب میں انکا نام قیامت تک زندہ رہیگا بمصداق

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق　　ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

بیشک چکبست کا دل قوم اور وطن کے عشق سے سرشار تھا۔ پھر اُن کا نام دُنیا سے کیونکر مٹ سکتا ہے،

یہ کتاب ان متعدد مضامین نظم و نثر کا دلکش مجموعہ ہے، جو ملک کے مشہور اہلِ قلم ادیبوں اور شاعروں نے پنڈت برج نراین چکبست اور ان کی شاعری پر لکھے تھے۔ جنھیں ہمارے دوست، نامور سخن سنج و سخن فہم پنڈت آنند نراین مُلا لکھنوی نے نہایت سلیقہ سے مرتب کرکے یکجا کردیا ہے مضامین نظم و نثر کے درمیان کہیں کہیں خود حضرت چکبست کی مشہور نظموں کے اقتباسات بھی داخل کردئے گئے ہیں۔ جس سے اس مجموعہ کا حسنِ معنوی دوبالا ہوگیا ہے۔ ادیبوں میں حضرت نیاز فتحپوری، مولانا عبدالحق، مرزا جعفر علی خاں اثر، پروفیسر مسعود حسین رضوی، ڈاکٹر تاراچند، رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو، منشی دیا نراین نگم اور شعرا میں مولانا صفی لکھنوی، حضرت وصل بلگرامی، حضرت محشر لکھنوی، حضرت جگر بریلوی وغیرہ کے اسمار گرامی شامل ہیں۔ لکھائی چھپائی، کاغذ عمدہ۔ شروع میں چکبست کا ایک نیا فوٹو بھی ہے۔ حجم چھوٹی تقطیع کے ۱۷۰ صفحات۔

---

[1] قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ:۔ انڈین پریس لیمیٹیڈ الہ آباد۔

نادر خطوط غالب

مرزا غالب مرحوم کے تقریباً تمام رقعوں اور خطوط کا مجموعہ مختلف ناموں سے شائع ہوچکا ہے۔ جنمیں "اُردوے معلیٰ" اور "عودِ ہندی" زیادہ مشہور ہیں۔ مگر کتاب زیر نظر میں مرزا غالب کے ۲۷ خط ایسے ہیں جو ابھی تک شائع نہیں ہوئے ہیں۔ اِسی لئے اِن خطوط کے مجموعہ کا نام "نادر خطوط غالب" رکھا گیا ہے۔ یہ خطوط وہ ہیں جو مرزا نے اپنے تین بہاری شاگردوں (۱) حضرت کرامت ہمدانی (۲) حضرت صفیر بلگرامی اور (۳) حضرت صوفی منیری کے نام وقتاً فوقتاً بھیجے تھے اور جو حضرت کرامت ہمدانی کے یہاں موجود و محفوظ تھے۔ اب حضرات کرامت ہمدانی کے نبیرہ حضرت رستا ہمدانی گیاوی نے اُن خطوط کو مسٹر شاکر میرٹھی کے اصرار و تقاضہ سے ایک بسیط مقدمہ کے ساتھ جو بہت فاضلانہ اور محنت سے لکھا گیا ہے، شائع کرا دیا ہے۔ خطوط سبق آموز اور پڑھنے کے قابل ہیں۔ فدائیان غالب اور شیدائیان ادب اُردو کے لئے واقعی ایک نادر تحفہ ہے۔ لکھائی چھپائی، کاغذ معمولی۔ چھوٹی تقطیع کے چار جزو ضخامت۔ قیمت آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ :۔ کاشانۂ ادب، گھسیاری منڈی، لکھنؤ۔

مہابھارت مسدس

رامائن اور مہابھارت، پراچین بھارت کی مشہور و معروف اور بہترین نظمیں ہیں۔ جن میں رزم و بزم دونوں کے مناظر نہایت دلفریب طریقے سے کھینچے گئے ہیں۔ دونوں کتابیں سنسکرت میں تھیں۔ رامائن شری والمیک جی نے کانپور کے قریب مقام بٹھور میں گنگاجی کے کنارہ بیٹھکر لکھی تھی اور اسکا ہندی ایڈیشن سوامی تلسی داس جی نے لکھا۔ جن کی "رامائن" بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ رامائن و مہابھارت دونوں کا ترجمہ فارسی زبان میں علامہ فیضی نے شہنشاہ اکبر اعظم کی فرمائش سے کیا تھا۔ اُردو زبان میں دونوں کتابوں کا ترجمہ حضرت افق لکھنوی نے کیا جو بہت مقبول ہوا۔ مگر یہ ترجمہ اُردو نثر میں تھا۔ اس کے بعد بعض شعراء نے بھی طبع آزمائی کی۔ اب منشی رامجی مل صاحب کپور سنبھلی المتخلص بہ رام نے دونوں کتابوں کا نہایت شگفتہ اور پسندیدہ نظم میں بصورت مسدس کیا ہے۔ رام صاحب کی رامائن مسدس مقبول عام ہوچکی ہے۔ اب آپ نے مہابھارت کو بھی اُردو مسدس کے سانچہ میں ڈھالا ہے۔ ایک بند ملاحظہ فرمائیے۔ اِسی سے مصنف کی شاعری اور کتاب کی خوبیوں کا بخوبی اندازہ ہوجائے گا۔ ایک نئے باب کے شروع میں لکھتے ہیں ؎

سوسن بتا رہی تھی کہ فصل بہار ہے — گردن میں گلعذاروں کی پھولوں کا ہار ہے
سنبل میں گویا نکہتِ مشک تتار ہے — شبنم کا گوشِ گل میں دُرِ شاہوار ہے
ہر اک کلی کے دل میں ہے کھلنے کی بیکلی
سبزہ کا صحن باغ میں ہے فرش مخملی

لکھائی چھپائی روشن۔ کاغذ عمدہ۔ حجم بڑی تقطیع کے ۱۱۶ صفحات ہے۔ قیمت سوا روپیہ ملنے کا پتہ:۔ ساہتیہ نکیتن کانپور

من کی بپتا

یہ سلسلہ ادارۂ ادبیات اُردو، حیدرآباد دکن کی تینتیسویں کڑی ہے۔ جسمیں لطیف النساء بیگم صاحبہ بی۔ اے، نے متوسط طبقہ کی عورتوں کی معاشرتی اور اخلاقی کمزوریوں پر بہت اچھے پیرائے میں روشنی ڈالی ہے۔ طرزِ بیان نصیحت آمیز ہے۔ امورِ خانہ داری اور تدبیر منزل کے نکات بھی خوب سمجھائے گئے ہیں اور گھر، نوکر، لباس، بچّوں کی تعلیم، علاج معالجہ، سیر و تفریح وغیرہ موضوعات پر نہایت سلجھے ہوئے پیرایہ میں بحث کی گئی ہے۔ متوسط طبقہ کی خواتین اور لڑکیوں کے لئے یہ چھوٹی کتاب بہت مفید ہوگی۔ حجم ۸۰ صفحات۔ قیمت ۸ر، ملنے کا پتہ:۔ دفتر ادارۂ ادبیات اُردو، رفعت منزل خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن

انیس الاخلاق

یہ میر انیس کی اخلاقی رُباعیوں کا مجموعہ ہے۔ جس کو سید محمد عباس صاحب ایم۔ اے، نے مرتب کیا ہے۔ شروع میں چند صفحات میں رباعیوں کی تاریخ اور میر انیس کے حالات زندگی درج ہیں۔ ہر رُباعی مع عنوان ایک صفحہ پر درج کی گئی ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب میں انیس کی ۹۵ رباعیاں درج ہیں۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ سب دیدہ زیب ہے۔ قیمت پانچ آنہ۔ شائقین دارالتصنیف و تالیف محمود آباد ہاؤس قیصر باغ لکھنؤ سے طلب فرمائیں

مصنفین اُردو

چھوٹے سائز کے ۲۳۲ صفحات پر حالی پبلشنگ ہاؤس، کتاب گھر دہلی نے اس نام سے اُردو کے مشہور اہل قلم کی تصانیف کی ایک جامع اور باتصویر فہرست تیار کی ہے۔ جسمیں مختلف عنوانات قائم کرکے تصانیف کو کئی مدعلں میں تقسیم کر دیا گیا ہے تاکہ شائقین اپنے حسب پسند کتابیں آسانی سے طلب کرلیں۔ اس فہرست میں مشہور مُصنفین اُردو کی مختصر سوانحعمری اور اُن کی تصویریں بھی درج کردی گئی ہیں۔ باتصویر فہرست صرف ۲/۱ ۲ آنہ میں "حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی سے مل سکتی ہے۔

تصحیح افسوس کہ کاتب و پروف ریڈر کی غفلت سے اکثر مضامین میں اہم غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ مثلاً پچھلے ماہ کے رسالہ میں "اردو، ہندی، ہندستانی" کے متعلق "حق پرست" صاحب کے مضمون میں صفحہ ۱۰۰ نیچے سے چھٹی سطر میں "عربی فارسی زندہ زبانیں ہیں" کی جگہ "مردہ زبانیں" چھپ گیا ہے جو صریحاً غلط ہے۔ اسی طرح صفحہ ۱۰۳ پر نیچے سے دسویں سطر میں "مگر حقیقت یہ ہے" کی جگہ "اور حقیقت یہ ہے" ہونا چاہئے۔ صفحہ ۱۰۴ پر اوپر سے پانچویں سطر میں "ہندی بہ حیثیت ایک زبان لازمی" ہونا چاہئے یعنی "زبان" پہلے اور "لازمی" بعد۔

صفحہ ۱۲۷ پر مضمون "آپ بیتی" میں کئی غلطیوں کے علاوہ عنوان کا شعر "سینہ می گویدکہ من تنگ آمدم فریاد کن" کے بجائے "سینہ میگویم من تنگ آمدم فریاد کن" چھپ گیا ہے جو صریحاً غلط ہے۔ ناظرین ان غلطیوں کو درست فرمائیں۔ ا۔ ز

رفتار زمانہ

جنگ

جیسا کہ ناظرین کو معلوم ہے۔ جرمنی نے یکم ستمبر کو پولینڈ پر تیغ طرف سے حملہ کردیا۔ جس پر انگلستان اور فرانس کو اُس کے خلاف جنگ کا اعلان کرنا پڑا۔ یکم اکتوبر تک اس لڑائی کو ایک مہینہ پورا ہوگیا۔ پولینڈ دو تین ہفتوں سے زیادہ جرمنی کے حملے کی تاب نہ لاسکا۔ پہلے خیال تھا کہ وہ دو ڈھائی ماہ تک جرمن افواج کو اُلجھائے رکھیگا جس کے بعد بارش شروع ہوجائے گی اور جرمنی کو کئی مشکلات سے سامنا ہوگا جنکی وجہ سے اسکی طاقت زیادہ کام نہ دیسکے گی۔ لیکن روس نے بھی پیچھے سے اُس پر حملہ کردیا۔ جس سے جرمنی کا کام بہت آسان ہوگیا۔ اور پولینڈ دو طرفہ حملے کی تاب مقاومت نہ لاسکا۔ وارسا اور بعض دیگر مقامات نے البتہ آخر تک حملہ آوروں کا بہادرانہ مقابلہ کیا۔ لیکن حکمرانانِ پولینڈ نے کچھ زیادہ بہادری نہ دکھائی۔ بلکہ آنیوالے خطرہ کا خیال کرکے وارسا کی تسخیر سے بہت پہلے ہی پایۂ تخت کو چھوڑ گئے اور کچھ دنوں اِدھر اُدھر رہنے کے بعد رومانیہ میں پناہ گزین ہوئے۔ مسٹر لائیڈ جارج نے اُنکی اس حرکت کی بجا طور پر مذمت کی ہے اور واقعی اُن کے لئے اپنی فوج اور شہری آبادی کو اس طرح بے یار و مددگار چھوڑنا زیبا نہ تھا۔ مگر کچھ بھی ہو، پولینڈ کی حکومت اور فوج کے تباہ و برباد ہونے اور روس اور جرمنی کے حصے بخرے کرنیکے بعد یہ جنگ ختم نہیں ہوئی۔ جرمنی کا یہی خیال تھا کہ پولینڈ کے خاتمے کے بعد برطانیہ و فرانس یا کم سے کم فرانس ضرور ہی صلح کے لئے تیار ہوجائے گا۔ مسولینی نے اپنی حال کی تقریر میں اسکا اشارہ بھی کیا ہے اور کہا ہے کہ یوروپ کو جنگ جاری رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہٹلر نے اپنی آخری تقریر میں بھی اس پر بہت زور دیا ہے کہ جرمنی کا (اپنی نوآبادیوں کی واپسی کے علاوہ جنکا تصفیہ باہمی بات چیت سے ہوسکتا ہے) انگلستان یا فرانس سے کوئی مطالبہ نہیں ہے اور وہ تمام مسائل یوروپ بلکہ اسلحہ کی کمی کا معاملہ بھی باہمی مشورہ سے طے کرنے کو تیار ہے۔ لیکن اس کا یہ خواب بے تعبیر رہیگا۔ پول قوم کی روح ابھی مفتوح نہیں ہوئی ہے چنانچہ پولستانی حکومت بھی فرانس میں قائم ہوگئی ہے۔ ادھر چیکوسلاویکیہ میں بھی جرمنی سے آزادی حاصل کرنے کی زبردست خواہش پیدا ہورہی ہے اور لندن میں ڈاکٹر بنیس عارضی حکومت قائم کرنیکی فکر کررہے ہیں۔ امریکہ نے بھی پولینڈ میں روس اور جرمنی کا قبضہ منظور نہیں کیا ہے۔ غرض برطانیہ اور فرانس متفقہ طور پر اس بات کا تہیہ کئے ہوئے ہیں کہ ہٹلریت کو فنا کرہی کے دم لیں گے۔ بات یہ ہے کہ ہٹلر کے وعدوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ چند ہی سال کے عرصہ میں وہ خود اپنے بیسوں وعدے توڑ چکا ہے۔ پچھلے سال بھر کے اندر اندر ہی اُس نے چیکوسلاویکیہ اور پولینڈ

کے متعلق کئی اہم وعدے کئے لیکن وقت آنے پر اُنکے صریحاً خلاف کارروائی کی۔ اسلئے جبتک جرمنی پر اُسکا اقتدار قائم ہے۔ مستقل صلح کا کوئی سامان نظر نہیں آتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس کیلئے انگلستان اور فرانس دونوں کو طولانی جنگ کرنا پڑیگی اور جرمنی کی موجودہ حکومت کو شکست دینا کوئی معمولی کام نہیں ہے لیکن ہم کو بھروسہ ہے کہ اگر اتحادی اسی طرح ہمت و استقلال سے ڈٹے رہینگے اور اُن کے بستگان اس موقعہ پر اُن کی پوری امداد کریں گے تو جرمنی کے موجودہ حکمرانوں کو مُنھ کی کھانی پڑے گی۔ اس وقت جرمنی کو روس سے معاملہ کرنے میں کچھ فوائد ضرور حاصل ہوگئے ہیں لیکن روس کی رفاقت جرمنی کو بہت مہنگی پڑے گی۔ اس وقت بھی روس نے پولینڈ کے بڑے اور اہم حصے کو اپنے قبضے میں لے لیا ہے اور اب وہ قرب وجوار کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر اپنا اقتدار قائم کر رہا ہے جو بالآخر جرمنی کے حق میں مضر ثابت ہوگا۔
پولینڈ کی فتح کا سب سے اہم نتیجہ یہ نکلا ہے کہ روس جو پچیس سال سے یوروپین سیاست سے بیدخل ہوگیا تھا۔ اب پھر ایک قوی طاقت کی حیثیت سے دخل یاب ہوگیا ہے اور بلقان کی ریاستیں جرمنی سے محفوظ ہوگئی ہیں اور بحر اسود بھی جرمن جہازوں کے لئے بند ہوگیا ہے۔ اسوقت تک جرمنی کا لندن، پیرس یا کسی دوسرے مشہور مقام پر کوئی ہوائی حملہ نہیں ہوا ہے۔ لیکن ہٹلر نے اس جنگ میں ایک خاص آلہ حرب استعمال کرنے کی دہمکی دی ہے۔ جرمنی کی سرحد پر فرانسیسی فوجوں کے حملے شروع ہوگئے ہیں۔ اور جرمنی کے حفاظتی استحکامات متزلزل ہو رہے ہیں۔ غالباً جرمنی ان حملوں کا اب جلد ہی سختی سے جواب دینے والا ہے اور بلجیم، ہالینڈ یا لکسمبرگ کسی نہ کسی طرف سے فرانس پر حملہ کرنیوالا ہے انگلستان کی فوجیں بھی فرانس کی کمک کو پہونچ گئی ہیں اور خود ڈیوک آف ونڈسر (سابق شاہ ایڈورڈ ہشتم) بھی اس نازک موقعہ پر انگلستان واپس آگئے ہیں اور فرانس کی فوج کے ساتھ شریک جنگ ہیں۔
برطانیہ کے جنگی بیڑے نے تمام سمندروں پر تسلط قائم کرکے جرمنی کے اقتصادی وجود پر سکرات کا عالم طاری کر رکھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی جرمن آبدوز کشتیوں نے برطانوی جہازوں پر بھی حملے کئے ہیں اور کئی بڑے جہاز ڈبو دئے ہیں۔ جن سے کروڑوں روپیہ اور اس سے بھی قیمتی جانوں کا نقصان ہوا ہے۔ لیکن یہ بات اطمینان بخش ہے کہ برطانیہ کے جنگی جہازوں نے جرمنی کا اتنا سامان پکڑ لیا ہے کہ وہ اُن کے نقصان سے بقدر ڈیڑھ لاکھ ٹن زیادہ ہے برطانیہ کی مستعدی کا تازہ ثبوت یہ ہے کہ اگلے مارچ تک کیلئے پارلیمنٹ نے بیس ارب پاونڈ جنگی مصارف کے لئے منظور کئے ہیں جس کے لئے ادنیٰ اعلیٰ سبھوں نے غیر معمولی ٹیکس ادا کرنا منظور کرلیا ہے۔

(ہندوستان)

جنگ یوروپ اور ہندوستان | یوروپ کی لڑائی ہندوستان کے لئے کم اہمیت نہیں رکھتی۔ چنانچہ ہمارے ملک کے ارباب حل وعقد بھی ملکی مسائل پر غور وخوض کرکے انھیں طے کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ ہندوستان بھی دل وجان سے اس جنگ میں حصہ لے سکے۔ چنانچہ لڑائی چھڑنے کے ایک ہی دو روز بعد حضور والیسرائے نے اہل ہند کے نام ایک پیغام شائع کیا۔ جسمیں آپ نے اُس جبر وتشدد کی طرف توجہ دلائی، جو ہر ہٹلر نے پولینڈ کے ساتھ روا رکھا ہے اور جو ہٹلر کے سیاسی پروگرام کا ضروری جزو بن گیا ہے۔ یہی طریقہ اُس نے آسٹریا، چیکوسلاویکیہ وغیرہ ممالک کے متعلق بھی اختیار کیا تھا۔ بقول لارڈ لنلتھگو' اس رویہ سے جو ہٹلر نے اختیار کیا ہے

دُنیا میں انسان کا زندگی بسر کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ کیونکہ اس سے جبر و تشدد کی فتح ہو گی اور "جسکی لاٹھی اُس کی بھینس" کا اصول تقویت پائے گا۔ چنانچہ اِس وقت ہمارے سامنے اُن اصولوں کی حفاظت کا سوال ہے۔ جن پر بنی نوع انسان کی آیندہ ترقی کا دار مدار ہے۔ یہ اصول بین الاقوامی انصاف و اخلاق کے اصول ہیں اور اس بات کے متقاضی ہیں۔ کہ مہذب انسان بین الاقوامی تنازعات بھی باہمی گفتگو اور معقولیت و دلیل سے طے کرے نہ کہ جبر و تشدد سے۔ وائسرائے ہند نے یہ بھی لکھا ہے کہ روئے زمین پر ہندوستان سے زیادہ کسی ملک میں ان عظیم الشان اصولوں کی قدر دانی نہیں ہوتی ہے۔ اور یہاں ہر وقت اور ہر زمانہ میں انکی حفاظت ہوئی ہے۔ چنانچہ آپ نے اہل ہند سے لڑائی میں بلا تفریق نسل و ملت و سیاسی اختلافات کے برطانیہ کی امداد و اعانت کی اپیل کی ہے۔ حضور وائسرائے نے جو کچھ فرمایا ہے بالکل صحیح ہے۔ واقعی ہندوستان زمانہ قدیم سے انسانیت و روحانیت اور اخلاق و تہذیب کا مرکز رہا ہے اور اب جبکہ مادّیت کے زہر نے تمام عالم کی فضا مسموم کر دی ہے۔ یہاں عدم تشدد اور امن پسندی کا جذبہ غالب ہے۔ مگر ہندوستان اُن اعلیٰ اصولوں کی حفاظت، جن کا ذکر حضور وائسرائے نے فرمایا ہے برطانیہ کی بقدر شوق اور بھرپور امداد اُسی وقت کر سکتا ہے جب وہ خود اُن بیجا قیود و بند سے جو اُسے عرصے سے جکڑے ہوئے ہیں آزاد ہو، یا کم از کم اُسے یہ اطمینان ہو جائے کہ برطانیہ واقعی انھیں اصولوں اور جمہوری حقوق کی حفاظت کے لئے ہندوستان سے امداد کا طالب ہے۔ چنانچہ کانگریس نے اِس سلسلہ میں جو بیان شائع کیا ہے وہ اسی نظریہ کے مطابق ہے۔ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے بیان میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ اصول جو موجودہ جنگ میں قوم کے رہنما ہونے چاہئیے، کانگریس کی جانب سے بارہا ضبط تحریر میں لائے جا چکے ہیں۔ چنانچہ ایک ماہ قبل ہی کمیٹی نے اُن کا اعادہ کیا تھا اور ہندوستان کی طرف سے یہاں کی رائے عامہ پر بیجا اثر انداز ہونے کی برطانوی پالیسی پر اظہار ناپسندیدگی کیا تھا اور اِسی پالیسی سے شدید اختلافات ظاہر کرنے ہی کے لئے کانگریسی ممبران کو مرکزی اسمبلی کے آیندہ اجلاس میں شریک نہ ہونے کی ہدایت کی تھی۔ اُس کے بعد جنگ چھڑ گئی اور برٹش گورنمنٹ نے ہندوستان کو بھی جنگ میں شریک قرار دیدیا اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں فوری ترمیم بھی کر دی جس سے صوبجاتی حکومتوں کے اختیارات بہت محدود ہو گئے ہیں۔

کانگریس بارہا فاسیت و نازیت کے طرز عمل اور اُصولوں کی مذمت کر چکی ہے اور اُنکی جنگجوئی اور تشدد پسندی کی انسانیت کش پالیسی پر بھی اپنی ناپسندیدگی اور غم و غصّہ کا اعلان کر چکی ہے۔ کانگریس کے نزدیک فاسیت اور نازیت کے اندر بھی امپیریلزم کے وہی اصول کام کر رہے ہیں۔ جن کے خلاف وہ

ہندوستان میں سالہا سال سے برسرِ پیکار رہے۔ لہذا ورکنگ کمیٹی بلا پس و پیش نازی حکومت کے اس جبر و تشدد کی جو اُس نے پولینڈ کے ساتھ اختیار کیا ہے سخت مخالف ہے۔ اور اُن ملکوں کی ہمدرد ہے جو اُس کی روک تھام کے لئے اِس وقت میدانِ جنگ میں صف آرا ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ اگر اِس جنگ کا نتیجہ یہ نکلے کہ امپیریل مقبوضات اور مفادات و مراعات میں پہلے سے بھی زیادہ استحکام ہو جائے تو کانگریس اہلِ مُلک کو اِس جنگ سے علیحدہ ہی رکھنا پسند کریگی۔ لیکن اگر اس کے برعکس اس لڑائی کی بدولت دُنیا میں جمہوری نظامِ حکومت کو فروغ دیا جائے تو ہندوستان کو اِس جنگ کیلئے گہری دلچسپی ہوگی۔ کمیٹی کو اِس بات کا یقین واثق ہے کہ ہندوستان کے جمہوری مفاد کا برطانیہ، نیز تمام دُنیا کے جمہوری مفاد سے کوئی تصادم نہیں ہے۔ اِس لئے اگر برطانیہ واقعی جمہوری اُصولوں کی حفاظت و توسیع کے لئے معرکہ آرا ہے تو اُس کو اپنے مقبوضات کو بھی امپیریلزم سے آزاد کردینا چاہیئے۔ چنانچہ ہندوستان میں پوری جمہوری حکومت قائم کردینا چاہیئے اور اہلِ ہند کو نمائندہ اسمبلی کے ذریعہ اپنے مُلک کیلئے آئین وضع کرنے کا اختیار دینا چاہیئے۔ کانگریس نے اِس مطالبے کے ساتھ یہ بھی یقین دلایا ہے کہ آزاد جمہوری ہندوستان بشوق جمہوریت کے تحفظ و استحکام کی جنگ میں دوسری جمہوری قوموں کے ساتھ برابر کا حصّہ لیگا اور اُن کے ساتھ اقتصادی اتحاد و تعاون کی پالسی پر بھی عملدرآمد کرے گا۔

اِن حالات کے پیشِ نظر کہ دُنیا کے لئے یہ ہنگامہ حد درجہ اہم ہے اور ایسی سُرعت کے ساتھ واقعات ظہور پذیر ہورہے ہیں کہ اکثر دِل و دماغ کی محتاط پرواز پیچھے رہ جاتی ہے۔ ورکنگ کمیٹی نے یہی مناسب سمجھا ہے کہ سر دست اپنا فیصلہ ملتوی رکھے تاکہ جنگ کے مقاصد زیادہ واضح اور روشن ہوجائیں۔ اِسی خیال سے ورکنگ کمیٹی نے برطانی حکومت کو مدعو کیا ہے کہ وہ صاف و صریح الفاظ میں اپنے جنگی مقاصد کا اعلان کردے اور یہ بات بھی واضح کردے کہ وہ دُنیا میں کس نظامِ حکومت کی حامی ہے اور وہ اپنے جمہوری مقاصد کا ہندوستان پر کس طرح اطلاق کرنا چاہتی ہے اور فی الحال اُن پر کیا عملدرآمد ہوگا۔ اِس کے ساتھ ہی ورکنگ کمیٹی نے اس بات کو بھی واضح کردیا ہے کہ اہلِ ہند کو اہلِ جرمنی یا اہلِ جاپان یا کسی اور قوم سے کوئی مخاصمت نہیں ہے لیکن انھیں اِس قسم کے نظامِ حکومت سے سخت نفرت ہے جو انسانی آزادی کو جکڑ بند میں رکھتے ہیں اور جن کا دارمدار جبر و تشدد پر ہے۔

کمیٹی نے اہلِ ہند سے یہ بھی اپیل کی ہے کہ وہ اس وقت تمام اختلافات باہمی کو بالائے طاق رکھ کر موجودہ خطرہ کے مقابلہ کے لئے متحدہ محاذ پیش کریں اور غیر متزلزل استقلال کے ساتھ اپنے ملک کیلئے دُنیا کی آزادی کے وسیع تر دائرہ کے اندر آزادی حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہوں۔

دُنیا میں اِنسان کا زندگی بسر کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ کیونکہ اس سے جبر و تشدد کی فتح ہو گی اور "جسکی لاٹھی اُس کی بھینس" کا اصول تقویت پائے گا۔ چنانچہ اِس وقت ہمارے سامنے اُن اصولوں کی حفاظت کا سوال ہے۔ جن پر بنی نوعِ اِنسان کی آئندہ ترقی کا دار و مدار ہے۔ یہ اصول بین الاقوامی اِنصاف و اخلاق کے اصول ہیں اور اس بات کے متقاضی ہیں۔ کہ مہذب اِنسان بین الاقوامی تنازعات بھی باہمی گفتگو اور معقولیت و دلیل سے طے کرے نہ کہ جبر و تشدد سے۔ وائسرائے ہند نے یہ بھی لکھا ہے کہ روئے زمین پر ہندوستان سے زیادہ کسی ملک میں ان عظیم الشان اصولوں کی قدر دانی نہیں ہوتی ہے۔ اور یہاں ہر وقت اور ہر زمانہ میں انکی حفاظت ہوئی ہے۔ چنانچہ آپ نے اہلِ ہند سے لڑائی میں بلاتفریق نسل و ملت و سیاسی اختلافات کے برطانیہ کی امداد و اعانت کی اپیل کی ہے۔ حضور والسرائے نے جو کچھ فرمایا ہے بالکل صحیح ہے۔ واقعی ہندوستان زمانہ قدیم سے انسانیت و روحانیت اور اخلاق و تہذیب کا مرکز رہا ہے اور اب جبکہ مادّیت کے زہر نے تمام عالم کی فضا مسموم کر دی ہے۔ یہاں عدم تشدد اور امن پسندی کا جذبہ غالب ہے۔ مگر ہندوستان اُن اعلیٰ اُصولوں کی حفاظت، جن کا ذکر حضور والسرائے نے فرمایا ہے برطانیہ کی بقدر شوق اور بھرپور امداد اُسی وقت کر سکتا ہے جب وہ خود اُن بیجا قیود و بند سے جو اُسے عرصے سے جکڑے ہوئے ہیں آزاد ہو، یا کم از کم اُسے یہ اطمینان ہو جائے کہ برطانیہ واقعی انھیں اُصولوں اور جمہوری حقوق کی حفاظت کے لئے ہندوستان سے امداد کا طالب ہے۔ چنانچہ کانگریس نے اِس سلسلہ میں جو بیان شائع کیا ہے وہ اسی نظریہ کے مطابق ہے۔ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے بیان میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ اصول جو موجودہ جنگ میں قوم کے رہنما ہونے چاہئیں، کانگریس کی جانب سے بارہا ضبطِ تحریر میں لائے جا چکے ہیں۔ چنانچہ ایک ماہ قبل ہی کمیٹی نے اُن کا اعادہ کیا تھا اور ہندوستان کی طرف سے یہاں کی رائے عامہ پر بیجا اثر انداز ہونے کی برطانوی پالیسی پر اظہارِ ناپسندیدگی کیا تھا اور اسی پالیسی سے شدید اختلافات ظاہر کرنے ہی کے لئے کانگریسی ممبران کو مرکزی اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں شریک نہ ہونے کی ہدایت کی تھی۔ اُس کے بعد جنگ چھڑ گئی اور برٹش گورنمنٹ نے ہندوستان کو بھی جنگ میں شریک قرار دیدیا اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں فوری ترمیم بھی کر دی جس سے صوبجاتی حکومتوں کے اختیارات بہت محدود ہو گئے ہیں۔

کانگریس بارہا فاسیت و نازیت کے طرزِ عمل اور اُصولوں کی مذمت کر چکی ہے اور اُنکی جنگجوئی اور تشدد پسندی کی انسانیت کش پالیسی پر بھی اپنی ناپسندیدگی اور غم و غصہ کا اعلان کر چکی ہے۔ کانگریس کے نزدیک فاسیت اور نازیت کے اندر بھی امپیریلزم کے وہی اصول کام کر رہے ہیں۔ جن کے خلاف وہ

ہندوستان میں سالہا سال سے برسرِ پیکار ہے۔ لہٰذا ورکنگ کمیٹی بلا پس وپیش نازی حکومت کے اِس جبر و تشدد کی جو اُس نے پولینڈ کے ساتھ اختیار کیا ہے سخت مخالف ہے۔ اور اُن ملکوں کی ہمدرد ہے جو اُس کی روک تھام کے لئے اِس وقت میدانِ جنگ میں صف آرا ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ اگر اِس جنگ کا نتیجہ یہ نکلے کہ امپیریل مقبوضات اور مفادات و مراعات میں پہلے سے بھی زیادہ استحکام ہو جائے تو کانگریس اہلِ ملک کو اِس جنگ سے علیحدہ ہی رکھنا پسند کریگی۔ لیکن اگر اس کے برعکس اِس لڑائی کی بدولت دُنیا میں جمہوری نظامِ حکومت کو فروغ دیا جائے تو ہندوستان کو اِس جنگ کیلئے گہری دلچسپی ہوگی۔ کمیٹی کو اِس بات کا یقین واثق ہے کہ ہندوستان کے جمہوری مفاد کا برطانیہ نیز تمام دُنیا کے جمہوری مفاد سے کوئی تصادم نہیں ہے۔ اِس لئے اگر برطانیہ واقعی جمہوری اُصولوں کی حفاظت و توسیع کے لئے معرکہ آرا ہے تو اُس کو اپنے مقبوضات کو بھی امپیریلزم سے آزاد کر دینا چاہیے۔ چنانچہ ہندوستان میں پوری جمہوری حکومت قائم کر دینا چاہیئے اور اہلِ ہند کو نمایندہ اسمبلی کے ذریعہ اپنے ملک کیلئے آئین وضع کرنے کا اختیار دینا چاہیئے۔ کانگریس نے اِس مطالبے کے ساتھ یہ بھی یقین دلایا ہے کہ آزاد جمہوری ہندوستان بشوق جمہوریت کے تحفظ و استحکام کی جنگ میں دوسری جمہوری قوموں کے ساتھ برابر کا حصّہ لیگا اور اُن کے ساتھ اقتصادی اتحاد و تعاون کی پالسی پر بھی عملدرآمد کرے گا۔

اِن حالات کے پیشِ نظر کہ دُنیا کے لئے یہ ہنگامہ حد درجہ اہم ہے اور ایسی سُرعت کے ساتھ واقعات ظہور پذیر ہو رہے ہیں کہ اکثر دل و دماغ کی محتاط پرواز پیچھے رہ جاتی ہے۔ ورکنگ کمیٹی نے یہی مناسب سمجھا ہے کہ سردست اپنا فیصلہ ملتوی رکھے تاکہ جنگ کے مقاصد زیادہ واضح اور روشن ہو جائیں۔ اِسی خیال سے ورکنگ کمیٹی نے برطانی حکومت کو مدعو کیا ہے کہ وہ صاف و صریح الفاظ میں اپنے جنگی مقاصد کا اعلان کردے اور یہ بات بھی واضح کردے کہ وہ دُنیا میں کس نظامِ حکومت کی حامی ہے اور وہ اپنے جمہوری مقاصد کا ہندوستان پر کس طرح اطلاق کرنا چاہتی ہے اور فی الحال اُن پر کیا عملدرآمد ہوگا۔ اِس کے ساتھ ہی ورکنگ کمیٹی نے اس بات کو بھی واضح کر دیا ہے کہ اہلِ ہند کو اہل جرمنی یا اہلِ جاپان یا کسی اور قوم سے کوئی مخاصمت نہیں ہے لیکن انھیں اِس قسم کے نظامِ حکومت سے سخت نفرت ہے جو انسانی آزادی کو جکڑبند میں رکھتے ہیں اور جن کا دار مدار جبر و تشدد پر ہے۔

کمیٹی نے اہلِ ہند سے یہ بھی اپیل کی ہے کہ وہ اس وقت تمام اختلافات باہمی کو بالائے طاق رکھ کر موجودہ خطرہ کے مقابلہ کے لئے متحدہ محاذ پیش کریں اور غیر متزلزل استقلال کے ساتھ اپنے ملک کیلئے دُنیا کی آزادی کے وسیع تر دائرہ کے اندر آزادی حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہوں۔

نیشنل لبرل فیڈریشن نے بھی اِس موقعہ پر جو ریزولیوشن پاس کیا ہے اُسمیں اہلِ ہند اور مُلک کی تمام سیاسی جماعتوں سے جنگ میں غیر مشروط طور پر برطانیہ کی اعانت کرنے کی اپیل کی ہے لبرل لیڈران اِس وقت انگلستان سے کوئی مطالبہ کرنا پسند نہیں کرتے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اُنھوں نے بھی برطانی حکومت سے یہ اپیل کی ہے کہ گورنمنٹ اپنے طرزِ عمل سے ملک میں ایسی فضا پیدا کردے کہ سیاسی حیثیت سے تالیفِ قلب ہوجائے اور وہ شوق سے جنگ میں امداد دیں۔ چنانچہ اِس بات کی خاص طور پر اپیل کی گئی ہے کہ گورنمنٹ ہند میں عوام کی نمایندگی کا جس صورت سے بھی ممکن ہو، پُورا انتظام کیا جائے۔ اور اہلِ ملک کی تمام بدگمانیاں رفع کرنے کی بھی کوشش کی جائے۔ لبرل فیڈریشن نے موجودہ فوجی پالیسی تبدیل کرنے اور ہندوستان کے لئے اہلِ ملک کی حفاظتی فوج قائم کرنے کا مشورہ دیا ہے تاکہ ہم لوگ غیر ملکی حملوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوجائیں۔

کانگریس اور لبرل پارٹی کے علاوہ فرقہ وارانہ جماعتوں نے بھی اِس اہم مسئلہ پر اپنی اپنی رائیں پیش کی ہیں مثلاً ہندو مہا سبھا نے اپنے ریزولیوشن میں اِس بات پر زور دیا ہے کہ ہندوستان کی حفاظت برطانی حکومت اور اہلِ ہند دونوں کا مشترکہ مسئلہ ہے اور چونکہ اہلِ ملک بلا امداد اِس اہم ذمہ داری کو اپنے ذمہ نہیں لے سکتے ہیں۔ اِس لئے ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان پُورا اتحاد باہمی ہونا چاہیے اور اُسکو موثر بنانے کے لئے اُس نے یہ مشورہ دیا ہے کہ مرکزی حکومت کو ذمہ دار حکومت بنادیا جائے کیمونل آوارڈ پر نظرِ ثانی کی جائے۔ ایکٹ اسلحہ میں ترمیم کرکے اسے انگلستان میں نافذ شدہ ایکٹ کے مطابق کردیا جائے، انڈین ٹیریٹوریل فورس کی توسیع کا انتظام کیا جائے، فوج میں داخل ہونے کے متعلق تمام موجودہ قیود کو توڑ کر جس قدر جلد ہوسکے فوج کو پُورے طور پر ہندوستانی بنادیا جائے اور انڈین ملٹری اکیڈمی میں طلبا کو مکمل فوجی تعلیم دینے کا بندوبست کیا جائے۔

اِس ریزولیوشن میں اِس بات کی بھی سفارش کی گئی ہے کہ حکومت ہندوستانی کارخانوں کو ہوائی جہاز وغیرہ جدید اسلحہ جات کے تیار کرنے کے قابل بنادے تاکہ مُلک کی تمام فوجی ضروریات مُلک ہی میں پُوری ہوجائیں۔

مسلم لیگ نے بھی بہت غور وخوض کے بعد اس مسئلہ پر ایک ریزولیوشن پاس کیا ہے۔ جسمیں اُس نے عجیب رویہ اختیار کیا ہے۔ یعنی ہندوستان میں جمہوری طرزِ حکومت پر برٹش گورنمنٹ کو ترجیح دی ہے۔ اور صوبجاتی گورنمنٹوں میں بھی گورنروں سے مداخلت کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔

اُس نے ایک مرتبہ پھر یہ شکایت کی ہے کہ جن صوبوں میں کانگریسی حکومتیں قائم ہوئی ہیں۔

وہاں مُسلمانوں کی بڑی حق تلفی ہوئی ہے اور لیگ کو شکایت ہے کہ گورنر صاحبان نے مُسلمانوں کے حقوق کی کوئی حفاظت نہیں کی اور نہ وزراء صوبہ کے کاموں میں دخل دینا گوارا کیا۔

ملک کے مشہور انگلو انڈین اخبار "اسٹیٹسمین" نے اس ریزولیوشن پر رائے زنی کرتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے کہ "اگر واقعی کسی صوبجاتی گورنمنٹ نے مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی، مجلسی یا اقتصادی مفاد کے خلاف کوئی کاروائی کی ہوتی اور گورنر صوبہ اس کے خلاف اپنے خاص اختیارات سے کام نہ لیتے، تو مسلم لیگ کی شکایت ضرور بجا ہوتی۔ لیکن اگر لیگ نے کانگریس پر کیچڑ اُچھالنے کی غرض سے پیرپور کمیٹی کے سراسر بے بُنیاد الزامات کی بنیاد پر یہ تجویز مرتب کی ہے تو ہمیں کہنا پڑے گا کہ صوبجاتی وزارتوں کو ختم کرنے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی ہے۔ بہرصورت اسٹیٹسمین کی رائے میں کانگریس پر جو الزامات لگائے گئے ہیں اُنھیں کوئی ہوشمند انسان تسلیم نہیں کر سکتا۔"

مگر لیگ نے صرف صوبجات ہی میں جمہوری طرز حکومت کی مخالفت نہیں کی ہے بلکہ کل ہند کیلئے ایک فیڈریشن قائم کرنیکی اسکیم کی بھی مخالفت کی ہے اور برٹش گورنمنٹ سے مطالبہ کیا ہے کہ یہ خیال ہی ہمیشہ کے لئے ترک کردیا جائے اور لیگ کی منظوری کے بغیر کوئی دوسرا آئین بھی وضع نہ کیا جائے۔

بقول معزز اخبار "اسٹیٹسمین" لیگ کے اِس مطالبہ کا صاف یہی منشا ہے کہ گو وہ ہندوستان کو آزاد دیکھنا چاہتی ہے لیکن قومی سلطنت کا قائم ہونا کسی صورت میں گوارا نہیں کرسکتی، اور ہندوستان کو برطانیہ کے تسلط سے آزاد کرا کے وہ اس ملک کی مجموعی ہیئت باقی نہیں رکھنا چاہتی بلکہ مختلف قوموں اور فرقوں کی آبادی کے لحاظ سے اِسکے سیکڑوں ٹکڑے کردینا چاہتی ہے۔ اس کے صاف یہی معنی ہیں کہ لیگ چاہتی ہے کہ مُسلمان حب الوطنی سے دُور کا بھی واسطہ نہ رکھیں۔ اِس افسوسناک رویہ پر جسقدر افسوس کیا جائے کم ہے۔

۱۱ ستمبر کو مرکزی حکومت کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں حضور وائسرائے نے یہ اعلان کیا کہ گورنمنٹ نے موجودہ نازک حالت کے لحاظ سے جو جنگ کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہے اور جس کی وجہ سے اِسوقت ملک کی تمامتر توجہ جنگی امداد کی طرف مبذول ہونا چاہئیے، فیڈریشن کی مجوزہ اسکیم کو معطل کردینے کا فیصلہ کیا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فیڈریشن کو، جو ہمارا نصب العین ہے، اُسے نظر انداز کیا جارہا ہے۔ اس اعلان کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ گورنمنٹ ہند کی مجوزہ اسکیم کا، جو کسی کو بھی پسند نہ تھی خاتمہ ہوگیا ہے اور اب گورنمنٹ برطانیہ کو عام رائے کے بموجب نیا آئین منظور کرنے کا پُورا موقعہ ہے۔ چنانچہ خوشی کی بات ہے کہ اِس وقت انگلستان کے اکثر ذمہ دار مدبران اور بعض بڑے بڑے اخبار نویس اِس بات کی ہر روز سفارش کررہے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو اہلِ ہند کو آئینی حیثیت سے مطمئن کردیا جائے۔ البتہ وزیر ہند لارڈ زٹلینڈ نے کانگریس

ورکنگ کمیٹی کے مطالبے کو کسی قدر بے موقعہ قرار دیا ہے۔ لارڈ موصوف نے صوبجاتی حکومت خود اختیاری جاری ہونے کے موقعہ پر بھی کانگریس کے مطالبات سے اختلاف کیا تھا۔ جو ہمارے لیڈروں نے گورنران صوبہ سے کئے تھے۔ بہرحال دارالعوام کے کئی با اثر ممبروں نے اس بارہ میں جلد سے جلد صلح و صفائی کر لینے کی رائے دی ہے اور دارالامرا میں بھی اِس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اِس موقع پر برطانیہ کو غرور بیجا سے کام نہ لینا چاہئے۔ بلکہ جس طرح سے ہوسکے اہل ہند کی دلجوئی کرنا چاہئے۔

پنڈت جواہرلال نہرو نے لارڈ زٹلینڈ کی تقریر کا مفصل جواب دیا ہے کہ ہم نے جنگ اور امن کے مقاصد کا پُورا لحاظ رکھتے ہوئے ہندوستان کے مسئلہ پر غور کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی وجہ سے کانگریس نے برطانوی حکومت سے درخواست کی ہے کہ وہ اپنے مقاصدِ جنگ کا صاف و واضح الفاظ میں اعلان کردے اور جہاں تک موجودہ حالات میں ممکن ہو اُس پر عملدرآمد کرے۔ پنڈت جی نے واضح کر دیا ہے کہ کانگریس اِس وقت برطانیہ سے کوئی سودا کرنا نہیں چاہتی ہے اور نہ برطانیہ کی مشکلات سے فائدہ اُٹھانیکا ہی خیال ہے لیکن ہندوستان اور دُنیا کے نقطۂ نظر سے اشد ضروری ہے کہ جنگ کے مقاصد کی پُوری وضاحت کردیجائے تاکہ لوگوں کو حقیقت حال سے نہ صرف واقفیت ہوجائے بلکہ انھیں اسکا یقین بھی ہوجائے۔ آپ نے برطانیہ سے بجا طور پر یہ سوال کیا ہے کہ کیا بے شمار اِنسان یہ جانے بغیر کہ وہ کس لئے مر رہے ہیں، موت کے مُنھ میں چلے جائیں؟ بقول پنڈت جی ماضی میں بھی جتنی لڑائیاں ہوئی ہیں اُن کی ابتدا میں پُر جوش اعلان کئے جاتے رہے ہیں۔ لیکن جنگ ختم ہوتے ہی وہ وعدے بُھلا دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ گذشتہ جنگ عظیم میں بھی ایسا ہی ہوچکا ہے۔

بہرحال آثار اُمید افزا نظر آرہے ہیں۔ حضور وائسرائے نے تمام ملکی لیڈروں سے تبادلۂ خیالات شروع کر دیا ہے۔ اِس وقت تک آپ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو۔ مہاتما گاندھی۔ پنڈت جواہرلال نہرو، مسٹر جناح، سردار پٹیل، بابو راجندر پرشاد وغیرہ سے ملاقات کر چکے ہیں۔

دہلی میں پنڈت نہرو اور مسٹر جناح کی بھی بات چیت ہوچکی ہے۔ اور اب وائسرائے نے مسٹر سوبھاش بوس، مسٹر ساورکر صدر مہاسبھا، مسٹر راجہ لیڈر پست اقوام، مسٹر پرکاش نراین سپرو صدر لبرل فیڈریشن کو بھی ملاقات کے لئے طلب فرمایا ہے۔ خدا کرے اِس گفت و شنید کا مُلک کے حق میں کوئی مُفید و دیرپا نتیجہ نکلے۔

زمانہ

جلد ۷۳ — اکتوبر ۱۹۳۹ء — نمبر ۴

عرفیؔ[1] ہندی زبان میں

(از جناب مقبول حسین صاحب احمد پوری بی - اے ایل ایل بی)

دوسرے مشاہیر عہد مغلیہ کی طرح عرفی بھی سنسکرت یا ہندی زبان نہ جانتا تھا، لیکن ہندوؤں کے رسم ورواج اور اُن کے عقائد کے متعلق عام باتوں سے واقف تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنے اشعار میں جابجا اہل ہند کے رسوم کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور یہ دلفریب کنائے زیادہ تر اس کے غزلیات کے مجموعہ میں پائے جاتے ہیں۔

بہ حیثیت انسان عرفی کی حقیقی خوبیاں پردۂ خفا میں رہیں۔ کیونکہ نقادانِ ادب نے اس کے ساتھ رواداری برتنے میں بہت بخل سے کام لیا ہے۔ خود ہمارے دور کے ایک وقیع مصنف یعنی مولانا شبلی نے شعر العجم میں عرفی کے کلام پر تنقید کرتے ہوئے کم وبیش اس کے اخلاق پر بھی نکتہ چینی کی جو عرفی کے ہمعصر سوانح نگاروں کی ہمنوائی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ تاہم مولانا مرحوم کو بھی عرفی کی جدتِ طبع کا اعتراف کرنا پڑا ہے۔ اور اگر وہ اس کے ہمعصروں کی تنقیدوں سے قطع نظر کرکے اپنے طور پر کوئی رائے زنی کرتے تو اُنھیں عرفی میں محاسن ہی نظر آتے۔ لیکن مولانا نے رداروی سے کام لیا اور تنقید میں کوئی جدت

---

[1] عرفی کا نام محمد جمال الدین تھا۔ اس کے باپ زین الدین علی ایک سرکاری عہدہ دار تھے۔ ایران میں یہ صفوی سلطنت کا زمانہ تھا۔ عرفی دسویں صدی ہجری کے وسط میں شیراز میں پیدا ہوا۔ غالباً سیر و سیاحت کی غرض سے وہ ہندوستان آیا اور یہیں لاہور میں عین شباب میں مر گیا۔ فیضی اور ابو الفضل اس کے ہمعصر تھے۔ اس کے قدردانوں میں شہزادہ سلیم، ابو الفتح گیلانی اور عبدالرحیم خانخاناں کے نام قابل ذکر ہیں۔

پیدا نہ کرسکے۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ عرفی کا دل بڑا غیور تھا، اوچھے پن کو اس کی سرشت میں بالکل دخل نہ تھا۔ وہ دن کو دن اور رات کو رات کہتا تھا۔ لگی لپٹی باتیں اُسے پسند نہ تھیں

بیشتر فارسی شعرا کی طرح عرفی کو ہندوؤں کے رسم و رواج سے دلچسپی تھی، اور جس طرح اُس نے ان کا ذکر کیا ہے، اُس سے ہمدردی سی پائی جاتی ہے۔

عرفی کے خیالات دنیا کے لٹریچر میں جگہ پانے کے مستحق ہیں، کیونکہ افتادِ طبع نے اس کے خیالات میں ایک خاص ندرت پیدا کر دی تھی، اور اگر ہندی زبان میں اُس کے خیالات پیش کر دئے جائیں تو وہ ایک مہا کوی یعنی بڑے شاعر کے خیالات معلوم ہونگے۔

عرفی کی یہ خصوصیت اُسکی انوکھی طبیعت کا نتیجہ ہے، جو خودداری، سنجیدگی اور آزادہ روی کا مجموعہ تھی اسی وجہ سے اُس کے اشعار میں غم و انبساط دونوں کے متضاد پہلو تاثیر اور دلفریبی کا باعث ہیں۔ لطف یہ کہ اس کے کلام کی تاثیر رُلانے والی نہیں، بلکہ ہمت بندھانے والی ہے۔ اس کا مذاقِ سخن (Humour) "ظرافت" کے بجائے مزاح کا پہلو لئے ہوئے تھا۔ مثال کے طور پر ایک شعر لکھا جاتا ہے جو اِن تمام خصوصیات کا مرقع ہے، وہ لکھتا ہے کہ:-

کفر نے، اسلام نے، اسلام کفر آمیز نے
حکمتِ ایزد ندانم چیست در ایجادِ ما

(ترجمہ: کفر نہیں، اسلام نہیں اور کفر ملا اسلام نہیں، میں نے یہ بھید نہ پایا کہ خالق نے مجھے کیوں بنایا)

عرفی کے ہمعصروں کو اس بات سے تعجب ہوتا تھا کہ وہ دوسروں کے برعکس کیوں دریوزہ گری کی زندگی سے بیزار رہتا ہے۔ اس بے نیازی کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ زمانہ ساز لوگوں کی سطحی ذہنیت کو بخوبی سمجھے ہوئے تھا۔ اس زمانے میں سوسائٹی کے دو پہلو خاص طور پر نمایاں تھے، ایک عام دوسرا خاص بلکہ خاص الخاص ان میں سے ایک مذہب تھا اور دوسرا چاپلوسی، مذہب اور اس سے متعلق تاویلات کے بارے میں عرفی نے کیا خوب لکھا ہے کہ

حرم جویاں درے را می پرستند ۔۔۔ فقیہاں دفترے را می پرستند
برافگن پردہ تا معلوم گردد ۔۔۔ کہ یاراں دیگرے را می پرستند

ترجمہ

در کو پوجیں کعبے والے ۔۔۔ پنڈت پوجیں پوتھی
کھینچ لے پردہ، دیکھ لیں صورت ۔۔۔ نہیں وہ، دل میں جو تھی

یعنی حرم کعبہ کے خواستگار حقیقتاً ایک معمولی در (دروازۂ حرم) کے پرستار ہیں اور عالموں یا پنڈتوں کی وہی صورت ہے جو کتاب کے کیڑوں کی ہے۔ اگر حقیقت اپنے رخ سے نقاب ہٹا دے تو معلوم ہو جائے کہ ان میں کوئی حقیقت کا پرستار نہ تھا۔ بلکہ ہر شخص ایک مصنوعی پیکر کی پرستش کر رہا تھا جو اس کی خام خیالی نے ایجاد کی تھی۔

چاپلوسی سے عرفی کو دلی نفرت تھی، اس کا یہ مسلک تھا کہ حق مستحق کے لئے ہے نا اہل یا منظور نظر کے لئے نہیں ہے۔ چنانچہ یہی مسلک عرفی نے ذیل کے شعر میں نمایاں کر دیا ہے:۔

گرفتم آنکہ بہشتم دہند بے طاعت　　قبول کردن و رفتن نہ شرط انصاف است

ترجمہ: ہم نے مانا باغ جنت بے عبادت ہی ملے　　لیکن اس طرح وہاں جانا سراسر ظلم ہے

غالباً اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے عرفی نے بہت کم قصائد لکھے اور جو قصائد لکھے بھی وہ زیادہ تر پیشوایان دین کی مدح میں ہیں۔ اس نے اکے دُکے قصائد امرا کی مدح میں بھی لکھے جو غالباً اُسے مجبوراً لکھنا پڑے۔ کیونکہ بادشاہوں کے دربار میں نذر پیش کرنے کی رسم آداب دربار سے تھی، مگر شاعر عموماً نادار ہوتے تھے ان میں نذر کی استطاعت کہاں۔ اس کے علاوہ شاعروں سے نقد رقم کی صورت میں نذر قبول کرنا معیوب بھی سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے شاعروں کو خواہ مخواہ قصیدہ لکھنا پڑتا تھا۔ عرفی نے بھی اسی بنا پر چند قصیدے لکھے اور اُن پر خاصہ انعام پایا۔

اپنی آزادمنش افتادِ طبیعت کی بنا پر عرفی کو خواجہ حافظ سے دلی عقیدت تھی، مگر دوسرے شاعروں سے بھی اُسے کوئی بیر نہ تھا۔ چنانچہ اُس نے کبھی کسی معصر شاعر کی ہجو نہیں لکھی۔

چونکہ عرفی کے شباب کا زمانہ ہندوستان ہی میں گزرا اس لئے اہل ہند کی نگاہوں سے اُس کا کلام اوجھل نہ رہنا چاہیئے۔ ہم اسی جذبے کے ماتحت اس کے چند مشہور اشعار کو دوہوں کی صورت میں بہ تصرف ترجمہ کر کے یہاں لکھتے ہیں، اور آسان ہندوستانی میں ایک غزل کا ترجمہ بھی بطور تتمہ دیئے دیتے ہیں تاکہ اہل ذوق اس بڑے شاعر سے بخوبی روشناس ہو جائیں۔ پہلے اس کے دو نہایت مشہور اشعار کا ترجمہ عام ہندوستانی میں پیش کیا جاتا ہے۔ تاکہ عرفی کی علو ہمتی کا اندازہ ہو سکے۔ اس کے ایک مشہور قصیدے کا مطلع یہ ہے ؎

اقبالِ کرم می گزد اربابِ ہمم را　　ہمت نخورد نیشترِ لا و نعم را

ترجمہ: سادھو کے اکھمان کو دُکھ دیتی ہے دَیا دَیا لوں کی
ہاں اور نہیں سے دَب نہیں سکتی، شکتی ہمت والوں کی

اسی قصیدے میں ایک جگہ اور لکھتا ہے کہ

بے برگیِ مَن داغ نہند بر دلِ ساماں　　بے مہریِ مَن زرد کند روئے دِرم را

ترجمہ: ہے کنگال پنے میں میرے شوبھا دولت والوں کی
کچھ مُکھ پڑتا ہے پیلا دھن رج سے کنگالوں کی

اِن اشعار کے بعد عرؔفی کے دوہے ملاحظہ ہوں۔ صحتِ کتابت کے خیال سے ہندی رسمِ خط بھی دے دیا گیا ہے اور ضروری فرہنگ بھی موجود ہے۔

(۱) نخورم زخم دراں کوچہ کہ مرہم باشد　　نہ شوم کشتہ دراں شہر کہ ماتم باشد

ترجمہ: میں وہاں چوٹ نہیں کھاتا جہاں مرہم ہو نہ اُس شہر میں قتل ہوتا ہوں جہاں ماتم برپا ہو۔)

دوہا　مَلہمُ دارو مِل سکے جہاں گھاؤ وہاں مت کھاؤ
جس نگری میں بَین ہو مرتُ وہاں مت آؤ

मलहम दारू मिल सके जहां घाव वहां मति खाओ
जिस नगरी में बैन हो, मृत्यु वहां मति आओ

(۲) فغاں نہ شیوہٗ اہلِ دل است اے بلبُل
وگرنہ مَن زِ تو افزوں خروش می کردم

(اے بلبل نالہ و فریاد دل والوں کا دستور نہیں ہے ورنہ میں تجھ سے بھی زیادہ نالہ و فریاد کرتا۔)

دوہا: سُن رے پپیہے باوَرے، بانی پہ آئے نہ کُوک
پریت نیمُ کہتا یہی، سادھ لے مَن میں ہُوک

(باورے معنی باولے، دیوانے، بانی معنی زبان، نیمَ معنی دستور، پریت نیم یعنی دستورِ محبت)

सुन रे पपीहे बावरे, बानी पे आये न कूक
प्रीति नियम कहता यही, साध ले मन में हूक !

(۳) غیرتم بیں کہ بَرآرندۂ حاجات ہنوز
از لبِم نامِ تو ہنگامِ دعا نشنیدہ است

(میری غیرت دیکھو کہ دعا کے وقت بھی خدائے قاضی الحاجات نے تیرا نام میرے منہ سے نہیں سُنا)

دوہا　لاج ہماری دیکھیئے، آپ کا اتنا پاس
نام بَرایا آپ کا، ہرؔ سے جو مانگی آس

(لاج معنی غیرت شرم۔ ہریا ہری معنی خدا۔)

लाज हमारी देखिये, आप का इतना पास
नाम बराया आप का, हरि से जो मांगी आस

(۴) ما لذتِ فقیریم سخا را نہ شناسیم
ناسورے ز زخمیم شفا را نہ شناسیم

(ہم فقیری کی لذت سے آشنا ہیں، اس لئے سخاوت کو نہیں پہچانتے، ہم ایسے زخم کے ناسور ہیں جو اچھا ہونا نہیں جانتا۔)

دوھا پریم بھکھاری ہم بنے، چھوڑ دَیا کی آس
پریت کے گھاؤ کو چھاجے نہ، مَلہَم کی بُو باس

"چھاجے نہ" موافق نہیں ہوتی

प्रेम भिखारी हम बने, छोड़ दया की आस
पीत के घाव को छाजे ना मलहम की बू बास

(۵) در ملامت صبر کُن عُرفی کہ آخر فیضِ عشق
زیں چمن گلہا بداماں زلیخا کردہ بود

(عرفی ملامت کے موقع پر صبر کرو، کیونکہ آخرکار باوجود ملامتوں کے زلیخا کا دامنِ مراد عشق کی بدولت گلہائے مراد سے معمور کر دیا گیا تھا۔)

دوھا عُرفی دھیرج راکھیئے جو کوؤ نام دھرائے
پیت لگے جس شول کو، ترت پھُول ہو جائے

(دھیرج معنی برداشت۔ تحمل۔ شول معنی کانٹا۔ تُرت معنی جلد)

उरफ़ी धीरज राखिये जो कोऊ नाम धराय,
पीत लगे जिस शूल को तुरत फूल होजाय ।

(۶) کفن شویم بخونِ دیدہ نے در چشمۂ زمزم
پرستارِ صنم را ہست عُرفی زمزمے دیگر

(میں خونِ دیدہ یعنی آنسوؤں سے کفن دھوتا ہوں زمزم کے پانی سے نہیں کیونکہ اے عُرفی معشوق کے پُجاری کے لئے دوسرا ہی زمزم چاہیئے)

دوھا پریت گنگ نیناں بھئے، پانی بھیو شریر
پریم پجاری کو لکھے نہ دوسر گنگا نیر

(پریت گنگ یعنی پریت کی گنگا۔ شریر یعنی جسم یعنی جسم پانی ہو کر بہہ گیا۔ لکھے معنی موافقت کرے)

प्रीत गंग नैना भये, पानी भयो शरीर,
प्रेम पुजारी को लखे न दूसर गंगा नीर।

(۷) مفروش نازِ عصمت، قدحِ شراب درکش
کہ بہ است شرمِ عصیاں زغرورِ بے گناہی

(اپنی آن بان نہ بیچو، جامِ محبت پیو، کیونکہ گناہ کی ندامت زُہد کے غرور سے بالاتر ہے)

دوہا آن بان کیوں بیچتے، پیو پلاؤ آج
بھگتی کے ابھمان سے، بھلی پاپ کی لاج
(غرور)

आन बान क्यों बेचते, पियो पिलाओ आज
भक्ती के अभिमान से, भली पाप की लाज।

(۸) گاہے بہ یادِ سرو قدے گریہ ہم خوشست
تاکے زشوقِ سدرہ و طوبیٰ گریستن

کبھی کبھی کسی حسین معشوق کی یاد میں رو لینا بھی غیر مناسب نہیں ہے، سدرہ و طوبیٰ کے شوق میں کب تک کوئی روئے۔ یعنی تو بہ و استغفار میں رونے سے مطلب یہ ہے کہ خدا جنت دے، ایسا رونا تو بقول اقبال عبادت نہیں بلکہ سوداگری ہے۔)

دوہا پیت دُکھن سے کبھو کبھو کُھل کُھل روئیں نین
کب تک سورگ کی چاہ میں کیا کرے کوؤ بَین!

(دُکھن معنی دردِ فراق۔ نین معنی آنکھیں۔ سورگ معنی جنت۔ بَین معنی گریہ وزاری)

पीत दुखन से कभू कभू, खुलि खुलि रोएं नैन,
कब तक स्वर्ग की चाह में, किया करे कोऊ बैन!

(۹) ہر کرا دشمن شوم بر عیبِ خود محرم کنم
تا زِ بیمِ طعنہ با او کینہ جوئی کم کنم

(میں جب کسی سے دشمنی کرتا ہوں اسکو خود اپنے عیب سے آگاہ کر دیتا ہوں تاکہ اُس کے طعنے کے خوف سے اُس کے ساتھ بغض و کینہ جوئی کم کروں۔)

دوہا بَیری جو کوؤ جان لوں تا کو عیب بتاؤں
نام دھرن کی لاج سے بَیر سے بچتا جاؤں

(بیری معنی دشمن۔ بَیر معنی دشمنی)

बैरी जो कोऊ जान लूँ ताको ऐब बताऊँ
नाम धरन की लाज से बैर से बचता जाऊँ

(۱۰) مدہ عنانِ تعلق بدستِ ہر ذرّہ
برآر دستے و بردوش آفتاب انداز

(ہر کسی معمولی آدمی سے ساز باز نہ رکھنا چاہیئے۔ہاں ہاتھ بڑھاکے آفتاب کے کاندھے پر دھرو یعنی صحبت بڑوں کی اختیار کرو۔بڑوں سے مطلب مالدار نہیں بلکہ عالی وقار لوگ۔)

دوھا: من بندھن باندھو نہیں، ہر اوچھے کے ساتھ
سورج مکھ شریمان سے بڑھ کے ملاؤ ہاتھ

(سورج مکھ شریمان معنی سورج کی سی اہمیت رکھنے والے صاحب جلال وجمال اور صاحب دبدبہ لوگ)

मन बंधन बांधो नहीं हर ओछे के साथ
सूरज मुख श्रीमान से बड़ के मिलाओ हाथ

(۱۱) کفر و دین درکعبہ و دیر از ازل بودند لیک
صلح و جنگے بر سر تسبیح و زنّارے نبود

کفر اور دین کعبے اور بت خانے وغیرہ میں تو ازل ہی سے تھے۔لیکن یہ شیخ و برہمن کے جھگڑے کبھی نہ تھے۔فرقہ وارانہ فساد کے باب میں عرفی کا یہ شعر خوب ہے؎

نہ ماند قاعدۂ مہر کوہکن بہ جہاں   ولے عداوتِ پرویز و کوہکن باقی است

دوھا دھرم ادھرم جگ میں رہے جب سے بنا سنسار
مالا ڈور کے کارنے مچا نہ ہاہا کار

(دھرم معنی دین، ادھرم معنی بیدینی۔ مالا یعنی تسبیح، ڈور یعنی زنّار۔ کارنے معنی سبب سے۔ ہاہا کار معنی غل غپاڑہ)

धर्म अधर्म जग में रहे जब से बना ससार
माला डोर के कारने मचा-न हाहा कार ।

(۱۲) عُرفی اگر بہ گریہ میسّر شدے وصال
صد سال می تواں بہ تمنّا گریستن

(اے عرفی اگر رونے سے وصالِ یار ممکن ہوتا تو اس تمنا میں برسوں رویا جا سکتا تھا)

دوھا عرفی برہ کے کشٹ سے روئے دھوئے کا ہوئے
پریہ ملن کی آس ہو تو جنم گنواؤں روئے
(برہ کا کشٹ بمعنی فراق کی تکلیف پریہ بمعنی معشوق)

उरफ़ी बिरह के कष्ट से रोय-धोय का होय
प्रिय मिलन की आस हो तो जनम गवाऊँ रोय

(۱۳) نزُبت نہ گوشۂ چشمے نہ چینِ ابروے
بحیرتم کہ دلِ برہمن زِ کف چوں شُد
(نہ بتوں میں ترچھی بانکی نگاہیں، نہ پیشانی کے بل، مجھے حیرت ہے کہ آخر برہمن کا دل ہاتھ سے کیوں جاتا رہا جو بتوں کا پجاری ہوا۔)

دوھا نین پلک چتون نہیں، پاتھر گول سڈول نین بمعنی (آنکھ)
من پنڈت کا کیوں بھیو بُت پر ڈانوا ڈول (پتھر)

नैन पलक चितवन नहीं, पाथर गोल सिडौल
मन पंडित का क्यों भयो बुत पर डाँवा डोल।

(۱۴) ہمرہِ غیری و می گوئی کہ عرفی ہم بیا
لطف فرمودی برو کیں پائے را رفتار نیست
(تو غیر کے تو ساتھ ہے اور کہتا ہے کہ عرفی تو بھی آ۔ بڑی مہربانی کی جو اتنا بھی کہا، مگر تشریف لیجائیے میرے پیروں کو چلنے کی تاب نہیں ہے۔)

دوھا سنگ لگے تم غیر کے کہتے مجھے بلائے
آ، اور تو بھی ساتھ چل، عرفی پگ نہ اُٹھائے
(ساتھ) (قدم، پیر)

संग लगे तुम ग़ैर के, कहते मुझे बुलाय,
आ और तू भी साथ चल उरफ़ी पग न उठाय।

(۱۵) بر ہر سُو می رَوَم بوئے چراغِ کشتہ می آید
مگر وقتے مزارِ کُشتگانِ عشق بود آنجا
(جدھر جاتا ہوں بجھے چراغ کی بُو آتی ہے، شاید کبھی اس جگہ شہیدانِ ناز کا مزار تھا۔)

دوھا جَون دِشا میں پگ دھروں، بجھے دِیا کی باس
پیت کے دیپک جل گئے رہ گئی من کی آس

जौन दिशा में पग धरूं बुझे दिया की बास
पीत के दीपक जल गये रह गई मन की आस ।

(۱۶) طغیانِ ناز بیں کہ جگر گوشۂ خلیلؑ
آید بہ زیرِ تیغ و شہیدش نمی کنند!

(یہ آن تو کوئی دیکھے کہ ابراہیم خلیل علیہ السلام کے جگر بند اسمٰعیل علیہ السلام تلوار کے نیچے لائے جاتے ہیں مگر اُسکو کند کر کے شہید نہیں ہونے دیا جاتا۔ اسمیں ایک تلمیح ہے اہل اسلام میں عید الضحیٰ کی تقریب سی واقعے سے تعلق رکھتی ہے۔)

دوھا: سیس دچھنا مانگتے، برچھی تلے دھرائے
یہ چھب دیکھ اَچرج بھیو، چھُری کُند ہو جائے
(سیس معنی سر۔ دچھنا معنی دان۔ کند۔ برچھی معنی تلوار۔ چھب معنی آن۔ ادا۔ اچرج معنی حیرت تعجب۔)

सीस दक्षिणा मांगते बरछी तले धराय,
यह छबि देख अचरज भयो छुरी कुंद होजाय

(۱۷) اُمید ہست کہ بیگانگیِ عُرفی را
بہ دوستی سخنہائے آشنا بخشند
(یہ امید ضرور ہے کہ عرفی کی بیگانگی (یعنی یادِ حق سے لا پرواہی) کو دوست کی باتوں (یعنی نعتیہ قصائد) کے وسیلے سے بخش دینگے)

دوھا آس لگا رکھ پیت سے، رے عُرفی انجان
متر بچن کی چاہ بد شاید لیں پہچان
(متر بچن، دوست کی باتیں۔ بد معنی ذریعے سے)

आस लगा रख पीत से, रे उरफ़ी अनजान
मित्र बचन की चाह बद शायद लें पहिचान ।

(۱۸) ہر کس کہ ہائے و ہو نہ کشید اہلِ روزگار
گوشش رضا بہ گفت، شنیدش نمی کنند

(جس کسی نے بھی اس دنیا میں غل غپارہ نہ کیا، دنیا والوں نے اس سے بے اعتنائی برتی اور اس کی بات چیت کی طرف توجہ نہ کی)

دوھا بِنْ ہلہ گد کچھ نہیں، جس جیون بِن پران
ہاہاکار مچائیے، سُنے جگت دھر کان
(ہلہ گد یعنی غل غپاڑہ - پران معنی سانس یا جان - ہاہاکار معنی شور و غوغا)

बिन हल्ला गुद कुछ नहीं जस जीवन बिन प्रान
हाहाकार मचाइये, सुने जगत धर कान ।

اُن کے علاوہ راقم نے اور بھی اشعار کا ترجمہ کیا ہے جو زمانۂ حال کی بے اعتنائیوں کی وجہ سے بکھرے پڑے ہیں۔ یہاں اتنے اشعار جو لکھے گئے اُن کے ترجمے کا مقصد بابا تلسی داس نے اپنے اس دوہے میں بیان کر دیا ہے اس لئے راقم کو اور کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

دوھا ترکی، عربی، فارسی، ہندی، جیتی آہ
جا میں مارگ پریم کو سبے سراہیں تاہ (تلسی داس)

तुर्की, अरबी, फ़ारसी, हिन्दी, जैती आहि
जामें मारग प्रेम को सबै सराहें ताहि ।

آخر میں عرفی کی ایک غزل بھی اسی لب و لہجہ میں سُن لیجئے، وہ یہ ہے:-

(۱) زباں ز نکتہ فرو ماند رازِ من باقی است بضاعتِ سخن آخر شد و سخن باقی است
گر بوجھن سے بانی ہاری بھید اپنا سب باقی ہے
مِٹ گئی پونجی بات بچن کی اور دُکھڑا سب باقی ہے

(۲) گماں مبر کہ چو تو بگذری جہاں بگذشت ہزار شمع بکشتند و انجمن باقی است
یہ نہ سمجھ تیرے مٹنے سے یہ سب جگ مٹ جائے گا
لاکھ دیئے جل جل بجھ جائیں پھر بھی سبھا سب باقی ہے

(۳) ز شکوہ ہائے جفایت دو کون پُر شد لیک ہنوز رنگِ ادب بر رخِ سخن باقی است
اس انیاو سے بھر گئے دو دو جگ تجھ سے اُلہنا (شکوہ) کون کرے
پریم بچن کا روپ منوہر تھا جیسا سب باقی ہے

(۴) کسیکہ محرمِ بادِ صبا است می داند کہ باوجودِ خزاں بوئے یاسمن باقی است

جو مدھو (بہشت) ماس کی ملیانل (باد بہاری) کا بھیدی ہے من میں اُسکے
پھول سوگندہ کی اِس پت جھڑ میں بھی آشا (آرزو) سب باقی ہے

(۵) نہ ماند قاعدۂ مہر کوہکن بجہان　　وَلے عداوتِ پرویز و کوہکن باقی است

رام چندر کی ریت بھولائی، رنگ لیا سب راون کا
مٹ گئے لنکا دھن اور راون یدھ (لڑائی) کتھا سب باقی ہے

(۶) مگو کہ ہیچ تعلق نماند عرفی را　　تعلقے کہ نبودش بخویشتن باقی است

نہیں رہا سمبندھ (تعلق) کوئی عرفی کو متر (دوست) یہ نہ کہو
تھا نہ سروپ (خودی) کا وہ سمبندھی (تعلق رکھنے والا)، یہ رونا سب باقی ہے

تیس سال پہلے

زمانہ بابتہ اکتوبر ۱۹۰۹ء میں دوسرے مضامین کے علاوہ "زلیخا" پر منشی پریم چند کا مضمون (نواب رائے کے نام سے) "دربار صاحب امرتسر" پر سید کرامت اللہ صاحب کا مضمون "آبر بہار" پر منشی نوبت رائے نظر کی نظم، "عوت گل" پر حضرت نادر کاکوروی کی نظم شائع ہوئی تھیں۔ نظر صاحب کی ایک غزل اس پرچہ میں ہدیۂ ناظرین کی گئی تھی جس کے چند اشعار ناظرین زمانہ کی دلچسپی کے خاطر درج ذیل ہیں:-

یاس سے ویرانیٔ حسرت کبھی ایسی نہ تھی　　دل میں سناٹا نہ تھا وحشت کبھی ایسی نہ تھی

اب تو دنیا کی ہوا اور روشنی آتی ہے صاف　　جا بجا سے شق مری تربت کبھی ایسی نہ تھی

جان ہی لینے لگی مایوسیٔ صبحِ وصال　　دل جگر میں درد کی شدت کبھی ایسی نہ تھی

ہجر میں دِل اِک مرقع تھا اُمید و بیم کا　　تھی بہت ابتر مگر حالت کبھی ایسی نہ تھی

عیشِ رفتہ کا مصیبت میں کیا جب ہم نے ذکر　　دل یہ بول اُٹھا تری قسمت کبھی ایسی نہ تھی

دل کے چھالے میں سمٹ کر حسرتیں سب مر گئیں　　قابلِ عبرت کوئی تربت کبھی ایسی نہ تھی

کچھ ڈالے زندگی میں وصل و فرقت کے طلسم　　غم کبھی ایسا نہ تھا راحت کبھی ایسی نہ تھی

دل کو کیا سمجھا دیا نومیدیٔ جاوید نے　　پردہ دارِ غم شبِ فرقت کبھی ایسی نہ تھی

زندگی کی کشمکش سے مر کے پائی کچھ نجات　　اِس سے پہلے اے نظر فرصت کبھی ایسی نہ تھی

جشنِ بیچارگی

(از جناب احسان بن دانش)

ہے داغِ دل اک شامِ سیہ پوش کا منظر
تھا ظلمتِ خاموش میں شہزادۂ خاور

عالم میں مچلنے ہی کو تھے رات کے گیسو
انوار کے شانوں پہ تھے ظلمات کے گیسو

یہ وقت اور اک دخترِ مزدور کی رخصت
واللہ قیامت تھی، قیامت تھی، قیامت

نوشاہ کا جو سر پہ تھا باندھے ہوئے سہرا
بھرپور جوانی میں تھا اُترا ہوا چہرا

اندوہ ٹپکتا تھا بشاشت کی نظر سے
مُرجھائے سے رخسار تھے فاقوں کے اثر سے

کرتا بھی پُرانا سا تھا، پگڑی بھی پُرانی
مجبور تھی قسمت کے شکنجوں میں جوانی

نوشہ کے جو ساتھ آئے تھے دو چار براتی
ہر اک کی جبیں سے تھی عیاں نیک صفاتی

توقیر کے، اُلفت کے، شرافت کے مرقعے
ایثار کے، ایمان کے، غیرت کے مرقعے

ہمراہ نفیری تھی، نہ باجا تھا، نہ تاشا
آنکھوں میں تھا بے مہریِ عالم کا تماشا

مجمع تھا یہ جس خستہ و افسردہ مکاں پر
تھا بھیس میں شادی کے وہاں عالمِ محشر

دالان تھا گونجا ہوا رونے کی صدا سے
اک درد ٹپکتا تھا عرق ناک ہوا سے

اماں کی تھی بیٹی کی جُدائی سے یہ حالت
چیخوں میں ڈھلے جاتے تھے جذباتِ محبّت

تھا باپ کا یہ حال کہ اندوہ کا مارا
اُٹھتا تھا تو دیوار کا لیتا تھا سہارا

وہ آپ کہیں اور تھا، جاں اور کہیں تھی
سینے میں کوئی شے تھی جو قابو میں نہیں تھی

افلاس کے آرے جو جگر کاٹ رہے تھے
ارمان سب اپنا ہی لہو چاٹ رہے تھے

لڑکی کا یہ عالم تھا کہ آپے کو سمیٹے
گُڑیا سی بنی بیٹھی تھی چادر کو لپیٹے

تھی پاؤں میں پازیب، نہ پیشانی پہ ٹیکا
اس خاکۂ افلاس کا ہر رنگ تھا پھیکا
انصاف زمانہ تھا، کہ تقدیر کا چکر
ماں باپ کو آیا نہ تھا، جوڑا بھی میسّر
یوں کہنے کو دولھن تھی، یہ مزدور کی دختر
امّاں کا دوپٹّہ تھا تو ابّا کی تھی چادر

آخر نہ رہا باپ کو جذبات پہ قابو
ہلنے لگے خود ہونٹ، ٹپکنے لگے آنسو

کہنے لگا نوشہ سے کہ اے جانِ پدر سُن!
اے وجہِ سکوں، لختِ جگر، نورِ نظر سُن!
گرچہ مری نظروں میں ہے تاریک خدائی
حاضر ہے مری عمر کی معصوم کمائی
کی لاکھ مگر ایک بھی کام آئی نہ تدبیر
مجبور ہوں مجبور، یہ تقدیر ہے تقدیر!
لیکن اسے ایمان کی دولت ہی بہت ہے
لڑکی کے لئے چادرِ عصمت ہی بہت ہے
اس سانولے چہرے میں تقدّس کی ضیا ہے
یہ پیکرِ عفّت ہے، یہ فانوسِ حیا ہے!
اس کے لئے چکّی بھی نئی چیز نہیں ہے
بیٹی ہے مری، دخترِ پرویز نہیں ہے!
غربت میں یہ پیدا ہوئی غربت میں پلی ہے!
خودداری و تہذیب کے سانچے میں ڈھلی ہے!!
زنہار یہ زیور کی تمنّا نہ کرے گی!
ایسا نہ کرے گی، کبھی ایسا نہ کرے گی!!
قسمت کی شکایت اسے کرنا نہیں آتا،
ادراک کی سرحد سے گزرنا نہیں آتا
ہے صبر کی خوگر، اسے فاقوں کی ہے عادت
ماں باپ سے پائی ہے وراثت میں قناعت

اس کی بھی خوشی ہوگی، تمھاری جو رضا ہو
تم اس کے لئے دوسرے درجے پہ خدا ہو

پھر آکے یہ بیٹی سے کہا، نرم زباں سے
بچّی مری رخصت ہے تو اب باپ سے ماں سے
اُمید ہے ہر بات کا احساس رہیگا
ماں باپ کی عزّت کا تجھے پاس رہیگا
آلام میں، کلفت میں وفادار ہی رہنا!
آئے جو قیامت بھی تو ہنس کھیل کے سہنا

دل توڑ نہ دینا کہ خدا ساتھ ہے بیٹی
لاج اس مری داڑھی کی ترے ہاتھ ہے بیٹی

آیا جو نظر مجھ کو یہ جاں کاہ نظارا
احسان نہ آنکھوں کو رہا ضبط کا یارا

تھمنے لگی ہر سانس مری سوزِ نہاں سے
اتنا ہے مجھے یاد کہ نکلا یہ زباں سے

آے خالقِ کونین، یہ تو نے بھی سُنا ہے؟ دُنیا کو گماں ہے کہ غریبوں کا خُدا ہے!
تو جن کا خدا اُن کا ہو گردش میں ستارا! کیا تیرے کرم کو یہ ستم بھی ہے گوارا؟
کِس طرح نہ ہو دل کو بھلا رنج و محن دیکھ؟ مزدور کے اس زندہ جنازے کا کفن دیکھ!

احساس کبھی دل سے جُدا ہو نہیں سکتا
اِنسان ہے انسان خدا ہو نہیں سکتا

انیسؔ کا غیر مطبُوعہ کلام

قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹرایٹ لا، پٹنہ نے میرانیس مرحوم کی ایک مکمل غزل اور ایک مطلع نقل کرکے رسالہ "اُردو" دکن کے نذر کیا ہے۔ چنانچہ ہم ان دونوں کو ناظرین زمانہ کی دلچسپی کے لئے درج ذیل کرتے ہیں۔

مطلع

خموش اے بلبلِ شوریدہ اس میں کیا ہے بس میرا
یہ اپنی اپنی قسمت ہے، چمن تیرا قفس میرا

غزل

شہیدِ عشق ہوئے قیسِ نامور کی طرح جہاں میں عیب بھی ہم نے کئے ہنر کی طرح
کچھ آج شام سے چہرہ ہے فق سحر کی طرح ڈھلا ہی جاتا ہوں فرقت میں دوپہر کی طرح
سیاہ بختوں کو یوں باغ سے نکال اے چرخ کہ چار پھول تو دامن میں ہوں سپر کی طرح
تمام خلق ہے خواہانِ آبرو یارب چھپا مجھے صدفِ قبر میں گُہر کی طرح
تجھی کو دیکھوں گا جب تک ہیں بیقرار آنکھیں میری نظر نہ پھرے گی تری نظر کی طرح

انیسؔ یوں ہوا حالِ جوانی و پیری
بڑھے تھے نخل کی صورت گرے ثمر کی طرح

اُردو شاعری میں آمد اور آورد

ازحضرت وصل بلگرامی

اگر کسی نے فارسی نہ بھی پڑھی ہو تو اتنا تو سبھی جانتے ہیں کہ "آمدن" کے معنی "آنا" اور "آوردن" کے معنی "لانا" ہیں۔ بس یہی معنی ان دونوں لفظوں کے شاعری میں بھی ہیں۔ اگر شاعری خود آپ کے پاس چلی آے، تو یہ اُس کی آمد ہوئی اور اگر آپ اُسے جاکر زبردستی لائیں تو یہ آورد ہوئی۔ جو شخص خود آپ کے یہاں آئے تو یہ سمجھا جائے گا کہ اُس کو آپ سے کچھ نہ کچھ مناسبت ضرور ہے۔ اگر آپ کسی کو پکڑ لائیں تو وہ خواہ مخواہ مُنھ بسور کر بیٹھے گا۔ اور جو بھی اُس کو دیکھے گا سمجھ جائیگا کہ یہ صاحب خانہ کی زبردستی کا نمونہ ہیں۔

یہ بالکل ٹھیٹ قسم کی تعریف ہے۔ اب ذرا آمد اور آورد پر شاعرانہ نقطۂ نگاہ سے غور کیجئے۔ بعض ادیبوں نے جو شاعری کی تعریفیں کی ہیں وہ سراسر اِسی آمد اور آورد کے امتیاز پر مبنی ہیں۔ مثلاً مشہور انگریزی شاعر ورڈسورتھ نے شاعری کی تعریف یہ کی ہے کہ:-

"جذبات کے بے اختیار اظہار کا نام شاعری ہے۔"

اس سے مراد یہ ہے، اگر جذبات اصل نہیں ہیں اور دوسروں کی کہانی اپنے الفاظ میں کہی جارہی ہے یا فرضی تخیل کو نظم کے قالب میں ڈھالا جارہا ہے تو وہ شاعری نہ ہوگی۔ مشرقی نقاد ایسے لوگوں کو شاعروں کی صف سے باہر تو نہیں نکالتے۔ بلکہ ایسی شاعری کو آورد کہہ کر چُپ ہو جاتے ہیں۔

تنقید کا بادا آدم ارسطو بھی شاعری کی یہی تعریف کرتا ہے کہ:-

"شاعری جذبات کی ترجمانی کا نام ہے۔"

بہرحال شاعر حقیقت میں وہی ہے جو جذبات کی ترجمانی کرتا ہو۔ یوں تو موزوں جملوں میں کسی واقعہ کے بیان کو بھی شاعری ہی کہا جاسکتا ہے۔ خواہ جذبات کا اُس واقعہ سے کوئی تعلق ہو یا نہ ہو۔

یہاں اِتنا اور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خواہ کسی نے وزن، قافیہ اور ردیف کو شاعری کے لئے لازم نہ بھی قرار دیا ہو۔ لیکن ان کے بغیر کسی کو شاعری کرتے نہیں دیکھا گیا۔ اِسی طرح شاعری اور

عروض و قوافی وغیرہ کا تعلق ہے۔ یہ چند جملے میں نے اِس وجہ سے عرض کئے ہیں کہ آگے چل کر عروض اور شعر کی بحث کے ساتھ آمد اور آورد کا تعلق ہے بہت کچھ مدد دیں گے۔

بہرصورت شعر کے لئے جذبات کی براہِ راست ترجمانی اور موزونیت ضروری ہے' اور موزوں الفاظ میں جذبات کی ترجمانی کا نام ہی شاعری ہے۔ خود میں نے اپنی نظم "لکھنؤ سے خطاب" میں ایک مقام پر عرض کیا ہے ؎

کہتے ہیں جس کو شعر' ہے تفسیرِ زندگی الفاظ کے لباس میں تصویرِ زندگی
اُتری ہوئی دماغ سے تنویرِ زندگی طرزِ بیاں کے دام میں تاثیرِ زندگی
آورد کی نہ قصۂ باطل کی بات ہے
کہتے ہیں جس کو شعر فقط دل کی بات ہے

اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ موزوں شعر ہم اُس کو کہتے ہیں جو ہماری مجوزہ بحروں میں سے کسی ایک میں پُورا اُترآئے۔ ہمارے یہاں ردیف اور قافیہ ایسی چیزیں ہیں۔ جن کی پابندی کو نئی وضع کے لوگ سراسر آورد کہتے ہیں۔ یہ اُلجھن اِسی وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ اکثر ہم کو ایسے اشعار ملتے ہیں۔ جن سے یہ اندازہ لگانا آسان ہو جاتا ہے کہ شاعر نے قافیہ ڈھونڈھ کر یا قافیہ کے لئے شعر کہا ہے۔ یہی حال طرحی غزلوں کا ہے کہ اُسمیں اُنھیں قافیوں میں دماغ سوزی کرنا پڑتی ہے جو طرح میں آسکتے ہیں جو زبردستی کی شاعری ہوئی نہ کہ اپنی خوشی کی۔

اگر یہ کہا جائے کہ شاعری میں آمد کوئی چیز نہیں بلکہ اصل میں آورد ہی سب کچھ ہے اور یہی آورد جب اچھوتے پن کے انتہائی کمال تک پہونچ جاتی ہے تو آمد بن جاتی ہے۔ عمدہ سے عمدہ اور برجستہ سے برجستہ شعر بغیر غور و فکر کے وجود میں نہیں آتا۔ تو ہم یہ عرض کریں گے کہ آپ نے قافیہ کا خیال چھوڑ کر مضمون کو پہلے درجہ میں رکھا تو وہ بھی آورد ہی کی ایک شکل ہوئی۔ آمد کی یہ تعریف کرنا کہ جو خود بخود ذہن میں آجائے اور موزوں الفاظ میں ادا ہو جائے کہنے میں تو یہ تعریف بہت اچھی معلوم ہوتی ہے لیکن جب اس کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ صرف ایک مغالطہ ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ شاعری سیکھنے کے لئے ایک مبتدی کو استادوں کے دیوان کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ جب شعر کہے تو دوسرا مصرع ہمیشہ پہلے کہے اور دوسرا مصرع بعد میں۔ ایک قافیہ لے کر اُسمیں شعر کہے پھر اُس قافیہ کو لے کر کسی دوسرے خیال کے ساتھ باندھے۔ اِسی طرح چار پانچ مرتبہ ایک ہی قافیہ پر طبع آزمائی کرے۔ تین چار مرتبہ تو وہ دوسرے کے خیالات کو نظم کرے گا۔ لیکن ایک ایسا وقت آجائے گا کہ اُسکے خیال میں ایک اچھوتا پن

نظر آنے لگیگا۔ اور وہ رفتہ رفتہ شاعر اور اُستاد ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے اصول بتائے گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ کسی کی طبیعت کے لئے یہ اصول موافق و کارآمد ہوں۔ لیکن یہ کلیہ کہاں تک ماننے کے قابل ہے غور طلب بات ہے۔ شاعری سیکھنے کے معنی یہ ہوئے کہ صحیح معنی میں شاعری سیکھنے سے آسکتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعری شروع ہی سے شعریت کا دماغ لے کر آتا ہے۔ اسکی خلقت اور فطرت شاعر ہوتی ہے اور وہ خود مجسم شعر بن کر آتا ہے۔ اُس کے لئے سیکھنے کی ضرورت نہیں۔ اس سے خود بخود شعر موزوں ہو جائے گا۔ ترنم اُس کی گھٹی میں پڑا ہوگا۔ اور وہ اسی دھن میں لگا رہیگا۔ ہاں! فن شعر اور فنِ موسیقی حاصل کرنا یہ شاعری اور موسیقی کی تکمیل ضرور ہے۔

اسمیں شک نہیں کہ عام طور سے غزلیں اُسی طریقے سے کہی جاتی ہیں جو اوپر بیان ہوا ہے اور کبھی دوسرا جیسا وقت ہو۔ اب آمد اور آورد میں فرق یہ رہجاتا ہے کہ اگر قافیہ اور ردیف شگفتہ ہے تو کہدیا کہ شعر میں آمد ہے ورنہ آورد۔ اس کو ایک مثال کے ذریعہ سے یوں سمجھئے۔ جناب منیر شکوہ آبادی کا جن کو مسلم الثبوت اُستاد مانا گیا ہے دیوان اُٹھا کر دیکھئے کیا کہتے ہیں۔ مطلع دیوان ملاحظہ ہو ؎

چوٹی عروس جاں کی ہے دنبالہ میم کا — سرتاج روح نام ہے ربِ کریم کا

اس دیوان کی طرحیں ملاحظہ ہوں۔ ع

بانکڑی مانگی تو حاضر کھنکھجورا ہو گیا

یہ اکیس ۲۱ شعروں کی غزل ہے اور شاید ہی کوئی قافیہ ایسا ہو جو نہ استعمال کیا گیا ہو۔ اب چند طرحیں اور سن لیجئے

"چوب مورلنگ پر سکھیں سواری بیٹریاں" — "ہمارے اُن کے رہے پردہ کفن میں نشست"

"رکھے نہ پھونک پھونک کے محشر میں صور پاؤں" — "نکل کر ناریل سے آگئی اکسیر چکّی میں"

"ڈھالی صراحی آہوئے مشکیں نے جست کی" — "سب سے عنقا کھیلیں یہ دیہی کبوتر کھیلتے"

"شب کو خموشی دن کو ژاژ" — اسی طرح نہ معلوم کتنی طرحیں ہیں۔

آپ اس کو کہنہ مشقی۔ کاوش۔ بلند خیالی اور اس سلسلے میں ہر شعر کو آمد کی ایک کڑی تصور کریں لیکن میں تو اس کو آورد ہی کہوں گا۔ یہیں پہونچ کر معلوم ہوجاتا ہے کہ شاعری اور چیز ہے اور کہنہ مشقی اور چیز۔ ذوق کی ایک غزل کا مطلع ہے ؎

بلبل ہوں صحن باغ سے دور اور شکستہ پر — پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر

آپ کہیں گے کہ یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔ میں کہوں گا بہت کچھ ہوا۔ بھلا اس خارستاں سے اور کون سے گلدستے بنتے۔ آپ سوال کریں گے کہ اس سے فائدہ۔ میں عرض کروں گا کہ پہلوان کی ورزش ہے

آخر میں ایک اُستاد کا یہ شعر بھی سن لیجئے ؎

آنکھ میں سرمے کا دنبالہ بنا کر بولے
کیوں عصا ٹیک کے ہو جائے کھڑی میری آنکھ

اس شعر میں ردیف "میری آنکھ" اور "کھڑی" - پڑی - لڑی وغیرہ قافیے ہیں - زمین مشکل ہے لیکن اتنی مشکل نہیں کہ ایسے خراب پھل نکلیں. یہاں اتنا فرض کر لینا پڑے گا کہ آنکھ کو نرگس بیمار بھی کہتے ہیں - نرگس کے لفظ کو شاعر نے نظر انداز کر دیا - صرف بیمار خیال میں رکھا - بیمار عصا ٹیک کر چلتا ہے - اسی طرح اور چیزوں کو جمع کیا، بس شعر بن گیا - شعر کتنا ہی بیکار کیوں نہ ہو - لیکن اُسے پڑھ کر آپ ہنسینگے ضرور، اور شاعر کی محنت کی داد بھی ضرور دیں گے - آنکھ کے سلسلے میں دو تین شعر ایسے بھی سن لیجئے، اور شاعری کی کسوٹی پر اُن کو جانچیئے - اسوقت آپ کو معلوم ہو گا کہ یہ شعر کیسے ہیں - اصغر گونڈوی کہتے ہیں ؎

بکھری ہوئی ہو زلف بھی اِس چشم مست پر
ہلکا سا ابر بھی سر میخانہ دیکھئے

بھلا کون کہے گا کہ اس شعر میں آمد نہیں - اسی مضمون کا ایک اور شعر سُنئے - جسمیں آمد اس سے زیادہ ہے

کیفیت چشم اسکی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

لیکن میر کے اس شعر میں آمد ہی آمد معلوم ہوتی ہے ؎

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

یہاں تک تو جو بحث ہوئی وہ اُردو شاعری کی اِس قسم کی بابت ہوئی جسمیں ردیف اور قافیہ امتیازی حیثیت رکھتے ہیں. مثلاً غزل، قصیدہ اور اسی قسم کی دوسری چیزیں ہیں جنمیں وہی ردیف، قافیے بار بار دہرانے پڑتے ہیں - یہاں ہم کو یہ معلوم ہوا کہ شاعر قافیہ کو چھوڑ کر خیال سے شعر بناتا ہے - بلکہ قافیوں سے خیال قائم کرتا ہے - اور اس پابندی میں بھی شاعر اگر صحیح معنوں میں شاعر ہے تو اس کی طبیعت سے شگفتہ اور برجستہ شعر نکل جاتے ہیں - دو شعر جناب مجذوب کے سنیئے ؎

عیاں حالِ دل بے بیاں ہو رہا ہے
کہ عاشق سراپا زباں ہو رہا ہے

پلا دی ہے باتوں ہی باتوں میں اتنی
کہ آنکھوں سے دریا رواں ہو رہا ہے

جگر مراد آبادی کے شعر ہیں ؎

نگاہوں سے چھپ کر کہاں جائیے گا
جہاں جائیے گا ہمیں پائیے گا

مٹا کر ہمیں آپ پچھتائیے گا
کمی کوئی محسوس فرمائیے گا

جناب رضا کے بھی تین شعر سُن لیجئے :-

متصل طفلی سے آغازِ شباب
خواب کے آغوش میں بیداریاں

دردِ دل اور جاں لیوا پرستشیں ایک بیاری کی تنتو بیماریاں

عشق اور قیدیں یہ رسم و راہ کی ہائے دُنیا اُف ری دنیا داریاں

آپ کہیں گے کہ ان کے قافیے مشکل نہیں ہیں۔ اچھا اب کچھ ایسے شعر بھی سُن لیجئے جو باوجود مشکل قافیوں کے نہایت چُست اشعار ہیں۔ فراقؔ گورکھپوری کا شعر ہے ؎

قفس سے چھٹ کے وطن کا سراغ بھی نہ ملا یہ رنگِ لالہ و گل تھا کہ باغ بھی نہ ملا

غالبؔ کی بیسوں غزلیں ایسی ہیں کہ جن کی زمینوں میں سیکڑوں شعرا نے طبع آزمائی کی لیکن مشکل سے وہ غالبؔ کی برابری کرسکے۔ بھلا ذیل کے مطلعوں سے شروع ہونے والی غزلوں میں کون سا شعر ایسا ہے جس میں آورد معلوم ہوتی ہے ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو نہ ہو جب دل ہی قابو میں تو پھر منھ میں زباں کیوں ہو

نکتہ چیں ہے غمِ دل اُسکو سنائے نہ بنے کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئینگے کیا

یہ صحیح ہے کہ شاعری اکتسابی چیز نہیں ہے بلکہ فطری ہے۔ شاعر بنائے نہیں جاتے بلکہ پیدا ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر شعرا کو تلامیذ الرحمٰن کہا گیا ہے۔ لیکن تربیت، اکتساب اور مشق سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ انیسؔ کو فطرت نے شاعر بنایا تھا۔ اور دبیرؔ خود شاعر بنے۔ میں کہتا ہوں یہ درست ہے مگر دُنیا دبیرؔ کے رنگ کا جواب بھی پیش نہ کرسکی۔ غرض فطرت کی فیاضیوں سے انکار نہیں ہوسکتا۔ اور تربیت اور اکتساب کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ بعض مرتبہ شعر پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح درجہ بدرجہ ترقی کر کے شعر کو اس منزل پر پہونچا گیا ہے۔ پہلے اس کا خاکہ یہ تھا پھر یہ ہوا اور پھر شکل ہو کر فتنۂ قیامت بن گیا۔ لیکن اس قسم کی تنقید میرے خیال میں جہاں دلچسپ ہے۔ وہاں شاعری پر ظلم بھی ہے۔ اور شعر کے حسن کی مٹی پلید کرنا ہے۔ انگریزی شاعر براؤننگ نے اپنی محبوبہ کے نازک ہاتھ کی ایک اچھوتی اور لاجواب تشبیہ دی ہے۔ کہتا ہے کہ تیرے سفید بازوؤں میں سُرخی اس طرح جھلکتی ہے جس طرح سنگ مرمر پر گلاب کی روح چھڑک دی گئی ہو۔ اگر آپ اُس کے ہاتھ کا پوسٹ مارٹم کر کے اس کے حسن کا تجزیہ کریں تو میں کیا کہوں۔ بس اسی طرح یہ سمجھ لیجئے کہ شعر کا پوسٹ مارٹم کرنا اس شعر کی زندگی کو خاک میں ملا دینا ہے۔ یوں ڈاکٹروں کے لئے تو مردہ بھی کار آمد ہوتا ہے۔

غرض آمد اور آورد یہ ایک ایسی چیز ہے کہ جس کا امتیاز مشقِ سخن کے بعد ذرا مشکل ہوجاتا ہے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ بعض بعض شاعر مشقِ سخن کی ایک صدی پوری کرکے بھی وہ بات حاصل نہیں کرسکتے جو ایک فطری شاعر بہت تھوڑے عرصہ میں حاصل کرلیتا ہے۔ اب اس کو آپ فطرت کی فیاضیاں کہئے یا کچھ اور۔ بہرحال واقعہ یہ ہے کہ کچھ شاعر پیدا ہوتے ہیں اور کچھ شاعر بن جاتے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ آخرالذکر شاعر نہیں ہوتے۔ میں عرض کروں گا کہ جو اکتساب سے شاعر ہوتے ہیں وہ اُن لوگوں میں نہیں ہوتے ع

کہ میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

بلکہ وہ بھی اپنے لئے ایک مستقل جگہ پیدا کرلیتے ہیں[1]

دُکھ کے لمحے

از مسٹر شانتی سروپ کیفؔ

تارے ڈوبے، سُورج نکلا، رات گئی اور ہوا سویرا
ابتک ڈولت ہے آوارہ سا بن ساجن کے مَن میرا
رات کٹی تھی نینوں میں اب دِن بپتا نے ہے گھیرا

بیچ ندی کے' نیا اور' دُور بانسری کوئی بجاوے
دھیمی دھیمی بنسی کی لَے میرے دِل میں اُتری جاوے
ایسے میں پھر روگ برہ کا گھُن کی نیائیں مَن کو کھاوے

ساون روتے بیت گیا ہے' بھادوں دیکھیں کیسا آئے!
چین نہیں ہے من کو کہیں بھی' ہردم اُسکی یاد ستائے
ایسا ہو' میں اُس کو بھلادوں' اے سجن جو مو سے بھلائے

---

[1] بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ ۔ ا۔ز

نقشِ بے ثبات

(از شیخ محمد یوسف صاحب ظفر بی، اے)

اُٹھا ہوں پچھلے پہر، رات کی خموشی میں — فلک ہے محو ستاروں کی گرمجوشی میں

فلک پہ چاند ہے پہرے میں ابر پاروں کے — تمام پڑ گئے مدھم چراغ تاروں کے

مغنیوں کے پپوٹے ہیں نیند سے بوجھل — مچی ہوئی ہے فضا میں نسیم سے ہلچل

سُبک سُبک ہے ہر اک چیز ماہ، نور، ہوا — شرابِ کیف میں ڈوبی ہوئی ہے اب دُنیا

وہ ایک حور نے آنچل اُٹھایا بادل کا — ہے چاند اوٹ میں اور رنگِ نور ہے ہلکا

چھلک رہی ہے خموشی شراب خانوں سے — گزر رہا ہے مسافر حسیں چٹانوں سے

چلی وہ ناز سے بدلی، وہ سرسرائی ہوا — وہ پیڑ جھوم گئے وہ کلی کا دل دھڑکا

وہ نور خیز ہے مغرب شعاعِ ایمن سے — اُچک کے دیکھا وہ سایوں نے زرد چلمن سے

وہ ابر چاک ہوا، وہ کرن اِدھر آئی — وہ مہ نے غرفۂ سیمیں سے شکل دکھلائی

وہ ماہ اُبھرا، وہ ظلمت نے پر سمیٹ لئے — گلوں نے نور کی چادر میں منہ لپیٹ لئے

وہ ٹمٹمائے ستارے، وہ بے خودی اُٹھی — وہ یاس ڈوب گئی، وہ اُمید جی اُٹھی

وہ چاند پھر ہے فسانہ نگارِ خاموشی
یہ دار، دارِ فنا ہے کہ دارِ خاموشی

عجیب حال ہے نقش و نگارِ ہستی کا — بلندیوں سے نکھرتا ہے رنگ پستی کا

یہاں نہیں ہے، کسی شئے کو بھی قرار نہیں — خوشی خوشی ہے، یہاں غم بھی پائدار نہیں

کبھی ہے نور کے پرتو میں تیرگی کا خرام — کبھی ہے نار کے ہونٹوں پہ آہِ نیلی فام

کبھی سکوت نے پرچم فضا میں کھول لئے　　کبھی سرودِ شبینہ نے دل ٹٹول لئے
کبھی کبود ہے رنگِ فضا کبھی زرّیں　　کبھی فلک ہے زمیں پر کبھی فلک پہ زمیں
کبھی نیاز میں نازِ حبیب ہے مضمر　　نظر سے دُور تو دل کے قریب ہے مضمر
کبھی ہے مہر کی تابش، کبھی ہے ماہ کا رنگ　　جہانِ زیست ہے گویا نگارشِ ارژنگ
گھڑی میں کچھ ہے، گھڑی میں ہے کچھ خیالِ بشر　　جو محوِ خواب ہے اب کل ہے وہ شہِ خاور
جو کیفِ مے سے ہے نہیں ہے وہ کیفِ مدہوشی　　جُدا ہے لطفِ ترنّم سے لطفِ خاموشی

ہے گرچہ ناظمِ فطرت کا انتظام وہی
نہیں ہے حُسنِ سحر اور حسنِ شام وہی

سکون کہتے ہیں ہم جس کو بے سکون ہے وہ　　تغیرات کی ہر آرزو کا خون ہے وہ
اِسی سے سلسلۂ کائنات جاری ہے　　اِسی سے شغلِ حیات و ممات جاری ہے

ظفرؔ یہ دل کے اُفق پر طلوع ہوتا ہے
کہ ہر فسانہ اِسی سے شروع ہوتا ہے

اعجازِ کلام

(از مولوی محمد یعقوب خاں کلامؔ بی اے)

عشق کی کائنات میں کون نہیں ہے کیا نہیں؟　　دیر نہیں، حرم نہیں، بت نہیں، یا خدا نہیں
تجھ پہ دلِ ستم نصیب کون ہے جو فدا نہیں　　ناز نہیں، ادا نہیں، جوَر نہیں، جفا نہیں
دہر کے ذرہ ذرہ کی حُسنِ تضاد ہے اساس　　درد نہیں، دوا نہیں، موت نہیں، بقا نہیں
کُنجِ لحد بھی ہے عجب، گوشۂ عافیت نواز　　غل نہیں، غلغلہ نہیں، ڈر نہیں، دغدغا نہیں
عشق بغیر زندگی، خوانِ طعام ہے، مگر　　آب نہیں، نمک نہیں، لطف نہیں، مزا نہیں
واقفِ حالِ مرغِ دل کون نہیں ہے باغ میں　　گل نہیں، بلبلیں نہیں، غنچے نہیں، صبا نہیں

کس کو سنائیے کلامؔ قصۂ وارداتِ دل
جوش نہیں، جگر نہیں، ہوش نہیں، وفا نہیں

پریم چند کی ادبی روش

از ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی، ڈی۔ لٹ

پریم چند کے ہاں لکھنؤ میں مہمان تھا۔ رات کو بات چیت میں بارہ بج گئے۔ سوتے وقت آپ نے فرمایا۔ "صبح کے بجے اٹھنا چاہتے ہو؟" میں نے عرض کیا۔ "معمولاً ۷ بجے صبح اٹھتا ہوں۔ کل شاید ذرا دیر ہو جائے۔" فرمایا۔ "میری آنکھ صبح پانچ بجے کھل جاتی ہے۔" میں پانچ کے قریب پیشاب کی حاجت سے اٹھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ آپ بیدار ہیں اور آلتی پالتی مارے ایک کمبل پر بیٹھے ہیں۔ سامنے منشیانہ وضع کا چھوٹا سا ڈیسک رکھا ہے اس پر ایک رجسٹر ہے اور حضرت لکھ رہے ہیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ایک کہانی ختم کرنے کی فکر میں ہیں۔ اسکے بعد بچوں کے لئے جو رامائن لکھ رہے ہیں اس پر ہاتھ صاف کریں گے۔ مجھے تعجب ہوا کہ کس طرح ایک شخص ایک ہی وقت میں متعدد مضامین اور مختلف موضوع پر خامہ فرسائی کر سکتا ہے۔ میری حالت یہ ہے کہ ایک دو بیٹھک میں جو چاہے لکھ لوں۔ اس سے زیادہ نشستوں میں دماغی تسلسل قائم نہیں رہتا۔ میں نے ان کے پابندی اوقات اور تسلسل خیالات کی داد دی اور اپنی نااہلیت کا اظہار کیا ؂

دن کو بتوں کی یاد ہو شب کو خدا کی یاد　　ہو انضباطِ وقت تو لطفِ حیات ہے



"یادگار پریم چند" میں جو دفتر زمانہ سے شائع ہوئی ہے، دو چار ایسے اقتباسات ہیں۔ جن سے پریم چند کی روش ادب اور معراج ادب پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ وہ بھی اس بات کے قائل تھے اور میرا بھی یہی عقیدہ ہے کہ بدی میں جو نظر فریبی ہے وہ نیکی میں نہیں۔ مگر طبعاً و فطرتاً وہ نیکی کی تحریک میں سعی کرتے تھے اور بندہ بدی کی ظاہری دلکشی کے پردے کو الٹنے کی فکر میں رہتا ہے۔ عملی حیثیت سے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ تو اچھے کریکٹروں کی تصویر کشی میں محو رہتے تھے اور میں سوسائٹی کے اوباشوں ملعونوں اور مطعونوں کو بے نقاب کرنے میں مصروف رہتا ہوں۔ یوں بھی زندگی میں انھوں نے سماج کے تاریک پہلوؤں سے کم واقفیت حاصل کی اور جیسے نیک خود تھے ویسے ہی نیکوں کے اعمال کا مطالعہ و مشاہدہ کیا۔ ان کے اقوال ملاحظہ ہوں اور میرے اشعار۔ پھر ایک واقعہ اپنے نظریہ کے ثبوت میں عرض کروں گا۔

"یہ عجیب بات ہے کہ نیکی میں جتنی نفرت ہوتی ہے بدی میں اُتنی ہی رغبت"
"عالم، عالم کو دیکھ کر، سادھو، سادھو کو دیکھ کر، شاعر کو شاعر دیکھ کر جلتا ہے۔ ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔ مگر جواری، جواری کو دیکھ کر، شرابی، شرابی کو دیکھ کر، چور، چور کو دیکھکر ہمدردی جتاتا ہے، مدد کرتا ہے۔"

فقیر نے لکھا ہے:۔

ہیچ دُنیا و کارِ دُنیا، ہیچ ـــــ پھر بھی نیکی بدی سے بہتر ہے
نظر کش، دلفریب اور قوت افروز ـــــ مگر با ایں ہمہ کیا ہے بدی میں؟
رندوں میں باہم اگر ہے کسقدر ربط و سلوک ـــــ اجنبیت سی دکھائی پارساؤں میں ہیں
خود عوام آئیں گے صد شوق سے نیکی کی طرف ـــــ بے نقاب آپ بدی کر کے دکھائیں تو سہی
باہر ہوا محیطِ مشیت سے وہ کہاں ـــــ شیطان کی سرکشی ہے رضائے خدا کا راز

انہی دنوں جب پریم چند "مادھری" کی عنان ہاتھ میں لئے تھے۔ میرے ہندی افسانوں کا ایک مجموعہ کانپور سے "سدا گلاب" کے نام سے شائع ہوا۔ مرحوم گنیش شنکر میرے نفسیاتی تجزیہ کے بہت مداح تھے۔ خود پریم چند نے میرے ایک ہندی ڈرامہ "خدا اور شیطان" کو مادھری میں شائع کرتے وقت مجھے برنارڈشا کی بعض خصوصیات پر حاوی اور اُن کا حامل لکھا۔ مگر اس مجموعہ کے ریویو میں انھوں نے لکھا کہ:۔

"موہن سنگھ سنکیت کلا میں سدھستھ ہیں" (یعنی رمز و کنایہ اور اشارت میں کامل فن ہیں) لیکن سماج کو ایسے افسانوں کی کوئی ضرورت نہیں، جن کے ہیرو ڈبو یوں کے خاوند، کوکین فروش ہوں اور اپنی زیرِ تعلیم شاگردہ کو لے بھاگیں۔ پریم چند ایسے ہیروؤں سے دُور بھاگتے تھے۔ اُن کے ہیرو بدی میں اپنے کمال دکھانے سے قاصر رہتے ہیں۔ بدی سے انھیں اسقدر نفرت تھی کہ وہ اس کی دلفریبیوں سے بھی نہ زندگی میں کوئی واسطہ رکھنا چاہتے تھے اور نہ ادب میں۔ بدکاروں کے اعمال کی تہ میں کام کرنیوالے جذبات، واقعات، اسباب اور ذمہ داریوں پر وہ نظرِ غائر ڈالنے سے قاصر رہتے تھے۔ میں عمل بدکی تہ میں بہت سی سماجی، خلقی اور خدائی مجبوریاں پنہاں دیکھتا ہوں۔ اسی سے مجھے بُرائی سے ایک ہمدردی سی ہے۔ پریم چند نیکی کی طرف راغب کرنے کے لئے نیکی ہی کی خوش انجامی کے گُن گاتے تھے۔ میں بدی کو انسانی کمزوری، خامی و بدذوقی سمجھتا ہوں۔ وہ اسے گناہ تصور کرتے تھے۔ چنانچہ ہندو سماج اور مذہب کی کمزوریوں خامیوں اور بدذوقیوں کو وہ اپنے افسانوں میں جیرت کرنا سماج اور مذہب کے خلاف جرم اور گناہ سمجھتے تھے۔[1]

[1] واقعات سے اس خیال کی تائید نہیں ہوتی۔ پریم چند ہندو سماج کی نکتہ چینی میں کبھی (باقی اگلے صفحہ کے حاشیہ پر)

اُن کی نا وقت موت کچھ ہی مدت پیشتر جب میں نے پریم چند کو پروگریسو رائٹرس ایسوسی ایشن سے وابستہ پایا تو مجھے بہت تعجب ہوا۔ وہی پریم چند جو ۲۷-۱۹۲۶ء میں میری کہانیوں کو ملک اور قوم کے لئے سمِ قاتل بتا چکے تھے۔ چند ہی سال کے بعد ایک ایسے حلقہ میں شامل ہوگئے۔ جس کا اگر واحد نہیں تو ایک خاص مقصد سماج کے تاریک سے تاریک پہلوؤں کو روشنی میں لانا ہے۔ مگر انقلابِ زمانہ سے کیا کیا رُونما نہیں ہوتا۔

(۳)

لکھنؤ کے قیام یا کم سے کم ہماری ملاقات کے وقت تک پریم چند کے افسانوں کا صرف ایک مجموعہ "پریم پچیسی" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ دورانِ گفتگو فرمایا کہ "اب یہی ہوس ہے کہ ایک چالیسی اور شائع ہوجائے"۔ مَیں سُن کر خاموش رہا۔ اور دل میں مَیں نے سراہا کہ تھوڑا لکھنا چاہتے ہیں مگر عمدہ۔ اپنی اُپج کی چیز سے واسطہ رکھتے ہیں اور ترجمہ اور ادھر اُدھر کی کوڑی کے حصول سے پرہیز۔ ایک خط میں بھی لکھا:-

"یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دو چار بلند پایہ کتابیں چھوڑ جاؤں۔ افسانوں اور ناولوں کے علاوہ جو کچھ لکھا وہ کسبِ روزی کے سلسلہ میں لکھا مگر بہ امرِ مجبوری اور بہت تھوڑا۔"

ورنہ انہی کے معاصرین میں درجنوں کو ہزاروں لاکھوں صفحات لکھکر بھی تشفی نہیں ہوئی۔ ہوس کی درازدستی کی حد نہیں۔ خصوصاً بڑھاپے میں تو ہوس عورت کی طرح مرد پر بے طرح غالب آجاتی ہے اور وہ اِس بات کو بھول جاتا ہے کہ اب جوانی ہوچکی اور ادب کی ناز برداری اور اُس سے کلیلیں کرنے کا وقت نہیں رہا۔ اب تو خامہ فرسائی اور دماغ سوزی اور جانکاہی کے کفارہ کا وقت ہے۔ مگر اِس بات کو کون سوچتا ہے ؎

دیوانہ رُعبِ حُسن سے چپ تھا شباب میں ——— پیری میں ہو کے شکوہ سرا چاہتا ہے کیا؟
کوتاہ دست جب خمِ پیری سے ہو چکے ——— حرص و ہوس کچھ اور درازآستین ہوئی

(۴)

"جب وقت آجائے گا تو معین و مددگار از خود پیدا ہوجائیں گے۔"

آجکل یہ حالت عام ہے کہ مُصنف صاحب نے ناظرین اور آنے والی نسلوں کے ہاتھوں سے فیصلہ چھین کر مقدمہ نگار، تنقید نویس اور دیباچہ طراز سے منھ مانگی تعریف کرالی۔ مگر اس پر بھی پیٹ نہیں بھرتا۔ اور دوستوں سے تحریک کی جاتی ہے کہ رسالوں میں مضامین لکھیں۔ ریڈیو پر تقریریں کریں۔ ادبی انجمنوں میں

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ البتہ اُن کی نکتہ چینی مجاہدانہ رنگ کی نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ ایک دردمند دل کی نکلی ہوئی آہ معلوم ہوتی تھی۔ دوسری شادی بال بدھوا سے کرکے انھوں نے عملی حیثیت سے بھی ہندو سماج کے ظلم و ستم کی علانیہ مخالفت کی۔ ایڈیٹر

مقالے پڑھیں اور درسی نصاب میں اُن مطبوعات کو داخل کرائیں۔ اِس طرح یہ بیچارے اپنی شہرت دوام کے ذلیل حقیر، تھوڑے ہی عرصہ تک رہنے والی تجاویز پر عمل کراتے ہیں۔ پریم چند کی ادیبانہ روش اسکے بالکل برعکس تھی۔ وہ اِتنا بھی نہ پوچھتے تھے کہ بھائی تم نے میری کونسی تصنیف دیکھی ہے اور کس کو پسند کیا؟ چہ جائے کہ ملاقات میں زبانِ شوق سے پہلا سوال یہی ہو:۔ "کہئے صاحب ہمارا تازہ ترین افسانہ بھی آپ نے نگار میں دیکھا؟" آپ نے وہ مضمون بھی دیکھا جسمیں فراق گورکھپوری نے میری زبان کی دِل کھول کر داد دی ہے؟

پریم چند سے میری خط وکتابت کافی عرصہ تک رہی۔ مگر اُنھوں نے کبھی مجھے اپنے بارہ میں لب کشائی کو نہ لکھا۔ نہ میری رائے چاہی۔ یہ نہیں کہ اُنھیں میری رائے کی قدر نہ تھی۔ بلکہ اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ وقت آنے پر اُن کی تصانیف کی قدر ہو کے رہیگی، اور غیب سے اس کے سامان پیدا ہو جائیں گے۔ یہ عقیدہ خدا کے انصاف اور اپنی بے لوث خدمت میں یقین پر مبنی تھا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ زمانہ بہترین منصف ہے۔ آیندہ والوں پر موجودہ تعلقات کا کوئی اثر نہ ہوگا بلکہ وہ ہر چیز کو مناسب نقطۂ خیال[ف] سے دیکھیں گے تو خود ہی دوستوں اور بہوا خواہوں کی بیجا خوشامد کو بجا تعریف سے الگ کریں گے۔

خدا کی کارسازیوں کے اسمیں چند باب ہیں ہے اور کیا ہماری بادقار داستان میں

یقین ہے زینۂ معراج اپنا عمل کیا ہے عمل کی ہے جزا کیا

(۵)

میری دھورتتا ملاحظہ ہو کہ آج تک پریم چند کی کہانیوں میں دس بیس سے زیادہ نہیں دیکھیں اور ناولوں کو تو چھوا بھی نہیں۔ اُس پر بھی زعم ہے کہ پریم چند کی نبض خوب پہچانتا ہوں اور اُس کی ادبی حدود ناپے بیٹھا ہوں۔ کس طرح؟ پریم چند سے ایک ملاقات اور ان کے ایک افسانہ کے مطالعہ کے بل پر۔ ستائیس[۲۷] برس پہلے کا واقعہ ہے۔ میں سیالکوٹ ہائی اسکول میں تعلیم پاتا تھا۔ وہاں سے اپنے ہم درس دوست پنڈت بہاری لال کے گاؤں میں گیا۔ جہاں مسٹر شیو لال چاولہ جو ہم سے ایک درجہ پیچھے تھے، رہتے تھے۔ اُن کے گھر پہونچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک رجسٹر میں منجملہ دوسری چیزوں کے پریم چند کی ایک کہانی "گنگا کے چراغ" بھی منقول ہے۔

پریم چند کی ہمہ گیری ملاحظہ ہو اور چاولہ صاحب کا شوق۔ اُن صاحب کا شوق تو اب بھی جاری ہے۔ چند سال ہوئے، شملہ میں ایک کاپی نکالی اور پنجابی زبان کے چند نہایت پُر لطف دیہاتی گیت پڑھکر سنائے

ف Due Prspective.

میں اُس کہانی پر ٹوٹ پڑا اور اُسے ختم کر کے دم لیا۔ اُس عہد کے یارانِ غار کی صورتیں دھندلی ہو گئیں مگر میرے حافظہ اور میرے دل میں اُس کہانی کا روشن اثر ابھی تک محفوظ ہے۔ دو باتیں قابل غور ہیں۔
پریم چند کی حسنِ عقیدت و فرطِ اعتقاد اور اُن کی دیہاتی زندگی اور جوانی کی اثر گیری۔ اُنھوں نے جب یہ کتاب لکھی ہوگی تو اُن کی عمر تیس سال کے قریب ہوگی۔ عین شباب کا عالم تھا مگر اُس وقت بھی پیر جہاں دیدہ کی پختہ مغزی کا جلوہ نمایاں تھا۔ نہ معلوم اُنھوں نے ہردوار کا کب سفر کیا اور کن حالات میں گنگا کے چراغ دیکھے۔ یا ممکن ہے، لبِ گنگا کسی اور شہر میں چراغ دیکھے ہوں۔ مگر سبحان اللہ کیا دیکھا اور کیا دکھایا۔
گذشتہ ستائیس برس میں جب کبھی ہردوار جانا ہوا ہے تو وہاں کے بندر بھی دیکھے اور گنگا کے چراغ بھی، یعنی کشمکشِ زیست کا بھی جلوہ دیکھا اور سکونِ مرگ کا بھی۔ دونوں اپنی جگہ پر لطف ہیں۔ وہ مختصر کہانی اُس اتھاہ پیار کا طولانی ثبوت ہے جو پریم چند کو ہندو تہذیب کے تمام لطیف و موثر شعبوں سے تھا۔ وہ عوام کے نمایندے تھے اور عوام پر اثر ڈالنے کے لئے پرانے ہندوؤں نے جو رسمیات وضع کی تھیں، اُن کی محبت ان کے رگ رگ میں ساری تھی۔ ذرا بتائیے کہ اُن سے پہلے کس ہندو مُصنف نے گنگا کے چراغ کی روح پرور رسم کو ادب سے روشناس کرایا ہے؟ میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ پریم چند مر کر گنگا کا چراغ ہو گئے، جو تٹ پر کھڑے لوگوں کی نظروں سے تو اوجھل ہو گیا ہے لیکن اب بھی اپنی ننھی سی ٹمٹماتی روشنی کی بھینٹ گنگا مائی کی نذر کر رہا ہے۔ ہم سے دور بہت دور ہے لیکن ہم اس کی روشنی کی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ بیوہ پریم چند اگر کبھی ہردوار جائیں تو میرا مشورہ ہے کہ پریم چند کی یاد میں گنگا کے چراغ کی رسم ضرور ادا کریں۔

(۶)

پریم چند نے صرف انھیں اشخاص واقعات اور موضوعات پر قلم چلایا ہے جن میں اُنکو اٹل شردھا تھی اس لئے کہ وہ خود بھی شردھا کے بندے تھے۔ اسی لئے صرف انھیں لوگوں سے ملتے تھے، جن سے مِل کر طبیعت خوش اور روح شگفتہ ہو اور نیکی کی طرف طبیعت راغب ہو۔
کانگریس پر اُن کو بیحد شردھا تھی اس لئے کہ کانگریس کا رُخ مشرقی تہذیب و تمدن کے احیاء اور دیہات سدھار کی طرف ہے۔ پریم چند دیہات اور ہندو زندگی کی بہترین روایات کو برقرار رکھنا (یا واپس لانا) چاہتے تھے۔ دیہات کی زندگی کا خاصّہ سادگی اور ضروریات کی کمی، اخلاق کی پختگی اور سلامت روی ہے۔

کھانا کھا چکے تو پریم چند نے مجھ سے اپنی لڑکی کے لئے ور تلاش کرنے کو کہا۔ میں نے پوچھا، کیسا ور چاہیئے؟ کالج میں ہر طرح کے طالب علم موجود رہتے ہیں؟ ٹھیک یاد نہیں کہ اُنھوں نے کیا جواب دیا۔ مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ اُنھوں نے کسی سادہ مزاج کفایت شعار اور بھلے گھر کے کائستھ کیلئے ہدایت کی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک معمولی اوقات کا آدمی بھی اپنی لڑکی کے لئے ایک نہایت اعلیٰ اور متمول خاندان کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکے کو تلاش کرے جس کی آمدنی پانچ سات سو روپیہ سے کم نہ ہو مگر نہیں، پریم چند کو دیہاتی مقولہ یاد تھا کہ "بڑے گھر کی بیٹی چاہے لیلو۔ مگر اپنی بیٹی کو اپنے سے چھوٹے گھر میں دو" انھیں خانہ داری کے تجربات تلخ بھی تھے اور شیریں بھی۔ وہ ایک معمولی گھر کو جسمیں خواہ روپیہ کی آور دکم ہو مگر محبت کی آمد زیادہ ایک آئیڈیل گھرانہ سمجھتے تھے۔ ادب میں بھی اُنکا یہی مزاج رہا امیر گھروں کی متزلزل روش سے وہ گھبراتے تھے۔ میں نے ایک دوست کے بھتیجے سے بات چھیڑی مگر انجام خاطر خواہ نہ ہوا۔ اب رسالہ میں دیکھا کہ لڑکی کئی بچّوں کی ماں بن چکی ہے۔ خدا اُن سب کی عمر دراز کرے۔ متوسط درجے کے ہندو گھرانے کے مصائب زندگی سے پریم چند خوب آگاہ تھے اور اُن کی تصویر بڑے مزے سے کھینچتے تھے۔ وضعداری اس درجہ والوں کو بہت مہنگی پڑتی ہے، مگر پریم چند نے اسے خوب نبھایا۔

(۷)

پریم چند کی ٹکر کے لکھنے والوں میں پنڈت بشمبھرناتھ کوشک اور بدری ناتھ سدرشن گنائے جاتے ہیں۔ فقیر کو ان دونوں صاحبوں کے قریبی مطالعہ کے مواقعے اور دوستانہ مراسم نصیب رہے ہیں۔ کوشک کو احباب کے مستقل حلقہ نے بنایا اور سدرشن کو جہاں نوردی نے۔ کوشک کی طبیعت لاابالی اور رندانہ ہے۔ سدرشن برہمن ہیں مگر روپیہ کی ضرورت نے انھیں تجارت بننے پر مجبور کر دیا ہے۔ ان دونوں کی ادبی روش ادب پریم چند سے مختلف ہے۔ سدرشن ایک حد تک پریم چند کے مقلد ہیں۔ کوشک شروع ہی سے امیرانہ و بے نیازانہ فرصت پرستی کے شیدائی ہیں۔ کبھی جی میں آیا یا کسی کی تحریک ہوئی تو کچھ لکھ دیا۔ کھانے پینے کو خدا نے کافی دے رکھا ہے۔ بھنگ ہے اور کیرم۔ دوستوں کی آؤ بھگت اور خوش گپیاں سدرشن دوسروں کی تجارت چمکانے اور حلال کی کمائی کھانے میں مصروف ہیں۔ پریم چند کو نہ ایسے بے فکرے ادبیوں کی مستقل صحبت نصیب ہوئی اور نہ سیر و سفری کے مزے نصیب ہوئے، اور نہ طرح طرح کے مالکوں سے واسطہ پڑا[1]۔ کوشک اور سدرشن کی محرک ادبی یا تو دوسروں کی کہانیاں ہیں

---

[1] پریم چند جی کا دو تین سال منشی نولکشور پریس سے ملازمت کا تعلق رہا۔ مگر پروپرائٹر مطبع کی قدر شناسی کی بدولت انھیں کبھی ملازمت کی دقتوں سے سامنا نہیں رہا۔ انکی نا وقت وفات کے بعد البتہ وہ باہمی رقابت اور حبا۔۔۔ کی ریشہ دوانیوں کے شکار ہو گئے۔ ایڈیٹر

...دستانہ تعلقات۔ آزادیٔ وطن کی جنگ میں دونوں نے دلچسپی تو لی لیکن دُور ہی سے لڑائی ...یکھتے رہے۔ کھدر پہننے کی بھی نوبت نہیں آئی۔ جیل جانے یا کسی دوسری قربانی کا کیا ذکر۔ انھیں ...رہ سے پریم چند کا درد ان کے حصّہ میں نہ آسکا۔ مگر عبارت دونوں کی خوب ہے۔ یوں بندہ ...رو والوں کی افسانہ نویسی کا سرے ہی سے قائل نہیں۔ عموماً انمیں نہ روانی ہوتی ہے اور نہ ...رمی۔ مگر پریم چند کی خاص روش تھی۔ اپنے دِل پسند کرداروں اور موضوعات پر وہ ہمیشہ گہری ...ردی سے طبع آزمائی کرتے تھے۔ دوست بھی اُنھوں نے اپنے مطلب اور اپنی وضع کے ...نب کئے اور اُن سے بوقت ضرورت ہی ملے۔ یہی انتخاب اور تعین اُنھوں نے ادبی میدان ...ں بھی عام طور پر برتا۔ بات چیت میں جس شغف اور طوالت سے سروکار تھا اُسی کو قصّوں ...ر ناولوں میں روا رکھا۔ لکھنے بیٹھے تو قصّہ کو مختصر ناول بنا دیا اور ناول کو ایک پھیلایا ہوا ...تصر افسانہ۔ غرض اُن کی روشِ ادب روشِ زیست کی مکمل آئینہ دار تھی ؎

لایا ہوں اپنے تجربہ کے گلستان کے پھول ——— خوشبوئے جذبہ اُنمیں ہے اِنمیں چلن کا رنگ

پریم چند کے اقوال

حسد میں دوسروں کو مالدار سمجھنے کی خاص صفت ہوتی ہے۔

بُزدلی ضعفِ دماغ کی علامت ہے۔

غصّہ سے مدافعانہ قوت کا اظہار ہوتا ہے۔

...سد ناکام مُصنف نقاد بن جاتا ہے۔

استقلال کبھی زندہ دِلی کی صورت اختیار نہیں کرتا۔ وہ دِل پر ایک مایوسانہ بیزاری کا رنگ پیدا کر دیتا ہے ...ہ سوزِ دل جس سے آنسو تک خشک ہو جاتے ہیں۔

مرگ بے ہنگام ایشور کی سب سے بڑی بیرحمی۔ یہ مصیبت ہمارے اعتقاد کی جڑوں کو ہلا دیتی ہے۔ ہم کو ...نکر و ملحد بنا دیتی ہے۔ ہم مصیبت کے نظارے آئے دن دیکھا کرتے ہیں اور اُن کے عادی ہو جاتے ہیں لیکن ہماری ...م نصیب آنکھیں اِس سانحہ کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ بے وقت موت ہمارے دِلوں پر مشیتِ الٰہی کا سب سے ...اتل وار اور ہماری خُدا پرستی پر سب سے بڑا ستم ہے۔

جس طرح روشنی کی شعاعیں کسی کثیف شے سے گذر کر منقلب ہو جاتی ہیں۔ اِسی طرح نیک ارادے غیر قومی حکومت ...ی سخت گیری اور حکام کی خود پروری سے مس ہو کر منقلب ہو جاتے ہیں۔ انصاف اور حق پیروں تلے آجاتا ہے۔ ...در فرض اور زعمِ حکومت سر پر جا پہونچتا ہے۔

پریم چند

بندۂ فرض

(از منشی گوبرسن لال آدیب لکھنوی، ایم ۔ اے)

دنیا جسے کہتے ہیں وہ نیرنگ کی جا ہے
اِک رنگ کبھی اس کا رہے گا نہ رہا ہے

شکلوں ہی میں کچھ فرق نمایاں نہیں ہوتا
ہر شخص کی افتادِ طبیعت بھی جُدا ہے

کہتا ہے کوئی حُسن سے رغبت نہیں اچھی
کہتا ہے کوئی حُسن پرستی ہی روا ہے

اربابِ محبت سے جو پوچھو تو کہیں گے
ہر درد کی اِک دردِ محبت ہی دوا ہے

کہتا ہے کوئی زہد کو لازم ہے بہر حال
اور بادۂ گلگوں پہ کوئی دل سے فدا ہے

کہتا ہے مساعی کو کوئی عین عبادت
کہتا ہے کوئی جادۂ حق صبر و رضا ہے

الہام کسی کے لئے ہے ویدِ مقدس
قرآن کسی کے لئے پیغامِ خدا ہے

کرتا ہے کوئی پیروی دینِ نصاریٰ
ایمان ہے جو فرمانِ مسیح ابن خدا ہے

کرتا ہے پرستش کوئی انوارِ سحر میں
اور آگ کے پردے میں کوئی پوج رہا ہے

جو ایک ہی مذہب کے کہے جاتے ہیں پیرو
ان میں سے بھی ہر شخص کا اِک دین جدا ہے

ہے مجھ کو آدیب اُن سے نہ کچھ اِن سے سروکار
پیغامِ خدا میرے لئے دل کی صدا ہے

کافر ہوں کہ ہوں صاحبِ ایماں نہیں معلوم
مَیں فرض کا بندہ ہوں مرا فرض خدا ہے

آنکھیں

ہیں جام بکف کسی کی سرشار آنکھیں
ہیں مست و خراب پر ہیں ہشیار آنکھیں

دل لیتی ہیں دے دے کے فریبِ الفت
غافل ہیں مگر کتنی ہیں بیدار آنکھیں

منظور الحق کلیم

واردھا کی تعلیمی اسکیم

از مسٹر سری کرشن سنہا بی۔اے عثمانیہ

ہندوستان پہلا ملک ہے جہاں روس کے بعد اپنے اقتصادی حالات کے مدِنظر ایک نیا تعلیمی نظام تمام ملک کے لئے تجویز کیا جا رہا ہے۔ ۱۹۱۷ء کے انقلابِ روس کا بانی لینن[1] تعلیم کا حامی اور جہالت کا مخالف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ملک کی فلاح و بہبود کا انحصار زیادہ تر تعلیم پر ہے۔ خود ایک مرتبہ کہا ہے کہ:-

"کسی چیز کو زیادہ مقدار میں حاصل کرنے کے لئے اس کا زیادہ پیدا کرنا ضروری ہے۔ جس کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کی جائے"۔

گویا لینن کو تمام ترقی کا راز علم کی اشاعت ہی میں ملا۔ اسمیں اس کو روس کی ترقی کے خواب کی تعبیر بھی معلوم ہوئی۔ اسلئے لینن نے جہالت کی کالی گھٹاوں کو دور کر کے تمام ملک میں تعلیم کی روشنی پھیلا دی۔ چنانچہ اس نے تعلیم کے پرانے نظام کو یکلخت منسوخ کر دیا۔ کیونکہ اس کا عوام کیساتھ دور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔ اور اس سے لوگوں کو صرف اوسط درجے کی تعلیم حاصل ہوتی تھی۔ چنانچہ لینن نے پہلے تو آٹھ برس سے سترہ برس کے لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم لازمی کر دی، اور اس کے ساتھ ہی ہر ایک کے رجحان کے مطابق دستکاری کی تعلیم بھی ضروری قرار دے دی۔ کیونکہ وہ خود یعنی عملی اکتساب فن (Learning by doing) کا قائل تھا۔

اب ہندوستان کے قومی لیڈران بھی تعلیمی نظام میں تبدیلی کرنے کے خواہاں ہیں۔ یوں تو ملک میں ایک زمانہ دراز سے مفت اور جبری ابتدائی تعلیم کی کوشش تھی۔ چنانچہ مسٹر گوکھلے آنجہانی نے امپیریل کونسل میں اس مسئلہ کو پیش کیا تھا اور گورنمنٹ سے پانچ کروڑ کی اسپیشل گرانٹ مانگی تھی اس کے بعد ۱۹۱۶ء میں ہرٹاگ کمیٹی بھی اسی مسئلہ پر غور و خوض کرنے کے لئے بیٹھی۔ چنانچہ اس نے یہ تخمینہ کیا کہ برٹش انڈیا میں مفت جبری ابتدائی تعلیم کے لئے دس کروڑ روپیہ کی ضرورت ہوگی۔ چونکہ گورنمنٹ ہند اتنی کثیر رقم خرچ کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ اس وجہ سے ایک عرصہ کے لئے

[1] Lenin.

یہ مسئلہ دب گیا۔ لیکن یہ ضروری مسئلہ کب تک دبا رہتا۔ دنیا کروٹ بدل چکی تھی اسلئے یہاں بھی اکابران قوم چونکے اور کانوکیشن کے خطبات میں تعلیمی نظام کی تبدیلی پر زور دیا جانے لگا۔ گویا ہندوستان میں نظری بیداری ہو رہی تھی اور لوگ تعلیمی نظام کی تبدیلی ضروری خیال کرنے لگے۔ لیکن یہ سب بیکاری پکار تھی۔ آگے بڑھنے کی کسی میں سکت نہ تھی۔

بالآخر مہاتما گاندھی نے جو علم و عمل دونوں میدانوں میں تیز گام شہسوار ہیں اس طرف توجہ کی۔ ماہرین تعلیم کی ایک کمیٹی مقرر ہوئی جس کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین منتخب ہوئے۔ اس کمیٹی نے ۱۹۳۷ء میں اپنی اسکیم پیش کی۔ جو واردھا اسکیم کے نام سے مشہور ہے۔ اب ہم اسکی خصوصیات کا ذکر کرینگے۔

اس اسکیم کی رو سے سات سال کا کورس ہوگا۔ جو ہر ایک بچے کے لئے سات سال سے شروع ہوکر چودہ سال کی عمر تک ختم ہو جائے گا۔ ہر ماہ میں چوبیس دن کام ہوگا، روزانہ ساڑھے پانچ گھنٹے تعلیم دی جائے گی۔ تین گھنٹے بیس منٹ صنعتی تعلیم اور دو گھنٹے دس منٹ بقیہ مضامین کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔

جو مضامین پڑھائے جائیں گے۔ انمیں سب سے اوّل کوئی دستکاری ہوگی۔ دستکاری میں نجاری کاشتکاری، بڑھئی کا کام وغیرہ شامل ہیں۔ دستکاری کا مقصد صرف کاریگر پیدا کرنا نہیں۔ بلکہ بچے کی دماغی تربیت ہے، اور دوسرے مضامین کی تعلیم کو دستکاری کی تعلیم سے ایسا جوڑ دیا گیا ہے کہ کہ بچہ جو کام کرے گا۔ اس کے متعلق وہ یہ بھی جان سکیگا کہ یہ کام کیوں اور کس لئے کیا جاتا ہے؟ چنانچہ یہی طریقہ اسوقت جرمنی میں بھی رائج ہے۔ جرمنی میں صنعتی مدارس کے لئے بھی اسی قسم کا نصاب مقرر کیا جاتا ہے کہ جس سے طلبا کو پیشوں کی تعلیم میں مدد ملے اور سہولت ہو۔ مثلاً ایک طالب علم مالی بننا چاہتا ہے۔ تو اس کی ادبی درسی کتابوں میں زیادہ تر درختوں اور باغات کے حالات درج ہوں گے۔ جغرافیہ کی تعلیم میں یہ پڑھایا جائے گا کہ مختلف ممالک میں کون کون سے پھل پیدا ہوتے ہیں اور مختلف پھلوں کے درختوں کی کاشت میں کس قسم کی کھاد دینا چاہیے۔

پروفیسر ڈیوی نے اس طریقہ تعلیم کا نام "پراجکٹ متھڈ" رکھا ہے۔ چنانچہ واردھا اسکیم میں اس کو ملحوظ رکھ کر اس بات کی کوشش کی ہے کہ ہر بچے کو اتنی کافی ابتدائی تعلیم دی جائے کہ وہ آسانی سے روٹی کما سکے۔ اس طریقے میں دستکاری کو تعلیم کی جڑ مانا گیا ہے اور دیگر مضامین کو اسکی شاخیں اور پتے قرار دیا گیا ہے۔

دوسرے مضامین میں سب سے زیادہ اہم مادری زبان کی تعلیم ہے۔ مادری زبان سے مراد

"ہندستانی" زبان سے لی گئی ہے۔ جس کے معنی عام فہم اُردو یا ہندی کے ہوں گے۔ فارسی یا ناگری رسم الخط کا انتخاب ہر طالب علم کے لئے اختیاری ہوگا۔ لیکن "ہندستانی" کی تعلیم سب کیلئے لازمی ہوگی مادری زبان کا معیار خاصہ اونچا ہے۔

تیسرا مضمون ریاضی ہے۔ معمولی ضرب تقسیم کے علاوہ کسر اور کسر عشاریہ۔ سود۔ پیمائش اور عملی ہندسہ کی تعلیم کافی سمجھی گئی ہے۔ لیکن بہی کھاتہ اور حساب کتاب لکھنے کی تعلیم بھی لازمی طور پر دیجائیگی۔

چوتھا مضمون سماج کے متعلق معلومات ہے۔ جسمیں تاریخ اور جغرافیہ کے عام معلومات کے علاوہ خاص خاص مضامین پڑھائے جائیں گے۔ اُسمیں اچھی اسپرٹ پیدا کرنے کی کوشش کی جائیگی۔ مُلک سے ہمدردی اور ملک والوں کی خدمت کرنے پر زور دیا جائے گا۔

پانچواں مضمون سائنس کی معلومات ہے۔ کہانیوں کے پیرائے میں بڑی بڑی ایجادات اور موجدوں کے حالاتِ زندگی بتائے جائیں گے۔ سائنس اور تاریخ کی تعلیم اِس طرح ہوگی کہ بنیادی دستکاری سے اُنکا رابطہ ٹوٹنے نہ پائے۔ اِن پانچوں مضمونوں کے ساتھ ساتھ ڈرائنگ اور موسیقی کی تعلیم بھی دی جائے گی۔

یہ رہا جبریِ ابتدائی تعلیم کا ذکر۔ اب ہم اعلیٰ تعلیم کی طرف اپنی توجہ مبذول کرتے ہیں۔

مہاتما گاندھی خود یونیورسٹیوں کی تعلیم کے اِتنے موید نہیں جتنے کہ ابتدائی تعلیم کے ہیں چنانچہ بارہا اُنھوں نے اپنے لکچروں میں اس کا اعادہ کیا ہے کہ ہندوستان کو یونیورسٹیوں اور کالجوں کی اتنی ضرورت نہیں۔ اس لئے جو رقم ملک میں یونیورسٹی تعلیم پر صرف ہوتی ہے، اُسے کسی دوسرے تعمیری کام میں لگایا جائے تو مقابلتاً زیادہ فائدہ ہوگا۔ مثلاً مفت جبری ابتدائی تعلیم۔ اور ترک مسکرات کی تحریک کی کامیابی کے لئے، اگر یونیورسٹیوں اور اُن کے ماتحت کالجوں کو بند کرکے جو رقم اُن پر صرف کی جاتی ہے وہ اِن دونوں چیزوں میں لگادی جائے تو اس سے کہیں زیادہ مُفید مطلب نتیجہ نکلے۔ واردھا اسکیم کے حامیوں نے بھی اِس رائے سے اِتفاق کیا ہے، اور حکومت کو اعلیٰ تعلیم سے کوئی سروکار نہ رکھنے کا مشورہ دیا ہے۔ صرف تھوڑے کالج تجویز کئے گئے ہیں۔ جو مختلف کارخانوں سے ملحق رہینگے۔ مثلاً ٹاٹا کے کارخانہ کے ساتھ انجنیری کالج قائم کیا جائے گا۔ اور مالک کارخانہ اِس کالج کے تمام اخراجات کا کفیل ہوگا۔ اور وہ ضرورت کے لحاظ سے طالبعلموں کو داخل کرے گا۔ اور جب وہ فارغ التحصیل ہوجائیں گے تو اُنھیں اپنے کارخانہ میں جگہ دیدیگا۔ اسی طرح تجویز کیا گیا ہے کہ تاجرانِ ہند کی انجمن سے ایک تجارتی کالج کھولنے کی فرمائش کی جائے۔

جسمیں تجارت کے متعلق تمام باتیں سکھائی جائیں۔ شفاخانوں کے ساتھ میڈیکل کالج قائم کئے جائیں اور اُن کے اخراجات روسا، اور امراء کے ذمہ کئے جائیں۔

سرکاری یونیورسٹیاں بھی رہیں گی لیکن بہت کم۔ اُن کا کام امتحان لینا اور مرکزی شعبۂ تعلیم کا قائم رکھنا ہوگا۔ حکومت اُن کو کوئی مدد نہ دے گی اور امتحانات کی فیس سے جو آمدنی ہوگی۔ اُس سے اُن کے مصارف چلیں گے۔

غرض وارد ھا اسکیم نے اعلیٰ تعلیم والے کالجوں کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کو ابھی سلجھانا نہیں چاہتی، بلکہ کارڈنیل نیومینؔ کی رائے پر عمل کرنا چاہتی ہے کہ اعلیٰ تعلیم آسودہ حالؔ طبقہ کے لئے موزوں ہے۔ بہرحال وارد ھا اسکیم نے زیادہ تر ابتدائی تعلیم کی اشاعت پر اپنی توجہ مرکوز کی ہے۔

تعلیمی۔ نفسیاتی۔ سماجی اور معاشی نقطۂ نظر سے اِس اسکیم میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ اِس میں موجودہ نظامِ تعلیم کے نقائص رفع کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔

نفسیاتی نقطۂ نظر سے اِسمیں بچّوں کی فطرت کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ بچّوں کو کھیلنے کودنے کا شوق پڑھنے سے کہیں زیادہ ہوتا ہے اور ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ ابتدائی تعلیم میں اس چیز کو خاص طور پر ملحوظ رکھا جائے اور تعلیم کو اس طرح ڈھالا جائے کہ بچّوں کو یہ نہ محسوس ہو کہ اُن پر زبردستی کوئی چیز عائد کر دی گئی ہے۔ بلکہ وہ خوش خوش اپنا کام کریں۔ چنانچہ بیشتر ممالک میں اس خیال کی پیروی کی گئی ہے۔ کنڈر گارٹن کے مقبول عام طریقہ تعلیم میں بھی اِسکا کافی لحاظ رکھا گیا ہے اور وارد ھا اسکیم میں بھی بچّوں کو کھیل کود ہی کے پیرائے میں دستکاری کے اہم سبق دینے کی تحریک کی جاتی ہے تاکہ بچّوں کو تعلیم کا کوئی بار محسوس نہ ہو۔ اور وہ کھیل ہی کھیل میں اہم اہم نکات سمجھ لیں۔ ٹیگور نے اپنے ایک معرکتہ الآرا مضمون "My School" میں نیم شعوری طور پر تعلیم حاصل کرنے کے طریقے پر بہت زور دیا ہے، اور یہ لکھا ہے کہ اگر بچّوں کی ابتدائی تعلیم یوں ہی دی جائے تو اس کا اثر بالکل اسی طرح قائم و دائم رہتا ہے جس طرح کہ جگنو کی روشنی اُس کی عمر بھر رہتی ہے۔

عملی کام کی وجہ سے بچّہ کو اپنے تمام حواس سے کام لینا پڑتا ہے۔ مثلاً اگر اس سے کوئی خاکہ یا نقشہ

Sub-Consciously of Leisured Classes of Cardinal NewMand

بنوایا جائے تو وہ پہلے داغ سے سوچے گا۔ اور پھر اس نقشہ کو ذہن میں تیار کرکے اُن کو ہاتھوں سے بنائیگا اس طرح اُسے جو معلومات حاصل ہوگی وہ عمیق اور پائیدار ہوگی۔ اس کے برعکس منطقی اور درسی تعلیم کے ذریعہ جو معلومات بچّہ کو حاصل ہوتی ہیں وہ خارجی، سطحی اور ناپائیدار ہوتی ہیں۔

سماجی نقطہ نظر سے جو طریقہ تعلیم واردھا اسکیم نے پیش کیا ہے وہ نہایت ہی مُفید ثابت ہوگا۔ تعلیم یافتہ طبقے میں جسمانی کام کی طرف سے اِس وقت عام طور پر جو حقارت پھیلی ہوئی ہے وہ دُور ہوجائیگی۔ سماجی تعلیم کی بدولت ہمارے بچّے آپس میں متحد رہنے کا سبق سیکھیں گے۔ تاریخ کی موجودہ شرانگیزیوں کا خاتمہ کرکے قومیت اور حبِ وطن کا احساس جاگزین ہوگا۔ بچّوں کے دل میں مشاہیر عالم کی بلا امتیاز مذہب و ملت عزت و قدر بیدار ہوگی۔ اِس طرح اس تعلیم کے پروردہ ہندو مسلمان لڑکے آپس میں شیر و شکر کی طرح رہیں گے اور اِس طرح ہندو مسلم اتحاد کا سوال خودبخود حل ہوجائے گا۔ اور تاریخی پس منظر اور قومیت کی تعلیم کا جو فقدان ہندو مسلم اتحاد میں بہت بڑی حد تک مانع رہا ہے۔ وہ واردھا اسکیم کے ذریعہ پُورا ہوجائے گا۔

معاشی نقطۂ نظر سے یہ نظام تعلیم اپنے اخراجات کا خود کفیل ہوگا۔ اگر پوری طور پر نہیں تو کم ازکم اخراجات کا ایک معتدبہ حصّہ تو بچّوں کی مصنوعات بیچ کر نکالا جاسکتا ہے۔

اِسمیں صنعتی، تجارتی اور زراعتی ترقی بھی مضمر ہے۔ کیونکہ اِس طریق تعلیم میں دستکاری کو لازمی قرار دیا ہے جس سے گھریلو صنعتوں کو ترقی ہوگی۔ زراعت بھی سائینٹفک طریقہ پر کی جاسکے گی۔ ان سب چیزوں کی ترقی سے ہندوستان کی حالت بالکل بدل جائے گی۔ اور قدیم زمانہ کی برکتیں حاصل ہونگی

اِس طریقہ تعلیم سے بیروزگاری کا بھی سدِباب ہوگا۔ یوں تو بیروزگاری ایک زمانہ دراز سے رہی ہے۔ سوداؔ کی مثنوی شہر آشوب اور اکبر الہ آبادی کے بیشتر شعر اِس کے شاہد ہیں کہ ہندوستان میں بے روزگاری کی شکایت اِسقدر عام ضرور رہی ہے کہ شعراء کی توجہ ہو۔ سپرو رپورٹ نے بھی بے روزگاری کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے روکنے کے طریقے بتلائے ہیں۔ لیکن وہ زیادہ تر تعلیم یافتہ طبقہ سے متعلق ہیں۔ بہرحال واردھا اسکیم کے ذریعہ بہت آسانی سے عام بیروزگاری کا خاتمہ ہوجائیگا۔ کیونکہ ہر شخص میں جسے اس طریقے سے تعلیم دی جائیگی کمانے کی قابلیت پیدا ہوجائے گی۔ کچھ نہیں تو چرخہ کات کرہی وہ اپنی بسر اوقات کرسکیگا۔

ہندوستان میں بال کی کھال نکالنے والوں کی کبھی کمی نہیں رہی۔ بات بات پر لڑنا۔ اُصولوں سے

قطع نظر جزئیات پر لعن طعن کرنا یہاں کا عام شیوہ ہے۔ ہم لوگوں میں فرقہ واری تعصبات اِسقدر غالب ہیں کہ ہماری نظریں ایک دوسرے کی خوبیوں پر پڑتی ہی نہیں۔ اگر کچھ دکھائی دیتا ہے تو بس عیب اور دوسرے کے نقص۔ ایسی صورت میں اگر وارؔدھا اسکیم پر بھی لعن طعن کی گئی، تو کوئی نئی بات نہیں۔ تعصب کی عینکیں لگا کر ہم ہر چیز کو دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اِس لئے وارؔدھا اسکیم میں بھی ہم کو کوئی اچھائی دِکھائی نہیں دیتی۔ لیکن اگر غائر نظر سے دیکھا اور انصاف سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وارؔدھا اسکیم میں خوبیاں زیادہ اور خرابیاں کم ہیں۔

سر ضیاآلدین، جیسے اصحاب کی رائے میں واردھا اسکیم موجودہ تعلیمی نظام سے بھی زیادہ فرسودہ ہے۔ میں اتنا بڑا دعویٰ تو نہیں کر سکتا۔ لیکن میں نقائص کو جو یقیناً بہت کم اور محض جزوی ہیں، چھپانے کا بھی خواہاں نہیں ہوں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جب اِس اسکیم کے عملی تجربہ سے اچھے اور خوشگوار نتائج نکلیں گے تو مخالفین کا مُنھ خود بخود بند ہو جائے گا۔

وارؔدھا اسکیم میں انگریزی تعلیم کو بالکل اُڑا دیا گیا ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ غیر ملکی زبان کے سیکھنے میں دِقت ہوتی ہے لیکن اِسکے معنی یہ نہیں کہ اس کی بین الاقوامی اہمیت پر پردہ ڈال دیا جائے۔ ایک انگریز مُصنف نے (اپنی کتاب "The Task of Social Hygeine." نامی میں) یہ پیشگوئی کی ہے کہ آئندہ پچاس سال کے اندر انگریزی زبان بین الاقوامی سرکاری زبان ہو جائیگی میرے خیال میں یہ پیشگوئی بڑی حد تک صحیح ثابت ہوگی۔ فی زمانہ بھی انگریزی زبان کو خاصی مقبولیت حاصل ہو چکی ہے۔ ایسی صورت میں وارؔدھا اسکیم میں انگریزی زبان کا قطعی اخراج قرین مصلحت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ہماری دیسی زبانیں ابھی عالمِ طفولیت میں ہیں۔ ضرورت ہے کہ انگریزی زبان کا علمی اور سائنٹفک ذخیرہ "ہندستانی" زبان میں منتقل کیا جائے۔

تعلیمی نقطۂ خیال سے بھی، اس اسکیم میں بعض نقائص نمایاں ہیں۔

کسی ماہر تعلیم کا مقولہ ہے کہ "اِنسان کی تعلیم کا آغاز اُسی دن سے ہوتا ہے جب وہ شکم مادر میں آتا ہے اور خاتمہ اُس وقت ہوتا ہے۔ جب وہ قبر کی آغوش میں سو جاتا ہے"۔

وارؔدھا اسکیم میں سات برس سے چودہ برس کے ہفت سالہ وقفہ کے علاوہ اور کسی عمر کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا ہے۔ پیدائش سے سات برس تک بچّہ کی تعلیم کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ بقول مسٹر جمیس بچّوں کی خصلت "ابھی یا کبھی نہیں" کے مصداق ہوتی ہے اِسلئے ضروری ہے کہ اُن کو اس وقفہ میں والدین زبان وغیرہ کی ذاتی طور پر تعلیم دیں۔ ورنہ بالکل نظر انداز کرنیکی صورت

میں ناقابل تلافی نقصان ہوگا اب رہا دوسرا رُخ کہ چودہ برس کے بعد تعلیم کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ یوں تو کالج رہیں گے اور ذاتی استعداد کے لحاظ سے بھی تعلیم جاری رہ سکتی ہے لیکن واردھا اسکیم کی رُو سے گورنمنٹ سے اس تعلیم کا کوئی واسطہ نہ رہے گا۔

معلوم ہوتا ہے کہ واردھا اسکیم کا منشا، ہندوستان کو بالکل صنعتی اور بڑی حد تک مادّی بنانا ہے اسی وجہ سے اسمیں پیشہ ورانہ تعلیم کا رنگ غالب رکھا گیا ہے۔ یوں تو زبان، سماجی، علم ریاضی وغیرہ کے علاوہ دستکاری کی عملی تعلیم بھی دی جائے گی۔ لیکن اُن کے لئے اتنا کم وقت رہیگا کہ کورس ہی مشکل سے ختم ہوسکیگا۔ اور دوسرے مضامین پر قدرت حاصل نہ ہوگی۔ ہم ہندوستان کو مادّی بنانے کے خلاف نہیں ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی دیگر علوم پر کافی وقت اور توجہ دی جانا چاہئے۔

مولویوں اور پنڈتوں کی طرف سے ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ واردھا اسکیم میں مذہبی تعلیم کو نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ میرے سمجھ میں نہیں آتا کہ ظاہر پرست اور ریا کار لوگ ہمیشہ مذہب کی آڑ کیوں لیتے ہیں؟ کیا اس وجہ سے کہ ہندو و مسلمان جہلا کو مذہب کے نام پر آسانی سے بھڑکایا جاسکتا ہے یا اس وجہ سے کہ وہ ہندوستان کو ایسی گری ہوئی حالت میں دیکھنا چاہتے ہیں؟ بہرکیف کچھ بھی ہو۔ مذہب کی ریتیلی زمین پر ہندوستان کی ترقی کی عمارت کبھی کھڑی نہ ہوسکے گی اور اگر کھڑی بھی ہو تو محض ہوا کے جھونکے اسے منہدم کرنے کے لئے کافی ہوں گے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ہندوستانی۔ سیاسی۔ معاشی اور سماجی ترقی کی خاطر نام نہاد مذہبیت کو پسِ پشت ڈال دیں اور چکبست کے ہمنوا ہوکر پکار اُٹھیں کہ ؎

شیدائے بوستاں کو سرو و سمن مبارک رنگین طبقوں کو رنگِ سخن مبارک
بُلبُل کو گُل مبارک گُل کو چمن مبارک ہم بیکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک

غنچے ہمارے دِل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اُٹھے ہیں اس خاک میں ملینگے

خواہش اپنی طرف کھینچتی ہے۔ محبّت خود کھنچ جاتی ہے۔ خواہش خودپروری ہے۔ محبّت خود فراموشی۔ خواہش میں عمل ہے۔ محبّت میں انتظار۔

پریم چند

شاعر اور پھول

از حضرت رہبر بی۔ اے (سنگرور)

کھلا تھا کل ابھی اے پھول مرجھایا بھی جاتا ہے
کہیں دنیا میں آکر اس طرح جایا بھی جاتا ہے

یہاں ہر چیز ایسی ہے کہ کہتے بھی نہیں بنتی
کوئی دیکھے نہیں بنتی تو چھوڑے بھی نہیں بنتی

کوئی دن تو چمن میں لطف جینے کا لیا ہوتا
مزہ کچھ شبنمِ تازہ کے پینے کا لیا ہوتا

خیال ان تتلیوں کی ہی مروت کا کیا ہوتا
کم از کم پاس بلبل کی محبت کا کیا ہوتا

تھی زینت شاخ کی تجھ سے تو گلشن کی نشانی تھا
ابھی جانے کی کیا تھی؟ یہ تو آغازِ جوانی تھا

یہ کھلنا اور مرجھانا ہی ہے بس زندگی تیری
بتا کیا خاک ہو جانا ہی ہے بس زندگی تیری؟

سُن اے شاعر کہ تجھ سے زندگی کا راز کہتا ہوں
ازل سے ہی میں اپنے فرض کا پابند رہتا ہوں

بساطِ دہر پہ کھلتا ہوں، خوشبو بانٹ دیتا ہوں
میں اپنا کام کر کے پھر عدم کی راہ لیتا ہوں

مروت یہ نہیں ہے زندگی کو زنگ لگ جائے
محبت کیا محبت ہے فرائض میں جو فرق آئے

جمودِ زندگی سے کب کسی کو پیار ہوتا ہے
کہ اس انداز کا جینا زمیں پر بار ہوتا ہے

مرا یہ کام کھلنا اور مرجھانا ہی اچھا ہے
مرا یہ خاک ہونا اور کھو جانا ہی اچھا ہے

کہ اس تن سے چمن کی پھر زمیں زرخیز ہو جائے
مجھے آغوش میں لے کر عروسِ نو بہار آئے



مولانا شوکت علی مرحوم

از مسٹر ضیاء الدین احمد برنی۔ بی۔ اے

مولانا سے میری پہلی ملاقات ۱۹۱۱ء میں جنگِ طرابلس کے زمانہ میں ہوئی تھی جب وہ ترکش زخمیوں کے لئے چندہ جمع کر رہے تھے۔ وہ زمانہ میری طالب علمی کا تھا۔ یہ ملاقات بہت جلد دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ جس کی محبت بھری یاد میرے دل میں تا زیست تازہ رہے گی۔

شوکت علی سات ہی برس کے تھے کہ اُن کے والد عبد العلی صاحب کا ۳۲ برس کی عمر میں یکایک ہیضہ میں انتقال ہو گیا۔ اور بچوں کی تعلیم و تربیت کا سارا بوجھ اُن کی شفیق ماں کے کندھوں پر آن پڑا جنھیں سارا ہندوستان "بی اماں" کے محترم نام سے یاد کرتا ہے۔ درحقیقت وہ عجیب و غریب خاتون تھیں۔ اُنھوں نے اپنے دونوں لڑکوں شوکت اور ذو الفقار کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لئے جسے اُس دَور کے مُسلمان نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے، بریلی بھیجا۔ یہ اُنھیں کی بلند ہمتی تھی کہ اپنے محدود مالی ذرائع کے باوجود اُنھوں نے اپنے بیٹوں کو بہترین تعلیم دِلوائی۔ یہی بلند ہمتی مولانا شوکت علی کے حصہ میں آئی۔

علی برادران کی سب سے بڑی بات اُن کی باہمی محبت تھی۔ جو نہ صرف علیگڈھ کے زمانۂ طالب علمی میں قائم رہی بلکہ پبلک لائف میں بھی اک جان دو قالب ہو کر رہے۔ اُن کا یہ اتحاد آخر دم تک قائم رہا۔ تمام زندگی کبھی کوئی ایسا اختلاف رائے نہیں ہوا جس سے اُن کی محبت پر اثر پڑتا۔

اِس صدی کے ابتدائی حصہ میں مولانا شوکت علی نے ہز ہائینس سر آغا خان کے سکرٹری کی حیثیت سے مسلم یونیورسٹی کے پروپگنڈے کے سلسلہ میں سارے ملک کا سفر کیا اور لاکھوں روپیہ جمع کیا۔ درحقیقت علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کا قیام بہت بڑی حد تک اُنھیں کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ اِس بارہ میں اُنکی شاندار خدمات کبھی فراموش نہیں کی جا سکتیں۔

جنگ بلقان کے زمانہ میں مولانا شوکت علی اور اُن کے چھوٹے بھائی مولانا محمد علی نے ترکی فوجوں کی امداد کے لئے ایک "فیلڈ ہاسپٹل" ترتیب دیا تھا۔ اس تجویز کی ابتدا تو محمد علی کی طرف سے ہوئی تھی۔ لیکن سرمایہ جمع کرنے کی خدمت شوکت علی نے اپنے ذمہ لی چنانچہ دسمبر ۱۹۱۲ء میں یہ مشن

ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کی رہنمائی میں بمبئی سے روانہ ہوا۔ اور ٹرکی میں مفید خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۱۳ء میں ہندوستان واپس آیا۔ انور پاشا مرحوم کو اس مشن کے ساتھ بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اس مشن میں علیگڈھ کالج کے بہت سے "اولڈ بوائے" شریک تھے۔ وائسرائے ہند لارڈ ہارڈنگ نے اس مشن کے جذبہ انسانیت کی بہت کچھ تعریف و توصیف کی اور اس کے لئے ہر ممکن آسانی بھی بہم پہونچائی۔

اخبار "کامریڈ" اور روزنامہ "ہمدرد" کے دہلی آجانے کے بعد مولانا شوکت علی اس شہر کے حقیقی لیڈر بن گئے۔ اور اُن کی آل انڈیا لیڈری کی ابتدا اسی زمانہ سے ہوئی۔ اس دور کے اکثر مسلمان لیڈران نمائشی لیڈر تھے۔ جن کی اصل غرض اپنے رشتہ داروں کے لئے ملازمتیں اور اپنے لئے خطابات اور دیگر اعزازات حاصل کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ لیکن ان دونوں بھائیوں نے مسلم سوسائٹی کی کایا پلٹ دی۔ اور اُسمیں ایک نئی روح پیدا کردی۔ میں اُس زمانہ کے اسلامی جلسوں میں شریک ہوا کرتا تھا اور اس لئے اپنے تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ عوام کے دماغوں پر مولانا شوکت علی کی تقریروں کا بڑا حیرت انگیز اور دیرپا اثر ہوا کرتا تھا۔ یہی دو بھائی اس وقت مسلم سوسائٹی کے ترقی پرور عناصر کے صحیح نمایندے تھے چنانچہ گاندھی جی نے بھی اسی وجہ سے اُن کے ساتھ اشتراکِ عمل کیا۔

۱۹۱۵ء میں مولانا شوکت علی نے اپنے بھائی محمد علی کے ساتھ پہلے پہل مہرولی میں اور پھر چھندواڑہ میں نظر بند کئے گئے بعد میں اُن کی یہ نظر بندی (بیتول میں) قید کی شکل میں تبدیل کردی گئی۔ لیکن جیسا کہ پنجاب کے مشہور لفٹنٹ گورنر سر مائیکل اوڈائر نے اپنی کتاب India As I Knew it میں تسلیم کیا ہے۔ "دونوں بھائی نہیں چاہتے تھے کہ ٹرکی جنگِ عظمیٰ میں شریک ہو۔ اور اُنھوں نے نہایت دانشمندی سے" اس بات کی کوشش کی کہ ٹرکی اور برطانیہ کی باہمی آویزش نہ ہونے پائے لیکن بدقسمتی سے ان کی کوششیں کامیاب نہ ہوسکیں۔ چھندواڑہ کے قیام کے زمانہ میں اُنھوں نے پبلک چندہ سے ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی۔ جو اُن کے "قیام" کی بہترین یادگار ثابت ہو رہی ہے۔

اپنی رہائی کے بعد مولانا شوکت علی پورے طور پر سیاسیات میں داخل ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد اُنھوں نے بعض دیگر اصحاب کی امداد و اعانت سے خلافت کمیٹی کی بُنیاد ڈالی جس کا مقصد یہ تھا کہ جنگِ عظمیٰ کے بعد ترکوں کے لئے منصفانہ شرائطِ صلح حاصل کی جائیں۔ اُس کے بعد اُنھوں نے مہاتما گاندھی کی لیڈری میں تحریک عدم تعاون میں زور شور کے ساتھ شرکت کی۔ اُن ہنگامہ خیز ایام میں مولانا نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے جو مخلصانہ کوششیں کیں، وہ شکر گذاری کے ساتھ یاد رکھنے کی مستحق ہیں۔ چند سال بعد نہرو رپورٹ کے سلسلہ میں اُن کی کانگریس سے چپقلش ہو گئی۔ لیکن وہ ہندو مسلم اتحاد کے ہمیشہ خواہشمند رہے اور

پرائیویٹ اور پبلک حیثیت سے اس کو ہندوستان کی آزادی کی لازمی شرط سمجھتے رہے۔

انتقال سے کچھ عرصہ پیشتر مولانا کلیتاً مسلم لیگ کے ساتھ وابستہ ہوگئے تھے۔ وہ مسلمانوں کو ہر طریقہ سے منظم اور مضبوط دیکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنے آپ کو مسٹر جناح کی ماتحتی میں اس طرح دیدیا تھا جس طرح سے عدم تعاون کے زمانہ میں وہ مہاتما جی کے پیرو تھے۔ ان دونوں موقعوں پر انھوں نے لیڈری کی خواہش نہیں کی بلکہ وہ آخر وقت تک اپنے آپ کو محض ایک کارکن ایک معمولی سپاہی سمجھتے رہے۔

مولانا کے کیرکٹر کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی تھا کہ جس میدان میں کام کرنے کے لئے نکلتے، اسمیں اپنا دل و جان تک وقف کردیتے تھے۔ انھوں نے کوئی کام نیم دلی سے نہیں کیا۔ چنانچہ اپنی عمر کے آخری زمانہ میں انھوں نے جس شدت سے کانگریس کی مخالفت کی، اسمیں بھی ان کی یہ شان پورے طور سے نمایاں تھی۔ چند سال پہلے انھوں نے سلطان ابن سعود کی بھی اسی شد و مد سے مخالفت کی، اور آخر وقت تک اپنے رائے پر قائم رہے۔

مولانا کو اسلامی ممالک سے محبت تھی۔ مگر ترکی سے انھیں سب سے زیادہ محبت تھی۔ وہ خلیفہ عبدالمجید آفندی کا بھی بیحد احترام کرتے اور کہتے تھے کہ اس "بےگناہ انسان" کو اپنے پیش روؤں کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا پڑا ہے۔

مولانا شوکت علی کو فلسطین کے عربوں سے بھی بہت گہری محبت تھی اور اُن کی سرزمین سے انھیں اس درجہ اُنس تھا کہ اُنھوں نے مولانا محمد علی کو یہودیوں اور مسلمانوں کے پیغمبروں کے قریب میں دفن ہونے دیا۔ اس سے اُن کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں اور عربوں کے درمیان تعلقات اور مضبوط ہوجائیں

مولانا یاس اور ناامیدی کو کبھی پاس نہ پھٹکنے دیتے تھے۔ نازک ترین موقعوں پر بھی وہ مستقبل سے کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ اپنی نظربندی کے زمانہ میں قرآن مجید اور ڈاکٹر اقبال مرحوم کی روح پرور نظموں کے مطالعہ میں اپنا وقت صرف کیا کرتے تھے۔ معاہدۂ سیورے کے تاریک زمانہ میں انھوں نے کبھی شکست محسوس نہیں کی اور ہمیشہ یہ یقین رکھا کہ بالآخر ترکوں کے ساتھ انصاف ہوگا۔ وہ اپنی قوم کے متعلق بھی ہمت افزا خیالات رکھتے تھے۔ وہ اس کی کمزوریوں سے بخوبی واقف تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اُن کا یہ عقیدہ تھا کہ ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں کا ہمیشہ نمایاں حصہ رہیگا۔ لیکن اس کے باوجود وہ مسلمانوں کے منھ پر اُن کی کمزوریاں بیان کرنے سے کبھی نہ جھکتے تھے۔

وہ آخر وقت تک تحریک سودیشی کے معتقد رہے۔ اپنی وفات سے چند سال پہلے، جب وہ صرف مسلمانوں ہی کے لئے کام کرتے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ یہ تلقین کی کہ مسلمان اپنے بھائیوں کے ہاتھ کا بُنا ہوا کپڑا پہنیں۔ وہ خود بھی انھیں کے ہاتھ کا بُنا ہوا کپڑا استعمال کرتے تھے۔

مولانا شوکت علی کی طبیعت بہت ہی اشتعال پسند تھی۔ بعض اوقات اُن کا ظاہر بہت کھرا، ترش اور خوفناک معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اُن کا باطن ہمیشہ اس کے خلاف رہا۔ یہ سچ ہے کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر غصہ میں آجاتے تھے، لیکن اُس کے فرد ہوتے ہی وہ پھر پہلے کی طرح سیدھے سادے، ہنسی مذاق کرنیوالے شوکت علی نظر آتے تھے۔ پرائیویٹ اور پبلک میں وہ ہر شخص سے مذاق کرنے کے عادی تھے۔ اُن کے چہرہ پر ہمیشہ مسکراہٹ نمایاں رہتی تھی۔

شوکت علی بلحاظ قابلیت اپنے چھوٹے بھائی سے بہت گھٹ کر تھے۔ وہ اعلیٰ درجے کے انشا پرداز بھی نہ تھے عموماً وہ انھیں باتوں کو دھرایا کرتے تھے۔ جو عندالوقت اُن کے دماغ میں غالب ہوا کرتی تھیں اور اس میں وہ اس بات کا خیال نہ رکھتے تھے کہ ان خیالات کی اشاعت مناسب ہوگی یا خلاف مصلحت۔ ایک مرتبہ میں نے انھیں "خلافت" میں ایک نہایت مدلل، معقول اور مبسوط مضمون لکھنے پر مبارکباد دی۔ ایسے مضامین کبھی کبھار ہی اُن کے قلم سے نکلا کرتے تھے۔ بہرحال انھوں نے فوراً یہ جواب دیا کہ "بھئی میں محمد علی نہیں ہوں۔ میں جب لکھتا ہوں، تو اس کا خیال ہی نہیں کرتا کہ خیالات موتیوں کی طرح پروئے گئے ہیں یا نہیں"

پچیس سال پہلے وہ "اولڈ بوائے" نکالا کرتے تھے، لیکن وہ بہت دنوں نہ چل سکا۔ "خدام کعبہ" کے نام سے بھی انھوں ایک رسالہ کے چند نمبر نکالے تھے۔ البتہ روزنامۂ "خلافت" کے ساتھ اُن کا تعلق انتقال کے وقت تک قائم رہا۔

مولانا شوکت علی کی عجیب وغریب شخصیت تھی۔ لوگ انھیں عام طور پر "بڑے بھائی" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ یہ محبت کا لقب تھا بعینہٖ اُسی طرح جس طرح "بی اماں" احترام کا خطاب تھا۔ انہیں بہت سی ایسی خصوصیات تھیں۔ جن کی وجہ سے لوگ اُن کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ بہرحال وہ صلح و جنگ دونوں حالتوں میں شریف آدمی کا سا برتاؤ کیا کرتے تھے۔ واقعی وہ بلند خیال اور پختہ ارادے کے آدمی تھے۔ اُن کی یہ بدقسمتی تھی کہ اُن کی زندگی میں اُن کے مخالف اُن کے متعلق غلط بیانیوں سے کام لیتے رہے۔ مثلاً انتقال سے کچھ عرصہ پہلے جو مشروط تعاون انھوں نے حکومت سے کیا تھا، اس کے بارہ میں اُن کے اکثر مخالفین کو غلط فہمی رہی۔

اُن کی وفات پر ہندوؤں، مسلمانوں، پارسیوں اور سکھوں نے یکساں طور پر ماتم کیا۔ واقعی وہ ایک قابل اعتماد لیڈر، ایک وفادار دوست اور ایک بہادر دشمن تھے۔ وہ ایسے شخص تھے جو معاف تو کر سکتے تھے لیکن کسی بات کو بھولنا نہ جانتے تھے۔ بہرحال اس وقت ہندوستان کے طول و عرض میں اُن کا مثل ملنا مشکل ہے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

بیکار مزدور کی شام

(از مسٹر منظور الحق کلیم فارسی ٹیچر گورنمنٹ اسکول دیوریا)

خستہ و درماندہ دن بھر کا تھکا ماندا ہوا نقد محنت شومئ تقدیر سے ہارا ہوا
خاک برسر، ہوش اُڑے، دُکھ درد کا مارا ہوا مالکِ عیش و طرب کے در کا ٹھکرایا ہوا

دیکھیئے کس بیکسی سے آ رہا مزدور ہے
شیشۂ دل جس کا سنگِ غم سے چکنا چور ہے

گھر کی جانب لوٹتا ہے حسرت و ارماں لئے عیش و عشرت سے الگ سوزِ غمِ پنہاں لئے
اپنی دن بھر کی کمائی فکرِ بے پایاں لئے بھوک کی شدت میں طوفانِ الم ساماں لئے

فکر میں ڈوبا ہوا ہے کچھ نہیں اس کو خبر
ڈوبتا سورج اُدھر ہے ڈوبتا ہے دل اِدھر

بھوک کی بیتابیوں میں جھڑکیاں کھائے ہوئے پیاس کی شدت کو خونِ دل سے بہلائے ہوئے
دل میں روکے شکوہ ہائے تا بہ لب آئے ہوئے آ رہا ہے خستگی کے تیرِ غم کھائے ہوئے

ہو بُرا مایوسیوں کا کس قدر مجبور ہے
سامنے ہے جھونپڑی لیکن وہ کوسوں دُور ہے

اپنی قسمت کا گلہ سرمایہ داروں کا تعب اُن کی بے مہری کا شکوہ چپکے چپکے زیرِ لب
دل بھرا ہے درد و غم سے ہے تہی دستِ طلب اپنے دل میں کہہ رہا ہے ہو کے مایوسِ طرب

کیا مرے افلاسِ بے حد کی دوا کوئی نہیں
ایشور تو ہی بتا میرا خدا کوئی نہیں

اس کے بچے دیکھ کر آتا ہوا خرسند ہیں نام جن کے رام و لچھمن اور پرمانند ہیں
سختیوں کے جھیلنے والے سعادت مند ہیں گو یہ فطرت کے کھلونے جھونپڑی میں بند ہیں

دوڑ کر لپٹے قدم سے باپ کی آواز پر
کان گویا تھے لگے مہرِ پدر کے ساز پر

دل بھر آیا ہاتھ خالی دیکھ کر مزدور کا اِک مرقع بن گیا خود وہ دلِ مجبور کا
چہرہ شاہد بن گیا اس کے غمِ مستور کا اپنی نظروں میں گھٹا مُنھ بڑھ گیا ناسور کا
شب کے فاقہ کا تصوّر سامنے آنے لگا
وہ قدم اپنا بڑھا کر گھر میں جب جانے لگا

خورد بین

از رائے سدھ ناتھ بلی صاحب فراقی دریا آبادی

ہوتی ہے قدر و زیب مکاں کی مکین سے
انگشتری کو فخر ہے حاصل نگین سے

شایاں یہ ہر طرح ہے امیروں کے واسطے
کیا ہم غریبوں کو ہے غرض شہ نشین سے

اندوختہ کبھی نہیں آتا ہے اپنے کام
مکھّی کو فیض پہونچا ہے کیا انگبین سے

مشکل ہے اُن کے جال میں پھنس کر چھٹے کوئی
یارب بچانا تو مجھے زن زر زمین سے

پیدا نگاہ کر تو کھلے عقدۂ وجود
چلتا ہے بال بال پتہ خورد بین سے

باتیں بناتا رہتا ہے عادت یہ اُس کی ہے
مطلب نہیں ہے کچھ بھی فراقی کو دین سے

محمود اور فردوسی

از سید رضا قاسم مختار (پلاموں) پوسٹ چیلا

ستمبر ۳۸ء کے زمانہ میں میرا ایک مضمون فردوسی کے متعلق شائع ہوا تھا جسمیں اُس کے مختصر حالات لکھتے ہوئے سلطان محمود غزنوی کی وعدہ خلافی کا بھی (جو اُس نے فردوسی سے کی تھی) ذکر کیا گیا ہے۔ جس سے مولوی محمد یحیٰ صاحب تنہا (وکیل میرٹھ) کو شدید اختلاف ہے اور فاضل ممدوح نے ایک تردید مقالہ بعنوان "فردوسی اور سلطان محمود" سپرد قلم فرمایا ہے جو زمانہ ماہ مارچ ۳۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔

میں جواب الجواب لکھکر تلخی پیدا کرنا نہیں چاہتا اور یہ کام ملک کے دوسرے ارباب فکر کی توجہ پر چھوڑتا ہوں۔ اُمید ہے کہ اہل نظر حضرات میں سے کوئی صاحب بصیرت رسالہ زمانہ کے صفحات پر اپنے خیالات پیش کرکے اس گتھی کو سُلجھانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے تاکہ مصدقہ و مستند طور پر اطمینان ہو سکے کہ ملک کے وسیع النظر اصحاب کے نزدیک فردوسی کے ساتھ سلطان محمود کی وعدہ خلافی کا واقعہ کوئی تاریخی صداقت و اہمیت رکھتا ہے یا نہیں؟ لیکن اس کے ساتھ ہی اپنے پہلے بیان کے ثبوت میں یہاں پر صرف چند سطریں حوالہ قلم کر دینا مناسب سمجھتا ہوں ؎

پیالہ خالی اُٹھا کر لگا لیا مُنھ سے — کہ یاس کچھ تو نکل جائے حوصلہ دل کا

تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ شاہنامہ کی تصنیف و تدوین اولین کے بعد عرصۂ دراز تک اسکی حفاظت و اشاعت کی کوئی صورت اختیار نہیں کی گئی۔ حتیٰ کہ اس ضخیم و جخیم کتاب پر نظر ثانی بھی نہ کی گئی۔ سلطان محمود کے سامنے پیش ہوتے ہی سلطان اور مُصنف کے درمیان ناگوار رنجش کا ایسا سلسلہ شروع ہو گیا کہ محمود کے عہد حکومت میں بھی اس کتاب کی جانچ پڑتال نہ ہو سکی۔ البتہ اول اول جس شخص نے اس کتاب کی تصحیح و تدوین کی طرف توجہ کی وہ امیر تیمور کا پوتا بایسنقر خاں تھا۔ جس نے شاہنامہ کی تصحیح و تدوین کی طرف خاص توجہ کی اور اس مشکل کام کی انجام دہی کے لئے اچھے اچھے کاملین فن و ماہرین سُخن کو مامور کیا۔ جنھوں نے بڑی جد و جہد سے ایک صحیح نسخہ تیار کیا۔ اور شروع میں ایک طویل دیباچہ شامل کیا۔ جسمیں مُصنف کتاب و متعلقات کتاب کی نسبت ضروری باتیں نہایت شرح و بسط کے ساتھ درج کی ہیں مثلاً

"سلطان محمود کا شغف۔ فردوسی کا بارگاہِ سلطانی میں باریاب ہونا اور اعزاز واکرام سلطانی کیساتھ شاہنامہ کی تنظیم پر گراں بہا صلہ کا وعدہ۔ حسن میمندی کی رخنہ اندازی اور سلطان کے وعدے کا پورا نہ ہونے دینا۔ فردوسی کا دربار سلطانی سے نکلنا اور اُس کی آوارہ گردی۔ اپنی وعدہ خلافی پر سلطان محمود کی پشیمانی اور آخرش عین اُس کے انتقال کیوقت موعودہ صلہ کا پہنچنا وغیرہ" مندرج ہیں۔

اِس کے علاوہ ہندوستان میں بھی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۸۱۱ء میں بمقام کلکتہ چند منتخب اشخاص کی نگرانی میں شاہنامہ کی ترتیب وتصحیح نہایت اہتمام وانتظام کے ساتھ شروع کی تھی اور ابتدا سے آغاز داستان سیاوش تک اس کے اجزا چھاپے جا چکے تھے[1]۔ مگر بعض وجوہ کی بنا پر کمپنی مذکور کو یہ کام ملتوی کرنا پڑا۔ اور کچھ دنوں کے بعد ایک باہمت وصاحب ذوق انگریز مسمی مسٹر ٹرنر میکن نے نہایت بلند ہمتی سے شاہنامہ کی ترتیب وتصحیح کا کام اپنے ذمہ لے کر کام شروع کردیا مگر مصارف طبع طباعت کیلئے اُس نے کمپنی مذکور ہی سے مدد کی درخواست کی، کمپنی مذکور تو پہلے ہی ہمت ہار چکی تھی۔ اِس لئے مسٹر ٹرنر کو وہاں سے نفی میں جواب ملا۔ مگر دھن کے پکے مسٹر ٹرنر نے ہمت نہ ہاری، اور اسی فکر میں لگا رہا۔ شدہ شدہ مسٹر ٹرنر کے عزم واستقلال اور اخراجات کی مشکلات کی خبر فرمانروائے اودھ نواب نصیر الدین حیدر کے کانوں تک پہونچی اور نواب ممدوح نے کمال فیاضی ودریادلی سے اِس کام میں مسٹر ٹرنر کا ہاتھ بٹاکر اخراجاتِ صحت ومصارف طباعت کی جانب سے اُس کو پوری طرح مطمئن کردیا مسٹر ٹرنر کو اِس درمیان میں دو مرتبہ انگلستان سے ہندوستان آنے جانے کا بھی اتفاق ہوا۔ اور اثنار سفر میں وہ دونوں مرتبہ ایران بھی گیا۔ اور اپنے جمع کردہ نسخوں میں جو داستانیں، اشعار یا الفاظ مشکوک پائے، اُن کی تصحیح ومقابلہ امرا ایران کے کتب خانوں کے مختلف نسخوں سے کیا۔ جس کے متعلق وہ یوں رقمطراز ہے:۔

"چوں قبل انطباع از گردشِ روزگار، اتفاق سیر دیار ہندوستان دوبار رو داد واکثر نسخ دیگر در اثنار راہ بسرکار امرائے ایران بملاحظہ رسید۔ ابیاتے کہ عند التصحیح مشکوک ماندہ باز بصحت انجامید۔"

مسٹر ٹرنر میکن نے شاہنامے کی تصحیح کا دار ومدار ایران کے قدیم نسخوں پر رکھا اور بلاضرورت ہندوستانی

[1] کوئنس کالج بنارس میں شاہنامے کے ایک نہایت عمدہ مگر ناتمام نسخے کا پتہ ملتا ہے جو بڑے پیمانے کے عمدہ اور چکنے کاغذ پر بہت ہی خوب خط اور خوبصورت ٹائپ میں جس کے داہنے صفحہ پر اصل متن اور مقابل میں بائیں صفحہ پر انگریزی ترجمہ چھپا ہوا تھا، گمان غالب ہے کہ یہ وہی ایسٹ انڈیا کمپنی کا مدون کردہ چھپا ہوا ناتمام نسخہ تھا، معلوم نہیں اب وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ (رضا قاسم)

نسخوں کی طرف توجہ نہ کی اور ایرانی نسخوں میں بھی کثرت و قلت توافق کا التزام رکھا یعنی جو قصے، اشعار یا الفاظ زیادہ نسخوں میں پائے گئے اُن کو اختیار کیا اور جو صرف معدودے چند نسخوں میں پائے گئے، اُن کو قلم انداز کر دیا۔ جیسا کہ خود اسکا قول ہے:۔

"ہموارہ محل اعتماد و مدار صحت و فساد بر کثرت توفق نسخ قدیم ایران بودہ گاہے بر نسخہ ہندوستان نظر بلا ضرورت نکشودہ اگرچہ معانی ابیات آنہا روشن"

الغرض مسٹر ٹرنر میکن نے نہایت دقیق النظری و قابلیت کے ساتھ تصحیح کے فرائض کو ادا کیا۔ اور نواب نصیر الدین حیدر نے جو مالی امداد اس جہت میں کی تھی، اسکو اپنے تصحیح کردہ نسخہ میں اسطرح درج کیا ہے

"از انجا کہ مصارف طبع کتاب بسیار است و بسبب انکار بر ٹمن صاحب دکہ درآں وقت یکے از صاحبان کونسل ایشی فرمانفرمائے ہندوستان بود) سرکار درین باب تنگدستی نمود۔ لہذا ایں کار ملتوی ماند بلکہ تاحال صورت نمی گرفت اگر بادشاہ سلیجاہ ابوالنصر قطب الدین سلیمان جاہ نوشیروان ثانی نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ عجیب دستگیری نمی کرد و بر خلاف رسم شاہ محمود کہ باوجود وعدہ بر مصنف راہ بخل سپردہ ایں عالیجاہ بدون استدعا بطرز عالی ہمتاں دست امداد بر مصحح کشود"۔

اِن شواہد معتبرہ کے پیش نظر تو سلطان محمود غزنوی کی وعدہ خلافی و دون ہمتی صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے، بفرض اگر بایسنقر خاں کے مرتب کردہ نسخے کے دیباچے کی عبارت (جس کا مختصر بیان اگلی سطروں میں کیا جاچکا ہے) شاید کسی وجہ سے ناقابل قبول سمجھی جائے۔ تو مسٹر ٹرنر میکن تو اجنبی قوم کے فرد ہیں اُنھوں نے جو کچھ کیا یا لکھا ہے وہ تو محض علم دوستی، ہنر پروری اور ادبی تقاضے کی بنا پر ہے۔

ظاہر ہے کہ اس کو کوئی ذاتی غرض نہ تھی، نہ سلطان محمود سے اس کا کسی قسم کا ذاتی بغض ثابت ہوتا ہے اور نہ اسمیں اس کی قومی حکومت کا کوئی فائدہ مضمر تھا۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مسٹر ٹرنر نے سلطان محمود غزنوی کی وعدہ خلافی کی مثال نواب نصیر الدین حیدر کی فیاضی کے ضمن میں کیوں لکھی ؏

اند کے پیش تو گفتم غم دل ترسیدم کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

رُباعی

کیا چیز ہے زیست اِسکا منشا سمجھے یا رازِ حیات کو معمّا سمجھے
افسوس ہے آرزو ہوئی عمر تمام فانی دُنیا کو ہم ہمیشا سمجھے

سورج نراین سنگھ آرزو

دعاء

(از دلیپ راج صاحب سروش)

یارب مری دعا کو منت کشِ کرم کر
دل کی کلی کو رشکِ صد گلشنِ ارم کر

میں کامیاب ہو کر دُنیا کے لُطف لوٹوں
قسمت میں دشمنوں کی ناکامیوں کا غم کر

صبر و رضا کی مے سے بیخود بنا کے مجھ کو
جامِ سفال میرا برتر ز جامِ جم کر

دنیا میں بیکسوں کے غم کا علاج کرنا
اِک مشغلہ سا میرا ہر شام و صبحدم کر

وحدت پسند ہو یا کثرت فروز ہو جا
یا مجھ کو راز دانِ بت خانہ و حرم کر

بعدِ فنا بھی زندہ رہتے ہیں جو سخنور
نامِ سروش اُن کی فہرست میں رقم کر

لُطفِ کلام

(از حضرت لطیف انور)

نکتہ شناسیٔ نظر تہمتِ عام ہو گئی!
سجدۂ شوق کے لئے قیدِ مقام ہو گئی

بن کے بگڑ گئی یہاں عشق کی بات بیگماں
میرے لئے مگر وہی حسنِ کلام ہو گئی

تیرے جمال کی طلب، کون کہے کہ ہے غضب
آج نگاہ کیا اُٹھی' رونقِ بام ہو گئی

یا نہیں حلقۂ جنوں شاملِ اہلِ آرزو
یا تری تیغ جانستاں وقفِ نیام ہو گئی

عشق کی آرزو کہیں حسن کی آبرو کہیں
آہِ فسردہ جابجا تازہ پیام ہو گئی

انورِ تشنہ کام تک پہنچا نہ ایک جام تک
گردشِ دو جہاں مگر گردشِ جام ہو گئی

سنگ تراش

از منشی کرشن سروپ فتنہ منشی فاضل

"صنعت صانع کا بہترین نمونہ" نوجوان سنگتراش کے منہ سے عالم بیخبری میں نکلا۔
اُس کا تمام جسم کانپنے لگا اور وہ ہاتھ جو سنگ تراشی میں مصروف تھے لمحہ بھر کے لئے رُک گئے۔
"اننت، تم اپنا کام کیوں نہیں کرتے۔ مجھے گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو؟" ایک شوخ مگر مترنم آواز نے اُس کو اس عالم بیخبری سے بیدار کیا۔
"تم جانتی ہو پربھا' میں دیوی کی مورت بنا رہا ہوں۔ تمھارا لباس مجھے بہت پسند آیا ہے۔ میں دیوی کو تمھارا جیسا لباس پہناؤنگا۔" اننت نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔
"اننت، اگر تم بُرا نہ مانو تو کہوں کہ مورت جیسی چاہئے ویسی خوبصورت نہیں بنی۔" یہ کہتی ہوئی پربھا خراماں خراماں محل کی طرف روانہ ہوئی۔
پربھا تلکھا کے ٹھاکر بکرماجیت کی اکلوتی لڑکی اور ماں باپ کی آنکھوں کا تارا تھی۔ دریائے نربدا اُن کے محل کے قدم چومتا ہوا بہتا تھا۔ ٹھاکر صاحب کا ارادہ محل کے نزدیک ہی ایک مندر بنوانے کا تھا۔ جس کی تعمیر کا کام اُنھوں نے شروع کر دیا تھا۔
اننت کا باپ اس علاقہ کا مشہور سنگ تراش تھا جس نے اننت کو بھی سنگ تراشی سکھائی تھی۔ اور اُس نے چند ہی سال میں اِس فن میں اِتنی مہارت حاصل کر لی کہ اُس کا شمار اعلیٰ پایہ کے سنگتراشوں میں ہونے لگا۔ سنگ تراشی کے علاوہ وہ زیورِ علم سے بھی آراستہ تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ کہنہ مشق اُستادوں سے اس فن میں گوئے سبقت لے گیا تھا۔
آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ اننت اپنے مکان پر واپس آیا۔ آج کچھ کھویا ہوا سا معلوم ہوتا تھا۔ وہ خیالات کی رَو میں بہہ رہا تھا۔ پربھا کا حسین چہرہ اُس کے سامنے تھا۔ اُس کی وہی مترنم اور شوخ آواز بار بار اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی "اننت اگر تم بُرا نہ مانو تو کہوں کہ مورت جیسی چاہئے ویسی خوبصورت نہیں بنی"۔ اُس کا دل ایک عجب قسم کی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اب وہ

از سر نو دوسری مورت تراشے گا۔ اِس خیال کے زیر اثر وہ اُٹھا اور مندر کی جانب روانہ ہوگیا۔

رات کی سیاہ چادر دِن کے چہرے کو چھپائے ہوئے تھی۔ چہار طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آتی تھی ہُو کا عالم تھا۔ اننت اِس تاریک رات میں مندر کی جانب جا رہا تھا۔ اُسے تقریباً ڈیڑھ فرلانگ راستہ طے کرنا تھا۔ یہ ڈیڑھ فرلانگ اُس کے لئے ڈیڑھ میل سے کم نہ تھے۔ تنفس بھاری ہوگیا۔ قدم لڑکھڑانے لگے۔ جوں توں کر کے وہ مندر تک پہونچا مورت کو اُٹھایا۔ اور ایک دھماکے کی آواز کے ساتھ مورتی پاش پاش ہوگئی۔ پھر وہ اپنے گھر واپس آکر دریائے فکر میں غوطہ زن ہوگیا۔

"دوسرے دِن اننت نے ٹھاکر صاحب سے کہا" مورت رات کو نہ جانے کس طرح ٹوٹ گئی۔

ٹھاکر صاحب نے کہا۔" اس مرتبہ تم مورت کو حفاظت سے رکھنا۔ ایسا نہ ہو پھر ٹوٹ جائے۔

یہ کہتے ہوئے وہ اُٹھ کر کسی کام سے باہر چلے گئے۔

اننت، رات دِن مورت بنانے میں مشغول رہتا تھا۔ اُسے اپنے تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ وہ کسی ایسے جذبے کے ماتحت کام کر رہا تھا۔ جس نے اُسے دار فانی سے ہٹا کر محبت کے ایسے عالمِ جادوانی میں لیجا کر کھڑا کر دیا تھا۔ جہاں پہونچکر انسان اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔

پندرہ دِن کی اَن تھک کوشش کے بعد اننت نے دلخواہ مورت بنالی۔ مورت کیا تھی، ہو بہو پربھا کا مجسمہ تھا۔ وہ حیران تھا کہ عالم بیخبری میں اُس نے کتنی زبردست غلطی کی ہے۔ اگر ٹھاکر صاحب نے تاڑ لیا، تو جان کی خیر نہیں اور نجانے بیقصور پربھا پر کیا کیا مُصیبتیں آئیں۔ اُسے اپنے متعلق تو کسی قسم کا خوف نہ تھا۔ مگر پربھا کی رسوائی وہ برداشت نہ کر سکتا تھا۔

محل میں مورت کے تیار ہو جانے کی اطلاع دیکر اننت وہاں سے روانہ ہوگیا۔ اور قریب کے قصبے میں سکونت اختیار کرلی۔ مگر یہاں اُس کا دل نہ لگا۔ یادِ محبوب دِل میں چٹکیاں لینے لگی۔ اُس نے غم غلط کرنے کے لئے پربھا کا ایک چھوٹا سا مجسمہ بنانا شروع کر دیا۔ اب اُسکا کام آنسو بہانا اور مجسمہ بنانا تھا

اننت آج مجسمہ کو مکمل کر چکا تھا۔ اور تلکھا جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اُس کے ایک دوست نے کہا۔

"اننت آج ٹھاکر بکرماجیت کی لڑکی کی شادی ہے کیا تم تلکھا نہیں چلو گے؟"

"نہیں، آج میری طبیعت اچھی نہیں ہے" اُس نے اپنے دوست کو ٹالتے ہوئے کہا۔

اننت کو اِس روح فرسا خبر سے روحانی اذیت پہونچی۔ اُس پر نیم بیہوشی کا عالم طاری ہوگیا۔ جب ذرا ہوش و حواس بجا ہوئے تو اُس نے مجسمہ کو کپڑے میں لپیٹا اور تلکھا کی جانب روانہ ہوگیا اور تقریب آدھ گھنٹے بعد وہ وہاں پہونچ گیا۔

تلکھا عروسِ نو کی مانند سجا ہوا تھا۔ بازاروں میں دو رویہ آئینہ بندی کی گئی تھی۔ چوک چوک پر ٹھاکر صاحب کی طرف سے نوبتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ نفیری اور نقارہ کی صداؤں سے کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ اننت سیدھا محل میں پہونچا۔ اس وقت پربھا براجمان ہو رہی تھی اور خویش و اقارب اُسے تحفے پیش کر رہے تھے۔ اننت آگے بڑھا اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے مجسمہ کو پیش کیا۔ پربھا نے اپنا مجسمہ دیکھا۔ اُسے فوراً مندر کی مورت کا خیال آگیا۔ وہ اننت کے جذبات بھانپ گئی اور اُس کے شیشۂ دل کو ٹھیس لگی اسکے جذبات میں زبردست ہیجان پیدا ہوا اور محبت کے آنسو آنکھوں سے ٹپکنے لگے۔

پربھا سسرال چلی گئی۔ پژمردہ اننت آنسو بہاتا ہوا اپنے گھر واپس آگیا۔ مگر اب صبر و سکون کہاں تھا۔ راحتِ قلب اور تسکینِ دل نے اُسے خیرباد کہدیا تھا۔ اُس نے جوں توں کر کے ایک مہینہ گذارا۔ پھر اُس قصبہ کی جانب روانہ ہوا جہاں پربھا بیاہی گئی تھی۔

اننت نے پتھروں کا ڈھیر اکٹھا کیا۔ اور پربھا کے مجسمے بنانے شروع کر دیئے۔ ڈیڑھ ماہ کے قلیل عرصہ میں پچاسوں مورتیں بناڈالیں۔ قصبے کے لوگ اننت کو پاگل سمجھتے تھے اور ازراہِ ہمدردی اُسے کھانے کو دیدیتے تھے۔ بچے اُسے پاگل سنگ تراش کہتے تھے۔ آہستہ آہستہ اُسکی شہرت پربھا کے کانوں میں بھی پہونچی۔ اُس کے دل میں ہزاروں قسم کے خیالات چکر لگانے لگے۔ محبت کی چنگاری ایک دفعہ پھر چمکی۔

"ہو نہ ہو یہ اننت ہے"۔ اس کے دل کی گہرائیوں سے آواز آئی، اور وہ بیقرار ہو گئی۔

رات گئے پربھا چپکے سے اُٹھی اور لوگوں نے جس طرف اننت کی جائے رہائش بتائی تھی اس طرف روانہ ہو گئی۔ اب اننت اور پربھا ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ وفورِ محبت میں دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آخر پربھا نے قفلِ خاموشی توڑا اور کہا "اننت تم جانتے ہو کہ میں راجپوت خاندان کی لڑکی اور بہو ہوں۔ ہماری محبت کا کوئی نتیجہ نہیں ہوسکتا۔ اس لئے تم صبر کرو اور مجھے بھلادو۔ میں بھی جس طرح ہوگا زندگی کے دن ختم کردوں گی۔"

ناکام محبت اننت کا دل ڈوبا جارہا تھا۔ رنج و غم اور دائمی مفارقت کے خیال نے اُس کے رونگٹیں رونگٹیں میں آگ لگادی تھی۔ اُس کا تمام جسم پھنکا جارہا تھا۔ اُس نے ایک دلدوز چیخ لگائی اور دوڑتا ہوا نربدا کی آغوش میں کود پڑا۔

اُف کسقدر خوفناک منظر تھا۔ اس منظر نے پربھا کو پاگل کردیا۔ وہ گھر لوٹی اور ایسی نیند سوئی کہ پھر بیدار نہ ہوئی۔ غم کے شدید حملے نے اُس کی حرکتِ قلب کو بند کردیا تھا۔

یہ تھا انجام سنگ تراش کی محبت کا

زمزمۂ مدہوش

(از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش ایم۔ اے)

سُلوک دنیا سے ہے یہ میرا، عجیب مردِ غیور ہوں میں
قریب آئے قریب ہوں میں جو دُور بھاگے تو دُور ہوں میں

ازل سے ہوں بندۂ محبت حریفِ کبر و غرور ہوں میں
خودی شکستہ کا ہوں پیامی، مئے حقیقت میں چور ہوں میں

ازل کے دن جاگ اُٹھی مجھی سے وہ منزلِ خفتۂ محبت
کئے فرشتوں نے مجھ کو سجدے خدا کی شان اور نور ہوں میں
بھرا ہے رگ رگ میں سوزِ الفت خمیر میں بادۂ محبت
رواں دواں خوں میں سیلِ آتش کہ شعلۂ برقِ طور ہوں میں

نہ رکھ مرے دل پہ ہاتھ دنیا کہ اِک دہکتا شرار ہے یہ
جلا دیا ما سوا کو اس نے جو جل اُٹھا ہے وہ طور ہوں میں
اُتر رہا تھا خمارِ ہستی کہا جو منصور نے انا الحق
عدوئے جاں تھا عدوئے جاں ہوں عدوئے فسق و فجور ہوں میں
ریاضِ رحمت کی شامِ رنگیں میں بادۂ اطہرِ حقیقت
میں پی کے مدہوش ہو گیا ہوں غریقِ کیف و سُرور ہوں میں



تنقید کتب

حیاتِ و کلیاتِ اسمٰعیل[1]

شاید ہی کوئی اُردو داں ہوگا۔ جس نے ؎

رَب کا شکر ادا کر بھائی — جس نے ہماری گائے بنائی

یا

نہر پر چل رہی ہے پن چکی — دُھن کی پوری ہے کام کی پکی

جیسی مشہور نظموں کے مصنف مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی کا نام نامی نہ سُنا ہو۔ جن کا شمار نئے دَور کے ادیبوں کی صفِ اوّل میں ہے۔ غالب تک تمام اُردو شاعروں کا معراج اہلِ ایران کی تقلید تھا۔ لیکن مولانا حالی اور شمس العلما آزاد نے نظموں کی بُنیاد ڈالی۔ جس کے بعد قومی اور فطری شاعری کا دَور شروع ہوا۔ جن حضرات نے مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی کی وہ اُردو ریڈریں دیکھی ہیں، جو عرصہ تک ہمارے اسکولوں کے کورس میں داخل رہ چکی ہیں۔ انھیں اس بات کا خوب اندازہ ہے کہ نثر و نظم دونوں لحاظ سے ان ریڈروں سے بہتر ریڈریں اب تک جاری نہیں ہوئیں۔ اگلی نسل کے اسکولی تعلیم یافتہ لوگ زیادہ تر مولانا محمد اسمٰعیل ہی کی تصانیف سے فیض اُٹھائے ہوئے ہیں۔ "ہماری گائے"۔ "پن چکی"۔ "دِل کی فریاد"۔ "گرمی کا موسم"۔ "برسات"۔ "دال چپاتی"۔ "طمع کی انگوٹھی" وغیرہ وغیرہ ایسی پیاری، دلچسپ اور دلکش نظمیں ہیں جو لاکھوں آدمیوں کی زبان پر چڑھی ہوئی ہیں، اور اُن کے پڑھنے اور سُننے سے اب بھی سب لُطف اندوز ہوتے ہیں، مولانا اسمٰعیل کا کلام سلاست و لطافت اور سادگی و برجستگی کا بہترین نمونہ ہے۔ انھوں نے جو لفظ جہاں رکھدیا، وہ اٹل ہے اور جو محاورہ استعمال کردیا، برمحل ہے۔ مولانا کی جو کہانیاں نظم کی ہیں وہ بھی سب کی سب اخلاقی ہیں۔ مولانا کی منظوم حکایات پڑھکر Æsop's Fables. کا لُطف آتا ہے۔

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کے فرزند اصغر خان بہادر محمد اسلم سیفی نے کلام اسمٰعیل کا مکمل و خوبصورت ایڈیشن شائع کرکے اُردو ادب پر بڑا احسان کیا ہے۔ شروع میں مولانا اسمٰعیل کی مفصل سوانحعمری اور اُنکے کلام پر تنقید درج ہے۔ اور اس کے بعد مجموعہ کلام۔ غرض یہ کتاب ہر شخص کے مطالعہ کے قابل ہے۔

---

[1] لکھائی چھپائی۔ کاغذ سب قابل قدر۔ حجم بڑی تقطیع کے ۴۱۶ صفحات۔ قیمت چار روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ، دہلی۔

آب حیات کے لطیفے[1]

اِس وقت ہندوستان میں اُردو شاعروں کے درجنوں تذکرے موجود ہیں۔ جنمیں ایک سے ایک بڑھ کر داد تحقیق و تدقیق دی گئی ہے۔ لیکن شمس العلمار مولوی محمد حسین آزاد کے تذکرۂ "آب حیات" کو جو ہر دلعزیزی حاصل ہے وہ آج تک کسی تذکرہ کو نصیب نہیں ہوئی۔ اس کی اصل وجہ آزاد کا دلآویز طرزِ تحریر ہے۔ جسکی تقلید میں بہت سے ادیب سر دُھنتے رہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب تک کسی سے نہ ہو سکی۔ آزاد کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی بات کو لکھتے لکھتے، جگہ جگہ ایسی دلنواز اور خوش آیند چٹکیاں لیتے ہیں کہ پڑھنے والے کے مُنھ سے بیساختہ "واہ واہ" نکل جاتی ہے۔

مولانا کی آب حیات، دربار اکبری اور سخندانِ پارس میں اِس قسم کی نکتہ سنجیاں بڑی کثرت سے موجود ہیں۔ مگر ان تینوں میں بھی "آب حیات" میں اس "امرت جل" کی دھار کسی قدر زیادہ تیز اور گہری بہتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اسے بار بار پڑھنے سے بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ اِس دلچسپی اور دل بستگی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اس تذکرہ میں نامور ادیبوں کے سیکڑوں نکتے و لطیفے یکجا کر دئے گئے ہیں۔ مگر بہت سے لوگ ہیں، جن کو "آب حیات" جیسی ضخیم کتاب کے پڑھنے کی مہلت نہیں۔ اُن کے لئے اب شمس العلمار آزاد کے نواسے مولانا محمد اشرف صاحب ایم۔ اے دہلوی نے "آب حیات کے لطیفے" کے نام سے اِس ضخیم کتاب کے تمام دلچسپ نکتوں اور لطیفوں کو چن کر کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔

پوری کتاب ۲ دو حصوں میں منقسم ہے۔ شروع کے ۹ نو جزو میں مولانا آزاد کے مفصل سوانح حیات درج ہیں اور دوسرے حصہ میں ۹ نو جزو کے اندر "آب حیات" کے دلچسپ لطائف و نکات درج کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب شایقین ادب کی تفریح طبع کے لحاظ سے بہت قابل قدر ہے۔ اس کا حجم چھوٹی تقطیع کے ۱۸ اٹھارہ جزو ہے۔

اُردو کے ۱۰۰ سو شعر

مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی نے زمانہ قدیم و حال کے مشہور اُردو شاعروں کے ۱۰۰ سو ۱۰۰ سو منتخب اشعار کا ایک بہت دلچسپ سلسلۂ کتب شائع کیا ہے۔ چنانچہ اب تک مختلف شعرا کے ۱۰۰ سو اشعار علیحدہ علیحدہ شائع ہو چکے ہیں مگر اب شاعری کے پانچ دَور مقرر کر کے ہر دَور کے ۱۰۰ سو ۱۰۰ سو چیدہ غزل کے اشعار ایک چھوٹی کتابی صورت میں شائع کئے گئے ہیں۔ کسی ایک دَور سے صرف ۱۰۰ سو اشعار انتخاب کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے مگر اِس سلسلے کے قابل مؤلفوں نے ہر مشہور شاعر کے کچھ اشعار اپنے انتخاب میں ضرور ہی شامل کر لئے ہیں

[1] قیمت سوا روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی۔

جن سے اُس دَور کی شاعری کی خصوصیات پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی قسم کی ایک کتاب میں ایسے نتوّ شعر درج کئے ہیں جو بطور ضرب المثال مروج ہیں۔ یہ نسخہ بھی خوب ہے اور اشعار کا انتخاب بہت اچھا کیا گیا ہے۔ لکھائی چھپائی عمدہ۔ لیکن قیمت چار آنہ کسی قدر زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

خیالات آزاد (حیدرآبادی)[1]

یہ کتاب مولوی سید محمد حسین آزاد حیدرآبادی کے مجموعۂ کلام کا دوسرا حصہ ہے۔ جسمیں زیادہ تر حصہ نظموں کا ہے جو چائے، سگرٹ وغیرہ وغیرہ مختلف عنوانوں پر لکھی گئی ہیں۔ فاضل مصنف نے سگرٹ پر جن خیالاتِ عالیہ کا اظہار فرمایا ہے۔ اسی سے مصنف کی شاعری کا اندازہ کر لیجئے ؎

سامنے اِس کے یہ بیڑی کی حقیقت کیا ہے ۔۔۔ دم نہیں مارتا چٹا[2] بھی جلے گر سگرٹ

حقّہ دیتا ہے اگرچہ کہ دھواں دھار اپیچ ۔۔۔ بند کر دیتا ہے اُس کو بھی سلگ کر سگرٹ

خضر منزل[3]

یہ چھوٹا سا رسالہ مولوی محمد عبدالشکور خان صاحب بی۔اے، بی۔ٹی (علیگ) اکبرآبادی کا دلچسپ سفرنامہ ہے۔ جس میں ریاست کشمیر، شمالی ہند، بنگلور، سرزمین دکن، اجمیر، آگرہ، دہلی، لاہور وغیرہ کی سیر و سیاحت کے دلچسپ حالات تحریر کئے گئے ہیں۔ سفرنامہ بہت پُرلطف اور دلچسپ ہے۔ جگہ جگہ مختلف اہم مقامات کے فوٹو بھی دیئے گئے ہیں۔ چھوٹی تقطیع کے ۷۲ صفحات ضخامت۔ قیمت ایک روپیہ کسی قدر زیادہ ہے۔

یادگار[4]

یہ چھوٹی سی کتاب مولوی محمد اسحٰق صاحب مائل انصاری، خیرآبادی ضلع سیتاپور کے کلام کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ جس میں چند غزلیات، چند قومی نظمیں اور چند قطعات ہیں۔ مولنا مائل نو عمر شاعر معلوم ہوتے ہیں، مگر خوب کہتے ہیں۔ ناظرین کو ذیل کے چند شعروں سے اُن کے کلام کا اندازہ ہو جائے گا ؎

ہزار رنج و مصائب میں مرد مرد رہے ۔۔۔ خزاں رسید چمن کی طرح نہ زرد رہے

ہمیشہ کرتا رہے تجربے بشر حاصل ۔۔۔ جہاں میں واقف اسرار گرم و سرد رہے

کبھی طریقہ باطل نہ اختیار کرے ۔۔۔ بشر وہ ہے جو بہ تیغ حق نبرد رہے

تونگری میں رہے دھیان فاقہ مستوں کا ۔۔۔ جگر میں سوز رہے، دل میں اُن کا درد رہے

---

[1] ملنے کا پتہ:- درویش منزل مستعد پورہ، آزاد منزل فلک نما حیدرآباد دکن۔

[2] "چٹا" دکھنی زبان میں دیسی عیسائیوں کو کہتے ہیں۔ [3] ملنے کا پتہ:- قصر الادب آگرہ۔

[4] حجم چھوٹی تقطیع کے ۶۴ صفحات۔ قیمت چھ آنہ۔ ملنے کا پتہ:- (۱) مصنف صاحب (ب) موسن بکڈپو موسن گنج کانپور

جدید دستور کا خاکہ

یہ قانون حکومت ہند مجریہ ۱۹۳۵ء کا خاکہ ہے۔ جس کے ماتحت برطانوی صوبوں میں اندرونی طور پر خود مختار حکومتیں قائم ہوگئی ہیں اور فیڈریشن کا قیام ابھی باقی ہے۔ زین العابدین صاحب بی۔ ایس۔ سی، پی۔ ایچ۔ ڈی لنڈن نے ضخیم قانون کا ضروری اور مفید خلاصہ کیا۔ جس کو مولوی شفیق الرحمن قدوائی بی۔ اے (جامعہ) نے اُردو کا لباس پہنایا ہے اس زمانہ میں جبکہ آئین جدید کا دَور شروع ہوا ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب کا مطالعہ بہت مفید ثابت ہوگا۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ معمولی۔ بڑی تقطیع کے دو جزو ضخامت قیمت دو آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔

مہاپرش محمدؐ صاحب (ہندی)

یہ کتاب کمار بشن پال سنگھ نے ہندی زبان میں لکھی ہے اور اسمیں پیغمبر اسلام کی زندگی اور اُن کی تعلیمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کو تین حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں محمدؐ صاحب سے پہلے عرب کے حالات درج ہیں۔ دوسرے حصہ میں محمدؐ صاحب کی زندگی کے حالات کا خلاصہ ہے، اور تیسرا حصّہ آنحضرتؐ کے اُپدیشوں اور اسلام کے اصولوں کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ درحقیقت مصنف نے ہندی جاننے والے و نیز ہندوؤں کے لئے مسلم کلچر کی تصویر سامنے رکھنے کی کوشش ہے اور اسمیں وہ کامیاب بھی رہے ہیں۔ اس ہندو مسلم کشیدگی کے زمانہ میں اس قسم کی کتابوں سخت ضرورت ہے۔ کاغذ و لکھائی عمدہ۔ قیمت ۵ آنہ ۶ پائی۔[1]

جوہرِ اقبالؒ

رسالۂ جوہر' لاہور کا اقبال نمبر ایک مستقل کتابی صورت میں مجلد شائع ہوا ہے۔ اس میں ملک کے مشہور اہل قلم نے علامہ اقبالؒ پر تقریباً دو درجن گرانبہا مضامین لکھے ہیں جنہیں اقبال مرحوم کی سوانحعمری، انکی شاعری اور دیگر امور متعلقہ پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ نظم و نثر دونوں قسم کے مضامین ہیں۔ مضمون نگاروں میں سیّد سلیمان ندوی، ڈاکٹر سید عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر عبدالحمید زبیری، پروفیسر محمد عاقل ایم۔ اے وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ شروع میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، مولینا ابوالکلام آزاد، مہاتما گاندھی، ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور، سر اکبر حیدری، سر تیج بہادر سپرو، ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر کانگریس وغیرہ کے پیغامات درج ہیں۔ بہر حال اقبالؒ کی شاعری کے متعلق یہ مجموعہ مضامین نہایت بیش بہا ہے۔[2]

---

[1] ملنے کا پتہ:۔ The Seminar for Comparative Religiom, Baroda College, Baroda.

[2] قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ:۔ انجمن اتحاد، جامعہ ملیہ۔ دہلی۔

رفتار زمانہ

جنگ یورپ

پولینڈ کے حصے بخرے ہوجانے کے بعد جنگ عملی طور پر رکی تھمی سی ہے۔مغربی محاذ میں جو تھوڑی بہت جنگی کارروائی فرانس اور جرمنی نے جاری کر رکھی تھی وہ بھی بارش شروع ہوجانیکی وجہ سے معطل ہوگئی ہے۔فرانسیسی فوجیں اُس جرمن علاقہ سے جو اُنھوں نے آغاز جنگ سے ابتک فتح کیا تھا ہٹ آئی ہیں۔جس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اگر وہ ایسا نہ کرتیں تو دریاؤں کی طغیانی کی وجہ سے دلدل میں پھنس کے رہ جاتیں۔اب تمام فرانسیسی فوجیں اپنی سرحد پر مورچہ بند ہوگئی ہیں۔معلوم ہوتا ہے، جرمنی نے بھی یہی تہیہ کرلیا ہے کہ وہ اب فرانس کے خلاف جنگ بند کرکے برطانیہ پر شدت کیساتھ ہوائی حملے کرے گا۔خبر ہے کہ اس کے متعلق ہٹلر نے سولینی سے بھی مشورہ کیا ہے۔

تجارتی جہازوں کے خلاف آبدوز کشتیوں کے حملے جاری ہیں اور جرمنی، برطانیہ کے دو بڑے جنگی جہاز اور متعدد دوسرے جہاز غرق کرچکا ہے۔رائل اوک نامی مشہور جنگی جہاز تو اپنے مستقر میں غرق کیا گیا۔جرمنی کے ہوائی جہاز بھی اسکاٹ لینڈ اور انگلینڈ کے مشرقی ساحل کے شہروں اور بندرگاہوں پر موقع پاکر حملے کرکے بھاگ جاتے ہیں۔لیکن ابھی تک ہوائی جنگ شدت کیساتھ شروع نہیں ہوئی اور جرمنی کی دھمکیاں بفضلہ پوری نہیں ہوئیں

برطانیہ نے جس طریق عمل کا اعلان کیا ہے وہ جرمنی کی درآمد تجارت بند کردینے کی پالسی ہے چنانچہ جہانتک واقعات وحالات سے واضح ہورہا ہے برطانیہ کو اسمیں خاصی کامیابی ہوئی ہے۔پچھلی جنگ عظیم میں بھی جرمنی کو اسی وجہ شکست ہوئی تھی کہ اس کی تجارت مسدود ہوگئی تھی۔اور اُسے کچا مال اور غلہ ملنے کی کوئی راہ باقی نہیں رہی تھی۔مگر اس مرتبہ ایک بڑا فرق ضرور ہے کہ جرمنی کو روس کی رفاقت سے بہت طرح کا کچا مال کافی مقدار میں ملنے کی توقع ہوگئی ہے۔

ہٹلر اور سولینی نے صلح کی بہت کوشش تو کی لیکن ہٹلر اپنی شرائط پر صلح کرنا چاہتا ہے اور پولینڈ کے مسئلہ پر کسی مصالحت کے لئے تیار نہیں ہے۔اس لئے برطانیہ و فرانس نے جرمنی کی پیشکش کو ٹھکرا دیا اور کہا کہ جب تک پولینڈ کی تقسیم شدہ ہڈیوں، گوشت اور خون کو جمع کرکے اور اس پیکر میں جان ڈال کر روس اور جرمنی اس سے دست بردار نہیں ہوجاتے صلح کے مسئلہ پر غور نہیں کیا جاسکتا۔اسوقت عوام برطانیہ کی بھی یہی رائے ہے حالانکہ مسٹر لائڈ جارج کی پرزور سفارش ہے کہ جرمنی نے امن وصلح کی جو کانفرنس منعقد کرنا تجویز کی ہے۔اس کو انگلستان کو منظور کرلینا چاہئے۔لیکن اس رائے کی عام طور پر مخالفت کی گئی ہے اور جرمنی نے بھی اس مسئلہ پر دوبارہ غور کرنے سے انکار کردیا ہے حالانکہ مسٹر چیمبرلین نے اپنی تجاویز کا جو خاکہ پیش کیا ہے اس پر جرمنی کو غور کرکے اپنی طرف سے دوبارہ نئی تجاویز پیش کرنی چاہئے تھا۔ بہرحال موجودہ طرز عمل سے جنگ جاری رہنے کی ذمہ داری ہٹلر ہی پر قائم رہتی ہے۔

ہٹلر جنگ کو شدت کیساتھ شروع کرنے میں ابھی تک پس وپیش کر رہا ہے۔ مگر یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ پولینڈ میں جو علاقہ روس نے لے لیا ہے وہاں سویٹ طرز پر تنظیم کی جا رہی ہے اور اس حصہ ملک کو روس میں ملانے کی پوری کاروائی ہو چکی ہے۔ اس لئے اب یہ امید کرنا کہ روس اس علاقہ سے دست بردار ہو جائیگا ذرا مشکل نظر آتا ہے اور چونکہ روس کو پولینڈ کے حصے بخرے سے فائدہ ہوا ہے اس لئے اس نے جرمنی کی ہمنوائی شروع کردی ہے اور روس کے وزیر خارجہ نے بھی اپنی تازہ ترین تقریر میں جنگ جاری رکھنے کی تمامتر ذمہ دار برطانیہ اور فرانس پر ڈالتے ہوئے اس بات کو بڑے زور وشور سے دہرایا ہے کہ پرانا پولینڈ اب کسی حکمت سے بھی دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتا ہے۔ آئندہ پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے وزیر موصوف نے کہا ہے کہ روس بین الاقوامی معاملات میں ہر ضروری کارروائی کے لئے اپنی آزادی برقرار رکھنا چاہتا ہے اور جنگ کو جلد سے جلد ختم کرنیکا خواہشمند ہے مگر خود غیر جانبدار رہے گا۔ اس اثنا میں روس نے ریاستہائے بلقان پر بھی اپنا اثر بہت بڑھا لیا ہے جس کی وجہ سے یوروپین سیاست میں اب اس کو خاصہ دخل ہو گیا ہے۔ مگر حال ہی میں دو خاص باتیں برطانیہ کے حق میں ہوئی ہیں۔ اول یہ ہے کہ برطانیہ کا ترکی کے ساتھ دوستانہ معاہدہ ہو گیا ہے۔ جس میں ترکی نے اس بات کو صاف کر دیا ہے کہ وہ روس کے خلاف جنگ میں شریک نہ ہوگا۔ اٹلی اور جرمنی میں اس معاہدہ پر بہت کچھ غم وغصہ کا اظہار کیا گیا ہے لیکن روس نے اس پر علانیہ کوئی اظہار ناپسندیدگی نہیں کیا ہے۔ البتہ یہ بات ضرور قابل لحاظ ہے کہ روس و ترکی کے درمیان جو معاہدہ کی گفتگو ہو رہی تھی وہ منقطع ہو گئی ہے۔ اور ادھر تین چار روز سے اس قسم کی بھی خبریں آرہی ہیں کہ روس ناراض ہو کر ترکی و رومانیہ کے خلاف حملہ کرنیکی تیاریاں کر رہا ہے اور جرمنی نے بھی مغربی جانب اسکی مدد کا وعدہ کیا ہے یعنی اگر روس ترکی یا رومانیہ پر حملہ کرے تو اسی وقت جرمن فوج بھی مغربی محاذ پر شدید حملہ کردے تاکہ برطانیہ و فرانس کو ترکی و رومانیہ کی امداد کا موقعہ نہ مل سکے۔ لیکن روس اور ترکی دونوں برطانوی معاہدہ ہو جانیکے بعد اس کا اعلان کر چکے ہیں کہ انکی دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ روس و جرمنی کے حال کے طرز عمل کو دیکھتے ہوئے انکی باتوں کا کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا ہے لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ رومانیہ یا ترکی پر حملہ کرنا کوئی آسان کام نہ ہوگا۔ کیونکہ روسی حملہ کے بعد اتحادی بیڑوں کیلئے درہ دانیال اور باسفورس کے دروازے فوراً کھل جائیں گے اور رومانیہ کو برابر مدد پہونچ سکیگی۔ دوسرے ترکی پر صرف سواحل بحیرہ اسود یا کوہ قاف کی طرف سے حملہ ہو سکتا ہے اور ان پہاڑوں میں کسی بڑی فوج کا ساز وسامان کے ساتھ نقل وحرکت کرنا خصوصاً جاڑے کے موسم میں کوئی آسان کام نہیں ہے بحیرہ اسود کے ساحل پر بھی روسی جہازوں کا فوجیں اتارنا سہل نہیں ہے۔ کیونکہ یہاں چند آبدوز کشتیاں اور تین چار جنگی جہاز تمام روسی بیڑہ کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔ روس کے وزیر خارجہ کی تازہ ترین تقریر سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ روس جنگ میں اپنی غیر جانبداری برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ اس پالیسی کے تحت میں ترکی یا رومانیہ پر حملہ کی گنجائش ہی نہیں رہتی ہے برطانیہ اور ترکی کے درمیان جو معاہدہ ہوا ہے اسکی سب سے اہم شرط یہ ہے کہ اگر ترکی پر کوئی یورپین طاقت حملہ آور ہو یا کسی یوروپین طاقت کی جارحانہ کارروائی سے بحیرہ روم میں جنگ چھڑ جائے اور ترکی کو اس جنگ میں شریک ہونا پڑے تو فرانس اور برطانیہ ترکی کی مدد کریگا۔ اس طرح اس معاہدہ کی رو سے ترکی، اٹلی کی طرف سے بھی محفوظ ہو گیا ہے۔

دوسرا اہم واقعہ امریکن سینٹ میں قانون غیر جانبداری کی ترمیم ہے۔ جس کی رو سے اب امریکہ نقد قیمت لے کر ہر فریق جنگ کے ہاتھ جنگی سامان فراہم کر سکتا ہے۔ اس ترمیم کو اتحادیوں کی فتح کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور کوئی شک نہیں کہ اس سے برطانیہ و فرانس کو جنگ میں غیر معمولی مدد ملے گی۔

مباحثہ

رحیم کے دوہے

از جگدیش بھٹناگر

زمانہ بابت دسمبر ۱۹۲۹ء میں "رحیم کے دوہے" کے عنوان سے جناب سید مقبول حسین احمد پوری کا جو قابل قدر مضمون شائع ہوا۔ اُس میں ہندی کے مسلمان شعراء کی خوب وکالت کی گئی ہے۔ مگر یہ لکھ دینا تو آسان ہے کہ "مسلمانوں نے ٹھیٹھ ہندی کی خدمت اُردو سے کہیں زیادہ کی ہے" لیکن اُس کو واضح کرنا مشکل ہے۔

بقول صاحب مضمون "امیر خسرو کے زمانہ میں اُردو کا نام تک کوئی نہ جانتا تھا ....." اگر اس صورت میں خسرو نے ہندی میں اشعار لکھے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ آج بھی بہت سے ہندو شعراء فارسی میں اشعار لکھتے ہیں اور اس سے پہلے بھی لکھتے رہے ہیں۔ منشی ہرگوپال تفتہ فارسی کے ایک مسلمہ شاعر تھے۔ رجحانِ طبیعت انسان کو سب کچھ سکھا دیتا ہے۔ سر رابندر ناتھ ٹیگور انگریزی کے نامور شاعر ہیں مگر اس سے یہ مراد لینا کہ "ہندوستانیوں نے ٹھیٹھ انگریزی کی خدمت اپنی قومی زبان سے کہیں زیادہ کی" صریحاً انصاف کا خون کرنا ہوگا۔

شیر شاہ نے اگر ہندی زبان سیکھی تو یہ بھی کوئی قابل ذکر بات نہیں ہے۔ اُن دنوں کے حالات و واقعات ایسے ہی تھے کہ وہ ہندی سیکھنے کیلئے مجبور تھا۔ جیسے اس وقت ہندوستان کے والیانِ ریاست انگریزی سیکھنے کے لئے مجبور ہیں۔ اور بیچارے بادل ناخواستہ سیکھتے ہیں۔ ہندی زبان کو دربار میں باقاعدہ باریاب کرنا بھی کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ آخر انگریزوں نے بھی تو ایک وقت اُردو کو اپنے دربار میں باقاعدہ باریاب کیا تھا۔ مگر یہ باریابی مصلحتاً تھی۔ اسی طرح مسلمان فرمانرواؤں نے بھی مصلحت وقت سے ہندی کو اپنے دربار میں باریاب کیا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ مذہبی رواداری نے ان فرمانرواؤں کو ہندی کے بڑے بڑے شاعروں کو سرفراز کرنے کے لئے مجبور کیا ہو۔ لیکن اس پر حیرانی کیوں ہے؟ اکبر کے حرم میں کئی راجپوتنیاں اور ہندو راجکماریاں تھیں تو کیا اس سے یہ اخذ کرلینا درست نہیں کہ اُس کے عہد میں حرم میں ہندی بخوبی رائج تھی۔

سید صاحب لکھتے ہیں کہ ہندی شعراء کو ہر قسم کی مراعات حاصل تھیں، مگر سید صاحب نے اُن شعراء کے نام نہیں بتائے۔ محض عبدالرحیم کا نام لے دینا کافی نہ ہوگا۔

سید صاحب لگے ہاتھوں اس کو بیان کر گئے ہیں کہ اُردو کی ابتدا کیونکر ہوئی؟ مگر اس سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ "ہندوؤں کی بہ نسبت مسلمانوں نے ہندی کی کہیں زیادہ خدمت کی۔"

ہمیں تسلیم ہے کہ سلطنت مغلیہ نے ہندی زبان کا ایک ایسا مسلمان شاعر دیا جس کی شاعری کا چرچا آج بھی ہندو گھرانوں میں ہے۔ لیکن اس سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا ہے کہ "مسلمانوں نے ٹھیٹھ ہندی کی خدمت اُردو سے کہیں زیادہ کی۔"

جواب

مضمون زیر بحث کے راقم سید مقبول حسین صاحب نے اعتراضات بالا کا مختصراً یہ جواب دیا ہے:-

ہندی سے میرا مطلب اُس زبان سے ہے جو عام ہندوستانی یعنی برہمن، چھتری، دیش، شودر، چنڈال، مچھ وغیرہ سب بولتے ہیں۔

زبان کی "خدمت" ارادتاً آجکل کے زمانہ سے پہلے کبھی نہیں کی گئی۔ آجکل زبان کی خدمت نے سیاسی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ ورنہ زبان خود پیدا ہوتی ہے اور اُس کا بولنا ہی اُسکی خدمت ہے۔

مُسلمانوں نے اِس ہندی کے لئے اپنی مادری زبان ترک کردی اور اسی کے ہو رہے یہ کیا کم خدمت ہے؟ اگرچہ اُنھوں نے یہ ارادہ کرکے فارسی نہیں چھوڑی کہ وہ ہندی کی خدمت کر رہے ہیں تاہم اُنھوں نے خدمت ضرور کی

ڈاکٹر رابندر انگریزی زبان کے شاعر نہیں ہیں۔ اگر اُنھوں نے اپنے بنگالی مضمون کا انگریزی میں ترجمہ کیا تو محض اس لئے کہ اُن سے اہلِ مغرب بھی روشناس ہو جائیں۔ چنانچہ اُنھوں نے بھی بظاہر انگریزی کی خدمت نہیں کی۔ مگر دراصل یہی خدمت ہے۔ اسی لحاظ سے ہر انگریزی دان ہندوستانی انگریزی کی خدمت کر رہا ہے اور واقعی ہم لوگ "انگریزی" کی خدمت اپنی نام نہاد قومی زبان سے کہیں زیادہ کر رہے ہیں)۔ اگرچہ یہ خدمت کسی خاص ارادے سے نہیں ہوتی ہے۔ بہر حال ہمارے حالات اور واقعات ہی خدمت کرا لیتے ہیں اور مجبوریاں ہی خالقِ تہذیب ہو جاتی ہیں۔

عہدِ اسلامی میں ہندو شعرا کو جو مراعات حاصل تھیں۔ ان کی تفصیل کے لئے علیحدہ تصنیف کی ضرورت ہے موقر ہمعصر "ہمایوں" لاہور میں "اُردو ہندی اور ہندو مسلمان" کے عنوان سے (مارچ ۱۹۳۹ء میں) ایک مضمون شائع ہوا ہے جس سے اِس سوال کا کچھ جواب ملتا ہے۔

اُردو کی ابتدا ایک تاریخی واقعہ ہے جسمیں جدت کی گنجائش نہیں۔ "ٹھیٹھ ہندی" دراصل کوئی زبان نہیں۔ البتہ ہمارے نام نہاد قوم پرست اب نئی ہندی ایجاد کر رہے ہیں۔

اِس مسئلہ پر اخبار پانیر نے اپنے ایڈیٹوریل مورخہ ۱۹ر مارچ ۱۹۳۹ء میں مزید روشنی ڈالی ہے۔ اور ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو نے بھی جامعہ عثمانیہ کے کنوو کیشن ایڈریس میں اس مسئلہ پر مفصل بحث کی ہے۔

(۲) حضرت آثر عظیم آبادی

از سید نصیر الدین حیدر رضوی ڈپٹی کلکٹر میمن سنگھ (بنگال)

صوبہ بہار کے مشہور ادیب سید رضا قاسم صاحب مختار کا گرانقدر مقالہ بعنوان "حضرت آثر عظیم آبادی" مطبوعہ رسالہ زمانہ ماہ جنوری ۱۹۳۹ء میری نظر سے گذرا۔ جسمیں موصوف نے تحقیق و تدقیق سے کام لے کر حضرت آثر مرحوم کے حالات قلمبند فرمائے ہیں۔ لیکن اُنھوں نے اس کی نسبت کچھ نہیں لکھا کہ جناب آثر مرحوم کو شعر و شاعری میں کس سے شرفِ تلمذ حاصل تھا؟

ممکن ہے کہ فاضل مضمون نگار کو اس ضمن میں مصدق طریق پر کوئی واقفیت حاصل نہ ہوسکی۔ جسکی بنا پر آپ نے اس کی نسبت کچھ لکھنا مناسب نہ سمجھا ہو۔ مجھے بھی اس امر کے متعلق کوئی علم نہ تھا۔ لیکن حال ہی میں

نواب سید نصیر حسین خاں خیالؔ عظیم آبادی مرحوم کی ایک تحریر نظر سے گذری۔ جس سے معلوم ہوا کہ حضرت اثرؔ عظیم آبادی مرحوم کو جناب شاہ الفت حسین صاحب فریادؔ عظیم آبادی مرحوم سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ چنانچہ ناظرین زمانہ کی آگاہی کے لئے متذکرہ تحریر کا اقتباس درج ذیل کیا جاتا ہے:۔

نواب خیالؔ مرحوم تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"...... شاہ الفت حسین فریادؔ میاں اشکیؔ کے بھانجے اور شاگرد تھے۔ فریادؔ کا مذاق شاعری دردؔ سے ملتا ہوا تھا اور زبان بھی وہی قدیم دہلوی۔ فریادؔ ایک عرصہ تک مرشد آباد میں وہاں نواب زادوں کے اُستاد اور اتالیق رہے۔ بعد کو مسند مرشد آباد کے سفیر ہوکر کلکتہ آئے، وہاں بھی زمانہ تک رہے۔ نواب امیر علی خان باڑھ والے اور شمس العلماء مولوی عبدالرف (کلکتہ) جناب شاہ صاحب کے نامی شاگردوں میں سے تھے۔ عظیم آباد واپس آنے پر شہر کے ممتاز لوگ حضرت کے شاگرد ہوئے۔ شادؔ مرحوم کے علاوہ جناب نواب شمس العلماء سید امداد امام صاحب اثرؔ کے ایسے اُستاد بھی فریادؔ ہی کے شاگرد ہیں۔ شاہ صاحب کے فرزند جناب سید ہمایوں مرزا صاحب عرصہ سے حیدرآباد دکن میں مقیم ہیں۔ پٹنہ کے مشہور فارسی گو شاعر و ادیب جناب خان بہادر احمد علی خاں صاحب فریادؔ کے نواسے ہیں۔ آپ کو تاریخ گوئی میں وہ ملکہ حاصل ہے۔ جس کی نظیر ملنا مشکل ہے .... الخ"

(۳) اُردو۔ہندی۔ہندستانی

ح۔ی۔ع صاحب کا جواب از حضرت جگرؔ بریلوی بی۔اے

ح۔ی۔ع صاحب نے اس بحث کے سلسلہ میں جو مضمون سپرد قلم فرمایا ہے اُسمیں چند جملے میری ذات سے متعلق ہیں۔ پہلے انھیں کے متعلق کچھ عرض کردوں۔

"ح۔ی۔ع" صاحب کی عبارت کے صاف معنی یہ ہیں کہ جگرؔ اس بحث کے بہانہ اپنی اُردو خدمات کی داد چاہتا ہے۔ جس کی کوئی قسط آپ بغیر ناپ تول کے دینا یا دلانا نہیں چاہتے۔ افسوس کہ "ح۔ی۔ع" صاحب نے اپنی دانست میں بات تو پتہ کی کہی تھی مگر ذرا ناپ تول کے نہیں کہی۔ اُردو دُنیا میں ذاتیات پر حملے کرنا کوئی نئی بات نہیں۔ لیکن ناظرین خود جانتے ہیں کہ اس قسم کے حملے کیا وقعت رکھتے ہیں۔ جگرؔ کی بحث تو یہ ہے کہ اُردو ادب ہندوؤں کی قومی خصوصیات سے یکسر خالی ہے۔ دوسرے اُردو میں ہندوؤں کو ہمیشہ پست و حقیر سمجھا گیا ہے، اور اُن کے مٹا دینے کی مسلسل کوششیں جاری ہیں۔ اِس بحث کی تائید میں ناقابل تردید دلائل اور ثبوت پیش کئے گئے ان کا جواب "ح۔ی۔ع" صاحب یہ دیتے ہیں کہ جگرؔ کو اس بحث سے اپنی اُردو خدمات کی داد مطلوب ہے۔ اِسکے معنی یہ ہوئے کہ کبھی کسی ہندو خدمتگذار اُردو کو ہندوؤں کی حق تلفی کے متعلق زبان کھولنے کی ہمت نہ کرنا چاہئے ورنہ اُس کا یہ فعل ذاتی خدمات کی داد طلبی پر محمول ہوگا۔ اس منطق کا کوئی جواب ممکن نہیں۔ البتہ اِس سے فاضل مضمون نگار کی نیک نیتی اور خوش فکری پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

اب سے پہلے اُردو نے ہرگز وہ اہمیت حاصل نہیں کی تھی جو اب آ سے حاصل ہو رہی ہے اور قبل اِسکے کہ

مُلک کے لئے کوئی خاص زبان تسلیم کی جائے اُردو کے متعلق میرے معروضات پر ارباب حل وعقد کو اور نیز اُردو کے علمبرداروں کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا ہوگا۔ زبان کے متعلق جو مسائل میں نے پیش کئے ہیں' وہ یہ کہہ کر ٹالے نہیں جا سکتے کہ اُن کے پردے میں میری یا کسی دوسرے شخص کی داد طلبی کی خواہش کام کر رہی ہے

مسائل زیر بحث کے متعلق "ح - ی - ع" صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ:-

"بات دراصل یہ ہے کہ آزاد نے محض اُن شاعروں کو اپنے تذکرے میں جگہ دی ہے جو اُس کے نزدیک اُستاد گذرے ہیں۔"

مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی نے بھی آزاد کی حمایت میں یہی عذر پیش کیا تھا۔ اُس کا جواب میرے نومبر ۱۹۴۳ء والے مضمون میں شائع ہوچکا ہے اور اخترؔ کے متعلق خود آب حیات سے اقتباسات پیش کرکے ثابت کردیا گیا ہے کہ یہ کہنا قطعی غلط ہے کہ آزاد نے اُنھیں شعراء کو اپنی کتاب میں جگہ دی' جو اُن کے بلند معیار پر اُترے۔ اس کے متعلق مزید ثبوت درکار ہو تو یہ بھی حاضر ہے۔

آزاد کو میرؔ اور سوداؔ کے ساتھ مظہرؔ کا نام لیتے ہوئے تامل ہوتا ہے۔ ضاحکؔ کے متعلق آزاد لکھتا ہے۔ "دیوانؔ اب تک نظر سے نہیں گذرا جس پر کچھ رائے ظاہر کی جائے۔ خواص میں جو کچھ شہرت ہے اُن ہجوؤں کی بدولت ہے جو سوداؔ نے اُن کے حق میں کہیں۔"

اب انصاف پسند حضرات غور فرمائیں کہ میرؔ و سوداؔ کے ساتھ مظہرؔ کا نام لینے میں خود آزاد کو تامل ہے اور ضاحکؔ کے متعلق گو وہ کوئی رائے قائم نہیں کرسکے۔ پھر معلوم نہیں اُن کو آب حیات میں کیوں جگہ دی گئی؟ اور کہنے والے کیونکر کہتے ہیں کہ آزاد نے صرف اُنھیں شعراء کا تذکرہ لکھا ہے جو اُن کے بلند معیار پر پورے اُترے ہیں یا جو اُستاد تھے۔ یہ ہٹ دھرمی نہیں تو اور کیا ہے؟

لیکن بفرض محال یہ تسلیم بھی کرلیا جائے تو کیا ہندوؤں میں کوئی اُستاد کسی دور میں نہیں گذرا جسکو آزاد اپنی بارگاہ میں جگہ دیتے۔ اب اگر ہر دور کے ہندو مشاہیر کو اُن کی اُستادی کی شہادت اور ثبوت کیساتھ پیش کرتا ہوں تو یہ سلسلہ نامتناہی ہوجائے گا۔ اس لئے میں نے کسی پچھلے مضمون میں متقدمین میں سے تمثیلاً صرف ایک دیوانہؔ کی بلند پایگی کے ثبوت میں مجموعۂ نغز مرتبہ حکیم قدرت اللہ سے ایک عبارت پیش کی تھی مگر "ح - ی - ع" صاحب نے اُس پر توجہ نہیں فرمائی۔

میر حسنؔ نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ "رائے سرب سنگھ المتخلص بہ دیوانہؔ شاعر زبردست فارسی است اُستاد ریختہ گویان لکھنؤ۔ چنانچہ میاں حسرتؔ حیدر علی حیرانؔ واکثر دیگراں شاگرد ایند۔"

مولوی محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شیروانی نے بھی تذکرہ میر حسنؔ کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ "میر حسنؔ کے تذکرے میں بھی بہت ہندو شعراء کا ذکر ہے جنمیں سے بعض جگت اُستاد تھے مثلاً رائے سرب سنگھ دیوانہ......"

غرض آب حیات سے پہلے تقریباً تمام تذکرہ نویسوں نے کم سے کم دیوانہؔ کو جگت اُستاد تسلیم کیا ہے۔ لیکن آزاد اس جگت اُستاد کو بھی اپنی محفل میں شرف باریابی نہیں بخشتے۔ اور اخترؔ، مضمونؔ، ضاحکؔ، مظہرؔ وغیرہ کے مقابلہ میں

لہ آب حیات صفحہ ۱۳۱ مطبوعہ نولکشور پریس لاہور ۱۹۰۷ء ۔ لہ ایضاً صفحہ ۱۷۲

قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔ ان واقعات کے روبرو میرا یہ اعتراض کہ آزاد نے ہندؤں سے اسی طرح بچنے کی کوشش کی ہے، جیسے کوئی وبائی امراض سے بچتا ہے۔ کسی کے اٹھائے اٹھ نہیں سکتا۔

میں نے خود اپنے ابتدائی مضمون مطبوعہ ماہ اپریل ۱۹۳۶ء میں اعتراف کیا ہے کہ آب حیات سے پہلے بہت سے تذکروں میں ہندو شعرا کا ذکر ہے۔ نہیں معلوم کہ "ح۔ی۔ع" صاحب نے اس کے دہرانے میں کیا مصلحت سمجھی کہ میر تقی میر، میر حسن، مصحفی، شیفتہ اور قدرت اللہ کے تذکروں میں ہندو بھی موجود ہیں؟ میرا التماس تو یہ ہے کہ قدیم تذکروں کے بعد جو دور شروع ہوا۔ اسمیں مسلمانوں کو اردو کا واحد موجد و معمار مان کر بحث کی گئی ہے اور محمد حسین آزاد نے جو بے انصافی کا طریقہ اختیار کیا۔ وہی بعد کے تذکرہ نویسوں کے لئے شمع ہدایت بن گیا۔ چنانچہ آٹھ کتابوں میں جو آب حیات کے بعد کی تصنیف ہیں ہندؤں کی سخت حق تلفی کی گئی ہے آب حیات و شعر الہند، سیر المصنفین سے کافی و وافی شہادتیں پیش کر چکا ہوں۔ ان کے بعد عبدالقادر سروری صاحب نے اپنی کتاب جدید اردو شاعری میں چار دور قائم کئے ہیں اور پہلے دور میں پینتالیس[۴۵] جلیل القدر شعرا گنائے ہیں۔ مگر انمیں ہندو ایک بھی نہیں۔ دوسرے دور میں بھی کوئی ہندو نہیں۔ تیسرے دور یعنی "درمیانی زمانہ" میں صرف شاد ایک ہندو نظر آتے ہیں۔ چوتھے دور (یعنی عصر حاضر) میں سرور جہان آبادی اور چکبست صرف دو ہندوؤں کا نام لیا گیا ہے۔ حالانکہ اس کتاب میں بہت سے ایسے حضرات شامل ہیں۔ جن پر کبھی شاعر ہونیکا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا اور جن کو سوا ناظم اور متشاعر کے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔

آب حیات، شعر الہند، جدید اردو شاعری تین کتابوں سے مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر تھوڑا تھوڑا سا مسالہ میں نے اپنے معروضات کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ اب اس کے بعد جو تصنیف "ح۔ی۔ع" صاحب تجویز فرمائیں اسی کا جائزہ لے کر مزید ثبوت کے طور پر کچھ عرض کیا جائے۔

میں نے اپنے کسی پچھلے مضمون میں عرض کیا ہے کہ جہاں ہندؤں کی ادبی فضیلت کے متعلق کسی نے بحث چھیڑی فوراً معیار کا ہوا پیش کر کے ان کو مرعوب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چنانچہ "ح۔ی۔ع" صاحب نے بھی بار بار اپنے مضمون میں معیار کا آلۂ حرب استعمال کیا ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس معیار کے بنانے اور قائم کرنے والے بھی وہی لوگ ہیں۔ جنھوں نے اردو ادب سے ہندوانی عناصر خارج کر دینا مناسب سمجھا۔ مگر کیا ایسے معیار کو اس زبان کے ادب کی صحیح کسوٹی کہا جا سکتا ہے جو ہندو مسلم دونوں قوموں کی زبان بتائی جاتی ہے؟ ادب عبارت ہے کسی قوم کی تمام خصوصیتوں کی تفسیر و تشریح سے۔ اس لئے اگر اردو ادب اس کلیہ سے مستثنےٰ نہیں تو ہندوانی خصوصیات کا فقدان یقیناً اس کے ادبی معیار کے ناقص و نامکمل ہونے کی دلیل ہے۔ لیکن اگر رفع حجت کے خیال سے یہ معیار بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی اسمیں پورے اترنے والے ہندو ہر دور میں ہوئے ہیں لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ ادب کے اجارہ داروں اور خود ساختہ خداوندان معیار نے ان کو مٹا ڈالا اور جو مٹانے پر بھی نہیں مٹے، ان کو کم حقیقت اور پست ثابت کرنے کی کوشش برابر جاری ہے۔

ہندؤں کی تہذیب کی اردو ادب میں نمایندگی کے متعلق "ح۔ی۔ع" صاحب نے سودا، ساغر اور

[۱] اگر جدید اردو شاعری میں آزاد، حالی کے ہمراہ نذیر احمد اور شرر بھی شمار کئے جا سکتے ہیں تو سرشار سب سے پہلے اسکا مستحق ہے۔ جگر

اقبال کے تین چار ایسے شعر پیش کئے ہیں جنہیں ارجن، ساون، راون، جمنا کا نام آگیا ہے۔ اور دو چار ایسی نظمیں بتائی ہیں جو بعض مسلم شعرا نے نانک، سوامی رام تیرتھ، رام وغیرہ پر لکھی ہیں۔ اس کی نسبت میں عرض کرونگا کہ اگر ایسے تین چار شعر یا بفرض محال سَو پچاس شعر یا دس بیس نظموں سے ہندو قوم کی تہذیب و معاشرت کی کافی نمائندگی ہوجاتی ہے تو یا تو ہمارے دوست ہندو قوم کی خصوصیات سے واقف نہیں اور اگر واقف ہیں تو یقیناً زبان و قوم کے باہمی رشتہ سے ناواقف ہیں۔ کسی قوم کی زبان اُس قوم کی تمام جسمانی، دماغی اور روحانی خصوصیات کی ترجمان اور محافظ ہوتی ہے۔ انہیں سے ایک ایک شعبہ میں ہندوؤں کی فتوحات اور کارنامے متمدن دُنیا کے لئے ہمیشہ باعث فخر اور قابل تقلید رہیں گے۔ ان پر ہر شعبہ میں دفتر کے دفتر لکھے جانیکے بعد بھی کچھ نہ کچھ کمی رہ جائے گی۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ نہیں اُردو کے سَو پچاس ہی شعر یا دس بیس نظموں سے ہی ان تمام خصوصیات کی کافی نمایندگی ہوجاتی ہے اور بہ حیثیت قوم ہندوؤں کے حقوق اُردو زبان ادا کردیتی ہے تو اُس کی عقل و ہمت پر سوا آفرین کے اور کیا کہا جائے۔

طلسم فریب

اس پرچہ میں مندرجہ بالا عنوان سے جو رنگین تصویر ہدیۂ ناظرین کی گئی ہے وہ اُسوقت کی ہے جبکہ راون نے سیتا ہرن کے لئے فریب کا جال اس طرح بچھایا تھا کہ اپنے ایک راکشس کو ایک نظر فریب ہرن کی صورت میں اس مقام پر بھیجا تھا جہاں سری رامچندر جی، لکشمن جی اور سیتا جی بن میں مقیم تھے۔ سیتا جی کو اس مصنوعی طلسمی ہرن کی ادائیں کچھ اسقدر پسند آئیں کہ اُنھوں نے رامچندر جی سے اُسکے زندہ گرفتار کرنے کی درخواست کی۔ چنانچہ وہ اُس کے تعاقب میں گئے۔ اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئے تو تھوڑی دیر بعد جنگل کی اوٹ سے "ہائے لکشمن! ہائے سیتا!!" کی آواز آئی۔ لکشمن جی اُسے رامچندر جی کی آواز سمجھ کر بے قرار ہوگئے اور بھائی کی مدد کو چل دئے۔ سیتا جی تنہا رہ گئیں۔ اور راون کو ان کو لے جانیکا موقعہ مل گیا۔

Insurance Vade Mecum.

اس کتاب کو جو تیرہ سال سے برابر سالانہ شائع ہو رہی ہے۔ مسٹر ایس۔ ایل۔ تُلی نے بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے مرتب کیا ہے۔ موصوف نے اسمیں ملک کی مختلف بیمہ کمپنیوں کی سرگرمیوں کا حال بیان کردیا ہے جنمیں ہندوستانی اور غیر ملکی دونوں قسم کی کمپنیوں کے متعلق تمام ضروری معلومات بہم پہونچائی گئی ہیں۔ اور ۱۵۳ ہندوستانی اور ۲۹ غیر ملکی بیمہ کمپنیوں کی شرح پریمیم بھی درج کردی ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے اعداد و شمار بھی دئے گئے ہیں۔ جو انشورنس کمپنیوں کے ایجنٹوں کے لئے خاص طور پر کارآمد ہوں گے۔ بہرحال بیمہ کمپنیوں سے دلچسپی لینے والے حضرات کے لئے یہ کتاب بہت سی مفید معلومات سے پُر ہے۔ ملنے کا پتہ: انشورنس پبلسٹی کمپنی لیمیٹیڈ ۱۳۳ میکلوڈ روڈ، لاہور

زمانہ

جلد ۷۳ — نومبر ۱۹۳۹ء — نمبر ۵

ہندی شاعری

(از پنڈت ونشی دھر ودّیا النکار اسسٹنٹ پروفیسر سنسکرت و ہندی، جامعۂ عثمانیہ)

ہندی شاعری سے ہماری مراد اُس زبان کی شاعری سے ہے جو راجپوتانہ، مالوہ، ممالک متحدہ (یو۔پی) بہار اور صوبۂ متوسط (سی۔پی) کے اوپر کے علاقوں میں مقامی طور پر بولی جاتی ہے۔ ان تمام جگہوں میں ہندی بولی کی بہت سی صورتیں ہیں، لیکن اِن میں ایک ایسی صورت بھی ہے جو ادبی سانچہ میں ڈھل گئی اور جس میں سالہا سال تک شاعری ترقی کرتی رہی۔ راجپوتانے کی بولی کو ڈنگل، یو۔پی ہندوستان کے مغربی علاقوں کی بولی کو پنگل یا برج بھاشا۔ اودھ اور سی۔پی کے اوپر کے علاقوں کی بولی کو پوربی اور بہار کی بولی کو بہاری کہا جاتا ہے۔ ڈنگل پنگل، پوربی اور بہاری، اِن تمام بولیوں میں ہندی شاعری کی تخلیق ہوئی ہے۔ اور اِسی لئے ہندی شاعری کی سرزمین بہت وسیع ہوگئی ہے۔ اِن بولیوں میں بھی پنگل یعنی برج بھاشا اور پوربی ہندی میں ہندی کی شاعری زیادہ ہے۔ ہندی کی ادبی زبان کو بنانے میں اِن تمام مقاموں کی بولیوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔

ہندی شاعری میں سب سے پُرانی جو شاعری ملتی ہے وہ ڈنگل یعنی راجپوتانہ کی ہندی ہے، اِس زبان میں زیادہ تر "راسو" اور "ویرگیت" یعنی Ballads لکھے گئے ہیں، اِن راسو اور ویرگیتوں میں راجاؤں کی لڑائی، بہادری اور اِن کے مختلف کارناموں کا بیان کیا گیا ہے۔ اِن نظموں کے لکھنے والے راجاؤں کے درباری شاعر چارن یا بھاٹ ہوتے تھے۔ یہ درباری شاعر جہاں محبت اور دوسرے رسوں سے بھری نظمیں

کہتے تھے وہاں ان کی بہادری کے کارناموں کو بھی قلمبند کرتے تھے۔ خاص خاص موقعوں پر وہ ایسی شاعری کرتے تھے جس سے مُردہ دلوں میں بھی جان آجاتی تھی۔ جس طرح 'مارو' وغیرہ باجے لڑائی میں جوش پیدا کرتے تھے، اسی طرح یہ نظمیں بھی بہادرانہ جوش پیدا کرتی تھیں۔ ان راسوں میں کئی راسو جیسے "کھمان راسو" "وِسیل دیو راسو" "پرتھوی راج راسو" وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ ویرگیتوں میں "آلھا اُودل" کے گیت بہت مشہور ہیں۔ یہ گیت شمالی ہندوستان میں برسات کے دنوں میں بادلوں کے گرج کی تال پر آج بھی بڑے چاؤ اور شوق سے گاؤں گاؤں میں گائے جاتے ہیں۔ ان راسو اور ویرگیتوں کی بُنیاد پر یہ کہا جاتا ہے کہ ہندی شاعری کا جنم لڑائی کے میدانوں میں ہوا۔ ان ویرگیتوں کو راجپوتانہ کے گاؤں کے گیتوں کی شکل میں اکٹھا کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اِنکی سیدھی سادی بے ساختہ بولی میں کچھ ایسی بجلی بھری ہوئی ہے کہ ڈرپوک سے ڈرپوک آدمی کے دل میں آناً فاناً بہادری کے جذبات اُبھر آتے ہیں۔

یہ ہندی شاعری کا پہلا تاریخی پہلو ہے۔ اس کے بعد جو ہندی شاعری کی تخلیق ہوئی اُس میں زیادہ تر سنتوں اور مہاتماؤں کا حصّہ ہے۔ وہ ہر جگہ گھومتے پھرتے تھے۔ اس لئے ان کی بولی میں ہندی کی بہت سی بولیوں کا پُٹ مِل گیا ہے۔ لیکن اس میں آہستہ آہستہ پُوربی بولی کو زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ اس کو ایک نہایت اونچے معیار پر ادبی شکل میں پیش کرنے والوں میں مہاتما اور مہاکوی کبیرداس تھے۔ کبیرداس نے اپنی بولی کے بارے میں کہا ہے:-

"میری بولی پوربی تاہی نہ چینھے کوئے"

یعنی میری بولی پوربی ہے، اِس بات کو کوئی نہیں پہچانتا۔

کبیرداس کی بولی روزمرّہ کی بولی ہے۔ بہت سادی بہت آسان لیکن اس میں جن خیالات کو پیش کیا گیا ہے وہ بہت گہرے ہیں۔ ان کے خیالات اور شاعری کا زبان اور سوسائٹی ہر دو پر بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ خصوصاً سوسائٹی پر اس قدر گہرا کہ ان کی شاعری محض ایک مذہبی تلقین کی حیثیت سے دیکھی جانے لگی، اور اُس کا ادبی پہلو نظرانداز ہوگیا۔ ان کی شاعری کے مذہبی شکل میں بدل جانے کا سبب اُن کے خیالات کی پاکیزگی اور بلندی ہے۔ اُن کی زبان بھی ایسی بے ساختہ اور سیدھی سادی ہے کہ آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ اس کے اس طرح مذہبی شکل میں بدل جانے اور زبان کی سادگی کی وجہ سے (جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے) شاعری کا پہلو نظر سے بہت کچھ اوجھل ہوگیا ہے۔ لیکن درحقیقت اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے کہ کبیر کے مقابلہ کا شاعر جس کے کلام میں اتنی سادگی، لطافت، جذبات کی گہرائی اور خیالات کی بلندی ہو، ہندی نے دوسرا نہیں پیدا کیا۔ ان کی شاعری کی عظمت امتدادِ زمانہ

کے ساتھ دن بدن بڑھتی جارہی ہے۔ "دوہا" جو کہ ہندی کی ایک مشہور صنف ہے کبیر داس سے پہلے بھی لکھا جاتا تھا، لیکن کبیر داس نے اِس میں وہ خوبی اور کمال پیدا کردیا کہ "دوہے" میں ایک خاص حسن اور نیاپن آگیا۔ اِن کے بعد "دوہے" کی مقبولیت لگاتار بڑھتی چلی گئی اور آج "دوہا" ہندی شاعری کی ایک خاص شان ہے۔ دوہے جتنے چھوٹے ہوتے ہیں، معانی اور مطالب میں اُتنے ہی وسیع اور گہرے ہوتے ہیں۔ مختصر ہونے کی وجہ سے یہ زبان پر جھٹ چڑھ جاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ "دوہا" ہندی کی ایک بے مثل چیز ہے۔

کبیر داس کے بعد کبیر کے طرز پر بہت سے شاعروں نے لکھا لیکن وہ رتبہ کسی کو حاصل نہ ہوسکا کبیر کا رنگ سب پر چڑھ گیا لیکن کبیر کا رنگ کوئی پیدا نہ کرسکا۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ایک شاعرِ اعظم کی حیثیت سے یعنی ادبی نقطۂ نظر سے کبیر کی جو قدر اور عزت ہونی چاہیئے تھی وہ نہیں ہوئی۔ اس کے بہت سے وجوہات ہیں۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا جائیگا ادبی نقطۂ نظر سے بھی کبیر کی شاعری کی قدر اور عزت بڑھتی چلی جائیگی۔ اِس کا کچھ اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر ربیندر ناتھ ٹیگور نے کبیر کی سو نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ اُنھوں نے پروفیسر کھشتی موہن سین کے ذریعہ کبیر کے اکٹھے کئے ہوئے گیتوں کی بُنیاد پر کیا ہے جو اُنھوں نے بنگالی میں شائع کئے تھے۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ہندی شاعری کی زبان کا مرکز بدل گیا، اور برج بھاشا کی باری آئی۔ چنانچہ برج بھاشا کے ذریعہ ہندی زبان میں جو مٹھاس، لطافت، حُسن اور نغمہ پیدا ہوا آج بھی ہندوستان میں اس کا جواب نہیں ہے۔ برج بھاشا کی وجہ سے ہندی بھاشا میں ایک لوچ پیدا ہوا اور اُس میں ایسا سنگیت تھا جس نے ایک نئی موسیقی کو جنم دیا۔ اسی موسیقی کی وجہ سے ہندی کے گانے ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیل گئے۔

ہندی کی ڈنگل بولی میں کچھ کرختگی تھی، پوربی زبان میں کچھ ایسا سیدھاپن تھا جو علمی زبان کی خصوصیتوں میں ہے۔ لیکن اس برج بھاشا میں ایک عجیب نزاکت تھی، ایک عجیب لُطف تھا، ایک عجیب حیرت انگیز چلبلاپن تھا اور اس کی ہر ایک ادا میں کچھ ایسا انوکھا موہنی منتر تھا کہ اسے جس نے سُنا وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

برج بھاشا کے لُطف اور مٹھاس کی سینکڑوں کہانیاں اور لطیفے مشہور ہیں۔ اسی مٹھاس اور لُطف کی وجہ سے ہندی کی مختلف بولیوں میں برج بھاشا کو ایک خاص درجہ حاصل ہوا جو کسی دوسری مقامی زبان یا بولی کو نہ ملا۔ چنانچہ برج بھاشا ہندی میں ایسی چھاگئی کہ ہر جگہ اسی کا بول بالا ہوگیا۔

یہاں تک کہ ہندی شاعری سے مراد برج بھاشا کی شاعری لی جانے لگی۔ اب بھی برج بھاشا کی شاعری کا ایسا گہرا اثر ہے کہ ہندی شاعروں میں آج ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا ہے جس کی رائے میں ہندی شاعری برج بھاشا میں ہی ہونی چاہیئے۔

برج بھاشا میں بڑے بڑے صاحبِ کمال شاعر ہوئے ہیں، لیکن ان میں سُور داس کا درجہ سب سے اونچا ہے۔ یہ متھرا کے رہنے والے تھے، اس لئے یہ اُن کی اپنی ہی بولی تھی۔ انھوں نے ہندی میں بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔ ان کی مشہور کتاب "سور ساگر" ہے۔ سور داس کے پدوں میں جو مٹھاس لوچ اور سنگیت ہے وہ لاجواب ہے۔ بہت سے نقاد سور داس کو ہندی کا سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں۔ اُن کی نظموں میں ایسی کسک بھری ہوئی ہے اور ان میں بے بسی اور لاچاری کے جذبات اس قدر خوبصورتی سے نمایاں ہوئے ہیں کہ اس کا دل پر گہرا اثر پڑتا ہے۔

بہر حال برج بھاشا کی مقبولیت یہاں تک بڑھی کہ مغل دربار میں بھی اس کی بڑی عزت ہوئی۔ بہت سے امیر امراء اور وزیر برج بھاشا میں شاعری کرتے تھے، جن میں کئی بہت اچھے شاعر تھے۔ ان میں عبدالرحیم خانخاناں، راجہ بیربل، راجہ ٹوڈرمل، ابوالفیض وغیرہ کے نام خاص طور پر مشہور ہیں۔ یہ خود بھی شاعر تھے اور ان میں یہ بھی خوبی تھی کہ دوسرے شاعروں کی قدر کرنے والے تھے۔ سچی قدر ہونے پر شاعری ہمیشہ پھلنے پھولنے لگتی ہے۔ یہ قدر دانی یہاں تک بڑھی کہ ایک دوہے پر خوش ہو کر جے پور کے مہاراجہ مان سنگھ نے ایک لاکھ روپیہ انعام میں دیدیے تھے۔ کہتے ہیں کہ عبدالرحیم خانخاناں نے کوی گنگا پرشاد کو اس کے ایک شعر پر خوش ہو کر چھتیس ۳۶ لاکھ روپیہ دیا تھا۔ کچھ ہو ان باتوں سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ برج بھاشا کی بڑی قدر ہوئی اور اس کی ترقی ہوتی چلی گئی۔

برج بھاشا کی اس مقبولیت کا ہندی شاعری پر یہ اثر ہوا کہ اس کے بعد جس کسی مقامی بولی میں بھی شاعری کی گئی برج بھاشا کا اثر اُس پر حاوی رہا۔

سُور داس کے بعد جس شاعرِ اعظم کا نام بہت مشہور ہوا وہ تلسی داس "تھے"، یوں تو تلسی داس کی شاعری کی زبان پوربی ہے لیکن اس میں برج بھاشا بہت ملی ہوئی ہے۔ تلسی داس نے اپنی رامائن سے ہندی شاعری میں ایک نئی جان ڈال دی۔ اگر مقبولیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ہندی میں تلسی داس سے بڑا کوئی شاعر نہیں ہوا۔ آج بھی ہندوستان میں ہندی شاعری کی کتابوں میں جتنی تلسی کرت رامائن پڑھی جاتی ہے اتنی اور کوئی کتاب نہیں پڑھی جاتی۔ تلسی داس کی رامائن ہندوستان کے شہروں اور گاؤں میں اس شوق سے گائی اور سُنی جاتی ہے کہ اب وہ لوگوں کی روزانہ زندگی کا

ایک خاص جزو بن گئی ہے۔

اگر خیالات کی بلندی، زبان کی سادگی اور قوتِ تخلیق کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ہندی شاعری میں کبیرداس کا کوئی ثانی نہیں ہے، اور اگر زبان کی مٹھاس، لطافت اور موسیقی کو پیش نظر رکھا جائے تو سورداس بے نظیر ہیں۔ اور اگر مقبولیت کے نقطۂ خیال سے دیکھا جائے تو گوسوامی تلسی داس کو کوئی شاعر نہیں پہونچ سکتا۔

ہندی کی مختلف مقامی بولیوں میں برج بھاشا نے ایک طرح کی یکسانیت پیدا کر دی جب تلسی داس کی رامائن عوام میں مقبول ہوئی تو اس سے زبان کی یکسانیت کو اور مدد ملی۔ جوں جوں اِس زبان میں یکسانیت آتی گئی بہت سی مقامی بولیوں نے مل کر ایک ایسی ادبی شکل اختیار کی جو معیاری ہوگئی اور ہر جگہ شاعری میں استعمال ہونے لگی۔

معیاری شکل اختیار کرنے سے اس میں پختگی بھی آگئی۔ ہندی شاعری کی زبان کی پختگی اور شستہ پن ہندی کے آخری زمانہ کے شاعروں کے کلام میں زیادہ واضح نظر آتا ہے۔ کیشوداس دیوکوی، متی رام بھوشن وغیرہ شاعروں کی زبان میں اِس کا ثبوت ملتا ہے۔ زبان کی یہ شستگی اور بانکپن "بہاری لال" کی شاعری میں کمال کے درجہ کو پہونچ جاتی ہے

اِس طرح ہندی کی شاعری ایک اسٹیج سے دوسرے اسٹیج پر بڑھتی ہوئی لگاتار ترقی کرتی چلی گئی۔ ہندی کی شاعری کا زمانہ اندازاً دسویں صدی سے شروع ہوا اور آج تک جاری ہے۔ ہزاروں شاعر پیدا ہوئے اور اپنے کلام سے زبان کو سنوارتے اور مالا مال کرتے گئے۔

ظاہر ہے کہ زمانہ کے تبدل و تغیر کے ساتھ زبان میں بھی تبدیلیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ آج کل کا زمانہ نثر کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ نثر کی زبان میں زیادہ یکسانیت کی ضرورت ہے۔ اِس لئے زبان میں یکسانیت کا آنا لازمی تھا۔ اب بھی ہندی میں اِن سب بولیوں کا استعمال ہوتا ہے، لیکن ہر جگہ ایک ہی ادبی زبان کا استعمال ہونے لگا ہے۔ نثر اور نظم کی ایک ہی زبان ہو گئی ہے، اِس کا ایک ہی روپ قائم ہوگیا ہے۔ اِس بولی کو کھڑی بولی کہتے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ پہلے اس بولی کا ہندی نظم میں استعمال نہیں ہوتا تھا، ضرور ہوتا تھا لیکن بہت کم۔ اب اس کا استعمال روز بروز بڑھتا جاتا ہے ہندی کے شاعر اس میں خوبی اور کمال پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چنانچہ بہت سی عمدہ اور اعلیٰ پایہ کی نظمیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں لیکن ابھی تک یہ کھڑی بولی وہ بلندی اور مقبولیت حاصل نہیں کر سکی جو پرانی ہندی کی شاعری نے حاصل کی تھی۔ مگر ہم سمجھتے ہیں کہ وہ دن زیادہ دور نہیں ہے جب کھڑی بولی کی شاعری بھی اُس بلند پایہ حسن و کمال کو حاصل کریگی اور تب یہ بھی اسی طرح مقبول ہو جائیگی جیسی کہ پرانی ہندی کی شاعری ہوئی تھی۔

کیلاش پربت

(از پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ ناشاد، ایم۔اے)

رات دن پیشِ نظر ہے برف کا منظر جہاں
دیوتاؤں کے لئے قدرت کا ہے مندر جہاں

بادلوں میں پربتوں کی چوٹیاں مستور ہیں
بادۂ حق سے جہاں ارض و سما مخمور ہیں

جس جگہ ہے پربتوں کے شاہ کا جھنڈا گڑا
تاج ہے الماس کا سر پر ہماچل کے دھرا

جس جگہ رہ کر فضا میں دل کو آتا ہے سُرور
جس جگہ کیفِ نظر ہے قدرتِ حق کا ظہور

جس جگہ لطفِ سماعت راگ سیّاروں کا ہے
جس جگہ آسودہ منزل کارواں تاروں کا ہے

جس جگہ جو شئے نظر آتی ہے سیم اندام ہے
کالعدم سورج کی کرنوں سے تپش کا نام ہے

روشنی مہتاب کی ہے جس جگہ نکھری ہوئی
اور بوئے عنبریں ہر سمت ہے بکھری ہوئی

نورِ عرفاں رات دن رہتا ہے جس جا آشکار
گلشنِ قدرت میں ہر دم ہے جہاں فصلِ بہار

جس جگہ بھولے سے اِنساں کا قدم جاتا نہیں
اور فرشتوں کے سوا کوئی جہاں آتا نہیں

طائرِ فردوس نے جس جا بنایا آشیاں
اور پہنچ سکتا نہیں انسان کا وہم و گماں

رحمتِ باری کے ہیں دریا نکلتے جس جگہ
رات دن ہیں نور کے چشمے اُبلتے جس جگہ

مست ہو کر جس جگہ بادِ صبا ہے گھومتی
جس جگہ اُٹھکر زمیں ہے آسماں کو چومتی

جس جگہ دھرتی سے ہر دم ہمکنار آکاش ہے
جس جگہ شِو جی کا آسن ہے وہاں کیلاش ہے

غالب اور رشک

از مسٹر اعجاز انصاری

یوں تو "رشک غیر" اردو شاعری کا ایک مستقل باب ہی ہے اور ہمارے شعرا میں ولی اور میر سے لے کر اقبال اور جگر تک کون اس جذبۂ انسانی کے اظہار کرنے والوں کی فہرست میں جگہ پانے کا مستحق نہیں؟ چنانچہ مرزا غالب بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ لیکن سطور ذیل میں میں قارئین کو مرزا غالب کے اشہب تخیل کی اُن ندرت آفریں جولانیوں سے لطف اندوز ہونے کی دعوت دینا چاہتا ہوں جو عام طور سے جمہور کے موافق ہونیکے باوجود اپنی انفرادی حیثیت کی آئینہ دار ہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ غالب اکثر "رشک غیر" کو رسماً بھی باندھتے ہیں۔ اور اپنی ایجاد آفرینی سے زیادہ کام نہیں لیتے تاہم اپنی طرز ادا سے اپنی انفرادیت ضرور قائم رکھتے ہیں۔ مثالیں ملاحظہ ہوں

عشق میں بیداد رشک غیر نے مارا مجھے کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمار دوست

مصرعۂ اولیٰ تو جمہور ہی کی ترجمانی ہے لیکن مصرعۂ ثانی۔ اگرچہ بیمار دوست تھا" لیکن "کشتۂ دشمن ہوں" غالب ہی کے لئے مخصوص تھا۔ اور یہی مصرعہ اُن کی انفرادیت پر دال ہے ؎

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

پہلے تو جمہور کا ہم زبان ہو کر "رشک غیر" پر آمادہ ہو جانا عام بات تھی لیکن "عقل" نے "اس بے مہر" کی عالمگیر بے مہریوں کا جس مخصوص انداز سے انکشاف کرتے ہوئے رشک کو تسلی دی ہے وہ غالب ہی کا خاص حصہ تھا اور یہی وہ مقام ہے جہاں اُن کی انفرادیت کا پتہ چلتا ہے ؎

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

غالب کا محبوب رقیب سے اپنے ربط وضبط رکھنے کو غالب کی وفاداری کے امتحان سے تعبیر کرتا ہے، اس پہ رشک ہونا تو کوئی نئی بات نہیں۔ لیکن موصوف نے محبوب کی اس رقیب دوستی کو جس خاص انداز میں اپنے ستانے کا ذریعہ قرار دیکر امتحان محبوب سے بچنے کی تدبیر نکالی ہے وہ غالب ہی کے لئے تھا۔

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

محبوب کا غیر سے ملنا اور عاشق کا جذبۂ رشک سے مغلوب ہو کر اس کو معشوق کے لئے رسوائی کا باعث

بتانا تو عام بات تھی۔ لیکن محبوب کے مقولہ "کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی" کا جس رشک آموز طرز سے مصرعۂ ثانی میں مذاق اُڑایا گیا ہے وہ غالب ہی کے لئے مخصوص تھا ؎

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

غیروں کا محبوب کی محفل میں شراب پینا غالب کیلئے سوہانِ روح ضرور ہے اور دوسرے شعرا بھی ایسی رقیب نوازی سے خوش نہ ہوں گے لیکن مصرعہ ثانی میں غیروں کی اس نوازش کے مقابلہ میں اپنے کو محفل میں بلائے بھی نہ جانے کو "پیغام کا لب تشنہ" کہنا سوائے غالب کے کسی دوسرے کو نصیب نہ ہوا۔

یا میرے زخم رشک کو رسوا نہ کیجئے یا پردۂ تبسم پنہاں اُٹھائیے

محبوب کا پوشیدہ طور سے رقیب کو دیکھ کر متبسم ہونا غالب کے لئے باعث رشک ہے۔ اُن کا محبوب اِن کی اس "رشک پروری" سے جل کر رقیبوں سے ان کی شکایت کرتا ہے۔ غالب کو معشوق کا یہ رویہ پسند نہیں آتا۔ اور یہ اپنے مخصوص انداز میں "یا پردۂ تبسم پنہاں اُٹھائیے یا میرے زخم رشک کو رسوا نہ کیجئے" کہہ کر نہ صرف معشوق کو یہ جتلا دیتے ہیں کہ وہ محبوب اور رقیب کے "در پردہ ربط نہانی" سے باخبر ہیں بلکہ یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ جب تک رقیب پر یہ پوشیدہ عنایتیں صرف کی جائیں گی عاشق کو رشک ہونا ضروری ہے۔

اوپر کے چھ سات شعروں میں تو "رشک غیر" پھر بھی جمہور ہی کے موافق ظہور پذیر ہوا ہے۔ اب دیکھئے کہ غالب کے دل و دماغ پر خصوصیت کے ساتھ اِس قسم کے رشک نے اور کیا کیا نئے نئے تاثرات کئے ہیں۔ اُن کو یہ تو یقین ہی ہے کہ وہ "بے مہر کسی کا آشنا نہیں" اِس لئے رقیب کو اُسکی "ہمدمی آسان نہیں" لیکن وہ یہ بھی گوارا نہیں کرتے کہ "رقیب آرزوئے دوست" کا بھی حامل ہو سکے ؎

نہیں گر ہمدمی آساں، نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے نہ دی جاتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

معمولی قسم کے عشاق، معشوق کی زبان سے رقیب کی شکایتیں سن کر خوش ہوں گے۔ غالب چونکہ معمولی قسم کے لوگوں سے بہت بلند ہیں، اِس لئے وہ معشوق کی اس قسم کی حرکت سے خوش نہیں بلکہ رنجیدہ ہوتے ہیں، وہ یہ پسند نہیں کرتے کہ اُن کا محبوب اُن کے رقیب کا نام بھی اپنی زبان پر لائے، خواہ "بر سبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو" ؎

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ ہر چند بر سبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو

ذرا اور دیکھئے۔ کہتے ہیں ؎

رات کے وقت مے پئے ساتھ رقیب کو لئے آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

عام شعرا رشک کے اِس درجہ کے نام سے بھی واقف نہیں اُن کے لئے تو معشوق کا آجانا ہی ہزار نعمت ہے، تا کہ رات کا وقت ہو اور محبوب اپنی میگوں آنکھوں کو دختِ رز کی وساطت سے جامِ صہبا کی دو آتشگی

بخش کر آجائے۔ غالب ان تمام کیف افزا تخیلات سے پناہ مانگتے ہیں اور محض اس وجہ سے کہ یہ رقیب کی محبت میں ہوتا ہے

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوف بد آموزی عدو کیا ہے

"بد آموزی عدو" سے کون نہ پناہ مانگے گا؟ لیکن غالب کو اس کی پروا نہیں، رشک ہے تو صرف اس بات پر کہ "بد آموزی عدو" رقیب کیلئے ان کے محبوب سے ہم سخن ہونے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

:(۲):

یہاں تک تو غالب کے "رشک غیر" کا اندازہ دیکھا۔ اب ذرا دیکھئے کہ غالب کا رشک رفتہ رفتہ کن ارتقائی منازل سے گذرتا ہوا کس درجہ تک پہونچ جاتا ہے۔ حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں:-

صبا بہ لطف بگو آں غزال رعنا را
کہ سر بکوہ و بیاباں تو دادہ ما را

اور ہمارے اکثر شعرا انھیں کے ہمنوا ہیں۔ جلیل کہتے ہیں:-

ہماری بیخودی کا حال گر پوچھیں تو اے قاصد
یہ کہنا ہوش اتنا ہے کہ تم کو یاد کرتے ہیں

لیکن ذرا غالب کو دیکھئے۔ وہ قاصد سے بھی رشک کرتے ہیں۔ اس رشک ہی کا نتیجہ ہے کہ وہ "مسرت پیغام یار" سے بھی چنداں محظوظ نہیں ہوتے۔

گذرا اسد مسرت پیغام یار سے
قاصد پہ مجھ کو رشک سوال و جواب ہے

حالانکہ ان کو معلوم ہے کہ یہ "سوال و جواب" انھیں کی وکالت ہے۔

قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے
اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

وہ قاصد کو محبوب کے ہاتھوں قتل ہوتا ہوا دیکھ کر اس کی جان بخشی کی سفارش کرتے ہیں۔ لیکن اس لئے نہیں کہ ان کو قاصد کے احسانات کا پاس ہے بلکہ اس لئے کہ وہ یہ نہیں دیکھ سکتے کہ ان کے ہوتے انکا محبوب اپنے نازک ہاتھوں سے کسی دوسرے کو شہید ناز کرے۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

غالب نہ صرف اس ندیم سے کبیدہ خاطر ہیں جس نے ان کے لئے ایک ایسا نامہ بر تلاش کیا جو ع

بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

کے مصداق ہونے کے لئے مجبور ہوگیا۔ بلکہ وہ نامہ بر کے لئے "سلام کہیو" کے جذبات پیش کرتے یعنی پناہ مانگتے ہیں۔ حالانکہ اور شعرائے اردو مثلاً شاہ حاتم آبرو قاصد کو اپنا ہمدرد، رازدار اور بہی خواہ خیال کرتے ہیں۔

میرا پیغام وصل اے قاصد
کہیو سب سے اسے جدا کر کے

قاصد تو خیر محبوب کے قرب جسمانی سے بہرہ اندوز ہونے کی وجہ سے معرض رشک میں آہی جاتا ہے۔ غضب

تو یہ ہے کہ غالب اپنے ہمنشین اور رازدار سے بھی اس بات پر رشک کرتے ہیں کہ اُن کو تسکین اور تسلی دینے میں وہ اُن کے محبوب کا نام کیوں لیتا ہے ؎

تعزیت کا گمان گذرے ہے میں رشک سے گذرا کیونکر کہوں لو نام نہ اُن کا مرے آگے

حالانکہ مومن ایسا عشقِ مجازی کا مردِ میدان جس کو کہ فطرتاً اس قسم کے رشک سے متاثر ہونا چاہیئے، اس راستہ سے کافی دور ہے ؎

اُس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں اے ہمنشین نزاکتِ آواز دیکھنا

ممکن ہے کہ ہمنشین "ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا" سے اسقدر متاثر ہوا ہو کہ اُن کے محبوب کے نادیدہ عاشقوں میں شمار کئے جانے کا متمنی ہوگیا ہو۔ لیکن معشوق کے نام رقیبوں کی طرف سے خط لکھنے والے لوگ تو اس قربِ روحانی سے بھی قطعی بہرہ اندوز نہیں ہوسکتے۔ تاہم اِن کے رشک کی یہ کیفیت ہے کہ غالب یہ بھی پسند نہیں کرتے کہ اُن کے علاوہ کسی دوسرے کی تحریر بھی اُن کے محبوب کے زیبِ نظر ہوسکے ؎

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

(۳)

قاصد پر رشکِ سوال وجواب ہونا۔ ندیم سے محبوب کے نام لینے کو منع کرنا۔ دشمن کو آرزوئے دوست کا دیا جانا۔ یہ تمام باتیں تو اس لئے باعث رشک ہیں کہ ان صورتوں میں قاصد۔ ندیم اور دشمن تینوں کسی نہ کسی طور سے حظِ روحانی حاصل کرنے کا موقع پاتے ہیں اور بیچارے غالب کو یہ سب کہاں نصیب؟ اُن کا اُٹھنا اور اُٹھ کے پاسباں کے قدم لینا بھی اُن کی "شامت" کا باعث ہوجاتا ہے۔ لیکن غالب صرف اسی رشک پر اکتفا نہیں کرتے۔ وہ تو یہ بھی گوارا نہیں کرتے کہ اُن کا معشوق ظلم بھی اُنکے علاوہ کسی اور پر صرف کرے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رشک اور محبت کی بدگمانیوں کے زیرِ اثر وہ تمام دُنیا کو اپنا رقیب خیال کرتے ہیں اور دُنیا کے کسی بھی فردِ بشر کو مظالمِ معشوق سے بھی بہرہ اندوز ہوتا نہیں دیکھ سکتے۔ سطورِ ذیل میں اُن کے چند اشعار تمام دُنیا کے لوگوں سے رقیبانہ رشک قائم کرلینے کی دلیل میں پیش کئے جاتے ہیں ؎

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک بلائے جاں ہے ادا تری اک جہاں کے لئے

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو کاش کہ تم مرے لئے ہوتے

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھکر

اس سلسلہ کی دو دلچسپ کڑیاں اور ملاحظہ ہوں:۔

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب کسی پر راہ چلتے چلتے عاشق ہو گئے اور شاید "ایک بار" بر سر راہے گاہے" اُس سے ملنے کا شرف حاصل کر لینے سے بھی محروم نہیں رہے۔ لیکن اس کے بعد عشق کے پینگ بڑھے، اور دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ ہمہ وقت "ہم ہوں اُن کے سامنے اور وہ ہمارے سامنے"۔ مکان کا پتہ کہیں اُس سے پوچھ چکے تھے۔ مکان تلاش کرنے نکلے۔ اب بلا کسی سے دریافت کئے ہوئے کہ فلاں محلہ میں فلاں شخص کس مکان میں رہتا ہے۔ اُس زمانہ میں کسی اجنبی کا مکان کیسے ملتا۔ (سائن بورڈ کی فراوانی اور اُس کا جا و بیجا استعمال تو آجکل ہوا ہے، غدر سے قبل یا اس پاس کب رہا ہوگا) یہاں انکو رشک کے باعث لوگوں سے محبوب کے گھر کا پتہ پوچھنا بھی پسند نہ آیا کہ مبادا کوئی دوسرا اِس دربارِ محبوبیت تک رسائی حاصل کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نام تو لیتے نہیں، ایک ایک آنے جانے والے سے یہی پوچھتے پھر رہے ہیں۔ "کہ کہاں جاؤں کدھر کو جاؤں"۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ اُن کا محبوب کرایہ کے مکان میں رہنے کا خوگر ہو۔ اور اُس نے حال ہی میں مکان بدلا ہو، اس لئے یہ اُسکے نئے مکان کی جستجو میں "کدھر کو جاؤں اور کہاں جاؤں" کا وظیفہ پڑھ رہے ہوں۔ بہرحال شعر کے مبالغہ سے قطعِ نظر کر کے اُن کے اشہبِ رشک کی جدت روی قابلِ داد ضرور ہے۔

اپنی گلی میں مجھکو نہ کر دفن بعدِ قتل میرے پتہ سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

عشاق میں سر فہرستِ اُنکا نام شاعری میں "ہر چہ فخر تست آں ننگ من است" ان کا دعویٰ اور اُسمیں شک نہیں کہ وہ اس دعویٰ کے "مدعی" نہیں بلکہ مستحق ہیں) پھر غالب کے نام سے کون نہ واقف ہوگا؟ یہی سبب ہے کہ معشوق کی گلی میں قبر بنوانے سے ڈرتے ہیں۔ اُن کو اس بات کا رشک ہے کہ کہیں اُن کے پتہ سے لوگ اُن کے محبوب کے گھر کا پتہ نہ پاجائیں حالانکہ تقریباً اور تمام شعرائے اردو "غبار رہِ محبوب" اور "مدفونِ کوچۂ قاتل" ہونے کی تمنا کیا کرتے ہیں۔ یہ ہیں اُن کے جذبۂ رشک کی جدت طرازیاں!

:(۴):

یہ سب تو خیر رقیب ہونے کی صلاحیت رکھنے کے ساتھ ساتھ اِس قابل بھی ہیں کہ عاشق ان سے رشک کرے۔ لیکن غالب کے بلند عشق کی گہرائیوں کا ہمیں اُسوقت پتہ چلتا ہے جبکہ وہ نہ صرف جاندار بلکہ اُن بے جان چیزوں پر بھی رشک کرتے ہیں، جن کو قربِ محبوب حاصل ہے ؎

تیرے جواہرِ طرفِ کُلہ کو کیا دیکھیں ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

لعل و گہر کے طالع کی بلندیوں کو دیکھنا رشک سے خالی نہیں۔ عاشق کی قسمت اِتنی پست کہ محبوب کے

درِ ناز تک اُس کی رسائی بھی دشوار ہے اور بقول غالب شاید رضوان دربار کا دربان ہوتا تو بعد یک عمرِ ورع دربار تک رسائی بھی ممکن تھی۔ لیکن یہاں تو ساری عمر صرف دعا ہو گئی اور دروازے تک پہونچنے کا بھی موقع نہ ملا۔ یہی سبب ہے کہ اگر کبھی حُسنِ اتفاق سے درگاہِ محبوبیت میں بار مل گیا ہے تو غالب کو جتنی دعائیں یاد تھیں سب صرفِ دربان ہو گئیں۔ یہ تھی اُن کی قسمت اور وہ ہے لعل و گہر کی قسمت جن کو ہر وقت رخسارِ یار کا قرب حاصل ہے۔ یہی سبب تو تھا کہ غالب ستارہ گوہر فروش کے اوج پر بھی رشک کئے بغیر نہ رہ سکے ؎

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا   کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

پھر دیکھئے "اہلِ تمنا" کا ایک طرف یہ عالم ہے کہ اُن کے لئے "شمشیر کا عُریاں ہونا عیدِ نظارہ ہے"۔ تاہم غالب اِس حال میں بھی اپنی اس خوش قسمتی پر کہ اُن کا محبوب اپنے ہاتھوں سے قتل کرنے والا ہے، ناز کرنا بھول جاتے ہیں۔ اور ان کو اِس بات کا رشک شروع ہو جاتا ہے کہ آخر تلوار اُن کے ہاتھوں سے کیوں مس ہو رہی ہے، جبکہ اُن کی جبینِ نیاز اپنے سیکڑوں تڑپتے ہوئے سجدوں کے ساتھ ساتھ محبوب کی خاکِ پا سے مس ہونے کے شرف سے محروم ہے ؎

آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے   مرتا ہوں اُس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

غالب کوہِ طور اور برقِ تجلّیٔ ایزدی کا قصہ سُنتے ہیں اور جوشِ رشک سے بیتاب ہو جاتے ہیں۔ یہ عاشق تھے اور یہ برق اُن کا حصہ تھی۔ اُن پر گرتی تو یہ اِس کی قدر کرتے اور اس کی تیزیوں کی تاب بھی لا سکتے۔ بھلا ایک مٹی کا تودہ جو روزِ ازل ہی میں "بارِ امانت" اُٹھانے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا، برقِ جمالِ الٰہی سے کیا محظوظ ہوا ہوگا۔ اور وہ اِس کی ان تیزیوں کو کہ جسکے باعث "رگِ سنگ سے لہو ٹپک پڑتا" کب برداشت کر سکتا تھا

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر   دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سنگِ درِ یار کا محبوب سے جو قرب ہے اور صبح و شام جس طرح وہ محبوب کے پائے ناز سے مس ہوا کرتا ہے وہ ظاہر ہے اور اُس کے مقابل میں غالب ایسے "رقیق القلب" عاشق کا اُس سے بُعد بھی عیاں ہے پھر اُن کو اس پتھر پر بھی رشک نہ آئے تو کیا ہو؟ چنانچہ کہتے ہیں ؎

دائم پڑا ہوا تیرے در پر نہیں ہوں میں   خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

اور یہی تو تھا جس نے غالب کو لبِ شکایت وا کرنے کی ضرورت محسوس کرا دی ؎

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ   رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

ساری زندگی اُن کا معشوق اُن کے زخمِ دل کو کُرید کُرید کر اپنے ناخن سُرخ کیا کرتا تھا اور باوجودیکہ یہ فعل دردافزا تھا۔ تاہم تسلی بخش بھی تو تھا کہ وہ "قتالِ جہاں" سوائے اُن کے اور کسی سے سامانِ آرائش طلب

نہیں کرتا۔ لیکن آخر یہ بھی انسان تھے۔ دل کے زخم کا مدتوں ہرا رہنا اور پھر اُن کی زندگی۔ یہ کیسے ممکن تھا؟ جان بحق تسلیم ہو گئے۔ معشوق نے اُن کی عدم موجودگی میں اپنے ناخن سُرخ کرنے کے دوسرے ذرائع اختیار کئے۔ مہندی پیسی گئی اور ہاتھ رنگے گئے۔ غالب بھلا اس کو کب برداشت کر سکتے تھے، جوشِ رشک سے قبر میں بھی تڑپ اُٹھے کہ ہائے وہ ناخن جو ہمیشہ سوائے میرے خونِ دل کے اور کسی دوسرے سامانِ آرائش کے ممنونِ منت نہ تھے آج حنا کے محتاج ہو گئے ہیں اور اس طرح حنا کو بھی قربِ محبوب حاصل ہو گیا ؎

خوں ہے دل خاک میں احوالِ بُتاں پر یعنی — اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

(اس موقع پر ایک غلط فہمی کی طرف اشارہ کر دینا بھی بیجا نہ ہوگا۔ اکثر معزز شارحین دیوان غالب "محتاج" کو "محروم" کا مرادف سمجھ بیٹھے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اُنھوں نے غالب کے اس لطیف معنی کو غلط فہمی کی قربان گاہ پر بڑی بے رحمی سے ذبح کر ڈالا ہے۔ ان حضرات نے ؎

درخورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا — نگہ ناز ہے سُرمہ سے خفا میرے بعد

کی معاونت سے غالب کے "خوں ہے دل خاک میں" کی علت معشوق کا "سوگ میں ترک حنا کر دینا قرار دیدیا ہے۔)

:(۵):

آئیے، اور اب غالب کے جذبۂ رشک کے ایک نادر الوقوع پہلو پر بھی نظر ڈال لیجئے اور انصاف کیجئے کہ یہ مردِ میدانِ سخن واقعی اپنے اور ہم مشربوں سے منفرد اور ممتاز ہے یا نہیں؟ رقیب کے قربِ محبوبی پر جلنا۔ قاصد کی درگاہِ محبوب کی رسائی پر رشک کرنا۔ لعل و گہر اور عطر و حنا کے اَوجِ طالع کو رشک آلود نظروں سے دیکھنا' یہ سب تو پھر بھی کچھ نہیں اور میدانِ شعر میں ان تمام مضمونوں سے کم خصوصیت باندھ دینا تو پھر بھی حیزِ امکان سے باہر نہ تھا۔ لیکن یہ خود کردۂ رشک تو اپنی ذات سے بھی رشک کرتے ہیں۔ اور یہ میدان اُنھیں اور صرف اُنھیں کے ہاتھ رہا ہے ؎

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے — میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن — وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے — مرتے ہیں و لے اُن کی تمنا نہیں کرتے

اور ذرا فطرت کا ستم ظریفی تو دیکھئے کہ غالب پہلے تو ؎

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر — دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

اس لئے کہہ گئے تھے کہ اپنے ظرف کو کوہِ طور کے ظرف سے بہتر سمجھتے تھے اور یہ بھی خیال تھا کہ برقِ جمالِ یار کی تاب صرف ہی لا سکتے ہیں اور کوئی نہیں۔ چنانچہ یہ خیال درست نکلا "رُخِ یار" اُنکے سامنے ہوا اور "تابِ رُخِ یار"

سے کوہ طور کی طرح نہیں جلے مگر ان کے رشک نے انھیں اِس حال میں بھی خوش نہ رکھا۔ اور اب یہ طرفہ تماشہ ہوا کہ اُن کو اپنی "طاقتِ دیدار" پر رشک آنے لگا ۔

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھکر جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھکر

———:(۶):———

رشک کی انتہا تک پہونچنے کے لئے اب ایک ہی درجہ باقی رہ گیا ہے۔ میر صاحب کہہ گئے ہیں ع

پہونچا جو آپ کو تو میں پہونچا خدا کے تئیں

اور "ماعرف نفسہ فقد عرف ربہ" بھی اسی بات کا اعلان کرتا ہے کہ اپنی ذات کو پہونچنا (سمجھ لینا) خدا تک پہونچنے (خدا کے سمجھ لینے) کے مرادف ہے۔ غالب نے اپنی ذات سے تو رشک کرنے سے گریز نہ کیا۔ اب صرف ایک ذات باقی رہ گئی تھی خدا کی۔ انھوں نے خدا سے بھی رشک کیا اور اس کو جس خوبی سے نبھایا ہے وہ اہلِ ذوق کی باریک بین نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ سُنئے ۔

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب وہ کافر جو خُدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

———

فکرِ لطیف

(از خواجہ عبد اللطیف شمیم بھیردی)

مغنّی! ساز اُٹھا، موسم کا کچھ نذرانہ ہو جائے
ترا نغمہ فروغِ محفلِ رندانہ ہو جائے

گھٹا اُٹھی، ہوا بہکی فضائیں رقص میں آئیں
اِس عالم میں ذرا شغلِ مے و مینا نہ ہو جائے

سرودِ سرمدی بن کر وہ مجھ پر چھائے جاتے ہیں
مرا سازِ نظر پھر زندگی آرا نہ ہو جائے

نہ چھیڑ اے لذتِ آسودگی کچھ روز جینے دے
علاجِ زخمِ دل سے عاشقی رُسوا نہ ہو جائے

جنونِ شوق کو منظور تجدیدِ تمنّا ہے
مزا ہے حسنِ بے پروا اگر دیوانہ ہو جائے

کوئی دھیمے سُروں گاتا ہے میرے دل کے پردوں میں
سنبھل ذوقِ خودی محشر کہیں برپا نہ ہو جائے

حجاب اُٹھنے لگے ہیں، مرگِ ذوقِ ناتمامی ہے
قریبِ دوست ہو جاؤں کہیں ایسا نہ ہو جائے

مکافاتِ سکوں ناآشنائی ہے یہی ساقی
گناہِ زندگی، غرقِ خم و مینا نہ ہو جائے

شمیم اُن کی نگاہِ ناز کو اِس سے نہیں مطلب
کوئی دیوانہ ہو جائے کوئی فرزانہ ہو جائے

———

دریا کا منظر

(از حضرت محمود اسرائیلی)

آئینۂ دوشیزۂ قدرت ہے یہ دریا یا نقرۂ تابندہ کا لبریز خزانا
تنویر سرِ طور
اسرار سے معمور
یا عکسِ رخِ حور

گل ہنستے ہیں بیساختہ دریا کے کنارے کس ناز سے کرتے ہیں یہ ہر سمت اشارے
ٹہنی کو جھکا کر
پتّوں کو اُٹھا کر
عارض کو دکھا کر

رومال ہلانے لگیں پانی پہ ہوائیں اور لینے لگیں چہرۂ دریا کی بلائیں
موجوں کے کھُلے لب
جنبش میں ہوئیں اب
اور گانے لگیں سب

کچھ اُن کی زبانوں پہ ہیں مبہم سے فسانے داؤد کے وہ شیریں و جاں بخش ترانے
گائے کوئی جیسے
خیّام کی لے سے
اور رومی کی نے سے

زربفت کی پوشاک ہی ہر گل کے بدن پر سورج نے بٹھایا ہے اِسے اپنی کرن پر
کس درجہ چمک ہے
رگ رگ میں جھلک ہے
ہر پتّی دھنک ہے

عکسِ آب میں پھولوں کا ہے او جھوم رہے ہیں جُھک جُھک کے یہ ساحل کا قدم چوم رہے ہیں
دیکھا ہے تہِ آب
اک منظرِ نایاب
اک گلشنِ شاداب
پانی میں جو کچھ پودے کھڑے کانپ رہے ہیں وہ سینۂ دریا کا عمق ناپ رہے ہیں
مرغاب ہیں جنباں
گرداب ہیں رقصاں
جو شئے ہے وہ شاداں
افکارِ جہاں یاس فزا او غم انگیز قدرت کے مناظر ہیں سکوں بخش و طرب خیز
گو صورتِ مدہوش
آبادی سے روپوش
ہر وقت ہیں خاموش

غزل

(از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش ایم۔ اے)

مہمل نہیں ہے عشق ستودہ صفات ہے عقدہ کشائے رازِ حیات و ممات ہے
رتبہ گناہِ عشق کا آدم سے پوچھیے سجدے میں تھے فرشتے ابھی کل کی بات ہے
کیونکر خوشی خوشی نہ اُٹھائیں غم و الم سر پہ ہمارے پیرِ طریقت کا ہات ہے
رنج و محن سے بھاگ نہ عیش و طرب پہ جا ناپائدار رنج، خوشی بے ثبات ہے
صبحِ شبِ فراق ہوئی ہے اجل کی شام سویا ہے نیند موت کی، عاشق کی رات ہے
ہر اہلِ دل کا سُن کے بڑھا ہے مذاقِ عشق لذت چشیدۂ غمِ اُلفت کی بات ہے
مدہوش کا کلام ہے کیونکر اثر نہ ہو
راز آشنائے دردِ محبت کی بات ہے

ڈاکٹر نذیر احمد بحیثیت نثر نگار

از حضرت وصل بلگرامی

شمس العلماء ڈاکٹر مولوی حافظ نذیر احمد کی ضلع بجنور کے ایک گاؤں رہڑ میں ۱۸۳۶ء میں پیدائش بتائی جاتی ہے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے اپنے والد مولوی سعادت علی صاحب سے حاصل کی اور اس کے بعد بجنور کے ڈپٹی کلکٹر مولوی نصر اللہ خاں صاحب سے، پھر دلی آکر مولوی عبد الخالق صاحب کے شاگرد ہوگئے۔ دلی اُن کے لئے ایک ایسی جگہ تھی۔ جہاں اُنکے ذہن اور دماغ کو نشو و نما کا اچھا موقع ملا۔ مولوی عبد الخالق صاحب نے ہونہار دیکھ کر اپنے بیٹے مولوی عبد القادر صاحب کی صاحبزادی سے اُن کی شادی کردی۔ اُس وقت سے انھوں نے دہلی کو اپنا مسکن بنالیا۔

۱۸۵۴ء تک انھوں نے دہلی کالج میں عربی تعلیم حاصل کی۔ اور وہیں سے فارغ التحصیل ہوئے۔ اُس کے بعد ملازمت کا خیال ہوا۔ پہلی ملازمت اُن کی کنجاہ ضلع گجرات کے ایک اسکول کی مدرسی سے شروع ہوتی ہے۔ لیکن ذاتی قابلیت کی وجہ سے زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ کانپور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوگئے۔ پھر الہ آباد آئے اور وہاں انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے۔ الہ آباد آکر انھوں نے مختلف ذریعوں سے انگریزی پڑھنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ اتنی ترقی کی کہ بی۔ اے والوں سے مقابلہ کرنیکی ہمت ہوگئی۔ اور انگریزی کتابوں کے مطالعہ کو برابر جاری رکھا۔ چنانچہ غالباً جب ۱۸۶۱ء میں انڈین پنل کوڈ یعنی مجموعہ تعزیرات ہند کے ترجمہ کی ضرورت ہوئی تو اوروں کے ساتھ ان کو اس خدمت میں شامل کیا گیا' اس کام کو انھوں نے اس خوبی سے کیا کہ اُن کو تحصیلدار مقرر کردیا گیا۔ اس کے بعد ضابطۂ فوجداری کے ترجمے کے صلے میں ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹر کا عہدہ حاصل ہوا۔ اور یہ محکمہ بندوبست کے افسر ہوگئے اسی زمانہ میں علم ہیئت کی ایک انگریزی کتاب کا بھی ترجمہ کیا جس پر ایک ہزار روپیہ انعام ملا۔

اب آپ کی شہرت دُور دُور پھیل گئی تھی۔ چنانچہ سالار جنگ بہادر نے گورنمنٹ ہند سے آپ کی خدمات حاصل کرلیں اور وہاں بھی یہ افسر بندوبست ہوکر گئے۔ یہاں ایک بات اور عرض کرنے کے قابل ہے کہ ڈاکٹر کو علم حاصل کرنے کا شوق ابھی تک تھا۔ چنانچہ اسی زمانہ میں قرآن شریف حفظ کیا۔

جس سے اُن کی غیر معمولی ذہانت کا پتہ چلتا ہے۔ حیدر آباد میں عہدہ اور تنخواہ کے لحاظ سے آپ نے نمایاں ترقی کی۔ ملازمت ختم کرنے کے بعد دہلی آ گئے۔ جس کو آپ نے اپنا وطن قرار دے لیا تھا اور عمر کا باقی حصہ تالیف و تصنیف اور ملک و قوم کی خدمت میں صرف کر دیا۔

آخر کار ایک نہایت کامیاب اور مشغول زندگی بسر کرنے کے بعد ۳ مئی ۱۹۱۲ء کی شب میں دُنیا کو چھوڑ کر اُردو ادب اور دُنیائے ادب کو اپنا سوگوار بنا گئے۔

یہ ہے اس شخص کی زندگی کا مختصر سا خاکہ جس نے صرف اپنی ذاتی قابلیت سے دُنیا میں عزت کی جگہ پیدا کر لی اور اپنی متعدد تالیف و تصنیف کی بدولت ادب اُردو میں اپنا نام چھوڑ گیا۔

اس کے علاوہ انھوں نے اپنی ادبی سرگرمیوں کے لئے ایک وسیع میدان منتخب کیا تھا جس میں ناول و حکایات مذہبی اور اخلاقی کتابیں، قانون، فلسفہ، تاریخ اور ترجمے بھی آجاتے ہیں۔

اُن کی طباعی سب سے زیادہ اُن کے ناولوں اور کہانیوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس ذیل میں اُنکی کتابیں مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، ابن الوقت، محصنات، ایامیٰ، رویائے صادقہ اور منتخب الحکایات سب سے زیادہ مشہور ہیں۔

اس سلسلے کی سب سے پہلی کتاب مراۃ العروس ہے جس کو اُنھوں نے ڈپٹی کلکٹری کے زمانہ میں تصنیف کیا تھا۔ اسمیں نہایت صاف اور سادی زبان استعمال کی گئی ہے اور عورتوں کے محاورات اور بول چال کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اسمیں دکھایا گیا ہے کہ ایک جاہل اور بے پڑھی لڑکی شریف خاندان میں آکر کیونکر دُرست ہو گئی۔ یہاں اُن تمام معاشرتی واقعات کو دکھایا گیا ہے جو شادی کے بعد لڑکیوں کو پیش آتے ہیں۔ اسمیں پُرلطف طریقے سے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ایک لڑکی دوسرے گھر میں جاکر اپنی اپنے شوہر اور اُس کے خاندان کی زندگی کیونکر کامیاب بنا سکتی ہے۔ یہ ایک ایسی دلچسپ کتاب ہے کہ جو عورت پڑھی ہوئی نہیں وہ بھی اسے شوق سے سُنتی ہے۔ حالانکہ یہ کتاب ایک مسلمان گھرانے کی زندگی کا نمونہ ہے۔ لیکن ہندو مسلمان دونوں میں اس کی بڑی قدر ہوئی، کیونکہ اس کی غرض صرف درستیِ اخلاق ہے۔ ابھی تک اور آیندہ بھی جو کتابیں لکھی گئیں، اُنمیں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے عشق و عاشقی کے مضامین درج کرنا ضروری سمجھا گیا تھا۔ لیکن یہ کتاب اس امر کی کافی دلیل ہے کہ اِن چیزوں کے بغیر بھی دلچسپی قائم رہ سکتی ہے۔ کتاب کی مقبولیت یہ کیا کم ہے کہ اس کا ترجمہ ملک کی اکثر دیسی زبانوں میں ہو چکا ہے۔

اس قسم کی دوسری کتاب "بنات النعش" ہے۔ اسمیں بھی عورتوں کی تعلیم کی طرف توجہ دلائی گئی ہے

پھر لطف یہ ہے کہ مفید و دلچسپ معلومات اور سائنس کے مسئلے بات چیت کی شکل میں سمجھائے گئے ہیں۔

آپ کا تیسرا ناول جس کو آپ کا شاہکار سمجھنا چاہئے، توبۃ النصوح ہے۔ اس کتاب میں یہ زور دیا گیا ہے کہ شروع میں اولاد کی نگہداشت کی سخت ضرورت ہے۔ بگڑے ہوئے لڑکے بڑے ہوکر کبھی سیدھی راہ پر نہیں آتے۔

"ابن الوقت" میں ایک ہندوستانی کا قصہ ہے' اس کو غدر کے زمانہ میں کچھ خدمتوں کے صلے میں ایک بڑا عہدہ مل جاتا ہے اور وہ اپنے ہندوستانی بھائیوں کی سوسائٹی چھوڑ کر یوروپین لوگوں کیساتھ مل جاتا ہے۔ لیکن یہ سب یوروپین دوست چلے جاتے ہیں۔ تو وہ پھر اپنے لوگوں میں آنیکی کوشش کرتا ہے مگر اسے کوئی نہیں پوچھتا۔

محصنات یا "فسانۂ مبتلا" میں تعداد ازدواج کی خرابیاں دکھائی ہیں۔ مبتلا ایک شریف وضع نوجوان ایک بری عورت کے پھندے میں پھنس کر تباہ ہو جاتا ہے۔

ایامیٰ میں انھوں نے بیوہ عورتوں کی شادی پر بہت زور دیا ہے اور ہندوستانی مسلمانوں' کی رسم کو غلط اور غیر اسلامی ثابت کیا ہے۔

رویائے صادقہ میں مسلمانوں کے چند عقائد کی بحث ہے اور ان کو اپنی رائے اور اپنے خیال کے مطابق ثابت کرنا چاہا ہے۔

اسی طرح آپ کی اس قسم کی اور تصنیفات بھی ہیں جو کسی نہ کسی نتیجے کی غرض سے لکھی گئی ہیں۔ ان کا مقصد ملک و قوم کو فائدہ پہونچانا ہے۔

ناول نویس ہونے کے علاوہ ڈاکٹر صاحب مذہبی حیثیت سے بھی قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کی کتاب امہات الامۃ جو ایک عیسائی کی کتاب امہات المومنین کے جواب میں لکھی گئی ہے، اسکی گواہ ہے۔

آپ کا سب سے بڑا مذہبی کارنامہ قرآن شریف کا اردو ترجمہ ہے جس کو آپ نے کئی عالموں کی مدد سے تیار کیا۔ اسی زمانہ میں اس کی اصلاح کے لئے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ باوجود اس کے اس دور میں بہت مشہور اور نئے تعلیم یافتہ انگریزی دان مسلمانوں میں خصوصیت کے ساتھ مقبول ہوا۔ سب سے بڑی خصوصیت اس میں یہ ہے کہ اس کی زبان بہت سادہ اور بامحاورہ ہے۔

آخر عمر میں آپ نے اور کئی مفید کتابیں لکھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب کو ماننا اور کہنا پڑا کہ ڈاکٹر صاحب کیا بحیثیت مؤلف، کیا بحیثیت مصنف اور کیا بحیثیت مترجم ایک خاص درجہ ضرور رکھتے ہیں۔ آپ نے اسکول کے کورس اور بچوں کے لئے جو مفید کتابیں لکھی ہیں وہ آپ کی یادگار ہیں۔

ملازمت سے کنارہ کشی کے بعد آپ کو لکچر دینے کا بھی بہت موقع ملا۔ آپ کی تقریریں پُرزور اور معلومات کا خزانہ ہیں۔ جنمیں ظرافت کی چاشنی اور بھی لوگوں کو محظوظ کرتی ہے۔ مجھ کو بھی غالباً ۱۹۰۵ء میں "حمایت اسلام لاہور" کے جلسہ میں آپ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے اور آپکی زبان سے کچھ سُننے کا موقع ملا ہے۔

ہمارے ڈاکٹر صاحب' جب بوڑھے ہوئے تو جوانی کے مشغلوں سے دلچسپی شروع کی یعنی شاعری نے بھی بہت گدگدایا اور شعر کہنے لگے۔ ہم کو اسوقت آپ کی شاعری سے بحث نہیں کرنا ہے۔ اسلئے ہم اس کو یہیں پر چھوڑتے ہیں۔ یہاں ہمیں اُن کو بحیثیت نثر نگار پیش کرنا ہے اسی لئے ہمنے انکی صرف نثر کی تصنیفات کا تذکرہ کیا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو جو مراتب حاصل ہوئے' وہ نثر کی بدولت۔ جس قدر خطابات ملے وہ نثر کی کارفرمائی کی وجہ سے۔

ڈاکٹر صاحب اپنے معاصرین میں شہرت کے لحاظ سے سب سے بازی لے گئے ہیں۔ کیونکہ آنکی تصانیف ہر لائن میں ہیں' اور ہر جگہ اُنھوں نے اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے ہیں۔ قانون کی کتابوں کے ترجمے کرنیکے سبب سے گورنمنٹ میں اُن کی شہرت ہوئی' ملازمت ملی اور ترقی پر ترقی حاصل ہوئی۔ قرآن شریف کے ترجمہ نے اُن کو مسلمانوں میں بہت مشہور کیا۔ لیکن سب سے زیادہ شہرت کے ذمہ دار ان کے ناول ہیں۔ خصوصاً وہ جو عورتوں کے لئے لکھے گئے ہیں۔ ان ناولوں نے ڈاکٹر صاحب کے نام کو ہر گھر میں پہونچا دیا۔

اُن کی شہرت کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ اُن کا طرز تحریر نہایت سادہ اور پُراثر تھا۔ اسمیں شک نہیں کہ بعض جگہ عربی، فارسی کے بڑے بڑے الفاظ استعمال ہو گئے۔ لیکن بہت کم۔ اُن کی خصوصیت یعنی ظرافت ان کے ہر کارنامہ میں موجود ہے۔ اس مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ ہم اُن کی نثر کے نمونے پیش کرکے اُن پر کسی رائے کا اظہار کر سکیں۔ لیکن اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جس وقت ڈاکٹر صاحب نے اُردو لکھنے کے لئے قلم اٹھایا ہے۔ اُس زمانہ کو دیکھتے ہوئے اور خوبیوں کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب آپ اپنی نظیر ہیں۔ گو بعض تذکرہ نویس ادیبوں کی رائے ہے کہ اُن کی نثر نگاری کا کوئی خاص ایسا طرز نہیں' جس کو ہم اُن سے منسوب کر سکیں۔ جس طرح آزاد اور غالب کی تحریروں کو دیکھ کر کہہ اُٹھتے ہیں کہ یہ اُن کا طرز ہے۔ دوسری طرف مولانا حالی کی رائے کا خلاصہ سنیئے :۔

"مولانا نذیر آحمد نے اپنی عام تصنیف سے جو احسان اُردو لٹریچر پر کیا ہے' اور اپنے

جادو اثر لیکچروں سے جو سکہ جمہور کے دلوں پر بٹھایا ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ ہر مشکل سے مشکل اور آسان سے آسان مطلب کے بیان کرنے پر جو غیر معمولی قدرت اس شخص کو اپنے اسٹائل میں تھی وہ اس قادر الکلامی سے کسی طرح کم نہ تھی جو سر سید مرحوم کو اپنے سیدھے سادے اسٹائل میں حاصل تھی۔"

غرض ڈاکٹر صاحب نذیر احمد بحیثیت نثر نگار وہ پایہ رکھتے تھے۔ جس پر آج اُردو ادب جس قدر ناز کرے وہ کم ہے اور اس بنا پر ہم کو یہ کہنے میں ہرگز تامل نہیں ہو سکتا کہ جب تک دُنیائے ادب قائم ہے نذیر احمد کا نام کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔[۱]

اگر ہمارے سامنے کسی شخص کی مصیبت کا حال درد انگیز لفظوں میں بیان کیا جائے تو اس واقعہ کے ادراک کے ساتھ ہم پر ایک اثر طاری ہوگا۔ اس قسم کے اثروں کا نام جذبات یا احساسات ہے۔ اور جو چیز ان جذبات اور احساسات کو برانگیختہ کر سکتی ہے وہی شاعری ہے۔ منطقی حیثیت سے شاعری کلام کی وہ قسم ہے جس سے جذبات انسانی برانگیختہ ہوں اور اس کے مخاطب حاضرین نہ ہوں بلکہ انسان خود اپنا آپ مخاطب ہو، اسی کا نام شاعری ہے۔ حالی

شعر کا طبیعت پر اثر کرنا ایک فطری بات ہے۔ شعر دراصل دو چیزوں کا نام ہے۔ مصوری اور موسیقی۔ اور یہ دونوں چیزیں فطرۃً انسان کے دل پر اثر کرتی ہیں۔ شبلی نعمانی

ارسطو کے نزدیک شعر ایک قسم کی مصوری اور نقالی ہے۔ فرق یہ ہے مصور صرف مادی اشیاء کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔ بخلاف اس کے شاعر ہر قسم کے خیالات، جذبات اور احساسات کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔ شبلی نعمانی

بے علم بادشاہ ملک اور بے علم زاہد دین کا دشمن ہوتا ہے۔ پریم چند

دوستی لطف و کرم سے اور بادشاہی انصاف سے ترقی کرتی ہے پریم چند

---

[۱] یہ مضمون لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے براڈکاسٹ ہوا۔ اب ڈاکٹر صاحب کی عنایت سے ہدیۂ ناظرین زمانہ ہو رہا ہے (د۔ ن)

جہانِ عشق کی دیوالی

(از مسٹر رام جوایا خنداں)

جہانِ عشق میں غم لے کے آئی دیوالی　چراغ داغ جلا کر منائی دیوالی
ہزار بار تماشا کیا چراغاں کا　سماں ہے اور ہی کچھ داغہائے خنداں کا
یہ داغ وہ ہیں جو آٹھوں پہر چمکتے ہیں　یہ وہ شرار ہیں جو رات بھر دہکتے ہیں
جگر کے خون کا روغن بنایا جاتا ہے　چراغِ سوزِ محبت جلایا جاتا ہے
جو پھول بن کے اُڑے داغ دل بہاروں میں　تڑپ رہے ہیں وہ جگنو سے سبزہ زاروں میں
تحیرات میں ہے حیرتِ نظارہ گم　تجلیات میں ہے غرق محفلِ انجم
کسی کی یاد میں مجبوریوں سے رو نہ سکے　یہ داغ وہ ہیں جنھیں آنسوؤں سے دھو نہ سکے
مٹیں جو آہ سے، وہ داغ دل کے داغ نہیں　ہوائیں جن کو بجھا دیں یہ وہ چراغ نہیں

فروغِ حسن ازل دیکھ دل کے داغوں میں
چراغِ طور کا پرتو ہے اِن چراغوں میں

دیپ مالا کی رات

یہی وہ رات ہے جلووں کا ساماں جس میں ہوتا ہے　یہی وہ رات ہے جشنِ چراغاں جس میں ہوتا ہے
یہی وہ رات ہے روشن شبستاں جس میں ہوتا ہے　یہی وہ رات ہے عالم فروزاں جس میں ہوتا ہے

یہ وہ شب ہے ضیائے صبحِ خنداں بھی ہے مات اس سے
یہ وہ شب ہے کہ تاریکی بھی ہے روشن صفات اس سے

اودھ میں جیت کر لنکیش کو جب رام آئے تھے　تو گھر گھر جشن بھارت ورش میں سب نے منائے تھے
مکاں اپنے سجا کر آئینہ خانے بنائے تھے　وفورِ شادمانی سے دیئے گھی کے جلائے تھے

یہی وہ رات ہے جو یادگارِ فتحِ لنکا ہے
یہی وہ رات ہے ہر سال بجتا جس کا ڈنکا ہے

بی - کے - بھیکن

ہندوستان کی اقتصادی پستی اور اسکا حل

(از مسٹر حلیم سلیمی، ایم اے (علیگ)

ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ایک ہیجان سا برپا ہے، اور سیاسی بیداری اور علوم فنون کی ترقی کے باوجود قدم قدم پر اقتصادی پستی کا اثر نمایاں ہے۔ ہمارے نوجوانوں کی نظر میں توسعت پیدا ہوتی جارہی ہے اور اپنے آپ کو صرف ایسے ملک کا باشندہ نہیں سمجھتے جو تین طرف سے سمندر سے گھرا ہوا ہے اور ایک طرف سے ہمالیہ کی پہاڑی دیوار سے ملک پناہ گزین ہے۔ بلکہ اُن کی نظروں کے سامنے جاپان کی زندہ مثال موجود ہے جو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے بعد اپنے حدودِ سلطنت بڑھانے کے درپے ہے اور تمام دنیا کی نظروں میں خار کی طرح کھٹک رہا ہے۔ ہمارے نوجوان ہندوستان کے بازاروں میں بیرونی ممالک کی بنی ہوئی اشیار کا انبار دیکھتے ہیں، اور جب اُن کی نظریں ملکی چیزیں تلاش کرتی ہیں تو مایوسی کے ساتھ جھک جاتی ہیں، ان کے کانوں میں ممالک غیر سے جنگ کے بلند نعرے سنائی دیتے ہیں وہ سنتے ہیں کہ چین کو جاپان کھا گیا، اٹلی حبشہ کو نگل گیا، جرمنی نے آسٹریا کو محض دھونس میں لاکر فتح کرلیا۔ جب حساس دل رکھنے والا نوجوان ان ساری باتوں کو سنتا، دیکھتا اور غور کرتا ہے تو اس کی پریشانی اور ندامت کی کوئی حد باقی نہیں رہتی۔ یہی وہ باتیں ہیں جن کی وجہ سے ہمارے نوجوانوں کے سرد خون میں قومی بیداری کی حدت پیدا ہورہی ہے۔ اور وہ بے چین و سراسیمہ نظر آرہا ہے۔ اس لئے یہ کہنا درست نہیں کہ ہندوستان والوں کو صرف روٹی کے سوال نے پریشان کررکھا ہے، یہ سوال تو زراعتی ترقی کے ذریعہ سے حل کیا جاسکتا ہے۔ مگر ساری پیچیدگیوں کا حل زراعت کو نہیں قرار دے سکتے۔

نوجوانوں کے خاموش کرنے کی بہت سی صورتوں پر غور کیا جارہا ہے۔ ملک میں امن اور شانتی پھیلانے کی تمام امکانی کوشش ہورہی ہے۔ کانگریس حکومتیں بھی اس پر اپنے محدود اختیارات کے ساتھ بڑے زور شور سے غور کررہی ہیں، حکام بھی اپنے سر کھپا رہے ہیں اور حد ہوگئی کہ مرکزی حکومت کو بھی ہندوستانیوں کی فلاح و بہبود کا خیال پیدا ہوچلا ہے اور مدبرانِ انگلستان کو بھی ہندوستان کے ساتھ ہمدردی کے جذبہ نے پریشان کررکھا ہے۔

ان سارے مسائل کا حل دو تین باتوں کے اندر پوشیدہ ہے:-

اول صنعتی تعلیم کی وسیع پیمانہ پر ترقی، دوم زراعت میں امکانی ترقی، سوم ملک کی تجارت کو فروغ۔
چنانچہ قوم کے بڑے بڑے نکتہ رسوں نے اکثر یونیورسٹیوں میں صنعتی تعلیم کا انتظام شروع کر دیا ہے، جس میں بنارس یونیورسٹی خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ علیگڈھ یونیورسٹی میں بھی تھوڑا بہت کام شروع ہو گیا ہے۔ حکومت کو بھی اس کا احساس ہو گیا ہے کہ موجودہ تہذیب و تمدن کی ملمع گری نے ہندوستانیوں کو اپنی روزانہ کی ضروریات کے لئے ممالک غیر کا نہ صرف محتاج بلکہ بے دست و پا بنا دیا ہے۔ اسی کے ساتھ ہر سال ملک کے کالجوں اور یونیورسٹی کی امداد سے فاقہ مست عیش پسند اور مغرب پسند ہندوستانی نوجوانوں کی بڑی فوج نکلتی رہتی ہے جو تکمیل تعلیم کے بعد اپنے اوپر روٹی کمانے کے ذریعوں کو بند پاتی ہے، اور ان کو ہر طرف مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کامیابی کے ہر دروازے پر تالے پڑے ہوئے نظر آتے ہیں

۱۸۱۳ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا چارٹر تبدیل کیا گیا تھا تو دار العوام میں یہ تجویز پیش ہوئی تھی کہ ہندوستان کے عوام میں ہر امکانی کوشش کے ساتھ بہبودی اور خوشحالی پھیلائی جائے۔ مگر اسی کے ساتھ ان ذرائع پر بھی غور کیا گیا تھا جن پر عمل کرنے کے بعد ہندوستان کی صنعت تباہ ہو جائے، اور اس کے بجائے برطانوی صنعتوں کی مانگ ہندوستان میں زیادہ ہو جائے۔ مگر اب حکومت کے اس رویہ میں تبدیلی ہوتی جا رہی ہے اور ہندوستانی صنعت و حرفت کو بیرونی مقابلہ سے حفاظت کرنے کی تدابیر پر غور کیا جا رہا ہے۔ مگر بیرونی تجارت سے میرا مطلب صرف جاپانی اور جرمنی کا مال ہے، ورنہ برطانیہ کو یہ کب گوارا ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی منڈی اُس کی صنعتوں سے خالی ہو جائے۔

ہندوستان میں سودیشی تحریک نے ۱۹۰۵ء سے ترقی کی جس سے بہت سے بیکاروں کو روٹی کا سہارا ہو گیا، اور غریب جلاہوں کو اپنی بسر اوقات کا کچھ ذریعہ ہاتھ آ گیا۔ آج کل ملک کے گوشہ گوشہ میں سوتی کاروبار تیزی کے ساتھ ترقی کر رہا ہے۔ گاؤں والوں نے اپنی ضروریات کے لئے خود ہی چیزیں بنانے کی ترکیبیں شروع کر دی ہیں۔ لیکن غیر ملکی اشیاء کی ارزانی نے ملکی صنعت کو اپنے پیروں پر قائم رہنے سے مجبور کر دیا ہے۔ کانپور اور دھاریوال کے اونی کپڑوں کی کھپت جاپانی اور دیگر بیرونی ممالک کے کپڑوں کے مقابلے میں مایوس کن ہے۔

بہر حال نوجوانوں کی بیکاری رفع کرنے کے متعلق اصل سوال یہ ہے کہ حکومت اس کے لئے کون سی تدابیر عمل میں لائے۔

اس کے دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے۔ اس لئے یہاں کے لوگوں کو زراعت کی ترقی کی طرف رجوع ہونا چاہیئے۔ لیکن ہم اپنی انتہائی نادانی کا ثبوت دیں گے اگر اوسط درجہ کے طبقہ والوں سے یہ اُمید رکھیں کہ وہ خود جا کر کھیتوں میں ہل چلائیں اور اپنی روزی کما کر کھائیں۔ اس کا ہرگز یہ مقصد

نہیں ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے بلکہ وہ ایسا نہیں کریں گے. کیونکہ ان کی سماجی رکھ رکھاؤ میں فرق آگیا ہے اور وہ اس پیشے کو اپنے لئے ذلیل سمجھنے لگے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی امر مسلمہ ہے کہ ہماری زراعت کا انحصار بارش پر ہے اس لئے پانی کا ایسا انتظام کیا جائے کہ خدا کی دین کے بجائے اپنے قابو کی چیز ہو جائے۔

ہندوستان کے باشندے طبعاً مشقت پسند اور قانع واقع ہوئے ہیں لیکن اگر اُن کے خوابیدہ جذبات کو چھیڑ دیا جائے تو پھر دیکھیئے کہ یہ کیا کچھ نہیں کر دکھاتے، اُن کے اندر ایک روح پھونکنے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ سرمایہ کی فراہمی بھی لازمی ہے۔ لیکن اوسط درجہ کے طبقے کے نوجوانوں کے لئے کیا کیا جائے؛ یورپ کی طرح فوج اور جہاز میں یہاں کے نوجوانوں کی کوئی خاص کھپت نہیں ہے، کلرکی کی جگہیں بھی قریب قریب بھر چکی ہیں۔ کاروباری کارخانے بھی ہندوستان میں معدودے چند ہیں اس لئے وہاں بھی اُن کی گنجایش کا کوئی سامان نہیں۔ اس لئے ان کا مستقبل انتہائی تاریک نظر آتا ہے۔ سماجی تفرق اور ذات پات کی تمیز ڈھیلی پڑ جانے سے اور بھی دقتیں بڑھ گئی ہیں، جہاں کہیں بھی روٹی ملنے کی اُمید پائی جاتی ہے وہاں ہندو (برہمن چھتری شودر) اور مسلمان سب کی درخواستیں موجود ہو جاتی ہیں۔ برہمنوں کو جوتوں کی دوکان پر کام کرنے میں عذر نہیں اور ریلوے اور دیگر کارخانوں میں چھوٹے سے چھوٹے ذات کے نوجوانوں کے ساتھ اونچی ذات کے نوجوان بھی بلا کسی چون وچرا کے کام کرتے نظر آتے ہیں۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان میں رفتہ رفتہ ایک سماجی انقلاب بھی آرہا ہے جس کے آثار روزمرہ نمایاں ہیں۔

میں بتلا چکا ہوں کہ سودیشی تحریک کی ناکامی کے بہت سے وجوہ ہیں. حکومت نے اس تحریک کا خلوص سے ساتھ نہیں دیا اور سرمایہ کی کمی سے بھی اس کی ترقی کو کافی صدمہ پہونچا۔ چند لوگوں نے دیا سلائی اور اس طرح کی دوسری چیزوں کے کارخانے قائم کرنے کے لئے سرمایہ لگانا چاہا مگر وہاں بھی حکومت نے ساتھ نہ دیا۔ ریلوے ڈپارٹمنٹ نے بھی مدد نہ کی۔ اس کے علاوہ ماہرینِ فن کی کمی نے بھی ان کوششوں کو سرسبز نہ ہونے دیا اور ناتجربہ کاری اور خلوص کی کمی سے بھی اس تحریک کو نقصان پہونچا۔

ظاہر ہے کہ ہندوستان بہت دولتمند ملک نہیں ہے اس لئے یہاں پر آسانی کے ساتھ جوٹ اور سوت کے بڑے بڑے کاروبار نہیں شروع کئے جا سکتے لیکن اگر مشترکہ کاروبار شروع کیا جائے تو آسانی کے ساتھ چلایا جا سکتا ہے اور اگر اتنا کافی سرمایہ نہ حاصل ہو سکے تو کم سے کم چھوٹے کاروبار تو آسانی کے ساتھ شروع کئے جا سکتے ہیں۔ اگر چھوٹے چھوٹے کارخانے ہی ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل جائیں، اور اپنی ضروریات کو پورا کرنے کی صلاحیت پیدا کرلیں تو سرمایہ کی کمی کا سوال بھی خود بخود حل ہو جائے۔

مارشل کا بیان بالکل صحیح ہے کہ اگر چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں کا سرمایہ اور عقلمندوں کی قابلیت ایک

دوسرے کی معین و معادن ہوں تو بڑے سے بڑے کاروبار کے شروع کرنے میں کوئی دقت باقی نہ رہے۔

بہرحال ملک میں کئی قسم کی صنعتیں تو فوراً شروع کی جاسکتی ہیں:۔

(۱) گھریلو صنعتیں جس میں بہت ہی کم سرمایہ کی ضرورت ہے۔

(۲) ایسی صنعتیں جن کے لئے کافی سرمایہ کی ضرورت ہے، لیکن ہندوستان ایسے ملک میں بہت سی ایسی صنعتیں اپنی ابتدائی حالت میں ہیں۔ اور جن کو حکومت کی امداد کی سخت ضرورت ہے۔ حکومت چاہے ان کی مالی امداد کرے یا ان کی چیزوں کو خرید کر ان کی امداد کرے۔

اب سوال یہ باقی رہتا ہے کہ حکومت ہندوستان کی صنعتوں کو کس طرح ترقی دے سکتی ہے، حسب ذیل طریقے کارآمد اور مفید ثابت ہونگے۔

(۱) صنعتی کاروبار کے سرمایہ داروں کو ایک مخصوص سود کی ضمانت۔

(۲) کم شرح سود پر سرمایہ کی فراہمی۔

(۳) بعض صنعتوں کی خاص طور پر امداد۔

(۴) ملک کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ تک خام مال پہونچانے کے ذرائع میں خاص سہولتیں پہونچائی جائیں۔

(۵) بیرونی ممالک کی اشیاء پر ڈیوٹی لگا کر ان کی درآمد روکی جائے۔

(۶) قرض دینے والی انجمنیں قائم کی جائیں۔

(۷) ہندوستانی مال کو بیرونی اشیاء پر ترجیح دی جائے۔

سرمایہ کے تحفظ اور منافع کے تعین کے طریقہ نے ہندوستان میں کافی ترقی حاصل کی ہے۔ یہاں کی ریلوں کی تعمیر زیادہ تر اسی طریقہ سے ہوئی، اب بھی چھوٹی چھوٹی ریلیں اسی طریقہ کے سرمایہ سے بنائی جارہی ہیں اور ان سے اچھی خاصی آمدنی ہورہی ہے مگر اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ ہندوستان ہی کا سرمایہ لگایا جائے نہ کہ برطانیہ سے روپیہ قرض لے کر یہاں کی پریشانی میں اضافہ کیا جائے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ حکومت انجمنوں کو یا خاص خاص لوگوں کو کچھ مالی امداد دے تاکہ وہ کاروبار میں لگا کر ہندوستان کی تجارت اور صنعت کو ترقی دے سکیں۔ اس سلسلہ میں روپیہ کے تحفظ کا سوال ضرور پیدا ہوتا ہے مگر روپیہ کی واپسی سے کافی اُمید ہوتی ہے کہ اس طرح کے قرض کا روپیہ بھی بآسانی واپس کیا جاسکتا ہے۔

(۳) جن صنعتوں کی ترقی کے امکانات پائے جائیں اُن کی خاص طور پر امداد کرنا حکومت کا فرض ہونا چاہیے۔

اِس طرح ملک کی ابتدائی صنعتیں کافی ترقی کر سکیں گی۔

(۴) ذرائع آمد و رفت کی سہولتیں مہیا کرنے سے حکومت کو کوئی خاص نقصان نہیں پہونچ سکتا کیونکہ جہاں دیکھا جائے کہ خام مال کم قیمت پر مِل سکتا ہے وہاں سے ریلوے یا سڑکوں کے ذریعہ مال منگانے کا آسانی سے انتظام کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح خام مال کی پیداوار میں بھی ترقی کی جا سکتی ہے۔ اور سڑک کی آمدنی کی بھی صورت نکل سکتی ہے۔

(۵) بیرونی ممالک کی چیزوں پر ڈیوٹی لگا کر اُن کی درآمد کو کم کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں کپڑے اور دیگر اشیاء کی وجہ سے ملک کو جو کچھ فائدہ ہوگا اس کا اندازہ آسانی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔

(۶) قرضہ دینے کی انجمنیں حکومت آسانی کے ساتھ اور بلا کسی عذر کے بنا سکتی ہے اور اس سے ملک کو بہت فائدہ پہونچ سکتا ہے۔

(۷) ہندوستان کی حکومت کو کافی سامان کی ضرورت ہوتی ہے مگر بدقسمتی سے حکومت کو زیادہ تر انگلستان ہی کا بنا ہوا سامان پسند آتا ہے۔ بجٹ کے موقع پر حکومت کے اس رویہ کی اکثر مذمت کی جاتی ہے مگر اب تک اس پر کوئی دھیان نہیں دیا گیا۔ اگر حکومت بھوکے ہندوستانیوں کا خیال کرتے ہوئے ہندوستان ہی کی بنی ہوئی چیزیں خریدنے لگے تو بہت سی صنعتوں کو یقینی طور سے ترقی ہو جائے مثلاً ممالک متحدہ کی کانگریسی حکومت نے دیسی کاغذ کا استعمال شروع کر دیا ہے جس کے سبب کاغذ کی صنعت میں خاصی ترقی ہونے کا امکان پیدا ہو گیا ہے۔

بہرحال یہ چند طریقے ہیں جن پر عمل کرنے سے ہندوستان کی صنعت کو یک گونہ ترقی ہو سکتی ہے مگر اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ خلوص سے کام کیا جائے۔ صرف اخباری پروپیگنڈا اور لیڈری حاصل کرنے کے لئے جو کام کیا جاتا ہے اُس سے فائدہ کے بجائے نقصان کا ڈر ہے۔ چھوٹی چھوٹی صنعتوں کو سارے ملک میں جال کی طرح پھیلا دینا چاہیئے۔ تاکہ بیکار نوجوانوں کو پیٹ پالنے کا ذریعہ ہاتھ لگ جائے اور ایمانداری اور سعادت مندی کے ساتھ ملک و قوم کے کام آ سکیں۔ صنعت و تجارت کے سلسلہ میں ہندوستان کے سرمایہ دار جو روپیہ لگائیں گے اس سے یقینی منافع حاصل ہوگا کیونکہ ہندوستان میں سودیشی تحریک کے لئے کانگریسی حکومت بہت کارآمد ثابت ہوگی اسی سلسلہ میں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اگر ہندوستان کے سرمایہ داروں کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ حکومت ان کی ہر ممکن امداد کے لئے تیار ہے تو پھر وہ فراخدلی اور دریا دلی کے ساتھ ہندوستانی صنعت کی طرف رجوع ہو جائیں۔

ہندوستان کی لاچاری سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستانی لوگوں کے وہم و گمان سے

بھی زیادہ خستہ حال ہو رہا ہے اور اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ہم اپنی روزمرہ کی ضروریات کی چیزیں بیرونی امداد کے بغیر پوری نہیں کر سکتے۔ ہم بیرونی اشیاء کے استعمال کے غلام ہو چکے ہیں۔ اور اگر فوری کوئی تدبیر عمل میں نہ لائی گئی تو مجھے شبہ ہے کہ ہندوستان سے اپنی پستی کا احساس بھی فنا ہو جائیگا اس لئے حکومت اور مدبران ملک دونوں کو ہندوستان کو اس قعر مذلت سے نکالنے کے لئے متوجہ ہونا چاہیئے تاکہ ملک کو بیرونی اشیاء کی غلامی سے نجات مل جائے۔ اور ہندوستان کے بیکاروں کو روٹی کا سہارا ہو جائے۔

اس سلسلہ میں یہ بتلانا بھی ضروری ہے کہ صنعتی اسکولوں اور کالجوں کا قائم کرنا بھی اشد ضروری ہے تاکہ ہندوستان کے نوجوان اس میں تعلیم حاصل کر کے ملک کی ترقی کرنے والی صنعتوں میں کامیابی کے ساتھ کام کر سکیں۔ مگر اس سلسلے میں یہ بات ضرور پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ صنعتی تعلیم جس قدر کم خرچ ہو گی اُسی قدر اُس سے ملک کو زیادہ فائدہ پہونچے گا۔ ورنہ غریب طبقہ کے نوجوان آسانی کے ساتھ تعلیم حاصل نہ کر سکیں گے۔ ہم کو غریب اور اوسط درجہ کے طبقے کا خیال رکھنا زیادہ ضروری ہے۔ کیونکہ یہی وہ طبقہ ہے جس کو حوادث سے زیادہ دوچار ہونا پڑتا ہے۔ صنعتی درسگاہوں کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ مغربی انداز کی اعلیٰ شاندار عمارتوں کے اندر تعلیمی کام انجام دیئے جائیں بلکہ ہندوستان کی غربت کا خیال رکھتے ہوئے چھوٹے چھوٹے کاروبار اور چھوٹی چھوٹی صنعتوں کے لئے معمولی معمولی اسکول بنائے جائیں، تاکہ آس پاس کے بچے ان سے فیض یاب ہو سکیں۔

بہر نوع اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان میں صنعتی ملک بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ یہی وہ ملک ہے جو کبھی بہترین ململ اور اونی سوتی کاروبار کے لئے دنیا میں مثال کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ کشمیر کی شال اور دریاں اب بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اگر ہمارے نوجوانوں کو کام کرنے کا موقع دیا جائے اور ان کے لئے ضروری سہولتیں مہیا کی جائیں تو پھر ہندوستان ایک نمونہ نہ بن سکے۔

رُباعی

ہم ہیں کہ یہ اک پیکرِ زندانی ہے — برباد حیات و نقد انسانی ہے
یہ قید ہے یا عذابِ دوزخ یارب — یا لعنتِ جسمانی و روحانی ہے

جگر بریلوی

تالاب کا سماں

(از حضرت ممتاز نونہروی)

شاعر کی مست نظریں اور شام کا سماں تھا
سرشار تھیں فضائیں مخمور آسماں تھا
ٹھنڈی ہوا کی مستی عالم پہ چھا رہی تھی
نیرنگیوں میں دُنیا غوطے لگا رہی تھی
سورج کی زرد کرنیں کروٹ بدل رہی تھیں
تالاب کی فضائیں سونے میں ڈھل رہی تھیں
اک ماہ وش، پری رُخ، رنگیں ادا، ستمگر
ظالم، حسین صورت، کافر حسین پیکر
طے کر کے سیڑھیوں کو پانی تک آ رہی تھی
کچھ خوف کھا رہی تھی، کچھ ہچکچا رہی تھی
پازیب کی صدائیں بلبل کے چہچہے تھے
نازک سی ٹھوکروں میں جلوے تڑپ رہے تھے
ناز و ادا سے اکثر یوں مسکرا رہی تھی
رنگینیوں میں دنیا غوطے لگا رہی تھی
کیفِ نظر فضا میں کروٹ بدل رہا تھا
پانی شراب بنکر پیہم اُچھل رہا تھا
فطرت بھی ہر طرف سے مسحور ہو رہی تھی
سرشار ہو رہی تھی، مخمور ہو رہی تھی

اُف کس ادا سے ظالم پانی میں جا رہی تھی
لہریں جو چھیڑتی تھیں وہ تن چرا رہی تھی
تھی گدگدی بدن میں رہ رہ کے کانپتی تھی
شرم و حیا کی ماری، زوروں میں ہانپتی تھی
حسنِ شباب رنگیں پردہ کئے ہوئے تھا
بادل سمٹ کے اپنا سایہ کئے ہوئے تھا
لہروں سے وہ خراجِ رعنائی لے رہی تھی
فطرت سنبھل سنبھل کے انگڑائی لے رہی تھی
تاریکیوں کی ناگن ہر سمت ڈس رہی تھی
تالاب کی فضا میں مستی برس رہی تھی
پانی میں چاند آکر نظریں لڑا رہا تھا
کچھ خوف کھا رہا تھا کچھ تھرتھرا رہا تھا
تاروں کی شوخ نظریں حسرت سے پڑ رہی تھیں
لیکن فضا کے اندر آپس میں لڑ رہی تھیں

شاعر کی مست نظریں سرشار ہو چکی تھیں | بدمست ہو چکی تھیں بیکار ہو چکی تھیں
جذبات میں تلاطم تخئیل میں تھی ہلچل | احساس کی فضا میں اُمڈے ہوئے تھے بادل
اِک بیخودی کا دریا طوفاں اُٹھا رہا تھا | ہوش و حواس اپنی رَو میں بہا رہا تھا

جب ہوش آیا، دیکھا سب کچھ گزر چکا تھا | بیتابیوں کا مارا پانی ٹھہر چکا تھا
حدِ نظر سے گویا وہ حور مِل رہی تھی
تاریکیوں میں دھندلی تصویر ہِل رہی تھی

یورشِ رنج

از حضرت گلشن (گرلی)

یورشِ رنج بے حساب نہ پُوچھ | ضبط بھی دے گیا جواب نہ پُوچھ
ماجرائے شبِ شباب نہ پُوچھ | کس قیامت کا تھا وہ خواب نہ پُوچھ
دیکھ، میری تباہ حالی دیکھ | میرے اعمال کا حساب نہ پُوچھ
امتحانِ وفا میں اے ہمدم | کون کہتا ہے کامیاب نہ پُوچھ
بحرِ اُلفت میں ڈوبنے والے | معنیِ عقدۂ حباب نہ پُوچھ
آرزوؤں کا خون کرتا جا | آرزوے دلِ خراب نہ پُوچھ
زندگی سے نہ دل کی پیاس بجھی | تابشِ جلوۂ شراب نہ پُوچھ
میری نظروں کی داد دے ظالم | "کیوں کیا تجھکو انتخاب نہ پُوچھ
جلوہ ہائے جمالِ جاناں دیکھ | رازِ بربادیِ شباب نہ پُوچھ
شغل ہو جس کا خونِ دل پینا | اُس سے کیفیتِ شراب نہ پُوچھ
جائزہ لے مِری خطاؤں کا | اپنے الطاف کا حساب نہ پُوچھ
پُھک گئے جان و دل بھی اے گلشن | آتشِ غم کا التہاب نہ پُوچھ

ہندو مسلم اتحاد کی تدابیر

از منشی رام پرشاد ماتھر بی۔ اے، بی۔ ای۔ ایس (ہیڈ ماسٹر پنشنر)

ہر نیک دل ہندوستانی چاہتا ہے کہ ہندو مسلمان برادرانہ زندگی بسر کریں، دونوں کسی صورت میں جُدا نہیں ہو سکتے۔ یہ امر نہایت اطمینان بخش ہے کہ دیہات میں دونوں قومیں نہایت محبت سے زندگی بسر کرتی ہیں، مگر بدقسمتی سے شہروں میں جہاں تعلیم یافتہ طبقہ زیادہ پُر اثر ہے منافقت نظر آتی رہتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس حالت کی جوابدہی ہمارے مدارس کی تعلیم پر ہے جس کو حاصل کر کے برادرانِ وطن ایک دوسرے سے محبت قائم نہیں رکھ سکتے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ باہمی نفاق کے وجوہ دریافت کئے جائیں اور اُن کو رفع کرنے کی تدابیر پر غور کیا جائے۔

اس افسوسناک اور فضول نفاق کی تین وجوہ ظاہر ہیں:۔

اول تاریخ ہند کی موجودہ کتب تعلیم اور اُن کو پڑھانے کا طریقہ۔

دوم اردو ہندی کا بے معنی قضیہ،

سوم۔ بعض قومی اخبارات کی دلشکن تحریرات اور ان کا لامتناہی سلسلہ۔

(۱) تاریخ کی تعلیمی کتب گو تیس یا چالیس سال پیشتر کی کتابوں سے ضرور بہتر ہیں، مگر ہندو مسلم اتحاد کے واسطے صریحاً ناکافی ہیں۔ لیکن کتابیں خواہ کیسی ہی ہوں اُن کو پڑھانے کا طریقہ بھی درست ہونا چاہیئے اور اس کی جوابدہی اساتذہ پر ہے۔ ہر استاد کا فرض ہے کہ تاریخ کی تعلیم کے وقت وہ اپنی قومیت کے خیال کو بالائے طاق رکھے اور یہ نہ خیال کرے کہ شیواجی یا اورنگ زیب میں اس کا کون ہم قوم یا ہم مذہب تھا اور کون مخالف۔ بعض اوقات مجھکو یہ خیال کر کے بہت ہنسی آتی ہے کہ شیواجی اور اورنگ زیب کو مرے ہوئے سینکڑوں برس گذر گئے اور ان کے گوشت و پوست کا قبر یا سمادھ میں پتہ بھی نہ ہوگا اور اُن کی اولاد کا پتہ بھی بمشکل ملتا ہے لیکن یہ لوگ جو نہ اُن کے رشتہ دار ہیں نہ کسی قسم کا تعلق اس کے سوا رکھتے ہیں کہ ان میں ایک ہندو تھا اور دوسرا مسلمان، اب صدہا سال بعد کٹے مرتے ہیں۔ اور اُن کی مثال پیش کر کے خیال کرتے ہیں کہ ان میں فلاں بھلا یا بُرا تھا اس لئے اس کی تمام قوم بھلی یا بُری ہوگئی اور صدہا برس بعد وہ قوم اب بھی نہایت اچھی یا نہایت بُری ہے۔ میں نہیں جانتا

کہ تعلیم یافتہ حضرات کس منطق سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں۔ ہر شخص اپنے ذاتی فعل کا خود جوابدہ ہے اُس کی تمام قوم نہیں۔ اس کے علاوہ اگر کسی شخص سے کوئی فعل شنیعہ سرزد ہوا تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ اس نے تمام عمر خراب کام ہی کیا۔ پھر کوئی بادشاہ کسی قوم کا فرد نہیں اور اس پر سعدی کا یہ شعر عاید نہیں ہوسکتا کہ ؎

چو از قومے یکے بیدانشی کرد   نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

بلکہ   رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند

مصلحت ملکی ہر کہ ومہ نہیں سمجھ سکتا، اس لئے فضول خراب نتیجہ نکال کر سینکڑوں برس بعد اب باہم لڑنا نادانی نہیں تو کیا ہے؟

اُستاد کو سمجھنا چاہیئے کہ جس طرح ہر جاندار کا لڑکپن جوانی اور بڑھاپا ہوتا ہے اسی طرح ہر قوم وسلطنت کا بھی حال ہے۔ انسان بچپن میں چیزوں کو توڑ پھوڑ کر تجربہ حاصل کرتا ہے، لیکن بڑا ہونے پر ہر چیز کو احتیاط اور انتظام سے رکھتا ہے اور بڑھاپے میں قویٰ مضمحل ہوجانے پر احتیاط وانتظام نہیں کرسکتا اور چیزیں خراب ہونے لگتی ہیں۔ یہی حالت قوم وسلطنت کی ہے۔ اس کی دوسری عمدہ مثال عمارت سے دی جاسکتی ہے۔ آپ کیسی ہی عمدہ عمارت بنوائیں، پہلے پھاوڑے سے کام لینا اور زمین درست کرنا یا پہلی بوسیدہ عمارت کو منہدم کرنا پڑیگا، یہ تعمیر کا بچپن ہے۔ اس کی جوانی کا وقت عمارت کا بنیاد پر کھڑا کرنا اور اس کو خوبصورت اور بودوباش کے قابل بنانا ہے۔ اور اس ذریعہ سے خود آرام حاصل کرنا اور دوسروں کو آرام دینا۔ جب عمارت بوسیدہ ہونے لگتی ہے تو اُس کا بڑھاپے کا زمانہ آجاتا ہے اور بودوباش مشکل ہوجاتی ہے، بالآخر خواہ وہ خود گر پڑتی ہے یا اس کو منہدم کرکے دوسری عمارت کا کام شروع ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح ہر قوم کو اپنی سلطنت کی بنیاد مضبوط کرنے کے لئے اول سختی کے ساتھ جنگ وجدل اور انتظام کرنا پڑتا ہے اور رعیت اس باعث سختی اور ظلم برداشت کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ لیکن انتظام ہو جانے پر یہی سختی رحمدلی اور انصاف سے بدل جاتی ہے اور رعیت خوشحال اور فارغ البال ہوتی ہے۔ مگر آخر میں جب سلطنت کمزور ہوجاتی ہے تو پھر بدانتظامی کے باعث ظلم پیدا ہوتا ہے اور اسی پر نئی سلطنت کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔

آجکل تعلیم یافتہ نوجوان کسی سلطنت کا ابتدائی زمانہ پڑھکر اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ اس قوم نے ہمیشہ ظلم کیا۔ دوسرا فریق تسلط کا زمانہ کے کر کہتا ہے کہ نہیں ہمیشہ انصاف رحمدلی اور ہمدردی کا برتاؤ ہوا اور نہایت عمدہ انتظام رہا۔ تیسرا فریق سلطنت کی کمزوری کے زمانہ کا حال سنا کر کہتا ہے کہ اس قوم نے کبھی نہ انتظامی قابلیت

دکھائی نہ اپنا ظالمانہ برتاؤ چھوڑا ہمیشہ رعیت کو ستایا اور اُن کے حقوق پامال کئے۔ حالانکہ تینوں فریق غلطی پر ہیں۔ نہ ہمیشہ ظلم ہوا نہ ہمیشہ انصاف اور ہمدردی۔ لیکن ظلم اور انصاف کا معیار ایک حد تک مدت سلطنت ہے، کیونکہ ظالم کی عمر زیادہ نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر کوئی قوم واقعی ظالم تھی تو وہ چھ سات سو برس تک ہندوستان پر حکومت نہیں کرسکتی۔ اسلامی حکومت و برطانیہ کی سلطنت کے ابتدائی زمانہ کے مطالعہ اور تعلیم کے وقت تاریخ ہندوستان میں ان اصول کو مدِنظر رکھنا چاہیئے، اور ہر حاکم کی خوبیوں کو نظرانداز نہ کرنا چاہیئے۔

تاریخ کو ٹھیک سمجھنے اور خاصکر اُس زمانہ کی اصلی حالت دریافت کرنے کے واسطے جب بادشاہ خود مختار تھے پیشتر یہ معلوم کرنا نہایت ضروری ہے کہ

(۱) بادشاہ کی تخت نشینی سے پیشتر ملک کی کیا حالت تھی؛

(۲) رعایا کس قسم کے رسم و رواج کی پابند اور کیسی جزا و سزا کی عادی تھی؛

(۳) بادشاہ کے ہمنشین اور بااثر اہالی و موالی کس مزاج کے تھے اور اُن کا رجحانِ طبع کس جانب تھا یا اُن کا رعایا اور بادشاہ تک کس قدر رسوخ تھا؛

(۴) بادشاہ کس انتظام پر مجبور تھا اور کس پر آزاد؛ اور

(۵) کسی سخت انتظام میں بادشاہ کی کیا نیت تھی؛

مثلاً اورنگ زیب نے اپنے بھائی مراد بخش کو دعوت کے بہانے بُلا کر گرفتار کرلیا اور چُپ چاپ زیرِ حراست قلعہ گوالیار بھیجدیا، دونوں کی فوجیں موجود تھیں لیکن کسی کو خبر نہ ہوئی۔ بعض مخالف اس کو دھوکہ دہی کی مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں لیکن یہ خیال نہیں کرتے کہ اس طریقے سے اُس نے ہزاروں آدمیوں کی جان بچادی اگر مراد بخش کو خاموشی سے گرفتار نہ کیا جاتا تو باہم کشت و خون ہوتا، نہ معلوم کتنے سپاہی مارے جاتے کتنی عورتیں بیوہ ہوجاتیں اور کتنے بچے یتیم۔ اس کے علاوہ آزمودہ کار سپاہیوں کی موت سے فوج کمزور ہوجاتی اور اس کا نتیجہ نہ معلوم کیا ہوتا۔ غرض بادشاہ کی نیت نیک تھی، گو بظاہر اس پر دھوکہ دہی کا الزام دیا جاتا ہے لیکن درحقیقت وہ ثواب کا مستحق ہے۔ یہ مثال غلط فہمی رفع کرنے کی غرض سے پیش کی جاتی ہے۔ کسی بادشاہ کی طرفداری کے لئے نہیں۔

اس کے بعد تاریخ کو درست سمجھنے کے واسطے دیکھنا چاہیئے کہ؛

(۶) بادشاہ کے انتظامات سے رعایا کے رسم و رواج عادات و خیالات میں کیا تبدیلیاں ہوئیں؛

(۷) اُس کے مصاحبین و ہمنشین کس قسم کے پیدا ہوئے؛

(۸) ورثائے سلطنت کی تربیت کس قسم کی ہوئی اور وہ سلطنت کا بار اُٹھانے کے قابل کس طرح بنائے گئے یا اُن کی تربیت میں کیا خامی رہ گئی اور کیوں؟ اور

(۹) بادشاہ کے انتظامات کا اُن پر کیا اثر پڑا جس کے باعث وہ تخت نشین ہونے پر کامیاب یا ناکامیاب ہوئے

بدقسمتی سے اس قسم کی کتابیں موجود نہیں ہیں نہ اساتذہ کا طریقۂ تعلیم ہی درست ہے۔ ایک معلم کسی بادشاہ میں تمام دنیا کی خوبیاں پاتا ہے تو دوسرا تمام خرابیاں۔ یہ تعلیم نہیں بلکہ طلبہ کو دھوکا دینا ہے اور ہندو مسلم منافقت پیدا کرنا۔ غیر متعصب ہندو مسلم مصنف اپنی جدید تصنیفات سے طلبار کو صحیح نتیجہ پر پہونچنے کا موقعہ دے سکتے ہیں لیکن اصلی کام اُستاد کا ہے کہ وہ نہایت ایمانداری سے طلبار کو صحیح نتیجہ پر پہونچا دے۔

ایک امر نہایت ضروری ہے۔ تاریخ کی ابتدائی تعلیم میں طلبار کو بادشاہوں کے حالات کہانی کے طور پر بتانا چاہیئے اور تعلیم کو دلچسپ بنانا چاہیئے۔ لیکن کسی کے عیوب بتانے سے ذرا دیر میں دلچسپی نفرت سے تبدیل ہو جاتی ہے اور جس کے عیوب بتائے جاتے ہیں اس کا حال پڑھنے یا سُننے کو دل نہیں چاہتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبار کو سبق ہی سے نفرت ہو جاتی ہے اور وہ اُس پر توجہ نہیں کرتے۔ اس لئے ابتدا میں کسی بادشاہ کے عیوب نہ بتائے جائیں بلکہ اُس کی خوبیاں ظاہر کی جائیں تاکہ طلبار اُس کے زیر اثر خود بھی نیک اور ہمدرد بننے کی کوشش کریں اور ہندو مسلم منافقت پیدا نہ ہو۔

(۲) ہندی اُردو کا قضیہ بالکل فضول اور بے معنی ہے۔ موجودہ شکل میں نہ اُردو ہندوستانی زبان کہلانے کی مستحق ہے نہ ہندی۔ اُردو داں اصحاب ہندی الفاظ کو گنواروں کی بولی (slang) سمجھتے ہیں۔ اور اُن کے استعمال کو غیر فصیح خیال کرتے ہیں۔ اس کے خلاف ہندی داں سنسکرت کے مشکل الفاظ کو اُردو یا فارسی کے مستعمل الفاظ پر ترجیح دیتے ہیں اور حتی المقدور عبارت کو غیر مانوس الفاظ سے بھر دینا فصاحت و بلاغت خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ ہندوستان کے سربرآوردہ مصنفین اور نامی گرامی شعرا مثلاً حالی سر محمد اقبال و تلسی داس جی وغیرہ نے ہندی اُردو اور عربی فارسی یا سنسکرت الفاظ کو اس خوبی سے جا بجا چسپاں کیا ہے کہ گویا عبارت میں جان ڈال دی۔ اُن کی یہ تحریرات ضرور ہندوستانی کہلانے کی مستحق ہیں۔ خاصکر مولانا الطاف حسین حالی کی مناجات بیوہ اور امیر خسرو کی خالق باری کی زبان یقیناً اُردو یا ہندی کے بجائے ہندوستانی زبان ہے۔ تلسی داس جی نے رامائن میں غنی غریب۔ عبیر۔ صاحب دغیرہ وغیرہ بیسیوں الفاظ استعمال کئے ہیں۔ مولانا حالی نے قریب قریب ہر نظم میں ہندی الفاظ کو استعمال کیا ہے۔ اُن کا مشہور ترکیب بند جس کو انھوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس چہارم میں سنایا تھا اور جسکا پہلا شعر یہ ہے

زمانہ دیر سے چلا رہا ہے اَے مسلمانو کہ ہے گردش میں میری غیب کی آواز پہچانو۔

جا بجا ہندی الفاظ سے بھرا ہوا ہے۔ آخر میں کالج کے اسٹاف کی فرداً فرداً خوبیاں مولانا نے اس ترکیب بند میں ظاہر کی ہیں۔ مثلاً علامہ شبلی کی بابت لکھا ہے :۔

ادب اور مشرقی تاریخ کا ہو دیکھنا مخزن — تو شبلی سا وحید عصر و یکتائے زمن دیکھیں

اور آخر میں سر سید احمد خاں کے بارہ میں چند اشعار تحریر کئے ہیں، مثلاً

پھر ان کے بعد دیکھیں گر مُرتی اپنے بچوں کا — تو اک بچوں سے بڑھکر زندہ دل پیر کہن دیکھیں

خوشی میں رنج میں صحت میں بیماری میں دکھ سکھ میں — اُسے جب آکے دیکھیں قوم کی دُھن میں مگن دیکھیں

ناظرین دوسرے شعر پر غور فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ خاص ہندوستانی زبان میں ہے، جس میں ہندی اور اُردو الفاظ مناسب موقع پر چسپاں ہیں اور ہندی الفاظ نے شعر میں جان ڈال دی ہے منشی نبواری لال شعلہ مرحوم نے اپنی کتاب بزم برندابن میں ہندی اور اُردو کے الفاظ یکجا کر کے دلچسپی اور اثر کو دوبالا کر دیا ہے :۔ مثلاً

عجب ہے کچھ مری حالت کا اظہار — سراسر ہوں ادھم پاپی گنہ گار

بُرا وہ وقت ہے جس کا کہ ڈر ہے — سماں یہ ہے کہ جو پیش نظر ہے

جب آئے آنکھ میں دم پران پیارے — لگا ہو دھیان چرنوں میں تمھارے

اگر اس چھب کا آخر میں سماں ہو — مرا مرنا حیاتِ جاوداں ہو

دوشالے کی عوض ہو برج کی دھول — پڑیں اُترے ہوئے سنگھار کے پھول

ملے جلنے کو لکڑی برج بن کی — بنے اکسیر یوں پھُنک کر بدن کی

نہیں ہوں مانگنے لایق کسی طور — مجھے کیا چاہیئے اس کے سوا اور

وہی جانکی سری رادھا رمن کی — وہی دو ہاتھ بھومی برج بن کی

نہیں میرا صلہ گوہر فشانی — مگر کچھ پریم کا آنکھوں میں پانی

غرضیکہ اُردو زبان میں ہندی کے مروج الفاظ کا استعمال ایک قسم کی صلاحیت خوبی اور فصاحت کا باعث ہوگا اور اُس وقت وہ ضرور ہندوستانی زبان کہلانے کی مستحق ہوگی۔ اس کے واسطے یہ امر نہایت ضروری ہے کہ ہندوستانی زبان کی ایک مبسوط لغت تیار کی جائے جس میں اُردو اور ہندی کے مترادف الفاظ موجود ہوں اور اساتذہ کو اُس کے استعمال پر مجبور کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی موجودہ اُردو و ہندی کتب تعلیم سے خواہ مضامین اخذ کر کے علیحدہ ہندوستانی کورس تیار کئے جائیں یا اُردو اور ہندی دونوں کی تعلیم پر طلبا کو ترقی دی جائے اور جو طلبا بوقت امتحان دونوں میں کامیاب

ثابت ہوں اُن کو درجہ چڑھایا جائے۔ اردو ہندی رسم الخط میں تبدیلی کی چنداں ضرورت نہیں، بلکہ اس کے بجائے اگر ہندی کتب تعلیمی کو اُردو رسم الخط میں اور اُردو کتب کو ہندی حروف میں بھی طلبا و اساتذہ کی آسانی کی غرض سے طبع کر دیا جائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔

میرے یہ خیالات پایونیر بابت یکم مئی ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئے تھے اور ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد نے ان کو پسند فرمایا ہے، بلکہ مہاتما گاندھی نے بھی ان پر توجہ فرمائی ہے، اور یہ امر باعث مسرت ہے کہ ڈاکٹر راجیندر پرشاد اور مولانا عبدالحق صاحب کی باہمی تجاویز سے اس کے متعلق کارروائی کی جا رہی ہے۔

(۳) بعض ہندو مسلم اخبارات کی ذریدہ دہنی نہایت قابل افسوس ہے۔ اس کی دو وجوہ ظاہر ہیں، یعنی اول اڈیٹر اور اسٹاف کی بے لگامی، دویم ناظرین اخبار کا بے لگام شوق۔ اخبارات دل شکن مضامین لکھ لکھ کر ناظرین میں اُسی قسم کا شوق اور مذاق پیدا کر دیتے ہیں، اور پھر اس خوف سے کہ اگر اس قسم کے چٹ پٹے مضامین نہ لکھے گئے تو خریداروں کی تعداد کم ہو جائیگی دلشکن تحریرات پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس طرح بدی کا دائرہ (Viciaus circle) پیدا ہو کر ہندو مسلم منافرت ترقی پاتی ہے، جو ملک کے زوال کا یقینی باعث ہے۔ میری رائے میں اس کا علاج یہ ہے کہ اڈیٹوریل اسٹاف میں اگر اڈیٹر ہندو ہو تو نائب اڈیٹر مسلمان، اور اگر اڈیٹر مسلمان ہو تو نائب ہندو۔ اس طرح نہ صرف اسٹاف کی بے لگامی ایک حد تک کم ہو گی بلکہ ملازمت حاصل کرنے کی غرض سے مسلمانوں کو ہندی اور ہندوؤں کو اُردو تعلیم کا شوق پیدا ہو گا، اور ہندی و اُردو ہندوستانی زبان کی صورت اختیار کریں گی۔ اخبارات کی وقعت بڑھ جائے گی اور اتحاد میں ترقی ہو گی۔ لکھنؤ کا اودھ اخبار غالباً ساٹھ برس یا اس سے زیادہ عرصہ سے جاری ہے، اِس کے مالک ہندو ہیں لیکن ہیڈ اڈیٹر عرصہ تک مسلمان رہے ہیں۔ اسی باعث اخبار کی وقعت معزز ہندو و مسلم ناظرین میں یکساں ہے۔ اور اکثر معزز رئیس و تعلقدار صاحبان اس کو شوق سے پڑھتے ہیں۔ اگر باقی اخبارات و رسالہ جات کے مالک اس کی پیروی کریں اور ہندو اور مسلمان دونوں کو اسٹاف میں مقرر فرمائیں تو بہت جلد ہندو مسلم منافرت کی بلا سے آزادی ممکن ہے۔

رُباعی

کیا موت کو مانگتا ہے آئیگی وہ
کیا زیست کو روتا ہے کہ جائیگی وہ
اصلاح خیال و طبع لازم ہے جگر
جنت تیرے لئے بنائیگی وہ

جگر بسوانی

حافظ شیراز کی ایک غزل

ہندستانی زبان مین

از مسٹر مقبول حسین احمدپوری، بی۔اے، ایل ایل بی)

اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ مارا — بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

نیہہ نگر کے موہن پیارے اب جو کہیں مِل جائیں گے — اُنکے کومل چرنوں پر بنگالہ دیس چڑھائیں گے

بدہ ساقی مےِ باقی کہ در جنّت نخواہی یافت — کنارِ آبِ رُکنا باد و گلگشتِ مصلّیٰ را

(محبت) ساقی بھردے پریم کا پیالہ، پیا نہ تو پچھتائیں گے — سُورگ (جنت) میں پریم کے رس کی بہتی گنگا کہاں سے لائیں گے (نازک)

فغاں کیں لولیانِ شوخ و شیریں کارِ شہر آشوب — چناں بُردند صبر از دل کہ ترکاں خوانِ یغما را

رام دہائی اِن بانکی اور چنچل[1] چتون والوں سے — پریت کا بھوگ سمجھ کے دل سے یہ دھیرج (قرار) لیجائیں گے

زِ عشقِ ناتمامِ ما جمالِ یار مستغنی است — بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

روپ رنگ سیندور ٹیکے سے کام نہیں سندرتا (حسن وجمال) کو — اپنا دھورا پریم دھیان میں ساجن کبھی نہ لائیں گے

حدیث از مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جو — کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معما را

بول بچن سنگیت (محفل طرب و نغمہ) اور مدرا (شراب) کے ٹوہ نہ لے اس جیون کی — جیون بھید کھُلنے نہیں چاہے اسمیں سر نہ کھپائیں گے

من از آں حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم — کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را

سندر مکھڑے والے کنھیا کی سندرتا کو سمجھا — برج دیش کی بیاکل رادھا کو وہ پل میں رجھائیں گے

نصیحت گوش کُن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند — جوانانِ سعادتمند پندِ پیر دانا را

یہ اُپدیش سُنو جی ساجن دھیان دھرو اِس پر دل سے — سُبُد بڑے بوڑھوں کے تمکو اُتم گیان سکھائیں گے

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی — جوابِ تلخ می زیبد لبِ لعلِ شکر خا را

مجھکو بُرا کہتے ہو، خوش ہوں، ٹھیک ہے ایشور بھلا کرے — کڑوے سُبد منوہر مکھ سے مصری گھول پلائیں گے

غزل گفتی و دُر سُفتی بیا و خوش بخواں حافظ — کہ بر نظمِ تو افشاند فلک عقدِ ثریا را

مہا کوی حافظ کی کویتا لڑی گندھی ہے موتی کی — اس پہ نچھاور ہونے کو آکاش سے تارے آئیں گے

[1] محبوبانِ مجازی

آغوشِ سکوں

(از حضرت طالب چکوالی بی، اے ایل ایل بی)

ایک مدت ہو گئی ہے تجھ سے منہ موڑے ہوئے — ایک مدت ہو گئی ہے تیرا در چھوڑے ہوئے

ایک مدت ہو گئی ہے ٹھوکریں کھاتے ہوئے — ایک مدت ہو گئی ہے دل کو بہلاتے ہوئے

ایک مدت ہو گئی کھوئے ہوئے تسکینِ دل — ایک مدت ہو گئی بھولے ہوئے آئینِ دل

یاد ہے کس شوق سے لپکا تھا دنیا کی طرف — تیری گودی سے نکل بھاگا تھا دُنیا کی طرف

چھوڑ کر تجھکو اُسی کا ہو گیا دیوانہ وار — اُس کی خدمت میں گئے کتنے مرے لیل و نہار

مَیں اُسی کا بندۂ بے دام ہو کر رہ گیا — طائرِ آزاد رہنِ دام ہو کر رہ گیا

بھینٹ میں دی انجمِ جذبات کی تابندگی — گلشنِ تخئیل کے تازہ گلوں کی زندگی

مَیں نے اُمیدوں کی دنیا میں بسایا تھا اُسے — اپنے ارمانوں کی شہزادی بنایا تھا اُسے

مَیں نے پہنایا تھا اُس کو تاجِ صد رنگِ خیال — مَیں سمجھا تھا اُسی کو معنیٔ حُسن و جمال

درحقیقت بھول تھی میری، خیالِ خام تھا — مَیں اسیرِ حلقۂ جادوگرِ ایام تھا

وہم کو سمجھا حقیقت، مَیں حقیقت کو جنوں — جوئے شیر اس کو سمجھ بیٹھا جو تھا دریائے خوں

زندگی کو خواب سمجھا اور حقیقت خواب کو — مفت کھویا وقت ایسے گوہرِ نایاب کو

یاد پھر آئی ہے گھر کی پھر سکوں کی ہے تلاش — مر رہا ہوں پھر وہی دن لوٹ کر آ جائیں کاش

خواب پھر دیکھوں وہی جس پر ہے بیداری نثار — آخری دم تک رہے گا جس کا مجھکو انتظار

خواب اچّھا تھا کہ بیداری سے گھبرایا ہوں میں — چیز جو جان دیکے لی تھی، بیچنے آیا ہوں میں

پھر ہوں طالب کیفِ آغوشِ سکوں پرور کا مَیں
کیا کہوں لوٹا ہوا ہوں رہزن و رہبر کا مَیں

چچا چھکن کا وارث

(از پروفیسر دیویندر دت کتاریہ ایم۔ اے)

(۱)

سیٹھ چھکن لال کو لکشمی نواس میں رہتے عرصہ گذر چکا تھا، یہیں پیدا ہوئے یہیں پروان چڑھے، یہیں نرم نرم گدیوں پر بیٹھ کر اجناس کے اُتار چڑھاؤ دیکھتے اور یہی کھاتے میں حسب منشا تغیر و تبدل کرتے ہوئے اُنھوں نے اپنی تجارت کو اتنا فروغ دیا کہ آج دروازے پر ہاتھی جھومتا تھا۔ کئی منیب کام کر رہے تھے اور نوکر چاکر ادر اُونگھنے والے دربانوں کا بھی ٹھٹھ لگا رہتا تھا۔ مگر آج سیٹھ جی جو کئی دنوں سے بیمار تھے اس دارفانی سے کوچ کرنے والے تھے۔ زر سے انسان دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت خرید سکتا ہے مگر موت کے فرشتے کو کوئی نہیں خرید سکا۔ ان کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا، ہاتھ پاؤں پر سوجن آ گئی تھی۔ تجارت کو فروغ دینے والا دماغ اب قوت خیال سے بھی خالی تھا۔ کاروباری دنیا میں تہلکہ مچا دینے والے ہاتھ بے سکت ہو چکے تھے۔ چاروں طرف تاریکی اور پژمردگی چھائی ہوئی تھی

دن رات باہم بغلگیر ہو رہے تھے، آفتاب جمنا کے پار درختوں کی اوٹ ڈھونڈھ رہا تھا، موٹروں کی آوازیں بھی خاموش ہو رہی تھیں۔

"کیا لڑکے آ گئے؟" بھرّائی ہوئی آواز میں سیٹھ جی نے دریافت کیا، اور بے نور آنکھوں میں قدرے روشنی سی آ گئی۔

"حضور بھتیجے صاحب تو آ گئے ہیں اور تین بار ....."

اس دھیمی مگر دلکش آواز کو سن کر چھکن نے بے صبری سے کہا:

سنو چمپا یا تو تینوں ساتھ آئیں یا پھر میں کسی سے نہ ملوں گا۔ میں ان تینوں کی موجودگی ہی میں وراثت کا فیصلہ کرنا چاہتا ہوں۔" میری جائداد بڑے گاڑھے پسینے کی کمائی ہے۔ میں خود آنکھوں سے دیکھکر جس کو مستحق سمجھونگا اُسی کو دونگا، جب سب آ جائیں تو میرے پاس لے آنا ورنہ نہیں۔"

"جی تار آ چکا ہے شاید صبح تک سب آ جائیں گے۔"

"اچھا پرمیشور مجھے تب تک......"
جھکی ہوئی آنکھیں نیم بیہوشی کے عالم میں محو خواب ہوگئیں، اور بوڑھا سیٹھ خرّاٹے لینے لگا۔

(۲)

دوا کی شیشیوں کو قرینے سے رکھکر چمپا گول کمرے میں آگئی جہاں سریندر کمار کی متجسس نگاہیں اُس کی راہ دیکھ رہی تھیں۔ سریندر جوان رعنا تھا، مگر اُس کے لباس سے بے پروائی اور غربت مترشح تھی، انگریزی وضع کی ٹوپی کے نیچے گھنگھریالے بال اُس کی شان فضیلت کو دوبالا کر رہے تھے!

"آخر تشریف لے آئیں!"

ہاں آتی کیوں نہ، مگر کوئی امید افزا بات طے نہیں ہوئی، آپ کے چچا جان آپ سے اُس وقت ملیں گے جب آپ کے دوسرے بھائی بھی آجائیں۔"

"اچھا کوئی مضائقہ نہیں مگر کہیں بڈھا ڈھلک نہ جائے۔"

چمپا کو سریندر سے محبت تو تھی، مگر یہ بے موقعہ بے تکلفی اُسے ناپسند ہوئی۔

جو دو گھڑی کا مہمان ہے اُس کی شان میں ایسے الفاظ زیبا نہیں۔"

"بیشک زیبا تو نہیں مگر میں بھی مجبور ہوں، ریاکار میں نہیں کہ جھوٹا افسوس ظاہر کروں۔ چچا صاحب پرلے سرے کے کنجوس ٹھہرے، جب وہ چل بسیں گے تو دو ایک کلمۂ خیر بھی ان کے حق میں کہہ دونگا، لیکن یہ ریاکاری مجھ سے نہ ہوگی کہ اُن کی موت پر بناوٹی آنسو بہاؤں، یہ وہی تو ہیں جنھوں نے مجھے محض اس بات پر دھتکار دیا تھا کہ میں نے ان کی سودخواری کی آمدنی کو اچھا نہ سمجھا تھا، لیکن اگر میں کھسیانا منہ بنالوں یا جھوٹا رنج دکھاؤں تو کیا تم اسے پسند کروگی؟"

چمپا بھی اس کی صاف گوئی اور سچائی کی معترف تھی، امیر کا یہ کنگال بھتیجا، یہ بانکا سجیلا نوجوان جس کے چہرے سے ہمیشہ صداقت ٹپکتی تھی، جو کرایہ کے مکان میں رہ کر تصویریں بناتا تھا اور سرو بازاری کے باوجود اپنی دھن میں لگا تھا۔ اس بانکے نوجوان کی صداقت نے چمپا کے دل میں گھر کر لیا تھا!

سریندر نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا "اگر چچا جان اپنا تمام ترکہ مجھکو دے جائیں جس کی ایک کوڑی بھی اُنھوں نے اپنی زندگی میں نہیں دکھائی تو میں اُن کا شکریہ ادا کرونگا، مگر افسوس مجھ سے خواہ مخواہ بیزار رہے! میں صدق دل سے چاہتا تھا کہ میرے بھائی ان کی دکانوں کا انتظام کریں اور میں اُن کی خدمت کروں، اِس طرح تم سے بھی مل بیٹھنے کا......"

الفاظ درد اور اثر سے پُر تھے، اس طعن و تشنیع میں رنج کی بھی جھلک تھی، مگر چمپا نے زندہ دلی سے کام لیا

"اچھا تو اب آپ مجھے جانے دیں، ابھی مجھے کئی کام کرنا ہیں۔"

سریندر: "آہ پھر کئی کام دھندے تو ہوتے ہی رہیں گے، کیا میں ایک بار پھر پوچھ سکتا ہوں کہ زندگی کی کشمکش میں ہم تم ایک کیوں نہ ہو جائیں؟"

چمپا نے پہلے کی طرح شانہ ہلا کر جواب دیا "ابھی یہ دنیا داری کی باتیں رہنے دیجئے۔"

جب چمپا اُٹھ کر چلی آئی تو اُس نے دل ہی دل میں کہا کہ "اگر میں ہاں کر لوں تو دنیا یہی کہے گی کہ دولت کی خاطر ہاں کی۔"

(۳)

کالی چرن کلکتہ میں شکر کے کارخانے کا مینجر تھا، اور بنداسرن کراچی میں سیمنٹ کے کارخانے کا۔ دونوں دوسرے دن صبح نو بجے دہلی پہونچے، اسٹیشن پر سریندر اُن کے استقبال کے لئے موجود تھا۔ دونوں نے نفیس اپ ٹو ڈیٹ سوٹ زیبِ تن کئے تھے۔ اور ان کی شکل و شباہت بھی اس طرح ملتی تھی گویا ایک سیپ کے دو موتی ہیں۔ سریندر نے انھیں مدتوں کے بعد دیکھا تھا اسلئے یہ نہ جان سکا کہ ان میں کون بنداسرن ہے اور کون کالیچرن اُس نے دونوں کے نام پوچھے۔

بنداسرن بولا: "بھئی اس میں تو کوئی شک نہیں کہ تم ہم دونوں سے نرالے ہو" یہ سریندر کے لباس پہ چوٹ تھی، جس پر کالی چرن نے اضافہ کیا "اور آپ کام کیا کرتے ہیں؟"

موٹر میں سوار ہوئے تو کالی چرن لے کہا "سریندر! چلو تم آگے بیٹھ جاؤ، تمھارے کوٹ میں پہلے ہی سے شکنیں پڑی ہوئی ہیں، اِس کے زیادہ خراب ہونے کا اندیشہ نہیں" بندو! ہم تم پیچھے بیٹھیں گے! کھڑکیاں کھول دو، دہلی والوں کو معلوم تو ہو جائے کہ کوئی آیا ہے!"

ڈرائیور کو لکشمی نواس چلنے کی ہدایت ہوئی، اور گاڑی تیزی سے چلنے لگی ......

سریندر اپنے اِن بھائیوں کو "مہاجن بھائی" کے لقب سے ملقب کرتا تھا۔ بہرحال اِن دونوں نے اس کے لباس کا خوب غور سے معائنہ کیا، کوٹ کے بٹن نہ تھے، پتلون میں کئی پیوند لگے تھے، ٹائی تھی تو ضرور مگر بار بار دُھلنے سے اُس کا رنگ بھی پھیکا پڑ گیا تھا۔ ان کی نظریں ملیں تو کالی چرن نے کہا، "سریندر! تم کہاں رہتے ہو تمھیں تو سب باتیں معلوم ہونگی، آخر کیا معاملہ ہے؟"

"چچا جان تو دو ہی چار گھڑی کے مہمان ہیں۔"

اس کی طرز گفتگو میں متانت بھی تھی اور درد بھی تھا۔

بندو: "اچھا تو جائداد کا کیا ہوا؟ یہی تو سوال ہے!"

سریندر نے جواب دیا: "مجھے کچھ علم نہیں"

مہاجن بھائیوں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں ایک دوسرے کے دلی جذبات کو بھانپنا چاہا۔

کالی: ہمیں تو یہ اطلاع ملی ہے کہ وہ ہم تینوں کا امتحان لیں گے، اور اس کے بعد جس کو پسند کرینگے وارث بنائیں گے، ٹھیک ہے نہ؟"

سریندر: "شاید ایسا ہی ہو، لو کوٹھی آگئی"۔

بندا: "ذرا ایک منٹ، پیشتر اس کے کہ ہم لوگ چچا صاحب سے ملیں کالی چرن اور میں تم سے کچھ تصفیہ کرنا چاہتے ہیں، ہمیں ایک ترکیب سوجھی ہے!"

سریندر نے دونوں کے چہروں پر نگاہ ڈالی، وہ حیران تھا کہ دیکھئے کیا گل کھلتا ہے؟

کالی: "جب تک چچا جاگیں آؤ ذرا چائے پی لیں"۔

چنانچہ تینوں بھائی میز پر بیٹھ گئے، اور چائے نوش کرنے لگے۔

بندا کا اشارہ پاکر کالی نے کہا: "ہم بنیوں کا تو اصول یہی ہے کہ بات جتنی مختصر ہو اتنی ہی اچھی، اس سے رائطہ نہیں بڑھتی، بڈھا لالہ تو ہم میں سے صرف ایک ہی کو اپنا وارث مقرر کرنا چاہتا ہے اور باقی دو کو کوڑی بھی نہیں دینا چاہتا، اس لئے ہر ایک کو تین چانس میں صرف ایک ہی ملتا ہے"۔

"واقعی"

"اچھا، تو بندو اور میں نے تو ساجھا کر لیا ہے۔ تم بھی چاہو تو اس ساجھے میں شریک ہو جاؤ"۔

"یہ کیسے؟"

بندا نے اٹیچی کیس میں سے تین ٹائپ شدہ کاغذ نکالے اور کہا "اس طرح" یہ ہے ہمارا اقرار نامہ (پڑھتے ہوئے) "ہم اقرار کرتے ہیں کہ چچا چھکن لال کی وصیت کی رو سے جتنا ورثہ جس کو ملے وہ ہم برابر برابر آپس میں تقسیم کر لیں گے۔ ہم تینوں اس پر دستخط کر کے نقصان سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ تم متفق ہو نہ......"

سریندر کو تجارتی معاملات کا کوئی تجربہ نہ تھا، اس تجویز کو سمجھنے میں اسے وقت لگا، مہاجن بھائیوں نے اس کی اور وضاحت کی، "موجودہ صورت میں ہم میں سے دو کو چچا کے ترکہ میں سے کچھ نہ ملے گا، لیکن اس اقرار نامہ کو ہم لوگ منظور کر لیں تو ایک تہائی رقم تو ضرور مل جائیگی"۔ سریندر سوچ رہا تھا اور مہاجن بھائیوں کی شوق بھری نگاہیں اس کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔

"کیوں جی پسند ہے نہ؟"

"تو پھر اِن تینوں کاغذوں پر دستخط کردو۔"

"اور ہم بھی دستخط کئے دیتے ہیں!"

میز پر اقرار نامے رکھ دیئے گئے اور قلم و دوات بھی۔ مگر سریندر نے کہا:

"نہیں، نہیں، مجھے منظور نہیں!!!"

"کیا پاگل ہو گئے ہو؟"

"آخر انکار کی وجہ؟"

"نہیں۔ نہیں، یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ہم چچا کو اُن کے مرتے وقت دھوکا دیں، انصاف اور ایمانداری دونوں کا تقاضا ہے کہ ہم بڈھے کو دھوکا نہ دیں۔"

مہاجن بھائیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر سریندر کے پیچھے پڑ گئے۔

"کیا تمھارے دماغ میں فتور ہے؟ کیا تم اتنے تارک الدنیا ہو کہ تمھیں دولت کی کوئی پرواہ نہیں کیا تمھارے دل میں یہ سمائی ہے کہ فنِ مصوری سے تمھیں کوئی دولت مِل جائیگی۔ بہر حال آیندہ کبھی ہمارے آگے دستِ سوال دراز نہ کرنا اور اپنے بالاخانے ہی پر پڑے سڑتے رہنا۔"

(۴)

مہاجن بھائیوں نے بیچارے سریندر کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ مگر جس قدر اُنھوں نے زیادہ کوشش کی اُسی قدر وہ زیادہ اکڑ گیا۔ اس کی نگاہوں میں بھائیوں کی ضد بے جا اور عقل سے بعید تھی۔

بندا سرن اب کے نرم لہجہ میں بولا "بھائی سریندر ہم تمھارے دل کو اب بھانپ گئے"

"اِس کا مطلب؟"

"کالی چرن، تم کتنے بھولے بھالے بنتے ہو، مَیں تو تمھیں اتنا چالاک نہیں سمجھتا تھا۔"

بندا سرن: "اور نہ مَیں تمھاری ہوشیاری کو پا سکا۔"

سریندر اور زیادہ برہم ہوا، اور بھائیوں سے ایک بار پھر مشورہ چاہا۔

بندا سرن: ہم دونو تو کلکتہ اور کراچی میں چچا جان کے کام میں لگے رہے، اور تم یہاں دہلی میں تھے کہیں بڈھے کو منانے کا تو موقع نہیں مِل گیا، اور وصیت تو نہیں لکھالی ہے، پھر ہمیں ذلیل کرنے کے لئے یہ ڈرامہ کھیلا جارہا ہے۔"

کالی چرن: "کیوں حضرت! خوب دھوکا دے رہے ہو!"

اِن الفاظ نے سریندر کے شیشۂ دل پر نوکِ سنان کا کام کیا، مگر پھر بھی وہ ہنسکر بولا:

"یہ سفید جھوٹ ہے، نہ میں چچا سے کبھی ملا اور نہ میرے پاس کوئی وصیت نامہ ہے، میرا چانس تم سے کسی طرح زیادہ نہیں۔"

"اِس کا ثبوت؟"

"ہاں ہاں اس کا ثبوت؟"

"بھلا میں اس بات کو ثابت کیسے کروں!"

اقرار نامے پھر آگے دھرے گئے" تو بس ان پر دستخط کردو۔"

"ہاں دستخط کردو، ورنہ........."

صداقت پسند، سلامت رَو سُریندر نے اب دونوں پر نگاہ ڈالی کہ دونوں غصہ سے لال ہورہے تھے پھر اُس نے تینوں اقرار ناموں پر دستخط کردیئے۔ اور ایک اقرار نامہ اپنی جیب میں ڈال لیا۔

اتنے میں ایک نوکر نے آکر اطلاع کی کہ سیٹھ صاحب نے آپ لوگوں کو یاد کیا ہے۔

(۵)

جھکن لال بسترِ مرگ پر استقلال کے ساتھ دمِ واپسیں کا انتظار کررہے تھے، وہ محسوس کررہے تھے کہ شاید ہی رات بھر کی مہلت ملے، جمپا کی طرف اپنا سر سرکایا، آنکھ کے اشارے سے وہ ان کے دلی جذبات کو بھانپ گئی، اُس نے نہایت سنجیدگی سے اطلاع کی کہ "لڑکے آگئے ہیں"۔ اور تینوں کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ تینوں بھائی بستر کے اردگرد آکھڑے ہوئے۔ کالی چرن اور بندا سرن اپنے نفیس سوٹوں میں ملبوس تھے ہی، ان کے چہرے سے سنجیدگی ترشح ہوتی تھی۔ بیچارہ سُریندر وہی دقیانوسی کوٹ پہنے ہوئے تھا، جس پر اُن رنگوں کے داغ بھی تھے جن سے وہ نقاشی کیا کرتا تھا۔ اس کا چہرہ بھی حسبِ معمول پژمردہ تھا۔

بڈھے سیٹھ نے جو چراغِ سحری کی طرح ایک آدھ جھونکے کا منتظر تھا، دھیمی آواز سے بولا:

"عزیزو، مَیں نے تمھیں اِس لیئے بُلایا ہے کہ تمھیں جی بھر کر آخری بار دیکھ لوں، تمھارے خیالات بھی جاننا چاہتا ہوں، یہ کم بخت دولت کسی کے ساتھ نہیں جاتی ہے، آخر اسے کسی نہ کسی کو سونپنا ہی پڑتا ہے یہ بتاؤ کہ تم کو مل جائے تو کیا کرو گے؟" کالی چرن! اگر میں تمھیں یہ ساری دولت سونپ دوں تو تم کیا کرو گے؟"

کالی چرن کا دل بلّیوں اُچھلنے لگا، کالر کو داہنے ہاتھ کی اُنگلیوں سے سرکاکر (جن کے ناخن سلیقہ سے کٹے ہوئے تھے) بولا:

"چچا جان آپ ابھی سے ہی رخصت کی بات چیت کرنے لگے، ہم تو چاہتے ہیں کہ ابھی عرصہ تک آپ کا

دستِ شفقت ہمارے سروں پر رہے۔ مگر آپ کے فرمان کے مطابق اگر مجھے یہ خزانہ مل جائے تو میں اسے شکر کی تجارت میں لگا دوں اور اس میں خوب اضافہ کروں۔"

بوڑھے سیٹھ نے اب بندا سرن کی طرف متجسس نگاہوں سے دیکھا اور زبان حال سے کہا:

"تم بندا سرن!"

بندا سرن نے آہ سرد بھری "چچا صاحب، آپ کو تکلیف میں دیکھ کر بڑا دُکھ ہوتا ہے۔ دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے، کلیجہ منہ کو آتا ہے، بھائی کالی چرن کی طرح مَیں بھی دست بدعا ہوں کہ آپ جلد شفایاب ہو جائیں۔"

"اگر ایسا نہ ہوا تو......"

"چچا صاحب میں تو سیمنٹ کی تجارت کو فروغ دینے کی کوشش کرونگا۔"

اب بوڑھے سیٹھ نے سریندر کمار سے پوچھا "تمھارا کیا خیال ہے؟"

"چچا جان! میری خواہش آپ سے چھپی ہوئی نہیں ہے، میں اس سُود پر گذارہ کرونگا اور مصوری ہی کرتا رہونگا۔"

مہاجن بھائیوں کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی، اور وہ دل میں پچھتا رہے تھے کہ اس بیوقوف کو خواہ مخواہ ساجھے میں شریک کیا۔ لیکن سیٹھ جی جو نفسیات کے ماہر تھے تاڑ گئے کہ کون ریاکار ہے اور کون صداقت پسند۔ بولے۔

"تو تینوں میں سے دیانت دار تمھیں ہو۔"

(۶)

سب پر محویت طاری تھی، سیٹھ جی کا چہرہ زبان حال سے کالی چرن و بندا سرن کی ریاکاری پر لعنت بھیج رہا تھا، اور سریندر کی صداقت کی داد دے رہا تھا۔ لمحہ بھر کے توقف کے بعد اُنھوں نے کہا "کاغذ لے آؤ اور چمپا کو بُلا لاؤ تاکہ وہ میری وصیت کو لکھ لے اور میں بھی اس پر دستخط کر دوں۔"

مصوّر خوشی سے پھُولا نہ سمایا۔

سریندر مصیبت و مایوسی سے اتنا مانوس ہو چکا تھا کہ اس کو یہ خواب میں بھی خیال نہ آسکتا تھا کہ کبھی میرے دن بھی پھریں گے!

مہاجن بھائی بھی کم متحیر نہ تھے، مگر اپنی ہوشیاری پر نازاں تھے کہ ہم نے کس طرح اقرار نامے پر دستخط کرا لئے، اگر اس قدر دُور اندیشی سے کام نہ لیا ہوتا تو اس بڈھے کے آخری فیصلے نے ہمیں برباد کر دیا [illegible]

کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی تھی۔

ایک بھائی تو چمپا کے بُلانے کے لیئے دوڑا، دوسرے نے قلم دوات میز پر دھر دی، اور سریندر نے جو عالم حیرت واستعجاب میں کھڑا تھا اپنی جیب سے وہی کاغذ نکالا جس پر اقرار نامہ لکھا ہوا تھا۔

لاغر ہاتھوں نے کاغذ کے اس پُرزے کو حسب عادت کھولا، چمپا کے لئے کرسی لانے میں ایک منٹ لگا، اور اس قلیل عرصے میں سیٹھ چھکن لال کی نگاہ اُس تحریر پر پڑی۔

ایکبے بوڑھے کی جو آواز سُنائی دی بے حد کرخت تھی۔

"یہ کیا مذاق ہے! یہ کیا مذاق ہے!"

لاغر ہاتھ کانپ رہے تھے اور کاغذ کا پرزہ بھی۔

"تم تینوں نے یہ اقرار نامہ لکھا ہے اور آج ہی؟"

کالی چرن نے کاغذ چھیننے کی کوشش تو کی مگر بعد از وقت، بندا سرن نے بڈھے کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا "چچا جان! یہ تو محض دل لگی تھی"

"اچھا دل لگی بھی تو اس دل لگی کا خمیازہ اب تم تینوں کو بھگتنا پڑے گا"

چمپا سیٹھ چھکن لال کے کانپتے ہوئے جسم سے چمٹ گئی، اور سریندر سے کہا "دوڑو، پروہت اور ڈاکٹر دونوں کو بُلا لاؤ!"

———.(۷).———

گھنٹہ بھر سریندر گول کمرے میں بیٹھا رہا، مہاجن بھائی رخصت ہو چکے تھے، وہ اپنی مکاری پر اتنے نہ جھلائے تھے جتنے کہ سریندر کی بیوقوفی پر برافروختہ ہو رہے تھے۔

کالی چرن: "تمھیں نے سب کو تباہ کر دیا"

بندا سرن: "افسوس قارون کا خزانہ ہاتھ سے جاتا رہا"

سریندر: "نہ میرے پاس کچھ تھا نہ میں نے کچھ کھویا، جیسا پہلے تھا ویسا ہی اب بھی ہوں"

تاہم اس کو بھی رنج ضرور تھا، اور وہ اتنا ضرور محسوس کرتا تھا کہ میں نے تینوں شخصوں کی قسمت کو اپنی غلطی سے برباد کر دیا۔ میری وجہ سے بوڑھے چچا کو یہ خیال ہوا کہ ہم تینوں مکار، ریاکار اور زمانہ ساز ہیں، مجھ سا بے وقوف کون ہوگا؟"

آخر دروازہ کھُلا، ڈاکٹر کے چہرے سے معلوم ہوا کہ چراغ سحری ہمیشہ کے لئے بجھ چکا ہے۔

پروہت جی بھی ساتھ تھے، وہ چمپا کو تسلی دے رہے تھے، مگر چمپا زار و قطار رو رہی تھی۔

جب ڈاکٹر اور پروہت چلے گئے تو سریندر چمپا کے پاس آیا اور بولا: "چچا جان کے چل بسنے کا مجھے بہت رنج ہے، ان کو میری بیوقوفی سے سخت قلق ہوا ہوگا۔"

چمپا نے کہا "تمھیں تو اس لئے افسوس ہے کہ تمھاری قسمت بنکر بگڑ گئی۔"

"مجھے اس سے انکار نہیں، مگر مجھے زیادہ تر اسی لئے رنج ہے کہ چچا جان کو یہ یقین ہوگیا کہ ہم خود غرض اور ناہنجار ہیں۔"

اِس صداقت پر چمپا کے دل کی کلی کھل گئی۔

منہ ہاتھ دھو کر چمپا نے ایک نیلے کنارے کی سفید ساڑی پہنی، سریندر کو اس کا نکھرا ہوا حسن بہت ہی بھایا۔

چمپا: "سریندر! اب افلاس سے کیسے نپٹو گے؟"

سریندر کے چہرے پر اُداسی چھا گئی، بولا "میں مصوری کرتا رہونگا اور اُمید کا رشتہ بھی نہ چھوڑونگا لیکن میں ہمیشہ نادار ہی رہونگا اور اِن حالات میں اپنی دلی آرزو پھر کبھی ظاہر نہ کرونگا۔"

چمپا کے رخسارہ آگ کی تپش سے اور بھی چمک اُٹھے "تو کیا اہل ثروت ہی محبت میں کامیاب ہوتے ہیں؟"

سریندر کے چہرے پر پھر اُمید کی جھلک نظر آئی، اُس نے پوچھا:

"چمپا! اس سے تمھارا مطلب؟"

چمپا نے سریندر کی طرف دیکھا مگر شرم سے آنکھیں نیچی ہوگئیں، یہ نگاہ ہزاروں الفاظ سے زیادہ معنی خیز تھی۔

سریندر عالم محویت میں تھا اور اُس کی زبان سے بے اختیار یہ کلمہ نکلا "چمپا! سچ مچ چمپا"

چمپا کے چہرے کی خوبصورتی کو دو گستاخ زلفیں اور بھی دوبالا کر رہی تھیں۔

"جب میں ایک غریب بھکارن تھی اور تم ایک رئیس کے وارث تھے تو تمھاری یہ آرزو کچھ وقعت نہ رکھتی تھی"

چمپا کی والدہ چائے لائی۔ چمپا آگ کے پاس سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور بڑے پیار سے بولی:

"ہاں! سُنا، سریندر کیا کہتے ہیں؟"

ہاں بیٹی، تو تم نے کیا جواب دیا؟

چمپا: "ہاں! ہاں!! ہاں!!!

سریندر کے دل پر سے ایک بوجھ سا اُتر گیا۔ وہ کہنے لگا "اب میں مصوّری چھوڑ کر کوئی اور ذریعہ معاش اختیار کرونگا۔ اب اسے چھوڑنے میں مجھے کوئی رنج نہیں!"

چمپا: "یہ تو تم نے بڑی اچھی بات کہی، مگر سچ کہتے ہو؟"

سریندر: "بے شک"

چمپا: "خیر، خیر! تم شوق سے مصوّری کرتے رہنا"

سریندر: "لیکن اس سے ہم دونوں کی گذر کیسے ہوگی؟"

چمپا: "اب نہ آپ ہی کو فکر معاش میں پڑنے کی ضرورت ہے اور نہ مجھکو"

سریندر نے محسوس کیا کہ اس میں کچھ راز پنہاں ہے؛ پوچھا "تو اس سے تمھارا کیا مطلب ہے؟"

چمپا: "آپ کے چچا آپ کا پورا انتظام کر گئے ہیں"

"ہیں! کس طرح؟"

"اس طرح کہ جب سیٹھ جی نے تم سب کو وراثت سے محروم کر دیا تو ڈاکٹر اور پروہت کی موجودگی میں یہ سب مال و متاع وہ اپنی خادمہ چمپا یعنی آپ کی محبوبہ کو دے گئے"

تیس سال پہلے

زمانہ بابتہ نومبر ۱۹۰۹ء میں سب سے پہلا مضمون "شاہراہِ حیات" پر مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب کے۔سی۔ایس۔آئی سابق وزیرِ اعظم حیدر آباد دکن کا ہدیہ ناظرین ہوا تھا۔ جس کا مختصر اقتباس درج ذیل ہے:۔

اللہ اللہ انسان بھی عجب طلسمات کا پتلہ ہے بدو شعور کے بعد اسکی عمر آخر دم تک لاکھوں آرزوؤں کی کشمکش میں گزرتی ہے اور اسکی وجہ یہی ہے کہ انسان جب اپنی کسی اُمید کی پیروی میں ہر طرف تگ و دو کرکے تھک جاتا ہے اور مایوسی کا ابر اسکے دل پر چھا جاتا ہے تو ناوک فکر سے زخمی ہو کر بیچین ہو جاتا ہے اور ہزاروں آرزوئیں اور تمنائیں اُمنڈ اُمنڈ کر ہر طرف سے دھاوا کرتی ہیں۔ ایسی حالت میں انسان دریائے حیرت میں غرق ہو جاتا ہے اور اسکی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس آرزو کو ترجیح دے اور کونسی اُمید کے ساتھ وابستہ ہو جائے، کسکی پیاری صورت سے نظر پھیر لے اور کس دل لُبھانیوالی تصویر کو مرکزِ نظارہ بنائے۔ کسکی محشر بپا کرنیوالی رفتار پر دل و جان کو صدقے کرے۔ جستجو کرے تو کسکی اور کونسا انمول ہیرا ڈھونڈھکر نکالے۔ بہر حال ایک آئینۂ حیرت آنکھوں کا پردہ بنجاتا ہے اور عقل و حواس بھی دامن نظارہ سے وابستہ ہو کر ایک روح ایک قالب بنجاتی ہیں اسکی لذت اُسی دل سے پوچھئے جو اس منزل کا دلدادہ ہو یا اسکا نشانہ بنا ہو۔ لیکن یہ ساری آفتیں جو ہمارے سر پڑ جاتی ہیں اسکی وجہ صرف ہماری نافہمی اور بے دست و پائی ہے اس لئے کہ ہماری زندگی زمانہ کی نیرنگیوں کے ساتھ اس طرح اُلجھی ہوئی ہے جیسے دامن خار کے ساتھ یا نظر آئینہ کے ساتھ دنیا کی ہزار دلچسپیوں اور بے شمار دلبستگیوں سے ہر وقت مقابلہ ہوتا ہے اور ہر ایک نیرنگی ہم کو محوِ حیرت بنا دیتی ہے کہ تمیز باقی نہیں رہتی۔

مخمّس بر غزل حضرت بیخود دہلوی

نتیجۂ فکر رائے سدھ ناتھ بلی صاحب فراقی دریا آبادی

ہے کس خیال میں بھولا ہوا خودی کیا ہے — خبر نہیں کہ روش رسم و راہ کی کیا ہے
نہ کام عقل سے جو نے وہ آدمی کیا ہے — گریز راہ وفا سے یہ کج روی کیا ہے
سمجھ تو دل میں تقاضائے دلبری کیا ہے

سمجھ میں آتا نہیں راز واقعی کیا ہے — خوشی کسی کی ہے کیا غایت دلی کیا ہے
غرور و ناز ہے کیا اور عاجزی کیا ہے — ستم کے بعد خوشامد یہ دل لگی کیا ہے
تسلیوں کی ضرورت مجھے ابھی کیا ہے

جمال ہستی آزاد کی بہاریں دیکھ — ریاض عالم ایجاد کی بہاریں دیکھ
نمود سبزہ و شمشاد کی بہاریں دیکھ — بہار حسن خدا داد کی بہاریں دیکھ
یہ پھول کیا یہ چمن کیا ہے یہ کلی کیا ہے

میں صاف صاف تو کہتا ہوں ہمنشیں تجھ سے — یہ بات ہوگی نہ زنہار دل نشیں میرے
ہزار کوئی تقاضا کرے ہزار کہے — وفا کا عہد نہ باندھوں گا چار دن کے لئے
یہی ستم ہیں تو امید زندگی کیا ہے

کہا جو آپ برا مانیے مری سنیئے — بھلا ہے فائدہ کیا آئے دن کی زحمت سے
ہٹائیے کہیں جھگڑا ابھی یہ نجات ملے — نگاہ پھیر کے کہہ دیجیے ہم نہیں ملتے
بگاڑ کے لئے دشمن سے سوچ ہی کیا ہے

ذرا مری بھی سنیں آپ ادھر اٹھا کر آنکھ — یہ بے رخی تو مناسب نہیں لگا کر آنکھ
نہ کیجئے مجھے مایوس یوں چرا کر آنکھ — گلے پہ پھیرئیے خنجر مگر ملا کر آنکھ
نظر بھی اٹھ نہیں سکتی یہ نازکی کیا ہے

جہاں کی فکر میں تو ہوش ہی نہ تھا مجکو — بہت ہی اپنے تغافل سے ہے حیا مجکو
[illegible] رضا مجکو — ابھی نہ رنج و مسرت میں آزما مجکو

سریندر کے دل پر سے ایک بوجھ سا اُتر گیا۔ وہ کہنے لگا "اب میں مصوری چھوڑ کر کوئی اور ذریعہ معاش اختیار کرونگا۔ اب اسے چھوڑنے میں مجھے کوئی رنج نہیں!"

چمپا: یہ تو تم نے بڑی اچھی بات کہی، مگر سچ کہتے ہو؟"

سریندر: "بے شک"

چمپا: "خیر، خیر، تم شوق سے مصوری کرتے رہنا"

سریندر: "لیکن اس سے ہم دونوں کی گذر کیسے ہوگی؟"

چمپا: "اب نہ آپ ہی کو فکر معاش میں پڑنے کی ضرورت ہے اور نہ مجھکو"

سریندر نے محسوس کیا کہ اس میں کچھ راز پنہاں ہے؛ پوچھا

"تو اِس سے تمھارا کیا مطلب ہے؟"

چمپا: "آپ کے چچا آپ کا پورا انتظام کر گئے ہیں"

"ہیں! کس طرح؟"

"اس طرح کہ جب سیٹھ جی نے تم سب کو وراثت سے محروم کردیا تو ڈاکٹر اور پروہت کی موجودگی میں یہ سب مال و متاع وہ اپنی خادمہ چمپا یعنی آپ کی محبوبہ کو دے گئے"

تیس سال پہلے

زمانہ بابتہ نومبر ۱۹۰۹ء میں سب سے پہلا مضمون "شاہراہ حیات" بہ مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب کے۔سی۔ایس آئی سابق وزیر اعظم حیدرآباد دکن کا ہدیہ ناظرین ہوا تھا۔ جس کا مختصر اقتباس درج ذیل ہے:۔

اللہ اللہ انسان بھی عجب طلسمات کا پتلہ ہے بد و شعور کے بعد اسکی عمر آخر دم تک لاکھوں آرزوؤں کی کشمکش میں گزرتی ہے اور اسکی وجہ یہی ہے کہ انسان جب اپنی کسی اُمید کی پیروی میں ہر طرف تگ و دو کر کے تھک جاتا ہے اور مایوسی کا ابر اسکے دل پر چھا جاتا ہے تو ناوک فکر سے زخمی ہو کر بیچین ہوجاتا ہے اور ہزاروں آرزوئیں اور تمنائیں اُمنڈ اُمنڈ کر ہر طرف سے دھاوا کرتی ہیں۔ ایسی حالت میں انسان دریائے حیرت میں غرق ہوجاتا ہے اور اسکی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس آرزو کو ترجیح دے اور کونسی اُمید کے ساتھ وابستہ ہوجائے، کسکی پیاری صورت سے نظر پھیرلے اور کس دل لُبھانیوالی تصویر کو مرکزِ نظارہ بنائے کسکی محشر بپا کرنیوالی رفتار پر دل و جان کو صدقے کرے۔ جستجو کرے تو کسکی اور کونسا انمول ہیرا ڈھونڈھ کر نکالے۔ بہر حال ایک آئینۂ حیرت آنکھوں کا پردہ بنجاتا ہے اور عقل و حواس بھی دامن نظارہ سے وابستہ ہو کر ایک روح ایک قالب بنجاتی ہیں اسکی لذت اُسی دل سے پوچھئے جو اس منزل کا دلدادہ ہو یا اسکا نشانہ بنا ہو۔ لیکن یہ ساری آفتیں جو ہمارے سر پڑجاتی ہیں اسکی وجہ صرف ہماری نافہمی اور بے دست و پائی ہے اس لئے کہ ہماری زندگی زمانہ کی نیرنگیوں کے ساتھ اس طرح اُلجھی ہوئی ہے جیسے دامن خار کے ساتھ یا نظر آئینہ کے ساتھ دنیا کی ہزار دلچسپیوں اور بے شمار دلبستگیوں سے ہر وقت مقابلہ ہوتا ہے اور ہر ایک نیرنگ ہم کو محوِ حیرت بنادیتی ہے کہ تمیز باقی نہیں رہتی۔

مخمس بر غزل حضرت بیخود دہلوی

نتیجۂ فکر رائے سدھ ناتھ بلی صاحب فراقی دریا آبادی

ہے کس خیال میں بھولا ہوا خودی کیا ہے خبر نہیں کہ روش رسم و راہ کی کیا ہے
نہ کام عقل سے جو نے وہ آدمی کیا ہے گریز راہِ وفا سے یہ کج روی کیا ہے
سمجھ تو دل میں تقاضائے دلبری کیا ہے

سمجھ میں آتا نہیں راز واقعی کیا ہے خوشی کسی کی ہے کیا غایتِ دلی کیا ہے
غرور و ناز ہے کیا اور عاجزی کیا ہے ستم کے بعد خوشامد یہ دل لگی کیا ہے
تسلیوں کی ضرورت مجھے ابھی کیا ہے

جمالِ ہستی آزاد کی بہاریں دیکھ ریاضِ عالمِ ایجاد کی بہاریں دیکھ
نمودِ سبزہ و شمشاد کی بہاریں دیکھ بہارِ حسنِ خدا داد کی بہاریں دیکھ
یہ پھول کیا یہ چمن کیا ہے یہ کلی کیا ہے

میں صاف صاف تو کہتا ہوں ہمنشیں تجھ سے یہ بات ہوگی نہ زنہار دل نشیں میرے
ہزار کوئی تقاضا کرے ہزار کہے وفا کا عہد نہ باندھوں گا چار دن کے لئے
یہی ستم ہیں تو امیدِ زندگی کیا ہے

کہا جو آپ مرا مانیے مری سنیئے بھلا ہے فائدہ کیا آئے دن کی زحمت سے
ہٹایئے کہیں جھگڑا ابھی یہ نجات ملے نگاہ پھیر کے کہدیجئے ہم نہیں ملتے
بگاڑ کے لئے دشمن سے سوچ ہی کیا ہے

ذرا مری بھی سنیں آپ ادھر اٹھا کر آنکھ یہ بے رخی تو مناسب نہیں لگا کر آنکھ
نہ کیجئے مجھے مایوس یوں چرا کر آنکھ گلے پہ پھیریئے خنجر مگر ملا کر آنکھ
نظر بھی اٹھ نہیں سکتی یہ نازکی کیا ہے

جہاں کی فکر میں تو ہوش ہی نہ تھا مجکو بہت ہی اپنے تغافل سے ہے حیا مجکو
مری جوشن تو دکھا جادۂ رضا مجکو ابھی نہ رنج و مسرت میں آزما مجکو

کہ میں ابھی نہیں سمجھا تری خوشی کیا ہے

ہوا کئے جی ہیں وہ کہئے ثبوت کیا اُس کا مجھے تو آپ نے کیا کیا نہ آزما دیکھا
یقین آئے تو میں ابھی ہوں عرض یہ کرتا جو آپ لے نہ سکیں گے وہ امتحاں دوں گا
وفا شریکِ محبت ہے تو کمی کیا ہے

یہ نفس خوار ہے ادراک و فہم کا دشمن غضب ہے گھیرے ہوئے مجکو فکر نازش تن
بھٹکتا راہِ تغافل میں ہے یہ اپنا من ابھی کہاں ترے جلوے سے دل ہوا روشن
الٰہی موت سے پہلے یہ بیخودی کیا ہے

ہنسی کی بات ہے کہہ دی خفا نہ ہو صاحب تمھیں کہو یہ روش کیا ہے اور کیا ہے ڈھب
مجھے تو ہوتا ہے دیکھ اور سُن کے سخت عجب ہر ایک بات یہ چون و چرا کا کیا مطلب
سمجھ میں کچھ نہیں آتا یہ فارسی کیا ہے

خیال کر تو ذرا دل میں اپنے اے غافل فضول بحث سے ہوگا نہ آہ کچھ حاصل
خبر نہیں تجھے اس کی ہے ہو تصور یحل کبھی نظارۂ بر رو کبھی خیال بدل
ہزاروں روز مسرت ہیں عید ہی کیا ہے

حضور سمجھیں نہ ایسا کبھی خیال ہے خام جو عرض کر رہا ہوں میں نہیں ہے اسمیں کلام
یہ جانتے نہیں کیا ہے حلال کیا ہے حرام شراب و حُور کا سُن آئے ہیں کسی سے نام
جنابِ شیخ کو جنت سے آگہی کیا ہے

نہیں ہے آہ شکایت کی اس میں بات کوئی کہوں گا میں تو ہمیشہ مگر خدا لگتی
نہیں ہے راس یہ تقدیر ہی مجھے میری ہوا بگڑ گئی ناپائدار دُنیا کی
ہزار میرے مخالف ہیں موت ہی کیا ہے

ہزار بار وہ فرما چکے ہیں یہ مجھ سے یہ کس کا منھ ہے مرے آگے جو زباں کھولے
اگر ہے عقل سے بہرہ تو پہلے خود سمجھے پرائے بس میں ہو جو اس کو دل نہیں کہتے
جو مستعار ملی ہو وہ زندگی کیا ہے

فراقی آپ سے کچھ جھوٹ ہم نہیں کہتے بزرگ آتے نظر میں ہیں شاذ ہی ایسے
سنا تھا ذکر ملاقات کو جو ہیں پہونچے بہت ہی خوش ہوئے ہم آج مل کے بیخود سے
خودی کو جو نہ مٹا دے وہ آدمی کیا ہے

تنقید کتب

ارمغانِ بازؔ

ارمغان بازؔ کے نام سے محمد تراب علی خاں صاحب بازؔ حیدرآبادی کا ایک مختصر مجموعہ کلام شائع ہوا ہے۔ اسکے پہلے جزو میں ایک مختصر سا مقدمہ ہے۔ باقی دو جزو میں حضرت بازؔ کا کلام ہے۔ آخری جزو میں عنایت علی صاحب ہلالؔ قریشی نے کلام بازؔ پر ایک تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ بازؔ صاحب کی شاعری پرانی وضع کی شاعری ہے، مگر کلام سے پختگی برتی ہے۔ ذیل میں چند اشعار نمونتاً درج کئے جاتے ہیں جن سے ناظرین زمانہ بازؔ صاحب کی شاعری کا خود ہی اندازہ فرمالیں گے ؎

تعینات کے پردے اُٹھا نہیں سکتے — خُدا کو دیکھتے ہیں پر دکھا نہیں سکتے

بندہ ہوں کہ اصل میں خدا ہوں — سمجھا نہیں آج تک میں کیا ہوں

نہیں درد سے تڑپتا نہ وہ غمگسار ہوتا — یہ سکوں کہاں سے ملتا جو نہ بیقرار ہوتا

طے کئے ہم نے بھی وحشت میں بیاباں کتنے — ٹوٹ کر پاؤں میں ہیں خارِ مغیلاں کتنے

ایسے دو دن کی بہاروں سے خزاں اچھی ہے — ہم اُجڑتے ہوئے دیکھے ہیں گلستاں کتنے

چُھپتی نہیں کسی کی کبھی شرمسار آنکھ — دُنیا میں کوئی لاکھ ملائے ہزار آنکھ

ہم نے حضرت بازؔ کے یہ چند اشعار سرسری نظر میں اُٹھائے ہیں۔ پانچویں شعر کے دوسرے مصرعہ میں لفظ "ہم" بمعنی "ہمنے" استعمال کیا گیا ہے۔ آخری شعر کے دوسرے مصرعہ میں "لاکھ" کے بعد "ہزار" لایا گیا ہے۔ یہ محاورے کم سے کم شمالی ہند میں مروج نہیں ہیں۔ اس مجموعہ میں غزلوں کے علاوہ بعض مشہور شعرا کی غزلوں پر تضمینیں بھی ہیں۔ شروع میں بازؔ صاحب کی قلمی تصویر کا ہاف ٹون فوٹو بھی دے دیا گیا ہے۔

تنقیدات عبدالحق

ڈاکٹر مولوی عبدالحق سکرٹری انجمن ترقی اُردو ہماری تعریف و تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ آپ

ملنے کا پتہ:۔ محمد تراب علی خاں بازؔ "کاشانۂ باز" بازار گھانسی میاں، حیدرآباد دکن۔

ہندوستان کے مسلمہ اہلِ قلم اور مشہور خدمتگذار اُردو ہیں۔ اور ہندوستان کے اکثر اہل قلم اپنی تصنیف وتالیف پر آپ سے مقدمہ لکھانا باعث فخر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ مولانا نے بہت سی کتابوں کے مقدمے لکھے ہیں اور بہت سی کتابوں پر تنقیدیں کی ہیں۔ جو اس سے پہلے کتابی صورت میں یکجا کر کے شائع ہو چکی ہیں۔ اب انجمن ترقی اُردو دہلی نے ان کی دس تنقیدوں کا ایک مختصر سا مجموعہ شائع کیا ہے جو ہماری رائے میں یونیورسٹی تعلیم نصاب میں شامل ہونے کے لائق ہے۔ کیونکہ مولانا جس موضوع پر قلم اُٹھاتے ہیں، تنقید کا حق ادا کر دیتے ہیں، اور آپ کی تنقید ہمیشہ مکمل اور سبق آموز ہوتی ہیں۔ جس کے مطالعہ سے ہمارے اسکولوں اور کالجوں کے طالبعلموں کو تنقید نگاری کا سلیقہ معلوم ہو سکتا ہے۔ اس کی قیمت بھی معقول رکھی گئی ہے یعنی صرف آٹھ آنہ میں انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی سے پانچ جزو کی ادبی تنقیدوں کی یہ چھوٹی سی کتاب مل سکتی ہے۔

ہندوستان کا دیہی قرض

ہندوستان کی نوّے فیصدی آبادی دیہات میں رہتی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ زبوں حالت دیہات اور وہاں کے رہنے والے لوگوں کی ہے۔ یہ لوگ بہت تکلیف میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر پیٹ کو روٹی ملتی ہے تو تن کو لتا نہیں، اور اگر تن کو کپڑا ہے تو پیٹ کو روٹی نہیں۔ اس کے اسباب ظاہر ہیں کہ ہمارا کھیتی باڑی کا طریقہ دقیانوسی ہے اور کسانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ کیونکہ ان کو قرضداری ہی سے کبھی نجات نہیں ملتی۔ اس زیر باری کے کیا اسباب ہیں؟ اور اس کی ادائیگی کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ اس موضوع پر اس چھوٹی سی کتاب میں پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم۔ اے، اُستاد معاشیات جامعہ ملیہ دہلی نے خوب سیر حاصل بحث کی ہے۔ کتاب بہت مفید اور غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ خصوصاً دیہات کی ترقی چاہنے والوں کو اس کو ضرور پڑھنا چاہئے۔ حجم چھوٹی تقطیع کے ساڑھے تین جزو۔ قیمت چار آنہ۔ ملنے کا پتہ: مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی۔

حیات اجتماعی[1]

انسان آپس میں مل جل کر زندگی بسر کرنے کا عادی ہے۔ اسی باہمی میل جول کو انگریزی میں سوشل لائف اور ہندستانی زبان میں سماجی زندگی کہتے ہیں۔ اسی کا وسیع نام تمدن ہے۔ سید اکبر علی ایم۔ اے ایل ٹی نے اس چھوٹی سی کتاب میں سوشل لائف کے تمام ابتدائی مدارج پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہ کتاب گویا "سیاست مدن" کی ایک ابتدائی کتاب ہے۔ جس کا مطالعہ نتیجہ خیز اور سبق آموز ہوگا۔ اصطلاحات اور زبان اگر اور زیادہ سلیس اور عام فہم ہوتی تو یہ رسالہ بہت زیادہ مفید ہوتا۔ جو لوگ میونسپل و ڈسٹرکٹ بورڈ اور لوکل سلف گورنمنٹ کے معنی اور غرض و غائت سمجھنا چاہتے۔ وہ اس چھوٹی سی کتاب کا ضرور مطالعہ کریں۔

---

[1] قیمت چار آنہ۔ ملنے کا پتہ: سید نجم الحسن نقوی، تاجر کتب، چوک لکھنؤ۔

مباحثہ

اُردو، ہندی، ہندوستانی

از "حق پرست"

"ہماری مزدوروں کی حیثیت اس سے ثابت ہے کہ ہمارے بڑے سے بڑے ادیبوں نے اپنے
"طبعزاد کلام میں پرمیشور نہیں اللہ یا خدا ہی کہا، جنیو کو زنار اور سنکھ کو ناقوس کہا، اُن کی شاعری
"میں ہندوستانی تہذیب وتمدن وادبیت کی کوئی خصوصیت نہ آئی، ترکیب میں نہ دوہے آئے
"نہ چھند، نہ کبت نہ سورٹھے، تخیل وتشبیہات میں وہی غیر ملکی چیزیں رہیں۔ محبت کیلئے لیلیٰ ومجنوں،
"شیریں وفرہاد، گل وبلبل، سخاوت کیلئے حاتم، دولت کے لئے قارون کا خزانہ، غرض کہیں ہندو
"ادبیت، ہندو تہذیب اور ہندو تمدن کا نام ونشان تک نہیں ....." اقتباس از زمانہ بابت اپریل ۱۹۳۹ء

مکرمی جگر بریلوی نے زمانہ بابتہ اگست ۱۹۳۹ء میں جن کریمانہ الفاظ میں اِس ناچیز کی جانب توجہ فرمائی ہے اُس کے لئے مَیں اُن کا ممنون ہوں۔ ممدوح کے اِس مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے قریب ہوتے جاتے ہیں۔ اب دو امور میں اختلاف ہے۔ ایک وہ رائے ہے جو اقتباس بالا میں ظاہر کی گئی ہے۔ اس کے متعلق مکرمی جگر رقمطراز ہیں کہ:۔

"جن اثرات کے تحت کہ اُردو کی ترقی ہوئی اُن کی وجہ سے یہ ضرور ہوا کہ خود ہندوؤں کی ادبیات ہندو تہذیب وتمدن کے آثار سے خالی رہیں۔ لیکن اِس سے یہ نتیجہ کیونکر نکالا جا سکتا ہے کہ ہندو مزدور اور نقال رہے؟"

میں سمجھتا ہوں کہ نقل اُس کو کہتے ہیں۔ جسمیں اپنی انفرادیت کا نہیں بلکہ غیر کی انفرادیت کا اظہار ہوتا ہے، اور چونکہ کسی قوم کی انفرادیت اُس کی تہذیب وتمدن سے عیاں ہوتی ہے۔ اِس لئے جب کسی کا کلام اِن اہم اجزا سے معرّا ہو اور اُن چیزوں کو پیش کرے جو غیروں کی انفرادیت کے مظہر ہیں تو میری دانست میں اُس کو نقالی ہی کہا جائے گا۔ میں مانتا ہوں کہ یہ لفظ بہت نامطبوع ہے اور اگر اس سے مکرمی جگر اور دوسرے ہندو بزرگوں کو تکلیف پہنچی ہے تو میں تہ دل سے معافی کا خواستگار ہوں۔

دوسرا اختلافی امر مکرمی جگر کے حسب ذیل الفاظ سے ظاہر ہوگا:-

"یہ استدلال میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ چونکہ اُردو ادبیات میں ہندوانی تہذیب و تمدن کا فقدان ہے اس نے ہندوؤں کی ادبی حیثیت بھی پست و فروتر ہے۔"

اِس کے متعلق میرا معروضہ یہ ہے کہ زبان جذبات، خیالات، تصورات وغیرہ کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ جب اِس اظہار میں سلاست، زور اور خوبصورتی پیدا ہوتی ہے تو اُس کو ادبی حیثیت حاصل ہوجاتی ہے ظاہر ہے کہ اِنسان کے جذبات میں زور، خیالات میں تحریک اور تصورات میں تنوع اور خوبصورتی جسقدر ان چیزوں سے پیدا ہوسکتی ہے جن کا اپنی تہذیب اور تمدن سے تعلق ہے اُس قدر اُن چیزوں سے نہیں ہوسکتی، جن کا تعلق غیر تہذیب اور تمدن سے ہو۔ مسلمان مُصنفین اُردو میں جن جذبات و خیالات کے اظہار میں طبع آزمائی کرتے ہیں وہ اُس تہذیب و تمدن سے متعلق ہیں جو اُن کی خاص ہے۔ جو صورت کہ ہماری نہیں ہے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ اُردو کی حد تک مسلمانوں کی ادبی حیثیت ہم سے برتر و بالا ہوگی۔

اِس کے علاوہ میرے اِس خیال کی تائید میں ایک اور دلیل ہے جو میں نے اپنے ابتدائی مضمون مطبوعہ زمانہ بابتہ اکتوبر ۱۹۳۹ء میں پیش کی تھی۔ وہ یہ کہ ہماری دیویوں کے مذہبی جذبہ کا ہمارے گھر کے اندرونی ماحول پر یہ اثر ہے کہ وہ اُردو اور فارسی اور دوسرے غیر ہندو اثرات سے بہت کچھ محفوظ ہے اور چونکہ ہنوز ہم ہندو ہیں خواہ نام نہاد میں سہی۔ اِس لئے ہمارا تعلق پنڈتوں، مذہبی رسم و رواج اور ریتیج تیوہاروں سے اِس طرح ہوجاتا ہے کہ یہاں ہماری زبان سنسکرت کی طرف جُھک جاتی ہے جس کی وجہ سے ہماری زبان پر گھر میں کچھ اور تاثرات رہتے ہیں اور باہر کچھ اور۔ اِس طرح تسلسل اور یکسانیت کے قائم نہ رہنے سے ہماری اُردو میں وہ سلاست، وہ روانی، وتصنع سے بَری، قدرتی رونق نہیں رہتی جو مسلمان بھائیوں کی زبان میں ہوتی ہے اِس لئے کہ وہاں گھر اور باہر ایک ہی اثر کام کرتا رہتا ہے۔ کوئی غیر چیز خلل انداز نہیں ہوتی۔

میں مکرمی جگر بریلوی کے اِس نظریہ کو قبول کرنے سے بھی قاصر ہوں کہ:-

"اُردو کی ساخت اور اجزائے ترکیبی میں دونوں قوموں کے دل و دماغ اور انفرادی خصوصیتوں کے نشوونما کے امکانات اور صلاحیتیں موجود ہیں۔"

اگر ایسے امکانات اور صلاحیتیں اِسمیں موجود ہوتیں تو اُردو کے ذریعہ ہماری قومی زندگی میں بھی اصلاحی اور رو بہ ترقی انقلاب پیدا کرنے والے ادیب پیدا ہوتے۔ جیسا حالی، اکبر، اقبال وغیرہ مسلمان بھائیوں کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ پنڈت کیفی جی نے حالی کی مسدس (شکوۂ ہند) کا جواب لکھا اور خوب نو طبع

دکھلایا لیکن حالی کے کلام کی طرح وہ گھر گھر کا چرچا نہ بن سکا۔ بلکہ اُردو ادب کے شائقین کے لئے محض ایک دماغی چٹخارہ سا ہو کر رہ گیا۔ یہی صورت سرور، چکبست، محروم وغیرہ کی ہوئی جنھوں نے ہندو تہذیب و تمدن سے متعلق چیزوں کو اُردو میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ غالباً یہی وجہ تھی۔ جس سے منشی پریم چند بالآخر ہندی کی جانب رجوع ہونے پر مجبور ہوئے۔

اِس ضمن میں مَیں یہ حقیقت آشکار واقعہ پیش کرنا چاہتا ہوں کہ نظیر اکبرآبادی جب مہادیوجی کے بیاہ یا کرشن کنھیا کے بالپن کا تذکرہ فرماتے ہیں تو اُن کی زبان اُس زبان سے بالکل مختلف ہوتی ہے جو وہ اسلامی اعتقادات یا تمدن سے متعلق نظموں میں یا غزل گوئی وغیرہ میں استعمال فرماتے ہیں۔ مثال کے طور پر مَیں یہاں چند اشعار دیتا ہوں:۔

پہلے تو حمدِ خالقِ ارض و سما لکھوں ۔۔۔ بعد اس کے پھر میں نعت شہ انبیاء لکھوں
گر عمر بھر میں اُسکو لکھوں بھی تو کیا لکھوں ۔۔۔ بے انتہا وہ ہے تو غرض تا کجا لکھوں
سحر اس جھمک سے آیا نظر اک نگارِ رعنا ۔۔۔ کہ خود اُس کے حُسنِ رُخ کو لگا تکنے ذرہ آسا
خد و خال خوبی آگیں لب لعل پان سے رنگیں ۔۔۔ نظر آفتِ دل و دیں، مژہ صد مضرت افزا

ملاحظہ ہو اِن اشعار میں عربی اور فارسی الفاظ کی کیسی کچھ بھرمار ہے اور ترکیبوں میں کیسی فارسیت بھری ہے۔ یہ چُنے ہوئے چند اشعار نہیں ہیں۔ ایسے اشعار نظیر کے کلام کا خاصہ جز ہیں۔ اب اِس کے مقابلہ میں اُنھیں کا کلام دوسرے رنگ میں ملاحظہ ہو:۔

پہلے ناؤں گنیش کو لیجئے سیس نوائے ۔۔۔ جا سے کارج سِدّھ ہوں سدا مہورت لائے
بول بچن آنند کے پریم پیت اور چاہ ۔۔۔ سُن لو یارو دھیان دھر مہادیو کا بیاہ
بیٹھا تھا جو کنس کے من وہ بھر کر نیند نہ سوتا تھا ۔۔۔ کچھ بات سہائی نا اُس کو نت اپنی پلک بھگوتا تھا
اُس مندر میں اُن دونوں کے جب کوئی بالک ہوتا تھا ۔۔۔ کنس آن اُسے جھپ مارے تھا اُن مات پتا کا رونا تھا

ملاحظہ ہو کہ اِن دونوں زبانوں میں کسقدر فرق ہے۔ صاف ایک اُردو ہے تو دوسری ہندی۔ نظیر کے کلام کے دیکھنے کے بعد مَیں تو اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ جس حقیقت کو ہم یا ہمارے بزرگ سمجھ نہیں سکتے تھے میاں نظیر کی نکتہ رس نظر خوب دیکھتی تھی کہ ہندو تہذیب و تمدن کا اظہار ہندی ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے اُردو کے ذریعہ ممکن نہیں۔

جناب جگر صاحب کے تمام مضامین ہندوؤں کی مسلمان بھائیوں سے ناقدری اور کس مپرسی، اُردو سے ہندووانی عناصر کے اخراج، ہندوؤں کی تصنیفات کو غیر حقیقی معیار سے جانچنے اور تعصب کی نظر سے

دیکھنے وغیرہ کی شکایت سے پُر ہیں۔ یہ شکایت خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس زبان کے مالک ہم نہیں ہیں۔ اسی لئے مالکوں سے نا قدردانی کی شکایت کر رہے ہیں۔ اگر اُردو زبان ہماری ہوتی تو ہم اپنی خوبیوں کی داد کے لئے دوسروں کا مُنھ نہ تاکتے۔ جیسا مُسلمان ہماری داد کے محتاج نہیں ہیں۔

ہندوستان کی زبانوں میں کسی صوبہ کی زبان لے لیجئے۔ خاصی متمدن اور مہذب ہے۔ اور زمانۂ جدید کی ترقیوں یا تبدیلیوں کے ساتھ اپنے آپ کو ہمقدم رکھتے ہوئے ترقی کے راستہ پر برابر گامزن ہے۔ بنگالی زبان کی تو یہ کیفیت ہے کہ جدید ترین علوم میں بھی کوئی ایسا نہیں ہے جو اس کے ذریعہ حاصل نہ ہو سکے۔ ان زبانوں میں ہندو اس بات کے محتاج نہیں ہیں کہ برادرانِ وطن ان کی حوصلہ افزائی کریں اور سند دیں تب وہ آگے بڑھیں۔

اُردو میں ہمارا انتہائی کمال یہ ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ مُسلمان اساتذہ کے قریب تک پہونچتے ہیں۔ اُن پر سبقت کبھی حاصل نہ کر سکے۔ اُردو میں ہندی یعنی ہندوستانی الفاظ کی صورت بگاڑی گئی۔ انھیں مفرّس اور معرّب بنایا گیا۔ اور ہم نہ صرف صورت دیکھا کئے بلکہ ہم نے اُسی مفرّس اور معرّب طریقہ کی پیروی کی۔ کوئی ہندی یعنی ملکی خصوصیت پیدا نہ کر سکے جیسا ہندی کے شعرا تلسی داس جی کبیر داس جی سور داس جی وغیرہ نے کی تھی کہ اپنی چیزیں تو اپنے ڈھنگ پر رکھیں۔ لیکن جب کبھی عربی فارسی کا لفظ استعمال کیا تو اُس کو پہلے اپنا یعنی ہندی بنا کر۔ کیا یہ حقیقت کہ "اُردو میں خود ہندوؤں کے ادبیات' ہندوؤں کی تہذیب و تمدن کے آثار سے خالی رہیں" ہماری آنکھیں کھولنے کے لیئے کافی نہیں ہے؟ جب ہم خود اس زبان میں وہ عناصر پیدا نہ کر سکے جو ہندو تہذیب و تمدن کے مظہر ہوتے' تو بیچارے مسلمانوں سے کیا شکایت ہو سکتی ہے؟ ضرورت ہے کہ ہم اس حقیقت کو سمجھیں جو نظیر کا کلام اِسقدر وضاحت اور صراحت سے ہمیں سمجھاتا ہے۔

مکرمی جگر بریلوی' ہندو شعراء کے اُردو کلام کا مسلمان شعراء کے کلام سے مقابلہ اور موازنہ کرنا چاہتے ہیں تو شوق سے کریں اور جب اُن کی وہ معرکۃ الآرا کتاب شائع ہو جائے گی تو ہم بھی دیکھ کر خوش ہولیں گے۔ مگر ہم اُمید کرتے ہیں کہ جناب جگر اس سے بھی بحث کریں گے کہ اس زبان کا مزاج ابتدا ہی سے کیسا واقع ہوا ہے، اسمیں ہندو پن کو کہاں تک دخل تھا اور اسمیں وہ کون سے زبردست ہندوانی عناصر تھے۔ جن کو رفتہ رفتہ مسلمانوں کے تعصب نے خارج کر دیا؟ اور ہندو لاچار صورت دیکھا کئے۔ میں یہ بھی توقع کرتا ہوں کہ ممدوح اپنی اُس کتاب میں اُردو کے کم از کم دو ایک ہندو شاعر ایسے بھی بتلائیں گے جو سور داس' کبیر داس' تلسی داس وغیرہ کے پلّہ کے ہوں یعنی جن کے کلام نے ہندوؤں کو اُسی پیمانہ پر متاثر کیا ہو جس پیمانہ پر کہ ان

ہندی مشاہیر کے کلام نے کیا ہے یا جس پیمانہ پر کہ اُردو کے مسلم اساتذہ کے کلام نے مسلمانوں کو متاثر کیا ہے مکرمی جگرؔ نے اپنے ایک مضمون میں اِس فکر کا بھی اظہار فرمایا ہے کہ اگر ہندو اُردو سے دست بردار ہو جائیں تو ہمارے بزرگوں کی بڑی بھاری کمائی لُٹ جائے گی۔ میں عرض کرتا ہوں کہ اِس کے پیچھے ہماری ہستی ہی نہ لُٹ جائے۔ برادرانِ وطن اِس مسئلہ کو بڑی گہری نظر سے دیکھتے ہیں اور اُردو سے بہت گہرے مقاصد وابستہ رکھتے ہیں۔ حیدرآباد دکن میں جن نام نہاد اصلاحات کا حال میں اعلان ہوا ہے۔ اُنمیں یہ معلوم کرکے مکرمی جگرؔ کو یقیناً حیرت ہوگی کہ اُردو کو رزروڈ سبجکٹ[1] رکھا گیا ہے۔ یعنی اُردو کو ذریعہ تعلیم تو قرار دیا ہی تھا جس سے وہاں کی رعایا کا پچاسی فیصدی سے زائد حصہ، جس کی مادری زبان مرہٹی، تلنگی، کنیڑی یا ہندی ہے، تمام علوم و فنون اُردو ہی کے ذریعہ سیکھنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ اب اِس مسئلہ پر غور و خوض اور احتجاج کا حق بھی ساقط کر دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کی ایک بڑی حکومت کا جس کی رواداری کے آئے دن گیت گائے جاتے ہیں، یہ طرزِ عمل مسلمان بھائیوں کی ذہنیت کا پتہ دیتا ہے، اور ہماری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے۔

عزیز اللغات[2]

یہ لغت لکھنؤ کے نامور شاعر اور مشہور ادیب مرزا محمد ہادی صاحب عزیزؔ مرحوم کی یادگار ہے جو اُنھوں نے اپنی زندگی میں کمال محنت و عرق ریزی سے مرتب فرمائی تھی۔ اِس لغت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اِسمیں لفظوں کے علاوہ، اُردو جملوں، محاورات اور ضرب المثلوں کی تشریح بھی کر دی گئی ہے۔ لکھنؤ کی خاص ٹکسالی زبان سیکھنا ہو تو اِس لغت سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ طلبار کے لئے نہایت کارآمد چیز ہے۔ اِس کی لکھائی، چھپائی صاف ہے۔ حجم چھوٹی تقطیع کے ۷۰۰ صفحات۔ قیمت تین روپیہ

اکبر الہ آبادی[2]

اُردو کے مشہور اہلِ قلم حضرت طالبؔ الہ آبادی نے حضرت اکبرؔ مرحوم کی مفصل سوانحعمری تصنیف کی ہے، جسکی ترتیب و تدوین میں دیگر ذرائع کے علاوہ حضرت اکبرؔ مرحوم کے خطوط سے بھی بہت کچھ کام لیا گیا ہے۔ کتاب بہت دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ کلام اکبرؔ پر مفصل تنقید بھی کی گئی ہے اور حضرت اکبرؔ کے دلچسپ کلام کا بہت سا حصہ بھی اِس میں آگیا ہے۔ واقعی طالبؔ صاحب کی محنت و جانکاہی قابل داد ہے۔ بہرحال کتاب دلچسپ اور پرائیویٹ و پبلک لائبریریوں میں رکھنے کے قابل ہے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ عمدہ۔ بڑی تقطیع کے ۴۸۲ صفحات ضخامت۔ کتاب مجلد ہے اور اُس کی قیمت پانچ روپیہ۔

---

[1] Reserved Subject.

[2] دونوں کتابوں کے ملنے کا پتہ:- مطبع انوار احمدی الہ آباد

رفتار زمانہ

ہندوستانی مسائل

کانگریس ورکنگ کمیٹی کے مطالبے کے جواب میں ہزایکسیلنسی لارڈ لنلتھگو وائسرائے ہند نے ملک کے چھوٹے بڑے پچاس سے زائد معززین سے تبادلہ خیالات کرنے کے بعد برٹش گورنمنٹ کی طرف سے جو جواب ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو شائع کیا۔ اس سے ملک کے کسی طبقہ کی تسلی نہیں ہوئی۔ کانگریس نے مقاصد جنگ کی تشریح چاہی تھی اور یہ معلوم کرنیکی کوشش کی تھی کہ جمہوریت و آزادی کے جن اصولوں کی اس شد و مد کے ساتھ یوروپ میں حمایت کیجا رہی ہے۔ جنگ کے خاتمے کے بعد ہندوستان میں بھی اُن پر عملدرآمد ہوگا یا نہیں؟

کانگریس کو اس پر بھی اعتراض تھا کہ شرکت جنگ کے متعلق برطانیہ نے نوآبادیوں سے تو مشورہ کیا لیکن ہندوستان سے استصواب رائے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی۔ یہ بات قومی خودداری کے خلاف تھی، اسلئے کانگریس کو ناگوار ہوئی۔

حضور وائسرائے نے اپنے طول طویل بیان میں اُن صاف و صریح سوالات کا کوئی اطمینان بخش جواب تو نہیں دیا لیکن اُنھوں نے دو باتوں پر گورنمنٹ کی آمادگی ضرور واضح کردی۔ اوّل یہ کہ جنگ کے بعد برٹش گورنمنٹ ہندوستان کے مختلف طبقوں کے مشورہ اور اتفاق رائے سے موجودہ آئین کی ترمیم پر غور کرنے کو تیار رہیگی دوسرے جنگی انتظامات کے متعلق فوراً ہی ایک مجلس شوریٰ قائم کیجائے گی جسکے ذریعہ مختلف لیڈران ملک سے وقتاً فوقتاً صلاح و مشورہ لیا جائے گا۔

ہندوستان کو نوآبادیوں کا درجہ دینے کی بابت ہزایکسیلنسی نے سابق وزیر ہند کے اس بیان کا حوالہ دیا ہے جو ۶ فروری ۱۹۳۵ء کو دارالعوام برطانیہ میں ملک معظم کی حکومت کی طرف سے دیا گیا تھا۔ اس بیان میں ایکٹ گورنمنٹ ہند ۱۹۱۹ء کے تمہیدی نوٹ کی طرف اشارہ کیا گیا تھا اور یہ بتایا گیا تھا کہ برٹش گورنمنٹ اپنے وعدہ سے ہرگز انحراف کرنا نہیں چاہتی ہے بلکہ جو وعدہ لارڈ اروِن سابق وائسرائے ہند نے دُہرایا تھا اُس کی پوری تصدیق کرتی ہے۔ کیونکہ موصوف نے یہ اعلان حکومت وقت کی طرف سے پوری ذمہ واری کے ساتھ کیا تھا۔ اس بیان میں یہ بات بھی واضح کردی گئی تھی کہ ایکٹ ۱۹۱۹ء کے تمہیدی نوٹ کے مطابق ہندوستان کی آئینی ترقی کا قدرتی نتیجہ درجہ نوآبادی کے طرز کی حکومت کا قائم ہونا ہے۔ رہنمایان ملک کو اس اعلان میں سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اوّل تو اسمیں نوآبادیوں کا درجہ حاصل ہونے کی کوئی میعاد مقرر نہیں کی گئی ہے، دوسرے یہ بات بھی صاف کہدی گئی ہے کہ ہندوستان کو یہ درجہ یکلخت نہیں بلکہ رفتہ رفتہ حاصل ہوگا۔ اس وقت بھی لارڈ لنلتھگو نے

اِس وعدہ کو عملی جامہ پہنانے کی بابت صرف اِسقدر ارشاد فرمایا ہے کہ:۔

"اسوقت مجھے ملک معظم کی حکومت نے یہ کہنے کا اختیار دیا ہے کہ اِس جنگ کے خاتمے پر جو ردوبدل ضروری مناسب ہوگا اس کی ترتیب وتدوین میں امداد ومشورہ حاصل کرنے کیلئے حکومت بخوشی خاطر ہندوستان کی مختلف جماعتوں پارٹیوں، مفادات اور دیسی ریاستوں کے نمایندوں سے گفتگو کرے گی۔"

اِس کے معنی یہ ہوئے کہ مزید آئینی اصلاح کے لئے ایک دوسری گول میز کانفرنس کی جائے گی۔ یعنی ایک مرتبہ پھر ہندوستانیوں کے نفاق باہمی کا دل شکن نظارہ دُنیا کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

مہاتما گاندھی نے اِس تجویز سے یہی نتیجہ نکالا ہے کہ برٹش گورنمنٹ آیندہ بھی ہمارے نفاق باہمی سے فائدہ اُٹھاکر حکمرانی کرنے کی پُرانی پالیسی بدستور قائم رکھنا چاہتی ہے۔ بقول مہاتماجی "کانگریس نے روٹی کا سوال کیا تھا مگر اُس کا جواب پتھر سے دیا گیا۔ چنانچہ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں تک برطانیہ کا اختیار ہوگا، ہندوستان میں جمہوری طرز کی حکومت قائم نہ ہوسکیگی۔ اِسلئے کانگریس کو اپنا مدعا حاصل کرنیکے لئے ایک مرتبہ پھر صحرانوردی اختیار کرنا پڑیگی"

مُلک کی تمام سیاسی جماعتوں نے جنگ کے متعلق جو ریزولیوشن پاس کئے ہیں۔ اُن میں مرکزی حکومت میں ذمہ واری کا عنصر داخل کرنے کا فوری مطالبہ کیا گیا تھا مگر اُس کا کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ البتہ والیسرائے ہند نے اپنی صدارت میں ایک مشاورتی کمیٹی قائم کرنے کا ارادہ ضرور ظاہر کیا۔ جس میں ملک کی بڑی بڑی پارٹیوں اور ریاستوں کے نمایندے شریک ہوں گے۔ لیکن اُس کے جلسے والیسرائے کی مرضی سے منعقد ہونگے، اور ممبران کا انتخاب بھی اس طرح ہوگا کہ مختلف پارٹیاں اپنے اپنے نمایندوں کی فہرستیں بنادیں گی اور والیسرائے اس فہرست سے اپنی پسند کے مطابق ممبر چُن لیگے اور اِس کمیٹی کے ذریعہ جنگ کے متعلق جُملہ کارروائیوں کو ہندوستان کی رائے سے وابستہ رکھنے کا اہتمام کریں گے۔ غرض اِس کمیٹی کے نہ تو ممبران ہی مستقل ہونگے اور نہ اُس کے اجلاس منعقد کرنے کی والیسرائے پر کوئی پابندی ہوگی اور نہ اسے کوئی اختیارات حاصل ہوں گے۔ یعنی اسے مشورہ دینے کا حق ہوگا مگر اُس پر عمل کرنیکی کوئی پابندی نہ ہوگی۔

بہرحال کانگریس نے اس اعلان اور مشاورتی کمیٹی کی تجویز کو قابلِ التفات نہیں سمجھا اور تمام مُلک نے ایک آواز سے اس کی مخالفت کی۔ حتیٰ کہ لبرل فیڈریشن نے بھی دو دن کے غور وخوض کے بعد اس اعلان کو غیر تسلی بخش قرار دیا۔ اُن کی رائے میں بھی والیسرائے نے اپنے اعلان میں یہ بات صاف نہیں کی کہ ہندوستان کے آیندہ نظام حکومت کی وہی شکل ہوگی جو خودمختار نوآبادیات برطانیہ کی ہے۔ لبرل فیڈریشن نے اس بات کی بھی شکایت کی ہے کہ جنگ شروع ہوجانیکے باوجود ابھی تک ہندوستان کی فوجی پالیسی میں کوئی ترمیم نہیں کی گئی اور نہ اس کا کوئی ذکر ہی والیسرائے کے اعلان میں ہے۔ فیڈریشن نے اسکو بھی واضح کردیا کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ گورنمنٹ ہند کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اتفاق رائے پر مبنی تھا۔ ہاں برطانوی مدبر اور برطانوی ڈیلیگیٹ ضرور اس پر متفق تھے۔

ورنہ اگر ہندوستانیوں کے متفقہ مشوروں کا خیال کیا جاتا تو سر آغا خان کی یادداشت کو جس سے ہندوستان کے سب ملکی لیڈر متفق تھے، ردی کی ٹوکری میں نہ ڈال دیا جاتا۔ حال میں ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہوئی کہ پارلیمنٹ نے تھوڑی بہت جو صوبجاتی آزادی دے رکھی تھی، اسمیں بھی اس نے وزیروں سے رائے لئے بغیر فوری طور پر تخفیف کر دی ہے۔

مسلم لیگ نے جو اپنے سابقہ ریزولیوشن میں ہندوستان میں جمہوری طرز کی حکومت قائم کرنے کی مخالفت کر کے برٹش گورنمنٹ کے پرانے مطلق العنان طریقہ حکمرانی کو قابل ترجیح قرار دیچکی ہے اس اعلان کے بعض حصوں پر اظہار اطمینان کیا ہے اور بعض دوسرے حصوں کے مزید توضیح کی درخواست کی ہے اور مسٹر جناح کو اس بات کا اختیار دیدیا ہے کہ اگر وہ ان امور کے متعلق مطمئن ہوجائیں تو مسلمانوں کی طرف سے برطانیہ سے جنگی امداد دینے کا وعدہ کر دیں۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اپنی بیزاری کا اظہار ضروری سمجھکر کانگریسی وزارتوں کو حکومت سے مستعفی ہوجانے کی ہدایت دی۔ لیکن چونکہ اس وقت وہ اپنی طرف سے برطانیہ کی مشکلات میں خواہ مخواہ اضافہ بھی کرنا نہیں چاہتی ہے۔ اس نے کسی کانگریسمین کو ذاتی حیثیت سے کوئی براہ راست کارروائی کرنے کی اجازت نہیں دی۔ چنانچہ اس ہدایت کے بموجب آٹھ صوبوں کی کانگریسی وزارتوں نے اپنی اپنی قانونی اسمبلیوں میں لڑائی کی بابت ایک خاص ریزولیوشن پاس کر کے یکے بعد دیگرے استعفے دیدیے ہیں ابتک صوبہ آسام کے سوا کسی دوسرے صوبے میں کوئی وزارت قائم نہیں ہوسکی۔ اس لئے گورنر صاحبوں کو بادل ناخواستہ آئین حکومت کو معطل کر کے کل نظم و نسق کو اپنے ہاتھ میں لینا پڑا۔ انھوں نے کہیں تین اور کہیں دو سرکاری افسران کو مشیر سلطنت بنا کر حکومت کا کام جاری رکھا ہے۔ پہلے خیال تھا کہ شاید مخالف پارٹی کے ممبران یا بعض دیگر رسوخ یافتہ اصحاب کو وزیر بنا کر کچھ دنوں تک کام چلایا جائے یا غیر سرکاری معززین کو سرکاری مشیر نامزد کر کے حکومت کیجائے مگر یہ دونوں صورتیں اختیار نہیں کی گئیں اور یہ بہت ہی اچھا ہوا کہ سرکاری افسران ہی حکومت کے مشیر مقرر کئے گئے۔ ہمارے صوبہ متحدہ میں مسٹر مارش سینئر ممبر بورڈ آف ریونیو، مسٹر سلون کمشنر میرٹھ اور مسٹر پنا لال چیف سکرٹری صوبہ جیسے قابل اور آزمودہ کار افسران مشیران سلطنت مقرر کئے گئے ہیں چنانچہ ہز ایکسیلنسی گورنر کا انتخاب ہر حیثیت سے پسند کیا گیا ہے۔

ہز ایکسیلنسی نے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ جس طرح کانگریس وزارت صوبہ کا نظم و نسق چلا رہی تھی اسمیں فی الحال کوئی اہم تبدیلی نہ کیجائیگی۔ بات یہ ہے کہ ان استعفوں کے بعد سے ابتک برٹش گورنمنٹ اور حضور وائسرائے لیڈروں سے سمجھوتہ کرنیکی کوشش کر رہے ہیں۔ اول ہفتہ نومبر میں دہلی میں لارڈ لنلتھگو نے مہاتما گاندھی، صدر کانگریس، ڈاکٹر راجندر پرشاد صاحب اور مسٹر جناح سے پھر ملاقات کی۔ اس اثنا میں پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں بھی کئی مرتبہ اس مسئلہ پر مباحثے ہوئے، اور لارڈ زیٹلینڈ وزیر ہند، ان کے نائب اور مسٹر سیموئل ہور، لارڈ چانسلر گورنمنٹ برطانیہ کی طرف سے سرکاری منشار اور ارادوں کی مکرر سہ کرر توضیح کر چکے ہیں۔ مسٹر ویجووڈ بن کی تقریر سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ۱۹۱۹ء کا اعلان انگلستان کی تمام سیاسی پارٹیوں سے مشورہ کر کے تیار کیا گیا تھا۔ لیکن اس مرتبہ گورنمنٹ وقت نے

وائسرائے کے اعلان کے بارہ میں لیبر یا لبرل پارٹی سے کوئی مشورہ نہیں کیا۔ مسٹر موصوف نے بھی وائسرائے کے اعلان کو بالکل غیر تسلی بخش قرار دیا ہے۔ سر سیموئیل ہور نے پارلیمنٹ کے مباحثہ کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ ہندستان کا مقصد درجہ نوآبادیات کا حاصل کرنا ہے مگر یہ درجہ جنگی امداد کے انعام کی حیثیت سے نہیں دیا جاسکتا ہے۔ دراصل ابھی تک اسمیں جو رکاوٹ ہے اُسکی تمام تر ذمہ داری سر سیموئیل ہور گورنمنٹ برطانیہ پر نہیں بلکہ ہمارے نفاق باہمی پر ڈالتے ہیں۔ ورنہ بقول اُن کے برطانیہ ہندوستان کو ہرگز غلام رکھنا نہیں چاہتا۔ بلکہ اس کے برعکس وہ جمہوریت قائم کرنے میں ہر طرح سے اُسکی مدد کررہا ہے۔ لارڈ زیٹلینڈ نے بھی دارالامرا میں لارڈ اسنیل اور لارڈ سیموئیل کی معرکۃ الآرا تقریروں کے جواب میں وائسرائے کی انتظامی کونسل کی توسیع کے مسئلہ پر غور کرنے کا وعدہ کیا۔ اس سلسلہ میں معلوم ہوا ہے کہ لارڈ لنلتھگو اپنی انتظامی کونسل میں چھ زائد ممبر مقرر کرنے کو تیار ہیں جنمیں چار نشستیں کانگریس کو اور دو نشستیں مسلم لیگ کو دینے کا خیال ہے بشرطیکہ صوبجاتی حکومت چلانے کے متعلق کانگریس و مسلم لیگ میں کوئی عملی سمجھوتہ ہو جائے۔ کانگریس کی طرف سے مہاتما جی، پنڈت جواہرلال نہرو اور خود ڈاکٹر راجیندر پرشاد صدر کانگریس بار بار یہی کہہ رہے ہیں کہ کانگریس ہندو، مسلمان، عیسائی، سکھ سب کی یکساں نمایندگی کرتی ہے اور اُسے سب جماعتوں کے فلاح و بہبود کی یکساں فکر ہے۔ اُنکی رائے میں ہندو مسلمانوں کا اختلاف خود برطانیہ کا پیدا کردہ ایک خانگی مسئلہ ہے۔ جسکی بنیاد پر آزادی کا مطالبہ رد نہیں کیا جاسکتا۔ مہاتما جی نے فی الحال سول نافرمانی کی تحریک کو پسِ پشت ڈالدیا ہے اور وہ برٹش گورنمنٹ کیلئے سمجھوتہ کا دروازہ کھلا رکھے ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی کانگریس ہندو مسلم اتفاق کیلئے بھی انتہائی کوشش کررہی ہے۔ ۱۹ لغایت ۲۲ نومبر تک کانگریس ورکنگ کمیٹی کا جو اجلاس الہ آباد میں ہوا، اسمیں بھی بڑے غور و خوض کے بعد اس قسم کا ریزولیوشن پاس ہوا ہے جسمیں اس بات کی پوری گنجائش رکھی گئی ہے کہ برطانیہ چاہے تو اب بھی کانگریس کے سیاسی مطالبے کو منظور کرکے جنگ میں ہندوستان کا مکمل تعاون حاصل کرے۔ کمیٹی نے اس بات کو بھی واضح کردیا ہے کہ کانگریس کسی قلیل تعداد جماعت کی حق تلفی روا رکھنا نہیں چاہتی۔ نئے آئین حکومت مرتب کرنے کیلئے جس قسم کی نمایندہ اسمبلی وہ طلب کرنا چاہتی ہے اُسمیں کسی جماعت کو شکایت کی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ کانگریس کمیٹی نے یہ بھی طے کردیا ہے کہ اس میں مسلمان اہل وطن چاہیں تو اپنے نمایندے انتخاب جداگانہ کے ذریعہ منتخب کریں۔ اس توضیح و ترمیم کے بعد نمایندہ اسمبلی کا مسئلہ ایسا دشوار نہیں رہتا جیسا کہ پہلے معلوم ہوتا تھا۔ اور اسمیں برطانیہ کے غیر سرکاری نمایندوں کیلئے بھی گنجائش نکل سکتی ہے۔ بلکہ سرکاری افسران بھی بہ حیثیت مشیر شریک ہوسکتے ہیں۔ لیکن صاحبزادہ لیاقت علی خانصاحب نے مسلمانوں کیلئے جداگانہ انتخاب کے علاوہ تعداد سے زائد نیابت کا بھی مطالبہ کیا ہے۔ حالانکہ کانگریس ہر بالغ شخص کو نمایندگی کا حق دے رہی ہے جس کے بعد زائد نیابت کا سوال باقی نہیں رہتا ہے۔ اگر مسلم لیگ نے واقعی زائد نیابت پر زور دیا تو اس مسئلہ میں نئی اور شاید ناقابل حل مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ مگر سر سکندر حیات خان وزیر اعظم پنجاب اور بعض دیگر خیر خواہان ملک کو بھروسہ ہے کہ

مسٹر جناح اور پنڈت جواہر لال نہرو جب کبھی آیندہ ملینگے تو فرقہ وارانہ مسائل کا کوئی نہ کوئی حل نکال ہی لیں گے۔ خدا کرے ایسا ہی ہو لیکن مسٹر جناح کا منانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اُن کی قابلیت میں کسی کو کبھی شبہ نہیں رہا۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ مہاتما گاندھی اور کانگریس کے ساتھ انھیں شاید نادانستہ طور پر کسی وجہ سے ایسی کد ہو گئی ہے کہ اکثر اُنسے بہت چھوٹی چھوٹی باتیں ظہور میں آجاتی ہیں۔ مثلاً آج تک وہ اس مسئلہ پر گفتگو کرنے کیلئے کانگریس کی دعوت پر کبھی لیڈران کے مقرر کردہ وقت و مقام پر نہیں گئے اور جب کبھی ضرورت ہوئی تو مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو یا سبھاش بابو کو خود ہی اُن کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا ہر چند کہ بجائے خود یہ ایسی چھوٹی بات ہے کہ اس کا ذکر بھی کانوں کو بھلا نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں ہی سے دلی رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ اسوقت بھی کانگریس ہی کی طرف سے پنڈت نہرو کو اُن سے بات چیت شروع کرنے کی درخواست کرنا پڑی ہے۔ یہی مسٹر جناح ہیں کہ چند سال ہوئے مسلمانان بمبئی نے انھیں ایک مسلم جلسہ میں محض اس وجہ سے بولنے نہیں دیا تھا کہ وہ شرع اسلام کے بموجب داڑھی نہیں رکھاتے ہیں۔ یہ مسٹر جناح ہی کی قابلیت ہے کہ سادہ رو ہونیکے باوجود وہ مسلم لیگ کے مستقل صدر اور مسلمانان ہند کے واحد ڈکٹیٹر بن گئے ہیں۔ لارڈ برکن ہیڈ وزیر ہند نے لارڈ ارون وائسرائے ہند کو سائمن کمیشن آنے کے وقت یہ ہدایت کی تھی کہ مسٹر جناح کو خشک و تنہا چھوڑ کر دوسرے مسلمان سرحزین سے بات چیت کرکے اُن کی حوصلہ افزائی کیجائے چنانچہ پہلی گول میز کانفرنس کے بعد مسٹر جناح کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ اور مسلمانان ہند یا اُن کے لیڈروں نے اس کا مطلق کوئی نوٹس نہیں لیا۔ دو سال پہلے مسلم لیگ ایک سست و غیر منظم جماعت تھی۔ مگر کانگریس وزارتوں کے قائم ہوتے ہی مخالف لیڈروں کو فرقہ وارانہ جذبات اُبھارنے اور مسلم لیگ کی مخالفانہ روش کو مضبوط کرنے کا بہت اچھا موقعہ مل گیا۔ ہندو مخالفین نے مہاسبھا کا آسرا لیا۔ اور کبھی کبھی زمینداروں کی تنظیم کے نام سے مشترکہ مخالفت کی پارٹیاں بھی بنیں لیکن یہ سرسبز نہ ہوئیں۔ مگر مسلم لیگ پر مسٹر جناح کا جادو چل گیا اور ہر صوبے کے مخالف لیڈران اُن کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ کانگریس کی غلطی یہ ہوئی کہ اس نے اصولوں کی دُھن میں بعض ایسے مسلمان لیڈروں کو بھی جو ہر طرح سے کانگریس پروگرام کے حامی تھے پارلیمنٹری کمیٹیوں اور وزارتی مجلسوں میں شامل کرنیسے انکار کر دیا۔ کانگریس سے مسٹر جناح کی ناراضگی کا راز بھی وہی ہے جس کی بدولت مولانا محمد علی مرحوم کا پنڈت موتی لال نہرو سے بگاڑ ہو گیا تھا۔ خیر وجہ کوئی ہو اس وقت جس طرح سے بنے کانگریس کو مسٹر جناح اور مسلمانوں کو راضی کرنا ہے۔ مسٹر جناح کے ذاتی رسوخ کا اصلی راز اُن کی پبلک لائف کی بے لوثی ہے۔ ذاتی اہمیت کے خیال سے اس درجہ متاثر ہونیکے باوجود وہ اپنے لئے کسی اعزاز، عہدہ یا نفع کے خواستگار نہیں ہیں۔ چنانچہ اسوقت بھی جب یہ خبر ہے کہ وائسرائے اپنی ایگزیکٹو کونسل میں مسلم لیگ کے دو نمایندے لینا چاہتے ہیں، انھوں نے سُنا جاتا ہے کہ صاحبزادہ لیاقت علی خاں اور مسٹر عزیز یا سیر ٹرسٹنہ کو انتخاب کیا ہے اب سنا جاتا ہے کہ عنقریب ہی پنڈت جواہر لال نہرو مسٹر جناح سے اس مسئلہ پر سلسلۂ جنبانی کرینگے۔ مسٹر ممدوح بھی حال میں کہہ چکے ہیں کہ جب روس اور جرمنی میں اتفاق و اتحاد ہو گیا تو ہندو مسلمانوں میں اتفاق ہونا کیا مشکل ہے۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ کیونکہ اسوقت ملک کی آیندہ ترقی اسی مسئلہ کے حل پر منحصر ہے۔ کانگریس کمیٹی کے پچھلے جلسۂ الہ آباد میں مولانا ابوالکلام صاحب آزاد نے اس ذیل میں ایک نئی اور مفصل اسکیم تیار کی ہے۔ جس کی رو سے ہر ضلع، ہر تحصیل اور ہر گاؤں کے کانگریسیوں کو ہدایت کی جائے گی کہ وہ اپنے اپنے علاقہ میں ہندو مسلمانوں کی صلح و صفائی کی کوشش کرنے میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں۔ ہماری رائے میں کانگریس کو سال دو سال تک صرف اسی مسئلہ پر اپنی تمامتر توجہ مبذول کر دینا چاہئے اسوقت کانگریس نے عملی طور پر مہاتما گاندھی کو اپنا ہادی و رہنما مقرر کر رکھا ہے اور انھوں نے ابھی تک ہر حیثیت سے اپنا رویہ انتہائی مصالحانہ رکھا ہے۔ اسی وجہ سے کانگریس کمیٹی سے صرف ایام گذاری کا ریزولیوشن پاس ہوا ہے۔ مہاتما جی نے ممبران و حامیان کانگریس کو تعمیری کام کرنے کی ہدایت دی ہے۔ وہ خود آیندہ سیتہ گرہ کی کوئی نئی اسکیم

سوچ رہے ہیں۔ خبر ہے کہ اگر برٹش گورنمنٹ سے سمجھوتہ نہ ہوا تو اس دفعہ لیڈران ملک الیسا زبردست ستیہ گرہ کرینگے جو تمام پچھلی تحریکات کو مات کردیگا اور جس کے ماتحت لیڈران اپنی بقیہ عمر جب تک حکومت خود اختیاری حاصل نہ ہو جائے گی، جیلخانوں ہی میں بسر کرینگے غیر ممالک میں بھی زور وشور سے پروپیگنڈا کیا جائے گا۔ جس کے لئے سنا جاتا ہے کہ کئی امریکن معززین نے اپنی آمادگی ظاہر کی ہے۔ مہاتما گاندھی اس سے بھی مطمئن ہو جائیں گے کہ گورنمنٹ برطانیہ ہندوستان کی خود مختاری کا اعلان کردے اور آئندہ نظام حکومت طے کرنے کے لئے فرقہ وارانہ اتفاق کی شرط لازمی قرار دیدے۔ مہاتما جی کا یہ خیال صحیح ہے کہ جب تک برطانیہ قلیل تعداد والی جماعتوں کی جا و بیجا حمایت کا دم بھرتی رہے گی اور جب تک اُن جماعتوں کو یہ خیال رہیگا کہ وہ کثیر تعداد جماعت سے بگاڑ کر کے برطانیہ سے الگ سودا کر سکتے ہیں اُس وقت تک یہ اہم مسئلہ طے نہ ہوگا۔ اس لئے اگر گورنمنٹ واقعی ہندوستان میں اتفاق باہمی کی خواہشمند ہے تو اسے اس معاملہ کو اہل ملک کی رائے پر چھوڑ دینا چاہئیے۔

جنگ یوروپ

یوروپ کی موجودہ جنگ کو شروع ہوئے بارہ ہفتے ہو چکے ہیں ان تین مہینوں میں ہونے کو تو سب کچھ ہوا لیکن نتیجہ کے اعتبار سے پولینڈ کی فوری تباہی کے علاوہ ابھی کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔

موجودہ جنگ مختلف صورتیں اختیار کئے ہوئے ہے یعنی بری، بحری، اقتصادی، ہوائی اور بادِ ہوائی یعنی پروپیگنڈا

مغربی محاذ پر ایک طرف جرمنوں اور دوسری طرف اتحادیوں (یعنی فرانس و برطانیہ) کی لکھو کھا فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے پر مورچہ بند ہیں۔ مگر سیجفریڈ لائن (جرمن خط جنگ) اور میجنو لائن (فرانسیسی خط جنگ) کے زمین دوز قلعوں میں اس طرح چھپی ہوئی ہیں کہ ایک دوسرے کو نظر نہیں آتیں، اور اُن دونوں خطوں کے درمیان دو میل سے لیکر دس میل تک چوڑا زمین کا طویل ٹکڑا ہے، جسے "علاقہ غیر مقبوضہ" یا "No Man's Land" کہتے ہیں۔

دونوں لائنیں ایک دوسرے کے مقابل سوئزرلینڈ کے سرحدی شہر باسلے سے لیکر دریائے رائن کے کنارہ کنارہ شہر لاٹربرگ اور وہاں سے لکسمبرگ کی سرحد تک چلی گئی ہیں۔ پہلے تو فرانسیسی فوجوں نے وقتاً فوقتاً پیشقدمی کر کے غیر مقبوضہ علاقہ میں تقریباً پانسو مربع میل رقبہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ مگر جاڑے کے موسم کے ساتھ برسات بھی شروع ہوگئی اور دریاؤں اور چشموں میں سیلاب آگیا اور نقل و حرکت اور رسد رسانی کی دقتیں بڑھ گئیں تو فرانسیسی جرنیلوں نے سیلاب زدہ علاقہ سے اپنی فوجیں پیچھے ہٹا کر محفوظ مقامات پر قائم کر دیں۔ چنانچہ اب بھی بعض بڑھی ہوئی فوجی چوکیوں کے سوا تمام اتحادی فوجیں محفوظ مقامات پر موجود ہیں۔ فریقین کے توپخانے کبھی کبھی سرگرمی دکھاتے ہیں اور بعض اوقات مقامی حملے بھی ہوتے رہتے ہیں اور ہوائی جہاز اڑ کر دشمن کی دیکھ بھال کر کے پھر واپس چلے آتے ہیں۔ اس سے زیادہ ابھی تک کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوئی ہے۔ جاڑا، برفباری اور بارش کی وجہ سے کسی طرف سے حملہ نہیں ہو رہا ہے۔ غالباً تین مہینے تک یہی حالت رہیگی۔

جرمنی کی بہت سی سپاہ پورے سازوسامان کے ساتھ ہالینڈ اور بلجیم کے سرحد پر بھی جمع ہے۔ اس لئے گمان تھا کہ شاید ہالینڈ، بلجیم یا سوئزرلینڈ سے ہو کر فرانس پر حملہ کیا جائے۔ لیکن جرمنی نے اسکی باضابطہ تردید کر دی ہے۔ جرمنی برطانیہ اور فرانس پر ہوائی اور بحری حملے بھی کر رہا ہے۔ چنانچہ جرمن طیارے متعدد بار جزائر شیٹلینڈ، مشرقی اسکاٹ لینڈ اور شرقی انگلینڈ کے شہروں اور بندرگاہوں پر حملے کر چکے ہیں۔ مگر برطانوی طیارہ شکن توپوں کی آتشباری اور برطانوی ہوائی جہازوں نے ان حملوں کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ برطانیہ و فرانس کے متعدد جہازوں کو نقصان پہونچا ہے۔ غیر جانبدار ملکوں کے بھی کئی جہاز غرق ہو چکے ہیں لیکن اس کے باوجود اب تک جسقدر نقصان دشمن کا ہوا ہے اتنا اتحادیوں کا نہیں ہوا۔ اُن کے جنگی بیڑوں نے تمام کھلے سمندروں کو جرمنی کیلئے بند سا کر رکھا ہے۔ جرمنی کی بہت سی آبدوز کشتیاں بھی غرق کر دی ہیں لیکن جرمنی کے دو تین چھوٹے چھوٹے جنگی جہاز اب بھی کھلے سمندروں میں ادھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ حال میں جرمنی نے

ایک نئی اور قابل ذکر حرکت یہ کی ہے کہ چونکہ رودبار انگلستان جو انگلینڈ، فرانس، ہالینڈ اور بلجیم کے درمیان واقع ہے، سمندر کا ایک تنگ راستہ ہے۔ جس میں ہو کر ہر قوم کے جہازوں کی بکثرت آمد و رفت ہوتی ہے۔ اس لئے جرمنوں نے ۲۰ و ۲۲ نومبر کی رات کو اتحادیوں کو پریشان کرنے اور ان کے جہازوں کو نقصان پہونچانے کیلئے اس تنگ سمندری راستہ میں ہلکی ہلکی بحری سرنگوں کا ایک زبردست جال ہوائی جہازوں کے ذریعہ بچھا دیا جس سے انگلینڈ و فرانس کے علاوہ ہالینڈ، اٹلی اور یونان کے متعدد جہاز غرق ہو چکے ہیں۔ اس طرح چند ہی روز کے اندر متعدد بڑے بڑے جہازوں کو صدمہ پہونچ چکا ہے۔ جرمنی کی یہ حرکت بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی ہے۔ اسلئے انگلستان نے اسکے جواب میں غیر جانبداروں کا وہ سب مال ضبط کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو اسوقت جرمنی کو جا رہا ہے۔ ساتھ ہی سرنگیں دور کرنیوالے جہاز بھی (Mine Sweepers.) مصروف کار ہیں۔ اُمید کیجاتی ہے کہ اُنکی مدد اور بعض دوسری تدبیروں سے جن پر عنقریب عمل ہونیوالا ہے یہ خطرہ بھی جلد ہی دُور ہو جائیگا۔

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ جرمنی نے ایک نئے قسم کے طیارے بنائے ہیں جو ہوا میں اُڑنے کے علاوہ سمندر میں بھی تیر سکتے ہیں وہ رات کی تاریکی میں آتے ہیں اور سمندر میں اُتر کر سُرنگیں بچھا جاتے ہیں۔ یہ سُرنگیں بہت ہلکی ہوتی ہیں، لیکن ان کے اندر بھک سے اُڑ جانے والا مادہ اسقدر سخت بھرا ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑا جہاز بھی اُن سے ٹکرا کر سلامت نہیں رہ سکتا۔

جنگ کا اقتصادی پہلو توپ و تفنگ سے بھی زیادہ کارگر ثابت ہو رہا ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں بھی جرمنی کو اسی وجہ سے شکست نصیب ہوئی تھی اور اس جنگ میں بھی یہی حربہ جلد یا دیر میں جرمنی کو نیچا دکھائے گا۔ اقتصادی جنگ میں دشمن کی ہر طرف سے ایسی ناکہ بندی کر دیگئی ہے کہ ضرورت کی چیزیں بھی اس کے پاس نہ پہونچ سکیں۔ چنانچہ گو جنگ میں کام آنے والی چیزیں (پٹرول، کوئلہ، ربڑ، لوہا، ایلومنیم، تانبہ، شورا، گندک وغیرہ) جرمنی اور اُس کے مقبوضہ علاقوں میں موجود ہیں۔ تاہم اُسے بہت سی چیزیں دوسرے ملکوں سے بھی منگانا پڑتی ہیں۔ مثلاً امریکہ۔ پولینڈ، رومانیہ اور روس سے جرمنی کو بہت سا پٹرول پہونچ سکتا ہے جس پر جرمنی طیاروں اور آبدوز کشتیوں کی تمام سرگرمیوں کا دار و مدار ہے لیکن پچھلے دنوں رومانیہ نے پٹرول دینے سے انکار کر دیا ہے۔ پولینڈ میں تیل کی مقدار بھی کافی نہیں ہے۔ اور روس اتنا تیل نہیں دے سکتا۔ جتنا جرمنی کو درکار ہے۔ اب صرف امریکہ باقی رہ گیا۔ لیکن ناکہ بندی کی وجہ سے امریکہ سے مال لانے میں بڑی قباحت ہے۔ اس لئے جرمنی نے یہ طریقہ نکالا ہے کہ بلقان کی ریاستوں سے معدنیات خرید کر جنوبی امریکہ کی کسی ریاست کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے اور اُسکے عوض ایسی چیز خریدتا ہے جس کی شمالی امریکہ کو ضرورت ہے اور اُس کی قیمت سے میکسیکو وغیرہ سے پٹرول خریدتا ہے، جسے سویڈن کے جہاز جرمنی تک پہونچا دیتے ہیں۔ مگر اب اتحادیوں نے اُن جہازوں کو (خواہ وہ غیر جانبدار ملکوں ہی کے کیوں نہ ہوں) گرفتار کر نا طے کر لیا ہے جنھیں جرمنی کو جانے یا وہاں سے آنیوالا مال بھرا ہوگا۔ ہالینڈ اور بلجیم نے اس پُر زور مخالفت کی ہے لیکن انگلستان اور فرانس اس کی پروا نہیں کر رہے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ غیر جانبدار سلطنتیں کیا صورت اختیار کرتی ہیں، اتحادیوں کے شریک ہوتی ہیں یا کھلم کھلا جرمنی کا ساتھ دیتی ہیں۔

امریکہ نے قانون غیر جانبداری میں حال میں ترمیم کی ہے اُس سے بھی اتحادیوں کو بڑی مدد ملی ہے۔

پروپیگنڈا کی جنگ بھی اس وقت خوب شد و مد سے جاری ہے۔ پچھلے دنوں میونخ کے ایک بیر گودام میں "وقتی بم" لگا کر ہٹلر کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مگر یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ جرمنی نے اس حادثہ کو انگریزوں کی ریشہ دوانیوں پر محمول کیا ہے لیکن انگلستان کی طرف سے اس الزام کی پُر زور تردید ہو گئی ہے۔ جرمنی اور بھی بہت سی غلط خبریں اتحادیوں کے خلاف اپنے ریڈیو اسٹیشنوں سے بھیجا رہتا ہے لیکن سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ جرمنی کی اس وقت کیا حالت ہو رہی ہے اور اس کی کامیابی روز بروز مشکل ہوتی جاتی ہے

رنگین تصویر } اس ماہ کی رنگین تصویر جو نماز مغرب کی تیاری کا ایک دلآویز نقشہ پیش کرتی ہے ایک ہندو مصور کے کمالِ فن کا نمونہ ہے۔

زمانہ

جلد ۷۳ — دسمبر ۱۹۳۹ء — نمبر ۶

افسانہ حکایت وناول

(از منشی جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی، بی۔ اے، ایل ایل۔ بی)

افسانہ دنیا کا قدیم ترین فن ہے، غالبًا روزِ ازل ہی سے فطرت نے انسانی طبائع کو افسانے کی لطافتوں سے روشناس کر دیا تھا۔ یونانی حکماء کے قول کے مطابق یہ وہ ادبی کارنامہ ہے جو دیگر فنونِ لطیفہ کی دیوتاؤں کے نزول سے بھی پہلے عالمِ وجود میں آیا۔ اس لحاظ سے قیاس کیا جاتا ہے کہ افسانہ کی پیدائش انسانی قوتِ گویائی کے ساتھ ہوئی، یعنی اُسے اظہارِ خیال کا سلیقہ آتے ہی قصہ کہانیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ آدمی کے خیالات پر اس کے ماحول کا براہ راست اثر پڑتا ہے، چنانچہ وہ قدیم قصے جو فطری زبان کے بیش بہا سرمایہ ہیں، اور سینہ بسینہ ہم تک پہونچے ہیں اس حقیقت کا آئینہ ہیں کہ خدا کی ساری خدائی حضرتِ انسان کی مطیع و رہنما ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بنی نوع انسان کی نسلِ اوّلین نے فطرت کے اِس راز کو ابتدا ہی سے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی تاریک زندگی کے ابتدائی مراحل میں نباتات و جمادات سے لیکر وحوش وطیور تک کو اپنا رفیق و رہبر بنایا اور ان کے ذریعہ سے فطرت کے بہت سے رازِ سربستہ کے انکشاف کرنے کی کوشش کی۔

نئی دُنیا کے نامحرم انسان موسمی تغیرات، گرمی جاڑے اور برسات سے خائف ہوکر ان تبدیلیوں کے اسباب وعلل سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور اپنی نادانی وبے بضاعتی کے باعث انواع و [illegible] ہر انقلاب کو کسی نہ کسی ما فوق الفطرت ہستی کے قہر ومہر

کی جانب منسوب کر دیتے۔ جب کبھی مطلع ابر آلود ہوتا یا وسیع کائنات پر کُہرے کی چادر مسلط ہو جاتی تو وہ کسی بیرونی و بعید از فہم ہستی کی بے پایاں جلالی طاقت کا تصوّر کر کے اس تبدیلی کو اِس کے غیض و غضب سے تعبیر کر کے دل ہی دل میں لرزنے لگتے۔

انھیں تصوّرات کو اُنھوں نے جِن بُھوت اور دیو وغیرہ کا نام دے رکھا تھا۔ اور اپنے ذہن میں اُن کی مہیب جسامت و کریہہ شباہت کی عجیب و غریب شکلیں بنالی تھیں۔ لیکن اس کے برعکس جب کبھی موسمِ بہار میں چودھویں کا چاند اپنے جلوؤں کے ساتھ بادل کے چھوٹے چھوٹے نورانی ٹکڑوں کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتا نظر آتا تو اُن کے عقائد و دلائل میں ہیجان انگیز تضاد پیدا ہو جاتا، اور ان کا ذہن رساً معاً نازک خیالی کی عظیم الشان رفعتوں کو عبور کر کے دامنِ فلک کو گلہائے رنگا رنگ سے لبریز کر دیتا۔ اور تخئیل پہلے مجسّموں کی ضد اِن کی آنکھوں کے سامنے لا کھڑی کرتی جو اُن کے نزدیک حور و پری کی مترادف ہوتی۔ چنانچہ جن، دیو اور بھوت پریت وغیرہ کے ساتھ ساتھ حور و پریوں کی بھی عجیب و غریب داستانیں مترتب ہوئیں آہستہ آہستہ وہ وقت بھی آیا جب لوگ موسمی انقلابات کے عادی ہو گئے اور رفتہ رفتہ ان کا ڈر نکل گیا تو اُن کی قوتِ مُدرکہ نے پاؤں پھیلائے جس کی وجہ سے وہ خارجی و مرئی اشیاء کا جائزہ لینے اور اپنی ہمسایہ اشرف مخلوق کو صحیح صحیح سمجھنے کی کوشش میں مصروف ہوئے۔ اب چرند و پرندان کے ہمدرد و رہنما تھے۔ جو آنے والے انقلابات سے اُنھیں قبل از وقت ہی مطلع کر دیتے تھے، اور ایسے کڑے وقت میں اُن کی دست گیری کرتے تھے، جب وہ اپنی عقل سے بعض گتھیاں سُلجھا نہیں سکتے تھے۔

چکوی چکوے اور طوطا مینا وغیرہ کی بے شمار داستانیں اسی عہد کہنہ کی یادگار اور اسی ہمہ گیر صداقت کی علمبردار ہیں کہ انسان و حیوان سب ایک ہی لافانی محبت کے رشتہ میں منسلک ہیں۔ اس کے علاوہ اِن پارینہ داستانوں سے اس حقیقت کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ ان کے خالق و موجد جانوروں کی زبان سے نابلد نہ تھے۔ اور اپنے تجربات و مشاہدات کو آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ رکھنے کے متمنی تھے یہ وہ زمانہ تھا جب انسان اپنی زندگی بالکل فطرت کے مطابق بسر کرتا تھا، اور اس کی فطری قوتیں اس کے رنج و راحت میں برابر کی شریک تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ جب طولانی داستانوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور اُن کا ازبر کرنا دوبھر ہو گیا تو پند و نصائح اور برسوں کے تجربات کے نچوڑ کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے حکایات کی بنیاد ڈالی گئی۔ اِس کے بعد انسان کی فکر رسا افسانہ کی طرف رجوع ہوئی۔ اور چھبیلی بھٹیاری اور اسی قماش کے افسانے وجود میں آئے جس میں پاکبازوں ٹھگوں، لُٹیروں، تماش بینوں اور طوائفوں وغیرہ کے حالات بیان کرنے کی کوشش کی گئی لیکن چونکہ ابھی تک

داستانوں کا رنگ عام طبائع پر غالب تھا۔ اِس لئے یہ قصّے بھی ایک نئی قسم کی معجون مرکب بن کر رہ گئے بالآخر انگریزی علم ادب کے اثرات نے اس آئینہ پر جِلا کی اور اسے واقعیت سے ہمدوش کرکے "افسانہ" کی حدود میں داخل کر دیا۔

دنیا کی تقریبًا تمام زبانوں میں افسانوں کو جتنا فروغ حاصل ہوا ہے وہ کسی دوسری چیز کو حشر تک نصیب ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ اِس اعتبار سے مغرب میں جس طرح روسی اور فرانسیسی زبانوں کا پایہ بلند ہے اسی طرح ہمارے یہاں اولیت کا سہرا بنگلہ زبان کے سر ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مغربی تمدن اور علم ادب سب سے پہلے بنگال ہی پر اثر انداز ہوئے۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ کہانیاں لکھنے کا آغاز کب اور کس طرح ہوا۔ تاہم یہ یقینی ہے کہ اس کی ابتدا سنسکرت زبان ہی سے ہوئی ہے۔ جہاں سب سے پہلے دنت کتھاؤں (दन्त कथाओं) کا رواج شروع ہوا۔ چنانچہ پرانوں (पुराणों) میں اس قسم کی بیشمار کہانیاں مدفون ہیں جنھیں ہم اس فنِ لطیف کے اولین نقوش کہہ سکتے ہیں۔ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ یونان اور روما میں بھی (Mythological Tales) ہی سے کہانیاں لکھنے کی ابتدا ہوئی ہے۔ فن کے اعتبار سے یہ کہانیاں مختصر افسانوں کے ذیل میں نہیں آسکتیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم انھیں داستانوں کے تحت میں رکھ سکتے ہیں مگر جیسا کہ آگے آئیگا داستان اور افسانوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

غالبًا دنت کتھاؤں کی تصنیف سے تفریح و تفنن کے ساتھ ساتھ تکوینِ عالم کے اسباب کا تخئیلی منظر پیش کرنا بھی مقصود تھا۔ مگر یہ داستانیں اپنی تمام جدتوں اور رنگینیوں کے باوجود بہت طویل و غیر مربوط تھیں اور ان میں کوئی اصلاحی پہلو نہ ہوتا تھا۔ اس لئے چھوٹے چھوٹے درشٹانت لکھے جانے لگے جس کے لئے ہندوستان کا روحانی ماحول خاص طور پر موزوں ثابت ہوا۔ اہلِ ہند کی دیکھا دیکھی مغربی دنیا میں بھی حکایات (Tales) کا رواج شروع ہوا۔

اِس کے بعد زمانہ نے دوسری کروٹ لی، چنانچہ ہندوستان میں منظوم افسانوں کا دور شروع ہوا۔ رامائن اور مہابھارت اس عہد کی سنہری یادگار ہیں۔ ان قابلِ قدر تصانیف کی تاریخی اہمیت سے قطع نظر کی جائے تو واضح ہوگا کہ ان میں داستانوں کے علاوہ ناول ناٹک اور مختصر افسانوں کا مواد بھی بکثرت موجود ہے۔ اس حیثیت سے ہم سنسکرت نظم کو اکثر اصنافِ ادب کا ماخذ قرار دے سکتے ہیں، اور کسی حد تک یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ یہ نظمیں قدیم افسانوی ادب کے تمام ارتقائی مدارج کے آئینہ دار ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سنسکرت میں غالبًا اس طرح کی کہانیاں لکھنے کی براہ راست کوئی کوشش نہیں کی گئی جو اصطلاحی نقطۂ نظر سے ہمارے

زمانہ کے ناول و افسانہ کے مقابلہ میں رکھی جاسکیں۔ قدیم سنسکرت میں افسانہ لکھنے میں جو پابندیاں مد نظر رکھی جاتی تھیں اُن سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

اُردو ادب میں افسانہ ایک جدید صنفِ ادب ہے جس کی ابتدا داستانوں حکایتوں اور منظوم افسانوں سے ہوئی ہے۔

غالباً خود شناسی کی اُمنگ ہی جدید افسانہ کی اپج کی محرک ہے۔ حیات اور کشمکش حیات کے لطیف سے لطیف پہلو کو نمایاں کرنا افسانہ کی ادنیٰ کرامات ہے۔ افسانہ فی الحقیقت گدیہ کادیہ (गद्य काव्य) یا نثر شاعری کا ایک اہم جزو ہے۔ افسانہ ایک مختصر کہانی تو ہوسکتا ہے لیکن ہر مختصر کہانی افسانہ نہیں ہوسکتی۔ ورنہ یوں تو دنیا اور اس کی ہر چیز بجائے خود ایک افسانہ ہی ہے۔ ٹھیک اسی طرح ناول کو بھی طویل افسانہ نہیں کہا جاسکتا۔ ہم افسانہ کو داستان اور حکایت کا خود ناول کا خلاصہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ ناول میں جو پھیلاؤ اور اہتمام اور طوالت ہوتی ہے اس کی افسانہ میں کہاں گنجایش ہوسکتی ہے۔ لیکن ہر طویل افسانے میں ناول کی خصوصیات کا موجود ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ ناول متعدد افسانوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ واقعات کی ترتیب ایک مختصر افسانہ کو طول دے سکتی ہے لیکن اس میں ناول کا رنگ بھرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

افسانہ کی ماہیت ذہن نشین کرنے کے لئے ہمیں یہ جان لینا ضروری ہے کہ اس کی کونسی خصوصیات اُسے ناول، داستان یا حکایت کے زمرہ سے خارج کرتی ہیں۔

جہاں تک داستان کا تعلق ہے اس پر طویل یا مختصر ہونے کی کوئی پابندی نہیں ہے، اور نہ اس کا فطری ہونا یا حقیقت کے مطابق ہونا لازمی ہے۔ داستان کے لئے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ ایک خاص نتیجہ پر پہنچکر ختم ہو یا ناظرین کا معیار زندگی بلند کرنے میں مدد دے۔ داستان محض تفریح و تفنن کا سامان فراہم کرسکتی ہے۔ لیکن اس میں کوئی شئے موجود نہیں ہے جو نشاطِ روح کی کفیل اور دماغی غذا کی ضامن ہو۔ کردار نگاری سے داستان کا دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے لیکن اس کے برخلاف کردار نگاری ہی افسانہ کی جان ہوتی ہے اور اس کی امتیازی خصوصیت اس کا غیر معمولی اختصار ہے۔ افسانہ ہمیشہ حقائق و وقائع کا آئینہ ہوتا ہے جس میں زندگی کا ایک نہ ایک روشن و معیاری پہلو بخوبی نظر آتا ہے۔ اور جو براہ راست دل و دماغ پر اثر انداز ہوکر وسعت نگاہ و بالغ نظری کا باعث ہوتا ہے۔

افسانہ پر سرتاسر شعریت چھائی رہتی ہے۔ لیکن داستان کی طرح حکایت بھی اس سے قطعاً عاری ہوتی ہے۔ جس طرح داستان کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ انسانی زندگی ہی سے متعلق ہو۔ اسی طرح

حکایت کے لئے بھی اِس قسم کی کوئی قید نہیں لگائی جاسکتی۔ حکایت بالعموم افسانہ سے بھی زیادہ مختصر ہوتی ہے اور پند و نصائح کی وجہ سے داستان کی طرح لغو بھی نہیں ہوتی۔ اس کے ساتھ ہی وہ وعظ کی طرح خشک و بے کیف ہوتی ہے، اور اس کا انداز بیان افسانہ کی طرح شاعرانہ نہیں ہوتا۔ حکایت میں واقعیت ہوسکتی ہے، لیکن اُس میں رنگ و بُو کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ داستان کا انداز بیان شوخی و رنگینی سے آشنا ہوتے ہوئے بھی ناول یا افسانہ کی طرح جمالیاتی و نفسیاتی موشگافیوں سے معرا ہوتا ہے۔ حکایت میں بھی یہی کمی رہتی ہے اسی لئے حکایت اور داستان کا اثر بالکل عارضی اور فانی ہوتا ہے لیکن افسانہ اور ناول کا اثر مستقل اور دیرپا ہوتا ہے۔ غالباً اسی لحاظ سے داستان اور حکایت کا مرتبہ دیگر اصنافِ ادب میں اس قدر پست ہے کہ بعض اہل الرائے انھیں اپنے ادبیات میں کوئی جگہ دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

ناول اور افسانہ کا بنیادی فرق یہ ہے کہ ناول میں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بیک وقت روشنی ڈالی جاسکتی ہے، اور ہر پہلو کو بالتفصیل پیش کیا جاسکتا ہے۔ لیکن افسانہ میں یہ وسعت و طوالت نہیں ہوتی اور اس کا میدان عمل تصویر کے کسی خاص رخ کی نقاب کشائی تک محدود ہوتا ہے۔ ناول کی طرح اس کی ضخامت و طوالت لامحدود نہیں ہوتی اور نہ اس میں اِس قدر گنجایش ہوتی ہے کہ متعدد و متضاد کرداروں کو پیش کرکے زندگی کے مختلف مسائل پر شرح و بسط کے ساتھ بحث کی جاسکے۔ ناول میں اس کے لئے ایک وسیع میدان موجود ہے۔ اسی لئے اس میں افسانہ کی بہ نسبت کردار نگاری کے بھی اچھے مواقع بکثرت ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ ناول کی کمی کو پورا کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ ناول میں طوالت کے ساتھ ساتھ واقعات کا پھیلاؤ بھی ممکن ہے۔ لیکن افسانے میں اس کی بھی بندش ہے۔ افسانہ میں ناٹک کی طرح صرف اشارہ و کنایہ سے کام لینا پڑتا ہے، ناولوں میں بال کی کھال کھینچی جاسکتی ہے۔

تاریخ گذشتہ واقعات کی روشنی میں اقوامِ عالم کے عروج و اقبال، زوال و ادبار کے اسباب سے بحث کرتی ہے۔ لیکن افسانہ افراد کی زندگی کی بعض عالمگیر حقیقتوں اور صداقتوں پر مبنی ہوتا ہے۔ جن واقعات پر افسانہ کی بنیاد رکھی جاتی ہے وہ اس کی تخلیق سے پہلے عرصہ ظہور میں آچکتے ہیں۔ بہرحال ان کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ ناممکن الوقوع نہ ہوں۔ ہرچند تاریخ کی طرح افسانے کا انحصار بھی واقعات ہی پر ہوتا ہے لیکن محض واقعات و حقائق ہی کا نام شاعری نہیں ہے۔ افسانہ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے شاعری کی ایک خاص صنف ہے اور تاریخ و شاعری میں بعد مشرقین ہے۔ چنانچہ تاریخی افسانے بھی تخیلی کہانیوں

کی ہمسری نہیں کر سکتے تاہم تاریخ اور تاریخی افسانوں کے مطالعہ سے یہ تفریق بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے اس کے علاوہ تاریخ میں جن واقعات کا ذکر ہوتا ہے وہ نام و مقام کے علاوہ سب کے سب درست ہی نہیں ہوا کرتے، لیکن افسانے میں نام و مقام فرضی ہوتے ہوئے بھی باقی تمام باتیں زندگی کی ہمہ گیر صداقتوں سے ہمدوش ہوتی ہیں۔ اور اُن پر مکان و زمان کی قیود کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

کہانی کا موضوع ایسا ہونا چاہیئے جس کی مکمل توضیح و تشریح اس کے محدود حلقہ میں آسانی سے ہو سکے، اور اس میں مزید اضافہ یا پھیلاؤ کی گنجایش باقی نہ رہے۔ افسانے میں غیر ضروری عناصر کا داخل کرنا ممنوع ہے۔ تاہم اس سے ایسے نتائج مترتب ہونا چاہیئے جن کی صداقت عہد و عصر اور محل و مقام کے لامحدود اثرات سے متزلزل نہ ہو سکے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کہانی میں صرف ایک ایسے مختصر واقعہ کا ذکر ہو جو صرف چند لمحات پر حاوی ہو۔ بلکہ اس میں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اس انداز سے روشنی ڈالی جائے جو مستقل ادب کی تعمیر میں معاون ہو۔ کہانی کی کامیابی کا بہت کچھ انحصار مصنف کے زورِ قلم اور قوتِ بیان پر ہے۔ اس کے لئے طرزِ بیان کا شگفتہ سادہ اور اچھوتا ہونا لازمی ہے۔ زبان کی رنگینی تو معیوب نہیں ہے، لیکن شوخی پست مذاقی کی دلیل ہے۔ مغرب کے تمام نقاد اس بارے میں متفق الرائے ہیں کہ پلاٹ کی ندرت ہی افسانے کی حقیقی دلکشی کی ضامن ہوتی ہے۔

افسانے کی زبان کے متعلق کوئی سخت پابندی عاید کرنا ضروری نہیں۔ لیکن محض زبان کی خاطر افسانہ لکھنا ناقابلِ معافی حماقت ہے۔ زبان خیال کا لباس ہے اور لباس کی سادگی ہی دلکشی کا باعث ہے۔ اس لئے زبان کی پیچیدگیوں میں خیال کی ندرت و لطافت کو محو کر دینے سے اصل مدعا کے فوت ہو جانے کا احتمال رہتا ہے۔ غیر معمولی تکلف و تصنع سے ذاتی محاسن پھیکے پڑ جاتے ہیں جس کی وجہ سے پیاسی نگاہوں کی تسکین نہیں ہوتی۔ پیکرِ قبائے گل کو گل بوٹے کی ضرورت ہی کہاں ہے؟ ہر فوق البھڑک پس منظر اصلی نقوش کی دلچسپیوں کو پس پشت ڈال دیتا ہے جس سے تصویر کی خوبیاں آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ یہ عالمگیر صداقت افسانہ اور اس کے اسلوب بیان پر بھی صادق آتی ہے۔ اس لئے زبان کے معاملہ میں اعتدال ایک نہایت ضروری چیز ہے۔

کہانی محسوسات اور اطوار و کردار کی ایک دنیا ہوتی ہے۔ لیکن اس میں احساس یا کردار کے کسی ایک پہلو سے بھی بخوبی بحث کی جاسکتی ہے۔ اور اس اعتبار سے اس میں اتنی کثیر التعداد اور ہمہ گیر حقیقتوں کی وضاحت کی جاسکتی ہے، جو طویل سے طویل ناول میں بھی نہیں سما سکتیں۔ لیکن اگر مختصر کہانی میں کسی کریکٹر کی ساری زندگی کے تمام واقعات بھرنے کی کوشش کی جائے تو بھی

کامیابی نصیب نہیں ہوسکتی۔

افسانے کا حلقۂ اثر اہل الرّائے کی نگاہ میں بہت وسیع ہے۔ ہنسانا، رُلانا، حیرت میں ڈالنا اور قلوب کو گرما کر سراپا ہمدردی بنا دینا افسانے کا ادنیٰ معجزہ ہے۔ ایسے ہنگامی افسانے جو پست جذبات کے محرک ہوں لغویات میں شمار ہوتے ہیں، نفرت و حقارت و تعصب پھیلانے والے افسانے محبت و رواداری کی علمبردار کہانیوں کے مقابلے میں بہت کم مقبول ہوتے ہیں۔ ہر کہانی جس میں مستقبل کو روشن و بہتر بنانے کی تلقین کی جائے اور جو لوگوں کو نا اُمید ہونے کی بجائے آئندہ اصلاح کی جانب راغب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو اس فن کا نادر نمونہ سمجھی جائیگی۔

افسانے کی غایت یہ ہے کہ اس کے آلۂ کار اور انجام میں توازن اور ہم رنگی ہو۔ کہانی کی غایت صرف ایک ہی ہوتی ہے، جسے تنوع کے ساتھ آخر تک بنایا جاتا ہے، اور ایک خاص نتیجہ پر پہنچکر اس کی تکمیل کردی جاتی ہے۔ اس طرح کوئی مخصوص و مطلوب نتیجہ اخذ کرکے معینہ انجام تک نہ پہنچا سکے۔ ناکامی کی دلیل ہے۔ اس کے برعکس افسانہ کی غایت اور اس کے انجام کی یکسانیت اس کی کامیابی کا بیّن ثبوت ہے۔

افسانہ کا آغاز اور انجام دونوں بڑے معرکہ کی چیزیں ہیں۔ ساری کہانی میں صرف انہیں دو مقامات میں مصنف کا کمال فن ظاہر ہوتا ہے، جس طرح کسی لمبی تمہید سے کہانی کا افتتاح کرنا معیوب ہے، اُسی طرح انجام کا بھی مختصر و جامع ہونا ضروری ہے۔ بعض مبصرین کا قول ہے کہ کہانی کے آغاز اور انجام پر نظر ڈالنے کے بعد ہی اس کا مرتبہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے افسانے کی ابتدا ہمیشہ کسی ایسے مقام سے ہونا چاہیئے جس سے اس کی دلکشی میں اضافہ ہو سکے اور کہانی بھی واقعات کے تسلسل کے لحاظ سے نامکمل و تشنہ نہ رہے۔ یہی خوبی اس کے اختتام میں بھی بدرجۂ اتم موجود رہنا چاہیئے۔

پہلے کہا جاچکا ہے کہ ہر افسانے کا مختصر ہونا اس کی بنیادی خصوصیت ہے، یہی وجہ ہے کہ علماء نے افسانہ نگاری کے لئے بہت سی شرطیں لگادی ہیں۔ ایک مغربی نقاد کا قول ہے کہ کہانی میں کوئی ایک حرف بھی لغو اور غیر ضروری نہ ہونا چاہیئے۔ اس احتیاط کے باوجود اس کا مکمل ہونا شرط ہے۔ مختصر یہ کہ اس کا کوئی ضروری جزو اختصار کی نذر نہ ہونے پائے۔ تاکہ اس میں کسی چیز کا فقدان محسوس نہ ہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ افسانے کے لئے پلاٹ یا کتھانک کی تشکیل کس قدر مشکل کام ہے۔ ہر وہ واقعہ یا مجموعۂ واقعات پلاٹ ہے جس سے ایک خاص مقصد کے تحت کردار کی تخلیق اور اس کے انجام کو واضح کرنے میں مدد مل سکے۔ اس لئے ضروری ہے کہ افسانہ نگار اپنے اغراض و مقاصد کو پیش نظر رکھکر واقعات کو اس طرح ترتیب دے کہ ایک محدود دائرے میں افراد کی زندگی کا مختصر سا خاکہ پیش ہوجائے اور حقائق زندگی اور

لوگوں کے کردار روشن ہو جائیں اور اس کے ساتھ ساتھ واقعات میں اول سے آخر تک جدت، تنوع اور تسلسل بھی قائم و برقرار رہے۔

مگر افسانے میں ناول کی طرح تسلسل اور تضاد دونوں کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی اس لئے افسانہ نگار کے لئے غیر ضروری تفصیلات سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ افسانے کے ماحول کو اس ڈھنگ سے نمایاں کرنا چاہیئے جس سے جزو میں کل کی حقیقت منکشف ہو جائے۔

ہر چیز جو حقیقت کی آئینہ دار ہو کہانی کا موضوع بن سکتی ہے، بشرطیکہ اس میں کردار نگاری کی گنجائش ہو۔ افسانہ محض اسکیچ اور سیرت نگاری تک ہی محدود نہیں ہوتا۔ کہانی میں افراد کی شکل و شبہات اور عادات و اطوار کا اجمالی تذکرہ بھی اس انداز سے کیا جاتا ہے کہ واقعات کے تسلسل میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔ اس لحاظ سے اسکیچ اور سیرت نگاری کہانی ہی کا ایک "جزو" قرار پاتے ہیں۔

وہ افسانے جن کا نصب العین بلند و رفیع ہوتا ہے۔ اور جو انسان کے لطیف جذبات کے حامل ہوتے ہوئے انبساط روح اور ترقی دماغ کا سامان فراہم کرتے ہیں صف اول میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔

تیس سال پہلے

حضرت اکبر مرحوم الہ آبادی "زمانہ" کے خاص قدردانوں میں تھے، چنانچہ ایک عرصہ تک اخبارات و رسائل کی مضمون نگاری سے کنارہ کش ہو جانے کے باوجود آپ نے سب سے پہلے ایڈیٹر زمانہ کی تحریک پر رسالہ زمانہ کو اپنا کلام بھیجنا شروع کیا اور آخر عمر تک اپنے قلمی احسانات کا سلسلہ جاری رکھا۔ تیس سال پہلے دسمبر ۱۹۰۹ء کے رسالہ زمانہ میں کلام اکبر ہدیۂ ناظرین ہوا تھا۔ اسی سے چند اشعار موجودہ ناظرین رسالہ کے تفنن طبع کے لئے درج ذیل ہیں۔ بعض باتیں ملک کے موجودہ حالات پر بھی صادق آتی ہیں۔

سب سعی میں مصروف ہیں حاصل کی نہ پوچھو ۔۔۔ مغرب کے خضر ساتھ ہیں منزل کی نہ پوچھو

ہے بحر مباحث میں رواں کشتیِ امید ۔۔۔ لہروں کی لچک دیکھ لو ساحل کی نہ پوچھو

ملک پر تاثیرِ چشمِ یار طاری ہو گئی ۔۔۔ مفت شیخ و برہمن میں فوجداری ہو گئی

وہ نہ سمجھے گا جو ایسے معنے سے بیگانہ ہے ۔۔۔ دیر میں بھی کعبہ ہے، کعبہ میں بھی بت خانہ ہے

مٹے جاتے ہیں ہم خود اپنی نظروں سے ستم یہ ہے ۔۔۔ بدل جاتے تو کچھ رہتے، مٹے جاتے ہیں غم یہ ہے

نہ کوئی تکریم باہمی ہے نہ پیار باقی ہے اب دلوں میں ۔۔۔ یہ صرف تحریر میں ڈیر سر ہے، یا جناب مکرمی ہے

کہاں کے مسلم کہاں کے ہندو بھلائی ہیں سب نے اگلی ریتیں ۔۔۔ ہر اک کرسمس کی فکر میں ہے نہ گیارھویں ہے نہ اسٹمی ہے

وادیِ نیپال

(از پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ ناشاد ایم اے)

اک ہماچل کے پہاڑوں میں نہاں وادی ہے
گھر جوانمردوں کا ہے مسکنِ آزادی ہے
شیرِ خونخوار گرجتے ہیں جہاں غاروں میں
ناچتے کبکِ دری رہتے ہیں کہساروں میں
جھولتی رات دن آزادی ہے گہواروں میں
سُورماؤں کی جہاں دیر سے آبادی ہے

ہے مناسب جو اسے وادیِ ایمن کہیئے
یا اسے راحتِ جاوید کا مسکن کہیئے
سبز اشجار کہیں وجد میں لہراتے ہیں
کہیں دھانوں کے ہرے کھیت نظر آتے ہیں
کہیں مرغانِ چمن حمدِ خدا گاتے ہیں
ہے بجا گر اسے فردوس کا گلشن کہیئے

لطف دیتی ہیں کہیں باگمتی کی لہریں
کہیں چشمے ہیں رواں جیسے عروضی بحریں
کون سا راگ ہے جو اس کی نواؤں میں نہیں
کون سا رنگ ہے جو اس کی فضاؤں میں نہیں
کون سا ناز ہے جو اس کی اداؤں میں نہیں
ہر طرف بہتی ہیں موجوں سے ہوا کی نہریں

دامنِ کوہ میں اک گوشۂ تنہائی ہے
کہ جہاں خلق کو قدرت سے شناسائی ہے
شور و ہنگامۂ عالم سے بہت دُور ہے وہ
نظرِ دہر سے رُوپوش ہے مستور ہے وہ
پردۂ حسن میں لپٹی ہوئی اک حُور ہے وہ
حسنِ قدرت کی وہاں انجمن آرائی ہے

یہ وہ گلشن ہے جہاں غنچۂ دل کھلتا ہے
قلب کو سرد ہواؤں سے سکوں ملتا ہے
یہ وہ وادی ہے جہاں بزمِ طرب بہتی ہے
اپنے اسرار جہاں قدرتِ حق کہتی ہے
جہاں بل کھاتی ہوئی موجِ صبا بہتی ہے
اِن ہواؤں میں مسرت کا فسوں ملتا ہے

اِسی وادی میں کبھی للتا پٹن بستا تھا
اِسی وادی میں نواڑوں کا چمن بستا تھا
اِسی وادی میں اشوکا کا گذر ہوتا تھا
اس کے ہی پاس مہابیر کا گھر ہوتا تھا

کبھی پرچار اہنسا کا ادھر ہوتا تھا
اِسی وادی میں کبھی باغِ عدن بستا تھا

یہ وہ گلشن ہے فقط گُل ہوں جہاں خار نہ ہو
یہ وہ خرمن ہے جہاں برقِ شرر بار نہ ہو
اس چمن سے اثرِ بادِ خزاں دُور رہے
بادۂ رحمتِ باری سے یہ مخمور رہے

خوش و خرّم رہے خنداں رہے مسرور رہے
گردشِ دَورِ زماں سے یہ کبھی خوار نہ ہو

وید کا قومی گیت

(از جناب فضل اللہ بسمل سیتاپور)

(۱)

اے مادرِ وطن! یہ پہاڑوں کی چوٹیاں
شرما رہا ہے جن کی بُلندی سے آسماں
جھیلوں کا وہ عمق کہ گُہر کا قیام ہے
میداں کی وسعتوں کا تخیّل غلام ہے
یہ جھومنا درختوں کا، سو مستیاں لئے
جیسے بھگت ہوں جھومتے، یادِ خدا کئے
یہ بادلوں کا سایہ، یہ برسات کی فضا
پُر کیف، سبز سبز سے کھیتوں کی ہرا دا

اے ماں! ہمارے واسطے راحت فزا ہوں یہ!
بارش ہو شانتی کی، مسرّت فزا ہوں یہ!

(۲)

یوں ندیاں رواں ہوئیں، جیسے کہ بحرِ حُسن
ہے ساحلوں کی گود میں تاثیرِ سحرِ حُسن
یہ جوئبار اور یہ نکھری ہوئی فضا
یہ خنکیِ لطیف، یہ گاتی ہوئی فضا
یہ پھول اور پھل، یہ ہوا اور یہ بہار
چشموں کے میٹھے گیت، یہ سبزہ، یہ مرغزار

سُکھ اور شانتی کے سہارے لئے رہیں!
ہم ان کے واسطے، یہ ہمارے لئے رہیں!

شاعری کی عظمت کا معیار

از حضرت وصل بلگرامی

شاعری اور حُسن، فطرت کے یہ دو ایسے کارنامے ہیں۔ جن کی تعریف دُنیا کے بڑے بڑے لوگوں نے کی ہے، لیکن باوجود ان تمام کوششوں کے اب تک ہم کسی تعریف پر نہیں پہونچے، جس کو ہم مکمل کہہ سکیں۔

اگر ہم سے کوئی سوال کر بیٹھے کہ شعر یا حُسن کس کو کہتے ہیں، تو شاید ہم کو سینٹ آگسٹائن کے الفاظ دُہرانا پڑیں، جو دوسرے معاملات کی نسبت کہا کرتا تھا کہ:۔

"اگر مجھ سے دریافت نہ کیا جائے تو میں سب کچھ جانتا ہوں۔ لیکن اگر مجھ سے پوچھا جائے، تو میں کچھ نہیں جانتا"۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جس شخص کو حُسن و شعر سے ذرا سا بھی لگاؤ ہوگا (میں یہاں پر اتنا اور کہے دیتا ہوں کہ حُسن و شعر سے لگاؤ ہونا اور انسان ہونا کوئی دو باتیں نہیں) وہ یہ ضرور سمجھتا ہوگا کہ میں اس شے کی بابت بہت کچھ جانتا ہوں، لیکن اس علم کو الفاظ کی شکل میں پیش کرنا ذرا مشکل ہے۔

ہمارے سامنے شعر کی ہزاروں تعریفیں ہیں۔ مختصر بھی اور طویل بھی۔ لیکن جب ہم غور کرتے ہیں، تو ان سے کوئی مدد ملتی نظر نہیں آتی۔

یہاں تک تو شعر کا تعلق ہے۔ اب شعر کی عظمت و خوبی پر غور کیجئے۔ ابھی میں عرض کر چکا ہوں کہ حُسن و شعر کی تعریف دُنیا کے بڑے بڑے لوگوں نے کی۔ لیکن وہ سب تعریفیں نامکمل رہیں۔ اب ان دونوں کو ایک کر دیجئے، اور ایک حسین شعر کی تعریف کیجئے۔ آپ کہیں گے، اب تو اور بھی مشکل کا سامنا ہے۔ لیکن آپ اس امر سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ آپ بعض اشعار کو اچھا، دوسرے لفظوں میں حسین اور بعض کو بُرا کہتے ہیں۔ یہ کیوں؟ پھر اچھے اور بُرے میں بھی درجے پائے جاتے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ جو شعر ہم کو اچھا معلوم ہوتا ہے، وہ اچھا ہوتا ہے اور جسے ہم پسند نہیں کرتے وہ بُرا ہوتا ہے۔ لیکن میں آپ سے سوال کروں گا کہ آخر آپکے اچھے سمجھنے کا معیار کیا ہے؟

اچھا آیئے، ان باتوں کا جواب ہم سب سے پہلے ارسطو سے پوچھیں، وہ کہتا ہے کہ:۔

"شاعری کی ابتدا دو وجہوں سے ہوئی ہے، جنیں سے ہر وجہ انسانی فطرت کا جزو ہے۔ انسان میں

نقل کرنے کا مادہ بچپن سے ہوتا ہے اور انسان کو جو فوقیت دوسرے جانوروں پر حاصل ہے۔
وہ یہ کہ وہ سب سے زیادہ نقال جانور ہے اور نقل ہی سے وہ علم بھی حاصل کرتا ہے اور نقل کو
دیکھ کر خوش ہونا یہ بھی انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ ہمارا تجربہ دوسرے امر کی شہادت دیتا ہے
خواہ وہ چیزیں کتنی ہی دردناک ہوں۔ لیکن ہم اُن کو اصل کے مطابق دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایک
دوسری بات سے بھی یہ امر واضح ہوجاتا ہے کہ کسی چیز کی بابت معلومات حاصل کرنا ایک فلسفی ہی
کے لئے نہیں، بلکہ ہر انسان کے لئے سب سے بڑی خوشی ہے۔ اس خوشی کی وجہ یہ ہے کہ وہ ساتھ
ہی ساتھ معلومات بھی حاصل کرتا ہے، یہی نقالی کا ملکہ بڑھ کر شعر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔"

ارسطو ان الفاظ میں شعر کی پیدائش کا ذکر کرتا ہے، گویا اُس کے نزدیک فطرت کی نقل کا نام شعر ہے، جس کا
منطقی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فطرت کا سب سے بڑا نقال سب سے بڑا شاعر ہے۔ اور فطرت کی عمدہ نقل
عمدہ شعر ہے۔ اچھا مومن کا ایک شعر سنئے ؎

پیہم سجود پائے صنم پر دمِ وداع — مومن! خدا کو بھول گئے اضطراب میں

فطرت کی کتنی اچھی نقل ہے۔ بتِ کافر کے قدموں پر بار بار سجدہ کرنا۔ اور پھر خدا یاد آجانا کیسی پتے کی
بات ہے۔ لیکن سچ بتائیے کہ آپ نے اس شعر کو سن کر کبھی یہ بھی خیال کیا ہے کہ چونکہ یہ فطرت کی نقل ہے
اس لئے اس کو ہم شعر کہتے ہیں؟ اور پھر چونکہ اچھی نقل ہے اس لئے اچھا شعر ہے، یا مثلاً ذیل کے اشعار ؎

زمانہ برسرِ آزار تھا، مگر فانی — تڑپ کے ہم نے بھی تڑپا دیا زمانے کو

قفس کی یاد میں جی چاہتا ہے اب تو جگر — لگا کے آگ نکل جاؤں آشیانے کو

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

میر ان نیم باز آنکھوں میں — ساری مستی شراب کی سی ہے

کیفیتِ چشم اُس کی مجھے یاد ہے سودا — ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

ان کو سن کر کون کہے گا کہ فطرت کی عمدہ نقالی ان اشعار کی عظمت و خوبی کی اصل وجہ ہے۔ ممکن ہے کہ
ایسا ہو، لیکن ہم کو کبھی ایسا خیال کیوں نہیں پیدا ہوتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید کچھ اور باتیں بھی ہوتی
ہوں گی جو شعر کو عمدہ بنا دیتی ہیں۔

آئیے اب دوسرے لوگوں کو ٹٹولیں۔ ڈاکٹر جانسن انگریزی ادبی دنیا کا زبردست نقاد سمجھا
جاتا ہے۔ شعر کی تعریف یوں کرتا ہے :-

"شعر موزوں عبارت کا نام ہے، یہ ایک فن ہے، حقیقت و مسرت کو یکجا کر دینے کا۔ جہاں

عقل کے ساتھ تخئیل بھی بڑا کام کرتی ہے"

شعر کی یہ تعریف بڑی لمبی ہے۔ سب سے پہلی بات جو ہم کو یہاں ملتی ہے، وہ لفظ "موزوں" ہے۔ جس کا دوسرا نام ہم نے موسیقیت رکھا ہے، اور اسمیں کوئی شک بھی نہیں کہ موسیقیت شعر کا ایک بڑا جزو ہے جس کے بغیر ہم شعر کو شعر نہیں کہتے۔ غالب کا ایک شعر ہے ؎

کہتے ہو نہ دینگے ہم، دل اگر پڑا پایا دل کہاں کہ گم کیجئے، ہم نے مدعا پایا

اسمیں آپ محسوس کریں گے کہ موسیقیت کے احساس سے پیشتر پہلے مصرع کا چلبلاپن دل میں چٹکیاں لینے لگتا ہے اور اس شعر میں ؎

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

موسیقیت بہت ہے، اور میں تو یہ کہوں گا کہ موسیقیت نہیں، بلکہ یہ اور کوئی نشتر ہے جو دل میں چبھ جاتا ہے۔

جانسن کی تعریف کا دوسرا حصہ ارسطو کے الفاظ کا الٹ پھیر ہے۔ وہ کہتا ہے :۔

"نقل سے ہم کو خوشی اس وجہ سے بھی ہوتی ہے کہ اس سے ہم معلومات حاصل کرتے ہیں"

جانسن کہتا ہے کہ :۔

"حقیقت و مسرت کو یکجا کر دینے کے فن کا نام شاعری ہے۔"

لیکن تیسرا جزو ذرا تشریح طلب اور اہم ہے۔ وہ کہتا ہے کہ :۔

"یہاں عقل و تخیل دونوں مل کر کام کرتی ہیں"۔

یعنی جو بات ہم کہیں وہ ایسی بے سر و پا نہ ہو کہ اسے عقل سے کوئی علاقہ بھی نہ ہو اور ایسی بھی نہ ہو کہ جس میں جدت ہی نہ ہو۔ یعنی تخئیل کی رنگ آمیزی نہ ہو جس کی وجہ سے وہ عامیانہ بن جائے۔ مثلاً کوئی دو اور دو چار والی بات کہے، تو ہم اسے شاعری نہ کہیں گے۔ لیکن حالی کے دو تین شعر آپ کو سناتا ہوں ؎

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ نہ سنا جائے گا تجھ سے یہ فسانہ ہرگز

آ رہی ہے چاہِ یوسف سے صدا دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

سچ کہئے کیا یہ دو اور دو چار والی باتیں نہیں ہیں۔ لیکن کتنی اثر میں ڈوبی ہوئی، کون کہہ سکتا ہے، کہ یہ شاعری نہیں، اور شاعری بھی وہ جس کو بلند پایہ کہا جا سکتا ہے۔

انگلستان کا ایک بڑا فلسفی جان اسٹوارٹ مل لکھتا ہے کہ :۔

"شاعری ان خیالات اور الفاظ کا نام ہے، جنہیں برجستہ جذبات کا اظہار کیا جائے"۔

مکالے لکھتا ہے کہ :-

"شاعر الفاظ سے وہ کام لیتا ہے جو مصوّر رنگوں سے لیتا ہے۔"

بل کے الفاظ یہاں تک درست معلوم ہوتے کہ "شعر جذبات کے اظہار کا نام ہے"۔ لیکن وہ اظہار کس انداز میں ہوگا۔ یہ وہ نہیں بتاتا۔ مکالے کے خیال میں شاعری بھی ایک قسم کی مصوّری ہے۔ یہ خیال ارسطو سے لیا گیا ہے۔ جس چیز کو مکالے مصوّری کہتا ہے۔ ارسطو اُس کو نقل کہتا ہے۔

اسی طرح سیکڑوں اور ہزاروں تعریفیں ہیں۔ جنمیں سے کوئی بھی ہم کو کسی خاص نقطہ پر نہیں پہونچاتی۔ نہ اُن میں کوئی ایسی بات معلوم ہوتی ہے کہ فلاں جُزو زیادہ ہو جانے سے شعر اچھا ہو جاتا ہے۔ اچھا اب تعریفوں کو چھوڑ کر ایک ذرا آسان بات یعنی شاعری کی خصوصیات پر غور کریں۔

ہم جانتے ہیں کہ ادب زندگی کی ترجمانی کا نام ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُس ترجمانی کا وہ خاص جزو کیا ہے، جس کو ہم شاعرانہ کہتے ہیں؟ اگر ہم لفظ شاعرانہ کے معنی سمجھ جائیں۔ تو شاید ہمیں کوئی دقت نہ ہو۔ شاعرانہ (جز) ہم اُس کو کہتے ہیں جو بیک وقت جذباتی اور تخیئلی ہو۔ اِسلئے شاعری زندگی کی اُس ترجمانی کا نام ہے۔ جسمیں اُن واقعات، تجربات اور مسئلوں کا ذکر کیا گیا ہو۔ جنمیں تخیئلی اور جذباتی عنصر غالب ہو۔ گویا شاعری کی ایک خصوصیت یہ ہوئی کہ اُسمیں زندگی کے جس پہلو پر نظر ڈالی گئی ہو، وہ اس طرح روشن ہو کہ ہمارے محسوسات اور جذبات کو چھیڑ دے اور اُسیوقت تخیئل اپنا پردہ ڈالکر حقیقت کو افسانہ اور افسانے کو حقیقت بنادے۔

جس وقت ہم جذبات اور تخیئل کا ذکر کرتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ گویا یہ چیزیں زندگی کی شاعرانہ ترجمانی کی خصوصیتیں ہیں۔ لیکن ہم یہ کبھی نہیں کہتے کہ صرف انھیں دو چیزوں کی موجودگی (خواہ وہ انتہائی نقطۂ کمال ہی پر کیوں نہ ہو) زندگی کی ترجمانی کو شاعرانہ بنانے کے لئے کافی ہے۔ ہم یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ جس چیز کو ہم شاعرانہ کہتے ہیں وہ بغیر ان کے وجود میں نہیں آتی۔

غالب کے خطوط میں یہ تمام عناصر موجود ہیں۔ لیکن ہم اُن کو شعر نہیں کہتے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تخیئل اور جذبات کے ساتھ ایک خاص طرز ادا کی بھی ضرورت ہے۔ جس کو ہم وزن یا دوسرے لفظوں میں عروض کہتے ہیں جس کے بغیر شعر کی روح تو ملے گی لیکن شعر وجود میں نہیں آسکتا۔ تو گویا ان تینوں اجزا کے شیر و شکر ہو جانیکا نام شاعری ہوا۔ اور یہ اجزا جتنے اچھے طریقے سے یکجا ہوں گے اُسی قدر شاعری کو بہتر کہا جائے گا۔

یہاں ایک اور بات ہم کو ذہن نشین کرنا پڑے گی۔ وہ یہ کہ شعر اور زندگی میں ایک بڑا نازک اور لطیف تعلق ہے اور شاعری کی ایک زبردست خصوصیت یہ ہے کہ وہ محسوسات کو ہمارے سامنے بے پردہ کر کے لے آتی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ شعریت ہر انسانی دماغ کی ایک لازمی خصوصیت ہے۔ یعنی حقیقی شاعر وہ ہے،

جسمیں احساسات اور جذبات دوسرے لوگوں سے زیادہ قوی ہوں۔ جو فطرت کے حسین مرقعوں کی ترجمانی کرنے میں عام لوگوں سے زیادہ ملکہ رکھتا ہو۔ جو زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال کر اُن کو ہمارے سامنے زیادہ حسین بنا کر پیش کرتا ہے۔ اور جو کچھ وہ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اُس کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ سُننے والے کے دِل میں وہ تمام باتیں اس طرح اُتری چلی جاتی ہیں گویا یہ جذبات کسی غیر کے نہیں خود سُننے والے کے ہیں۔ ہم آنکھیں رکھتے ہیں، مگر نہیں دیکھتے۔ ہم کان رکھتے ہیں، لیکن نہیں سُنتے۔ دِل رکھتے ہیں، لیکن محسوس نہیں کرتے۔ شاعر ہمارے حواس کو قوی اور ہماری احساس کرنے والی قوتوں کو تیز کر دیتا ہے۔ یہاں مجھے انیسویں صدی کے مشہور شاعر براؤننگ کے الفاظ یاد آئے۔ جو شاعروں کو حقیقتِ فطرت دکھانیوالا کہتا ہے۔

پس شاعری کو ہماری روزمرہ کی زندگی سے ایک گہرا تعلق ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ شاعر جس چیز پر نظر ڈالتا ہے۔ اُسمیں اُس کو شعریت نظر آتی ہے، خواہ عام نظروں میں وہ کتنی بدنما اور عامیانہ کیوں نہ ہو۔ شاعری کا کام ایک یہ بھی ہے کہ وہ بدنما چیزوں کو حسین بنا کر ہمارے سامنے پیش کرے اور حسین کو شاعری کی امداد کبھی نہ فنا ہونے والا بنا دیتی ہے۔ تو پھر اگر شاعری تخیل اور جذبات کے پردے میں زندگی کی ترجمانی کا نام ہے تو بہترین شاعری کا معیار یہ ٹھہریگا کہ جن قوتوں کی امداد سے شاعر زندگی کی تفسیر کرتا ہے، وہی قوتیں جتنی کسی شخص میں بڑھی ہوئی ہوں گی، اُتنی ہی شاعرانہ عظمت اُسے حاصل ہوگی۔ اور جتنی زیادہ قوی ترجمانی کسی شعر میں ہوگی اُتنی ہی عظمت شعر میں بڑھ جائے گی۔

لیکن ہم کو یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ شاعری ایک فن ہے اسمیں بہت سی باتیں ایسی بھی ہونا لازمی ہیں۔ جن کا تعلق براہِ راست فن سے ہے اور اِس سے بھی ہم کو انکار نہیں ہو سکتا کہ شاعری کا مقصد یہ ہے کہ ہم مسرت اور حیرت کے طوفان میں ڈوب جائیں اور شاعر جو تصویر ہمارے سامنے پیش کرے وہ اتنی عجیب اور نرالی ہو، کہ طبیعت خود بخود اُدھر راغب ہو جائے۔ وہ تصویر اتنی نئی ہو کہ ہم اُس کو دیکھنے کے لئے اُسی شوق سے بڑھیں جس طرح تاج محل کو پہلی مرتبہ دیکھنے والا شوق کی نگاہوں کو سیر کرنے کے لئے آگے بڑھنے پر مجبور ہوتا ہے تاج محل کو اکثر یہ کہا گیا ہے کہ وہ ایک ایسی یادگار ہے جو شعر میں تبدیل کر دی گئی ہے۔ اور یہ سچ بھی ہے کیونکہ جتنی مرتبہ ہم اُسے دیکھتے ہیں ہم کو ایک نئی مسرت اور ایک نئی حیرت ہوتی ہے جو خصوصیت ایک شعر کی ہے یہاں پہونچکر شاعری کی ایک زبردست خصوصیت ہم کو نظر آتی ہے کہ شاعری کبھی پُرانی نہیں ہوتی۔ ہم ایک شعر کو بار بار پڑھتے ہیں۔ لیکن ہر مرتبہ وہ ہم کو زیادہ سے زیادہ لُطف دیتا ہے۔ انیس کا ایک شعر ہے ؎

روئے ہیں فرقتِ شہ عالی جناب میں　　نرگس کے پھول تیرتے ہیں گلاب میں

اِس کو خواہ جتنی مرتبہ پڑھئے۔ اس کی مسرت بخش قوت کبھی ختم نہ ہوگی۔ کیونکہ یہاں حُسن کو غیر معمولی بنا کر

پیش کیا گیا ہے، تو گویا شعر کی عظمت وخوبی کے لئے طرزِ ادا کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے۔ جتنی فطرت کی ترجمانی کی
اب شعر کی تعریف ہم یوں کریں گے کہ شعر وہ ہے جسمیں جذبات اور محسوسات کی ترجمانی ایک نئے انداز سے کیگئی ہو
اور یہ نیا انداز جتنا حسین اور اعلیٰ ہوگا۔ اتنا شعر بھی بلند پایہ کہا جائے گا۔ لیکن اس نئے انداز کی وسعت کو
بتانا اور اس کے حدود مقرر کرنا۔ یہ بھی صرف شاعر کا کام ہے۔ وزن، قافیہ، طرزِ ادا، جدتِ تخیل، موسیقیت
اور بھی کچھ اِس دائرے میں آجاتا ہے۔ غالب کہتا ہے ؎

نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو — یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بیوفا سہی — جس کو ہو دین و دل عزیز اُسکی گلی میں جائے کیوں

ان اشعار میں بہت سی باتیں ایسی ہیں۔ جن کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شعر اِس وجہ سے اچھا ہوگیا۔ لیکن
ان باتوں کے ناموں کو بتانا، یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔ ہاں محسوسات کی ترجمانی کا نیا انداز ضرور ہے۔
تو پھر اس مبہم سی تعریف ہی کو کیوں نہ لے لیا جائے۔ اور ہم یہی کہہ دیں کہ جتنا یہ انداز نرالا اور حسین ہوگا
اُتنی ہی شاعری بھی بڑے مرتبہ کی ہوگی۔

لیکن یہاں میں آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں کہ آپ جس شاعر کو پسند کرتے ہوں اگر اُس کی عظمت کا
معیار صرف یہی نیا انداز رہ جائے۔ تو مجھے یہ کہنے میں تامل نہ ہوگا کہ آپ نہ مانیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ انیس کا
اندازِ بیان بہت اچھا ہے۔ اس لئے انیس کی شاعری اُردو ادب میں بلند درجہ رکھتی ہوگی۔ لیکن شاید کوئی بھی اس
بات کو ماننے کیلئے تیار نہ ہوگا کہ یہی بات اُس کو اتنا بڑا شاعر بنائے ہوئے ہے۔ اور عظمت کا معیار اگر یہی ہوتا
تو پھر ہر شاعر کی نئی خصوصیت کیوں ہوتی۔ میر و سودا، مومن و غالب، انیس و دبیر، اقبال و جوش اور جگر و فانی
کی شاعری کو ہم مختلف پہلوؤں سے کیوں دیکھتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اندازِ بیان تو حقیقتاً سب کا نرالا اور
مسرت و حیرت کے طوفان میں ڈال دینے والا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ نیا انداز سب کے یہاں ایک ہی سا ہو،
جس طرح ہر پھول کی خوشبو اور ہر موسیقی کی آواز جُدا جُدا ہے، اسی طرح ہر شعر اور ہر شاعر کی خصوصیت الگ الگ ہے۔

شاعری کے مختلف حصّوں پر روشنی ڈالنے کے بعد شاید آپ یہ سمجھے ہونگے کہ اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر شعر کی عظمت یا
خوبی کا معیار یہ ہے لیکن مَیں آپ سے کہوں گا کہ باوجود اس تمام کوشش کے وہ چیز جس کو اطمینان کہتے ہم کو نصیب
نہیں ہوئی۔ اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں ع وہ اور چیز ہے کرتی ہے دل کو جو تسخیر
جس طرح ایک حسین شے کی مجموعی کیفیت اور اُس کی ناگہانی جھلک دل پر بجلی گرا دیتی ہے۔ اسی طرح شعر بحیثیت
ایک مکمل شعر کے دل میں چٹکیاں لیتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ہم یہ بتانے کی کوشش کریں کہ اچھے شعر میں فلاں فلاں بات
ہونا ضروری ہے۔ لیکن ہم معترض کو اُس وقت تک لاجواب نہیں کر سکتے۔ جب تک اپنے دلائل کی امداد کیلئے ایک
عمدہ شعر بھی پیش نہ کر دیں۔ اور یہ کہہ کر خاموش نہ ہو جائیں کہ ایسی چیز کو ہم اچھا کہتے ہیں۔

موت اور محبّت

از خان بہادر مرزا جعفر علی خاں صاحب اُو۔ بی۔ ای۔ ڈپٹی کمشنر سیتا پور

پچھلے دنوں ایڈیٹر زمانہ پر جو خانگی مصائب نازل ہوئے، اُن سے اکثر ہمدرد احباب متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔ چنانچہ محب محترم حضرت اثر کی یہ نظم اِن اندوہناک واقعات سے بے تعلق نہیں ہے۔ اِس کے ساتھ جو محبت نامہ آیا ہے اس میں آپ لکھتے ہیں کہ "حال ہی میں مَیں نے یہ نظم کہی ہے، دل و دماغ نامحسوس طریقے پر آپ کے واقعہ سے متاثر تھے۔ غالبًا جذبۂ شعر نے عمل کرکے یہ نظم پیش کر دی"۔ ا۔ز

ہر گلِ تازہ ہے اک تازہ حکایت تیری — پتّی پتّی میں بسی پاتا ہوں نکہت تیری
مہ و انجم کی ہے چشمک میں اشارت تیری — میری آنکھوں میں پھرا کرتی ہے صورت تیری
موت نے چھین لیا تجکو تو کیا ہوتا ہے؟

پھول جب کھلتے ہیں اور فصلِ بہار آتی ہے — عطر میں ڈوبی ہوئی گُل بکنار آتی ہے
بدھیاں پہنے، لپیٹے ہوئے ہار آتی ہے — تیری ہی طرح کئے سولہ سنگار آتی ہے
موت نے چھین لیا تجکو تو کیا ہوتا ہے؟

دستِ گستاخ سے دامن وہ بچانا تیرا — شوقِ بیتاب کو آنکھیں وہ دکھانا تیرا
یاد ہے، یاد ہے، منھ پھیر کے جانا تیرا — عذر خواہی کے لئے آپ سے آنا تیرا
موت نے چھین لیا تجکو تو کیا ہوتا ہے؟

جس طرح تیری حیا تھی کبھی غمّاز تری — راز کہتی تھی ترے چشمِ سخن ساز تری
دل کے دھڑکن میں سُنا کرتا ہوں آواز تری — خود خموشی ہے مجھے انجمنِ ناز تری
موت نے چھین لیا تجکو تو کیا ہوتا ہے؟

تیرے ہونٹوں پہ نہ آیا تھا مرا نام ابھی — آنکھوں ہی آنکھوں میں تھا نامہ و پیغام ابھی
اُسی صہبا سے چھلکتا ہے مرا جام ابھی — شفق آلودِ تبسّم ہے مری شام ابھی
موت نے چھین لیا تجکو تو کیا ہوتا ہے؟

عشق اگر پاک خیالات کا گلدستہ ہے — دل گرفتہ ہے نہ مایوس و جگر خستہ ہے
ہجر میں وصل ہے اور وصل بھی پیوستہ ہے — رشتۂ روح تری روح سے وابستہ ہے
موت نے چھین لیا تجکو تو کیا ہوتا ہے؟

شبِ غم

(سانٹ از حضرت شایق وارثی)

Show the hours one by one,
In midnights footsteps creep.
Lovers who lie alone,
Soon wake to weep. (D.S.Blunt.

ظلمتِ شب ہے فضاؤں پر محیط
چھا رہی ہیں ہر طرف خاموشیاں
یہ سیاہی اور پہنائے بسیط
آہ! یہ بڑھتی ہوئیں مدہوشیاں

ایک بیکس بسترِ آلام پر
اشک افشاں ہے کسی کے واسطے
بیکسی ہر سمت آتی ہے نظر
آہ! یہ مایوس لمحے رات کے

بیکسی، بیچارگی، افسردگی
ناامیدی، یاس، حسرت، اضطراب
اُف! کسی مجبور کی یہ زندگی
بے سکون و تلخ اور ناکامیاب

اس قرارِ شب میں کوئی بے قرار
ہے کسی کی یاد میں زار و نزار

ہوش وخرد کی دوکان

(از پروفیسر حامد حسن قادری ایم۔اے)

میرے کتب خانہ کے پرانے کاغذات میں دو نظمیں نکلی ہیں جو سنہ ۱۳۰۶ھ ۱۸۸۹ء میں (اب سے نصف صدی پہلے) چھپی ہیں۔ میں نے اور کہیں ان کو مطبوعہ یا غیر مطبوعہ دیکھا سنا نہیں۔ ان میں سے بالفعل ایک نظم (ہوش وخرد کی دکان) ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔ یہ ایک قطعہ ہے مصنفۂ ابوالمحمود سید کفایت علی صاحب علوی ہاپوڑی تلمیذ حکیم سید منور علی خاں صاحب آشفتہ دہلوی وکیل راج الور اور اسی پر تخمیس ہے مصنفۂ مولوی محمد عبدالحی صاحب بیخود بدایونی شاگرد حضرت داغ دہلوی۔ اس کو مولوی علی احمد خاں صاحب اسیر بدایونی (سابق پروفیسر فارسی سینٹ جانس کالج آگرہ) نے شائع کیا ہے۔ حکیم آشفتہ دہلوی کے خلف رشید حکیم سید محمد حسن صاحب حسن دہلوی سے تقریظ لکھوائی ہے اور حضرت بیخود سے دیباچہ۔

یہ سب نظم و نثر قدیم رنگ سخن اور اسلوب و مذاق کے دلچسپ نمونے ہیں۔ اور یہ چاروں حضرات (علوی۔ بیخود۔ آشفتہ۔ اسیر) اپنی اپنی جگہ باکمال ہیں۔ اگرچہ بعض مشہور ہیں بعض گمنام، اس لئے میں پہلے ان بزرگوں کا مختصر تعارف کراتا ہوں:۔

(۱) **علوی**۔ تخلص لفظ قمری کے وزن و اعراب کے مطابق ہے عَلی سے منسوب نہیں، عُلوی ستارہ کو کہتے ہیں۔ مولوی کفایت علی علوی کا زیادہ حال دریافت نہیں ہو سکا۔ صرف اتنا معلوم ہوا کہ ریاست الور میں ملازم اور قصبہ ہاپوڑ ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ میرے بزرگوں سے ان کے خاص تعلقات محبت تھے بڑے ذہین، خوش فکر، شوخ طبع، نکتہ رس تھے۔ ان کے بعض دلچسپ ادبی خطوط میرے خاندان میں محفوظ ہیں علوی نے ایک کتاب میلاد شریف مولوی غلام امام شہید کی مشہور تصنیف کے جواب میں لکھی تھی جس میں شہید کی ہر رباعی و قطعہ و غزل کے مقابلے میں ویسی ہی چیزیں نظم کر کے شامل کی ہیں۔ یہ کتاب چھپ گئی ہے علوی کی کوئی غزل اس وقت دستیاب نہیں ہوئی، صرف دو شعر ملے ہیں وہ پیش کرتا ہوں:۔

گم کرو دل سے کسی دھیان میں جب تم مجھکو ۔۔۔ پہلے اُس وقت سے اللہ کرے گم مجھکو
خندۂ گل پہ نظر بھی ہو تو آنکھیں پھوٹیں ۔۔۔ یاد ہے یاد ہے وہ طرز تبسم مجھکو

(۲) **آشفتہ دہلوی** کا حال "خمخانۂ جاوید" میں صرف اتنا لکھا ہے کہ فن طب میں حکیم غلام حیدر خاں کے شاگرد

اور فنِ شعر میں حکیم مومن خاں اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ مرحوم سے مستفید تھے، مزاج میں خلقی بیباکی تھی، کچھ دنوں میرٹھ کی عدالت میں ڈگری نویس رہے، نہایت ذکی و فہیم تھے اور فنِ سخن سے قدرتی مناسبت رکھتے تھے ۱۸۵۸ء میں چالیس سال کے قریب عمر تھی۔ اس نظم زیرِ بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو ریاست الور میں وکیل ہو گئے تھے۔ "خمخانۂ جاوید" سے چند شعر بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں:۔

اجل تو نے کیا کیسا مجھے شرمندہ قاتل سے	تماشا تھا اُسے میرے تڑپنے کی اذیت کا

عاشق کو لطف سے ہے فزوں لطف جور میں	یہ غیر کی سزا ہے، ہماری سزا نہیں

جو نامہ بر گیا، وہ گیا جان سے وہاں	اب جی میں ہے رقیب کو ہم نامہ بر کریں

اللہ رے یاوریِ طالع	ٹھکرا کے چلے وہ میرے سر کو

(۳) بیخود بدایونی۔ مشہور آدمی ہیں، خمخانہ میں اُن کا مفصل حال درج ہے۔ پہلے مولانا حالی کے شاگرد ہوئے۔ پھر جب حضرت داغ کا پہلا دیوان گلزارِ داغ شائع ہوا تو اُس کو دیکھکر رامپور گئے اور داغ کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوگئے۔ سنبھل میں وکالت کی۔ پھر ریاست سروہی میں جوڈیشل افسر ہوگئے چند شعر خمخانہ سے نقل کئے جاتے ہیں:۔

ہاں سچ ہے میرے سینے میں کیا ہے دھرا ہوا	اِک داغِ ہجر، وہ بھی تمھارا دیا ہوا

دل بھی عزیز ہے، مجھے غم بھی عزیز ہے	یہ نعمتِ خدا، وہ بتوں کا دیا ہوا

وہ کہتے ہیں نہیں یہ نام کچھ خدا کا نام	ہمارے سامنے کیوں لے کوئی وفا کا نام

کہا جب اس سے کسی نے کہ مر گیا بیخود	بلا جواب "ہمیشہ رہے خدا کا نام"

میکشوں کا خم نے توڑ دیا زاہد نے	یا خدا بوند نہ اب چشمۂ زمزم میں رہے

راہ پر ناصحِ مشفق کو لگا لو رندو	یہ بھی کچھ لطف ہے، ہم سا نہو اوہم میں رہے

دعا کو نہیں راہ ملتی فلک کی	کچھ ایسا ہجوم بلا ہو رہا ہے

وہی جنت ہے جہاں چین ملے دل بہلے	جس پہ دل آئے وہی حور ہے انساں کے لئے

(۴) اسیر بدایونی۔ ان کا حال خمخانہ میں تو صرف اتنا لکھا ہے کہ گو ان کا اصل وطن بریلی ہے۔ مگر بدایوں میں رہتے ہیں۔ اور حضرت مذاق (شاہ دلدار علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کے شاگردوں میں ہیں اور صرف تین شعر درج کئے ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے:۔

ادائیں نہ کیوں چشم کی ہوں پسند اٹھاتے ہیں سب ناز بیمار کے

لیکن میں مولانا علی احمد خاں صاحب آسیرؔ سے ذاتی طور پر واقف ہوں، عربی و فارسی کے عالم متبحر تھے شعر و سخن میں اُستادانہ کمال رکھتے تھے بعض مختصر مثنویاں نعت شریف میں مطبوعہ موجود ہیں جن میں حضرت محسنؔ کاکوروی کا رنگ ہے، یہ اس وقت میرے پاس موجود نہیں ہیں، حاصل ہوگئیں تو ان کے متعلق مستقل مضمون لکھونگا۔ مولانا آسیر ایک مدت تک سینٹ جانس کالج آگرہ میں پروفیسر رہے۔ بڑے صاحب دل اور درویش کامل تھے۔ اُن بزرگوں میں تھے جن کے دیدار و صحبت سے خدا یاد آتا ہے اور جن کی نگاہ سے دل کو تسکین ہوتی ہے۔ لیکن مولانا تعلیم و تعلم اور شعر و شاعری میں اپنا احوالِ باطن چھپائے رکھتے تھے۔ جولائی ۱۹۲۶ء میں مدینۂ منورہ میں وصال پایا۔ یہ سفر حجاز اور سفر آخرت دونوں مولانا آسیر کے والہانہ عشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے مظاہر تھے۔ مولانا نہایت سن رسیدہ اور بیمار و ضعیف تھے۔ جب آخر جون ۱۹۲۶ء میں حج و زیارت کے لئے تشریف لے گئے۔ مکۂ معظمہ پہونچکر ایسے بیمار ہوگئے کہ مدینۂ طیبہ کی حاضری دشوار ہوگئی۔ وہاں اپنے ہموطن مولوی اسمٰعیل ذبیح بدایونی کے مہمان ہوئے، جو ملک الحجاز ابن سعود کی طرف سے کعبہ شریف کی برقی روشنی کے انجنیئر و منتظم ہیں۔ مولانا نے اپنے میزبان سے اصرار کیا کہ جس طرح ہو مجھے مدینہ پہونچادو نہ پہونچ سکونگا تو راستے ہی میں ختم ہونا چاہتا ہوں۔ چنانچہ مولانا اسمٰعیل ذبیح نے خاص طور پر موٹر کا انتظام کیا، اور مولانا اسیر دیار محبوب کو روانہ ہوئے۔ راستے بھر اپنا ایک شعر پڑھتے جاتے تھے، اسی کا مضمون سچ ہوگیا اور راستے ہی میں وصل دوام حاصل ہوگیا، شعر یہ تھا:۔

مجھے پہونچادیا ہے ضعفِ تن نے منزلِ جاں تک الجھ کر رہ گیا ہیں وادیٔ طیبہ کے کانٹوں میں

مولانا علی احمد خاں صاحب آسیرؔ کی کچھ نثر و نظم دوسری نظم کے سلسلے میں شائع ہوئی ہے وہ انشاءاللہ آئندہ اُسی نظم کے ساتھ پیش کرونگا۔

اب اس نظم (ہوش و خرد کی دکان) کا حال سُنیئے، نام کے اوپر مصرع درج ہے:۔

"ایک دل بیچتے ہیں، ہے کوئی لینے والا"

پھر سب سے پہلے حضرت بیخودؔ بدایونی صاحب مخمس کا یہ دیباچہ ہے:۔

دیباچہ از حضرت بیخودؔ

من قماش فروشِ دلِ صدپارۂ خویشم لختے برد از دل گذرد ہر کہ زپیشم

صاحبو! مجکو نہ شعر و شاعری سے مَس ہے، نہ لکھنے پڑھنے سے سروکار، نہ بحور و قوافی کی حس ہے نہ میں نظم و نثر سے خبردار۔ نہ اُستادی کی گون ہوں، نہ شاگردی کے لائق، نہ کسی چیز سے نفور ہوں نہ

نہ کسی بات کا شائق، مردہ دل، پژمردہ طبع، افسردہ خاطر، زندہ درگور، صدموں پر صدمے اُٹھائے ہوئے مصیبتوں پر مصیبتیں جھیلے ہوئے، حسن وعشق کو خیرباد کیے، سب جھگڑوں کو القط، سارے بکھیڑوں کو دال فے کئے۔ عاشقی ومعشوقی سے جان بچائے، بچی کھچی کو خیر منائے بیٹھا ہوں، علامن کجا و ذوق سخن کجا۔ مگر میرے مخدوم جاں نواز یعنی عُلوی شیوا بیان نے زہرہ وشوں کو مشتری بنانے کے لئے بساط خانہ کی ایک دُکان کھولی، اور اس دُکان نے کچھ ایسی شہرت پائی کہ جس نے سُنا یا دیکھا وہ ہزار جان سے گاہنک[1] ہوگیا اور جب نوبت کا یہاں تک پہونچی کہ خوبانِ خود فروش بھی اس کے سودے کے خریدار اور مطلوبِ روزگار بھی اس کے طلبگار بن گئے، تو یہاں بھی شوق کا دریا اُمڈا اور بے اختیار جی چاہا کہ کوئی ایسا ہی بہروپ گانٹھیئے، اور اسی طرح اچھے اچھے مجمعوں اور مزے مزے کے جلسوں میں پہونچیئے، لیکن اسی خیال نے ہمت سرد کردی کہ ایک چلتی ہوئی دُکان کے سامنے نئی دُکان کا فروغ مشکل ہے۔

قصہ مختصر، جب اس خیال کی صدائے دُور باش نے اس ولولے کو سرد کر دیا، تو چالا لی سے اُسی مکرم سراپا اکرام یعنی عُلوی اپنا کلام کو دم جھانسے میں لیکر اُسی چلتی ہوئی دُکان میں ساجھا ملا دیا اور ساجھا بھی کیسا! کہ اُن کی دو پائی تو اپنے تین حصے، بارے الحمدللہ کہ وہ شرکت بے سود نہ ہوئی یعنی خریداروں نے ہر جنس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور قدردانوں نے ہر چیز کو پسند کیا۔

غرض جب یہ سب کچھ ہوچکا تو یہ خیال آیا کہ آجکل ہر کارخانہ اپنے موجودہ مال واسباب کے اشتہار چھپوا کر اپنی شہرت ومنفعت کو بڑھاتا ہے، اور چوگنے نفعے اُٹھاتا ہے، تو ہم کیوں درگذر کریں مگر صدمات وتفکرات پے درپے کے متواتر حملوں نے دل ودماغ کو اس قابل بھی نہ رکھا تھا کہ تفصیل اور ترتیب کے ساتھ سب جنسوں اور ہر ایک مال واسباب کی کیفیت اور وضع تحریر ہوسکے۔ ناچار مخدومی ومخدوم زمن جناب حکیم سید محمد حسن صاحب حسن خلف الرشید حضرت حکیم سید منور علی خاں صاحب آشفتہ ارشد تلامذہ حضرت مومن دہلوی سے تقریظ کے پیرایہ میں سب مال واسباب کا اشتہار لکھوایا اور تضمین کے لباس میں دُکان کا فوٹو لیکر اس اشتہار کے ساتھ شامل کردیا۔

دعا یہ ہے کہ سودا بکے یا نہ بکے، کچھ منافع ہاتھ لگے یا نہ لگے، مگر یہ چند اوراق مشتریانِ جنس سخن کی نگاہوں تک ضرور پہونچ جائیں، اور التجا یہ ہے کہ جو صاحب کسی شے کو ناپسند فرمائیں یا کسی

---

[1] گاہک کا یہی املا لکھا ہوا ہے، اس لئے میں نے مع نون نقل کردیا کہ یہ تغیر یادگار رہے، ورنہ اور الفاظ میں املا درست کردیا گیا ہے مثلاً اُس۔ اُٹھانا۔ دُکان میں ایک ایک واؤ کا اضافہ تھا۔

چیز کی ترتیب میں غلطی پائیں، وہ پردہ پوشی و اصلاح کوشی کو کام میں لائیں۔ وآخر دعوانا
ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی حبیبہ سید المرسلین
وشفیع المذنبین وعلیٰ آلہ الطیبین واصحابہ الطاہرین واولیاء
اُمتہ اجمعین۔

اب حضرت بیخود کی تضمین ملاحظہ ہو:-

تضمین قطعۂ علوی

ہوش و خرد کی دُکان

بسکہ اُلفت میں حسینوں کے سہے لاکھوں جَور کوچہ گردی کے سوا شغل نہ رکھا کچھ اَور
اب یہ سنیئے کہ ہر اک سمت کو کرتے ہوئے غور کل نکلتے تھے ہم اِک کوچے سے لیکن اس طور
سر پہ اِک بستۂ غم، دوش پہ بارِ حرماں

رفتہ رفتہ جو ہوا ایک جگہ اپنا گذر ہوگیا حالِ دلِ حسن طلب نوعِ دگر
الغرض پاؤں بڑھاتے ہی اُٹھاتے ہی نظر ناگہاں دیکھتے کیا ہیں کہ وہیں کوٹھے پر
جلوہ فرما ہے کوئی بادلہ پوشِ آفتِ جاں

محوِ حیرت ہوئے ہم دیکھ کر اس کے جلوے عقل جاتی رہی اور ہوش ٹھکانے نہ رہے
چشمِ مخمور سے کچھ اُس نے اشارے جو کئے پھر تو جی میں یہی آئی کہ یہیں دم لیجئے
اور ڈرے بھی کہ نہ لوگوں کو ہو کچھ اور گماں

شوق بولا کہ کرو عرضِ تمنا دل کی حسن کے رعب سے پر کہنے کی ہمت نہ ہوئی
یہی حالت دلِ مضطر کی تھی سینے میں ابھی اتنے میں خود ہی پکارا کہ میاں پردیسی
تم کدھر جاتے ہو اور کون ہو رہتے ہو کہاں

خم کمر بوجھ سے ہے، سر پہ یہ رکھا کیا ہے ہم بھی مشتاق ہیں، دیکھیں تو سہی، کیا کیا ہے
نقشِ حیرت ہوئے کیوں، کہئے تو نقشا کیا ہے اور اس گانٹھ میں فرمایئے سودا کیا ہے
کچھ پسند آیا تو لے لیں گے اُٹھا لاؤ یہاں

ہم کو اِک عمر سے ہے شوق خریداری کا مال اچھا ہو تو قیمت کی نہیں کچھ پروا
خوف کھاؤ نہ یہاں آنے سے جی میں اصلا اتنی سنتے ہی یہاں کون ٹھہرتا تھا بھلا
پہونچے جھٹ پٹ وہیں، وہ ماہِ دوہفتہ تھا جہاں

بسکہ خود ہم کو بُلایا تھا، نہ تھا کچھ وسواس دل میں کہتے تھے کہ ہم آئے ہیں کس شوخ کے پاس
گو نہ تھا خوف نہ کوئی اور نہ کچھ بیم و ہراس پر وہاں جاتے ہی جاتے رہے سب ہوش و حواس
بے طرح صورتِ دل کش نے بنایا حیراں

یاس سے دیکھا جو اُس شوخ کا حسنِ نیکو طائرِ عقل بنا قیدیِ دامِ گیسو
بسٗ زباں پر نہ رہا اور نہ دل پر قابو دیکھکر مجھ کو وہ بولے کہ دِوانا[1] ہے تو
ہوش میں آ، ارے منھ تکنے کو آیا ہے یہاں

پاس جو جنس ہو اچھی وہ ہمیں دکھلا دے واجبی دام جو ایمان سے ہوں، ہم سے لے لے
شکل کیا تکتا ہے، چلتا ہو جو میزاں نہ چلے سُن کے یہ بات کہا تھام کے دل کو میں نے
کہ سُن اے رشکِ قمر، غیرتِ ماہِ کنعاں

تو ہے یوسف، تو مہیّائے غلامی ہیں ہم خاص بندے ہیں کوئی اور نہ عامی ہیں ہم
بتذل ہیں نہ بہت، اور نہ گرامی ہیں ہم نہ دِوانے[2] ہیں، نہ سوداگر نامی ہیں ہم
نہ جنوں ہے ہمیں زنہار، نہ ہرگز خفقاں

ہم نہیں جانتے کیا چیز ہیں کفر و اسلام بے ہمہ با ہمہ، دنِ زیست کے کرتے ہیں تمام
بُتکدے کو جو ہے آداب، تو مسجد کو سلام کوئی رندوں سے غرض ہمکو، نہ زہاد سے کام
عشق ہے مذہب و دیں، حُسن پرستی ایماں

نہ دوَا اور نہ دوش، رکھتے ہیں تھوڑی سی بساط کچھ نہ کاوش نہ خلش، رکھتے ہیں تھوڑی سی بساط
شان ہے کچھ نہ منش، رکھتے ہیں تھوڑی سی بساط پھیری والوں کی روش، رکھتے ہیں تھوڑی سی بساط
نہ کہیں اپنی دُکاں ہے، نہ کہیں اپنا مکاں

نفع کی ہم کو تمنّا، نہ ضرر سے سروکار کسی گاہک سے کبھی کی نہیں ہم نے تکرار
مال وہ رکھتے ہیں، تم لوگ کرو جس سے سنگھار ہیں غرض پاس ہمارے یہی سودے دو چار
شانۂ ہوش و خرد، سرمۂ دین و ایماں

بیش و پس بیع و شریٰ میں کسے یاں آتا ہے بخت سودائی میں جو نفع ہے وہ پاتا ہے
ہر جگہ کب دلِ نادان گھٹی کھاتا ہے کوئی تم سا ہی خریدار جو مل جاتا ہے

---

[1] اس لفظ پر یہ حاشیہ درج ہے:- اگرچہ اب لفظ دِوانا متروک ہے مگر اس مصرعہ میں قول معشوق بیان کیا گیا ہے اور وہ لوگ ابتک دوانا ہی بولتے ہیں۔ کما لا یخفیٰ۔

[2] اس پر یہ حاشیہ ہے:- چونکہ معشوق کی زبان سے دوانا ہی نکلا تھا اس لئے عاشق نے بھی دِوانا ہی کہا ہے۔

دیکھ کر بھاؤ کو دیتے ہیں ارزاں کہ گراں

جنسِ ہستی ہے خدا، ساتھ ملے گر سونا درم داغ کو حاضر ہے کلیجا اپنا
ساتھ ہے سر کے کسی زلفِ سیہ کا سودا اور یہ مال کھلے مول سے بکتا ہے سدا

نگہِ ناز کو دل، عشوہ و انداز کو جاں

کہہ چکا، تو نگہِ جور سے دیکھا مجھ کو نئے تیور سے، نئے طور سے دیکھا مجھکو
بات آہستہ تو کی اور سے، دیکھا مجھ کو سن کے یہ بات ذرا غور سے دیکھا مجھکو

پھر تو اک طیش میں آ کھینچ کے منھ پر داماں

مجھ سے کہنے لگے، اوسان گئے، بس خاموش ہم تری چال کو اب مان گئے، بس خاموش
میں جو بولا، مجھے کیا جان گئے، بس خاموش بولے غصہ سے کہ پہچان گئے، بس خاموش

تو وہی غلوی ہے، ہاں آئیو کوئی دَرباں

گو کہ جی بھر کے نہ دیکھا تھا ابھی دلبر کو ڈر سے قابو میں نہ پایا جو دلِ مضطر کو
خرد و ہوش سے کہتے ہوئے سر کو سر کو نام درباں کا ہم سنتے ہی سیدھے گھر کو

دل کو اِنٹی میں دبا کر ہوئے ایسے پرّاں

کہ نہ دن ہی ہمیں معلوم ہوا اور نہ شب کہیں رکھا تو کہیں پاؤں پڑا ہائے غضب
کیا بیاں کیجئے بیخود، رہی کونچی کیا اب کہ وہیں چھوڑ اٹھے وحشت و جلدی کے سبب

جامۂ صبر و سکوں، پارچۂ تاب و تواں

اس کے بعد منشی محمد حسن صاحب حسنؔ کی تقریظ نثر میں ہے، اور دیباچۂ بیخود کے طرز میں بلکہ اُس سے شوخ تر لکھی گئی ہے۔ لیکن اس کا آخری صفحہ غائب ہے اس لئے ناتمام ہے۔ اس کو چھوڑتا ہوں۔

اِسی کے ساتھ حضرت آسیر نے دوسری نظم کا اعلان اِن الفاظ میں کیا ہے:۔

"مژگاں سے دل بچا تو نگہ نے لپک لیا"

ابھی اہلِ نظر اپنے دامنِ شوق کو پھیلائے رکھیں، ایک اور بہار کا بادل اُمنڈنے والا ہے، وہ وہ تازہ پھول کھلیں گے کہ جن سے چشم و دماغ کو لذّت و سرور ہو، اور نگہِ ناز کے جگر فگار اپنے اپنے کلیجے کو مضبوط تھامے رہیں، جادوئے چشم کے پردہ میں دزد و دزدیدہ نظر کا کچھ ایسا تماشا ہوگا کہ دیکھنے والوں کے دل و جان ہاتھ سے جاتے رہیں گے۔ یعنی دوسرا قطعہ مصنفۂ جناب مولوی افتخار حسین صاحب مضطرؔ خیر آبادی تلمیذ رشید حضرت آسیر مینائی لکھنوی برادر خورد جناب مولوی محمد حسین صاحب بسملؔ وکیل ریاست عالیہ ٹونک

متعینہ ایجنسی راجپوتانہ مع تخمیس جناب مولوی عبدالحی صاحب بیخود بدایونی جوڈیشل افسر دربار ریاست عالیہ سروہی شاگرد حضرت داغ دہلوی "صبر و شکیب کی لوٹ" کے نام سے تیار ہے۔ وما علینا الا البلاغ

المشتہر، فقیر علی احمد اسیر

ان پھولوں کے لئے ناظرین زمانہ کسی آئندہ اشاعت تک اپنے دامن شوق کو پھیلائے رکھیں۔

تیرا خیال

(سانٹ)

(نتیجۂ فکر منشی شانتی سروپ کیف)

کون لیتا ہے تصور میں مرے انگڑائیاں
چھیڑتا ہے ساز نغمات شباب زندگی
روح کو میری پلاتا ہے شرابِ زندگی
انجمن آرا ہیں کس کے حسن کی رعنائیاں

لوٹ آئی ہے چمن زارِ محبت میں بہار
دل بنا ہے محشرِ ہنگامہ ہائے آرزو
کھلکھلا کر ہنس رہی ہے کائناتِ رنگ و بو
پھر ابھر آئے ہیں سب کھوئے ہوئے نقش و نگار

آ گیا ہے پھر معاذ اللہ مجھے کس کا خیال
یادِ الفت کی جواں راتوں کی پھر تازہ ہوئی
حسن کی لذت بھری باتوں کی پھر تازہ ہوئی
پھر نظر کے سامنے ہے وہ جنوں پرور جمال
ہم سخن صبح و مسا رہتا ہوں اس کی یاد سے
حالِ دل کہتا ہوں اپنے ہی دلِ ناشاد سے

فردوسِ تصوّر

(از حضرت کیفی اعظمی)

(۱)

جہاں کی شام پر "شامِ اودھ" کی مستیاں صدقے جہاں کی صبح پر "صبحِ بنارس" کا سماں صدقے
جہاں کے ذرّے ذرّے پر بساطِ کہکشاں صدقے
اُسی دنیا میں ہم تم بیخود و مخمور رہتے ہیں نگاہیں مست سی رہتی ہیں دل مسرور رہتے ہیں

(۲)

جہاں موجِ صبا پر بھی چراغِ شوق جلتے ہیں جہاں ذرّوں سے چشمے کامرانی کے اُبلتے ہیں
جہاں جلوے برستے ہیں جہاں نغمے اُچھلتے ہیں
اُسی دنیا میں ہم تم بیخود و مخمور رہتے ہیں نگاہیں مست سی رہتی ہیں دل مسرور رہتے ہیں

(۳)

جہاں زرّیں کرن خورشید کی سونا چھپاتی ہے جہاں ٹھنڈی ہوا الفت کے میٹھے گیت گاتی ہے
جہاں رنگیں دُھنک جھک کر ہمیں جھولا جھلاتی ہے
اُسی دنیا میں ہم تم بیخود و مخمور رہتے ہیں نگاہیں مست سی رہتی ہیں دل مسرور رہتے ہیں

(۴)

جہاں اک زعفرانی بھاپ جلووں کو بھگوتی ہے جہاں ہر شے خوشی میں مست سُکھ کی نیند سوتی ہے
جہاں کی چاندنی دلکش سُہانی دھوپ تی ہے
اُسی دنیا میں ہم تم بیخود و مخمور رہتے ہیں نگاہیں مست سی رہتی ہیں دل مسرور رہتے ہیں

(۵)

جہاں قوسِ قزح کا رنگ اُڑتا ہے فضاؤں میں جہاں رہتی ہے رقصاں روح میخانہ ہواؤں میں
بجا کرتا ہے گھنگرو سا جہاں اُودی گھٹاؤں میں
اُسی دنیا میں ہم تم بیخود و مسرور رہتے ہیں نگاہیں مست سی رہتی ہیں دل مسرور رہتے ہیں

(۶)

جہاں اک خواب کی سی کیفیت دن رات ہوتی ہے جہاں کچھ جاگتی ہے اور کچھ ہر چیز سوتی ہے
جہاں رنگینیوں میں روح کو الفت ڈبوتی ہے
اسی دنیا میں ہم تم بیخود و مخمور رہتے ہیں نگاہیں مست سی رہتی ہیں دل مسرور رہتے ہیں

(۷)

جہاں رعنائیاں ہیں حسن کی جلوہ نمائی ہے جہاں کے ایک اک ذرے میں شانِ دلربائی ہے
جہاں کیفی سے شوریدہ طبیعت کی خدائی ہے
اسی دنیا میں ہم تم بیخود و مخمور رہتے ہیں نگاہیں مست سی رہتی ہیں دل مسرور رہتے ہیں

جذباتِ جذب

مدعا ہوں عشقِ نافرجام کا آدمی ہو کر نہیں ہوں کام کا
شام میں مضمر ہیں آثارِ سحر زور ہے کیا ابلقِ ایام کا
فیض بخشی ہو زر گل کی روش اس چمن میں تنگدل کس کام کا
اک نہ اک گردش میں رہتے ہیں مدام سلسلہ جب سے ہے صبح و شام کا
رخ پہ کیا لہرا گئی زلفِ سیہ صبح نے جلوہ دکھایا شام کا
اختلاطِ باہمی جب کشف ہو درمیاں میں دخل کیا پیغام کا
امتیازِ جیب و داماں اور جنوں کیا ٹھکانا ہے خیالِ خام کا
نام ہی سنتے رہے ہم عمر بھر ذکر کیسا راحت و آرام کا
بھول جائے اپنا بل شاخِ غزال پیچ ہے وہ زلف عنبر فام کا
گاہ ذکرِ رخ کبھی تذکیرِ زلف ورد ہے اپنا یہ صبح و شام کا
اپنے ہاتھوں جب ہیں گردش میں اسیر پھر گلہ کیا گردشِ ایام کا
کلفتِ آفاق جس سے دور ہو ایک قطرہ اس مئے گلفام کا
تا دمِ آخر نہ افشا راز ہو
جذب ہے منشا بتِ خود کام کا

سید عبد... جذب

ہندو مسلمانوں کی باہمی منافرت کا تاریخی راز

(از حضرت کوثر چاند پوری)

قوموں کے بگاڑنے سنوارنے اور اُن کے لڑانے ملانے میں تاریخ کو بہت بڑا دخل رہتا ہے۔ ہندوستان کے اندر بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ اجنبی قوم نے ہندوستان میں اپنی حکومت کو مضبوط کرنے کے لئے تاریخ کے اینٹ گارے سے کافی امداد لی ہے، اور ہر جگہ اس نکتہ کو ملحوظ رکھا ہے۔

ہندوستان میں مختلف خیال اور عقیدے کی اقوام آباد ہیں، جن میں دو بڑے مذہبی گروہ ہندو اور مسلمانوں کے ہیں۔ انھیں دونوں کے اتحاد اور نفاق، میل اور بگاڑ سے ہندوستان کا حال اور مستقبل وابستہ ہے۔ سرزمین ہند پر بیرونی قومیں برسر اقتدار آنے سے پہلے ماضی قریب میں یہاں مسلمانوں کی حکومت تھی جن کو مغلوب کرنے کے بعد سات سمندر پار کے انگریزوں کا یہاں تسلط ہوا، سیاسی اور حاکمانہ چالوں کا تقاضا تھا کہ سلطنت کا جو پودا حال ہی میں بھارت ورش کی موتی اُگلنے والی زمین پر بویا گیا ہے اُس کی جڑوں کو اچھی طرح زمین میں پیوست کر کے مضبوط کیا جائے۔ اس منصوبے کو پورا کرنے کے لئے ہزار ہا قسم کے سیاسی کھاد تیار کئے گئے۔ انھیں میں تاریخ کا مرتب کرنے کا کام بھی شامل تھا چنانچہ وہ بھی ہاتھ میں لیا گیا، اور واقعات کو اس طرح اکٹھا کر کے مواد جمع کیا گیا اور اُسے تعلیمی نصاب میں داخل کیا گیا۔

اُس وقت خاص طور پر مسلمانوں کو کمزور کرنا مقصود تھا، ان سے ابھی ابھی سلطنت چھنی تھی، اُن کے دل دُکھے ہوئے تھے اور دماغوں میں حکمرانی کا نشہ موجود تھا۔ ایسی صورت میں اِن سے اقتدار شاہی کو صدمہ پہونچنے کا اندیشہ تھا، اس لئے ملک کے اندر ہی دوسری طاقتوں سے ٹکرا کر مستقل طور پر اُن کے زور کو توڑنے کا بندوبست کیا گیا۔ لیکن یورپ کے سیاست داں جب کوئی قدم اُٹھاتے ہیں تو اس میں اپنے بہت سے فائدوں کو مدِ نظر رکھتے ہیں، مقصد تو مسلمانوں کو کمزور کرنا تھا لیکن ضمنی طور پر اُنھوں نے یہاں کی ہر قابل ذکر قوم کی قوت اس ذریعہ سے توڑ کر رکھ دی، اور جہاں جہاں تاریخ میں موقع ملا ایسا شوشہ چھوڑ دیا جو مختلف اقوام ہند کو ایک دوسرے سے بدظن کر دے۔ یہ انتظام مؤثر ہونے کے باوجود بالکل غیر محسوس طریقے پر کیا گیا۔ جب کوئی تیسرا آدمی دو آدمیوں کے خانگی جھگڑوں میں کسی ایک کا ساتھ دیتا ہے تو ایک

فریق اس سے ضرور خوش ہو جاتا ہے، اور یہ نہیں سوچتا کہ اِس طرزِ عمل سے وہ اپنی کیا اغراض حاصل کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس وقت کسی کے ذہن میں بھی یہ بات نہ آئی کہ مدرسوں میں جو کتابیں بچوں کو پڑھائی جا رہی ہیں یا تاریخ کے جو ذخیرے یورپ کے عینک پوش مورخ جمع کر کر کے الماریاں بھر رہے ہیں، اُن کا ہماری موجودہ یا آئندہ زندگی پر کیا اثر پڑے گا۔ لیکن پوشیدہ اور نامعلوم طور پر یہ زہر پھیلتا رہا، اور ہندو مسلمانوں کی باہمی نفرت آہستہ آہستہ بڑھتی رہی، جس سے حکومت کی جڑیں مضبوط ہوتی رہیں۔ مورخین نے اپنا نصب العین یہ قرار دے لیا تھا کہ جہاں مسلمان بادشاہوں کا ذکر کیا جائے وہاں معمولی طور پر یہ بات بھی کہہ دی جائے کہ وہ مذہب کے معاملہ میں متعصب، ظالم اور سنگدل تھے، ہندوؤں سے انھیں بیر تھا، وہ انھیں کافر سمجھتے تھے، اُن کی عبادت گاہوں کو مسمار اور برباد کرنا ثواب جانتے تھے۔ اِس سلسلے میں بہت سی جھوٹی اور مصنوعی باتیں بھی لکھی گئیں، کہ اگر اب ان کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو سخت تعجب اور افسوس ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف ہندوؤں کو مسلمانوں سے نفرت ہو گئی اور وہ انھیں ظالم، سخت گیر اور ہٹ دھرم سمجھنے لگے، بلکہ خود مسلمان بھی اِن جھوٹے واقعات پر اِترانے لگے، اور انھوں نے اِن کو فخریہ دُہرانا اپنا شعار بنا لیا۔ یہ ایک اور زہر تھا جس سے بھائی بھائی مسموم ہو گیا۔

یوروپین مورخین نے ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی تاریخ لکھنے میں یہ التزام کیا ہے کہ جن بادشاہوں کو مذہب سے بغاوت یا بے اعتنائی برتنے کے باعث سخت قسم کے مذہبی مسلمان اچھا نہیں سمجھتے، اُن کی تعریف و توصیف کی جائے، اور جن کو مسلمان پکا مذہبی سمجھتے ہوں اُن کی دل کھول کر بُرائی کی جائے۔ اس میں یہ بھی راز تھا کہ پہلی قسم کے بادشاہوں کا زمانہ بہت دُور کا تھا اور دوسری قسم کے سلاطین کا عہدِ حکومت قریب ہی گزر چکا تھا، اس لیئے ان کی برائی سے یہ بھی خیال تھا کہ مسلمان زیادہ ناراض اور ہندو زیادہ خوش ہونگے۔ اور اُن واقعات کی روشنی میں جب موجودہ انتظامات اور عدل و انصاف پر نظر کی جائے گی تو ہر شخص کے دل میں تعاون کا جذبہ پیدا ہو گا۔ دوسرا راز یہ تھا کہ مسلمان بادشاہوں نے جو مظالم کئے اُن کا تعلق اُن کی شخصیت سے نہیں بلکہ مذہب کی تعلیم سے بتایا گیا، لہٰذا محض شخصی عداوت نہیں بلکہ مذہبی منافرت پیدا ہو گئی۔ اور دلوں میں یہ خیال جاگزیں ہونے لگا کہ اسلام ہندوؤں کا دشمن ہے جو اپنے پیروؤں کو اُن کے مقابلہ میں سخت اور خلافِ انسانیت برتاؤ کرنے پر مجبور کرتا ہے مگر جن بادشاہوں پر اسلام کا گہرا رنگ نہ تھا وہ ہندوؤں کے ساتھ رواداری اور انصاف کا برتاؤ کرتے تھے۔ یہ رنگ ذرا گہرا تھا وہ تعصب اور تنگ نظری کے پتلے تھے۔ حقیقت میں یہ بڑی گہری

چال تھی، جس کا اثر دونوں جانب برابر کا ہوتا تھا۔ ایک طرف ہندو مسلمان کو اپنا دشمن سمجھنے لگے، دوسری طرف مسلمانوں نے ہندوؤں کو اپنا بیری خیال کیا۔ اور یہ عداوت شخصی نہیں تھی بلکہ مذہبی تھی ظاہر ہے کہ شخصی عداوتیں مٹ جاتی ہیں اور کبھی نہ کبھی اتحاد ہو جاتا ہے، مگر مذہب کے نام پر ایک مرتبہ جو خلیج بنا دی جاتی ہے وہ بڑی مشکل سے پٹتی ہے۔ مغربی مدبرین اور مورخین کو یہ راز معلوم تھا، چنانچہ انھوں نے اس سے خوب خوب فائدہ اُٹھایا۔ اگرچہ ان بے حقیقت الزامات کی بار بار تردید کی جاچکی ہے اور ثابت کیا جاچکا ہے کہ مسلمان بادشاہوں کے خلاف اِن الزامات کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ اور جب تاریخ کی روشنی میں اِن کو دیکھا جاتا ہے تو نہ صرف یہ کہ ان کی صداقت ہی مشتبہ ہو جاتی ہے بلکہ مورخ کی بدنیتی بھی صاف طور پر واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ لیکن صفائی کے کارگر ہونے کے لئے جس فضا کی ضرورت تھی وہ موجود نہ تھی، اس کا وقت ہی گذر چکا تھا۔ ضد اور ہٹ دھرمی پیدا ہو چکی تھی، جس کے جوش میں معقول باتیں نہیں سُنی جایا کرتیں۔ جب آنکھوں اور دماغ کے درمیان تعصب اور عداوت کی سیاہی پیدا ہو جاتی ہے تو آدمی دماغ کو بھی دھوکہ دینے لگتا ہے اور آنکھ سے جو کچھ دیکھتا ہے دماغ سے اُسے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ یہی سلوک ہندوستانی مورخین کی پیش کی ہوئی شہادتوں کا ہوا۔ اسے کڑوا سمجھکر کسی نے قبول نہ کیا، اور اُس سے شربت سمجھکر سب پی گئے۔ پھر فضا مسموم تھی، زہر کے ذخیرے کتابوں کی شکل میں موجود تھے، سچ اور جھوٹ کو پرکھنے کی ضرورت تھی اور نہ سچائی کو تلاش کرنے کا شوق۔ اِسی لئے سچائی کا دیا بجھا نہیں تو اُس کی لَو ضرور کم ہو گئی، اور جھوٹ کی تاریکی برابر بڑھتی رہی۔ اگرچہ سب جانتے ہیں کہ گھر کی بات سے گھر کا آدمی ہی خوب واقف ہوتا ہے لیکن بدنصیب ہندوستانیوں نے اپنی بدقسمتی سے اس پر بھی التفات نہ کیا، اُنھوں نے اپنے گھر کی اچھی بُری باتیں بھی یورپ ہی کے افسانہ طراز اور داستان گو مورخ سے سنیں، اور ہندوستان کی ایسی تاریخوں کو جس میں چشم دید حالات لکھے گئے تھے جن کے لکھنے والے ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی، انھیں تو جھوٹ سمجھا گیا اور باہر کے مصنفوں نے جو سُنی سُنائی بے سروپا باتیں لکھدیں اُن پر یقین کر لیا گیا۔ ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا کیونکہ یہ مورخ بات کرتے تھے وقت کے اقتضا اور انسان کی فطرت کو دیکھکر وہ سمجھتے تھے کہ سچی بات سے کوئی ہنگامہ پیدا نہیں ہوا کرتا جبکہ ذرا سا جھوٹ قیامت برپا کر دیتا ہے، پھر اس جھوٹ کو پھیلانے کے لئے ان کے پاس کافی ذرائع موجود تھے مدرسوں کا ایک وسیع جال ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا جو اس مقصد میں خاطر خواہ امداد دے رہا تھا، اور ہندوستان کے سادہ لوح باشندے اس فریب میں مبتلا ہو رہے تھے، وہ گھر کی سچی باتوں کے مقابلے میں باہر کی جھوٹی باتوں کو زیادہ توجہ اور دلچسپی سے سُن رہے تھے، حالانکہ اُن کے گھر کی تاریخوں

میں مسلمان فرمانرواؤں کے ہزارہا واقعات اس قسم کے مل سکتے تھے جن سے ہندوؤں کے مقابلے میں اُن کی رواداری اور کشادہ دلی کا ثبوت مل سکتا تھا، یورپی مدبّرین نے تو انھیں دانستہ نظر انداز کردیا، کیونکہ ان کو روشنی میں لانے سے اُن کے مقاصد کو نقصان پہونچتا تھا۔ لیکن ہندستانی چاہتے تو ان سے حقیقت کا سُراغ لگا سکتے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے کسی وقت بھی امور سلطنت میں تعصب کو دخل نہیں دیا، اُنھوں نے ہر موقعہ پر اپنی غیر مسلم رعایا کے آرام و آسایش کا خیال رکھا، یہی نہیں بلکہ انھیں اپنی دفتری زبان کی تعلیم دے کر کاروبار حکومت میں شریک کیا۔ سلطان سکندر لودی کے زمانے تک ہندو شاہی زبان یعنی فارسی سے ناواقف ہونے کے باعث دفتری ملازمت سے محروم تھے۔ اگرچہ فوج وغیرہ میں ہندوؤں کی کافی تعداد تھی مگر ملکی و مالی عہدے اُنھیں حاصل نہ تھے۔ سلطان سکندر نے ہندوؤں کی اس حق تلفی کا سدِّ باب کرنے کی غرض سے سب سے پہلے اس ضرورت کو محسوس کرکے ہندوؤں کو فارسی زبان سیکھنے پر متوجہ کیا تاکہ وہ ملازمتوں میں اپنا حصہ لے سکیں اور سلطنت کے کاموں میں شریک رہیں۔ جب سلطان سکندر نے دیکھا کہ اہلکاران و عہدیداران میں ہندو نظر نہیں آتے تو اُس نے ہندوؤں کو ان کا یہ حق دینا چاہا۔ مگر معلوم ہوا کہ ہندو فارسی زبان سے بالکل ناواقف ہیں، اور اُس وقت کوئی ہندو بھی ایسا نہیں جو فارسی جانتا ہو۔ چنانچہ سلطان نے سب سے پہلے برہمنوں کو بُلاکر ان سے فارسی پڑھنے کو کہا۔ اُنھوں نے اپنی مذہبی ضروریات اور مصروفیتوں کے پیش نظر انکار کردیا۔ پھر چھتریوں سے کہا گیا، مگر یہ فوجی زندگی ہی کو اپنے لئے سربلندی کا ذریعہ خیال کرتے تھے، انھوں نے بھی اظہار مجبوری کیا۔ ویش قوم کے لوگ تجارت سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے، یہ خدمت مذہبًا اُن پر فرض تھی وہ بھی اس ذمہ داری کو قبول نہ کرسکے۔ اعلیٰ قوموں میں کایستھوں نے فارسی کو اپنے عروج کا ذریعہ بنایا اور فارسی پڑھنے پر آمادہ ہوئے۔ چنانچہ اُنھوں نے فارسی زبان سیکھ کر مسلمانوں کے عہد سلطنت میں زبردست عروج حاصل کیا۔ اور بڑے بڑے عہدوں پر مامور ہوئے۔ اُنھوں نے مسلمانوں کے علوم میں اتنی دستگاہ بہم پہونچائی کہ ان علوم کا درس دینے لگے، فارسی میں بے تکلف شعر کہتے تھے۔ پنڈت ڈونگرمل کا یہ مطلع آج بھی داد حاصل کئے بغیر نہ رہیگا۔

دل خوں نہ شدے چشم تو خنجر نہ شدے گر
رہ گم نہ شدے زلف تو ابتر نہ شدے گر

سلطان سکندر لودی ہی نے امر گر مہا ویدک کا ترجمہ سنسکرت سے فارسی زبان میں کرایا اور خراسان و ہندوستان کے طبیبوں کو جمع کرکے فن طب میں ایک کتاب طب سکندری کے نام سے تصنیف کرائی جس میں یونانی اور ویدک کے مسائل کو سمو کر دونوں کو ایک کردیا ہے، اور اس علمی اتحاد سے قومی اتحاد کی بنیاد قائم کی ہے

دکن کے نامور بادشاہ علاؤالدین حسن گانگوی نے محض اس وجہ سے لفظ "گانگوئی" کو اپنے نام کا جزو بنالیا تھا کہ اُس کے آقا کا نام "گانگوئی تھا جو قوم کا برہمن تھا۔ اس واقعہ کو سیاست اور ڈپلومیسی سے دُور کا بھی تعلق نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد دوستانہ تعلقات اور اُن مخلصانہ روابط پر ہے جو ایک آقا اور وفادار ملازم کے درمیان ہوا کرتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ دولت و سلطنت پر پہونچکر ان کا نباہنا کیسا کٹھن کام ہے۔

شیرشاہ سوری کے حالات میں اس کے عدل و انصاف کے متعلق ایک واقعہ ملتا ہے، جس میں ملزم شیرشاہ کا بڑا بیٹا اور ولیعہد سلطنت عادل خاں ہے اور مستغیث ایک معمولی بنیا۔ مگر شیرشاہ نے عدالت کے وقت اس فرق کو مطلقاً نظرانداز کردیا۔ اور بغیر کسی رو رعایت کے بیٹے کے خلاف فیصلہ صادر کیا۔ حالانکہ اس فیصلہ سے خود ناموسِ شاہی کو صدمہ پہونچتا تھا۔ اور عادل خاں کی بیوی کی بے پردگی ہوتی تھی۔ مگر انصاف کے آگے ان چیزوں کی کوئی وقعت نہ تھی، جیسی کرنی ویسی بھرنی۔

یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے بلکہ اس سے عہدِ شیرشاہی کے متعلق بہت سی باتوں اور حُسن انتظام وغیرہ کا انکشاف ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیرشاہ کے دورِ حکومت میں رعایا اُس کے انصاف اور عدل گستری سے اتنی مطمئن تھی کہ معمولی بنیا یہ جانتے ہوئے بھی کہ ملزم بادشاہزادہ ہے اُس کے خلاف استغاثہ دائر کرنے میں پس و پیش نہیں کرتا۔ باپ کی عدالت میں بیٹے کے خلاف مقدمہ کا پیش ہونا اس امر کی کُھلی ہوئی دلیل ہے کہ اُس وقت انصاف حاصل کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہوسکتی تھی اور ہر شخص کو کامل آزادی تھی کہ اپنی تکالیف کا بادشاہ کے سامنے اظہار کرے، ہندو مسلمان کا تو سوال ہی کیا ہے بھائی اور بیٹے کی تمیز بھی نہ تھی۔

عبدالرحیم خان خاناں اکبری عہد کا زبردست جرنیل تھا، وہ سنسکرت پر کامل عبور رکھتا تھا، بھاشا میں نہایت شگفتہ اور دلچسپ اشعار کہتا تھا جس طرح فارسی کے مسلمان شعرا اُس کے دستِ کرم سے فیضیاب ہوتے تھے، اُسی طرح نغمہ سنجانِ ہندی کو انعامات اور صلے دیئے جاتے تھے۔ بلکہ صاحبِ مآثر رحیمی کا بیان ہے کہ جتنے انعامات اُس نے فارسی شعرا کو دیئے ہیں اُس سے دس گُنا روپیہ ہندی کے شاعروں کو بخشا ہے۔

ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں میں شاہجہاں اور عالمگیر بہت بدنام ہیں۔ یورپ کے مؤرخین نے ان دونوں کو دل کھول کے رُسوا کیا ہے۔ خدا شاہد ہے کہ ان کی زیادتیوں کو چھپانا ہمارا مقصود نہیں ہمیں معلوم ہے کہ ان میں کمزوریاں تھیں جیسی ہر انسان میں ہوا کرتی ہیں۔ مگر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ وہ جو کام کرتے تھے مذہب کے حکم سے کرتے تھے۔ شاہجہاں کے متعلق سب جانتے ہیں کہ اُس نے اپنے حقیقی بھتیجوں کو قتل کرکے تخت سلطنت پر قبضہ کیا تھا۔ کیا اُس کے مذہب نے جو صلۂ رحمی کو بہت ضروری قرار دیتا ہے

اس خونریزی کی تعلیم دی تھی؟ ہرگز نہیں یہ جذبہ اس کے دل میں تخت وتاج کی اندھی حرص نے پیدا کیا تھا۔ آگے چلکر خواہ وہ کیسا ہی اچھا حکمران ثابت ہوا ہو مگر اس کا دامن ظلم کے اس دھبے سے صاف نہیں ہوسکے گا ہندوؤں کے مقابلہ میں اس بادشاہ کا طرز عمل بہت اچھا تھا۔ شاہجہاں نے اپنے عہد سلطنت میں ہندوؤں کو ہر قسم کی مذہبی اور تمدنی آزادی دے رکھی تھی، بلکہ آج اس آزادی کو شاہجہاں کی کمزوری پر محمول کیا جائے گا۔ شاہجہاں کی رواداری کی حد یہ ہے کہ اس کے دور حکمرانی میں ہندوؤں نے مسجدوں کو مندروں کی شکل میں منتقل کرنا شروع کردیا تھا۔ شاہجہاں کو اطلاع ہوئی تو اُس نے کوئی سخت کارروائی نہیں کی صرف وہ مسجدیں مسلمانوں کو واپس دلادیں شاہجہاں کا بڑا اور چہیتا بیٹا دارا شکوہ جب باپ کا شریک حکمرانی ہوا تو اُس نے ہندوؤں کی کافی رعایت ملحوظ رکھی، بڑے بڑے عہدوں پر ہندو مامور ہوئے۔

شاہجہاں کا وزیر نواب سعداللہ خاں جو اپنی مذہبیت اور خداپرستی کے لحاظ سے شاہجہاں اور اورنگ زیب دونوں سے ممتاز تھا۔ اس کی بے تعصبی اور رواداری کا یہ عالم تھا کہ رگھناتھ اُس کا پیشکار تھا۔ خالصہ وتن کی پیشکاری اس سے متعلق تھی۔ سعداللہ خاں نے اس کی اتنی عمدہ تربیت کی تھی کہ سعداللہ کے بعد ہی اس کا عارضی انچارج ہوا۔ شاہجہاں کے دربار سے اس کو رائے مایاں کا خطاب عطا ہوا تھا۔ اسی زمانہ میں ایک اور ہندو چندربھان دارالانشا کی خدمت پر متعین تھا اور رائے چندربھان مشہور تھا۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے ہندو سرکاری عہدوں پر فائز تھے۔ فوجی عہدے بھی ہندوؤں کو حاصل تھے۔ اورنگ زیب کی تاریخ یورپین مورخین کی ستم ظریفانہ توجہات سے اور زیادہ تاریک ہے۔ اس کو ہندوؤں کے مقابلے میں نہایت سرگرم مجاہد ظاہر کرکے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اس کا مقصد ہی ہندوستان سے ہندوؤں کی بیخکنی کرنا تھا۔ سیواجی کے مقابلے میں اس کی لشکرکشی کو ہندوکشی کا سب سے بڑا ثبوت بیان کیا گیا ہے۔ حالانکہ جن لوگوں نے اورنگ زیب کے سوانح حیات کو تعصب اور تنگ نظری سے الگ ہوکر مطالعہ کیا ہے وہ ضرور اس کی شہادت دیں گے کہ وہ ہندوؤں ہی کے بالمقابل سخت نہ تھا۔ خود مسلمانوں سے بھی اسی قسم کا برتاؤ کرتا تھا۔ اس کے سیاسی کارناموں کو مذہبی تنگ نظری پر محمول کرنا تاریخ کو مسخ کرنا ہے۔ حقیقت میں اورنگ زیب ملک گیری اور سلطنت کی وسعت کا دلدادہ تھا اور اسی کو مقصد حیات جانتا تھا۔ اس راستے میں جو چیز اس کے سامنے حائل ہوتی تھی وہ ارادے کی پختگی اور طاقت کے پورے جوش کے ساتھ اُسے ہٹانے کی سعی کرتا تھا سب سے پہلے دارا شکوہ کو اور پھر شجاع کو راستے سے ہٹاکر اورنگ زیب نے اپنی بادشاہت کے لئے میدان صاف کیا۔ آخر میں مرادبخش جو دارا شکوہ کی لڑائی میں اس کا دست راست تھا اور اس لڑائی کی فتح

میں اُس کا حصّہ اورنگ زیب سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ جب اورنگ زیب کی فرمانروائی میں روڑے اٹکانے لگا تو اورنگ زیب نے اُسے بھی گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا۔ اور اس پر بھی یہ کانٹا اُس کے پہلو میں چبھتا رہا تو نہایت بیدردانہ طریقہ پر مراد بخش کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد دکن کی مسلمان ریاستوں میں وہ جس جوش و خروش سے لڑا اور خود اپنے بیٹوں کے ساتھ جو جارحانہ رویہ رہا اُس سے تاریخ کے طالب علم اچھی طرح واقف ہیں۔ ایسی صورت میں کون کہہ سکتا ہے کہ اورنگ زیب صرف ہندوؤں ہی کے ساتھ سختی کرتا تھا۔ اور اُس نے جس قسم کا جہاد سیوا جی کے مقابلے میں کیا ہے وہی دارا شکوہ۔ شجاع۔ مراد اور دکن کے تاجدار ابوالحسن کے مقابلے میں نہیں کیا، اور بیجاپور کے محاصرے میں اُس نے اُسی جوش و خروش کا اظہار نہیں کیا۔ اورنگ زیب کے عہدِ حکومت میں ستائیس ہندو بڑے بڑے عہدوں اور منصبوں پر فائز تھے۔ اگر عام عہدیداران اور فوجی افسروں کا شمار کیا جائے تو یہ سلسلہ ہزاروں تک پہونچ سکتا ہے۔ اورنگ زیب بت شکنی کے معاملہ پر نہایت شہرت رکھتا ہے، لیکن بدامنی اور شورش کے زمانہ میں اُس نے بہت مجبور ہو کر سیاسی و ملکی ضرورت سے ایسا کرنے کی جرأت کی۔ اور اُسی صورت میں جبکہ اُنھیں فوجی مرکز بنا دیا گیا تھا۔ عام حالات اور امن و سکون کے وقت اُس نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ اورنگ زیب نے پچیس سال دکن میں قیام کیا مگر وہاں کے کسی بتخانے کو نہیں چھیڑا۔ اگر اُسے اُن سے دشمنی ہوتی تو دکن کے ہزاروں مندروں پر بھی غصہ کی نگاہیں ڈالتا، لیکن اُس نے کبھی اس قسم کا ارادہ تک نہیں کیا۔

لیکن مصیبت یہ ہے کہ تاریخ کے طالب علم ہندو ہوں یا مسلمان، اورنگ زیب کو محض ایک بت شکن کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اُنھیں اول سے آخر تک یہی بتایا گیا ہے، اور یہی ذہنیت لے کر وہ اسکول اور کالجوں سے نکلتے ہیں۔ اگر انھیں بھی سچی تاریخ پڑھائی جائے تو ہندو مسلمانوں کی بہت سی عداوتیں دور ہو جائیں، اِن میں محبت، ہمدردی اور رواداری کے جذبات پیدا ہوں، قومی حکومتوں اور قومی کارکنوں کو جو مسئلۂ تعلیم یا ہندو مسلم اتحاد سے دلچسپی رکھتے ہیں فوراً اس اہم ضرورت کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ اور تاریخی کتابوں سے جو آجکل مدارس میں پڑھائی جارہی ہیں، ایسے فاسد اور تباہ کن عنصر کو فوراً خارج کر دینا چاہیئے جو دونوں قوموں میں منافرت و عداوت، دشمنی اور تنگ دلی کی خلیج کو بڑھا رہا ہے۔

شاعر

(از نتیجۂ فکر ڈاکٹر جگدیشور چندر قیسیؔ بیرنی)

زمانہ میری ہستی کو مٹا سکتا ہے؟ ناممکن
چراغِ زندگی میرا بجھا سکتا ہے؟ ناممکن

مکمل زندگی ہوں، مَیں مجسّم کامرانی ہوں
قدم پیچھے مرا کوئی ہٹا سکتا ہے؟ ناممکن

کوئی حد ہی نہیں ہے میرے پروازِ تخیّل کی
مرے جذبات کو کوئی دبا سکتا ہے؟ ناممکن

مَیں وہ ہوں ایک دنیا جسکے آگے سر جھکاتی ہے
زمانہ میری گردن کو جھکا سکتا ہے؟ ناممکن

چراغِ دیر و کعبہ دونوں میرے دم سے روشن ہیں
انھیں اک کرمکِ ناداں بجھا سکتا ہے؟ ناممکن

جہاں کو درس دیتا ہوں مَیں آئینِ محبت کا
کوئی دنیا محبّت کی مٹا سکتا ہے؟ ناممکن

مَیں دنیائے محبت کے لئے اک خضرِ منزل ہوں
مرے دعوے پہ کوئی حرف لا سکتا ہے؟ ناممکن

مری قوت کا لوہا مانتا سارا زمانہ ہے
مَیں "شاعر" ہوں مرا اک کھیل دنیا کو بنانا ہے

غزل

ہم اُن کی جب نگاہِ فتنہ ساماں دیکھ لیتے ہیں
حقیقت ہی بتوں میں شانِ یزداں دیکھ لیتے ہیں

کبھی ہم اُن کو ہر ذرّے میں پنہاں دیکھ لیتے ہیں
کبھی ہر شکل میں اُن کو نمایاں دیکھ لیتے ہیں

قفس میں یاد آجاتی ہیں وہ آزادیاں پچھلی
کسی کو باغ میں جب گل بداماں دیکھ لیتے ہیں

اگرچہ لاکھ دیوانے ہیں اتنا ہوش رکھتے ہیں
بہار آنے سے پہلے اپنا داماں دیکھ لیتے ہیں

ہمیں بے ساز و سامانی پہ اپنی شرم آتی ہے
جنوں میں جب کبھی سوئے گریباں دیکھ لیتے ہیں

ہمیں اچھا سمجھتے ہیں یہ رازِ عشق اے واعظ
کہ ہر سجدے سے پہلے اپنا ایماں دیکھ لیتے ہیں

صنم خانہ ہو میخانہ ہو یا کعبہ ہو اے قیسیؔ
ہم اپنا جذبِ ایماں تا بہ امکاں دیکھ لیتے ہیں

عہدِ جدید

(از شایق ہندو)

(۱)

نذرِ اشک و ہدیۂ لختِ جگر دیتا ہوں میں — مفت بالکل دولتِ لعل و گہر دیتا ہوں میں
ساکنانِ ارضِ مشرق اپنا رتبہ پوچھ لیں — ہر کسی کو اُس کی قسمت کی خبر دیتا ہوں میں
ہندیوں کے حق میں ہوں پیغمبرِ انسانیت — خاک کے پُتلوں کو جذباتِ بشر دیتا ہوں میں
گلشنِ ہندوستاں کو ہو نویدِ نوبہار — لالہ و گُل کو پرِ و بالِ شرر دیتا ہوں میں
ہاں خدا ہاں بھیج اب خطراتِ تازہ نو بہ نو — حضرتِ انسان کو ذوقِ صد خطر دیتا ہوں میں

(۲)

بارگاہِ حق سے حکمِ کن فکاں ہونے کو ہے — یہ جہانِ کاف و نوں پھر سے جواں ہونے کو ہے
از سرِ نو ہوگی تکوینِ قوانینِ حیات — شیوۂ پارینہ بے نام و نشاں ہونے کو ہے
امتیازِ خواجگی و بندگی مٹ جائے گا — گرم بازارِ مساواتِ جہاں ہونے کو ہے
شیوہ ہائے سُبحہ و زُنّار ہوں گے برطرف — پھر سے تازہ سنّتِ تیغ و سناں ہونے کو ہے
شعلہائے لالہ و گُل پائیں گے سوزِ دروں — بندوبستِ دستبردِ باغباں ہونے کو ہے
صفحۂ عالم بنے گا خوانِ یغما سر بہ سر — عام اتنی نعمتِ ہر دو جہاں ہونے کو ہے

(۳)

ہندیِ ناعاقبت اندیش و نافرجام سُن — آ۔ اِدھر آ۔ سُن رجائیت کا یہ پیغام سُن
کب تلک سنتا رہے گا وعظِ شیخ و برہمن — کام کی باتیں بھی اے سرگشتۂ اوہام سُن
ایک دھوکا ہے حدیثِ شرّ بیت اللہ دیکھ — ایک جلوہ ہے فروغِ صورتِ اصنام سُن
ہو رہی ہیں جملگی اقوامِ عالم فیض یاب — ہے ورودِ رحمتِ باری کا یہ ہنگام سُن
چار سوئے دہر میں بیدار ہے روحِ عمل — ہے یہی موقع و محلِ ہمت و اقدام سُن
وقتِ فرصت ہے جو کرنا ہو وہ کر لے جلد جلد — کچھ نہیں ہے اعتبارِ گردشِ ایام سُن

"چتا کے انگارے"

ایک قصہ

از شری امرناتھ جوہری بی۔ اے (الہ آباد یونیورسٹی)

(۱)

شفق کی سُرخی اناساگر جھیل کے خاموش پانی کو طرح طرح کے رنگوں میں تبدیل کر رہی تھی۔ سامنے دُور تک پہاڑوں اور ٹیلوں کے دلآویز سلسلے سورج کی آخری شعاعوں میں چمک رہے تھے۔ پیڑوں کے سائے آہستہ آہستہ لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی کسی چڑیا کا چہچہانا سنائی دیتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا قدرت کی ناؤ تاریکی کے اتھاہ سمندر میں ہچکولے کھا رہی تھی اور فضا اختتام زندگی کا روپ بھر رہی تھی۔

گلاب کے پھول کے مانند دو بچے ابھی تک جھیل کے کنارے کھیل رہے تھے۔ دونوں عمر کے اُس حصے سے گذر رہے تھے جب دنیا کے جذبات کا تھوڑا تھوڑا علم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور ایک عجیب قسم کی برقی قوت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ کشور کی عمر تقریباً تیرہ چودہ سال کی تھی۔ سروج کی گیارہ کے قریب۔ دونوں نے دنیا میں آنکھ کھولتے ہی ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ زندگی کے آفتاب کی پہلی سنہری کرنوں کی گنگا میں دونوں گانٹھ جوڑ کر نہائے تھے۔ وہ زمانہ بھی کتنا مُبارک تھا۔ نفس کی آلائشوں سے پاک، زندگی کی ڈراونی حقیقتوں سے دُور، دونوں نے شاید کبھی ایک دوسرے کو اپنے سے الگ نہ دیکھا تھا۔

مگر یہ خواب فانی تھا، سماج کے تنگ دائرے میں جہاں ہر وقت زندگی اور موت کی بازیاں لگی رہتی ہیں ان باتوں کے لئے جگہ نہ تھی۔ زندگی کے قانون و قواعد ان بچوں پر بھی نافذ ہونے لگے۔ اور آج اسی بات کو سوچکر دونوں متفکر تھے۔ سروج کو حکم ملا تھا کہ اُسے اب گھر سے باہر نہ نکلنا چاہیئے، کیونکہ اب وہ بڑی ہو گئی ہے۔ کشور کو تنبیہ کی گئی تھی کہ اب کھیل کود چھوڑ کر اسے پڑھنے لکھنے کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ یہ بات دونوں نہ سمجھ سکے، مگر اُن کے سمجھنے کے لئے تھوڑے ہی کہی گئی تھی!

سروج نے کاغذ پھاڑتے ہوئے کہا "اب میں کبھی ناؤ نہ بناؤں گی" اور چپ چاپ کشور کے پاس آ بیٹھی۔

کشور کیا کہتا۔ حسرت سے سروج کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اُس کا بس چلتا تو وہ زندگی بھر سروج

کے ساتھ کاغذ کی ناؤ بنا کر کھیلنا۔ کچھ سوچکر اُس نے کہا "سروج! تم جب کہیں اور چلی جاؤگی تو مجھے بالکل ہی بھول جاؤگی"۔

سروج نے تجاہلِ عارفانہ کے ساتھ کہا "کہاں چلی جاؤنگی؟"

کشور نے اُس کے جذبات پڑھنے کی کوشش کی اور کہا "تم اتنا بھی نہیں جانتیں سروج!"

"نہیں" اُس نے کہا "میں کہیں نہیں جاؤنگی" اور ہنسکر کشور کے ہاتھ پکڑ لئے "تم بڑے شریر ہو ایسی باتیں کہتے ہو"۔

اور اپنی آنکھوں میں سو سو بوتلوں کا نشہ لئے ہوئے وہ کشور کی طرف دیکھکر ہنس پڑی، دیوتا مسکرا دئے

(۲)

سروج کے رخساروں پر سولہ بہاروں کی لالی چمکنے لگی۔ دنیا اور دنیا کی فضا بدل گئی، سروج" اب بڑی ہوگئی، بچپن کی باتیں بھی ہوا ہوگئیں۔

اِس عرصہ میں اُس نے ایک مرتبہ بھی کشور کو نہ دیکھا۔ کشور کی محبت اُس کے سینے میں دفن ہوگئی اور وہ پُورے انہماک کے ساتھ دُنیا کے کاموں میں لگ گئی تھی۔

ایک دن اُس نے سُنا کہ اُس کی شادی ہو رہی ہے، گھر میں چل پہل شروع ہوگئی۔ دُور دُور نیوتے جانے لگے۔ سب کے چہروں پر خوشی و مسرت کے آثار نمایاں تھے، بھائیوں اور بہنوں کی خوشی کا کیا کہنا گویا اُنھیں کا بیاہ رچایا جا رہا تھا۔

لیکن سروج کو یہ دھوم دھام پسند نہ آئی: "بیاہ ہوگا" "کس کے ساتھ؟" "کیوں؟" "آخر ایسی جلدی کیا ہے!" "اور پھر کشور؟"

اب نہ معلوم کدھر سے کشور کی یاد چور کی طرح آگئی۔ جس بات کو وہ پانچ برس کے عرصہ میں بھول گئی تھی، وہ پھر ایسی تازہ ہوگئی۔ گو یا کل ہی کی بات ہے۔ سروج سوچتی کہ یہ کیا بات ہے؟ اس کے دل میں سیکڑوں سوالات اُٹھتے تھے سیکڑوں بھولی ہوئی باتیں یاد آتی تھیں۔ اب اُسے کشور اور اپنی ماں اور بہنیں سب کو چھوڑنا ہوگا۔ اُس نے سوچا کہ میں وہاں کیسے رہ سکونگی۔ اُس کی نظر میں شادی موت کے مانند معلوم ہو رہی تھی، مگر اس کی وجہ کیا ہے، اسے وہ نہ سمجھ سکی۔

اور کشور اُس سے ملنے کیوں نہیں آیا، وہ جا رہی ہے، اتنا بڑا دکھ سہہ رہی ہے، پھر بھی کسی کو اس پر رحم نہیں آتا۔ ماں شادی کی تیاریوں میں مصروف ہے، سہیلیاں مذاق اُڑاتی ہیں، کشور کہاں گیا جس سے سب باتیں کہہ کر وہ اپنے جی کے بوجھ کو ہلکا کرتی، لیکن وہ کہاں تھا؟

آنے والی جُدائی کے خیال نے اُس میں کشور کے لئے اور بھی محبت پیدا کر دی۔ تکلیف کے وقت ہم اپنے دشمن سے بھی محبت کرنے لگتے ہیں۔ لیکن سروج نے سوچا کہ وہ کشور کو بھول جائیگی اُس سے صرف ظاہری تعلق رکھیگی اور اگر کبھی کشور آئیگا تو وہ منھ چھپا کر بھاگ جائیگی۔ اس خیال نے اُس کے دل میں ایک قسم کی قوت ارادی پیدا کی اور اس قوتِ ارادی کے ساتھ ساتھ محبت سے کھیلنے کے منصوبے، اُس وقت وہ یہ نہ سمجھ سکی کہ یہ منصوبے اُسکی قوتِ ارادی کو جلاکر راکھ کر دیں گے، مگر راکھ اور مٹی سے ہی تو مورتیاں بنتی ہیں!

۳

وہ خاوند کے گھر آئی، دنیا کے رنگین خوابوں کی رانی بنکر، کسی بہشتی حور کی مانند، آنکھوں کو چکا چوند کرنیوالی روشنی میں ناچتی ہوئی۔ اور اس کے ساتھ ہی جذبات کا ایک ناپیدا کنار سمندر اس کے دل کی گہرائیوں میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اُس کے دماغ میں امیدوں خواہشوں اور ارمانوں کے ختم نہ ہونے والے ہنگامے بپا تھے۔ مگر اُس نے ان سب کو اپنے خاوند کے چرنوں میں ڈال دیا۔ اور خود ایک گنہگار قیدی کی طرح اس کی آنکھوں میں سما گئی۔

اُس کا خاوند شیام بھی کالج کا طالب علم تھا۔ اُس نے بھی ادب کا مطالعہ کیا تھا، اور ناولوں کی ہیروئنوں کو اپنی محبت کا معیار بنایا تھا۔ اُس ملاح کی مانند جو دن بھر سمندر کا سفر کر کے شام کو ساحلِ زمین پر قدم رکھتے ہی اپنے کو دنیا کا سب سے زیادہ خوش نصیب آدمی تصور کرتا ہے۔ شیام بھی اپنے دلی ارمانوں کو سروج کی صورت میں مجسّم دیکھکر مست ہو گیا۔ اُس نے سمجھا، اُس کی فتح ہوئی ایک وارفتہ مزاج بندۂ عشق کی طرح اُس نے اپنا سب کچھ سروج کو دے دیا۔ لیکن سروج اُسے منظور نہ کر سکی۔ وہ تو اپنا سب کچھ پہلے ہی کشور کو نذر کر چکی تھی۔

شادی کے بعد کچھ مہینے تو بڑے آنند سے گذرے۔ شیام نے ہر طرح سے سروج کو خوش رکھنے کی کوشش کی، لیکن جتنی اُس کی محبت بڑھتی گئی اُتنی ہی سروج پیچھے ہٹتی گئی۔ اپنی غلطی اور ناقابلیت کا اُسے تھوڑا سا تجربہ ہوا۔ اُسے معلوم ہوا کہ خاوند کی محبت سانپ بن کر اُسے ڈس لے گی۔ اور پھر بلی چٹان بن کر اُسے کچل دے گی۔

اُسے اپنے اوپر غصہ آیا، شیام کی محبت دیکھکر اُس کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگتے، وہ سوچتی کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ وہ کیوں مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں؟ میرا جسم تو اُن کا ہو ہی چکا، مگر دل .... آخر وہ دل کے اتنے طلبگار ہی کیوں ہیں؟

شیام ایک آدرش نوجوان تھا۔ اپنی نیک چلنی، خوش اخلاقی اور اعلیٰ ذہانت کی وجہ سے وہ کالج کا ایک مشہور و نیکنام طالب علم تھا۔ اُس نے ہندی لی تھی، اُسے کتب بینی کا اس قدر شوق تھا کہ ہر وقت ہندی ادب

کی خوشہ چینی کرتا رہتا تھا۔ ان کتابوں کے علاوہ اسے اور کسی چیز کا شوق نہ تھا۔ وہ فرسٹ ڈویژن میں بی۔اے پاس ہوا۔

اُسے دیکھکر سروج کے قلب مضطر میں طوفانی جذبات کا تلاطم برپا ہونے لگتا ہائے وہ ... کتنا نیک ہے دنیا کے کسی مکروفریب اور جھوٹ کو جانتا ہی نہیں ہے۔ ندی کی لہروں کی طرح نرمل، تپائے ہوئے سونے کی طرح کندن۔ لیکن اس پر بھی وہ اس سے محبت نہ کرسکی، دغا دے سکتی تھی، مگر یہ بھی نہ دے سکی، اس کا جی چاہتا تھا سر پھوڑ کر جان دیدے۔

اس خیال نے دماغ میں جاگزیں ہوکر سروج کی زندگی تلخ کردی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اُس کی تندرستی بگڑنے لگی، چہرہ پیلا پڑنے لگا۔ پاگلوں کی طرح وہ اکثر اوقات سارے واقعات بھول جاتی تھی۔ تھوڑے ہی دنوں میں شیام کو معلوم ہوگیا کہ اس کی بیوی تپ دق کے آخری درجے سے گذر رہی ہے۔ شیام نے سر پیٹ لیا۔

(۴)

اجمیر کالج سے اعزاز کے ساتھ بی۔ ایس۔سی کی ڈگری لیکر کشور نے الہ آباد یونیورسٹی میں ایم۔ ایس۔سی کلاس میں نام لکھایا۔ جن دنوں وہ اجمیر میں پڑھتا تھا اُس کے دل میں کئی مرتبہ سروج سے ملنے کی خواہش ہوئی لیکن وہ ایسا نہ کرسکتا تھا۔ شیام اُس کا دوست تھا، اور گو اُس نے اُسے کئی بار بلایا پھر بھی سروج سے ملنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اُس کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ جس وقت سروج کی شادی ہورہی تھی اُس وقت کشور انا ساگر جھیل کے کنارے بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ آج میری دنیا سونی ہوگئی۔ آج سے میرے سارے ارمان ہمیشہ کے لئے لوٹ گئے۔

اس درمیان میں بہت سی باتیں ہوئیں، بڑی بڑی تبدیلیاں ہوئیں، گردش روزگار نے شیام کا بھی پیچھا نہ چھوڑا، شہر میں اُس کے جو مکانات تھے نذر آتش ہوگئے، اور اُسے مالی مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ مگر اس عرصہ میں پوشیدہ طور سے اس کے پاس ہر مہینہ روپئے آجاتے تھے، اُسے تعجب کے ساتھ ساتھ ندامت بھی ہوتی تھی مگر وہ اس کا تدارک نہ کرسکا۔ بعض لوگ اس بات سے واقف تھے۔ صرف شیام ہی نہیں جانتے تھے۔

جب سروج کی سہیلی نے ایک دن اُس سے سارا حال کہا تو اُس کی گردن بار احسان سے جھک گئی برسوں کے بھولے ہوئے جذبات اُبل پڑے۔ کشور کی صورت آنکھوں میں پھرنے لگی، اور ایک رات کو دنیا کے تمام اُصولوں کے خلاف ورزی کرکے، سماج کو ٹھکرا کے اُس نے کشور کو خط لکھ ہی دیا۔

خط دیکھکر کشور کا دل خوشی سے بیتاب ہوگیا۔ اوہ سروج اب اتنا اچھا لکھنے لگی ہے۔ اُس کے پاس سروج کے بچپن کی ایک کاپی رکھی تھی۔ اُس کو اُس نے نکال کر دیکھا اور ایک بار وہ پھر وقت کے اس تجربے پایاں

کو پار کر کے اناساگر جھیل کے کنارے پہونچ گیا۔ سروج نے اپنے خط میں کشور کو بُلایا تھا۔

اس مرتبہ جب گرمیوں کی چھٹی میں شیام نے اُسے منصوری بُلایا تو وہ انکار نہ کرسکا۔ شیام نے لکھا تھا کہ" سروج کی حالت بہت خراب ہے، ہم لوگ یہاں اکیلے ہیں، اگر تم آجاؤ تو اچھا ہے۔"

(۵)

سروج کی چارپائی کے پاس کُرسی پر بیٹھتے ہوئے جس وقت کشور نے کہا" سروج تم کب سے بیمار ہو؟" اُس وقت سروج آنکھ بند کئے چپ چاپ پڑی تھی۔

کشور کی آواز سُن کر چونک پڑی، گویا خواب سے جاگی۔ پھر کشور کی طرف ٹکٹکی لگاکر دیکھنے لگی، بولی" کیا تم سچ مچ آگئے؟ میں نے تو تم سے ملنے کی اُمید ہی چھوڑ دی تھی۔ اچھی طرح ہو؟"

شیام اُس وقت ڈاکٹر صاحب کو بُلانے گئے تھے۔

سروج کا سوال سُنکر کشور کے دل میں برچھی سی چبھی، ایسا معلوم ہوا کہ سیکڑوں بچھوؤں نے کاٹ کھایا اپنی بے پروائی اور خودغرضی پر افسوس ہوا، آنکھوں میں آنسو جل کر راکھ ہو گئے۔

سنبھل کر بولا" تم کب سے بیمار ہو سروج؟ مجھے اطلاع کیوں نہ دی"؟

سروج ہنس پڑی، ہڈیوں کے ڈھانچہ میں موتی چمک اُٹھے۔

کشور نے لمحہ بھر کے لئے آنکھیں بند کرلیں، ہائے سروج کا وہ رنگ وروپ کہاں گیا؟ پھر کسی نے دل کو مسوس کر کہا۔ کشور اس کے لئے تمھیں گنہگار ہو، تمھیں نے سروج کی یہ حالت بنادی ہے۔ کشور کا سر خود بخود ندامت سے جُھک گیا۔

سروج نے کہا" سچ کہتی ہوں کشور، اگر تم ہماری مدد نہ کرتے تو میں نہیں کہہ سکتی......"

کشور نے اُسے روکتے ہوئے کہا، اِن باتوں کو چھوڑو، یہ بتاؤ کس کی دوا کر رہی ہو؟

جم دوت کی،

ٹھیک اسی وقت شیام اور ڈاکٹر کمرہ میں داخل ہوئے۔

(۶)

تین مہینے کی دن رات خدمت کا نتیجہ یہ ہوا کہ سروج اچھی ہو چلی، اب وہ تھوڑا تھوڑا گھوم پھر بھی آتی تھی، تھوڑا بہت پڑھنے بھی لگی تھی۔ کشور اُسے نئی نئی کہانیاں سُناتا، اخبار وغیرہ کی خبریں بھی بتادیتا۔ یہ تین مہینے پھر ایک دوسرے کو نزدیک لے آئے

ایک دن سروج گھوم کر آئی تو کشور کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا، شاید کچھ سوچ رہا تھا، اُس روز سروج

کچھ تھکی ہوئی سی تھی۔ آتے ہی پلنگ پر لیٹ گئی۔ کچھ اداس بھی تھی، بولی "تم آج باہر نہیں گئے"؟
کشور اس وقت قدرتی مناظر دیکھنے میں اتنا منہمک تھا کہ اُس نے سروج کا سوال سُنا ہی نہیں، پھر یکایک چونک کر اُٹھ بیٹھا، بولا "تم کب آ گئیں، مجھے تو معلوم ہی نہیں ہوا!"

سروج نے کچھ سوچکر کہا، اب تو تعطیل ختم ہو رہی ہے، تم کالج نہ جاؤگے؟

اس خیال کے آتے ہی اُس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں، وہ کشور کی طرف دیکھ نہ سکی۔

کشور نے کہا "چلا جاؤنگا" پھر اُس کی طرف ایک نگاہِ ترحم سے دیکھکر بولا کہ "تو ایسی کیا جلدی ہے"
"میرے لئے اپنا ہرج کیوں کرتے ہو؟"

"میں یہ سوچ رہا تھا سروج کہ گھر میں تو تمھارا علاج ٹھیک طرح نہ ہو سکے گا.... میرے کالج کی تم پروا نہ کرو......"

"تب؟"

اور شیام کا جانا بھی ضروری ہے، اب اُن کی بھی چھٹیاں ختم ہو گئیں..... میری رائے یہ ہے .... کہ..... اگر تم یہیں کچھ دن بنی رہو..... اور......"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کشور؟"

شیام بھی اُسی وقت آ گئے، بولے "گھر سے خط آیا ہے ....." مگر سروج کی طرف دیکھکر چونک پڑے بولے، "آج تو تم بہت تھکی ہوئی معلوم ہوتی ہو......"

پھر کشور کی طرف دیکھکر بولے "کشور بھیّا تمھارا یہ احسان میں زندگی بھر نہ بھولونگا، تمھیں نے مجھے جیون دان دیا ہے، تم نے سروج کی جتنی سیوا کی ہے، اُتنی کوئی سگا بھائی بھی نہیں کر سکتا تھا، میں تمھارا قرض کئی جنم تک نہ چُکا سکونگا"

اس نے اتنا کہا اور فرطِ عقیدت سے اُن کی آنکھیں بھر آئیں۔

منصوری چھوڑنے سے ایک دن پہلے سروج نے کہا "کشور! نہ جانے پچھلے جنم میں میں نے کون سے پاپ کئے تھے جن کا ڈنڈ مجھے یہاں بھوگنا پڑا۔ پھوٹی قسمت لے کر آئی تھی جبھی تو کسی کو سکھ نہ دے سکی"

کشور نے کہا "ایسا نہ کہو سروج......"

لیکن سروج نہ مانی۔ آج وہ سب کچھ کہہ ڈالے گی، زندگی میں آہ پھر کبھی موقعہ ملا یا نہ ملا۔

بولی "اگر تم نہ آتے تو میں زندہ بھی رہتی، اس میں مجھے شک ہے،.... ایک بات پوچھوں، بتاؤ گے؟"
"پوچھو!"

"تم مجھے بالکل بھول گئے تھے؟ پانچ برس ہوگئے تم نے ایک دفعہ بھی خبر نہ لی۔"

کشور سر جھکائے کھڑا تھا، سروج نے کہا "خیر، اس بات کو جانے دو، مگر یہ تو بتاؤ کشور کہ کیا تم نے مجھ سے کبھی پریم کیا تھا؟"

"تم اس کو کیوں پوچھتی ہو سروج؟ کیا تم نہیں جانتیں؟"

"جانتی ہوں، تب ہی پوچھ رہی ہوں، سنو کشور، تم مجھے بھول جاؤ، ہمیشہ کے لئے میری محبت دل سے نکال کر پھینک دو، سمجھ لو کہ میں کبھی تھی ہی نہیں...... میرے لئے اتنا کرو کشور!"

کشور کا گلا خشک ہوگیا، جسم میں عجیب قسم کی سنسناہٹ محسوس ہوئی، آخر بڑی دقت سے بولا،

"ایسا کیوں کروں سروج؟" اور پھر مسکرانے کی کوشش کی۔

سروج بولی "اس لئے کہ تم دیوتا ہو اور میں پاپن ہوں، میں نہیں چاہتی کہ تمہاری ساری سیوا اور تپسیا کو ضائع کردوں۔ کشور اس بیماری میں جس لگن سے تم نے میری سیوا کی ہے اور جس آتمک پریم کو نبھایا ہے کیا میں اُسے نشٹ ہونے دونگی، مر جاؤنگی پر ایسا نہ ہونے پائے گا۔"

کشور نے سروج کے چہرے کو غور سے دیکھنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے استقلال اور نفس کشی کی چمک کے سامنے کشور کی آنکھیں نہ اُٹھ سکیں، جذبات کو دباتا ہوا بولا..." سروج......!"

سروج اُٹھ کھڑی ہوئی اور ہاتھ جوڑتی ہوئی بولی "تم دیوتا ہو، میں تمہاری پوجا کرونگی، آرادھنا کرونگی، لیکن پریم نہ کرسکوں گی۔"

کشور حیرت سے سروج کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ صرف اتنا ہی کہا "تمہارا حکم سر آنکھوں پر" اور دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھاک کر دوسرے کمرے میں ایک آرام کرسی پر گر پڑا۔

دوسرے دن وہ الہ آباد چلا آیا۔



پانچ مہینہ بعد ———

سب کچھ ختم ہوچکا تھا، سروج کی زندگی کی چنگاری بجھ چکی تھی...... سروج کی چتا بھڑک کر دہک رہا تھا، سامنے اناساگر جھیل کا پانی خاموشی سے بہہ رہا تھا، کچھ چنگاریاں چمک چمک کر انسانی زندگی کا مذاق اُڑا رہی تھیں....

کشور سوچنے لگا، اور ماضی کا پردہ اُس کے سامنے سے ہٹ گیا..... اُس نے دیکھا....

اناساگر جھیل کے کنارے دو بچے کھیل رہے تھے، سروج نے کاغذ پھاڑتے ہوئے کہا۔ اب

میں کبھی ناؤ نہ بناؤنگی.....

اُس نے کہا " سروج، تم جب کہیں اور چلی جاؤ گی تب تو مجھ بالکل ہی بھول جاؤ گی

سروج نے کہا " کہاں چلی جاؤنگی ؟"

اُس نے کہا " تم اتنا بھی نہیں جانتیں سروج ؟".

" ہش " اُس نے جواب دیا " میں کہیں نہ جاؤنگی ..... تم بڑے شریر ہو، ایسی باتیں کہتے ہو ....."

چتا کے انگارے اُس وقت بھی ہنس رہے تھے۔

جذباتِ اختر

آرزوئے وصل رسم عام ہے — جاں نثاروں کو وفا سے کام ہے

حُسن کی فتنہ نگاہی کم نہیں — عِشق ہی پر کیوں یہ سب الزام ہے

ذرّہ ذرّہ میں یہ جوشِ انقلاب — اُس نگاہِ عشوہ گر کا کام ہے

صاحبِ ذوقِ نظر تو ہو کوئی — ہم نے مانا تیرا جلوہ عام ہے

آپ بھی ہیں میری بربادی پہ خوش — کیا محبت کا یہی انجام ہے

جنّتوں کا ذکر کیوں ہے بار بار — چاہنے والوں کو تجھ سے کام ہے

دیکھکر تیور ترے بدلے ہوئے — ذرّہ ذرّہ لرزہ بر اندام ہے

انقلابِ دہر کا اعجاز دیکھ — عاصیوں پر لُطف ہے انعام ہے

خونِ ناحق سے ہو جس کے رخ پہ رنگ — ایسی دنیا سے مجھے کیا کام ہے

ہے وہ اِک تخئیلِ رنگیں کی بہار — واعظوں میں جس کا جنّت نام ہے

دیکھکر دار و رسن ہمت نہ ہار — منزلِ مقصود بس دو گام ہے

اُس کی بے مِہری پہ یہ شکوے گلے!
عاشقی اختر اِسی کا نام ہے؟

ہندو یونیورسٹی لائبریری بنارس

از مولوی فاضل منشی مہیش پرشاد پروفیسر ہندو یونیورسٹی

ہندو یونیورسٹی کی اہمیت جہاں اور باتوں کی وجہ سے ہے وہاں اسکی لائبریری بھی قابل ذکر ہے۔ یہ لائبریری درحقیقت سنٹرل ہندو کالج کی بنیاد کیساتھ یعنی ۱۸۹۸ء میں وجود میں آئی تھی۔ اس کے بعد جب پروفیسر تیلنگ مرحوم نے اپنے والد ماجد کی یادگار میں بہت سی کتابیں لائبریری کو دیں تو اسمیں ایک قابل قدر اضافہ ہوگیا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ ڈاکٹر اینی بسنٹ مرحومہ کی سرپرستی میں لائبریری کی حیثیت بہت ہی اچھی ہوگئی۔

۱۹۱۶ء میں جب ہندو یونیورسٹی کی بنیاد پڑی اور سنٹرل ہندو کالج کے ساتھ ہی ساتھ لائبریری بھی ہندو یونیورسٹی کے تحت میں آگئی، تو اس کا انتظام ایک کمیٹی کے سپرد ہوا جسمیں وائس چانسلر۔ پرو وائس چانسلر۔ رجسٹرار۔ لائبریرین اور بعض دیگر اصحاب ممبر منتخب ہوئے۔ سرجادوناتھ سرکار جو اسوقت ہندو یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ اس لائبریری کے سب سے پہلے لائبریرین مقرر ہوئے۔

چونکہ یونیورسٹی کی وجہ سے لائبریری کی مزید ترقی و تکمیل کی ضرورت تھی۔ اس لئے تقریباً ایک لاکھ روپیہ ضروری کتب و رسائل وغیرہ کی خریداری کیلئے منظور کیا گیا۔ اس کے علاوہ یو۔ پی گورنمنٹ اور بعض دیگر علم دوست و فیاض حضرات کے گراں بہا عطیات نے لائبریری کی اہمیت اور بھی بڑھادی۔

یو۔ پی گورنمنٹ نے پچاس ہزار روپیہ عطا کیا۔ ملک کے نامور لیڈر سیٹھ جمنالال بجاج نے اپنے دادا سیٹھ بچھراج جی (وردھا) کے نام پر پچاس ہزار روپیہ دیئے۔ بیکانیر ریاست کے سیٹھ بھیرو داس ایشور چندجی نے دس ہزار روپئے ریسرچ کے لئے سائنٹفک رسائل اور عمدہ عمدہ کتابیں خریدنے کے لئے عطا کئے۔ کلکتہ کے سیٹھ رورمل گوینکا نے تقریباً چالیس ہزار قیمت کی نادر و نایاب سنسکرت کتابوں کا ذخیرہ عطا کر دیا۔ ہندو یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر سر سندر لال کے بھائی پنڈت بلدیو رام صاحب داوے نے بھی اپنی قانونی کتابوں کا گراں مایہ ذخیرہ عطا کیا۔ حیدرآباد دکن کے رائے بیج ناتھ صاحب نے اپنا ذخیرہ عنایت کیا۔ جسمیں قانونی کتب کا عنصر غالب تھا۔ فخر قوم پنڈت موتی لال نہرو جی کے ذخیرہ نے قانونی سرمایہ کی اہمیت بہت ہی زیادہ بڑھادی۔

کلکتہ کے نامور جج سر آسوتوش چودھری نے پانچ ہزار جلدیں اپنے والد ماجد بابو درگا داس جی کے نام نامی پر عطا کیں۔ سر آسوتوش کے بھائی مسٹر پرست ناتھ چودھری نے فرانسیسی زبان کی مستند مصنفین کی پندرہ سو تصنیفات مرحمت فرمائیں۔ فرانسیسی زبان کا ایسا گراں بہا سرمایہ غالباً ہندوستان کی کسی اور لائبریری میں نہیں ہے۔ بمبئی کے شری پرسوتم وسرام ماوجی کی چھ ہزار کتابیں بھی اِس لائبریری کو مل گئی ہیں انمیں بعض کتابیں خاص طور پر قابل دید ہیں۔ اِس سرمایہ میں رباعیات عمر خیام کے باتصویر نسخے بھی ہیں۔

صاحب خمخانۂ جاوید مرحوم لالہ سری رام صاحب ایم۔اے کا عربی، فارسی اُردو کتب و رسائل کا بیش قیمتی ذخیرہ بھی اسی لائبریری کو ملا۔ اِس قیمتی ذخیرے میں بہت سی قلمی کتابیں اور بعض نایاب مطبوعات ہیں، مثلاً:۔

مہر نیمروز، از مرزا غالب دہلوی، مطبوعہ دہلی (ایڈیشن اوّل) ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۴ء

مثنوی ابر گہر بار، از مرزا غالب دہلوی، مطبوعہ دہلی (ایڈیشن اوّل) ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۴ء

رسالہ گلدستہ نتیجہ سخن کلکتہ ۱۸۸۳ء کے پرچے وغیرہ وغیرہ

کتابوں کے علاوہ عمدہ عمدہ تصاویر کا جو ذخیرہ جناب لالہ سری رام صاحب نے عنایت فرمایا ہے اس کی وجہ سے لائبریری کے میوزیم کی قدر و قیمت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ یہ تصاویر مغل و راجپوتی آرٹ کے فن لطیف کی جیتی جاگتی مورتیں ہیں۔

مُلک کے مشہور تاریخ دان اور عالم بابو کاشی پرشاد صاحب جیسوال مرحوم بیرسٹر پٹنہ نے اپنی تمام کتابیں لائبریری کو عطا کر دی ہیں۔

اِن کے علاوہ تھوڑی تعداد میں کتابیں عطا کرنیوالے قدردانوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اِن عطیات کی بدولت بھی بہت سی اہم کتابیں مل گئی ہیں۔ چنانچہ کنور راج رگھونندن سنگھ طاہر صاحب متوطن کناری بازار دہلی کی عنایت سے ہندو یونیورسٹی لائبریری کو دیوان غالب اُردو کا وہ نسخہ مل گیا ہے جو غالب کی زندگی میں نظامی پریس کانپور سے ۱۲۹۶ھ / ۱۸۶۲ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ مطبوعہ نسخہ بہت کمیاب اور قابل قدر ہے۔ کیونکہ مرزا نے جس نسخے کی خود تصحیح کی تھی اُسی سے یہ دیوان طبع ہوا تھا۔

لکھنؤ کے منشی مہادیو پرشاد صاحب کی بدولت اُردو میں ناولوں کا سیلاب اُمنڈ چلا تھا اُنھوں نے اپنا تمام مال و متاع ہندو یونیورسٹی کے حق میں وصیت کیا تھا۔ چنانچہ اِس وصیت کی بدولت لائبریری کی کتابوں میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔

کتب و تصاویر کے علاوہ لائبریری کو قدیم سکوں کا بہت اچھا مجموعہ بھی بنارس کے رئیس جناب

بابو درگا پرشاد صاحب کی فیاضی سے مل گیا ہے۔

اسی سلسلے میں اس امر کا بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ ہندوستان اور ممالک غیر کی بعض مطبوعات یونیورسٹی کو مفت ملی ہیں۔ مثلاً گورنمنٹ آف انڈیا کی مطبوعات، عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کی مطبوعات ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد کی مطبوعات، لیگ آف نیشن کی مطبوعات، کارنیگی انسٹیٹیوٹ امریکہ کی مطبوعات۔

غرض اسوقت اس لائبریری میں تقریباً ایک لاکھ کتابیں ہیں اور ہر سال تقریباً پچیس ۲۵ ہزار روپوں کی کتب کا اضافہ ہوا کرتا ہے۔

برٹش میوزیم لنڈن، باڈلین لائبریری آکسفورڈ اور کنگس کالج لائبریری کیمبرج میں فارسی گیتا کے جو نسخے ہیں ۱۹۳۸ء میں اُن کے عکس بھی ہندو یونیورسٹی کے لئے منگائے گئے ہیں۔

مرحوم مہاراجہ صاحب بڑودہ نے ۱۹۲۷ء میں ڈیڑھ لاکھ روپیہ ہندو یونیورسٹی کو لائبریری کے لئے عطا فرمایا تھا۔ چنانچہ اُن کے نام نامی پر لائبریری کی عمارت کا سنگِ بنیاد سن مذکور ہی میں ہز ایکسیلنسی لارڈ اروِن گورنر جنرل و وائسرائے ہند نے رکھا تھا۔ اب اس عمارت کا بیشتر حصہ پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے چنانچہ ۱۶ ستمبر کو یونیورسٹی کے بانی مبانی فخر ملک و ملت پنڈت مدن موہن مالویہ جی مہاراج نے لائبریری میں ایک ریڈنگ روم کی رسم افتتاحی ادا کی ہے۔ اب لائبریری رات کے وقت ۸ بجے تک کھلی رہا کرے گی اور معلم و متعلم دونوں اس سے پہلے سے بھی زیادہ فائدہ اٹھا سکیں گے۔

خیالات زرّین

غلطی کرنا نادان رہنے سے کہیں بہتر ہے۔

سیدھے راستہ پر چل کر کوئی گمراہ نہیں ہو سکتا۔

وقت گذرتے دیر نہیں لگتی۔

زندگی کا منزل مقصود خوشی و مسرت نہیں بلکہ نیک اعمال ہے

ہر کام میں خدا کی یاد رکھنا۔ یہی اصل مذہب ہے۔

(ماخوذ)

سمن نگم

تنقید کتب

بہاراں[1]

ناظرین زمانہ خان بہادر مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی ڈپٹی کمشنر سیتا پور کے نام نامی سے بخوبی واقف ہیں۔ آپ ایک نامور ادیب زمانہ کے قلمی معاون اور ہمارے دیرینہ کرمفرما ہیں۔ پُرگو، کہنہ مشق اور نازک خیال سخنور ہونیکے علاوہ آپ اعلیٰ درجہ کے سخن سنج اور نقاد بھی ہیں۔ آپ کا دیوان "اثرستان" کے نام سے شائع ہوکر مقبول عام ہو چکا ہے لیکن اُس کو کئی سال ہو گئے۔ اس لئے قدر دانان سخن یہ سُن کر خوش ہوں گے کہ حال ہی میں آپ کے کلام معجز نظام کا ایک مکمل دیوان خاص اہتمام سے طبع ہوا ہے۔ اسمیں آپ کی تازہ ترین غزلیں پُرانے کلام کا انتخاب، متفرق اشعار اور فارسی کلام سب کچھ یکجا کر دیا گیا ہے۔

کسی شاعرانہ کلام کی تنقید کرنا دراصل "عالم رنگ و بو" کے تجزیہ و تحلیل کے بمنزلہ ہے۔ ایک پھول اپنے خاص ماحول مخصوص فضا اور اپنی ظاہری حیثیت میں جتنا خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ اتنی دلفریبی اور دلکشی اُس وقت باقی نہیں رہتی، جب یہ بتایا جائے۔ کہ اُس میں ہائیڈروجن یا نائٹروجن کی کتنی مقدار ہے یا کاربن کا کتنا جزو ہے۔ اسی طرح اثر صاحب کے کلام کا جو لطف اُس کے پڑھنے اور اُس سے لطف اُٹھانے میں ہے وہ اس تنقید کرنے میں نہیں۔ اس لئے ہم صرف اتنا ہی عرض کریں گے کہ یہ مجموعہ کلام قدیم و جدید لکھنوی اسکول کی شاعری کا ایک دلکش مجموعہ ہے۔ جس کا اندازہ اشعار ذیل سے ہو سکتا ہے جو اس دلچسپ مجموعہ سے لیگئے ہیں۔

پردہ اگر اُٹھے نگہ امتیاز کا — آئینہ منھ تکا کرے آئینہ ساز کا

ہوش کس کو ہے تیرے ذوق طلبگاری میں — خواب سب دیکھتے ہیں عالم بیداری میں
دل سلامت ہے تو اک روز دکھا ہی دینگے — یہ جو اک شان خودی ہے ابھی خودداری میں

لو اُن کے التفات پہ بھولا ہوا ہے دل — ایسے اجل گرفتہ کو ہشیار کیا کریں؟
ہے ہے وہ منتیں نگہ نیم مست کی — اب اس کے بعد شوق کا اظہار کیا کریں؟

میں مرگ و زیست اس کے سوا جانتا نہیں — آیا تیری پناہ میں، تیری پناہ سے

[1] حجم ۴۸۰ صفحات۔ قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ نظامی پریس لکھنؤ۔

دیکھا مآلِ عرضِ تمنا دلِ خراب! — محروم ہوگئے نگہِ گاہ گاہ سے

نکلے بھی تو یوں آہ دلِ تنگ سے نکلے — جس طرح کہ نغمہ کی صدا چنگ سے نکلے

دل حیرتیِ بزمِ تماشا نہیں ورنہ — وہ جلوۂ بیرنگ ہر اک رنگ سے نکلے

میں نے ہر آرزوئے دل پہ کیا دل کو شُلا — شوق کو لغزشِ مستانہ سکھانے کے لئے

تجھ کو اپنی ہی دلآزاری پیہم کی قسم — لُطف کی ایک نظر ہوش میں لانے کے لئے

محرمِ شوخیِ جلوہ نہیں آنکھیں ورنہ — کبھی پنہاں وہ ہوا تھا کہ نمایاں نہ ہوا؛

ہے یہی کفر محبت کے پرستاروں میں — عشق اگر عشق کی عصمت کا نگہباں نہ ہوا

غم نہیں تو لذتِ شادی نہیں — بے اسیری لطفِ آزادی نہیں

تجھ کو دیکھا ہی نہیں چشمِ تماشائی نے — کام دل کا بھی دیا ہے کہیں بینائی نے

بے نقاب اب تو نظر آ کہ بہت دیکھا ہے — پردے پردے میں تجھے چشمِ تماشائی نے

یہی اک قطرۂ خونِ جگر سرمایہ مژگاں — ٹپک جائے سرِ دامن تو سازو برگِ طوفاں ہے

اسے اے کارسازِ عشق تحتِ سن میں لکھ دے — وہ اک لفظِ وفا جو داستانِ دل کا عنواں ہے

بزمِ امکاں جلوۂ جانانہ سے معمور ہے — آنکھ ہو تو ہر طرف روشن چراغِ طور ہے

مل گئی ہیں گو مکان و لامکاں کی سرحدیں — جس کا میں جویا ہوں اے ہمت وہ منزل دور ہے

بہم خلوص تھا آپس میں دوستانہ تھا — نفاق تھا نہ کدورت تھی کیا زمانہ تھا

اثر تھا رند سیہ مست و معصیت آلود — مگر کلام کا انداز عارفانہ تھا

غرض یہ "بہاراں" اسی قسم کے خوش رنگ اور خوش بو پھولوں کا ایک آراستہ و پیراستہ چمن ہے جسکی روح پرور نکہتوں سے مذاقِ سلیم کا مشامِ جان معطر ہو جاتا ہے۔ اس مجموعہ کا نام "بہاران" بھی خوب تجویز کیا گیا ہے۔ سرنامہ پر میر کے یہ اشعار درج ہیں ؎

چلتے ہو تو چمن کو چلئے — کہتے ہیں کہ بہاراں ہے

پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں — کم کم باد و باراں ہے

کوئی شک نہیں اثر صاحب نے اکثر غزلوں میں میر کی زبان کی بڑی کامیابی سے پیروی کی ہے یہ مجموعہ ظاہری محاسن سے بھی آراستہ پیراستہ ہے۔ لکھائی چھپائی نہایت نفیس۔ کاغذ بہتر۔ جلد خوشنما۔

کائناتِ دل

یہ ایک دوسرا نفیس مجموعہ مکرمی منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی کا شائع ہوا ہے۔ منور صاحب کا خاندان

ہمیشہ علم و فضل کیلئے مشہور رہا ہے چنانچہ آپ کے والد حضرت افق مرحوم اور چچا حضرت تمنا لکھنوی نے اُردو ادب کی تمام عمر خدمت کی۔ منور صاحب کے خسر جناب صدر مرحوم کو بھی فن تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا خاندانی بزرگوں کے علاوہ منور صاحب کو حضرت نظر لکھنوی سے فیض حاصل کرنے کا بھی موقعہ مل چکا ہے غرض منور صاحب نے شعر و سخن کے گہوارہ میں پرورش پائی ہے۔ یوں بھی لکھنؤ کی فضا موسیقی اور شعریت سے معمور رہی ہے۔ منور صاحب جن کا کلام زمانہ اور ملک کے دوسرے رسالوں میں شائع ہوتا رہتا ہے نسیم عرفاں" کے نام سے" شری بھگوت گیتا" کو اُردو نظم میں منتقل کر چکے ہیں جو مقبول عام ہو چکا ہے۔ اور اب "کائناتِ دل" میں آپ نے اپنی سب نظمیں یکجا کر دی ہیں۔ اُن کی تعداد دو سو کے قریب ہے اور یہ مختلف مضامین پر لکھی گئی ہیں۔ چنانچہ ہر شخص کو اپنے دلچسپی کے مطابق اسمیں کافی نظمیں مل جائیں گی۔ بہت سی نظمیں ذاتی اعتقادات سے متعلق ہیں۔ باقی میں قومی جذبات کے مختلف پہلوؤں پر دلچسپ و دلنشین انداز بیان میں اظہار خیالات کیا گیا ہے۔ متعدد نوحے اور بیس پچیس ترجمے بھی اس مجموعے میں شامل ہیں یہ نظمیں سب کی سب بلند پایہ اور دلکش ہیں اسلئے اگر قدر دانانِ سخن منور صاحب کی کائناتِ دل" کا سرسری طور پر بھی مطالعہ کریں گے تو انھیں یہ فتویٰ دینا پڑے گا کہ منور صاحب کی شاعری ہندوستان کی موجودہ شاعری کا ایک پسندیدہ نمونہ ہے۔ آپ نے حسن فطرت کی نقاشی کے ساتھ ساتھ قومی جذبات کی بھی بوجہ احسن ترجمانی فرمائی ہے۔ بعض نظموں کے شعر نمونتاً درج کئے جاتے ہیں جن سے ناظرین زمانہ خود اُن کی دلچسپی کا اندازہ کریں گے۔ "محبت کا مذہب" نامی نظم میں کہتے ہیں ؎

نہ جدت ہے اہلِ شریعت کی اِس میں — نہ دقت ہے راہِ طریقت کی اِس میں
نہ حاجت کسی کی اطاعت کی اِس میں — ضرورت نہ شغل و ریاضت کی اِس میں

طریقِ پرستش یہ اعلیٰ ہے سب سے
محبت کا مذہب نرالا ہے سب سے

یہی ایک مسلک ہے جو قدرتی ہے — اسی ایک مشرب میں اصلی خوشی ہے
یہی دین ایک قابلِ پیروی ہے — جو سمجھو تو یہ بات ایمان کی ہے

طریقِ پرستش یہ اعلیٰ ہے سب سے
محبت کا مذہب نرالا ہے سب سے

آگے چلکر یوں درس عمل دیتے ہیں ؎

اب آؤ یہ دُنیا کے جھگڑے چکا دیں — یہ تفریق و تمیز دل سے مٹا دیں

محبت کے مذہب کا سکہ چلادیں سرورِ حقیقی کی لذت چکھادیں

....

نہ کوئی یہودی، نہ کوئی نصارا ہو بس ایک مذہب ہمارا تمھارا
محبت کی تنویر ہو عالم آرا دکھائے یہ وحدت کا ہم کو نظارا

....

برسات کے ترانے میں جو منظر کشی کی گئی ہے ملاحظہ ہو

طرب خیز کیسا ہے منظر فلک پر گھٹاؤں نے پھیلائے ہیں پر فلک پر
رواں ہے یم آبِ کوثر فلک پر اُتر آیا ہے شاید سمندر فلک پر
ہیں آئینۂ قدرت کے جوہر فلک پر

کبھی موسلا دھار بارش کا عالم کبھی بوندیاں ننھی ننھی ہیں کم کم
اُمڈتے ہیں رہ رہ کے جذبات پیہم برستا ہے جس وقت پانی جھما جھم
سماں ہے سہانا ہے دلچسپ موسم

منّور صاحب کی اکثر نظموں میں قوم پرستی اور دیش بھگتی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ وہ کیسے قوم پرست اور کیسے دیش بھگت ہیں۔ ذیل کے اشعار سے اندازہ فرمائیے

حُبِ وطن کے راگ الاپے جو ہر نفس یارب زباں ملے وہ، دہن وہ ملے مجھے
جس کا ہر ایک تار ہو سر رشتۂ وفا مرنے پہ اوڑھنے کو کفن وہ ملے مجھے
جس میں نہ غیر ملک کی مٹی کا جزو ہو جسمیں ہو خاک ہند کی تن وہ ملے مجھے
پیراہن وطن کی ہو زینت پہ جس کو ناز اے ضامن لباسِ بدن وہ ملے مجھے
سینہ ہو جس کا چاک وطن کے فراق میں بحرِ جہاں میں درِ عدن وہ ملے مجھے
بلبل صفت ہوں جس کی محبت میں بیقرار رہنے کو بوستاں وہ، چمن وہ ملے مجھے
دی جائے جو محبِ وطن کی زبان سے میں چاہتا ہوں دادِ سخن وہ ملے مجھے

کتاب کے شروع میں نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی، جناب فراقی دریا بادی، حضرت جوش ملیح آبادی، جناب ساحر دہلوی اور جگر صاحب بریلوی کی منظوم تقریظیں ہیں، اسکے بعد پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی، ڈاکٹر موہن سنگھ صاحب دیوانہ اور مسٹر آصف علی بیرسٹر دہلی کی فاضلانہ تقریریں ہیں، اور انکے بعد مسٹر گوپی ناتھ امن دہلوی کا مقدمہ اور مسٹر گیان پرکاش اختر بریلوی کی تنقید درج ہے۔ اس دلکش مجموعہ کلام میں منّور صاحب

کی ہاف ٹون تصویر بھی ہے جس کے نیچے اُن کا یہ شعر درج ہے ؎

میرے کلام سے خونِ جگر ٹپکتا ہے　　قبولِ عام کی پھر بھی سند نہیں ملتی

غالباً ہر خادم اُردو کو یہی شکایت ہے مگر جس جوش و مسرت سے سرزمین ملک نے کلام منوّر کی تقریب و تعارف میں حصہ لیا ہے اس کے بعد اُن کو اپنے معاصرین سے بے قدری کی شکایت تو نہ ہونا چاہئے۔

منوّر صاحب نے اپنے مجموعہ کلام کو اپنی ماں کے نام معنون کیا ہے۔ اِس چھوٹی سی بات سے بھی منوّر صاحب کا اہل دل ہونا ثابت ہوتا ہے۔

کالیداس[۱] اور ودّیا

پراچین ہندوستان کے مشہور ترین سخنور ملک الشعراء کالیداس، مہاراجہ بکرماجیت کے نو رتن میں تھے اُن کے ڈرامے "شکنتلا"۔ "میگھدوت" اور "وکرم اروسی" وغیرہ تمام دنیا میں مشہور ہیں اور قریب قریب ہر زبان میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ لیکن اِس نامور شاعر کی نسبت یہ روایت مشہور ہے کہ ابتداء میں وہ قطعی جاہل اور اَن پڑھ تھے حُسنِ اتفاق سے کالی داس کی شادی ایک عالی خاندان اور عالم فاضل بیوی سے ہوگئی۔ ایک روز اُن کی بیوی نے اُن کے اجڈپن سے تنگ آکر اُن کو دھکا دیدیا اور وہ بالاخانہ سے لڑھکتے ہوئے نیچے گرے۔ اتفاق دیکھئے جہاں وہ گرے "کالی دیوی" کا مندر تھا۔ کالیداس شدید زخمی ہوگئے اور زخموں سے خون بہنے لگا۔ جس پر کالی جی نے خوش ہوکر انھیں علم و فضل کا بردان دیا۔ چنانچہ اس کی شکرگذاری میں اُنھوں نے آیندہ کے لئے اپنا نام "کالی داس" یعنی کالی جی کا غلام رکھ لیا۔ یہ روایت صحیح ہو یا غلط مگر اسی روایت کو سنگِ بنیاد قرار دیکر پنڈت جگدیش چندر جوش ابنالوی نے ایک دلچسپ ڈرامہ تیار کرڈالا۔ یہ ڈرامہ دلچسپ ہونے کے علاوہ اصلاحی اور سبق آموز بھی ہے۔ زبان صاف اور عام فہم۔ پلاٹ بھی اچھا اور دلکش ہے اسمیں موٹے موٹے اور ثقیل الفاظ کے استعمال سے پرہیز کیا گیا ہے تاہم دو ایک نامانوس لفظ آگئے ہیں۔ بہرحال اِس ڈرامہ میں اَن پڑھ بالغوں کو حصولِ علم کی ترغیب دی گئی ہے۔ جو ملک کیلئے بہت مفید بات ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ سب پسندیدہ۔

انوکھے افسانے[۲] (حصہ اول)

اِس نام سے مولانا محمد نذر الاسلام صاحب فضلی کے افسانوں کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے۔ یہ سب سراغرسانی کے قصے ہیں۔ جنمیں پہلے چار تو ایک ہی کہانی کی مختلف کڑیاں ہیں۔ جس طرح مسٹر ظفر عمر کی مشہور ناول "نیلی چھتری" میں بہرام اور محمود سراغرسان کی نوک جھونک ہے۔ اُسی طرح ان افسانوں میں کور ستین

---

[۱] قیمت آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ ودّیا پبلشنگ ہاؤس ابنالہ چھاؤنی [۲] قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ حالی اکاڈیمی، پانی پت۔

نامی ایک ہوشیار جرائم پیشہ عیار اور کپتان عباس علیخان کی دماغی زور آزمائی کا ساماں ہے۔ البتہ پانچواں افسانہ جداگانہ نوعیت کا ہے۔ سب افسانے دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہیں۔

بچوں کی کتابیں

حال میں جامعہ ملیہ دہلی نے چھوٹے بچوں کے پڑھنے کے لائق کئی کتابیں تیار کرائی ہیں۔ چنانچہ "جنگلو کی بلی" کے نام سے مولانا عبدالواحد صاحب سندھی اُستاد جامعہ ملیہ دہلی نے سلیس اور عام فہم زبان میں ایک پر لطف کہانی لکھی ہے۔ اسمیں خیر آبادی دیو کا منتر بھی بہت پر لطف قصہ ہے۔

اس طرح کی دوسری کتاب "انعامی مقابلہ" ہے۔ جسمیں "انعامی مقابلہ" اور "شرارت" نامی دو چھوٹی کہانیاں درج ہیں۔ پہلی میں مختلف چڑیوں کے درمیان گھونسلا بنانے کا مقابلہ ہوا ہے اور دوسری کہانی میں ایک خرگوش نے لومڑی کے کان کاٹے ہیں۔ قصوں کے متعلق بہت سی تصویروں نے اُنکی دلچسپی میں بہت اضافہ کردیا ہے۔ یہ کہانیاں محمد حسین خاں ایڈیٹر "پیام تعلیم" نے بچوں کے لئے لکھی ہیں۔

ایک اور چھوٹی سی کتاب "پوری جو کڑھائی سے نکل بھاگی" نامی ہے۔ جسمیں رقیہ ریحانہ صاحبہ نے بچوں کی تفریح کے لئے دو دلچسپ کہانیاں لکھی ہیں۔ جنمیں ایک کا نام مندرجہ عنوان ہے اور دوسری کا نام "مرغی کا نرالا بچہ" ہے۔ دونوں کہانیاں دلچسپ اور مزیدار ہیں۔ بچے پڑھیں گے تو خوب ہنسیں گے، کتاب کی زبان بھی بچوں کے لئے سلیس بنائی گئی ہے۔ یہ کتابیں دو دو آنہ میں جامعہ ملیہ دہلی سے مل سکتی ہیں،

دستکاری کی کتابیں

تعلیم کے متعلق کانگریس نے جو وار دھا اسکیم مرتب کی ہے اس کا یہی مقصد ہے کہ طلبا کو لکھنے پڑھنے کے ساتھ ساتھ کارآمد دستکاریاں اور ہنر بھی سکھائے جائیں۔ جن سے معاش پیدا کرنے میں مدد ملے۔ اسی خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے عصمت بکڈپو دہلی نے مختلف دستکاریوں کے متعلق چھوٹی چھوٹی کتابیں شائع کی ہیں۔ جنمیں سے ایک زیر نظر کتاب بھی ہے۔ تین جزو کی اس چھوٹی سی کتاب میں سید رضا احمد صاحب جعفری نے لکڑی کے تختہ میں جالی کا کام بنانے کا ہنر سکھانے کی کوشش کی ہے۔ جس کو انگریزی زبان میں Fret-work (کٹاؤ کا کام) کہتے ہیں۔ ماہر مصنف نے اوزاروں اور مشینوں کا حال اور اُن کے استعمال کرنیکے طریقے بیان کردئے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر کام کیلئے موزوں لکڑی کی شناخت کرنے اور اُن کے خاکے اور فریم بنانے، صاف اور پالش کرنے وغیرہ وغیرہ کے طریقے بھی بیان کر دیئے ہیں۔ حسب ضرورت درجنوں نقشے اور تصویریں بھی دیدی گئیں ہیں۔ اسی طرح "وصلی کی دستکاری" کے نام سے سید رضا احمد صاحب جعفری نے وصلی یا دفتی (کارڈ بورڈ) کی مختلف چیزیں بنانیکی ترکیبیں بتائی ہیں۔ اور جابجا نقشے اور شکلیں دیکر مقصد کو سمجھانیکی کوشش کی ہے۔ دونوں کتابوں کی قیمت آٹھ آٹھ آنے،

تلقینِ صبر

(از جناب روحی، حلیم مسلم انٹر کالج کانپور)

اے مرے مشفق نگم، اے پیکرِ علم و کمال — کیوں نہ تڑپائے مرے دل کو ترا رنج و ملال
کر دیا صدموں نے اے والا ہمم تجھ کو نڈھال — طاقتِ صبر و تحمل دے خدائے ذوالجلال

ہو گیا کیسا خزاں دیدہ وہ باغِ آرزو
جس کے دم سے آسماں پر تھا دماغِ آرزو

تیرے چہرے پر اداسی غم کی ہے چھائی ہوئی — ہے کلی افسوس تیرے دل کی مرجھائی ہوئی
ہے وفورِ رنج سے آواز تھرّائی ہوئی — کیوں حریفِ دل نگاہِ چرخِ مینائی ہوئی

کتنی وحشتناک ہے اب شامِ تنہائی تری
آفریں صد آفریں شانِ شکیبائی تری

حیف تجھ پر یک بیک ٹوٹے ہیں دو کوہِ الم — تابِ ضبطِ غم کہاں تک؟ جب ستم پر ہو ستم
آہ یہ پیری کا عالم اور بارِ رنج و غم — تیری ہمت کی کمر کیونکر نہ پھر ہو جائے خم

موت نے بیوی کو، بیٹی کو، جدا تجھ سے کیا
دل، جگر کو اُس نے دو تیروں سے چھلنی کر دیا

کر گئی پرواز روحِ غمگسارِ زندگی — آہ رخصت ہو گئی تجھ سے بہارِ زندگی
اب نہیں دُنیا میں کوئی رازدارِ زندگی — ہو گئی قربان تجھ پر جاں نثارِ زندگی

تیری مایوسی کا عالم کتنا حسرت بار ہے
سچ ہے جب ہمدم نہ ہو تو زندگی بیکار ہے

غم نہ کر، دنیائے فانی کا یہی دستور ہے — امرِ خلاقِ دو عالم سے ہر اک مجبور ہے
یہہ مقام بے بقا، آلام سے معمور ہے — یہ جہاں ظلمت کدہ ہے، وہ جہاں پُر نور ہے

دیکھ! دونوں سُرگ کی رنگینیوں میں کھو گئیں
یعنی جا کے گود میں پرماتما کے سو گئیں

قطعۂ تعزیت

(از حکیم سید محمد عباس صاحب رضوان رائے بریلی)

کیسے ستانے کو بن گئے ہیں حوادثِ روزگار فطرت
بھلا فلک تجھ کو کیا پڑی ہے۔ جو دے کسی دردِ دل کو راحت

زمین کانپی، غبار اُٹھا، جو برق تڑپی تو ابر رویا
ستارے ٹوٹے، فلک جھک آیا، اُٹھی جو اک باوقار میّت

کسی کے جینے کا آسرا کیا، حیات پانی کا بُلبُلا ہے
مُسافر آئے گئے سدھارے، سرائے فانی ہے جائے عبرت

لگی جو ٹھیس آبلہ میں دل کے، ہر ایک رگ ہے شریکِ ماتم
لہُو کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ عجیب ہے چشمِ تر کی حالت

خروشِ فریاد و جوشِ غم سے یہ قول ہے قلبِ مضطرب کا
بہت ہی کم رہ گئی ہے اب تو زمین و افلاک کی مسافت

جہاں میں ہلچل مچی ہوئی ہے، زمانے بھر کی یہی دعا ہے
خدا عزیزوں کو صبر بھی دے جنھیں دیا ہے ملالِ فرقت

بھلائی کر کے گذرنے والی، وفا و الفت پہ مرنے والی
ہزار پردوں میں تو نہاں ہو، مگر نہ دل سے مٹے گی صورت

جہاں تھے اوصاف سب حمیدہ یہ تین باتیں تو منتخب تھیں
سلیقہ مندی۔ ہر اک سے نیکی۔ مزاجِ خاوند کی اطاعت

چمن کے اُس کے جو تازہ گل ہیں، تو ان میں اچھا وکیل کوئی
کوئی سشن جج کوئی ہے ڈپٹی[1] ام۔ کوئی ڈی۔ ایس[2] پی بجاہ و عزت

یہ شوق دل میں بھرا ہوا تھا، تمام حالات کہہ گذاروں
زبان اچھی کہاں سے لاؤں، بیاں میں اتنی نہیں ہے وسعت

کیا جو رضواں نے سالِ رحلت طلب تو ہاتف نے یہ صدا دی
بجھا دی بادِ اجل نے واللہ دیا نزاین کی شمعِ خلوت

سنہ ۱۳۵۸ ہجری

[1] ڈپٹی مجسٹریٹ

[2] ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس

رفتار زمانہ

جنگ یوروپ

حال ہی میں روس نے فنلینڈ پر حملہ کر دیا ہے اور وہاں وہ بالکل ہر ہٹلر کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ اِس سلسلے میں "ہندوستان ٹائمز" نے ایک دلچسپ کارٹون شائع کیا ہے جسمیں ہٹلر کی مشہور کتاب Mein Kamp "میری جدوجہد" اسٹالین کے ہاتھ میں ہے اور وہ غم و غصہ سے اپنے نازی افسروں سے پوچھ رہا ہے کہ میری کتاب کون لے گیا ہے۔ بہرحال لتھونیا، اسٹونیہ اور لٹویہ کو دھمکا کر خاطر خواہ مراعات حاصل کرلینے کے بعد اسٹالین، فنلینڈ سے بھی جبر و تشدد سے اپنا مدعا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ فن لینڈ بعض امور میں دبنے کو تیار تھا لیکن روس کے اکثر مطالبات ایسے تھے۔ جنھیں موجودہ حکمرانِ فنلینڈ منظور نہیں کر سکے اور اُنھوں نے روس کے احکام کی تعمیل کرنیسے معذوری کا اظہار کیا۔ جس پر روس کی فوجوں نے سرحد کا رُخ لیا اور بحیرہ بالٹک میں قوت کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا۔ پچھلے نومبر میں روس کے وزیر خارجہ مولوٹوو نے اِس سلسلے میں ایک تقریر کی تھی اُس سے یہ بھی ظاہر ہوگیا تھا کہ اگر روس کا منشا رآسانی سے پورا نہ ہوا تو اُس کو جنگی کارروائی کرنے میں کوئی پس و پیش نہ ہوگا۔ بہت لوگوں کا خیال ہے کہ روس نے محض اِس وجہ سے کہ اب جرمنی مشرق میں بڑھ رہا ہے اس کو ضروری سمجھا کہ اپنے مغربی محاذ کی حفاظت کا خود ہی اہتمام کرے۔ اِس لحاظ سے اُس کیلئے پولینڈ کے ایک حصہ پر قبضہ کرلینا کافی نہیں ہوا بلکہ بالٹک ریاستہائے بلقان سے بھی ضروری مراعات طلب کرنا لازمی ہوگیا ہے چنانچہ اس کو مجبوراً اپنی موجودہ پالسی پر عملدرآمد کرنا پڑا۔ بہرحال اس وقت روس کا بڑھتا ہوا اقتدار اتحادیوں کے علاوہ جرمنی کے مفاد کے بھی کھُلے صریحاً خلاف ہے۔ اسلئے بعض مدبروں کی رائے ہے کہ اس وقت اتحادیوں کو جرمنی سے صلح و صفائی کی کوشش کر کے کوئی ایسا معاہدہ کرلینا چاہئیے جس سے روس بالکل علیحدہ ہو جائے۔ اِس طریقے سے روس کی جارحانہ کارروائیاں بھی رُک جائیں گی اور جرمنی بھی دھمکی دینے اور جبر و تشدد کی کارروائی کرنیکے قابل نہ رہ جائے گا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو یوروپ بھر میں جنگ پھیل جائیگی۔

روس کی پیشقدمیوں کا اس کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا ہے کہ جنگ کل یوروپ میں محیط ہونیکے علاوہ یوروپ کے باہر بھی پھیل جائے۔ فنلینڈ کے حملہ سے اسکینڈینیویا اور اسکینڈینیویا کے ساتھ کل مغربی یوروپ پر جنگ کا خطرہ طاری ہوگیا ہے۔ چنانچہ حال میں سوویٹ ہوائی جہازوں نے Tornea پر جو فنلینڈ اور سویڈن کے حدود پر واقع ہے، بمباری کی ہے اِس سے بھی یہی اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ روس اپنا حملہ فن لینڈ تک محدود نہ رکھیگا۔

بظاہر روس کے بڑھتے ہوئے اقتدار کی وجہ سے بالٹک کی حیثیت سوویٹ جھیل کی ہو جائے گی جو جرمنی کے لئے ایک زبردست شکست کے برابر ہے۔ کیونکہ اس سے اقتصادی اور سیاسی دونوں لحاظ سے مشرقی یوروپ میں جرمنی کی پوزیشن دوسرے درجہ کی ہو جائیگی۔ اُس پر بھی ایک طرح سے روس کی یہ کارروائی جرمنی کیلئے مفید ثابت ہو سکتی ہے

کیونکہ اِسقدر اقتدار حاصل کرلینے کے بعد روس اپنا کچا مال جرمنی کو بہ آسانی اسٹونیہ اور لیٹویا کے بندرگاہوں کے ذریعے بھیج سکیگا۔ اِسی طرح اگر روس کو جرمنی کی تائید حاصل رہی تو فنلینڈ کے تباہ کردینے اور اُس پر قبضہ حاصل کرلینے میں اُس کو کوئی مشکل درپیش نہ ہوگی۔ کیونکہ روس اپنی کثیر فوج کو اُس سمت روانہ کرسکیگا۔ ورنہ روس کو مشرق بعید کے علاوہ بالٹک اور بلقان کی سرحدوں پر بھی اپنی فوج کا ایک معقول حصّہ جرمنی کے اندیشہ سے محفوظ رہنے کی غرض سے مقیم رکھنا پڑے گا۔ یہ بھی خبر ہے کہ جرمنی روس سے محفوظ و مامون رہنے کے خیال سے اپنی نئی سرحد پر ایک نئی حفاظتی لائن بنانے کا اہتمام کر رہا ہے۔ پولینڈ لے لینے میں روس کو بالکل کوئی دقت نہیں ہوئی کیونکہ اُسکی طاقت جرمنی کے حملوں کی وجہ سے زائل ہوچکی تھی یوں بھی وہاں زیادہ تر ناخواندہ کسان آباد ہیں مگر فنلینڈ کی آبادی خواندہ ہے جہاں کے لوگ ذہین مہذب اور تربیت یافتہ ہیں اور تمام ملک صنعتی ہے اُس کی فوج بھی ایسی ہی منظم کہی جاتی ہے جیسی کہ جرمنی کی، اس لئے روس کا فنلینڈ کو شکست دینا اسقدر آسان نہ ہوگا جیساکہ پولینڈ کی تسخیر کا معاملہ تھا۔ پھر بھی فنلینڈ روس کے مقابلہ میں ایک بہت ہی چھوٹی سی ریاست ہے اور ہم یہ توقع نہیں کرسکتے ہیں کہ وہ دیر تک تاب مقاومت لاسکے۔ بہرحال اِسوقت وہ نہایت استقلال و پامردی کے ساتھ روس سے لڑ رہا ہے۔ اور موسم بھی بہتوں ہی بہت اُسکی مدد کر رہا ہے

جرمنی اور برطانیہ کی جنگ جو ابھی تک رُکی تھمی سی ہے بہت جلد کوئی اور صورت اختیار کرنیوالی ہے۔ ممکن ہے کہ جلد ہی جرمنی انگلستان پر ہوائی حملے کرنا شروع کردے اور انگلستان کو اِتنی مہلت نہ دے کہ وہ نئے ہوائی جہاز جو امریکہ کے کارخانوں میں تیار ہو رہے ہیں انگلستان پہونچ سکیں۔ مگر اس کارروائی کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہالینڈ پر حملہ کرکے بلجیم میں اپنا ہوائی مستقر قائم کرے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں مُلک اپنی اپنی حفاظت کے خیال سے بے فکر نہیں ہیں۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ روس اور جرمنی دونوں کے دانت رومانیہ پر ہیں جس کا داؤں چل گیا وہی رومانیہ کو ہڑپ کرلیگا یہ بھی ممکن ہے کہ جس طرح جرمنی اور روس دونوں نے مل کر پولینڈ کے حصّے بخرے کرلئے۔ اُسی طرح اب پھر یہ دونوں رومانیہ کے حصے بخرے کرنے میں ایک دوسرے سے مل جائیں۔ ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ٹرکی کی سرکردگی میں بلقانی ریاستوں اور اٹلی کا سمجھوتہ ہوجائے اور بحیرہ روم میں فرانس اور برطانیہ کی تائید سے معاملات استقامت حاصل کریں بہرحال اسوقت اٹلی کیلئے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کس کروٹ بیٹھے گا پچھلی جنگ کی طرح اٹلی اِس دفعہ پھر اتحادیوں سے مل سکتا ہے بشرطیکہ وہ اُن کا پلّہ بھاری سمجھے۔ لیکن ابھی تو وہ یورپ میں امن وصلح کا خواہشمند ہے البتہ اگر اُس کے مفاد کے خلاف کوئی کارروائی ہو تو اور بات ہے۔

جرمنی کی بحری سرنگوں اور آبدوز کشتیوں نے اب تک برطانیہ کے بہت سے جہاز ڈبوئے ہیں اُن کا نقصان بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اگر برطانیہ کی بحری طاقت اِسقدر عظیم الشان نہ ہوتی، تو جرمنی کی یہ کارروائی ابتک بہت تباہکن ثابت ہوچکی ہوتی۔ لیکن برطانی ملاحوں کی جانبازی کی جسقدر تعریف کی جائے کم ہے کہ وہ اس وقت بھی جان ہتھیلی پر رکھکر بحری آمدورفت کا سلسلہ جاری کئے ہوئے ہیں۔ جرمنی کی سرنگوں سے اتحادیوں کے علاوہ غیر جانبدار ملکوں کے جہاز بھی تباہ ہو رہے ہیں۔ جسکی وجہ سے بالآخر اِن ملکوں کا غم و غصہ بھی جرمنی پر نازل ہونا لازمی ہے۔ برطانیہ پہلے سے بھی زیادہ

ہمت و مستعدی سے سمندروں کو سرنگوں سے صاف کرنے میں مصروف ہے۔ اُس نے جرمنی کی تشددانہ کارروائیوں کے جواب میں یہ اعلان کیا ہے کہ وہ جرمنی کو جانیوالے اور جرمنی سے باہر آنے والے مال کو ضبط کرلیگا۔ خواہ وہ غیر جانبدار ملکوں کے جہازوں ہی میں کیوں نہ آ جارہا ہو۔ غیر جانبدار ملکوں نے اِس اعلان پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا ہے لیکن اگر واقعی برطانیہ کو اس میں کامیابی ہوگئی تو جرمنی کو اپنی اقتصادی حالت برقرار رکھنے میں بڑی مصیبت کا سامنا ہوگا۔ درحقیقت جرمنی کو شکست دینے کا سب سے آسان طریقہ یہی ہے کہ اسکی درآمد اور برآمد کو قطعی مسدود کر دیا جائے جیسا کہ گذشتہ جنگ عظیم میں ہوا تھا۔

برطانیہ۔ کے اِس اعلان کے خلاف جاپان نے خاص طور پر اظہار ناراضگی کیا ہے، اور ملکوں نے بھی احتجاج کیا ہے لیکن اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ چنانچہ مسٹر چیمبرلین نے اِس بارہ میں معذوری ظاہر کرتے ہوئے اِس بات کو تسلیم کیا ہے کہ گو اِس طرح غیر جانبدار طاقتوں کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ضرور ہے لیکن برطانیہ کے لئے کوئی دوسرا چارہ کار ہی نہیں ہے۔ اسلئے اُسکے نزدیک اگر اِس مقصد کے حاصل کرنے میں غیر جانبدار طاقتوں کو قربانی کرنا پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ تاہم برطانیہ نے اِس رعایت کا اعلان کر دیا ہے کہ اگر مال واقعی اسی قوم کا ثابت ہوگا۔ جس کے جہاز میں لدا ہوا ہے تو اس بات کا پورا خیال رکھا جائے گا۔ چنانچہ ان کپتانوں کو جو جرمنی سے جانیوالے اور غیر ملکوں سے وہاں آنیوالے مال کی نگرانی کرنے کے لئے مقرر ہوئی ہیں، غیر جانبدار ملکوں کے صحیح مفاد کا لحاظ رکھنے کی تاکید کر دی گئی ہے۔ برطانیہ یہ بھی کوشش کریگا کہ غیر جانبدار جہازوں کو کم سے کم تکلیف دی جائے۔

مُلکی مسائل

کانگریسی وزارتوں کے مستعفی ہونے کے بعد سات صوبوں کے گورنر صاحبان نے مختلف صوبوں کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اور گو وہ اِسوقت ہمارے اہل ملک کے نہیں بلکہ صاحب گورنر جنرل ہند کے علاوہ صاحب وزیر ہند اور برٹش پارلیمنٹ کے جوابدہ ہیں اور سات صوبوں میں تیس سال پہلے کی سیاسی حالت یعنی مطلق العنان حکومت پھر از سر نو قائم ہوگئی ہے۔ لیکن برٹش گورنمنٹ کی پالسی کی تعریف کرنا چاہئے کہ ابھی تک ہر جگہ گورنر صاحبان حتیٰ المقدور اپنے سابق وزیروں کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ گورنمنٹ صوبہ متحدہ کی طرف سے اس کے متعلق ایک اعلان بھی شائع ہوا تھا اور گو حکومت کو بعض اصطلاحی وجوہ پر اُس اعلان کی تردید کرنا پڑی ہے لیکن امر واقعہ یہی ہے کہ اِسوقت رفاہ عام کے متعلق کانگریسی وزارت کی تمام اسکیمیں کم و بیش جاری ہیں۔ ان اسکیموں میں جو کہیں کہیں جزوی رد و بدل کیا گیا ہے وہ بدرجہ مجبوری کیا گیا ہے ورنہ عام پالسی یہی معلوم ہوتی ہے کہ حکومت کے تمام انتظامات جیوں کے تیوں چلتے رہیں۔ چنانچہ اسی خیال سے گورنر صاحبان صوبہ متحدہ، صوبہ متوسط۔ صوبہ بہار اور صوبہ سرحد نے گورنمنٹ انڈیا ایکٹ کے ماتحت اختیارات حکومت لینے کا جو اعلان کیا تھا۔ اسمیں اب ایک ضروری ترمیم کا اعلان کر دیا ہے جس کی رو سے وہ اُن قانونی مسودوں کو منظور کر سکیں گے جو سابقہ کانگریسی وزارت کے عہد میں صوبجاتی قانونی مجلسوں سے کثرت رائے سے پاس ہو چکے ہیں۔ لیکن جن کی منظوری کی تصدیق گورنر صاحبان ابھی تک کسی وجہ سے نہیں کر سکے۔ پہلے اعلان کی رو سے یہ سب مسودے بالکل بیکار ہوگئے تھے مگر اس ترمیمی اعلان سے

گورنر صاحبان کو ان مجوزہ قوانین کے منظور کرنے کا حق و اختیار حاصل ہوگیا ہے۔ چنانچہ ہمارے صوبہ کے گورنر ہز ایکسلنسی سر ہیری ہیگ نے ۶ر دسمبر کو نئے قانون مزارعین کو اپنی منظوری دیدی ہے۔ حالانکہ ذی اثر زمیندار و تعلقہ دار صاحبان کی آخر تک یہی کوشش رہی کہ یہ قانون جس کو کانگریسی وزارت نے پورے ڈیڑھ سال کی مسلسل جد وجہد کے بعد دونوں ایوان قانون صوبہ سے منظور کرایا تھا کھٹائی میں ڈال دیا جائے۔ مگر ہز ایکسلنسی نے بہ مشورہ صاحب گورنر جنرل ہند و صاحب وزیر ہند اُسے منظور کرنا ہی مناسب سمجھا۔ اِس قانون سے کسانوں کی حالت بہت کچھ سدھر جائے گی۔ سیاسی حیثیت سے اِس کارروائی سے یہ بات بالکل روشن ہوگئی ہے کہ برٹش گورنمنٹ عوام کے منتخب کردہ وزیروں کی پالیسی میں خواہ مخواہ دخل دینے کو تیار نہیں ہے بلکہ اپنے امکان بھر وہ اسوقت اہلِ ملک کے سیاسی جذبات کا پورا لحاظ رکھنا چاہتی ہے۔ شاید اسی لحاظ سے صوبہ متحدہ میں جنگی بورڈ قائم کرنے کا خیال بھی جس کے عملدرآمد سے جاہ طلب اصحاب کو خواہ مخواہ خودنمائی کا موقعہ ملتا، فی الحال ترک کردیا گیا ہے۔ لیڈران ملک بھی اسوقت ایسی کوئی کارروائی نہیں کرنا چاہتے ہیں جس سے لڑائی کی امداد میں نقص یا رکاوٹ پڑے۔ اِس اثنار میں وزیر اعظم۔ وزیر ہند وغیرہ بڑے بڑے ارکانِ حکومت نے اِس بات کا بار بار اعلان کیا ہے کہ برٹش گورنمنٹ ہرگز امپیریلزم کی پالیسی پر عملدرآمد نہیں کرنا چاہتی بلکہ وہ انصاف، آزادی اور عوام کو حقوق و اختیارات دِلانے کی خاطر ہی اِس جنگ کو جاری کئے ہوئے ہے، اور ہندوستان کو بھی وہ جنگ کے بعد سیاسی آزادی دینے کو تیار ہے بشرطیکہ ہندوستان کے مختلف فرقے آپس میں متفق و متحد ہوکر زندگی بسر کرنے کو تیار ہوں۔ کانگریس کی طرف سے برابر نمایندہ اسمبلی کا مطالبہ ہو رہا ہے۔ مہاتما جی پنڈت جواہر لال نہرو اور دیگر لیڈران کانگریس اس کے دلدادہ ہیں اور اُن کا خیال اور یقین ہے کہ اسی ذریعہ سے ملک کی عام رائے کے مطابق سب فرقوں کے حسب دلخواہ کارروائی ہوسکتی ہے۔ مسلم لیگ کے لیڈران کو اسمیں بہت کچھ رد و کد ہے اور اس وقت اُنھوں نے کانگریس کے دعوؤں اور مطالبات کے خلاف قیامت کا شور برپا کر رکھا ہے۔ اِس تمام شور و غوغا کا اصل مدعا یہ معلوم ہوتا ہے کہ کانگریس کسی طرح صوبوں کی حکومت میں فرقہ وارانہ مسلم لیڈروں کو بھی اپنے ساتھ حکومت میں شامل کرنے پر رضامند ہو جائے۔ چنانچہ اس وقت ہر طرف سے کانگریسی مظالم کا شور بلند کیا جا رہا ہے اور عام مسلمانوں کو کانگریس کی طرف سے بدظن کرنے کی انتہائی کوشش کی جا رہی ہے۔ کانگریس کی طرف سے جب کبھی تفصیلات دریافت کی گئیں تو ابھی حال تک باستثنائے چند عام اور مبہم شکایتوں کے جو ترنگے جھنڈے، بندے ماترم کے گیت، ودیا مندر کی اسکیم اور ہندی کی ترویج وغیرہ کے متعلق ہیں اور کوئی خاص واقعات بیان نہیں کئے گئے۔ فرقہ وارانہ پروپیگنڈا کی بدولت اکثر مقامات میں نقضِ امن واقع ہوچکا ہے۔ لیکن اُن کا انتظام مقامی حکام نے اپنی ذمہ داری پر کیا اور جہاں تک ہم کو معلوم ہے کانگریسی وزرا نے ہر جگہ غیر مسلموں ہی کو دبانے کی کوشش کی۔ چنانچہ یہاں تک نرمی برتی گئی کہ جب کانپور میں آنریبل مسٹر محمد ابراہیم صاحب کے جلوس پر بے وجہ علانیہ حملہ کیا گیا تو بانیانِ فساد کے خلاف کوئی تعزیری کارروائی نہیں کی گئی۔ راستے میں صاحب موصوف پر قرولی کا حملہ ہوا۔ لیکن یہاں بھی ملزم بلاتعرض رہا کردیا گیا۔ اسی طرح ہر جگہ کانگریس نے مسلمانوں کی دلجوئی کرنے کی کوشش کی لیکن چونکہ بڑے بڑے لیڈروں کو حکومت صوبہ

میں کوئی دخل نہیں ملا۔ اس لئے مسلم حقوق کی پامالی کا نعرہ بلند کیا گیا اور اب تک زور وشور سے پروپیگنڈا ہو رہا ہے کہ آج ملک کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک اس کی گونج سُنائی دے رہی ہے۔ ممبران مہاسبھا اور بعض دوسری پارٹی کے، لیڈران بھی جن کے وقار کو کانگریس کی بدولت دھکا پہونچا ہے اپنی اپنی جگہ کانگریس کو بدنام کر رہے ہیں۔ لیکن مسلم لیگ کو اس بارے میں جو کامیابی ہوئی وہ اور کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ بات یہ ہے کہ مسلمانوں میں مذہبی تعصب کا مشتعل کر دینا بہت ہی آسان بات ہے۔ اسی لئے "اسلام خطرہ میں ہے"۔ "مسلم کلچر خطرہ میں ہے" یہ نعرے ملک ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک بلند کر دے گئے ہیں حالانکہ غور اور بے لوثی سے دیکھا جائے تو کانگریس کا سب سے بڑا قصور یہی ہے کہ اُس نے کسی کو کانگریس کا باقاعدہ ممبر ہوئے بغیر اپنی وزارت میں شامل نہیں کیا حالانکہ انہیں گو بعض خاص اصحاب ہمہ تن کانگریس کی پالسی پر عملدرآمد کرنیکو تیار تھے

کانگریس وزارت نے اپنی طرف سے مسلمانوں کا دل ہاتھ میں لینے کیلئے کئی ایسی کارروائیاں بھی کیں، جن سے دوسری قوموں کو خواہ مخواہ شکایت کا موقعہ ملا۔ اسی پالسی کے ماتحت مدح صحابہؓ کے جلوس کی اجازت دی گئی جس سے مُفت میں شیعہ حضرات کی دل شکنی ہوئی اور سُنّی جماعت نے اس نئی رعایت کی کوئی خاص قدر نہ کی۔ بہرحال اسوقت سارا زور اسی پر ختم ہو رہا ہے کہ جس طرح ہو سکے حکومت سے عہدوں اور اعزازوں کی فرقہ وارانہ حیثیت سے تقسیم کرالیجائے۔ اور اگر کانگریس اس پر تیار نہ ہو تو جمہوری طرز حکومت کی بنیادی حیثیت سے مخالفت کی جائے بقول صاحب وزیر ہند اس تمام شور وشر کا صحیح علاج تو یہ ہے کہ پولیٹکل پارٹیاں مذہبی تفرقوں پر نہیں بلکہ سیاسی اصولوں کی بُنیاد پر قائم کی جائیں۔ لیکن تیس سال ہوئے خود برٹش گورنمنٹ نے جداگانہ نیابت کا طریقہ رائج کرکے مشترکہ قومیت کے جذبہ پر ضرب کاری لگائی تھی اور آج جو کچھ دیکھنے میں آرہا ہے اِسی طریقہ نیابت کا نتیجہ ہے۔ اسوقت مظالم کے جو طول طویل افسانے دُہرائے جارہے ہیں۔ اِن کا نتیجہ ملک کی فضا کو گندہ اور عوام کو بدظن کرنیکے سوائے اور کچھ نہیں نکل سکتا ہم یہ نہیں کہتے کہ کانگریسی وزارتوں سے کوئی غلطی نہیں ہوئی یا اُن کا ہر کام بجا و درست تھا۔ لیکن ہم یہ ضرور کہتے ہیں کہ اُنھوں نے خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ بحیثیت مجموعی عوام کی خدمت کرنے اور اُن کے مفاد کو بلا لحاظ مذہب وملت ترقی دینے کی کوشش کی۔ حکومت کا ان کو پہلا سابقہ تھا۔ اسلئے کچھ تو ناتجربہ کاری، کچھ بعض خود غرض طبقوں کی مخالفت کے باعث اور کچھ آئینی مشکلات کی وجہ سے انھیں اپنے مقاصد میں جتنی کامیابی ہونا چاہئے نہیں ہوئی۔ لیکن اگر کانگریس کو آیندہ کبھی اطمینان کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ ملا، تو ہم کو بھروسہ ہے کہ رفاہ عام کے بہت سے کام جو ابھی اُدھورے پڑے ہیں پُورے ہو جائیں گے۔ مگر اسوقت مسٹر جناح کی اس انوکھی تجویز نے کہ ۔ کانگریسی وزارتوں کے استعفاء پر شکرانہ کی نماز ادا کی جائے خوشی منائی جائے ملک میں باہمی نفاق کی خلیج کو بہت زیادہ وسیع کر دیا ہے چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو کو صلح کی بات چیت

ملتوی کرنا پڑی۔ مسٹر جناح نے متفرق "مظالم" پر غور کرنے کے لئے ایک شاہی کمیشن کی تقرری کا بھی مطالبہ کیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ جب وہ اپنی شکائتیں حضور وائسرائے کے سپرد کر چکے ہیں اور صدر کانگریس بابو راجندر پرشاد نے اُن کے متعلق صاحب چیف جسٹس انڈیا کا فیصلہ منظور کرلینے کی رضامندی دیدی ہے تو شاہی کمیشن کی تجویز پیش کرکے مسٹر جناح اس معاملے کو کیوں اس قدر طول دے کر ملک کی رسوائی کا سامان کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے پنڈت جواہر لال نہرو اور مسٹر فضل الحق وزیر اعظم بنگال کے درمیان بھی شکایات کی تحقیقات کے متعلق خط و کتابت ہو چکی ہے مگر اب مسٹر حق بھی روائل کمیشن کی آڑ لے کر تحقیقات کی زحمت سے بچ رہے ہیں۔ اُنھوں نے الزامات کی جو فہرست شائع کی ہے اسمیں تو بہت سی ایسی باتیں ہیں جو اتنے بڑے ملک میں ہر عہد حکومت میں آئے دن ہوتی رہتی ہیں اسکا کانگریسی وزارتوں پر ان معاملات کی ذمہ داری ڈالنا صریحاً زبردستی ہے۔ بہرحال کانگریس کو ان تمام واقعات کی بے لوثی سے جانچ کرا کر اپنا مفصل جواب شائع کرا دینا چاہیئے۔ اس کے علاوہ اور کسی کارروائی کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی گورنران صوبہ کو قلیل تعداد والی جماعتوں کی دادرسی کے ازروئے آئین خاص اختیارات حاصل ہیں۔ اس لئے اگر کسی صوبہ کی وزارت سے اس بارے میں کوئی شدید غلطی سرزد ہوئی ہوتی تو گورنر صوبہ بطور خود اسکی اصلاح ضرور کرتے یہ واقعہ کہ کسی صوبہ کے گورنر کو اپنے وزرا کے نظم و نسق میں اس بنا پر دخل دینے کی ضرورت نہیں پڑی اس بات کا مکمل ثبوت ہے کہ وزرا نے صریحاً کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ کانپور کے فسادات کا جو انتظام ہوا۔ اُس کے متعلق جہاں تک ہماری معلومات ہے آنریبل مسٹر پنتھ وزیر اعظم صوبہ نے جو کارروائی کی۔ اُسمیں ہمیشہ وہ گورنر صوبہ سے مشورہ کرلیا کرتے تھے۔ دراصل آپ نے یہاں تک احتیاط برتی کہ خود جانے سے پہلے انھوں نے اپنے مسلم رفیقوں، مسلم وزیروں اور مسلم پارلیمنٹری سکرٹریوں کو موقعہ واردات پر بھیجکر رپورٹ منگالی۔ آپ خود کسی ہندو ڈیپوٹیشن سے بھی علیحدہ نہیں ملے۔ اس سے زیادہ فرقہ وارانہ جذبات دبانے کیلئے وہ اور کیا کرسکتے تھے؟ اسمبلی ہال میں جب سُنّی نوجوانوں نے حملہ کیا۔ اُس وقت بھی اُنھوں نے انتہائی نرمی سے کام لیا۔ اُس پر بھی آج اُن پر اور کانگریس کی دوسری وزیروں پر مسلمانوں پر ناگفتنی مظالم ڈھانیکا الزام عائد کیا جارہا ہے۔ مسٹر پٹیل صدر کانگریس پارلیمنٹری کمیٹی کا بیان ہے کہ گورنروں کو کبھی اپنے وزیروں سے فرقہ وارانہ طرفداری کی شکایت نہیں ہوئی۔ مسلم لیگ نے "بندے ماترم" پر اعتراض کیا۔ کانگریس نے مسلمانوں کے خوش کرنے کے لئے اُس کے کئی بند اُڑا دئے۔ لیگ نے قومی جھنڈے پر اعتراض کیا۔ اُس کے متعلق بھی کانگریس نے اپنے رویہ میں بہت کچھ تبدیلی کرلی۔ ودیا مندر کے متعلق جو اعتراضات ہوئے۔ اس کے بابت بھی مسٹر شوکلا وزیر اعظم صوبہ متوسط نے سکرٹری مسلم لیگ کی رائے اور مشورہ سے مسلمانوں کیلئے ضروری ترمیم و تنسیخ کردی۔ اب گورنر صاحب صوبہ متوسط نے کانگریس وزارت کے استعفار کے بعد ودیا مندر کا قانون منظور کرلیا ہے

---

[1] یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مسٹر فضل الحق نے صوبہ متوسط کے جن "مظالم" کی فہرست شائع کی ہے، ان کے ہی سکریٹری صاحب مسلم لیگ تحقیقات کرکے اپنا اطمینان کر چکے ہیں۔

اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ اسکیم کسی کے خلاف نہیں، ورنہ برطانیہ کے قائمقام گورنر اُسے کیوں منظور کرتے؟ یہ بات کہ گورنر صاحبان نے اپنی ذمہ داری محسوس کرکے ہی پاس شدہ قوانین کو منظور کیا ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ صوبہ متحدہ میں ملازمت ٹیکس کے ساتھ بالکل دوسرا برتاؤ کیا گیا۔ اور اب اس کے متعلق گورنر صاحب صوبہ کے ایما پر پارلیمنٹ گورنمنٹ انڈیا ایکٹ میں ضروری ترمیم کررہی ہے۔ جس کی رُو سے صوبجاتی وزارتوں کو آیندہ اس ٹیکس کے نام سے کسی شخص سے پچاس روپیہ سے زیادہ رقم وصول کرنے کا اختیار نہ ہوگا۔ اسی طرح گورنران صوبہ کو کسی اور تجویز کے متعلق بھی کسی فرقہ یا طبقہ کی حق تلفی کا اندیشہ ہوتا، تو وہ انھیں ضرور ہی دخل دیتے۔ خواہ اس کا نتیجہ کچھ ہی کیوں نہ ہوتا۔ یہ سب باتیں مسٹر جناح کو بخوبی معلوم ہیں لیکن اسوقت اصل مقصد یہی ہے، کہ جس طرح ممکن ہو کانگریس کو بدنام کیا جائے۔ اس سلسلے میں بات ضرور اطمینان بخش ہے کہ آزاد خیال مسلم لیڈران اور مقتدر اخبارات نے مسٹر جناح کی تجویز کی بہت مخالفت کی ہے۔ جس سے مسٹر موصوف بھی اتنا تو متاثر ہوئے گئے ہیں کہ اب انھوں نے اس بات کا اعلان کرنا ضروری سمجھا کہ اُن کی تجویز ہندوؤں کے خلاف نہیں ہے بلکہ وہ صرف کانگریس سے برسرِ پیکار ہیں اور اُس کے خلاف ایک محاذ قائم کرنا چاہتے ہیں، غالباً اسی مخالفت کا اثر ہے کہ مسٹر جناح نے نمازِ شکرانہ کے علاوہ کسی اشتعال انگیز مظاہرہ، جلوس یا ہڑتال وغیرہ کی ممانعت کردی ہے۔ مسٹر جناح اپنی قوت بڑھانے کے لحاظ سے بعض دوسری اقلیتوں کو بھی اپنے ساتھ لینے کی فکر کررہے ہیں لیکن عیسائیوں اور سکھوں نے تو علانیہ کہدیا ہے کہ انھیں کانگریس سے کوئی شکایت نہیں ہے۔

صوبہ متحدہ میں کنور سر مہاراج سنگھ صاحب نے جو صوبہ کے ایک تجربہ کار افسرِ اعلیٰ اور مسیحی جماعت کے رہنما ہیں، صاف کہدیا ہے کہ کانگریس گورنمنٹ نے دیدہ و دانستہ مسلمانوں کے ساتھ کوئی زیادتی یا تشدد نہیں کیا، خیر حقیقت جو ہو مگر اِسوقت ان باتوں نے ملک کی سیاسی فضا بہت مکدر کردی ہے اور ہندوستان کے آئینی مسئلہ کا حل دشوار سے دشوار تر ہوگیا ہے۔ آیندہ دیکھئے کیا ہوتا ہے؟

نیا سال

سنہ ۱۹۳۹ء کا سال بھی آخر ختم ہو رہا ہے۔ ملک اور دنیا کیلئے یہ سال منحوس ہی ثابت ہوا۔ کیونکہ اسمیں جنگ یورپ چھڑ گئی ہے، جو کیا عجب ہے آگے چل کر عالمگیر جنگ ہو جائے۔ چھوٹے چھوٹے ملکوں کے حق میں تو یہ سال بہت ہی تباہ کُن رہا۔

جہاں تک زمانہ کا تعلق ہے خانگی مصائب کے باوجود جس طرح ہو سکا اس کا کام حسب دستور جاری رکھا گیا اور آیندہ بھی جب تک کارکنوں کے دم میں دم ہے اپنا چیز خدمت کا سلسلہ اسی طرح قائم رکھا جائے گا۔ لیکن اب قدر دانانِ رسالہ کے لئے مستقبل کی فکر ضروری ہے کیونکہ چھتیس ۳۶ سال تک کی مسلسل خدمت کے بعد قدرتاً اس بات کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے کہ رسالہ کی آیندہ زندگی کسی فرد واحد سے وابستہ نہ رہے بلکہ علم دوست و پُرجوش احباب اگر اس ذمہ داری کو فوراً ہی اپنے سر نہ لے سکیں تو کم سے کم اس میں شریک تو ضرور رہیں۔ تمام ناظرین رسالہ کو بھی یہ بات ذہن نشین کرنا چاہئے کہ رسالہ کے ذرائع آمدنی میں توسیع کی سخت ضرورت ہے اس لئے قدر دانانِ رسالہ کو توسیع اشاعت پر اپنی فوری توجہ مبذول کرنا چاہئے تاکہ قابل کارکنوں کی امداد سے یہ علمی خدمت بلا منت غیرے پوری قوت اور شوق و دلچسپی کیساتھ جاری رہ سکے۔ بہرحال عرض کرنا ہمارا کام ہے توجہ دینا شائقین رسالہ کا فرض ہے۔

آیندہ سال زمانہ و ناظرینِ زمانہ کو مبارک ہو

ضروری اطلاع

جن صاحبوں کی خریداری جنوری نمبر سے شروع ہوتی ہے اُنکا حساب اِس نمبر سے ختم ہوگیا۔ اور اب آیندہ سال کی قیمت واجب الوصول ہوگئی ہے۔ اِس لئے اُن سب صاحبان سے درخواست کیجاتی ہے کہ براہِ کرم اِس نمبر کے پہونچنے کے پندرہ ۱۵ دن کے اندر زمانہ کا آیندہ سالانہ چندہ مبلغ پانچ روپیہ (ﷲ) بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمادیں۔ ورنہ جنوری سنہ ۱۹۴۰ء کا پرچہ سالانہ قیمت کیلئے بذریعہ قیمت طلب پیکٹ (V.P.P.) ارسال ہوگا۔

جن صاحبوں کا حساب جولائی یا دوران سال کے کسی دوسرے مہینہ سے شروع ہوتا ہے مگر کسی وجہ سے اُنکی قیمت وصول ہونیسے باقی رہ گئی ہے، وہ بھی براہ عنایت ۱۰ جنوری سنہ ۱۹۴۰ء تک رقم واجب الوصول بذریعہ منی آرڈر بھیج دیں۔ ورنہ اُن کی خدمت میں بھی جنوری سنہ ۱۹۴۰ء کا پرچہ سالانہ چندہ کے لئے وصول طلب پارسل (V.P.P.) سے روانہ ہوگا۔

جن صاحبان کو آیندہ خریداری جاری رکھنا منظور نہ ہو۔ وہ براہ کرم اِس نمبر کے پہونچنے کے بعد فوراً ہی اطلاع دیدیں تاکہ اُنکی خدمت میں جنوری سنہ ۱۹۴۰ء کا رسالہ نہ بھیجا جائے اور وہ قیمت طلب پیکٹ کی واپسی کی زحمت سے اور دفتر زمانہ صرفہ ڈاک کے نقصان سے محفوظ رہے۔

باقیدار اصحاب جو آیندہ خریداری جاری نہ رکھنا چاہتے ہوں براہ خوش معاملگی اپنے ذمہ کی بقایا ادا فرماکر اپنے عندیہ سے مطلع فرمادیں۔

جنوری سے رسالہ کی نئی جلد شروع ہوتی ہے۔ اسلئے نئے خریداروں کو اسی نمبر سے خریداری شروع کرنا چاہیے

نوٹ

(۱) چونکہ قیمت طلب پیکٹ (V.P.P.) کے لئے رجسٹری ہونا ضروری ہے۔ اسلئے دو آنہ فیس منی آرڈر کے علاوہ تین آنہ رجسٹری فیس بھی ادا کرنا پڑتی ہے جس سے قیمت طلب پیکٹ میں لازمی طور پر پانچ آنہ کا صرفہ ہوتا ہے۔ منی آرڈر کے ذریعہ قیمت بھیجنے والے اصحاب کو تین آنہ کی کفایت ہوگی

(۲) قواعد ڈاکخانہ کی رُو سے ویلیو پے ایبل پیکٹ ایک ہفتہ سے زائد ڈاکخانہ میں امانت نہیں رہ سکتے، اس لئے استدعا ہے کہ جو صاحبان منی آرڈر کے ذریعہ قیمت نہ بھیجیں۔ وہ براہ مہربانی جنوری نمبر کا قیمت طلب پیکٹ (V.P.P.) فوراً ہی وصول فرمالیں۔ ڈاکخانہ میں پڑا نہ رہنے دیں۔

(۳) منی آرڈر کے ذریعہ قیمت بھیجنے والے اصحاب کوپن میں اپنا پورا نام و پتہ مع نمبر خریداری صاف و خوشخط تحریر فرمائیں۔ تاکہ رقم بلا صحت کے ساتھ درج حساب ہوسکے۔

منیجر زمانہ کانپور